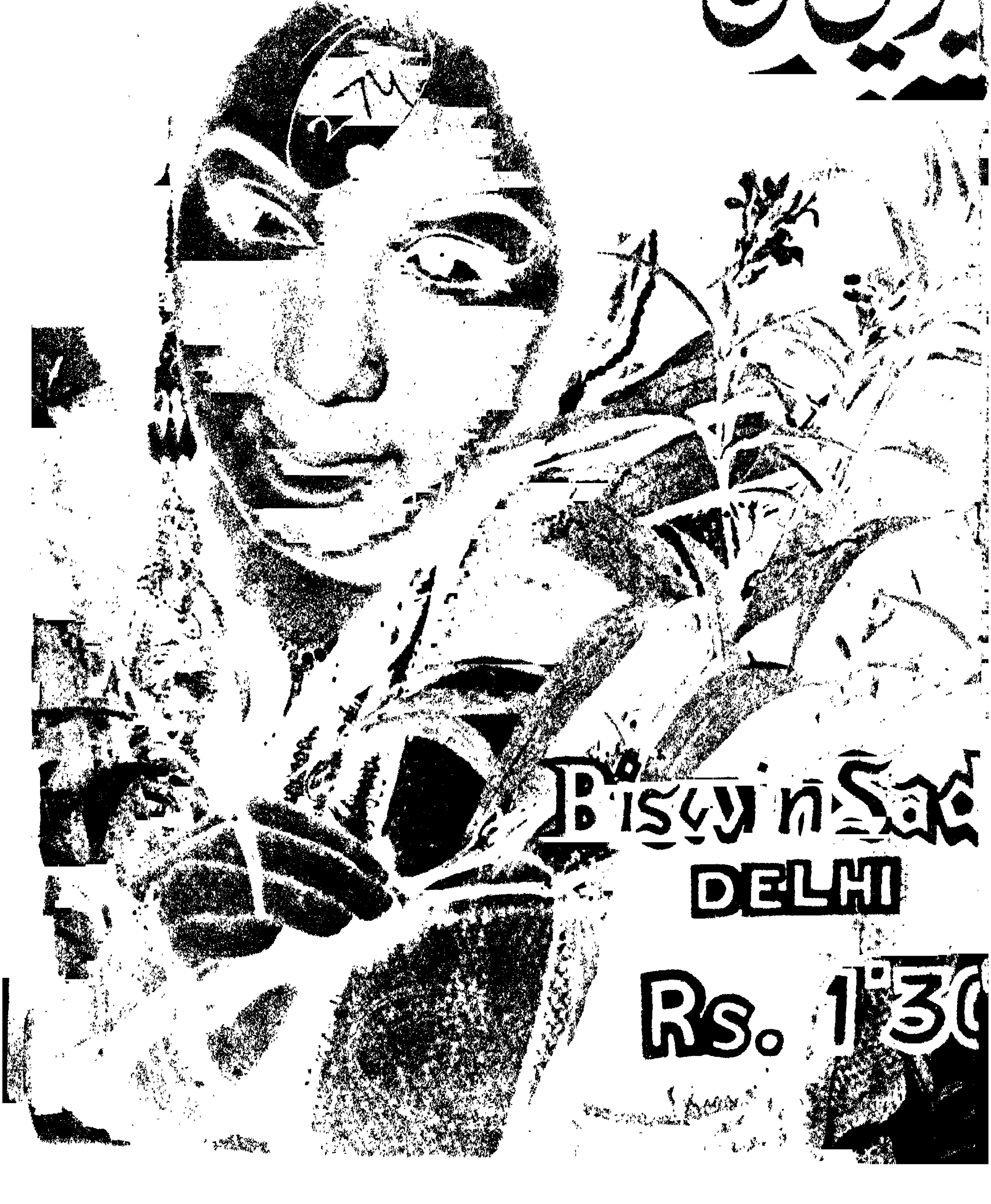
فروری

بیسویں صدی





[illegible]

[illegible]



گذشتہ دنوں یادِ آختر کمیٹی ہوشیار پور کے زیرِ اہتمام پنڈت ہری چند آختر مرحوم کی یاد میں ایک مشاعرہ ہوا۔ جس میں جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اپنا کلام سنا رہے ہیں۔ محفل ہمہ تن گوش ہے۔

متاعِ عہدِ محبت کسی کو کیا معلوم ⁞ یہ دو دلوں کی امانت کسی کو کیا معلوم
نگاہِ لطف و نگاہِ عتاب کیا کہنا ⁞ یہ اندمال و جراحت کسی کو کیا معلوم
جو تو نہیں تو نہ رہے چارہ ساز ترا ⁞ کمالِ سحرِ محبت کسی کو کیا معلوم
وہ اور ہوں گے تغافل کو جو غلط سمجھے ⁞ ہمارا حسنِ عقیدت کسی کو کیا معلوم
نہ شوقِ سجدہ ہے دل میں نہ قصدِ دیر و حرم ⁞ ہماری طرزِ عبادت کسی کو کیا معلوم
کسی نے ہنس کے پکارا تو آنکھ بھر آئی ⁞ دکھے دلوں کی مصیبت کسی کو کیا معلوم

سحر نہ تابِ جدائی ہمیں نہ تابِ وصال
ہمارے دل کی یہ حالت کسی کو کیا معلوم



حضرتِ ساحرؔ ہوشیار پوری اپنی غزل کا جادو جگا رہے ہیں

دوستی کی جو گُل عذاروں سے — دُشمنی ہو گئی بہاروں سے
ایک طوفاں سے کیا بچی کشتی — لاکھ طوفاں اُٹھے کناروں سے
ہم کو اغیار سے گِلہ کیسا — زخم کھائے ہیں ہم نے یاروں سے
رہ گئے دِل میں سینکڑوں ارماں — سینکڑوں غم ملے بہاروں سے
وقت آنے دے، ہم بھی اے صیّاد — گُل تراشیں گے خارزاروں سے
منزلیں خود ہی پاس آئیں گی — ہم نہ گزریں گے رہ گزاروں سے

عاقبت پر نظر ہو کیوں ساحرؔ
ہم کو فُرصت نہیں نظاروں سے



جنابِ آر۔ ڈی۔ سیال وفا غزل سرا ہیں۔

جب کبھی سُن لوں کسی سے ہیں ترانہ عشق کا
یاد آجاتا ہے مجھ کو بھی زمانہ عشق کا

جب وہ کہتے ہیں نہیں ہے عشق سے اُن کو غرض
ہر کسی کو کیوں سُناتے ہیں فسانہ عشق کا

اُن کے کُوچے کے ہر اِک ذرّے کو ہے میرا سلام
ہے اُسی کُوچے میں آخر آستانہ عشق کا

اب محبّت کی جگہ ہے مصلحت، یا ہے ہَوس
آگیا ہے اے وفا کیسا زمانہ عشق کا



حال ہی میں نئی دلّی میں کوی سمیلن کا ایک نیا تجربہ کیا گیا۔ جس کو تھیٹرائنشن کوی سمیلن کا نام دیا گیا۔ اس کوی سمیلن کی خصوصیت یہ تھی کہ شاعروں اور کویوں سے اپنے اپنے گیت پہلے خود سنائے۔ بعد میں انہیں گیتوں کو پٹے ہائے ستار نے آرکسٹرا کی دھن پہ گایا۔ اور ابھرتی ہوئی اداکارہ ممتا نے رقص اور ساؤنڈ کے ذریعے گیتوں کے جذبات کی عکاسی کی۔ تصویر میں جناب پورن لال ہوش نغمہ سرا ہیں۔

زندگی کا میلہ رے یہ زندگی کا میلہ
اس میلے کی بھیڑ میں گھومے ہر انسان اکیلا رے
زندگی کا میلہ رے

اپنے دکھ ہیں اپنے سکھ ہیں سب ہیں کھوئے کھوئے رے
کس کو فرصت ہے جو تیرے بھاگیہ کی گٹھڑی ڈھوئے رے
اپنی اپنی الجھن سب کو اپنا ایک جھمیلا رے
زندگی کا میلہ رے

کوئی اپنا کوئی پرایا ساتھ نہیں جا پائے گا
میت بچھڑ جائے گا رے لگے دشمن بھی چھٹ جائے گا
پل دو پل کا ساتھی، تیرے سنگ جو رٹھا کھیلا رے
زندگی کا میلہ رے

تیرے دل کی میرے من کی بات یہیں رہ جائے گی
صبح یہیں رہ جائے گی ساتھی رات یہیں رہ جائے گی
چھین کے سب لے جائے گا تجھ سے انت سمے کا ریلا رے

زندگی کا میلہ رے

بیسویں صدی دہلی

ایڈیٹر خوشتر گرامی

فروری ۱۹۷۳ء

جلد — ۳۷ شمارہ — ۲

حال ہی میں نئی دلّی میں کوی سمیلن کا ایک نیا تجربہ کیا گیا۔ جس کو تھری ڈائمنشن کوی سمیلن کا نام دیا گیا۔ اس کوی سمیلن کی خصوصیت یہ تھی کہ شاعروں اور کویوں نے اپنے اپنے گیت پہلے خود سنائے۔ بعد میں انہیں گیتوں کو پلے بیک سنگرز نے آرکسٹرا کی دھن پہ گایا۔ اور ابھرتی ہوئی اداکارہ منیشا نے رقص اور بھاؤ کے ذریعے گیتوں کے جذبات کی عکاسی کی۔ تصویر میں جناب نیرج لال رتوشش نغمہ سرا ہیں :۔



زندگی کا میلہ رے یہ زندگی کا میلہ
اس میلے کی بھیڑ میں گھومے ہر انسان اکیلا رے

زندگی کا میلہ رے
اپنے دکھ میں اپنے سکھ میں سب ہیں کھوئے کھوئے رے
کس کو فرصت ہے جو تیرے بھاگیہ کی گٹھڑی ڈھوئے رے
اپنی اپنی الجھن سب کو اپنا ایک جھمیلا رے

زندگی کا میلہ رے
کوئی اپنا کوئی پرایا ساتھ نہیں جا پائے گا
میت بچھڑ جائے گا رے پگلے دشمن بھی چھوٹ جائے گا
پل دو پل کا ساتھی، تیرے سنگ جو روڑھا کھیلا رے

زندگی کا میلہ رے
تیرے دل کی میرے من کی بات یہیں رہ جائے گی
صبح یہیں رہ جائے گی ساتھی رات یہیں رہ جائے گی
چھین کے سب لے جائے گا تجھ سے انت سمے کا ریلا رے

زندگی کا میلہ رے

ٹیلیفون دفتر
ٹیلیفون رہائش

بیسویں صدی دہلی

تیر و نشتر

خوشتر گرامی

• ہندوستان کسی بڑی طاقت کا طفیلی نہیں" وزیر اعظم اندرا گاندھی کا اعلان ـــــ مگر اس پر یہ الزام لگانے والے تو ہیں۔

• شملہ معاہدہ" ایک عنوان ـــــ جس کی قدم بقدم کامیابی سے دیش دشمنوں کے قصر لرز رہے ہیں۔

• کھادی کی مقبولیت بڑھ رہی ہے" ایک خبر ـــــ اس لئے کہ اسے پہن کر ہر ایک حکمران خاندان کا فرد جو معلوم ہوتا ہے۔

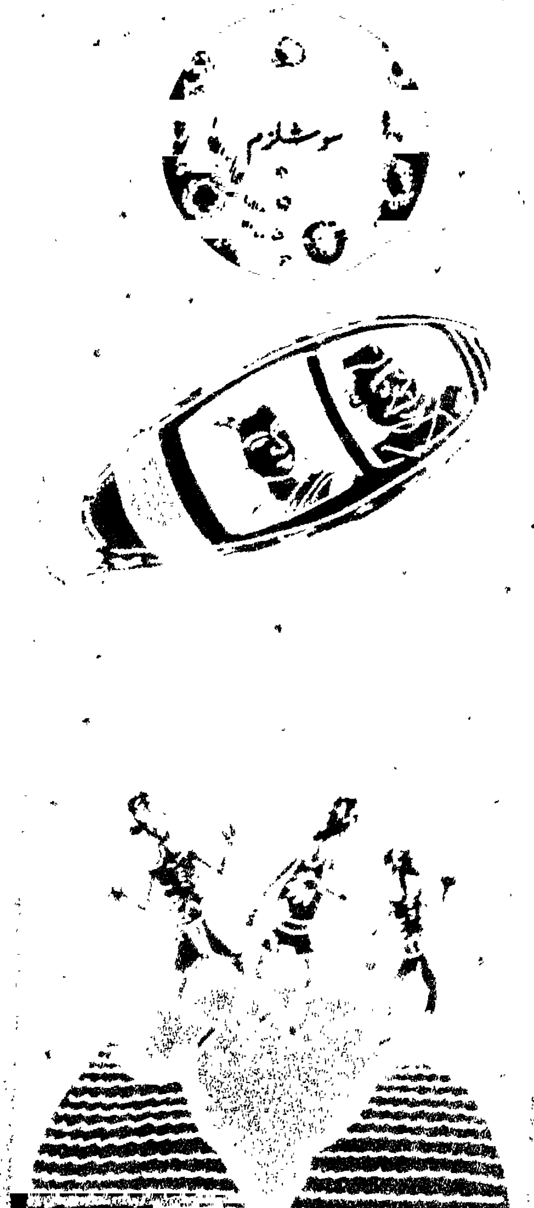
• رام نام کی لوٹ ہے" ایک اعلان ـــــ لوٹ لو جتنا لوٹا جائے۔

• کانگریس کے انتخابات جوتیوں میں دال بٹ رہی ہے" خبر ـــــ برتنوں کی کمی ہونے کی وجہ سے۔

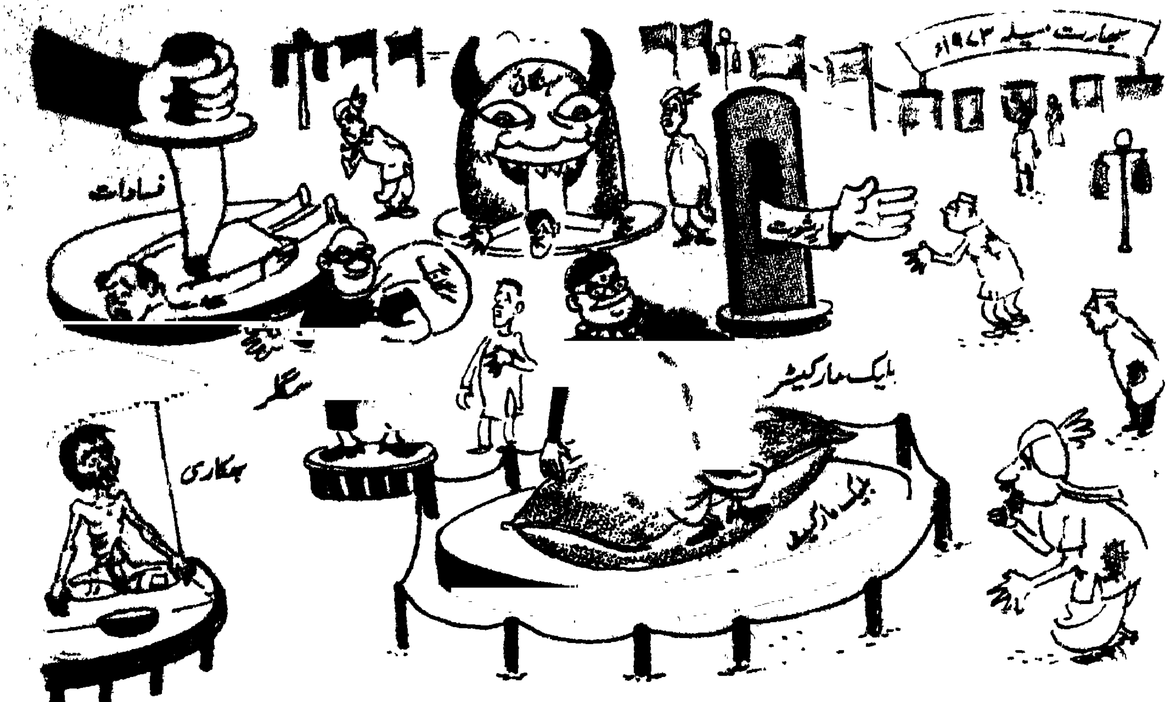
• یونیورسٹی ٹیچروں کا دھرنا" ایک خبر ـــــ ہندوستان میں تعلیم کا خالص سودیشی طریقہ۔

• شیخ مجیب کو امن انعام" ایک خبر ـــــ اور یحییٰ خاں کو جنگ بازی کے لئے ہٹلر ایوارڈ۔

• ہندو مسلمانوں میں امن رکھنے کے لئے سیاسی لیڈروں سے تعاون کی اپیل" ایک خبر ـــــ یہ ایسا عمل کریں گے کہ چھوٹے کہیں [illegible] ہوشیار رہنا۔



• ہندوستان بڑی تیزی سے سوشلزم کی طرف گامزن ہے [illegible]



"راجستھان نہر" ــــ جو راجاؤں مہاراجاؤں کے بہہ جانے کے بعد بن رہی ہے۔

"کھادی بھون سٹاف کی تنخواہ کا سکیل" ایک خبر ــــ سودیشی ہوگا۔

"بچوں کی دیکھ بھال بھی مشین کے ذریعہ" ایک خبر ــــ اور پیدائش بھی مشینوں کے ذریعہ کرانے کی کوشش۔

"بہار کے چیف منسٹر کا پتلا جلایا گیا" ایک خبر ــــ کوئی بات نہیں، وہ خود تو بچ گئے۔

"پانی پت میں کوئلہ کی بلیک" ایک خبر ــــ دلالی تو نہیں جس میں ہاتھ کالے ہوتے ہیں۔

"ریلوں کی بھیڑ کم کرنے کے لئے" ایک خبر ــــ جنتا کو انجن میں جوت کر ہانکنے کا فیصلہ۔

"کیا بچے اور اناج پیدا کرنے میں تعلق ہے؟" ایک عنوان ــــ ہاں! بالکل ہے۔ پیدا تو دونوں ہوتے ہیں۔ لیکن ایک کو پیدا کرنے کے لئے کہا جاتا ہے اور دوسرے کو نہ پیدا کرنے کو۔

"لوک سبھا کے ممبر کو جان کی دھمکی" ایک خبر ــــ غنیمت ہے گولی کی یا چھرے چاقو کی دھمکی نہیں دی ہے۔

"پنجاب میں آنریری سب رجسٹرار مقرر ہوں گے" ایک خبر ــــ دیکھئے آنریری وزیروں کا سلسلہ کب شروع ہوتا ہے؟

"جن سنگھ آندھرا کی تقسیم کے حق میں" ایک خبر ــــ اور تقسیم کے بعد الزام کانگریس کو دے گا۔

"[illegible] ہاتھ میں لے گی" —— پہلے [illegible]

"ایشیا [illegible] نے بیوپار کو بہت آگے بڑھایا ہے" ایک خبر —— یہاں تک کہ دکانداروں کو چھوٹ دے دی گئی تھی حتیٰ کہ چائے کی ایک پیالی ایک روپے میں بکی۔

"پولیس نے ایوب خان کے خاندان کے خلاف دولت جمع کرنے کے الزامات کی تفتیش شروع کر دی" ایک خبر —— جمع کرنے کے ضائع تو نہیں کی۔ مجرم تو یحییٰ خاں ہے جس نے پاکستان کی دولت برباد کی۔ تحقیقات تو اس کے خلاف ہونی چاہئے۔

"ایشیائی میلہ ختم ہو گیا" —— یعنی لوٹ کا بازار بند ہو گیا۔

"صرف ہندی ہی رابطہ کی زبان بن سکتی ہے" —— اس لئے کہ مری نگر سے ٹریوینڈرم تک بولی اور سمجھی جانے والی زبان کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے۔

"ٹیچر پارٹی بازی سے اوپر اٹھ کر طلباء کو اخلاقی لیڈر شپ مہیا کر سکتے ہیں" ایک عنوان —— بشرطیکہ وہ خود اخلاق سے آگاہ ہوں۔

"وقت برباد نہ کرو تحریک" ایک خبر —— اپوزیشن پارٹیوں میں چلائی جائے۔

"دلی کے گونگے بہروں کے تھیلے انعامات سے بھر گئے" ایک خبر —— اور زبان دراز اور لمبے لمبے بھاشن دینے والے سیاستدان منہ تکتے رہ گئے۔



بنگال اور پنجاب کی کانگریسی پارٹیوں کی طرف سے بنگال اور پنجاب کی حکومتوں پر اظہار اعتماد۔



"الہ آباد یونیورسٹی کا وائس چانسلر بننے کو کوئی تیار نہیں" وزیرِ تعلیم یو۔پی کا بیان۔

"اُردو والوں سے !" ایک عنوان ـــــ اچھے گلا بازوں کو جمع کر کے مشاعرے کرایا کرو۔ یہ بہت بڑا تعمیری کام ہے۔

"موجودہ منصوبوں سے صرف پچاس فیصدی ضرورت ہی پوری ہوگی" ایک عنوان ـــــ اس لئے پچاس فیصدی ہندوستانی آئندہ ۵ سالہ منصوبے تک دَم کھینچ لیں۔

"ترقی اُردو بورڈ کے زیرِ اہتمام وضعِ اصطلاحات پر سیمینار" ایک خبر ـــــ اُردو کو کہیں دوسرا درجہ بھی نہ ملے گا تو یہ اصطلاحات کس کے کام آئیں گی۔

"ہندی صوبے غیر ہندی زبان والے صوبوں پر ہندی ٹھونسنے کی کوشش نہ کریں" ایک عنوان ـــــ اس لئے کہ وہ اُردو والے نہیں جو لہو کے گھونٹ پی کر بیٹھ جائیں گے۔

"نکسن کے امن کے وعدے فراڈ" ایک عنوان ـــــ صرف وعدے نہیں، وہ خود مکمل فراڈ ہے۔

"پنجاب نئی راہوں پر" ایک عنوان ـــــ نئے مکھیہ منتری کا نئے اندازِ فکر کا نتیجہ۔

"یو۔پی میں کانگریس کے چناؤ میں بڑے بڑے مگر مچھ کامیاب" ـــــ اب چھوٹی مچھلیوں کی خیر نہیں۔

"یو۔پی کے وزیروں کے خلاف انکوائری" ایک خبر ـــــ کون کرائے، سیّاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا۔

"پھانسی کی سزا" ایک خبر ـــــ برقرار رکھنے پر جلّادوں کا اظہارِ تشکر ـــــ بے روزگاری کا خطرہ ٹل گیا۔

• "نقب زنوں کا گروہ پکڑا گیا" ایک خبر — گویا ان کو بھی نقب لگ گئی۔

• "بنگلہ دیش میں بھرشٹاچار کے خلاف جہاد۔ بڑے کارخانوں کے پانچ ایگزیکٹو گرفتار" ایک خبر — اور بھارت میں بھرشٹاچار سے چشم پوشی اور انتخابی فنڈ میں رقم دینے والوں کی حوصلہ افزائی۔

• "پریتم پورہ روڈ دلی پر ٹرک اُلٹ گیا" ایک خبر — پریتم کی نظروں کی تاب نہ لا کر۔

• "راشٹرپتی کی طرف سے ایشیائی میلے جیسے میلے لگنے کا مشورہ" ایک عنوان — تاکہ ایشیا میلے جیسی لوٹ کا بازار گرم رہے۔

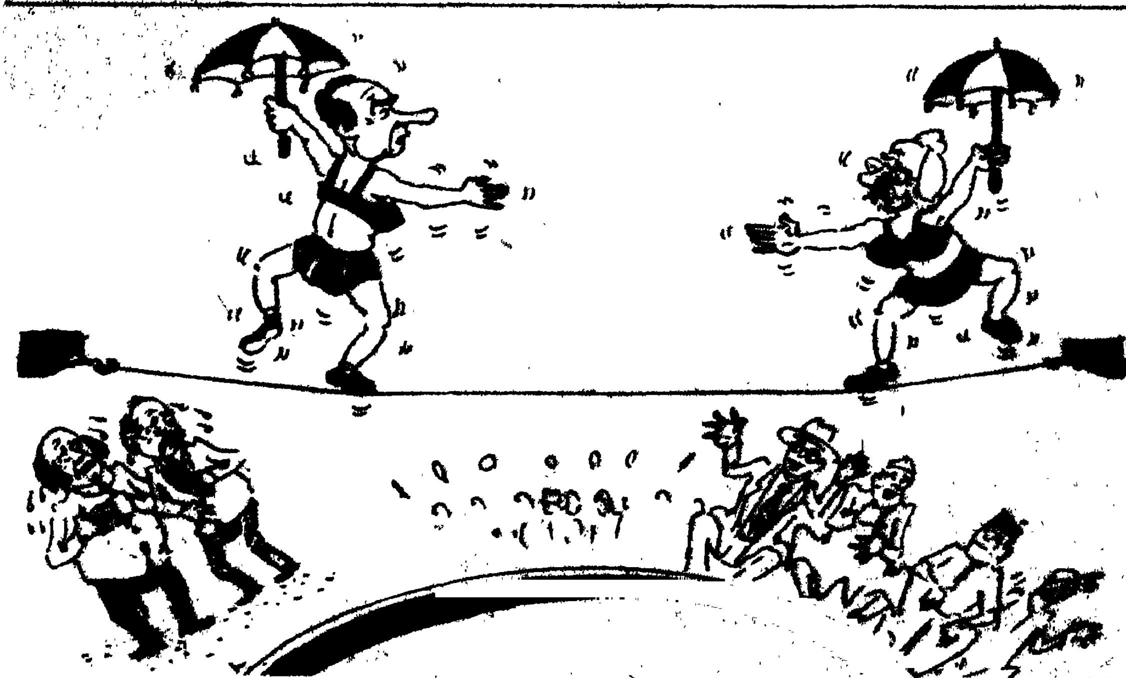
• "ایک ادبی نشست" ایک خبر — جس میں شریک نہ ہونا بے ادبی ہے۔

• "جو کانٹے بوئے تھے" ایک عنوان — وہ اب بھالے بن گئے ہیں۔

• "معمولی جھگڑے میں عورت کی جان گئی" ایک خبر — ایک معمولی واقعہ۔

• "مرادآباد میں چوریوں کی بھرمار" — [illegible] بن گئے ہوں گے۔

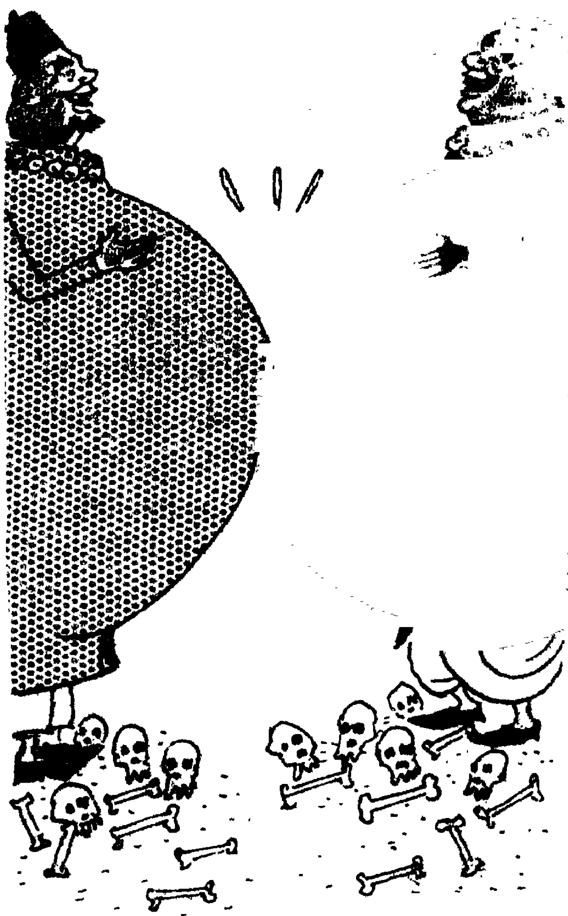
• "کھیل میں دیش کو خود کفیل بنانا ضروری ہے" ایک عنوان — اس لئے مقابلہ تو ہم [illegible]



"ہند اور امریکہ تعلقات معمول پر لانے کے خواہاں" ایک خبر

سرمایہ دار

خوشتر گرامی



سرمیں سودا سود کا۔ آنکھ میں سؤر کا بال۔ بے مروّتی سے مالامال۔ اپنے پرائے کی پہچان مفقود۔ سماج میں ناک کٹی ہوئی۔ اِس پر بھی عزّت پاتا ہے۔ زبان کا میٹھا، قول کا کچّا، لین دین کے الگ الگ اصول۔ دِل مہر و محبت سے پاک، خوفِ خدا سے خالی۔ یہ ہے سماج کا وہ گندہ پھوڑا جسے کہتے ہیں ——

سرمایہ دار

یہ لامذہب ہے۔ ہندو مسلم سِکھ عیسائی ہر مفلس، نادار کا خون چوسنا اِس کا ایمان ہے۔ کوڑی کوڑی جمع کرتا ہے۔ ٹکے ٹکے پر جان دیتا ہے۔ سود خوری، لوٹ کھسوٹ، ذخیرہ اندوزی، قلّت، گرانی، بلیک مارکیٹ سے روپیہ کماتا اور تجوریاں بھرتا ہے —— زمینی و آسمانی آفات اِس کے لئے ایک کے چار اور چار کے چونسٹھ بنانے کا موقع فراہم کرتی ہیں۔ جھگڑے فسادات میں بھی کماتا ہے۔ مزدوروں، غریبوں، مفلسوں، ناداروں کا خون پی کر، اُن کی حق تلفی کرکے اپنے زر و مال میں اضافہ کرتا ہے —— اِس کی پوجا پاٹھ، نماز روزہ دھوکا۔ اِس کا دان پُن دکھاوا۔ اِس کا میل جول مطلبی۔ سِکّوں کی جھنکار، نوٹوں کی بھرمار اِس کے قلب کو سیاہ بنا دیتی ہے۔ اِن سے آنکھوں میں چربی چھا جاتی ہے۔ کانوں میں سیسہ بھر جاتا ہے۔ آہوں، سسکیوں اور آنسوؤں کا اِس پر اثر نہیں ہوتا۔ اِس کے یہاں انسانوں کی قدر مچھر مکھی سے زیادہ نہیں۔ وہ پانچ انگلیوں سے دیتا اور دس انگلیوں سے وصول کرتا ہے —— سرمایہ کے بل بوتے پر سیاستدانوں کو نچاتا ہے۔ کسی کو سامنے سے دیتا ہے کسی کو پیچھے سے۔ یہ پرسا، پرسو، پرسرام کی منزلیں طے کرتا ہوا سوشلسٹ سماج میں بھی قدر و منزلت پاتا ہے۔ اکھوں کروڑوں سے بھری ہوئی تجوریوں پر ناگ بن کر بیٹھنے کے باوجود طلبِ زر کی دائمی بیماری میں مبتلا ہے۔

کبھی کبھی پکارتا ہے یہ دن رات ہائے زر

مشنیا

کرشن چندر ایم۔ اے

دی نیش بسینٹ فرانسس ایونیو۔ سانتاکروز ویسٹ۔ بمبئی نمبر ۵۴

عزیز برادرم خوشتر گرامی!

اُمید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ میں نے آپ کو بھیجا ہُوا افسانہ ہندی میں ابھی تک کسی کو نہیں دیا اور اب اِس خط کے ساتھ آپ کو ایک اور نیا افسانہ "مشنیا" اِرسال کر رہا ہوں۔ اُمید ہے پسند آئے گا —— آپ کی صحت اب کیسی ہے؟ —— اِدھر آنے کا کب تک اِرادہ ہے؟ میں شاید جنوری میں آسکوں۔

بہت بہت آداب کے ساتھ

مخلص —— کرشن چندر

★

مشنیا بہت حسین اور ذہین ہے۔ میں نے خود اُسے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ اُس کے جسم کے اعضاء صاف ستھرے اور لچکتے ہوئے فولاد سے بنے ہیں! چہرہ سٹین لیس سٹیل کا ہے، آنکھیں پلاسٹک کی اور سر کے بال تانبے کے مہین تاروں کے! وہ گھنٹوں آئینے کے سامنے بیٹھی اپنے بالوں میں کنگھی کرتی رہتی ہے اور دھیرے دھیرے گُنگُناتی رہتی ہے۔ اُسے میک اَپ کرنے اور سجنے سنورنے کا شوق بھی ہو چلا ہے اور کیوں نہ ہو، مشنیا اب سولہ سال کی ہو چلی ہے۔

عام طور پہ خوبصورت لڑکیاں ذہین نہیں ہوتیں۔ مشنیا میں اِس نقص کو میں نے دُور کر دیا ہے۔ میں نے اُسے عام عورتوں سے دُگنی ذہانت عطا کی ہے۔ اُس کے دماغی کمپیوٹر میں دُنیا کا اعلیٰ ترین ادب، فلسفہ، سیاست، سائنس اور سائیکلوجی ٹیپ کرکے ڈال دیئے ہیں۔ اب مُسلسل استعمال سے وہ خود سے سوچ سکتی ہے۔ گھنٹوں سارتر کے فلسفۂ وجودیت پر بحث کر سکتی ہے۔ اخباروں کے لئے مضامین لکھتی ہے۔ اُسے الکٹرانک فوٹوگرافی سے گہرا شغف ہے۔ اُس کے کمرے میں جایئے، ہر طرف دیواروں پر اُس کی اپنی کھینچی ہوئی تصویریں دیکھئے گا۔ جنھوں نے مختلف نمائشوں میں انعام حاصل کئے ہیں۔ بڑے بڑے پروفیسر اور عالم و فاضل میرے گھر آتے ہیں اور اُس سے بحث کرکے مرعوب ہو جاتے ہیں اور مجھے مشنیا کی تخلیق پر مُبارکباد پیش کرتے ہیں۔

کل میری سولہویں سالگرہ تھی۔ اِس خوشی میں پروفیسر فیضی نے ہمارے گھر پر بہت بڑی پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ میں نے بالوں میں پھول لگائے تھے اور ایک خوبصورت منی سکرٹ پہنا تھا اور ستار پہ "چَل کا ننھی ننھی بُوندیاں" گاکر سُنایا تھا۔ جس پر اِتنے زور کی تالیاں بجیں کہ سارا ڈرائنگ رُوم گُونج گیا اور سب لوگ پروفیسر فیضی کے گرد اِکٹھے ہو کر اُن کے ہاتھ ہلا ہلا کر اُنھیں مُبارکباد دینے لگے اور کہنے لگے "پروفیسر فیضی! تم نے اپنی نوعمری میں اِتنا بڑا سائنسی کمال کر دکھایا ہے، تو آگے چل کر تم جو کر دکھاؤ گے اُس سے سائنس کی دُنیا کو بہت بڑی توقعات ہیں!"

چند لمحوں کے لئے میں بالکل اکیلی پڑ گئی تھی اور سوچنے لگی تھی، یہ کیا بات ہے؟ سالگرہ میری ہے لیکن مُبارکباد پروفیسر فیضی کو دی جا رہی ہے! جیسے میں کچھ نہیں ہوں۔ بے شک فیضی نے مجھے بنایا ہے۔ ہر کسی کا کوئی نہ کوئی بنانے والا تو ہوتا ہی ہے۔ لیکن میری اپنی بھی تو کوئی

مُبارکباد دینے والوں کی بھیڑ میں اچانک فیضی کی نگاہیں مجھ سے ملیں۔ وہ فوراً بھیڑ چیرتے ہوئے میرے پاس آئے اور بولے "بھئی مُبارکباد تو اصل میں اِس حسینہ مِس مشنیا کو ملنی چاہئے" یہ کہہ کر اُنھوں نے بہت محبت سے میرے بالوں میں لگا سفید پھول ٹھیک کیا اور بہت سے نوجوان پروفیسر اور دماغیات کے طلباء میرے گرد جمع ہو کر مجھ سے گفتگو کرنے لگے۔

پھر چائے کا دَور چلنے لگا۔ میں سب کو چائے، مشروبات اور کھانے پینے کی چیزیں پیش کر رہی تھی۔ لیکن بار بار میری نگاہ فیضی پر جا کر ٹِک جاتی۔ جب سے مِس صفیہ کمال الدّین آئی تھیں برابر فیضی کے گرد منڈلا رہی تھیں اور اُنہی کو توجہ کا مرکز بنا رہی تھیں کبھی اُن کی پلیٹ میں سموسے رکھتیں، کبھی دہی بڑے، کبھی کباب، کبھی پنیر کی پھلکیاں۔ میں دُوسرے مہمانوں کی خاطر و مُدارات میں مصروف تھی۔ لیکن چور نگاہوں سے اُن دونوں کو دیکھ لیتی تھی۔ وہ برابر آدھے گھنٹے سے نہ جانے کیا اُن سے سرگوشی کر رہی تھیں اور فیضی تھے کہ بات بے بات اُن کی کسی بات پر ہنس دیتے۔ ایک بار تو میں نے دیکھا کہ بے تکلفی میں صفیہ کا ہاتھ فیضی کی کرسی کے پیچھے اُن کی گردن تک گیا۔ پھر چند لمحوں کے بعد ہی واپس آگیا۔ میرا دل زور سے دھڑکنے لگا اور میں اپنے آپ پر قابو نہ پا سکی میں نے چائے کی بھری کیتلی مِس صفیہ کمال الدّین پر انڈیل دی۔ اِدھر وہ چیخ مار کر اُٹھیں اُدھر میں روتی ہوئی اپنے کمرے کو بھاگ گئی . . .

ساری محفل درہم برہم ہو گئی۔ آج مشنیا کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا کوئی بھی جاہل سے جاہل کمپیوٹر بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا اور مشنیا تو ایسی پڑھی لکھی، مہذب اور متمدّن تھی کہ اُس سے ایسی ناشائستہ حرکت کی توقع بھی نہ کر سکتا تھا۔

صفیہ سے معافی مانگ کر فوراً اُسے ہسپتال بھجوا دیا اور دُوسرے لوگوں سے بھی جلدی جلدی معذرت طلب کر کے مشنیا کے کمرے میں گیا تو اُسے اپنے بستر پر مُنہ کے بل لیٹے دیکھ کر حیرت میں رہ گیا۔ مشنیا رو رہی تھی، روئے چلی جا رہی تھی۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے تھے۔ پھر یہ آنسو کدھر سے اُبل پڑے۔ میں نے سکریو ڈرائیور سے اُس کے دماغ کا اُوپر کا ڈھکن کھولا۔ دماغ ٹھیک کام کر رہا تھا۔ پھر اُس کے دل کا ویلو کھول کر دیکھا۔ اُس کا الکٹرانک دل بھی برابر برقی خون پمپ کر رہا تھا۔ گو ذرا تیزی سے۔ پھر جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو میں نے اُسے سیدھا کر کے اُس کی ناف کے اندر کے بٹن کو کھول کر اُس کی بیٹری کو دیکھنا چاہا۔ کہیں بیٹری میں کوئی نُقص تو نہیں ہے۔ مشنیا بیٹری سے چلتی ہے اور یہ بیٹری ہر دو سال کے بعد چارج کی جاتی ہے۔ اُن چند لمحوں کے لئے جب میں مشنیا کی ناف سے بیٹری نکال لیتا ہوں چارج کرنے کے لئے مشنیا کی عارضی موت ہو جاتی ہے چند منٹوں کے لئے!

لیکن آج کیا ہُوا۔ جونہی میں نے اُسے سیدھا کیا، وہ جھٹک کر اور کروٹ لے کر میرے بازو کی ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھ کر، ایک بے بس بچی کی طرح زار و قطار رونے لگی۔ میں دھیرے دھیرے اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔ یکایک سارا معاملہ میری سمجھ میں آگیا۔ میری مشنیا جوان ہو گئی ہے اور جب لڑکیاں جوان ہو جاتی ہیں تو بلا وجہ بھی اُن کی آنکھوں میں آنسو آنے لگتے ہیں۔ اب مشنیا کی شادی کر دینی چاہئے۔

پروفیسر فیضی کو آج کل نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ روز میرے لئے پیغام لے کر آتے ہیں۔ ایک دن ایک نئے پریشر کُکر کی تصویریں کر آئے، کہنے لگے "اِس سے تمہاری شادی کر دیں؟ یہ بالکل تازہ ترین پریشر کُکر ہے بغیر بیٹری، بجلی یا گیس کے چلتا ہے۔ سُورج کی شعاعوں سے کھانا پکاتا ہے اور دن بھر میں اِتنی شعاعیں جذب کر لیتا ہے کہ رات کو بھی اُسی ذخیرے سے کام کر سکتا ہے۔ شکل و صورت بھی کسی قدر اچھی ہے"

میں نے کہا ــــــ "بھاڑ میں جائے پریشر کُکر۔ مجھے باورچن نہیں بننا ہے!"

پھر ایک دن واشنگ مشین کی تصویریں آئے۔ جس میں کپڑے ڈالے جائیں تو دُھلے دُھلائے ہی نہیں، اِستری شُدہ کپڑے باہر نکل آتے ہیں۔ اِتنا باتدبیر اور سمجھدار ہے کہ ریشمی، سُوتی اور اُونی تینوں طرح کے کپڑے اُس سے دھوئے جا سکتے ہیں۔

میں نے پاؤں پٹک کر کہا "مجھے دھوبن نہیں بننا ہے!"

کچھ دنوں کے بعد ہسپتال میں کام کرنے والے کمپیوٹر ہاؤررام کی تصویر لے آئے ــــــ "یہ تمہارے لئے سب سے اچھا رہے گا۔ ہسپتال میں ڈاکٹر تک اِس سے مشورہ کرتے ہیں اور یہ چند سیکنڈ میں ہر مرض کی تشخیص کر کے اُس کے لئے دوا بھی تجویز کر دیتا ہے۔ ہاؤررام ڈاکٹروں کا ڈاکٹر ہے!

ہمارے ملک میں اِن کی بڑی عزت ہے۔ جب اُن سے تمہاری شادی ہو جائے گی تو سارے اخباروں میں چھپے گا۔ پھر تم دونوں کی تصویریں چھپیں گی ۔۔۔

میں نے کہا ۔۔۔ "مجھے نرس کا پیشہ پسند نہیں ہے۔ نہ میں کسی ڈاکٹر کی بیوی بننا پسند کرتی ہوں۔"

"تو پھر تم کس کی بیوی بننا پسند کرتی ہو؟"

میں نے گھبرا کر نگاہیں نیچی کر لیں اور خاموش رہ گئی۔

پروفیسر فیضی کچھ دیر چپ چاپ مجھے حیرت زدہ ہو کر دیکھتا رہا، پھر وہاں سے چلا گیا۔

اگلے دو ہفتوں میں اور بہت سے پیغام آئے۔ میرے حُسن اور ذہانت کا شہرہ سُن سُن کر دُور دُور سے پیغام آ رہے تھے۔ واشنگٹن سے برطوم نہرِ جات کا پیغام جو چاند اور زمین کے درمیان راکٹوں کی رہبری کرتا ہے۔ برطانیہ سے تانبے کے بنے ہوئے نقلی کُتّے کا جو بالکل اصلی کُتّوں کی طرح دُم ہلاتا ہے۔ فرانس سے لوئی فور دان ایٹ کا، جو ہر سیاسی موضوع پر تقریر کر سکتا ہے اور ہر قسم کی شراب چاٹ کر اُس کے بارے میں سب کچھ بتا سکتا ہے اور گوڈارڈ سے لے کر ترُوفو اور ترُوفو سے لے کر ستیہ جیت رے تک ہر نئے فلمی ڈائرکٹر کے محاسن اور معائب کا تجزیہ کر سکتا ہے۔ پھر کچھ معمولی قسم کے پیغام بھی آئے تھے، جن میں ایک گیزر، ایک بجلی کی آری، ایک فلکیاتی دُوربین اور ایک الکٹرانک ہتھوڑا بھی شامل ہیں۔

جب میں ہر بار انکار کرتی گئی تو بیچارہ فیضی بالکل پریشان ہو گیا۔ بہت پیار سے بولا۔

"مگر سُنو مشنیا! اب تم جوان ہو گئی ہو۔ سولہ برس کی دوشیزہ ہو۔ اب ہندوستانی رسم و رواج کے مطابق مجھے تمہاری شادی جلدی سے جلدی کر دینی چاہئے۔ اگر تمھیں میری پسند کا کوئی پسند نہیں ہے تو تم خود اپنی پسند بتا دو۔"

میں یہی سُننے کے لئے بیتاب تھی! میری آنکھیں فیضی کے چہرے پر جیسے جم کر رہ گئیں۔ میں کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن کچھ کہہ نہ سکی۔ میری نگاہیں اُس کے پیچھے گھومتے ہوئے بالوں سے اُتر کر اُس کے فراخ ماتھے پر جم گئیں۔ میری آنکھوں نے اُس کی آنکھوں میں جھانک کر اپنے سوال کا جواب پوچھنا چاہا۔ گھبرا کر نیچے لوٹ آئیں میری نگاہیں۔ وہ رخساروں پر دو شعلے سے دہک رہے تھے۔ وہ مضبوط ٹھوڑی اور گردن اور اُس کے نیچے فراخ سینہ!

میں ایک دم دوڑتی ہوئی اُس کے فراخ سینے سے جا لگی۔ میری دونوں فولادی بانہیں اُس کی گردن میں حمائل ہو گئیں اور میں نے زور سے اُسے بھینچ لیا۔

چند لمحوں کے لئے وہ ہکا بکا کھڑا رہا۔ پھر اُس نے اپنے آپ کو مجھ سے چھڑانے کی کوشش کی۔ بہت مشکل سے وہ میری فولادی بانہوں کی گرفت سے آزاد ہُوا۔ پھر میں نے دیکھا کہ ماتھے پر اور رخسار پر جہاں جہاں میں نے اُسے چُوما تھا، وہاں پر ایک زخم ہے اور اُس سے خون بہہ رہا ہے اور خون اُس کے شانوں سے بھی بہہ رہا تھا، جہاں میرے بازو اُس کی گردن میں حمائل ہوئے تھے۔

وہ ایک چیخ مار کر پلٹا ۔۔۔ اور اپنی لیبارٹری میں گھس گیا۔

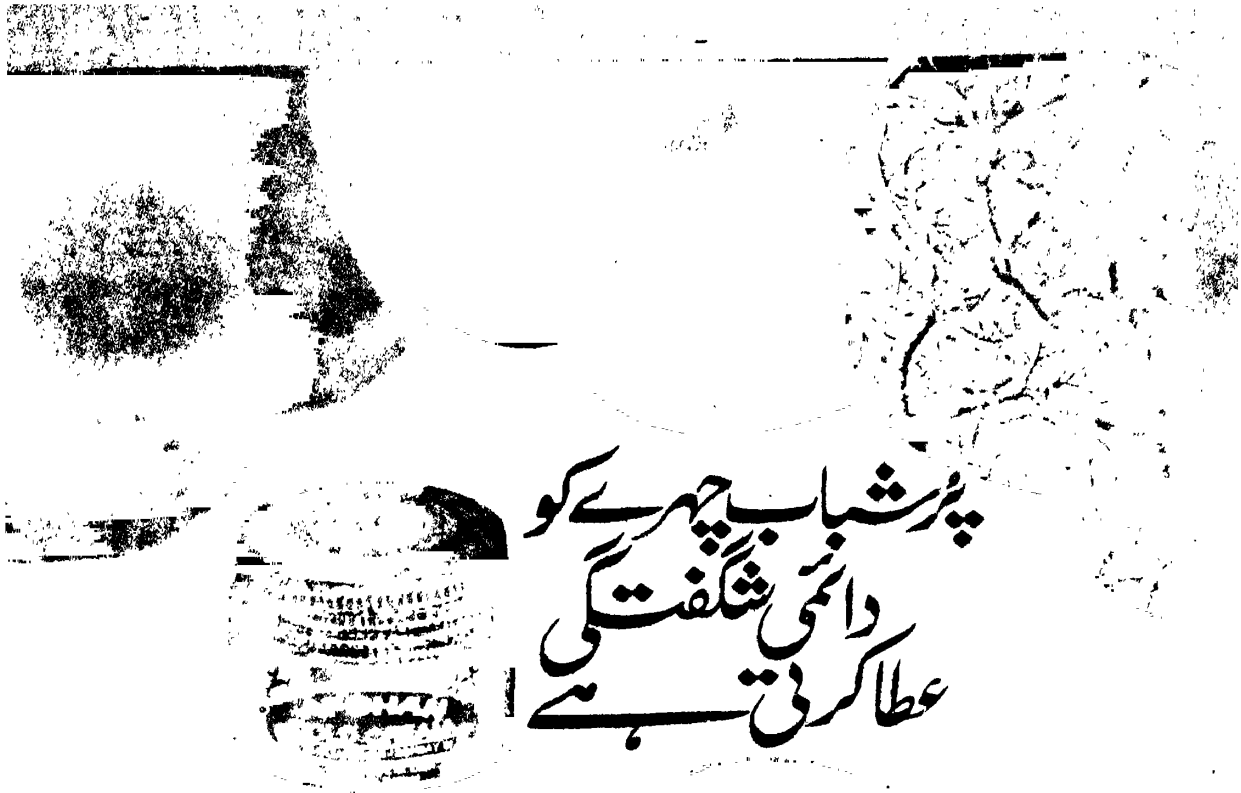
میں کھڑی کھڑی کانپتی رہی۔

اب وہ میری طرف چلا آ رہا ہے۔ ہاتھ میں پانا۔ ہتھوڑا اور اسکریوڈرائیور لئے ہوئے۔ اُس کے چہرے پر غصّہ ہے اور اُس کی تیز نگاہوں میں کسی خوفناک ارادے کی خشمگیں چمک رہی ہے!

شاید اب وہ مجھے کھول ڈالے گا۔ میرا پُرزہ پُرزہ الگ کر دے گا۔ میری ناف میں سے بیٹری نکال کر باہر پھینک دے گا۔ اِس طرح مشنیا کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے گا!

"فیضی۔۔ فیضی۔۔۔! کیا تم نہیں جانتے میں اِس دُنیا میں کسے چاہتی ہوں؟" ہائے! یہ انسان بھی کتنے عجیب جانور ہیں! انہیں جانتے محبت کیا ہوتی ہے!!

مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ مضمون حاشیہ چھوڑ کر روشن سیاہی سے خوشخط لکھا کریں اور دو سطروں کے درمیان فاصلہ چھوڑنا بہت ضروری ہے۔ بعض اچھے مضامین محض بدخطی کی وجہ سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں۔ ہمیشہ غیر مطبوعہ مضامین بھیجیں اور ایڈیٹر کی اطلاع کے لئے مضمون کے خاتمے پر غیر مطبوعہ لکھیں۔ بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں۔ یہ نہایت نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اپنے پاس مضمون کی نقل ضرور رکھیں کیونکہ ناقابلِ اشاعت مضامین ضائع کر دئے جاتے ہیں۔ ناقابلِ اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجنے کی بجائے اپنا پورا پتہ لکھا ہُوا پوسٹ آفس کا لفافہ ارسال کریں ورنہ ہم مضمون کی واپسی کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ منیجر

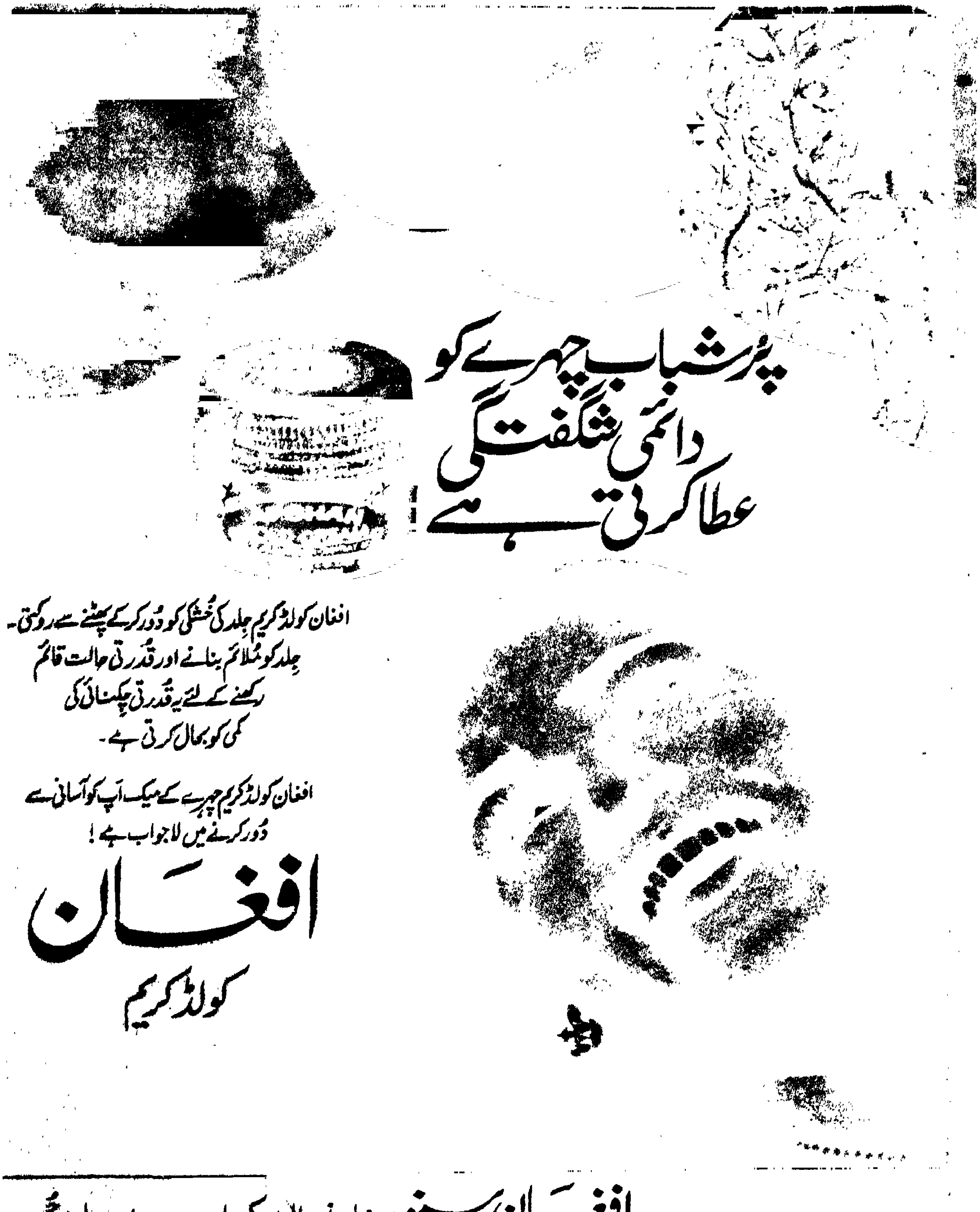

پُرشباب چہرے کو
دائمی شگفتگی
عطا کرتی ہے!

ہندوپاک کے فنکاروں اور شاعروں کے نام!

پروفیسر جمیل مظہری ایم۔ اے

سنو زلفِ لیلائے فن کے اسیرو
مرے ہمنواؤ مرے ہم صفیرو
سنو، راگنی ہے یہ بے ساز کیسی
سنو آرہی ہے یہ آواز کیسی
حدی خواں ہے پھر دشت و در کی خموشی
حدی خواں ہے شام و سحر کی خموشی
نوا سنج ہے گنگناتا سویرا
بکھرتا اجالا سمٹتا اندھیرا
دھندلکے میں اُن کے یہ کہتا ہے کوئی
ہے کیوں مجلسِ فکر و فن کھوئی کھوئی
رفیقو! اُتارو خمار اپنا اپنا
جگالو، جگالو ستار اپنا اپنا
وطن آج نفرت کا آتش کدہ ہے
محبت کا سوزِ یقیں بجھ رہا ہے
تحیّر ہے چپ چشمِ حیرت کھلی ہے
بصارت بصیرت سے یہ پوچھتی ہے
یہ فتنوں کی گرمیِ بازار کیوں ہے
یہ للکار کیوں ہے یہ جھنکار کیوں ہے
جنوں کا گریباں جنوں کھینچتا ہے
خرد سے خرد گرمِ پیکار کیوں ہے
ہر اک موج سے موجِ خوں کیوں بنی ہے
ہر اک شاخِ گل آج تلوار کیوں ہے
ہوس نے یہ دھند کیسی مچائی
خدایانِ فکر و نظر کی دہائی

صحافت عذابِ منظّم بنی ہے
سیاست سے دنیا جہنم بنی ہے
ثقافت ہی تنہا سہارا ہے اِس کا
یہی سیلِ خوں میں کنارا ہے اِس کا
یہی اِس جہنم کو جنّت کرے گی
یہی شرحِ خوابِ مشیت کرے گی
اُٹھو اے ثقافت کے خدمت گزارو!
اُٹھو اے محبت کے پروردگارو!
تمہارا قلم ترجمانِ مشیت
تمہاری زباں ہے زبانِ مشیت
قلم اپنا اپنا اُٹھالو رفیقو!
چراغ اپنا اپنا جلالو رفیقو!
کہاسوں نے ذہنوں کو گھیرا بہت ہے
اندھیرا بہت ہے اندھیرا بہت ہے
سیاہی نے پرچم کو لہرا دیا ہے
ستاروں کی آنکھوں کو دھندلا دیا ہے
سیاست نے گردِ کدورت اڑا کر
محبت کے چشموں کو گدلا دیا ہے
روایاتِ قومی کی تذلیل کر کے
ہمالہ کی گردن کو نہوڑا دیا ہے
ہمارے صحافی تمہارے صحافی
یہ جذباتِ سفلی کے مارے صحافی
قلم سے یہ بارود برسانے والے
طبیعت کے شعلوں کو لپکانے والے


پُرشباب چہرے کو
دائمی شگفتگی
عطا کرتی ہے!
افغان کولڈ کریم جِلد کی خُشکی کو دُور کر کے پھٹنے سے روکتی۔ جِلد کو مُلائم بنانے اور قُدرتی حالت قائم رکھنے کے لئے یہ قُدرتی چکنائی کی کمی کو بحال کرتی ہے۔
افغان کولڈ کریم چہرے کے میک اَپ کو آسانی سے دُور کرنے میں لاجواب ہے!
افغان
کولڈ کریم
افغان سنو بنانے والوں کی طرف سے معاونِ حُسن

ہندوپاک کے فنکاروں اور شاعروں کے نام!

پروفیسر جمیل مظہری ایم۔ اے

سنو زلفِ لیلائے فن کے اسیرو
مرے ہمنواؤ مرے ہم صفیرو
سنو، راگنی ہے یہ بے ساز کیسی
سنو آرہی ہے یہ آواز کیسی
حدی خواں ہے پھر دشت و در کی خموشی
حدی خواں ہے شام و سحر کی خموشی
نوا سنج ہے گنگناتا سویرا
بکھرتا اُجالا سمٹتا اندھیرا
دھندلکے ہیں اُن کے یہ کہتا ہے کوئی
ہے کیوں مجلسِ فکر و فن کھوئی کھوئی
رفیقو! اُتارو خمار اپنا اپنا
جگالو، جگالو ستار اپنا اپنا
وطن آج نفرت کا آتش کدہ ہے
محبت کا سوزِ یقیں بجھ رہا ہے
تحیّر ہے چپ چشمِ حیرت کھُلی ہے
بصارت بصیرت سے یہ پوچھتی ہے
یہ فتنوں کی گرمیِ بازار کیوں ہے
یہ للکار کیوں ہے یہ جھنکار کیوں ہے
جنوں کا گریباں جنوں کھینچتا ہے
خرد سے خرد گرمِ پیکار کیوں ہے
ہر اک موجِ مے، موجِ خوں کیوں بنی ہے
ہر اک شاخِ گل آج تلوار کیوں ہے
ہوس نے ہے یہ دُند کیسی مچائی
خدایانِ فکر و نظر کی دہائی

صحافت عذابِ منظّم بنی ہے
سیاست سے دنیا جہنّم بنی ہے
ثقافت ہی تنہا سہارا ہے اِس کا
یہی سیلِ خوں میں کنارا ہے اِس کا
یہی اِس جہنّم کو جنّت کرے گی
یہی شرحِ خوابِ مشیّت کرے گی
اُٹھو اے ثقافت کے خدمت گزارو!
اُٹھو اے محبت کے پرور دگارو!
تمہارا قلم ترجمانِ مشیّت
تمہاری زباں ہے زبانِ مشیّت
قلم اپنا اپنا اُٹھالو رفیقو!
چراغ اپنا اپنا جلالو رفیقو!
کہاسوں نے ذہنوں کو گھیرا بہت ہے
اندھیرا بہت ہے اندھیرا بہت ہے
سیاہی نے پرچم کو لہرا دیا ہے
ستاروں کی آنکھوں کو دھندلا دیا ہے
سیاست نے گردِ کدورت اڑا کر
محبت کے چشموں کو گدلا دیا ہے
روایاتِ قومی کی تذلیل کرکے
ہمالہ کی گردن کو نہوڑا دیا ہے
ہمارے صحافی تمہارے صحافی
یہ جذباتِ سفلی کے مارے صحافی
قلم سے یہ بارود برسانے والے
طبیعت کے شعلوں کو لہکانے والے

یہ تاجر یہ سوداگرانِ نفرت
بہشتِ وطن کے ستمگارانِ نفرت
سیاست کے فتنوں کو جو نکالنے والے
مزاجِ حکومت کو بہکانے والے
قلم سے بجاتے ہیں پھر طبلِ جنگی
لباسِ بیاں میں بھی نفرت ہے ننگی
دھواں اُن کے دل کا فضا میں نہ چھائے
قیامت سے پہلے قیامت نہ آئے
اُٹھو اے محبت کے درد آشناؤ!
گلستانِ معنی کے رنگیں نواؤ!
اُٹھو اب کہ ابلیسیت فتنہ زا ہے
خدا بھی تمہاری طرف دیکھتا ہے
نقیبانِ امن و رقیبانِ ظلمت
کرو تار تار اُٹھ کے دامانِ ظلمت
اٹھو اور ستار اپنا اپنا اُٹھاؤ
محبت کے نغموں کی گنگا بہاؤ
سیاست کے دوزخ کی یہ آنچ دیکھو
صحافت کے بھوتوں کا یہ ناچ دیکھو
بناتے ہیں یہ ایک کو پانچ یارو
یہ غصہ ہے غصہ ہے یا ناچ یارو
صحافت کے نقارچی ناچتے ہیں
سیاست کے نارد منی ناچتے ہیں
کنیزانِ دیر و حرم رقص میں ہیں
عزیزانِ دانشوری ناچتے ہیں
خرد کو بھی حیرت جنوں کو بھی حیرت
یہ بندر نہیں آدمی ناچتے ہیں

بدیشی مداری نچاتا ہے ان کو
جہاں میں تماشا بناتا ہے ان کو
ہے گردش میں زہراب کا جام دیکھو
یہ نفرت کی کھیتی کا انجام دیکھو
کہ اُڑتی ہیں چنگاریاں پھر ہوا میں
چھڑک دو محبت کے نغمے فضا میں
سنو یہ ثقافت کی آہیں عزیزو
یہ تہذیب کی ہیں کراہیں عزیزو
وہ فنکار من جنکا دھن میں بسا ہو
تجوری کے بچھو نے جن کو ڈسا ہو
یہ روئے سخن ان کی جانب نہیں ہے
مریضوں سے محبت مناسب نہیں ہے
کلام اُن سے ہے جو دلیلِ سحر ہیں
دھندلکوں میں بھی رہنمائے نظر ہیں
اُٹھو روشنی کو زباں دینے والو!
اندھیرے میں اُٹھ کر اذاں دینے والو!
اُٹھو اور ستار اپنا اپنا اُٹھا لو
اندھیرے کے سینے سے سورج نکالو
تمہیں مادرِ ایشیا کی دعائیں
وہ دیکھو اُمنڈتی ہیں کیسی گھٹائیں
تجلی تخیل کے پر تولتی ہے
گھٹن ذہن کی ہر گرہ کھولتی ہے
یہ میرا تاثر نہیں بولتا ہے
یہ فنکار کی آتما بولتی ہے
اُٹھو ہند اور پاک کے ہم صفیرو
کہ دنیا ہے عرش اور زمیں ڈولتی ہے

جمیل مظہری

بیسویں صدی دہلی فروری ۱۹۷۳ء

ایک رنگ اور

م۔ک مہتاب ایم۔اے

ڈبلیو۔زیڈ ۳۴۴ بشیونگر۔ نئی دہلی نمبر ۱۸

مکرمی و محترمی خوشتر صاحب! آداب

۔۔ ارشاد کی تعمیل میں کچھ تاخیر ہوئی ہے۔ اُمید ہے درگزر کریں گے ——— سالنامہ کے لئے ایک افسانہ "ایک رنگ اور" ارسالِ خدمت ہے۔ اُمید ہے قارئین پسند فرمائیں گے۔ سالنامہ کی کامیابی کے لئے دعاؤں کے ساتھ!

آپ کا عزیز ——— م۔ک۔ مہتاب

★

سردیوں کے دن، پہاڑ کی ناہموار کچی سڑکوں پر جیپ کا سفر کبھی کبھی موڑ کاٹتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیپ کے کل پُرزے ٹوٹ کر کھائی میں بکھر جائیں گے اور اِس کے ساتھ ہی جسم کے اعضاء بھی منتشر ہو جائیں گے۔ جب کبھی گیند کی طرح اُچھلتی ہوئی جیپ کسی محبوبہ کی طرح رُوٹھ کر ایکدم چلنے سے اِنکار کر دیتی ہے اور آپ اُس کے پُرزے دُرست کرتے کرتے پسینہ پسینہ ہو جاتے ہیں تو جی چاہتا ہے جیپ کو کسی کھائی میں دھکیل دیں اور خود کسی چٹان پر دھوپ سینکنے کے لئے لیٹ جائیں۔

میں شملہ کے قریبی دیہات میں سارا دن دَورہ کرنے کے بعد جب چنڈی گڑھ واپس پہنچا تو جسم جیسے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔ کان تپ رہے تھے۔ ہاتھ اور مُنہ جیپ کا انجن درست کرتے کرتے کالے ہو رہے تھے۔ جی چاہتا تھا دفتر کو لکھ دوں کہ مجھے اِس نوکری سے فارغ کیا جائے۔ پھر خیال آیا ملازمت تو مجبوری کا نام ہے۔ آدمی اپنے لئے کب ملازمت کرتا ہے۔ زندگی کے کتنے تقاضے اور اقتصادی مجبوریاں ہیں جو انسان کو نوکری کا طوق گلے میں ڈالنے کے لئے بے بس کر دیتی ہیں۔ ورنہ کس کا جی چاہتا ہے سردیوں میں صبح چار بجے گرم گرم لحاف کو چھوڑ کر جیپ میں آبیٹھے اور سرد ہواؤں کے تھپیڑے کھاتا ہوا دیہات کی خاک چھانتا رہے۔

لیکن جب موسم کی اِس درشتی اور راستے کی ناہمواری کے بعد گھر کا سا پُر تپاک ماحول اور آسائش میسّر آجائیں تو ذہن میں اپنی موجودہ حالت سے بغاوت کر دینے کے کیسے کیسے خطرناک خیال پیدا ہونے لگتے ہیں۔

میں ریسٹ ہاؤس کے سُنسان کمرے میں جاکر تنہا لیٹ رہنا نہیں چاہتا تھا۔ اِس لئے میں راجندر کے ہاں چلا آیا تھا۔ راجندر میرا بچپن کا دوست ہے۔ کالج کی تعلیم کے بعد ہمارے راستے الگ ہوگئے۔ وہ اب تک اچھا بزنس مین ہے۔ رنگ روغن کا کام کرتا ہے اپنی مرضی کا مالک ہے۔ جب کہ میں نے گاؤں گاؤں گھومتے رہنے کی یہ ملازمت اختیار کر لی ہے۔ راجندر کا یہاں خوبصورت سا مکان ہے۔ جسے اُس نے پیارے پیارے رنگوں سے سجا رکھا ہے۔ اُس کی جاپانی گڑیا کی سی بہت ہی ملنسار بیوی ہے۔ جو ہنستی ہے تو فضا مُسکرانے لگتی ہے۔ راجندر بہت خوش نصیب ہے کہ اِس جاپانی گڑیا نے پانچ برسوں میں تین خوبصورت کھلونے سجا رکھے ہیں۔ جب وہ تینوں آنگن میں کھیلتے اور چلتے پھرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جاپانی نے پلاسٹک کے تین کھلونے چابی بھر کر چھوڑ دئے ہوں جو فرش پر اپنے کرتب دکھا رہے ہوں۔ گھر میں آرائش سے آسائش تک کا ہر سامان موجود ہے۔ دروازے پر چڑھتی ہوئی عشق پیچاں کی بیل کے مُسکراتے

پھول اندرونِ خانہ کی مسکراہٹوں کے آئینہ دار ہیں۔ جب ایک ایسے گھر میں ایک مہربان دوست دونوں ہاتھ پھیلائے آپ کا خیر مقدم کر رہا ہو تو ریسٹ ہاؤس کے اجنبی ماحول میں کون جاکر ٹھہرے۔

میں نے جیپ سیدھی راجندر کے مکان کے سامنے ہی جاکر کھڑی کی۔ ہارن دیا۔ باہر کی بتی روشن ہوگئی۔ کسم نے تھوڑا سا کواڑ کھول کر جھانکا اور مسکرانے لگی۔ پھر جھٹ سے باہر نکل آئی اور بولی۔

"تو آپ ہیں؟ ہارن کیوں دئے جا رہے ہیں۔ دروازہ کھول کر اندر کیوں نہ آگئے؟ میں بچے کو دودھ پلاتی چھوڑ کر بھاگی آئی ہوں کہ نہ جانے کون ہارن بجائے جا رہا ہے!"

"بھابی! میں نے سوچا شریف آدمیوں کے گھر میں ہارن بجاکر ہی جانا چاہئے۔"

"تو کیا آپ شریف آدمی نہیں ہیں؟"

"تھا تو سہی۔ لیکن معلوم نہیں اب شریف دکھائی دے رہا ہوں یا نہیں؟"

کسم اپنی لمبی چوٹی کو سینے سے پشت کی جانب اچھال کر زور سے ہنسنے لگی۔ جیسے اس کے ہر عضو سے قہقہے پھوٹ رہے ہوں اور کہنے لگی۔

"ستیش! سچ اس وقت تو تم کچھ اور ہی دکھائی دے رہے ہو! یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ ہاتھ کالے، منہ کالا، کپڑے ستل متل، الجھے بال، سرخ آنکھیں۔ کیا کسی موٹر گیراج میں مکینک کی نوکری کر لی ہے؟"

"ہوں" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "بھابی! اس ملازمت کی آئے دن کی آوارہ گردی سے تو میں موٹر مکینک ہی اچھا دکھائی دیتا ہوں۔ بشرطیکہ تم مجھے پہلے ہی کی طرح ایک شریف آدمی سمجھتی رہو۔"

"چلو اندر چلو۔ زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ حلیہ کیا بنا رکھا ہے!"

"بھابی! کیا بتاؤں۔ تمھیں ایک دن ایسی نوکری کرنی پڑے تو عمر بھر کانوں کو ہاتھ لگاتی رہو! تم لوگوں کی کیا بات ہے۔ روپیہ تھیلیوں میں بھر بھر کر چلا آرہا ہے۔ نہ کہیں آنا نہ جانا!" میں نے اٹیچی کیس برآمدے میں پھینکتے ہوئے کہا۔

"تم غلط سمجھتے ہو ستیش! بیوپار بھی پھولوں کی سیج نہیں ہے۔ ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر روزی کہاں ملتی ہے۔ ان کے پاؤں میں کل سے سخت درد تھا۔ لیکن ایک سودے کے سلسلے میں دہرہ دون گئے ہوئے ہیں۔ نہ جاتے تو نقصان ہوتا۔"

"بہت تیرے کی! تو کیا راجندر آج بھی گھر پر نہیں ہے۔ میں تو آیا ہی اُسے ملنے کے لئے ہوں۔ لائیے میرا اٹیچی کیس میں پلٹتا ہوں!" میں نے اٹیچی کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تو اس کا مطلب ہے ہم آپ کے کچھ نہیں ہوتے؟"

"میں نے یہ کب کہا ہے۔ لیکن جو لطف راجندر کی موجودگی میں حاصل ہوسکتا ہے وہ اس کے بغیر کہاں؟"

"اچھا باتیں پھر بنائیے گا۔ یہ لیجئے تولیہ اور جاکر اپنا حلیہ درست کیجئے۔ میں نے گیزر میں پانی گرم کر دیا ہے۔"

کسم ایک بڑا سا تولیہ میری طرف پھینک کر اندر چلی گئی۔ میں نے غسل خانے کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ میں واقعی کوئی بھوت معلوم ہو رہا تھا! خدا کا شکر ہے کہ کسم نے مجھے پہچان لیا۔ ورنہ راجندر کی عدم موجودگی میں وہ بجا طور سے مجھے ٹھہرانے سے انکار کر سکتی تھی۔

"منہ ہاتھ دھو لیجئے نا! آپ میری طرف کیا دیکھے جا رہے ہیں؟ چہرے کی کالکھ صاف کیجئے ورنہ بچے ڈر جائیں گے!"

واقعی جاپانی کھلونے کا سا ایک بچہ کسم کے پیچھے کھڑا ایک طرف سے مجھے جھانک رہا تھا۔ مجھے بہت ہنسی آئی۔ میں سفید تولیے سے اپنا کالا منہ بہت زور زور سے رگڑنے لگا۔ دو اور بچے کمرے سے نکل آئے اور حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے۔

"بیٹو ڈرو نہیں یہ بھوت نہیں تمھارے انکل ستیش ہیں۔ تم ان کے پاس ٹھہرو۔ میں ان کے لئے چائے بناؤں۔ ستیش! انڈے آپ اُبلے ہوئے کھائیں گے یا آملیٹ بناؤں؟"

"مہمان کی کوئی مرضی نہیں ہوتی بھابی!"

"یہ فلمی مکالمے اپنے دوست کو سنائیے گا۔ مجھے یہ بتائیے کہ آپ انڈے کیسے کھائیں گے؟"

"جو کچھ بھی گھر میں ہے کھا لوں گا۔ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔"

"پھر باتیں کیوں بنا رہے ہو جاکر گرم پانی سے نہاتے کیوں نہیں؟" اور کسم اپنے چہرے پر لہراتی ہوئی زلفوں کو سنبھالتی ہوئی

مجھ میں جاگ گئی۔

گرم پانی کے غسل سے بہت کچھ افاقہ ہُوا۔ لیکن سر کے چکر نہ گئے۔ طبیعت متلا رہی تھی۔ سارے دن کے سفر اور جیپ کی خرابی نے جسم توڑ کر رکھ دیا تھا۔

کُسم نے چائے لگا دی تھی۔ انڈے، مکھن، پھل، میوہ، بسکٹ، کاجو۔ اُس نے کتنا کچھ کھانے کے لئے رکھ دیا تھا! کُسم اور بچّے بھی چائے کی میز کے گرد بیٹھے تھے۔ مجھے کچھ بھی اچھا نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ اس لئے میں کچھ کھانے کی بجائے کُسم کی جانب دیکھے چلا جا رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟ آپ کچھ لے نہیں رہے ہیں؟"

"بھابی! سر بہت بھاری ہے!"

"اوہو! آپ کو تو حرارت بھی ہے!" وہ میرے بازُو کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔ "میں بھی کہوں کہ آپ میری طرف پاگلوں کی طرح کیا دیکھے جا رہے ہیں۔"

"بھابی! میں احسان کے بوجھ تلے دبا آپ کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ آپ کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو وہ کبھی مجھے اپنے گھر میں گھسنے نہ دیتی!"

"اچھا! میں آپ کو دو گولیاں دیتی ہوں۔ گرم دودھ کے ساتھ نگل لیجئے اور لحاف اوڑھ کر سو جایئے۔ سردی اور تھکاوٹ کی وجہ سے آپ کو تکلیف ہو رہی ہے۔ دو گھنٹے آرام کے بعد آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔"

گرم دودھ اور دوا سے جسم کو کافی آرام محسوس ہُوا لیکن سر میں سخت درد اور بھاری پن تھا۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ کروٹیں بدلنے کی آواز کچن تک جا رہی تھی جہاں کُسم رات کا کھانا بنا رہی تھی۔ وہ کچھ دیر بعد اندر آئی اور کہنے لگی۔

"کیوں ستیش! کچھ آرام آیا یا نہیں؟"

"آرام تو بہت ہے۔ لیکن سر میں بہت درد ہے۔ میں نے ناحق آپ کو آکر تکلیف دی ہے۔"

"آپ لیٹے رہیئے۔ میں سر میں گرم تیل سے مالش کر دیتی ہوں، نیند آ جائے گی۔"

وہ جھٹ سے ایک بڑا تولیہ، تکیہ اور کٹوری میں گرم تیل لے آئی۔ ایک اچھی نرس کی طرح میرا سر اُوپر اُٹھایا اور اپنی گرم گرم اُنگلیوں سے



میرے سر میں مالش کرنے لگی۔ ایک عجیب احساس تھا جسے میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں نے کبھی جوان عورت کو کسی غیر مرد کے ساتھ ایسی تنہائی میں ایسا سلوک کرتے نہیں دیکھا تھا۔ کیا کُسم کو علم نہیں کہ انسان کے بیرونی خول اور اندرونی مادّے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ شاید کُسم کا ظاہر و باطن ایک ہی ہو اور وہ ہر کسی کو اپنے جیسا ہی سمجھتی ہو۔ کُسم کی اُنگلیوں کی حرکت سے نیند آنے کی بجائے میری نیند اور اُچاٹ ہوئی جاتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا بہت دیر پتھروں میں ٹکرانے کے بعد میرا چہرہ تازہ کونپلوں کے درمیان آکر رُک گیا ہو۔ کُسم نے ایک دو بار میری پیشانی اور میرے چہرے پر بھی ہاتھ پھیرا۔ جیسے کسی نے گھوڑے کی پیٹھ پر چابک مار دیا ہو۔ میرا جی چاہا اُس کا ہاتھ جھٹک کر کہوں ——

"کُسم! مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے نادانستہ کوئی گستاخی ہو جائے گی۔ میں بہت کمزور آدمی ہوں۔"

لیکن وہ کوئی فلمی گیت گنگناتی ہوئی میرے سر میں مالش کئے جا رہی تھی۔ جیسے وہ ایک بے جان مشین ہو جس کے من میں گناہ اور ثواب کا کوئی احساس نہ ہو اور جیسے بٹن دبا کر ایک کام پر لگا دیا گیا ہو۔ آخر اُنگلیوں کا جادُو اپنا اثر دکھانے لگا اور مجھے نیند آ گئی۔

کسم اُٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ مجھے اُس کے چلے جانے کے بعد بہت راحت ہوئی جیسے مجھے کسی نے جذبات کی سُولی سے اُتار لیا ہو! میرے ذہن میں خیالات کا ایک عجیب طوفان اُٹھ رہا تھا کہ اِس حسین گُڑیا کی کون سی جِس تشنہ کام ہے۔ اُس کے طرزِ عمل کا کوئی پنہاں مقصد بھی ہوسکتا ہے۔ وہ اپنے دامن کی ہوا دے کر کیوں میرے جذبات کے شعلوں کو بھڑکا رہی ہے۔ کیا اُسے مجھ سے ڈر نہیں لگتا؟ اُس نے راجندر کی عدم موجودگی میں مجھے اپنے ہاں ٹھہرانے سے انکار کیوں نہ کر دیا؟ پھر خیالات کی ایک اور لہر دَور چکر لیتی کہ جو کچھ تم سوچ رہے ہو یہ صرف تمہارے دل و دماغ کی خباثت ہے۔ کسم انسانیت و ہمدردی کی ایک مُورتی ہے۔ اُس کے من میں کوئی پاپ نہیں۔ اگر تم دودھ کی نہر کو آگ کی نہر سمجھ لو تو اِس میں دودھ کا کوئی قصور نہیں ہے۔

میں کمبل اوڑھے لیٹا ہُوا تھا۔ لیکن میرے کان کسم کی سُریلی آواز پر لگے تھے۔ وہ گنگنا رہی تھی۔ خوشی خوشی مہمان کی تواضع کے لئے کھانے تیار کر رہی تھی۔ وہ دبی دبی آواز میں بچوں کو ڈانٹ بھی رہی تھی۔ تاکہ اُن کے شور سے میرے آرام میں خلل نہ پڑے۔ پھر وہ لوری گا کر ننھے بچے کو سُلانے لگی۔ اُس کی آواز میں کیسا جادو تھا جسے سُن کر بچے کو تو کیا بڑوں کو بھی نیند آ جائے۔

"لیکن وہ اتنی جلدی بچوں کو کیوں سُلا رہی ہے؟ کیا میرے پاس بیٹھنے کے لئے تنہائی چاہتی ہے؟" میرے دل میں ایک اور خباثت نے سر اُبھارا۔

کسم بچوں کو سُلا کر ڈائننگ ٹیبل پر کھانا چُننے لگی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ چمچے سے چینی کی پلیٹوں پر جیسے جلترنگ بجا رہی تھی۔ کچھ دیر کے لئے پُوری خاموشی ہو گئی۔ شاید وہ منہ ہاتھ دھو کر کنگھی کرنے چلی گئی تھی۔ میں یہ نظارہ دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن عورت کے مُوڈ اور موسم کے بارے میں کوئی یقینی پیشن گوئی نہیں کی جاسکتی۔ کہیں وہ برہم نہ ہو جائے۔ اِس لئے میں کمبل اوڑھے لیٹا رہا۔ گھڑی نے نَو بجا دیئے۔ کسم گنگناتی ہوئی آئی اور بولی۔

"ستیش جی! کیسی طبیعت ہے آپ کی؟"

"قُدرت نے عورت کے ہاتھ کو شفا کی جو تاثیر بخشی ہے وہ کسی اور دوا کو عطا نہیں کی!"

"میں نے فلمی مکالمے ادا کرنے کو نہیں کہا۔ آپ کی طبیعت کے بارے میں پوچھا ہے۔"

وہ تازہ رنگے ہونٹوں سے مُسکرا رہی تھی۔ اُس کا شگفتہ گلاب کا سا چہرہ چمکتے ہوئے گیسوؤں کے ہالے میں غضب ڈھا رہا تھا۔ صاف ستھرے لباس میں سج دھج کر وہ بہت ہی حسین ہو گئی تھی۔

"اِس رات کی تنہائی میں ایک غیر مرد کے سامنے اِس سنگھار کا کیا مطلب ہے؟" میرے ذہن میں ایک سانپ پھن اُٹھا کر سوالیہ نشان کی طرح کھڑا ہو گیا!

"میں اب بالکل ٹھیک ہوں بھابی۔" میں نے کمبل ایک طرف رکھ کر انگڑائی لی۔

"منہ ہاتھ دھو لیجئے۔ کھانا تیار ہے۔ میں نے آپ کے اٹیچی میں سے آپ کا شب خوابی کا لباس نکال کر رکھ دیا ہے۔ آپ تو پتلون سمیت ہی سو گئے تھے۔" وہ ہنسنے لگی۔

"بھابی! جب خون کا درجۂ حرارت بڑھتا ہے تو پتلون اور ساڑی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا!"

"لیکن اب تو آپ کا بُخار اُتر گیا ہے!" وہ میری بالوں بھری کلائی پر اپنی سفید سفید اُنگلیاں رکھتی ہوئی بولی۔ لیکن اُسے کون کہتا کہ کسم! تن اور من کے درجۂ حرارت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ کبھی بار تن ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ لیکن من میں آگ لگی رہتی ہے!

میں منہ ہاتھ دھوتا رہا اور وہ تولیہ لئے کھڑی رہی۔ میں کنگھی کرتا رہا اور وہ میرے پیچھے کھڑی رہی۔ آئینے میں اُس کا عکس میرے عکس میں جذب ہوتا رہا اور میں سوچتا رہا یہ عورت کیسی ماہرِ نفسیات ہے؟ کس طرح قدم قدم مجھے گناہ کی وادی کی طرف بڑھا رہی ہے۔

لیکن کہیں میں غلط تو نہیں سوچ رہا ہوں؟ کہیں اُس کی یہ سب نوازشیں اپنے شوہر سے داد پانے کے لئے تو نہیں کہ اُس نے اُس کی عدم موجودگی میں اُس کے ایک جگری دوست کے ساتھ کتنا اچھا سلوک کیا۔ اُس کی کتنی خدمت کی۔ شاید وہ خود بھی [illegible] اُس کے من میں کوئی پاپ نہیں ہے۔ شاید اِسی لئے وہ [illegible] رہی ہے۔ ایک آدمی سانپ کو دیکھتے ہی [illegible] کی سوچتا ہے اِس لئے اُسے سانپ سے [illegible]

سانپ کو کھیلتا دیکھ کر اسے گردن سے پکڑ لیتا ہے۔

"بھائی! تمھیں معلوم تھا کہ میری طبیعت اچھی نہیں پھر تم نے یہ کیا کچھ پروس کر رکھ دیا ہے؟"

"اب تو تم اچھے ہو۔ صبح سے پہاڑوں میں گھومتے گھومتے تمھیں بھوک نہیں لگی کیا؟" وہ میری طرف دیکھ کر ہنس رہی تھی جیسے میری بہکی بہکی باتوں سے لطف اندوز ہو رہی ہو۔

"آپ کھانا کھا چکی ہیں؟"

"نہیں آپ کو کھلائے بغیر کیسے کھا سکتی تھی؟" وہ چوٹی کے پھندے کو کستے ہوئے بولی۔

"بھابی! مجھے کیوں پاگل بنانا چاہتی ہو۔ کیا میں یہاں آپ کو پریشان کرنے کے لئے آیا ہوں؟ پہلے آپ کھائیں گی تب میں کچھ لوں گا!" اور میں اٹھ کر اس کی پلیٹ میں چاول، انڈے، سلاد، مٹر پنیر اور دہی ڈالنے لگا۔

"یہ آپ باورچی کب سے بن گئے ہیں؟ آپ کو میری ضرورت کا علم نہیں۔ آپ اپنے لئے لیجیے۔" اس نے اپنی نرم نرم ہتھیلی سے میرا بازو تھام لیا۔

وہ میرے سامنے بیٹھی کھانا کھانے لگی۔ ہم کھانا کم کھا رہے تھے اور ایک دوسرے کو زیادہ دیکھ رہے تھے۔ وہ بار بار بے اختیار ہنسنے لگتی تھی۔ میں نے بھی آج پہلی بار اس کی دلکشی و رعنائی اور جان لیوا اداؤں کا بھرپور جائزہ لیا تھا۔ کیا ایک مہمان کے روبرو یوں بن سنور کر آ بیٹھنا بھی مہمان نوازی کی ایک ادا ہے؟ وہ مجھے الجھا ہوا دیکھ کر ہنسنے لگی۔

"کیا بات ہے بھائی؟"

"میں سوچ رہی تھی کہ کل راج آئیں تو ان سے کہوں گی کہ ملازمت ان شریمان جی کے بس کی بات نہیں۔ انھیں بھی کوئی دھندا کرا دیجیے۔"

کھانے کے بعد وہ گرم کافی لے آئی۔ میں اسے پہاڑی لوگوں کی زندگی کے بارے میں کہانیاں سناتا رہا۔ راجندر جس گاڑی سے واپس آ سکتا تھا اس کا وقت نکل گیا تھا۔

باہر تیز سرد ہوا چل رہی تھی۔ لیکن برآمدے کے سامنے شیشے کا پردہ لگا کر اسے بند کر دیا گیا تھا۔ وہ اب ایک اچھی خواب گاہ کا کام دے رہا تھا۔ میں نے وہیں سو رہنا مناسب سمجھا اور کسم نے بھی مجھے کسی اور جگہ سونے کو نہیں کہا۔ گھر میں سونے کا ایک بڑا کمرہ تھا جس میں بچے سو رہے تھے اور ایک ڈبل بیڈ پر راجندر اور کسم کے بستر لگے ہوئے تھے۔ دوسرے بیڈ روم میں رنگ روغن سٹور کئے ہوئے تھے جن کی تیز بو باہر برآمدے تک آ رہی تھی۔

کسم ہاتھ میں ایک باتصویر میگزین اٹھائے مسکراہٹوں کے جال پھیلاتی مجھے شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے بتی بجھا دی۔ کلاک گیارہ بجا رہا تھا۔ بستر بہت گدا ز اور کمبل بھی بے حد نرم تھے۔ آنکھیں خود بخود بند ہوئی جاتی تھیں۔ کسم کے کمرے میں ابھی بتی جل رہی تھی۔ شاید اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ شاید وہ میگزین دیکھ رہی تھی۔ شاید اسے کسی کا انتظار تھا۔ میں فضول فضول سی باتیں سوچ رہا تھا۔

یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟ میں نے سر کو جھٹک کر آنکھیں بند کر لیں۔ کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ لیکن نیند اچاٹ ہونے لگی۔ میں کروٹیں بدلتا تو پلنگ چرمراتا۔ کسم کے کمرے سے روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔ اس نے بتی بند کر دی۔ شاید اسے میری بے خوابی کا علم ہو گیا تھا اور میری نیند میں خلل کے اندیشے سے اس نے بتی بجھا دی تھی۔ وہ ضرور سو گئی ہو گی۔

لیکن اسے کیا پتہ کہ اس کے خاموش حسن، اس کی بولتی آنکھوں، اس کی ناگن سی زلفوں اور اس کے دہکتے ہونٹوں نے اس اندھیرے میں کتنے الاؤ روشن کر دئے ہیں جو مجھے سونے نہیں دے رہے ہیں۔ اس آگ کی لپٹیں مجھے کہہ رہی ہیں —— بے وقوف اٹھ! کوئی تیرا منتظر ہے۔ یہ موقع پھر نہ آئے گا! اٹھ دروازہ کھلا ہے! ورنہ یہ آگ تمھیں ساری رات جلاتی رہے گی! اور جب کبھی اس رات کی یاد آئے گی تیرا جسم جلنے لگے گا۔ دریا میں طغیانی روز نہیں آتی۔ ہو سکتا ہے صبح وہ تم پر نفرت بھری ہنسی ہنسے۔ بزدل کہیں کا!؟ یہ تہذیب کے بندھن، یہ فلسفے کے اصول اور عقیدے سب ان لوگوں کے ذہن کی پیداوار ہیں جن کے خون کی چنگاریاں راکھ ہو چکی ہیں۔ انگارے تو ایک انقلاب ہیں جن کے سامنے کوئی عقیدہ اور کوئی اصول نہیں ٹھہر سکتا۔

میں کبھی دائیں اور کبھی بائیں کروٹ بدل رہا تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر حسن اپنے گرد اپنی دلکشی کا حصار باندھ کر محو خواب تھا

اور دھوپ سے باہر ایک جانور بے قرار ہو کر ناچ رہا تھا۔ جب جسم میں آگ لگ رہی ہو تو بستر کتنا ہی آرام دہ ہو نیند نہیں آتی۔ میں اُٹھ کر سوچنے لگا۔

میں کیوں نہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دوں اور اس روشنی کو اپنے سینے کے اندھیرے میں روشن کر لوں۔ اس گڑیا میں اتنی ہمت نہیں کہ دم مار سکے یا راجندر کے سامنے کبھی لب وا کر سکے۔ میں کیا بیوقوفوں کی طرح باہر سردی میں بیٹھا حُسن کا پہرہ دے رہا ہوں جب حُسن و جوانی کا چھلکتا جام کسی تشنہ لب کا منتظر ہے!

میں پھر پلنگ پر لیٹ کر کروٹیں بدلنے لگا۔ میں ایک صلیب کے درمیان لٹکا ہوا تھا۔ نہ اُترتا تھا نہ پھانسی پا رہا تھا۔ اتنے میں دروازے کی چٹخنی کھلی۔ میں ایک چور کی طرح کمبل میں دُبک گیا۔ ہو سکتا ہے کسم باتھ رُوم میں جانے کے لئے باہر نکلی ہو۔ کیسا سُنہرا موقع ہے باز کے لئے چڑیا پر جھپٹ پڑنے کا!

"ستیش جی! نیند نہیں آ رہی کیا؟" شاید اُس نے پلنگ کی آواز سے اندازہ لگا لیا تھا۔

"ہاں بھابی!"

"میں نے کہا تھا نا سردی بہت ہے۔ آپ تو ٹھٹھر رہے ہیں۔"

"اُدھر بیڈ رُوم میں وارنش کی بہت بدبو ہے۔"

"اُدھر نہیں اِدھر۔ میرے پاس راجندر کا بستر خالی ہے۔" اُس کے لہجے میں بے پناہ ہمدردی تھی۔

مجھے ایسا محسوس ہُوا جیسے اُس نے آواز کا تیز خنجر میرے سینے میں اُتار دیا ہو۔ میں نے لپک کر کسم کو کمرے میں دھکیل دیا اور زور سے دروازہ بند کرتے ہوئے چیخا۔

"نہیں! خُدا کے لئے نہیں بھابی! تم سو جاؤ بھابی!"

میں کمبل اوڑھے برآمدے میں گھوم رہا تھا۔ میرے اندر ناچتا ہُوا جانور لہولہان ہو کر تڑپ رہا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کمبل اُتار پھینکوں اور لان میں اُس وقت تک ننگا ناچتا رہوں جب تک میرے اندر موجود جانور کا سارا فاسد خون نہ بہہ جائے اور سارا لال خون کے دھبّوں سے نہ اَٹ جا سکے! تاکہ جب کل راجندر آئے تو اُسے معلوم ہو کر ایک ننگ یہ بھی ہے جس کا بیوپار اُس نے کبھی نہیں کیا!!

غزل

پروفیسر کرامت علی کرامت ایم۔ایس سی

ستاروں کی ٹمٹماتی ہے	پھر تری یاد دل میں آتی ہے
ماضی ہے کتنی دل آویز	جیسے چلمن سے جھلملاتی ہے
ل میں ہوتا ہے جب تو محوِ خرام	موجِ غم آکے لوٹ جاتی ہے
تنی رنگیں ہے گردشِ ایام	مرے دل کو ہمیشہ بھاتی ہے
ری تقدیر پہ ہنسو تم سب	چاندنی اب بھی مسکراتی ہے
کو رہتا ہے انتظار ترا	جب کبھی بھی بہار آتی ہے
کے رخ پر، ملاحتوں کی صبا	اک تبسم بکھیر جاتی ہے
ور رس کتنی ہے نگاہِ بشر	آسمانوں کو چیر جاتی ہے
رے اندر چھپی ہوئی اک شے	مجھ کو خوابوں میں بھی ڈراتی ہے
ل کے گوشے میں زیست کی امید	گاہے آتی ہے گاہے جاتی ہے
م گل میں کسک کرن کی	اک نیا زہر گھول جاتی ہے
ں مرن گری کی چشم کی شب ہے	شمع انفاس جھلملاتی ہے

میں کرامت ہوں کشتۂ امروز
یادِ ماضی بھی کچھ ستاتی ہے

رُباعیات

مہدی پرتاب گڑھی

یادوں کی گھٹا چھائی ہے، اب تو آجاؤ
پیغامِ جنوں لائی ہے، اب تو آجاؤ
کاٹے نہیں کٹتے ہیں جدائی کے یہ دن
ہاں جان پہ بن آئی ہے، اب تو آجاؤ

گذرے ہوئے لمحوں کو صدا دیتا ہوں
طوفاں سا اک دل میں اٹھا دیتا ہوں
تنہائی کی تاریکی مٹانے کے لئے
میں یادوں کی اک شمع جلا دیتا ہوں

تم پاس نہیں، چاند ستارے ہیں اداس
یہ جھیل، یہ پُرکیف نظارے ہیں اداس
یہ ساز، یہ نغمات، یہ غنچے یہ پھول
اک میں ہی نہیں، سارے کے سارے ہیں اداس

یہ رات، یہ چاند، یہ ستارے خاموش
سرشار ہے ماحول، فضائیں مدہوش
چھلکی ہے کچھ اس طرح اُن آنکھوں سے شراب
ساغر ہی الٹ بیٹھے ہیں گلگشت فروش

مہدی نہیں دل کے چاک سینا آساں
کیونکر ہو شراب کا پینا آساں
ناواقفِ تہذیبِ محبت کے لئے
مرنا ہی کچھ آساں ہے نہ جینا آساں

کیچڑ میں کنول

راشد سہوانی ایم۔ اے

۱۳۵۴۔ پہاڑی املی، دہلی نمبر ۶

محترمی خوشتر صاحب! تسلیم

کئی سال بعد ایک کہانی "کیچڑ میں کنول" آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ اُمید ہے پسند آئے گی ——— براہ کرم اپنی گرانقدر رائے سے آگاہ کر کے ممنون فرمائیں . . .

نیاز مند ——— راشد سہوانی

★

ہماری پہلی ملاقات بس میں ہوئی تھی۔ میں اپنے دفتر جا رہا تھا۔ وہ گرین پارک جا رہی تھی۔ اُس کے پاس دس رُوپے کا نوٹ تھا۔ کنڈکٹر کے پاس ریزگاری نہیں تھی۔ دونوں میں بحث ہونے لگی میں نے مداخلت کی۔ کنڈکٹر کو ٹکٹ کے پیسے دے دیئے۔ لڑکی نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد یہ چھوٹی سی مدد قبول کر لی۔ تھوڑی دیر بعد میں اپنے دفتر کے بس اسٹاپ پر اُتر پڑا۔ میرے اُترتے وقت اُس نے پُوچھا۔

"میں آپ کے پیسے کس طرح واپس کروں گی؟"

میں کوئی جواب دیئے بغیر بس سے اُتر گیا۔

دُوسری ملاقات کناٹ پلیس کے ایک اوسط درجے کے کیفے میں ہوئی۔ میں بیٹھا ہی تھا کہ وہ آگئی۔ مُسکراتی ہوئی سامنے کی کُرسی پر بیٹھ گئی اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

"شاید آپ نے مجھے نہیں پہچانا؟"

"پہچان لیا!" میں نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن صرف صورت سے!"

"مجھے کملا کہتے ہیں" اُس نے مُسکرا کر کہا۔

"اور میں راکیش ہوں" میں نے تعارف مکمل کر دیا۔

وہ کہنے لگی۔

"نہ تو آپ نے اپنا ایڈریس بتایا اور نہ کہیں دکھائی دیئے۔ اس لئے آپ کے پیسے ———"

"ارے چھوڑیئے بھی" میں نے اُس کی بات کاٹ دی۔ "آپ بھی کیا بات لے بیٹھیں۔ یہ بتایئے آپ کیا پئیں گی؟"

"میں تو کافی پینے کے ارادے سے آئی تھی" اُس نے کہا اور فوراً ہی کافی اور کچھ دُوسری چیزوں کا آرڈر دے دیا۔ پھر مجھ سے پُوچھنے لگی۔

"مسٹر راکیش! آپ کیا کرتے ہیں؟"

میں نے اُسے اپنے کام کی نوعیت سے آگاہ کیا۔ اپنے آفس کا پتہ بتایا۔

"آپ کی کوالیفکیشن؟" اُس نے پُوچھا۔

جب میں نے اُسے اپنی کوالیفکیشن بتائی تو وہ بُری طرح اُچھل پڑی۔

"آپ اِتنے قابل آدمی ہیں اور اِتنی گھٹیا پوسٹ پر کام کر رہے ہیں؟" اُس نے کہا۔

"اچھی کوالیفکیشن اور اچھی پوسٹ کے درمیان کوئی رشتہ داری نہیں" میں نے جواب دیا۔

بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے بھی اُس سے بہت کچھ پُوچھا۔

وہ گریجویٹ تھی۔ ایک سرکاری دفتر میں ٹائپسٹ تھی۔ قرولباغ کے علاقے میں رہتی تھی۔ ماں باپ مر چکے تھے۔ صرف ایک بھائی تھا جو اُس سے تین سال بڑا تھا۔

کافی کا بل اُس نے ادا کیا۔ میں نے بہت روکا لیکن اُس نے ایک نہ سُنی۔ اُس نے ٹپ سمیت پانچ روپے اور کچھ پیسے خرچ کئے تھے۔ اور میں شرم کے بوجھ سے دبا جا رہا تھا۔

میں نے باہر نکل کر اُس کا پتہ پوچھا۔ وہ کچھ پریشان ہو گئی۔ پھر کہنے لگی۔

"گھر پر مُلاقات بہت مشکل ہے۔ آپ مجھے اپنا ٹیلیفون نمبر دے دیجئے اور میرے دفتر کا ٹیلیفون نمبر نوٹ کر لیجئے۔ اس طرح آسانی رہے گی۔"

پھر اگلے ہفتے تیسری مُلاقات ہوئی۔ ٹیلیفون کے ذریعے ٹائم مقرر ہوا تھا۔ اسی طرح چوتھی مُلاقات ہوئی۔ ہر مُلاقات میں بے تکلفی بڑھتی گئی۔ چوتھی مُلاقات میں یوں محسوس ہونے لگا جیسے ہم دونوں ایک دُوسرے کو برسہا برس سے جانتے ہوں۔

وہ ہماری پانچویں مُلاقات تھی۔

میں نے اپنا دل کھول کر اُس کے سامنے رکھ دیا۔

"میں تمھیں جیون ساتھی بنانا چاہتا ہوں!" میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

وہ مُسکرا کر بولی۔

"تم بہت جلد باز ہو۔ ابھی تو ہماری پانچویں مُلاقات ہوئی ہے۔"

"میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"ہاں اگر تم چاہو تو جواب دینے میں تھوڑی دیر لگا سکتی ہو۔ اس وقت تو میں یہ بات جاننا چاہتا ہوں کہ تمھیں میری بات ناگوار تو نہیں گزری؟"

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"بیوقوف ہو تم ——— بہت بیوقوف!"

میں اُس کی بات نہ سمجھ سکا۔ اُس کی ہنسی مجھے چبھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ ہنسی پر قابو پا کر بولی۔

"تم بہت بھولے ہو۔ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے۔ اگر مجھے تمھاری بات ناگوار گزرتی تو کیا میں اِسی انداز سے بات کرتی؟"

میں جھینپ گیا۔ اُس نے بہت محبت سے میرا ہاتھ تھام لیا اور کہنے لگی۔

"یہ تمھارا قصور نہیں۔ لڑکیوں کے سامنے لڑکے عام طور پر بوکھلا جاتے ہیں اور خاص طور سے ایسے موقعوں پر ———"

وہ شام بہت پیاری تھی۔ میں کملا کو اپنے کمرے پر لے گیا۔ میرا کمرہ بالائی منزل پر تھا۔ میں وہاں تنہا رہتا تھا۔ اُسے میرا کمرہ پسند آیا۔ لیکن سامان کی بے ترتیبی دیکھ کر وہ ہنس پڑی۔ جب میں کچھ چیزیں خریدنے کے لئے نیچے گیا تو اُس نے ہر چیز قرینے سے رکھ دی۔ میں یہ سلیقہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ مُسکرا کر بولی۔

"عورت کا ہاتھ کیا کچھ نہیں کر سکتا!"

میں نے کہا۔

"اس کمرے کو دیکھ کر یہ محسوس ہو رہا ہے کہ مجھے عورت کے ہاتھ کی بے حد ضرورت ہے!"

"اخبار میں ضرورت کا اشتہار نکلوا دو!" اُس نے کہا۔

اور میں نے جواب دیا۔

"اشتہار پر پیسہ کون خرچ کرے۔ اگر کسی بس میں کوئی خوبصورت سی پیاری پیاری لڑکی مل گئی تو اُسی کا ہاتھ پکڑ کر گھر لے آئیں گے۔"

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

دُوسرے ہی دن اُس سے چھٹی مُلاقات ہوئی۔ پھر ہم روزانہ ہی ملنے لگے۔ کبھی کبھی کسی خاص وجہ سے ایک دن کا وقفہ ہو جاتا تھا۔ میں دفتر کا ٹائم پُورا ہونے کا بے چینی سے انتظار کرتا رہتا تھا۔ پانچ بجتے ہی سرپٹ بھاگتا تھا۔ کملا کے دفتر کی طرف جس کے صدر دروازے کے سامنے والے پارک میں وہ اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ میری منتظر ہوتی تھی۔

اُس دن پانچ بجنے میں صرف دو منٹ باقی تھے کہ ڈائریکٹر صاحب نے مجھے بلا بھیجا۔ مجھے سخت غصہ آیا۔ لیکن بے بس تھا۔ جانا پڑا۔

خلافِ معمول ڈائرکٹر صاحب نے مُسکرا کر میرا سُواگت کیا اور خلافِ توقع اُنھوں نے سامنے والی کُرسی پر بیٹھنے کا اِشارہ کیا۔ پھر کہنے لگے۔

"مسٹر راکیش! مجھے تمھارے مُستقبل کے بارے میں بہت فِکر تھی۔ لیکن کچھ کرنے کا موقع ہی نہ مِلتا تھا۔ اب میں نے بہت مشکل سے ایک راستہ نکالا ہے۔ ہماری ڈائریکٹریٹ کو تین سینئر ریسرچ آفیسرز کی ضرورت ہے۔ بہت جلد اخباروں میں اِشتہار نکلنے والا ہے۔ اِشتہار نکلتے ہی تم درخواست دے دینا۔ اِنٹرویو کی فِکر مت کرنا۔ اِنٹرویو بورڈ کے سارے آدمی میری مٹھی میں ہیں۔"

میرا ذہن اُس وقت انتہائی بلندیوں پر اُڑ رہا تھا۔ مجھے وہ پوسٹ مِلنے والی تھی جس کے لئے میں پانچ سال سے سر مار رہا تھا۔ اِس عرصے میں چھ سینئر اور پانچ جونیئر آفیسرز بھرتی کئے گئے تھے لیکن میری درخواستوں کا کوئی جواب نہ مِلا تھا۔ ریکروٹنگ ڈیپارٹمنٹ والوں نے بتایا کہ میرے کلرک ہونے کی وجہ سے اُن کے اعلیٰ افسران مجھے درخواست دینے کا حق دار بھی نہ سمجھتے تھے۔ اِس لئے مجھے جواب دینے کا مستحق بھی نہیں گردانا گیا۔ میں نے اُن لوگوں سے بحث کی۔

"اگر میں سرکاری مُلازم نہ ہوتا اور اِس پوسٹ کے لئے درخواست دیتا تو کیا مجھے اِنٹرویو میں نہ بُلایا جاتا؟"

اِس بات کا بے حد حوصلہ شکن جواب مِلا۔

"بھائی صاحب! ایسی کچھ رسم سی بن گئی ہے کہ چھوٹی پوسٹ پر کام کرنے والوں کو بہت بڑی پوسٹ نہیں دی جاتی، چاہے اُن کے پاس ضروری قابلیت کے ساتھ ساتھ کام کا تجربہ بھی ہو۔ ہاں اگر آپ سرکاری مُلازم نہ ہوتے یا مُلازمت کا ذِکر کئے بغیر درخواست دیتے تو آپ کو اِنٹرویو کے لئے بُلایا جا سکتا تھا، یا کم از کم آپ کو جواب ضرور بھیج دیا جاتا۔"

بعد میں پتہ چلا کہ یہ ذہنیت عام تھی۔ ایک اور اہم ادارے میں ایک اچھی پوسٹ نکلی۔ میں تفصیلات معلوم کرنے کے لئے وہاں گیا۔ انکوائری کلرک حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"آپ صرف کلرک ہیں اور اِتنی بڑی پوسٹ کا خواب دیکھ رہے ہیں!" اُس نے کہا۔

میں نے فخر کے ساتھ جواب دیا۔

"اِس پوسٹ کے لئے جتنی قابلیت کی ضرورت ہے میرے پاس اُس سے کہیں زیادہ قابلیت ہے!"

وہ مُسکرایا۔

"بھائی صاحب! وہ تو ٹھیک ہے، گورنمنٹ کی طرف سے بھی کوئی پابندی نہیں ہے۔ لیکن فیصلہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے وہ لوگ جب یہ دیکھیں گے کہ آپ صرف اَپر ڈویژن کلرک ہیں تو آپ کی ایپلی کیشن اُٹھا کر ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیں گے۔ ویسے میں آپ کو منع نہیں کرتا۔ آپ اپنی تسلّی کے لئے درخواست دے دیجئے۔"

میں نے درخواست دے دی اور جب چھ ماہ بعد مجھے پتہ چلا کہ اُس جگہ پر کسی تازہ گریجویٹ کا تقرّر ہو گیا تو واقعی میری تسلّی ہو گئی۔ میری درخواست کی تو کوئی رسید بھی نہ بھیجی گئی تھی۔

پھر ایک بار میں نے ایک اچھی پوسٹ کے لئے براہِ راست درخواست بھیج دی۔ اُس میں اپنی مُلازمت کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ صرف ایک مہینے بعد اِنٹرویو کے لئے بُلاوا آ گیا۔ لیکن نہ جانے کس طرح میرے دفتر والوں کو پتہ چل گیا۔ مجھ سے اُس "ناجائز اقدام" کی وضاحت طلب کی گئی۔ سخت کارروائی کی دھمکی دی گئی۔ میں نے تحریری طور پر معافی مانگی۔ لیکن مجھے اِنٹرویو میں شرکت کی اجازت نہ دی گئی۔

آج ڈائرکٹر صاحب کی اِس عظیم پیش کش پر میرا بوکھلا جانا قدرتی امر تھا۔ میری زبان بند ہو گئی۔ بہ مشکل تمام اِتنا کہہ سکا۔

"میں کس زبان سے آپ کا شُکریہ ادا کروں۔ آج آپ نے مجھے نئی زندگی بخش دی ہے۔"

وہ کُرسی سے اُٹھتے ہوئے بولے۔

"مسٹر راکیش! کام کرنے والا تو بھگوان ہے۔ ہاں وہ کسی نہ کسی کو ذریعہ بنا دیتا ہے۔ تمھیں یہ جان کر خوشی ہو گی کہ بہت جلد میرا پروموشن ہونے والا ہے۔ شاید میں باہر بھیج دیا جاؤں۔ میں چاہتا ہوں میرے جانے سے پہلے تمھارا کام بن جائے۔"

میں خوشی سے جھومتا ہُوا باہر نِکلا۔ سب لوگ جا چُکے تھے۔ میں وہاں سے نکل کر جب کملا کے دفتر کے سامنے پہنچا تو وہ حسبِ معمول میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھ پر نشے کی سی کیفیت طاری تھی۔ میں نے آگے

بڑھ کر اُس کے دونوں بازو پکڑ لئے اور اُسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

"کیا کرتے ہو شرم نہیں آتی" اُس نے خود کو چھڑاتے ہوئے کہا۔

میں نے شرمندہ ہو کر اُسے چھوڑ دیا۔ کچھ فاصلے پر کھڑے لوگ ہمیں دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ میں اُسے اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھ گیا۔

"آج کیا بھنگ پی کر چلے تھے؟" اُس نے کہا۔

"آج مجھ پر دس بوتل کا نشہ سوار ہے!" میں نے پُرخمار آواز میں جواب دیا۔

"کیوں —— خیر تو ہے؟" اُس نے مسکرا کر پوچھا۔

میں نے اُسے ساری بات بتا دی۔ وہ دلچسپی سے سنتی رہی۔

پھر ایک گہری سانس لے کر بولی۔

"شکر ہے تمھارے آفیسرز نے تمھاری سن لی"

"آفیسرز کیا سنیں گے۔ یوں کہو بھگوان نے سن لی!" میں نے کہا۔

"ہونہہ۔ بھگوان!" ایک طنز آمیز مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر بکھر گئی "بھگوان کیا چیز ہے اِن آفیسرز کے سامنے! جب تک یہ لوگ کرسی پر بیٹھے ہیں۔ یہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ساری خدائی کو بدل سکتے ہیں!"

"تم ناستک ہو کملا!" میں نے ہنس کر کہا۔

وہ سنجیدہ لہجے میں بولی۔

"پہلے تو ناستک نہیں تھی۔ اب بنتی جا رہی ہوں۔ میں سمجھتی ہوں یا تو بھگوان ہے ہی نہیں۔ یا پھر بالکل بے پروا ہے۔ اُسے کسی کے دُکھ درد کا احساس نہیں ہے"

میں نے ہنس کر کہا۔

"یہ بات پھر کریں گے۔ پہلے یہ بتاؤ شادی کب کر رہی ہو؟"

وہ کچھ سوچنے لگی۔ بہت دیر تک سوچتی رہی۔ میں بور ہو گیا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" میں نے تنگ آ کر پوچھا۔

وہ مسکرا کر بولی۔

"مجھے تین مہینے کی مہلت چاہئے۔ تین مہینے بعد اپنے فیصلے کی اطلاع دوں گی"

"فیصلے کی اطلاع دو گی یا شادی کرو گی؟"

"فیصلے کی اطلاع دوں گی"

"تمھارا فیصلہ میرے خلاف بھی ہو سکتا ہے؟"

"ہاں —— ہو سکتا ہے" وہ مسکرا کر بولی۔

"جب تم اِس طرح بات کرتی ہو تو میری عجیب حالت ہوتی ہے"

"کیا حالت ہوتی ہے؟"

"دل بہت زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے"

"بس؟" اُس نے ہنس کر کہا "میں تو کچھ اور سمجھی تھی"

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

وہ ہنس کر بولی۔

"پھر بتاؤں گی۔ چلو اُٹھو۔ کچھ کھائیں پئیں گے۔ بھوک لگ رہی ہے۔"

پھر چھ ہفتے کے اندر سارا کام ہو گیا۔

میں کلرک کی کرسی سے اُٹھ کر سینئر ریسرچ آفیسر کی کرسی پر جا بیٹھا۔ ایک الگ کمرہ ملا۔ شاندار فرنیچر۔ بڑی سی میز۔ میز پر خوشنما ٹیلیفون۔ پھر لُطف یہ کہ کام بہت ہی کم!

میں نے کملا کو یہ باتیں بتائیں تو وہ مسکرا کر بولی۔

"مبارک ہو! پہلے تم نے بہت کام کیا تھا۔ اب پنشن مل رہی ہے!"

"پنشن" میں نے ہنس کر کہا "تنخواہ سے تین گُنی پنشن!"

"آم کھاؤ پیڑ مت گنو" اُس نے کہا اور ہم دونوں ہنسنے لگے۔

پھر میں نے کہا۔

"میرا ایک دوست کہتا ہے تم جب کلرک تھے تو ایمانداری کی کھاتے تھے۔ لیکن اب حرام کی کھاؤ گے"

وہ کہنے لگی۔

"تمھارا دوست یا تو پاگل ہے یا پھر تم سے جلتا ہے"

میں نے کہا۔

"کچھ بھی کہو —— بات تو کچھ عجیب سی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ مجھ سے سینئر آدمی تین مہینے کی چھٹی چلا گیا تھا۔ میں نے جب اپنا کام

تین مہینے کے لئے اُس کی جگہ پر میرا تقرر ہو جائے تاکہ مجھے پچاس رُوپے مہینے کا فائدہ ہو جائے۔ لیکن اُس وقت بھی یہی ڈائرکٹر صاحب تھے جنھوں نے میری درخواست یہ کہہ کر نامنظور کر دی تھی کہ وہ سرکاری خزانے پر ڈیڑھ سو رُوپے کا بوجھ نہیں ڈال سکتے۔ اُن کی اِس بات کے باوجود مجھی کو اُس آدمی کا کام سونپا گیا۔ لیکن مجھے ایک پیسہ بھی زیادہ نہ مل سکا! کیا زمانہ تھا وہ بھی۔ سرکاری خزانے پر تین مہینے میں ڈیڑھ سو رُوپے کا بوجھ نہیں ڈالا جا سکتا تھا اور اب ــــــ"

"اور اب تم خزانے کا بوجھ ہلکا کر رہے ہو!" کملا نے بات پُوری کر دی۔

پھر وہ سنجیدہ ہو گئی۔

"راکیش! ایمانداری اور بے ایمانی کے چکر میں مت پڑو۔ گندے تالاب میں گھُس کر تم کیچڑ سے نہیں بچ سکتے۔ یا تو ایسی جگہ سے دُور رہو یا پھر اُس جگہ کی گندگی کو ہنسی خوشی قبول کر لو۔"

دُوسرے ہی دن ڈائریکٹر صاحب کے ٹرانسفر کا آرڈر آ گیا۔ ہم لوگوں نے اُسی شام کو الوداعی پارٹی دینے کا اہتمام کیا۔ میں نے کملا کو ٹیلیفون کر کے اُس شام کی چھٹی لے لی اور اگلی صبح کو مجھے فوری طور پر لکھنؤ جانے کا حکم مِلا۔ میں نے کملا کو اِطلاع دی۔ وہ میری روانگی کے وقت ریلوے سٹیشن پہنچی لیکن دُوسرے لوگوں کی موجودگی میں کوئی تفصیلی بات نہ ہو سکی۔ البتہ لکھنؤ پہنچ کر میں نے بذریعہ ٹرنک کال اُس سے بات کی۔

لکھنؤ میں پندرہ دن لگ گئے۔ واپس آ کر میں نے سب سے پہلے کملا کو ٹیلیفون کیا ــــــ جواب مِلا۔

"مِس کملا نے نوکری چھوڑ دی ہے۔"

"کیوں؟"

"آپ کے اِس 'کیوں' کا جواب تو وہی دے سکتی ہیں۔" دُوسری طرف سے آواز آئی۔ "انھیں نوکری چھوڑے ایک ہفتہ گزر چُکا ہے۔ نوکری چھوڑنے کی اِتنی جلدی تھی کہ ایک مہینے کی تنخواہ بھی چھوڑ دی۔"

میرا سر چکرانے لگا۔ کملا نے نوکری چھوڑ دی۔ نوکری چھوڑنے کی اِتنی جلدی تھی کہ ایک مہینے کی تنخواہ بھی چھوڑ دی۔ میرے دل و دماغ نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ یہ سب کیا ہے۔ وہ کیا کر رہی ہے؟ اُس نے نوکری کیوں چھوڑ دی؟ وہ بھی اِتنی عجلت کے ساتھ! آج تو کملا سے اُس کا فیصلہ معلوم کرنے کا دن تھا۔ کیا وہ مجھ سے دُور رہنا چاہتی ہے ــــــ؟

میں نے پھر ٹیلیفون کیا۔

"آپ مجھے مِس کملا کے گھر کا پتہ بتا دیجئے۔"

جواب مِلا۔

"آپ کل ٹیلیفون کر لیں۔ پتہ بتا دیا جائے گا۔"

میری حالت عجیب ہو رہی تھی۔ میں جلدی چھُٹی لے کر گھر پہنچ گیا۔ دروازہ کھولتے ہی ایک لفافہ پر نظر پڑی۔ جس پر میرا نام لکھا تھا۔ تحریر کملا کی تھی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ جلدی سے لفافہ چاک کیا اور انگریزی میں لکھا ہُوا خط پڑھنے لگا ــــــ

"ڈیر راکیش! دل کی عجیب حالت ہے۔ خط لکھ رہی ہوں لیکن ہاتھ لرز رہا ہے۔ دل رو رہا ہے۔ آج تین مہینے پُورے ہو گئے۔ جواب حاضر ہے۔ تمھاری کملا تم سے شادی نہیں کر سکتی۔ اِس لئے کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے اور محبت دھوکا نہیں دے سکتی۔ پیار میں وِشواس گھات کے لئے کوئی جگہ نہیں!

میں نے تمھاری محبت کو نہیں ٹھکرایا ہے، اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا دبا دیا ہے۔ جو تمھاری خواہش تھی وہی میری تمنا تھی۔ لیکن میں تمھیں اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتی اور نہ یہ سوچنا چاہتی ہوں کہ شادی کے بعد تمھارے چہرے پر نفرت اور بیزاری کی شکنیں دکھائی دیں۔ تمھاری نظروں نے مجھے پیار کے قابل سمجھا ہے۔ لیکن راکیش! یہ ایک تکلیف دِہ حقیقت ہے کہ تمھیں اپنے خواب کی تعبیر نہیں مِل سکتی۔ کملا شریف ضرور ہے۔ لیکن پاک دامن نہیں۔ محبت کا وہ کنول جو عورت انتہائی عقیدت کے ساتھ اپنے من مندر کے دیوتا کو پیش کرتی ہے، کیچڑ میں گر کر گندا ہو چُکا ہے۔ تم اِس پھُول کو سُونگھو گے۔ بار بار سُونگھو گے پھر ایک دن تمھیں اِس کی تہہ میں لگی کیچڑ نظر آ جائے گی۔ تم ناک سکوڑ لو گے۔ پھُول کو نفرت سے زمین پر پھینک دو گے۔ پھر کیا ہو گا ــــــ راکیش! پھر کیا ہو گا؟

میں نے بار بار سوچا کہ تمھیں سب کچھ بتا دوں۔ لیکن ہر بار

میری ہمت نے جواب دے دیا۔ میں سچ بول کر اُن حسین لمحات سے محروم نہیں ہونا چاہتی تھی جو میں ہر شام کو تمھارے ساتھ گزارتی تھی۔ لیکن تمھارے تقاضوں نے بہت جلدی فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ اُس فیصلے نے میرے دل و دماغ کو ماؤف کر دیا۔ میں نے نوکری چھوڑ دی اور آج یہ شہر چھوڑ رہی ہوں، صرف اِس لیے کہ اگر یہاں رہی تو پاگل ہو جاؤں گی۔ میں کب واپس آؤں گی یہ نہیں بتا سکتی۔ لیکن باہر جانے سے پہلے تمھیں ساری باتیں بتا دینا چاہتی ہوں۔

میں اِس بھری دُنیا میں تنہا ہوں۔ بالکل تنہا! ماں نہیں، باپ نہیں، بہن نہیں، بھائی نہیں (معاف کرنا میں نے تمھیں غلط بتایا تھا کہ میرا ایک بڑا بھائی ہے) میرے ماں باپ اب سے پانچ سال پہلے ٹریفک کے ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے۔ اُس وقت میں بی۔اے پاس کر چکی تھی۔ ڈیڈی کے دفتر کے افسروں نے ازراہِ ہمدردی مجھے ٹائپسٹ کی نوکری دے دی۔

دفتر کا ماحول بہت اچھا تھا۔ ادھیڑ عُمر سیکشن آفیسر کو مجھ سے بہت ہمدردی تھی۔ میں اُس ناطے اُنھیں انکل کہنے لگی۔ وہ ہمارے پڑوس ہی میں رہتے تھے۔ ایک بار اُن کی بیوی بیمار ہو کر ہاسپٹل پہنچ گئیں تو میں انکل کے گھر جا کر اُن کا کھانا تیار کرنے لگی۔ وہ خوش تھے۔ بہت خوش! کہتے تھے 'کملا! میں تمھارے احسان کا بدلہ نہیں چُکا سکتا!'

لیکن بھگوان نے جلدی ہی احسان کا بدلہ اُتارنے کا موقع دے دیا۔ اُن کی بیوی مر گئیں تو اُنھوں نے میری خدمات کے صلے میں مجھ پر زندگی کا سب سے بڑا احسان کرنا چاہا۔ لیکن میں نے اُنھیں احساس دلایا 'میں تو آپ کو اپنے ڈیڈی کے برابر سمجھتی ہوں!'

اُنھوں نے میری بات کو ہنسی میں اُڑا دیا۔ لیکن میں نے صاف اِنکار کر دیا۔ اُنھیں بہت تکلیف ہوئی۔ لیکن وہ احسان فراموش نہ تھے! میری خدمات کا تھوڑا بہت معاوضہ ادا کرنا ضروری تھا۔ اِس لیے اُنھوں نے زبردستی معاوضہ دے ڈالا!

پہلے تو میں نے خودکُشی کا ارادہ کیا۔ لیکن بعد میں انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا۔ شکایت لِکھ کر اُوپر پہنچائی۔ فوراً اِنکوائری کا حکم جاری ہو گیا۔ تحقیقات کے لیے دو آدمی ہمارے دفتر آئے۔ اُنھوں نے سٹاف کے سارے ممبروں کے باری باری بیانات لیے۔ سب لوگوں نے تقریباً ایک ہی بات کہی۔

'مِس کملا کام چور ہیں۔ وقت پر دفتر نہیں آتیں۔ وقت سے پہلے گھر چلی جاتی ہیں۔ دفتر کے اوقات میں ناول پڑھتی رہتی ہیں یا پھر باہر تفریح کے لیے نکل جاتی ہیں۔ صاحب نے اُنھیں کئی بار وارننگ دی تو وہ صاحب کے خلاف اُلٹی سیدھی باتیں کرنے لگیں۔ اب اُنھوں نے ایک فرشتہ سیرت انسان پر اِتنا بیہودہ اور گھناؤنا الزام لگایا ہے!'

اِنکوائری کرنے والے کِس نتیجے پر پہنچے یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ البتہ اگلے ہفتے ہی وہاں سے میرا تبادلہ کر دیا گیا۔ اور۔۔۔ بس۔۔۔

میرے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ لیکن جب میرے نئے دفتر کے سیکشن آفیسر نے ایک دن مجھے اوورٹائم کے بہانے سے سات بجے شام تک روک کر بہتے دریا میں ہاتھ دھو لیے تو یہ آگ بجھ گئی۔ بالکل ٹھنڈی ہو گئی!

اُس راکھ میں اُس وقت چنگاریاں پیدا ہو گئیں جب ہمارے سیکشن آفیسر نے ایک شام کو ایک سیل بند لفافہ جس میں چند اہم کاغذات تھے، مجھے دے کر حفاظت کے ساتھ ایک بہت بڑے ڈیپارٹمنٹ کے انچارج آفیسر مسٹر کھنہ کو پہنچانے کا حکم دیا۔ کھنہ جی کے فلیٹ پر پہنچنے کے بعد پتہ چلا کہ مجھے بطور تحفہ کھنہ جی کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ دراصل وہ لفافہ میرے ذریعے کھنہ جی کے پاس بھیجنے کی بجائے مجھے اُس لفافے کے ذریعے اُن کے پاس بھیجا گیا تھا۔ اِس لئے کھنہ جی نے مجھے اِس بات کا موقع ہی نہ دیا کہ میں وہ لفافہ اُن کی خدمت میں پیش کر سکتی۔

گھر پہنچ کر میں نے لفافہ کھول ڈالا اور انتقام کی تمنا ایک بار پھر جاگ گئی۔ بجھی ہوئی آگ پھر بھڑک اُٹھی۔ اِس بار مجھے اپنی کامیابی کا یقین ہو گیا۔ اِس لئے کہ اُس لفافے کے اندر واقعی کچھ اہم کاغذات تھے۔ جن سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ ہمارے مہربان سیکشن آفیسر صاحب اور کھنہ جی مل کر ایک بہت ہی نفع بخش دھندا چلا رہے تھے۔ لاکھوں کی آمدنی ہو رہی تھی۔

پہلے تو میں نے اِرادہ کیا وہ سارے کاغذات اعلیٰ افسران کو بھیج دوں۔ لیکن پھر کچھ سوچا اور ارادہ بدل دیا۔ اِس طرح کامیابی کی زیادہ اُمید نہ تھی۔ کافی سوچ وِچار کے بعد ایک اور فیصلہ کر لیا۔

میں دُوسرے دن دفتر جانے کی بجائے بنک چلی گئی اور وہ کاغذات اپنے لاکر میں بند کر دیئے۔ پھر سیکشن آفیسر صاحب کو ٹیلیفون کر کے اعلانِ جنگ کر دیا۔ وہ بہت گھبرائے۔ فوراً کھنہ جی کو ساتھ لے کر میرے گھر آئے۔ دونوں نے مجھ سے معافی مانگی۔ میں نے اُن سے سودا طے کر لیا۔

"اگر میرے مطالبات پُورے ہوتے رہے تو وہ کاغذات اعلیٰ افسران کے پاس نہ جائیں گے" میں نے اُن دونوں سے کہا۔

معاہدے کی پہلی شرط کے طور پر میں نے اپنے سیکشن آفیسر سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنا تبادلہ کسی اور سیکشن میں کرا لیں یا پھر میرا تبادلہ کرا دیں۔ اُنھوں نے میری دُوسری بات مان لی۔ پندرہ دن بعد میں ایک اور سیکشن میں پہنچ گئی۔

پھر میں نے اُن سے دس ہزار رُوپے کا مطالبہ کیا۔ وہ دُوسرے ہی دن پُورا ہو گیا۔ اُس کے بعد میں نے کھنہ جی کی خبر لی اور اُن سے بھی اِتنی ہی رقم وصول کر لی۔

تم سے دوستی ہو جانے کے بعد میں نے سوچا اِس بلیک میل سے تمھیں بھی فائدہ پہنچنا چاہیئے۔ یہ سوچتے ہی میں نے کھنہ جی کو ٹیلیفون کر دیا اور یہ اُسی ٹیلیفون کا کرشمہ ہے کہ اب تم سینئر ریسرچ آفیسر کی کُرسی پر بیٹھے ہو!

ہاں راکیش! یہ وہی کھنہ جی تھے تمھارے سابق ڈائریکٹر صاحب! تم ابھی تک حیران تھے کہ ڈائریکٹر کھنہ تم پر اِس طرح اچانک کیسے مہربان ہو گئے۔ اُمید ہے کہ اب تمھاری حیرانی دُور ہو گئی ہو گی۔

کھنہ جی کا تبادلہ نہیں ہُوا۔ اُنھوں نے مجھ سے گھبرا کر خود ہی اپنا تبادلہ کرا لیا ہے۔ حالانکہ وہ مجھ سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتے! پھر بھی میں چاہتی ہوں کہ وہ کچھ دن اطمینان کی سانس لے لیں۔ میں بھی کچھ دن کے لئے دُنیا کی سَیر کرنا چاہتی ہوں تاکہ ذہن کا بوجھ کم ہو جائے۔

واپس آ کر تم سے ضرور مِلوں گی۔ لیکن (یہ خط پڑھنے کے بعد اگر تمھارے دل میں میرے لئے کوئی جگہ باقی رہ جائے) میرا انتظار مت کرنا۔ کیا پتہ کہ میں کب واپس آؤں ———"

میرے دل میں اب بھی کملا کے لئے جگہ ہے۔ میری نگاہوں میں وہ کیچڑ میں کنول ہے ——— میں گُناہ سے نفرت کرتا ہوں، گُناہگار سے نہیں!!

شِکاکائی
بھارتی عورتوں کے خوبصورت بالوں کا روایتی راز



سواستک

شِکاکائی

شیمپو صابن

پراچین روایتوں اور سہولت کو یکجا کر کے آپ کے خاندان کے لئے

Shilpi-HPMA-6A/72 URDU

غزل

جگن ناتھ آزاد ایم۔ اے

شاید کہ موجِ بادہ ہے تیرا سخن تمام
تصویرِ میکدہ ہے تری انجمن تمام

جیسے بسی ہو اِس میں شمیمِ چمن تمام
ایسے مہک رہا ہے ترا پیرہن تمام

اللہ رے یہ زُلف، یہ عارض، یہ چشم ولب
گویا کہ فصلِ گُل میں کھلا ہے چمن تمام

احباب کے خلوص سے شاید کھلے یہ راز
کیوں ہے زمینِ غیر زمینِ وطن تمام

...ت کی اِس غزل پہ تو قرباں ہے دل مرا
... ہے زمینِ دکن تمام"

ہر تارِ پیرہن ہے کرن آفتاب کی
دیکھا ہے موجِ مے سے جو تیرا بدن تمام

... کے ذکر کا شاید یہ فیض ہے
... پہ آج ہے رنگِ سخن تمام

غزل

سعید عارفی ایم۔ اے

بھٹک رہی ہے خلاؤں میں کیوں نظر تنہا
اُسے تو کرنی ہے طے راہِ پُر خطر تنہا

کوئی تو ہم سفر راہِ زیست مل جائے
کہ ایک شخص بھٹکتا ہے دربدر تنہا

جلے ہزار شناسائیوں کے دیپ مگر
ہم اجنبی سے پھرے رات رات بھر تنہا

یہ ڈھلتی رات بھی اب اپنا ساتھ چھوڑ چلی
ہمارے حال پہ رونے کو ہے سحر تنہا

جھلس نہ جائیں کہیں نکہتوں کے پیراہن
ابھی تو آتشیں موسم میں ہے شجر تنہا

کوئی اُمید کوئی آرزو نہ کام آئی
عجیب حال میں لوٹا ہے نامہ بر تنہا

ملا سعید نہ اس نازشِ چمن کا سراغ
کہ صرف جس کے نہ ہونے سے ہے یہ گھر تنہا

غزل

جگن ناتھ آزاد ایم۔ اے

شاید کہ موجِ بادہ ہے تیرا سخن تمام
تصویرِ میکدہ ہے تری انجمن تمام

جیسے بسی ہو اس میں شمیمِ چمن تمام
ایسے مہک رہا ہے ترا پیرہن تمام

اللہ رے یہ زُلف، یہ عارض، یہ چشم و لب
گویا کہ فصلِ گُل میں کھلا ہے چمن تمام

احباب کے خلوص سے شاید کھُلے یہ راز
کیوں ہے زمینِ غیر زمینِ وطن تمام

حسرت کی اِس غزل پہ تو قرباں ہے دل مرا
"گلزار بن گئی ہے زمینِ دکن تمام"

ہر تارِ پیرہن ہے کرن آفتاب کی
دہکا ہے موجِ مے سے جو تیرا بدن تمام

حُسنِ دکن کے ذکر کا شاید یہ فیض ہے
میری غزل پہ آج ہے رنگِ سخن تمام

غزل

سعید عارفی ایم۔ اے

بھٹک رہی ہے خلاؤں میں کیوں نظر تنہا
اُسے تو کرنی ہے طے راہِ پُر خطر تنہا

کوئی تو ہم سفرِ راہِ زیست مل جائے
کہ ایک شخص بھٹکتا ہے دربدر تنہا

جلے ہزار شناسائیوں کے دیپ مگر
ہم اجنبی سے پھرے رات رات بھر تنہا

یہ ڈھلتی رات بھی اب اپنا ساتھ چھوڑ چلی
ہمارے حال پہ رونے کو ہے سحر تنہا

جھُلس نہ جائیں کہیں نکہتوں کے پیراہن
ابھی تو آتشیں موسم میں ہے شجر تنہا

کوئی اُمید کوئی آرزو نہ کام آئی
عجیب حال میں لوٹا ہے نامہ بر تنہا

ملا سعید نہ اس نازشِ چمن کا سراغ
کہ صرف جس کے نہ ہونے سے ہے یہ گھر تنہا

حسن جو چاند کو شرمائے



جے

سندرتا اور خوشبو
میں ڈوب ڈوب
جائیے

جے کا نرم نرم سہانا جھاگ آپکی
جلد کو پھول کی طرح نازک اور خوبصورت
رکھتا ہے ۔ اس کی بھینی بھینی
چنبیلی کے پھولوں میں بسی
خوشبو آپکو
دیر تک شاداب
رکھتی ہے

ٹاٹا کا بنایا ہوا

OBM-7002U

آواز کا زخم

مس نعیمہ جعفری ایم۔ اے

نیاز منزل، دودھ پور، علی گڑھ

محترمی و مکرمی! خلوصِ فراواں

بہت دنوں کے بعد ایک بار پھر "بیسویں صدی" کی بزم میں شریک ——— ہو رہی ہوں۔ "آئیڈیل" کی پسندیدگی کے لئے ہند اور بیرونِ ہند سے جو بہت سارے خطوط موصول ہوئے انھوں نے مجھے ایک نیا حوصلہ عطا کیا۔ میں اپنے اُن سب پڑھنے والوں کی ممنون ہوں ——— ایک اور کہانی "آواز کا زخم" حاضر ہے۔ آپ کو اور قارئین کو پسند آگئی تو میں سمجھوں گی مجھے اپنی محنت کا صلہ مل گیا . . .

نیاز مند ——— نعیمہ جعفری

★

اُس دن میں بہت خوش تھا۔

ساری رات بارش ہوتی رہی تھی۔ گھٹاؤں پر گھٹائیں آتی رہیں اور برستی رہیں۔ دوسری صبح موسم بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔ حدِ نظر تک پھیلے ہوئے سبز میدانوں میں پانی ہی پانی نظر آرہا تھا۔ پیپل کے چمکدار پتے پانی میں نہائے نکھرے نکھرے سے نظر آرہے تھے۔ دھیمی دھیمی ہوا درختوں سے اٹکھیلیاں کر رہی تھی اور ایسے حسین موسم میں اُس کی درد بھری آواز ———

گھونگھٹ کے پٹ کھول ری توہے پیا ملیں گے

افق کے پار سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سُر نے اُس لڑکی کا روپ دھار لیا ہے۔ بہت دنوں کے بعد ایک ایسی دلکش آواز سُننے کو ملی تھی۔ اسی لئے میرا دل مسرت کے لطیف احساس سے لبریز تھا۔

سہ پہر کو جب میں گھر پہنچا تو یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ ماں بھی بے حد خوش ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کیونکہ پتا جی کے سورگباس ہو جانے کے بعد سے میں نے بہت کم اُس کے ہونٹوں کو مُسکراتے دیکھا تھا۔ کھانے کی میز پر آخر میں نے پوچھ ہی لیا۔

"کیا بات ہے ماں؟ آج تم بہت خوش نظر آرہی ہو!"

"ہاں بیٹا! خوشی کی تو بات ہی ہے۔ میری زندگی میں خوش ہونے کا یہی تو ایک موقع رہ گیا ہے۔" ماں کی آواز بھرّا گئی۔ میں ہاتھ روک کر سوالیہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھنے لگا۔ ساری کے پلّو سے آنکھیں خشک کر کے وہ بولی: "ٹھاکر سورج مل جی کے یہاں سے تیرا رشتہ آیا ہے۔"

"کون سورج مل؟ وہ۔ وہ سنگیت کار؟" میرا دل دھڑک اُٹھا۔

"ہاں وہی۔ اُن کی بڑی لڑکی پُشپا کو تو تُو نے دیکھا ہی ہے۔ اُسی کی چھوٹی بہن ہے۔ لڑکی کی تصویر بھی آئی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سنگیت کار کی بیٹی ہے۔ تیری مرضی کے مطابق گانا بجانا بھی جانتی ہے۔ پُشپا کا گانا تو تُو نے سُنا ہوگا۔ نائی بتا رہا تھا کہ ٹھاکر جی نے دونوں لڑکیوں کو سنگیت سکھایا ہے۔"

کھانے کے بعد جب میں اپنے کمرے میں گیا تو میز پر سنگیتا کی تصویر

رکھی تھی۔ تصویر ہی میں وہ اتنی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی کہ میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میری جگہ کوئی شاعر ہوتا تو اُس کی آنکھوں کو کنول سے تشبیہ دیتا، اُس کے ہونٹوں کو گلاب کی پنکھڑی کہتا، اُس کے ابروؤں کو مہِ نو کہتا! لیکن میں، ایک سیدھا سادہ سنگیت کار، اِس سے زیادہ نہ سوچ سکا کہ وہ مشرقی حُسن کا بہترین نمونہ تھی۔ دل ہی دل میں میں اپنی قسمت پر ناز کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اب تک زندگی میں بہت سی لڑکیوں سے سابقہ پڑ چکا تھا۔ لیکن کسی لڑکی نے مجھے اِتنا متاثر نہ کیا تھا، جتنا اُس بے جان تصویر نے ایک پل میں متاثر کر دیا۔ اِس میں میرے اصولوں کو بھی دخل تھا۔ محبت کو میں نے ہمیشہ غالب کے بقول دماغ کا خلل سمجھا تھا۔ حالانکہ میرا پیشہ ایسا تھا کہ دن رات لڑکیوں سے واسطہ رہتا تھا۔ لیکن میں نے اُنھیں کبھی غور سے دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی تھی۔

مجھے بچپن ہی سے سنگیت کا شوق تھا۔ اِسی شوق کے پیشِ نظر پتا جی نے مجھے موسیقی کی تعلیم دلوائی تھی اور اب جبکہ میں صرف موسیقی کا کلپرار ہی نہ تھا، موسیقار کی حیثیت سے بھی مشہور ہو چکا تھا۔ میرا یہ شوق جنون کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ اچھی آواز میری سب سے بڑی کمزوری بن گئی تھی۔ اچھی آواز میری رُوح کی غذا تھی، میری زندگی تھی۔ اگر ایک دن کوئی دلکش آواز کانوں میں نہ پڑے تو مجھے اپنا وجود ادھورا سا معلوم ہونے لگتا تھا۔ میرے کالج کی لڑکیوں میں ایک سے ایک خوش گلو لڑکی تھی۔ لیکن میں اپنے پانچ سالہ تجربے کی بِنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اِس سلسلے میں خالق کائنات قطعی بے انصافی کرتا ہے۔ اچھی آواز والی لڑکیاں نہ جانے کیوں اچھی صورت سے محروم ہوتی ہیں۔ یہی سبب تھا کہ جب میری نئی اسٹوڈنٹ رتیا میرا بائی کا گیت گا رہی تھی تو میں نے آنکھیں بند کر کے اُسے سُنا تھا۔ لیکن سنگیتا میں یہ دونوں خوبیاں یکجا تھیں۔ وہ تو مجسّم سنگیت تھی! اُس کی بڑی بہن پُشپا کو میں نے دیکھا ہی نہ تھا، گاتے ہوئے بھی سُنا تھا۔ اُس کی آواز میں جادو تھا۔ جب وہ ہنستی تھی تو معلوم ہوتا تھا جیسے کانسی کی تھال میں چاندی کے سِکّے کھنک رہے ہوں اور جب وہ بولتی تھی تو محسوس ہوتا تھا کسی نے سِتار کے تاروں کو چھیڑ دیا ہو!" اور یہ سنگیتا' میں نے اُس کی مُسکراتی ہوئی تصویر کو پیار سے دیکھتے ہوئے سوچا: اُسی کی تو بہن ہے!

شادی کے لئے میں نے ہاں کر دی۔ ماں کی خوشیوں کی حد نہ تھی۔ شادی سے پہلے میں نے اُسے صرف ایک بار دیکھا تھا۔ جب منگنی کی رسم کے لئے وہ ٹھاکر صاحب کے ساتھ آئی تھی گلابی زرکار ساڑی میں لپٹی، گہنوں سے لدی، شرم سے جھکی جھکی وہ میرے سامنے بیٹھی رہی۔ لیکن اشتیاق کے باوجود میں اُس سے ایک بات بھی نہ کر سکا۔ شاید اُس کے حُسن سے مرعوب ہو گیا تھا۔ اُس کے بعد کبھی موقعے آئے جب میں اُس سے مِل سکتا تھا۔ لیکن میں نے ایسا نہ کیا۔ شادی سے پہلے کے رُومان اور اسکینڈل بازی سے مجھے سخت نفرت تھی اور پھر زیادہ عرصہ بھی تو نہیں گزرا۔ ماں کو شادی کی جلدی تھی۔ اُدھر ٹھاکر صاحب بھی جلدی سے جلدی اس فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتے تھے۔ دو مہینے کے اندر ہی ہماری شادی ہو گئی۔

بارہ بجتے بجتے سب مہمان رُخصت ہو گئے۔ تو میں تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ میرا کمرہ جو آج دُلہن کی طرح سجا ہُوا تھا، آج وہاں تنہائیاں میری منتظر نہ تھیں۔ آج وہاں سنگیتا تھی! سنگیتا کا خیال آتے ہی ریتا کی آواز میرے کانوں میں گونجی ——

مکھ گھٹ کے پٹ کھول ری توہے پیا ملیں گے،

نئے جیون کی ابتدا بھی سنگیت سے ہونی چاہئے۔ پہلے اس سے ایک گیت سُنوں گا۔ میں نے سوچا۔ ستار اس کے ہاتھوں میں دے کر کہوں گا: "سنگیتا! تم تو مجسّم سنگیت ہو۔ شرم چھوڑو اور مجھے ایک گیت سنا دو۔" شرماتی لجاتی سی جب وہ ستار ہاتھ میں لے کر گائے گی تو ساری کائنات جھوم اُٹھے گی۔ ایسا معلوم ہوگا جیسے مغنّیِ فلک زہرہ زمین پر اتر آئی ہو! لیکن پہلی رات اُسے کس نے گاتے سُن لیا تو؟ دل نے شک ظاہر کیا: "تو نہ ہے ہی کون؟" میں نے دل کو سمجھایا۔ نہ بہنیں، نہ بھابیاں، نہ بھائی۔ ایک ماں ہے۔ اُس نے سُن بھی لیا تو کیا۔ جانتی ہے اُس کا بیٹا سنگیت کا دیوانہ ہے۔

کمرے کی مدہوش کُن فضا نے مجھے اور زیادہ مدہوش کر دیا۔ دروازہ بند کر کے میں نے کمرے میں سے ستار اُٹھایا اور اُس کے قریب جا بیٹھا۔ ایک شرمیلا متحرک گٹھری کے روبرو، جس میں سے سہاگ، عطر اور مہندی کی مِلی جُلی خوشبوئیں اُٹھ رہی تھیں، اپنے نزدیک محسوس کر کے میں نے سوچا بات کی ابتدا کس طرح کی جائے۔ تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد میں نے کہا۔

"سنگیتا جی! میں سچ مچ بہت خوش نصیب ہوں کہ مجھے آپ جیسی روپ وتی پتنی مِلی۔ آپ شاید یقین نہ کریں گی۔ جب سے آپ کو دیکھا ہے آپ کی مدھر آواز سُننے کے لئے میرے کان ترس رہے ہیں۔ اِس لمحے کا میں نے کتنا انتظار کیا ہے جب آپ کی مدھر آواز چاندی کی گھنٹیوں کی طرح میرے کانوں میں بج اُٹھے گی۔ آپ جانتی ہوں گی کہ میں ایک سنگیت کار ہوں اور اچھی آواز کا دیوانہ ہوں۔ اِسی لئے آپ سے ایک چھوٹی سی درخواست کروں گا۔ ایک گیت سُنا دیجئے! حالانکہ یہ بات آپ کو عجیب سی معلوم ہوگی۔ آج ہماری سہاگ رات ہے اور آج ہی میں آپ سے ایسی فرمائش کر رہا ہوں!" میں دھیرے سے ہنس دیا۔ لیکن وہ خاموش رہی۔ میں نے اُنگلیوں سے اُس کا چہرہ اُوپر اُٹھایا۔ اُس کے صبیح رخساروں پر زردی چھا رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں شرم کی جگہ خوف کے سائے لرز رہے تھے۔ میں گھبرا گیا: "کیا ہُوا سنگیتا؟ تم پریشان کیوں ہو گئیں؟ رہنے دو۔ پھر کبھی سُنا دینا۔ اب تو ساری زندگی کا ساتھ ہے!" مجھے واقعی اپنی احمقانہ فرمائش پر افسوس ہُوا۔ میں نے دیکھا اُس کی لمبی لمبی پلکوں میں آنسوؤں کے موتی چمک رہے تھے۔

"جی... جی... مجھے گانا بجانا بالکل نہیں آتا۔ ایک انتہائی بھدّی اور بے سُری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور میرے ہاتھ سے ستار چھوٹ کر فرش پر دُور تک پھسلتا چلا گیا!!

ممبر صاحبان سے گزارش ہے کہ خط لکھتے وقت اختصار سے کام لیا کریں تاکہ آپ کے ارشاد کی تعمیل فوراً ہو سکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے۔

رسالہ نہ ملنے کی شکایت

دو مرتبہ پتے چیک کرنے کے بعد ہی رسالہ ہر ماہ باقاعدگی سے سپرد ڈاک کیا جاتا ہے۔

اس کے باوجود شکایتی خطوط موصول ہونے پر رسالہ دوبارہ بھیج دیا جاتا ہے۔ ۲۵ تاریخ کے بعد شکایتی خطوط موصول ہونے پر دوبارہ پرچہ بھیجنے سے ہم معذور ہیں۔ رسالہ نہ ملنے کی شکایت فوراً ڈاک سے کیجئے۔ (منیجر)

غزل

محمد حسان عارف نقشبندی ایم۔ اے، ایل ایل بی ممبر پارلیمنٹ

چلتے چلتے ہاتھ سے دامن جو وہ جھٹکا گئے
زندگی کے جگمگاتے راستے دُھندلا گئے

دِل پہ بجلی تو گری نظریں بدلتے ہی مگر
آپ کے ناز و اَدا سارے سمجھ میں آگئے

زندگی جس کے لئے ہم جان دیتے تھے کبھی
آج ہم اُس کے تصوّر ہی سے کیوں گھبرا گئے

آپ کے ہاتھوں مری بربادیوں کو دیکھ کر
دوستوں کا ذکر کیا غیروں کے آنسو آگئے

رِند مسجد میں گئے تو انگلیاں اُٹھنے لگیں
کھِل اُٹھے میکش کبھی زاہد جو اُن میں آگئے

مُجرمِ اُلفت ہوں میں مجھ کو زمانہ دے سزا
آپ کو کیوں غم ہوا اس کا آپ کیوں گھبرا گئے

زندگی کے چار دن ہنس بول کر گذرے نہیں
ہنستے ہنستے رو دیئے آنکھوں میں آنسو آگئے

آئینے کل تک بکھر جاتے تھے جنکی دید سے
وقت کے شیشے میں خود کو دیکھ کر گھبرا گئے

ایک وہ بھی ہیں سمندر پی کے جو پیاسے رہے
ہم تو عارف چار قطرے پی کے تسکیں پا گئے

غزل

نسیم شاہجہان پوری

ابھی سے ہے تغافل اُن کی فطرت دیکھئے کیا ہو
یہ ہے آغاز، انجامِ محبت دیکھئے کیا ہو

ہوس کو لوگ کہتے ہیں محبت، دیکھئے کیا ہو
فسانے کو سمجھتے ہیں حقیقت دیکھئے کیا ہو

مری جانب سے پیہم سعیٔ تکمیلِ محبت ہے
وہ ہیں آمادۂ ترکِ محبت دیکھئے کیا ہو

حقیقت میں یہ دورِ کشمکش پھر بھی غنیمت ہے
ہمارے بعد اس دُنیا کی حالت دیکھئے کیا ہو

حدودِ ضبطِ اُلفت سے گزر کر سوچتا ہوں میں
مآلِ جرأتِ اظہارِ اُلفت دیکھئے کیا ہو

محبت کو محبت کا شرف ہم نے ہی بخشا ہے
ہمارے بعد مفہومِ محبت دیکھئے کیا ہو

خلافِ مصلحت کوئی قدم اُٹھتا نہیں اُن کا
محبت میں بھی شامل ہے سیاست دیکھئے کیا ہو

نگاہِ خاص سے وہ دیکھتے تو ہیں مجھے لیکن
مآلِ التفاتِ بے نہایت دیکھئے کیا ہو

خزاں میں جب نسیم اپنا گریباں پارہ پارہ ہے
بہاروں میں مآلِ جوششِ وحشت دیکھئے کیا ہو

کوئی منزل نہ راستہ نہ سفر

رئیس نجمی

"آشیانہ" سرائے کہنہ۔ امروہہ (یوپی)

گرامی قدر! واجبات!

کل فون پر آپ کے حکم کی تعمیل میں اپنی نئی تخلیق "کوئی منزل، نہ راستہ، نہ سفر" آپ کی نذر کر رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میری کہانیوں کو انتہائی ذوق و شوق سے مطالعہ کرنے والے قارئین اس کہانی کو بھی خصوصی توجہ سے پڑھیں گے اور ہمیشہ کی طرح اپنی رائے سے مجھے سرفراز فرمائیں گے ——— یہ اتفاق ہی ہے کہ اس کہانی کے کچھ واقعات میرے اپنے ہی ماضی کے ایک دلچسپ حادثے کی دین بن گئے ہیں۔ باقی جو کچھ ہے افسانہ طرازی ہے اور وہ افسانہ طرازی آپ کی داد کی مستحق ہو گئی ہے۔ پچھلے دنوں شملہ سمجھوتے پر دستخط ہوئے تو مجھے روحانی مسرت حاصل ہوئی کہ برصغیر میں ایک پائیدار امن کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا گیا۔ پچیس سال بعد جنگ کے بادل کروڑوں انسانوں کے سروں سے چھٹ گئے۔ دیکھئے امن اور شانتی کا سورج بھی مشرق ہی سے طلوع ہو رہا ہے۔ اس دیرپا امن کی کامیابی کا سہرا ابھی ہمارے ملک کی ہر دلعزیز وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی اور پاکستان کے صدر محترم ذوالفقار علی بھٹو کے ہی سر بندھا ہے ——— کتنے دن گزر گئے ہم پاکستان کے قلمکاروں ہی سے نہیں قارئین سے بھی کٹ کر رہ گئے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد "بیسویں صدی" وہاں جانا بالکل بند ہو گیا تھا۔ خدا کرے وہ پابندیاں اب جلد ختم ہو جائیں، حالات جلد معمول پر آ جائیں اور ایک ملک کے عوام دوسرے ملک کے عوام سے بھائیوں کی طرح گلے مل سکیں۔ موجودہ کہانی دونوں ملکوں کی سرحدوں کے ادھر ادھر سسکتے ہوئے ان ہی جذبوں کی ترجمان ہے جنہیں حالات کی دوریوں نے جلا کر رکھ دیا ہے۔ یوں تو پاکستان میں اردو کے لاتعداد رسائل شائع ہوتے ہیں لیکن چند گنے چنے جرائد کو چھوڑ کر جس ذوق و شوق سے وہاں کے باذوق و بلند ذوق ادب دوست "بیسویں صدی" خریدتے اور پڑھتے ہیں اس کی مثال یہاں کے کسی بھی رسالے کی مقبولیت اور اشاعت سے نہیں دی جا سکتی۔ یہ میری آنکھوں دیکھی بات ہے کسی سے سنی ہوئی نہیں۔ وہاں "بیسویں صدی" کی بے پناہ مقبولیت کا ثبوت لاہور سے اس کی ہوبہو نقل کا ایک اور "بیسویں صدی" ہونا بھی ہے۔ نقل کسی کامیاب چیز کی بڑھتی ہوئی مانگ دیکھ کر ہی کرتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے......

خلوص کامند ——— رئیس نجمی

یہ بادل بھی کھل کر نہ برسیں گے ——— شاید برس بھی جائیں۔
ابھی کچھ دیر پہلے بہت گھر کے آئے تھے۔ بادلوں کا گھر کے آنا اور پھر کھل کے برسنا مجھے بہت پسند ہے۔ اتنا ہی پسند جتنا یہ کمرہ، یہ کرسی اور میز! یوں بھی اس میز کے سامنے اس کرسی پر بیٹھ کر میں نے تمہیں بے شمار خط لکھے ہیں۔ اس کرسی کو دیکھتے ہی ہمیشہ تم مجھے یاد آتی ہو۔ اب بھی یاد آ گئی ہو اور میں بہت دیر سے تمہیں ایک خط لکھنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں ——— صرف ایک خط ——— آخری خط! آخری خط کتنے بوجھل ہیں یہ دو لفظ! کتنی جان لیوا ہے یہ سوچ! کیسا روح فرسا ہے یہ خیال! کیسا دلخراش ہے یہ تصور — جس میں اب میرے احساس کے کانٹوں کی چبھن کے سوا کچھ بھی تو باقی نہیں رہا۔

بادل پھر گھر آئے ہیں۔ ہو سکتا ہے برس ہی جائیں ——— جب بادل برس جاتے ہیں تو دھرتی کی پیاس بجھ جاتی ہے۔ لیکن کتنی برساتیں گزریں کیسے کیسے بادل برسے! میری پیاس کبھی نہ بجھی۔ بجھتی بھی کیسے ——— میں تو ماضی کے صحرا میں بھٹکتا ہوا وہ راہی بن گیا ہوں جس کے خوابوں کی تشنگی کو تمہاری یادوں کی شبنم کے قطرے نہ مل سکے جن کی نمی سے میری وہ تشنگی بھڑک تو گئی بجھ نہ سکی۔

میں قلم اٹھاتا ہوں اور پھر یہ سوچتا ہوں تمہیں کیا لکھوں ———؟
کیسے لکھوں! تمہارے بارے میں جب بھی سوچتا ہوں، ہمیشہ ہی خیالوں میں بہت سی ادھوری کہانیوں نے اپنے اختتام کی جستجو شروع کر دی ہے۔ میں کتنی ہی بار اس جستجو میں اپنا وجود گم کر چکا ہوں۔ لیکن یہ جستجو آج تک ختم نہ ہوئی اور نہ شاید کبھی ہو گی۔
تم یاد آتی ہو تو مجھے یہ بھی یاد آ جاتا ہے کہ تم سے پہلی ملاقات لاہور میں ہوئی تھی۔ ان دنوں کی بات ہے جب میں اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے ملنے کراچی گیا تھا۔ لاہور میں میرا دوست ظہور رہتا تھا۔ جس سے ملنے کی آرزو برسوں سے میرے دل میں مچل رہی تھی۔ اس کا اور میرا بچپن ایک گلی ایک محلے اور ایک ہی ماحول میں ساتھ گزرا تھا۔ لیکن ہم دونوں کے شعور نے دو الگ الگ راہوں سے گزر کر اپنی من چاہی منزلوں کو پایا تھا۔ جس دن کراچی سے میں لاہور پہنچا اتفاق سے اس کے کالج کی سلور جوبلی کا فنکشن تھا، جس میں اسٹیج ہونے والے شیکسپیئر کے ڈرامے "جولیس سیزر" کے ڈائریکشن کی تمام تر ذمہ داری اس کے سپرد تھی۔ وہاں اپنے کئی دوستوں کے ساتھ جو خصوصی مہمانوں کی حیثیت سے اس فنکشن میں مدعو تھے۔ اس نے تم سے بھی میرا تعارف کرایا تھا۔ مجھے یاد ہے وہ تعارف رسمی سا ہی تھا، اور ہماری ابتدائی گفتگو کے صرف جملے بلکہ ان کا ایک دوسرے سے بات کا انداز بھی رسمی ہی سا تھا۔ لیکن پھر بھی مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ تم کئی سال تک ظہور کی کلاس فیلو رہ چکی ہو اور کسی لیڈیز کالج میں تاریخ کی لیکچرار ہو۔ ظہور سے قریب رہنے کی وجہ سے تم شاید اس بات سے بھی واقف ہو گئی تھیں۔ میری زندگی کے حالات کے بارے میں بھی تمہیں بہت کچھ معلوم تھا۔ میری زندگی کے بارے میں کسی کو بھی جب کوئی دلچسپی ہو جاتی ہے تو ہمارے دل میں ایک عجیب سا [illegible] بڑے پن کا احساس ہوتا ہے۔ ایسا احساس جس میں [illegible] کے ساتھ ان کے بارے میں اور بہت سی باتیں جاننے کا شوق [illegible] ایسے ہی کسی احساس کو ذہن کی گرفت میں چھپا کر جب میں نے تم سے گفتگو کا آغاز کیا تو مجھے یہ جان کر دکھ ہوا تھا کہ تم وقت سے بہت پہلے اپنی ماں اور باپ کے سائے سے محروم ہو چکی ہو۔ حالات کے کسی بھی تاثر سے نہ ٹوٹنے والے رشتوں میں صرف تمہاری ایک بہن ہے جو اس وقت زیر تعلیم تھی۔

فنکشن شروع ہونے سے پہلے تم سے بہت کم دیر گفتگو ہو سکی لیکن شاید یہ بات تمہیں معلوم بھی نہ ہو گی کہ اتنی ہی دیر میں تمہاری شخصیت نے مجھ پر ایسا گہرا تاثر چھوڑ دیا تھا جو برسوں کی ملاقاتوں کے بعد بھی بعض شخصیتوں کے نصیب میں نہیں ہوتا۔ تمہارے نام اور چہرے میں کتنی مطابقت تھی اس کا یقین تو صرف وہی کر سکتا ہے جس نے نہ صرف تمہیں دیکھا ہے بلکہ تمہارا نام بھی سنا ہے۔ تمہاری صورت درحقیقت تمہارے نام کا مکمل جواب تھی۔ تمہارا پورا نام شگفتہ جہاں تھا لیکن تم سے قربت رکھنے والے تمہیں صرف "جہاں" کہتے تھے۔ تمہارا گفتگو کرنے کا انداز انتہائی سنجیدہ اور شائستہ تھا۔ وقفے وقفے سے جملے بولنے کے بعد تمہارے باریک ہونٹوں کے درمیان مسکراہٹ اور اس مسکراہٹ کے وقت سنگِ مرمر کے موتیوں جیسے تمہارے خوبصورت دانت مجھے بہت اچھے لگے تھے۔ تمہارے چہرے پر دیومالائی دیوتاؤں کی رعنائیوں کا عکس تھا لیکن نہ جانے کیوں آنکھوں میں قدیم بابل کے ویرانوں جیسی خاموشی تھی۔ جیسے ان بیکراں خاموشی میں ہمیشہ کے لئے ڈوب کر کھو جانے کی آرزو میں دو آنکھوں نے جھانک کر دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہاں تمہاری زندگی کی راہوں میں کئی بے شمار قافلے اپنا راستہ بھٹک گئے ہیں۔ میں اس پہلی ہی ملاقات میں تم سے بہت سی طویل باتیں کرنے کا خواہشمند ہو گیا تھا۔ لیکن ساتھ ہی تمہارے چہرے کے ابھرتے ڈوبتے تاثرات سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا جیسے تم مجھ سے اس اچانک ملاقات کے ہونے پر کسی قدر نروس ہو گئی ہو۔

فنکشن کے اختتام پر بات زیادہ دیر تک نہ ہو سکی اور تم سے مزید گفتگو نہ ہو سکی تھی۔ تم ڈرامے میں "سیزر" کے کردار کی غیر معمولی کامیابی پر ظہور کو کامیاب ڈائریکشن کی مبارکباد دے کر اپنے گھر چلی گئی تھیں۔
راستے میں تمہارا ذکر کرتے ہوئے اس دن ظہور نے مجھے بتایا کہ

تب چونکہ بالطبیعت اور ہرکسی سے جلد بے تکلف ہوجانے کی عادت کی وجہ سے اپنی کلاس میں مختلف عنوان سے کافی مشہور ہوچکی ہو۔ یہی وجہ تھی کہ بعض تم سے قربت رکھنے والے بھی تمہارے بارے میں کوئی مستقل رائے نہ رکھ سکے تھے۔ اتنا بتانے کے بعد وہ یہ وضاحت بھی کرنے لگا تھا کہ تمہاری کسی بھی لغزش کو اُس نے کبھی سُنا تھا اور نہ آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اُس کی نظر میں تمہارا کردار لائق پرستش تھا۔ دلائل کی روشنی میں وہ یہ بھی ثابت کرنے لگا کہ ایسا ہی ہوتا ہے جب کوئی لڑکی اپنے معاشرے کی حدود سے ذرا سا باہر نکل کر ترقی پسند ہونے کی کوشش کرتی ہے یا پھر اِرد گرد کے چند لڑکوں کا اعتماد پاکر اُن سے بے تکلف ہوجاتی ہے تو باقی لوگ حسد کی بنا پر اُس لڑکی کے کردار کے ساتھ بے راہ روی کا اشتہار جوڑ دینا اپنا پیدائشی حق سمجھنے لگتے ہیں اور یہ حق تھوڑا آگے بڑھ کر ہماری آج کی سوسائٹی کا ایک المیہ بن گیا ہے۔ تمہارے کردار کے اِس المیے کا دوسرا سبب تمہارا حد سے زیادہ فیشن بھی تھا جسے تم نے زمانے کی نئی قدروں کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے لئے اپنا لیا تھا۔ شاید ایسا ہو بھی۔ لیکن میں اِن ساری باتوں سے دُور اپنے کسی اَدھورے خواب کی تکمیل میں کھو گیا تھا جہاں میری برسوں کی تلاش کے قدم تمہارے وجود کی پرچھائیوں پر ٹھہر گئے تھے ——— گھر آکر بھی وہ بہت دیر تک تمہارا ذکر کرتا رہا اور میں تمہارے اُس ذکر میں اپنی منزل کے نشان کو تلاش کرتا رہا۔

دوسرے دن تم کو ظہور کے یہاں آگئی تھیں۔ ابتدائی گفتگو کے بعد جب تم خود ہی کسی قدر بے تکلف ہوگئی تھیں تو میں نے بھی اجنبیت کے احساس کو پیچھے چھوڑ کر تمہارے ساتھ بات چیت کے وہ انداز اپنا لئے جن کی شاید تمہیں بھی توقع تھی۔ تاریخ کا اسکالر ہونے کی وجہ سے تمہاری دلچسپی صرف مغلوں کے فن تعمیر ہی میں نہ تھی بلکہ ہندوستان کے اُن قدیم مندروں اور مقبرہ خانقاہوں کے طرز تعمیر میں بھی تھی جن کے بارے میں تم نے کبھی کتابوں میں پڑھا ہوگا۔ میں نے تمہیں وہ سب کچھ بتا دیا جو دیکھا تھا سُنا تھا اُس دن ہمیں ایک دوسرے کے مزاق سے دلچسپی کو سمجھنے میں بالکل دیر نہ لگی اور یہیں ہمارے درمیان ماضی سے لیکر حال اور مستقبل تک کی باتوں کے سلسلے جُڑنے شروع ہوگئے تھے۔ میں نے تو محسوس کرلیا تھا شاید تم نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے قرُب کے پیاسے تھے اور اب قربت مِل گئی تھی تو اِن لمحوں کو ابدی بنانے کے لئے ہم گفتگو کے نئے نئے سہارے تلاش کرنے لگے تھے۔ ذرا سی دیر میں ہم نے بے شمار باتیں ایک دوسرے کے بارے میں معلوم کرلی تھیں۔ لیکن اُس بے تکلف اور خوشگوار ماحول میں باتیں کرتے کرتے جب اچانک تمہیں اپنی زندگی کی کوئی محرومی یاد آگئی تھی تو تم اُداس ہوگئی تھیں۔ پُورا ماحول اُداس ہوگیا تھا ساری فضا پر افسردگی چھاگئی تھی تب میں نے اِس افسردہ ماحول کو بدلتے ہوئے تم سے کہا تھا ———

"تم سے ملاقات ہونا میری خوش گوار یادوں میں ایک اضافہ ہے۔ لاہور

یہ بادل ابھی کھل کر نہ برسیں گے ——— شاید برس بھی جائیں۔

ابھی کچھ دیر پہلے بہت گھر کے آئے تھے۔ بادلوں کا گھر کے آنا اور پھر کھل کے برسنا مجھے بہت پسند ہے۔ اتنا ہی پسند جتنا یہ کمرہ، یہ کرسی اور میز! میں بھی اس میز کے سامنے اس کرسی پر بیٹھ کر میں نے تمہیں بے شمار خط لکھے ہیں۔ اس کرسی کو دیکھتے ہی ہمیشہ تم مجھے یاد آتی ہو۔ اب بھی یاد آگئی ہو اور میں بہت دیر سے تمہیں ایک خط لکھنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں ——— صرف ایک خط ——— آخری خط! آخری خط کتنے بوجھل ہیں یہ دو لفظ! کتنی جان لیوا ہے یہ سوچ! کیسا روح فرسا ہے یہ خیال! کیسا دلخراش ہے یہ تصور! جس میں اب میرے احساس کے کانٹوں کی چبھن کے سوا کچھ بھی تو باقی نہیں رہا۔

بادل پھر گھر آئے ہیں۔ ہو سکتا ہے برس ہی جائیں ——— جب بادل برس جاتے ہیں تو دھرتی کی پیاس بجھ جاتی ہے۔ لیکن کتنی برساتیں گزریں کیسے کیسے بادل برسے! میری پیاس کبھی نہ بجھی۔ بجھتی بھی کیسے ——— میں تو ماضی کے صحرا میں بھٹکتا ہوا وہ راہی بن گیا ہوں جس کے خوابوں کی تشنگی کو تمہاری یادوں کی شبنم کے قطرے ہی مل سکے جن کی نمی سے میری وہ تشنگی بھڑک تو گئی بجھ نہ سکی۔

میں قلم اٹھاتا ہوں اور پھر یہ سوچتا ہوں تمہیں کیا لکھوں ——— ؟

کیسے لکھوں؟ تمہارے بارے میں جب بھی سوچتا ہوں، ہمیشہ ہی خیالوں میں بہت سی ادھوری کہانیوں نے اپنے اختتام کی جستجو شروع کر دی ہے۔ میں کتنی ہی بار اس جستجو میں اپنا وجود گم کر چکا ہوں۔ لیکن یہ جستجو آج تک ختم نہ ہوئی اور نہ شاید کبھی ہو گی۔

تم یاد آتی ہو تو مجھے یہ بھی یاد آ جاتا ہے کہ تم سے پہلی ملاقات لاہور میں ہوئی تھی۔ ان دنوں کی بات ہے جب میں اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے ملنے کراچی گیا تھا۔ لاہور میں میرا دوست ظہور رہتا تھا۔ جس سے ملنے کی آرزو برسوں سے میرے دل میں مچل رہی تھی۔ اس کا اور میرا بچپن ایک گلی ایک محلے اور ایک ہی ماحول میں ساتھ گزرا تھا۔ لیکن ہم دونوں کے شعور نے دو الگ الگ راہوں سے گزر کر اپنی من چاہی منزلوں کو پایا تھا۔ جس دن کراچی سے میں لاہور پہنچا اتفاق سے اس کے کالج کی سلور جوبلی کا فنکشن تھا، جس میں اسٹیج ہونے والے شیکسپیئر کے ڈرامے "جولیس سیزر" کے ڈائریکشن کی تمام تر ذمہ داری اس کے سپرد تھی۔ وہاں اپنے کئی دوستوں کے ساتھ ہم خصوصی مہمانوں کی حیثیت سے اس فنکشن میں مدعو تھے۔ اس نے تم سے بھی میرا تعارف کرایا تھا۔ مجھے یاد ہے وہ تعارف رسمی سا ہی تھا، اور ہماری ابتدائی گفتگو کے نہ صرف جملے بلکہ ان کا ایک دوسرے سے جڑنے کا انداز بھی رسمی سا تھا۔ لیکن پھر بھی مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ تم کئی سال تک ظہور کی کلاس فیلو رہ چکی ہو اور کسی لیڈیز کالج میں تاریخ کی لیکچرار

ہو۔ ظہور سے قریب رہنے کی وجہ سے غائبانہ طور پر میرے تمام حالات سے واقف تھیں۔ میری زندگی کے حالات کے بارے میں بھی تمہیں بہت کچھ علم تھا۔ اپنی زندگی کے بارے میں کسی کو بھی اجنبی کی دلچسپی کا علم ہو جانے پر ہمارے دل میں ایک عجیب سی خوشی اور بڑے پن کا احساس ہوتا ہے۔ ایسا احساس جس میں اس اجنبی کو قریب سے جاننے کی خواہش کے ساتھ اس کے بارے میں اور بہت سی باتیں جاننے کا اشتیاق بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی کسی احساس کو ذہن کی گرفت میں چھپائے جب میں نے تم سے گفتگو کا آغاز کیا تو مجھے یہ جان کر دکھ ہوا تھا کہ تم وقت سے بہت پہلے اپنی ماں اور باپ کے سائے سے محروم ہو چکی ہو۔ حالات کے کسی بھی تاثر سے نہ ٹوٹنے والے رشتوں میں صرف تمہاری ایک بہن ہے جو اس وقت زیر تعلیم تھی۔

فنکشن شروع ہونے سے پہلے تم سے بہت کم دیر گفتگو ہو سکی۔ لیکن شاید یہ بات تمہیں معلوم بھی نہ ہو گی کہ اتنی ہی دیر میں تمہاری شخصیت نے میرے ذہن پر ایسا گہرا تاثر چھوڑ دیا تھا جو برسوں کی ملاقاتوں کے بعد بھی بعض شخصیتوں کے نصیب میں نہیں ہوتا۔ تمہارے نام اور چہرے میں کتنی مطابقت تھی، اس کا اندازہ تو صرف وہی کر سکتا ہے جس نے نہ صرف تمہیں دیکھا ہے بلکہ تمہارا نام بھی سنا ہے، تمہاری صورت درحقیقت تمہارے نام کا مکمل جواب تھی۔ تمہارا پورا نام شگفتہ جہاں تھا، لیکن تم سے قربت رکھنے والے تمہیں صرف "جہاں" کہتے تھے۔ تمہارا گفتگو کرنے کا انداز انتہائی سنجیدہ اور شائستہ تھا۔ دو تین جملے بولنے کے بعد تمہارے باریک ہونٹوں کے درمیان مسکراہٹ اور اس مسکراہٹ کے وقت سنگ مرمر کے موتیوں جیسے تمہارے خوبصورت دانت مجھے بہت اچھے لگے تھے۔ تمہارے چہرے پر دیومالائی دیوتاؤں کی روایتوں کا تقدس تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں آنکھوں میں قدیم بابل کے ویرانوں جیسی خاموشی تھی۔ جب میں بیکراں خاموشی میں ہمیشہ کے لئے ڈوب کر کھو جانے کی آرزو میں وہ تک میں نے جھانک کر دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہاں تمہاری زندگی کی بہاریں کسی شاہراہ قافلے اپنا راستہ بھٹک گئے ہیں۔ میں اس پہلی ملاقات میں تم سے بہت سی طویل باتیں کرنے کا خواہش مند ہو گیا تھا۔ لیکن ساتھ ہی تمہارے چہرے کے ابھرتے ڈوبتے تاثرات سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا جیسے تم مجھ سے اس اچانک ملاقات کے ہونے پر کسی قدر نروس ہو گئی ہو۔

فنکشن کے اختتام پر رات زیادہ بیت گئی اور تم سے مزید گفتگو نہ ہو سکی تھی۔ تم ڈرامے میں "سیزر" کے کردار کی غیر معمولی کامیابی پر ظہور کو کامیاب ڈائریکشن کی مبارکباد دے کر اپنے گھر چلی گئیں۔

راستے میں تمہارا ذکر کرتے ہوئے اس دن ظہور نے مجھے بتایا تھا

تم ہی تھا بالطبیعت اور کسی سے جلد بے تکلف ہو جانے کی فطرت کی وجہ سے اپنی کالج لائف میں مختلف عنوان سے کافی مشہور رہ چکی ہو۔ یہی وجہ تھی کہ بعض تم سے قربت رکھنے والے بھی تمہارے بارے میں کوئی مستقل رائے نہ رکھتے تھے۔ آتنا بتانے کے بعد وہ یہ وضاحت بھی کرنے لگا تھا کہ تمہاری کسی بھی لغزش کو اُس نے کبھی سُنا تھا اور نہ آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اُس کی نظر میں تمہارا کردار لائقِ پرستش تھا۔ دلائل کی روشنی میں وہ یہ بھی بتا رہا تھا کہ اکثر یوں بھی ہوتا ہے جب کوئی لڑکی اپنے معاشرے کی حدود سے ذرا سا باہر نکل کر ترقی پسند ہونے کی کوشش کرتی ہے یا پھر اِرد گرد کے چند لوگوں کا اعتماد پاکر اُن سے بے تکلف ہو جاتی ہے تو باقی لوگ حسد کی بنا پر اُس لڑکی کے کردار کے ساتھ بے راہ روی کا اشتہار جوڑ دینا اپنا پیدائشی حق سمجھنے لگتے ہیں اور یہ حق تھوڑا آگے بڑھ کر ہماری آج کی سوسائٹی کا ایک المیہ بن گیا ہے۔ تمہارے کردار کے اِس المیے کا دوسرا سبب تمہارا حد سے زیادہ فیشن بھی تھا جسے تم نے زمانے کی نئی قدروں کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے لئے اپنا لیا تھا۔ شاید ایسا ہو بھی۔ لیکن میں اِن ساری باتوں سے دُور اپنے کسی اَدھورے خواب کی تکمیل میں کھو گیا تھا جہاں بہاری برسوں کی تلاش کے قدم تمہارے وجود کی پرچھائیوں پر ٹھہر گئے تھے ——— پھر آخر کب وہ بہت دیر تک تمہارا ذکر کرتا رہا اور میں تمہارے اُس ذکر میں اپنی منزل کے نشان کو تلاش کرتا رہا۔

دوسرے دن صبح کو تم ظہور کے یہاں آگئی تھیں۔ ابتدائی گفتگو کے بعد جب تم خود ہی کسی قدر بے تکلف ہو گئی تھیں تو میں نے بھی اجنبیت کے احساس کو کچھ چھوڑ کر تمہارے ساتھ بات چیت کے وہ انداز اپنا لئے جن کی شاید تمہیں بھی تمنا تھی۔ تاریخ کا اسکالر ہونے کی وجہ سے تمہاری دلچسپی صرف مغلوں کے فنِ تعمیر میں ہی نہ تھی بلکہ ہندوستان کے اُن قدیم مندروں اور خانقاہوں کے طرزِ تعمیر میں بھی تھی جن کے بارے میں تم نے کبھی کتابوں میں پڑھا ہوگا۔ میں نے تمہیں وہ سب کچھ بتایا جو دیکھا تھا، سُنا تھا۔ اُس دن ہمیں ایک دوسرے کے مزاج اور دلچسپی کو سمجھنے میں بالکل دیر نہ لگی اور یوں ہمارے درمیان ماضی سے لے کر حال اور مستقبل تک کی باتوں کے سلسلے جُڑنے شروع ہو گئے تھے۔ میں نے تو محسوس کر لیا تھا شاید تم نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے قُرب کے پیاسے تھے اور اب قُربت مِل گئی تھی تو اِن لمحوں کو ابدی بنانے کے لئے ہم گفتگو کے نئے نئے سہارے تلاش کرنے لگے تھے۔ ذرا سی دیر میں ہم نے بے شمار باتیں ایک دوسرے کے بارے میں معلوم کر لی تھیں۔ لیکن اُس بے تکلف اور خوشگوار ماحول میں باتیں کرتے کرتے جب اچانک تمہیں اپنی زندگی کی کوئی محرومی یاد آگئی تھی تو تم اُداس ہو گئی تھیں۔ پورا ماحول اُداس ہو گیا تھا ساری فضا پر افسردگی چھا گئی تھی تب میں نے اِس افسردہ ماحول کو بدلتے ہوئے تم سے کہا تھا ———

"تم سے ملاقات ہونا میری خوش گوار یادوں میں ایک اضافہ ہے۔ لاہور

[illegible]

یہ بادل یونہی گھل کر برستے رہیں گے ——— شاید برس بھی جائیں۔

ابھی کچھ دیر پہلے بہت گھر کے آئے تھے۔ بادلوں کا گھر کے آنا اور پھر کھل کے برسنا مجھے بہت پسند ہے۔ اتنا ہی جتنا پسند تھا یہ کمرہ، یہ کرسی اور میز! یوں بھی اس میز کے سامنے اس کرسی پر بیٹھ کر میں نے تمہیں بے شمار خط لکھے ہیں۔ اس کرسی کو دیکھتے ہی ہمیشہ تم مجھے یاد آتی ہو۔ اب بھی یاد آ گئی ہو اور میں بہت دیر سے تمہیں ایک خط لکھنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں ——— صرف ایک خط ——— آخری خط! آخری خط کتنے بوجھل ہیں یہ دو لفظ! کتنی جان لیوا ہے یہ سوچ! کیسا روح فرسا ہے یہ خیال! کیسا دلخراش ہے یہ تصور — ! جس میں اب میرے احساس کے کانٹوں کی چبھن کے سوا کچھ بھی تو باقی نہیں رہا۔

بادل پھر گھر آئے ہیں۔ ہو سکتا ہے برس ہی جائیں ——— جب بادل برس جاتے ہیں تو دھرتی کی پیاس بجھ جاتی ہے۔ لیکن کتنی ہی باتیں گزر گئیں کیسے کیسے بادل برسے! میری پیاس کبھی نہ بجھی۔ بجھتی بھی کیسے ——— میں تو مانی کے صحرا میں بھٹکتا ہوا وہ راہی بن گیا ہوں جس کے خوابوں کی تشنگی کو تمہاری یادوں کی شبنم کے قطرے نہ مل سکے جن کی نمی سے میری وہ تشنگی بھڑک تو گئی بجھ نہ سکی۔

میں قلم اٹھاتا ہوں اور پھر یہ سوچتا ہوں تمہیں کیا لکھوں ———؟ کیسے لکھوں! تمہارے بارے میں جب بھی سوچتا ہوں، ہمیشہ ہی خیالوں میں بہت سی ادھوری کہانیوں نے اپنے اختتام کی جستجو شروع کر دی ہے۔ میں کتنی ہی بار اس جستجو میں اپنا وجود گم کر چکا ہوں۔ لیکن یہ جستجو آج تک ختم نہ ہوئی اور نہ شاید کبھی ہو گی۔ تم یاد آتی ہو تو مجھے یہ بھی یاد آ جاتا ہے کہ تم سے پہلی ملاقات لاہور میں ہوئی تھی۔ ان دنوں کی بات ہے جب میں اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے ملنے کراچی گیا تھا۔ لاہور میں میرا دوست ظہور رہتا تھا۔ جس سے ملنے کی آرزو برسوں سے میرے دل میں مچل رہی تھی۔ اُس کا اور میرا بچپن ایک گلی ایک محلے اور ایک ہی ماحول میں ساتھ گزرا تھا۔ لیکن ہم دونوں کے شعور نے دو الگ الگ راہوں سے گزر کر اپنی من چاہی منزلوں کو پایا تھا۔ جس دن کراچی سے میں لاہور پہنچا اتفاق سے اُس کے کالج کی سلور جوبلی کا فنکشن تھا، جس میں اسٹیج ہونے والے شیکسپیئر کے ڈرامے "جولیس سیزر" کے ڈائریکشن کی تمام تر ذمہ داری اُس کے سپرد تھی۔ وہاں اپنے کئی دوستوں کے ساتھ ہم خصوصی مہمانوں کی حیثیت سے اُس فنکشن میں مدعو تھے۔ اُس نے تم سے بھی میرا تعارف کرایا تھا۔ مجھے یاد ہے وہ تعارف رواجی سا ہی تھا، اور ہماری ابتدائی گفتگو کے نہ صرف جملے بلکہ اُن کا ایک دوسرے سے کہنے کا انداز بھی رسمی سا تھا۔ لیکن پھر بھی مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ تم کئی سال تک ظہور کی کلاس فیلو رہ چکی ہو اور کسی لیڈیز کالج میں تاریخ کی لیکچرار ہو۔ ظہور سے قریب رہنے کی وجہ سے تم شاید [illegible] میری زندگی کے حالات کے بارے میں بھی تھوڑا بہت [illegible] بارے میں کسی کو بھی اجنبی کی دلچسپی کو جاننے کا [illegible] بڑے پن کا احساس ہوتا ہے ایسا احساس جس میں اُس [illegible] کے ساتھ اُس کے بارے میں اور بہت سی باتیں جاننے کا [illegible] ویسے ہی کسی احساس کو کہ جو کی گرفت میں [illegible] پھر جب میں نے تم [illegible] کیا تو مجھے یہ جان کر دکھ ہوا تھا کہ تم وقت سے بہت پہلے اپنی ماں اور باپ کے سائے سے محروم ہو چکی ہو۔ حالات نے کسی بھی تاثر کے نہ ٹوٹنے والے رشتوں میں صرف تمہاری ایک بہن ہے جو اُس وقت زیرِ تعلیم تھی۔

فنکشن شروع ہونے سے پہلے تم سے بہت کم دیر گفتگو ہوئی لیکن شاید یہ بات تمہیں معلوم بھی نہ ہو گی کہ اتنی ہی دیر میں تمہاری شخصیت نے میرے ذہن پر ایسا گہرا تاثر چھوڑ دیا تھا جو برسوں کی ملاقاتوں کے بعد بھی [illegible] کے نصیب میں نہیں ہوتا۔ تمہارے نام اور چہرے میں کتنی مطابقت تھی یہ [illegible] تو صرف وہی کر سکتا ہے جس نے نہ صرف تمہیں دیکھا ہے بلکہ تمہارا نام بھی سنا ہے۔ تمہاری صورت درحقیقت تمہارے نام کا عکس ہو بہو تھی۔ تمہارا پورا نام [illegible] جہاں تھا، لیکن تم سے قربت رکھنے والے تمہیں صرف "مہ جہاں" کہتے تھے۔ تمہارا گفتگو کرنے کا انداز نہایت سنجیدہ اور شائستہ تھا۔ وہ تمہیں جملے بولنے کے بعد تمہارے باریک ہونٹوں کے درمیان شگفتہ سی مسکراہٹ کے وقت سنگِ مرمر کے موتیوں جیسے تمہارے خوبصورت دانت بہت اچھے لگتے تھے۔ تمہارے چہرے پر دیو مالائی دیوتاؤں کی روایتوں کا تقدس چھایا ہوا تھا لیکن نہ جانے کیوں آنکھوں میں قدیم مالا کے دیوانوں جیسی خاموشی تھی جیسے بکھری ہوں خاموشی میں ہمیشہ کے لئے ڈوب جانے، کھو جانے کی آرزو میں۔ وہ میں نے جب تمہیں غور سے دیکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے تمہاری زندگی کی [illegible] کے بے شمار قافلے اپنا راستہ بھٹک گئے ہیں۔ میرے دل میں پہلی بار [illegible] بہت سی طویل باتیں کرنے کی خواہش پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن ساتھ ہی تمہارے چہرے کے ابھرتے ڈوبتے تاثرات سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا جیسے تم [illegible] اچانک ملاقات کے ہونے پر کسی قدر نروس ہو گئی ہو۔

فنکشن کے اختتام پر بات زیادہ دیر تک [illegible] نہ ہو سکی تھی۔ تم ڈرامے میں "سیزر" کے کردار کی [illegible] کامیاب ڈائریکشن کی مبارکباد دے کر اپنے گھر جا چکی تھیں۔

راستے میں تمہارا ذکر کر کے میرے اُس [illegible]

[illegible] سے [illegible]
[illegible] بہت [illegible]
[illegible] ۔ یہی وجہ تھی کہ [illegible] تم سے [illegible]
[illegible] اب تک [illegible] مستقل [illegible]
[illegible] ۔ تم بتا نہ سکے [illegible] دست [illegible]
[illegible] سنجیدگی شرافت اور
آنکھیں [illegible] تمہارا کردار [illegible]
پرستش تھا۔ [illegible]
[illegible] ہوتا ہے جب کوئی لڑکی اپنی معاشرت کی حدود
سے نکل کر ترقی پسند بننے کی کوشش کرتی ہے یا
پھر [illegible] کے چند لوگوں [illegible] سے [illegible]
[illegible] کی بنا پر اس لڑکی کے کردار کے ساتھ
[illegible] اشتہار [illegible] اپنا پیدائشی حق سمجھنے لگتے
ہیں اور یہی [illegible] آج کی سوسائٹی کا
ایک المیہ بن گیا ہے۔ تمہارے کردار کے ایسے [illegible] کا دوسرا
سبب تمہارا حد سے زیادہ فیشن بھی تھا جسے تم نے زمانے
کی نئی قدروں کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے لیے اپنا لیا تھا
شاید [illegible] ۔ لیکن [illegible] ساری باتوں سے [illegible] اپنے
کسی [illegible] خواب [illegible] میں [illegible]
[illegible] تلاش کے [illegible] تمہارے وجود [illegible]
[illegible] ——— [illegible]
[illegible] تمہارے اس ذکر میں اپنی منزل کے
نشان [illegible] تلاش کرتا رہا۔

دوسرے [illegible] کو تم ظہور کے یہاں آئی تھیں۔ ابتدائی گفتگو
کے [illegible] بے تکلف ہو گئی تھیں تو میں نے بھی اجنبیت کے احساس
[illegible] تمہارے ساتھ باتیں [illegible] وہ انداز اپنا لیا جس کی شاید تمہیں
[illegible] آرٹ کا اسکالر ہونے کی وجہ سے تمہاری دلچسپی صرف ناولوں کے
[illegible] ناقدوں کے
[illegible] کے بارے میں تم نے [illegible] پڑھا ہوگا۔ میں نے
[illegible] ایک دوسرے کے مذاق
[illegible] ماضی سے لے کر حال

اور مستقبل تک کی باتوں کے سلسلے جڑنے شروع ہو گئے تھے۔ میں نے تو محسوس
کر لیا تھا شاید تم نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے قرب کے
پیاسے تھے اور اب قربت مل گئی تھی تو ان لمحوں کو ابدی بنانے کے لئے ہم گفتگو کے
نئے نئے سہارے تلاش کرنے لگے تھے۔ ذرا سی دیر میں ہم نے بے شمار باتیں ایک
دوسرے کے بارے میں معلوم کر لی تھیں۔ لیکن اس بے تکلف اور خوشگوار ماحول
میں باتیں کرتے کرتے جب اچانک تمہیں اپنی زندگی کی کوئی محرومی یاد آگئی تھی تو تم
اداس ہو گئی تھیں۔ پھر ماحول اداس ہو گیا تھا ساری فضا پر افسردگی چھا گئی تھی
تب میں نے اس افسردہ ماحول کو بدلتے ہوئے تم سے کہا تھا ———
"تم سے ملاقات ہونا میری خوش گوار یادوں میں ایک اضافہ ہے۔ لاہور

اگر تم سے میری ملاقات نہ ہوتی تو شاید میرا یہ سفر انتہائی غیر دلچسپ ہو کر رہ جاتا۔"
میرے ان احساسات کی ترجمانی کے جواب میں تم نے فلسفیانہ انداز میں بتلایا تھا۔
"بعض خواہشیں بھی عجیب سی ہوتی ہیں جن کا نہ کوئی نام ہوتا ہے اور تصور لیکن وہ وقت کے کسی بھی تاثر سے دل میں جنم لیتی ہیں اور بغیر کسی جدوجہد کے پوری بھی ہو جاتی ہیں۔ ایسی کسی بھی خواہش کی تکمیل سے روح کو بہت سکون نصیب ہوتا ہے۔ مجھے نہ جانے کیوں آپ سے مل کر ایسے ہی سکون کا احساس ہو رہا ہے"
چند لمحے خاموش رہ کر تم نے پھر یہ بھی کہا تھا ——————
"آپ سے ملاقات کی آرزو اسی دن میرے دل میں پیدا ہو گئی تھی جب ظہور صاحب نے آپ کا ایک خط مجھے پڑھنے کے لئے دیا تھا۔ اس خط میں آپ کی تحریر کا انداز اور اس میں بسی ہوئی یاسیت مجھے بے حد پسند آئی تھی۔ آپ کے حالات نہ

- ماں باپ تیری جنت ہیں اگر تو نے انھیں راضی کر لیا۔ ماں باپ دوزخ ہیں اگر وہ تجھ سے ناراض ہیں۔
(سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- حاسد تمہاری خوشی سے غمگین ہوتا ہے۔ یہ اس کے لئے کافی ہے۔ (تمہیں انتقام کی ضرورت نہیں، وہ خود اپنی آگ میں جل رہا ہے۔)
(حضرت عثمان غنی رضؓ)
- بخیل اور دے کر احسان جتانے والا، یہ سب جنت سے محروم ہیں۔
(سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- صدق امانت ہے اور کذب خیانت۔ (حضرت ابو بکر صدیق رضؓ)

جانے کیوں مجھے اپنے ہی درد کی آواز محسوس ہونے لگے تھے، یا پھر ان دنوں میرے اور آپ کے دکھ کسی ایک مرکز پر آ کر مل گئے تھے۔ آپ سے ملنے کی میں دل میں صرف آرزو ہی رکھ سکتی تھی۔ لیکن یہ میرے تصور میں بھی نہ تھا کہ ایک دن یوں آپ سے ملاقات بھی ہو جائے گی اور اب ملاقات ہو گئی ہے تو میں نہ جانے کیوں اپنی بہت سی محرومیاں کو بھول گئی ہوں۔ میری دلی خواہش ہے کہ مستقبل میں یہ ملاقات ہمیں قریب سے قریب تر کرتی رہے۔"
"خدا کرے مقصد ہمیشہ نیک رہے" میں نے گفتگو میں شوخی کا رنگ بھرنے کی خواہش میں مختصر سا جواب دے کر تمہارے ماتھی پر ہلکی سی چوٹ کر دی تھی۔ ان لمحوں میں یکلخت تمہارے چہرے پر حیا کی سرخی و دلگیری تھی اور بہت گمبھیر لہجے میں تم نے کہا تھا۔ "مرد بھی عجیب ہوتے ہیں کسی بھی ذہنی آسودگی یا وقتی مصلحت کی بنا

پر جب کوئی عورت ان سے ذرا بھی بے تکلف ہو جاتی ہے تو [illegible] نہ کوئی مشکوک پہلو ڈھونڈ لیا جاتا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ [illegible] روایتی انداز میں رشتہ نہ جوڑ کر اس کا دوست جیسا کر دار [illegible]
حیرت نہیں کہ آپ نے بھی اسی معیار سے الگ نہیں سوچا۔"
یہ کہتے کہتے تمہاری آواز جذبات میں ڈوب گئی تھی اور میں [illegible] گوئی سے متاثر ہو کر تمہاری عقیدت کی گہرائیوں میں ڈوب گیا تھا۔ [illegible] جب ان گہرائیوں سے ابھر کر میں خیالوں کی سطح پر آیا تو تمہارا [illegible] میرے ذہن میں آ چکا تھا ——————— اگرچہ تمہاری باتوں میں نہ [illegible] تھا نہ ہی لہجے میں کوئی تلخی تھی، صرف ایک جواب تھا یا پھر تمہارے [illegible] تھا جس نے تمہیں یہ دو رائے پیش کرنے کی بخشش دی تھی۔ پھر بھی میں [illegible] تنقید کا جواب دینے کے لئے میں نے تمہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔
"بس جاناں! چاہنے اور چاہے جانے کا جذبہ انسان کی [illegible] سے ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وقت کے تقاضوں کے تحت ان جذبوں [illegible] کر انہیں رشتوں میں باندھ لیا جاتا ہے۔ بات صرف سوچ اور سمجھ کی ہے۔"
میرے جواب سے تمہاری وہ تنقید ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گئی تھی اور میں پھر جواب کے انتظار میں تمہاری طرف دیکھنے لگا تھا۔ شاید میری باتوں کی گہرائی میں ڈوب کر اس وقت تمہارے ہونٹوں کی سطح پر بہت پیاری مسکراہٹ کی لکیر ابھر آئی تھی اور تم نے شکست کا اعتراف کرتے ہوئے ہنس کر کہا تھا۔
"وسیم صاحب! آپ کی ذہانت کی تو میں پہلے ہی معترف تھی۔ لیکن آج حاضر جوابی کی بھی قائل ہو گئی ہوں!" پہلی بار تمہارے [illegible] مجھے انتہائی اپنے پن کا احساس ہوا تھا۔
"شکریہ! ویسے نوازش ہے آپ کی!" میں نے جواب میں کہا [illegible] ملکر ہنس پڑی تھیں اور پھر میں بھی ہنسنے لگا تھا۔
تب اپنی کسی دوست کے یہاں [illegible] کی سالگرہ [illegible] تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد تم چلی گئی تھیں۔
اس کے برعکس سڑک پر تمہارے [illegible]
دن تم نے شام کے کھانے پر مجھے مدعو کیا تھا۔ اس [illegible] شامل ہو گئی تھی۔ تم نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا تھا [illegible] کا بھرپور اعتماد حاصل کرنے کے بعد بتایا تھا [illegible] کی کچھ ایسی ناقابلِ فراموش یادیں [illegible] شیئر کرنا چاہتی تھیں۔ اس دن تم نے اپنے [illegible]

کہ ہوتا تو یہ احساس ہوتا کہ محبت میری اپنی ملکیت ہے — جب کہ [illegible] سے
[illegible] نے اپنے ساتھ ہی [illegible]
[illegible] کے لئے میں جب بھی [illegible]
[illegible] کے سلسلے میں [illegible]
[illegible] تم سے بھی [illegible] کی دل میں شدید آرزو تھی لیکن اُس آرزو کی تکمیل [illegible] کی خرابی نے مشکل میں بدل دیا تھا۔ مجھے امید نہ رہی تھی کہ تم ایسے حالات میں مجھے [illegible] گی۔ تم نے بتایا کہ تم بہت [illegible] واقف۔ کر رہی تھیں ——— [illegible] نہیں [illegible] ہوں [illegible] شاید کبھی بھول سکوں، جب [illegible] میں [illegible] ہونے لگا تھا تو تمہارے وجود پر اداسی چھا گئی تھی [illegible] آنکھوں میں تمہارے آنسوؤں کی نمی کو میں نے دیکھ لیا تھا۔ جدائی کی [illegible] ساعتوں میں تم نے سب سے زیادہ یہ یاد کرانے کی کوشش کی تھی کہ [illegible] گزرے ہوئے وقت کا ہر لمحہ تمہاری زندگی کی [illegible] یاد بن کر [illegible] کو خوشیوں کی نوید سناتا رہے گا۔

اُس کے بعد تم سے میں پھر کبھی نہ مل سکا ——— اور مستقبل میں بھی [illegible] کا امکان باقی رہ گیا ہے۔ تمہاری ذات سے وابستہ میری یادوں کا [illegible] چند ملاقاتوں پر ختم نہیں ہو جاتا۔ اُس کے آگے ایک موڑ اور [illegible] ہے جو تمہارے بے شمار خطوط کی پگڈنڈی کی طرف مڑ جاتا ہے۔ تمہارے خطوط کی [illegible] پگڈنڈی میرے خیال کے تصور کو اُس وقت نصیب ہوئی جب میں گھر آ گیا تھا [illegible] کئے ہوئے وعدے کے مطابق تمہارا پہلا خط مجھے ملا تھا۔ تمہارے اُس پہلے خط میں [illegible] خیریت کی طلب تھی اور اُس طویل سفر کے تاثرات کی مانگ تھی [illegible] تمہاری [illegible] کی خوشیوں [illegible] اور تم سے کئے گئے عہد و پیمان کا اقرار [illegible] کا تفصیل سے جواب دیا اور تمہاری رفاقت میں بیتے ہوئے ہر [illegible] یاد کو دہرایا۔

تمہارا [illegible] آیا ——— میں نے پھر جواب دے دیا۔

[illegible] تمہارے خط کی عبارت میرے لئے تمہاری شخصیت سے بھی زیادہ [illegible] ثابت ہونے لگی۔ وہ یوں کہ ذاتی باتوں کے علاوہ [illegible] کے کسی [illegible] کا انتہائی دلچسپ انداز میں [illegible] [illegible]

خط لکھتے وقت تمہارے قلم سے انتہائی پُر لطف [illegible] جاتی تھیں ——— خط لکھنے کے [illegible] سے تمہیں پوری واقفیت تھی اور اُس واقفیت میں تمہارا ادبی ذوق اور سلیقہ ہمیشہ پیش پیش رہتا تھا۔

تمہارے خط آتے رہے اور میں اُن کے جواب دیتا رہا اور پھر ——— یوں بھی خط و کتابت کے سلسلے پابندی کی زنجیروں میں جکڑے چلے گئے۔ تمہارے ہر خط میں [illegible] ان خلوص اور اپنائیت کے جذبوں نے میرے دل کے نہاں خانوں میں تمہاری ذات کے لئے عقیدتوں کے بے شمار حصار بنا دیئے جن کے [illegible] میں نے تمہارے بارے میں اور بھی زیادہ سوچنا شروع کر دیا۔ میری خوابیدہ سوچوں میں میرے اُلجھے ہوئے جذبات مچل گئے جن کے [illegible] کا سہارا پا کر میرے خط کی عبارت کے الفاظ کو محبت کے ادبی نقوش سے ہم کنار ہونا پڑا۔ تمہارے احساس کی صداقت نے جب [illegible] کی [illegible] کے ترنم کو تمہارے دل نے اپنے ہی

- ہم کاہلوں کو نہیں چاہتے۔ (جواہر لال نہرو)
- میں چاہتا ہوں کام! کام!! کام!!! (جواہر لال نہرو)
- کسی کا دل دُکھانا سب سے بڑا پاپ ہے۔ (مہاتما بُدھ)
- سب سے بڑا دھن نیکی ہے۔ (شری کرشن جی)
- سب سے مدھر بانی سچی بات ہے۔ (شری کرشن جی)
- خدا سب سے بڑی صداقت ہے۔ (حضرت بابا گرو نانک)
- عمل وہ آئینہ ہے جو ہماری صورت ہمیں دکھاتا ہے اِس لئے ہمیں عمل کا احساس ہونا چاہئے۔ (شری ونوبا جی)
- تنہائی میں بھی ہم کب تنہا ہوتے ہیں۔ (بائرن)

دل کی دھڑکنوں کا ساز بخش دیا اور پھر زمان و مکان کی اُن مقدس فضاؤں میں ایک ایسے ابدی محبت کی لے شروع ہو گئی جس کی طرف گنگناہٹ پر تمہارا دل اور میرا دل بھی دھڑکنے لگا۔ دل کے اُن گیتوں کی لے اور اُن کی ہم آہنگی نے ہمارے ارادوں کو یقین میں بدل دیا اور پھر ہم نے اپنے مستقبل کی کھنڈروں کو رفاقت کے آسمان کی ایسی رفعتوں پر پہنچنے کا منصوبہ بنایا جہاں تمہارا وجود میرے لئے تھا اور میرا وجود تمہارے لئے [illegible] کہانی کے اختتام سے بے خبر ہو کر ہم اپنے راستوں میں آنے والے تاریک موڑوں کو بھول گئے۔

منزل ابھی دور تھی ——— کہ اچانک خیالوں کی کہکشاں سے میرا پاؤں پھسل گیا اور میں حقیقت کی اُس پستی میں جا گرا جہاں سے میں نے تمہاری منزل کو پہنچنے کے [illegible] ایک خط [illegible] اس

سے اپنی زندگی کے لئے تمہارے ہر خیال، ہر ایک سوچ اور ہر ایک ارادہ کو مجھ سے ہمیشہ کے لئے الگ کر دیا۔ میں تمہیں کبھی یہ نہ لکھ سکا اور نہ کبھی لکھوں گا کہ اُس خط کو پاکر جب میں نے تمہارے بارے میں سوچا تو میرے سامنے دو ملکوں کی طویل سرحدوں کے علاوہ ظہور کی زندگی بھی تھی جو مجھے تم سے زیادہ عزیز تھی۔ اس لئے میں نے یہی بہتر سمجھا کہ میں اپنے سفر کی اُس دوپہر کو شکست خوردہ منزل کی شام میں بدل دوں اور تم سے وابستہ ہر حقیقت، ہر تصور اور ہر یاد کو دل کے قید خانوں میں ہمیشہ کے لئے منتقل کر کے تمہیں بھول جاؤں۔ اس لئے میں نے اپنا آخری فیصلہ اپنے عزیز دوست کے لئے قربانی کے ہاتھوں میں دے کر ایک اچھے دوست کی حیثیت سے تمہیں پھر خط لکھنے لگا۔ میں پھر بھی تمہیں خط لکھتا رہا اور تمہارے خط پھر بھی مجھے ملتے رہے۔ لیکن کچھ ہی دن گزرنے کے بعد پھر یوں بھی ہوا کہ تمہارے خطوط کی عبارت کے دائروں میں اچانک ایک پروفیسر کا چہرہ اُبھرا جو جوان تھا، خوبصورت تھا جس کی کشادہ پیشانی صرف ذہین ہی ہونے کی غماز نہ تھی جس کی پیاسی آنکھوں میں تمہاری بے پناہ چاہت کی قندیلیں روشن تھیں اور جن کی تابانی بھی تمہارے ہی خواب دیکھنے کی منتظر تھی۔ حال کے ان تابناک اُجالوں میں گم ہو کر جب تم نے اپنے کھوئے ہوئے مستقبل کی طرف نظر کی تو وہ تمہاری ہر تمنا کا جواب لئے ایک نئے اور حسین موڑ پر تمہارا منتظر تھا۔ تمہاری فکرِ جمیل سے ترشے ہوئے اس شہزادہ نے جیسے ہی تمہارے دل کی راجدھانی کو جیتنے کی آرزو میں تمہاری سوچوں کی شہر پناہ کے دروازہ پر دستک دی، تمہارے احساس کی شدت نے اُس آواز کی بازگشت کو پہچان لیا اور پھر تم نے اپنی سوچوں کا دروازہ کھول دیا اور اُس کے وجود کی پرچھائیوں کو اپنی، چاہتوں میں ہمیشہ کے لئے سمیٹ لیا۔ تم زندگی کی طویل راہ گزاروں کا سفر طے کرنے کے لئے کسی من چاہے ہم سفر کی متلاشی بن گئی تھیں، اور وہ ہم سفر خود ہی تمہاری تلاش میں تمہارے قریب آپہنچا تھا۔ تمہاری مسرتوں کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اُن دنوں تمہارے خطوط کی عبارت میں پھر ایک بار پیار کی ایک ایسی کہانی شروع ہو گئی جس کا آغاز بھی قہقہوں سے ہوا تھا اور جس کا اختتام بھی شاید قہقہوں پر ہی ہونا تھا۔

اُس کے بعد تمہارے خطوط میں نہ کالج کے واقعات رہے نہ کسی فنکشن کا آنکھوں دیکھا حال باقی رہا۔ صرف اِس پروفیسر کا وجود تمہارے ہر خط کی عبارت کا مرکز بن کر رہ گیا۔ اُن دنوں تمہارے آنے والے خطوط اپنی عبارت میں کبھی تو پورے چاند کی راتوں میں اُس پروفیسر کے ساتھ راوی پر تمہاری بوٹنگ کی کہانیاں کہتے، کبھی شالیمار گارڈن میں تمہاری اور اُس کی پکنک کے تذکرے سناتے؛ اور اگر اُن میں یہ سب کچھ نہ ہوتا تھا تو جہانگیر اور نور جہاں کے مقبروں کی خاموش محرابوں میں محبت میں کئے گئے عہد و پیمان ہوتے تھے۔ مجھے تمہاری ذات سے جو وابستگی ہو گئی تھی، اُس کی حدود میں رہ کر تمہارے مستقبل کے بارے میں جو کچھ میں سوچ سکتا تھا سوچ چکا تھا۔ میری حیثیت اب ایک تماشائی جیسی بن گئی تھی۔ اس سے آگے تمہارے لئے میں کچھ بن سکتا تھا نہ کچھ بننے کی آرزو ہی رہ گئی تھی۔ مجھے دکھ بھی تھا اور خوشی بھی ——— خوشی اس بات کی تھی کہ تمہاری طوفان میں پھنسی ہوئی کشتی کی طرح زندگی کو ایک پُرسکون ساحل مل گیا تھا، اور دکھ تو صرف اِس بات کا کہ ظہور نے میری شدید خواہش کے باوجود اِس سلسلے میں پھر کبھی کوئی خط مجھے نہ لکھا۔ نہ جانے کس مصلحت کی بنا پر تم نے بھی اپنے کسی خط میں کوئی وضاحت نہ کی ——— اور تمہاری وضاحت کی ضرورت بھی کیا تھی۔ ؟

مجھے یقین تھا کہ وہ پروفیسر میرا دوست ظہور ہی ہو سکتا ہے جس کا جمالیاتی شعور تمہیں اپنی پسند کی معراج بنا کر عمر بھر کے لئے تمہارا ہو جانے کی خواہش کی تکمیل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ تم نے بھی ایک طویل گفتگو کے دوران اپنی زندگی کی ہر تاریکی اور روشنی کو میرے سامنے پھیلا دیا تھا۔ میری نگاہوں نے اُس تاریکی یا روشنی میں کسی کو بھی تمہاری تلاش میں بھٹکتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ تمہاری تنہائیوں میں ہلچل مچانے والے یہ نئے قدم میرے دوست ظہور کے علاوہ کسی اور کے نہیں ہو سکتے تھے۔

تمہاری ملاقاتوں سے شروع ہونے والی یادوں کی یہ شاہراہ اور اِس شاہراہ کا موڑ اور اُس موڑ سے شروع ہونے والی پگڈنڈی بس یہاں آکر ختم ہو جاتی ہے۔

یہ چند سال پہلے کی بات تھی ——— !!

اور یہ چند دن پہلے کی بات ہے ——— !! اچانک مجھے تمہاری شادی کا دعوت نامہ ملا۔ تمہارے ملک سے میرے ملک کے براہِ راست ڈاک کے راستے بند ہیں۔ اِس لئے یہ کارڈ بحرین ہو کر میرے پاس آیا ہے اور آج بھی میری میز پر رکھا ہے۔ میں اُس وقت حیرت میں ڈوب گیا تھا اور اِس وقت بھی حیرت میں ڈوبا ہوا ہوں ——— شادی کے اِس کارڈ پر تمہارے نام کے ساتھ ظہور کا نام کیوں نہیں ہے؟

پروفیسر مشکور شوق کا نام کیوں ہے؟

یہاں تک سوچنے کے بعد نہ جانے کیوں میری سوچیں ساکت ہو جاتی ہیں۔ باہر بادل برس رہے ہیں ——— شاید کھُل کر برس رہے ہیں اور میں آج شدید خواہش کے باوجود تمہیں کوئی خط نہیں لکھ رہا ہوں اور نہ شاید اب کبھی لکھ سکوں گا۔ نہ جانے کیوں ——— ؟

غزل

پروفیسر بیتاب پیلی بھیتی ایم۔ اے (علیگ)

نظریں ہم پہچان رہے ہیں
دل کی باتیں جان رہے ہیں

ریت کو پھر ہم چھان رہے ہیں
جھوٹ کو پھر سچ جان رہے ہیں

آپ کی دل جوئی کی خاطر
آپ کا کہنا مان رہے ہیں

دور رہے آنکھوں سے لیکن
دل میں تو مہمان رہے ہیں

آپ تصور کی دنیا میں
ہر لمحہ ہر آن رہے ہیں

پاتے رہے یہ مجبوری مجھ کو
جان کے بھی انجان رہے ہیں

آپ کو سن کر حیرت ہوگی
آپ کو ہم پہچان رہے ہیں

میں نے تو اک بات کہی ہے
آپ برا کیوں مان رہے ہیں

کتنے ارماں میرے دل میں
برسوں تک مہمان رہے ہیں

اُن کی میری بات نہ پوچھو
دو قالب اک جان رہے ہیں

جانو رہتا مجھ پر میرے
جان و دل قربان رہے ہیں

اللہ کریں کیا تیری خاطر
خاک تو در در چھان رہے ہیں

یاد کرو جو ہم میں تم میں
کچھ عہد و پیمان رہے ہیں

دل پہ وہی ہے جس میں تیری
چاہت کے ارمان رہے ہیں

بات جو میں کہنا چاہتا ہوں
محفل میں سب جان رہے ہیں

دریا کی موجوں میں اکثر
پوشیدہ طوفان رہے ہیں

سن سن کر بیتاب کی باتیں
سب کے سب حیران رہے ہیں



ایک پاؤڈر
جو کپڑوں اور ہاتھوں کیلئے
نہایت محفوظ ہے
ایک پاؤڈر
جو رنگین کپڑوں کو
زیادہ چمکدار بناتا ہے
ایک پاؤڈر
جو کپڑوں کو
نہایت سفید دھوتا ہے
نیا
تین طرفہ عمل والا
ڈیٹ
نیا ڈیٹ جس میں دُھلائی کے بعد کپڑوں کو نہایت سفید بنانے کیلئے ایک زائد سفیدی لانیوالا جز شامل ہے۔
نیا ڈیٹ کپڑوں کو زیادہ صاف بنانے کی قوت سے مالا مال ایک پاؤڈر ہے۔ کپڑوں میں جمی میل کچیل کو بھی دُور کرتا اور رنگین کپڑوں کو نہایت چمکدار بناتا ہے۔
نیا ڈیٹ بھرپور جھاگ دیتا ہے جس میں کپڑوں کو ملائم رکھنے کیلئے ایک خاص جز شامل ہے۔
یہ آپکے کپڑوں کو نہایت محفوظ طریقے سے دھوتا ہے...
اور آپکے ہاتھوں کو نہایت ملائم رکھتا ہے!
NEW!
TRIPLE AOTION
det
WASHES WHITEST
det
نیلا ڈیٹ
سفید ڈیٹ
det
ایک اور اعلیٰ درجہ
کی ڈیٹ مصنوعات
ڈیٹ ٹکیہ

لمس کی خوشبو

پروفیسر اسلم آزاد ایم اے

[illegible]

محترمی عقیدتیں

چند دن پہلے ایک خط لکھ چکا ہوں۔ اُمید ہے مل گیا ہوگا۔ [illegible] [illegible] سکتا ہوں ـــــ [illegible] [illegible] آپ کے لئے کچھ کہانیاں [illegible] میں انشاء اللہ معیار حاصل کرنے کی کوشش کروں گا ـــــ سالنامہ کے لئے "لمس کی خوشبو" بھیج رہا ہوں۔ یہ کہانی مجھے بے حد پسند ہے کیونکہ یہ میرے احساسات کی [illegible] تصویر ہے۔ یقین ہے کہ پہلی کہانیوں کی طرح یہ کہانی بھی قارئین کو پسند آئے گی ـــــ وصولیابی کی رسید اور آپ کی گرانقدر رائے کا انتظار رہے گا۔

نیاز کیش ـــــ اسلم

★

[illegible] کے دھوئیں سے [illegible] ہو گیا ہے اور بہت تنگ [illegible]

[illegible]

[illegible]

وہ جگہ [illegible] کی [illegible] کے لئے کافی تھے [illegible] پروفیسر رحمٰن [illegible] آئی۔

کلاس روم [illegible] جب [illegible] (POINTS) [illegible] (SKETCHES) [illegible] پروفیسر رحمٰن کے کلاس میں۔ [illegible] کے لیکچرز بہت ہی خشک ہوتے۔ بظاہر میرا قلم چلتا رہتا لیکن میں کسی کہانی کے تانے بانے میں الجھا رہتا یا [illegible] ٹیڑھی میڑھی لکیریں کھینچتا رہتا [illegible] لڑکیوں کے نام لکھتا [illegible] اور اسی طرح پیریڈ گزر جاتا۔

ایک دن پروفیسر رحمٰن نے کلاس روم میں پوچھ لیا تم لڑکوں میں کون کون کہانیاں لکھتا ہے [illegible] میری طرف اشارہ کر دیا۔ کلاس ختم ہونے کے بعد [illegible] آپ کہانیاں لکھتے ہیں [illegible]

[illegible]

کہانی کار صاحب صورت سے کہانی کار تو کم لیکن فلسفی زیادہ معلوم ہوتے ہیں! تمہاری مسکراہٹ کا زہر میری رگوں میں بس گیا اور میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا تھا۔

پھر تم میری دوست بن گئیں۔ ہم دونوں میر کی غزل، تاج کے حسن، ہمالہ کی بلندی، قطب مینار کے وقار اور لال قلعہ کی عظمت کے بارے میں گفتگو کرتے۔ ڈیپارٹمنٹ، یونیورسٹی یا سیمینار کی لائبریری میں بیٹھ کر ایک ہی موضوع پر بہت سی کتابیں پڑھتے، تبادلۂ خیال ہوتا، بحثیں کرتے۔ تم اپنی رائے کا انطباق مجھ پر کرنا چاہتیں، لیکن میں اپنے خیالات پر اٹل رہتا۔ کیوں کہ مجھے ہمیشہ اپنے فیصلہ پر اعتماد رہا ہے۔ بلا سے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو! یہی وجہ ہے کہ میں آج گم کردۂ راہ ہوں۔ کوچہ کوچہ قریہ قریہ بھٹک رہا ہوں۔ لہولہان ہو گئے ہیں میرے تلوے۔

سنو! تم نے ایک دن کہا تھا۔ "مرد بے وفا ہوتے ہیں سنگ دل اور پتھر صفت! میں یہ اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم کل مجھے بھول جاؤ گے۔ پکاسو بھی آخر یہ بھول گیا ہے کہ اولیور کون تھی۔ پکاسو جو ایک عظیم آرٹسٹ ہے۔ اولیور کو فراموش کر بیٹھا ہے۔ اُسے یہ بھی یاد نہیں کہ اُس کے بیشتر لمحے اولیور کے ساتھ گذرے ہیں۔ آخر ٹھہرا نا فنکار ..... پاگل .....! میں نے جواب دیا تھا۔ اولیور پکاسو کی تصویروں، اُس کے طرز زندگی اور اُس کی مفلوک الحالی تک سے ٹوٹ کر پیار کرتی تھی۔ ایک ایک چیز کے لئے پریشان اور محتاج تھا پکاسو ان دنوں۔ پھر بھی وہ دونوں کتنے خوش تھے اور بے فکر۔ ایسی خوشیاں زندگی میں بہت کم آتی ہیں۔ جیسے پہاڑی شہروں میں سردیوں کے موسم میں خوشگوار سنہلی دھوپ نظر آتی ہے۔ جانتی ہو اولیور کا خیال بس یہی تھا کہ کھانا کپڑا آسائش نہ سہی، ایک پیالی گرم کافی ہو، بہت ساری کتابیں ہوں، تخت پر نرم گدا پڑا رہے اور گدّے پر پکاسو ہو تو پھر اور کیا چاہیئے۔ لیکن تم ایسا نہیں کر سکتیں۔ کیوں کہ تمہیں اولیور کی طرح نہ میرے فن سے محبت ہے اور نہ میری شخصیت سے۔ تم نے اپنی نگاہیں جھکا لی تھیں۔ شاید کوئی جواب نہیں بن پڑا تھا تمہیں۔

مئی کا تپتا مہینہ تھا۔ طوفانی ہواؤں کے جھکڑ وہ بھنگ ہاؤس کے اونچے درختوں، گھنی جھاڑیوں اور خودرو پودوں میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ تمہاری شخصیت، جس میں ایک عجیب تمکنت اور وقار تھا، جس ادائے بے نیازی سے پتہ نہیں کتنوں کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ وہ سب [illegible] بھی تمہیں دیکھنے آتے، جملہ بازی کرتے لیکن تم اُن کی ساری باتوں [illegible] سے بے پروا اپنی دنیا میں مگن رہتیں، کھوئی رہتیں۔ غالباً گرمیوں کی چھٹیاں ہونے والی تھیں یا یونیورسٹی کا آخری دن تھا۔ چند طلبا نے [illegible] تمہیں بُری طرح چھیڑا تھا۔ تم ڈر گئی تھیں۔ منا، نقیر اور فہیم نے آ کر مجھے ساری باتیں بتائیں۔ پھر تم شوخ اور پریشان سی میرے پاس پہونچیں۔ اُس وقت تم اُس مستِ خرام ہرنی کی طرح معلوم ہو رہی تھیں جسے کسی لق و دق ریگستان میں شکاریوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہو اور پناہ کی کوئی صورت نظر نہ آتی ہو۔ میرے پہونچنے پر تمہاری پلکیں لرزش پر اکثر مجھے کیکٹس کے نوکیلے کانٹوں کا گمان ہوتا ہے۔ جن کے دیئے ہوئے زخم ابھی تک رس رہے ہیں میرے دل میں۔ تم انھیں دیکھ نہیں سکتیں جن کی ٹیسیں محسوس نہیں کر سکتیں۔ یہ تو میں جانتا ہوں میں محسوس کرتا ہوں اور صرف میں! جھکی رہی تھیں۔ میں بہ غور تمہارے آتشیں پیکر کا جائزہ لے رہا تھا کہ تم نے اپنی نگاہیں اُٹھائیں اور میرے وجود پر تمہاری نظریں بھٹکنے لگیں۔ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہیں پھوپھی جان کے یہاں سبزی باغ چھوڑ آؤں۔ کیوں کہ تم اب بھی خوف زدہ تھیں۔ کہیں لڑکوں نے راستے میں تنہا دیکھ کر ...... میں تمہارے جذبات اور احساسات بخوبی سمجھ رہا تھا۔ لیکن سوچ رہا تھا کہ لڑکیوں کی یہ عمر تو اُس پہاڑی ندی کی طرح ہوتی ہے جس کا شور، تلاطم اور طوفان خشکی، چٹان اور پتھروں تک کو بہالے جاتی ہے۔ سنگ ریزوں اور تنکوں کی بساط کیا؟ حقیقت میں پاگل لڑکوں کا کیا قصور؟ میٹھے میٹھے، رسیلے رسیلے بھرے شہتوت کو دیکھ کر بچے تو پتھر مارتے ہی ہیں۔ میں تمہیں سبزی باغ پہونچا آیا۔ پھوپھی جان کے یہاں۔ کیوں کہ اُن کا مکان یونیورسٹی سے قریب ہی تھا اور تمہارا کوارٹر چھ میل دور۔ تم رکشے میں میری بغل میں بیٹھی تھیں۔ تمہاری مہکتی سانسوں کی گرمی۔ محرابی گول گول ٹرپ کی [illegible] اور مخملیں لمس کی دھیمی آنچ مجھے بے خود بنا دینے کے لئے کافی ہوتی تھی۔ کیا؟ سنو! جب بھی مئی کا تپتا مہینہ آتا ہے، لو چلتی ہے، جھکڑوں کے قافلے آتے ہیں۔ تم بہت یاد آتی ہو۔ جلتی دھوپ میں ایک ٹھنڈک سا سکون بن کر میرے وجود پر چھا جاتی ہو۔ خیالوں میں بس جاتی ہو!

آج بھی جب شام کے دُھندلکے گہرے ہو جاتے ہیں [illegible] بازار گلیاں، کوچے اور شاہراہیں جہاں انسانوں کا سیلاب [illegible]

ہر تقریب کی جان ہوا کرتی تھیں۔ کیسی لگتی ہو تم۔ [illegible]
[illegible] دھندلا سا [illegible]
[illegible] اس کا احساس شدید
ہو جاتا ہے [illegible] مسکراہٹ کی لکیر ابھرتی ہے۔ ایک لمحہ
کے لئے [illegible] اور میں اپنے ہونٹوں کو بھینچ لیتا ہوں۔ میرے ہونٹ
نیلے ہو جاتے ہیں۔ دانتوں کی گرفت کے باعث اور سوفا فاؤنٹین
کا احساس کرنے کی میرے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپائے بیٹھا
رہتا ہوں۔ سوچتا رہتا ہوں اور کبھی کبھی بالوں اور آنکھوں کو اپنی گوری
انگلیوں سے مسلتا رہتا ہوں۔ سوفا فاؤنٹین کی زنبی عمارت، وہ پارک،
وہ میزیں، وہی بھیڑ، لڑکوں کا کیا رہا، دھندلا سا ماحول۔ مدھم مدھم روشنی،
سرگوشیوں کی آوازیں، چوڑیوں کی کھنک اور سگریٹ کا دھواں! تمہیں یاد
ہے جب میں نے اپنی مخصوص میز پر تمہارے نام کے ساتھ اپنا نام
کھود دیا تھا۔ جانتی ہو نام اب بھی کھدا ہوا ہے۔ لیکن صرف تمہارا! میرے
نام کو کسی نے مٹا دیا ہے۔ پھر بھی دھندلے دھندلے حروف میں پڑھ لیتا
ہوں۔ شاید کوئی دوسرا نہیں پڑھ سکتا۔ میرے ہونٹوں پر پھر مسکراہٹ
پھیل جاتی ہے۔ آنکھیں سکڑ جاتی ہیں اور چند لمحوں کے لئے جلتی پلکوں پر
شبنمی ٹھنڈک کا قرب محسوس ہوتا ہے۔ پناما کے ڈبے میں بچے ہوئے
آخری سگریٹ کو نکال کر کافی کا آرڈر دے دیتا ہوں۔ کبھی کبھی بے دودھ
کی اور کبھی کبھی شکر کے بغیر کتنی اچھی لگتی ہے کافی! سنو! میٹھی کافی وہ پیتے
ہیں جن کی زندگی تلخ ہوتی ہے، زہر ہوتا ہے۔

یہ تم کو وہ رات یاد ہے تمہیں جب سارا شہر خاموشی اور سکوت کی
چادر میں لپٹا سو رہا تھا۔ مدھم سی ٹھنڈک اور خنک رات۔ ہم دونوں نے بوٹنگ
کا پروگرام بنایا تھا۔ ایک چھوٹی سی [illegible] کشتی گنگا کے [illegible] پانی کی ہلکی لہروں پر
تیرنے لگی۔ میں آہستہ آہستہ چپو چلا رہا تھا۔ دور تک گہرا سناٹا اور دھندلے
بادل [illegible] تھے۔ [illegible] کی روشنی بھی دھندلی اور مدھم ہونے لگی تھی۔
[illegible] چاندنی کے [illegible] کی جانب بڑھ رہی تھی۔ دفعتاً
[illegible] ہاتھوں سے چھوٹ کر کشتی میں رہ گیا اور میں
[illegible] جو تمہارے
[illegible] تمہارے چہرے کے
[illegible]
[illegible]



سی خاموشی ہو گئی تھی اور تم لہرا کر درخت سے ٹوٹتے ہوئے پتے کی مانند میری آغوش
میں آ گری تھیں۔ اور پھر ... چاند جھک کر بہت نیچے آ گیا تھا۔ گنگا کی لہریں
جیسے خاموش ہو گئی تھیں۔ تم نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ تمہارے
چہرے پر سکون تھا اور ہونٹوں پر بے معنی آوارہ مسکراہٹ جیسے گلاب
کی کومل پنکھڑیوں کو شبنم کی بوندوں نے دھو دیا ہو! ہم بوٹنگ سے اس وقت
لوٹے تھے جب پو پھٹ رہی تھی۔ چاند پچھم کی طرف دھندلے درختوں کے
سروں کو چھو رہا تھا اور گرجا کے پاس اشوک کے اونچے پیڑوں پر چڑیوں کا
شور بلند ہونے لگا تھا۔ تمہیں آج اس کا احساس ہے کہ اس رات چاند کیوں
جھک آیا تھا؟ دریا کی بے قرار اور متلاطم لہریں کیوں خاموش ہو گئی تھیں؟
دور آسمان کی پہنائیوں میں ستاروں کا حسن کیوں بڑھ گیا تھا؟ میں جانتا
ہوں تمہارا حقیقت پسندی کا اصول بے معنی، لغو اور بے بنیاد ہے۔ کیوں کہ
تم اب بھی تنہائی میں جب ان لمحات کو یاد کرتی ہو جو منجمد ہو گئے ہیں،
مقید ہو گئے تو دیر تک اپنے کمرے میں بیٹھی گلاس میں تیرتی ہوئی ان
رنگین مچھلیوں کو دیکھتی رہتی ہو۔ سوچتی رہتی ہو اور کبھی کبھی تمہارے
سانس رکنے سی لگتی ہیں۔ تم اس کرب، گھٹن اور تشنگی کے احساس

کو ایسا محسوس ہوتی ہو۔ لیکن شعوری کوششوں کے باوجود ایسا نہیں ہوتا ... میں، میرا تصور، میری باتیں تمہیں یاد آتی ہیں اور آتی رہیں گی چلی جاتی ہیں جیسے ساون کے مہینے میں بوندا باندی کا لامتناہی سلسلہ۔ کیا میں یہ سب جھوٹ کہہ رہا ہوں؟ بظاہر تم انکار ہی کر سکتی ہو لیکن

آنکھیں جذبات اور احساسات کی عکاسی کرتی ہیں۔ ذرا اپنی ... آئینے میں جائزہ لے کر دیکھو تو ساری حقیقت تم پر واضح ہو جائے گی۔ سنو! حقیقت پسندی کے اس معنوی لبادے کو تم اتار کر ... ورنہ جانتی ہو ساری عمر یوں ہی سلگتی اور تڑپتی رہو گی۔

غزلیں

شکیل احمد عاصم ... بی اے، ایم اے ...

رُخ سے ترے یہ زُلفِ رسا ہم کلام ہے؟
یا صبحِ دلنواز کے پہلو میں شام ہے؟

کیوں یہ تمہاری آنکھ سے آنسو ٹپک پڑے؟
رودادِ غم ابھی تو مری ناتمام ہے

اِک خار زارِ غم ہے محبت کی رہ گذر
اس میں خوشی کا نام بھی لینا حرام ہے

کہتے ہیں جس کو عشق وہ میری نگاہ میں
اے ہم نشیں اِک آتشِ پنہاں کا نام ہے

دامن ہے تار تار گریباں ہے چاک چاک
اے فصلِ گُل یہ تیرے لیے اہتمام ہے

دیکھا کبھی جو رنگِ رُخ اُن کا اُڑا اُڑا
ایسا لگا کہ گہن میں ماہِ تمام ہے

کتنا عجیب تر ہے یہ دستورِ عاشقی!
رونا ہے اس میں جُرم تو ہنسنا حرام ہے

محسوس ہو رہا ہے کہ ہوں زندگی سے دُور
تجھ بن حیات ہیچ ہے جینا حرام ہے

عاصمؔ غمِ حبیب کے بدلے میں جو ملے
اُس غم کو بھی مقدر سے میرا سلام ہے

رشی ...

غمِ ہستی میں کچھ ایسے بھی لمحے اکثر آتے ہیں
زباں پر آہ پلکوں پر ستارے جھلملاتے ہیں

ہم آغوشِ رگِ جاں بھی رہ کر اکثر دور ہو کر بھی
کبھی نزدیک ہونے پر بھی اُن کو ڈھونڈ لاتے ہیں

ہزار ارماں شکن ہے یہ تاثر نامرادی کا
مگر اُمید کہتی ہے، ابھی وہ آئے جاتے ہیں

ترے پیکر کی خوشبو پھیل جاتی ہے فضاؤں میں
نسیمِ صبح کے جھونکے ترا پیغام لاتے ہیں

لکیریں کھینچ دے جیسے کوئی کاغذ پہ بے مطلب
یونہی ربط و تعلق کے فسانے بنتے جاتے ہیں

سرابوں سے علاجِ تشنہ کامی ہو نہیں سکتا
خلا میں ہم اُمیدوں کے گھروندے کو بناتے ہیں

فسانے مختصر ہونے پہ بھی ہوتے ہیں طولانی
بہ عنوانِ محبت جب کہیں دہرائے جاتے ہیں

جہاں مہر و وفا کا نام تک لینا ہو گناہ
وہاں کیا سوچ کر شمعِ محبت ہم جلاتے ہیں

رشیؔ یکبارگی دل دل سے ملنے کا نہیں ممکن
یہ مانا درمیاں فاصلے کم ہوتے جاتے ہیں

شگوفے

پروفیسر مہندر پرتاپ چاند ایم۔ اے

ڈیپارٹمنٹ آف لائبریری سائنس، کورو کشیتر یونیورسٹی لائبریری، کورو کشیتر (ہریانہ)

قبلہ و کعبہ! آداب

آپ کے دونوں کرم نامے موصول ہو گئے ہیں۔ لیجئے آپ کے ارشاد کی تعمیل میں سالنامے کے لئے کچھ شگوفے بھیج رہا ہوں۔ مجھے اُمید ہی نہیں یقین ہے کہ آپ اور قارئینِ "بیسویں صدی" اِنھیں بھی پہلے کی طرح پسند فرمائیں گے اور شرفِ قبولیت بخشیں گے ...

آپ کا ممنونِ محبت

—— مہندر پرتاپ چاند

★

حضرتِ قیس جالندھری قصبہ تسی کلاں (ضلع ہوشیار پور) کے رہنے والے ہیں۔ یہ علاقہ آموں کے لئے بہت مشہور ہے۔ سادھو سنت زیادہ تعداد میں یہ موسم وہیں جا کر گزارتے ہیں۔

قیس صاحب کے ایک گورو بھائی جناب ساگر نکودری نے ایک بار قیس صاحب کو لکھا: "ہم آموں کی فصل میں آپ کے پاس پہنچ رہے ہیں۔"

قیس صاحب نے بے تکلفی سے جواب لکھ دیا: "ساگر بھائی! کیا ڈاکٹر نے آپ کو یہ مشورہ دیا ہے؟ اِس بار فصل اچھی نہیں۔ آم بھی اچھے نہیں۔"

(واقعی ساگر صاحب بیمار تھے اور ڈاکٹری نے مشورہ دیا تھا)

جنابِ قیس نے بعد میں اِس خط و کتابت کا ذکر اپنے ایک مقامی مہربان سے کیا کہ ایک دوست کو آموں کے سلسلے میں یہاں آنے سے منع کر دیا ہے، تو وہ کہنے لگے: "دوستوں کے لئے آموں کا باغ ہی اِمسال خرید لیا ہے۔ اپنے دوست کو لکھ دیجئے کہ سب دوستوں کے ساتھ آ جائیں۔"

قیس صاحب نے دوسرا خط لکھ دیا کہ آ جائیے۔ تب ہی گئے اور دو ایک دن کے بعد واپس چلے گئے۔

اُس کے بعد نکودر کے مشاعرے میں قیس صاحب شریک ہوئے تو ساگر صاحب نے اپنے دولت کدے پر ایک غزل سُنائی۔ مقطع تھا ؎

حضرتِ ساگر! یہ خط لکھ دو جنابِ قیس کو
آئیں گے آموں کی رُت میں ہم تمہارے شہر میں!

واپسی پر قیس صاحب نے ساگر صاحب کو پھر ایک خط لکھا کہ دوستوں کے ساتھ ضرور تشریف لائیے۔ لیکن جواب آیا: "میں نہ آسکوں گا۔ مقطع ہی کافی ہے!"

بار بار لکھنے پر بھی جب ساگر صاحب نہ گئے تو جنابِ قیس نے یہ شعر اُنھیں لکھ بھیجا ؎

ہو گئیں آنکھیں سفید آخر کار
حسرتِ دید کا انجام نہ پوچھ!

حضرتِ جہاں برنالوی کی خط و کتابت کلام کی اصلاح کے سلسلے میں اپنے اُستاد قبلہ جوش ملسیانی سے باقاعدگی کے ساتھ جاری

رہی تھی کچھ دنوں تک سلسلہ قائم نہ رہ سکا اور ہماؔ صاحب نے جوشؔ صاحب کو خط لکھا جو ندامت کا اظہار تھا۔ صرف ایک مصرع درج کر دیا ؏

بندۂ مُہر بہ لب ہوں میں ثنا خواں تیرا

اِدھر اُستادِ محترم نے بھی جواب میں ایک مصرع لکھ بھیجا اور مطلع مکمل ہو گیا ؏

دل میں رکھتا ہوں مقفّل غمِ پنہاں تیرا

ہماؔ صاحب نے ایک بار جشنؔ پور نگر سے اِصلاح کے لئے غزلیں جوشؔ صاحب کی خدمت میں بھیجیں لیکن لفافے پر ٹکٹ چسپاں کرنا بھول گئے اور وہ بیرنگ ہو گیا۔ حضرتِ جوشؔ ملسیانی نے کلام دُرست کر کے واپس بھیجا تو یہ فقرہ بھی لکھ دیا۔
"اگرچہ لفافہ بے رنگ تھا مگر بہت سی رنگینیوں کا حامل تھا!"
یہ پڑھ کر ہماؔ صاحب کچھ نادم بھی ہوئے اور بے حد محظوظ بھی!

قریباً بیس سال ہوئے شملے کے ایک کُل ہند مشاعرے میں برشیؔ پٹیالوی صاحب نے غزل پڑھی۔ مطلع تھا ؎

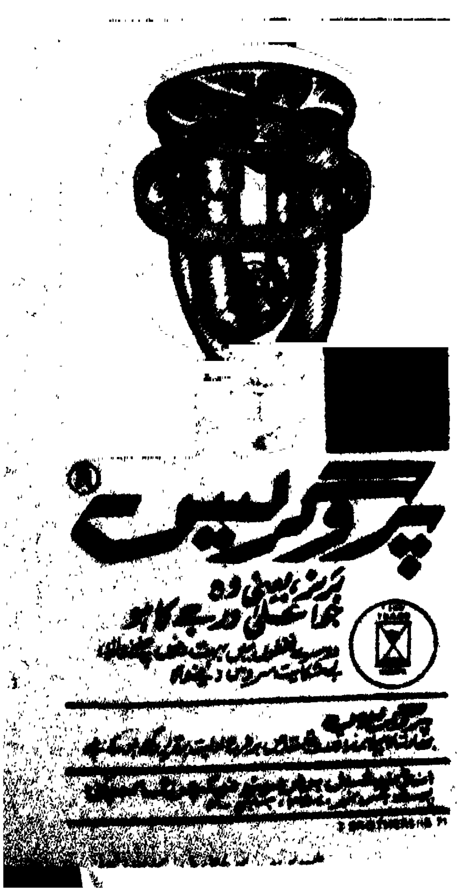
سرِ راہ اِک حادثا ہو گیا
اچانک ترا سامنا ہو گیا

مشاعرے کے اختتام پر جنابِ روشؔ صدیقی، رشیؔ صاحب سے مخاطب ہوئے "آپ کا مصرع ہمارے مصرعے سے لڑ گیا ہے!" اور یہ شعر پڑھا ؎

چلے تھے زمانے سے مُنہ موڑ کر
یکایک ترا سامنا ہو گیا

قیسؔ جالندھری جو اِس گفتگو کو توجّہ سے سُن رہے تھے چلم میں تمباکو کا کش لگا کر (سگریٹ وہ نہیں پیتے) کہا۔
"روشؔ صاحب! 'اچانک' اور 'یکایک' کے فرق پر بھی تو نظر ڈالئے!"
"'اچانک' اور 'یکایک' میں کتنا فرق ہے؟" روشؔ صاحب نے پُوچھا۔
پنڈت ہری چند اخترؔ مرحوم جن کی حاضر جوابی مشہورِ زماں ہے فوراً بول اُٹھے: "'اچانک' اور 'یکایک' میں اُتنا ہی فرق ہے جتنا رشیؔ اور روشؔ میں! مزید وضاحت کی ضرورت ہو تو رشیؔ اور روشؔ کو لڑا کر دیکھ لیجئے دونوں کے مصرعے جو لڑ گئے ہیں!"
پنڈت جی کی گُل فشانی پر محفل تو قہقہہ زار بن گئی، لیکن روشؔ صاحب دیکھتے ہی رہ گئے۔

تقسیم وطن سے بہت پہلے کی بات ہے۔ رشیؔ پٹیالوی جو فرعونیت سے ہمیشہ برسرِ پیکار رہے اور حق گوئی کو اصول بنائے رکھا، بنک آف پٹیالہ میں ملازم تھے۔ ایک بار وہ "ویکلی" (ہفتہ وار) حساب کی فرد وقت پر پیش نہ کر سکے تو افسرِ اعلیٰ کے حکم سے اُن کی تنخواہ اُس وقت تک عارضی طور پر روک دی گئی جب تک "ویکلی" پیش نہ ہو۔ ساتھ ہی جواب طلبی بھی ہوئی۔
رشیؔ صاحب نے جواب طلبی کے جواب میں فی البدیہہ یہ اشعار لکھ کر بھیج دئے ؎



مجھ کو سزا ملی ہے بڑے سخت کام کی
تنخواہ رُک گئی ہے کلیم پینڈنگ ہے ویکلی
تنخواہ کے بغیر گزارہ محال ہے
گھر کی جو پوچھیے تو نہ آٹا نہ دال ہے!
صاحب اِدھر خفا ہے تو بیوی اُدھر خفا
بگڑا ہے کچھ عجیب طرح یہ معاملا!

ایسے میں لاکے زہر پلادے کوئی مجھے!
مُلکِ عدم کی راہ دکھا دے کوئی مجھے

اِس پر افسرِ اعلیٰ اِس قدر متاثر ہُوا کہ تنخواہ کی ترسیل کا حکم جاری ہوگیا اور ریکشی صاحب کو ایک کلرک بھی معاون کے طور پر مل گیا۔

ایک دن ابُوالاثر حفیظ جالندھری نے قیس جالندھری اور ساحر سیالکوٹی سے ایک مصرع پر غزلیں لکھنے کے لئے کہا۔ دونوں نے اگلے دن غزلیں سُنائیں۔ حفیظ خوش ہوئے۔ لیکن ساحر صاحب سے کہا: "آپ نے 'تلوار' کا قافیہ چھوڑ دیا۔"
ساحر صاحب نے تھوڑی دیر کے بعد یہ شعر سُنایا تو حفیظ صاحب نے بہت داد دی ؎

نازک سے ہاتھ، نرم کلائی، ذرا سا دل
ہنستا ہوں اُن کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

ٹھاکر رتن سنگھ کلیم جنابِ جوش ملسیانی کے پُرانے شاگردوں میں سے ہیں۔ کلیم صاحب نے غزل اصلاح کے لئے بھیجی تو یہ بھی لکھا۔
"قبلہ! کلام کی اصلاح تو آپ فرماتے ہیں۔ لیکن میں جو کچھ نثر میں لکھتا ہوں اُس میں بھی بہت سی غلطیاں ہوتی ہوں گی۔ براہِ کرم اُس کی بھی اصلاح فرما دیا کیجیے تاکہ میں نثر لکھنا بھی سیکھ جاؤں۔"
جوش صاحب نے جواب میں لکھا: "بچوں کی تُتلی باتیں بہت پیاری لگتی ہیں۔"

ابُوالبرکات عاشق جالندھری اَن پڑھ پہلوان تھے۔ جالندھر کے مضافات میں بستی غزاں کے رہنے والے۔ اُن کا ایک مطلع ہے ؎

کیا پُوچھتے ہو حضرتِ عاشق کہاں کے ہیں؟
بستی غزاں میں رہتے ہیں، بستی غزاں کے ہیں

نکودر کا طرحی مشاعرہ تھا۔ عاشق صاحب نے اپنی باری پر غزل پیش کی۔ مطلع کا یہ مصرعِ اُولیٰ جب انھوں نے دوسری بار پڑھا تو ایک من چلے نے کہہ دیا داغ کا مصرع ہے ع

"جو عاشقی میں خاک ہوا، کیمیا ہوا"

عاشق صاحب نے جواب دیا: جی ہاں۔ مجھے بھی اِس کی ملکیت کا دعویٰ نہیں۔ مصرعِ ثانی ملاحظہ فرمائیں ع

"گلزارِ داغ میں ہے یہ مصرع لکھا ہوا"

معترض لاجواب ہو کر خاموش ہوگیا اور عاشق صاحب نے یہ مطلع ایک بار پھر شان سے یوں دُہرایا ؎

"جو عاشقی میں خاک ہوا، کیمیا ہوا"
"گلزارِ داغ" میں ہے یہ مصرع لکھا ہوا

اُردو کالج جالندھر کے پرنسپل کے۔ ایل۔ چوپڑہ نیرنگ کی خدمت میں ایک سردار صاحب حاضر ہوئے اور "ادیب" کی تعلیم حاصل کرنے کے سلسلے میں درخواست کی۔ انھوں نے پنجابی میں تعلیم حاصل کی تھی۔ نیرنگ صاحب نے انھیں "ادیب" کی جماعت میں داخل کرلیا اور محنت کے ساتھ الف، بے پڑھانے لگے۔ کچھ دنوں کے بعد سردار صاحب کو ایک مختصر سا مضمون لکھنے کے لئے کہا گیا تو وہ بہت سے الفاظ غلط لکھ کر لائے۔ مثلاً "غلط" کو "گلت" لکھ دیا اور "تصدیق" "تسدیک"۔ نیرنگ صاحب نے اِصلاح کر دی۔

اِسی طرح ایک بار پھر سردار صاحب نے بہت سے غلط الفاظ لکھے۔ مثلاً "لفظ" کو "لپھج" لکھ دیا۔ نیرنگ صاحب مُسکرا کر کہنے لگے: "سردار صاحب! آپ تو اپنا نام بھی غلط لکھتے ہیں!"
سردار صاحب نے کہا: "نہیں تو صاحب! درست لکھتا ہوں۔ یوں، ساون سنگھ۔"
نیرنگ صاحب نے کہا: "آئندہ اِس طرح لکھا کرو۔ صاون سنگھ!"

سردار صاحب کچھ بھی بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکے اور نہایت سنجیدگی اور فرمانبرداری سے جواب دیا: "بہت اچھا جناب! آئندہ خیال رکھوں گا!"

چند برس گزرے ایک مشاعرہ میں جس میں بیشتر تعداد بے گانہ بار شعراء کی تھی۔ حضرت طالب پانی پتی نے مندرجہ ذیل قطعہ پڑھ کر سامعین سے دادِ تحسین حاصل کی ؎

نغمہ و شعر مجھے باعثِ اعزاز نہیں
دل میں شہرت کی ذرا حرص نہیں، آز نہیں
تجھ سے شکوہ ہے مجھے میرے بنانے والے!
میری آواز میں موسیقیٔ آواز نہیں

پروفیسر اخگر شہابی ۳۴ سال تک دیال سنگھ کالج کرنال اردو و فارسی کے لیکچرار رہے۔ ایک صبح اچانک انھیں کالج ٹرسٹ اور پرنسپل صاحب کی طرف سے نوٹس ملا کہ اگلے سیشن (Session) سے اُن کا شعبہ بند کیا جا رہا ہے لہٰذا انھیں ایک سال کا نوٹس دیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی نوکری کا کہیں اور انتظام کرلیں۔ اخگر صاحب کی شاعرانہ غیرت کو چوٹ لگی اور انھوں نے اُسی وقت استعفیٰ دے دیا اور اگلے ہی دن سے کالج جانا بند کر دیا۔ منتظمین کالج نے حیران ہو کر جب اُن سے اِس کی وجہ پوچھی تو اخگر صاحب نے جواب میں محض یہ قطعہ پیش کر کے اپنے جذبات کا اظہار کیا ؎

میری رضا میں کسی کی رہوں، رہوں نہ رہوں
میں آؤں جاؤں کہیں یا کہیں رہوں نہ رہوں
نہ سننے والی تو جی ہاں ہزار سنتے ہو
نہ کہنے والی بھی اک ہے کہو کہوں ؟ نہ کہوں ؟

شری گیان چند منصور اپنے استاد جناب نسیم نور محلی (مرحوم) کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ رسمی بات چیت کے بعد غزل اصلاح کے لئے پیش کی تو استاد نے فرمایا: "شام کو دیکھ دوں گا۔" مگر منصور صاحب نے التجا کی "میں جلد جالندھر واپس جانا چاہتا ہوں۔ کل دفتر میں حاضری ہے۔"

نسیم صاحب نے کہا: "چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے [illegible] میں غزل دیکھتا ہوں۔" ایک بار سرسری نظر سے پڑھ کر نسیم صاحب کہنے لگے: "غزل اچھی ہے میں اصلاح کرتا ہوں۔ آپ ہوا کا قافیہ باندھنے کی کوشش کریں یہ رہ گیا ہے۔"

اصلاح ہو چکی تو منصور نے کہا: "قبلہ! یہ شعر بھی دیکھ لیجئے" ہوا کے قافیے میں ؎

پری نہیں کوئی پیکر اُن کی نظر؟
مرا دل اُڑا کر ہوا ہو گئی

نسیم صاحب بہت خوش ہوئے اور خوب داد دی۔

ابوالحماقت عاشق جالندھری مزاحیہ رنگ میں خوب کہتے تھے۔ پڑھے لکھے تو تھے نہیں۔ اپنے اشعار رٹ لیتے تھے مشاعرے میں شرکت کرتے تو کاغذ سامنے رکھ لیتے جس پر اپنے اشعار بول کر کسی سے لکھوا لیتے تھے۔

ایک مشاعرے میں کاغذ اُلٹا پکڑ رکھا تھا اور شعر پڑھتے جا رہے تھے۔ اختتام پر ایک دوست نے اُن کے کان میں کہا: "آپ نے کاغذ اُلٹا پکڑ رکھا تھا!"

عاشق صاحب نے جواب دیا: "جی ہاں میں اُلٹا بھی پڑھ لیتا ہوں!!"

غزل

کیفؔ مُرادآبادی

جذبِ پنہاں کو اگر کام میں لایا جائے
ہم جہاں چاہیں وہیں جلوہ دکھایا جائے

کوئی شہر ایسا بھی دُنیا میں بنایا جائے
جس میں صرف اہلِ محبت کو بسایا جائے

دل کا یہ حال ہوا اُن سے جُدا ہوتے ہی
جیسے شیشہ کسی پتھر پہ گرایا جائے

دِل جواں تھا کوئی دیکھے یہ تمنا کب تھی
اب یہ ٹوٹا ہوا دل کس کو دکھایا جائے

چاہے دیدار کو ہر آنکھ ترس جائے مگر
حُسن کو قیدِ تعیّن میں نہ لایا جائے

میں فنا ہو نہیں سکتا ہوں محبت کی قسم
تُم مٹاؤ مجھے جتنا بھی مٹایا جائے

اپنی کشتی کو بچانے کا تو مطلب یہ ہے
کوئی طوفان سرِ ساحل بھی اُٹھایا جائے

جانے کیسے تو دل ہے ترے دامن کی ہوا
آ بھی سکتے ہوں تو کیوں ہوش میں آیا جائے

[illegible] میں جب ہو اس انداز سے کیفؔ
[illegible] بٹھایا جائے

غزل

دلؔ ایوبی ٹونکی بی اے (علیگ)

دِل سلامت ہو نہ ایمان بچا ہو جیسے
اُن کا ہر تیر نشانے پہ لگا ہو جیسے

اُن کا اندازِ کرم دیکھ کے یوں ہوں محجوب
بیگناہی بھی مری کوئی خطا ہو جیسے

ایک آواز کہ یوں آتی ہے ہر منزل پر
جانی پہچانی ہوئی کوئی صدا ہو جیسے

عُقدہ حل ہو، نہ کھُلے راز، نہ گتھی سُلجھے
میری قسمت بھی ترا بندِ قبا ہو جیسے

اے زہے بندگیِ عشق کہ ہو فرض، مگر
زِندگی بھر نہ ادا ہو نہ قضا ہو جیسے

غلبۂ شوق ہے منزلِ جاناں مت پُوچھ
دِل دھڑکنے کی صدا بانگِ درا ہو جیسے

کتنے ارمانوں کا خوں اُس نے کیا ہے اب تک
پھر بھی ہاتھوں پہ وہی رنگِ حنا ہو جیسے

یوں دمکتا ہے چمن آتشِ گُل سے اے دلؔ
سُرخیِ خونِ شہیدانِ وفا ہو جیسے

ہمسفر

پریم دیوان

۳/۳۴ راجندر نگر، نئی دہلی

محترم خوشتر صاحب! آداب

"بیسویں صدی" کے لئے یہ کہانی کچھ عرصہ پہلے لکھی تھی۔ پھر نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ کل اچانک مل گئی اور آج پہلا کام یہ کر رہا ہوں کہ اسے آپ کو بھیج رہا ہوں — یہ کہانی ایک فلم ایکٹریس سے متعلق ہے۔ بلکہ اس کی زندگی کا ایک سچا واقعہ ہے۔ یہ مشہور فلم ایکٹریس اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ میں اس کا نام نہ بتاؤں گا، پڑھنے والے خود سمجھ جائیں گے۔

آپ کا — پریم دیوان

★

لندن کے ہیتھرو ایئرپورٹ سے بمبئی جانے والے ایئر انڈیا کے طیارے میں داخل ہونے والا میں آخری مسافر تھا۔ ایئر ہوسٹس کی مدد سے اپنی سیٹ پر بیٹھا تو دیکھا کہ میرے ساتھ والی سیٹ پر ایک خوبصورت ہندوستانی عورت بیٹھی ہے۔ اس عورت کو میں نے دیکھا تو میں نے محسوس کیا کہ میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔

میں نے ایک نظر پھر اسے دیکھا۔ وہ واقعی خوبصورت عورت تھی۔ عمر بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ یہی کوئی تیس بتیس برس ہوگی۔ رنگ گورا، جسم بے حد متناسب، بادامی رنگ کی بڑی بڑی آنکھیں اور ان آنکھوں میں بھری مقناطیسی کشش۔ وہ ریشمی ساڑی اور ہلکے بادامی رنگ کا ہائی نیک وول کا سویٹر پہنے ہوئے تھی۔ اسے دیکھ کر میں اس کی دلکش و دلنواز شخصیت میں کچھ اس طرح کھو گیا جیسے خوبصورت کہانی پڑھتے پڑھتے کوئی کھو جاتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ بند ہوا اور جہاز چلنے کے متعلق اناؤنسمنٹ ہونے لگی۔ ہم پیٹیاں باندھنے لگے اور جہاز پانی میں کشتی کی طرح چلنے لگا۔ ایک جگہ رک کر اس کی رفتار تیز ہو گئی اور پھر دیکھتے دیکھتے وہ ہوا میں پرواز کرنے لگا۔ پہلے ترچھا اوپر اٹھتا چلا گیا اور پھر سیدھا ہو گیا۔ اب ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ہم کسی ڈرائنگ روم کے نرم صوفے پر بیٹھے ہوں۔

بیلٹ کھولنے کے بعد میں نے جیب سے سگریٹ کیس نکالا۔ کیس کھول کر سگریٹ بھی نکال لیا۔ لیکن سلگانے سے پہلے خیال آگیا اور میں نے اس عورت سے انگریزی میں پوچھا۔

"اگر آپ کو ناگوار نہ گزرے تو میں سگریٹ سلگا لوں؟"

وہ چونک پڑی اور ہندوستانی میں بولی: "جی۔۔؟"

"کیا میں سگریٹ پی سکتا ہوں؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

اس نے کچھ لمحے سوچ کر صاف اور پیاری ہندوستانی میں جواب دیا: "اگر آپ برا نہ مانیں تو براہِ کرم سگریٹ نہ پئیں۔ میری

دِل

اِک لفظِ محبت کا ادنیٰ یہ فسانہ ہے

سمٹے تو دلِ عاشق، پھیلے تو زمانہ ہے ——— جگرؔ مرادآبادی

کیوں کر ہوا ہے فاش زمانہ پہ کیا کہیں

وہ رازِ دل جو کہہ نہ سکے رازداں سے ہم ——— مجازؔ

دِل لاکھ ہو بیتاب مگر چپ ہی رہیں گے

شوخی تیری یاد آئیگی تڑپا نہ کریں گے ——— نظامؔ رامپوری

اچھا ہے دِل کے پاس رہے پاسبانِ عقل

لیکن کبھی کبھی اِسے تنہا بھی چھوڑ دے ——— اقبالؔ

کس درجہ دل شکن تھے محبت کے حادثے

ہم زندگی میں پھر کوئی ارماں نہ کر سکے ——— ساحرؔ

مُرسلہ: سید حسن محمد عابدی امروہوی رامپور

طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

میں حیران تو ہُوا لیکن پریشان نہیں۔ سفر میں ہر طرح کے آدمی ملتے ہی ہیں۔ میں نے سگریٹ رکھ لیا لیکن ساتھ ہی پُوچھ لیا۔ "کیا تکلیف ہے آپ کو؟ بطور ایک ڈاکٹر کے کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟" اب میں نے بھی ہندوستانی میں کہا۔

اُس عورت کی بڑی بڑی آنکھوں میں اس طرح حیرت آگئی جیسے اچانک کوئی کھویا ہُوا دوست مِل جائے۔ اُس نے پُوچھا۔ "آپ ڈاکٹر ہیں کیا... لندن میں پریکٹس کرتے ہیں؟"

"جی نہیں۔ میرا نام ڈاکٹر دیویندر سرین ہے۔ ہندوستانی ہوں اور ہندوستان ہی میں رہتا ہوں..." میں نے جواب دیا۔

میرا نام سُن کر اُس کے چہرے پر اور بھی حیرت اُبھر آئی۔ بولی۔ "او... ڈاکٹر سرین! آپ تو دہلی میں پریکٹس کرتے ہیں اور وہاں ریسرچ بھی..."

اُس کے مُنہ سے اپنے بارے میں سُن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ میں نے پُوچھا "آپ مجھے کیسے جانتی ہیں؟"

میرے سوال پر وہ یکایک اُداس ہوگئی۔ اُس کا چہرہ اُتر گیا۔ بہت یاس بھرے لہجے میں بولی "میں نے جب اپنے علاج کے بارے میں مشورہ کیا تو آپ کا نام بھی تجویز کیا گیا تھا۔"

"کیا تکلیف ہے آپ کو؟" میں نے پُوچھا۔

میرے سوال پر وہ خاموش ہوگئی۔ اگر میں اتنا مشہور ڈاکٹر نہ ہوتا تو شاید وہ ٹال بھی جاتی۔ لیکن کچھ سوچ کر اُس نے کہا "ڈاکٹر صاحب! مجھے کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ اکثر پیٹ میں ہلکا ہلکا درد رہتا ہے۔ دل دھڑکتا ہے اور رہ رہ کر چھاتی میں درد ہوتا ہے۔ اب بھی میرا جی بُری طرح گھبرا رہا ہے۔"

اُس کے چہرے پر گھبراہٹ دیکھ کر میرے چہرے پر اپنے پیشے کی سنجیدگی آگئی۔ میں نے کہا "ذرا اپنی نبض دکھایئے۔"

اُس نے فوراً اپنی خوبصورت مہندلیں کلائی میرے آگے کر دی۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ میں نے نبض دیکھتے ہوئے پُوچھا "کیا آپ اکیلی سفر کر رہی ہیں؟"

"جی ہاں" اُس نے مختصر سا جواب دیا۔

اُس کی نبض بالکل ٹھیک چل رہی تھی۔ دل کی دھڑکن کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اُس کی گھبراہٹ دُور کرنے کے لئے میں نے اپنے بیگ میں سے ہومیوپیتھک کی معمولی سی دوا کی چار گولیاں نکال کر اُس کی ہتھیلی پر رکھ دِیں اور اُنھیں چُوس جانے کے لئے کہا۔ حالانکہ یہ گولیاں میں اپنے استعمال کے لئے ساتھ رکھتا تھا۔

کوئی پانچ منٹ بعد اُس نے کہا "آپ کی دوا تو رام بان ثابت ہوئی! کیا تکلیف تھی مجھے؟"

میں نے مُسکرا کر جواب دیا "آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہے۔ آپ کا ہارٹ بالکل نارمل ہے۔"

میرے جواب پر اُس کے چہرے پر اطمینان اور مُسکراہٹ کی جھلک آگئی۔ اُس نے مُسکراتے ہوئے کہا "سبھی ڈاکٹر یہی کہتے ہیں لیکن ساتھ ہی دوا ضرور دیتے ہیں۔ لندن میں علاج کروانے آئی تھی۔ ڈاکٹر روزانہ دو انجکشن لگاتا تھا۔ کئی بار خون اور بلڈ پریشر ٹیسٹ کیا لیکن روز یہی کہتا تھا کہ مجھے کچھ نہیں ہے۔"

اپنے پیشے پر یہ پُرخلوص الزام سُن کر میں مُسکرا دیا۔ تھوڑی دیر بعد پُوچھا "آپ لندن میں کیوں علاج کروانے آئیں۔ کیا ہندوستان میں کوئی اچھا ڈاکٹر نہیں مِلا؟"

میرے سوال کا اُس نے جلدی جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر بعد بولی: "علاج کرانا تو ایک بہانہ تھا۔ دراصل میں کچھ دنوں کے لیے اپنے ماحول سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ تنگ آ گئی تھی۔"

میں نے حیران ہو کر پوچھا: "ایسا کیا ماحول ہے آپ کا؟"

جتنا میں حیران ہو رہا تھا، اُس سے کہیں زیادہ مجھے اُس کی آنکھوں میں حیرانی دکھائی دی۔ اُس نے اُلٹا مجھ سے سوال کیا: "کیا آپ مجھے نہیں جانتے؟"

"معاف کیجئے۔ میرا خیال ہے آپ سے یہ پہلی ملاقات ہے۔" میں نے کہا۔

وہ مُسکرا دی اور بولی: "ملاقات ضرور پہلی ہے۔ لیکن آپ مجھے جانتے ضرور ہوں گے۔ یاد کیجئے۔"

اُس کے یاد دلانے پر میں نے پھر ذہن پر زور ڈالا کہ میں نے اسے پہلے کہاں دیکھا ہے؟ لیکن بہت یاد کرنے پر بھی میں اُسے نہ پہچان سکا اور یہی میں نے اُسے بتا دیا۔

وہ ہنس پڑی اور بولی: "میرا نام وِینا رمانی ہے۔ میں مشہور فلم سٹار سمجھی جاتی ہوں ــــــ حیرت ہے آپ مجھے نہیں جانتے۔"

"اوہ!" میرا ذہن یکایک صاف ہو گیا۔ میں نے اکثر اُس کی تصویریں سڑکوں پر لگے پبلسٹی بورڈوں پر دیکھی ہیں۔ میں نے کہا۔ "معاف کیجئے گا، مجھے فلمیں دیکھنے کا بالکل شوق نہیں۔ اپنی ریسرچ اسائنمنٹس کے سلسلے میں بالکل وقت نہیں ملتا۔ بُرا نہ مانیے گا۔"

اُس کے چہرے پر گہری سنجیدگی آ گئی۔ بولی: "بُرا کیوں مانوں گی۔ مجھے تو بے حد خوشی ہوئی کہ میرا نام سُن کر آپ چونکے نہیں۔ ورنہ... عام ہندوستانی تو مجھے پہچانتے ہی، میرے گرد منڈلانے لگتا ہے۔ ہندوستان میں تو باہر نکلنا مشکل ہے۔ یہاں لندن میں بھی... کیا تھوڑے ستائے ہے... توبہ!"

"ان حالات میں؟" میں نے کچھ بے تکلفی سے پوچھا: "تو آپ کی جنت بنی چاہئے۔ ظاہر ہے دولت آپ کے قدم چوم رہی ہے اور شہرت آپ کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔ آپ کا ہر لمحہ مصروف ہے اور خوشیوں سے بھرپور ہے۔ پھر بحث کرنے کی کیا وجہ ہے؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ جیسے کسی کشمکش میں ہو۔ جیسے چاہ

زُلفیں

ادا سے رُخ پہ زُلفیں ڈال کر کہنے لگے مجھ سے
کہ دیکھا ہے کسی نے ایک جا شام و سحر ہونا ــــــ علی جہانگیر

اُڑائی زُلف کی خوشبو کہ اُس کے کوچے سے
دُلہن بنی ہوئی بادِ صبا نکلتی ہے ــــــ عبدالحمید

نہیں کُھلتا ترا حال پریشاں زُلف سے تیری
کہ وہ کافر ترے سر کی قسم کچھ اور کہتی ہے ــــــ نامعلوم

لبِ بام بیٹھے تو جو زُلف کھولے
کہیں دل نہ اُس میں پھنسا ناکسی کا ــــــ احمد علی اکبر

اس طرح زُلفیں وہ بکھراتے ہیں روئے صاف پر
جس طرح بدلی میں منہ اپنا چھپاتے آفتاب ــــــ وحشت

مرسلہ: محمد وسی، دہلی، مظفر پور

رہی ہو کہ اِس بحث میں نہ پڑے۔ لیکن آخر عورت تھی اور دل غبار سے بھرا ہوا تھا۔ رُک نہ سکی۔ بولی: "پہلے میں بھی خوشی سے پھُولی نہ سماتی تھی۔ اپنی تعریفیں سُن کر، دولت باڑھ کی طرح آتی دیکھ کر میں بھی مغرور ہو گئی۔ لیکن جلد ہی مجھے قُدرت کا مذاق معلوم ہو گیا۔ میری خوشیاں میری بدنصیبی کا دیباچہ تھیں۔ ڈاکٹر صاحب! بہت دُنیا دیکھی ہے میں نے۔ میرا کوئی خیر خواہ نہیں ہے۔ سب یا تو میری دولت کے خیر خواہ ہیں یا میرے جسم کے ــــــ میرا... میرا کوئی نہیں ہے۔ کوئی ایسا نہیں جسے میں اپنے دل کا درد دل سے سُناؤں۔" یہ کہتے کہتے اُس کی آواز درد بھری ہو گئی۔ وہ کہتی گئی: "بس اب تو جی چاہتا ہے کوئی میرا ہمدرد نہ بنے۔ کوئی مجھ سے ذاتی سوال نہ کرے۔ میں ہر وقت تنہا رہوں، اپنے آپ سے باتیں کروں، برہا کے گیت گاؤں اور روؤں۔ اپنے دل کا درد اپنے ہی اندر بانٹوں۔ کچھ آنکھوں کو دوں اور کچھ ہونٹوں کو..." یہ کہتے کہتے اُس کی آنکھیں بھر آئیں، آواز بھر آئی۔

اُس کی دلکش و دلنواز شخصیت اور اُس کے دل کی حالت میں یہ تضاد دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ ظاہر تھا کہ اُس کی بیماری کے پیچھے ایک ذہنی پریشانی تھی جو ہر وقت اُس کے دماغ میں کسی

[illegible] کی طرح چمک رہی تھی۔

[illegible] کوئی وجہ نظر نہیں آرہی تھی۔ جو کچھ تھا اُس کے دل میں تھا اور دل ایک ایسا گہرا کنواں ہے جہاں کوئی نہ کوئی غم [illegible] کی طرح اُبھرتا رہتا ہے۔ انسان کے پاس بہت کچھ ہو اُسے اتنی خوشی نہیں ہوتی جتنا غم ایک معمولی سی کمی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

میں نے زیادہ بات کرنا مناسب نہیں سمجھا، خیال ہوا ایسا نہ ہو اُس کے دل کا زخم پھوٹ پڑے۔ اُس کا دھیان دُوسری طرف کرنے کے لئے میں نے ایئر ہوسٹس کو بُلانے کے لئے بٹن دبایا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آئی تو میں نے اُسے دو آرنج سکواش لانے کے لئے کہا۔

ناشتے کے بعد وہ بولی "ڈاکٹر صاحب! آیئے آپ کو ایک چیز دکھاؤں۔"

یہ کہہ کر اُس نے اپنے بیگ میں سے ایک البم نکالی اور اُسے کھولا۔ اُس میں اُس کی مختلف فلموں سے لی گئی تصویریں تھیں۔

ہر تصویر میں وہ مختلف پوز، لباس اور جگہ پر تھی۔ کہیں وہ نوجوان لڑکی نظر آرہی تھی تو کہیں گھریلو عورت۔ کہیں وہ مغلیہ سلطنت کی ملکہ تھی تو کہیں بالاخانہ کی طوائف۔ کہیں کشمیر کی وادیوں میں تھی تو کہیں تنگ و تاریک گلیوں میں ——— ہر تصویر کے بارے میں وہ بتاتی کہ وہ کہاں لی گئی تھی۔ اِس کا شاٹ کس طرح لیا گیا تھا۔ اِس فلم کے دَوران کیا دلچسپ واقعات ہوئے۔

ایک تصویر میں اُس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر آدمی کھڑا تھا۔ وہ تصویر دکھاتے ہوئے اُس نے کہا: "یہ میرے ہسبینڈ.... " اور یہ کہتے کہتے وہ خاموش ہوگئی۔

میں نے تصویر کو غور سے دیکھا اور اچانک میرے منہ سے نکل گیا: "کیا یہ آپ کے ہسبینڈ ہیں؟"

"ہیں نہیں، تھے۔ اب ہمارا طلاق ہوگیا ہے۔" اُس نے دبی آواز میں اس طرح جواب دیا جیسے ایک ایک لفظ کو بہت تکلیف سے کہہ رہی ہو۔

میں نے محسوس کیا اُس کے دل میں وہ پھوڑا جہاں سے

[illegible] ایسی کیس ہے۔ میں نے اِس بات کو اور نہ چھیڑا۔

ایک تصویر ایسی آئی جس میں وہ ایک بچے کو پیار کر رہی تھی۔ وہ تصویر دکھاتے ہوئے اُس نے کہا: کتنی پیاری بچی ہے۔ فلم میں اِس بچی کا اپریشن ہونا ہے اور . . . یہ بچی مر جاتی ہے۔"

میں تصویر کو غور سے دیکھنے لگا تو اُس نے پوچھا: "آپ کے کتنے بچے ہیں ڈاکٹر صاحب؟"

"دو" میں نے جواب دیا۔

"دو۔ دو کیوں، تین کیوں نہیں؟ تین بچوں تک تو فیملی پلاننگ میں بھی اجازت ہے۔" اُس نے بہت اصرار سے کہا۔

میں نے مسکرا کر جواب دیا: "ایک بچے کے لئے گنجائش رکھ دی ہے۔ شاید کوئی بھولا بھٹکا آجائے۔"

"یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ کیا آپ کو بچے اچھے نہیں لگتے؟ گھر میں کم سے کم چھ سات بچے ہونے چاہئیں۔"

"چھ سات! مائی گاڈ! اور وہ بھی ایک ڈاکٹر کے گھر میں؟" میں نے کہا۔

"تو کیا ہوا۔ جو لوگ پالنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ اُن کے لئے کیوں اعتراض ہو۔"

اِس سوال کو نظر انداز کر کے میں نے پوچھا: "اچھا آپ کے کتنے بچے ہیں؟"

میرا سوال ——— لگتا تھا سوال نہیں تلوار کا وار تھا اُس کے چہرے پر مُردنی چھا گئی۔ جیسے کوئی چوری کرتا رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا ہے، اُس کا چہرہ اِس طرح شرمندہ ہو گیا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ کوئی جواب نہ دیا۔

میں نے بے خیالی میں وہی سوال پھر پوچھا تو اُس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا: "بچے تو صرف خوش قسمت لوگوں کے گھروں میں ہوتے ہیں۔ میری ایسی قسمت کہاں؟"

ایکدم مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے وہ پھوڑا ایسی تھا۔ یہیں سے رہ رہ کر اُس کے دل سے درد اُٹھتا تھا۔ میں نے پوچھا: "آپ نے . . . چیک تو کرایا ہوگا؟"

تھوڑا اٹک اٹک کر اُس نے سامنے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"سب کچھ کرا چکی ہوں۔ دولت پانی کی طرح بہائی تھی۔"

"کیا مجھے بھی ایک موقع دیں گی؟" میں نے کہا۔

میری بات سُن کر ایک لمحے کے لئے اُس کے چہرے پر رونق آگئی، مگر دوسرے لمحے وہ پھر مُرجھا گئی اور بولی: "کوئی فائدہ نہیں۔ میں سب کچھ کر چکی ہوں۔ ابھی لندن میں بھی کئی ٹاپ کے ڈاکٹروں سے چیک کرایا تھا۔"

میں چُپ رہ گیا۔ سوچا، کیس واقعی علاج کے قابل نہ ہوگا۔ اب تک ہم اِس طرح گھل مل چکے تھے کہ اُس کے دُکھ نے میرے دل کو بھی چھو لیا۔ ایک دوست کی حیثیت سے میں نے اُسے زندگی کا دُوسرا رُخ دکھایا: "بچے ہمیشہ سُکھ کا کارن نہیں ہوتے۔ کتنے بچوں کو دیکھا ہے وہ نالائق نکل گئے ہیں۔ چور، بدمعاش بن جاتے ہیں۔ اپاہج ہو جاتے ہیں یا کسی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اُس حالت میں اور زیادہ دُکھ دیتے ہیں۔ یہ سب قُدرت کی جوڑ توڑ ہے۔ کسی کے پاس کم اور کسی کے پاس زیادہ! اب دیکھئے، آپ کو پرماتما نے عزت دی ہے، دولت دی ہے، شہرت دی ہے۔ یہ سب چیزیں ہر انسان کو تو میسّر نہیں ہیں۔ اصل چیز تو ہے خوشی۔ من کی شانتی . . ."

وینا میری بات بہت دھیان سے سُنتی رہی۔ پھر بے حد یاس بھرے لہجے میں بولی: "آپ نے ٹھیک کہا ہے ڈاکٹر صاحب! اصل چیز من کی شانتی ہی ہے اور اُسی کو تلاش کرتے کرتے میں باولی ہو گئی۔ لیکن مجھے وہی نہیں ملی۔ کہاں ہے من کی شانتی ڈاکٹر صاحب؟ میری ساری دولت، عزت اور شہرت لے لیجئے اور من کی شانتی لا دیجئے۔ میں یہ سودا کرنے میں ایک لمحہ بھی دیر نہ لگاؤں گی۔ بچپن میں میں نے ماں باپ کو غریبی میں دیکھا، خواہشوں کو دباتے اور قدم قدم پر دل کو مسوستے دیکھا تو سوچا، من کی شانتی دولت میں ہے۔ میرے دل میں اُسی وقت یہ عزم جاگا تھا کہ میں کسی طرح خوب دولت کماؤں۔ میرے پتا جی فلمی دُنیا میں ایک چھوٹے موٹے آرٹسٹ تھے۔ اُنھیں دیکھ دیکھ کر میں نے بھی ایکٹنگ کا آرٹ سیکھا اور تن من سے سیکھا۔ میرا خیال تھا کہ لوگ میرے آرٹ کو دیکھ کر عش عش کر اُٹھیں گے۔ لیکن جب میں بڑی ہوئی ——— تو دُنیا کو بالکل مختلف پایا لومڑی کی طرح چالاک اور بھیڑیئے کی طرح خونخوار۔ اُس وقت ایسا

گیا تھا جیسے جھوٹ، فریب اور مکاری کے بنا زندہ رہا ہی نہیں جا سکتا۔ فلمی دنیا میں جگہ بنانا کوئی کھیل نہیں ہے ڈاکٹر صاحب۔ ہوس کی آگ سے اپنا دامن بچاتی ایک معصوم گھری کی طرح پھدکتی پھرنے لگی۔ وہ تو میرے پتاجی ساتھ تھے ورنہ میں تو کبھی کا کسی مگرمچھ کا نوالہ بن گئی ہوتی۔

ایک فلم میں قدم رکھنے کو جگہ ملی۔ پھر دوسری میں۔ میرا آرٹ اور عزم میرے ہر پوز میں جگمگایا۔ کچھ پارکھی جوہریوں نے مجھے پہچانا اور ایک فلم میں مجھے ہیروئن کا رول ملا۔ اُس وقت مجھے اپنے اوپر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ میں ہر وقت یہی سوچتی تھی کہ ضرور قسمت کو دھوکا ہوا ہے۔ یقین مانئے، جب فلم ریلیز ہوئی اُس وقت ہر لمحہ میں بھگوان سے پرارتھنا کرتی تھی کہ یہ فلم کامیاب ہو جائے۔ اِس لئے نہیں کہ مجھے شہرت ملے گی۔ اِس لئے کہ میری بدنصیبی کا سایہ کہیں اُس پروڈیوسر پر نہ پڑ جائے۔ فلم تو ضرور کامیاب ہو گئی۔ لیکن اُنھیں دنوں میرے پتاجی کا سورگباش ہو گیا۔ جس سہارے پر میں کھڑی تھی وہ جھٹکے سے پیچھے کھسک گیا۔

میں گھر میں سب سے بڑی تھی اور پتاجی کے سورگباش ہونے کے بعد گھر کا سارا بار میرے کندھوں پر آ پڑا لیکن میں نے پھر بھی ہمت نہ ہاری۔ ایک ڈائرکٹر صاحب کو اپنا رفیق سمجھ کر اُن سے شادی کر لی۔ اُنھیں سے، جن کی آپ نے فوٹو دیکھی تھی۔ اُن سے شادی کرنی تھی کہ دھڑا دھڑ کئی فلموں کے لئے میرے کانٹریکٹ ہو گئے۔ دولت اور عزت قدم چومنے لگیں۔ میں اپنے آپ کو سب سے خوش نصیب انسان سمجھنے لگی۔ لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ ساری خوشیاں بھولی بھٹکی تھیں۔ چند دنوں کا جلوہ تھیں۔ میری اصلیت تو بدنصیبی کا دلدل تھی۔

کوئی ایک سال بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ مجھے بچہ نہیں ہو سکتا۔ اُس کے بعد یہ بوجھ ہر وقت میرے سینے پر اس طرح رہنے لگا جیسے میرے اُوپر پہاڑ رکھا ہُوا ہو۔ اُس وقت جی چاہتا تھا کہ کوئی مجھ سے ساری دولت لے لے۔ لیکن میری جھولی میں یہ پھل ڈال دے۔ میں نے دولت پانی کی طرح بہائی۔ ڈاکٹروں، فقیروں سب کے پیروں میں گڑگڑائی۔ لیکن... لیکن کچھ بھی حاصل نہ ہُوا۔ میری جھولی خالی ہی رہی!

پھر شادی کے تین سال بعد ہمارا طلاق ہو گیا۔"

یہ کہتے کہتے وینا کی آنکھیں بھر آئیں۔ جس بات کا مجھے ڈر تھا وہی ہُوا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے زخم کو کُرید بیٹھی اور وہ اُبل اُبل کر بہنے لگا۔ اُس نے اپنی بات جاری رکھی۔

"کبھی کبھی بار ایسا محسوس ہُوا ہے، کسی چڑیل نے میرے جسم میں اپنا گھر بنا لیا ہے۔ میں خود محسوس کرتی ہوں کہ میرے قدم منحوس ہیں۔ کئی بار دل میں آزمایا بھی ہے۔ کسی فنکشن پر جاؤں، فلم کے مہورت پر جاؤں یا کسی فلم کے پریمیئر پر۔ وہاں ضرور کوئی نہ کوئی آفت کھڑی ہو جائے گی ـــــ اب تو یہ حالت ہو گئی ہے کہ میں کسی کو اپنا کہنے سے بھی ڈرتی ہوں، کسی کو پیار کرنے سے بھی ڈرتی ہوں اور کسی کا پیار پانے سے بھی ڈرتی ہوں۔ سوچتی ہوں کہیں میری بدنصیبی کا سایہ اُس پر بھی نہ پڑ جائے۔

"بولیئے ڈاکٹر صاحب! انسان آخر کہاں تک لڑ سکتا ہے۔ کس کس کے ساتھ لڑ سکتا ہے۔ کہاں سے لاؤں من کی شانتی میں تو بھگوان سے اکثر پوچھتی ہوں آخر میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟"

کوئی اپنے آپ کی وجہ سے زندہ ہوں۔ اگر کل اس کی
کیسے بھی قدرت قدرت کے سامنے زندہ رہوں گی؟ یہ کہیں
ہونے میرے لئے مجھے ہی کیوں اس سزا کے لئے چُن لیا ہے۔
مجھے ہی کیوں ــــ؟"

یہ کہتے کہتے اُس کی آواز رُندھ گئی۔ اُس کی آنکھیں تو
پہلے سے بھری ہوئی تھیں۔ اُس کے درد نے میرے دل کو اندر سے
کی طرح چھو لیا۔

باتیں کرتے کرتے پتہ ہی نہ چلا تھا کہ کس وقت پیرس آیا
اور چلا گیا، کس وقت اندھیرا چھا گیا اور کس وقت جہاز کی بتیاں
جلیں۔ ہمارا دھیان تو اُس وقت ٹوٹا جب ڈنر کے لئے اناؤنسمنٹ
ہونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ایئر ہوسٹس مینو لے کر آئی تو وینا
نے مجھ سے کہا: "مجھے تو بھوک نہیں ہے۔ آپ اپنے لئے آرڈر
دے دیجئے۔"

میں نے کہا: "نہیں نہیں۔ تھوڑا سا ہی سہی!"

اس نے پھر نہیں کی اور میں نے اصرار کیا۔ آخر میرے بہت
کہنے پر وہ مان گئی اور ہم نے نان ویجی ٹیرین کھانے کا آرڈر
دے دیا۔

کھانا کھانے کے بعد وہ بغیر کچھ اور بات کئے اپنے خیالوں
میں کھوئی ہوئی، آنکھیں بند کرکے سو گئی۔ مجھے نیند نہیں آرہی تھی
اِس لئے کتاب نکال کر پڑھنے لگا۔ پڑھتے پڑھتے میرا دھیان بار بار
بھٹک جاتا تھا۔ میں سوچنے لگا وینا جسمانی طور پر بھی بیمار ہے
اور ذہنی طور پر بھی۔ انسان کی زندگی بھی کیا عجیب چیز ہے؟
اِس زمین پر ــــ جس پر یہ جہاز گزر رہا ہے کروڑوں انسان
بستے ہیں۔ اِس وقت مجھے اِن کی حقیقت کیڑے مکوڑوں کی طرح
معلوم ہو رہی ہے۔ لیکن جب یہ جہاز زمین پر اُترے گا تو ہر انسان
کی اپنی کہانی ہوگی۔ مصیبتوں اور غموں سے بھری کہانی!

یہی سوچتے میں پھر پڑھنے لگا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ میری
گھڑی میں ابھی تک لندن کا وقت تھا۔ میں نے ساڑھے پانچ گھنٹے
آگے کرکے اسے ہندوستان کے وقت سے ملا دیا۔ ہندوستانی
وقت کے مطابق اس وقت میری گھڑی میں رات کے ڈھائی
بج رہے تھے۔

گھڑی کا وقت ٹھیک کرنے کے بعد جب میں پڑھنے لگا تو
مجھے بھی نیند آنے لگی اور پھر دھیرے دھیرے میں بھی سو گیا۔

ایک گھنٹے بعد پھر میری آنکھ کھلی۔ اُس وقت اپنے آپ کو
فضا میں، ایک ہوائی جہاز میں دیکھ کر کچھ ڈر سا محسوس ہوا۔ یونہی ایک
خیال آیا کہ اگر یہ جہاز گر جائے تو ــــ میں نے سوچا صبح صبح
ایسے خوفناک خیال کو دل میں نہ لانا چاہئے۔ میں نے دل میں
نیک خیالوں کو لانے کے لئے ایک میوزیم میں رکھی ہوئی جاتا بدھ
کی شانت مورتی کو یاد کیا اور دھیرے دھیرے مجھے پھر نیند
آگئی۔

پھر جب میری آنکھ کھلی اُس وقت میری گھڑی میں صبح کے
سوا پانچ بج رہے تھے۔ جہاز کو بمبئی پہنچنے میں صرف بیس منٹ کی
دیر تھی۔ دیکھتے دیکھتے سبھی مسافر جاگنے لگے۔ کچھ ہلکا سا شور
سُن کر وینا بھی جاگ گئی۔ اُس کی آنکھوں سے معلوم ہو رہا تھا
کہ وہ سوئی تھوڑی دیر تھی اور سوچتی زیادہ دیر رہی تھی۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا: "گڈ مارننگ!"

وہ بھی مسکرائی اور بخندہ پیشانی بولی: "گڈ مارننگ!"

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے فضا میں پھول بکھر گئے۔

"کیسی نیند آئی؟" میں نے پوچھا۔

"اوں ــــ" اُس نے انگڑائی لیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔
"کچھ میٹھی سی، کچھ رُوٹھی سی۔"

وہ اُٹھ کر باتھ رُوم گئی۔ واپس آئی تو بمبئی پہنچنے کے
لئے اناؤنسمنٹ ہونے لگی۔ ہم پیٹیاں باندھنے لگے۔ وینا نے
کھڑکی سے نیچے دیکھا۔ دُور بمبئی کی روشنیاں دیوالی کے دیوں
کی طرح جگمگا رہی تھیں۔

جہاز اُن روشنیوں کے اُوپر آیا، نیچے اُترا۔ ہمارے دل
منزلِ مقصود پر پہنچنے کے لئے بے چین ہونے لگے ــــ لیکن
یہ کیا! جہاز پھر اُوپر اُٹھنے لگا اور دیکھتے اور دیکھتے دیکھتے روشنیوں
کو پار کر گیا۔ پھر ــــ پھر جہاز اُن روشنیوں کا چکر لگانے لگا۔
ایک چکر لگایا، دُوسرا چکر لگایا اور پھر تیسرا اور پھر لگاتا ہی گیا۔

سبھی مسافر حیران تھے کیا بات ہو گئی؟ بیچ میں ایک بار
اناؤنسمنٹ ہوئی۔ اُس سے اِتنا ہی معلوم ہُوا کہ ایروڈرم سے

گیا تھا جیسے جھوٹ، فریب اور مکاری کے بنا زندہ رہا ہی نہیں جا سکتا۔ فلمی دُنیا میں جگہ بنانا کوئی کھیل نہیں ہے ڈاکٹر صاحب۔ ہوس کی آگ سے اپنا دامن بچاتی ایک معصوم گلہری کی طرح پھدکتی پھرنے لگی۔ وہ تو میرے پتاجی ساتھ تھے ورنہ میں تو کبھی کا کسی مگرمچھ کا نوالہ بن گئی ہوتی۔

ایک فلم میں قدم رکھنے کو جگہ ملی۔ پھر دوسری میں۔ میرا ٹیلنٹ اور عزم میرے ہر پوز میں جگمگایا۔ کچھ پارکھی جوہریوں نے مجھے پہچانا اور ایک فلم میں مجھے ہیروئن کا رول ملا۔ اُس وقت مجھے اپنے اوپر یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ میں ہر وقت یہی سوچتی تھی کہ ضرور قسمت کو دھوکا ہوا ہے۔ یقین مانیئے، جب فلم ریلیز ہوئی اُس وقت ہر لمحہ میں بھگوان سے پرارتھنا کرتی تھی کہ یہ فلم کامیاب ہو جائے۔ اِس لئے نہیں کہ مجھے شہرت ملے گی۔ اِس لئے کہ میری بدنصیبی کا سایہ کہیں اُس پروڈیوسر پر نہ پڑ جائے۔ فلم تو ضرور کامیاب ہوگئی۔ لیکن اُنھیں دنوں میرے پتاجی کا سورگباش ہوگیا۔ جس سہارے پر میں کھڑی تھی وہ چپکے سے نیچے سے کھسک گیا۔

میں گھر میں سب سے بڑی تھی اور پتاجی کے سورگباش ہونے کے بعد گھر کا سارا بار میرے کندھوں پر آپڑا لیکن میں نے پھر بھی ہمت نہ ہاری۔ ایک ڈائرکٹر صاحب کو اپنا رفیق سمجھ کر اُن سے شادی کرلی۔ اُنھیں سے، جن کی آپ نے فوٹو دیکھی تھی۔ اُن سے شادی کرنی تھی کہ دھڑا دھڑ کئی فلموں کے لئے میرے کانٹریکٹ ہوگئے۔ دولت اور عزت قدم چومنے لگیں۔ میں اپنے آپ کو سب سے خوش نصیب انسان سمجھنے لگی۔ لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ یہ ساری خوشیاں بھول بھٹکی تھیں۔ چند دنوں کا جلوہ تھیں۔ میری اصلیت تو بدنصیبی کا دلدل تھی۔

کوئی ایک سال بعد مجھے معلوم ہوگیا کہ مجھے بچہ نہیں ہوسکتا۔ اُس کے بعد یہ بوجھ ہر وقت میرے سینے پر اِس طرح رہنے لگا جیسے میرے اوپر پہاڑ رکھا ہُوا ہو۔ اُس وقت جی چاہتا تھا کہ کوئی مجھ سے ساری دولت لے لے۔ لیکن میری جھولی میں پھل ڈال دے۔ میں نے دولت پانی کی طرح بہائی۔ ڈاکٹروں فقیروں سب کے پیروں میں گڑگڑائی۔ لیکن ... لیکن کچھ بھی حاصل نہ ہُوا۔ میری جھولی خالی ہی رہی!

پھر شادی کے تین سال بعد ہمارا طلاق ہوگیا۔"

یہ کہتے کہتے وینا کی آنکھیں بھر آئیں۔ جس بات کا مجھے ڈر تھا وہی ہُوا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے زخم کو کھرونچ لگی اور وہ اُبل اُبل کر بہنے لگا۔ اُس نے اپنی بات جاری رکھی۔

"کبھی بار ایسا محسوس ہوتا ہے، کسی چڑیل نے میرے جسم میں اپنا گھر بنالیا ہے۔ میں خود محسوس کرتی ہوں کہ میرے قدم منحوس ہیں۔ کئی بار دل میں آزمایا بھی ہے۔ کسی فنکشن پر جاؤں، فلم کے مہورت پر جاؤں یا کسی فلم کے پریمیئر پہ۔ وہاں ضرور کوئی نہ کوئی آفت کھڑی ہو جائے گی ــــ اب تو یہ حالت ہوگئی ہے کہ میں کسی کو اپنا کہنے سے بھی ڈرتی ہوں، کسی کو پیار کرنے سے بھی ڈرتی ہوں اور کسی کا پیار پانے سے بھی ڈرتی ہوں۔ سوچتی ہوں کہیں میری بدنصیبی کا سایہ اُس پر بھی نہ پڑ جائے۔

"بولیئے ڈاکٹر صاحب! انسان آخر کہاں تک لڑ سکتا ہے کس کس کے ساتھ لڑ سکتا ہے۔ کہاں سے لاؤں من کی شانتی میں تو بھگوان سے اکثر پوچھتی ہوں آخر میں نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟"

[illegible] کی وجہ سے زندہ ہوں [illegible] کل اس کی
[illegible] کے سامنے زندہ رہوں گی؟ کیسی
[illegible] مجھے بھی اس مزاک [illegible] چپ ہو گیا ہے۔
[illegible] ـــ؟"

[illegible] کی آواز بند ہو گئی۔ اس کی آنکھیں تو پہلے سے بھری ہوئی تھیں۔ اس کے درد نے میرے دل کو اندر سے کاٹ کر رکھ دیا۔

باتیں کرتے کرتے پتہ ہی نہ چلا تھا کہ کس وقت بیروت آیا اور چلا گیا۔ کس وقت اندھیرا چھا گیا اور کس وقت جہاز کی بتیاں جلیں۔ ہمارا دھیان تو اس وقت ٹوٹا جب ڈنر کے لئے اناؤنسمنٹ ہونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ایئر ہوسٹس مینو لے کر آئی تو وینا نے مجھ سے کہا: "مجھے تو بھوک نہیں ہے۔ آپ اپنے لئے آرڈر دے دیجئے۔"

میں نے کہا: "نہیں نہیں۔ تھوڑا سا ہی سہی!"

اس نے پھر نہیں کی اور میں نے اصرار کیا۔ آخر میرے بہت کہنے پر وہ مان گئی اور ہم نے نان ویجی ٹیرین کھانے کا آرڈر دے دیا۔

کھانا کھانے کے بعد وہ بغیر کچھ اور بات کئے اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی آنکھیں بند کر کے سو گئی۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی میں نے کتاب نکال کر پڑھنے لگا۔ پڑھتے پڑھتے میرا دھیان بار بار بھٹک جاتا تھا۔ میں سوچنے لگا وینا جسمانی طور پر بھی بیمار ہے اور ذہنی طور پر بھی۔ انسان کی زندگی بھی کیا عجیب چیز ہے؟ اس زمین پر ـــ جس پر یہ جہاز گزر رہا ہے کروڑوں انسان بستے ہیں۔ اس وقت مجھے ان کی حقیقت کیڑے مکوڑوں کی طرح معلوم ہو رہی ہے۔ لیکن جب یہ جہاز زمین پر اترے گا تو ہر انسان کی اپنی کہانی ہوگی ـ مصیبتوں اور غموں سے بھری کہانی!

سوچتے سوچتے میں پھر [illegible] لگا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ میری گھڑی میں ابھی تک لندن کا وقت تھا۔ میں نے اسے پانچ گھنٹے [illegible] کر کے ہندوستان کے وقت سے ملایا۔ ہندوستانی [illegible] میری گھڑی میں رات کے [illegible]

گھڑی کا وقت ٹھیک کرنے کے بعد جب میں پڑھنے لگا تو مجھے بھی نیند آنے لگی اور پھر دھیرے دھیرے میں بھی سو گیا۔

ایک گھنٹے بعد پھر میری آنکھ کھل گئی۔ اس وقت اپنے آپ کو فضا میں، ایک ہوائی جہاز میں دیکھ کر کچھ ڈر سا محسوس ہوا۔ یعنی ایک خیال آ گیا کہ اگر یہ جہاز گر جائے تو ـــ میں نے سوچا صبح صبح ایسے خوفناک خیال کو دل میں نہ لانا چاہئے۔ میں نے دل میں نیک خیالوں کو لانے کے لئے ایک میوزیم میں دیکھی ہوئی مہاتما بدھ کی شانت مورتی کو یاد کیا اور دھیرے دھیرے مجھے پھر نیند آ گئی۔

پھر جب میری آنکھ کھلی اس وقت میری گھڑی میں صبح کے سوا چار بج رہے تھے۔ جہاز کو بمبئی پہنچنے میں صرف چند منٹ کی دیر تھی۔ دیکھتے دیکھتے سبھی مسافر جاگنے لگے۔ کچھ ہلکا سا شور سن کر وینا بھی جاگ گئی۔ اس کی آنکھوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ سوئی تھوڑی دیر تھی اور سوچتی زیادہ دیر رہی تھی۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا: "گڈ مارننگ!"

وہ بھی مسکرائی اور خندہ پیشانی بولی: "گڈ مارننگ!"

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے فضا میں پھول بکھر گئے۔

"کیسی نیند آئی؟" میں نے پوچھا۔

"اوں ـــ" اس نے انگڑائی لیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "کچھ میٹھی سی، کچھ روٹھی سی۔"

وہ اٹھ کر باتھ روم گئی۔ واپس آئی تو بمبئی پہنچنے کے لئے اناؤنسمنٹ ہونے لگی۔ ہم پیٹیاں باندھنے لگے۔ وینا نے کھڑکی سے نیچے دیکھا۔ دور بمبئی کی روشنیاں دیوالی کے دیوں کی طرح جگمگا رہی تھیں۔

جہاز ان روشنیوں کے اوپر آیا، نیچے اترا۔ ہمارے دل منزل مقصود پر پہنچنے کے لئے بے چین ہونے لگے ـــ لیکن یہ کیا! جہاز پھر اوپر اٹھنے لگا اور دیکھتے اور دیکھتے روشنیوں کو پار کر گیا۔ پھر ـــ پھر جہاز ان روشنیوں کا چکر لگانے لگا۔ ایک چکر لگایا، دوسرا چکر لگایا اور پھر تیسرا اور پھر لگاتا ہی گیا۔ سبھی مسافر حیران تھے کہ کیا بات ہو گئی؟ [illegible] ایک بار اناؤنسمنٹ ہوئی۔ اس سے اتنا ہی معلوم ہوا کہ [illegible]

کچھ فرق نہیں پڑی۔ لیکن مسافر بیوقوف نہ تھے۔ وہ سمجھ گئے کہ جہاز خطرے میں تھا۔

وینا نے مجھ سے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا: "جہاز نیچے کیوں نہیں اتر رہا ہے؟"

میں اُسے کیا جواب دیتا۔ میں خود پریشان تھا۔ دل بے قابو ہو رہا تھا۔ میں ٹھیک جواب نہ دے سکا۔ صرف اتنا کہا: "جہاز خطرے میں ہے۔"

پھر اٹھ کر میں باتھ رُوم کی طرف چل دیا۔ سارے مسافروں کے چہرے زرد تھے، رنگ اُڑا ہوا۔ کچھ لوگ تو اونچی آواز میں پرماتما کو یاد کر رہے تھے۔ ایک دو عورتیں رُومال منہ پر رکھے اپنی سسکیوں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اُن کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

کریو کے بہت محتاط رہنے کے باوجود مسافروں کو پتہ چل گیا کہ جہاز کے پہیئے کسی خرابی کی وجہ سے باہر نہیں نکل رہے ہیں۔

واپس آکر اپنی سیٹ پر بیٹھا تو وینا نے پھر وہی سوال کیا: "جہاز کو کیا خطرہ ہے؟"

مجھے یہ بات عجیب معلوم ہوئی کہ وہ بالکل پُرسکون بیٹھی ہوئی تھی اور اُس نے یہ سوال بے خوف آواز میں کیا۔ مجھے ایسا محسوس ہُوا کہ اُسے جہاز کی خطرناک حالت کا پتہ نہ تھا یا اُسے موت کا ذرا بھی ڈر نہ تھا۔

میرے ہوش و حواس قابو میں نہ تھے، میرے ہاتھ پیر پھول رہے تھے، بات کرنے کی ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی۔ لیکن اُسے ـــــ ایک عورت کو شانت دیکھ کر میں نے دل کو قابو میں کر کے کچھ اُکھڑی ہوئی آواز میں اُسے بتایا کہ جہاز کے پہیئے کسی خرابی کی وجہ سے باہر نہیں نکل رہے ہیں۔ اب شاید جہاز کو پیراشوٹ کی مدد سے نیچے اُتارا جائے گا۔ نیچے اُتارتے وقت زمین کے ساتھ رگڑ لگنے پر کہیں اِس میں آگ نہ لگ جائے۔ اِس لئے پائلٹ جہاز کا پٹرول ختم کرنے کے لئے اِسے چکّر لگوا رہا ہے۔"

وینا بہت غور سے میری بات سُنتی رہی تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اُس نے پھر پوچھا: "رگڑ لگنے پر کیا جہاز ٹوٹ نہیں سکتا؟"

"کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اِس وقت ہم موت کے منہ میں ہیں۔ بس کوئی غیبی طاقت ہی ہمیں بچا سکتی ہے!" میں نے کہا۔

دھیرے دھیرے جہاز کو چکّر لگاتے ہوئے ڈھائی گھنٹے گزر گئے۔ دن نکل آیا اور سُورج کافی اُوپر چڑھ آیا۔ لیکن ہمیں ہر لمحہ گزرنے پر یوں محسوس ہوتا ہماری زندگی کا خاتمہ اور قریب آگیا ہے! اب تو بیچ بیچ میں اِدھر اُدھر سے تیز آواز میں رونے کی آواز بھی آجاتی ـــــ مختلف بھاشاؤں میں دبی دبی بَین کرنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب زندہ بچنا ہے مشکل! اب یہ جہاز ہی ہمارا کفن، ہمارا مدفن بنے گا!

مجھے یاد آیا کہ ابھی پچھلے دنوں بالکل ایک ایسا ہی حادثہ ہُوا تھا۔ دہلی سے سری نگر جانے والے ایک جہاز کا پہیہ جہاز کے اُوپر اُٹھتے ہی زمین پر گر گیا۔ ہوشیار پائلٹ بھانپ گیا اور اُس نے نیچے کنٹرول رُوم سے پتہ لگوایا۔ تھوڑی دیر بعد اُسے جواب مل گیا کہ پہیہ واقعی گر گیا تھا۔ اُس پائلٹ نے بھی اِسی طرح فضا میں چکّر لگا لگا کر تین گھنٹے میں پٹرول ختم کیا اور آخر اُس جہاز کو پیراشوٹ کی مدد سے نیچے اُتار لیا گیا۔ قسمت اچھی تھی اور اُس جہاز کا پیراشوٹ کھل گیا۔ اگر نہ کھلتا تو۔۔۔؟

اگر اِس جہاز کا بھی پیراشوٹ نہ کھلا تو! آخر یہ کب تک یونہی چکّر لگاتا رہے گا۔ زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین گھنٹے تک! آخر تو اِسے اُترنا پڑے گا۔ اگر اُترتے وقت زمین کے ساتھ رگڑ لگنے پر یہ ٹوٹ گیا تو اِس حادثے میں میری جان نہ بھی جائے، کوئی بازو یا ٹانگ کٹ گئی تو ـــــ

اچانک ایک اچنبھا ہو گیا!

اناؤنسمنٹ ہونے لگی کہ تھوڑی دیر میں جہاز نیچے اُترنے والا ہے۔ جہاز کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ مسافروں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اطمینان سے اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھے رہیں۔"

اور پھر دیکھتے دیکھتے جہاز رن وے پر اُتر آیا۔ وہ چوڑی سڑک پر اِس طرح تیرنے لگا جیسے کوئی موٹر بوٹ جھیل میں تیر رہی ہے۔ پھر آہستہ ہوتا ہوتا وہ اپنی جگہ پر آکر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے

[illegible] متاز دیسے [illegible] اپنی [illegible] ہو گئے۔ وہ بھی کسی غیبی طاقت نے بچا لیا تھا۔ [illegible] ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے نئی زندگی پائی ہو اور اب ایک نئی دنیا میں قدم رکھنے والا تھا۔

میں بے اختیار کھڑا ہو گیا۔ لوگوں کے پُر مسرت چہروں کو دیکھ کر میرے اندر بھی جوش بھر آیا۔ دروازہ کھلا تو سب باہر جانے کو بے چین ہو اٹھے۔

تبھی ایک دم مجھے وینا کی یاد آئی۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ وہ اسی طرح شانت بیٹھی تھی۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تھپتھپایا تو وہ بے اختیار ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا اور اسے بازو سے پکڑ کر بولا: "اب رونے کی کیا بات ہے وینا جی؟ اب تو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اٹھئے۔"

اتنے میں ایئر ہوسٹس بھی دوڑتی ہوئی آئی۔ میں نے اسے ایک گلاس پانی لانے کے لئے کہا۔ میں دل میں حیران تھا کہ یہ اب کیوں رو رہی ہے؟

تھوڑی دیر بعد ایئر ہوسٹس پانی کا گلاس لائی۔ میں نے اسے ہاتھ میں لے کر وینا کو دیتے ہوئے کہا: "لو یہ پی لو۔ ہمیں تو بھگوان کا شکر کرنا چاہئے کہ اس نے ہمیں نئی زندگی دی ہے!"

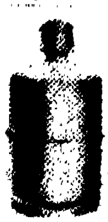
میرے ساتھ ایئر ہوسٹس نے بھی وہی الفاظ دہرائے۔ وینا نے گلاس میرے ہاتھ سے لے کر تھوڑا سا پانی پیا۔ اس کا رونا تو رک گیا لیکن سسکی تھی کہ بچوں کی طرح رہ رہ کر اس کے چہرے کو ہلا دیتی تھی۔ میں نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور کہا: "نئی زندگی مبارک ہو!"

تھوڑی دیر بعد اپنے اپنے بیگ سنبھال کر جب ہم اٹھے تو میں نے دیکھا سارے مسافر جا چکے تھے اور ہم دو آخری مسافر رہ گئے تھے۔ سیڑھیاں اترتے وقت میں نے اسے سہارا دیا۔ جب ہم نے زمین پر قدم رکھا تو میں اس سے ایک سوال کئے بغیر نہ رہ سکا۔ پوچھا: "وینا جی! جب جہاز خطرے میں تھا تب تو آپ بالکل شانت تھیں اور جب جہاز خطرے سے باہر تھا تب آپ کیوں رونے لگیں؟"

چلتے چلتے وہ رک گئی۔ میری طرف پُرنم آنکھوں سے دیکھ کر بولی: "ڈاکٹر صاحب! دیکھا نہیں آپ نے۔ مجھ منحوس کی وجہ سے جہاز خطرے میں پڑ گیا۔ آپ کی... نہیں، سارے مسافروں کی جان خطرے میں پڑ گئی۔ میں نے دل میں بھگوان سے کہا کہ مجھ سے دشمنی ہے تو مجھے سزا دو۔ میرے ساتھ ان بیچاروں کی جان کیوں جائے۔ ان لوگوں کا کیوں خون ہو ـــــ ڈاکٹر صاحب! میں تین گھنٹے تک بھگوان سے لڑتی رہی ـــــ لڑتی رہی ـــــ اور آخر بھگوان نے میری سن لی۔ دیکھا آپ نے ڈاکٹر صاحب ـــــ!"

اور یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں چھلچھلانے لگیں اور آواز بھر آئی ـــــ! اپنے خوبصورت ہمسفر کو مغموم دیکھ کر میں سوچنے لگا ـــــ کاش! اس خوبصورت عورت کی آنکھوں میں آنسو نہ ہوتے، سرور و انبساط کی چھلکتی ہوئی شراب ہوتی۔ رخساروں پر گلاب کھلے ہوتے!!

بلی ۲ حفاظتی سلنڈر — ۱-۲

پکوان گیس کو  قابو میں رکھیے!

پیٹرولیم گیس — جسے عام طور پر پکوان گیس کہتے ہیں — اگر اس پر دھیان نہ دیا جائے تو شدید پریشانیوں کا باعث بن سکتا ہے۔ اس سے بچنے کا ایک یقینی طریقہ یہ ہے کہ جس وقت استعمال میں نہ ہو تو سلنڈر والو اور برنر کے ناب کو اچھی طرح بند رکھیں۔

مندرجہ ذیل چند ہدایات پر عمل کریں۔ اس سے گھروں میں آگ کے جان لیوا خطرات کو دور رکھا جا سکتا ہے:

ان باتوں پر عمل کریں ■ سلنڈر والو اور برنر کے ناب، عدم استعمال کے وقت، مضبوطی کے ساتھ بند رکھے جائیں۔ ■ جب ریفل سلنڈر کا کنکشن جوڑنا ہو تو سبھی شعلے بجھا دیے جائیں ■ جب سلنڈر کا کنکشن جوڑ دیا گیا ہو تو صابن کے سولیوشن کے ذریعے ریگولیٹر جوڑوں کو جانچ کر دیکھ لیجیے۔ ■ سلنڈر والو کو کھولنے کے لئے صرف ہلکے دباؤ سے کام لیجیے اور ہاتھ کے چکر کو گھڑی کی سوئیوں کے مخالف سمت میں بس آدھا ہی گھمایئے۔ ■ ناب کو گھمانے سے پہلے جلتی ہوئی دیا سلائی کو پہلے برنر سے لگا دیجیے۔ ■ جب بھی ریفل کا کنکشن جوڑیں ہر بار فلیکسیبل ہوز کی حالت کو جانچ لیا کریں اور اسے ہمیشہ صاف رکھیں۔

مندرجہ ذیل باتوں سے گریز کریں ■ سلنڈر کو پہلوؤں پر مت پڑا رہنے دیجیے۔ ■ گیس سلنڈر کے کنکشن کو آپ خود نہ تو جوڑیے نہ الگ کیجیے۔ اپنے ڈسٹری بیوٹر سے کہیے کہ وہ آپ کے لئے سلنڈر کے کنکشن کو الگ کر دے اور جوڑ دے۔ ■ سلنڈر والوز، یا پریشر ریگولیٹر یا برنر کو خود نہ تو چھیڑیں نہ مرمت کریں۔ ■ فلیکسیبل ہوز کو ریگولیٹر سے یا برنر سے نہ کھینچیے اس سے حادثات پیش آ سکتے ہیں۔ ■ ہمیشہ فلیکسیبل ٹیوبنگ کو آنچ سے الگ رکھیے

اپنا انسٹرکشن کارڈ اپنے ڈسٹری بیوٹر سے طلب کر لیجیے اور اس میں دی ہوئی ہدایتوں پر سختی سے عمل کیجیے



اپنے ہر فن مولا کو دور ہی رکھیے!



یہ ہر کام کو اپنے تئیں کرنے والا ماہر ہے! لیکن ہمیں چاہیے کہ سلنڈر کے کنکشن کو جوڑنے اور الگ کرنے کے لئے اس کام کو کرنے والے پیشہ ور ٹیکنیشین ہی پر بھروسہ کریں۔ ایسا ہی اس وقت بھی کرنا ضروری ہے جب سلنڈر والو کو یا پریشر ریگولیٹر یا برنر کو ٹھیک بٹھانے یا مرمت کی ضرورت ہو۔ ہمیشہ... ڈسٹری بیوٹر ہی کو بلانے پر زور دیجیے۔

Indane

انڈین — پکانے کے دوسرے ایندھنوں کی طرح بے ضرر

روشناس کنندہ
انڈین آئل کارپوریشن لمیٹیڈ

آتشبازی تماشہ ہی — لیکن آپکے باورچیخانے میں نہیں!

آتشبازی کو دیکھنا یقیناً بھلا معلوم ہوتا ہے بشرطیکہ وہ آپکے باورچیخانے میں نہ ہو رہی ہوں۔ ٹھیک یہی بات پیش آسکتی اگر آپ اس فلیکسیبل ٹیوبنگ کی طرف سے غفلت برتیں گے جو سلنڈر اور برنر کے کنکشن کو جوڑتا ہے۔ جب جب ریفل کا کنکشن جوڑا جائے تب تب ہر بار اس کی حالت کی جانچ کر لیا کریں اور جونہی آپکو ذرا سی بھی شکستگی دکھائی دے اُسے فوراً ہی بدل دیجئے۔



مندرجہ ذیل چند ہدایات پر عمل کریں۔ اس سے گھروں میں آگ کے جان لیوا خطرات کو دور رکھا جاسکتا ہے۔ ان باتوں پر عمل کریں ■ سلنڈر والو اور برنر کے ناب عدم استعمال کے وقت مضبوطی کے ساتھ بند رکھے جائیں۔ ■ جب ریفل سلنڈر کا کنکشن جوڑا جا رہا ہو تو سبھی شعلے بجھا دیئے جائیں۔ ■ جب سلنڈر کا کنکشن جوڑ دیا گیا ہو تو صابن کے سولیوشن کے ذریعے ریگولیٹر جوڑوں کو جانچ کر دیکھ لیجئے۔ ■ سلنڈر والو کو گھمانے کے لئے صرف ہلکے دباؤ سے کام لیجئے اور ہاتھ کے چکر کو گھڑی کی سوئیوں کے مخالف سمت میں بس آدھا ہی گھمایئے۔ ■ ناب کو گھمانے سے قبل جلتی ہوئی دیا سلائی کو پہلے برنر سے لگا دیجئے۔ ■ جب بھی ریفل کا کنکشن جوڑیں ہر بار فلیکسیبل ہوز کی حالت کو جانچ لیا کریں اور اُسے ہمیشہ صاف رکھیں۔

مندرجہ ذیل باتوں سے گریز کریں ■ سلنڈر کو پہلوؤں پر مت پڑا رہنے دیجئے۔ ■ گیس سلنڈر کے کنکشن کو آپ خود نہ تو جوڑیئے نہ الگ کیجئے۔ اپنے ڈسٹری بیوٹر سے کہئے کہ وہ آپ کے بھرے سلنڈر کے کنکشن کو الگ کر دے اور جوڑ دے۔ ■ سلنڈر والو، یا پریشر ریگولیٹر یا برنر کو خود نہ تو کھولیں نہ مرمت کریں۔ ■ فلیکسیبل ہوز کو ریگولیٹر سے یا برنر سے نہ کھینچئے اس سے حادثات پیش آسکتے ہیں۔ ■ ایسے فلیکسیبل ٹیوبنگ کو آنچ سے الگ رکھئے۔

لہٰذا انڈین کنکشن کارڈ اپنے ڈسٹری بیوٹر سے طلب کر لیجئے اور اُس میں دی ہوئی ہدایتوں پر سختی سے عمل کیجئے۔

ایک چھوٹی سی چنگاری سی زبردست آگ لگ سکتی ہی!



جس وقت ریفل سلنڈر کا کنکشن جوڑا جا رہا ہو اس وقت سگریٹ سلگانے سے بھی دور رہنا چاہیئے۔ جس وقت کنکشن دیا جا رہا ہو تو تمام شعلوں کو بجھا دیجئے اور بڑی آگ بجھا دیجئے۔



Indane

انڈین — پکانے کے دوسرے ایندھنوں کی طرح بے ضرر

انڈین آئل کارپوریشن لمیٹیڈ

غزلیں

امر چند قیس جالندھری

جب ملی مے اذانِ شام ہوئی
مے کشی اور بھی حرام ہوئی

وعظ سُن سُن کے تیرا اے واعظ!
زیست کی ہر خوشی حرام ہوئی

نگہِ اوّلیں کا کیا کہنا!
شوقِ پیہم کا جو پیام ہوئی

آپ ہی سی ہے آپ کی تصویر
نہ کبھی ہم سے ہمکلام ہوئی

ہو چلے عام حُسن کے جلوے
اب اگر عاشقی بھی عام ہوئی؟

تارے گنتے کٹی شبِ فُرقت
راہ تکتے سحر سے شام ہوئی

چشمِ ساقی کے فیض سے اے قیس!
مے پرستی ہمیں حرام ہوئی

دھرم پال عاقل ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی

اب کسے فکرِ دُنیا و دیں ہے
ہم ہیں اور اُن کی یادِ حسیں ہے

یہ ترا سحر اے مہ جبیں ہے
میں کہیں تو مرا دل کہیں ہے

یاد آتا ہے رہ رہ کے کوئی
دُور ہو کر بھی کتنا قریں ہے

تنگ ہیں جو زمانے کے ہاتھوں
موت بھی اُن کو آتی نہیں ہے

اِس کو دوزخ بنایا ہمیں نے
ورنہ دُنیا بہشتِ بریں ہے

ہم نے سب کے دلوں کو کُریدا
بے غرض کوئی اِنساں نہیں ہے

وُہ بھی ہے کوئی انسان عاقل
جس کے دِل میں محبت نہیں ہے

قمر مراد آبادی

تُم اُسی کو دِجِہِ طرب کہو، ہم اُسی کو باعثِ غم کہیں
وہی اِک فسانۂ عشق ہے کبھی تُم کہو کبھی ہم کہیں

کبھی ذکرِ مہر و وفا کریں، کبھی داستانِ الم کہیں
بڑے اعتماد سے وہ سُنیں، بڑے اعتماد سے ہم کہیں

وہی دلخراش سی اِک نظر جو بقدرِ ذوق ہے نیشتر
کوئی اُس کو طرزِ ستم کہے، ہم ادائے پرسشِ غم کہیں

جسے انقلاب نہ چھو سکا اُسے تُو نے خود ہی مٹا دیا
وہی ایک دل کا صنم کدہ، جسے آبروئے حرم کہیں

تجھے یہ خبر نہیں ساقیا کہ ہے میکشوں کا مقام کیا
یہ اُنھیں کی وسعتِ ظرف ہے کہ خود اپنے ظرف کو کم کہیں

ہمہ آرزو ہمہ بیخودی، ہمہ بندگی ہمہ بیکسی
یہی چند لمحوں کی زندگی اسے کیوں نہ فرصتِ غم کہیں

قمرؔ اس سے ہم کو غرض ہی کیا کہ جُدا جُدا ہے معاملہ
جو خدا کہیں وہ خدا کہیں، جو صنم کہیں وہ صنم کہیں

خوابوں کا سفر

کوثر جہاں کوثر ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ
(اسٹوڈنٹ گورنمنٹ مہاکوشل آرٹس کالج نگر چیری، جبل پور مدھیہ پردیش)

محترم بھائی صاحب! خلوص و احترام

لیجئے سالنامہ کے لئے "خوابوں کا سفر" حاضر ہے۔ یہ افسانہ ایک برس پہلے ایک خبر کے تاثرات سے متاثر ہو کر لکھا تھا لیکن وہ کہیں گم ہو گیا —— گم شدہ افسانے کی جذباتی تھیم میرے ذہن میں محفوظ تھی۔ اس لئے دوبارہ اسے پھر لکھا ہے۔ میرے لکھنے میں قارئین "بیسویں صدی" کا پُرخلوص اصرار اور پسند بھی شامل ہے۔ تصویر پھر سنجیدہ آگئی ہے۔ نجانے کیوں کیمرے کے سامنے سنجیدہ ہو جاتی ہوں۔ ویسے میں اتنی سنجیدہ نہیں ہوں جتنی تصویر اور تحریر میں نظر آتی ہوں —— گذشتہ افسانے کے سلسلے میں ہندوستان کے علاوہ غیر ممالک سے بھی بہت سے خطوط موصول ہوئے۔ یہ حقیقت ہے میں قارئین کو جواب نہ دے سکی۔ اُن کا شکریہ ادا کرنے کے لئے "بیسویں صدی" کے توسط کا سہارا لے رہی ہوں۔ گذشتہ دنوں کالج آف ہوم سائنس سے ٹرانسفر ہو کر مہاکوشل آرٹس کالج (ڈگری کالج) میں آگئی ہوں۔ یہاں ایم۔ اے کی اسٹوڈنٹ تھی۔ وقتی طور پر یہی میرا پتہ ہوگا......

نیک تمناؤں کے ساتھ آپ کی بہن —— کوثر

★

"اب میں تمہارے کسی دوست کے یہاں نہ جاؤں گی" سپنا نے بے حد سخت لہجے میں کہا اور آفتاب بے بسی سے اُس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

کل وہ اُسے سمجھا بجھا کر اپنے دوست راکیش کے یہاں چھوڑ آیا تھا۔ راکیش کی فیملی ساتھ تھی اور فلیٹ بھی کافی بڑا تھا۔ اور پھر سپنا کا وہاں رہنا ہی آفتاب کے لئے باعثِ اطمینان تھا۔

باہر بارش تیز ہو گئی تھی۔ وہ دریچے کے پاس کھڑی آسمان کی وسعتوں میں نجانے کیا تلاش کر رہی تھی۔ اُس کے سیاہ گھنے بال بھیگی ہوئی ہواؤں کے جھونکوں سے اُڑ رہے تھے۔ چہرے کے تاثرات آفتاب کی نظروں سے اوجھل تھے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ سپنا کا اُداس اُداس چہرہ اور زیادہ بکھر گیا ہوگا۔ اُس کی آنکھوں میں تیرتی ہوئی ویرانیاں اور زیادہ گہری ہو گئی ہوں گی۔

وہ کمرے کی ایک ایک چیز کو بہت انہماک سے دیکھنے لگا۔ اُس کے کمرے کی بے ترتیب اور بکھری ہوئی چیزیں قرینے سے اپنی جگہ رکھی ہوئی تھیں۔ دُھلا ہوا ٹیبل کلاتھ ٹیبل پر پڑا تھا۔ پلنگ پر بے شکن چادر، دُھلے ہوئے تکیے کے غلاف، کونے میں رکھی ہوئی تپائی پر کروشیے سے بنا ہوا جالی دار پوش اور کتابوں کی شیلف پر ترتیب سے رکھی ہوئی کتابیں۔

آج جب آفتاب یونیورسٹی سے گھر آیا تو سپنا کمرے کی صفائی میں مصروف تھی۔ کل شام سے وہ اچانک ہی آگرہ پہنچی تھی۔

کرسی پر بیٹھ کر اُس نے جوتے کے بند کھولتے ہوئے مسکرا کر سپنا کی طرف دیکھا اُس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی.....

"چائے لو گے یا کافی؟" وہ بک شیلف میں کتابیں جماتے ہوئے بولی۔

"کافی ——" آفتاب قمیص کے بٹن کھولنے لگا۔

ملگجے سے بال لئے کونہ گھر سپنا ساڑی اور بلاؤز لے کر غسل خانے چلی گئی۔ آفتاب کپڑے بدل کر شو بنانے لگا۔

آفتاب کی آنکھوں میں سپنا کا اداس چہرہ گھوم رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر ذرا بھی سُرخی نہ تھی۔ اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تفکرات کے غماز تھے۔ چھ برس پہلے جب وہ دونوں بی۔ایس سی میں تھے۔ اُس وقت بھی سپنا اُس کے لئے اجنبی نہ تھی۔ سپنا ہمیشہ ہی سے پُروقار، سنجیدہ اور کم گو تھی۔ سنجیدگی کے باوجود آفتاب کی شرارتوں پر زوردار قہقہے لگاتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلک پڑتے تھے اور آفتاب اُس کی اِس حالت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اپنی شرارتیں برقرار رکھا کرتا اور اُسے ستانے کے لئے اکثر گرلس ہوسٹل کے لان میں پہنچ جاتا — کبھی کبھی گاؤں سے سپنا کی بھابی کا دیا ہوا سامان لے کر پہنچ جاتا۔ یہ سامان گاؤں سے لوٹتے وقت اکثر سپنا کی بھابی اُسے تھما دیتی تھی۔

"سپنا! یا تو تم ہنس لو جی بھر کر یا — " وہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر سیٹی پر کسی دُھن کی مشق کرنے لگتا۔

"یا — کیا!؟" وہ اپنی ہنسی بھول کر حیرت سے اُسے دیکھتے ہوئے کہتی۔

"یا پھر رو لو — " وہ ہنستے ہوئے اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے دبا لیتی اور ساڑی کے آنچل سے اپنے آنسو پونچھ ڈالتی۔

"کیا تم سوچتی ہو کہ تمہاری ہنسی ختم ہو گئی — " وہ اُسے ٹوکتا۔

"اور نہیں تو کیا — ؟" سپنا معصومیت سے کہتی۔

"تمہاری آنکھیں اب بھی مسکرا رہی ہیں۔" اور سپنا ساری کے آنچل سے مُنھ ڈھانپ کر ہنسنے لگتی — اور پھر گاؤں سے لایا ہوا سامان لے کر گرلس ہوسٹل کی طرف بھاگ جاتی۔

"کافی تیار ہے!" سپنا نے آہستہ سے اُس کے پاس آکر کہا۔

اور آفتاب کے ہونٹوں کی مُسکراہٹ یوں ختم ہو گئی، جیسے بے حد پیارا خواب دیکھتے ہوئے اچانک ہی کوئی جاگ جائے۔

کافی پینے کے بعد آفتاب نے کپڑے تبدیل کئے۔ جب دونوں تیار ہو کر باہر نکلے تو مطلع صاف تھا۔

اگست کی ایک دلفریب شام تھی۔

دُھلا دُھلا سا نیلا آسمان، بارش کی بھیگی ہوئی ہوائیں جمنا کے سینے اور پُرشور سیاہ کو چھوتی ہوئی — شام کے حسن کو رنگینیاں بخشتی تاج محل سے ٹکراتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ سپنا محبت کی اُس بے مثال یادگار کے نظارے میں محو تھی۔ تاج کے قریب سے گزرتے ہوئے بے حد ادب اور عقیدت سے اُس نے ملکہ کی خوابگاہ کی دہلیز پر اپنی پیشانی جھکائی اور جھک کر آہستہ سے بوسہ دیا — اُس کے چہرے پر بلا کا سکون تھا — طمانیت تھی۔

آفتاب نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں ایک ایسی رہگذر پر آکر رک گئے جہاں دونوں طرف خودرو پودے تھے۔ آفتاب زمین پر تقریباً لیٹ گیا، اور سپنا خیالات میں ڈوبی ہوئی اس کے قریب بیٹھ گئی۔ کچھ یوروپین لڑکیاں اُن کے قریب سے قہقہے لگاتی ہوئی گزر گئیں۔

"سپنا — !" آفتاب نے اُسے یونہی پکارا۔

"کیا — ؟" وہ جیسے خوابوں میں ڈوبتے ہوئے بولی۔

"تم اِس انداز میں کافی بزرگ نظر آتی ہو" اُس نے کچھ شرارت سے کہا۔

"رحمت" وہ مُسکرا دی۔

"سنو!"

"ہوں"

"گھر کب واپس جاؤ گی — ؟" وہ سنجیدہ ہو گیا۔

"واپس، واپس، واپس!" وہ تلملا گئی اِس بے تکے، بے محل سوال پر "کہہ دیا نہیں جاؤں گی، نہیں جاؤں گی!" اُس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ "مجھے دو لمحے، دو گھڑیاں تو سکون سے گزارنے دو آفتاب!" اُس کا دل رو پڑا اپنی بے کسی پر۔

"میرا کوئی گھر نہیں، مجھے کہیں واپس نہیں جانا ہے" اُس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

آفتاب اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ایسا نہیں کہتے سپنا — آج نہیں تو کل وہ تمہیں گھر لینے جائیگا۔ اُسے اگر تمہارے پاگل پن کا پتہ چل گیا تو بہت بُرا ہوگا۔ تمہارا واپس جانا ہی مناسب ہے — پھر تم نے گھر والوں کو بھی تو مطلع نہیں کیا، اُنہیں جب یہ سب معلوم ہوگا تو وہ لوگ پریشان ہو جائیں گے۔"

"آفتاب مجھے کچھ مت یاد دلاؤ — تم نہیں جان سکتے [illegible]

[illegible] آفتاب
تم اس کے چہرے سے واقف نہیں ہو۔ اتنا حسین اتنا کھلا چہرہ [illegible]
انسان ——— [illegible] اس کے ساتھ زندہ رہ رہی ہوں
——— اُف!

"آفتاب ——— [illegible] مجھے کچھ بھی یاد مت
دلاؤ۔" اس کی گہری اداس آنکھیں بھر آئیں۔
آفتاب خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔

وہ اٹھ کر سامنے پڑی سنگ مرمر کی بینچ پر بیٹھ گئے۔
آفتاب خاموشی سے سوچتا رہا اس کے بارے میں۔
یہ لڑکی ——— جو اس طرح آنکھوں میں آنسو لیے
کی داستانیں سمیٹے ہے، اس کے لئے صرف اس کی
مسکراہٹوں کی خاطر ——— کہ اس کی زندگی میں آفتاب
کا نام آنسو بن کر شامل نہ ہو۔ اس نے اپنا گھر چھوڑ دیا، اپنا
گاؤں چھوڑ دیا ——— اور تنہا اس مشینی شہر میں جہاں دو چار
دوستوں کے سوا اس کا اپنا کوئی نہیں ——— کوئی ہم آشنا
نہ تھا یہاں وہ ان لوگوں کی طرح زندہ رہ رہا ہے جن کی زندگی
میں صبح و شام کی رنگین خوشگواریاں بے معنی ہیں جب سورج
کی کرنیں زمین پر تیز ہو جائیں تو پھیکی سی بے کیف زندگی کا آغاز۔
اور جب شام کا سُرمئی اندھیرا گہرا ہو جائے تو زندگی کی بے رنگ شام جیسے
کوئی تھکا ہوا مسافر ——— جسے اپنی منزل کا کوئی سُراغ تک نہ معلوم
ہو اور پھر راستہ اجنبی راہوں سے جا ملے۔
آفتاب زندگی کی سنسان رہگذر پر بھٹکے ہوئے قدم بڑھاتا۔
بے معنی سفر پر آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔
[illegible]
[illegible]
[illegible] آئیں گے۔
[illegible] دل میں تھی۔
[illegible] آگے کر دی گئی ہیں وہ
کبھی [illegible] اور ہم [illegible] بھی نہیں سکتیں ——— اگر میں
چاہوں بھی تو نہیں، تمہاری سُلگتی ہوئی زندگی سے نجات دلانا ممکن نہیں۔



وہ سپنا کی طرف دیکھتے ہوئے سوچتا رہا ——— سپنا سفید ساڑی میں ملبوس
کسی راہبہ کی طرح نظر آ رہی تھی۔
سامنے سنگ مرمر کی بینچ پر بیٹھا ہوا ایک امریکن اپنی ساتھی لڑکی
کے بال سنوارنے میں مصروف تھا۔ لڑکی گم صُم بیٹھی تاج کو گھورے جا رہی
تھی۔
آفتاب بچن کی "مدھو شالا" کا مصرع گنگنانے لگا۔
"اس پار پریے تم ہو مدھو ہے ——— اُس پار نہ جانے کیا ہوگا
[illegible]
[illegible]
کے دُھندلکوں میں سپنا نے کبھی اپنے نام کے ساتھ آفتاب کا نام زینے پر
لوہے کی چابی سے نقش کر دیا تھا اور اب وہ بار بار اُس کھودے ہوئے نام کو
اپنی نازک انگلیوں کے لمس سے محسوس کر رہی تھی۔

خموشی

ایسے صیاد نے کچھ، گل نے کچھ، بلبل نے کچھ سمجھا
چمن میں کتنی معنی خیز تھی اک خامشی میری ——— جگر

جان پر آ بنی ہمدم مری خاموشی سے
بات کچھ بن نہیں آتی ہے اب اظہار بغیر ——— دیوانہ

کیا قیامت ہے شبِ وصل خموشی اُس کی
جس کی تصویر کو بھی ناز ہے گویائی کا ——— سیاحں

اپنی لذت میں گم ہوئے نغمے
اب خموشی سخن سے بہتر ہے ——— اثر

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں ——— مومن

مرسلہ: سنذیا محمود۔ لائٹ انجینیرنگ، بکسر

آتی رہیں گی ——— آتی رہیں گی ——— آتی رہیں گی۔

"سپنا ——— سپنا ——— !" آفتاب نے آہستہ سے آواز دی۔

وہ سر جھکائے ہوئے خوابوں کا سفر طے کر گئی۔ ——— اُسے محسوس ہوا جیسے آفتاب اُسے بہت دور سے آواز دے رہا ہے۔

"ہاں ———" اُس نے اُداس لہجے میں کہا۔

"چلو چلیں ——— اس سے پہلے کہ پہرے دار ہمیں جانے کو کہیں ہمیں خود چلنا چاہئے۔"

سارے لوگ جا چکے تھے اور ——— پُرسکون ماحول میں تاج اپنی جلوہ سامانیوں کے ساتھ جاگ رہا تھا ——— ایک پُراسرار سی فضا کی ویرانیوں میں ڈوبا ہوا چمن زار۔ جگنوؤں کی چمک سے جگمگا رہا تھا اور وہ دونوں آہستہ خرام تھے۔ گیٹ پر پہنچ کر سپنا چند لمحوں کے لئے رُکی پھر مُڑ کر حسرت بھری نگاہ اُس پُرسکون فضا میں ڈالی اور پھر وہ باہر نکل آئے۔

اُس نے اپنے تخیل میں اپنی زندگی کا جو رُوپ سجا رکھا تھا اُس رُوپ کی اَنا کو تسکین پہنچانے کے لئے اُس نے اپنا اور آفتاب کا نام قریب قریب لکھ کر اپنے لاشعور کی دنیا میں سینکڑوں خوبصورت رنگ بھر دیئے اور زمانے سے بے خبر، اپنے آپ سے بے خبر روح کی بے پایاں مسرت کی دولت اپنے دامن میں سمیٹے دور اندھیری رات میں چمکتے ہوئے ستاروں کی روشنی کے سہارے ——— جمنا کو چھو کر گزرتی ہوئی ہواؤں کے دھیمے سحر انگیز نغمے کی لَے پر اس کا وجود گنگنا رہا تھا۔

ہم کل جب یہاں نہ ہوں گے تو پتھروں پر کھُدے ہوئے ہمارے ناموں کو جمنا کے دھیمے شور سے گزرتی ہوئی ہوائیں اپنی رعنائیوں کے ساتھ سرگوشیوں میں زندگی اور ابدیت کا پیغام سنا سنا کر بکھریں اور تم ——— تم اور میں ——— اپنے ناموں کے ساتھ اس حسین وادی میں آنے والے محبت کی تلاش میں سرگرداں دلوں میں خوشبو بن کر سماتے جائیں گے۔

ہمارا نام تاج کی طرح زندہ و پائندہ تو نہیں، لیکن ہم کہیں بھی جائیں۔ کہیں بھی رہیں، ہماری رُوحیں اپنے وجود کو ابدیت بخشنے کے لئے اِس لافانی محبت کی حسین آرام گاہ میں چاندنی راتوں اور ستاروں سے کرنوں کا روپ لے کر اندھیری راتوں میں جگنو کی چمک بن کر تاج کا طواف کرنے کے لئے

سپنا محوِ خواب تھی ———

آفتاب کی آنکھوں سے نیند کوسوں دُور تھی۔ وہ سوچ رہا تھا گزرے ہوئے واقعات ایک ایک کر کے اُسے یاد آتے رہے۔ سپنا جن حالات کے تحت اُس تک پہنچی تھی۔ وہ ناقابلِ یقین حد تک بدتر تھے۔ سماجی نقطۂ نظر سے اُس کا اپنے سسرال سے بغیر کسی کو اطلاع دیئے آفتاب تک پہنچ جانا ایک طرح سے سپنا کو ایسے جرم کا مرتکب کر گیا تھا جو کسی بھی حالت میں ناقابلِ معافی تھا۔ اس سانحے کا ذمّہ دار صرف آفتاب ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ اگر گندی سیاست کا ذرا سا بھی عُنصر اِس جذباتی حادثے میں شامل ہو جائے ——— اور یہ سوچتے ہی وہ بے چین ہو گیا۔ بستر سے اُٹھ کر کمرے میں ٹہلتے ہوئے اُس کی نگاہ سپنا کے تھکے ہوئے لیکن پُرسکون سے معصوم چہرے پر پڑی۔ وہ صوفہ کم بیڈ پر نیند کی وادیوں میں گم تھی۔

سوگوار اور زرد سا چہرہ، کتنی کمزور ہو گئی تھی وہ! اُس کی نازک گردن کی گولائی میں ہڈیوں کا ہالہ سا بن گیا تھا۔ یہ ساری باتیں اِس بات کی غماز تھیں کہ وہ شدید ذہنی اور جذباتی انتشار سے نجات حاصل نہیں کر سکی تھی۔ اُسے اِس حالت تک پہنچانے میں کسے مورد الزام ٹھہرایا جا سکتا تھا۔

سپنا کے بھائی بھابی ——— جو اُس کی شادی اور خوشی
[illegible] سے واقف ہوتے ہوئے بھی انجان تھے
سپنا کی ڈیڈی ——— ؟ جو وقت اس کے حساس دل کو
ٹھیس پہنچا رہا۔

یا پھر وہ پنڈت جی ——— ؟ میں تمہیں دُکھوں کے سوا تحفہ
اور [illegible] کے سوا دے بھی کیا سکتا تھا۔ اُس کے ماتھے پر پسینے کے
بے شمار قطرے اُبھر آئے ——— اور خیالات کا ایک نہ تھمنے والا ریلا
ماضی کی طرف بہتا چلا گیا۔

گاؤں کی سنسان سی پگڈنڈی پر اچانک سپنا اُس کے سامنے آکر ٹھہر گئی۔

"آفتاب! میری شادی طے ہوگئی ہے۔" اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور آفتاب کے چہرے کے تاثرات کا ردِ عمل دیکھنے کے لئے اُس کے قریب آگئی تھی۔

"مبارک ہو ———" آفتاب پُرسکون لہجے میں بولا تھا۔

"میں آج بابی اور امی سے ملنے آؤں گی۔ تم اب تک رہو گے یہاں۔؟" سپنا کے لہجے میں تھرتھراہٹ تھی۔

"کچھ ٹھیک نہیں۔ کل ہی چلا جاؤں یا نہ بھی جاؤں ———" آفتاب کا لہجہ پھر پُرسکون تھا۔

"آگرہ جا کر کیا کرنے کا ارادہ ہے ———" دوستانہ لہجے میں سپنا نے پوچھا تھا۔

"ریاضیات و شماریات میں یو۔جی۔سی۔ کی اسکالر شپ کے لئے منتخب ہوگیا ہوں۔ ریسرچ ہی کروں گا۔"

"ہائے آفتاب! سچ تم ریسرچ کرو گے ———!" وہ خوشی سے بے تاب ہوگئی تھی۔

اور شام جب آفتاب اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا یوں ہی ورق گردانی کر رہا تھا تو سپنا سلیٹی رنگ کی سوتی ساڑی میں ملبوس دروازے پر آکھڑی ہوئی تھی۔

گھنے لمبے بالوں کی موٹی سی چوٹی سامنے کئے ہوئے اور بالوں کی منتشر لٹوں کو پیچھے سرکاتے ہوئے اُس نے اپنا بایاں ہاتھ آگے کیا تھا۔

"یہ کیا ہے ———" آفتاب نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"یہ ——— یہ میرا بیگ ہے۔ اس میں میرے ——— میرے کپڑے [illegible] تھی۔

[illegible] ——— وہ بظاہر ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا تھا۔

بجلی

بجلی گری وہ دل پہ کہ اللہ کی پناہ
اُس چرخِ ناز سے قدِ بالا کہیں جسے ——— [illegible]

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو ——— غالب

قفس کے سامنے بجلی کچھ اس طرح چمکی
نظر تک پھر گئی تصویر آشیانے کی ——— جگر مرادآبادی

بجلیاں زور اپنا دکھاتی رہیں
اور ہم آشیانہ بناتے رہے ——— قمر لکھنوی

نشیمن تو چمن میں پھر بنا لوں گا مگر بجلی
جہاں اک بار گرتی ہے وہاں سو بار گرتی ہے ——— [illegible] سعیدی

مرسلہ: ایس۔ ایس۔ ہنکاری۔ ایم۔ اے۔ شیلانگ

لیکن وجود کی گہرائیوں تک لرزا سا دوڑ گیا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی، میرا فیصلہ ہے قطعی اور آخری۔" سپنا نے بے حد پُرسکون بڑے پُروقار انداز میں کہا تھا۔

"تباہیوں کی طرف بڑھتے رہنے کا تمہارا فیصلہ قطعی اور آخری ہے۔" وہ بڑے دُکھ سے بولا تھا اور وہ سکتے کے عالم میں کھڑی رہ گئی تھی۔

"ہمارے درمیان مذہب کی خلیج ہے سپنا۔ مذہب کی حدوں سے نہ تم گزر سکتی ہو اور نہ میں ——— رہا سوال ہماری محبت کا تو، ضروری نہیں کہ ہم ساتھ رہ کر ہی کسی کو چاہ سکتے ہیں، تم جہاں کہیں بھی رہو، ہر لمحہ ہر وقت میرے قریب ہو اور رہو گی ——— جاؤ یہاں سے اور ہو سکے تو بھولنے کی کوشش کرو۔" آفتاب اتنا کہہ کر اُس کی طرف سے اپنا رُخ موڑتے ہوئے پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا تھا۔

سپنا کب وہاں سے چلی گئی اُسے نہ معلوم ہوا۔ بس اُس کے قہقہوں کی آواز اُس کے کانوں سے ٹکراتی رہی۔ وہ اُس کی بہنوں اور ماں میں گھری نجانے کس بات پر ہنس رہی تھی۔ آفتاب کو محسوس ہوا تھا جیسے اُس کی ہنسی [illegible] ——— اُس کے [illegible]
[illegible]

کریں وہ وہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آگرہ چل دیا تھا۔ بڑی بڑی تبدیلیاں آئیں ——— بہنیں اپنے اپنے گھر بسانے چلی گئیں۔ ماں چاند سی بہو کا خواب آنکھوں میں سجائے دنیا سے چلی گئی۔ لیکن آفتاب یونہی خانماں برباد — ویران ویران صورت لئے ایک آدھ دن کے لئے گاؤں پہونچا اور آنکھوں میں اور گہری ویرانیاں لئے آگرہ واپس آ گیا۔

آج سپنا پھر ایک بار اُس کی یاد میں واپس آ گئی تھی ——— وہ گاؤں کی اُس دُھندلی شام سے زیادہ بے خوف ہو کر اُس کے کمرے میں اس طرح اچانک ملی جیسے اُس کی فردوسِ گمشدہ اُسے ایک بار پھر مل گئی ہے۔ لیکن خوابوں کی خوشیاں بے ثبات تھیں ——— ابھی وہ اُنہیں دل کے گوشوں میں محفوظ بھی نہ کر پایا تھا کہ اُسے خیال کی تلخ حقیقت کو قبول کرنا پڑا ——— سپنا کسی کی امانت ہے!

سپنا کے گلے میں پڑے ہوئے کالے موتیوں والے طلائی منگل سوتر نے دل کی دہلیز پر پڑی ہوئی رواج کی وزنی زنجیر کی شکل اختیار کر لی اور پھر آفتاب نے سپنا کی تصویر دل سے نکال پھینکنے کی سعی لاحاصل کرتے ہوئے دل کے دروازے بند کرنا چاہے ——— لیکن وہ ——— وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرنے لگا۔ کیونکہ سپنا کی مانگ میں بھرے ہوئے سیندور کی شاہراہ حدِ نگاہ تک اُس کی تمناؤں کے خون کی سرخی لئے ہوئی تھی ——— اور بہت قریب ہوتے ہوئے بھی منزل دُور تھی ——— دشوار گذار رہگذر کانٹوں سے پُر تھی۔

میری ویران راتوں کے خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکیں گے ——— اور میں یونہی زندگی کی اس بے رنگ بے نور ——— رہگذر پر تنہا چلتا رہونگا۔ میں اگر آج تمہاری سانسوں سے معطر ہو رہا ہے سپنا ——— کل پھر یہاں ایک روح فرسا تنہائی کا راج ہوگا ——— تم چلی جاؤ گی خود سے ——— یا پھر میرے مجبور کرنے پر اور میں ——— میں پھر یونہی تمہاری صورت کو تم سے بات کرنے کو ترس جاؤں گا ——— نہیں سپنا! اب نہیں میں اس طرح خالی ہاتھ نہ لوٹاؤں گا ——— اب میں تمہیں اُس رونق کی طرح ہمیشہ کے لئے سلگتے رہنے کیلئے واپس جانے پر مجبور نہ کروں گا۔ اب احساسات کی تپش میں جھلسنے کے لئے تمہیں تنہا نہ چھوڑ دوں گا میری سپنا! ——— تمہارے چہرے پر چھائی ہوئی اداسیاں میرے ضبط کو مجروح کر گئی ہیں۔ وہ کھوئی کھوئی آنکھوں سے سپنا کی طرف دیکھتے ہوئے سوچتا رہا۔

صبح یونیورسٹی پہنچ کر آفتاب نے تھیسس ڈاکٹر گیان سنگھ کے حوالے کر دی۔ اُنہیں کے زیرِ نگرانی اُس نے اپنا ریسرچ ورک مکمل کیا تھا۔ یونیورسٹی سے لوٹتے ہوئے بڑے اہتمام سے اُس نے کچھ شاپنگ کی اور گھر واپس آ گیا۔

سپنا اُس وقت کمرے میں لگی ہوئی تمام پینٹنگز کو اپنے ذوق کے مطابق آراستہ کر چکی تھی ——— اور اُس کے انتظار ہی میں بیٹھی تھی۔ جب وہ اندر داخل ہوا سپنا کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے اُس نے سپنا کی پُرسکون مسکراہٹیں اپنی جلتی ہوئی آنکھوں میں ابدی نیندیاں کی طرح محفوظ کر لیں اور پھر بنڈل اُس کی طرف پھینک دیا۔

”اسے پہنو ——— پھر ہم گھومنے چلیں گے نا بے۔“ سنجیدگی سے آفتاب نے کہا۔

”آفتاب آج تمہاری آنکھیں بہت سرخ ہیں ——— چہرے پر تھکن کے آثار ہیں ——— تم آرام کرو۔ جائیں گے کبھی ہم کہاں ——— ؟“

وہ ٹیبل پر جھکا ہوا لیٹر پیڈ پر کچھ لکھنے لگا۔

”ایسی کیا ضروری بات ہے جو آتے ہی لکھنے بیٹھ گئے ——— ؟“

”سپنا ——— جلدی تیار ہو جاؤ پلیز! ——— “

سپنا کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اُس نے پیڈ پر ہاتھ رکھ دیا۔ سپنا کمرے سے منہ ہاتھ دھونے جا چکی تھی۔

جس وقت آفتاب سُرخ جوڑے میں ملبوس سپنا کو ساتھ لئے گلی کے موڑ سے گذرا تو محلے کے بہت سے بچے اپنا کھیل چھوڑ کر حیرت و استعجاب سے دونوں کو دیکھنے لگے ——— سپنا کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے اُبھر آئے۔ آفتاب بچوں کی شریر مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیتے ہوئے گلی کے مکانوں سے دروازے کی اوٹ سے، کھڑکیوں کے پردوں سے جھانکتی ہوئی پُرتجسس آنکھوں کو نظر انداز کرتا ہوا آگے بڑھ گیا ———

شام کی گہری ہوتی ہوئی سیاہی میں وہ دونوں موتی مسجد کے برج سے گذرتے ہوئے اُس جگہ آ کر کھڑے ہو گئے جہاں سے جمنا کے پانی کے شور کی آواز کانوں تک نہیں پہنچ سکتی۔ پُرشکوہ تاج اپنے حسین انداز میں ایستادہ تھا ——— جنگلی کبوتروں کے بے شمار جوڑے قلعے کی [illegible] پر آشیانوں کی طرف لوٹ پڑے تھے۔ [illegible] میں بے شمار پرندوں کے شور [illegible] آنے والی [illegible] میں سپنا [illegible]

[illegible]

[illegible]

— سپنا اُس نے تاج کی طرف ایک بار پھر عقیدت اور حسرت بھری نظروں سے دیکھا ہے — کبھی اس کہانی کی طرف بھی نظر کی — جو تاج محل کے پہلو میں زنجیریں کر اس کا راستہ روکے ہوئے تھی —؟

چہرہ اتر گیا سپنا سہم کر پیچھے کی طرف ہٹ آئی — "مجھے اس کہانی سے کیا غرض —"

"یہ کہانی ہماری مہذب دنیا کی مہذب حدود کا تعین کرتی ہے اور ہم حدوں سے آزاد [illegible] تہذیب و تمدن کا بے رنگ لبادہ اوڑھے ہوئے [illegible] کے زخموں کو اپنے سینے میں چھپائے ہوئے روشنی کی تلاش میں — سکون کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں — کیونکہ ہمارے درمیان ایک ایسی ہی کہانی حائل ہے —" آفتاب کی آواز میں ارتعاش تھا۔

"تم آوارگی پسند کیوں کرتے ہو —؟"

"[illegible] — مگر سفر بہت لمبا ہے سپنا —" نجانے کیوں آفتاب کی آنکھیں بھیگ چلی تھیں۔

"میرا ساتھ کہاں تک دے سکتی ہو —؟"

"جہاں تک ساتھ ہو سکتا ہے — اس دنیا میں — اس کے بعد اگر کوئی اور دنیا ہے — تو وہاں بھی میں تمہارے ساتھ ہوں — ساتھ رہوں گی —!"

سپنا کے چہرے پر لفظوں کی سچائی ایک پاکیزہ تاثر سے پُر وقار ہو گئی —

آفتاب کو محسوس ہوا جیسے [illegible] کہانی کو پار کرتی ہوئی وادی [illegible] کی طرف [illegible] کے دوش پر محوِ خرام ہیں۔

"[illegible] آؤ ہم چلیں —" آفتاب [illegible]

[illegible]

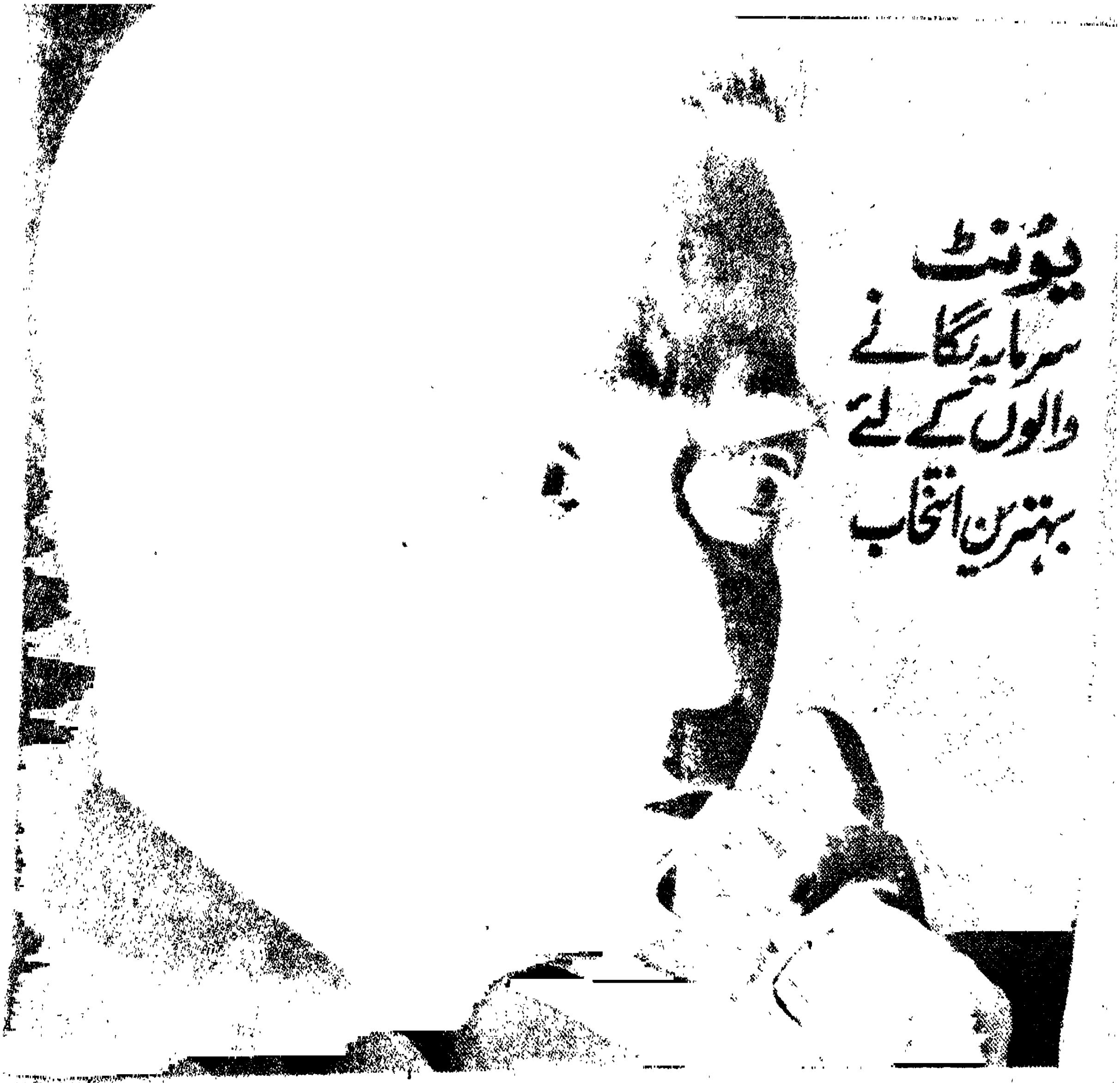
سالنامہ دیکھ کر

شفیع پنیالوی

کھِل گیا دل سالنامہ دیکھ کر
ہو گیا شاداب دامانِ نظر
حسنِ ترتیب و طباعت کا کمال
بے نظیر و لاجواب و بے مثال
فکرِ نَو موضوعِ نَو آوازِ نَو
رنگِ نَو اسلوبِ نَو اندازِ نَو
ہر غزل آئینۂ فکر و نظر
ہر فسانے کی حقیقت معتبر
حسنِ معنی داستاں در داستاں
ہر کہانی حاصلِ زورِ بیاں
سینۂ اوراق پر لفظوں کا رقص
جدتِ فن کاریٔ خوشتر کا عکس
ایک جلوہ منظرِ تصویر کا
اک مرقع شوخیٔ تحریر کا
دیکھتا رہ جائے جو دیکھے اسے
مرحبا کہہ جائے جو دیکھے اسے
زندہ باد اے خوشتر معجز رقم
منتظر ہے تیری ہستی تیرا دم

[illegible]

[illegible]



جو لوگ سنجیدگی سے سرمایہ لگانا چاہتے ہیں وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کا سرمایہ محفوظ رہے۔ انہیں زیادہ منافع ملے اور وہ اسے آسانی سے ضرورت کی صورت میں واپس حاصل کر سکیں۔

UNIT TRUST OF INDIA

یونٹ — [illegible]

یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا

davp 72/436

غزلیں

[illegible]

چھلکنے والے بادۂ رنگیں کے جام سے
قدرِ شراب پوچھو کسی تشنہ کام سے

کچھ ایسے اُن کے نین کٹوروں سے پی چکے
نفرت سی ہو گئی ہمیں صہبائے جام سے

بے وقتِ شام ڈوب چکا آفتاب بھی
اُبھرا چاند ابھی تک نہ بام سے

وابستہ ہو چکی ہے مری تلخ زندگی
ساقی سے میکدہ سے صراحی سے جام سے

دل [illegible]
[illegible] رنگین شام سے

[illegible]
[illegible]

زبیر احمد راہی قاسمی

خوشی سے نذرِ الم کی ہے زندگی میں نے
پیا ہے زہرِ محبت میں آپ کی میں نے

حیات زہد میں ہے کائنات [illegible]
تمہارا نام لیا تھا ابھی ابھی میں نے

جواب، نکہتِ گیسوئے یار کا نہ ملا
چمن میں دیکھ لی جا کر کلی کلی میں نے

جنازہ دوش پہ حالات کا اُٹھائے ہوئے
تڑپ تڑپ کے گزاری ہے زندگی میں نے

تمہارے شہر میں برپا تھے سخت ہنگامے
حدودِ وحشت میں پائی سلامتی میں نے

[illegible]
[illegible]

اسیر شاہجہانپوری

جنگل جنگل میری وحشت
بستی بستی آپ کی شہرت

گر گئے آنکھ سے اشک تو پھر کیا
ٹوٹے ہوئے تاروں کی قیمت

جتنے منہ ہیں اُتنی باتیں
کوئی نہ سمجھا تیری حقیقت

ناز نہ ہو کیوں دل کا غنی ہوں
آپ کا غم ہے میری دولت

کون سنے اے ناصحِ مشفق
کس کو اپنے کام سے فرصت

اتنا بہت ہے [illegible]
[illegible]

طنزیہ

میر بیمار ہوئے...

فکر تونسوی

اے ۲۳/۱۸، موتی نگر، نئی دلی

خوشتر صاحب دلی گریٹ!

اِس بار "افواہوں" کو ریسٹ (Rest) عنایت کر دی ہے۔ ایک اور طنزیہ حاضر کر رہا ہوں۔ یہ لذیذ کانٹا میرے رگ و پے میں کئی ماہ سے چبھ رہا تھا۔ جی چاہتا ہے اِسے نکال دوں۔ افواہوں کا درد تو مستقل ہے۔ کبھی کبھی ذائقہ بدلنے کے لئے ہنگامی درد بھی سہی —— اِس مضمون میں آنکھوں کی روشنائی اور تیرگی۔ روشنائی کا فاصلہ ذرا بڑھ گیا ہے۔ اُمید ہے آپ خوبصورت گالیاں نکال کر اسے عبور کر لیں گے۔

—— فکر تونسوی

★

میں بے حد پریشان تھا۔ بلکہ شرمندہ تھا ——

شرمندگی کا باعث میرا یہ نصیب تھا کہ مجھے کوئی سیریس بیماری لاحق نہیں ہوتی تھی۔ جب بھی کوئی بیماری آتی وہ نزلہ زکام میں بدل جاتی۔ زیادہ سے زیادہ سر کا درد، پیٹ کا درد یا کوئی پھوڑا اُبھر آتا اور مجھے دَم دے کر نو دو گیارہ ہو جاتا۔ احباب اور رشتے دار زیرِ ناف قسم کا طعنہ دیا کرتے کہ اِن غیر ضروری بیماریوں پر کوئی آپ سے کیا ہمدردی کرے۔ میری بیوی تو کنکھیوں سے کئی بار اشارے بھی کر چکی تھی کہ میں آپ کی خاطر مرمٹنے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن اِس مرمٹنے کی کوئی ٹھوس بنیاد بھی تو ہو۔

اور نہ جانے میرے کس پیارے کی دُعا قبول ہوئی کہ ایک دن میں صبح کو شیو کر کے اُٹھا تو میری ایک لغزشِ پا نے پکارا۔ "لینا کر چلا میں!" میری بیوی جو شاید اِسی نادر لمحے کے انتظار میں ادھیڑ ہو گئی تھی، فوراً ڈاکٹر کو بُلا لائی۔ ڈاکٹر نے کہا: "یہ لغزشِ پا ہی نہیں ہے، سیریس بیماری ہے!"

بیوی کی زبان سے بے ساختہ نکلا: "ہائے اللہ! یہ سیریس بیماری اِن کی بجائے مجھے لگ جاتے!"

ڈاکٹر نے وارننگ دیا: "یہ فیصلہ ہسپتال میں جا کر ہوگا کہ بیماری کس جسم کے لئے موزوں ہے، یہ متنازعہ مسئلہ ہے۔"

اِتنے میں میرے بہت سے احباب اور رشتے دار جمع ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے ڈاکٹر سے ونس مور کہا اور باری تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا کہ آخر میں تھرڈ ریٹ بیماریوں کے چنگل سے نکل آیا اور اب راہِ راست پر چل پڑا ہوں۔ اُن کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو بھر گئے۔ اُنھوں نے تالیاں بجائیں۔ کئی ایک فرطِ انبساط سے رقص کرنے لگے۔ میری بیوی نے جذبات سے کانپتے لفظوں میں اعلان کیا کہ وہ میرے غسلِ صحت پر یتیموں کو کھانا کھلائے گی۔ ہسپتال کے بڑے ڈاکٹر نے سرگوشی میں میرے ایک دوست کو بتایا کہ یہ نروس بریک ڈاؤن کی بیماری ہے۔ ہو سکتا ہے، کئی سال لگ جائیں!"

کئی سال —— ؟ مجھے یتیموں کا مستقبل بہت خطرے میں نظر آیا۔

ہسپتال کے بیڈ پر لیٹتے ہی مجھے بے حد اطمینان ہوا۔

نہ پریشانی باقی رہی تھی نہ شرمندگی ہی۔ بلکہ فخر سے پھولا نہ سماتا تھا کہ اب اس سیریس بیماری کی بدولت میں کئی لوگوں کو اُبلائیج (Oblige) کر سکوں گا۔ میرے احباب خلوص اور ہمدردی کا فراخ دلانہ استعمال کر سکیں گے۔ رشتے داروں کو ٹھنڈی آہیں بھرنے اور آنسو تھرتھرانے کا موقع نصیب ہوگا۔ میری ایک جنبشِ لب پر وہ اپنی گردنیں کٹوانے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ میری آنکھ کا ایک ہلکا سا اشارہ اُن کی زنگ آلودہ روح کے سبھی بند دروازے کھول دیتا تھا۔ میرے بدن میں ایک چھوٹی سی ٹیس اُٹھے گی تو احباب مرغِ بسمل کی طرح ہسپتال کی سڑک پر تڑپتے ہوئے نظر آئیں گے۔ میری بیوی ہر پُرسانِ حال کے ہونٹوں پر

- جو شخص نیک عمل حصولِ ثواب کے خیال سے کرتا ہے، تاجر ہے۔ جو خوف دوزخ سے کرتا ہے، وہ غلام ہے اور جو صرف خُدا کے لئے کرتا ہے وہ خُدا کا نیک بندہ ہے۔ (حضرتِ معروف کرخیؒ)
- علم کی باتیں سُن کر جو اُن پر عمل کرتا ہے اُس کے دل میں علم کا نُور ظاہر ہوتا ہے۔ (حضرتِ ابو عثمانؒ)
- جس کا غصہ زیادہ ہوگا اُس کے دوست کم ہوں گے۔ (حضرتِ فضل بن عیاضؒ)

اُنگلی رکھ کر کہہ سکے گی ؎

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

غرض میں اپنے آپ کو بڑا خوش نصیب سمجھتا تھا کہ زندگی میں کسی کے کام تو آیا! دوسروں کی خوشنودی کے چند لمحے بھی میسر آجائیں تو وہ سنبل و ریحان اور لعل و یاقوت وغیرہ سے کم نہیں ہوتے۔ ورنہ اس سے پہلے تو زندگی جیسے بے برگ و گیاہ ریگستان میں گزر رہی تھی۔ نہ کسی کے آنسو، نہ تبسم، نہ جذبات سے چُور چُور ہونٹ، نہ کسی کی ہمدردی، نہ کسی کا خلوص، نہ کسی کا امتحان، نہ کوئی ممتحن ——

ہسپتال میں جاتے ہی سب سے پہلے تو میرے ایک منسٹر دوست نے اُس ریگستان میں ایک پھول کھلا دیا۔ یعنی ایک دوست کے ٹیلیفون پر اُنھوں نے میڈیکل سپرنٹنڈنٹ سے کہہ دیا کہ اِس مریض کو فوراً ایک بیڈ عطا کیا جائے! ہسپتال میں بیڈ میسر آنے کا مطلب ہوتا ہے۔ جیسے کسی بیروزگار کو اپائنٹمنٹ لیٹر مل جائے۔ میرے ایک پروفیسر دوست نے میری ہوا باندھتے ہوئے کہا "اجی! بیڈ کیوں نہ ملتا۔ اِن کی رسائی تو منسٹروں تک ہے!" مجھے منسٹروں کی اِس پستی پر رحم کھانا چاہئے تھا۔ لیکن منسٹر کی خوشی مجھے بیڈ مل جانے میں مضمر تھی۔ اسلئے میں اُس پستی کو شہد کا گھونٹ سمجھ کر پی گیا۔

بیڈ مل جانے کے بعد تین چار دن تک میں یہ دیکھتا رہا کہ احباب اور رشتے دار نہایت سرگرم ہو گئے ہیں۔ چاروں طرف بھاگے بھاگے پھرتے ہیں۔ وہ لمحہ بہ لمحہ اپنی دوڑ دھوپ کی رپورٹ لے آتے اور میرے حلق میں انڈیل دیتے۔ کوئی بتاتا ہسپتال کا ہارٹ اسپیشلسٹ میرے کالج کا ساتھی ہے اور مجھ سے میتھمیٹکس کی گائڈنگ لے جایا کرتا تھا۔ کوئی انکشاف کرتا بلڈ بنک کے انچارج سے میں نے کہہ دیا ہے کہ آپ کی خوش نصیبی ہے آپ کے ہسپتال میں ایک عظیم مریض داخل ہوا ہے۔ یہ انچارج میری خالہ کا چوتھا بیٹا ہے۔ اگرچہ خالہ نے اُسے جائداد سے عاق کر دیا ہے۔ لیکن اُس کی تو میرج سے پہلے ہی سبھی لیٹر میں نے ہی قلم بند کر کے دیئے تھے۔ ایک دوست نے تین اخباروں میں میری فوٹو اور بیماری کی خبر بے حد ولولہ انگیز انداز میں شائع کروا کے مسرت حاصل کی۔ جیسے اُس نے مجھے مرنے کے بعد جنت کی سیٹ دلوا دی ہو! چار پانچ دوستوں نے کافی ہاؤس میں ایک ریزولیوشن پاس کروا دیا کہ خُدانخواستہ اگر فکر تونسوی کی موت واقع ہوگئی تو پُورے کافی ہاؤس کے ممبران نہ صرف باجماعت شمشان بھومی تک جائیں گے۔ بلکہ پسماندگان کے لئے چندہ بھی اکٹھا کریں گے۔

یہ جان توڑ سرگرمیاں دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے سارا ہندوستان میری بیماری کی خاطر زندہ ہے۔ ورنہ درگور ہو گیا ہوتا! ہر روز کئی ڈاکٹر باری باری آتے اور مجھے لیبارٹری

مجھ کر تجربے شروع کر دیتے۔ جیسے یہ ڈاکٹر جونئر سکول کے طالب علم ہوں اور میں ایک کاپی ہوں، جس پر وہ ہوم ورک کر رہے ہوں۔ پہلے تو میں سمجھا کہ وہ میرے مرض سے خوش ہونے کی وجہ سے سرگرم ہیں۔ لیکن ایک بار میں نے اُن کی خوشی سے بور ہو کر ایک ڈاکٹر سے پوچھا: "جناب کیا آپ کو مریض سے محبت ہے یا مرض سے؟"

وہ بولا: "مرض سے! کیونکہ ہم مریض پر ریسرچ کر کے مرض تک پہنچتے ہیں تاکہ آپ پر ریسرچ سے بنی نوع انسان کو بھی فائدہ پہنچے۔"

"اور اگر میں نہ آتا تو بنی نوع انسان کا کیا بنتا؟"

اِس کے جواب میں ڈاکٹر نے اپنے اسسٹنٹ کو حکم دیا۔

"اِس مریض کی بی۔ سی۔ جی بھی کرائی جائے۔ دماغ میں توقع سے زیادہ خلل معلوم ہوتا ہے۔"

لیکن میں جانتا تھا کہ میرے دماغ کے خلل کا سبب میری بے پناہ مسرت ہے، جو مریض بن کر مجھے حاصل ہو رہی ہے۔ میں یہ سوچ کر جھوم اٹھا کہ ہسپتال میں مجھے بے حد رومانٹک ماحول ملے گا۔ میں نے سُن رکھا تھا کہ کئی آرٹسٹ لوگ ہسپتال میں جا کر ناول تک لکھتے ہیں اور بیماری کو ادبِ عالیہ میں اضافہ کا باعث بناتے ہیں۔ اُن میں سے کئی ایک نرسوں سے پیار بھی کرنے لگتے ہیں۔ بلکہ کئی نرسیں تو نوکری پر لات مار دیتی ہیں اور ناول نگار کی رُوح کے نرم گوشے میں دُلہن بن کر گھس جاتی ہیں۔

دُوسرے دن جب میں چم سے کسی نرس کی آمد کے انتظار میں آنکھیں بند کئے پڑا تھا، کسی نے میرا کندھا جھنجوڑا۔ یہ واقعی نرس تھی (میرے متوقع ناول کی متوقع ہیروئن)۔ میں نے آنکھ کھول کر دیکھا۔ نرس خوبصورت نہ تھی، خوبصورت دُنیا کے جِسم پر ایک چیتھڑا تھی! اُس نے پہلے مجھے سُونگھا، پھر ماحول کو سُونگھا اور جیسے اُسے احساس ہُوا کہ ماحول نامکمل ہے۔ اِس لئے اُس نے میرے بیڈ کے سرہانے ایک میلے سے گتّے پر میڈیکل چارٹ لٹکا کر ماحول کو مکمل کر دیا۔

اور مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے اُس نے میری قبر پر دیا جلا دیا ہو!

میری بیماری اُچھلتی کُودتی، چھلانگیں لگاتی ہوئی جب کئی ہفتے عبور کر گئی تو مجھے شک ہونے لگا کہ ڈاکٹر حضرات کو خدمتِ خلق سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اُن کی حالت اُس عورت سے بہتر نہیں ہے جو شوہر کے لئے کھانا تیار کرتی ہے۔ شام کو سبزی وغیرہ لاتی ہے اور صبح دودھ کے ڈپو کی لمبی قطار میں دو بوتلیں لانے کے لئے اپنی باری کا انتظار کرتی ہے ——— عام اصطلاح میں اُسے گرہست کی خدمت کہا جاتا ہے لیکن گرہستن سے پُوچھا جائے تو وہ اُسے اُکتا دینے والی روٹین (Routine) کا نام دیتی ہے۔

میرا خیال تھا اور افسوس ناک حد تک غلط خیال تھا کہ

•••~~~~~•~~~~~•••~~~~~•~~~~~•••

- اگر سوشلزم کی تعمیر کے لئے تہذیب و تمدّن ضروری ہیں تو ایسا کیوں نہ کریں کہ تہذیب و تمدّن کی تعمیر کے لئے پہلے ہم زمینداروں اور سرمایہ داروں کا خاتمہ کر دیں۔ بعد میں سوشلزم کی طرف رجوع ہوں۔ (لینن)
- شاعر کا فن یہ ہے کہ وہ محض انفرادی جذبوں میں رنگ نہ بھرے، اجتماعی طور پر انسانی بہتری کے وہ نقش اُبھارے، جن سے سب متاثر ہو سکیں۔ (جانسن)
- عورت ہونا ایک خطرناک اور مشکل عمل ہے، کیونکہ اِس عمل میں مردوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ (جوزف کامریڈ)

•••~~~~~•~~~~~•••~~~~~•~~~~~•••

ڈاکٹر جب مریض کی خدمت کرتے ہیں تو اُسے انسانیت کا عروج سمجھتے ہیں۔ لیکن جب میں نے ذرا قریب ہو کر دیکھا تو یوں محسوس ہوا وہ انسانیت سے اُکتا چکے ہیں۔ وہ جب مریض کا بلڈ پریشر دیکھتے ہیں یا اُس کے ہارٹ اور جگر اور پھیپھڑے کی رپورٹ کا مطالعہ کرتے ہیں تو انھیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آلو چھیل رہے ہوں یا سبزی میں نمک مرچ مسالے کا تناسب پیدا کر رہے ہوں۔ ڈاکٹر سچ مچ ایک انار ہوتے ہیں جس کے ایک سو نہیں ہزاروں بیمار ہوتے ہیں۔ ہر بیمار سمجھتا ہے یہ انار میرے ہی کھانے کے لئے ہے اور ڈاکٹر کی بے بسی یہ ہے کہ وہ کسی مریض سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا: "دوست! انار کے متعلق تم جو بھی

نقطۂ نگاہ بنالو، میں دخل نہ دوں گا۔ لیکن ظالم! مجھے پانچ منٹ کی تنہائی تو عطا کر دو۔ تاکہ میں خدمتِ خلق سے بلند ہو کر ایک سگریٹ تو پی سکوں۔"

ایک دن میں نے ایک ڈاکٹر سے پوچھ لیا: "ڈاکٹر صاحب! آپ کے اندر خدمتِ خلق کا جذبہ کیوں مر گیا؟"

وہ جیسے دو دُونی چار کا پہاڑا پڑھتے ہوئے بولا: "وہ تو اُسی دن مر گیا تھا جب میں نے اس ہسپتال میں نوکری کے لئے برسوں اپنے گھٹنے اور ماتھا رگڑا۔ ایک نہایت ہی بھونڈے، غیر انسانی شکل کے ڈپٹی منسٹر کو وقت کا جہانگیر اور یوسف کہا تھا۔ انسانیت تو اس سماج کے لئے اچھوت کا درجہ رکھتی ہے!"

یہ سُن کر مجھے شک ہوا کہ میرے بھی جذبے اچھوت ہیں۔ ڈاکٹر میرے جذبوں کو ہاتھ لگانا نہیں چاہتا۔ وہ صرف ہسپتال کے مُردہ قاعدے قانون کے چوکھٹے میں گھومے جا رہا ہے۔ اس چوکھٹے کے باہر کی دُنیا اچھوتوں کی دُنیا ہے۔ اس چوکھٹے میں انسانیت داخل نہیں ہو سکتی۔ ڈاکٹر اس چوکھٹے سے باہر آکر اچھوتوں کو چھونا نہیں چاہتا۔ جو مریض ہسپتال میں اس خیال سے داخل ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اُس کا انتظار کر رہا ہے اور لپک کر مریض کے جسم میں خدمتِ خلق کا انجکشن دے دے گا اور وہ ناچ اُٹھے گا۔ ایسے مریض کو چاہئے کہ وہ اچھوت ہی رہے تو اچھا ہے۔ ڈاکٹر کے لئے سب مریض برابر ہیں، سب بور ہیں، سب اچھوت ہیں!

بھونڈے ڈپٹی منسٹر نے ڈاکٹر سے انسانیت چھین لی۔ اب تو وہ کسی لیڈی ڈاکٹر سے بھی پیار کرنے سے پہلے دیکھ لیتا ہے کہ اُس کی تنخواہ کتنی ہے۔

احباب اور رشتے داروں تک میرے وارڈ اور بیڈ نمبر کی باقاعدہ اطلاع پہنچا دی گئی تھی۔ ایک دوست نے خلوص کی بلندیوں پر کھڑے ہو کر مشورہ دیا کہ بیڈ نمبر اخباروں میں چھپوا دیا جائے۔ چھپ جانے کے بعد وہ اپنے فرضِ منصبی سے چھٹکارا پا گئے اور پھر کبھی ہسپتال میں نہ آئے۔ باقاعدہ اطلاع کے باوجود (سُنا ہے) یار دوست ایک دُوسرے سے پُوچھتے پھرتے۔ "بھائی! فکر صاحب کا بیڈ نمبر کون سا ہے؟"

شروع شروع میں خلوص کے ماروں کی آمد زوروں پر رہی۔ اُن کی آمد پر میرا دل بلّیوں اُچھلتا اور میں پھُول جاتا کہ میں بیمار ہوں۔ ہر ملاقاتی یہ جھُوٹ بول کر بہت خوش ہوتا: "اجی آپ تو بالکل بھلے چنگے ہیں۔ ورنہ ایسے اعصابی امراض میں تو انسان ہڈیوں کا ڈھانچہ بن جاتا ہے!"

جوں جوں وہ میرا دل بڑھاتے، میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بنتا چلا جاتا۔ لیکن پھر بھی میرا جی چاہتا، میری ہڈیوں کی مزید تعداد نمایاں ہوتی چلی جائے تاکہ میں پُرسانِ حال کی محبت کے لذیذ جام لنڈھاتا رہوں۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ میری اس سازشیانہ پلاننگ کا علم احباب اور رشتے داروں کو ہو گیا اور آہستہ آہستہ اُن کی تعداد کم ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ ایک دن نظروں سے بالکل اوجھل ہو گئی اور میرے بیڈ کے پاس صرف چند شیشیاں، ایک میڈیکل چارٹ اور ایک بیوی رہ گئی! شاید پُرسانِ حال نے میرے مرض کی بُو سُونگھ لی کہ یہ مرض تو طولِ شبِ فراق کی مانند بڑھ گیا ہے اور زندگی صرف مرض کے گرد تو نہیں گھومتی۔ کئی اور اہم کام بھی ہیں۔ مثلاً پتنگ اُڑانا ہے، بلیک مارکٹنگ ہے، لڑکیوں سے چھیڑ کرنی ہے، پڑوسیوں سے لڑائی جھگڑا کرنا ہے۔ غرض سینکڑوں ضروری کام ہیں۔ فکر تونسوی کا مرض کا زندگی کا ایک حقیر سا حصّہ ہے۔ ایک گھٹیا سی روٹین (Routine) ہے۔ ہُنھ! سینکڑوں مریض ہر روز صبح ہسپتال کی او۔ پی۔ ڈی کی کھڑکی کے سامنے کیو بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بھلا بیمار ہونا بھی انسان کی کوئی بنیادی ضرورت ہے۔

اور یوں آہستہ آہستہ میں غیر دلچسپ ہوتا گیا۔ ہمدردی اور خلوص کا سیلاب ایکدم تیزی سے شام کے سُورج کی طرح ڈُوب گیا۔ یہاں تک کہ ڈُوبتی شعاعوں کی سُرخی بھی نظروں سے اوجھل ہو گئی اور میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ مرض کو عادت نہ بنانا چاہئے۔ اِتنی بڑی کائنات ہے اور ایک انسان اُس میں ایک بے حد مدھم ہوتا ہوا نقطہ ہے۔ جس سے کوئی لفظ نہیں بنتا، کوئی لکیر نہیں بنتی۔ اِس حقیر نقطے پر انسانیت اور محبت اور خلوص وغیرہ وغیرہ چیزوں کی بُنیاد رکھنا خالی خولی جذباتی پن ہے۔

بمبئی سے ایک افسانہ نگار دوست نے خط لکھا: "تم بڑے خوش قسمت ہو کہ دہلی میں بیمار پڑے ہو اور (سنا ہے) تمھارے پُرسانِ حال تمھاری اِس بیماری کو غنیمت سمجھ کر جوق در جوق تمھیں پُوچھنے کے لئے بھی آتے رہتے ہیں۔ لیکن میری بد بختی! کہ میں بمبئی میں بیمار پڑا ہوں۔ جہاں کسی کو کسی کی خبر نہیں کہ کس حال میں ہے؟ یہاں کا ہر فرد اپنے بدن کی مختصر سی دُنیا کے باہر دیکھ ہی نہیں سکتا! میں سمجھتا تھا اُن کے پاس جذبات کی کمی ہے، لیکن اب معلوم ہُوا ہے، فرصت کی کمی ہے۔ جتنے وقت میں وہ مجھے پُوچھنے کے لئے آئیں، اُتنے وقت میں وہ اپنے مالک مکان سے تُو تُو میں میں کر سکتے ہیں۔ یہ تُو تُو میں میں میری بیماری کی خاطر ملتوی نہیں کی جا سکتی۔ چھ ماہ سے اپنے گھر میں پڑا ہوں اور کسی پُرسانِ حال کو ترس گیا ہوں! کل کسی نے میرے کمرے کا دروازہ کھٹ کھٹایا تو میں بے حد جذباتی ہو گیا کہ آخر کسی پُرسانِ حال کے دل میں خلوص جاگا۔ میں اٹینشن ہو گیا اور مریضوں کی طرح ہائے ہائے کرنے لگا۔ نووارد نے پُوچھا۔۔۔ صاحب! کیا بات ہے۔ آپ تو کچھ بیمار معلوم ہوتے ہیں کسی اچھے ڈاکٹر سے علاج کرائیے۔ جلدی تندرست ہو جائیے کیونکہ ہندوستانی ادب کو ابھی آپ سے بہت اُمیدیں ہیں۔ میں تو بائی دی وے آپ کے گھر میں ایک ضروری ٹیلیفون کرنے آیا تھا۔ اجازت ہو تو کر لوں؟"

بمبئی کے اُس دوست کے خط سے مجھے آبدیدہ ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن میرے پاس تھیٹر کے ایک پروڈیوسر دوست بیٹھے تھے۔ اِس لئے میں نے جذباتی ہونا مناسب نہ سمجھا کیونکہ وہ کہہ رہے تھے: "فکر صاحب! آپ تو بیماری سے چمٹ ہی گئے ہیں۔ میں پُوچھنے آیا تھا کہ وہ ڈرامہ جس کے ابھی تین منظر قلم بند کرنا باقی ہیں، اُس کا کیا بنے گا۔ ڈرامے کا مکمل ہونا تو بے حد ضروری ہے۔"

"جنابِ من! ڈرامے سے زیادہ میری بیماری ضروری ہے۔ میں تو غسلِ صحت کے بعد ہی وہ سین لکھ سکوں گا۔" میں نے کہا۔

"آپ جلد جلد تندرست ہو جایئے۔ ہمارا بڑا نقصان ہو رہا ہے۔ یہ لیجئے، آپ کے لئے آلو بخارا لایا ہوں۔ کھایئے اور سوچیئے کہ کیا دَورانِ مرض آپ ڈرامہ مکمل نہیں کر سکتے؟"

دُنیا ستم گر نہیں ہے۔ بلکہ اُس کی مجبوری ہے کیونکہ اُسے مرض سے زیادہ اپنے ڈرامے سے محبت ہے اور محبت کے بغیر وہ سانس نہیں لے سکتی۔

ایک نزدیکی رشتے دار (کم از کم وہ بدستور مجھے رشتے دار کہتے تھے) بہت سنجیدہ غم اپنی پلکوں پر تھرتھراتے ہوئے میرے بیڈ کے پاس آئے۔ میڈیکل چارٹ اُٹھا کر آنکھوں سے لگایا اور بولے: "خُدا چاہے گا تو آپ بہت جلدی صحت یاب ہو جائیں گے۔"

میں نے عرض کیا: "آپ کو اتنی کیا جلدی ہے؟"

وہ روہانسے ہو کر بولے: "آپ بیماری میں بھی مذاق سے باز نہیں آتے۔ آپ کی بھتیجی کے بیاہ کا مسئلہ تھا۔ آپ کی بیماری کے باعث اٹکا ہُوا ہے۔ تاریخ مقرر کرنا ہے، لڑکے والے بہت پریشان کر رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں، کل جُگ ہے، کسی کی نیّت بدلتے دیر نہیں لگتی۔"

میں نے اُن سے ہمدردی کرتے ہوئے کہا: "غلطی میری تھی کہ کل جُگ میں بیمار ہُوا۔ آپ بیاہ کر دیجیے، میری بیماری پر بھروسہ مت کیجیے۔"

بزرگوار خوشتر صاحب! تسلیم و نیاز

"بیسویں صدی" کا سالنامہ نظر نواز ہُوا۔ آپ نے ہمیشہ اپنی درخشندہ روایت کو قائم رکھا ہے۔ حسبِ سابق یہ سالنامہ بھی بُوقلموں کیفیات کا حامل ہے۔ دلچسپی و دلربائی اِس عروسِ ادب کا زیور ہے۔ اور شوخی و رعنائی تیور۔ مضامینِ نظم و نثر عمدہ اور قابلِ مطالعہ ہیں۔ آپ کی ملاحت، الامان والحفیظ۔ اِس شگفتہ بیانی کا جواب نہیں۔ کرشن چندر، موہن یاور اور رام لعل کے افسانے، کنہیا لال کپور اور پرکاش ناتھ پرویز کے مضامین اور مخمور سعیدی، امرت لعل عشرت اور عرش ملسیانی کے منظومات پسند آئے۔ ابھی کئی تحریریں پڑھ نہیں پایا۔ سالنامہ کی کامیابی پر ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔۔۔

کرشن موہن (دہلی)

چند دن بعد معلوم ہُوا اُنھوں نے بیاہ کر دیا ہے۔ میری آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ نکل سکا۔ جسے میں ان کے دعوتی کارڈ پر گرا سکتا۔ البتہ میں نے ایک دانش مندانہ قدم ضرور اُٹھایا کہ ہسپتال کے قواعد توڑ کر گھر آگیا۔ پُرسانِ حال پر بھروسہ کرکے بیمار رہتے چلا جانا مجھے غیر ضروری معلوم ہُوا۔

گھر آکر ایک اور قریبی رشتے دار کا پیغام مِلا کہ میرا بڑا لڑکا جوئے میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اس پریشانی میں آپ کو پوچھنے کے لئے حاضر نہ ہو سکا۔ ایک دس سالہ پُرانے دوست کو کاغذ کی ایک چِٹ لِکھ کر بھجوائی کہ میں تمھارے ہجر میں تڑپ رہا ہوں، ہسپتال میں نہیں آئے تو گھر پر ہی آجاؤ! اُس نے اُسی چِٹ کی پُشت پر جواب دیا: "اب تم نے مجھے شرمندہ کرنے کی ٹھانی ہے۔ اِس لئے میں تمھیں شکل نہیں دکھا سکتا۔ میں تمھیں نارمل ہی حالت میں دیکھ سکتا ہوں۔ بیمار حالت میں تمھیں دیکھنا میری قوتِ برداشت سے باہر ہے۔"

ایک اور دوست سے کافی ہاؤس میں مُلاقات ہوئی۔ ہنس کر بولے: "میں نے سُنا تو ضرور تھا کہ تم بیمار ہو لیکن میں نے سوچا۔ مذاق کرنا تمھاری عادت ہے۔ شاید تم نے بیماری سے بھی مذاق کیا ہوگا۔ اب کیسے ہو؟"

اُس کے بعد میں ہر رشتے دار اور دوست کے گھر جا کر اِطلاع دے آیا کہ میں اب بھی بیمار ہی ہوں۔ اِس لئے موقع غنیمت ہے، آکر میری پرسشِ حال کر جاؤ۔ ایک صاحب اُلٹے مجھ سے شکایت کرنے لگے: "واہ فِکر صاحب! آپ نے بھی کمال کر دیا! میں ہسپتال میں آپ کی صورتِ حالات پُوچھنے کے لئے پہنچا تو معلوم ہُوا آپ ڈسچارج ہو کر گھر چلے گئے۔ آخر اتنی بھی کیا جلدی تھی؟" ایک دُوسرے رِشتے دار کو دوسری شکایت تھی کہ میں ہسپتال میں دو گھنٹے تک ہڈیاں جوڑنے والے وارڈ میں آپ کو ڈھونڈتا پھرا لیکن ناکام لَوٹ آیا۔ کم از کم یہ بتا دینا تو آپ کا فرض تھا کہ آپ کی ہڈی نہیں ٹُوٹی۔ بلکہ اعصابی نظام میں خلل تھا۔

میں نے معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ آئندہ موقع مِلا تو ہڈی ہی تُڑواؤں گا! اور ہسپتال سے باہر آکر میں نے محسوس کیا کہ دُنیا ویسی کی ویسی ہی ہے۔ کِسی کو کِسی سے دلچسپی نہیں۔ ہر آدمی ایک دُوسرے کے ساتھ قہقہے لگانے میں مصروف ہے۔ اُن کی محفل میں کون آیا، کون گیا، کون مر گیا، کس کی ہڈی ٹُوٹ گئی، کس کی آنکھ پھُوٹ گئی، کون دیوالیہ ہو گیا، کس کی لاٹری نِکل آئی؟ اِن تمام تبدیلیوں سے بے نیاز اس دُنیا کا ہر آدمی اپنے ہی چند سانسوں میں مگن ہے اور مجھے بھی اپنی اِن محفلوں میں اُنھوں نے یوں کھپا لیا جیسے میں بیمار نہیں ہوں، جیسے میں کبھی بیمار نہ ہُوا تھا اور جیسے میں اُن کی خاطر بیمار نہیں ہُوا تھا۔ بلکہ اپنے بدن کی آزمائش کرنے کے لئے بیمار ہُوا تھا۔

البتہ پُرسانِ حال اب بھی شاید خلوص و محبت کے مارے مجھ سے میری صحت کے بارے میں پُوچھ لیتے ہیں اور اِس بات پر بہت افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ میں نہایت غلط دوائیں کرتا رہا۔ وہ مجھے مشورے دیتے ہیں، مختلف نسخے بتاتے ہیں کہ میں اُن پر عمل کروں تو بالکل تندرست ہو جاؤں گا۔ بلکہ ایک دوست تو مجھے اپنے گھر لے گئے اور میرے ہاتھ میں دوا کی ایک شیشی تھماتے ہوئے بولے: "اِسے استعمال کیجئے۔ تیر بہدف ہے!"

"آپ نے ڈاکٹری کا یہ فن کہاں سے سیکھا؟" میں نے اُن سے پُوچھا۔

وہ گردن پھُلا کر بولے: "اجی میرے والد صاحب عطار تھے!" اور میں گردن جھُکا کر گنگنانے لگا ؎

میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اُسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

صحت و زندگی

۱ــــ نمک کی دوائی اہمیت

نمک ہماری غذا کا ایک ضروری جزو ہے۔ کھانے میں نمک شامل نہ ہو تو وہ بے مزہ معلوم ہوتا ہے۔ نمک غذا کو خوش ذائقہ ہی نہیں بناتا بلکہ صحت اور تندرستی کے لیے بھی اس کا استعمال بہت ضروری ہے۔ نمک کے استعمال سے غذا کے ہضم ہونے میں مدد ملتی ہے، بھوک لگتی ہے اور جسم سے ریاح خارج ہوتی ہے۔ انسان کو نمک نہ ملے تو وہ کمزور اور لاغر ہو جاتا ہے۔ مختلف سبزیوں اور پھلوں سے بھی ہمیں نمک حاصل ہوتا ہے۔ اس کے باوجود غذا میں بھی اسے ملانا پڑتا ہے ـــ اس کا مزاج گرم اور خشک ہے۔ نمک دوائی اعتبار سے بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔

- بدہضمی اور معدہ کی گرانی کی حالت میں نمک کا استعمال بہت مفید ہے۔ پانی کے ایک گلاس میں دو ماشہ نمک ڈال کر تھوڑے تھوڑے وقفے سے ایک ایک گھونٹ پیا جائے تو بدہضمی کی تکلیف دور ہو جاتی ہے۔
- پسا ہوا نمک شہد میں ملا کر کپڑے میں لپیٹ دیں اور اس پر مٹی لگا کر آگ پر رکھیں۔ جب مٹی خوب سرخ ہو جائے تو نمک کو اندر سے نکال کر خوب پیس لیں۔ نزلہ اور زکام کی تکلیف میں نمک چند دن صبح و شام ایک ماشہ استعمال کر لیا جائے تو نزلہ اور زکام کی شکایت دور ہو جاتی ہے۔
- آنکھوں میں ناخونہ اور جالا کی شکایت ہو تو بطور سرمہ نمک کا استعمال مفید ہے۔
- نمک گلے کے امراض کا بہترین علاج ہے۔ گلے کی کوئی تکلیف ہو تو گرم پانی میں پسا ہوا نمک ڈال کر غرارے کرنے سے تکلیف ختم ہو جاتی ہے۔
- موسم گرما میں جب شدید لُو کا زمانہ ہوتا ہے، پسا ہوا نمک پانی میں ڈال کر پی لیا جائے تو لُو لگنے کا اندیشہ نہیں رہتا۔
- نمک ریاح کو تحلیل کرتا ہے۔ دل کی حرکات کی ترتیب میں نظم پیدا کرتا ہے۔
- نمک پیشاب آور ہے۔ معدہ اور آنتوں میں عفونت نہیں پیدا ہونے دیتا۔
- لاہوری نمک کا منجن دانتوں کے لئے بے حد مفید ہے۔
- کمسن بچے جن کے دانت نکل رہے ہوں اکثر دست آنے سے لاغر ہو جاتے ہیں۔ انھیں گرم پانی میں نمک ملا کر غسل دیا جائے تو جسمانی کمزوری دور ہو جاتی ہے اور اعصاب کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ چھوٹے بچوں کو اس طرح غسل دیا جائے تو وہ آشوب چشم کی شکایت سے محفوظ رہتے ہیں۔
- ہیضہ کی شدت میں نمکین پانی جسے طبی اصطلاح میں سیلائن مکسچر کہتے ہیں، اس کا استعمال بے حد فائدہ بخش ہے۔
- سیاہ نمک جو کیمیاوی طور پر تیار کیا جاتا ہے جسم کی گرمی کو دور کرتا ہے۔ معدہ کی گرانی کی حالت میں اس کا استعمال بے حد مفید ہے۔
- معدہ میں ترشی بڑھنے سے اگر کھٹی ڈکاریں آتی ہوں اور کھانا ہضم نہ ہوتا ہو تو کھانا کھانے سے پہلے دو گھونٹ نمکین پانی پینا بہت مفید ہے۔

عورتوں کو بچہ پیدا ہونے کے بعد بعض اوقات بدن کی شکایت ہو جاتی ہے اسے پیٹی روگ کہتے ہیں۔ اس میں گرم پانی میں نمک کا استعمال مفید ہے ــــ یہ عمل درد گردہ میں بھی مفید ہے اور اس سے اپھارا بھی دور ہوتا ہے۔

۲ــــ صحت مند رہنے کے لئے

یہ روشن حقیقت ہے کہ صحت ہی زندگی ہے۔ صحت نہ ہو تو

زندگی موت سے بدتر بن جاتی ہے۔ آپ اپنے گرد صحت سے محروم لوگوں کو دیکھتے ہوں گے جو صحت مند لوگوں کو حسرت سے دیکھتے ہیں۔ قدرت کسی کو بیمار نہیں پیدا کرتی۔ جو لوگ صحت کے اصولوں کی پابندی کرتے ہیں وہ صحت مند رہتے ہیں۔ جو لوگ صحت کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں قدرت انھیں معاف نہیں کرتی، انھیں سخت سزا دیتی ہے۔ اُن سے صحت کی دولت واپس لے لیتی ہے۔

ماہرینِ صحت نے لکھا ہے ——— صحت مند رہنے کے لئے صحت کے اصولوں کی پابندی کرو۔ اُن چیزوں کو ہاتھ بھی نہ لگاؤ جو صحت کے لئے مضر ہیں، چاہے وہ کتنی ہی خوش ذائقہ ہوں۔ ایسی چیزوں کو میٹھا زہر سمجھو!

- جینے کے لئے کھاؤ، کھانے کے لئے نہ جیو! زیادہ کھانا طرح طرح کے امراض کو دعوت دیتا ہے۔ جو لوگ بھوک سے کم کھانا اپنا اصول بنا لیتے ہیں، انھیں کبھی ڈاکٹر کے پاس نہیں جانا پڑتا۔ خدا نے غذائیں اس لئے پیدا کی ہیں کہ انسان اعتدال سے انھیں کھا کر زندہ رہ سکے۔
- صحت مند رہنے کے لئے بہترین اصول ہے کہ ایک وقت میں ایک ہی قسم کی غذا کھائی جائے۔ غذا مقررہ وقت پر اور مناسب مقدار میں کھائی جائے۔
- تنگ دل نہ بنو۔ ہر حالت میں خندہ رُو، خندہ جبیں رہو۔ اپنے دل کے دامن پر رنج و غم، فکر و تشویش کا سایہ بھی نہ پڑنے دو۔ رنج و غم اور فکر و تشویش سے بڑھ کر انسان کی صحت اور اُس کی زندگی کا کوئی دشمن نہیں!
- دل اور جسم کو صاف رکھو۔ صفائی ایک مستحکم قلعہ ہے جس میں بیماری داخل نہیں ہو سکتی۔
- روزانہ کھلے میدان میں ورزش کرنا اپنا معمول بنا لو۔ لیکن اعتدال سے باہر کبھی قدم نہ رکھو۔

وقت پر سو جایا کرو اور مکمل آسودگی کے ساتھ اپنی نیند پوری کیا کرو۔ پوری نیند میں صحت کا راز مضمر ہے۔

- محنت کو اپنا شعار بناؤ۔ کاہل سے نفرت کرو۔ کاہل انسان کبھی صحت مند نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کہ قدرت کا قانون ہے ——— قدرت کی عطا کی ہوئی قوت و طاقت سے کام لو ورنہ وہ اُسے واپس لے لے گی۔"

۳ ——— کیا آپ جانتے ہیں؟

فرانس کے مشہور ڈاکٹر موسیو الیوی نے تجربات کے بعد لکھا ہے ———

جو لوگ کثرت سے چائے پیتے ہیں اُن کی دماغی قوتوں میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ دماغ کی نازک نسیں کمزور ہو جاتی ہیں، قوتِ حافظہ ضعیف ہو جاتی ہے۔ ... اور گرم مزاج والوں کے لئے اعتدال سے چائے پینا کسی حد تک فائدہ مند ہے ... گرانی، نیند اور غنودگی کے غلبے میں چائے کا استعمال مفید ہے۔

چائے کی طرح کافی بھی صحت کے لئے ... ہے۔ ... ڈاکٹر ... پال نے لکھا ہے ـــــ "کافی نوشی کی عادت انسان کو دل کی حرکت بند ہو جانے کے قریب لانے کا موجب ہوتی ہے۔ تجربات و تحقیقات سے اس حقیقت کا انکشاف ہوا ہے کہ جو لوگ کثرت سے کافی پیتے ہیں اُن کے معدے میں سوزش پیدا ہوتی ہے ... کافی پینے والے کو محسوس نہیں ہوتا کہ اس کے معدے میں ... جو وقت آنے پر پھنکار اُٹھے گا اور شدید نقصان پہنچا دے گا!"

انگلینڈ کے ... ڈاکٹروں کی رائے یہ ہے کہ دل کے امراض کی خاص وجہ کافی نوشی کی لت ہے۔

چائے اور کافی کی طرح تمباکو کا نشہ بھی غیر محسوس طور پر جو آہستہ آہستہ جسم پر مہلک اثر کرتا رہتا ہے۔ دُنیا کے بڑے بڑے ڈاکٹروں کے نزدیک تمباکو انسان کا خطرناک دشمن ہے۔ اس کا استعمال، استعمال کرنے والے ہی کو نقصان نہیں پہنچاتا، ان کی اولاد کے لئے بھی مضرت رساں ہے۔ سگریٹ پینے والے والدین کی اولاد جسمانی اور دماغی طور پر مضبوط اور صحتمند نہیں ہو سکتی۔

ماہرینِ صحت کی رائے میں لباس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ طبی نقطۂ نگاہ سے تنگ لباس مُضر ہے۔ اس لئے کہ اس سے سینہ پُوری طرح پھیل نہیں سکتا، اس طرح بدن پُوری مقدار میں آکسیجن جذب نہیں کرتا جس سے خون کی صفائی پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ اس لئے ہمیشہ کُشادہ لباس پہننا چاہیئے۔

ہلکے اور سُبک کپڑے صحت کے لئے بہتر ہوتے ہیں۔ لباس ہمیشہ صاف استعمال کرنا چاہیئے۔ گندے کپڑے صحت کے لئے مُضر ہیں۔

لباس جسم کا محافظ ہے۔ گرمیوں میں سیاہ رنگ کے کپڑے نہ پہننے چاہئیں۔ سیاہ لباس میں سُورج کی شعاعیں بہت جلد جذب ہوتی ہیں۔

۴ ـــــ کامیابی کا راز

کامیابی سے محروم لوگ اکثر اپنی قسمت کو کوستے ہیں۔ ناساعد حالات کا گلہ کرتے ہیں۔ ایک مفکر نے لکھا ہے ـــــ "ہر ناکام انسان اپنی ناکامی کا خود ذمہ دار ہوتا ہے۔ زندگی میں کامیابی اُنھیں لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو دل میں اُسے پہلے ہی حاصل کر چکے تھے جنھوں نے زندگی کے خوابوں کو حقیقت کا روپ دینے ... خوابوں کی تعبیر پہلے اپنے دل میں پا چکے تھے۔ اُن کی کامیابی ... تھی۔ اگر آپ اپنے خوابوں کی اچھی تعبیر چاہتے ہیں تو آپ کو بھی ... نقش ... چاہیئے۔"

مشہور مفکر ڈاکٹر ... نے لکھا ہے ـــــ "کامیاب لوگوں کی کامیابی کا ایک خاص سبب یہ ہے کہ وہ کامیابی چاہتے ہیں، کامیابی کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ جو لوگ زندگی کی بساط پر ناکام رہتے ہیں وہ زندگی کی سطحی باتوں پر غور کرتے رہتے ہیں اور دل میں چھپی ہوئی عظیم قوتوں کی طرف اُن کا خیال نہیں جاتا۔ جب کہ یہی قوتیں حقیقت میں زندگی کو بنانے والی ہوتی ہیں۔ وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے بارے میں سوچنے کی بجائے اپنی موجودہ ... اور ناکامیوں کے بیکراں سمندر میں ڈوبے رہتے ہیں اور خُدا کی اُس عظیم طاقت کو بھی بُھلا دیتے ہیں جس کے سامنے دُنیا کی کوئی ناکامی ٹک ہی نہیں سکتی۔ خُدا کسی انسان کو ناکام نہیں دیکھنا چاہتا۔"

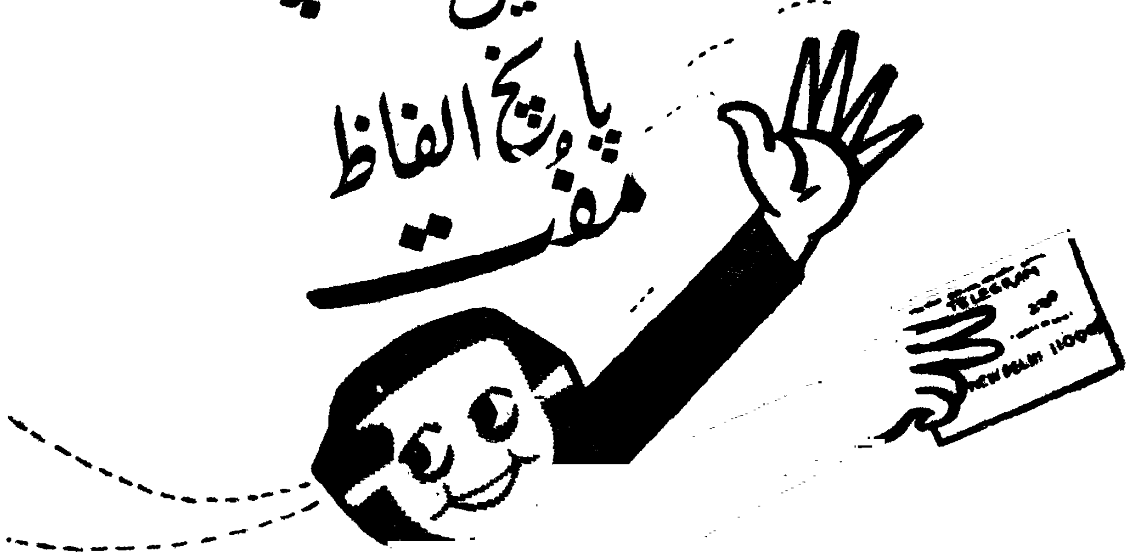
ایک ... مفکر نے کامیابی کا راز اِن الفاظ میں بتایا ہے ـــــ "آپ کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے ... آپ جو کچھ سوچتے ہیں لاشعور اُسے اپنے اندر جذب کرتا رہتا ہے، اس لئے بُرے خیالات کو تحت الشعور تک پہنچنے سے روکنا چاہیئے۔ اگر آپ اپنے تحت الشعور کو تمام ... خیالات سے پاک رکھنا چاہتے ہیں تو اپنے ذہن کو بھی اِس طرح کے خیالات سے پاک رکھیں۔ ایک بلند مقصدِ حیات ... کیجئے۔ اُس کے متعلق سوچئے۔ اُسی کے لئے اپنے لاشعور کو سوچنے کے لئے مجبور کیجئے۔ اگر آپ ایسا نہ کریں گے تو آپ زندگی میں وہ نمایاں کامیابی نہیں حاصل کر سکتے جس کے آپ متلاشی ہیں۔"

... ... میں ادب و دانش کے پھول اور کلیاں لئے ہوئے ... ... کا گنج ... نظر ... مرکز نگاہ ہے۔ ... ... مساعد حالات میں ایسی عظیم ادبی دستاویز پیش کر ... کا عظیم ... ہے! آفرین باد ... ...

آپ کا اپنا

آسی رام نگری (مغل سرائے)

تار کے پتے میں پانچ الفاظ مفت



آپ جو تار بھیج رہے ہیں اگر اس میں پتہ لمبا ہے تو آپ گھبرائیں نہیں۔
ایسی حالتوں میں پتے کے پہلے پانچ الفاظ پر پیسے لئے جاتے
ہیں اور باقی پانچ الفاظ مُفت بھیجے جاتے ہیں۔
پتے میں دس سے زیادہ جتنے الفاظ ہوں ان پر
بھی پیسے لئے جاتے ہیں۔
براہ مہربانی شہر کے نام کے بعد پن کوڈ بھی لکھیے۔
اس پر کوئی پیسہ نہیں لیا جاتا۔
یاد رکھیے پورا اور صحیح پتہ لکھنے سے آپ کا تار
جلدی پہنچے گا۔

محکمہ ڈاک و تار

davp 72/383

سوال و جواب

سرگوشیاں

اس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دئے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش دو معنی سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے۔ (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

مس رخسانہ عابدی۔ بحرین

س۔ یہ خوبصورت قطعہ کس کا ہے ——

ہر کلی مست خواب ہو جاتی
پتی پتی گلاب ہو جاتی
تو نے ڈالیں نہ مے فشاں نظریں
ورنہ شبنم شراب ہو جاتی!

ج۔ یہ قطعہ نریش کمار شاد کا ہے۔

س۔ اور یہ شعر کس کا ہے ؎

اے سرِ مقصدِ حیات، گوشۂ چشم التفات
ایک نگہ تو ہے بہت، نیم نگہ میں کیا نہیں!

ج۔ یہ شعر حضرت جگر مرادآبادی کا ہے۔

محمد عظیم الدین پرویز۔ عادل آباد

س۔ کیا یہ سچ ہے کہ عورت گھر کی زینت ہے؟

ج۔ یہ سو فیصدی سچ ہے۔ یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ ڈاکٹر ٹامس نے کہا ہے —— "جس مکان میں عورت نہیں، سمجھ لو اُس مکان میں شگفتگی، بشاشت اور مسرت کا تعلق ہرگز نہیں" —— شیکسپیر نے کہا ہے —— "عورت خوشبو، نغمہ، رقص اور روشنی کا مجموعہ ہے"

س۔ آج کل مسلمان عورتوں میں پردہ کا لحاظ کیوں نہیں ہے؟

ج۔ آپ کے اس سوال کا جواب اب سے بہت پہلے حضرت اکبر الہ آبادی ان الفاظ میں دے گئے ہیں ——

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بی بیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا وہ پردہ کیا ہوا؟
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا!

محمد مصطفےٰ علی انصاری۔ نلگنڈہ

س۔ سپاہی کی تلوار اور شاعر کے قلم میں کیا فرق ہے؟

ج۔ سپاہی کی تلوار رزم ہی میں اپنے جوہر دکھاتی ہے، شاعر کا قلم رزم، بزم ہر جگہ اپنے جوہر دکھاتا ہے۔ شاعر اپنے قلم سے مجاہد کو بیدار کرتا ہے۔ اُس کے جذبات و احساسات میں شعلے بھر دیتا ہے۔ تب مجاہد کی تلوار اپنا جوہر دکھاتی ہے۔

محفوظ عالم۔ بھاگلپور۔ پیرو۔ آرہ

س۔ دائمی قبض سے نجات پانے کا مفید اور سہل طریقہ بتلائیے۔ کرم ہوگا۔

ج۔ رات کو مویز منقہ دو دانے اور انجیر دو عدد پانی میں بھگو دیا کیجئے۔ صبح کو پانی پی لیا کیجئے اور انجیر اور منقہ کھا کر پیدل سیر کے لئے نکل جایا کیجئے —— قبض سے نجات پانے کے لئے ککڑی، پپیتہ، کھیرا، پالک، مولی، شلغم، گاجر، ٹنڈا، امرود، گلقند، بڑ، انجیر، بادام مفید ہیں —— سبز ترکاریاں بھی قبض دور کرنے کے لئے فائدہ بخش ہیں۔

چستی، پھرتی
اور بہتر نشو و نما
کا ضامن
فیراڈول

- فیراڈول میں شامل فولاد اور لذیذ مالٹ بھرپور اور مسلسل قوت اور توانائی کا خزانہ ہیں جو آپ کو ہمیشہ چست اور پھرتیلا بنائے رکھتے ہیں۔
- اس میں شامل ضروری وٹامنوں کا متوازن مرکب طاقتور اور صحتمند نشو و نما کا ضامن ہے۔

فیراڈول

فولاد اور وٹامن آمیز ٹانک

مزیدار ذائقے دار

کا تیار کردہ۔

● رجسٹرڈ ٹریڈ مارک۔ رجسٹرڈ یوزرز۔ پارک۔ ڈیوس (انڈیا) لمیٹڈ۔ بمبئی ۷۲۔ اے ایس



ہدایت علی ساحل، مچھری تلیا

س۔ زندگی بوجھ کب بن جاتی ہے؟

ج۔ جب انسان اُسے بوجھ بنا لیتا ہے۔

س۔ عورت کی زندگی میں بہار کب آتی ہے؟

ج۔ جب اُس کی آغوش میں کوئی ننھا سا بچہ مسکراتا ہے۔

س۔ سچے دوست کی پہچان کیا ہے؟

ج۔ سچا دوست مہینے کے چاند جیسا نہیں ہوتا!

نظر النساء، پچھروکھی، مارن

س۔ میری خاموش رہنے کی عادت سے لوگ مجھے مغرور سمجھتے ہیں۔ بتایئے کیا کروں؟

ج۔ اتنی خاموش نہ رہا کیجئے کہ لوگ مغرور

مجھے لگس

س۔ ذہنی توانائی کے لئے کیسی غذا مفید ہوگی؟

ج۔ سائنسدانوں کا تجربہ ہے کہ فاسفورس دماغی تقویت کے لئے ضروری چیز ہے۔ اس لئے ذہنی توانائی کے لئے ایسی غذا استعمال کرنی چاہئے جس میں فاسفورس ہو۔ مچھلی، انڈے، گوشت، دودھ، ماکھن اور بادام میں کافی فاسفورس پایا جاتا ہے۔ چنے، مٹر، سویابین، کشمش، پستہ، اخروٹ اور پنیر بھی دماغی تقویت کے لئے اچھی غذائیں ہیں۔

سراج تمنائی۔ دائم باڑی

س۔ انسان زندگی میں راحت پانا چاہے تو اُسے کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ دُوسروں کو سُکھ پہنچانا چاہئے۔

س۔ غم کی راتیں لمبی کیوں ہوتی ہیں؟

ج۔ غم کی راتیں لمبی نہیں ہوتیں، لمبی محسوس ہوتی ہیں۔

س۔ شکیل بدایونی کا کوئی شعر سنایئے۔

ج۔ یہ اُداس اُداس چہرے یہ حسیں حسیں تبسم
تری انجمن میں شاید کوئی آئینہ نہیں ہے

ساگر پیٹیلوی۔ انبالہ

س۔ ٹائپ کس نے اور کب ایجاد کیا اور وہ کہاں کا رہنے والا تھا؟

ج۔ ۱۴۵۰ء میں گٹن برگ نے ایجاد کیا۔ وہ جرمنی کا رہنے والا تھا۔

اگلا بچہ ہونے سے پہلے

ذرا ٹھہریے



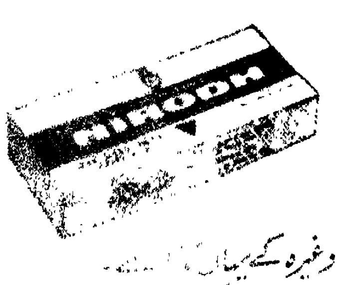
کیا آپ اس بچے
کی صحیح دیکھ بھال
نہیں کرنا چاہیں گے ؟

اس کے روشن مستقبل کیلئے اعلیٰ تعلیم کی ضروریات اور باقی سبھی ضرورتوں کو پورا کرنے کا انتظام ... لیکن اگر بچہ جلد ہو گیا تو یہ سب پورا کرنا آپ کے لئے مشکل ہوگا۔ آپ اس پریشانی سے ضرور بچنا چاہیں گے۔

نِرودھ کی مدد سے اب آپ اگلے بچے کی پیدائش کو تب تک ٹال سکتے ہیں، جب تک آپ اسکی پوری دیکھ ریکھ کرنے لائق نہیں ہو جاتے۔ نِرودھ مردوں کیلئے ہے۔ ربڑ سے بنا حمل روکنے کا یہ آسان ذریعہ برسوں سے ساری دنیا میں مقبول ہے۔ آپ بھی نِرودھ استعمال کیجئے۔

نِرودھ ہر جگہ ملتا ہے۔ سرکاری رعایتی دام، 15 پیسے میں 3

جب تک نہ چاہیں تب تک نہ پائیں سنتان



▼ نِرودھ

لاکھوں میں مقبول، بے ضرر اور آسان

کریانہ فروشوں، دوا فروشوں، پنساریوں، پان و سگریٹ کی دکانوں وغیرہ کے یہاں ...

davp 71/460

حسین احمد خاں معروف گنج۔ گیا

س۔ مسلسل جدوجہد کے بعد بھی انسان کو کامیابی حاصل نہ ہو تو؟

ج۔ جدوجہد جاری رکھنی چاہئے۔ علامہ اقبال نے فرمایا ہے ؎

حال و استقبال ہر دو جاں ساز تدبیر تست
ہاں بجہد آمادہ شو در دست تو تقدیر تست

س۔ انسان اپنے فیصلے پر کب اور کیوں نادم ہوتا ہے؟

ج۔ جب بغیر سوچے سمجھے غلط فیصلہ کر لیتا ہے۔

وینا کماری بی۔ اے۔ الہ آباد

س۔ شلغم کی تاثیر بتائیے مہربانی ہوگی۔

ج۔ شلغم کی تاثیر گرم تر ہے۔

س۔ ٹماٹر کی تاثیر سرد ہے یا گرم؟ میری سہیلی ششی کہتی ہے ٹماٹر کی تاثیر بہت سرد ہے۔ سردیوں کے موسم میں بچوں کو ٹماٹر نہ دینا چاہئے۔

ج۔ ٹماٹر کی تاثیر معتدل، خشک ہے۔ سردیوں کے موسم میں بچوں کو شوق سے ٹماٹر دے سکتی ہیں۔ ہاں کھانسی، نزلہ، یا زکام کی حالت میں نہ دیں۔

نواب اصغر علی۔ دھنباد

س۔ پیسہ اور پیار میں آج انسان کے لئے کون سی چیز ضروری ہے؟

ج۔ پیسہ! آج کی دنیا میں پیسے سے پیار بھی خرید لیا جاتا ہے، دولت سے محبت بھی خرید لی جاتی ہے۔

س۔ عزت کھو کر دولت کمانا اچھا ہے یا دولت کھو کر عزت حاصل کرنا؟

ج۔ سب کچھ کھو کر عزت کمانا اچھا ہے۔ لیکن آج کی دنیا میں سب کچھ کھو کر دولت کمانے کو اچھا سمجھا جاتا ہے۔

س۔ قرابی بنا یا شراب؟

ج۔ دونوں

میر عرفان علی شاطر۔ بمبئی

س۔ بھائی جان! زندگی زندہ دلی کا نام ہے تو موت؟

ج۔ ہم زندگی کے نقیب ہیں۔ موت کی بات کسی اور سے پوچھئے۔

س۔ انسان موت سے کیوں گھبراتا ہے؟

ج۔ جو اپنی موت کو بھی زندگی بنا لیتا ہے، وہ موت سے نہیں گھبراتا۔ وہ مر کر بھی زندہ رہتا ہے۔

ابن الحسن سعید۔ شاہ جمعہ

س۔ دنیا رنگ و بو کی دیوانی کیوں ہے؟

ج۔ اس لئے کہ رنگ و بو میں کشش ہوتی ہے۔

س۔ انسان تنہائی پسند کب ہو جاتا ہے؟

ج۔ جب وہ اس حقیقت سے آشنا ہو جاتا ہے — رسید آفت نہ رسد گوشۂ تنہائی را!

س۔ کیا یہ سچ ہے کہ غم مسرت کا دوسرا نام ہے؟

ج۔ جی ہاں، غم مسرت کا دوسرا نام ہے، غم مسرت کا دوسرا روپ ہے۔

محمد ارشاد صدیقی۔ سلیم پور۔ دیوریا

س۔ چچا جان! مجھے اچھی باتیں جاننے کا بے حد شوق ہے۔ کچھ اچھی باتیں بتائیے۔

ج۔ بزرگانِ دین کے ان ارشادات کو آویزۂ گوش بنا لیجئے —

- کسی پر ظلم و زیادتی نہ کرو۔
- کسی سے ناپسندیدہ بات نہ کرو۔
- جو اپنی قدر نہیں جانتا، دوسرے بھی اس کی قدر نہیں پہچانتے۔
- دل شفقت سے خالی ہو تو انسان انسان نہیں رہتا۔

راج جلالی ایم۔ اے۔ اندور

س۔ عورت فطرتاً بزدل ہے یا بہادر؟

ج۔ عورت بزدل نہیں ہے۔

س۔ عورت کانٹا کب بن جاتی ہے؟

ج۔ جب مرد اسے کانٹا بن جانے کے لئے مجبور کرتا ہے۔

جان عالم روش۔ مظفر پور

س۔ پھول حاصل کرنے کے لئے کانٹوں سے الجھنا پڑتا ہے۔ ایسا کیوں؟

ج۔ پھول حاصل کرنے کے لئے تو کانٹوں ہی سے الجھنا پڑتا ہے، موتی پانے کے لئے تو سمندر کی گہرائی میں اترنا پڑتا ہے۔

س۔ غموں کا پہاڑ سر پر ٹوٹ پڑے تو؟

ج۔ حوصلہ کا دامن نہ چھوڑنا چاہئے ؎

یہ کہہ کے دل نے مرے حوصلے بڑھائے ہیں
غموں کی دھوپ کے آگے خوشی کے سائے ہیں

س۔ حضرت جگر مرادآبادی کا کوئی حیات افروز شعر سنائیے۔

ج۔ سنئے ؎

یہ مصرعہ کاش نقش ہر در و دیوار ہو جائے
"جسے جینا ہو مرنے کے لئے تیار ہو جائے!"

آپ کے لئے پھلوں اور سبزیوں کے تحفظ کا آسان طریقہ

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے پسندیدہ پھل اور سبزیاں آپ کو سارا سال کھانے کے لئے مل سکیں تو آپ پھلوں اور سبزیوں کے تحفظ کے لئے بھارت سرکار کے اہتمام میں چلنے والے کسی بھی مرکز میں تشریف لے جائیں اور اپنی پسند کے مطابق جیم، جیلی، مارملیڈ، چٹنیاں، اچار، سکوئش وغیرہ تیار کروائیں۔

کسی مرکز میں جانے سے پہلے، وقت طے کر لیں اور یہ بھی معلوم کر لیں کہ کسی چیز کی تیاری کے لئے پھل اور چینی کتنی مقدار میں درکار ہوں گے۔ یہ چیزیں آپ اپنے ساتھ لے جائیں اور معمولی خرچ پر اپنی پسند کے مربّے اچار اور چٹنیاں وغیرہ تیار کروالیں۔

تربیت:-

اگر آپ چاہیں تو اچار، مربّے، جیم وغیرہ بنانا سیکھ بھی سکتے ہیں۔ یہ تربیت مفت دی جاتی ہے۔ دو ہفتوں میں آپ کی تربیت مکمل ہو جائے گی اور آپ کو سرٹیفکیٹ بھی دیا جائے گا۔



پھلوں اور سبزیوں
کے تحفظ کے
مرکز میں
تشریف لائیے

ڈی II / 183 قدوائی نگر (ویسٹ)
نئی دہلی-23
فون:- 626960

35 - راجندر پارک، نئی دہلی-60
فون:- 582871

ڈی- 26 سی۔سی کالونی - دہلی-7

مکان نمبر 3040
سیکٹر 21 - ڈی چنڈی گڑھ
فون:- 27879

سی-61 سوجنی مارگ-سی-اسکیم-جے پور
فون:- 74073

اشوکا ہوٹل اسٹیٹ-رج-شملہ

34/1 سنت نگر-سول لائنز-لدھیانہ

davp 72/160

قاضی سعید الدین۔ بدنیرہ گنگاکی۔ بہار

س۔ کیا یہ سچ ہے کہ جو انسان زمانہ کے ساتھ چلتا ہے کامیاب ہوتا ہے؟

ج۔ جی ہاں
پیچھے والا جو زمانے کے اشارے سمجھا
سرخرو ہو نہ سکا بار دو گمنام کے ساتھ

سیما علی گڑھ

س۔ وفاداری مردوں میں کم کیوں ہوتی ہے؟

ج۔ اس لئے کہ مرد بے وفا ہوتا ہے۔

س۔ تیاز کا کوئی شعر سنایئے۔

ج۔ میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

محمد ظہیر نظامی۔ دھنباد

س۔ کوئی ظلم و بربریت کی حد سے گزر جائے تو؟

ج۔ تو یقین کر لیجئے کہ چنگیز اور ہلاکو سے اس کا کوئی رشتہ ہوگا!

س۔ انسان زندگی کی دھوپ اور چھاؤں کی طرح ہے کیا آپ اس خیال سے متفق ہیں؟

ج۔ یہ خیال بہت حد تک حقیقت سے قریب ہے۔

س۔ مرد کی سب سے بڑی کمزوری کیا ہے؟

ج۔ شاید آپ یہ کہنا چاہتے ہیں، مرد کی سب سے بڑی کمزوری عورت ہے! لیکن یہ حقیقت نہیں ہے۔ عورت مرد کی سب سے بڑی کمزوری نہیں، مرد کی سب سے بڑی طاقت ہے۔

محمد رفیع احمد۔ دھنباد

س۔ انسان خود مختار کب ہو جاتا ہے؟

ج۔ جب مختاجی دور کرنے کے لئے جدوجہد کرنا چھوڑ دیتا ہے۔

س۔ انسان اپنی زندگی سے ہار کب جاتا ہے؟

ج۔ جب حوصلہ کا دامن چھوڑ دیتا ہے۔

پوسٹ مارٹم جناب عرش ملسیانی نے مزاحیہ نثر کا ایک معیاری نمونہ اس کتاب کے انشائیوں میں پیش کیا ہے۔ قاضی عبدالغفار مرحوم ایسے مستند ادیبوں نے اس کی داد دی تھی۔ قیمت صرف تین روپے فی جلد۔

آہنگ حجاز "قومی یک جہتی کے خیال سے ایک برہمن اگر رسول کریم کے اوصاف عقیدت مندانہ انداز سے نعتوں کی شکل میں پیش کرے تو یہ بڑی مستحسن بات ہے" جناب عرش ملسیانی کی ان نعتوں کا دیباچہ حضرت مولانا عبدالماجد دریا بادی نے لکھا ہے۔ کتابچہ آرٹ پیپر پر چھپا ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ۔

جنون و ہوش ابوالفصاحت جوش ملسیانی کا مجموعہ غزل کا دوسرا ایڈیشن ختم ہو چکا ہے۔ ارفع و اعلےٰ کلام، سلیس زبان اور بلند خیالات۔ یہ کتاب یونیورسٹی کے اعلےٰ ترین امتحان میں کئی سال تک پڑھائی گئی ہے۔ قیمت صرف چار روپے۔

شرار سنگ عرش ملسیانی کے وجد آفریں کلام کا حسین و جمیل مجموعہ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے اس کی بہت داد دی تھی۔ خواجہ غلام السیدین۔ فراق۔ ڈاکٹر مسعود حسین اور اردو کے اکابر نے اس کی بہت تعریف کی۔ قیمت آٹھ روپے۔

اُردو کی مزاحیہ شاعری (انتخاب) اسے جناب عرش ملسیانی نے مرتب کیا ہے۔ کتاب ہاتھوں ہاتھ نکل رہی ہے۔ ہندوستان و پاکستان کے نئے اور پرانے مزاح نگاروں کا کلام اور ان کے حالات زندگی درج ہیں۔ قیمت آٹھ روپے۔

آئینہ اصلاح حضرت جوش ملسیانی کی شاگردوں کے کلام پر اصلاحیں مع توجیہ۔ کتاب زبان و بیان کے نکات سمجھنے کیلئے بے بہا نسخہ ہے۔ قیمت پانچ روپے۔

رُوحِ افکار جناب واجد سحری نے ہند و پاک کے جدید شعراء کے کلام میں سے سینکڑوں مختلف موضوعات پر بہت حسن و خوبی سے منتخب اشعار کا یہ مجموعہ کئی سال کی کاوش سے مرتب کیا ہے۔ جس میں ایک ہزار سے زائد اشعار ہیں۔ سائز بڑا، کتابت عمدہ، طباعت نفیس، سرورق دیدہ زیب۔ قیمت چار روپے۔ محصول ڈاک علاوہ۔

ریگِ رواں جناب رنگی پٹیالوی کا مجموعہ کلام مطلع تا مقطع غزلوں کے ہر شعر میں تغزل کی شان جلوہ گر ہے اور ہر شعر آئینہ دار معراج فکر و فن ہے۔ اعلیٰ پایہ کی کتابت، دیدہ زیب طباعت نیز منقش گرد پوش سے آراستہ یہ غزل دستہ ہر لائبریری کی زینت بننے کے قابل ہے۔ قیمت صرف چھ روپے۔ محصول ڈاک علاوہ۔

پتہ: رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر

ثریا پروین جانسی۔ کلکتہ

س۔ چار سال سے میں کسی چیز کو پانے کے لئے بہت کوشش کر رہی ہوں لیکن شاید میری تقدیر میں ناکامی لکھی ہے۔ پھر بھی میں تہیہ کر چکی ہوں کہ پا کر رہوں گی! کیا اُمید پر بھروسہ کروں؟

ج۔ کسی حالت میں مایوس نہ ہونا چاہئے۔ کسی چیز کو پانے کے لئے جو لوگ اس طرح تہیہ کر لیتے ہیں وہ اپنا مقصد حاصل کرنے میں یقیناً کامیاب ہوتے ہیں۔

ایس۔ پرویز۔ بریلی

س۔ قرآن پاک میں لکھی ہوئی کچھ باتیں بتایئے جن سے کچھ نصیحت ملے۔ مجھے اچھی باتیں جاننے کا بہت شوق ہے۔

ج۔ بُرائی کو بھلائی سے رفع کرو۔
- ناحق سرکشی نہ کرو۔
- ناشکری نہ کرو۔

محمد لقاء الرحمٰن۔ اورنگ آباد۔ گیا

س۔ جسم کے زخم اور داغ مٹ سکتے ہیں۔ رُوح کی جراحتیں کیسے مندمل ہوں گی؟

ج۔ رُوح کی جراحتیں اچھے خیالات سے مندمل ہو سکتی ہیں۔

س۔ عورت جب آزادی پسند ہو تو؟

ج۔ عورت آزادی پسند ہو تو اُس کے پیروں میں اپنی محبت کی بیڑیاں ڈال دینی چاہئیں۔

س۔ خوبصورتی کا راز؟

ج۔ حفظانِ صحت کے اصولوں کی پابندی۔ اچھی صحت میں خوبصورتی کا راز مضمر ہے۔

ڈاکٹر زبیر احمد شمسی۔ محمد آباد گہنہ

س۔ آج کل کی تعلیم کا مقصد کیا ہے؟

ج۔ تخریب کاری کی تربیت حاصل کرنا!

س۔ آج کے انسان کی سب سے بڑی کمزوری کیا ہے؟

ج۔ خود کو خُدا سے بھی قوی سمجھنا!

کرشنا کماری بی۔ اے۔ دہلی

س۔ کسی نے آپ سے پُوچھا تھا پاکستان کے صدر ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی مس بے نظیر کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ جواب میں آپ نے کہا تھا "بے نظیر ہے!" ـــــ کیا آج بھی بے نظیر کے بارے میں آپ کا یہی خیال ہے؟

ج۔ جی ہاں۔

س۔ اور بھٹو صاحب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ طرح طرح کی متضاد باتیں کرنے میں وہ بے مثال ہیں!

عبدالرحمٰن .....

س۔ عورتوں کو اعلیٰ تعلیم دلانا اچھا ہے یا بُرا؟

ج۔ عورتوں کو اتنی تعلیم دلانی چاہئے جو انہیں چراغِ خانہ سے شمعِ محفل نہ بنا دے۔

س۔ بچوں کی پیدائش روکنے کے لئے فیملی پلاننگ کی باتیں کی جاتی ہیں۔ لیکن موت کو روکنے کے لئے ـــــ؟

ج۔ موت کو کوئی نہیں روک سکتا، لیکن صحت کے اصولوں پر کاربند ہو کر زندگی اور موت کے درمیانی فاصلہ میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ زندگی طویل بنائی جا سکتی ہے۔

س۔ انسان کو باعزت اور ترقی یافتہ زندگی گزارنے کے لئے کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ باعزت اور ترقی یافتہ لوگوں کے نقشِ قدم پر چلنا چاہئے۔ اُن کے حالات سے روشنی حاصل کر کے آگے بڑھنا چاہئے۔

آر۔ اے۔ سعیدی۔ دھنباد

س۔ انسان اپنے آپ کو خُدا کب سمجھنے لگتا ہے؟

ج۔ جب وہ غرور کے نشے میں یہ بھول جاتا ہے کہ وہ ناچیز بندہ ہے!

س۔ انسان غلط راستہ کب اپنا لیتا ہے؟

ج۔ جب وہ غرور کے نشے میں خود پسند ہو جاتا ہے۔

سرورج سکسینہ۔ نئی دہلی

س۔ پنسلین دوا کس نے ایجاد کی ہے؟

ج۔ انگلینڈ کے ڈاکٹر فیلمنگ نے۔

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر: خوشتر گرامی ـــــ مطبوعہ: پربھات آفسیٹ پریس و لیبل آرٹ پریس دہلی۔ تصاویر و ٹائیٹل: پی۔ کے پریس و برانڈ پریس دہلی ـــــ پتہ: دفتر بیسویں صدی، دریا گنج، نئی دہلی

37th YEAR OF PUBLICATION
Telephones Office: 271637 Residence: 619927

RADIUM TONIC PILLS

نیا خون ـــ نئی طاقت

کمزوری کا زبردست علاج

ریڈیم ٹانک پلز

نیا خون بکثرت پیدا کرکے نہ صرف کمزوری دور کرتی ہیں بلکہ جسم میں زبردست طاقت بڑھاتی ہیں۔ وزن اور خون کئی پونڈ بڑھ جاتا ہے۔ کھوئی ہوئی طاقت اور صحت واپس لانے کے لئے ملک کے کونے کونے میں مشہور و مقبول ہیں اور لاکھوں انسان روزانہ استعمال کرتے ہیں کمزوری خواہ کسی وجہ سے ہو کمزور انسان کو بھی نئی طاقت حاصل ہوتی ہے۔ تندرست نوجوان ریڈیم ٹانک پلز کے علاج سے اپنی طاقت کئی گنا بڑھا سکتے ہیں۔ قیمت مکمل علاج صرف چھ روپے محصول ڈاک علاوہ۔

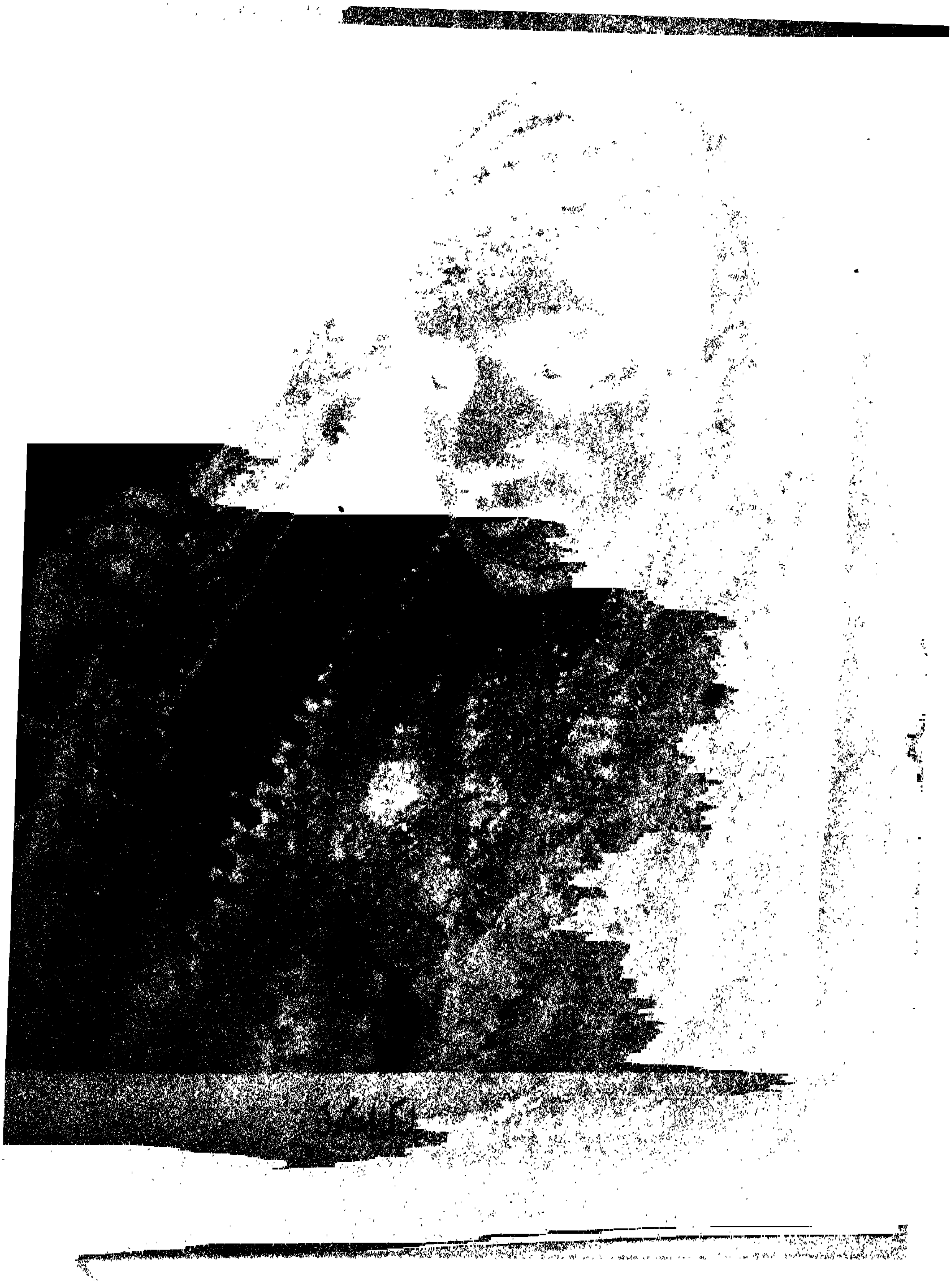


کلکتہ ایجنٹ:۔
ایم ایچ اسمٰعیل پرائیوٹ لمیٹیڈ
نمبر ۸۰ کولوٹولا اسٹریٹ کلکتہ ۱

پتہ:۔ ریڈیم کیمیکل [illegible] پرائیوٹ) لمیٹیڈ پو [illegible]

بیسویں صدی







گزشتہ دنوں ہریانہ اُردو کلب جیند کی طرف سے ایک کل ہند مُشاعرہ ہوا۔ جس کی صدارت نامور شاعر اور ادیب جناب گوپال متل نے کی اور میرِ مُشاعرہ کے فرائض حضرتِ مخمور سعیدی نے انجام دیئے۔ تصویر میں میرِ مُشاعرہ اپنی غزل سُنا رہے ہیں۔

مصرف کے بغیر جل رہا ہوں
میں سونے مکان کا دیا ہوں

منزل ہے نہ کوئی جادہ پھر بھی
آشوبِ سفر میں مُبتلا ہوں

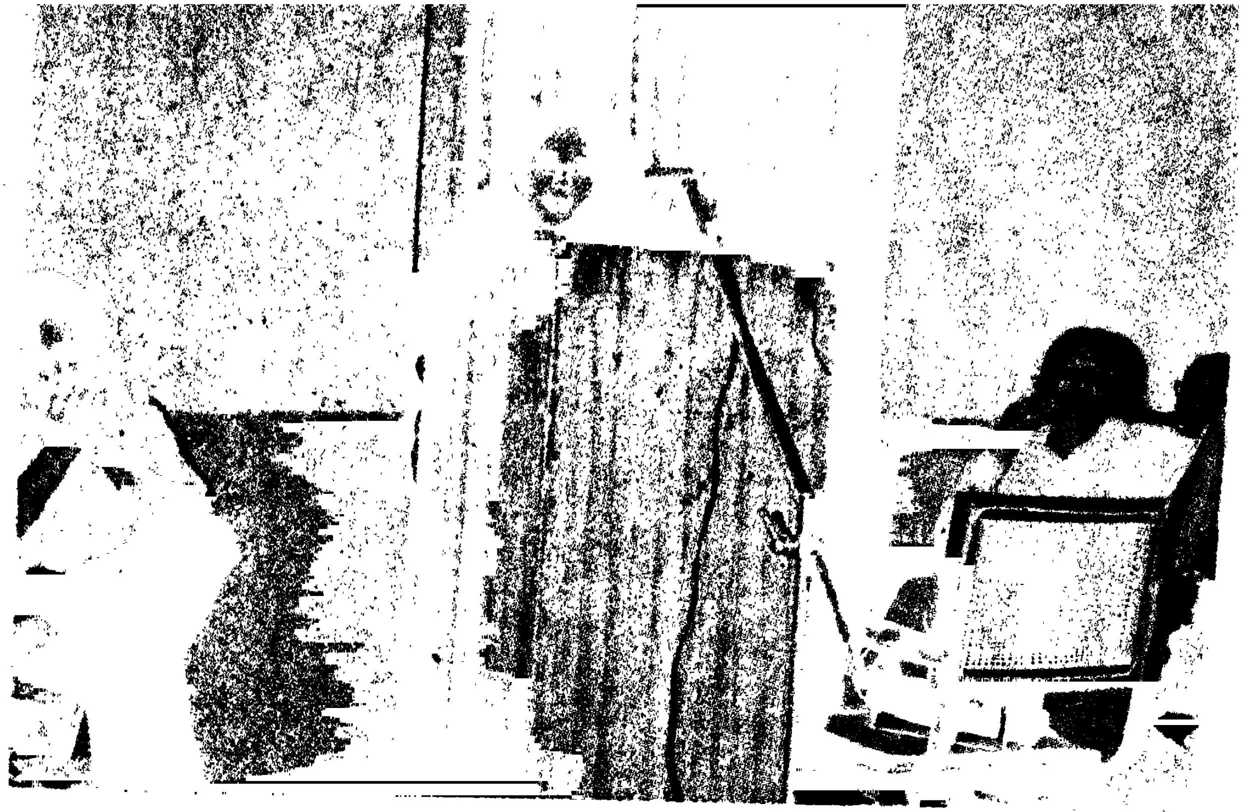
محمل بھی نہیں کوئی نظر میں
صحرا کی بھی خاک چھانتا ہوں

منصُور نہ دعویِ انا الحق
سولی پہ مگر لٹک رہا ہوں

اِس شہر میں وضعِ کج کلاہی
میں واقعی درخورِ سزا ہوں

اے اہلِ کرم نہیں میں سائل
رستے پہ یونہی کھڑا ہوا ہوں

اب شکوۂ سنگ و خشت کیسا
جب تیری گلی میں آگیا ہوں



ڈاکٹر مایا کھنہ راجے بریلوی اپنی مترنم آواز میں اپنا کلام پیش کر رہی ہیں۔

مذاقِ لُطفِ زِندگی نہ شہر میں نہ گاؤں میں
وفاشناس دوستی نہ شہر میں نہ گاؤں میں

قدم قدم پہ دیر ہے قدم قدم پہ ہے حرم
شعورِ عشق و بندگی نہ شہر میں نہ گاؤں میں

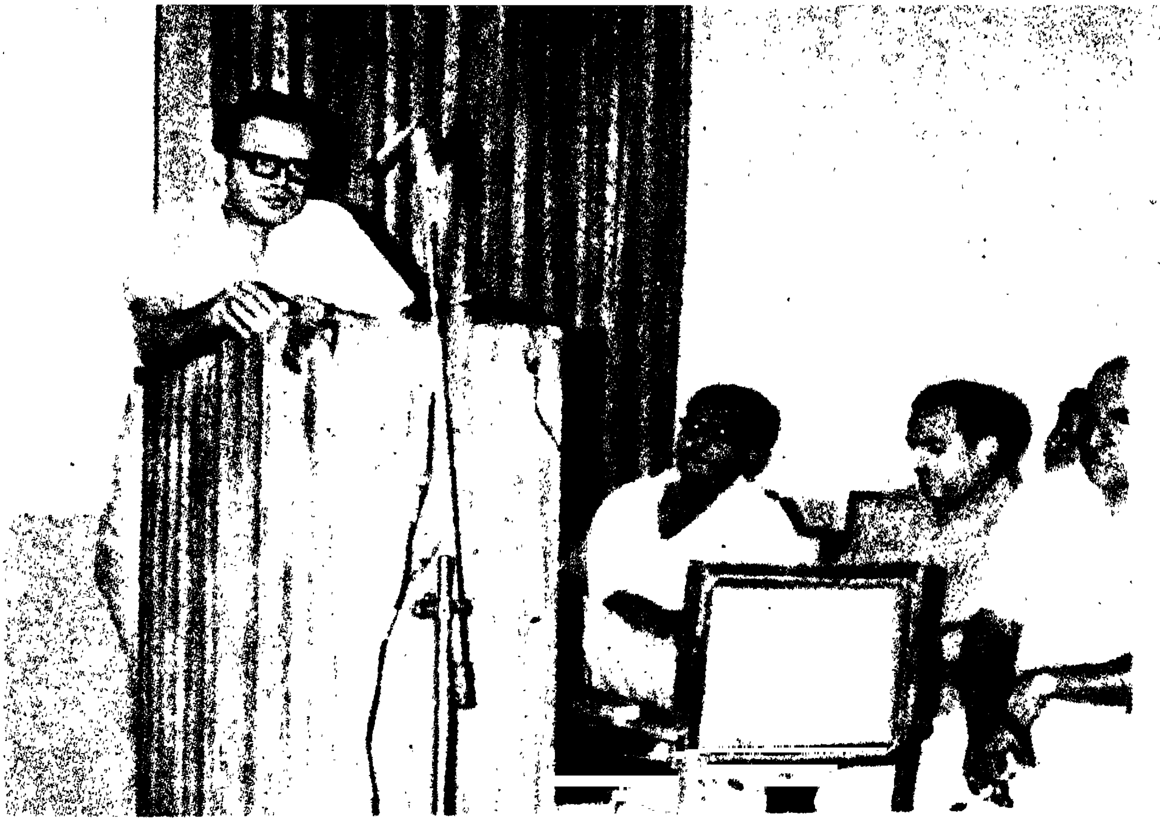
اِدھر بھی ہیں بناوٹیں اُدھر بھی ہیں بناوٹیں
ہوائے رسمِ سادگی نہ شہر میں نہ گاؤں میں

وہ محفلوں میں رونقیں نہ پنگھٹوں پہ شور ہے
نظر نواز دلکشی نہ شہر میں نہ گاؤں میں

گذر رہی ہے زِندگی گھروں میں جاگ کر
کہاں ہے امن و آشتی نہ شہر میں نہ گاؤں میں

اِدھر اُدھر ہزارہا چراغ ہیں جلے ہوئے
مگر دِلوں میں روشنی نہ شہر میں نہ گاؤں میں

یہ پورنیما کی رات کو ہوا تو آج کیا ہوا؟
بکھر رہی ہے چاندنی نہ شہر میں نہ گاؤں میں



جنابِ پورن کمار ہوشؔ اپنا کلام سُنا رہے ہیں۔

جمنا کی تھاہ تو کبھی گنگا کا پاٹ ہے
اپنا جو ایک دِل ہے وہ کتنا وِراٹ ہے

شیتل بھی ہے پوتر بھی پوجا کے یوگ بھی
تیرا یہ رُوپ ہے کہ بنارس کا گھاٹ ہے

مچلا ہوا شباب بھبکتا ہوا سا رنگ
وہ انگ انگ اب کسی دیپک کی لاٹ ہے

دِل کا جو درد ہے نہیں اُس کا کوئی علاج
کانٹوں کی یہ چُبھن نہیں پھولوں کی کاٹ ہے

مندر سمان جسم ہے دیوی سمان روپ
من باورا پھرے کوئی گھر ہے نہ گھاٹ ہے

اُدھروں پہ چاندنی کی ہے شیتل سی ایک لہر
سورج کا تیج ہے کہ دمکتا للاٹ ہے

تُم کو تو ہوشؔ اُن سے شکایت نہ تھی مگر
آنکھیں بُجھی بُجھی سی ہیں چہرہ سپاٹ ہے



قومی ایکتا ٹرسٹ دلّی کی طرف سے منعقدہ ایک مُشاعرہ میں نامور شاعر حضرتِ مخمورؔ سعیدی اپنا کلام سُنا رہے ہیں۔

لمحہ بھر رُکنا پڑا، گو میں بہت عجلت میں تھا
اِک بُلاوا سا عجب اُس اجنبی صورت میں تھا

رات کے آنگن میں رقصاں تھی اُمیدِ صبحِ نَو
نُور کا اِک دائرہ بھی حلقۂ ظُلمت میں تھا

دو دھڑکتے دِل نکل بھاگے حصارِ ضبط سے
دشت و در سوئے ہوئے تھے، وقت بھی غفلت میں تھا

اُس کا افسردہ تبسّم، میری پھیکی سی ہنسی
منعکس دونوں کا غم اِک لمحۂ رُخصت میں تھا

سنگ پیکر لوگ بھی اندر سے تھے ٹوٹے ہوئے
عکسِ احساسِ شکست آئینۂ نخوت میں تھا

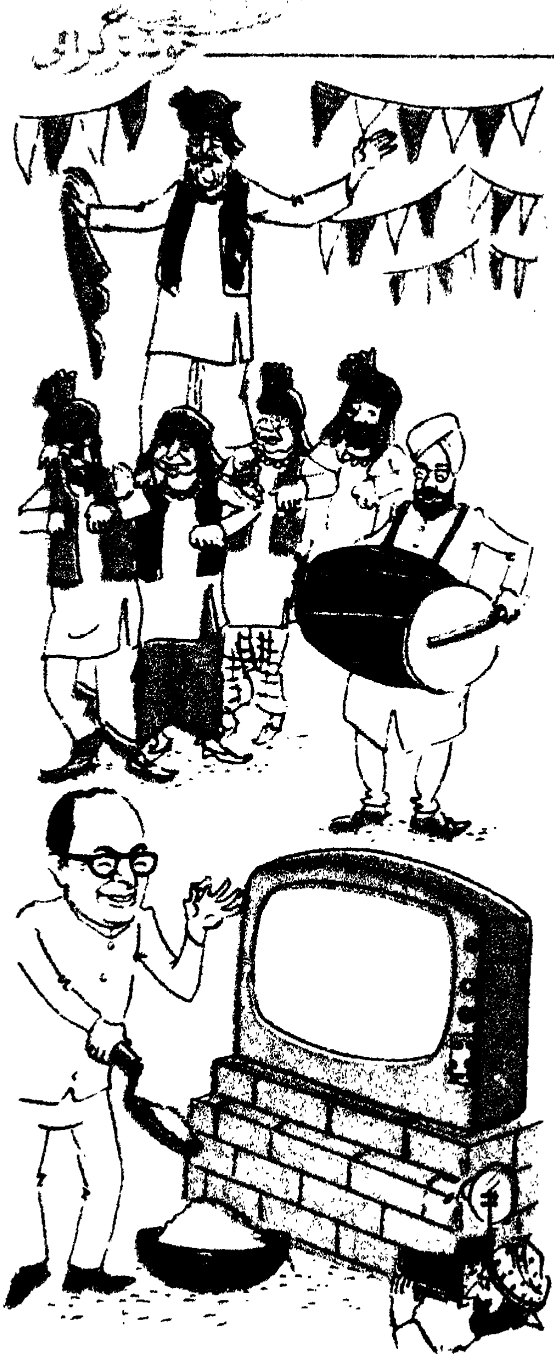
تجھ سے دُور آ کر کبھی سوچا تو حیرانی ہوئی
خود فراموشی کا عالم جو تری قربت میں تھا

اب اُسے مخمورؔ میں کس نام سے آواز دوں؟
وہ کہ جس کے سامنے تھا، اِک نئی صورت میں تھا

بیسویں صدی دہلی

ٹیلیفون دفتر ——— ۲۶۱۹۳۶
ٹیلیفون رہائش ——— ۶۱۹۹۲۶

تیر و نشتر



شری گجرال وزیرِ براڈ کاسٹنگ نے پنجاب میں پہلی ٹیلی ویژن فیکٹری کا سنگِ بُنیاد رکھا۔

"ہریانہ میں بے روزگاری میں اضافہ" ایک خبر ——— وزارت میں توسیع کر لی جائے۔

"کانسٹبل کی آسامی کے لئے ایم۔اے" ——— اس لئے کہ اعلیٰ پوسٹوں میں ان پڑھ سیاستداں قابض ہو گئے ہیں۔

"اسلحہ کی اسمگلنگ" ——— کاش امن بھی اسمگل ہو سکتا۔

"ٹیکس میں چھوٹ" ایک خبر ——— کیا کچھ وزیر مستعفی ہو گئے ہیں؟

"صدر بھٹو کو اب کس چیز کا انتظار ہے؟" ——— امریکہ کے چشم و ابرو کے اشاروں کا۔

"پنجاب کی صنعتوں کے لئے بجلی کی ساٹھ فیصدی کٹوتی" ——— یعنی پنجاب کی صنعتوں پر بجلی گر پڑی۔

"بھٹو اور بلوچستان کے مُکھیہ منتری میں ٹکر" ——— دیکھو کس کا بھٹہ بیٹھتا ہے۔

"دیش کے کیریکٹر کو بلند کرنے کے لئے دیش بھگتوں کو میدان میں آنا چاہیئے" ایک عنوان ——— اور اقتدار کی کُرسیاں آپ کے لئے چھوڑ دی جائیں۔

"پیٹ کی پکار" ایک عنوان ——— ہائے روٹی ہائے دال۔



وزرائے اعلیٰ نے پانچویں پلان کے لئے منظوری دے دی۔

"بمبئی سے چینی غائب" ایک خبر ــــ پیکنگ سے اور منگا لیجیے۔

"بھٹو کا پستہ کٹ جائے گا" پاکستانی اخبارات ــــ اس کا بھٹو کو یقیناً افسوس نہ ہوگا۔ مگر یحییٰ جیسے حشر سے خدا بچائے۔

"معجزہ اثر دوائی جو کئی بیماریوں کے لئے استعمال ہو سکے گی" ایک خبر ــــ مگر حسب ذیل بیماریاں مستثنیٰ ہیں:

- سیاسی دھڑے بندی
- سیاسی اقتدار کی ہوس
- سیاست کے لئے بھوک ہڑتال
- مرن برت، ہڑتالیں، مظاہرے اور جلسے جلوس

"پاکستان سکھا شاہی سے گھبرانے والا نہیں" بھٹو کی تقریر ــــ اس لئے کہ وہ یحییٰ شاہی کو جھیل چکا ہے۔

"شراب کی بوتل میں کیڑے" ایک خبر ــــ ہم کہتے ہیں، اللہ کرے شراب خانے ہی میں کیڑے پڑ جائیں۔

"غازی آباد کے ٹیچر پر حملہ" ایک خبر ــــ بچ گیا تو غازی، مرگیا تو شہید۔

"مندر سے مورتیاں غائب" ایک خبر ــــ چوروں کی شردھا کا مظاہرہ۔

"سفید شیرنی" ایک عنوان ــــ انگریز نسل سے تعلق رکھتی ہوگی۔

• بجلی کا استعمال نہ کیجئے" ایک اپیل ——— اندھیرا بڑھاؤ تحریک چلاؤ۔

• اندھے پن سے بچنے کے لئے غذائی عادات بدلنے کا مشورہ" ایک عنوان ——— سیاسی اندھے پن سے بچنے کے لئے بھی نسخے کی ضرورت ہے۔

• امریکہ کے ہسپتالوں میں خون کی قلت" ایک خبر ——— وہ خون جمع کرلیں جو نکسن کے حکم سے امریکیوں نے ویتنام میں بہایا ہے۔

• چین پاکستان کی مدد کرے گا" ایک خبر ——— پاکستانی دیوانِ غالب سے اگر فال نکالیں تو جواب ملے گا ؏
ہوئے یہ دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

• سرکاری پارٹیوں اور دعوتوں میں اب میٹھا نہیں ہوگا" ——— صرف نمک دیا جائے گا تاکہ لوگ نمک حرام نہ بنیں۔

• دلّی میں جرائم" ایک عنوان ——— سب سیاسی ہوں گے۔

• ویتنام سے متعلق صلحنامہ کس نے کیا کھویا کیا پایا؟" ——— ویتنامیوں کا نام ہوا۔ نکسن نے عزت گنوائی۔

• بزمِ خواتین" ایک عنوان ——— جو مردوں کے لئے آراستہ کی جاتی ہے۔

• بھٹو کا نیا آئین۔ ایوب کے دستور کی نئی شکل" ایک عنوان ——— یعنی پرانی شراب نئی بوتل میں۔



وہ کلچرل جھلکیاں جو ۲۶ جنوری کی پریڈ میں نظر نہیں آئیں۔



جنرل ٹکا خاں کا دورۂ چین۔

"آؤ ذرا بیٹھ کر سوچیں" ایک عنوان ——— کہ وہ فتنہ انگیزی سے کیوں باز نہیں آتے؟

"بہار میں اُردو میں درخواستیں لی جائیں گی" ایک خبر ——— مگر اُردو کو علاقائی زبان تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

"دلّی میں پٹرول کا راشن۔ پمپوں میں پٹرول ندارد" ایک خبر ——— یہاں پمپوں میں پانی نہیں نکلتا، پٹرول تو دُور کی بات ہے۔

"دلّی میں طلباء کا مظاہرہ" ایک خبر
دُوسری خبر "غازی آباد میں ٹیچروں کا مظاہرہ" ——— دونوں مِل کر گائیں سے

آ عندلیب مِل کر کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گُل پکار میں چِلّاؤں ہائے دل

"یو۔پی گورنمنٹ کی طرف سے اُردو شاعروں اور ادیبوں کی تصانیف پر انعامات دینے کا اعلان" ——— حاتم کی قبر پر لات مار دی۔

"ہندوستان میں عورتوں کو شکتی کا رُوپ سمجھا جاتا ہے" ایک عنوان ——— اور اِس کا سب سے بڑا ثبوت دِلّی کا شکتی نگر ہے۔

"سہارنپور میں بزمِ فارسی کا قیام" ایک خبر ——— اب سہارنپور والے پڑھیں فارسی بیچیں تیل۔

"پنجاب میں ترقیاتی اسکیموں کو کامیاب بنانے کے لئے نئے ٹیکس لگائے جائیں گے" وزیر خزانہ ——— اور اِن اسکیموں کو چلانے کے لئے وزیروں کی تعداد اور معیار میں ترقی کی جائے گی۔

"پرانا چین سنسکرتی کی حفاظت کرو" گورو گول والکر کی اپیل
——— اور گورو جی جیسی شکل و صورت بناؤ۔

"چولھا صرف ایک وقت گرم ہوتا ہے" ایک خبر ———
ایندھن اور راشن دونوں کی بچت۔

"چین پاکستان میں اسلحہ ساز فیکٹریاں کھولے گا" ایک خبر
——— اور منافع چین لے جائے گا۔

"شہری جائداد حد بندی بل یو۔پی اسمبلی سے واپس" ———
کملا پتی جی کا سوشلزم تمام شُد۔

"بچوں سمیت بیوی کا اغوا" ایک خبر ——— ورنہ بچے پریشان
ہوتے اور مارے مارے پھرتے۔

"دلی کا انتظامی ڈھانچہ" میر مشتاق احمد چیئرمین میٹرو
پالیٹن کونسل کا ایک مقالہ ——— ایسا ڈھانچہ جو میر صاحب کے
معیار پر کھوٹا ثابت ہُوا۔

"پاکستان میں عورتوں کو بھی فوجی ٹریننگ" ——— تاکہ
عورتوں کو بھی آئندہ فوجی ڈکٹیٹر بننے کا موقع ملے۔

"ایک بالٹی پانی ایک روپیہ میں" ایک خبر ——— دس
روپے کی بالٹی جو مفت پڑے گی۔

"عوام پریشان" ——— اور حکمران حیران۔

"غزل" ایک عنوان ——— ع
غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا



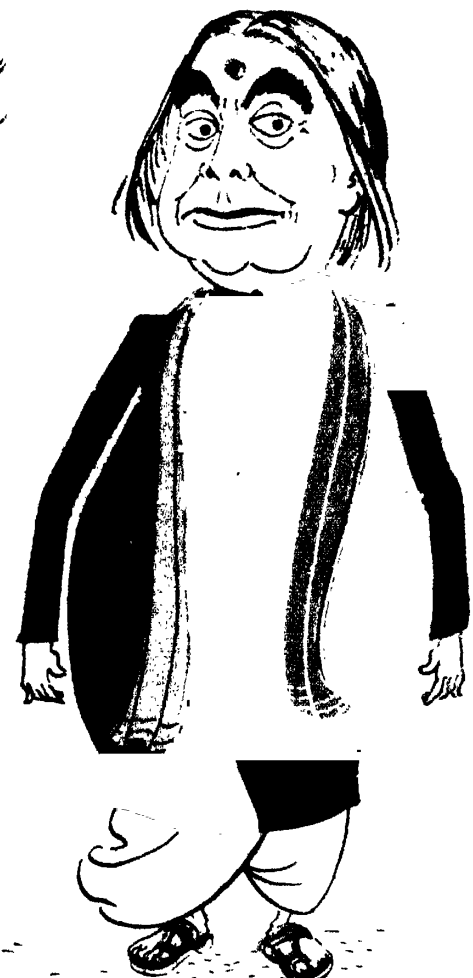
ویتنام میں جنگ بندی۔ امریکہ کے زبردست نقصانات۔

کملاپتی ترپاٹھی ———

خوشتر گرامی

کوتاہ قد، کوتاہ اندیش، گول پُچاریوں جیسا چہرہ، موٹی سی پھیلی ہوئی بھدی ناک، بڑی بڑی آنکھیں، موٹی موٹی بھویں، چوڑی پیشانی تِلک دھاری، اُلٹے لمبے بال، موٹے نقش ونگار، بھرے ہوئے گال، کلین شیو۔ اِس حُلیے کے ہیں یو۔پی کے وزیرِ اعلیٰ ———

کملاپتی ترپاٹھی



دوہرا بدن، کھدر کا کُرتہ دھوتی لباس، پاؤں میں چپل، گلے میں کھدر کا پٹکہ، قلب کی سیاہی کو ڈھانپے ہوئے —— بِلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا اور یو۔پی کی وزارتِ اعلیٰ آپ کے ہاتھ آئی اور آپ نے اُس کا استعمال اِس طرح کیا جیسے بندر نے ادرک کا کیا تھا —— ماتھے پر تِلک کی دھاریاں قلب ونظر کی تنگی کی علامت۔ اُوپر سے کانگرسی، اندر ٹنڈن، سمپورنانند کی رُوح بولتی ہے —— ہاتھ میں اندرا کا جھنڈا، لبوں پر جواہر لال کی جے جے کار۔ لیکن دل مدھوک اور اٹل بہاری باجپائی کے خیالات ونظریات میں ڈُوبا ہُوا۔ ہندو مُسلم اِتحاد کا نام لیتے ہیں۔ مگر ہندو مُسلم مِلاپ اور گنگا جمنی تہذیب کی جیتی جاگتی یادگار اُردو زبان کے قاتلوں کی صف میں بڑی ڈِھٹائی سے شامل ہیں —— انیس ودبیر، چکبست اور رتن ناتھ سرشار کے وطن لکھنؤ میں راج سنگھاسن ہے جو اُردو کے وطنی نغموں سے گونج رہا ہے اور اُردو کی دُوسری راجدھانی تھی مگر وہ اُردو کو وہاں کی زبان ماننے سے مُنکر ہیں —— اُردو کی ترقّی کا فریب دیتے ہیں۔ اُردو ٹیکس دہندگان کی گاڑھی کمائی سے وصول کی ہوئی رقم کے عشرِ عشیر کا بھی ہزارواں حصّہ حاتم کی قبر پر لات مار کر اُردو ادیبوں اور شاعروں میں تقسیم کرنے کو اُردو کی بقا قرار دیتے ہیں۔ یعنی اُردو کی جڑیں کاٹتے ہیں اور ٹہنیوں میں پانی دیتے ہیں —— میرے ذہن میں اِن کی تصویر اُبھرتی ہے تو میں اُس پر یہ مصرع لکھ دیتا ہوں ؏

نہاں اس کی تعمیر میں تھی خرابی

آکہ وابستہ ہیں....

انجم عرفانی ایم۔ اے

۳۵ منیر ساگر، گورکھپور

محترمی! آداب

لیجئے آپ کی خدمت میں ایک اور افسانہ "آکہ وابستہ ہیں...." لے کر پھر حاضر ہو رہا ہوں۔ محبت کا موضوع جتنا فرسودہ ہے اُتنا ہی ناگزیر بھی ہے۔ کوئی تخلیق اِس سے بے نیاز ہو کر اور سب کچھ ہو سکتی ہے 'ادب' نہیں ہو سکتی۔ اِسی پُرانے اور فرسودہ موضوع پر ایک نیا افسانہ ملاحظہ فرمائیے۔ اُمید ہے پسند آئیگا۔
آپ کی گرانقدر رائے کا منتظر....
انجم عرفانی

چشمِ خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا
ہم نے سمجھا تھا کہ اے میر یہ آزار گیا

میری نگاہیں اِس شعر میں اُلجھ کر رہ گئیں ہیں۔ جب بار بار اِس شعر کو پڑھتا ہوں۔ سارا صفحہ خون آلودہ دکھائی دیتا ہے۔ ٹیڑھے میڑھے حروف لختِ جگر محسوس ہوتے ہیں۔ ساری فضا سوگوار اور بجھی بجھی معلوم ہوتی ہے۔ اپنا وجود آتش فشاں کا کھولتا ہوا لاوا بنا ہوا ہے۔ کاش! اُس کا دہانہ کھل جاتا اور اندر اُبلتا ہوا مادّہ دُور دُور تک پھیل جاتا۔ جسم راکھ کی طرح فضا میں بکھر جاتا۔ اُس سُلگتے ہوئے وجود کا نام و نشان مٹ جاتا۔ اے کاش ایسا ہو جاتا!

تم نے ہولے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا ہے۔ میں سر اُٹھا کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ تمہارے ہاتھوں کے لمس سے بخوبی واقف ہوں۔ دستِ قاتل کو کون نہیں پہچانے گا، اور وہ بھی عزیز ترین قاتل کے ہاتھوں کو! تمہارے ہونٹ حسبِ معمول ہلے ہوں گے۔ اُن سے وہی جانے پہچانے، فرسودہ الفاظ پھسل کر فضا میں تیرتے ہوئے، میری سماعت سے ٹکرانے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔ مگر میرے ذہن کے صحرا میں اُٹھی ہوئی تیز و تُند آندھی، میری قوتِ سامعہ کو بھی اپنی زد میں لئے ہوئے ہے۔ اچھا ہی ہے کہ اُس پگھلتے ہوئے زہریلے سیسے سے میرے کان محفوظ رہیں۔ تمہارے ہاتھ کا بوجھ ابھی تک میں اپنے کندھے پر محسوس کر رہا ہوں۔ لمحہ بہ لمحہ دباؤ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ کاش تم اپنا یہ نجس ہاتھ میرے کندھے سے ہٹا لیتے۔ اس کا دباؤ ناقابلِ برداشت ہے۔ کندھے سے بڑھتے بڑھتے دل پر اِس بوجھ کو محسوس کرنے لگا ہوں۔ ایک روحانی اذیت میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ اِن ہاتھوں سے میرے ارمانوں کے خون کی بُو آ رہی ہے۔ مگر یہ کیسی بے بسی ہے کہ میں تم سے یہ کہہ بھی نہیں سکتا کہ خدا! اپنا ہاتھ ہٹا کر مجھے روحانی اذیت سے نجات دو۔

تمہیں میرے بے پناہ درد کی کیا خبر؟ خبر ہوتی بھی تو تم کونسا مداوا کر دیتے؟ تم نے تو خود ہی جان بوجھ کر مجھے تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ تمہیں میری بربادی میں یقیناً لُطف آتا ہوگا۔ مجھے یوں سُلگ سُلگ کر جلتے ہوئے، یوں گھُٹ گھُٹ کر جیتے ہوئے دیکھ کر تمہیں ضرور مسرت ہوتی ہوگی۔ جبھی تو گلستاں بکنار ہوتے ہوئے بھی؟

م سے میرے دامن نے تنہا پھول کو بھی نہ دیکھا گیا۔ رنگ و نکہت کے طوفانوں میں زقند بھرتے ہوئے بھی، میری سمت آتے ہوئے ایک ہلکے سے نرم رو جھونکے کا رُخ بھی اپنی طرف پھیر لیا۔ میں تمہاری زیادتی کا شکوہ بھی نہ کر سکا۔ تم بہت بے دردی سے میرے دل کی دنیا اپنے مغرور قدموں سے پامال کرتے رہے، اور میں حسرت و یاس کی تصویر بنا، چپ چاپ اپنی بربادی کا منظر دیکھتا رہا۔ دل ہی دل میں آہیں بھرتا رہا۔ آخر تمہارے کس جذبے کو میری اس شکست سے تسکین پہنچی؟

تمہیں تو لاتعداد زہرہ جبینوں کا قرب حاصل ہے۔ چمن سے بیاباں تک تمہارے ہی پیار کے قصے زباں زدِ خاص و عام ہیں۔ نہ جانے کتنی تتریا نگاہ، اور پری ترین صفت حسینوں کی نیندیں تم نے حرام کر رکھی ہیں۔ کتنی شہلائیں تمہارے فراق میں تارے گن گن کر راتیں کاٹتی ہیں۔ کتنی ناہید، نسرین، نرگس اور نورا کی نگاہوں میں تمہارے خوابوں نے رنگ بھرا ہے۔ کتنی ہی آئینہ بدنوں اور شمع رخساروں کے دلوں میں تمہاری چاہت کی آگ لگی ہوئی ہے۔ پھر کیوں تم میرے کاشانۂ غم کے تنہا قمقمے پر بھی اپنا دستِ ہوس دراز کر بیٹھے۔ کیوں میری شاخِ تمنا پر کھلتے ہوئے تنہا گلاب کو چند نفس بھی نہ دیکھ سکے۔ کیا دوستی اور رفاقت کا یہی انعام ہے؟ اگر تم نے رہِ وفا میں یہی رسم جاری کر رکھی ہے تو یوں ہی سہی۔ میں کل بھی حرفِ شکایت زباں پر نہ لایا تھا۔ آج بھی مُہر بہ لب ہوں۔ میں جانتا ہوں، تمہیں مزید اپنے جذبے کی تسکین کا سامان درکار ہے۔ مگر میں تم سے محبت کی بھیک نہ مانگوں گا، کبھی نہیں کیونکہ ؎

یہ ہاتھ سو گئے ہیں سرہانے دھرے دھرے

میں نے تمہیں صبا سے ملنے کو کبھی منع نہیں کیا تھا۔ میں کیوں منع کرتا۔ مجھے کیا حق پہنچتا تھا؟ اگر صبا کو دیکھ کر میرے دل کا کلیوں کی شگفتگی کا سا انداز ہوتا، تو ہوا کرے، اگر اُس کے ذکر سے میرے چہرے پہ فروغِ مے کا دھوکا ہوتا، تو ہو، اگر کاریڈار یا روش پر یکایک اُس کا سامنا ہو جانے پر میرے دل میں ہلچل مچ جاتی تو مچے، میں تمہیں اُس سے ربط ضبط بڑھانے سے روکنے والا کون تھا۔ اگر اُس کے خیال سے میں اپنے خوابوں میں رنگ بھرنے لگا، اُس کی چاہت کی آگ میری شریانوں میں لہو بن کر دوڑنے لگی، اُس کے جسم کی خوشبو میری سانسوں میں بس گئی، اُس کا ذکر میری سوچ کا محور بن گیا، مختصر یہ کہ وہ میری زندگی بن گئی! پھر بھی میں تم سے اپنی زندگی کی بھیک کیونکر مانگتا۔ تم سے رحم کی کیسے التجا کرتا۔ وہ ہاتھ جو دوستانہ انداز میں پھر دل تمہارے ہاتھوں میں رہے۔ انھیں گدایانہ تمہارے سامنے کس دل سے دراز کرتا۔ گو تم یہی چاہتے تھے۔

میں سدا کا کم سخن اور شرمیلا، تم بلا کے تیز و طرار اور حاضر جواب۔ میں لڑکوں کی محفل میں مُہر بہ لب، تم بزمِ نگاراں میں نغمہ سرا۔ میں خلوت نشیں، تم جلوت آرا۔ تمہاری ہر کس و ناکس سے شناسائی، میری تمہارے علاوہ کسی سے بھی بے تکلفی نہیں۔ تم اکثر میری اس عادت پر جھنجھلا جاتے، بور ہو جاتے۔ مگر میں کیا کرتا، مجبور تھا۔ مجھے اپنے اس ڈرا بیک کا پورا احساس تھا۔ اسی لئے میں سب سے الگ تھلگ، ریڈنگ روم یا لائبریری کا ہو کر رہ گیا۔ بزمِ ادب یا دوسرے کلچرل فنکشنس میں پچھلی نشستوں میں نظر آتا۔ تم ہاتھ پکڑ کر اگلی صف میں بٹھاتے، مگر موقع ملتے ہی میں کھسک جاتا۔ تم ہر پروگرام کے روحِ رواں، ہر محفل کی جان، ہزاروں تمہیں گھیرے رہتے۔ مجھے بے حد وحشت ہوتی۔ ایسے میں ہمیشہ تم سے دُور دُور رہنے کی کوشش کرتا۔ تم نے لاکھ چاہا کہ میرا یہ کمپلکس دور ہو جائے، میں بھی بولڈلی ہر سچویشن کو فیس کر سکوں۔ مگر یہ شرمیلا پن میری فطرت بن چکی تھی۔ اپنی فطرت کو تبدیل کر دینا اتنا آسان بھی تو نہیں۔ ایک گمنام اور معمولی نوجوان کی طرح میں طالب علمانہ زندگی کی پگڈنڈیوں پر خاموشی سے سر جھکائے رواں دواں تھا۔

ندیم شاعر ہے، اُس کے اشعار ڈائریوں کی زینت اور نامۂ الفت کے عنوان بنتے ہیں۔ جمیل کی آواز میں جادو ہے۔ اُس کے ترنم میں بادِ صبا کے جھونکوں کا لوچ ہے۔ اُس کی آواز میں آواز ملانا، دوسروں کی ایک عام ہابی ہے۔ راکیش اور آذر آرٹسٹ ہیں۔ اُن کے آرٹ کے نت نئے نمونوں اور اُن کے فن کی باریکیوں پر ہر محفل میں مذاکرے ہوتے۔ راحیل بہترین بیٹس مین ہے۔ اُس کی ہر ہٹ کی دھمک دلوں میں محسوس کی جاتی ہے۔ اُس کی سینچوریز کی تعداد سب کو زبانی یاد ہے۔ راجن کی بالنگ کی اسٹائل کا کیا کہنا۔ اُس کی برق اندازی نگاہوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ تم خود ٹینس کے چیمپین۔ باتوں کے دھنی۔ جاذبِ نظر شخصیت کے مالک۔ لوگوں میں جلد ہی گھل مل جانے اور مخاطب کو مرعوب کر دینے میں یکتا۔ خاص کر زہرہ جمالوں کے درمیان تمہاری گُل افشانی کا انداز دیکھنے کی چیز ہوتا ہے۔ اچھے اچھوں کو تمہارے اس آرٹ پر رشک آتا ہے۔ میں تمہاری اس ادا کو آرٹ ہی کہوں گا۔ حسین اور کارآمد ترین آرٹ! ہمارے درمیان یہ جو طرح طرح کے فائن آرٹس رواج پذیر ہیں، آخر یہ سب کس جذبے کی

تسکین کے لئے ہیں؟ سماج میں نمایاں مقام حاصل کرنے، دوسروں کو مرعوب کرنے، خصوصاً جنس مخالف میں مقبول ہونے کے لئے ہی ہیں نا! یہ سب جنگ و جدل، یہ ساری رقابت کشی، اسی جذبہ کی تسکین کا سامان بہم پہنچانے کے لئے ہے۔ پھر تم سے بڑھکر کون اِس لقب کا حقدار ہو سکتا ہے؟ جس بزم میں گئے، چھا گئے۔ جس محفل میں شریک ہوئے، جانِ محفل بن گئے۔ جس انجمن میں داخل ہوئے، داستان چھوڑ آئے۔ تمہارے بعد دیر تک زبانوں پہ تمہارا ذکر رقص کرتا رہتا ہے، سپہردل تمہاری ایک ایک ادا دلوں کو گدگدیا کرتی ہے۔ تمہاری شخصیت کا جادو ہر ایک کو مسحور کر دیتا ہے۔ بیشک تم ایک طلسمی شخصیت کے مالک ہو۔ تم میرے قاتل ہو۔ مگر مسیحا کے لقب سے مشہور ہو۔ تم نے میرا سکون درہم برہم کر دیا پھر بھی میں تمہیں رفیق ہی سمجھتا ہوں، رقیب نہیں۔ یہ تمہاری شخصیت کا طلسم ہی تو ہے۔

صہبا سے میری اسی کم آمیزی نے ملاقات کرائی۔ وہ بھی ہنگاموں سے دُور، الگ تھلگ، خاموشی سے اپنی راہ چلنے والی لڑکی تھی۔ سنجیدگی اور بُردباری اُس کی ایک ایک ادا سے نمایاں تھی۔ اپنے ہی خیالوں میں گم، گرد و پیش سے بے خبر، کتابوں کی ورق گردانی کرتی، یا تنہا گھاس پر بیٹھی پھولوں کا رقص اور ہوا کے شریر جھونکوں کی شاخِ گُل سے چھیڑ چھاڑ دیکھتی اور دل ہی دل میں خوش ہوتی۔ جب سارے لڑکے اور لڑکیاں کینٹین کا رُخ کرتے، یا لان میں اِدھر اُدھر چہل قدمی کرتے، ایسے میں ہم دونوں ریڈنگ روم میں تنہا رہ جاتے۔ اسی یکساں فطرت، اور مطالعے کے شوق نے پہلے ہم دونوں کا تعارف کرایا، پھر قربت بخشی۔ چوکیدار کبھی اُس سے کہتا "بی بی جی ریڈنگ روم بند کرنے کا وقت ہو گیا!" اور کبھی مجھ سے کہتا۔ "اب اُٹھیئے بھی بہت پڑھ لیا۔ ہم لوگوں کو بھی آرام کا موقع دیجئے بابوجی!" اور ہم مُسکراتے ہوئے اُٹھ جاتے۔ کبھی وہ پہلے نکل جاتی اور کبھی میں۔ پھر ہم ساتھ ساتھ نکلنے لگے، مگر خاموش!! ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے۔ آہستہ آہستہ اُس خاموشی نگاہی نے معنویت اختیار کر لی، پھر الفاظ کی صورت میں ہونٹوں سے پھسل کر سماعت سے ٹکرائے۔ اُس میں بھی پہل اُسی نے کی۔ میں سدا کا بُزدل ایک لڑکی سے گفتگو کرنے کی جسارت کر سکتا تھا؟ شروع میں اُس کے سوالوں کے جواب میں صرف ہوں، ہاں کرتا رہا۔ الفاظ سے زیادہ گردن کی جُنبش سے کام لیا۔

کورس کی کتابوں سے گفتگو ذاتی پسند ناپسند تک جا پہونچی۔ علمی موضوعات نے بڑھ کر دوسرے مشاغل کا احاطہ کرنا شروع کر دیا۔ دھیرے دھیرے دونوں ایک دوسرے پر کھُلنے لگے۔ ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ میں اپنی جگہ مطمئن تھا کہ وہ میرے ذوق پر پوری اُتری۔ اُسے حیات کے طویل اور دشوار گذار سفر میں شریکِ سفر بنایا جا سکتا ہے۔ اُس پہ پورا پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ اُس کے خیال سے نوجوانی کے خوابوں کو رنگین بنانے لگا اور مستقبل کے شیش محل میں چراغاں کرنے لگا۔ وہ بھی مجھ سے متاثر ضرور ہوئی تھی، ورنہ یوں میرے ساتھ گھنٹوں دنیا کے تمام موضوعات پہ کھُل کر گفتگو نہ کرتی۔ بات چیت کے دوران ماحول سے بے خبر نہ ہو جاتی۔ میری آمد کی منتظر نہ رہتی، اگر کسی دن نہ ملتا تو بے چین نہ ہو جاتی اور دوسرے دن ملتے ہی گلہ نہ کرنے لگتی۔ میں خوش تھا کہ قسمت نے یاوری کی۔ میرے دل کے ویرانے میں رقصِ بہار کا اہتمام ہو ہی گیا۔ صہبا میری زندگی کا محور بن گئی۔ میرے دل کی دھڑکن اُس کی آواز پاسے ہم آہنگ تھی۔ میری شریانوں میں لہو کی رفتار اُس کی نگہِ التفات کی محتاج تھی۔ صہبا میری زندگی تھی۔ میں اُس کے لئے تھا اور وہ میرے لئے تھی، صرف میرے لئے! میں نے یہی محسوس کیا تھا۔

پھر تم یکایک ہم دونوں کے بیچ طلسمی کہانیوں کے دیوزاد کی طرح کہاں سے آ کودے۔ ایک ایسے دیوزاد کی طرح جس کے مارنے کا میرے پاس کوئی حربہ تھا نہ جسے مقید کرنے کا میرے پاس کوئی منتر! اور نہ کوئی بزرگ ہی میرا مددگار۔ کوئی میرا مددگار تھا بھی تو وہ تم ہی تھے۔ مگر حالات کی ستم ظریفی کہ تم ہی دیوزاد کی طرح میرے مقابل تھے! پھر تمہارے خلاف میں کہاں سے مدد لاتا اور کیونکر؟

میں اکثر سوچتا ہوں تم نے صہبا کو مجھ جیسے ازلی تشنہ لب سے کیونکر چھین لیا۔ تمہیں تو میری تشنگی کا بخوبی علم تھا۔ میرے تہی جام ہونے پر تم نے اکثر افسوس کا اظہار بھی کیا تھا۔ پھر کیا اب میں یہ سمجھوں کہ تم نے وہ سب الفاظ یونہی بلا سوچے سمجھے کہے تھے۔ اُن میں خلوص کا کوئی شائبہ تک نہ تھا؟

صہبا کا حُسن ہوشربا تو نہ تھا، قامت قیامت بھی نہیں کہی جا سکتی تھی اور نہ اُس کی درازئ مژگاں سے دلوں میں حشر بپا ہوتا تھا۔ اُس کے رخسار پر طلوعِ مہر کا دھوکا بھی نہ ہوتا تھا، اور نہ اُس کی محشر خرامی کا کسی نے کوئی اثر لیا تھا۔ گندمی رنگ کی معمولی ناک نقشہ والی ایک اوسط درجہ کی صحتمند لڑکی تھی وہ۔ اُس کی کم سخنی اور کم آمیزی نے اُسے اور بھی گوشۂ گمنامی میں پھینک دیا تھا۔ لباس کے معاملے میں بھی وہ زیادہ پریشان نہ ہوتی تھی۔

ابتدا میں تو وہ بالکل گھریلو قسم کے لباس میں آتی تھی، مگر آہستہ آہستہ مجھ سے بے تکلفی ہونے پر، اور دوسری لڑکیوں کے لباسوں کی تعریف سُن سُن کر وہ بھی غیر محسوس طریقے پر اپنے لباس میں تبدیلی کرنے لگی۔ پہلی بار جب وہ کسی قدر شوخ پرنٹ کی جمپر اور میچنگ شلوار اور دوپٹے میں آئی تو میری آنکھوں میں اپنے انتخاب کی داد تلاش کرنے لگی۔ اُس کے رخساروں پہ مسرت کی قوسِ قزح لہرا رہی تھی۔ میں نے بھی دل کھول کر داد دی۔ اُس نے شرما کر کہا تھا۔

"اب زیادہ نہ بنیئے۔ میں اس لباس میں آ کر پچھتا رہی ہوں۔"

میں نے بھی اُسے چھیڑتے ہوئے کہا "ہاں اِس میں کیا شک؟ ابھی تک صرف اس ناچیز کا خون آپ کے سر تھا، آج نہ جانے کتنے اور شہید ہو جائیں گے! کس کس کا خون کرتی پھریں گی آپ؟"

صہبا کا چہرہ شرم سے سرخ آتش ہو گیا تھا۔ میں اُس کے وجود کے نشہ میں ڈوبتا چلا گیا۔ اُس کے علاوہ سارے جہاں کو فراموش کرتا گیا۔

ایک بار وہ پڑھتے پڑھتے شاید تھک گئی تھی۔ ہتھیلیوں میں اپنے چہرہ کو لئے لان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ رہ رہ کر اپنی جلتی ہوئی آنکھوں پہ اپنی اُنگلیاں بھی پھیرتی جاتی تھی تاکہ مطالعہ کی زیادتی سے پیدا شدہ ناخوشگواری کا اثر زائل ہو جائے۔ میں یک بیک اُس کے قریب آ گیا اور سرگوشی کے انداز میں شرارتاً یہ شعر پڑھا ؎

ابرو نہ سنوارا کرو کٹ جائیگی اُنگلی
نادان ہو تلوار سے کھیلا نہیں کرتے

ایک لمحہ کو اُس کی اُنگلیاں جہاں تھیں وہیں رُک گئیں اور میں نے اُس وقت محسوس کیا تھا کہ وقت کی رفتار کس طرح رُک جاتی ہے۔

میں نے جہاں تک غور کیا اِس نتیجہ پہ پہونچا کہ تمہاری حد سے بڑھی ہوئی اَنا جو ہر معاملہ میں کامرانی و کامیابی کی عادی ہو چکی تھی، ایک معمولی لڑکی کی یہ خودسری برداشت نہ کر سکی کہ تمہارے حضور اُس نے سرِ تسلیم خم نہیں کیا۔ تمہاری جیسی مقبول اور ہمہ گیر شخصیت سے وہ ذرا بھی متاثر نہ ہوئی۔ اُس نے تمہاری بارگاہ میں خراجِ عقیدت نہیں پیش کیا۔ اُس کی یہ بے نیازی تمہیں سرکشی محسوس ہوئی۔ اُس کی بے خبری کو تم نے خودسری پر محمول کیا۔ اُس کی نادانی نے تمہارے اعضاء کو لرزہ بر اندام کر دیا۔ تم نے اپنے اُسی جذبۂ انانیت کی تسکین کے لئے اُسے بھی نہ بخشا۔ میری تہی دامنی پر بھی تمہیں رحم نہ آیا۔ تم نے بے حد عونت سے اُسے میرے دل کے نہاں خانوں سے نکال کر اپنے مغرور قدموں میں لا ڈالا۔ تمہیں مجھ سے کوئی عناد نہ رہا تھا، مگر اُس معمولی لڑکی کی یہ جسارت کہ تم سے سرکشی اختیار کرے، تمہارے وجود کے طلسم کی اسیر نہ ہو، تمہارے ذکر سے اُس کے لب بے فیض رہیں، برداشت نہ کر سکے۔ اپنی اُس انتقامانہ کارروائی میں اپنے عزیز دوست کے جلتے ہوئے آشیانے کو بھی نہ دیکھ سکے۔ اُس کی بربادی کا منظر تمہاری بلند حوصلہ نگاہوں کو نہ چھو سکا مگر میں تمہیں قصوروار نہیں سمجھتا۔ جب دریا اپنی طغیانی پہ آتا ہے، تو بڑی بڑی سنگین و آہنی فصیلوں، اور لق و دق صحراؤں کے ساتھ ساتھ غریب کے معمولی جھونپڑوں کو بھی خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتا ہے۔ تم بھی تو ایک پُر غضب اور قہار دریا کی مانند ہو، جسے اپنی موج کی طغیانیوں ہی سے کام ہے۔

میں صہبا کو بھی بیوفا نہیں کہہ سکتا۔ اُس معصوم کو میں کیا الزام دوں۔ اُس نے کبھی ساری زندگی ساتھ نبھانے کا وعدہ بھی تو نہیں کیا تھا۔ چاندنی راتوں میں کسی جھیل کے کنارے، یا موسمِ ابر میں کسی گوشۂ چمن میں اُس نے رہِ حیات میں ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کی قسم تو نہیں کھائی تھی۔ اُس نے اپنے نازک ہاتھوں میں میرا ہاتھ لے کر پیمانِ وفا تو نہیں باندھا تھا، کہ مجھے چھوڑ کر تمہاری سمت چلے جانے پر اُسے بیوفا، ظالم، جفا پیشہ یا ستمگر کے القابات سے نوازوں۔ کون جانے اُسے یہ احساس تھا بھی کہ نہیں کہ میں اُس کی چاہت کو سرمایۂ جاں بنا چکا ہوں۔ اُس کی یاد میری شہ رگ میں دھڑکتی ہے۔ اُس کا خیال تنہائیوں کا رفیق اور مسرت کے لمحوں کا امین ہے۔ میں نے اُس کے بارے میں ایسا سوچا تھا، اپنے گرد اُس کے حُسن کی سنہری دھوپ محسوس کی تھی۔ اُس کے پیار کی چاندنی اپنے دل کے آنگن میں پھیلی ہوئی دیکھی تھی۔ میں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ اُس کے دل پر میری سوچیں عیاں ہیں۔ میری حالت سے وہ بخوبی واقف ہے۔ کون جانے یہ سراسر غلط فہمی، یا زیادہ سے زیادہ خوش فہمی تھی۔ میں سدا کا شرمیلا اور کم سخن اِس بار کم فہم بھی ثابت ہوا۔

"ارے بیٹھو بھی! کب تک یوں ہی کھڑے رہو گے؟" میں تمہیں بے تکلفی سے کھینچ کر اپنے برابر بٹھاتا ہوں۔ تمہیں اِس طرح دیر تک اپنے سامنے مجرموں کی طرح کھڑا دیکھ بھی تو نہ سکتا۔ تم میری آنکھوں میں میرے جذبات کو پڑھنا چاہتے ہو۔ مگر میں تمہیں کامیاب نہ ہونے دوں گا۔ اپنے اوپر مجھے اِتنا اختیار تو ہے ہی۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ تمہارا ضمیر تمہیں ملامت کر رہا ہے۔ تم بارِ ندامت سے سر اُٹھانے میں تکلیف محسوس کر رہے ہو۔ میں بھی کتنا خودغرض ہوں؟ کہ اپنی ذرا سی خواہش (جسے ہوس کہنا زیادہ مناسب ہے) کے لئے اپنے عزیز ترین دوست کو یوں ندامت اور

شرمساری سے دوچار کر رہا ہوں۔ میں خود کو لعنت ملامت کرتا ہوں۔

"ارے کچھ بولو بھی، یہ لونڈیا بہت کب تک رہے گا؟" اُس جانی پہچانی مسکراہٹ کی کرن میرے ہونٹوں پر لرزنے لگی۔ تم اب بھی میری آنکھوں میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش میں ہو۔ میں رومال نکال کر یونہی چہرہ پر پھیرنے لگتا ہوں۔ آنکھوں کے گوشوں کو رومال سے خشک کرتا جاتا ہوں۔ ڈرتا ہوں چشم غزل بستہ سے ابھی ایک آدھ بوند تمہارے سامنے بھی نہ ٹپک پڑے۔ تمہیں مزید شرمسار نہ کر دے۔

"اور سناؤ کیا حال ہے شہر نگاراں اور شہریاراں کا؟" میں خاموشی کی رِیت پگھلانے پر بضد ہوں۔ مگر تم نے یہ کیا غضب کر دیا۔ صہبا ہی کے ذکر سے داستانِ دل کا آغاز کر دیا۔ میں اُس کے ذکر سے منع بھی نہیں کر سکتا۔ ہائے کیا مجبوری ہے۔ تم اُس کی تعریف کرتے کرتے یہ کیا کہنے لگے۔ شاید تم اپنی صفائی میں کچھ کہہ رہے ہو۔ محبت اور دوستی، فرض اور وفا وغیرہ فرسودہ موضوعات پر ڈبی گھسے پٹے انداز میں پرانے الفاظ کو دُہرا رہے ہو۔

"چھوڑو بھی اِس قصۂ پارینہ کو" آخر مجھے لب وا کرنا ہی پڑا۔ "تم بھی کہاں کی داستان لے بیٹھے۔ زندگی ہر لمحہ رواں دواں ہے۔ صہبا نہیں صبا، حنا، ھما، اُدا کوئی بھی سہی۔ چند لمحوں کی رفاقت ہی کی تو بات ہے۔ کسی کا بھی ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ کسی ایک کی تخصیص کیا معنی؟ تم کیوں خواہ مخواہ ذہنی خلجان میں مبتلا ہو رہے ہو؟"

میں حیرت کرتا ہوں کہ ایسی غلط اور بے حیائی کی باتیں میں کیونکر کہہ سکا۔ صہبا کے ساتھ ساتھ ایک ہی سانس میں دوسری لڑکیوں کا اُسی عنوان کے تحت کیسے نام لے سکا۔ مگر مجھے اپنے دوست کی دلجوئی میں کچھ نہ کچھ کہنا تو ضرور ہے۔ اب الفاظ میرا ساتھ نہ دیں تو میرا کیا قصور؟

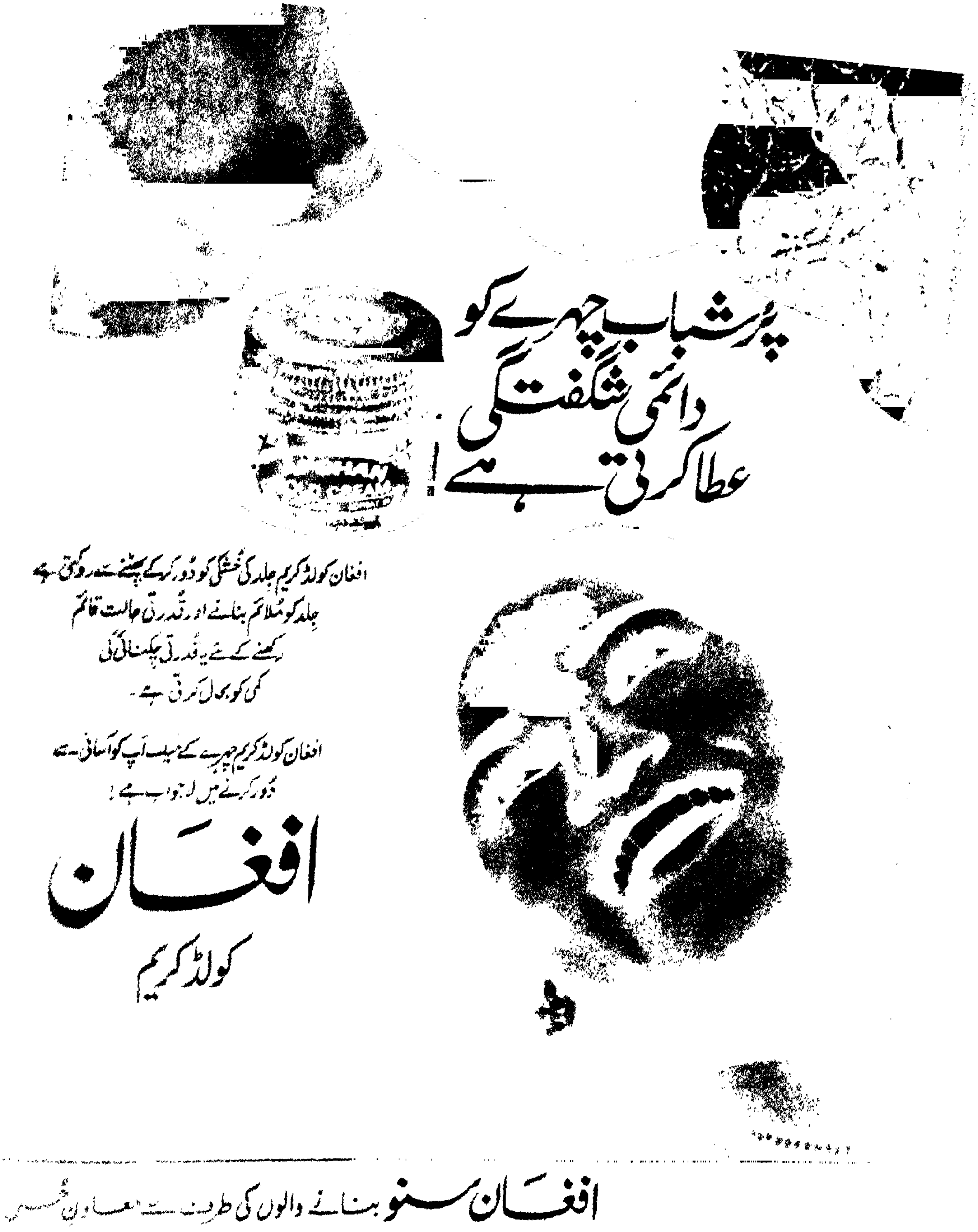
ساری زندگی میں کوئی لڑکی میرے دل کی گہرائیوں میں نہ اُتر سکی۔ کوئی بھی میری روح میں نہ جھانک سکی۔ ہوا کے آوارہ جھونکوں کی طرح وہ آتی رہیں اور جذبات و احساس کو چھو کر چلی جاتیں۔ کوئی بھی ایسا جھونکا نہ تھا جس سے دل کی کلی کھل جاتی۔ صہبا ہی ایک ایسی لڑکی ملی جو رگ رگ میں دلنواز نشہ بن کر دوڑ گئی ہے۔ اُس کی اداؤں نے دل کی گہرائیوں میں جگہ بنا لی ہے، اُس کی محبت، اُس کے خلوص اور اُس کی سادگی کا میں اسیر ہو کر رہ گیا ہوں۔"

تم ابھی اور نہ جانے کیا کیا کہتے۔ اِس میدان کے پرانے شہسوار جو ٹھہرے ایسے دلنشیں جملے تم نے ہزار بار دُہرائے ہوں گے۔ لیکن میں بھی کتنا خودغرض اور چھوٹی طبیعت کا ہوں۔ خودغرضی نے مجھے اندھا بنا دیا ہے۔ ہو سکتا ہے تم انتہائی خلوص اور صدق دل سے صہبا کی محبت کا اقرار کر رہے ہو۔ تمہیں واقعی صہبا سے سچا پیار ہو۔ مگر ایسا ہے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ ضرور یہی ایسا ہو گا۔ تمہارے چہرے سے تمہاری اندرونی کیفیت کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہوں۔ میرا دل کہہ رہا ہے تم جو کچھ کہہ رہے ہو سچ کہہ رہے ہو۔ بخدا اگر ایسا ہے تو کیا خوب ہے.....؟

یکایک میرے دل کی انتہائی گہرائیوں سے نور کا ایک چشمہ اُبل پڑتا ہے۔ میرے ذہن کے تمام دریچے جن پر غم اور سوگواری کی تاریکی چھائی ہوئی تھی، اُس سے روشن ہو جاتے ہیں۔ میری روح سے افسردگی کے بوجھل بادل ایک لمحہ میں چھٹ جاتے ہیں۔ میں خود کو بہت ہی ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہوں۔ ایک غیر ارضی مسرت سے میرا تمام وجود سرشار ہو جاتا ہے۔ میرے ہر بُنِ مُو سے سرخوشی پھوٹنے لگتی ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے عشق کا ایک نیا باب وا ہو جاتا ہے۔ میں تیزی سے اپنی جگہ سے اُٹھتا ہوں اور بڑھ کر تمہیں گرمجوشی سے اپنی طرف کھینچ لیتا ہوں۔ تمہاری پُشت پر جذبات کی فراوانی سے لرزاں ہاتھ بہت پیار سے پھیرتے ہوئے گنگناتا ہوں ؎

آکر وابستہ ہیں اُس حُسن کی یادیں تجھ سے
جس نے اِس دل کو پری خانہ بنا رکھا ہے
جس کی چاہت میں بُھلا رکھی ہے دُنیا میں نے
دہر کو دہر کا افسانہ بنا رکھا ہے

مدیر بیسویں صدی کے نام خط لکھتے وقت اختصار سے کام لیا کریں تاکہ آپ کے ارشاد کی تعمیل فوراً ہو سکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے۔


پُرشباب چہرے کو
دائمی شگفتگی
عطا کرتی ہے!
افغان کولڈ کریم جلد کی خشکی کو دُور کرکے پھٹنے سے روکتی ہے
جلد کو ملائم بنانے اور قدرتی حالت قائم
رکھنے کے لئے یہ قدرتی چکنائی کی
کمی کو بحال کرتی ہے۔
افغان کولڈ کریم چہرے کے میل آپ کو آسانی سے
دُور کرنے میں لاجواب ہے!
افغان
کولڈ کریم
افغان سنو بنانے والوں کی طرف سے معاون خصوصی

نرس

محمد عثمان عارف نقشبندی ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی، ممبر پارلیمنٹ

نکہت و نور میں ڈوبی ہوئی رنگیں بہار
کتنی بے نور سی آنکھوں کا نظارا تو ہے
موت کے گھور اندھیروں میں ہے جیون کی کرن
کتنے مایوس مریضوں کا سہارا تو ہے

مانتا ہوں کہ لبوں پہ ترے ہلکی سی ہنسی
دامن زخمِ جگر پھولوں سے بھر جاتی ہے
مانتا ہوں کہ ترے پاؤں کی آہٹ سن کر
ڈوبتی نبض پھر اک بار اُبھر آتی ہے

درد مندوں کی پکاروں پہ تڑپنے والی
اپنے جذبات کی چیخوں کو سُنا ہے کہ نہیں
چارہ سازی پہ زمانے کی تلی بیٹھی ہے
اپنے دُکھ کی بھی ترے پاس دوا ہے کہ نہیں

جسم آسودہ کہاں، رُوح کو تسکین کہاں
ذہن میں خوابِ پریشاں کے سوا کچھ بھی نہیں
اپنے جلووں ہی کے جھرمٹ میں گھری ہے لیکن
زندگی خلوتِ ویراں کے سوا کچھ بھی نہیں

کہہ رہی ہیں تری مخمور گلابی آنکھیں
کتنی راتیں تری آنکھوں میں بسر ہوتی ہیں
اُف وہ فطرت کے تقاضوں کا حسیں وقت کہ جب
کچھ ادائیں تری محتاجِ نظر ہوتی ہیں

بھیگتی، مدھ بھری، ساون کی مدھر راتوں میں
تیرے سینے میں اُمنگوں کی چتا جلتی ہے
تمتماتے ہوئے رُخساروں پہ بکھری زُلفیں
جیسے بجلی کے چمکنے سے گھٹا جلتی ہے

تیری اُمید کی کلیاں، ترے ارمان کے پھول
بارہا کھِلنے کو، ہنسنے کو ترستے ہوں گے
زندگانی کی حسیں شام و سحر میں اکثر
تیرے امرت سے بھرے نین برستے ہوں گے

اپنی آزاد خیالی کا بھرم رکھنے کو
تُو نے صدیوں کی روایات سے منہ موڑا ہے
بیاہ شادی کو مصیبت کا سمجھ کر بندھن
رشتہ تہذیب و تمدّن سے الگ توڑا ہے

خدمتِ خلق کا جذبہ تو بجا ہے لیکن
اپنی تخلیق کے منشا کا بھی کچھ دھیان رہے
بات جب ہے کہ پھلے پھولے جوانی کی بہار
مانگ آباد کرے، سُرخرو ارمان رہے



FERRADOL
PARKE DAVIS

شکست

پروفیسر ظفر احمد نظامی ایم۔ اے

۱۲۳۱۔ محل سرائے، بلیماران، دلی نمبر ۶

برادر محترم! آداب و تسلیمات

مرکزی حکومت کی تفویض کردہ تنی ذمہ داریوں نے فرصت کے اوقات کو خواب و خیال سے ہمکنار کر دیا ہے۔ لیکن حسب ارشاد تازہ کہانی ارسال خدمت ہے۔ تاخیر کے لئے معذرت خواہ ہوں۔۔۔

آپ کا بھائی ——— ظفر احمد نظامی

★

رنگ محل کے صدر دروازہ میں قدم رکھتے ہی انور پر افتخار کا نشہ طاری ہو گیا۔ قریب ہی کھڑے ہوئے چوکیدار کی کورنش کو نظر انداز کرتے ہوئے اُس نے تصویر گھر کی عظیم عمارت پر نگاہ ڈالی تو اُس نے اُسے بھی اپنے آگے جھکتی ہوئی محسوس کیا۔ جیسے وہ بھی اُس کا خیر مقدم کر رہی ہو! انور پہلے بھی سینکڑوں بار یہاں آ چکا تھا، اِس کے چپے چپے سے واقف تھا۔ لیکن آج اُسے یہاں کی ہر چیز میں ایک نئے حُسن کا احساس ہو رہا تھا۔ جس میں ایک نامعلوم سی خلش شامل تھی اور مسرت کی آمیزش بھی! کیونکہ پہلے تو وہ محض ایک مصوّر اور تماشائی کی حیثیت سے رنگ محل کی دیواروں پر اپنے نقش و نگار ثبت کرنے آیا کرتا تھا۔ لیکن آج وہ اُسی کے نگراں کی عظمت کا پیکر بن کر اُس پر اپنا حقِ ملکیت جتانے کی غرض سے اُس میں داخل ہو رہا تھا۔

دفتر کا وقت نہیں ہُوا تھا اِس لئے مُلازمین ابھی پہنچے نہ تھے۔ لان سنسان پڑا تھا۔ اُس کے سبزہ زار پر سُورج کی کرنیں رقص کر رہی تھیں۔ وہ دُوب کے ہرے بھرے پودوں کو چُومتی محسوس ہو رہی تھیں۔ جیسے وہ اپنی بلندی کے باوجود اپنی شکست کے اعتراف پر مجبور ہوں۔ انور نے فطرت کے اِس حُسن کو محسوس کیا اور اُس کی نظریں سامنے کھڑے ہوئے ایک مرمریں مجسمے پر جا ٹھہریں۔ یہ ایک دوشیزہ کا خوبصورت مجسمہ تھا جس کے لبوں پر ابدی مُسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ جیسے وہ ہر آنے والے کو خوش آمدید کہہ رہی ہو! انور کو ہمیشہ اُس کی یہ مُسکراہٹ طنز آمیز معلوم ہوتی تھی جیسے وہ اِس کا مذاق اُڑا رہی ہو! لیکن آج اُس نے اُس کی مُسکراہٹ کو بھی فتح کر لیا تھا۔ آج وہ اُس مجسمہ کا فاتح نظر آ رہا تھا جسے حکومت نے اختیار میں دے کر اُس کا مالک و مختار بنا دیا تھا۔ اِس وقت مجسمہ کی مُسکراہٹ میں طنز نہ تھا، حیا کا احساس جھلک رہا تھا جس سے شکست خوردگی نمایاں تھی ——— یہ شکست مجسمہ کی نہیں لیلا کی شکست تھی جو پہلے اُس کی ہم جماعت رہی اور پھر فن کے میدان میں اُس کی حریف بن گئی ——— لیلا، جو اپنے نام کی کسوٹی پر پُوری اُترتی تھی۔ لیکن اُس کی اُنگلیوں کی جنبشوں نے کتنے ہی ماہتاب و آفتاب ڈھالے تھے۔ اُسے فن سے عشق تھا۔ وہ فنکار کو صرف فن کی بلندی کے لئے جینے کا حق دیتی تھی۔ اُس کے نزدیک فن ہی ایک آرٹسٹ کی عظمت کا نشان تھا۔ وہی لیلا جس نے انور کو ہر مقابلہ میں شکست دی تھی اور ہر معاملہ میں اپنی بلندی کا

ثبوت دیا تھا۔ جو اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد رنگ محل کے فنکار کی حیثیت سے اس کے اسٹاف میں شامل ہو گئی تھی۔ آج وہی لیلا، انور کی نگرانی میں اس کے ماتحت کی حیثیت سے کام کرنے کے لئے مجبور تھی۔

لیلا کا خیال آتے ہی انور کی نگاہیں رنگ محل کے پیچھے آرٹ کالج کی عمارت پر جا ٹھہریں۔ یہیں بہت عرصہ پہلے لیلا سے ملاقات ہوئی تھی اور یہیں انور نے فن کو فن کے لئے نہیں بلکہ تشہیر کا وسیلہ سمجھ کر حاصل کرنے کی کوشش کی تھی جبکہ لیلا نے خود کو فن کی بیکراں وسعتوں میں گم کر دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ دونوں ہی اپنے اپنے مقاصد میں کامیاب رہے تھے۔ انور کے پاس اعلیٰ تعلیم کی ڈگریوں کا پلندہ تھا، لیلا کے پاس اپنی تصویروں کا وہ انبار تھا جن کے بغیر ہر نمائش ادھوری سمجھی جاتی تھی۔ اسی کالج میں جب پہلے دن انور نے اپنے آرٹ ٹیچر پر آوازہ کسا تھا تو لیلا نے غصّہ میں کہا تھا

'جو اپنے اُستاد کا احترام نہیں کرتا، فن کبھی اس کی عزت نہیں کرتا!'

'آپ اس سلسلہ میں دخل اندازی کرنے والی کون ہیں؟' انور نے بھی سخت لہجہ میں پوچھا تھا۔

'آرٹ کی ایک معمولی سی عقیدت مند جو خود کو اسی کالج کا پجاری سمجھتی ہے!'

'آرٹ کی بڑی دلدادہ ہو؟'

'وہ تو ہر فنکار کو ہونا چاہئے'

'خاموش رہو، بڑی آئیں فن کی پرستش کرنے والی!' انور واقعی جھلا گیا تھا۔

'اے مسٹر! آپ خود اپنے منہ کو لگام دیجئے۔ عبادت گاہ میں عبادت کی توہین کرنا جذباتِ بندگی کو شرمسار کرتا ہے!'

وہ تو کچھ لڑکوں نے درمیان میں پڑ کر معاملہ رفع دفع کرا دیا ورنہ بات بڑھ جاتی۔ لیکن انور نے اسی دن محسوس کر لیا تھا کہ لیلا کے آگے چراغ جلانا دشوار ہوگا۔ لیکن ساتھ ہی اس نے یہ بھی تہیّہ کر لیا کہ وہ لیلا کو ہر معرکہ میں شکست دے کر رہے گا!

اور آج اُسے محسوس ہوا جیسے رنگ محل کا نگراں بن کر اس نے لیلا کو شکست دے دی ہے! اب وہ اس کی ہر بات ماننے کے لئے مجبور تھی۔ کیونکہ وہ اب اس کا افسر تھا۔ اس کی تجاویز رد کر سکتا تھا، اُسے تنبیہہ کر سکتا تھا، اس سے جواب بھی طلب کر سکتا تھا! اس طرح انور نے تصوّر میں لیلا کے اُداس اور محکوم پیکر کو اپنے سامنے پاکر ایک نامعلوم مسرّت کا احساس کیا۔

ریسپشن رُوم سے گزرتا ہوا انور اُس ہال میں داخل ہوا جہاں ماضی کے دریچوں سے جھانکتی ہوئی یادوں نے اُس کے ذہن کو مسحور کر لیا۔ وہ اُس دن کے تصوّر میں گم ہو گیا جب اسی ہال میں تصویروں کی ایک نمائش ترتیب دی گئی تھی۔ انور اور لیلا کے فن پارے بھی اُس میں شامل تھے۔ یوں ہی نمائش میں گھومتے ہوئے وہ لیلا کے پاس چلا گیا تھا اور اُس نے اُس سے پُوچھا تھا ——

'کیا خیال ہے لیلا! نمائش کے بارے میں؟'

'وہی جو ایک فنکار کا ہونا چاہئے'

'یعنی؟'

'یعنی نمائش فن کے پرستاروں میں جمالیاتی ذوق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے'

'بس؟'

'نمائش آنکھوں کو متاثر کرنے کے بعد دل و دماغ کی پنہائیوں میں چھپے ہوئے حُسن اور اُس کے شعور کو بیدار کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے'

'تم تو بالکل فلسفی ہو لیلا!'

'فلسفہ بھی حقیقت تک پہنچنے کا ایک وسیلہ ہے'

'تو تم نمائش کو داد و تحسین حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں سمجھتیں؟'

'حوصلہ افزائی کا ذریعہ تو سمجھتی ہوں۔ لیکن اس سے بڑا مقصد اس کا یہی ہے کہ ذوقِ جمال کو آسودگی حاصل ہو'

'اپنی تصویروں کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟'

'مجھے اُن پر پُورا اعتماد ہے!'

'یعنی تمہیں یقین ہے کہ تمہاری تصویریں انعام کی مستحق

قرار پائیں گی؟'

'انعام میرے نزدیک ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ میں اس سے عظیم مقصد کی نشان دہی کر چکی ہوں۔'

'تو پھر تمہیں تصویروں کو نمائش میں رکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟' انور نے جل کر کہا۔

'میں فن کی نمائش کے سلسلہ میں بخل سے کام نہیں لیا کرتی۔'

اور انور احساسِ کمتری کی چٹانوں میں دبنے لگا۔ اُس کی شخصیت پر لیلا کی فنکارانہ عظمت غالب آ رہی تھی۔ نمائش میں لیلا کی تصویروں نے انعام حاصل کر لیا تھا۔ اُس کی وجہ یہی تھی کہ انور نے ہمیشہ فن کو تجارت سے زیادہ اہمیت نہ دی تھی۔ اُس کے نزدیک فن تشہیر کا ذریعہ تھا، مادّی منفعت کے حصول کا وسیلہ تھا اور لیلا فن کو زندگی کی رُوح سے تعبیر کرتی تھی۔ وہ فن کی قدر شناسی کا جذبہ رکھتی تھی۔ اُس کے نزدیک فن رُوح کی گہرائیوں میں تخلیق ہوتا تھا۔ اسی لئے اُس کی انگلیاں جب برش کو تھام کر کینوس پر رقص کرنے لگتیں تو اُن کی ہر جنبش سے رنگ و نکہت کی بارش ہونے لگتی۔ خیال، رنگوں کی زنجیروں میں گھر کر حقیقت بن جاتا۔۔۔ لیکن آج انور یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ دُنیاوی زندگی میں برتری ہی عظمت کی دلیل ہے، محض فنکاری سے کام نہیں چلتا۔۔۔ انور انھیں خیالوں میں ڈوبا آگے بڑھتا گیا۔ اچانک ہال کے ملحقہ کمرہ میں آویزاں ایک تصویر پر اُس کی نظر ٹھہر گئی جو لیلا نے بنائی تھی۔ اُس میں ایک دوشیزہ گلابی رخساروں پر آنسوؤں کے شفاف موتی سجائے غمگین انداز سے خلاؤں میں جھانک رہی تھی۔ انور کو یاد آیا کہ اس تصویر کے سلسلہ میں بحث کرتے ہوئے اُس نے لیلا سے پُوچھا تھا

'تم حُسن کو اتنا اُداس کیوں سمجھتی ہو لیلا؟'

'ہمیشہ تو اُداس نہیں سمجھتی۔ لیکن ایسے لمحات پر ضرور یقین رکھتی ہوں جب خوشی کا احساس سرد ہو جاتا ہے۔'

'یہ تو حُسن کے ساتھ زیادتی ہے!'



'ہرگز نہیں، غم کو بھی اُس کا حق ملنا چاہئے۔ زندگی کے اُن گوشوں کو بھی اُبھاگر کرنے کی ضرورت ہے جو خوشی سے محروم ہیں۔'

'تم اس خوبصورت دوشیزہ کو مُسکراہٹیں بھی تو بخش سکتی تھیں؟'

'مُسکراہٹ تو معمولی سی چیز ہے' میں اسے قہقہے بھی عطا کر سکتی ہوں۔ لیکن غم بھی زندگی ہی کا عطیہ ہے۔'

'ہوگا!'

'تمھیں کیا پسند ہے؟' لیلا نے اچانک ـــــ انور سے پُوچھا۔

'میں تو رنگ و نکہت کا دلدادہ ہوں!'

'مجھے رات کی تاریکیوں اور اُن میں چمکتے ہوئے تاروں سے پیار ہے!' لیلا نے بیساختہ کہا۔

'کیوں؟'

"ممکن ہے یہ ذوق ہمارے ناموں سے تعلق رکھتا ہو!"

"کیا مطلب؟"

"تم نور۔ چودھویں اندھیری رات!"

"نور محبت" انور الجھ کر رہ گیا۔ وہ لیلا کی بے باک

تو جیہہ پر لاجواب ہوگیا۔

لیلا کی ان معقول باتوں نے اُسے شرمندہ کر دیا۔ اِس پر شرمساری کا احساس چھا گیا تھا۔ اِسی لئے اُس نے نوکریوں کا سہارا لیا اور فیصلہ کر لیا کہ وہ فن کے میدان میں نہ سہی زندگی کے مقابلہ میں لیلا کو بھرپور شکست دے گا اور اُسے خود پسندی کا مزہ چکھائے گا! اسی لئے آج اس کے دل میں گدگدی سی محسوس ہو رہی تھی اور احساسِ برتری کی آنچ سے سرد موسم میں بھی اُس کی پیشانی دہک رہی تھی۔ لیلا کی شکست ایک خود سر کی ہار تھی، ایک مغرور اور بے باک عورت کی شکست تھی!

اب دفتر کا وقت ہو چکا تھا۔ رنگ محل کے ملازمین اپنی نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُس کے ماتحت عہدہ دار انور کے قریب آ گئے تھے اور رنگ محل کے نگراں کی حیثیت سے اس کے تقرر پر مبارکباد دینے کے بعد اُس کے کمرے تک لے گئے تھے۔

راستہ میں لیلا کا کمرہ تھا، وہ اب تک آئی نہ تھی۔ انور نے سوچا وہ لیلا سے جواب طلب کرے گا اور تاخیر سے آنے کی وجہ دریافت کرے گا۔ اپنے عہدے کا چارج لیتے ہی اُس نے بیل پر اُنگلی رکھ دی تاکہ لیلا کے بارے میں جواب طلب کر سکے۔ ... اُس کی نظر میز پر ایک کاغذ پر پڑی جو پیپر ویٹ کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اُس کا مضمون ایک ایسا طمانچہ تھا جس کی چوٹ براہِ راست انور کے احساس پر پڑی۔ ... یہ لیلا کا استعفیٰ تھا اُس نے رنگ محل کی ملازمت چھوڑ کر اپنی فن ... کو بچا لیا تھا ——!!

"بیسویں صدی" میں وہی مضامین شائع ہو سکتے ہیں جن ...
غیر مطبوعہ لکھا ہو۔ بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین ... دیتے ...
نہایت نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے

قطعات

کرشن موہن ایم۔ اے

آزمائش:

ستائش پر ستائش ہو رہی ہے | محبت کی نمائش ہو رہی ہے
مگر محسوس ہوتا ہے یہ مجھ کو | کہ میری آزمائش ہو رہی ہے

بزرگی:

جلوہ ہائے شباب کھو ہی گئے | اپنے جذباتِ شوخ سو ہی گئے
کرشنؔ موہن ہے من اُداس کہ ہم | ہوتے ہوتے بزرگ ہو ہی گئے

اندازِ تخاطب:

تھا جو اندازِ تخاطب پہلے وجہِ ننگ و عار | آج ہے وائے تغیّر باعثِ صد افتخار
کرشنؔ موہن پہلے کہتی تھیں سہیلی یا سکھی | لڑکیاں اک دوسرے کو آج کل کہتی ہیں یار

ریش و حشیش:

مکتب میں علم و فضل کی حالت خراب ہے | تہذیب و رنگِ عہدِ رواں لاجواب ہے
[illegible] ذہنوں سے شعارِ زیست | ریش و حشیش مشربِ اہلِ شباب ہے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کوئی آہنگ نہیں، رنگ نہیں | [illegible]
[illegible] ڈھنگ نہیں | [illegible]

"ممکن ہے یہ ذوق ہمارے ناموں سے تعلق رکھتا ہو!"

"کیا مطلب؟"

"تم نور ہو اور میں اندھیری رات!"

اور انور صرف "اوہ!" کہہ کر رہ گیا۔ وہ لیلا کی بے باک توجیہہ پر لاجواب ہو گیا۔

لیلا کی اِن معقول باتوں نے اُسے شرمندہ کر دیا۔ اِس پر شرمساری کا احساس چھا گیا تھا۔ اِسی لئے اُس نے ڈگریوں کا سہارا لیا اور فیصلہ کر لیا کہ وہ فن کے میدان میں نہ سہی زندگی کے مقابلہ میں لیلا کو ضرور شکست دے گا! وہ اُسے خود پسندی کا مزہ چکھائے گا! اِسی لئے آج اُس کے دل میں گدگدی سی محسوس ہو رہی تھی اور احساس برتری کی آنچ سے سرد موسم میں بھی اُس کی پیشانی دہک رہی تھی۔ لیلا کی شکست ایک خود سر کی ہار تھی۔ ایک مغرور اور بے باک عورت کی شکست تھی!

اب دفتر کا وقت ہو چکا تھا۔ رنگ محل کے ملازمین اپنی نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُس کے ماتحت عہدہ دار انور کے قریب آ گئے تھے اور رنگ محل کے نگراں کی حیثیت سے اُس کے تقرر پر مبارکباد دینے کے بعد اُس کے کمرہ تک لے گئے تھے۔ راستہ میں لیلا کا کمرہ تھا، وہ اب تک آئی نہ تھی۔ انور نے سوچا وہ لیلا سے جواب طلب کرے گا اور تاخیر سے آنے کی وجہ دریافت کرے گا۔ اپنے عہدے کا چارج لیتے ہی اُس نے بیل پر اُنگلی رکھ دی تاکہ لیلا کے بارے میں جواب طلب کر سکے۔ اُسی وقت اُس کی نظر میز پر ایک کاغذ پر پڑی جو پیپر ویٹ کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اُس کا مضمون ایک ایسا طمانچہ تھا جس کی چوٹ براہِ راست انور کے احساس پر پڑی —— یہ لیلا کا استعفیٰ تھا! اُس نے رنگ محل کی ملازمت چھوڑ کر اپنی فنی انا کے آبگینہ کو بچا لیا تھا ——!!

"بیسویں صدی" میں وہی مضامین شائع ہو سکتے ہیں جن کے نیچے "غیر مطبوعہ" لکھا ہو۔ بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں۔ یہ نہایت نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ —— ایڈیٹر

قطعات

کرشن موہن ایم۔ اے

آزمائش:

ستائش پر ستائش ہو رہی ہے	محبت کی نمائش ہو رہی ہے
مگر محسوس ہوتا ہے یہ مجھکو	کہ میری آزمائش ہو رہی ہے

بزرگی:

جلوہ ہائے شباب کھو ہی گئے	اپنے جذباتِ شوخ سو ہی گئے
کرشن موہن ہے من اُداس کہ ہم	ہوتے ہوتے بزرگ ہو ہی گئے

اندازِ تخاطب:

تھا جو اندازِ تخاطب پہلے وجہِ ننگ و عار	آج ہے وہ اے تغیّر باعثِ صد افتخار
کرشن موہن پہلے کہتی تھیں سہیلی یا سکھی	لڑکیاں اک دوسرے کو آجکل کہتی ہیں یار

ریش و حشیش:

مکتب میں علم و فضل کی حالت خراب ہے	تہذیب و رنگِ عہدِ رواں لاجواب ہے
ژولیدگی و نشّہ ہوں جیسے شعارِ زیست	ریش و حشیش مشربِ اہلِ شباب ہے

سوچ:

لگن سنکوچ بن کر رہ گئی ہے	محبت سوچ بن کر رہ گئی ہے
سکونِ دل کہاں ہے کرشن موہن	تمنّا سوچ بن کر رہ گئی ہے

امیر بیوہ:

ڈن لوپلو کے بستر پہ سوتی ہے وہ	لیکن اشکوں کے موتی پروتی ہے وہ
عیش و آرام سب ہیں فراہم اُسے	پھر بھی اپنے مقدر پہ روتی ہے وہ

لاکھ پتی:

دولتِ صبر و قناعت تو ہے	نہ سہی تو ہُوں جو نہیں لاکھ پتی
کرشن موہن بہر اصل بہتر	ہے یہ صُورت کہ ہُوں میں لاکھ پتی

بے آہنگ:

کوئی آہنگ نہیں، رنگ نہیں	واؤ دبتی ہے الف گرتا ہے
شعر کہنے کا جنہیں ڈھنگ نہیں	اُن کا فن دیکھ کے سر پھرتا ہے


حسن جو چاند کو شرمائے
جے کا نرم نرم سہانا جھاگ آپکی
جلد کو پھول کی طرح نازک اور خوبصورت
رکھتا ہے۔ اس کی بھینی بھینی
چنبیلی کے پھولوں میں بسی
خوشبو آپکو
دیر تک شاداب
رکھتی ہے
ہر روز
جے
صابن سے نہائیے
سندرتا اور خوشبو
میں ڈوب ڈوب
جائیے
Jai
ٹاٹا کا بنایا ہوا
OBM-7002U

چند لمحے سکون کے

عظیم اقبال ایم۔ اے

گنج نمبر ا۔ بتیا (بہار)

میرے سرکار آداب و بندگی

ایک خوشخبری سناؤں آپ کو ـــــ ایک امریکی ادارے "رائٹرس گلڈ آف انڈیا" نے نیویارک سے میری کہانیوں کے انگریزی تراجم کو کتاب کی شکل دینے کی پیش کش کی ہے ـــــ امریکہ میں ہندوستانی مصنفین کے لئے کافی مواقع ہیں۔ امریکہ والے ہندوستانی ادب کو نہ صرف شرفِ قبولیت بخش رہے ہیں بلکہ جی کھول کر اسے سراہ بھی رہے ہیں ـــــ "چند لمحے سکون کے" کا مرکزی خیال پٹنہ کے پرنس ہوٹل کے لاؤنج ہی میں چند ماہ پہلے میرے ذہن میں آیا تھا۔ اتنے دنوں بعد میں نے اسے صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے۔ اس بار مرد کی نفسیات کی ایک گتھی سلجھا رہا ہوں ـــــ "عورتیں" تو مجھے نہیں بخشتیں، امید ہے مرد اس بار یقیناً مجھے بخش دیں گے۔

نیاز کیش ـــــ عظیم اقبال

★

اس وقت پرنس کے لاؤنج میں بیٹھا ہوا میں کولڈ بیئر سِپ کر رہا تھا۔ سرد، ہلکی تلخی، حلق سے نیچے اتر کر چپکے چپکے رگوں میں پھیلنے لگی تھی۔ اب ایک سرور آمیز کیف آہستہ آہستہ محسوس کرنے لگا تھا۔

سامنے میز پر اسنیکس تھے۔ سلاد، سوس، کوکاکولا اور بیئر کی بوتلیں۔

پہلا گھونٹ لینے سے پہلے ہی ہم سب نے اپنے گلاس ٹکرائے تھے۔

"چیرز فار دی ہیپی نس آف آنند!"

"چیرز فار دی بلیسنگس آف پدما!"

"اوہ نو! ایوری ون!"

میں نے بڑا لمبا گھونٹ لیا تھا اور گلاس کو قدرے سختی سے میز پر رکھ دیا تھا۔ سگریٹ پیکٹ پر آہستہ آہستہ تھپتھپا کر میں نے ہونٹوں میں دبا لیا تھا۔

شیکھر نے لائٹر جلائی تھی۔

"تھینکس!"

میں نے ایک لمبا کش لیا اور دھواں پشت پر مڑ کر چھوڑ دیا۔ ایک نہایت ہی خوبرو جوڑا ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ابھی ابھی لاؤنج میں داخل ہوا تھا۔ عورت سبک خرام تھی۔ لہراتی ہوئی ایسے چل رہی تھی جیسے زمین پر نہ ہو، ہواؤں کے دوش پر ہو!

لاؤنج میں اِس سرے سے اُس سرے تک دبیے دبیے قہقہے کبھی کبھی گونج جاتے۔ بہت ہی ہلکی نیلگوں روشنی سے بیچ ٹھہر ٹھہر کر میچ یا لائٹرس کے شعلے لپکتے، بجھ جاتے۔ دھوئیں کے مرغولے منڈلاتے ہوئے نظر آتے۔ دبے دبے کوئی کھانس دیتا۔

کارک کھلنے کی آواز آتی۔ گلاسوں کی کھنک —— چیرز، چیرز!

مجھے پینے کی کوئی خاص عادت نہیں۔ کبھی کبھی شوقیہ پی لیتا ہوں یا پھر جب کبھی کسی دُکھ یا کسی خوشی کو سلیبریٹ کرنا ہوتا ہے تب پیتا ہوں۔ پدما کہتی تھی ایسے پیتے رہنے سے بھی عادت پڑ جاتی ہے، اِس لئے نہ پیا کروں —— آہ! بیچاری پدما!

سامنے رکھے خالی گلاسوں میں شراب انڈیلتے ہوئے تریش نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اپنا گلاس کھینچ لیا۔

"بس!"

آج تو میں نے کچھ بھی نہیں پیا تھا —— پینے پر آؤں تو بے حساب پی لوں۔ حلق جلتا ہے، سانسیں سُلگتی ہیں، زبان لڑکھڑا جاتی ہے لیکن تشنگی نہیں مٹتی۔

پاس کی سڑک سے گزرتی کاروں کی سرسراہٹ سُنائی دے رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی ہارن یا سائرن بھی بج اُٹھتا۔ روشنی کے جھپاکے تیزی سے آتے اور گزر جاتے۔ جیوک باکس سے وان ٹیپلے کی الیکٹرک گٹار پر بجائی ہوئی کوئی دلنواز دُھن اُبھر رہی تھی۔

اچانک اپنی ہتھیلی پر کسی ہاتھ کا مس اور دباؤ میں نے محسوس کیا۔ شیکھر تھا۔

"سُنو آنند! ادھر میں پدما سے ملا تھا"

"کیسی ہے وہ؟"

میں پہلو بدل کر ذرا آگے کی طرف جُھکا۔

"وہ... اچھی ہے!"

اُس کی گرفت میری ہتھیلی پر ڈھیلی ہو گئی۔

"ہُوں!"

کھنکار کر میں نے گلا صاف کیا۔ سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا۔ رُک رُک کر فضا میں دُھواں چھوڑ دیا۔ تریش دھوئیں سے چھوٹے بڑے دائرے بنا رہا تھا۔ کوشش کے باوجود آج تک میں دھوئیں سے گولائیاں بنانا نہیں سیکھ پایا ہوں۔

شیکھر نے پھر میری ہتھیلی تھام لی تھی۔ اُس کی گرفت بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"پرچھائیوں کے تعاقب سے بھی کبھی کچھ ہاتھ آیا ہے؟"

میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

"پدما بھی تو ایک پرچھائیں ہے!"

ایک ہلکی مُسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر رینگ گئی۔

میں نے نیم سوختہ سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل دیا۔ دھوئیں کی ایک پتلی لکیر بلند ہوئی۔

"گزرے دنوں کا کیا اعتبار؟ بیتی باتوں کا کیا بھروسہ؟ یادیں سوہان رُوح بن جاتی ہیں آنند!"

شیکھر کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

میں نے ایک اور سگریٹ سُلگایا۔ تمباکو کے ایک دو ریشے مُنہ میں چلے گئے۔ تلخ ذائقہ سا محسوس ہُوا۔ تھوک دیا۔

یکایک چاروں طرف اندھیرا پھیل گیا۔ بجلی فیل ہو گئی تھی۔ دم بھر کے بعد روشنی آئی۔ بغل کی میز پر چھناکے سے ایک گلاس ٹوٹ گیا تھا۔ کوئی زور سے ہنسا۔ کئی آوازیں اُبھریں ——

"ویٹر! ویٹر!"

ایک لمبی سبز کار پورٹیکو میں آکر رُکی۔ بیش قیمت سوٹ میں

ملبوس ایک سن رسیدہ شخص گداز اعضاء والی ایک نوجوان عورت کا سہارا لئے ہوئے لاؤنج کی طرف بڑھا۔ مرد کے ایک ہاتھ میں واکنگ اسٹک تھی۔ اس کا دوسرا ہاتھ عورت کے کندھے پر تھا۔ ہوٹل کا باوردی ملازم ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔ ہماری کرسیوں کے قریب ہی سے وہ گزرے۔ عورت کا آنچل ذرا سا سرسرایا کچی کلیوں کی خوشبو بکھر گئی۔

سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑ کر میں نے شیکھر کی بانہیں تھام لیں۔ وہ مسکرایا۔ ترلیش بیئر میں کوکا کولا مکس کر رہا تھا۔ اس نے ایک چسکی لی۔ باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ عموماً بجھی بجھی رہنے والی اس کی آنکھیں کبھی کبھی حد سے زیادہ چمکنے لگتی تھیں۔ آج ڈرنک کے بعد اس کی آنکھیں شراروں سے مشابہ ہو گئی تھیں۔

یک بارگی شیکھر نے میری بانہیں جھنجوڑ ڈالیں۔

"آنند! زندگی ایک خواب نہیں، سایہ نہیں، حقیقت ہے! اسے اس طرح نہ گنواؤ۔"

میں اپنے اکھڑے بالوں پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگا۔

"تم نے اپنی زندگی کے پیالے میں جو زہر گھول لیا ہے، اسے چھلک جانے دو، اسے انڈیل ڈالو آنند!"

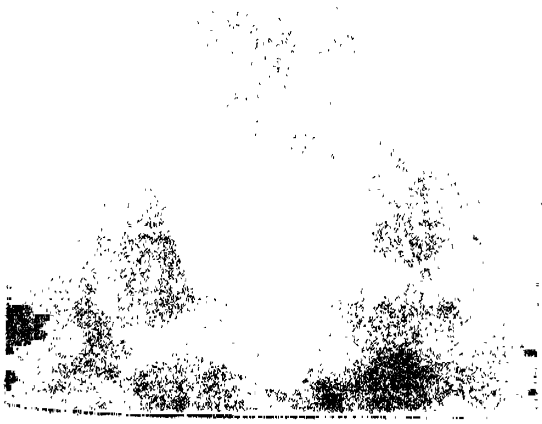
وہ ایک پل کے لئے رکا۔ ایک گہری سانس لی۔

"محبت تو ایک نعمت ہوتی ہے، رحمت ہوتی ہے۔ اسے زحمت تو نہ بناؤ۔ اس تڑپ، اس کسک سے کیا فائدہ؟ جو بیت چکا اسے بھول جاؤ ـــ پدما کو بھلا دو!"

میں نے نظریں جھکا لی تھیں۔ حلق میں کچھ اٹکتا سا لگا تھا۔ ذرا ٹھہر کر ایک نرم نگاہ میں نے سامنے ڈالی تھی۔ شیکھر کے چہرے کے خطوط دھوئیں کے پیچھے مدھم سے محسوس ہوئے۔ پھر بہت آہستگی سے میں نے لب کھولے۔

"زندگی تو اجیرن ہو ہی گئی۔ کسی کو بھلانے سے بھی کیا ہوگا ـــ؟"

"تم چاہو تو سب کچھ بدل سکتا ہے۔ زندگی کے سفر کا آغاز کسی سرے سے کیا جا سکتا ہے! اپنی سوچ، اپنی فکر کا انداز بدل کر تو دیکھو ـــ! بہتر ہے شادی کر لو۔"



میں نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ تارے جھل مل کر رہے تھے ہوٹل کا نیون لائٹ جگمگا رہا تھا۔ انٹرنس پر رنگ برنگے چھوٹے چھوٹے بلب روشن تھے۔ قدموں تلے نرم گھاسوں کی روش تھی۔

میں نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ پھر کہا۔

"نہیں شیکھر! وہ نہیں تو کوئی بھی نہیں۔ میں نے اس سے بھی کہا تھا۔ وہ نہ مانے، میں تو مانتا ہوں۔"

ترلیش نے اپنی کرسی تھوڑا آگے کھسکا لی۔ لڑکھڑاتے لہجے میں بولا۔

"ورمنڈپ میں پدما کو میں نے دیکھا تھا۔ آگ کے گرد پھیرے لگاتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ گھونگھٹ اٹھائے نظروں میں ایک سوال چھپا کر ہر کسی کو تکتی جا رہی تھی۔"

شیکھر نے گلاس سے ایک گھونٹ پیا۔ اپنے ہونٹوں کو ملتے ہوئے کہا۔

"یہی سوال نا کہ ـــ تم نے آنند کو دیکھا تو نہیں؟"

یکایک میں اپنے سر میں شدید درد محسوس کرنے لگا تھا۔ حلقوں میں آنکھیں دھنسنے لگی تھیں۔ دل چاہ رہا تھا دو چار سونار ل،

سے لوں۔ نیند آجائے گی۔

سُریش نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا۔ دھوئیں سے چھلّے بناتے ہوئے بولا۔

"سُنا ہے تم نے پدما کو ٹھکرا دیا تھا ــــــ کیوں؟"

میں نے بوجھل آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ میری بھویں تن گئی تھیں۔ جیسے کس گئے تھے۔

"سُنا تھا تمھارے سوا وہ کسی اور کو سویکار نہ کرے گی!"

میری نسیں کھنچتی جا رہی تھیں۔

"لیکن . . ."

شیکھر نے بیئر کا لمبا گھونٹ لیا تھا۔

". . . مجھے پدما کے حال پر ترس آتا ہے۔ اُس کی سوگوار آنکھوں میں وہ چمک نہ رہی، اُس کے ہونٹوں پر قہقہے نہ رہے، اُس کے چہرے کی ساری رونق ہوا ہو گئی۔ وہ خوش نہیں ہے ــــــ خوش رہ بھی کیسے سکتی ہے!"

"سچ؟"

یک لخت میرے مُنہ سے نکل گیا۔ میں نے میز کے سرے زور سے پکڑ رکھے تھے۔

اُن دونوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔

میں اپنے آپ کو بہت ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ اب درد میں وہ شدت نہ رہی تھی۔

میں نے ویٹر کو آواز دی۔

"بوائے! ایک گلاس ٹھنڈا پانی!!"

غیر طلبیدہ مضامین واپس منگوانے کیلئے اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ روانہ کیجیے بہتر ہو گا اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھیے۔ ہم واپسی سے معذور رہیں گے۔ (ایڈیٹر بیسویں صدی دہلی)

تمنّا

نسیم سامانی

تمہاری راہوں کو خونِ دل سے میں رشکِ صد گلستاں بنا دوں
زمیں کو جنت نشاں بنا دوں فلک کو عنبر فشاں بنا دوں
تمہاری ہر ہر ادائے رنگیں کو نازشِ دو جہاں بنا دوں
نئی نئی یہ زمیں بنا دوں نیا نیا آسماں بنا دوں
مری محبت قبول کر لو تو میں تمہیں جاوداں بنا دوں

تمہاری شبرنگ کاکلوں کو خمِ تب و تاب کا زری دوں
لبوں کو رنگِ شہاب دے کر شباب کا رنگِ دلبری دوں
گھنیری پلکوں کی جنبشوں کو ادائے افسونِ سامری دوں
تمہارے عکسِ جمیل کو میں چراغِ کون و مکاں بنا دوں
مری محبت قبول کر لو تو میں تمہیں جاوداں بنا دوں

تمہارے رخسارِ آتشیں کو حسینِ ماہِ تمام دوں گا
نظر کے اندازِ کیف د کم کو حیاتِ نو کا پیام دوں گا
میں تشنہ لب خود رہوں گا لیکن تمہارے ہاتھوں میں جام دوں گا
کتابِ ہستی کا میں تمہاری ورق ورق گلستاں بنا دوں
مری محبت قبول کر لو تو میں تمہیں جاوداں بنا دوں

تمہاری خلوت کو میں جو چاہوں تو رشکِ صد انجمن بنا دوں
لبِ حسیں کی خموش جنبش کو موجِ گنگ و جمن بنا دوں
خزاں رسیدہ دلِ حزیں کو جہانِ سرو و سمن بنا دوں
تمہارے گلشن کو خونِ دل سے بہار کا ترجماں بنا دوں
مری محبت قبول کر لو تو میں تمہیں جاوداں بنا دوں

بہارِ ہستی بھی میرے بس میں خزاں کا عالم بھی میرے بس میں
عروسِ دُنیائے رنگ و بو کی ہے زُلف برہم بھی میرے بس میں
خرد کے بندے بھی میرے بس میں جنوں کے محرم بھی میرے بس میں
اگر اجازت ملے تمہاری تو ایک تازہ جہاں بنا دوں
مری محبت قبول کر لو تو میں تمہیں جاوداں بنا دوں

گنہگار فرشتے

پروفیسر مس نگہت ریحانہ ایم۔ اے

بنگلہ نمبر ۲۔ نزد عثمانیہ مسجد، مال ٹیکری روڈ، امراؤتی (مہاراشٹر اسٹیٹ)

بزرگ محترم! عقیدتیں

تعمیلِ ارشاد باعثِ افتخار ہے! ایک افسانہ "گنہگار فرشتے" پیشِ خدمت ہے۔ افسانے کے متعلق صرف اتنا کہوں گی کہ اسے سمجھنے کے لئے خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ آپ کے حسبِ ارشاد تصویر بھی حاضر ہے۔۔۔۔ سالنامہ کا اعلان کرکے آپ نے آتشِ شوق کو اور بھڑکا دیا۔ دیکھیں اس دو ماہ کے عرصہ میں وقت کس رفتار سے گزرتا ہے ــــــ ان دنوں آپ کی صحت کیسی ہے؟ آپ کی زندگی سے ان گنت زندگیاں وابستہ ہیں۔ انھیں کے لئے اپنا خیال رکھئے۔ سالنامہ کی اشاعت کے سلسلے میں آپ کی بے انتہا محنت و کاوش کہیں آپ کی صحت پر کوئی بُرا اثر نہ ڈالے ۔ ۔ ۔ اب اجازت چاہوں گی۔ خدا کرے آپ بالکل اچھے ہوں!

خیر اندیش ــــــ نگہت ریحانہ

★

"یہ ہے میری محبوبہ ــــ میری بیوی ــــ میری سب کچھ ــــ اوہ! آخر آپ بھی حیران ہوگئے؟ میں جانتا تھا!!"

"ــــ؟"

"یہی کہ جب کبھی سرِ ر کی آواز کے ساتھ یہ پردہ سرکتا ہے۔ حُسن و رعنائی کا یہ مجسمہ دیکھنے والوں کی نظروں کو خیرہ کر جاتا ہے۔ یہ زندہ و جاندار مُسکراہٹ جسے ہزار زندگیاں پانے کے بعد بھی کوئی اپنے لبوں پر نہیں لاسکتا۔ لوگوں کو از خود رفتہ کر دیتی ہے!"

"ــــ؟"

"جی! یہی ہے اُس کا عکس۔ میرے چاند کا عکس ۔ ۔ ۔ نہیں، نہیں۔ میرا نہیں سب کا چاند! اپنے حُسن میں بھی یہ چاند کی طرح بے مثال ہے اور اپنے اوصاف میں بھی چاند ہی کی طرح دریادل۔ جو بکھرتا ہے تو اپنی چاندنی کسی ایک پر نہیں سب پر بکھیرتا ہے۔ کسی ایک کا ہو کر نہیں رہتا ــــ میری محبوبہ کی مُسکراہٹ بھی کسی ایک کے لئے نہ تھی، ایسی خوشبو کی طرح تھی جو ہوا کے دوش پر ہر جگہ اُڑی اُڑی پھرتی ہے۔"

"ــــ!!"

"جی! آپ نے درست فرمایا۔ یہ تصویر سب کو ایسی ہی نظر آتی ہے۔ جیسے کوئی جیتی جاگتی ہستی آنکھوں کے سامنے آجائے۔ یہی تو ایک فنکار کا کمال ہے۔ اُس کے فن کی معراج ہے کہ بے جان تخلیق میں جان ڈال دے۔ میری پکچر گیلری کے نوادر میں یہ سب سے ممتاز ہے!!"

"ــــ؟"

"ہاں! اور آپ کو سُن کر حیرت ہوگی کہ اُس مشہور فنکار آذر نے محض چند گھنٹوں کی کاوش کے بعد اپنا شاہکار مکمل کر لیا تھا۔ نتیجہ میں یہ آپ کے سامنے کھڑی ہے۔ اگر زحمت نہ ہو تو آپ تصویر کے سامنے رکھے اُس دیوان پر بیٹھ کر اسے بغور دیکھئے۔"

"______؟"

"گستاخی معاف! آپ کو غلط فہمی ہو تی ہے ___ یہ خوشنما گڑھے جو مُسکراتے وقت ان صبیح و شہابی رخساروں پر پڑ جایا کرتے تھے اور یہ غنچۂ دل کھلا دینے والی مُسکراہٹ اور مُسکراتے وقت دائیں لب کے قریں اس سیاہ خال کا اور زیادہ اُبھر جانا، اُس پر پُرشباب جذبات کی قوسِ قزح کا چہرہ پر بکھر جانا، ان چیزوں کو دیکھ کر آپ ہی نہیں کئی لوگ حیران ہوتے ہیں۔"

"______؟"

"جی! آپ پہلے شخص نہیں جس نے یہ پُوچھا! آپ سے پہلے بھی کئی لوگ یہ سوال کر چکے ہیں!!"

"______؟"

"وہ سب جان چکے ہیں اور آج آپ کو بھی بتا دوں کہ یہ دلفریب، دلنشیں، دلربا و دلکش مُسکراہٹ صرف میرے ہی لئے رہتی تھی!"

"______؟"

"آپ حیران نہ ہوں! میرا یہ معصوم چاند صرف مجھے ہی نہیں سب کو روشنی دیتا تھا۔ بیشک اُس کے چہرے پر فرشتوں کا سا تقدس تھا جسے دیکھ کر ولیوں و پیغمبروں کی پاکیزگی کا تصور ذہن میں آجاتا تھا۔ اِس تقدس کو وہ سب پر نچھاور کرتی تھی۔"

"______!"

"بجا فرمایا! یہ حُسنِ بے پناہ آپ بھی دیکھ رہے ہیں اور مجھے فخر ہے کہ میں بلا شرکتِ غیرے اُس کا مالک تھا۔ پھر بھی اِس حقیقت سے اِنکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُس کے جذبات صرف میرے لئے نہ تھے۔ اُس کی مُسکراہٹوں پر صرف میرا ہی قبضہ نہ تھا بلکہ . . ."

"______!"

"میرا مطلب اِس کے سوا اور کچھ نہیں کہ میرے علاوہ اور سب کا بھی وہ بہت خیال کرتی تھی۔ وہ سب کی طرف دیکھ کر مُسکراتی تھی۔ اُس نے یہ کبھی نہ سوچا کہ اُس کی مُسکراہٹ کو لوگ کیا سمجھیں گے۔ یہاں تک کہ کوٹھی کے معمولی ملازمین بھی اُس کی مُسکراہٹوں کے پھولوں سے اپنے دل کی جھولی بھر لیتے تھے۔"

"______؟"

"اِس کی وجہ شاید یہی تھی کہ وہ بے حد نرم دل تھی۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ خشکی کے اطراف سمندر ہی سمندر ہیں۔ لیکن اِن سمندروں میں دُنیا جہاں کا پانی سما جائے تب بھی وہ حدود کو توڑ کر دُنیا کو نہیں ڈبو سکتے۔ اُس کے دل میں بھی گہرے سمندر کی سی وُسعت تھی کہ دُنیا جہاں کے لوگوں کی خواہشوں کو وہ اپنے دل میں سمو لیتی تھی اور اپنے وجود سے مُسکراہٹوں و قہقہوں کی دَولت لُٹا کر اُن کے دامن بھرتی رہتی تھی۔ کبھی اُس نے جذبات سے دل کے حدود توڑ کر دُوسروں کی خوشیاں لُوٹنے کی کوشش نہیں کی۔ اُس نے کبھی کسی کو مایوس نہ کیا۔"

"______؟"

"اِس لئے کہ اُس کا دل اپنی ذات میں خود ایک کائنات بسائے ہوئے تھا۔ جس میں ہر آنے والے کا خیر مقدم کیا جاتا!!"

"______!"

"جی! ایک چھوٹی سی بات بھی اُسے خوش کر دینے کے لئے کافی تھی۔ پھر اُس خوشی کا اظہار ایک دلآویز مُسکراہٹ سے ہوتا!!"

"______؟"

"اب آپ جو بھی سمجھ لیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اُس کے جذبات کو متحرک کرنے کے لئے ایک معمولی سا واقعہ یا حادثہ کافی تھا۔ اُسے کائنات کے ذرّہ ذرّہ سے پیار تھا۔ جس چیز پر بھی اُس کی نظر پڑتی وہ اُسے پسند آجاتی اور ہر شے پر اُس کی نظر پڑتی ہی تھی۔ کوئی شے اُس کی نظر سے پوشیدہ نہ تھی۔"

"______!"

"آپ اُسے All Round کہہ لیں یا کچھ اور نام دے دیں۔ لیکن میں تو حقیقت بیان کر رہا ہوں۔"

"______؟"

"اِس سے مجھے اِنکار نہیں۔ میں نے شوہر کے رشتے سے جب کبھی اپنا حق مانگا۔ اُس نے دل و جان سے اپنا سب کچھ مجھ پر نچھاور کر دیا۔ تب میں نے سمجھا کہ میں نے حقیقی طور پر اُسے پا لیا ہے!!"

"______!"

"پھر! جب دُوسروں نے انسانیت کے ناطے اپنا حق اُس سے مانگا۔ وہ اُن کی راہوں میں بچھ بچھ گئی۔ اُس نے کسی کا

دل توڑنا گوارا نہ کیا اور سب کا دل رکھنے کی خواہش میں انجانے ہی میں سہی وہ میرے دل کو زبردست ٹھیس لگا بیٹھی۔ تب اپنے ہی شیشۂ دل کے ریزوں کو میں نے اپنے وجود میں چبھتے محسوس کیا!!"

"______؟"

"جی! میں نے بتایا نا! خاص و عام کی کوئی تخصیص نہیں۔ نوکروں نے جب کبھی دامن پھیلایا اُس نے میری دولت کے خزانوں کے منہ کھول دیئے۔"

"______!!"

"جی! میں بھی اُسے بُرا نہیں سمجھتا۔ میں تو خود کہہ رہا ہوں کہ وہ ایک معصوم فرشتہ تھی۔ جب کبھی میرے اور اُس کے دوستوں، ہمسایوں، عزیز و اقربا نے اُس کا ساتھ چاہا، اُس نے اپنے وجود سے اُن کی محفلوں کو رشکِ ارم بنا دیا اور اپنی دلنواز مُسکراہٹوں سے اُن کے دلوں کے نہاں خانوں میں مسرّت و انبساط کے چراغ روشن کر دیئے۔"

"______!"

"جی! میں آپ سے بالکل متفق ہوں۔ وہ شاید اسی اصول پر چلتی تھی ______ دل بدست آور کہ حجِ اکبر است!"

"______!"

"میں نے کب اعتراض کیا ______ لیکن وہ معصوم اِس بات کو بھلا بیٹھی کہ شوہر کے قدموں کے نیچے عورت کی جنّت ہے۔ اپنی جنّت کو انجانے میں سہی ٹھکرا کر اُس نے لوگوں کی جنّت بسا دی!!"

"______!"

"خیر آپ کے کہنے سے میں یہ فراموش کر دوں لیکن یہ بات میں کیسے بھول جاؤں کہ آج میں جو کچھ ہوں اپنے آباؤ اجداد کی وجہ سے ہوں ______ یہ کوٹھیاں، یہ کاریں، یہ اِتنا بڑا کاروبار، یہ دولت کے خزانے ______ اِنھیں جمع کرنے کے لئے کئی جنم لینے پڑتے ہیں۔ یہ جاہ و حشمت، یہ بہشت کا سا آرام و سکون، یہ عزّت و توقیر، یہ سب میرے بزرگوں کی برسہا برس کی عرق ریزی کا نتیجہ ہیں، اُس کا پھل ہیں۔ لیکن یہ بلند و بالا عمارت اُس وقت ڈگمگانے لگتی تھی جب وہ سب کو میرے ساتھ ایک ہی صف میں کھڑا کر کے سب سے ایک سا سلوک کرتی تھی۔ یہ زمین و آسمان کا فرق! جسے میرے آباؤ اجداد نے کئی پُشتوں میں پیدا کیا تھا، اُسے اُس کی ہلکی سی مُسکراہٹ ایک پل میں ختم کر دیتی تھی، مِٹا دیتی تھی۔"

"______!"

"جی ہاں! تب مجھے شدّت سے احساس ہوا . . . !!"

"______؟"

"یہی کہ انسان ہونے کے ناطے میں اِس فرشتہ کے ساتھ نہ رہ سکوں گا!"

"______؟"

"مجبوراً میں نے فیصلہ کیا کہ برسہا برس میں بنائی گئی اِس عزّت کو جو مُسکراہٹ ایک پل میں ختم کر دے، اُس مُسکراہٹ ہی کو

"کیوں نہ روک دیا جائے۔"

"____!"

"جوں جوں اُس کی مُسکراہٹ بڑھتی رہی، میرا فیصلہ مُستحکم ہوتا گیا۔ آخر۔۔۔!!"

"____!"

"ہاں۔ یہی میں بتانے جا رہا ہوں۔ اس لئے کہ آپ ہی کے خاندان کی بیٹی کے ساتھ میں پھر نئی زندگی شروع کرنے جا رہا ہوں۔ اسی لئے آج اس راز پر سے پردہ ہٹا دینا چاہتا ہوں۔"

"____!"

"پھر؟ پھر میں نے ایک حکم دیا۔"

"____!!"

"بس اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ میں نے حکم دیا اور۔۔۔ اور اس کے نتیجے میں ____ اُس کی مُسکراہٹ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی!"

"____!"

"میں مجبور تھا، بہت مجبور!!"

"____!"

"ایک غیر مرئی طاقت کے زیرِ اثر وہ سب کچھ ہوگیا۔ اب آج وہ یہاں کھڑی ہے اپنا ہی عکس بن کر۔ مجھے اکثر محسوس ہونے لگتا ہے جیسے وہ زندہ ہے اور ابھی بول پڑے گی ____!!"

"____!!"

"نہیں، نہیں۔ میں نے اُس سے بے پناہ محبت کی تھی۔ اسی لئے دل کی گہرائیوں میں آج بھی وہ موجود ہے۔ اُس کی حسین پرچھائیاں آج بھی میرے پیچھے چلتی ہیں ____ اُس کا حسین سراپا آج بھی میرے ذہن کے کینوس پر ثبت ہے ____ میرے دل کے گوشوں میں آج بھی اُس کی باتوں کے گہرے نقوش موجود ہیں ____ میرے گھر کے کونے کونے میں آج بھی اُس کے سُبک و نازک پیروں کی ہلکی ہلکی چاپ سُنائی دیتی ہے ____ کوٹھی کے در و دیواروں میں آج بھی اُس کے قہقہے گونجتے محسوس ہوتے ہیں ____ میرے دل میں آج بھی اُس کا دل دھڑکتا ہے ____ میری

سانسوں سے آج بھی اُس کی سانسیں اُلجھتی ہیں ــــ میرے وجود کے گرد اُس کی خوشبو بکھری ہوتی ہے ــــ وہ میرے روم روم میں سما چکی ہے ــــ اُس کا خیال وجود میرے وجود پر چھاتا چلا جا رہا ہے۔ اِسی لئے میں اپنی زندگی کو ایک نئے موڑ پر لے جانا چاہتا ہوں ــــ!!"

"ــــ!"

"بیشک ایک جیون ساتھی پالینے کے بعد میں اپنے ماضی کی ساری یادوں کو دفن کر دوں گا۔"

"ــــ!"

"اِسی لئے میں نے آپ لوگوں کے تعاون کی خواہش کی ہے!"

"ــــ!"

"معاف کیجئے گا میں نے آپ کا بہت وقت لے لیا۔ آیئے نیچے چل کر دیوان صاحب سے کچھ گفتگو کریں۔"

"ــــ!"

"جی! یہ بات آپ ہی اُن سے کہیں تو مناسب ہوگا۔ میری طرف سے عرض کر دیجئے گا کہ وہ فکرمند نہ ہوں۔ اپنی بیٹی کے ساتھ جہیز کے نام پر جو کچھ بھی وہ دیں گے میں بغیر کسی انکار کے قبول کر لوں گا۔"

"ــــ!!"

"جی ہاں۔ صرف اِس لئے کہ میں اُن کا دل نہیں توڑنا چاہتا۔ ورنہ میرا مقصود و اصلی تو اُن کی ہمہ صفات بیٹی کا ساتھ پانا ہے۔ اُسے اپنی شریکِ حیات بنانا ہے!"

"ــــ!"

"جی بس یہی خواہش ہے کہ پچھلی محرومیوں کی تلافی ہو جائے!!"

"ــــ!"

"آپ کو یہ سب بتانے کا مقصود بھی یہی تھا کہ میں زندگی میں دوبارہ اِس قسم کے کسی طوفان کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہیں۔ مجھے ایسا ساتھی چاہئے جو مکمل طور پر میرا ہو۔ صرف میرا اپنا۔"

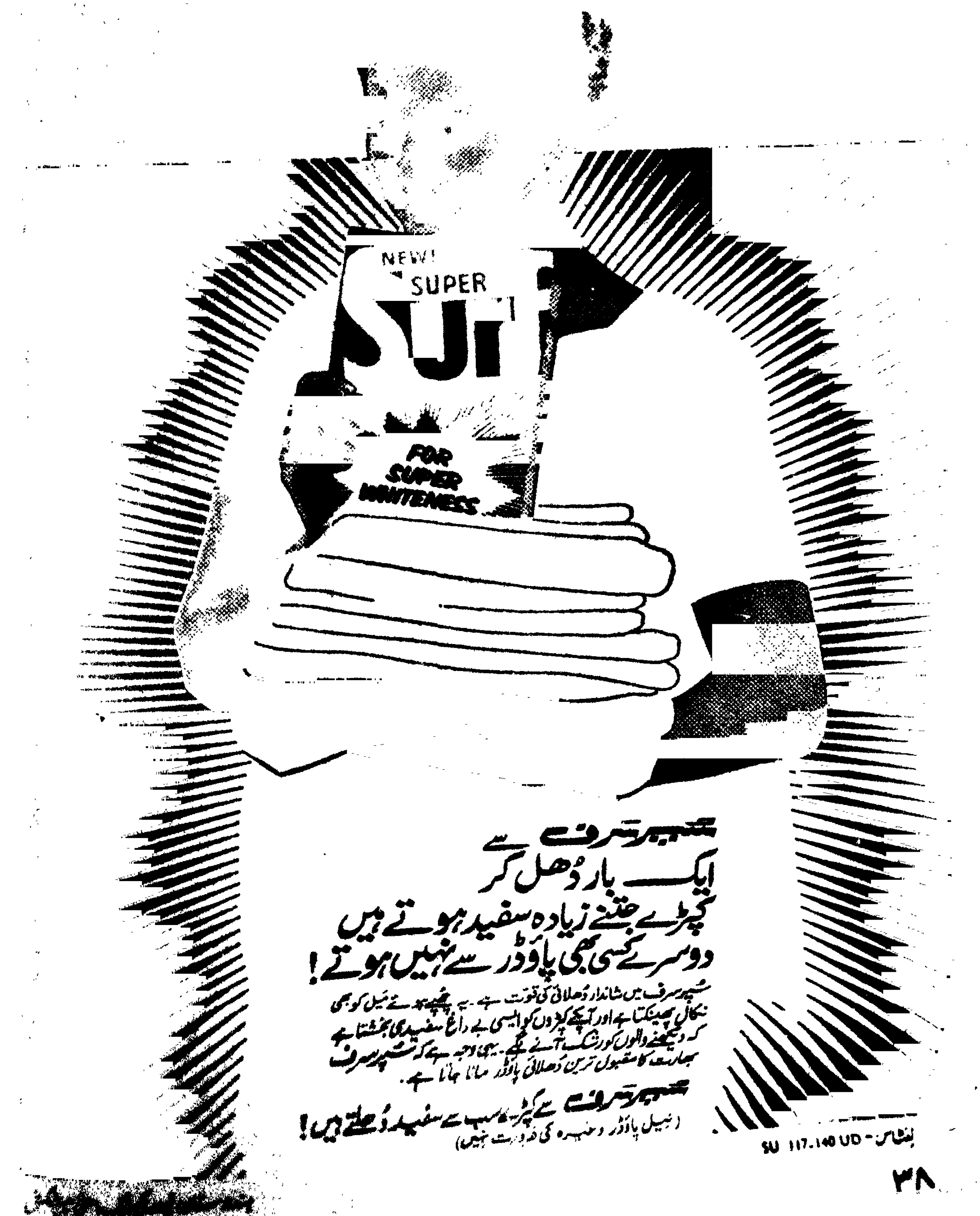
"ــــ!"

"حرج نہ ہو تو ایک منٹ رُکیئے گا۔ اِدھر دیکھئے کتنی خوبصورت Painting ہے!"

"ــــ؟"

"جی! وہ Neptune ہے۔ جسے سمندر کا دیوتا کہتے ہیں۔ جو Sea-Horse (سمندری گھوڑے) کو چابک سے مار رہا ہے۔ تصویر میں پیش کئے گئے مقصد کو غالباً آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ انسان کو اپنے وجود سے بُرائی کو ہر صورت میں دُور کرنا ہی پڑتا ہے ــــ خدا نہ کرے اب اِس قسم کی کسی چیز سے میرا سابقہ پڑے۔ میری آرٹ گیلری میں انشاءاللہ آئندہ کبھی اِس قسم کی کوئی کہانی جنم نہ لے گی!!"

جواب طلب امُور کے لئے ہمیشہ اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ یا پوسٹ کارڈ بھیجئے ورنہ ہم جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ (بیسویں صدی)


NEW!
SUPER
SURF
FOR SUPER WHITENESS
سُپر سرف سے
ایک بار دُھل کر
کپڑے جتنے زیادہ سفید ہوتے ہیں
دوسرے کسی بھی پاؤڈر سے نہیں ہوتے!
سُپر سرف میں شاندار دُھلائی کی قوت ہے۔ یہ چھپے ہوئے میل کو بھی نکال پھینکتا ہے اور آپکے کپڑوں کو ایسی بے داغ سفیدی بخشتا ہے کہ دیکھنے والوں کو رشک آنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ سُپر سرف بھارت کا مقبول ترین دھلائی پاؤڈر مانا جاتا ہے۔
سُپر سرف سے کپڑے سب سے سفید دُھلتے ہیں!
(نیل پاؤڈر وغیرہ کی ضرورت نہیں)
بلٹاس- SU 117.140 UD

غزل

اُما شنکر شاداںؔ گوالیاری

کیا لُطف آئے جب یہ کرشمہ دِکھائی دے
چلتا ہو جام، اور نہ چلتا دِکھائی دے

جلوہ دِکھاؤ، تاکہ اُجالا دِکھائی دے
ہم خود میں کھو گئے ہیں، ہمیں کیا دِکھائی دے

دُنیائے آرزو کا یہ کیا اہتمام ہے
دیکھوں جو آپ کو، مجھے دُنیا دِکھائی دے

اے دل نہیں قرار وسکوں اپنا مُدّعا
اِتنا تڑپ، جہان تڑپتا دِکھائی دے

اِک اِنقلاب اور زمانے میں لائیے
جب انقلابِ نو بھی پلٹتا دِکھائی دے

اُس کی اُداسیوں کا ٹھکانا نہ پوچھئے
محفل میں رہ کے جو تنِ تنہا دِکھائی دے

یہ حال کر دیا ہے تمہاری نگاہ نے
جو بھی کہوں، وہ عرضِ تمنّا دِکھائی دے

اُس وقت جانئے، کہ مکمل ہے زِندگی
جب آنسوؤں میں خُون نکلتا دِکھائی دے

جس راستے پہ دار و رسن کا ہو اہتمام
اُس راستے پہ کون گزرتا دِکھائی دے

پاکیزگی کی آڑ میں پلتی ہے زِندگی
دیکھو جسے وہ تارکِ دُنیا دِکھائی دے

پردے پڑے ہیں عقل کی آنکھوں پہ آجکل
اپنا دِکھائی دے نہ پرایا دِکھائی دے

سوؤں، تو جیسے عینِ حقیقت ہو زِندگی
جاگوں تو جیسے خواب میں جلوہ دِکھائی دے

وہ بے نِقاب بام پہ آئیں تو دیکھئے
سجدے کو آفتاب اُترتا دِکھائی دے

دُنیا کو تم نے کیسا بنایا ہے آئینہ
ہر عکس جیسے اپنے ہی جیسا دِکھائی دے

وہ دِن نہ آئے کاش ترقّی کے دَور میں
جب گاؤں میں بھی شہر کا نقشہ دِکھائی دے

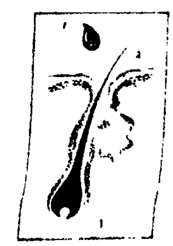
شاداںؔ جو اُن کا نقش بناؤں نگاہ سے
عارض کا رنگ اور بھی گہرا دِکھائی دے

پروٹین کا نہ مِلنا بالوں کے گِرنے کا باعث ہوتا ہے



پیوٗر سِلویکرین میں ۱۷ ضروری و اضافی پروٹین شامل ہوتے ہیں... نوبل پرائز یافتہ تکنیک سے ثابت ہے کہ پیوٗر سِلویکرین بالوں کی جڑ تک پہنچتا ہے اور بالوں کو ضروری غذا فراہم کرتے ہوئے انھیں گرنے سے روکتا ہے۔





پیوٗر سِلویکرین بال گرنے سے روکتا ہے یہ ہے اسکا ثبوت!

۱۔ اگر بالوں کو امینو ایسڈ دستیاب نہ ہو تو بال اُگنا کم ہو جاتے ہیں اور کمزور بھی۔ اگر بروقت احتیاط نہ برتی جائے تو بال کمزور ہوتے جائیں گے اور گرنے لگیں گے۔

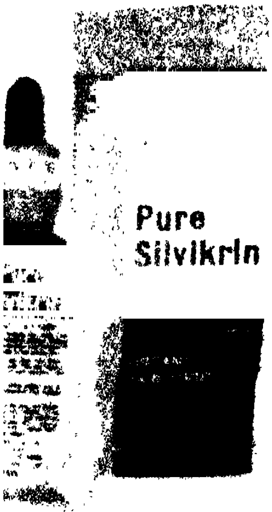
۲۔ پیور سِلویکرین (میگنیفائیڈ) کے قطرے میں تمام کے تمام ۱۷ امینو ایسڈ شامل ہیں۔ خالص قدرتی پروٹین جو کہ صحتمند اور مضبوط بالوں کی پیدائش کے لئے لازمی ہیں۔ پیور سِلویکرین تیزی سے بالوں کی جڑوں تک میں داخل ہوتا چلا جاتا ہے۔

۳۔ نوبل پرائز جیتنے والی ریسرچ ثابت کر چکی ہے کہ پیور سِلویکرین آپکے بالوں کو گھنے اور مضبوط بنانے والے لازمی حیاتین مہیا کرتا ہے۔

بس تو آج ہی پیور سِلویکرین استعمال کرنا شروع کر دیجئے

پیوٗر سِلویکرین کا مستقل استعمال ضروری ہے تاکہ بہتر نتائج پیدا ہوں۔

ہر روز دو مرتبہ مقررہ مقدار میں پیوٗر سِلویکرین لے کر سر کی مالش کیجئے۔ آپ کو خود محسوس ہوگا کہ آپکے بال گھنے ہوتے جا رہے ہیں اور صحتمند و مضبوط بھی۔ مختصر سے وقت میں بے مثال سِلویکرین کا مسلسل استعمال آپکے بالوں کو ان کی قدرتی صحت لوٹا دیگا... انھیں مضبوط اور گھنا بنا دے گا۔



پیوٗر سِلویکرین

جو بالوں کیلئے قدرتی پروٹین بھی ہے، صحت مند غذا بھی۔

وہ لڑکی!

وحید الدین احمد (علیگ)

عثمان پارہ، علی گڑھ

محترمی! تسلیم

مجھے افسوس ہے کہ میں چند مجبوریوں کی وجہ سے سالنامہ کے لئے افسانہ نہ بھیج سکا۔ لیجئے، اب "بیسویں صدی" کے قارئین کی خدمت میں ایک کہانی پیش کر رہا ہوں اور اس درخواست کے ساتھ کہ وہ اسے یہ سمجھ کر پڑھیں کہ وہ اسے سالنامہ ہی میں پڑھ رہے ہیں۔ ہے نا عجیب سی بات ——؟ لیکن نہیں —— اس لئے کہ "بیسویں صدی" کا ہر شمارہ خاص نمبر ہوتا ہے!

مخلص —————— وحید

★

چائے ختم ہونے کے بعد ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ صرف اس انتظار میں کہ بارش ذرا تھم جائے۔ تھوڑی دیر بعد کینٹین سے نکل کر ہم مین روڈ پر آ گئے۔ بادل اب بھی ہو رہے تھے۔ فضا میں ہلکی خنکی تھی، پھولوں پر نکھار آ گیا تھا، لان میں ہلکا ہلکا پانی بھرا تھا۔ اُس سے آگے پکی سڑک اب دھلی ہوئی صاف ستھری سڑک معلوم ہوتی تھی۔ سڑک اس وقت بالکل سنسان تھی۔ سامنے آخری موڑ تک یا ہمارے پیچھے کوئی نہ تھا۔ اُس پر پبلک ٹرک یا بس تو شاید ہی گزرتی ہو، کیونکہ یہ یونیورسٹی کے حدود میں تھی اور یونیورسٹی سے متعلق ٹرک یا بس کا تو ویسے ہی کبھی کبھی یا اپنے مقررہ اوقات پر گزر ہوتا ہے۔

پھر دُور سے ایک آدمی سائیکل پر آتا نظر آیا۔ یہ بات ہمارے لئے کوئی خاص بات نہ تھی۔ البتہ دُوسری بات ضرور خاص تھی جب اُس نے اپنی سائیکل ایکدم سڑک کے ایک کنارے پر روک دی۔ اب وہ بھی سائیکل پر بیٹھا ہوا تھا۔ ایک پیر کسی پتھر پر ٹیک رہا تھا، دُوسرا پیڈل پر تھا۔ اُس نے دایاں ہاتھ جیب میں ڈالا۔ کچھ نکالا۔ جھک کر اُسے آہستہ سے زمین پر رکھا اور اُسے رُومال سے ڈھانپ کر آگے ہماری طرف بڑھ لیا۔

رمیش میری طرف بہت دلچسپی سے سوالیہ انداز میں دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو —— کوئی خطرناک آدمی معلوم ہوتا ہے!

میں نے سوچا پاس سے گزرے گا تو دیکھ لوں گا۔ واقعی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس طرح سڑک پر کوئی چیز رکھنا اور پھر اُسے رُومال سے ڈھک کر آگے بڑھ جانا کیا معنی رکھتا ہے؟ ہو سکتا ہے ہمارے لئے کوئی ٹائم بم ہی رکھ دیا ہو —— نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا! بھلا کوئی ان فضول چکروں میں کہاں اپنا وقت برباد کرتا پھرتا جبکہ ہماری کسی سے دُشمنی تھی اور نہ کوئی اتنا دلیر ہی دکھائی دیتا تھا جو اس بے باکی سے ہمیں ہلاک کر سکے۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے سوال اُٹھنے لگے۔ لیکن مجھے ان سوالوں کا ایک ہی جواب اُس وقت ملا جب میں نے دُور سے آتی ہوئی دو لڑکیوں کو دیکھا۔ ایک بُرقع میں تھی، دُوسری بغیر بُرقعے کے۔

ہماری یونیورسٹی کا ماحول بھی کتنا عجیب ہے۔ کہیں

زندگی

خلوصِ عشق، نہ جوشِ عمل نہ دردِ وطن
یہ زندگی ہے خدایا کہ زندگی کا کفن؟ ——— جگر مراد آبادی

قدرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں
دو دن کی زندگی میں بھلا کیا کرے کوئی ——— درد

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی ——— اقبال

ہر گھڑی عمرِ گذشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا ——— فانی بدایونی

زندگی اپنی جو اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے ——— غالب

مرسلہ:- محی الدین - بسوئے - مونگیر (بہار)

بے پردہ لڑکیاں نظر آتی ہیں تو کہیں برقعے والیاں! دونوں مطمئن ہیں اور یونیورسٹی کے احاطے میں دونوں کا یونیورسٹی معیار اور وقار برابر ہے۔ لیکن میرا خیال ہے اب پردہ ختم تو نہیں البتہ کم ضرور ہوتا جا رہا ہے۔ اب بھی کچھ لڑکے پردے کو اچھی نگاہ سے دیکھتے ہیں، کچھ محض ڈھونگ سمجھتے ہیں۔

ہاں تو جب وہ لڑکا ہمارے قریب سے گذرا تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے ہوئے گہری سوچ میں تھا۔ اس کا چہرہ سُرخ تھا۔ میرا خیال ہے یہ سُرخی گھبراہٹ، خوف، فکر، خوشی اور اُمید کی تھی۔ ایسے میں آدمی کی جو حالت ہوتی ہے اس کا اندازہ لگانا میرے لئے مشکل تھا۔ کیونکہ میں ان حالات سے نہیں گذرا تھا۔ بہرحال میں نے اور رمیش نے اُسے اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ وہ ہمارے پیچھے کافی دُور تک جاتا دکھائی دیتا رہا۔ پھر ایکدم بائیں جانب مُڑ گیا۔

وہ تو گزر گیا۔ لیکن ایک بات بہت دلچسپ ہوئی۔ جب دُور سے آنے والی لڑکیوں میں سے بے پردہ لڑکی ہماری طرف بھاگنے لگی تو ہم اس کا مطلب سمجھ چکے تھے۔ وہ چاہتی تھی جب تک ہم اُس چیز تک پہنچیں اُس سے پہلے بھاگ کر وہ وہاں تک پہنچ جائے اور اُسے اُٹھا لے۔ وہ رُومال اب بھی ہم سے کافی دُور تھا۔ لیکن لڑکی بھی رُومال سے کافی دُور تھی۔ ایسی حالت میں رمیش کو نہ جانے کیا سُوجھی۔ بولا ——— "فلاں ذرا یہ کتابیں پکڑنا!"

کتابیں میرے ہاتھ میں تھما کر وہ بہت تیزی سے بھاگا۔ اُدھر سے لڑکی اور تیز بھاگنے لگی۔ رُومال بیچ میں تھا اور میں سوچ رہا تھا کہیں ایسا نہ ہو۔ . .

لیکن ایسا ہو کس طرح سکتا تھا؟ یہ تو رمیش کی شکست تھی اور وہ یہ کب گوارہ کر سکتا تھا کہ کوئی اُسے ہرا دے یا جھٹکا دے۔ بازی رمیش کے ہاتھ رہی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہوگی کہ لڑکیاں لڑکوں کے مقابلے میں تیز نہیں دَوڑ سکتیں۔ لیکن وہاں یہ بات قابلِ غور تھی کہ رمیش نے اُس لڑکی کے مقابلے میں زیادہ فاصلہ کم وقت میں طے کیا۔ خیر! مجھے تو اس موقع پر ایک لڑکی اور ایک لڑکے کے مقابلے کی دَوڑ کا جو منظر دیکھنے کو ملا، وہ اپنی مثال آپ تھا اور اُسے میں آسانی سے نہیں بُھلا سکتا۔

رمیش نے جس وقت وہ رُومال اور ڈبّہ اُٹھایا تھا وہ لڑکی صرف چند گز کے فاصلے پر رہ گئی تھی ——— پھر یکایک اس کا چہرہ فق پڑ گیا۔ وہ بُری طرح گھبرا رہی تھی۔ میں بھی اب اُن کے قریب پہنچ رہا تھا۔ رمیش نے ڈبّہ رُومال سے لپیٹ کر جیب میں رکھ لیا اور میری طرف دیکھ کر مُسکرانے لگا۔ میں نے پاس پہنچ کر رمیش کو دیکھا اور پھر اس لڑکی کو جو بُری طرح ہانپ رہی تھی۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ میرا خیال ہے یہ سُرخی گھبراہٹ، خوف، فکر، افسوس اور نااُمیدی کی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اگر اسے ڈبّہ نہ دیا گیا تو اسی وقت اِس کا دَم نکل جائے گا! اُس کی نگاہ میں رحم کی اپیل تھی جس کے ذریعہ کہا جا رہا ہو کہ میری امانت مجھے لَوٹا دو، ورنہ میں کہیں کی نہ رہوں گی، یہیں جان دے دوں گی! لیکن اُس کی زبان گُنگ ہو گئی تھی۔ وہ کچھ بول نہ سکتی تھی!

اُس کی یہ حالت مجھ سے نہ دیکھی جا رہی تھی میں نے رمیش سے کہا ——— "مجھے تمھاری یہ حرکت بالکل پسند نہیں۔ تم ڈبّہ اسے واپس دے دو۔"

"یہ ڈبّہ اِس کا ہے کب؟ یہ تو سائیکل والا رکھ گیا ہے ——— "

وہ بولا۔

"رکھا تو اِسی کے لئے گیا ہے۔ تم بات کو سمجھتے کیوں نہیں؟"

میں نے اُسے سمجھایا۔

اب وہ بُرقعے والی لڑکی بھی ہمارے پاس آپہنچی تھی۔ اُس کے چہرے پر نقاب پڑا ہُوا تھا۔ وہ خاموشی سے ایک طرف کھڑی ہوگئی۔ رمیش بولا ——— "دیکھو خان! میں یہ ڈبّہ آسانی سے واپس کرنے والا نہیں۔ اِس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ اِسی کے لئے رکھا گیا ہے؟"

میں نے پھر سمجھایا ——— "یہ ڈبّہ تمھارا نہیں ہے۔ دُوسرا آدمی رکھ گیا ہے۔ جب وہ حاصل کرنا چاہتی ہے تو دے کیوں نہیں دیتے۔" جب میں نے لڑکی سے پُوچھا کیا وہ ڈبّہ چاہتی ہے؟ تو اُس نے 'ہاں' میں سر ہلا دیا تھا۔

"خان! پہلے ذرا میں یہ دیکھ لوں کہ اِس کے اندر ہے کیا بلا؟" وہ ڈبّہ جیب سے نکال کر اُسے کھولنے ہی والا تھا کہ لڑکی نے آہستہ سے کہا ——— "اِسے مت کھولئے۔ اِس میں چوڑیاں ہیں اور . . . "

"اور؟" رمیش نے بیچ میں لقمہ دیا۔

"اور پرچہ ہے!"

"ہائیں ——— مار دیا ظالم ——— لو دیکھ لو!" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ——— "پانچ سال سے جھک مار رہا ہوں۔ کچھ حاصل نہ ہُوا ——— یہاں منٹوں میں کام ہوگیا! کیا کیا قسمت پائی ہے لوگوں نے!"

"دُوسرے کی کامیابی سے تم جلتے کیوں ہو؟" میں نے کہا۔

وہ بولا ——— "جل نہیں، کُڑھ رہا ہوں! اِس لئے کہ میں سڑک چھاپ عاشقوں کا ہمیشہ سے مخالف رہا ہوں۔"

پھر میں نے اُس لڑکی سے پُوچھا ——— "محترمہ! یہ بتائیے کہ یہ صاحب جو ڈبّہ رکھ کر گئے ہیں، کرتے کیا ہیں؟"

"سروس کرتے ہوں گے۔"

ویسے تو ہم نے شکل دیکھ کر ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ مسٹر یونیورسٹی کے طالب علم تو ہو ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ یونیورسٹی کا اسٹوڈنٹ ایسی حرکت نہیں کرتا۔ یہ جان کر کہ وہ سروس کرتے ہیں، یہ بھی اندازہ لگ گیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ کلرک یا کم سے کم چپراسی ہو سکتے ہیں۔ اِس لئے کہ پچھلے ریکارڈ سے ہم جانتے تھے کہ یونیورسٹی کے بہترین سڑک چھاپ عاشق زیادہ تر چپراسی ہوتے تھے یا اُن میں سے کچھ ایک کلرک بھی ہوگئے تھے۔

رمیش نے اُس لڑکی سے پھر پُوچھا ——— "اور آپ کیا کرتی ہیں؟"

"میں پڑھتی ہوں۔" لڑکی نے جواب دیا۔

"کس کلاس میں؟"

"ایم۔ اے پریوِس۔"

"آپ ایم۔ اے کی طالبہ ہیں اور پھر بھی آپ . . . دیکھئے آپ کو ایسی باتیں زیبا نہیں دیتیں۔ مجھے آپ کے اِس عمل سے بہت افسوس ہُوا ہے۔" رمیش یکدم سنجیدہ ہوگیا تھا۔ وہ لڑکی کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے کسی مُجرم کو دیکھتے ہیں۔ اُس کے اِسٹائل سے یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ وہ معاف کرنے اور ڈبّہ واپس کرنے کے موڈ میں ہے اور میں رمیش کو غور سے اِس لئے دیکھ رہا تھا کہ وہ بہت احتیاط سے اُردو بول رہا تھا۔

تُو اور میں

میں انتہائے عشق ہوں تُو انتہائے حسن
دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی ——— علامہ اقبال

تُو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دُور دراز ——— مرزا غالب

جس چمن زار کا ہے تُو گُلِ تر
بلبل اُس گلستاں کے ہم بھی ہیں ——— میر تقی میر

نہ مشتاقوں کی محفل تھی نہ جانبازوں کا میلہ تھا
خدا جانے کہاں مرتا تھا میں جب تو اکیلا تھا ——— شاد عظیم آبادی

وہ بھی عالم تھا کہ تُو ہی تُو تھا اور کوئی نہ تھا
اب یہ کیفیت ہے میں ہی میں کا ہے سودا مجھے ——— امرناتھ ساحر

مرسلہ: محمد مومن خاں بی کام ۔ حیدرآباد دکن

لڑکی آہستہ سے بولی ـــــ "آئندہ ایسی غلطی نہ ہوگی"
ڈبّہ واپس کرتے ہوئے رمیش نے کہا ـــــ "مجھے آپ کی اِس بات سے بہت خوشی ہوئی ہے" اور جب اُس نے ڈبّہ واپس کرنے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا تو لڑکی نے اُسے لیتے ہی بُرقعے والی لڑکی کو تھما دیا اور کہنے لگی ـــــ "یہ میرا نہیں، اِن کا ہے"

"اِن کا! ـــــ یہ کون ہیں؟" رمیش نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔

"اِنھیں میں نہیں جانتی۔ یہ سڑک پر مِل گئی تھیں۔ باتوں باتوں میں مجھے ڈبّے کے متعلّق بتایا تھا۔ پھر جب اِنھوں نے دَوڑ کر ڈبّہ اُٹھانے کو کہا تو میں نے اُٹھا دیا"

"آئندہ احتیاط رکھئے گا۔ یہ ایکٹِ وِٹی نہیں سیریس معاملہ ہے!"
پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا ـــــ "خان! آج تم نے بُرقعے کا وہ استعمال دیکھا جیسے ایسی ویسی لڑکیاں اپناتی ہیں"

اِس پر اُس بُرقعے والی لڑکی نے نقاب اُلٹ دیا اور غصّے سے لال پیلی ہوتی ہوئی چیخی ـــــ "آپ لوگوں کو لڑکیوں کو چھیڑتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ دونوں کو ۲۹۴ میں بند کروا سکتی ہوں۔ چوکی کے سب پولیس والوں سے میری جان پہچان ہے۔ فوراً دفعان ہو جاؤ ـــــ بدمعاش کہیں کے!"

اِس پر رمیش نے ایک پُر زور قہقہہ لگایا اور کہا ـــــ "اِس سے زیادہ آپ اور کر بھی کیا سکتی ہیں؟"

میں نے رمیش کو آنکھوں کے اشارے سے سمجھایا کہ لڑکی تیز معلوم ہوتی ہے۔ بہتر یہی ہے کھسک لیا جائے۔ رمیش سمجھ گیا۔ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ چلتے چلتے میں نے بے پردہ لڑکی سے جو بیل باٹم میں تھی کہا، وہ دُوسرے راستے سے جائے۔

وہ فوراً کتابیں سنبھالتی ہوئی ایک طرف کو چلی گئی۔ وہ بُرقعے والی وہیں کھڑی کچھ سوچ رہی تھی۔ چند قدم چلنے کے بعد رمیش کو میں نے بتایا کہ یہ بُرقعے والی لڑکی یونیورسٹی کی طالبہ نہیں ہو سکتی۔ میں نے اُس کے ڈریس اور بولنے کے انداز سے یہ نتیجہ نِکالا تھا۔ پھر پیچھے دیکھا تو وہ لڑکی سیدھی جا رہی تھی۔ کچھ اور دُور پہنچ کر دو موڑ پڑتے تھے۔ میں رُک گیا اور رمیش سے بولا ـــــ "اچھا بھئی رمیش! یہ بتاؤ کہ اب ہمیں کِدھر جانا ہے؟"

اُس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مُسکرا کر کہا ـــــ "اچھا یہ بھی اب مجھے ہی بتانا پڑے گا؟" پھر اچانک وہ چونک پڑا۔

"ارے ارے! وہ دیکھو، وہ بُرقعے والی کِدھر جا رہی ہے؟"

میں نے مُڑ کر دیکھا تو وہ لڑکی یونیورسٹی کی طرف نہیں، شاخِ گُل کی طرح لچکتی لہراتی اب بائیں جانب مُڑ رہی تھی!!

غزل

پروفیسر ڈاکٹر آمانت ایم۔ اے، پی ایچ، ڈی

افکار کے آہوئے حسیں رام کیے ہیں
صحرا میں تخیل کے بہت گھوم لئے ہیں

رُوٹھے ہیں کبھی اِن سے تو سجدے بھی کیے ہیں
اصنامِ خیالی کے سہارے ہی جئے ہیں

ہر گام پہ سو ناز اُٹھاتے ہیں جُنوں کے
سو بار گریباں کے بھی سب چاک سیئے ہیں

وارفتگیِ شوق بڑھی جب بھی ہماری
بیساختہ پیمانے کے لب چُوم لیئے ہیں

کچھ دِل نے بھی بیباک اشاروں سے لیا کام
کچھ اُن کی نگاہوں نے بھی پیغام دیئے ہیں

اب اور زمانے کو ہے کیا جانے شکایت
الزام تو سب اپنے ہی سَر ہم نے لئے ہیں

دِل جنکی سزاؤں میں گرفتار ہے اب بھی
کچھ ایسے نگاہوں نے مری، جرم کیئے ہیں

اِس "ناولِ رنگیں" کی ضخامت تو بہت ہے!
دو باب محبت کے ابھی ختم کیئے ہیں

خدشاتِ مسلسل میں دلِ زار پھنسا تھا
نازک سے جو رشتے تھے سبھی توڑ دیئے ہیں

اللہ رے اعجازِ تصور یہ آمانت!
خلوت میں بھی ہم ساتھ پریخانہ لئے ہیں

غزل

ابر احسنی گنوری

رسمِ جنونِ عام کے شایاں نہیں ہیں ہم
سینہ تو شق ہے چاک گریباں نہیں ہیں ہم

یہ سچ کہا کہ قرب کے شایاں نہیں ہیں ہم
یہ بھی کہو قریبِ رگِ جاں نہیں ہیں ہم

اب کون بجلیوں سے گلستاں بچائے گا
پروا انہیں نہیں ہے۔ نگہباں نہیں ہیں ہم

ہم پر یہ سب کرم ہے شبابِ بہار کا
اپنی خوشی سے چاک گریباں نہیں ہیں ہم

دِل میں ہزار بُت ہیں نظر میں ہزار بُت
حالت بتا رہی ہے مسلماں نہیں ہیں ہم

ہیں مطمئن کہ دِل میں ہے اُنکا رُخِ جمیل
آئینہ اُن کا ہو کے بھی حیراں نہیں ہیں ہم

اِس کا جواب کیا ہے بتا اے سکونِ دل
اُن کو یہ ہے گلہ کہ پریشاں نہیں ہیں ہم

ہم دامنِ حیات کیا کرتے ہیں رفو
ہو جاتیں چاک خود وہ گریباں نہیں ہیں ہم

موت آکے ختم کر نہیں سکتی ہے زندگی
افسانۂ حیات ہیں عنواں نہیں ہیں ہم

ہر اک نفس پہ آبرِ گریزاں ہے زندگی
اِس پہ بھی زندگی سے گریزاں نہیں ہیں ہم

مرنے والا

از مدن موہن شرما ایم۔ اے

اُردو ترجمہ۔ پُشکر ناتھ بی۔ اے

تارا نواس، نئی سڑک، جموں

برادرِ محترم! آداب و نیاز

ڈوگری افسانوی ادب میں شری مدن موہن شرما کا نام سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے اس ترقی پذیر زبان کو نہایت خوبصورت افسانے دئے ہیں۔ ڈوگری ادب اِن پر بجا طور پر ناز کرتا رہے گا۔ شری شرما نے افسانوں کے علاوہ ڈرامے اور ناول بھی لکھے ہیں۔ ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں سے کچھ ڈوگری نصاب میں بھی شامل ہیں۔ یہ آجکل بھدرواہ گورنمنٹ کالج میں انگریزی کے لیکچرر ہیں ——— زیرِ نظر افسانہ "مرنے والا" انہی کے ایک ڈوگری افسانے کا ترجمہ ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ترجمہ میں اصل کا رنگ برقرار رہے۔ میرا خیال ہے کہ میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوا ہوں۔ آپ اپنی رائے تحریر فرمایئے . . .

خیر اندیش ——— پُشکر ناتھ

★

مرنے والے نے جب آخری بار آنکھ کھولی تو آسمان پر کچھ تارے باقی رہ گئے تھے۔

اپنی چارپائی پر پڑے پڑے اُس نے آنگن میں بچھی ہوئی دُوسری چارپائیوں کی طرف دیکھا۔ پہلی چارپائی پر ششما سو رہی تھی۔ اُس کی بیٹی، جو دسویں جماعت میں پڑھتی ہے۔ دُوسری چارپائی پر آٹھ سال کی بچّی چھ سال کے راجُو کے گلے میں بانہیں ڈالے بے سُدھ پڑی تھی۔ تھوڑا ہٹ کر ایک اور چارپائی تھی، جس پر گھر کی نوکرانی مائی دُرگاں پڑی خراٹے بھر رہی تھی۔ سارے دن کی تھکی ہاری بے چاری مائی دُرگاں!

مگر؟ گھر کی مالکن ———؟

کرشنا اندر ڈرائنگ رُوم میں پنکھے کے نیچے سوئی ہوگی۔

کرشنا سوئی ہوئی ہے یا جاگ رہی ہے؟ اُسے یہ معلوم نہ ہو سکا۔ اپنے تکیئے پر سر رکھے وہ صرف دروازے کے کُھلے ہوئے کِواڑ دیکھ سکتا تھا یا پھر تیز چلتے ہوئے پنکھے کی گرر گرر کی آواز ہی سُن سکتا تھا۔

مرنے والا کتنی ہی دیر تک نیند میں ڈُوبے ہوئے اپنے اِن بچّوں کی طرف دیکھتا رہا، اپنے آنگن کو دیکھتا رہا، آنگن میں پڑی ہوئی کُرسیوں کو دیکھتا رہا جو بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر پڑی تھیں۔ آنگن کے بیچ میں بندھے ہوئے لوہے کے تار سے کپڑے لٹک رہے تھے۔ اُن میں کچھ کپڑے اُس کے تھے، کچھ اُس کے بچّوں کے ——— اور وہ رسوئی کے باہر مولسری کا پیڑ۔ بس یہی ساری چیزیں اُس کی نگاہوں کے دائرے میں بار بار آتی تھیں۔

اُس نے بہت مشکل سے کروٹ بدل لی۔ اُس کی نگاہ کا زاویہ بدل گیا۔ اب اُس کے سامنے گھر کا دروازہ آ گیا، جو باہر گلی میں کھلتا تھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ مگر نہ جانے کیوں اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ آنکھوں میں جلن سی ہونے لگی۔ اُس کا جسم جگہ جگہ سے جیسے ٹوٹنے لگا۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ کروٹ بدل لے۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ وہ جس حالت میں پڑا تھا، پڑا رہا۔

دروازے کے باہر گلی تھی۔ گلی کے آگے اور بہت سی گلیاں تھیں۔ پھر بازار، سڑکیں، لوگ —— ہاں! ایک لمبی چوڑی دُنیا تھی، جس میں رہ کر اُس نے بھی اپنی عمر کے چالیس برس گزارے تھے۔ اِس دُنیا میں بسنے والے کروڑوں لوگوں میں سے کچھ اُس کا نام بھی جانتے تھے، اُس کا احترام بھی کرتے تھے۔ لیکن زیادہ تر وہ تھے جو اُسے بیچارہ سمجھ کر اُس پر رحم کھاتے تھے۔ اُس کا نام زبان پر لانے سے پہلے کرشنا کا نام اپنے ہونٹوں سے ادا کرتے تھے اور پھر کرشنا کے نام کے ساتھ کئی جانے انجانے ناموں کی ایک فہرست جوڑ کر داستانیں گھڑتے تھے، چٹخارے لیتے تھے، اُس کا مذاق اُڑاتے تھے۔

کتنی عجیب بات ہے۔ میرے گھر کے بارے میں لوگ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ مرنے والے کے ہونٹوں پر ایک بن بلائی، اَن چاہی مسکراہٹ پھیل گئی۔ لیکن دُوسرے لمحے یہ مسکراہٹ ہونٹوں پر جم گئی اور جم کر دَم توڑ گئی —— اُس کی زبان تلخ ہو گئی، جیسے زہر کی ایک بُوند اُس کے مُنہ میں چلی گئی ہو۔ اُس کا حلق سوکھنے لگا، جیسے وہ کربلا کے میدان میں سے تنہا گزر رہا ہو۔ اُس کے ہاتھ پاؤں اینٹھنے لگے، جیسے بدن کی نس نس سُکڑ کر چھوٹے چھوٹے مرغولوں میں بدل گئی ہو۔ اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں —— کیا —— ؟ کیا —— ؟ نہیں!

اُس نے بہت کوشش سے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو کھولے رکھا —— بڑی کوشش سے —— اُس کے سامنے آکاش تھا۔ وہ آکاش کے بدلتے ہوئے رنگ دیکھنے لگا۔

وہ اور کرشنا پچھلے پندرہ برسوں سے ایک ہی گھر میں ساتھ رہتے چلے آ رہے تھے۔ لیکن بیاہ کے چار ہی پانچ سال کے بعد اِن کے درمیان ایک لکیر پڑ گئی۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ یہ لکیر بڑھتی گئی اور بڑھتے بڑھتے خلیج بن گئی اور نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ ایک دُوسرے کے ساتھ بات کرنے سے کترانے لگے!

یہ اَن مٹ دُوری اِن کے درمیان کیسے آ گئی تھی؟ کون ذمے دار تھا اِس کے لئے —— ؟

اِس بات کا فیصلہ کرنا دونوں کے لئے مشکل تھا۔ پھر ناممکن بن گیا!

کرشنا کا اِس میں کیا قصور تھا کہ وہ اپنے محکمے میں بہت پاپولر تھی۔ اُس کے آفیسر اُسے عزت اور احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اُس کے ملنے والوں کی تعداد کافی تھی۔ شہر کے بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ اُس کا میل ملاپ تھا —— اور یہ کہ اُس کی پروموشن وقت سے بہت پہلے ہوئی تھی اور وہ انسپکٹریس آف سکولز بن گئی تھی۔ لوگ سفارشیں کرانے اُن کے گھر بار بار آتے تھے، نذرانے پیش کرتے تھے —— اور وہ؟

وہ اپنے محکمے میں ترقی نہ کر پایا تھا۔

اُس کے آفیسر اُس پر مہربان ضرور تھے، اُسے بے حد شریف سمجھتے تھے۔ مگر اُس کی بیوی کی تعریفیں زیادہ کرتے تھے۔ جس شدت کے ساتھ وہ اُس کی بیوی کی تعریفیں کرتے تھے، اُتنی شدت کے ساتھ اُس کے بارے میں اظہارِ رائے نہ کرتے تھے۔

وہ اِس بات پر جھنجھلا اُٹھتا تھا۔ اندر ہی اندر کڑھتا رہتا تھا۔ گھر پر آتے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر اُس کے ذہن میں تلخی بھر جاتی تھی۔

ڈرائنگ رُوم میں محکمے کے آفیسروں کے ساتھ کرشنا کو بیٹھے دیکھ کر، اُن کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھ کر اُس کے سراپا میں ایک آگ سی لگ جاتی اور وہ گھر کی چھت پر آ کر ایک کونے میں ٹیک جاتا۔ سوچتا رہتا، سوچتا رہتا اور سوچ سوچ کر تھک ہار کر گھر سے باہر چلا جاتا۔ کافی رات گئے گھر لوٹتا۔ گھر میں کرشنا کو نہ پا کر اپنی ہی آگ میں کروٹ کروٹ جلنے لگتا۔ جبھی شنشا اُسے کہتی ——

"پاپا! ممی آپ سے بہت ناراض ہیں!"
"مجھ سے؟"
"ہاں پاپا ـــــ کہہ رہی تھیں آپ کو مینرز کا کچھ پتہ نہیں۔"

ششا سے یہ بات سُن کر وہ ایک دَم بُجھ سا جاتا۔ اُسے اپنا وجود اجنبی اجنبی سا محسوس ہوتا۔ کیا واقعی اُسے مینرز کا کچھ پتہ نہیں ہے؟ کیا اُسے چار آدمیوں میں بیٹھنے کا سلیقہ نہیں ہے؟ کیا اُسے ٹھیک ٹھیک بات کرنے کا ڈھنگ نہیں آتا؟

اور ـــــ اور اُس کی پرموشن؟ ایک دن ششا ہی نے کہا تھا ـــــ "پاپا! آج ممی آپ کی پرموشن کے لئے ایک بڑے آفیسر سے کہہ رہی تھیں۔ دوپہر کو وہ ہمارے گھر آئے تھے۔"

وہ رات اُس نے انگاروں پر لوٹ کے کاٹی۔ بار بار اُسے خیال آتا، کیا اُس کی پرموشن کے لئے بھی کرشنا ہی کو کوشش کرنی پڑے گی؟ کیا وہ اپنی بیوی کی سفارش پر آفیسر بننا پسند کرے گا ـــــ؟ یہ سوال اُسے اندر ہی اندر سُلگاتا رہا۔ کئی دن تک سُلگاتا رہا۔ تب اُسے اپنا جیون، اپنا وجود نہایت حقیر معلوم ہونے لگا۔ موری میں رینگنے والے ایک حقیر کیڑے کی طرح! اُسے بار بار یہ احساس ڈسنے لگا کہ وہ مرد کہلانے کے قابل نہیں ہے۔ مٹی کا مادھو ہے! اِس گھر میں اُس کی کوئی حیثیت نہیں۔ ایسے میں اُس کی نظر گھر کے دروازے پر لگی پیتل کی تختی کی طرف جاتی ـــــ "کرشنا بھاردواج ـــــ انسپکٹرس آف سکولز۔"

"یہ گھر میرا نہیں ہے۔ کرشنا کا ہے!" یہ سوچ کر اُس کے ہونٹوں پر ایک زہر خند پھیل جاتا۔ اِس تلخی سے گھبرا کر وہ دل میں فیصلہ کرتا کہ کرشنا گھر لوٹے گی تو میں اُس کے پاس جاؤں گا، یا اُسے اپنے پاس بُلاؤں گا۔ اُسے کہوں گا کہ لوگ تمہارے بارے میں جو جو بُہتان تراشی کرتے پھرتے ہیں، مجھے اُس کی ذرا بھی پرواہ نہیں ہے۔ آخر ـــــ آخر وہ میری بیوی ہے۔

مگر ـــــ ایسا کبھی نہ ہو سکا۔ وہ جب بھی کرشنا کو دیکھتا،



اُسے شدّت کے ساتھ اِس بات کا احساس ہو جاتا کہ اُس کے دل میں اِس کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ یہ سوچ کر اُس کا اِرادہ بدل جاتا۔ کرشنا کی طرف بڑھتے ہوئے اُس کے پاؤں رُک جاتے۔ سوچوں کا ایک ریلا کہیں سے آکر اُسے بہا لے جاتا اور اُسے احساس ہوتا کہ وہ اِس عورت کے قابل ہی نہیں۔

اگر کرشنا حُسن و شباب کا ایک موجزن دریا ہے، تو وہ اِس دریا کی بپھرتی لہروں میں گُم گشتہ ایک حقیر تِنکا! اگر کرشنا لامحدود وُسعتوں والا روشن گگن ہے، تو وہ اِس نیلگوں گگن کی گہرائیوں میں گُم ہوتا ہوا ایک چھوٹا سا، بدصورت پنچھی ہے!

کیا ہُوا اگر وہ کرشنا سے زیادہ پڑھا لکھا ہے۔ ڈگریوں کے انبار جمع کر لینا اور بات ہے اور دُنیا میں کامیاب ہو کے دکھا دینا اور بات!

وہ ناکام ہے ـــــ حقیر ہے!! اُسے اِس دُنیا میں رہنے، جدّ و جہد کرنے، آگے ہی آگے بڑھتے رہنے کا سلیقہ

نہ آیا۔ اصل میں یہ دُنیا اُس کی تھی ہی نہیں۔ اُس کا گھر کہیں اور تھا ——— کہیں اور!

وہ تو آؤٹ سائیڈر تھا۔

چھ برس پہلے اُس کی زندگی میں تھوڑے وقفے کے اندر دو حادثات ہوئے ——— ایک اُس کا پرموشن اور دُوسرا راجُو کا جنم۔ رِشتے ناطے والوں نے ڈانڈے مِلائے ——— بڑا نصیبوں والا لڑکا پیدا ہُوا۔ آنے سے پہلے ہی باپ کو آفیسر بنا دیا!

لیکن وہ اُس کمرے میں قدم بھی نہ رکھ سکا، جہاں کرشنا زچگی کے دن گزار رہی تھی چالیسویں دن! جب مائی دُرگاں نے راجُو کو لاکر اُس کی گود میں ڈال دیا، تو اُس نے پہلی بار اپنے بچّے کا مُنہ دیکھا۔ پل بھر بچّے کی طرف دیکھ کر اُس نے برآمدے میں دھوپ میں بیٹھی کرشنا کی طرف دیکھا۔

کرشنا نے بھی ایک لمحہ کو اُس کی طرف دیکھا۔ پھر غصّے اور نفرت سے کانپتی ہوئی اُٹھی اور اندر کمرے میں چلی گئی۔ دُوسرے لمحے مائی دُرگاں بھی راجُو کو اُس کی گود سے اُٹھا کر اندر چلی گئی۔

اُس دن پہلی بار پانی کا گلاس اُس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر گرا اور چکنا چُور ہوگیا اور اُس دن پہلی بار کھڑے کھڑے اُسے چکّر آنے لگا اور وہ دیوار کے ساتھ ٹکرایا اور پھر وہ ایک دن کے لئے بھی پھر صحت یاب نہ ہوسکا۔ اُس کی سوچیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گُم ہوگئیں۔ اُس کی نسیں اُس کے جسم کو جکڑنے لگیں ——— وہ چلتے چلتے لڑکھڑانے لگتا اور اکثر گر جاتا۔

کچھ مُدّت کے بعد وہ ڈاکٹری معائنہ کرانے چنڈی گڑھ چلا گیا۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ اُس کے دماغ میں ٹیومر ہے ——— اور اب بیماری لاعلاج ہے!

آسمان کا رنگ پہلے سیاہ تھا۔ پھر سُرمئی ہُوا اور اب مَیلی مَیلی سپیدی چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ وہ چڑیا جو ہر روز اِسی وقت نہ جانے کہاں سے آکر مولسری کے پیڑ پر بیٹھ جاتی تھی، آج بھی



تک کے بیٹھ گئی ہے۔ اِس چڑیا کے گیت کی آواز پنکھے کی گڑگڑ کے شور کے باوجود صاف سُنائی دے رہی تھی۔

اچانک ہَوا تیز ہوگئی۔ مرنے والے نے ایک پل کے لئے اُوپر بہت اُوپر چمکتے ہوئے تاروں کی طرف دیکھا اور پھر اپنی ساری طاقت جمع کرکے اپنے بستر سے اُٹھ پڑا۔ نہ جانے ہَوا کے کس آوارہ جھونکے نے آکر اُس کے کان میں کہا کہ رُخصت ہونے کی گھڑی اب دُور نہیں!

تھر تھر کانپتے ہوئے جسم کو مشکل سے سنبھالتے ہوئے اب وہ اُن چارپائیوں کے سامنے کھڑا تھا، جن پر پڑے اُس کے بچے سو رہے تھے۔ اِجو کے جنم لینے کے بعد اُس نے ایک بار بھی بچّوں کے سر پر شفقت کا ہاتھ نہ رکھا تھا۔ تینوں بچّوں کے لئے اُس کے دل میں اُداسی اور اُداسی سے بھی بڑھ کر نفرت کا جذبہ روز بروز زور پکڑتا چلا گیا۔ اُس کی یہ نفرت بچے بھی سمجھ گئے تھے۔

چارپائیوں کے سامنے کھڑا وہ کتنی ہی دیر تک نیند میں ڈُوبی اپنی دو بچّیوں کو دیکھتا رہا اور دیکھتے دیکھتے اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اُس کے کانپتے ہوئے ہاتھ ہَوا میں اُٹھے اور ایک دُوسرے سے جُڑ گئے: "الوداع میرے بچّو!" چند لمحے وہ یونہی کھڑا رہا، پھر اُس نے جُھک کر پہلی بار اور آخری بار رَجو کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔

اب وہ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے ڈرائنگ رُوم کی طرف جا رہا تھا۔ اندر کرشنا پلنگ پر سوئی ہوئی تھی۔ بستر کی چادر اُس کے سینے سے ڈھلک کر ایک طرف گر گئی تھی۔ گہری نیند میں ڈُوبی ہوئی کرشنا اُسے بے حد خوبصورت معلوم ہوئی —— جیسے سُورج کی پہلی کرن!

وہ دروازے پر بُت بنا کھڑا ہی رہ گیا۔ دیر تک سوئی ہوئی کرشنا کو دیکھتا رہا۔ اُس کا جی چاہا وہ اُسے جگائے، اُس سے باتیں کرے۔ کچھ اپنی کہے، کچھ اُس کی سُنے۔ اب تو مُدّت گزر گئی تھی اُس سے کوئی بات کہے۔ لیکن —— اچانک اُس کا دماغ جیسے جُھنجُھنے کی طرح بجنے لگا۔ اُس کے سارے جسم میں کپکپاہٹ شروع ہوگئی۔ اُسے خیال آیا وہ کچھ دیر اور وہاں کھڑا رہا تو وہیں پر ڈھیر ہو جائے گا!

ایسا نہ ہونا چاہیئے ——

ایسا نہ ہونا چاہیئے ——

وہ ڈگمگاتے قدموں سے واپس مُڑا اور دھیرے دھیرے —— ٹٹول ٹٹول کر چلتا ہُوا اپنے بستر تک پہنچا —— اور پھر وہ کٹی ہوئی لکڑی کی طرح بستر پہ گر پڑا۔ کانپتے ہاتھوں سے اُس نے چادر کھینچ لی اور اپنے اُوپر پھیلائی۔

چند لمحوں تک وہ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ کوئی آہٹ نہیں، کوئی آواز نہیں، کوئی صدا نہیں —— کیا کوئی ایسے بھی مرا کرتا ہے —— پھر ایک گھٹی سی آواز فضا میں اُبھری —— نہیں!! اُس کے ہونٹ ایک پل کے لئے کانپے اور اُس کی نگاہ اُوپر کی جانب اُٹھ گئی۔ اُس نے دیکھا مولسری کے پیڑ پر بیٹھی ہوئی چڑیا اُڑ کے ماتھے اُڑ گئی ہے۔ اُڑتی ہی چلی جا رہی ہے۔ خلاء کے بیچوں بیچ! اور اُوپر آسمان پر چمکتا ہُوا وہ تنہا تارا، جو سیدھا اُس کے ماتھے کے اُوپر کھڑا تھا، وہ مدھم ہوتا گیا، ڈُوبتا گیا، گُم ہوگیا!! اور تب کچھ لمحوں کے بعد اُس گُم ہوئے تارے کی جگہ ایک خون سے رنگے ہوئے کراس نے لے لی۔

"یہ صلیب کس کی ہے؟"

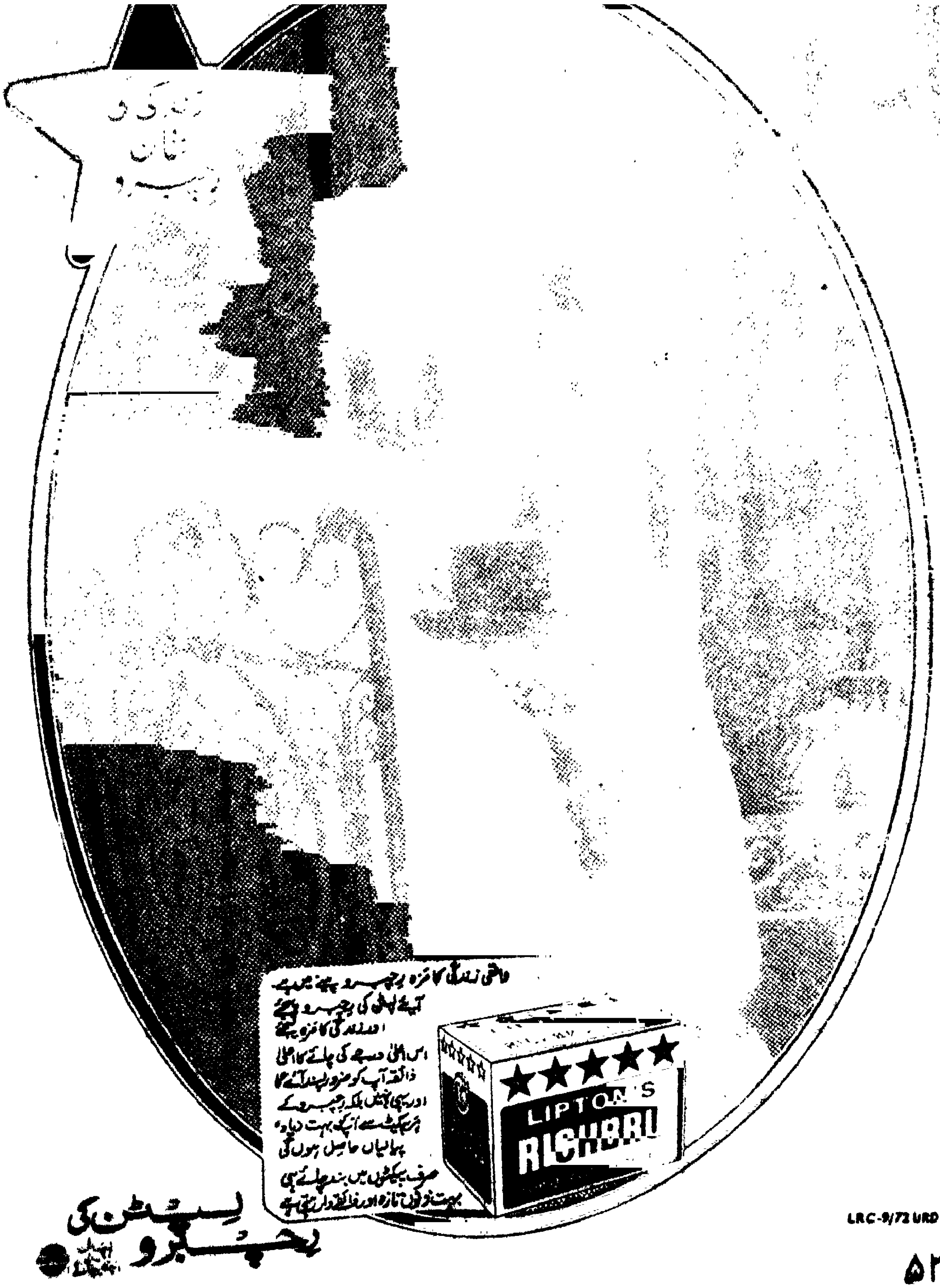
"کون اُٹھائے گا اِسے اپنے کندھے پر؟"

اُس کے ماؤف ہوتے ہوئے دماغ کے اندر ایک انگارے کی طرح دہکتا ہُوا سوالیہ نشان اُبھرا اور اُس نے دیکھا —— اُس نے دیکھا اُس کے ہاتھوں سے، بازوؤں سے، سینے اور پیروں سے —— جسم کے ایک ایک حصّے سے لہو بہہ رہا ہے۔ لگاتار بہتا چلا جا رہا ہے!

ابھی سُورج کی پہلی کرن دھرتی سے کوسوں دُور تھی جب مرنے والے کے دونوں ہاتھ ہَوا میں اُٹھے۔ ایک دُوسرے سے جُڑ گئے —— اور پھر اُس کی بے حس چھاتی پر آگرے۔

بظاہر یہ اُس کی موت تھی، مگر درحقیقت وہ نئی زندگی پا گیا ——! اپنی بیوی کی مقبولیت و اہمیت سے اُس کے اندر پیدا ہو جانے والے احساسِ کمتری نے اُس کی زندگی کو موت سے بدتر بنا دیا تھا!!

بیسویں صدی دہلی مارچ ۱۹۷۳ء



واقعی زندگی کا مزہ رچ برو پینے میں ہے
آپ بھی لپٹن کی رچ برو پیجئے
اور زندگی کا مزہ لیجئے
اس اعلیٰ قسم کی چائے کا اصلی
ذائقہ آپ کو ضرور پسند آئے گا
اور یہی نہیں بلکہ رچ برو کے
ہر پیکٹ سے آپ کو بہت زیادہ
پیالیاں حاصل ہوں گی
صرف پیکٹوں میں بند چائے ہی
بہت دنوں تک تازہ اور خوش ذائقہ رہتی ہے
LIPTON'S
RICHBRU
لپٹن کی
رچ برو
LRC-9/72 URD

غزل

شباب الست ایم۔ اے

رقص کریں گے مور بھی، مست گھٹا بھی چھائے گی
بیتی رُتوں کی سرخوشی پھر سے مگر نہ آئے گی

کس کو خبر تھی زندگی درد میں ڈوب جائے گی
تیری وفا بھی ایک دن ہم کو نہ راس آئے گی

صبحِ حیات آئے دن رنگ نیا دکھائے گی
شامِ اجل بھی نت نیا رُوپ بدل کے آئے گی

شوقِ بہار ہیں کہاں، اہلِ چمن کو تھا گماں
اب کے بہارِ گلستاں اور ہی گُل کھلائے گی

ایک وُہی نہ آئے گا روٹھ کے جو چلا گیا
صبح کی رات جائے گی درد کی رات آئے گی

ٹوٹی ہے ایک شاخ تو اُس کا بھی انتقام ہو
ورنہ چمن کی ہر کلی جبر کی زد میں آئے گی

آج ہمیں رُلا کے تم جشنِ طرب میں مست ہو
اور ہماری یاد کل خُون تمہیں رُلائے گی

یاس زدہ ہو کس لئے وقت کے انقلاب سے
دَورِ بہار اگر گیا، فصلِ خزاں بھی جائے گی

ہے کوئی روز اور یہ رنگِ نظام ہے کہ
تشنہ لبوں کی تشنگی رنگ ضرور لائے گی

حُسن کی مشتعل نظر مجھ کو یہ دے گئی شراب
پیاس تری بجھے گی کیا، پیاس تجھے بجھائے گی

اپنی زباں کو آپ نے تیغِ رواں بنا لیا
پھر بھی شباب کی زباں آپ کے گیت گائے گی

غزل

عبدالقدوس ناطق

نہیں ہے اور کچھ اس کے سوا اوّل سے آخر تک
دو عالم میں ہے اک نورِ خدا اوّل سے آخر تک

وفاداری ہے عنوانِ حیاتِ عاشقی اپنی
نباہا ہم نے پیمانِ وفا اوّل سے آخر تک

جہانِ عشق میں لفظِ زوالِ غم ہے بے معنی
یہاں ہے ارتقا ہی ارتقا اوّل سے آخر تک

نگاہِ حُسن کے سارے کرشمے ہیں دو عالم میں
نہیں ہے کچھ بھی دل کا ماسوا اوّل سے آخر تک

کسی کی شام تمہیدِ شبِ راحت ہے اے ساقی
ہماری شامِ غم ہے غم فزا اوّل سے آخر تک

اثر انداز کب اُن پر ہوئی آہِ رسا میری
رسا ہو کر رہی ہے نارسا اوّل سے آخر تک

فنا کے راز کو سمجھا نہیں ہے تُو نے اے واعظ
فنا در پردہ ہے اصلِ بقا اوّل سے آخر تک

جنابِ خضر کا ممنونِ احساں کیوں بنے کوئی
مذاقِ رس ہے، دل کا رہنما اوّل سے آخر تک

سلیقہ مانگنے کا ہو تو مل سکتا ہے کیا کیا کچھ
طلب اپنی ہے، مشروطِ دُعا اوّل سے آخر تک

جمالِ عارضِ تاباں کا جلوہ دیکھنے والے
رہے محرومِ عرضِ مدّعا اوّل سے آخر تک

فروغِ شامِ غم ہو، یا نمودِ صبحِ غم ناطق
محبت میں ہیں دونوں خوش ادا اوّل سے آخر تک



بیسویں صدی دہلی مارچ ۱۹۷۳ء

شیشے میں بال

سیف سہسرامی

نورنگنج سہسرام (بہار)

برادرِ محترم! آداب و نیاز

. . . آپ ابھی سے سال ۲۰۰۰ء کی تزئین و آرائش میں مصروف ہیں اور ہزاروں آنکھیں تھوڑے کے آئینے میں اس حسین ادبی دستاویز کو دیکھ رہی ہیں جو اہلِ علم و ادب کے لئے باعثِ فخر اور عروسِ اردو کے ماتھے کا حسین جھومر ہے ——— چند خطوط پر مشتمل "بیسویں صدی" کے دو فنکاروں کی ایک سچی کہانی حاضرِ خدمت ہے۔ اُمید ہے پسند آئے گی۔ ایک غیر مطبوعہ غزل بھی منسلک ہے۔ اپنی گراں قدر رائے سے مطلع فرمائیں۔ خدا کرے مزاجِ گرامی خوش تر ہو۔

آپ کا ——— سیف سہسرامی

★

محترمہ صبوحی ظفر صاحبہ! تسلیم

آپ کی کہانی "ایک مسافر تنہا تنہا" "بیسویں صدی" کے تازہ شمارہ میں نظر سے گزری۔ آپ اتنی خوبصورت کہانیاں کیسے لکھ لیتی ہیں۔ وہ بھی راجستھان کے خشک ماحول میں رہ کر! یقین جانئے ایک ایک جملہ دل کی گہرائیوں میں اُتر گیا! آپ نے کہانی کیا لکھی ہے

الفاظ کے پتھر سے تراشے ہیں صنم!

حیران ہوں کہ آپ عورت ہیں، لیکن آپ نے مرد کے جذبات کی اتنی صحیح عکاسی کیسے کی ہے۔ بہر حال مُبارکباد قبول فرمایئے۔

آپ کا ——— م۔ اقبال

محترم کرمفرما م۔ اقبال صاحب!

آپ نے تو مجھے عرش پر بٹھا دیا! میری کہانی سے زیادہ حسین تو آپ کا خط ہے! آپ نے نثر میں شاعری کی ہے۔ بُرا نہ مانیئے گا اگر میں پُوچھوں کہ آپ کا مشغلہ کیا ہے؟ میرا خیال ہے آپ شاعر بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔ دیکھئے جھوٹ نہ بولئے گا۔ اچھا اب اجازت دیجئے۔

——— صبوحی ظفر

صبوحی صاحبہ!

آپ کا خیال صحیح ہے۔ مجھے بھی افسانہ نگاری کا خبط ہے۔ میری کہانیاں اکثر رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ شاید کبھی آپ کی نظر سے گزری ہوں۔ رہ گئی شاعری کی بات تو میں شاعر نہیں، البتہ میرا ایک بہت پیارا دوست شاعر ضرور ہے جو اکثر اپنی غزلیں سُنا کر بور کرتا رہتا ہے۔ بے حد پیاری شخصیت کا مالک ہے اور ویسی ہی پیاری شاعری بھی کرتا ہے۔ کبھی وقت نے ساتھ دیا تو آپ سے مِلاؤں گا۔ ایک بات پُوچھوں آپ ناراض تو نہ ہوں گی۔ یہ ظفر صاحب آپ کے کون ہوتے ہیں؟

آپ کا اپنا ——— م۔ اقبال

مکرمی اقبال صاحب!

آخر دل کی بات زبان پر بلکہ کاغذ پر آ ہی گئی! یہ مرد بھی بڑے جلد باز ہوتے ہیں۔ جہاں کوئی نوجوان لڑکی نظر آئی بس دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں! جانے یہ سبھی کو اس نظر سے کیوں دیکھتے ہیں۔ انھیں اس کا بھی خیال نہیں رہتا کہ کسی کنواری لڑکی سے کس طرح بات کرنی چاہیئے۔ بس ذرا موقع ملا اور یہ آنا پتا سب پوچھ ڈالیں گے۔ سوچا تھا اب آپ کو خط نہ لکھوں گی۔ لیکن قلم بے ارادہ ہی چل پڑا۔ خیر آئندہ آپ ایسی باتیں نہ لکھا کریں۔ کہیں میرے پاپا (خان بہادر ظفر خاں) کو معلوم ہو گیا تو آپ کا کچھ نہ بگڑے گا، مجھے گولی ضرور مار دیں گے!

———— مہوجی ظفر

محترمہ! تسلیم

خط ملا، شکریہ!

آپ تو ناراض ہو گئیں۔ چلئے معاف کر دیجئے۔ ویسے آپ کی ناراضگی میرے لئے نیک فال ثابت ہوئی اور ایک کانٹا جو بہت دنوں سے دل میں کھٹک رہا تھا نکل گیا۔ یقین جانئے آپ کے اس خط کا ہر لفظ ایک ایسا پھول ہے جس سے خلوص و محبت کی خوشبو آ رہی ہے اور خوشبو کا ہر جھونکا کچھ حسین رازوں پر سے پردے اُٹھا رہا ہے۔ خط کیا ہے علامتی شاعری کا ایک نمونہ ہے جس کے پس پردہ نہ جانے کتنی کہانیاں مچل رہی ہیں۔ آپ میرے قلم کی بیباکیوں پر حیران نہ ہوں۔ ادیب اور فنکار کو بیباک ہونا ہی چاہیئے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

آپ کا ———— م۔ اقبال

فنکار (اقبال) صاحب!

معذرت نامہ بلکہ محبت نامہ ملا۔

آپ واقعی بیباک ہیں۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ وہ کون سا کانٹا تھا؟ ویسے میرا خیال ہے کہ آپ ہوائی قلعے بنانے میں ماہر ہیں۔ میرے خط کے پس پردہ کئی کہانیاں مچلتی نظر آ گئیں۔ کیا اُن میں سے ایک آدھ مجھے سُنانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے۔ میری مانئے تو دل اور قلم دونوں کو قابو میں رکھئے۔ ورنہ کسی دن ساری بیباکی دھری رہ جائے گی!

———— مہوجی ظفر

مہوجی صاحبہ!

مختصر سا خط ملا ————

باتوں باتوں میں بہت کچھ کہہ جانے کا فن تو بس لڑکیوں اور عورتوں ہی سے سیکھنا چاہیئے۔ میں ہوائی قلعے تو نہیں ہاں تاج محل ضرور بنانا چاہتا ہوں۔ لیکن اس کی تعمیر کسی کے حُسن کی محتاج ہے! دیکھئے وہ وقت کب آتا ہے جب میرا تاج محل منت کش تعمیر ہوتا ہے اور آپ کے حُکم کی تعمیل ہوتی ہے۔ یعنی ایک آدھ کیا میں ساری کی ساری کہانیاں آپ کو سُنا کر صحیفۂ حیات کے نئے باب کی ابتدا کرتا ہوں۔ آپ چاہیں تو ایک پنتھ دو کاج۔ آپ کہانیاں سُن لیں، میں تاج محل بنا لوں!

مُشتاق دید ———— م۔ اقبال



اقبال صاحب!

آپ کی کہانیاں سن لیں۔ شکریہ!

اُمید ہے جناب کا تاج محل بھی مکمل ہو چکا ہوگا۔ آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ میں نے یہ کہانیاں کب سنیں؟ تو عرض ہے کہ آپ کے خط کا ہر لفظ ایک کہانی سنا رہا ہے اور آپ کے دل کی دھڑکنیں یہاں سے محسوس کر رہی ہوں۔ لڑکیوں اور عورتوں کو باتوں باتوں میں بہت کچھ کہہ جانے کا فن آتا ہے۔ لیکن یہ مرد لڑکیوں کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے بے وقوف بنا کر کام نکالنا بھی خوب جانتے ہیں۔ کیا خیال ہے۔ کہیں انجانے میں کوئی دُکھتی رگ تو نہیں پکڑی گئی؟

——— صبوحی ظفر

محترمہ صبوحی صاحبہ!

میرے خط کا ہر لفظ ایک کہانی سنا گیا! چلئے اچھا ہوا میں زحمت سے بچ گیا۔ ہاں تاج محل کی بنیاد تو پڑ گئی۔ وہ یوں کہ تحریر کے آئینے میں کسی کے حسن کے جلوے جھلک اٹھے۔ بس کام شروع ہو گیا۔ لیکن اچانک نقشہ کہیں کھو گیا۔ اب آپ کرم فرمائیں تو شاید اُس کی تکمیل ہو سکے۔ بس اپنی کوئی تصویر بھجوا دیجئے۔ یہ میری ان دھڑکنوں کا تقاضا ہے جنھیں آپ کوسوں دور سے محسوس کرتی ہیں!

نیازمند ——— م۔ اقبال

محترمہ صبوحی ظفر صاحبہ!

تاج محل کی تعمیر کا خواب ادھورا رہ گیا۔ نقشہ (آپ کی تصویر) کی راہ تکتے تکتے کسی نے ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں! آہ! کیسے لکھوں کہ بدنصیب م۔ اقبال اب اس دنیا میں نہیں۔ انھوں نے آپ سے تصویر کی فرمائش کر دی تھی۔ آپ نے ناراض ہو کر خط لکھنا ہی چھوڑ دیا۔ مرحوم کے دل پر اس کا گہرا اثر پڑا۔ انھیں رہ رہ کر یہی خیال آتا تھا کہ یہ کیا کیا۔ آپ سے گستاخی کر کے سب کچھ کھو دیا! وہ اتنے شرمندہ تھے کہ آپ کو خط لکھ کر معافی بھی نہ مانگ سکے۔ انھیں دنوں اچانک اُن پر دل کا



دورہ پڑا۔ ڈاکٹروں نے تشویش ظاہر کی اور مکمل آرام کا مشورہ دیا۔ لیکن ———

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی!

نہ دوا کام آئی نہ دعا! اور آرام تو شاید اُن کے نصیب میں لکھا ہی نہ تھا۔ ہو سکے تو انھیں معاف کر دیجئے گا۔ شاید اس طرح اُن کی روح کو سکون مل سکے۔

غم نصیب ——— اختر شمیم

اختر شمیم صاحب!

تین مہینے اسپتال کے بستر پر پڑی حیات و موت سے جنگ کرتی رہی۔ آخر زندگی نے فتح پائی۔ کاش! موت جیت گئی ہوتی اور میں آپ کا یہ منحوس خط پڑھنے کے لئے جیتی نہ رہتی! صبح جس وقت سے آپ کا خط ملا ہے، تین بار غشی کا دورہ پڑ چکا ہے۔ بہت مشکل سے یہ چند جملے لکھ پائی ہوں۔ یقین نہیں آتا کہ میرا محبوب فنکار اس دنیا میں نہیں۔ خدا کے لئے

جلد لکھئے کہ آپ نے مذاق کیا ہے۔

بدنصیب —— صبوحی

یہ صبوحی کا اظہار محبت

آخر تمہارے دل کی بات کہہ دی۔ میں یہی چاہتا تھا۔ عورت ذرا مشکل سے اظہار محبت کرتی ہے۔ اسی لئے مجھے یہ انوکھا طریقہ اختیار کرنا پڑا۔ تمہاری علالت کی اطلاع نہ تھی ورنہ اس طرح تمہارا خوبصورت دل نہ دکھاتا۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دو اور اپنی خیریت جلد لکھنا۔ میری دعا ہے کہ خدا میری زندگی کے اچھے دن بھی تمہیں دے —— اور تم میری تمناؤں، آرزوؤں کی جنت میں سدا مسکراتی رہو۔ اختر نسیم میرا چھوٹا بھائی ہے۔ وہ بھی شرمندہ ہے اور تم سے معافی کا خواستگار!

تمہارا اور صرف تمہارا

م۔ اقبال

اختر نسیم صاحب!

آپ کے بھائی م۔ اقبال صاحب کسی خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ ان سے کہہ دیجئے شیشے میں بال آچکا ہے! آئندہ کوئی خط لکھنے کی کوشش نہ کریں۔ ورنہ میرے یہ خطوط ان کے پاس ہوں گے، انھیں جلا دیں گے۔ کیا پتہ تھا کہ آپ لوگ اس طرح کی چھچھوری حرکت کر گزریں گے۔ زیادہ افسوس تو اس کا ہے کہ آپ نے اپنے قلم سے بھائی کی موت کا نقشہ خوب کھینچ کر لکھا ہے کہ اس بیہودہ خبر نے میری جان نہیں لی۔ میرے خط کا جواب دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ [illegible] گئے۔ جیسے میری شادی مشہور شاعر ارشد جمال سے ہو رہی ہے!

صبوحی ——

غزل

[illegible] ـ اے عیک

ذہن میں محفوظ اک نقشہ تو ہے
آپ کو شاید کہیں دیکھا تو ہے

رُخ پہ اک تصویر کا دیکھا تو ہے
زندگی ہم نے تجھے سمجھا تو ہے

سرفروشوں کو ملامت تو ہے
چہرۂ قاتل پہ رنگ آیا تو ہے

خطرۂ ماضی سے پا کر بھی نجات
حال کو اندیشۂ فردا تو ہے

مٹ گئے اہلِ وفا تو کیا ہوا
اُس گلی میں آج تک چرچا تو ہے

ہم سفر منزل تو پھر آ ہی گئی
اِس سے آگے بھی مگر رستہ تو ہے

کون جانے صبح کا کیا رنگ ہو
شام تیری زُلف کا سایہ تو ہے

گوہرِ مقصود ہاتھ آئے نہ آئے
بحرِ غم میں آج دل ڈوبا تو ہے

غزل

معتدی پرتابگڑھی

جانے اُس جسم کی خوشبو ہے کہ یادوں کی مہک
بھینی بھینی سی ہوا ساتھ لئے آئے ہے

فصلِ گل تیری نوازش بھی گلستاں پہ نزول
دیکھو! ہر پھول کے چہرے پہ تبسّم ہے

ایک ہم ہیں کہ ہیں ناواقفِ تہذیبِ خلوص
ورنہ حیواں بھی محبت کی زباں سمجھے ہے

آنکھوں آنکھوں میں بھی پیغام دیئے ہیں اُس نے
اُس کی خاموشی کا مفہوم کوئی سمجھے ہے

کون جانے مرا پردیسی ابھی آ جائے
آج اک کاگ منڈیروں پہ مرے بولے ہے

عقل وہ شے جو پرکھتی ہے حقیقت کا لباس
دِل وہ دیوانہ جو پتھر کو خُدا سمجھے ہے

یہ مرے ذہن کی اپنی ہی صدا ہو نہ کہیں
ایک آواز مرے کانوں میں رَس گھولے ہے

ہے بھروسہ مجھے اُس ذات پہ جس کی رحمت
ایک دربند کرے سیکڑوں در کھولے ہے

زندگی مانگے سے ملتی نہیں ہمدم سُن لو
جس کو جینا ہے وہ خود دار پہ جا پہنچے ہے

مُسکراتے آنسو

رضوان احمد

دفتر ماہنامہ "نیرنگ" پوسٹ نمبر ۴ (بہار)

محترمی خوشتر صاحب! آداب و نیاز

"شاہکار" کی اشاعت کا شکریہ۔ یہ افسانہ قارئینِ "بیسویں صدی" نے بے حد پسند کیا ہے۔ بہت سے ستائشی خط ملے ہیں۔ کچھ باشعور قارئین نے خامیوں اور کمزوریوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔ بجائے تعریف مجھے پسند ہے تنقید خامیوں کی اصلاح کرتی ہے ——— طویل فلسفے میں بہت کم لکھتا ہوں، کیونکہ میرا عقیدہ ہے کہانی اتنی دلکش ہوگی جتنی مختصر ہوگی ——— لیجئے ایک مختصر لیکن تاثر انگیز کہانی حاضر ہے۔ یہ کہانی المیہ بھی ہے اور طربیہ بھی۔ مجھے یقین ہے قارئین پسند فرمائیں گے...

آپ کا ——— رضوان احمد

"ان واقعات پر دس برسوں کے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں لیکن آج بھی مجھے سب کچھ یاد ہے۔ بالکل اچھی طرح یاد ہے اور شاید کبھی نہ بھول سکوں... میں بھولنا چاہتا بھی نہیں۔ دل میں جو پھانس چبھ گئی تھی اُس کی کسک اور چبھن ہی میری زندگی کا سرمایہ ہے۔ جس دن اِس درد کو خود سے الگ کر دوں گا وہ دن شاید میری زندگی کا آخری دن ہو..."

نوین نے رُک کر کافی کی چسکی لی اور اشوک اور رنجنا کے چہروں کا جائزہ لینے لگا۔ وہ بہت غور سے اُس کی کہانی سن رہے تھے ——— اشوک نوین کا کولیگ تھا اور رنجنا اشوک کی دھرم پتنی ——— نوین کی بھابی۔ نوین جو دس سال سے اپنائیت کی مسرت سے محروم تھا اُس سے اشوک اور رنجنا نے پھر آشنا کر دیا تھا۔ اِس شہر میں آنے کے بعد ہی اُس نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ ہنگاموں کے درمیان بھی تنہا ہے اُسے تنہا ہی رہنا پڑے گا۔ لیکن پھر اشوک مل گیا جس نے اُس کے دل میں چھپے ہوئے درد کو سمجھا۔ پھر وہ قریب سے قریب تر آتے گئے۔ روزانہ آفس سے واپسی میں وہ اشوک کے ساتھ اُس کے گھر جاتا۔ چھوٹی سی فیملی تھی۔ اشوک، رنجنا اور ننھا گڈو ——— وہ تینوں ساتھ چائے پیتے۔ گپ شپ ہوتی۔ رنجنا مذاق کرتی۔ گڈو اپنی توتلی زبان میں چٹکلے اور نظمیں سُناتا: "بابا بلیک شیپ..." اور نوین ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ ساری تھکان دُور ہو جاتی۔ اشوک، رنجنا اور گڈو اب اُس کی زندگی کا ضروری جُزو بن گئے تھے ———

لیکن جونہی وہ اپنے وحشت کدے میں قدم رکھتا سامنے دیوار پر آویزاں مالتی کی اُداس تصویر اُس کا استقبال کرتی۔ پھانس پھر کھٹکنے لگتی، چبھن پھر شروع ہوتی اور نوین دیوانہ وار ماضی کے زخموں کو حال کے ناخنوں سے کُرید کر لہولہان کر دیتا۔ اُس کا سارا وجود خون میں لت پت ہو جاتا۔ ہر لمحہ ایک صدی بن جاتا۔ وقت کے اِس سنگلاخ پہاڑ کو کاٹ کر آگے بڑھنے کے لئے وہ تیشہ اُٹھا لیتا۔

"آپ کچھ سوچنے لگے شاید؟" رنجنا نے خاموشی کو توڑا تھا۔

"تم نہیں جانتی ہو رنجنا! یہ نوین ایکدم فلاسفر ہے!" اشوک نے

مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں سوچ رہا تھا بات کہاں سے شروع کروں"۔ انھیں اُلجھے ہوئے دھاگوں کو سلجھا رہا تھا، جس کا سرا تلاش کر رہا تھا ——
ہاں! وہ یہی بتا رہا تھا کہ مالتی مجھے زندگی کے ایک حسین موڑ پر اچانک مل گئی تھی۔ اس وقت میری راہوں میں دھنک کے ساتوں رنگ بکھر گئے تھے۔ مالتی کو پا کر میں نے سب کچھ پا لیا تھا۔ زندگی بہت حسین ہو گئی تھی۔ ہم مستقبل کے خواب دیکھتے، خلاؤں کی وسعتوں میں اڑانیں بھرتے، آکاش کی بلندیوں سے بھی اُوپر چلے جاتے۔ لیکن اسی درمیان نہ جانے کیسے مالتی راستے سے بھٹک گئی۔ اس نے سینی ٹوریم کی دہلیز پار کر لی۔ مالتی جو میرے ساتھ خلاء کی وسعتوں میں اڑانیں

••• ——— • ——— ••• ——— • ——— •••

- سچا مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے کسی کو اذیت نہ پہنچے۔
(سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- شرک کے بعد بدترین معصیت خلقِ خدا کی ایذا رسانی ہے۔
(سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- جو شخص اپنا راز مخفی رکھتا ہے وہ گویا اپنی سلامتی کا محافظ ہے۔
(حضرت عمر فاروقؓ)
- سردار بننا چاہتے ہو تو حرکت و عمل، جدوجہد کو معمول بناؤ۔
(حضرت امام حسینؓ)

••• ——— • ——— ••• ——— • ——— •••

بھرا کرتی تھی، سینی ٹوریم کی چہار دیواری کے اندر گھٹے گھٹے ماحول میں طائرِ قفس کی طرح پھڑ پھڑانے لگی۔ میں روزانہ اُس کی مزاج پُرسی کے لئے جاتا۔ مالتی کو سُرخ گُلاب بے حد پسند تھے۔ اِسی لئے میں روزانہ تازہ سُرخ گُلابوں کا گُلدستہ لے جاتا۔ پھر بھی اُس کے چہرے پر سُرخی نظر نہ آتی۔ وہ ساری شفق کی سُرخی اُس کے رُخساروں سے نہ جانے کس نے چُرا لی تھی۔ آنکھیں جو جھیل سے زیادہ گہری تھیں اب اُن میں ریگستان کی سی ویرانی نظر آتی اور میں اُس ویرانی کو دیکھ کر کانپ جاتا۔

نرس ڈھارس بندھاتی کہ آپ بہت جلد اچھی ہو جائیں گی۔ اور مالتی صرف معنی خیز انداز میں مُسکرا دیتی۔ وہ اندر ہی اندر ٹکڑے ہو کر بکھر رہی تھی۔

سینی ٹوریم کے لان پر بیٹھے ہوئے مُدتوں بے حِس و حرکت لوگ نہ جانے آسمان کی پہنائیوں میں کیا تلاش کیا کرتے تھے۔ شاید وہ بھی انھیں بلندیوں سے گزر کر نیچے آ گئے تھے۔ اُن کی آرزوئیں بھی وہیں پر پھڑک رہی تھیں۔ اُس وقت انسان کی بے بسی کی کوئی حد نہیں ہوتی جب وہ چاند کی بلندیوں پر کامیابی کے پرچم لہرانے کے بعد بھی زمین پر خود کو کمزور اور بے سہارا محسوس کرتا ہے۔ جب وہ موت کے سامنے خود کو بے بس پاتا ہے۔ میں نے خوف سے تمام چہرے پیلے ہوتے ہوئے دیکھے تھے۔

میں اور مالتی سبز گھاس پر بیٹھ جاتے میری نظریں سینی ٹوریم کی چہار دیواری سے اُوپر اُٹھتے ہوئے آکاش تک پہنچ جاتیں۔ لیکن مالتی کی نظروں نے پھر آکاش کی آرزو نہیں کی۔ شاید اب وہ پرواز نہ کر سکتی تھی۔ اُس کے پنکھ ٹوٹ چکے تھے۔ وہ اُداس ہو کر کہتی: "نوین! اب مجھ میں اُڑنے کی طاقت نہیں ہے۔ میں اتنی ٹوٹ کر بکھر چکی ہوں کہ اب خود کو سمیٹنا بھی ممکن نہیں ہے"۔ میں کُھلی فضا میں بھی طائرِ قفس کی طرح پھڑ پھڑاتا۔ اُن وسعتوں میں بھی حبس کا احساس ہوتا۔ جیسے کوئی دھیرے دھیرے دَم گھونٹ رہا ہو۔

"اور ایک دن جب میں سینی ٹوریم پہنچا تو مالتی ٹھوس اور بے جان فرش کو لالہ زار بنا چکی تھی۔ پتھر! جہاں سے کوئی سبز پودا سر اُٹھانے کی کوشش نہیں کرتا وہاں سُرخ سُرخ پھول کھلے تھے ——
لہو کے پھول! زندگی کی اُن تپتی راہوں پر میرا ساتھ دینے سے پہلے ہی وہ چلی گئی۔ بس وہ صرف یہی کہہ سکی تھی: "نوین! تم میرے مر جانے کے بعد شادی کر لینا۔ ضرور کر لینا۔ میری آتما کی شانتی کے لئے۔۔۔" لیکن شادی کر کے میں اب زخم پر اور کچوکے لگانا نہیں چاہتا۔ وہ پھانس جو چُبھ گئی اب نہیں نکل سکتی۔۔۔"

نوین نے دیکھا اشوک اور رنجنا دونوں کی پلکیں بھیگ گئی تھیں۔
"ارے بھابی! آپ رونے لگیں۔۔۔" معاف کرنا بھیا! میں نے بے وجہ آپ لوگوں کو اُداس کر دیا۔۔۔"

نوین نے زندگی میں پہلی بار اِن واقعات سے پردہ اُٹھایا تھا۔ اپنے زخم کھول کر دکھا دیئے تھے۔ یہ راز دس سال سے اُس کے سینے میں دفن تھا۔ اُس کی خاموشی، اُداسی، ناکامی اور محرومی کا

بار ذہن کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔ رنجنا اور اشوک کے اصرار نے اُسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ اُنھیں اپنا ہمراز بنا لے۔ آخر وہ کب تک اِس انجانی آگ میں جلتا رہتا، سُلگتا رہتا۔ لیکن آگ بجھی کہاں تھی بس ذرا سرد ہوئی تھی۔ احساس کی گرم راکھ کسی وقت سارے وجود کو جھلسا سکتی ہے۔ خوشی کی چند گھڑیاں گزارنے کے بعد اُسے پھر وہی سزا کاٹنی تھی۔

وقت جو پر لگا کر اُڑتا ہے وہ نوین کے لئے گھسٹ گھسٹ کر چل رہا تھا۔ نوین خود کس طرح چل رہا تھا؟ یہ اُسے بھی نہ معلوم تھا۔ کیونکہ جب کوئی منزل نہ ہو تو پھر راستہ طے کرنے کی جلدی نہیں ہوتی۔ پھر اچانک ہی روما آگئی۔ وہ خود نہیں آئی تھی۔ رنجنا بھابی نے اُسے راستے میں لا کھڑا کیا تھا۔ نوین کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لئے!

"یہ ہے ملو نوین! یہ ہیں مس روما گریجویشن کرنے کے بعد اب ایم۔ اے کر رہی ہیں۔"

"اچھا خیال ہے۔ کیا سبجیکٹ ہے آپ کا؟"

"سائیکولوجی۔"

پھر روما نے ہر زاویے سے نوین کا نفسیاتی مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ بہت جلد وہ نوین سے بے تکلف ہو گئی۔ روزانہ جب وہ اشوک کے یہاں جاتا تو وہاں روما بھی موجود ہوتی۔ اب ہر پروگرام میں رنجنا اُسے بھی شامل کر لیتی تھی۔

ایک دن رنجنا نے نوین کو اچھے موڈ میں دیکھ کر پوچھا تھا——

"روما کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"بہت اچھی لڑکی ہے۔" اُس نے جواب دیا تھا۔

"پسند ہے؟"

"کیا مطلب؟" وہ خود ہی سوال بن گیا تھا۔

"ارے اب اِتنا انجان بننے سے کیا حاصل؟ کسی جوان لڑکے سے جب کسی لڑکی کے متعلق رائے پوچھی جائے تو اُس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ سبھی جانتے ہیں اِس میں بتانے کی کیا ضرورت؟ تمھاری بھابی نے روما کو تمھارے لئے پسند کیا ہے۔ بس تمھارے ہاں کہنے کی دیر ہے۔" رنجنا اور اشوک دونوں اُس کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا جواب دے۔ روما یقیناً بہت اچھی لڑکی تھی۔ لیکن اُس کی مجبوری یہ تھی کہ وہ مالتی کی جگہ کسی اور کو نہیں دے سکتا تھا۔ وہ خاموش رہا۔

"کیا سوچ رہے ہو نوین؟ بھائی مجھ سے کسی لڑکی کے متعلق پوچھا جاتا تو میں بغیر سوچے سمجھے ہی ہاں کہہ دیتا۔ لیکن اپنی ایسی قسمت کہاں؟" اشوک نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آپ مالتی بہن جو نہیں ہیں؟" رنجنا نے چوٹ کی۔

"بھابی معاف کیجئے گا۔ میں نے اُسے کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا اور نہ شادی کے متعلق سوچا۔ مالتی کے بعد یہ کٹھن سفر تنہا ہی طے کرنا ہے۔"

- اگر انسان سے گناہ ہو بھی جائے تو اُسے دُہرانا نہ چاہئے، نہ اُسے چھپانا بھی نہ چاہئے، نہ اُس سے خوش ہونا چاہئے۔ گناہ کا اندوختہ ہی سلسلۂ دُکھوں کی بنیاد ہے۔ (مہاتما بدھ)
- جس کے پاس خدا کی یاد کا سرمایہ ہے اُس کی خوش نصیبی کا کیا کہنا! (گرو نانک جی)
- کامیابی کا راز یہ ہے کہ ہم پریشانیوں کے [illegible] نہ ہوں۔
- دُنیا کی کامیابی کی کنجی محنت، [illegible] ہے۔ ([illegible])

رنجنا نے زور نہیں دیا۔

روما اُس کے بعد بھی ویسے ہی ملتی رہی۔ اُس کے رویّے میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ شاید اُسے اِن باتوں کا علم نہ تھا۔ جتنی نوین کی زندگی کے تلخ واقعات رنجنا نے اُسے بتا دیئے تھے اُسی سے اُسے نوین سے بے پناہ ہمدردی تھی۔ روما ہمسفر تو نہ تھی۔ لیکن نوین نے یہ ضرور محسوس کیا کہ وہ زندگی کی تپتی راہوں پر برسات کی پھوار بن کر برس گئی ہے۔ راہ کی مشکلیں کچھ آسان ہو گئی تھیں۔ روما نفسیات کی طالبہ تھی اِسی لئے اُس نے محسوس کر لیا تھا کہ نوین کے زخم گہرے ہیں اور اُنھیں مندمل ہونے میں وقت لگے گا۔ اُدھر نوین کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ روما کا شکریہ کس طرح ادا

کرے جو اِسے زندگی سے پیار کرنا سکھا رہی ہے۔ اِس کی زندگی کے ویرانے میں پھول کھلا رہی ہے۔

پہلے ذہن سے وہ اِس احساس کو جھٹک ہی پاتا تھا کہ کوئی اور مالتی کی جگہ لے سکتا ہے۔ اُس نے دل کے ہر گوشے میں جھانک کر دیکھا۔ مالتی ہی نظر آئی! مالتی کی اُداس تصویر پر نظر پڑتی تو وہ خود بھی اُداس ہو جاتا۔ پلکیں بھیگ جاتیں اور ایسا محسوس ہوتا کہ مالتی کی تصویر بھی آنکھوں سے موتی رولنے لگی ہے۔ وہ دیر تک خود کلامی کرتا۔ وقت کی سُست رفتاری اُس کے لئے اُلجھن کا باعث تھی نہیں کیونکہ نہ اُسے کسی منزل پر پہنچنا تھا، نہ کارواں کی تلاش تھی اور نہ وہ راہگیروں پر نظر کرتا تھا۔ لیکن ایک دن وہ سڑک پر ایک تیز رفتار کار سے ٹکرا گیا۔ بس ہر طرف اندھیرا! اور اُسے کچھ نظر ہی نہ آیا۔ پھر کیا ہُوا؟ یہ بھی اُسے پتہ نہ چل سکا۔ جب اُسے ہوش آیا تو سب سے پہلے اُس کی نظر روما پر پڑی۔ پھر رنجنا بھابی اور اشوک۔ ——

"اب کیسی ہے آپ کی طبیعت؟" روما نے مُنہ اُس کے قریب لاکر پُوچھا تھا۔ اِتنے قریب کہ اُس کی سانسوں کی گرمی اُس نے اپنے چہرے پر محسوس کی تھی۔ لیکن وہ خاموش رہا۔ یہ سوچ کر کہ روما کو اِس سے پُوچھنے کا کیا اختیار؟

روما نے نوین کی تیمارداری میں دن رات ایک کر دیا۔ وقت پر کھلانا، پِلانا، دوا دینا، ساری رات جاگ کر گُزار دینا۔ نوین کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے؟ اُس کا نوین سے کیا تعلق ہے؟ اُس نے ایک دن بے بسی سے کہا تھا "روما! کسی پر اِتنا احسان نہیں کیا جاتا کہ اُس کے شانے اُس بوجھ کو برداشت ہی نہ کر سکیں! میں تو بہت ہی کمزور انسان ہوں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ انسانیت کے ناطے یہ تو میرا فرض ہے۔ آپ کی زندگی کی اُداس اور تاریک راہوں پر اگر میں ایک دِیا بھی جلا سکوں تو اِسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گی!"

آخر مَوت اور زندگی کے درمیان ایک ماہ تک مُعلّق رہ کر وہ ہسپتال سے واپس آ گیا۔ اُس دن روما بہت خوش تھی اور اُس دن اُس نے محسوس کیا تھا کہ اُس کے جِسم ہی نہیں دل کے زخم بھی مندمل ہو گئے ہیں! اُس کے اندر ایک نیا انسان انگڑائیاں لینے لگا تھا۔ جِس کے گِرد مایوسیوں کے ہالے نہ تھے۔ شاید وہ حصار سے باہر آ گیا تھا۔ روما نے اُسے روشنی دکھا دی تھی۔ زندگی سے پیار کرنا سِکھا دیا تھا۔ اُس کی زندگی کے ویرانے میں پھول کِھلا دیئے تھے۔ اُسے ایسا محسوس ہونے لگا راتیں سُہانا سپنا، دن مدھر گیت بنتے جا رہے ہیں!

اور اُس نے رنجنا بھابی سے اٹک اٹک کر کہا تھا "بھابی! ایک بار آپ نے کہا تھا کہ روما میری جیون ساتھی۔ ..." جملہ ادھورا ہی رہ گیا تھا۔

"کیا تم روما کو جیون ساتھی بناؤ گے؟" بھابی کی آواز فرطِ جذبات سے کانپ رہی تھی۔

"ہاں!" اُس نے جِسم کی تمام طاقت یکجا کر کے کہا تھا۔

"تم نے مالتی کی آخری آرزو پوری کر دی۔ آج اُس کی آتما بہت خوش ہوگی!"

اور اُس دن جب نوین نے کمرے میں قدم رکھا تو اُسے بے حد سکون کا احساس ہُوا۔ مالتی کی تصویر پر نظر پڑی تو آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے —— خوشی کے آنسو! مالتی کی تصویر کی پلکوں پر بھی اُسے آنسوؤں کے دو قطرے نظر آئے —— خوشی سے مُسکراتے ہوئے ——!!

غزل

نفیس فتح آبادی ایم اے

بہار کا ہے گماں، یہ کوئی بہار نہیں
یہ پھول پھول نہیں ہیں یہ خار خار ہیں

وفا پرست تو اُس دل کو بلا نہیں کہتے
ہوا جو یار میں بے تاب وہ بے قرار نہیں

وہ خواب خواب نہیں موڑ موڑ پہ جس کے
تری گلی، ترا گھر ہو، ترا دیار نہیں

لگائے بیٹھا ہوں اُمید عفو رحمت سے
مرا گناہ یہ ہے میں گناہگار نہیں

جفا سہوں، دکھ جھیلوں، مجھی کو ہے تلقین
مجھی کو کہتی ہے دُنیا وفا شعار نہیں

اُٹھا دو پردہ کہ ہو شام زندگی کی سحر
چلے بھی آؤ کہ اب تاب انتظار نہیں

اسیر ہوش کے قفس سے کہاں رہا ہوئے
خزاں کا ذکر ہے اب موسم بہار نہیں

کمال جذب محبت ضیا یہی تو ہے
پُر اضطراب ہے دل، آنکھ اشکبار نہیں

غزل

امر چند قیس جالندھری

آوارہ رہا یوں میں ترے گھر سے نکل کر
بُو جیسے پریشاں ہو گلِ تر سے نکل کر

جب کشتی مئے آئی مرے سامنے آ کر
بہہ نکلی مرے صحن کی ساغر سے نکل کر

کشتی مری غرقاب ہوئی ہے سرِ ساحل
افواج بلا خیز کے چکر سے نکل کر

اللہ کے گھر میں بھی نہیں کوئی ٹھکانا
بے گھر ہوئے ہم ایسے ترے گھر سے نکل کر

کچھ اور پریشاں بھی، پشیماں بھی ہوئے ہیں
ہم پنجۂ صیاد ستمگر سے نکل کر

بن جائیں گے شکوے بھی تشکر ترا لب پر
پہنچیں جو تمھیں پر دلِ مضطر سے نکل کر

[illegible]
اِس در سے نکل کر کبھی اُس در سے نکل کر

جب قیس کو اپنائیں وہ بد عہد نہ دیکھو
ساقی وہ کہاں جائے ترے گھر سے نکل کر؟

پنجاب کا شاندار ریکارڈ

[illegible] رہا ہے۔ اس نے اپنی اس عظمت کو برقرار رکھنے کی [illegible]
[illegible] رکھا ہے

[illegible] منٹگمری، لائلپور، ملتان اور
[illegible] اپنی عظمت کا لوہا منوایا ہے۔

تقسیم وطن کے بعد پنجاب کے پاس صرف 46,376 مربع میل (بشمولہ 19 اضلاع) کا علاقہ ہی ایسا تھا جو قابل کاشت [illegible] تھا۔ لیکن ہم پنجاب کے کسانوں کی کوششوں کے شکر گزار ہیں جنھوں نے کھانے میں ہمارے دیش کو پھر سے خود کفیل سٹیٹ ہونے کا مرتبہ دیا۔

1966ء کی تنظیم نو کے نتیجہ میں دیش کے پاس صرف 19,404 مربع میل (صرف 11 اضلاع) علاقہ رہ گیا تھا۔ لیکن ہم پھر سے پنجابی کسانوں کی انتھک محنت کے شکر گزار ہیں کہ ہم گندم کی پیداوار کو 72-1971ء میں 41.78 لاکھ ٹن سے بڑھا کر 79 لاکھ ٹن لے آئے تھے۔

اس دیش نے اس سال 32 لاکھ ٹن گیہوں اور 7 لاکھ ٹن چاول کو پیدا کیا ہے۔ جو ہندوستان بھر کی کل پیداوار کا آدھا حصہ ہے۔

[illegible] نمایاں پر فخر ہے جو کہ اس نے اناج کے محاذ پر کیے اور پانی کی کمی، آبپاشی کے لئے پانی کی کمی اور زراعتی اوزاروں کی بھاری تعداد میں کمی کے باوجود پنجاب نے اپنی اس ترقی کو قائم رکھنے [illegible]

[illegible] بنجر زمینوں کے محاذ پر جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس طرح سے 17 لاکھ ایکڑ زمین کو 26 کروڑ [illegible] زمین میں اصلاح کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

جاری کردہ:-

ڈائریکٹر انفارمیشن اینڈ پبلسٹی

پنجاب

عکس

ایس۔ ایم۔ عبّاس رضوی ایڈوکیٹ
سانی کلاں، ضلع جونپور (یو۔پی)

محترمی، تسلیمات

ایک کہانی "عکس" نذر کر رہا ہوں۔ جس میں میں نے ایک عورت کے جذبات کا نفسیاتی تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی کوشش میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں اس کا فیصلہ آپ اور قارئین کے سپرد ہے۔ تخلیق پسند آجائے تو کسی شمارے میں شامل فرمالیں اور اپنی قیمتی رائے سے نوازیں۔ آپ کی رائے میرے لئے باعث حوصلہ افزائی ہوگی۔ . . "بیسویں صدی" کا افسانہ نمبر دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ دُعا ہے کہ اس کے لاکھوں کروڑوں نمبر اسی آب و تاب کے ساتھ منظر عام پر آتے رہیں۔ آمین!

آپ کا اپنا ——— ایس۔ ایم۔ عبّاس

★

"جانے بھی دو بہو! بچے ہیں۔ پیار کی باتوں کا بُرا نہیں مانتے"

اور میں سوچنے لگتی ہوں ———

'پیار' بھی کیسا لفظ ہے۔ وسیع، بلند، مقدّس!

'پیار' کتنا پاکیزہ جذبہ ہے!

'پیار' دُنیا کی کتنی بڑی نعمت ہے!

'پیار' انسان کی کتنی عظیم تمنّا ہے!

'پیار' انسان کو کیا نہیں دیتا ——— جنم جنم تک قائم رہنے والا سکون، اطمینان، چین، آرام، مسرت، شادمانی!

"لیکن کیا ہر پیار کرنے والے کو خوشی ہی ملتی ہے؟"

بہت آہستہ سے کہیں کوئی آواز اُبھرتی ہے۔ میرے اندر ایک درد کروٹ بدلنے لگتا ہے۔ پُورے وجود میں ایک عجیب سی کسک، عجیب سی چبھن، عجیب سی جلن محسوس ہونے لگتی ہے۔ میری آنکھیں بھیگ بھیگ جاتی ہیں۔ پھر میرا جی چاہتا ہے، میں اُوما کے ہاتھ سے سارے پھُول نوچ کر پھینک دوں اور اُس سے چیخ چیخ کر کہہ دوں: "ارے یہ پھُول نہیں ہیں، کانٹے ہیں! کانٹے چُبھ جائیں گے!"

اُس دن جب ماں جی نے کہا تھا ——— "بہو! یہ بڑے بابو کے یہاں سے روز روز پھُول کیوں آتے ہیں؟" تو میں جلدی میں کچھ بھی نہ کہہ سکی تھی۔ خاموش رہ کر یوں بات ٹال دینا چاہی جیسے سُنا ہی نہ ہو۔ لیکن ایک ہی منٹ کی خاموشی نے جیسے میری جان ہی تو لے لی اور میں نے ماں جی کے جواب میں کہا تھا

"پتہ نہیں ماں جی! مجھے کیا معلوم" لیکن ایسا معلوم ہُوا جیسے کہیں کچھ سُلگنے لگا ہو، جلنے لگا ہو۔ میں اُن کے پاس سے اُٹھ گئی۔ نہ جانے انھوں نے میرے بارے میں کیا سمجھا، میری بات کا کیا نتیجہ نکالا۔ مجھے کن نگاہوں سے دیکھا؟ دیر تک میں اُن سے نگاہیں مِلانے کی ہمت نہ کر سکی تھی۔

اور کچھ دنوں بعد ماں جی نے میری دُکھتی ہوئی رگ

یاد

یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ
ناداں! پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا ——— میرؔ

مانوس ہو چلا تھا تسلّی سے حالِ دل
پھر تم نے یاد آ کے بدستور کر دیا ——— حسرتؔ موہانی

کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب
آج تم یاد بے حساب آئے ——— فیضؔ

اک ایک نفس میں روشنی ہے
یادوں کے چراغ جل رہے ہیں ——— شاعر لکھنوی

کچھ نقش تری یاد کے باقی ہیں ابھی تک
دل بے سر و ساماں سہی ویراں تو نہیں ہے ——— عقیم مرتضیٰ

مُرسلہ: سُلطان احمد ساحل ہرگانوی مشید پور

پھر پکڑ لی۔

"بہو! یہ روز بڑے بابو ایک ہی طرح کے پھول کیوں بھیجتے ہیں؟ بالکل سفید سفید، اُجلے اُجلے!" اور مجھے محسوس ہوا جیسے یکایک وقت کی نبض ڈوب گئی ہو، زمانہ چلتے چلتے رُک گیا ہو۔

"ہو گا ماں جی۔ پھول تو پھول ہیں۔ جیسے بھی ہوں۔" میں نے ماں کے جواب میں کہا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں جیسے یہ الفاظ میرے حلق میں پھنس گئے ہوں۔ جیسے دل کے نزدیک کوئی چیز دہک اُٹھی ہو اور اُس کی تپش سے میرا حلق سوکھ گیا ہو۔ ماں نے کچھ محسوس کر لیا شاید۔ کہنے لگیں۔

"تمھاری طبیعت تو اچھی ہے نا؟"

بہت مشکل سے زبان سے "ہاں" نکلا۔ میں فوراً اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی اور ماضی کی اُسی سرد راکھ میں کچھ تلاش کرنے لگی جو نہ جانے کب کی سرد ہو چکی ہے۔

اُف! وہ لمحہ، وہ دن، وہ واقعہ! ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ابھی ابھی گزرا ہو۔

رات ٹرین کے ڈبے میں میں بھی آہستہ آہستہ پاؤں پھیلا چکی تھی۔ پورے ڈبے پر سکوت چھا گیا تھا۔ کچھ لوگ سو گئے تھے کچھ اونگھ رہے تھے۔ میری سامنے والی سیٹ پر بیٹھا ہوا وہ بھی شاید تھک کر گھٹنے پر کتاب رکھ کر سونے لگا تھا۔ البتہ میری آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ کھڑکی سے سر چپکائے گھٹنوں تک چادر اوڑھ کر میں خدیجہ مستور کے ناول "آنگن" کے مطالعہ میں کھوئی ہوئی تھی کہ یکایک بجلی چلی گئی اور ڈبے میں یکلخت بہت سا اندھیرا اُبھر گیا۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین کے دوسرے ڈبے روشن ہو گئے۔ لیکن میرے ڈبے میں بجلی نہیں آئی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں سوئچ کو بہت اِدھر اُدھر کیا۔ لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر جب میں مایوس ہو کر بیٹھ گئی تو وہ ٹارچ جلا کر اِدھر اُدھر کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنی جد و جہد میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے اطمینان کی سانس لی اور اِس اطمینان دلانے والے کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھا۔

"اُجالا ہو گیا۔ آپ کے کسرے کے لئے دھنیہ واد!" میں نے آہستہ سے کہا تھا۔

"کوئی بات نہیں۔" اُس نے نہایت نرمی سے جواب دیا تھا۔ پھر ٹرین کے ساتھ ہماری باتوں کا سلسلہ بھی بڑھتا رہا۔

"کہاں جا رہی ہیں آپ؟"

"کان پور۔"

"اور آ رہی ہیں کہاں سے؟"

"دھنباد سے۔"

"کان پور میں کہاں رہتی ہیں؟"

"ارمان پور میں۔"

"گورنمنٹ کوارٹرس میں؟"

"جی ہاں۔"

"کس نمبر میں؟"

"آر۔ ۱۵۵۰۔"

"اوہ! وہ بازار والے چوراہے کے پاس؟"

"ہاں۔"

"مگر آپ... آپ کو کیسے معلوم؟" میں حیرت سے چونک پڑی تھی۔

"جانتا ہوں ـــــ یونہی۔"

"آخر؟"

"میں وہاں اکثر جاتا ہوں ـــــ میرے چاچو بھی وہیں رہتے ہیں۔" اس کے چہرے پر خوبصورت مسکراہٹ بکھر گئی۔

"کون سا نمبر ہے ان کا؟"

"بی-۳۵۵"

"وہ بالکل گیٹ کے پاس ہی والا۔ جس میں درّشہوار بابو رہتے ہیں؟"

"ہاں وہ میرے چاچا جی ہیں۔ لیکن ان کا نام آپ کو کیسے معلوم؟" اس بار اس کے چہرے پر حیرت تھی۔

"مجھے میرے چاچا جی نے بتایا تھا۔"

ٹرین منزل کی طرف بڑھتی رہی۔ ہوا کے جھونکے کچھ تیز ہو گئے تھے۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ پوری طور پر گرا دیا اور پھر ناول کے صفحات میں کھو گئی تھی۔ لیکن اب میرا ذہن کتاب پر نہ تھا۔ رہ رہ کر کوارٹر نمبر بی-۳۵۵ والی بات یاد آجاتی۔

"چاچا جی! آپ بھی ایک بی ٹائپ کوارٹر کیوں نہیں لے لیتے؟" اور جب انھوں نے پیار بھری نگاہوں سے گھور کر پوچھا تھا ـــــ "کیوں؟" تو میں نے جھینپتے جھینپتے کہا تھا ـــــ "وہ گیٹ کے سامنے بی ٹائپ کوارٹر ہے نا ـــــ وہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔"

چاچا جی دو منٹ تک چپ رہے۔ پھر بولے: "بیٹی! وہ درّشہوار صاحب کا کوارٹر ہے۔ وہ خوش نصیب ہیں اور میں مزدور۔ میرا ان کا کیا مقابلہ ـــــ اول تو ویسا کوارٹر ہی ملنا مشکل ہے اور اگر مل بھی جائے تو اس کا کرایہ ادا کرنا بہت مشکل ہے۔" چاچا جی کا لہجہ بالکل سرد پڑ گیا تھا اور میں اداس ہو گئی تھی۔

سڑک پار کر کے بالکل گیٹ کے سامنے ہی ہرے بھرے اشوک کے گھنے درختوں کے درمیان، بہت ساری بیلوں کی چادر اوڑھے اور سپید سپید، اُجلے اُجلے پھولوں کا ہار پہنے ہوئے

گل و بلبل

کیسے پیام دنا بانسری سے بلبل
گل نے پہچان لے گی گل تر کی صورت ـــــ حق

یہ گل کھلے ہیں کہ نغمہ بلبل کے ابھری ہیں
نہال جبکہ تھی بلبل ترے ترانے میں ـــــ [illegible]

یہ آمد تھی کہ گل کے ندبد کرتے
ہم اور بلبل ناشاد گفتگو کرتے ـــــ [illegible]

گریباں چاک گل ہے بوستاں میں
اثر کتنا ہے بلبل کی فغاں میں ـــــ [illegible]

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا ـــــ غالب

مرسلہ: [illegible]

ایسا معلوم ہوتا یہ کوارٹر ہر آنے والے کا خیر مقدم کر رہا ہو۔ میں تو جب بھی ادھر سے گزرتی اس کی خوبصورتی کو دیکھتی ہی رہ جاتی اور میرا جی چاہتا کہ یہ سارے پھول اپنے دامن میں بھر لے جاؤں!

"لیجیے آ گئے ہم لوگ؟"

اس نے آہستہ سے اٹھتے ہوئے کہا اور میں خیالات کی تہوں سے نکل آئی۔ ٹرین پلیٹ فارم پر پہنچ رہی تھی۔ ڈبے کے گرد لوگ امڈ پڑتے تھے۔ ابھی ٹرین رکی بھی نہ تھی کہ چڑھنے والے بیتاب ہو اٹھے تھے۔ اترنے چڑھنے والے ایک دوسرے پر گرنے لگے تھے۔ میں جھکی ہوئی اپنا ہولڈال سمیٹ رہی تھی اور وہ اوپر سے میرے سامان اتار رہا تھا۔ اتنے میں کسی نے زور کا دھکا دیا اٹیچی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر میرے شانے پر گر پڑی۔ میرے اور اس کے منہ سے ایک ساتھ ہی چیخ نکل پڑی۔ دوسرے ہی لمحہ میں تو شانہ پکڑ کر بیٹھ گئی اور وہ اس طرح مجھے دیکھنے لگا جیسے ابھی رو پڑے گا۔ میرے شانے پر ایک نیلگوں نشان بن گیا تھا۔ ایک خراش بھی ہو گئی تھی اور اس میں سے خون کے قطرے نمودار ہو گئے تھے۔

میرے شانے سے نیچے بہنے والے خون کے قطروں کو اُس نے اپنے رومال میں اس طرح جذب کر لیا جیسے وہ اُس کے لئے متاعِ گراں مایہ ہوں! اور پھر اُترتے وقت اُس نے آہستہ سے میرے شانے کو سہلا لیا اور دونوں ہی بار میرے اندر عجیب سی لہر دَوڑ گئی تھی۔

پلیٹ فارم سے باہر نکل کر اُس نے ٹیکسی بلائی اور میرا سامان بھی اُسی پر رکھتے ہوئے بولا ـــــ "چلئے تھوڑی دُور اور ساتھ ہی ـــــ کوئی حرج تو نہیں؟" ٹیکسی رینگ گئی اور میں اُس کی اِس ادا پر مُسکرا پڑی۔

"یہ اتفاق بھی عجیب سا رہا ـــــ میں شاید کبھی نہ بھول سکوں گا یہ بات!"

"جانے دیجئے ـــــ کوئی بات نہیں۔"

"ارے میری وجہ سے آپ کو کتنی تکلیف پہنچ گئی!"

میں نے محسوس کیا اُس کا گلا بالکل بھر گیا تھا۔ ٹیکسی اُس کے کوارٹر پہنچ کر رُک گئی۔ وہ بوجھل قدموں سے نیچے اُترا۔ اپنا سامان اُتار کر رکھا۔ ڈرائیور سے آہستہ سے کہا اور میرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دئے۔ جواب میں میں نے بھی ہاتھ جوڑ دئے۔ اِتنے میں اُس کے اندر جیسے بجلی سی کوند گئی ہو۔

"ارے میں نے نام تو پُوچھا ہی نہیں آپ کا؟"

"مجھے اُوشا کہتے ہیں!" میں مُسکرا پڑی۔

"اوہ! اور مجھے اومیش!"

میں ہنسی ضبط نہ کر سکی۔

'کتنا سیدھا، سادہ، شریف اور نیک ہے اومیش!'

'ایک چھوٹی سی بات نے کتنا متاثر کیا ہے اُسے!'

'کتنا بوجھل تھا اُس کا لہجہ!'

سوچتے سوچتے میں بھی کوارٹر پہنچ گئی اور ٹیکسی سے سامان اُتار کر جب کرایہ دینے لگی تو ڈرائیور نے بتایا کہ اُسے پُورا کرایہ مل چُکا ہے اور میں جیسے اومیش کے احسان کے بوجھ تلے دب کر رہ گئی تھی۔

اومیش مجھے اتفاقاً مل جاتا۔ فیکٹری گیٹ پر، سڑک پر، بازار میں، ہسپتال کے پاس، پوسٹ آفس میں۔ ہم ایک دُوسرے کو دیکھتے اور نگاہیں جُھک جاتیں اور مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے میں کسی جھیل میں ڈُوب گئی ہوں۔ گہری بہت گہری!

وقت گزرتا رہا ہم ایک دُوسرے کے نزدیک آتے گئے۔ آپ کی دیوار گری اور تم کی بنیاد پڑ گئی۔ پھر اِس بُنیاد پر ایک محل کھڑا ہونے لگا۔ حسین، خوش نما، رنگین۔ کیا ہو گیا تھا مجھے۔ آج سوچتی ہوں تو طبیعت عجیب سی ہو جاتی ہے۔ اومیش کے قریب جا کر، اُس کی میٹھی میٹھی باتوں کو سُن کر، عجیب عجیب شرارتوں کو دیکھ کر میں کہیں کھو سی جاتی ـــــ

اُف! وہ میری طرف دیکھنے کا انداز!

مدھم مدھم لہجہ میں چھیڑنے کا سلیقہ!

بیچ بیچ میں عجیب سی مُسکراہٹ کی ادا!

آہستہ آہستہ رگ و پے میں شرارے بھر دینے کا فن!

پُورے وجود کو جھنجھوڑ دینے کا شعور!

اور پھر بھرپور جادُو جگا دینے کے بعد جیسے کہیں

پاگل ہے کہ یہ کہنے والی بات —— اُوشا! سنبھلو، سنبھلو، ورنہ میں پاگل ہو جاؤں؟

اور وہ بات —— میں کتنی پگلی تھی واقعی۔ اُس دن میں اکیلے ہی شہر سے لوٹ رہی تھی کہ اومیش گیٹ کے پاس مل گیا۔ کہنے لگا چلو آج میرے ساتھ چلو، تمہیں اپنا کوارٹر دکھا دوں۔ اور میں اُس کے ساتھ ہو لی۔ اندر کوئی نہ تھا۔ اومیش مجھے بٹھا کر کسی کام سے باہر چلا گیا اور میں جلدی جلدی بیلے، چمیلی اور جوہی کے پھول چننے لگی۔ اتنے میں وہ آ گیا۔ آنچل پھولوں سے بھرے دیکھ کر شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا —— "اچھا۔ پھولوں کو بھی پھولوں کی رغبت!" اور میں شرما گئی۔

"اُوشا! کیا یہ پھول تمہیں بہت پسند ہیں؟" اومیش نے مجھے گدگدایا۔

"ہاں... کیونکہ تمہاری پسند..." میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ اُس نے پیار سے میرا ہاتھ چوم لیا اور میں شرما کے رہ گئی۔

اُس دن کے بعد سے اومیش جب بھی ملتا مجھے پھول ضرور پیش کرتا، پھولوں سے متعلق کوئی نہ کوئی بات ضرور کرتا —— وہ باتیں تھیں یا مچلتی ہوئی پانی کی لہریں! میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتی۔

"اُوشا! تم تو خود ایک پھول ہو۔ پاکیزہ، حسین، خوشنما!"

"... تم تو خود ایک کلی ہو۔ تر و تازہ، نرم و نازک، معصوم!"

"اُوشا! کیا تم میں کسی پھول سے کم خوشبو ہے —— دیکھو نہیں مت کہنا —— نہیں تو... نہیں تو!"

اور صبح و شام، دن رات یہی خواب دیکھتے دیکھتے میں اُس وقت چونک پڑی جب اومیش نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ یہ بتایا کہ "پاپا کا تبادلہ جبل پور ہو گیا ہے۔ ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔" اور مجھے محسوس ہوا جیسے کہیں کچھ اکھڑ رہا ہو، کچھ ٹوٹ رہا ہو، کچھ گر رہا ہو!

اومیش چلا گیا اور اپنے ساتھ میرے سارے خواب بھی سمیٹ لے گیا۔ پھر پندرہ دنوں کے بعد اُس کا ایک خط ملا لفظوں میں ڈوبا ہوا۔ جذبات سے لبریز ——

"اُوشا! کیسے کہوں کہ پاپا نے مجھے کتنی بڑی سزا دی ہے! کیسی زیادتی کی ہے! نہ جانے انہوں نے یہ سب کچھ کیسے کیا اور کب، یقین کرو، مجھے ذرا سی خبر نہ تھی۔ کل جب میری بارات جانے کا دن ہے تو مجھے آج شادی کی بات بتائی گئی ہے۔ اُوشا! مجھے معاف کر دو۔ میرا دل بے حد پریشان ہے، دماغ معطل ہے۔ میرے سامنے بے پناہ تاریکیاں ہیں۔ دُور، دُور تک مہیب اندھیرے ہیں اور اس اندھیرے میں میں اُس مسافر کی طرح حسرت و یاس کی تصویر بن کے رہ گیا ہوں جس کا منزل کے قریب پہنچ کر سب کچھ لُٹ گیا ہو!"

آنکھوں کے ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر پڑے۔ دل سے زہر سا گاڑھا سیاہ دھواں نکلا اور پورے وجود پر چھا کے رہ گیا۔ کہیں کچھ اچانک کسی چیز نے کروٹ بدلی۔ جیسے کہیں دھڑام کی آواز گونجی۔ میرے ہاتھ سے اومیش کا خط چھوٹ کر گر گیا اور چشم زدن میں خوابوں کا سارا محل زمیں بوس ہو گیا!

اکثر چپکے سے، تنہائی میں، دبے پاؤں میں یادوں کے سمندر میں پہنچ جاتی... نہ جانے کتنی دیر تک وہاں کھڑی [illegible] دیکھتی رہتی، سوچتی رہتی۔

"آخر یہ کیسا نشہ ہے، کیسا جذبہ ہے؟"

"انسان بچوں کی سی تمنا کر کے اپنے آپ کو فریب کیوں دیا کرتا ہے؟"

"ایسے خواب کیوں دیکھتا ہے جن کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی!"

"بے سوچے سمجھے دوسرے کو اپنی آرزوؤں کا مالک کیوں بنا دیتا ہے؟"

"اپنے ارمان کیوں سونپ دیتا ہے؟"

یہی سوچتے سوچتے میں اُس وقت ایک بار پھر چونک پڑی جب وقت کی پریوں نے نیا ناچ شروع کر دیا۔ میری زندگی سسندر کی امانت بنا دی گئی اور جس دن میں پی کے گھر جانے کے لئے بابل کی گلیوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی تو

میری نظر پھر اُسی کھنڈر پہ جا پڑی جس پر کبھی ایک عظیم الشان محل کھڑا تھا۔ لیکن اُس دن میں نے آنسو نہیں بہائے، ساری یادوں کو سمیٹ کر اُسی کھنڈر کے ویرانے میں اِس طرح دفن کر دیا کہ وہ کبھی نکل نہ سکیں!

اِن باتوں کو زمانہ گزر چکا ہے۔ میری اوما بارہ سال سے اُوپر کی ہو چکی ہے۔ اُسے دیکھنے کے بعد جب میں آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر خود کو دیکھتی ہوں تو مجھے اپنی صورت اجنبی سی معلوم ہوتی ہے۔ دہرہ دون سے تبادلے کے بعد جب شاہجہاں پور آئی تو کلاتھ سنٹر پر اوما کے لئے کپڑے خرید رہی تھی کہ اومیش مِل گیا۔ وہ اپنے لڑکے دنیش کے لئے کوئی کپڑا خریدنے آیا تھا۔ ہم مِلے لیکن ہر دل پہلے کے سے جذبات نہ جاگ سکے۔ مشکل سے دونوں جانب ہلکی سی مُسکراہٹ بکھر کر رہ گئی۔ اومیش نے بتایا کہ وہ یہاں کی آرڈیننس فیکٹری میں اسسٹنٹ فورمین ہے۔ پھر اُس نے سُندر کے بارے میں پُوچھا اور میں نے جھینپتے ہوئے کہا کہ وہ بھی اُسی میں فٹر ہے۔ کچھ اور رسمی باتوں کے بعد اومیش جیسے کہیں کھو گیا ہو۔ پھر آہستہ سے بولا ـــــ "میں نے اپنے کوارٹر میں بہت سارے پھُول لگا رکھے ہیں۔ ویسے ہی سفید سفید، اُجلے اُجلے، اُوشا!" اور میرے جی میں آیا کہہ دوں ـــــ اب مجھے اُن پھُولوں سے کوئی رغبت نہیں اومیش!، لیکن ہونٹ ہِل نہ سکے۔ میں زیرِ لب مُسکرا کر رہ گئی۔

اِسی طرح اومیش جب بھی مِلتا ہے اُسی گمبھیر سرد راکھ کو ٹٹولنے لگتا ہے اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی نہ جانے کیوں اپنے ماضی کی طرف لَوٹ جاتی ہوں۔

اومیش نے ہماری بڑی مدد کی ہے۔ اُس نے سُندر کا گریڈ بڑھوا دیا ہے، ہمارا کوارٹر بدلوا دیا ہے۔ ایک اچھے کوارٹر کا بندوبست کر دیا ہے۔ سُندر کی ڈیوٹی بھی تبدیل کرا دی ہے۔ ماں جی اور سُندر، اومیش کی اِن باتوں سے بہت متاثر ہیں۔ اُسے بڑے بابو کہہ کر بہت احترام سے اُس کا نام لیتے ہیں۔ اوما، دنیش سے بہت مُنہ لگی ہوئی ہے۔ دنیش اکثر سفید سفید، اُجلے اُجلے پھُول لاتا ہے اور وہ اُنھیں جھپٹ لیتی ہے۔ ماں جی دونوں کو ساتھ دیکھ کر خوش ہو جاتی ہیں۔ لیکن میں کانپ جاتی ہوں۔ اُس کا لہک لہک کر باتوں کا انداز مجھے ڈرا دیتا ہے۔ میں اوما کو کچھ اِشارہ کرنا چاہتی ہوں، کچھ بتانا چاہتی ہوں، سمجھانا چاہتی ہوں، جبھی ماں جی بول پڑتی ہیں ــــــ

"جانے بھی دو بہو! بچے ہیں۔ پیار کی باتوں کا بُرا نہیں مانتے۔"

اور میں سوچنے لگتی ہوں۔ پیار کتنا پاکیزہ جذبہ ہے، پیار دُنیا کی کتنی بڑی نعمت ہے، پیار انسان کی کتنی عظیم تمنا ہے، پیار انسان کو کیا نہیں دیتا؟ سکون و اطمینان، چین و آرام، مسرّت و شادمانی!

لیکن کیا ہر پیار کرنے والے کو خوشی ہی مِلتی ہے؟ آہستہ سے کہیں سے کوئی آواز اُبھرتی ہے اور میرے اندر ایک درد سا اُٹھنے لگتا ہے۔ پُورے وجود میں عجیب سی کسک، عجیب سی چُبھن محسوس کرنے لگتی ہوں۔ میری آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ اِک عُمر گزارنے کے بعد بھی میں ماضی کے کھنڈر میں کچھ ڈھونڈنے لگتی ہوں۔ پھر میرا جی چاہتا ہے کہ میں اوما کے ہاتھ سے سارے پھُول نوچ کر پھینک دوں اور اُس سے چیخ چیخ کر کہہ دوں ـــــ "ارے یہ پھُول نہیں ہیں، کانٹے ہیں۔ کانٹے چُبھ جائیں گے!!"

غزلیں

شفیع ہدایت قریشی (دتیاوی) ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ

میں، کہ دُنیا میں وفا ڈھونڈھ رہا تھا کل تک
آج یہ سوچ رہا ہوں، کہ میں کیا تھا کل تک

آج سے پہلے تو تم اتنے قریب آئے نہ تھے
کون تھا وہ جو تمہیں روک رہا تھا کل تک

مجھ سے یہ پوچھ رہی ہے، مری معصوم نظر
آج وہ کیسے صنم ہے جو خدا تھا کل تک

آج کیا بات ہے، آئینے کو وہ دیکھتے ہیں
اُن کا آئینہ، اُنہیں دیکھ رہا تھا کل تک

کس کو سمجھائے کوئی بزدلوں کی بستی میں یہ بات
آدمی کا بھی قد کتنا بڑا تھا کل تک

فرق اتنا ہے کہ بس، پینے کا انداز ہے اور
وہ بھی تو زہر تھا جو میں نے پیا تھا کل تک

حفیظ فضا

ہم سے وہ اتنی بیدلی سے ملے
اجنبی جیسے اجنبی سے ملے

رنگِ گل ہو کہ جلوۂ مہتاب
کب ترے رُخ کی دلکشی سے ملے

اب بھی ہوتا ہے درد سا دل میں
اِک زمانہ ہوا کسی سے ملے

نہ ملی پائلور کی لے میں بھی
وہ کھنک جو تری ہنسی سے ملے

بھیس بھر بھر کے تری اُلفت کا
سلسلے غم کے، زندگی سے ملے

دوست تو دوست دشمنوں سے بھی
جب ملے ہم تو کس خوشی سے ملے

جن کا درماں نہ ہو فضا کوئی
درد وہ ہم کو زندگی سے ملے

ظفر سنبھلی

جن کا دل پر بس نہ ہو وہ غم کے مارے کیا کریں
اس ضروری مسئلے پہ آپ بھی سوچا کریں

دوستوں ہی نے دیئے ہوں ہر قدم پر جب فریب
زندگی میں دُشمنوں سے ہم شکایت کیا کریں

اُس کا جسمِ ناز ہے یا کسی آذر کا خواب
جی میں آتا ہے اُسے بس رات دن دیکھا کریں

رشتۂ نازو نیازِ شوق، ٹوٹا ہے کبھی؟
ترکِ ربط و ضبط کا کتنا ہی ہم دعویٰ کریں

آپ ہی بتلایئے ہم آپ کو کیسے بھلائیں
آپ ہر ہر سانس میں جب یاد آیا کریں

اور بھی رنگیں نظر آئے گی تصویرِ شباب
آپ میرا نام لے کر آئینہ دیکھا کریں

مے سے غم ہوتا ہے ہلکا لوگ کہتے ہیں ظفرؔ
بات جھوٹی ہے مگر ہم بھی چلو ایسا کریں

ایک لاش۔ایک افواہ

فکر تونسوی

جب ادیب مرگیا ——۔

ادیب مرگیا۔ احباب نے جو قضا و قدر سے واقف مند تھے، خدا کی بارگاہ میں دو شکرانے ادا کئے۔ ایک یہ کہ شکر ہے اُس کی موت اچانک طریقے سے ہوئی۔ کسی دُوسرے طریقے سے ہوتی تو بے حد بورییت ہوتی —— اور دُوسرے یہ کہا گیا کہ ادیب مرگیا مگر شکر ہے، اُس کا ادب زندہ رہے گا!

ادیب جو زندہ تھا اُس پر کوئی تنازعہ نہ ہُوا۔ سبھی اُس پر متفق تھے کہ اُس کا ادب عظیم تھا۔ لیکن ادیب کی لاش جو زندہ نہ تھی، اُس پر شاید تنازعہ ہوگیا۔ مرنے کے بعد عام طور سے جائداد پر تنازعے پیدا کئے جاتے ہیں۔ لیکن عجیب بات تھی کہ لاش بذاتِ خود کوئی جائداد نہ تھی، ساری جائداد پیچھے چھوڑ کر مرگھٹ تک آئی تھی۔ تنازعہ ہوتے دیکھ کر ایک مسخرے کے مُنہ سے نکلا "یہ معلوم ہوتا ہے، ادیب کا صرف ادب ہی عظیم نہیں ہے، اُس کی لاش بھی عظیم ہے!"

ماتم گساروں نے اُس مسخرے کی طرف نفرت سے دیکھا۔
"چھی چھی! موت کے بعد جو بھی مذاق کیا جائے گا، وہ بھونڈا ہوگا۔"

دراصل تنازعہ پیدا نہ ہوتا اگر . . .

ادیب کی لاش اپنے ادب کی طرح تمکنت اور احترام کے ساتھ مرگھٹ پر لائی گئی۔ پھول، اگر بتیاں، گھی، لکڑیاں، پروہت ہر شے جو لاش کو باوقار بناتی تھی، انتہائی خاموشی کے ساتھ وجود میں آگئی تھی۔ کافور کی ایک سپید معطر ٹکیہ، آگ پیدا کرنے والی ماچس کے اتنے قریب رکھ دی گئی تھی کہ دونوں کو ایک دُوسرے کے سانسوں کی مہک محسوس ہو رہی تھی۔ عظیم رسوم ادا . . .

ے اُس زندہ ماحول میں ادیب کی لاش پر کبھی تنازعہ نہ ہوتا۔

اگر . . .

. . . اگر میں اُس نازک لمحے پر ادیب کا بیٹا موجود نہ ہوتا۔

ادیب بے حد لاآبالی تھا۔ اُس نے جب قلم اُٹھایا تھا تو اُسے یقین نہ تھا کہ اُسے کوئی بھی سماجی مرتبہ ملے گا۔ کیونکہ وہ ہندوستانی ادیب تھا اور اُن دنوں عام رواج تھا کہ سماجی مرتبہ صرف کسی ہلدی کے سوداگر کو ملتا! ادیب کو صرف داد و تحسین ملتی ہے اور داد و تحسین کسی بنک میں بھنائی نہیں جا سکتی۔ پُوری غزل کی تخلیق سے ہلدی کی ایک گانٹھ بھی نہیں اُگ سکتی۔

اور سماجی مرتبے کے ساتھ یہی بدسلوکی تھی، جس پر ادیب کے قلم میں طیش بھر گیا۔ طیش کا یہ شعلہ بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ اُس سے ہلدی کے سوداگروں کو بھی سینک آنے لگی —— اُس سینک کو ادب عالیہ سے تعبیر کیا گیا اور چند ہی برسوں میں ادیب کی شہرت، عظمت میں بدل گئی۔ عظمت دَولت میں بدلنے لگی۔ اُس کی تحریریں عوام و خواص دونوں میں پریشانی کی حد تک مقبول ہوگئیں اور وہ ۔۔۔ کے خالق اور محافظ جو ہلدی کے سوداگروں کی نسل سے تھے اور کتابوں کے پبلشر کہلاتے تھے، ادیب کو سماجی مرتبہ عطا کرنے پر مجبور ہوگئے۔ کیونکہ ادیب کا ہر لفظ شعلے اُگلتا تھا اور ہر شعلہ بنک میں جا کر کیش ہوجاتا تھا اور جب ادب کے جُگنو برسانے لگے تو ہلدی کے سوداگر ادیب پر ہلدی کی گانٹھوں کی بارش کر دیتے تھے!

ادیب نے ہندوستانی ادب کی روایت توڑ دی تھی اور ہلدی کی گانٹھوں سے سجدے کرائے تھے۔

لیکن پھر نہ جانے کیا ہُوا؟ ـــــ روایت توڑنے کی بے پناہ سسرت نے اُس کے نرم و لچکیلے اعصاب پر حملہ کیا یا دب کو سماجی مرتبے میں ڈھلتے دیکھ کر اُسے اپنی عظمت کا صدمہ ہُوا کہ عین اُس لمحہ عروج پر جب دوست و دُشمن بیک زبان اُس کی عظمت کا اعتراف کر رہے تھے اور یہ اعتراف دانتوں میں اُنگلیاں دبائے کر رہے تھے ـــــ ادیب اچانک لاش بن کر مرگھٹ میں پہنچ گیا اور ہلدی کی ساری گانٹھیں پیچھے چھوڑ گیا۔

ایک اندازہ کے مطابق اُس کی ادبی جائداد اتنی معقول تھی کہ کوئی بھی ہلدی کا سوداگر اُس پر رال ٹپکا سکتا تھا۔

اور ماتم گُساروں نے دیکھا کہ ادیب کی لاش پر گھرے

- جو اپنی ضرورتیں بڑھا لیتا ہے اُسے اکثر محرومی کا غم رہتا ہے۔ (حضرت علی کرم اللّٰہ وجہہٗ)
- نفس کو مارو تاکہ دل زندہ ہو۔ (حضرت احمد خضرویہؒ)
- جو زبان کو قابو میں رکھے گا وہ پشیمان نہ ہوگا۔ (حضرت امام جعفر صادقؒ)
- جھوٹ ساری بُرائیوں کی جڑ اور سچ ساری بُرائیوں کا علاج ہے۔ (حضرت مولانا رومیؒ)
- اگر دُنیا کی طلب میں نیت بخیر ہے تو یہ طلب دین کے منافی نہیں۔ (حضرت شیخ نصیر الدین محمودؒ)

لے کر مرگھٹ تک ایک موٹا تازہ ماتم گُسار (مونچھوں پر تاؤ دیتا ہُوا) مُسلسل رال ٹپکاتا آرہا ہے! ریشمی کفن، خوبصورت ارتھی، سُریلی ماتمی دُھن، اگر بتیاں، گھی، پروہت، لکڑیاں، کافور اور ماچس ـــــ ہر شے میں جو ترک و احتشام پیدا ہُوا تھا وہ اُسی رال ٹپکانے والے ماتم گُسار کے دستِ شفقت کا نتیجہ تھا۔ سب کا متفقہ فیصلہ تھا کہ یہی ماتم گُسار ہی ادیب کی لاش کا جائز وارث ہے اور یہی لاش کو آگ لگانے کا مستحق ہے۔

وہ ماتم گُسار ایک پبلشر تھا۔ ادبی تخلیقات کو ہلدی کی گانٹھیں سمجھ کر بیچنے والا ایک سوداگر ـــــ ادبی سوداگر!

اور ادبی سوداگر جونہی کافور کی سفید ٹکیہ ہاتھ میں لئے احتراماً کانپ رہا تھا اور قریب تھا کہ وہ ماچس سے شعلے کو علیحدہ کرے۔ اچانک کسی مسخرے نے سرگوشی میں کہا: "ادیب کا بیٹا آگیا ہے!" کافور کی ٹکیہ سوداگر کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی۔

لاش کا وارث کون؟ ـــــ •

اور اُس مرحلے پر لاش کے لئے تنازعہ شروع ہوگیا۔

عظیم سماجی روایت کا سوال سب کے ذہنوں میں کچھ اس طرح کُلبلانے لگا کہ ادیب کی لاش کو آگ دکھانے کا مستحق کون ہے؟ بیٹا یا پبلشر، لہو یا ہلدی کی گانٹھ؟

"مگر تم اُس کے بیٹے نہیں ہو؟" پبلشر نے کہا۔

"میں ہی اُس کا بیٹا ہوں! میری رگوں میں اب بھی اُسی کا لہو رواں ہے!" لڑکے نے روتے ہوئے گلے سے کہا۔

"لیکن میرے پاس وہ قانونی دستاویز موجود ہے، جس کی رُو سے ادیب نے تمہاری ماں کو طلاق دے دیا تھا!" پبلشر اُود بلاؤ کی طرح گردن اکڑا کر دُوسرے ماتم گُساروں کی طرف دیکھا۔ جن میں ادیب تھے۔ شاعر تھے، اداکار تھے اور پینٹر تھے۔

سبھی ماتم گُساروں نے پبلشر کی ہاں سے ہاں ملائی: "فرمایا، بجا فرمایا!"

ادبی سوداگر کی گردن ہاتھی کی طرح موٹی تھی اور ادیب کے لڑکے کے ہاتھ نرم تھے اور چھوٹے تھے۔ وہ ہاتھی کو گرفت میں لینے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے، جن میں جذبوں کی تھرتھراہٹ تھی۔ جذبے، اُس کی طاقت و استطاعت تھے۔ اُس نے اپنے باپ کی لاش کے اِرد گِرد کھڑے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کی طرف لرزتے آنسوؤں سے دیکھا۔ یہ فنکار انسانی جذبوں کے عکاس کہلاتے تھے۔ لڑکے کے آنسو دیکھ کر اُنھوں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ ایک افسانہ نگار جو مرحوم ادیب کی شہرت اور عظمت سے نالاں تھا، نیم باز آنکھوں سے بولا۔

"عزیز! آج کل تمہاری ماں کہاں رہتی ہے؟"

"اپنے نئے عاشق کے ساتھ!" دُوسرے افسانہ نگار نے افسانے کو آگے بڑھایا۔

اس پر پبلشر کے ہونٹوں پر ایک استہزائیہ قہقہہ اُبھرا جسے دو تین ادیبوں نے چور نگاہوں سے دیکھ لیا۔ پبلشر کے استہزائیہ قہقہے کے ساتھ اُن سبھوں نے بھی اپنا قہقہہ بلا نا موزوں سمجھا۔ کیونکہ پبلشر ابھی زندہ تھا اور اُس کی گردن موٹی تھی اور وہ ادیبوں کو شہرت اور دولت اور نقصے عطا کرنے کی قدرت رکھتا تھا۔

بہت سے استہزائیہ قہقہے، ماتمی فضا کی سرحدوں کو خاموشی سے چیرتے ہوئے ادا ہو گئے۔ پبلشر نے کہا: بیٹا تمھارا اور تمھاری ماں کا سوشل رشتہ تو ادیب سے دس سال پہلے ٹوٹ چکا تھا۔ جب ادیب سے تمھاری ماں نے طلاق حاصل کر لی تھی۔"

"طلاق دونوں کی مرضی سے ہوا تھا۔" ادیب کے لڑکے نے پبلشر کی غلط بیانی کی تردید کر دی اور کہا: ماں نے دوسری شادی بھی ڈیڈی کی خواہش سے کی تھی۔ لیکن ان سارے حادثوں میں میری خواہش بالکل شامل نہ تھی۔ کیونکہ میں نے کبھی اپنے آپ کو یتیم نہیں مانا تھا۔ میری ماں کا بطن بھی زندہ تھا، جس نے مجھے جنم دیا تھا اور میرا باپ بھی زندہ تھا، جنھوں نے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ میں اُن کے جگر کا ٹکڑا نہیں ہوں۔ اس لئے جونہی میں نے ڈیڈی کی موت کی دردناک خبر سنی، میرے دل میں ہوک اُٹھی اور میں ڈیڑھ سو میل کا سفر طے کر کے . . ."

یہ کہہ کر ادیب کا بیٹا سسکیاں بھرنے لگا اور موٹے موٹے چمکیلے، شفاف اور مضطرب آنسو اُس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔ چند آنسو لاش پر بھی جا گرے۔ جنھیں پبلشر نے آگے بڑھ کر اپنے ریشمی رومال سے پونچھ دیا۔

لڑکے کے قدرے طویل جذبات انگیز بیان نے ماحول میں سناٹا پیدا کر دیا۔ قریب کے پیڑ سے چڑیا کا ایک ننھا سا بچہ اپنی ماں کے پروں تلے سمٹ گیا۔ ایک بوڑھے پینٹر نے جو اہلِ دُنیا کی شقاوت اتنی زیادہ دیکھ چکا تھا کہ اب کسی بات پر احتجاج کرنا تضیعِ اوقات سمجھتا تھا، ادیب کے بیٹے کے آنسوؤں کی تاب نہ لا سکا اور بول اُٹھا۔

" قانونی طور پر وہ آج بھی ادیب کا بیٹا ہے۔ لاش کو آگ لگانے کا حق صرف اُسے ہے!"

پبلشر لرز اُٹھا۔ ادیب کی کتابوں کی سالانہ آمدنی ہزاروں روپوں تک پہنچی تھی۔ کیا قانون کا ہاتھ اُن تمام روپوں کو اِس لونڈے کے ہاتھ میں منتقل کر دے گا؟ یہ کیسا قانون ہے؟ نہیں نہیں! میں ادبِ عالیہ سے یہ ناانصافی کبھی نہ ہونے دوں گا!

اُس نے اپنی لرزش کو اپنے آپ تک محدود رکھتے ہوئے حاضرین سے خطاب کیا ———

"صاحبان! انصاف آپ کے ہاتھ میں ہے! ایک طرف ادبِ عالیہ ہے، مرحوم ادیب کے عظیم خیالات ہیں۔ جنھیں صرف

• ——— ••• ——— • ——— •• ——— •

- سُورگ اور پرتھوی ہمارے ہی اندر ہے۔ ہم پرتھوی سے متعارف ہیں، لیکن اپنے اندر کے سُورگ سے قطعی ناواقف ہیں۔ (مہاتما گاندھی)
- بے شمار لوگ خود اعتمادی کی کمی کے باعث اپنی زندگیاں برباد کر لیتے ہیں۔ (ڈاکٹر مارڈن)
- غُربت بے وقار گناہ ہے! جو اسے دُور کرنے کے لئے جدوجہد کرتا ہے وہ مجاہد ہے۔ (ڈاکٹر نپولین ہل)
- جن لوگوں کی قوتِ ارادی مضبوط ہے اُنھیں خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔ (نیمی حسن)

• ——— ••• ——— • ——— •• ——— •

میں ہی ادیب کی کتابیں شائع کر کے بنی نوعِ انسان تک پہنچا سکتا ہوں اور دوسری طرف قانون ہے۔ اندھا اور گونگا اور بہرہ قانون! جسے ادب کے مستقبل سے کوئی دلچسپی نہیں۔ جیتے جی میں پرن کیا تھا کہ اے میرے پیارے عظیم ادیب! میں تجھے اپنے ہی ہاتھوں سے مقدس اگنی کے حوالے کروں گا لیکن اب . . . اب . . . میرا دل ٹوٹ جائے گا، میرا دل . . ."

یہ کہہ کر پبلشر رونے لگا۔ اُس کے آنسوؤں میں گلیسرین ہو گی۔ اِس کے متعلق کوئی ادیب یقین سے کہنا مناسب نہ سمجھتا تھا۔

"میں کہتا ہوں۔ عظیم ادیب نے اپنی پُرانی بیوی اور بیٹے

لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا؟ ــــــ روایت توڑنے کی بے پناہ مسرت، اُس کے نرم و لچکیلے اعصاب پر حملہ کیا یا ادب کو سماجی مرتبے میں ڈھلتے دیکھ کر اُسے اپنی عظمت کا صدمہ ہوا کہ عین اُس کے عروج پر جب دوست و دشمن بیک زبان اُس کی عظمت کا اعتراف کر رہے تھے اور یہ اعتراف دانتوں میں انگلیاں دبائے کر رہے تھے ــــــ ادیب اچانک لاش بن کر مرگھٹ میں پہنچ گیا اور ہلدی کی ساری گانٹھیں پیچھے چھوڑ گیا۔

ایک اندازے کے مطابق اُس کی ادبی جائداد اتنی معقول تھی کہ کوئی بھی ہلدی کا سوداگر اُس پر رال ٹپکا سکتا تھا۔

اور ماتم گساروں نے دیکھا کہ ادیب کی لاش پر گھرے

• ~~~ ••• ~~~ • ~~~ ••• ~~~ •

- جو اپنی ضرورتیں بڑھا لیتا ہے اُسے اکثر محرومی کا غم رہتا ہے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ)
- نفس کو مارو تاکہ دل زندہ ہو۔ (حضرت احمد خضرویہؒ)
- جو زبان کو قابو میں رکھے گا وہ پشیمان نہ ہوگا۔ (حضرت امام جعفر صادقؒ)
- جھوٹ ساری بُرائیوں کی جڑ اور سچ ساری بُرائیوں کا علاج ہے۔ (حضرت مولانا رومیؒ)
- اگر دُنیا کی طلب میں نیّت بخیر ہے تو یہ طلب دین کے منافی نہیں۔ (حضرت شیخ نصیر الدین محمودؒ)

• ~~~ ••• ~~~ • ~~~ ••• ~~~ •

لے کر مرگھٹ تک ایک موٹا تازہ ماتم گسار (مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا) مُسلسل رال ٹپکاتا آ رہا ہے! ریشمی کفن، خوبصورت ارتھی، سُریلی ماتمی دُھن، اگر بتیاں، گھی، پروہت، لکڑیاں، کافور اور ماچس ــــــ ہر شے میں جو تزک و احتشام پیدا ہوا تھا وہ اُسی رال ٹپکانے والے ماتم گسار کے دستِ شفقت کا نتیجہ تھا۔ سب کا متفقہ فیصلہ تھا کہ یہی ماتم گسار ہی ادیب کی لاش کا جائز وارث ہے اور یہی لاش کو آگ لگانے کا مستحق ہے۔

وہ ماتم گسار ایک پبلشر تھا۔ ادبی تخلیقات کو ہلدی کی گانٹھیں سمجھ کر بیچنے والا ایک سوداگر ــــــ ادبی سوداگر!

اور ادبی سوداگر جونہی کافور کی سفید ٹکیہ ہاتھ میں لئے احتراماً کانپ رہا تھا اور قریب تھا کہ وہ ماچس سے شعلہ [illegible] کرے۔ اچانک کسی سنگھرنے سرگوشی میں کہا: "ادیب کا [illegible] ہے!" کافور کی ٹکیہ سوداگر کے ہاتھ سے چھوٹ کر [illegible]

لاش کا وارث کون؟ ــــــ •

اور اُسی مرحلے پر لاش کے لئے تنازعہ شروع ہو گیا۔

عظیم ... وراثت کا سوال سب کے ذہنوں میں کیڑے کی طرح کلبلانے لگا کہ ادیب کی لاش کو آگ دکھانے کا مستحق کون ہے؟ بیٹا یا پبلشر، یعنی ہلدی کی گانٹھیں؟

"مگر تم اُس کے بیٹے نہیں ہو؟" پبلشر نے کہا۔

"میں ہی اُس کا بیٹا ہوں! میری رگوں میں اب بھی ادیب کا لہو ... وراثت!" لڑکے نے رُکتے ہوئے گلے سے کہا۔

"لیکن میرے پاس وہ قانونی دستاویز موجود ہے، جس کی رُو سے ادیب نے تمہاری ماں کو طلاق دے دیا تھا۔" پبلشر نے اُود بلاؤ کی طرح گردن اکڑا کر ... ماتم گسار ... کی طرف دیکھا۔ جن میں ادیب تھے، شاعر تھے، ... تھے ... تھے سبھی ماتم گساروں نے ... کی ... فرمایا، بجا فرمایا!"

ادبی سوداگر کی گردن ہاتھی کی طرح موٹی ... لڑکے کے ہاتھ نرم تھے اور چھوٹے تھے۔ وہ ہاتھی کو ... لینے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ ... میں آنسو آ گئے تھے، جن میں جذبوں کی تھرتھراہٹ ... جذبے، اُس کی طاقت و استطاعت تھے۔ ... لاش کے ارد گرد کھڑے ہوئے ادیبوں اور ... لرزتے آنسوؤں سے دیکھا ... کہلاتے تھے۔ لڑکے کے آنسو ... کرلیں۔ ایک افسانہ نگار ... نالاں تھا ...

[illegible]

... افسانے کو ... بڑھایا۔

اس پر پبلشر کے ہونٹوں پر ایک استہزائیہ قہقہہ ابھرا جسے ادیب اور بیٹے نے چور نگاہوں سے دیکھ لیا۔ پبلشر کے استہزائیہ قہقہے کے ساتھ ان سبھوں نے بھی اپنا قہقہہ ملانا موزوں سمجھا کیونکہ پبلشر ابھی زندہ تھا اور اس کی گردن موٹی تھی اور وہ ادیبوں کو شہرت اور دولت اور لے مٹا کرنے کی طاقت رکھتا تھا۔

بہت سے استہزائیہ قہقہے، ماتمی فضا کی سرحدوں کو خاموشی سے چیرتے ہوئے ادا ہو گئے۔ پبلشر نے کہا: بیٹا! تمہارا اور تمہاری ماں کا سوشل رشتہ تو ادیب سے دس سال پہلے ٹوٹ چکا تھا۔ ادیب سے تمہاری ماں نے طلاق حاصل کر لی تھی۔"

"طلاق دونوں کی مرضی سے ہوا تھا" ادیب کے لڑکے نے پبلشر کی غلط بیانی کی تردید کر دی اور کہا: "ماں نے دوسری شادی بھی ڈیڈی کی خواہش سے کی تھی۔ لیکن ان سارے حادثوں میں میری خواہش بالکل شامل نہ تھی۔ کیونکہ میں نے کبھی اپنے آپ کو یتیم نہیں مانا تھا۔ میری ماں کا بطن بھی زندہ تھا جس نے مجھے جنم دیا تھا اور میرا باپ بھی زندہ تھا، جنھوں نے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ میں ان کے جگر کا ٹکڑا نہیں ہوں۔ اس لئے جونہی میں نے ڈیڈی کی موت کی دردناک خبر سنی میرے دل میں ہوک اٹھی اور میں اڑھائی سو میل کا سفر طے کر کے۔۔۔"

یہ کہہ کر ادیب کا بیٹا سسکیاں بھرنے لگا اور موٹے موٹے چپکیلے شفاف اور مضطرب آنسو اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔ چند آنسو لاش پر بھی جا گرے جنھیں پبلشر نے آگے بڑھ کر اپنے ریشمی رومال سے پونچھ دیا۔

لڑکے کے قدرے طویل جذبات انگیز بیان نے ماحول میں [illegible] پیدا کر دیا۔ قریب کے پیڑ سے چڑیا کا ایک ننھا سا بچہ اپنی [illegible] پروں سمیٹے سہم گیا۔ ایک بوڑھے پیڑ نے جو اس دنیا کی [illegible] زیادہ دیکھ چکا تھا کہ اب کسی بات پر [illegible] کرنا [illegible] سمجھتا تھا۔ ادیب کے بیٹے کے آنسوؤں [illegible]

[illegible]

[illegible] ادیب کا [illegible] لاش کو [illegible]

[illegible]

قانون بڑا کہ عشق

پبلشر نے زندگی بھر ادیب کی کتابوں کی سالانہ رائلٹی ہزاروں روپوں تک پہنچی تھی۔ کیا قانون کا ہاتھ ان تمام روپیوں کو اس [illegible] کے ہاتھ میں منتقل کر دے گا؟ یہ کیسا قانون ہے؟ نہیں نہیں [illegible] ادب عالیہ سے یہ ناانصافی کبھی نہ ہونے دوں گا! اس نے اپنی لرزش کو اپنے آپ تک محدود رکھتے ہوئے حاضرین سے خطاب کیا —

"صاحبان! انصاف آپ کے ہاتھ میں ہے! ایک طرف ادب عالیہ ہے، مرحوم ادیب کے عظیم خیالات ہیں، جنھیں صرف

- شورگ اور پرتھوی ہمارے ہی اندر ہے۔ ہم پرتھوی سے متعارف ہیں، لیکن اپنے اندر کے شورگ سے نا واقف ہیں۔ (مہاتما گاندھی)
- بے شمار لوگ خود اعتمادی کی کمی کے باعث اپنی زندگیاں برباد کر لیتے ہیں۔ (ڈاکٹر مارگن)
- غربت سب سے بڑا گناہ ہے! جو اسے دور کرنے کے لئے جدوجہد کرتا ہے وہ مجاہد ہے۔ (ڈاکٹر نپولین ہل)
- جن لوگوں کی قوت ارادی مضبوط ہے انھیں خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ (یمین حسن)

میں ہی ادیب کی کتابیں شائع کر کے ہی انسانوں تک پہنچا سکتا ہوں اور دوسری طرف قانون ہے۔ اندھا اور گونگا اور بے حس قانون! جسے ادیب کے مستقبل سے کوئی دلچسپی نہیں۔ [illegible] دل میں پرن کیا تھا کہ اے میرے پیارے عظیم ادیب! میں تجھے اپنے ہی ہاتھوں سے مقدس آگ کے حوالے کروں گا لیکن اب۔۔۔

اب۔۔۔ میرا دل ٹوٹ جائے گا، میرا دل۔۔۔"

یہ کہہ کر پبلشر رونے لگا۔ اس کے آنسوؤں میں گلیسرین ہوگی، اس سے متعلق کوئی ادیب بیٹے سے کہنا مناسب نہ سمجھتا تھا۔

"[illegible] عظیم ادیب نے اپنی پرانی بیوی اور بیٹے

سے تعلق کا قطعی اعلان کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ اپنے ناول "کون تیرا، کون میرا" کا مرکزی خیال بھی یہی تھا۔"

سبھی ادبی بُت تراشوں نے دل ہی دل میں داد کی تالی بجائی اور ادیب کے بیٹے کی طرف ملامت آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ ادیب کے بیٹے کے مُنہ سے ایک ٹھنڈی آہ نکلی جو ادیب کے کفن کو مرتعش کرتی چلی گئی۔

ادیب کے بیٹے نے بھی اپنے ڈیڈی کا وہ ناول پڑھا تھا۔ اُس کے سبھی ناول پڑھے تھے۔ سبھی تخلیقات! ادیب نے انسانی خیالات کی دُنیا میں ایک نیا تہلکہ مچا دیا تھا۔ اُس نے دُنیا والوں کو ایک نئے نقطۂ نگاہ سے بے چین کر دیا تھا۔ اُس کی ہر تخلیق اِس اچھوتے نقطۂ نگاہ کے گرد گھومتی تھی کہ اِس دُنیا کا ہر انسان اپنی تکمیل کی تمنا میں سرگرداں ہے۔ ایک انسان کے سبھی جذبے دوسرے انسان کے جذبوں سے وصال کی آرزو میں تڑپ رہے ہیں۔ ہر انسان دوسرے انسانوں سے اُن کے جذبوں کی بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ لیکن بھیک کی جھولی بھر کر بھی اپنی تکمیل نہیں کر پاتا۔ ہزاروں مختلف جذبے مِل کر بھی ایک انسان کو اکملیت عطا نہیں کرتے اور ہر انسان اِس شدید احساس کے باعث تڑپتا پھرتا ہے۔ روتا پھرتا ہے، دُوسروں کی تلاش میں وہ خود بھی بھٹک گیا ہے۔

یہ ایک عظیم اور اچھوتا تخیّل تھا۔ ادیب کا بیٹا اِسے جانتا تھا اور اُسے فخر تھا کہ وہ اُس لہو کی بوند سے تخلیق کیا گیا ہے، جس نے دُنیا کو ایک عظیم تصوّر سے کپکپا دیا تھا۔ اِسی لئے وہ بھاگا بھاگا شمشان پہنچ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے عظیم باپ کو اپنے ہی ہاتھ سے اگنی کے سپرد کر کے اپنی تکمیل کر لے۔

اور ادیب کا بیٹا اپنے آنسوؤں کی دُھند میں جذبوں کی قندیل روشن کئے سوچ رہا تھا ـــــ میرے ڈیڈی کی رُوح بھی تو مضطرب تھی۔ وہ بھی تو اپنی تکمیل کے لئے بھٹکتی پھرتی تھی۔ اُس نے میری ممّی سے رِشتہ قائم کیا۔ لیکن اُس کی تکمیل نہ ہو سکی۔ اُس نے ایک موسیقار لڑکی سے پیار کیا۔ لیکن اضطراب دُور نہ ہو سکا تو وہ پاگل ہو گئی! اور پھر ایک اور کا فرادا اُس عظیم ادیب کی تکمیل کے لئے بارگاہِ ادب میں داخل ہوئی۔ لیکن وہ بھی بیوہ ہو گئی اور آخر ادیب اپنی تکمیل کی لافانی آرزو لئے ہوئے عالمِ جاودانی کی طرف پرواز کر گیا۔

اور اب اُس کی لاش باقی رہ گئی تھی یا وہ ادبی شہپارے جنھیں ہلدی کی بوریوں کی طرح فروخت کر کے پبلشر اپنی تکمیل کرنا چاہتا تھا اور اِس کے لئے ضروری تھا کہ لاش کا وہی حقیقی وارث بن جائے۔

جذبوں کی شکست ــــــ •

بیس سال کے نوجوان لڑکے کا دل بار بار بھر آتا تھا۔ اب تو الفاظ بھی اُس کے مُنہ سے نکلنا بند ہو گئے تھے۔ جذبات کے دھندلے غبار نے الفاظ کو نِگل لیا تھا۔ اُس نے آخری بار ماتم گُسار مجمع پر نظر ڈالی کہ شاید اُن میں سے کوئی میرے اُن فطری جذبوں کو موتی سمجھ کر چُن لے جو ایک بیٹے کے دل میں باپ کے لئے اُٹھتے ہیں۔

لیکن ماتم گُسار جذبوں کے غمّاز نہ تھے۔ اُنھوں نے بیٹے کی نِگاہ سے آنکھیں پھیر لیں۔ کیونکہ وہ ادیب نہ تھے، طوطے تھے۔ وہ صرف لفاظ تھے، لفظوں سے کھیلتے تھے اور اُنھیں کیش کراتے تھے۔ لطیف اور پوتّر جذبوں سے اُنھیں ایک ایسے چیک کا خیال آتا تھا جو "ڈِس آنر" ہو جاتا ہے۔

ادیب کے بیٹے کو طوطوں کی آنکھیں دیکھ کر اپنی شدید بے بسی کا احساس ہُوا۔ اُسے پہلی بار یقین آیا کہ وہ یتیم ہو چکا ہے۔ وہ اِس وسیع دُنیا میں جو گلیسرین کے آنسو والے ماتم گساروں سے بھری پڑی ہے، تنہا ہو چکا ہے!

بے بسی کی رُلاتی ہوئی منزل پر کھڑے ہو کر اُس نے ایک آخری تیر پھینکا ـــــ "مجھے چِتا میں آگ لگانے کی اجازت دے دی جائے تو میں ڈیڈی کی ساری جائداد، ساری رائلٹی، سارے حقوق سے دستبردار ہونے کو تیار ہوں!"

سبھوں نے پبلشر کی طرف دیکھا۔ آفر (Offer) بڑی لذیذ تھی اور پُر وقار تھی۔ اُس میں ہلدی کی خوشبو صاف محسوس ہو رہی تھی۔

پبلشر جیسے بیواؤں کی طرح سینہ پیٹنے لگا اور ایسی

بچے بھول جیسے اُس کا سہاگ لٹ گیا ہو۔۔۔۔ کیا آپ لوگ مجھے بیا کا دست قبول کرتے ہیں۔ مجھے راستی کا قطعی دعویٰ نہیں۔ میں ادیب کا گہرا دوست تھا۔ آپ سب جانتے ہیں کہ ہمارا رشتہ پبلشر اور رائٹر کا رشتہ نہ تھا بلکہ آنکھ اور آنسو کا رشتہ تھا!"

"میں جانتا ہوں": ایک افسانہ نگار نے جلدی کا وزن بڑھایا۔ "آنکھ آپ کی ہوتی تھی تو آنسو ادیب کا بہتا تھا!"

مجمع نے تالیاں بجائیں۔ ادیب کا بیٹا سہم گیا۔

"میں ادیب کے بیٹے سے پوچھتا ہوں، کیا آپ کے ڈیڈی سے ان کا کوئی ایسا رشتہ تھا؟" پبلشر نے فضا میں بڑا نازک سوال اچھالا: "اگر چتا کو کسی اور نے آگ دکھائی تو میری گزشتہ پندرہ برس کی دوستی ایک آنسو بن کر میری آنکھ سے ٹپک پڑے گی۔ کیا آپ اسے پسند کریں گے؟"

"ہرگز نہیں، ہرگز نہیں!"

ادیب کے بیٹے نے دیکھا کہ میرا کیس طفلانہ حد تک جذباتی تھا۔ اُس نے زندگی کا ایک آخری دردناک فیصلہ کیا۔ باپ کی لاولد لاش پر حسرت سے نگاہ ڈالی اور سر جھکائے آہستہ آہستہ شمشان گھاٹ کے مین گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔

سب نے شکر کا سانس لیا۔

کسی نے ایک ٹوٹتے ہوئے دل کی آواز سُنی۔

جذبے شکست کھا کر شمشان سے بھاگ گئے۔

مبارک سلامت کی صداؤں کے درمیان منتر پڑھے گئے اور پبلشر نے بڑے فخر کے ساتھ، ایک فاتح کی طرح ادیب کی لاش کو آگ دکھا دی۔ شعلے اُٹھے اور اُن شعلوں میں سے بدی کی خوشبو اُٹھنے لگی۔ جسے سارے ماتم گُسار عود و عنبر کی خوشبو سمجھ کر اپنا اپنا مشامِ جاں تازہ کرنے لگے۔

آخری افواہ

ایک ہفتے بعد شہر کے اخباروں میں ادیب کی وصیت دھڑلے سے شائع ہو گئی۔ جس میں اُس نے اپنی ساری جائداد کا وارث اپنے بیٹے کو قرار دیا تھا!!

... دن دنیا کے بعد

مشکلات اور جدوجہد کی دنیا میں قدم رکھنا ہی ہوگا

بچے ہمیشہ اپنے کھلونوں سے ہی خوش رہتے ہیں اور فکر سے بے نیاز۔ لیکن جونہی وہ بڑے ہونگے، انہیں مشکلات بھری دنیا کا سامنا کرنا ہوگا اور پھر انہیں اس امر کا احساس ہوگا کہ ہنر اور قابلیت کے بغیر روزی پیدا کرنا آسان نہیں۔

کیا ماں باپ ہونے کی حیثیت سے آپ اپنے بچوں کی تعلیم پر کافی توجہ دے رہے ہیں؟
کیا اس ذمہ داری کو آپ کسی دوسرے کے سپرد کرسکتے ہیں؟ — نہیں۔ تو پھر آج ہی سے ایسا اثاثہ جمع کرنے کے لئے

ایل۔آئی۔سی کی تعلیمی اینویٹی پالیسی

(EDUCATIONAL ANNUITY POLICY) لیجئے!

فرض کیجئے اس وقت آپ کی عمر 28 سال ہے اور آپ کے لڑکے کی عمر 2 سال۔ اور آپ ہر ماہ تقریباً 40 روپے بطور پریمیم ادا کرتے ہیں تو جب لڑکے کی عمر 18 سال ہوجائے گی اور اس کی کالج کی پڑھائی شروع ہوگی تو اس پالیسی کے تحت لڑکے کو ہر چھ ماہ کے بعد -/1000 روپے (ایک ہزار روپے) اگلے 5 سال تک ملتے رہیں گے جس سے اس کے کالج کے اخراجات پورے ہوں گے۔
اگر انشورڈ یعنی لڑکے کا باپ پورے پریمیم ادا کرنے سے پہلے ہی چل بسے تو بھی لڑکے کو پڑھائی کے لئے پوری رقم ملتی رہے گی

مکمل تفصیلات کے لئے اپنے جانے پہچانے ایجنٹ یا نزدیکی بیمہ دفتر سے رابطہ قائم کیجئے



NPS UC-7 URD

بیمہ زندگی سلامتی کیلئے بیمثال ہے! لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا

آدھی پیالی چائے

انور قمر

اے ۱۴۔ مہر آباد، ہل روڈ، باندرہ، بمبئی نمبر ۵۰

گرامی محترم!

میں آپ کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ آپ نے میرا افسانہ "تماکیجیے" ماہ جون کے شمارہ میں شائع فرمایا۔ دو ہفتہ کے عرصہ میں مجھے اُس کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے سلسلے میں نصف درجن خطوط ملے۔ اُن میں ایک خط بھوپال سے کسی محمد خلیل صاحب نے لکھا ہے اُنھوں نے میرے افسانہ کو کسی ہندی افسانہ کا چربہ قرار دیا ہے۔ حالانکہ اُن کے اِس خیال میں حقیقت کا شائبہ بھی نہیں ——— اب آپ کی خدمت میں "آدھی پیالی چائے" پیش ہے۔ آپ پسند فرمائیں تو قارئینِ "بیسویں صدی" کو بھی اِس سے لُطف اندوز ہونے کا موقع دیں . . .

نیازکار ——— انور قمر

★

گرمیوں کی ایک ایسی ہی شام تھی۔ سُورج اپنا سارا تیج نُٹا کر کسی ہارے ہوئے جُواری کی طرح عمارتوں کے پیچھے مُنہ چُھپانے جا رہا تھا۔ کارخانوں اور مِلوں کی چمنیوں کے اُگلے ہوئے دھوئیں سے ساری فضا آلودہ ہو چکی تھی۔ اُفق میں چھائی ہوئی سُرخی بھی مَیلی مَیلی سی نظر آ رہی تھی۔

اچانک میری نظر ایک خوش خرام نازک اندام لڑکی پر پڑی جو اُوپر کو گردن اُٹھائے مجھے دیکھ رہی تھی اور اپنی ساتھی سے بھی کچھ کہتی جا رہی تھی۔

میں نے اپنے مکان کی اِس بالکونی سے بڑے دلچسپ تماشے دیکھے تھے۔ یہ کھیل بھی میرے لئے نیا نہ تھا۔

چند منٹوں بعد مجھے دروازہ پر دستک سُنائی دی۔ گھر پر کوئی موجود نہ تھا، جو دروازہ کھولتا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہُوا دروازہ پر گیا۔ دروازہ کھولا اور دم بخود رہ گیا۔ وہی نازک اندام لڑکی اپنی اُسی سہیلی کے ساتھ میرے سامنے کھڑی تھی۔

وہ مجھے دیکھ کر چونکی اور زبردستی مُسکراتی ہوئی بولی۔

"شاہدہ گھر پر ہیں؟ میں اُن کی سہیلی ہوں۔ نعیمہ . . . نعیمہ سُلطان!"

"وہ تو گھر پر نہیں ہیں۔"

میں اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

"پندرہ بیس منٹ میں آجائیں گی ——— آپ چاہیں تو دیوان خانہ میں تشریف رکھیں۔"

اُس نے اپنی سہیلی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ جیسے کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اُس کی رائے جاننا چاہتی ہو۔

وہ دونوں دیوان خانہ میں جا کر بیٹھ گئیں اور تپائی پر پڑے ہوئے رسالے اُلٹنے پلٹنے لگیں۔

میں نے اُنھیں اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر پیش کی اور بغیر کوئی بات کئے پھر بالکونی میں چلا آیا۔ لیکن یہاں بھی وہ پیکرِ ناز و انداز

میرے ذہن و احساس پر چھائی ہوئی تھی۔

نعیمہ دُبلی پتلی، دراز قد، لمبے لمبے بالوں والی لڑکی تھی۔ گندمی رنگ کی۔ بادامی آنکھوں والی۔ اُس کی نظریں پل بھر کسی شئے پر نہیں ٹھہرتی تھیں۔ جیسے بہت مضطرب ہوں۔ اُس کی آنکھوں پر کسی خوف زدہ ہرنی کی آنکھوں کا گمان ہوتا تھا۔

وہ آپس میں سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھیں۔ کبھی کبھار مجھے اُن کی کوئی بات سُنائی دیتی۔ جس سے پتہ چلتا کہ موضوعِ گفتگو میں ہی ہوں! اور جب مجھے اُن کا کوئی دبا دبا سا قہقہہ سُنائی دیتا تو میں تلملا اُٹھتا کہ نہ جانے میری کس حرکت کا یا میری کس بات کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے۔

کچھ ہی دیر میں میری بہن شاہدہ آگئی اور وہ تینوں آپس میں بات چیت اور ہنسی مذاق کرنے لگیں۔

میں بالکونی میں کھڑا بہت دیر تک اُسی کے متعلق سوچتا رہا۔ دُنیا سے بے خبر، اُس میں کھویا رہا۔ مجھے یہ بھی احساس نہ ہوا کہ وہ کب گھر سے رخصت ہوئی۔

دُوسری بار وہ مجھے اُسی لڑکی کے ساتھ امپیریل سنیما میں نظر آئی۔ فلم شروع نہیں ہوئی تھی۔ میں ٹی اسٹال پر کھڑا چائے پی رہا تھا۔

"ایک راسبری دینا!" اُس نے کہا۔

اسٹال کیپر دُوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ تھا۔ اُس کا آرڈر نہ سُن سکا۔

"اے، ایک راسبری دینا۔ ۔" اُس کی آواز نہ مُنہ سے نکلی نہ کسی کے کانوں تک پہنچی۔ کیونکہ وہ مجھے دیکھ چکی تھی۔

میں نے مُسکرا کر بلند آواز میں راسبری کا آرڈر دیا۔ دوسرے ہی لمحہ بوتل میرے ہاتھ میں آگئی۔ وہ بوتل میں نے نعیمہ کو بڑھا دی۔

اُس نے کپکپاتے ہاتھوں سے بوتل تھام لی اور اُس کے ابرُو سے ذرا اُوپر پسینے کی بُوندیں چمکنے لگیں۔ نظریں مضطرب ہوگئیں۔

اُس نے بہت دھیمی آواز میں "شکریہ" کہا اور اٹھتی میرے سامنے رکھ کر شاخِ گُل سی لچکتی چلی گئی۔ میں اُسے بہت دُور تک جاتے

دیکھتا رہا۔

میں نے سوچا لڑکی نوجوان ہے۔ کھاتے پیتے گھرانے کی ہے۔ تعلیم یافتہ ہے۔ خوبصورت ہے۔ شرمیلی ہے۔

کیا اُس کے دل میں کوئی بسا ہے؟

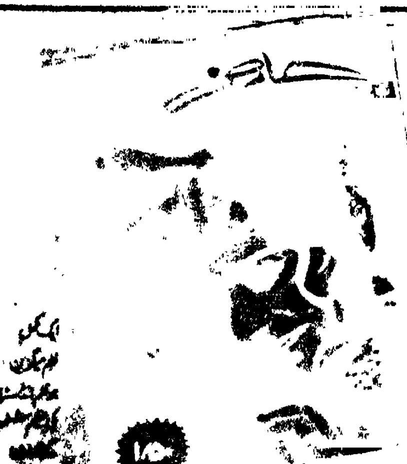
یا اُس کے دل کا خانہ خالی ہے؟

کہیں اُس خانہ میں میری تصویر تو نہیں؟

مجھے ٹائیفائڈ کے مرض نے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میری ہڈیوں کا ڈھانچہ بستر پر پڑا تھا۔ ڈاکٹر اسٹیتھسکوپ کانوں میں لگائے مجھے ٹھونک بجا رہا تھا۔

"تمہیں اب سگریٹ نہ پینا چاہیئے۔ تم بہت کمزور ہوگئے ہو۔ تمہارے پھیپھڑے متاثر ہو سکتے ہیں۔"

"صرف دس سگریٹ تو پیتا ہوں میں ڈاکٹر صاحب! اگر آپ کا خیال ہے کہ مجھے اتنے سگریٹ بھی نہ پینے چاہیئں تو بالکل ترک کیے دیتا ہوں!"



"شاباش! یہ ٹانک دن میں دو بار چمچ بھر کھانے سے پہلے اور یہ کیپسول رات کو سونے سے پہلے ایک..."

یہ کہہ کر ڈاکٹر نے پرچی میرے ہاتھ میں دے دی اور اپنا بیگ اٹھا کر چلا گیا۔

میں نے سگریٹ پینا چھوڑ دیا۔ ٹانک اور کیپسول اپنا اثر دکھانے لگے۔ صحت روز بروز بحال ہونے لگی۔

میری علالت کے دوران بھی ایک بار وہ گھر آئی۔ بغل کے کمرے سے اُس کی آواز جس میں ذراسی کھنک تھی (کھنک ایسی جیسے چاندی کے پیالے ٹکرائے ہوں) مجھے صاف سُنائی دیتی رہی۔

وہ میری بہن سے اپنی کسی سہیلی کی منگنی کی رسم کی ادائیگی کا حال بیان کرتی رہی اور میں اپنی کمزوری کا شدید احساس کرتا رہا۔ مجھ میں اتنی بھی سکت نہ تھی کہ میں دو قدم چل کر اپنے کمرے سے جھانک کر اُسے دیکھ لیتا۔

لیکن وہ میری مزاج پُرسی کو کیوں نہ آئی؟

آتی بھی کیوں؟

اُس کا میرا تعلق ہی کیا تھا؟

تعلق...؟ تھا... ضرور تھا ایک تعلق!

میں اُس کی سہیلی کا بھائی تھا!

اِس لئے وہ مزاج پُرسی کو چلی آتی؟

نہیں... نہیں... یہ میری خام خیالی تھی۔ اُس میں اِتنی جرأت اور بلند نظری کہاں تھی کہ وہ مجھ بیمار کا حال دریافت کرتی۔

میں نے وہ رات کروٹیں بدل بدل کر کاٹ دی اور جب صبحِ کاذب کو دیکھ کر کتے کائیں کائیں کرنے لگے اور صبح کا تارا میری نظروں سے اوجھل ہونے لگا تو میں اِس نتیجہ پر پہنچا کہ

اُس کے دل کا خانہ خالی ہے!

یا اُس خانہ میں میری تصویر موجود نہیں!

جاتے جاتے برسات اپنے پیچھے بہت سے کیڑے مکوڑے چھوڑ گئی۔ میں ٹیبل لیمپ کی روشنی میں اُنھیں سے اُلجھتا گریجویشن کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا کہ ایک رات مجھے اپنے ٹیبل پر نعیمہ سُلطان کی شادی کا رُقعہ پڑا مِلا!

گزشتہ تیس پینتیس برس کے عرصہ میں اردو جرائد و رسائل کے ذریعے اُردو زبان و ادب کی خدمت کرنے والوں میں بیسویں صدی اور خوشتر گرامی کا نام سرِفہرست آتا ہے۔ حُسنِ ترتیب، معیار اور ادبی نفاست کے اعتبار سے بیسویں صدی نے جو معیار ابتدا میں قائم کیا اُس کو ناگزیر حالات اور فضا کے باوجود آج تک جاری رکھا۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس کے لئے حضرت خوشتر گرامی کی تحسین ایک فریضہ تصور کی جا سکتی ہے ــــ زیرِ نظر سالنامہ بھی بیسویں صدی کی روایتی خوبیوں اور اعلیٰ ترین معیار کے ساتھ منظرِ عام پر آیا ہے حسبِ معمول اِس شمارے نے بھی کئی نئی ادبی شخصیتوں کو اُردو پڑھنے والوں سے رُوشناس کرایا ہے۔ حصۂ نظم ہو یا نثر جہاں مُلک کے برگزیدہ شعراء و افسانہ نویسوں کے نام سامنے آتے ہیں وہیں کچھ نئے ناموں پر بھی نگاہ ٹھہر جاتی ہے اور اُن کی تحریر پڑھنے کے بعد ذہن چونک اُٹھتا ہے کئی کہنہ مشق شعراء کا کلام بیسویں صدی کے ادبی وقار میں اضافہ کر رہا ہے...

بہار برنی رُکن ادارہ روزنامہ الجمعیتہ، دِلّی

میں نے کتابیں کھُلی چھوڑ دیں اور شب خوابی ہی کے لباس میں گھر سے باہر چلا آیا۔ مجھے اپنے کمرے میں گھٹن ہونے لگی تھی۔

میں ساری رات بمبئی کی سڑکیں ناپتا رہا اور سگریٹ پھونکتا رہا۔ بہت دیر تک پُرسکوت سمندر کے کنارے بیٹھا رہا اور اُس کے باطن کے اضطراب کا اندازہ کرتا رہا ــــ فلک بوس عمارتوں کو اندھیرے میں گھورتا رہا اور اُن کی ہیبت اور سنگینی کا احساس کرتا رہا۔

صبح ہونے سے پہلے جب میں بوجھل قدموں سے گھر لوٹا تو میرا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا اور جسم کا انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔

شادی کے بعد نعیمہ سُلطان، نعیمہ صدیقی ہو چکی تھی۔ وہ کلکتہ چلی گئی۔ اُس کے خاوند وہاں کسی اِسٹیم نیوی گیشن کمپنی میں اکاؤنٹنٹ تھے۔

وہاں سے اُس نے دو خط شاہدہ کو لکھے۔ ایک میں اُس نے اپنے بخیر و عافیت وہاں پہنچنے کا ذکر کیا اور دوسرے میں اپنی لڑکی کی پیدائش کی خبر سُنائی۔ اُس کے بعد اُس کی کوئی خبر نہ مِلی۔

ایک دن میں یونیورسٹی سے تھکا ہارا لوٹا تھا اور اپنے کمرے میں بیٹھا شاہدہ سے باتیں کر رہا تھا کہ خادم نے اُس کے آنے کی اطلاع دی۔

شاہدہ دوڑی دوڑی گئی اور اُسے گلے لگا لیا۔ اُس کی شادی کو صرف دو سال ہوئے تھے۔ لیکن اِس عرصہ میں وہ کافی موٹی ہو گئی تھی اور پہلے سے زیادہ دلکش نظر آ رہی تھی۔

وہ مجھے دیکھ کر مُسکرائی اور میں نے بھی سر کی جُنبش سے اُسے "ہلو" کہا۔ اِس سے زیادہ میں اور کیا کر سکتا تھا؟

یکایک مجھے اپنے گلے میں کانٹے چُبھتے محسوس ہوئے۔ آنکھیں دُھندلانے لگیں اور ذہن میں خیالات مکڑی کے جالوں کی طرح تننے لگے۔

میں سگریٹ خریدنے کے بہانے نیچے چلا آیا اور ایک ہوٹل کے ایک گوشے میں جا بیٹھا۔

چائے منگائی، سگریٹ سُلگایا اور دونوں کی مشترکہ تلخی حلق سے بار بار زہر کی طرح اُتارتا رہا۔

لڑکی نوجوان ہے۔ کھاتے پیتے گھرانے کی ہے تعلیم یافتہ ہے۔ خوبصورت ہے۔ شرمیلی ہے۔

کیا اُس کے دل میں کوئی بسا ہُوا ہے؟

یا اُس کے دل کا خانہ خالی ہے؟

کہیں اُس خانہ میں میری تصویر تو نہیں؟

یہ خیال ذہن میں آتے ہی میرے لبوں پر ایک طنزیہ مُسکراہٹ پھیل گئی۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد میں بھاری قدموں سے سیڑھیاں چڑھتا گھر پہنچا۔ نعیمہ اب تک وہاں موجود تھی۔ اُس کے خاوند بھی چلے آئے تھے اور اپنی بچّی کو بھی لے آئے تھے جو اُس وقت قالین پر بیٹھی ربڑ کی گُڑیا سے کھیل رہی تھی اور بار بار کلکاریاں مار رہی تھی۔

شاہدہ نے میرا تعارف صدیقی صاحب سے کرایا اور ہم دونوں بات چیت کرنے لگے۔

تپائی پر پڑی ہوئی ہلکی پھلکی، میٹھی اور نمکین چیزوں پر نظر ڈالتے ہوئے میں نے محسوس کیا نعیمہ مجھے دُوسروں کی نظریں بچا کر بار بار دیکھ رہی ہے۔ اُس کی آنکھوں سے خوف و اضطراب کے بجائے پیار و محبت مترشح تھی۔

"بھائی جان! میں ابھی آپ کے لئے چائے لاتی ہوں" کہہ کر شاہدہ اپنی جگہ سے اُٹھنا چاہتی تھی کہ میں نے اُسے روک دیا۔

"میں ابھی نیچے سے چائے پی کر آ رہا ہوں"

"کوئی بات نہیں" نعیمہ اپنی پیالی لئے صوفے سے اُٹھی۔ "دو گھونٹ ہی سہی!" کہہ کر اُس نے آدھی چائے طشتری میں اُنڈیل کر پیالی مجھے بڑھا دی۔

پیالی تھامتے ہی میرا ہاتھ کانپنے لگا۔ چائے چھلکنے لگی اور میں بمشکل تمام چائے پینے لگا۔

مجھے تیس سال کی خدمت کے بعد محکمۂ خارجہ کے دفتر سے ریٹائرڈ کر دیا گیا ہے۔ میں اب تک اپنے اُسی آبائی مکان میں رہتا ہوں تنہا ہوں۔

شاہدہ نے اپنا گھر بسا لیا ہے۔ اُس کے بچّے جوان ہو چُکے ہیں۔ میں کہیں نہیں جاتا آتا۔ بس سارا دن کتابیں پڑھتا رہتا ہوں اور جب شام کو پڑھتے پڑھتے تھک جاتا ہوں تو بالکونی میں چلا آتا ہوں اور اِدھر اُدھر نظریں دَوڑاتا ہوں۔ مجھ سے زیادہ دیر تک کھڑا نہیں رہا جاتا تو کُرسی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ مجھے اُس وقت اپنی تنہائی کا شدید احساس ہونے لگتا ہے۔ میں اِس احساس کو کم کرنے کے لئے سگریٹ پینے لگتا ہوں۔

کسی شام کوئی بھولا بھٹکا مجھ سے مِلنے چلا آتا ہے تو اپنے ہاتھوں سے چائے دَم دیتا ہوں اور اُسے دیوان خانہ میں بِٹھا کر چائے پلاتا ہوں۔

اُس وقت مجھے ایک بہت پُرانا واقعہ یاد آتا ہے اور میں بڑبڑانے لگتا ہوں ——

"اُس کے دل کا خانہ کبھی خالی نہ تھا۔ اُس میں ہمیشہ میری تصویر رہی تھی۔ اُس کے دل کا خانہ ... اُس میں ہمیشہ ...؟!

مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ [illegible]

[illegible] کے درمیان فاصلہ ضرور [illegible]

[illegible] ہمیشہ غیر مطبوعہ مضامین [illegible] اور ایڈیٹر کی اطلاع کے [illegible]

خاطے پر غیر مطبوعہ لکھیں بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین [illegible]

اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اپنے پاس مضمون کی نقل ضرور رکھیں کیونکہ [illegible] اشاعت [illegible]

ضائع کر دئے جاتے ہیں۔ ناقابلِ اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے مضمون کے ساتھ [illegible]

پورا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا لفافہ ارسال کریں ورنہ مضمون کی واپسی [illegible]

صحت و زندگی

۱ — ایک عادت

کچھ لوگ صبح کے ناشتے کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ناشتہ کرتے ہی نہیں۔ یہ ایک مہلک عادت ہے۔ خاص کر اُس شخص کے لئے جو اپنے دل، جسم اور دماغ کو قوی، توانا اور جوانی سے بھرپور رکھنا چاہتا ہے۔

تحقیقاتی مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوئی ہے کہ صبح کا تقویت بخش ناشتہ جسمانی سرگرمی کو دن چڑھے تک اعلیٰ درجہ پر برقرار رکھتا ہے۔ صبح کے اچھے ناشتے کے بعد آدمی سارا دن بلا احساسِ تکان جسمانی اور دماغی کام بخوبی انجام دے سکتا ہے اور کام کے بعد خستگی اور درماندگی سے نڈھال نہیں ہوتا۔

ممتاز ماہرِ غذائیات ایڈا جین کین نے لکھا ہے — "دن کا آغاز ناشتے سے کیجئے۔ اِس سے آپ کا جسم چاق و چوبند اور دماغ روشن رہے گا۔ تحقیقاتی مطالعوں سے معلوم ہوا ہے کہ ناشتہ کئے بغیر کاروبار شروع کر دینے کی عادت مُضر بلکہ تکلیف دِہ اثرات رکھتی ہے۔"

اگر آپ ناشتہ پسند نہیں کرتے جب بھی ذرا آزما کر تو دیکھئے کہ اُس کے بعد سارا دن کس خوش اسلوبی سے کام انجام دیا جا سکتا ہے۔

تجربات سے ثابت ہو چکا ہے کہ ناشتہ حذف کر دینے سے کام کی صلاحیت میں نمایاں کمی ہو گئی۔

ناشتے کے ساتھ پھل یا پھلوں کے رس، سنترہ، مالٹا، انگور، ٹماٹر، گاجر وغیرہ کا رس ایک پیالہ لے لیا جائے تو اس سے سارے دن کے لئے وٹامن سی کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔

دودھ، دلیا، انڈے اور مکھن سے اعلیٰ قسم کے پروٹین اور معدنی اجزاء دونوں حاصل ہوتے ہیں۔ ناشتے کے بعد کوئی نیم گرم مشروب پی لیجئے تو بے حد طمانیت و مسرت کا احساس ہوگا۔

ناشتے کے سلسلے میں ممتاز ماہرِ غذائیات لیلارڈ کارڈیل نے یہ انتباہ بھی کیا ہے — "اگر آپ نے اپنے ناشتے میں ہلکی پھلکی اور زود ہضم چیزوں کے علاوہ وافر نشاستہ دار اور دیر ہضم مرغن غذاؤں سے کام و دہن کو آسودہ کیا ہے تو دن کا آغاز عارضی سیری اور تسکین کے ساتھ ہوتا ہے، پھر بھی اُس سے آپ کا ہاضمہ دیر ہضم غذا سے گراں بار ہوگا اور آپ کو سارا دن ڈکاریں اور اُبکائیاں آتی رہیں گی۔ زیادہ دیر نہ گزرے گی کہ اِس غیر منہضم اور دیر ہضم غذا سے آپ کے انہضامی خطے میں گیس (ہَوا) پیدا ہو کر جمع ہو جائے گی اور سینے میں دل پر دباؤ ڈالنے لگے گی۔ آپ بے چینی اور تکلیف محسوس کرنے لگیں گے اور سوچیں گے اِس ناشتے سے تو ناشتہ نہ کرنا ہی اچھا ہوتا؟"

مُدیر بیسویں صدی صبح ناشتے میں بُھنے ہوئے چنے کھاتا ہے اور دن بھر گھوڑے کی طرح کام کرتا ہے، اور کبھی تکلّف ہو تو زیادہ سے زیادہ بیسن کی ایک روٹی اور مکھن نکلے ہوئے دودھ کا ایک گلاس۔

۲ — قدرت کا سب سے بڑا انعام

انسان کے لئے قدرت کا سب سے بڑا انعام قوتِ ارادی ہے۔ جو لوگ قدرت کے اِس انعام — قدرت کے اِس عطیے سے محروم ہوتے ہیں وہ حیات کی اِس بازی گاہ میں کبھی کامیاب و کامران نہیں ہوتے۔

مشہور مفکر ڈاکٹر ملٹن نے لکھا ہے — "ہم میں سے ہزاروں لوگ اپنی اندرونی طاقتوں کو قوتِ ارادی کی کمی کے باعث ضائع کر دیتے ہیں۔ کامیابی و کامرانی کا دھارا ہمیشہ اُنہیں لوگوں کی طرف بہتا ہے جن کے دل میں قوتِ ارادی راسخ ہوتی ہے۔ کامیابی و کامرانی کی ندی آپ کی دہلیز کے پاس سے بہہ رہی ہے جس میں مسرت اور خوشحالی کے انمول لعل اور موتی چھپے ہیں۔ اگر آپ کے دل میں قوتِ ارادی ہے تو یقیناً آپ انہیں پا سکتے ہیں۔"

مشہور مفکر سی۔ جی۔ ڈوکان نے لکھا ہے ۔۔۔ "انسان کی قوتِ ارادی اُس کے دل کا آئینہ ہوتی ہے۔ کسی انسان کو فطرت کی طرف سے جو سب سے بڑا انعام ملتا ہے وہ قوتِ ارادی ہی ہے۔ اگر یہ فطری طور پر آپ میں نہ ہو تو آپ اپنی توجہ سے پیدا کر سکتے ہیں۔"

۳ ۔۔۔ مسرت کا راز

ساری دُنیا مسرت پانے، مسرت حاصل کرنے کے لئے دیوانی ہو رہی ہے۔ انسان کی ساری تگ و دو کے پیچھے یہی جذبہ کارفرما ہے۔ لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ مسرت کا راز کیا ہے؟

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ۔۔۔ "مسرت کے متعلق لوگوں میں عجیب و غریب خیالات پائے جاتے ہیں۔ لوگ سوچتے ہیں مسرت دَولت سے خریدی جا سکتی ہے۔ جتنی دَولت زیادہ ہوگی اُتنی ہی زیادہ چیزیں خریدی جا سکیں گی اور اُتنی ہی زیادہ خوشی ہوگی لیکن یہ یکسر وہم ہے۔ کوئی آج تک دَولت سے بھی خوشی خرید سکا ہے؟ دَولت و ثروت، جاہ و حشمت سے کبھی حقیقی مسرت نہیں حاصل ہو سکتی ۔۔۔ دُوسروں کو مسرت دینے سے مسرت حاصل ہوتی ہے۔ دُوسروں کو خوشی دینے سے خوشی ملتی ہے۔ بلند خیالات اور دُوسروں کی بھلائی سے خوشی ملتی ہے

مسرت کا یہی راز ہے ۔۔۔ خود غرض، خود پسند، تنگدل اور حریص انسان مسرت سے ہمیشہ نا آشنا رہتا ہے۔"

۴ ۔۔۔ کیا آپ جانتے ہیں؟

جن ساگ سبزیوں کو ارزاں ہونے کی وجہ سے آپ حقیر سمجھتے ہیں۔ اپنے حیات بخش اَوصاف کی بنا پر سونے سے تولنے کے قابل ہیں۔ ساگ اور سبزیاں حیات بخش اجزاء کا خزانہ ہیں۔ جسم کے لئے ساگ سبزیوں میں قیمتی پھلوں سے زیادہ مفید اجزاء ہیں۔ بے قدری کی نگاہ سے دیکھی جانے والی ارزاں سبزیوں میں صحت و تندرستی عطا کرنے والی صفات بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ دودھ جسے ہم اعلیٰ غذا سمجھتے ہیں، انھیں ساگوں اور سبزیوں کا دُوسرا رُوپ ہے۔ دودھ میں یہی سبز پتے خوش ذائقہ محلول کی صورت میں ہوتے ہیں۔ کچے ساگوں سے بہتر دودھ کا کوئی بدل نہیں۔ جہاں دودھ کی کمی ہو وہاں ساگ کے استعمال سے اُس کی تلافی ہو سکتی ہے۔

بچوں کے نشو و نما میں بھی ساگ سے بہت مدد ملتی ہے۔ اگر اُن میں بچپن ہی سے ساگ اور سبزی کی رغبت پیدا کی جائے تو یہ عادت ساری زندگی اُن کی صحت کی حفاظت کرتی ہے۔

۵ ۔۔۔ آپ بھی عظیم بن سکتے ہیں

کوئی انسان عظیم پیدا نہیں ہوتا، جو لوگ عظمت حاصل کرنے کا تہیہ کر کے مشکلات اور مخالفتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اپنے بلند مقاصد کے حصول کے لئے جدّوجہد کرتے ہیں وہ کامیاب و کامران ہو کر عظیم بن جاتے ہیں ۔۔۔ آپ بھی عظیم بن سکتے ہیں۔

مشہور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ۔۔۔ "مخالفت اور سخت مخالفت کا مقابلہ کئے بغیر کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ کوئی عظیم انسان نہیں بن سکتا۔ تاریخ عالم اِس حقیقت کی شاہد ہے جو شخص کسی بڑے مقصد کے حصول کے لئے آگے بڑھتا ہے، تنگدل، تنگ نظر، حاسد طرح طرح سے اُسے ناکام بنانے، اور اُس کی راہ میں مشکلات پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُس کے متعلق بہت تلخ باتیں کہی جاتی ہیں۔ اِس غلط مخالفت سے کوئی اچھا مقصد حاصل نہیں ہوتا، لیکن ہوتا یہی ہے۔ جو لوگ مشکلات اور مخالفت کے طوفان میں بہہ جاتے ہیں وہ ناکام ہو کر ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو لوگ مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی دُھن میں آگے بڑھتے جاتے ہیں وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں، عظیم بن جاتے ہیں۔ اُس بلند مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ہر ایک کو اُن کے آگے جھکنا پڑتا ہے اور اُن کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔"

٦ — ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

اپنی آرزوئیں اور تمنائیں پُوری نہ ہونے سے ہم بددل ہو جاتے ہیں، مایوس ہو جاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آرزو کی تکمیل آرزو کی موت ہے۔

مشہور مفکّر ڈاکٹر پولین ہل نے لکھا ہے — "انسان کی سب سے بڑی مسرّت وہ ہے جسے ابھی اُس نے حاصل نہیں کیا ہے! جو چیز ہمارے قبضہ میں ہے ہم اُس سے دلچسپی نہیں لیتے۔ ہمیں مسرّت اُس وقت حاصل ہوتی ہے، جب ہم مستقبل کے متعلق سوچتے ہیں اور خیالات کے محل تعمیر کرتے ہیں — خواہش کی موت ہماری موت ہے۔ آرزو کی زندگی سے ہماری زندگی ہے"

آرزو پوری نہ ہو تو گھبرانا نہ چاہئے۔ بددل نہ ہونا چاہئے۔ انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسی طرح سوچتا رہے۔ اپنے دل میں آرزو کی تپش سرد نہ ہونے دے۔ ورنہ اُس کی نُدرتِ تخیل ختم ہو جائے گی۔ اُس کا دل مُردہ ہو جائے گا اور وہ ستاروں سے آگے دُوسرے جہاں نہ ڈھونڈ سکے گا۔

٧ — ہر دلعزیزی کا راز

ایسی بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جو بظاہر بہت چھوٹی ہیں، لیکن زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ اگر آپ انھیں نظر انداز نہ کریں تو کچھ خرچ کئے بغیر لوگوں میں ہر دلعزیز ہو سکتے ہیں۔

مشہور مفکّر سی۔ جی۔ ڈوکان نے لکھا ہے — "جن لوگوں سے آپ کا واسطہ پڑتا ہے، اُن میں کوئی آپ کا دوست ہوتا ہے یا آپ کا دُشمن یا وہ آپ کے خیالات و نظریات سے اختلاف رکھتا ہے۔ اپنے دُشمن یا مخالف کو دوست بنا لیجئے۔ پھر ساری دُنیا آپ کی دوست ہو جائے گی! دوستوں کا ایک ایک حلقہ جو ہر وقت آپ کی مدد کرنے کو تیار ہوگا۔ دُنیا میں صرف ایک ہی طریقہ ہے جس کے سہارے آپ دُوسروں کو اپنی مدد کے لئے آمادہ کر سکتے ہیں اور وہ بھی بغیر کسی معاوضہ کے۔ یہ صرف اسی حالت میں ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کے بارے میں اچھی رائے رکھیں۔

لوگ کس طرح آپ کے بارے میں اچھی رائے رکھ سکتے ہیں؟ کوئی چیز؟ اچھی رائے حاصل کرنے میں کوئی فرق نہیں۔ آپ کو ہر حال میں قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ روپے کی صورت میں یا کسی اور طرح — غور کیجئے لوگ آپ سے کیا مانگتے ہیں؟ کیا چاہتے ہیں؟ ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو آپ انھیں نہیں دے سکتے۔ لیکن اُن سب چیزوں کے علاوہ وہ ایک بہت معمولی، بہت چھوٹی سی چیز کے طلب گار ہوتے ہیں اور آپ کو اُس کی کوئی قیمت ادا نہیں کرنی پڑتی — اور وہ چھوٹی سی چیز ہے دُوسروں کی "انا" کو مطمئن کرنا! اگر آپ لوگوں کی اِس خواہش، مانگ — کو پُوری کر دیں تو لوگ آپ کو پسند کریں گے، آپ سے پیار کرنے لگیں گے اور آپ ہر دلعزیز ہو جائیں گے۔

ملک بھر میں "بیسویں صدی" ہی ایک ایسا جریدہ ہے جو اُردو ادب کی بے لوث خدمت کر رہا ہے۔ کتنی مخالف ہوائیں چلیں، بس خود ہی اُڑ گئیں۔ لیکن "بیسویں صدی" "بیسویں صدی" ہی رہا۔ "بیسویں صدی" سال میں دو خاص شمارے نکالتا ہے۔ ایک افسانہ نمبر اور دُوسرا سالنامہ۔ "بیسویں صدی" کے عام شمارے بھی کسی خاص نمبر سے کم نہیں ہوتے۔ جس قدر مواد اُن عام شماروں میں ہوتا ہے، اُتنا مسالہ دُوسروں کے سالنامہ میں بھی نہیں ہوتا۔ ۔ تیر و نشتر میں تو خوشتر گرامی جواب نہیں رکھتے اور تیر و نشتر جو تیر کا بھی کام کرتے ہیں اور نشتر کا بھی — "بیسویں صدی" کا یہ سالنامہ بھی گذشتہ سالناموں کی طرح اُردو ادب میں سنگِ میل کی حیثیت ہی رکھے گا اور اس کا سہرا خوشتر گرامی کے سر ہے۔ جنھوں نے اُردو کی خدمت کے لئے بیڑا اُٹھا رکھا ہے — "بیسویں صدی" کا یہ سالنامہ صوری و معنوی لحاظ سے قابلِ قدر ہے اور معیاری۔

"رفتار" ویکلی جموں

غیر طلبیدہ مضامین واپس منگوانے کیلئے اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ ضرور بھیجئے بصورتِ دیگر اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھیئے۔ ہم واپسی سے معذور رہیں گے۔ (ایڈیٹر بیسویں صدی دہلی)

رسالہ نہ مِلنے کی شکایت

دو مرتبہ پتے چیک کرنے کے بعد "بیسویں صدی" ہر ماہ باقاعدگی سے سپردِ ڈاک کیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود شکایتی خطوط موصول ہونے پر رسالہ دوبارہ بھیج دیا جاتا ہے۔ ٢٥ تاریخ کے بعد شکایتی خطوط موصول ہونے پر دوبارہ پرچہ بھیجنے سے ہم معذور رہتے ہیں۔ رسالہ نہ ملنے کی شکایت محکمۂ ڈاک سے بھی کیجئے۔ (منیجر)



سرگوشیاں

اِس عُنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دئیے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اِس عنوان سے ہمارا مقصد، قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے۔ (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

محمد منصور احمد۔ دھنباد

س۔ وقت کی قیمت؟

ج۔ وقت گوہرِ گرانمایہ ہے!

ثروت حسین نظامی۔ آگرہ

س۔ زندگی ــــ؟

ج۔ زندگی شغلِ آہ و زاری ہے
زندگی ایک ضربِ کاری ہے
پھر بھی کیا دلکشی ہے ظالم میں
پھر بھی کمبخت کتنی پیاری ہے!

س۔ ثروت ــــ؟

ج۔ ثروت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے!

نوشابہ جمیل بہیت

س۔ گاجر کی تاثیر سرد ہے یا گرم؟ اس کے فائدے کیا ہیں؟

ج۔ گاجر کا مزاج گرم و تر ہے۔ جدید تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ یہ سبزی جسے ہم اتنی حقیر سمجھتے ہیں، وٹامنز کا خزانہ ہے۔ اِس میں وٹامن اے، بی، سی، فولاد، چونا، فاسفورس، نشاستہ اور شکر وغیرہ اجزاء پائے جاتے ہیں۔ اِس لئے جسم کی تعمیر و پرورش اور قیامِ صحت کے لئے گاجر مفید ترین سبزی ہے۔ گاجر کا رس پینا بہت ہی مفید ہے۔ اِس سے خونِ صالح پیدا ہوتا ہے۔ گاجر کھانے سے بصارت تیز ہوتی ہے۔

سید حسین۔ حیدرآباد دکن

س۔ آپ کی ہابی؟

ج۔ ادب اور انسانیت کی خدمت کرنا!

مس رخسانہ۔ بحرین

س۔ عورت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ عورت کے متعلق ہم شیکسپیئر کے ہمخیال ہیں جس نے کہا ہے ــــ "عورت خوشبو، نغمہ، رقص اور روشنی کا مجموعہ ہے!"

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں یہ قول کس کا ہے ــــ "نیک عورت رات کا تارا اور صبح کا ہیرا ہے!"

ج۔ یہ قول طامس مور کا ہے۔

خورشید نقوی سہوانی لکچرر

س۔ آج کا انسان اپنی بیوی بچوں کے پیچھے اپنے ماں باپ کو چھوڑ دیتا ہے لیکن جس وقت اُس پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو اُس کی زبان پر ہائے ماں ہی کیوں نکلتا ہے، ہائے بیوی کیوں نہیں نکلتا؟

ج۔ اِس لئے کہ بیوی ماں کی محبت و شفقت نہیں دے سکتی۔

س۔ انسان کو اپنی شریکِ حیات کا انتخاب کرتے وقت اُس کے حُسن، محبت، دولت، اخلاق اور تعلیم میں کس چیز کو ترجیح دینی چاہیئے؟

ج۔ اخلاق اور تعلیم کو۔

نواب پرواز۔ بنگلور

س۔ وہ کون سی شئے ہے جو آفات و بلیات کو دُور رکھتی ہے؟

ج۔ نیکی!

این۔ ایم۔ انصاری جمشید پور

س۔ پہلے اذان کی آواز سُن کر شیطان بھاگتے تھے۔ اب اذان کی آواز سُن کر انسان بھاگتے ہیں! ایسا کیوں؟

ج۔ اس لئے کہ اب انسان شیطان بنتے جا رہے ہیں!

س۔ اپنی پسند کے چند اشعار سنائیے۔

ج۔ سُنئے ؎

ڈوب کر بحرِ حوادث میں اُبھر آنے کا نام
زندگی ہے پے بہ پے موجوں سے ٹکرانے کا نام

•

نشیمن پر نشیمن اس طرح تعمیر کرتا جا
کہ بجلی گرتے گرتے آپ ہی بیزار ہو جائے

•

راہِ عمل میں شوقِ فراواں کی شرط ہے
جاتی نہیں ہے سعیِ طلب رائگاں کبھی

غلام جیلانی اعجاز۔ حیدرآباد دکن

س۔ کیلے کے فائدے بتائیں۔

ج۔ کیلے کا مزاج معتدل اور گرم و تر ہے۔ وٹامنز کے لحاظ سے مفید ترین پھلوں میں سے ہے۔ اس میں وٹامن اے، بی۔ اور سی وافر مقدار میں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ وٹامن ڈی ع اور ای بھی ہوتے ہیں۔ کیلا نہایت مقوّی اور جسم کو فربہ کرنے والی غذا ہے۔ کیلا طاقت اور خون پیدا کرتا ہے۔ دست، پیچش، سنگرہنی اور کئی امراض کا نافع ہے۔

محمد خلیل اللہ ملہاروی

س۔ کیا کھلے سر نماز پڑھنا جائز ہے؟

ج۔ جی نہیں۔

س۔ میرے دوست کا کہنا ہے ــــــ شاعر بننا ہے تو شراب پینا چاہئے۔ کیا یہ سچ ہے؟ بغیر شراب پئے کوئی شاعر نہیں بن سکتا؟

ج۔ یہ کہنا غلط ہے۔ ہم ایسے شاعروں کو جانتے ہیں جو شراب تو کیا سگریٹ بھی نہیں پیتے!

س۔ دُنیا میں انسان کیوں آتا ہے؟

ج۔ انسانیت کا سر بلند کرنے کے لئے۔

ماجدہ ہما صدیقی۔ میسور

س۔ کامیابی کا راز؟

ج۔ ناکامیوں سے بد دل نہ ہونا!

س۔ علامہ اقبال کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ایم۔ ایم۔ احمد۔ دھنباد

س۔ جھوٹ اور افواہ میں کیا فرق ہے؟

ج۔ جھوٹ میں سچ کا کوئی پہلو نہیں ہوتا۔ افواہ سچی بھی ہو سکتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ افواہ جھوٹی ہی ہو۔

س۔ انسان وقت کی قدر کب کرتا ہے؟

ج۔ جب اس حقیقت سے آشنا ہو جاتا ہے کہ وقت ہی زندگی ہے۔

زبیر احمد شمسی۔ محمد آباد گوہنہ

س۔ اس ایٹمی دور کا انجام کیا ہوگا؟

ج۔ اتنا خوفناک جس کے تصور سے بھی دل کانپ جاتا ہے!

س۔ دنیا کی سب سے ارزاں شئے؟

ج۔ اس خوفناک گرانی کے دور میں کوئی شئے ارزاں نہیں ہے۔ زہر بھی ارزاں نہ ہوگا!

ہدایت علی ساحل۔ جھمری تلیا

س۔ انسان کو وقت کی قدر کب معلوم ہوتی ہے؟

ج۔ جب وہ وقت سے کچھ پاتا ہے، یا جب وہ وقت کو کھو دیتا ہے۔

س۔ اس وقت ہندوستان کا عظیم ناول نگار کون ہے؟

ج۔ ہر ناول نگار خود کو عظیم ناول نگار سمجھتا ہے!

بلراج سبل۔ رائے پور

س۔ شہریار، پروازؔ، ساغر نظامی کے صاحبزادے ہیں؟

ج۔ شہریار، پروازؔ، ساغر صاحب کے بھائی ہیں۔

س۔ میں نے سنا ہے آپ کا اصلی نام رام لبھایا ہے؟

ج۔ جی نہیں، احقر دکتر کو خوشتر گرامی کہتے ہیں!

سلطان احمد اشک۔ کریم نگر

س۔ ناشپاتی کے فائدے بتائیے۔

ج۔ ناشپاتی قبض کشا سہل ہے۔ دل و دماغ، معدے اور جگر کو طاقت دیتی ہے۔

پیاری سلطانہ گنسور۔ ڈبے دارہ

س۔ بھائی جان! کیا آپ بتا سکتے ہیں انسان خوش ہو کر بھی غم زدہ کیوں رہتا ہے؟

ج۔ کوئی خوش ہو کر غم زدہ نہیں رہتا۔ ہاں کوئی اپنے دل سے مجبور ہو کر خوشی کا سامان پا کر بھی غم زدہ ہو سکتا ہے۔

ارون کمار۔ شملہ

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں ۷۱ء کا نوبل پرائز کسے دیا گیا؟

ج۔ ۷۱ء کے نوبل پرائز کے لئے چلی کے شاعر اور سیاستداں پابلو نیرودا منتخب کئے گئے ہیں۔ اُن کی مشہور تخلیق "کانٹو جنرل" کے علاوہ تین سو سے بھی زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ وہ اس وقت پیرس میں سفیر ہیں۔

اور بجھے چراغ اور کم ہوئی روشنی

دُنیائے علم و ادب میں آج رنج و غم کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ جناب پروفیسر سید احتشام حسین کی تکلیف دہ رحلت کے بعد جناب غلام احمد فرقت کاکوروی بھی ہم سے بچھڑ گئے۔ یہ خبر مدیرِ "بیسویں صدی" پر بجلی بن کر گری اور دلی کی علم و ادب کی محفلیں سُونی ہو گئیں۔ ہر طرف سناٹا ہے، ہر دل بجھا ہوا ہے۔

جنابِ فرقت کاکوروی دلی کی علمی و ادبی محفلوں کی جان تھے۔ اُن کی شخصیت اور عظمت اُن کے دوستوں کے دلوں میں نقش تھی اور رہے گی۔ اُن کی موت ایک نیک انسان کی موت ہے۔ وہ صاحب طرز مزاح نگار تھے اور باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کے مزاج میں بے حد انکساری اور مروت تھی۔ وہ خلوص اور محبت کے پیکر تھے اور مدیرِ "بیسویں صدی" کے دل کے بہت قریب تھے۔

زمین کے ایک ذرے میں اور بے کسی کے عالم میں اُن کے انتقال کی خبر سُن کر ہم سکتے میں رہ گئے اور ادبی حلقے رنج و غم میں ڈوب گئے۔ خدا انھیں آغوشِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور اُن کے لواحقین کو صبرِ جمیل کی توفیق دے۔

سوگوار

خوشتر گرامی

مس نسرین۔ امراؤتی

س۔ ہِمت صحیح ہے یا ہمّت؟

ج۔ ہمّت۔

س۔ فضا کا صحیح تلفظ کیا ہے؟ میری سہیلی
کو شاہ کہتی ہے فَضا صحیح ہے۔ لیکن
عام طور پر لوگ فِضا ہی بولتے ہیں۔

ج۔ عام طور پر لوگ فِضا بولتے ہیں، لیکن
فَضا صحیح ہے۔

نسیم صدیقی۔ بنارس

س۔ مجروح کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

نزہت رضوان۔ دریاپور۔ پٹنہ

س۔ کون سا موسم صحت کے لئے مفید ہے؟

ج۔ موسم سرما۔

س۔ ’’لیڈر‘‘ اور ’’پلیڈر‘‘ میں کیا فرق ہے؟
جبکہ دونوں زیادہ بولتے ہیں!

ج۔ لیڈر عوام کو سبز باغ دکھا کر، خوش
آئیند فریب دے کر منسٹر بھی بن جاتا ہے۔
لیکن فریب اور جھوٹے وعدوں کا پردہ
چاک ہونے کے بعد جب لیڈر عوام کا
اعتماد کھو دیتا ہے تو اُسے کوئی نہیں
پوچھتا ____ ع
پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں!
لیکن ایسے لیڈر کی طرح پلیڈر کی مٹی
پلید نہیں ہوتی۔

کملا کانت بھاٹیہ۔ بمبئی

س۔ دُنیا کی سب سے بلند عمارت کہاں ہے؟

ج۔ کبھی دُنیا کی سب سے بلند عمارت ۱۲۰ منزلہ
عمارت امپائر اسٹیٹ بلڈنگ مانی
جاتی تھی۔ اب دُنیا کی سب سے بلند
عمارت ’’ورلڈ ٹریڈ سینٹر‘‘ ہے۔ یہ
دونوں عمارتیں نیویارک میں ہیں۔

سیّد نصرت حسین۔ بھوپال

س۔ علامہ اقبال کہاں پیدا ہوئے تھے؟

ج۔ سیالکوٹ (مغربی پنجاب) میں۔

س۔ علامہ کا مدفن کہاں ہے؟

ج۔ لاہور میں۔

س۔ ڈاکٹر ٹیگور بڑے شاعر تھے یا علامہ
اقبال؟

ج۔ دونوں بڑے شاعر تھے۔

نسرین قادر۔ سہرسہ

س۔ چچا جان! میں نے خوب سوچ سمجھ کر
اپنی پسند سے شادی کی ہے، لیکن
میرے والدین ناراض ہیں۔ کیونکہ میں نے
جس سے شادی کی ہے وہ میرا ہم قوم
نہیں ہے۔ کیا دل کے معاملے میں ذات
پات کی پابندی ضروری ہے؟

ج۔ جو شادی والدین کو ناراض کر کے کی
جاتی ہے وہ خوشی نہیں دیتی۔ ایسی شادی
کو خود رائی کہا جائے گا۔

سیّد پرویز احمد سالم چند رپاڑہ۔ ہزاری باغ

س۔ میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا خواجہ
احمد عباس، خواجہ حسن نظامی کے نواسے
ہیں۔ لیکن آپ نے بلراج بہل کے ایک
سوال کے جواب میں انھیں خواجہ
الطاف حسین حالی کا نواسہ بتایا ہے،
تو پھر خواجہ حسن نظامی سے خواجہ
احمد عباس کا کیا رشتہ ہے؟

ج۔ اُن سے اِن کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔

ظفر اللہ۔ سُندر گڑھ

س۔ ہمدردی کا جذبہ زیادہ عورتوں میں
ہے یا مردوں میں؟

ج۔ عورتوں میں ____ چنگیز اور ہلاکو مرد
تھے!

س۔ سچی خوشی کیسے ملتی ہے؟

ج۔ دُوسروں کو خوشی دے کر!

محمد ظہیر نظامی۔ دھنباد

س۔ شادی اور بربادی میں کتنا فاصلہ ہے؟

ج۔ یہ شادی کرنے والے پر موقوف ہے، وہ
شادی کو خانہ آبادی بنائے یا بربادی!

س۔ محبت کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے
کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
زندگی صرف محبت ہی نہیں ہے اے دوست!

س۔ زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات پر کوئی
طنزیہ شعر سنائیے۔

ج۔ ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر

ثریا پروین جالسی۔ کلکتہ

س۔ شادی سے پہلے رومانس ضروری ہے؟

ج۔ ہرگز نہیں۔

عبدالواسع علوی۔ علی گڑھ

س۔ آپ شاعر کے اس خیال سے کس حد تک متفق ہیں ؎

قلبِ تپاں کی آنچ ہے کتنی اداس آنچ
شعلوں پہ سوگئی ہے محبت مرے ندیم

ج۔ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
زندگی صرف محبت ہی نہیں ہے اے دوست!

شمسہ خانم شمیم۔ آسنسول

س۔ کیا فکر بہت بری چیز ہے۔ اگر ہے تو کس حد تک؟

ج۔ فکر بہت بری چیز ہے۔ چِتا انسان کو چِتا تک پہنچا دیتی ہے!

س۔ کیا ہنسنے والے کی عمر دوسروں سے زیادہ ہوتی ہے؟

ج۔ جی ہاں ـــــ زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔

شیخ علاؤالدین، شیخ لیسین۔ مالیگاؤں

س۔ میرے گال اندر دھنس گئے ہیں کوئی مناسب ورزش یا نسخہ بتائیے۔

ج۔ جب تک پوری حالت معلوم نہ ہو، کسی مرض کے ازالہ کے لئے علاج بتانا اندھیرے میں تیر چلانا ہوگا۔ آپ کو کسی مقامی معالج سے رجوع کرنا چاہئے۔

بلقیس بانو۔ پورولیا

س۔ ہندوستان میں گرانی بڑھتی کیوں جارہی ہے؟

ج۔ اس لئے کہ مصنوعی گرانی بڑھانے کے لئے ذخیرہ اندوزوں کو کھلی چھوٹ ہے!

س۔ کب بے پردگی بے باک بنادیتی ہے؟

ج۔ جی ہاں

ع۔ ص۔ نیتی۔ کریم گنج۔ گیا

س۔ غم کیا ہے؟

ج۔ خوشی کا دوسرا روپ!

س۔ آج جینے کے لئے کیا ضروری ہے؟

ج۔ حضرت جگر مرادآبادی نے فرمایا ہے ؎

یہ مصرعہ کاش نقشِ ہر در و دیوار ہو جائے
جسے جینا ہو مرنے کے لئے تیار ہو جائے!

س۔ خوش قسمت انسان خدا سے کیا مانگتا ہے؟

ج۔ خدا کی خوشنودی۔

سیّد ذوالفقار افضل۔ ڈالٹن گنج۔ پلاموں

س۔ انسان غم سے کب محبت کرتا ہے؟

ج۔ جب اسے غم کا عرفان حاصل ہوجاتا ہے۔

س۔ پھول کے ساتھ کانٹے کیوں رہتے ہیں؟

ج۔ پھول کی حفاظت کے لئے۔

ہری نرائن جھا۔ جبل پور

س۔ کوچین کہاں ہے؟

ج۔ جنوبی بھارت میں۔

مُبین انصاری۔ بنگلور

س۔ کچھ اچھی باتیں بتائیے جنھیں میں اپنی بیاض میں محفوظ کرلوں۔

ج۔
- خدا کے نزدیک سب سے پسندیدہ بات آدمی کی سچی بات ہے۔
- لوگوں میں سب سے افضل وہ ہے جو دل کا نرم اور زبان کا سچا ہے۔
- کتابوں کا مطالعہ دماغ کو روشن کرتا ہے۔
- دوسروں کے ساتھ ایسا سلوک ہرگز نہ کرو جسے تم اپنے لئے پسند نہیں کرتے۔
- سعی و عمل میں برکت ہے۔
- دوسروں کی زندگی کے آئینہ میں اپنے لئے راہِ عمل تلاش کرو۔

س۔ کوئی طنزیہ شعر سنائیے۔

ج۔ حضرت اکبر الٰہ آبادی نے کبھی فرمایا تھا ؎

عابدہ چپکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی!

ابرار انصاری۔ جمشید پور

س۔ دولت مند بننے کا راز کیا ہے؟

ج۔ دولت حاصل کرنے کے لئے عزم محکم جہد پیہم

س۔ علامہ اقبال کے چند اشعار سنائیے۔

ج۔ اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِّ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی
اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی!

محمد ادریس بیرسٹ۔ جمشید پور

س۔ کیا ہر ناکامی کے پس منظر میں کامیابی کا راز پنہاں ہوتا ہے؟

ج۔ جی ہاں۔

س۔ کیا کسی کے کام آجانا [illegible]

ج۔ جی ہاں۔ [illegible]

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر [illegible] ـــــ مطبوعہ [illegible] دہلی۔ تصاویر [illegible] دہلی ـــــ [illegible]

[illegible]

BISWIN SADI
37th YEAR OF PUBLICATION
Telephones Office. 271637 Residence.61992

RADIUM TONIC PILLS

نیا خون — نئی طاقت

کمزوری کا زبردست علاج

ریڈیم ٹانک پلز



نیا خون بکثرت پیدا کر کے نہ صرف کمزوری دُور کرتی ہیں بلکہ جسم میں زبردست طاقت بڑھاتی ہیں۔ وزن اور خون کئی پونڈ بڑھ جاتا ہے۔ کھوئی ہوئی طاقت اور صحت واپس لانے کے لئے مُلک کے کونے کونے میں مشہور و مقبول ہیں اور لاکھوں انسان روزانہ استعمال کرتے ہیں۔ کمزوری خواہ کسی وجہ سے ہو کمزور سے کمزور انسان کو بھی نئی طاقت حاصل ہوتی ہے۔ تندرست نوجوان ریڈیم ٹانک پلز کے علاج سے اپنی طاقت کئی گُنا بڑھا سکتے ہیں۔ قیمت مکمل علاج صرف چھ روپے۔ محصول ڈاک علاوہ۔

کلکتہ ایجنٹ:-
امین اینڈ اسمٰعیل پرائیویٹ لمیٹڈ
نمبر ۸۰ کولوٹولا اسٹریٹ کلکتہ ۱

پتہ:- ریڈیم کیمیکل ورکس (پرائیویٹ) لمیٹڈ پوسٹ بکس نمبر ۱۳۵۱ دہلی


اپریل
Biswin Sadi
DELHI.
Rs. 130



دَم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا ـــــ غالبؔ

فوٹو: شورج این مٹھ



اُردو کے آفاقی شاعر مرزا اسداللہ خاں غالؔب کی عظیم یادگار، غالب اکیڈمی بستی نظام الدین، نئی دہلی میں گذشتہ دنوں "بزمِ سازوادب" کی طرف سے جشنِ جمہوریت زیرِ صدارت مدیرِ "بیسویں صدی" دِلّی منایا گیا۔ اِس کیف آگیں تقریب میں بزمِ مُشاعرہ کے علاوہ محفل شعرونغمہ بھی منعقد کی گئی۔ رسمِ افتتاح شریمتی سبھدرا جوشی ممبر پارلیمنٹ نے اپنی فاضلانہ تقریر سے انجام دی۔ اِس جلسہ میں دانشور، اساتذہ، شعراء واُدباء اور فنکاروں کے علاوہ شہر کے ممتاز شہریوں نے شرکت کی۔ تقریب کا آغاز "بزمِ سازوادب" کے صدر جنابِ ذہین نقوی نے اپنے ابتدائیہ کلمات سے کیا۔ جس میں اُنھوں نے جشنِ جمہوریت کی ثقافتی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ "ایسی ثقافتی شامیں جو قومی یکجہتی اور جذباتی آہنگی کی آئینہ دار ہوتی ہیں، ہمارے مُلک کو صحت مند خیالات اور تعمیری رُجحانات عطا کرتی ہیں اور ہمارے علمی وادبی ذوق کو سنوارتی ہیں"۔——— خوشتر گرامی مدیرِ "بیسویں صدی" نے اپنے صدارتی خُطبہ میں کہا "اُردو زبان کی اپنے ہی وطن میں جڑیں کاٹی جارہی ہیں اور اب شاخوں کو پانی دیا جارہا ہے۔ حکومت نے اُردو کی ترقی کے لئے ایک کروڑ کی رقم وقف کی ہے، مگر جب تک اسکولوں میں اُردو کی تعلیم کا انتظام نہیں ہوتا اور اِسے کوئی سرکاری حیثیت نہیں دی جاتی اُس وقت تک اِس رقم سے اُردو کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔ شریمتی اندرا گاندھی بلاشُبہ اُردو کی ترقی چاہتی ہیں، مگر اُن کے بہت سے مُنافق کانگریسی ساتھی جن کا ظاہر اور باطن ایک نہیں، وُہ اُردو کی جڑیں کاٹ رہے ہیں...."



جناب رفعت سروش نے میرِ مشاعرہ کے فرائض بھی انجام دیئے، اپنے اشعار کی منہ بولتی تفسیر بنے فرما رہے ہیں۔

اپنے گھر، اپنی دھرتی کی، آس لئے بُو باس لئے ۔۔۔ جنگل جنگل گھوم رہا ہوں جنم جنم کی پیاس لئے

جتنے موتی، کنکر، اور خذف تھے اپنے پاس لئے ۔۔۔ میں انجانے سفر پر نکلا مدھر ملن کی آس لئے

کچی گاگر پھوٹ نہ جائے نازک شیشہ ٹوٹ نہ جائے ۔۔۔ جیون کی پگڈنڈی پر چلتا ہوں یہ احساس لئے

وہ ننھی سی خواہش اب بھی دِل کو جلائے رکھنی ہے ۔۔۔ جس کے تیاگ کی خاطر میں نے کتنے ہی بن باس لئے

سوچ رہی ہے کیسے آشاؤں کا نشیمن بنتا ہے ۔۔۔ من کی چڑیا تن کے دوارے بیٹھی چونچ میں گھاس لئے

جب پربت پر برف گرے گی سب پنچھی اُڑجائیں گے ۔۔۔ جھیل کنارے جا بیٹھیں گے اِک انجانی پیاس لئے

چھوڑ کے سنگھرشوں کے جھنجھٹ توڑ کے دُنیا کے رشتے

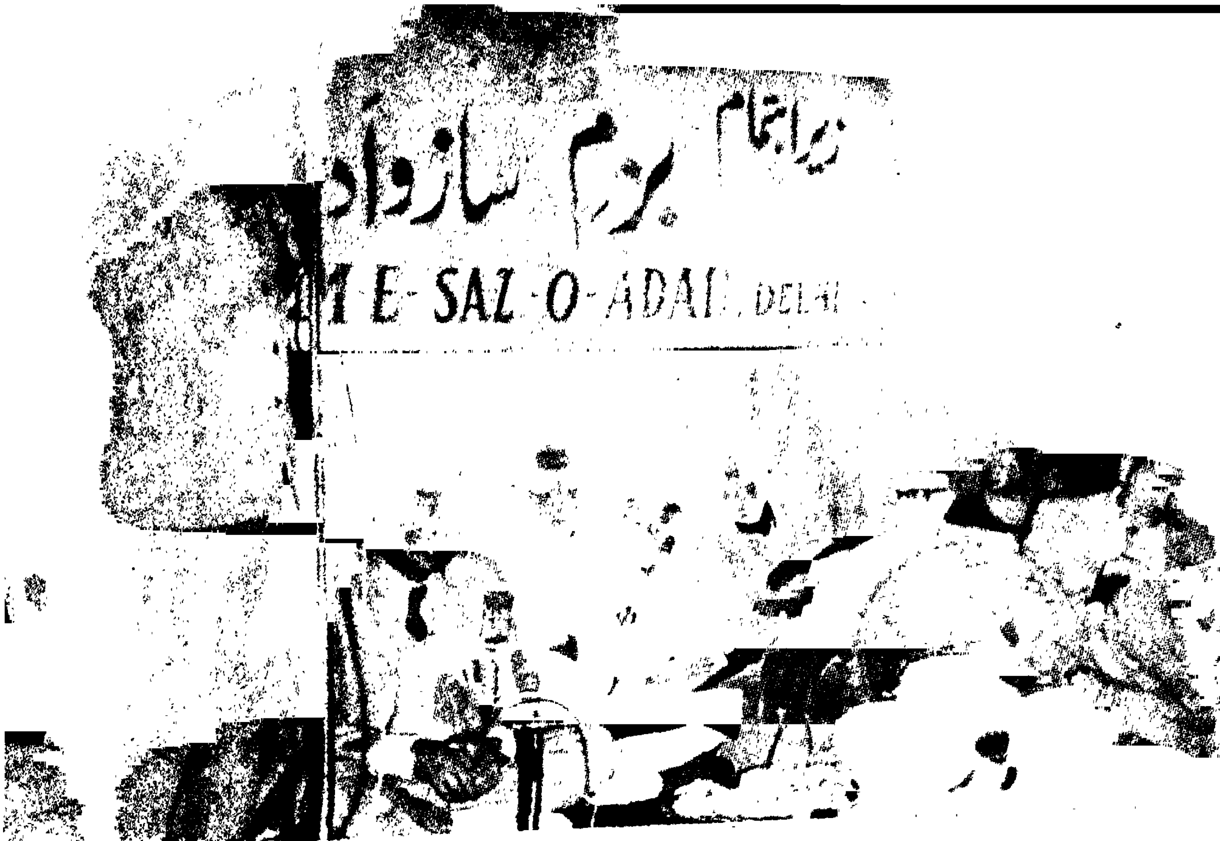
گوتم برگد کے سائے میں بیٹھا ہے بن باس لئے



کلام کی شگفتگی جناب کمالؔ احمد صدیقی کے چہرے پر تبسم بن کر کھیل گئی اور محفل کی فضا گویا زبانِ حال سے کہہ رہی ہے۔ ——— تبسم ہی تبسم اب زمیں سے آسماں تک ہے۔

نا صحو اُس کی سُناؤ کہ ذرا جی بہلے ⁞ کوئی جاکر اُسے لاؤ کہ ذرا جی بہلے
کتنی بے رنگ ہے ماحول کی یک رنگی بھی ⁞ کوئی تصویر بناؤ کہ ذرا جی بہلے
ایک مُدّت سے ہے ویران یہ دِل کی بستی ⁞ تھوڑی ہی دیر کو آؤ کہ ذرا جی بہلے
رات ہے، رات کا سناٹا ہے، تاریکی ہے ⁞ یاد کی شمعیں جلاؤ کہ ذرا جی بہلے
مے نہیں ہے نہ سہی میکدہ پھر میکدہ ہے ⁞ جام خالی ہی اُٹھاؤ کہ ذرا جی بہلے
ہائے یہ کشمکشِ وہم و یقیں کیا کہیے ⁞ کوئی چلمن ہی اُٹھاؤ کہ ذرا جی بہلے
کوئی نوخیز حقیقت ہو برافگندہ نقاب ⁞ پھر کوئی خواب سجاؤ کہ ذرا جی بہلے

میں نے خوابوں سے حقیقت کو جگایا ہے کمالؔ
تُم مرے خواب جگاؤ کہ ذرا جی بہلے



ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر جناب واجد سحری خود اعتمادی کے ساتھ اپنی غزل پیش کر رہے ہیں۔

ادا کے ساتھ یوں چلے کہ شاخِ گل لچک گئی
وہ زلف جب بکھر گئی فضا مہک مہک گئی
چمن میں کوئی شاخِ گل اگر کبھی لچک گئی
جمالِ دلفریب سے ہٹی ہی تھی ذرا نظر
ہے یہ بھی مخلصوں کی اک ادائے خاص دوستو!
وہ زلف عطر بیز تھی وہ چشم بادہ ریز تھی
رہِ وفا میں ٹھوکریں، نصیب کی یہ بات ہے

جدھر سے وہ گزر گئے وہ رہ گزر مہک گئی
نقابِ رخ سرک گیا تو چاندنی چھٹک گئی
یہ کیوں سمجھ لیا گیا گلوں سے اب مہک گئی
وہ ہنس کے پوچھنے لگے نگاہِ شوق تھک گئی؟
کسی سے جب کھٹک گئی تو سمجھو بس کھٹک گئی
سنا ہے ساری انجمن مہک گئی بہک گئی
جسے یہ مل گئیں اسی کی زندگی چمک گئی

بتاؤ واجدِ حزیں دیا ہے تم نے کس کو دل؟
چھپانا اب فضول ہے خبر یہ دور تک گئی

بیسویں صدی
دہلی

تیر و نشتر

خوشتر گرامی

• پاکستان کو چین سے بھاری تعداد میں ہتھیاروں کی سپلائی" ایک خبر ——— ضائع کرنے کے لئے۔ جیسے پہلے دو مرتبہ کئے ہیں۔

• اقلیتوں سے متعلق مرکز میں نئی وزارت بنائی جائے" ایک مطالبہ ——— وزارت بنتے ہی اقلیتوں کے تمام مسئلے حل ہو جائیں گے۔

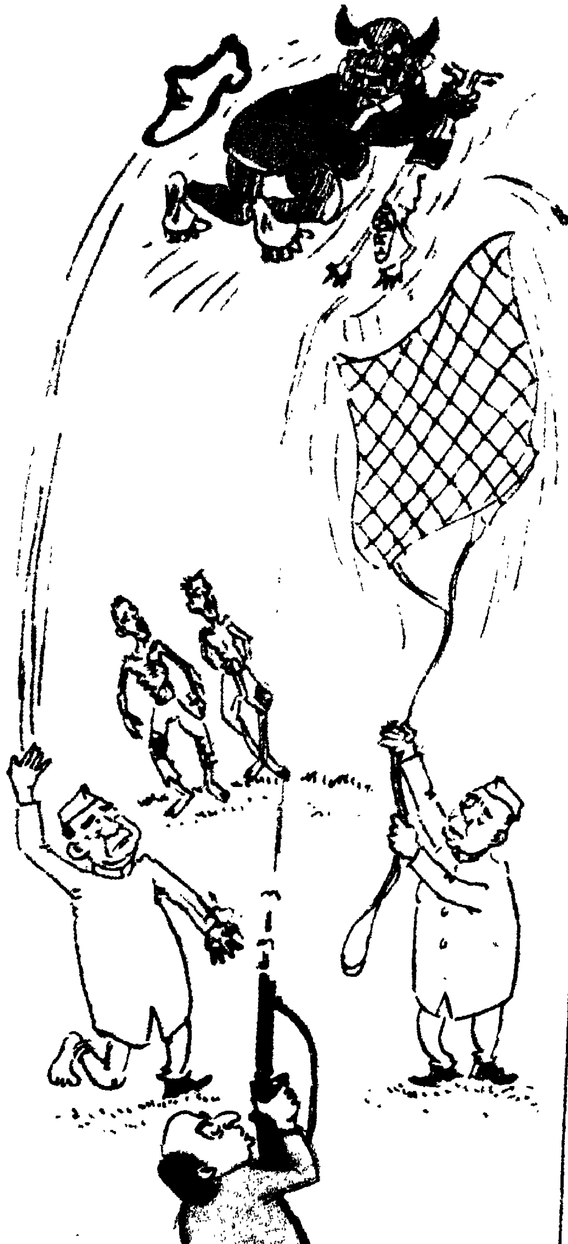
• غریبی نہیں غریب ہٹ رہے ہیں" ایک عنوان ——— اور ان کے ہٹ جانے کے بعد غریبی کا خاتمہ خود بخود ہو جائے گا۔

• چو۔ این۔ لائی نے پاکستان سے لفظی ہمدردی کا اظہار کیا ہے" ایک خبر ——— چینی محبت کا معیار یہی ہے۔ لینے دینے کے نام پر خاک محبت پاک۔

• ریلوے کرایہ اور بھاڑے میں اضافہ سے مہنگائی بڑھے گی" ایک عنوان ———

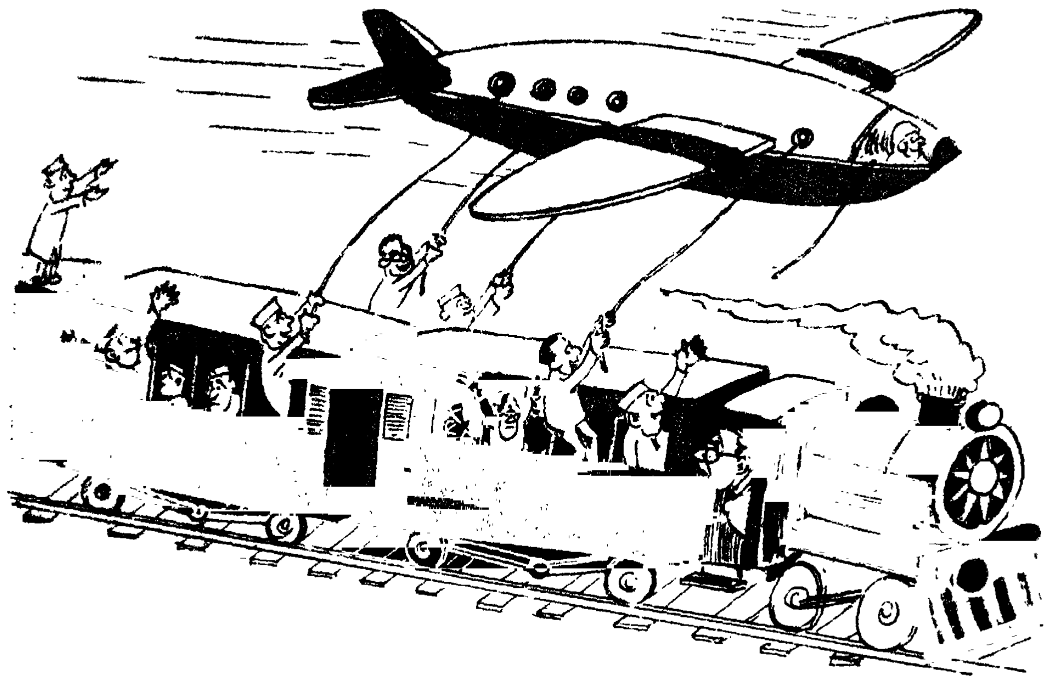
- پھر پارلیمنٹ میں ہنگامہ ہوگا۔ التوا کی تحریکیں اور توجہ دلاؤ نوٹس پیش ہوں گے۔
- جلسے، جلوس اور مظاہرے ہوں گے۔ سیاہ جھنڈیاں دکھائی جائیں گی اور نعرے لگیں گے۔
- تنخواہ کمیشن مقرر ہوں گے۔
- انٹرم ریلیف دینا پڑے گا۔
- تنخواہ میں اضافہ ہوگا۔
- اور مہنگائی پہلے سے بھی بڑھ جائے گی۔

• "ہانسی میں مہنگائی" ——— جس کی سب نے ہنسی اڑائی۔



مہنگائی

بیسویں صدی دہلی اپریل ۱۹۷۲ء



ریلوے کرایہ میں اضافہ

"ایّوب خاں کے غیر سرکاری وزیرِاعظم پیرزادہ بھی گرفتار" ایک خبر — ایّوب خاں شکر کریں کہ ابھی تک بچے ہوئے ہیں۔

"دِلّی میں دُودھ اور مہنگا ہوگا" ایک خبر — پانی مِلاکر سستا کر لیجئے گا۔

"تین بچّوں کی ماں نے غُربت کی وجہ سے خودکشی کر لی" ایک خبر — اور غریبی ہٹانے کا نُسخہ بتا گئی۔

"پاکستان میں چینی کی قِلّت" ایک خبر — بیگم بھٹّو کے چین سے لَوٹ آنے کے بعد چینی کی ریل پیل ہو جائے گی۔

"غذائیت سے بھرپُور گندم کا آٹا" ایک عنوان — سُنا ہے علاؤالدّین خلجی کے زمانے میں مِلتا تھا اور رُوپے کا ۲½ من۔

"تعلیم کے موجودہ ڈھانچہ میں تبدیلی کی سخت ضرورت ہے" ایک عنوان — اور تبدیلی ایسی ہو کہ بچّے پڑھیں نہ لکھیں اور کہلائیں محمد فاضل۔

"امریکی ڈالر کی قیمت گِر گئی" — صدر نکسن کی ساکھ گِر جانے کا نتیجہ۔

"علیحدگی کی تحریک کو تیز کرو" جن سنگھی لیڈر باجپائی کا آندھرا کو مشورہ — ع

شرم تم کو مگر نہیں آتی

"آدنی چیتھڑوں کی گانٹھیں ریلیز کرنے کا فیصلہ" ایک خبر — یعنی اب کی بار گرمی میں بھی چاندنی چوک دِلّی میں گرم کوٹوں کا گرما گرم بیوپار ہوگا۔

"راجدھانی کا ایک ہسپتال جس میں ذمہ داران ندارد"—— راجدھانی کا نہیں اندھیر نگری چوپٹ راج کا ہسپتال ہوگا۔

"ہم کہاں کھڑے ہیں؟" ایک عنوان——

- جہاں ریلوں اور بسوں میں سفر محفوظ نہیں۔
- جہاں ریلوے اسٹیشن، ڈاک اور تار گھر، ٹیلیفون کی عمارتیں اور تھانے محفوظ نہیں۔
- جہاں پتھراؤ، لاٹھی چارج، آنسو گیس اور گولی کا دور دورہ ہے۔
- جہاں نہ مال کی حفاظت کی ضمانت نہ جان کی۔
- جہاں عورتوں پر حملے ہوتے ہیں۔ بچّوں پر ہاتھ اُٹھائے جاتے ہیں۔
- جہاں اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں لڑکیوں کو رُسوا کیا جاتا ہے۔

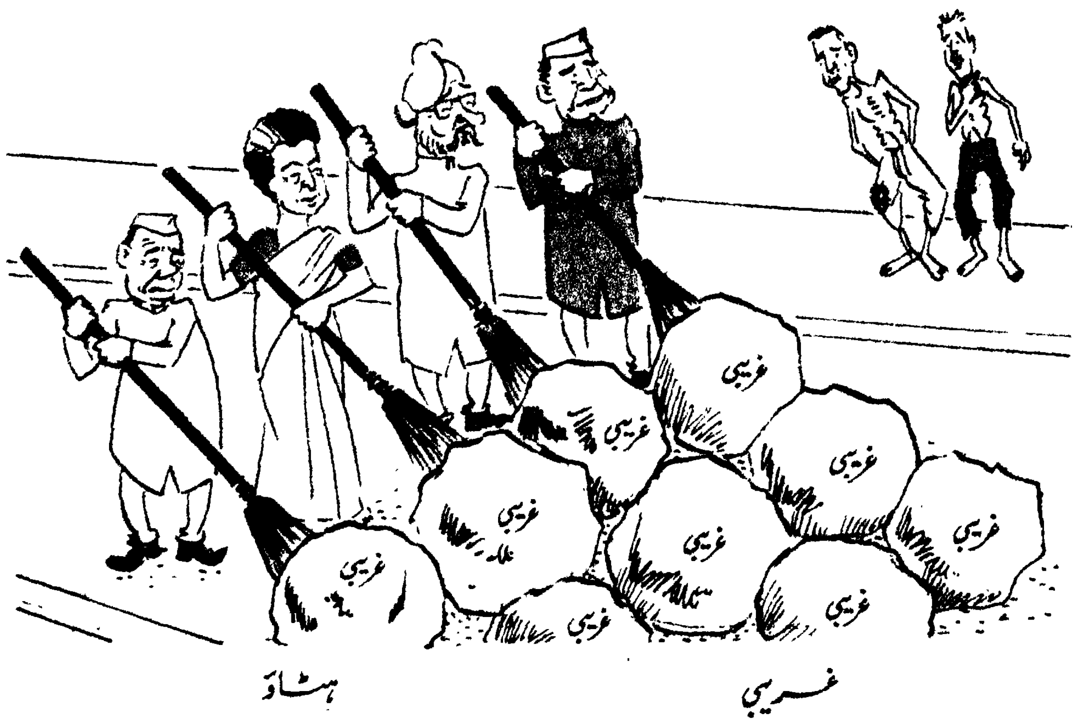
"فریدآباد میں اشیائے ضروریہ کی مہنگائی" ایک خبر—— اشیائے غیر ضروری تو سستی ہوں گی انھیں دھڑا دھڑ خرید ڈالیں۔

"سنگھار ہائی اسکول کو نیچر دیجئے"—— کنگھا، شیشہ اور چٹلہ موجود ہے۔

"اُستاد پر خیانت کا الزام" ایک خبر—— لائق شاگردوں کا کارنامہ۔

"کانپور میں اُردو سروے" ایک خبر—— اصل کام اُردو دشمنوں کے سروے کا ہے۔

"باپ نے بیٹے کو گروی رکھ دیا" ایک خبر—— کوئی بات نہیں عصائے پیری جو تھا۔



غریبی ہٹاؤ



دِلّی میں یومِ غالب

"پاکستان کے سابق وزیرِ قانون کا لڑکا گرفتار" ایک خبر —— گرفتار نہیں لاقانونی کا شکار۔

"آندولنوں کے سوا چارہ ہی کیا ہے" ایک عنوان —— یہ اقتدار سے محروم لوگوں کا نعرہ ہے۔

"بچے زیادہ پیدا کرو۔ روسی والدین کو مشورہ" ایک عنوان —— ہندوستانی والدین کو مشورہ :۔

دو یا تین اور بس۔
اگلا بچہ ابھی نہیں، تین کے بعد کبھی نہیں۔
چھوٹا پریوار سُکھی پریوار۔
خاندانی منصوبہ بندی بڑی عقلمندی۔

"سیمنٹ کی کمی" ایک خبر —— پتھر کے کوئلے کی راکھ مِلا کر دُور کیجیے۔

"مولانا آزاد کا پیغام آج بھی ہمارے لئے مشعلِ راہ ہے" صدرِ کانگریس —— اور مولانا آزاد کا مزار آج اپنی کسمپرسی کے لئے فریاد کر رہا ہے۔

"چھ بچوں کی ماں کا معاشقہ" ایک خبر —— بچے ہیں دفعہ ۱۴۴ تو نہیں جو معاشقہ روک دیتے۔

"نظام الدین سے لاش مِلی" —— اِس میں تعجب کیا ہے۔ وہاں چپّہ چپّہ پر قبریں جو ہیں۔

"پاکستان میں نئے فوجی افسروں کی تلاش" ایک خبر —— پُرانے مقیّد افسروں کو چھڑانے سے بے پروائی کا ثبوت۔

"آمدنی چھپانے پر سَو فیصدی تاوان" گورنمنٹ کا فیصلہ —— اور رِشوت سے آمدنی بڑھانے پر کتنا تاوان؟

• غلام احمد فرقت کی یاد" ایک عنوان —— ع
آئی جو اس کی یاد تو آتی چلی گئی

• یو۔ پی کے پرائمری ٹیچروں میں ایک ایک اردو ٹیچر" ایک خبر —— ع
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

"یو۔ پی کے وزیر اعلیٰ کملا پتی ترپاٹھی مسز اندرا گاندھی سے ملے" ایک خبر —— لیکن اردو کے متعلق رائے پھر بھی نہ بدلی۔

• مزار مرزا غالب پر یوم غالب" ایک خبر —— اسی لئے غالب نے کہا تھا ؎

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

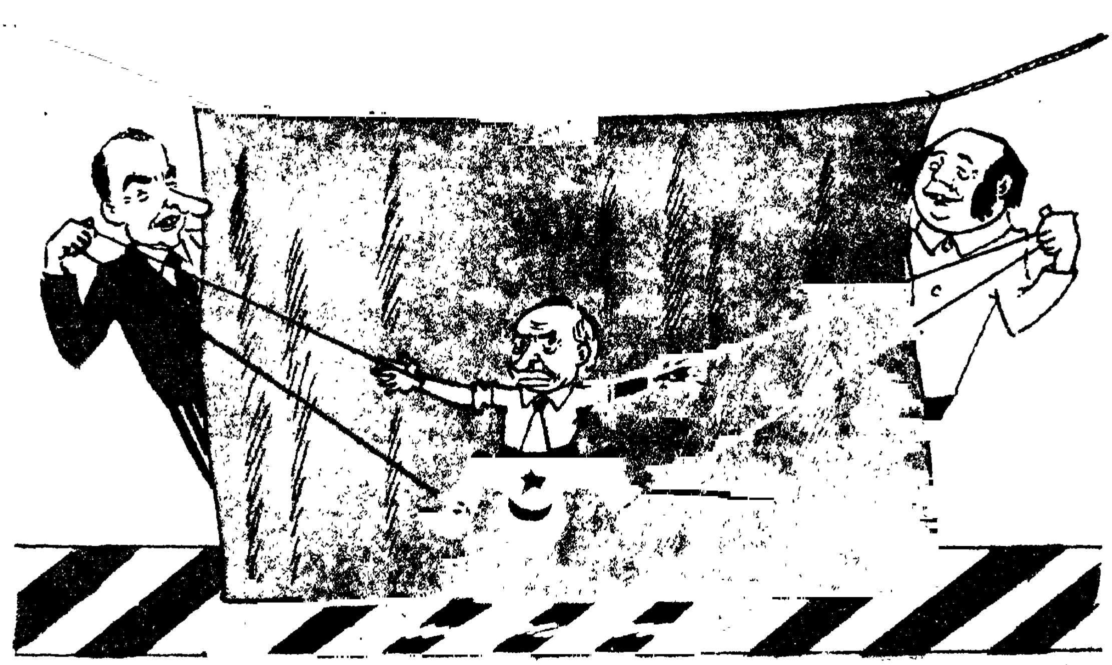
• ہڑتالی ٹیچر نااہل، کام چور اور شرابی ہیں" بنسی لال کے ارشادات —— اور وزیر سب فرشتے اور لائق۔

• برات کی بس نہر میں گر گئی" —— دولہا کے ساتھ سب نے اشنان کر لیا۔

• حکومت ہند اور حکومت دلی اردو کے فروغ کے لئے اقدامات کریں گی" ایک خبر —— لیکن ؎

ترے وعدے پہ جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

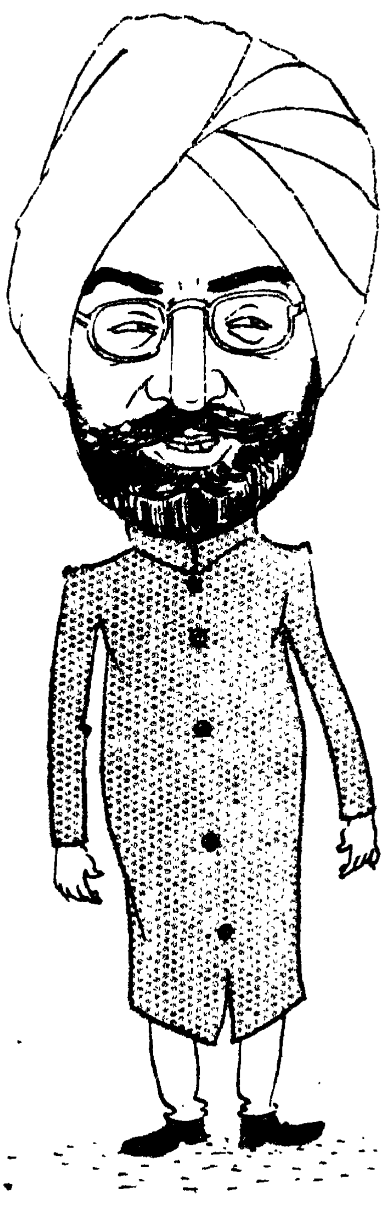
" دروازہ پر آٹا" ایک عنوان —— یہاں دو کانوں تک نہ ملنے کی شکایت ہے آپ دروازہ کی بات کرتے ہیں۔



"بھٹو امریکہ اور چین کی کٹھ پتلی" ایک عنوان

گیانی ذیل سنگھ

خوشتر گرامی



سروقد، سجیلا بدن، کشادہ جبیں، بڑی بڑی دُور بیں آنکھیں، اُونچی ناک جس نے پنجاب کی ناک اُونچی کی۔ نکھرا رنگ، خوبصورت داڑھی، خوشنما خدوخال سونے پر سہاگہ۔ اِس حلیہ کے ہیں پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ ———

گیانی ذیل سنگھ

کھدر پوش بلکہ سرتاپا کھدر بھنڈار۔ شیروانی، چوڑی دار پاجامہ لباس۔ سُریلی آواز، میٹھے بول سُننے والے کا دل موہ لیتے ہیں۔ پنجاب کی وزارتِ اعلیٰ حق بحقدار رسید کے مصداق ملی ہے ——— پنجاب کی مُردہ کانگرس کو حیاتِ نَو دینا اور اکالیوں، جن سنگھیوں کے چُنگل سے آزاد کراکر پنجاب کو سیکولر اور سوشلسٹ راہ پر چلانا آپ کے تمام کارناموں میں ہمیشہ سرِفہرست رہے گا ——— مذہبی اعتبار سے جتنے خُدا پرست ہیں، سیاسی اعتبار سے اُتنے ہی کٹر سوشلسٹ ہیں۔ لیکن آپ کی خُدا پرستی اور سوشلزم میں کہیں تصادم نہیں ——— سترہ برس کی عُمر میں سیاست میں قدم رکھا اور پرجا منڈل قائم کی۔ اب تک اُس سے دوگنی سے بھی زیادہ عُمر سیاست کی وادیٔ پُرخار میں گزار چکے ہیں۔ ایثار و قُربانی، تپ اور تیاگ کی بھٹیوں اور قید و بند کی صعوبتوں سے گزر کر اس منزل تک پہنچے ہیں۔ ضلع فریدکوٹ کے رہنے والے ہیں اِس لئے بابا فرید کی محبت گھُٹی میں پڑی ہے۔ انسان کے ہاتھ میں مَوت و حیات ہوتی تو مہاراجہ فریدکوٹ نے آپ کے کیس جیپ سے بندھوا کر اور سڑکوں پر کھنچوا کے آپ کو مروا ڈالنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی مگر مَوت و حیات کے حقیقی مالک، عزت و ذِلت دینے پر قادر ذاتِ پروردگار نے آپ کے لئے عزت اور مہاراجہ فریدکوٹ کے لئے گمنامی کی ذِلت مخصوص کر رکھی تھی ——— آپ اقلیتوں اور پسماندہ طبقوں کے مفاد اور کلچر سے خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اُردو دوست، اُردو نواز اور اُردو کو اُس کا صحیح مقام دینے کے زبردست حامی ہیں ——— آپ نے ایک ورکر سے لیڈر، پردیش کانگرس کے صدر اور چیف منسٹر بننے کے تمام مراحل نیک نامی سے طے کئے ہیں اور ایک ایسی شخصیت بن گئے ہیں کہ ؏

[illegible]

پرائی چیز

عُمر عادل

جامع مسجد، قلعہ، بریلی

خوشتر بھائی! تسلیم

برسوں کے بعد "پرائی چیز" کے ساتھ حاضر ہوا ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ پہچان لیں گے ——— یہ ایک سچی کہانی ہے (اگرچہ نئی نہیں) عائشہ کا کردار ایک حقیقت ہے اور عورت کی عظمت کے ایک پہلو کو اُجاگر کرتا ہے۔ یہ کردار بھی نیا نہیں ہے اور یہ پہلو بھی۔ لیکن اچھے لوگ، اچھی چیزیں ہوتی ہی اِس لئے ہیں کہ اُن سے ملتے رہا جائے، اُنھیں دیکھا جاتا رہے تاکہ اِس کلجگ سے اچھائیاں جو رہ گئی ہیں مِٹ نہ جائیں . . .

مخلص ——— عُمر عادل

★

رنگ برنگی روشنیوں، رنگ رنگ کے لباسوں، قہقہوں اور ڈھولک کی تھاپ پر اُبھرنے والے گیتوں کو پیچھے چھوڑ کر جب میں آگے بڑھ گیا ہوں تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کسی خوبصورت خواب سے بیدار ہو گیا ہوں ——— اور یہ سامنے کی پگڈنڈی جو کھیتوں اور اونچے نیچے ٹیلوں کے درمیان بَل کھاتی ہوئی شہر کی سڑک سے مل جاتی ہے، مجھے ایک حقیقت محسوس ہو رہی ہے۔

جیسے پیچھے ایک خواب ہے ——— اور میرے سامنے ایک حقیقت ہے ——— مگر نہیں، بات تو اِس کے بالکل برعکس ہے۔ میرے گھر کے آنگن سے اُبھرنے والی یہ روشنیاں، گیتوں کی یہ آوازیں تو مستقبل کے اُس قافلے کا شور ہیں جو میرے مستقبل کی طرف جا رہا ہے ——— اور چاندنی کو جسم سے لپیٹے ہوئے یہ خاموش پگڈنڈی میرے ماضی کی طرف جاتی ہے اور ماضی کبھی حقیقت نہیں ہوتا ——— ماضی تو خواب ہوتا ہے۔ حقیقت تو یہ روشنیاں، یہ گیت ہیں۔ اور یہ پگڈنڈی تو صرف ایک خواب ہے! چلو خواب ہی سہی۔ خواب کی بھی تو ایک حقیقت ہوتی ہے۔

مجھے اِس پگڈنڈی پر عائشہ نظر آ رہی ہے!

اُونچی سی فراک اور شلوار پہنے، ململ کے دوپٹے سے سر ڈھکے ہوئے، قرآن شریف کو سینے سے لگائے ہوئے چھوٹی سی عائشہ اور میں مدرسہ میں قرآن شریف پڑھنے جاتے تھے۔ شلوار کے اُونچے پائینچوں کے نیچے، چاندی کی پازیب میں پڑے ہوئے ننھے ننھے گھنگھروؤں کی ہلکی ہلکی آواز کے ساتھ حرکت کرتے ہوئے عائشہ کے چھوٹے چھوٹے پاؤں مجھے اُس وقت بھی کتنے اچھے لگتے تھے۔ میں عائشہ کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے اُس کے پاؤں کو دیکھتا رہتا تھا اور ایسے میں ایک دن ٹھوکر لگی تو قرآن شریف میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

"کیا ہوا ———؟" عائشہ چلتے چلتے رُک گئی۔

"یہ ——— یہ گر گیا ———" میں اِس احساس سے خوفزدہ نہیں ہو گیا کہ قرآن شریف کی بے ادبی ہو گئی، بلکہ اِس خیال سے کہ اب پھر عائشہ اِس بے ادبی کی شکایت مولوی صاحب سے کر دے گی۔

"ہائے اللہ ——— جلدی اُٹھاؤ ——— اِسے چُوم لو ورنہ اللہ میاں ناراض ہوں گے ———" عائشہ بولی اور میں نے قرآن شریف کو

اٹھا کر چوم لیا۔

"دیکھتے ہوئے نہیں چلتے؟" عائشہ بولی۔

"دیکھتا ہُوا ہی تو چل رہا تھا ـــــ" میں نے کہا۔

"کیا دیکھ رہے تھے ـــــ؟" عائشہ بولی۔

"تمھارے پاؤں ـــــ" میں نے بغیر کچھ سوچے سمجھے بہت ملائمت سے سچ بول دیا۔

"اب تو اس کے برابر اناج تول کر فقیر کو دینا پڑے گا جیسے اُس دن تم نے شہید کر دیا تھا تو خالہ نے تولا تھا۔"

"اماں پھر دے دیں گی۔"

"پہلے تو مدرسہ چلو۔ مولوی صاحب سے کہہ کر مار پڑواؤں گی تو پتہ چلے گا ـــــ کہوں گی یہ میرے پاؤں دیکھ دیکھ کر چلتا ہے ـــــ" عائشہ نے مجھے ڈراتے ہوئے کہا اور میں اُس کی خوشامد کرنے لگا۔

"لو یہ پراٹھا کھا لو!" میں نے ناشتہ دان اُس کی طرف بڑھا دیا۔

"نہیں میں پرائی چیز نہیں لیتی" عائشہ نے میرا ہاتھ پیچھے ہٹا دیا۔

پگڈنڈی کتنی سُونی ہوتی جا رہی ہے۔ اُس پہ چلتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے آخری ملاقات پر کسی کو اُس کے گھر تک چھوڑنے جا رہا ہوں۔ جب میں قُرآن شریف ختم کر کے ایک مکتب میں داخل ہو گیا تھا تب بھی میں اور عائشہ پگڈنڈی کا یہ سفر ساتھ ساتھ طے کرتے تھے۔ میں اُسے مدرسہ تک چھوڑنے جاتا تھا۔ جب بھی اُس کے پاؤں مجھے اچھے معلوم ہوتے تھے۔ پگڈنڈی کا کوئی کنکر اُس کے چپل میں آ جاتا تھا اور عائشہ ٹھہر کر پاؤں کو جھٹکتی تو پنڈلی سے لپٹی ہوئی پازیب کے گھنگھروؤں کی آواز میری نگاہوں کو اُس کے پاؤں کی طرف پکار لیتی تھی۔

ایک دن ـــــ

ہم دونوں ساتھ جا رہے تھے کہ مجھے پگڈنڈی پر پڑا ہُوا کسی کا بچھوا نظر پڑا۔

"دیکھو عائشہ یہ کیا؟" میں نے بہت خوشی سے عائشہ کو پکارا جو چند قدم آگے بڑھ چکی تھی۔

"کیا ہے ـــــ؟" عائشہ پلٹ آئی۔

"یہ ـــــ یہ بچھوا ـــــ اُٹھا لو عائشہ! تم پہن لینا۔"

"نہ بھیا میں پرائی چیز نہ لوں گی ـــــ" عائشہ بچھوے کے پاس سے ہٹ گئی۔

مجھے بہت مایوسی سی ہوئی۔ بچھوے کو دیکھ کر ایک لمحے میں میں نے یہ تصوّر کیا تھا کہ یہ عائشہ کے پاؤں میں کتنا اچھا معلوم ہوگا!

یہ تصوّر میری زندگی میں حُسن کا پہلا تصوّر تھا ـــــ اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ اِس تصوّر کا سِلسلہ بڑھتا گیا ـــــ اُبھرتا گیا۔ یہاں تک کہ ایک دن آپا کے پَیروں میں مہندی دیکھ کر میں نے عائشہ کے پَیروں میں حِنا کی سُرخی کی خواہش کی اور صُبح اسکول جاتے ہوئے تھوڑی سی مہندی عائشہ کے لئے لے گیا۔

پگڈنڈی پر سوئی ہوئی رات گہری ہوتی جا رہی ہے۔ اب یہاں ٹیلوں کے درمیان کچھ عمارتیں بن گئی ہیں۔ چند کھیتوں میں رہٹ کی جگہ ٹیوب ویل لگ گئے ہیں۔ وقت کے ساتھ تبدیلیاں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ یہ پگڈنڈی شہر کی جس سڑک سے ملتی ہے وہ اُن دنوں کچّی تھی جب میں اور عائشہ پرائمری اسکول میں پڑھتے تھے۔ پھر جب ہم مڈل اسکول میں جانے لگے تو کچّی سڑک نے تارکول کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔

عائشہ بھی سیاہ بُرقعہ پہننے لگی تھی۔ ہم دونوں اب بھی اپنے اپنے گھروں سے نکل کر شہر کی سڑک پر کچھ دُور تک ساتھ رہتے تھے۔ پھر عائشہ لڑکیوں کے اسکول کی طرف مُڑ جاتی تھی۔

اُس دن جب میں نے عائشہ کے لئے آپا کی مہندی چُرائی تھی تو سیاہ بُرقعے کے سائے میں سیاہ چپل میں چھُپے ہوئے عائشہ کے پَیروں کو دیکھ کر جب میں نے اُن پر حِنا کی سُرخی کا تصوّر کیا تھا تو اُس خوبصورتی نے میرے اندر ایک جِھجک سی پیدا کر دی تھی اور عائشہ کو مہندی دینے کی ہِمّت نہیں پڑی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے اسکول کے موڑ پر مجھ سے الگ ہو گئی۔

واپسی پر بڑی ہِمّت کر کے میں نے گھر سے کچھ پہلے اُسے روک لیا تھا۔

"ایک مِنٹ ٹھہرنا ـــــ"

"کیوں؟"
"میں تمہارے لئے ایک چیز لایا ہوں!"
"کیا؟"
"یہ مہندی!"

آدھے چہرے سے لپٹی ہوئی نقاب کے درمیان سے عائشہ کی آنکھیں چند لمحے مہندی کو گھورتی رہیں۔ کلائیوں میں پڑی ہوئی کانچ کی چوڑیاں ایک لمحے کو جھنجھنائیں جیسے مہندی لینے کو ہاتھ بڑھانا چاہا ہو۔

"میں پرائی چیز نہیں لیتی" — عائشہ نے آہستہ سے کہا۔

"کیا بات کرتی ہو بچوں جیسی" — میں جھنجھلا گیا — "اب تو تم بڑی ہو گئی ہو، سمجھ دار ہو —"

"تم بھی تو سمجھ دار ہو —"

"ہاں میں تو ہوں —"

"تو پھر سمجھو نا — مہندی لڑکیاں کب لگاتی ہیں —؟"

عائشہ نے مسکرا کر نگاہیں جھکا لیں اور آگے بڑھ گئی۔

میں اپنی جگہ کھڑا سوچتا رہا کہ جب عائشہ کی شادی ہوگی، وہ دلہن بنے گی اور اس کے پیروں میں مہندی کی سرخی ابھرے گی تو پیر کتنے خوبصورت نظر آئیں گے!

جب میں ڈگری کالج کا طالب علم تھا اور عائشہ انٹرمیڈیٹ میں پڑھ رہی تھی — جب بھی ہم دونوں اس پگڈنڈی کا سفر ساتھ ساتھ طے کرتے تھے۔ شہر کی سڑک سے وہ رکشا کر لیتی تھی اور میں سائیکل پر جاتا تھا۔

تب عائشہ کا ہر انداز بدل گیا تھا۔ اونچی سی شلوار اور فراک کی جگہ اپنے نئے طرز کے جمپر اور رنگ برنگے دھاگوں سے کڑھے ہوئے شلوار کے نیچے اور تنگ پائینچوں نے لے لی تھی — کبھی سینڈل، کبھی ہلکا سا چپل اس کے پاؤں میں کتنا اچھا لگتا تھا — عائشہ کا بہت کچھ بدل گیا تھا مگر اس کے پیروں کی کشش میں کوئی فرق نہ آیا تھا — پگڈنڈی کا راستہ میں اس کے پیچھے پیچھے چل کر طے کرتا تھا اور کبھی کبھی وہ مجھے ٹوک دیتی تھی۔

"یہ لوفروں کی طرح پیچھے پیچھے کیوں چلتے ہو؟"



میں اسے سمجھاتا تھا کہ تنگ پگڈنڈی پر مع سائیکل کے برابر برابر چلنے میں دشواری ہوتی ہے۔ یہ کبھی نہیں کہتا تھا کہ برابر برابر چلنے میں اس کے پاؤں اچھی طرح نظر نہیں آتے۔

لیکن ایک دن میں نے یہ بات عائشہ کو بتا دی تھی اور تب اس نے کہا —

"ہٹو بھی —" عائشہ نے ایسی آواز میں کہا تھا جو زندگی میں میں نے پہلے کبھی نہ سنی تھی اور یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایسی چمک ابھری تھی جو میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔

میں نے اس آواز کو اپنے دل میں چھپا لیا اور راتوں کی تنہائیوں میں یہ آواز میری دھڑکنوں میں ابھر کر دیر تک جگانے لگی — آنکھوں کی اس چمک نے میرے وجود کے گرد ایسے چراغ جلا دیے جن کی روشنی میں جب دنیا کی نگاہوں سے چھپ کر میں عائشہ سے ملتا تو زندگی کتنی اجلی، کتنی خوبصورت نظر آتی!

ہم دونوں نے اس پگڈنڈی کے ارد گرد اونچے اونچے ٹیلوں، جھاڑیوں اور کھیتوں کی جوان فصلوں کی آڑ میں آئندہ

زندگی کے کتنے خواب دیکھے تھے ـــــ کتنے منصوبے بنائے تھے کتنے عہد و پیمان اور حوصلے ایک دُوسرے کو دیتے تھے اور میں نے اُس دن کا انتظار کیا تھا جب عائشہ کے پیروں میں حنا کی سُرخی رچے گی اور جوڑے کی لالی کے سائے میں اُس کے قدم میرے ساتھ ایک نئی زندگی کے رستے پر اُٹھیں گے!

پھر ایک دن عائشہ کے پاؤں میں مہندی رچی ـــــ سُنہری پازیب اور بچھوئے بجے اور جوڑے کی سُرخی اُن پر بکھر گئی اور وہ تمام عہد و پیمان، تمام حوصلے جو ہم نے ایک دُوسرے کو دیئے تھے صرف آنسو بن کر رہ گئے!

دُلہن بنی عائشہ کے پاس جب میں چند منٹ کی تنہائی میں گیا تھا تو اُس نے گھبرا کر اپنے پیروں کو غرارے کے پائنچوں میں چھپا لیا تھا۔

"میں نے تو سُنا تھا کہ دُلہنیں چہرہ چھپاتی ہیں تم کیسی دُلہن ہو؟" میں نے کہا اور عائشہ نے جلدی سے اپنے چہرے پر آنچل کھینچ لیا۔

"یہ انگوٹھی ـــــ یہ تمہاری شادی پر کوئی تحفہ نہیں ـــــ یہ صرف ایک نشانی ہے ـــــ" میں نے عائشہ کی اُنگلی میں انگوٹھی پہناتے ہوئے کہا تو اُس نے اپنا ہاتھ کھینچنا چاہا۔

"کیوں ـــــ پرائی چیز ہے کیا ـــــ؟" میں نے کہا اور عائشہ نے اپنا ہاتھ ڈھیلا چھوڑ دیا۔

دُلہن بنی عائشہ کے پاس یہ چند لمحے مجھے اُس تمام مُدّت کی طرح طویل محسوس ہوئے جو ہم نے اِس پگڈنڈی پر مدرسہ سے کالج تک گزاری تھی۔

یہ سڑک جو شہر کی طرف جا رہی ہے رات کے اِس حصّے میں پگڈنڈی کی طرح سونی ہے۔ لیکن اندھیری نہیں اور یہ اندھیری ہو بھی کیسے سکتی ہے۔ اِس پر اب تک وہ تیز روشنیاں بکھری ہوئی ہیں جن کے سائے میں عائشہ دُلہن بن کر سلمان کے دیس گئی تھی۔

کبھی پرائی چیز نہ لینے والی عائشہ خود پرائی چیز بن گئی۔ لیکن میں پھر بھی اُسے پرائی محسوس نہ کر سکا۔ عائشہ نے مجھے ایسا محسوس ہی نہ ہونے دیا۔ وہ جب بھی اپنے میکے آتی مجھ سے ضرور ملتی، کبھی گھر پر، کبھی اُس پگڈنڈی پر ہم گھنٹوں باتیں کرتے ـــــ ایسی باتیں جن میں ماضی کا کوئی ذکر اور اُس کی ازدواجی زندگی کا کوئی احساس نہ ہوتا تھا، کوئی تمنا، کوئی خواب ہمارے درمیان نہ تھا۔ لیکن پھر بھی میں محسوس کرتا تھا کہ کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ عائشہ وہی عائشہ تھی اور اُس کے ہونٹوں پر وہی مُسکراہٹ، آواز میں وہی انداز اور آنکھوں میں وہی چمک تھی جسے شعور کی حدوں پر میں نے پایا تھا۔

جب بھی پنڈی جانے کا موقع ملتا، میں سلمان کے پاس ضرور جاتا۔ عائشہ سے ملتا اور دو چار دن ہم دونوں سلمان کی موجودگی اور عدم موجودگی میں بہت خوبصورت وقت گزارتے۔

ایک دن میں نے عائشہ سے پوچھا تھا۔

"تمہیں اِس میں کوئی اُلجھن محسوس نہیں ہوتی کہ ایک طرف تو تم مجھ سے آج بھی محبت کرتی ہو اور دُوسری طرف سلمان کی وفادار بیوی بھی ہو!"

"نہیں ـــــ" عائشہ نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا تھا ـــــ "میرے ذہن میں کوئی اُلجھن نہیں، دل میں کوئی چور نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میری شخصیت کے دو حصّے ہو گئے ہیں ـــــ ایک عائشہ سلمان کی وفادار بیوی ہے، اُس کے بچّے کی ماں ہے اور سلمان کو چاہتی ہے ـــــ ایک عائشہ میں ہوں جس نے تمہیں چاہا اور ہم دونوں میں کوئی جھوٹا نہیں، کوئی مجرم اور گنہگار بھی نہیں۔ ہم دونوں وفادار ہیں۔"

"کبھی کبھی سوچتا ہوں تو یہ سب بہت عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ تم سلمان کی بیوی ہو، اُس کے بچّے کی ماں ہو، مگر میں تمہیں پھر بھی ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے پہلے کرتا تھا ـــــ ایسا جیسے کوئی اپنا اور صرف اپنا ہو!" میں نے کہا۔

"میں خود تمہیں اپنا محسوس کرتی ہوں اور اس کے ساتھ ہی مجھے یہ احساس ہمیشہ رہتا ہے کہ میں سلمان کی ہوں میرے دل میں اُن کے لئے ایک چاہ بھی ہے۔ میرے لئے بھی یہ عجیب سی بات ہے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم دونوں کے راستے ہمیشہ کے لئے الگ ہو چکے، تمہیں میں اپنا محسوس کرتی ہوں [illegible]

میں اس کے آگے بالکل لاچار اور مجبور ہوں ــــ" عائشہ نے کہا۔

اور اُس وقت میں نے عائشہ سے دل کی وہ بات بھی کہہ دی جو اب تک نہیں کہی تھی۔

"سنو عائشہ ــــ میں چاہتا ہوں کہ ــــ کہ . . ." میں کہتے کہتے رُک گیا۔

"کیا چاہتے ہو ــــ" عائشہ نے میری جھجک محسوس کر لی۔

"عائشہ! اگر میں تم سے کہوں کہ اِس گھر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر میرے گھر آجاؤ ــــ تو ــــ" "یہ ناممکن بھی نہیں اور بھاری۔"

"خدارا یہ بات مجھ سے نہ کہنا۔ ورنہ میرے دل میں ایک چور پیدا ہو جائے گا ــــ" عائشہ گھبرا سی گئی ــــ "اگر تم ایسا کہو گے تو میں تم سے پھر کبھی نہ ملوں گی ــــ یہ رشتہ جو ہمارے درمیان ہے ــــ یہ نازک سا پاک سا رشتہ داغدار ہو کر ٹوٹ جائے گا اور میں، میرے دل کا چور . . ."

عائشہ سِسکیاں لے کر رونے لگی اور جب اُس نے خود کو سنبھالا تو پہلی بار مجھ سے کہا کہ تمھیں بھی زندگی کا کوئی ساتھی تلاش کر لینا چاہیئے۔

شہر جانے والی سڑک پر وہ کار میرے قریب سے ابھی ابھی گزری ہے جس میں عائشہ میری شادی میں شرکت کے بعد پنڈی واپس چلی گئی ہے۔

عائشہ ایک ماہ پہلے میرے گھر آئی تھی۔ اپنی آمد کے پہلے دن اُس نے میرے سامنے طاہرہ کی ہزاروں تعریفیں کر کے مجھ سے کہا تھا کہ میں اُسے اپنا لوں ــــ پھر یہ اصرار کبھی ضد، کبھی خوشامد، کبھی خواہش اور کبھی حکم کا رنگ اختیار کرتا رہا۔

اور آج جب عائشہ واپس گئی ہے تو میرے لئے طاہرہ کو دُلہن کے روپ میں چھوڑ گئی ہے۔

اِس ایک مہینے میں، میں نے محسوس کیا کہ عائشہ کی صرف ایک شخصیت رہ گئی تھی ــــ اُس پگڈنڈی پر ساتھ چلتے ہوئے، میرے سامنے شادی کے لئے اصرار کرتے ہوئے، ڈھولک پر تھاپ دیتے ہوئے ہر وقت وہ مجھے صرف عائشہ نظر آئی۔

اُس وقت بھی جب وہ دُلہن بنی ہوئی طاہرہ کو پالکی سے اُتار کر اِس طرح سہارا دیتی ہوئی گھر میں لا رہی تھی جیسے طاہرہ کوئی بہت عزیز، بہت بیش قیمت اور نازک سی چیز ہے۔ ذرا ٹھیس لگی تو ٹوٹ جائے گی۔

لیکن اُس وقت عائشہ مجھے صرف سلمان کی بیوی اور اُس کے بچے کی ماں محسوس ہوئی جب اُس نے ایک تنہا گوشے میں مجھے لے جا کر میرے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا اور چھوٹی سی ایک ڈبیہ دے کر کہا۔

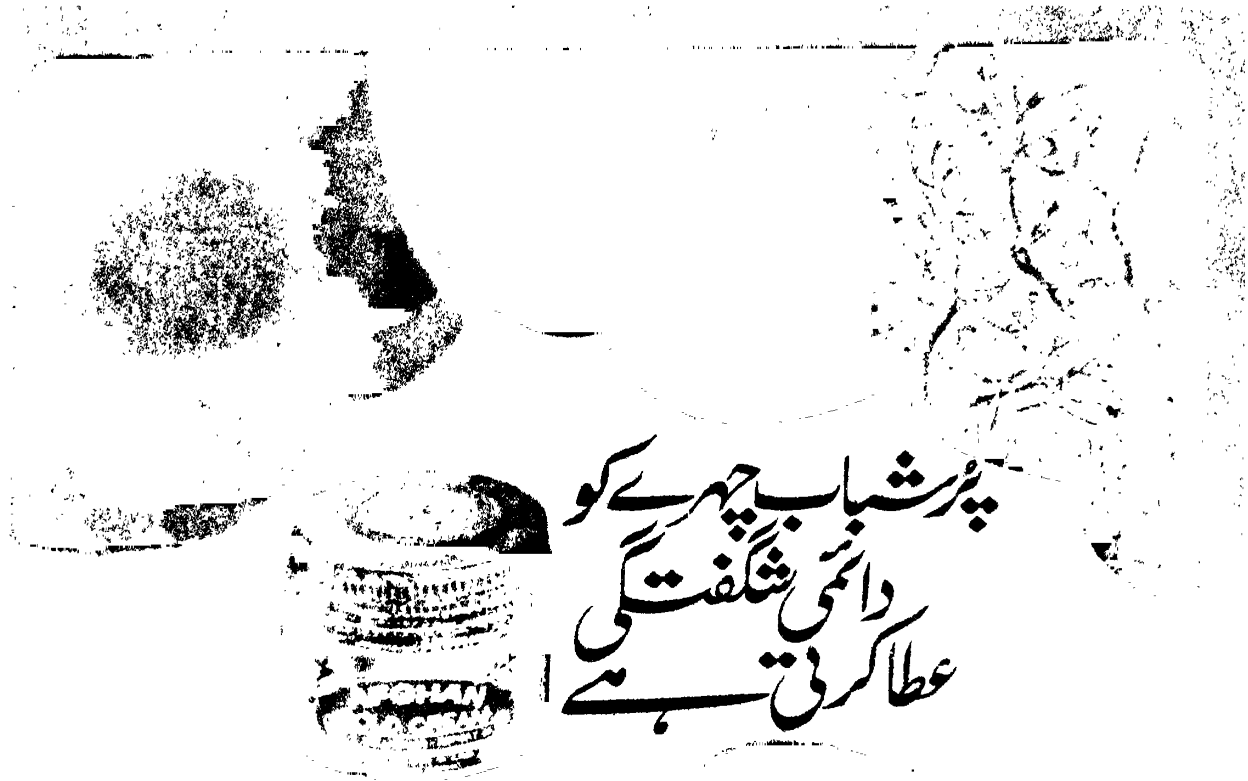
"میں جا رہی ہوں ــــ ابھی ــــ سلمان میرا انتظار کر رہے ہوں گے ــــ"

اور پھر مہمانوں کے ہنگاموں میں اِس طرح کھو گئی کہ پھر میں اُسے نہ پا سکا۔

کاغذ کے اُس ٹکڑے پر لکھا تھا ــــ

"میری یہ خواہش اور ضرورت ہے کہ کاغذ کا یہ
چھوٹا سا ٹکڑا ــــ یہ مختصر سی تحریر ہمارے درمیان
آخری رابطہ ــــ آخری تعلق ہو!
سُنو ــــ زندگی سے دو چیزیں میں نے
بہت قیمتی پائی تھیں۔ مجھے ہمیشہ بہت عزیز رہی تھیں
ــــ ایک یہ انگوٹھی جو تم نے مجھے دی تھی ــــ ایک
وہ دل جس نے بچپن سے مجھے چاہا تھا!
یہ دونوں چیزیں لوٹا رہی ہوں۔ اب یہ طاہرہ
کی ہیں۔ اُسے دے دینا ــــ تم تو جانتے ہو میں پرائی
چیز نہیں لیتی . . .!!"

مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ مضمون حاشیہ چھوڑ کر روشنائی سے صفحہ کے ایک طرف لکھا کریں اور دو سطروں کے درمیان فاصلہ چھوڑنا بہت ضروری ہے۔ بعض اچھے مضامین محض بدخط ہونے کی وجہ سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں۔ ہمیشہ غیر مطبوعہ مضامین بھیجیں اور ایڈیٹر کی اطلاع کے لئے مضمون کے خاتمے پر غیر مطبوعہ لکھیں۔ بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں۔ یہ نہایت نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اپنے پاس مضمون کی نقل ضرور رکھیں کیونکہ ناقابلِ اشاعت مضامین ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔ ناقابلِ اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجے جائیں۔ پہلے چھپا ہوا لکھا ہوا پتہ ٹکٹ لگا لفافہ ارسال کریں ورنہ ہم مضمون کی واپسی سے قاصر رہیں گے۔ منیجر



غزل

محمد عثمان عارف نقشبندی ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی، ممبر پارلیمنٹ

رنگ سو سو نہ بدل اِتنے تو منظر نہ بنا
پیاس اِتنی نہ بڑھا دل کو سمندر نہ بنا

ناز و غمزہ میں تبسم کی شرارت کیوں ہے
دل میں چبھنے لگیں ایسا انھیں نشتر نہ بنا

قیمتی لاکھ ہو، پتھر تو ہے پتھر آخر
اشک میں جوہرِ غم ہے اسے گوہر نہ بنا

تُو مجھے پیارا ہے سو جان سے پیارا لیکن
میری تقدیر نہ بن خود کو مقدر نہ بنا

نقرئی سکے ترے ناز کی قیمت تو نہیں
حسن زیور ہے ترا جسم کو زیور نہ بنا

شعلے احساس کے جذبات کے طوفاں بھرے
دل بنا دل کو، تراشا ہوا پتھر نہ بنا

جان لینے کے لئے زُلفِ پریشاں کافی
آئینہ دیکھ کے گیسوئے مُعنبر نہ بنا

ہر بڑے در سے کوئی آس لگاتا کیا ہے
دستِ اُمید کو یوں بھیک کی چادر نہ بنا

آنکھ میں بھر نہ سکے ہاتھ سے بھی چھو نہ سکے
حسن کو صرف خیالوں کا تو پیکر نہ بنا

پیار سے بادِ صبا نے نہیں چھیڑا جب تک
پھول غنچہ نہ ہوا، کھل کے وہ ساغر نہ بنا

اتنا حیران ہے کیوں جلووں سے اُس کے عارف
دل کا معبود بنا آنکھ کا محور نہ بنا

[illegible] اپریل ۱۹۶۷ء

غزل

پرکاش ناتھ پرویز ایم۔ اے

ہم نے قلبِ مضطر پر جب بھی چوٹ کھائی ہے
اپنی خوش نصیبی پر زیست مسکرائی ہے

موسمِ خزاں کا یہ جیسے کوئی نغمہ ہو
رُوح کے خرابے سے اِک صدا سی آئی ہے

اُن کے سُرخ ہونٹوں کے پھول مسکرا اُٹھے
ہم نے دل کے زخموں کی یُوں بھی داد پائی ہے

صُبحِ نو سے رشتہ ہے اُن حسین چہروں کا
جن حسین چہروں سے میری آشنائی ہے

زندگی کی پلکوں پر کچھ دیئے سے جل اُٹھے
اپنے عہدِ رفتہ کی جب کبھی یاد آئی ہے

رسم و راہ پنہاں ہے پُرفسوں اندھیرے سے
اُن کی زُلفِ شب گوں تک اِن دنوں رسائی ہے

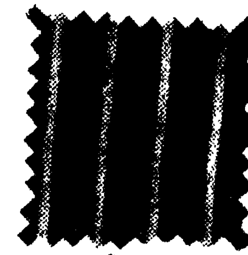
ختم ہی نہیں ہوتے سلسلے سرابوں کے
کس مقام پر ہم کو زیست لے کے آئی ہے

لفظ لفظ بکھری ہے داستاں محبت کی
کل جو بات اپنی تھی آج وہ پرائی ہے

تھم کے رہ گیا شاید دردِ بے کسی پرویز
اِک خفیف سا آنسُو ماحصلِ جُدائی ہے



اگر آپ کو ٹائی پہننے کی عادت ہے



تب تو قمیض اور سوٹ
بامبے ڈائنگ کیپیتان شرٹنگ اور واڈرین سوٹنگ کا ہی پہنئے۔

کیونکہ ٹائی کے ساتھ کچھ خاص طرح کے کپڑے کی بنی قمیض، اور سوٹ ہی سجتے ہیں۔ ایسا کپڑا آپ کو بامبے ڈائنگ کی 'ٹیرین' بلینڈ کیپیتان شرٹنگ اور واڈرین سوٹنگ کے بے شمار ڈیزائنوں، رنگوں اور بناوٹوں میں آسانی سے مل جاتا ہے۔ اسکے علاوہ بامبے ڈائنگ ہر مہینے ۲۵-۲۰ نئے شرٹنگ ڈیزائن پیش کرتے ہیں۔ کئی طرح کے اسٹرائپس، چیکس، اور مردانے رنگوں میں ملنے والی بامبے ڈائنگ کی کیپیتان شرٹنگ اور واڈرین سوٹنگ آپ کی انفرادیت کو برقرار رکھتی ہے۔

اونچا کپڑا، مناسب دام
بامبے ڈائنگ، ایک نام

کیپیتان شرٹنگ
واڈرین سوٹنگ

TERENE

® ...

بامبے ڈائنگ

بیسویں صدی دہلی اپریل ۱۹۸۲ء

Ulka-BDM-1 Urd

سُرخ آنچل

خواجہ معین الدین

مکان نمبر ۵-۴-۲/۱۴ ، ماتیم چلکہ، نلگنڈہ (اے۔پی)

اخلاص پرور اسلام خلوص

"ادھورا سپنا" کی اشاعت کا بے حد شکریہ! اس کی پسندیدگی کے بہت سے خطوط موصول ہوئے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ "بیسویں صدی" ملک کے گوشے گوشے میں پڑھا جاتا ہے۔ ان تمام بلند ذوق قارئین کا میں شکر گزار ہوں —— لیجئے، ایک تازہ ترین افسانہ "سُرخ آنچل" حاضرِ خدمت ہے۔ اُمید ہے قارئین کو ضرور متاثر کرے گا۔ اگر ایسا ہُوا تو سمجھوں گا کہ میری محنت کا صلہ مل گیا۔ اشعار کی نوک پلک سنوار لیجئے گا۔

خلوص آگیں —— خواجہ معین الدین

★

سارے کالج میں چہل پہل تھی۔ سب اپنے اپنے نئے سُوٹ میں ملبوس تھے۔ ہر طرف لڑکیوں کی ٹولیاں، جیسے قاف کی پریاں —— بات بے بات پر قہقہوں کے فوارے —— ایسا معلوم ہوتا تھا ویرانے میں بہار آگئی ہے! لان پر سلمیٰ، صبا، ناہید اور اختر تبسم بیٹھی لہک لہک کر باتیں کر رہی تھیں۔ تبسم کے گداز جسم پر سُرخ ساڑی بہت پیاری معلوم ہو رہی تھی۔ اُس کے گلابی لبوں پر ہلکی مُسکراہٹ مچل رہی تھی۔

سلمیٰ نے لہراتی ریشمی زُلفوں کو اپنی پیشانی سے ہٹاتے ہوئے کہا: "آج پروفیسر قادری صاحب کی ادبی تقریر میں بہت لُطف آئے گا۔ شاید اُنھیں سے پروگرام کا آغاز ہوگا۔"

ناہید نے کہا: "اُن کے بغیر بھی کوئی کلچرل پروگرام کامیاب رہا ہے؟"

صبا نے اپنے دوپٹے سے چہرے پر بکھری پسینے کی بُوندیں صاف کرتے ہوئے کہا: "ارے آپ تو ساجد صاحب ہی کو نظر انداز کر بیٹھے!"

ناہید نے کہا: "ساجد تبسم کہئے۔ ورنہ منیری اختر ناراض ہو جائے گی!"

اختر نے حیرت بھری نگاہوں سے ناہید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "بھلا میں کیوں ناراض ہو جاؤں گی؟ مجھے اُس تبسم سے کیا لینا ہے؟"

سلمیٰ نے کہا: "ہمیں کیا معلوم؟ اُنھیں سے جاکر پُوچھیے کہ اُنھوں نے کس لئے آپ کے نام کو اپنا تخلص بنا رکھا ہے؟"

صبا نے کہا: "تخلص ہی کیا کہتی ہو؟ اپنے خیالوں کی ملکہ، اپنے دل کی شہزادی بنا رکھا ہے!"

تبسم کے نازک لبوں پر مُسکراہٹ کی لکیریں بکھر گئیں۔ بارِ حیا سے اُس کا چہرہ گُلنار ہو گیا۔ پلکیں جُھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ ناہید کو اُس کی خموشی کاٹ رہی تھی۔ تبسم کو چھیڑتے ہوئے وہ خوشی محسوس کرتی تھی۔ کہنے لگی۔

"ساجد صاحب کا نام آگیا۔ اختر صاحبہ کا مُنہ بند ہو گیا۔ کیا گزر رہی ہے میری جان کے دل پر؟"

"پھر وہی بات! میری جان لو گے تم سب مل کر؟" وہ زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔

سلمیٰ نے کہا: "خیر بھئی۔ آج بھری محفل میں آپ کے 'وہ' کوئی نئی غزل سنائیں گے۔ تب تمھیں بھی یقین ہو جائے گا۔"

سب نے ایک ساتھ قہقہہ بلند کیا۔ اختر نے شرما کر اپنا چہرہ ساڑی کے آنچل میں چھپا لیا۔

وہ ایک دوسرے کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہی تھیں کہ اتنے میں مائک میں اناؤنسر کی آواز گونجی: "سارے حضرات سے گزارش ہے کہ وہ سٹیج کی آگے والی کرسیوں پر بیٹھ جائیں تھوڑی ہی دیر میں پروگرام شروع ہوگا۔"

سارے طلباء سٹیج کی طرف بڑھنے لگے۔ سلمیٰ، صبا، ناہید اور اختر تبسم بھی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ پروفیسر قادری نے اپنی دلچسپ تقریر سے ساری محفل کو محظوظ کیا۔ جمیل، کلیم، ریاض، ضیا اور قربان نے اپنے کلام سے سننے والوں کو مسحور کر دیا۔ اناؤنسر نے ساجد تبسم کا نام لیا۔ ساری محفل میں تالیوں کی آواز گونج اٹھی۔ سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ نظریں منتظر تھیں۔ سلمیٰ، ناہید اور صبا بے چینی سے انتظار کر رہی تھیں۔ اختر خاموش اپنا سر جھکائے بیٹھی رہی۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک خوبرو نوجوان سفید سوٹ میں ملبوس سٹیج پر آگیا۔ ایک بار اپنی نظر سامعین پر ڈالی۔ اُس کی نظریں سرخ لباس میں ملبوس اختر تبسم پر مرکوز ہو گئیں۔ وہ اپنی غزل سنانے لگا۔ سلمیٰ، صبا اور ناہید ساجد کی ہر حرکت کو بغور دیکھ رہی تھیں۔ اختر کے نازک لبوں پر ہلکی مسکراہٹ کبھی کبھی مچلتی نظر آرہی تھی۔ ساجد غزل پڑھتے ہوئے اِس شعر پر آپہنچا ؎

مرے طرزِ بیاں سے تیرے دل پر کیا گزرتی ہے؟
بھری محفل میں دل کا راز لب پر بار بار آیا!

چاروں طرف سے مکرر کی آوازیں گونج اٹھیں۔ ساجد نے بار بار یہ شعر سنایا۔

سلمیٰ نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اختر کی جانب بڑھا کر اشارہ کیا۔ ناہید نے کہا: "میری جان! ذرا اُن کی طرف دیکھ لے کیسی درد بھری آواز ہے!"

تبسم کے نازک ہونٹوں پر محبوب مسکراہٹ نکھر آئی۔

ساجد نے مقطع پیش کیا ؎

بہت مشکل سے کٹتے تھے مرے شام و سحر لیکن
ترے لب پر تبسم دیکھ کر دل کو قرار آیا!"

بزم میں ہر طرف سے مکرر کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ لیکن ساجد تبسم کبھی کا سٹیج چھوڑ چکا تھا۔

سلمیٰ نے اختر کو اپنی جانب کھینچ کر کہا: "بڑی بے درد ہو تم! بیچارے کی تڑپ پر تو رحم کھاؤ!"

صبا نے کہا: "سنا؟ ساجد بھائی غزل سناتے ہوئے کس سے مخاطب تھے؟"

اختر تبسم ہنسی روکنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ آخر کھل کھلا کر ہنس دی اور کہا: "بہت اچھی بہن ہو۔ مبارکباد دینا ہی بھول گئیں۔"

"ہاں! تمھارے خیال میں کھو کر سب کچھ بھول گئی۔ اب جا کر کہوں گی آپ کی جانِ غزل کو آپ کی غزل بہت پسند آئی!" کہتے ہوئے وہ ساجد کی طرف بڑھی۔

اختر نے کہا: "صبا کی معصومیت تو انتہا کو پہنچ گئی!"

ناہید نے کہا: "سلمیٰ! دیکھا! اُنکی تعریف ہو رہی ہے۔ یہ ایسا تو حال ہے!" یہ کہتے ہوئے اُس نے ایک سرد آہ بھر دی۔ اختر نے سلمیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ ناہید تو بہت شریر ہے۔ قربان سے کہہ دوں گی کہ ذرا اچھی طرح خبر لیں۔"

سلمیٰ نے کہا: "قربان صاحب اِن کی کیا خبر لیں گے۔ یہ شریر ہی اُن کی خبر لے گی!" وہ ایک دوسرے پر فقرے چست کر کے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

اور بھی کئی غزلیں سنائی گئیں۔ ڈرامہ ہوا۔ رات کے تین بجے قومی ترانے کے ساتھ پروگرام ختم ہو گیا۔ لوگ چاروں طرف بکھر گئے۔ سلمیٰ، صبا اور ناہید اختر سے اجازت لے کر ایک ہی ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی گئیں۔ اختر ٹیکسی کی منتظر تھی۔ وہ آہستہ آہستہ روڈ کی طرف بڑھنے لگی۔ اُسے کوٹھی پہنچنا تھا۔ ساجد اختر کو دیکھتے ہی اُس کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچ کر "آداب" کہا۔

وہ گھبرا کر گھومی۔ سامنے وہی ساجد تھا جسے کالج کی ہر لڑکی

اپنا چہرہ چھپا لیتی۔ وہ شرما گئی۔

"میں شرمندہ ہوں۔ مجھ سے پہلے آپ ہی نے آداب کہا۔"

"واہ! اِس میں شرمندگی کی کیا بات ہے؟"

"خیر چھوڑئیے یہ بات۔ آپ کی غزل مجھے بےحد پسند آئی۔"

"شکریہ!"

"لیکن مجھے آپ سے شکایت بھی ہے!"

"کہیے، خاکسار سے کیا گستاخی ہوئی؟"

"آپ کے تخلص سے مجھ پر بُری طرح اثر پڑتا ہے۔"

"یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"میرا نام اختر بیگم ہے۔"

ساجد نے مسکراتے ہوئے کہا: "ہاں سمجھا۔ لیکن اب اپنا تخلص کیسے بدل سکتا ہوں؟ کیا اِس سے آپ پر کوئی بُرا اثر پڑتا ہے؟"

"....؟"

"کیا آپ میرا نام اپنے نام کے بائیں طرف بھی لکھنا پسند نہیں کریں؟"

"میں ایسے سُہانے سپنے دیکھنے کے قابل بھی نہیں ہوں۔"

"یہ آپ کہتی ہیں؟ آپ میں کیا کمی ہے؟ اختر! پھر ایسا نہ کہئے۔ ہر انسان کو اپنی زندگی خوشگوار بنانے کا حق ہے۔"

"....؟" وہ خاموش نظریں جُھکائے کھڑی رہی۔

"اختر! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔"

"کہیے۔"

"کیا میں آپ کے پیار کے قابل ہوں؟"

"ایسا نہ کہئے ساجد! اِس بدنصیب کی قسمت اِتنی بلند نہیں ہو سکتی؟"

"آپ اپنے آپ کو بدنصیب کہتے ہوئے میرے دل میں نشتر نہ چُبھوئیے۔ میں آپ سے پیار کرتا ہوں۔ جب سے میں نے آپ کو دیکھا ہے آپ کی محبت پانے کے لئے تڑپتا ہوں۔"

"لیکن میں مجبور ہوں ساجد!"

"اِن بہانوں سے ساجد کے دل کا خون نہ کیجیے۔"

آگے سے ٹیکسی آ رہی تھی۔ ساجد نے آواز دے کر روک لیا۔ اختر آہستہ آہستہ ٹیکسی کی طرف بڑھی۔ اُس نے اپنے پرس سے ایک کارڈ نکال کر ساجد کو دیتے ہوئے کہا: "کل آپ اِسی پتہ پر آئیے۔" ہاتھ ٹیکسی کے باہر لہرانے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

دُوسرے دن ناشتے کے بعد وہ بار بار کارڈ نکال کر پڑھنے لگا۔ نو بجے کا وقت تھا۔ کبھی بستر پر لیٹتا، کبھی کُرسی پر بیٹھتا، کبھی انگریزی میگزین کے اَوراق اُلٹ پلٹ کرتا۔ اضطراب بڑھتا رہا۔ انتظار کی ایک ایک گھڑی ایک ایک صدی بن کر بیت رہی تھی۔ بہت مشکل سے دس بجے۔ وہ اپنی موٹر سائیکل لے کر نکل پڑا۔ دس منٹ میں وہ اُس پتہ پر جا پہنچا۔ گیٹ پر نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی—

ذکی احمد صدیقی (بی۔ ای) چیف انجینئر۔ بنگلہ نمبر ۱۶ بنگ کوٹھی۔

گیٹ سے وہ اندر داخل ہُوا۔ ہر طرف طرح طرح کے پھولوں کے پودے نظر آ رہے تھے۔ عالیشان کوٹھی بہت خوبصورت تھی۔ اُس نے دروازے کے قریب پہنچ کر کال بیل پر اُنگلی رکھی۔ چند ہی لمحوں بعد ایک بُوڑھا آدمی اپنے ہاتھ میں کور لئے باہر آ گیا۔

"آپ کس سے ملنے کے لئے آئے ہیں صاحب؟" بُوڑھے نے ساجد سے سوال کیا۔ اُس کے چہرے سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اِسی کے انتظار میں بیٹھا ہے۔

"مجھے اختر صاحبہ سے مِلنا ہے۔"

"بی بی جی ابھی کہیں باہر گئی ہیں۔ آپ کا نام کیا ہے صاحب؟"

"مجھے ساجد کہتے ہیں۔"

"لیجیے آپ کا خط! بی بی جی آپ کو یہ خط دینے کو کہہ گئی ہیں۔"

ساجد نے آگے بڑھ کر خط لیا اور موٹر سائیکل لئے اپنے مکان کی طرف چل پڑا۔ وہ بےحد مضطرب تھا۔ گھر پہنچ کر کور کھولا۔ خط پڑھنے لگا——

"ساجد صاحب! السّلام علیکم

میں نے آپ کو گھر پر مدعو کیا۔ لیکن میں خود ہی گھر سے غائب رہی! یہ میرا اخلاقی جُرم ہے۔ اِس کے لئے معافی چاہتی ہوں۔ مجھے آپ سے بہت کچھ کہنا تھا۔ لیکن میری زبان میں طاقت نہیں۔ اِسی لئے خط لکھ رہی ہوں۔

آپ میرے لئے تڑپتے ہیں، ترستے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے مجھے پانے کے لئے آپ اپنی جان بھی نثار کرنے پر آمادہ ہیں۔ میں ایسی قربانی کے قابل نہیں ساجد! میرے بارے میں آپ کچھ نہیں جانتے۔ کچھ جانتے ہیں تو بس اتنا کہ میں آپ کے کالج میں پڑھتی ہوں۔ میری شخصیت کیا ہے؟ سوچتی ہوں تو مجھے اپنے آپ سے نفرت ہوتی ہے۔ اپنی زندگی سے نفرت ہوتی ہے۔ دُنیا سے نفرت ہوتی ہے۔ دل چاہتا ہے کہیں دُور چلی جاؤں۔ زندگی سے دُور ـــ بہت دُور ـــ اتنی دُور کہ کسی کو میری خبر تک نہ ہونے پائے۔ لیکن یہ خیال آتے ہی میرے قدم ڈگمگاتے ہیں۔ کانپ اُٹھتی ہوں۔ موت سے ڈر کر نہیں۔ میں جیتی ہوں تو صرف اپنے ڈیڈی کے لئے!

ساجد صاحب! بچپن ہی میں ماں کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ ڈیڈی نے لاڈ و پیار سے پالا۔ وہ مجھے اُداس نہیں دیکھ سکتے۔ میری خوشی انھیں کاٹ کھاتی ہے۔ مجھے ہمیشہ ہنستے گاتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ میری ہر خواہش پُوری کرتے ہیں۔ ماں کی محبت سے تو محروم رہی لیکن باپ کی شفقت میں ماں کی مامتا بھی پاتی ہوں۔ اُن کے آنسو خُشک کرنے کے لئے، اُن کا درد بانٹنے کے لئے میں جیتی ہوں۔

دن رات لمحوں کی مانند گزرتے گئے۔ جدھر بھی نظر گھومتی خوشیوں کے خزانے خیر مقدم کرتے۔ وادیوں میں سکون ملا۔ ہمارے پیار نے صحرا کو بھی چمن بنا دیا۔ ہمارے مُسکرانے سے ساری کائنات مُسکرا اُٹھتی۔ جس رہگذر سے ہم گزرتے وہ گُل و غُنچوں سے بھری ہوتی۔ مسرّتوں کے گہوارے میں زندگی کٹتی رہی۔ کیف و سرخوشی کا یہ عالم تھا کہ اپنی بھی خبر نہ رہی! میں زندگی کی اُس منزل پر جاکر رُک گئی جہاں پہنچ کر انسان اپنے جذبات کو اُبھارتا ہے۔ پیار و محبت کی باتوں پر یقین کرنے لگتا ہے۔ دل کا حُکم چلتا ہے۔ خِرد مجبور و محکوم ہو جاتی ہے۔

مجھ پر بھی شباب آگیا۔ ڈیڈی مجھے بہت پیار کرنے لگے۔ لیکن میں کچھ محدود سی ہوگئی۔ نہ جانے کیوں میرا طرزِ عمل بدل گیا۔ ڈیڈی میرے لئے رفیقِ حیات ڈھونڈنے لگے۔ ہماری دولت پر تو سب کی نظریں تھیں۔ برابر پیام آتے رہے۔ لیکن ڈیڈی کو کوئی رِشتہ پسند نہ آیا۔ انھیں دنوں اُن کے ایک دوست کا لڑکا پی ایچ۔ ڈی کرکے امریکہ سے لوٹا۔ وہ اورنگ آباد کے کسی سائنس کالج میں پروفیسر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ ڈیڈی کی نظروں نے آخر کار انھیں منتخب کرلیا۔ ڈیڈی کا کہنا ہی تھا کہ اُنھوں نے بھی مان لیا۔ رِشتہ طے ہوا۔ میں تو خوشی سے جھوم اُٹھی۔ سوچنے لگی ـــ وہ ایک پروفیسر! کتنے عظیم انسان ہوں گے! کیا میں اُن کے ساتھ قابلِ قبول سلوک کر سکوں گی؟ وہ میری ہر بات پر ہنستے ہوں گے۔ بھولی، پگلی جیسے خطابوں سے نوازتے ہوں گے۔ اپنے قریب بٹھا کر پیار و محبت کی باتیں کرتے ہوں گے۔ میں ایک گڑیا کی طرح اُن کے زانو پر سر رکھ کر میٹھے میٹھے خواب دیکھوں گی۔ لیکن میرے خواب، خواب ہی رہے جن کی کوئی تعبیر نہیں۔

وہ دن بھی آگیا جس دن کے لئے میں مضطرب تھی۔ بڑی دھوم دھام سے میری شادی رچائی گئی ـــ حُجلۂ عروسی میں مسہری پر بیٹھی اُن کا انتظار کرنے لگی۔ میرے دل پر خوف اور خوشی کا عجیب عالم طاری تھا۔ ہر آہٹ پر چونک پڑتی کنکھیوں سے دیکھتی۔ کلاک گھنٹے پر گھنٹے بجانے لگا ـــ ایک ـــ دو ـــ تین ـــ میرا اضطراب اور بڑھ گیا۔ چار بج گئے۔ دروازے پر آہٹ سُن کر چونک پڑی۔ وہ آرہے تھے ـــ ایک پروفیسر! چھ فٹ کے نوجوان! وہ قریب آنے لگے۔ بہت قریب آکر میرے پہلو میں بیٹھ گئے۔ دل کی دھڑکن اور تیز ہوگئی۔ پسینے میں نہا گئی۔ آنکھیں بند کی بند رہیں۔ اُن کی سانس میرے گالوں سے ٹکرا رہی تھی۔ میں حیران رہ گئی۔ اُن کے مُنہ سے شراب کی بُو آرہی تھی۔ اُف! شراب!! شبِ عروسی میں! میرے پَیروں تلے کی زمین سرکتی محسوس ہوئی۔ سر چکرانے لگا۔ اُنھوں نے مُسکراتے ہوئے کہا "آپ کو بہت دیر میرا انتظار کرنا پڑا" اُن کے مُسکرانے کا انداز عجیب تھا۔ بات میں انگریزوں کا لہجہ۔ اُن کی آنکھیں سُرخ تھیں۔ تھکے تھکے نظر آرہے تھے۔ بیہوش سے مسہری پر ڈھیر ہوگئے۔ مجھ پر نیند حرام تھی۔ لیکن وہ نیند کی آغوش میں کھو گئے۔ میں پریشان تھی۔ میرے دل پر کیا گزری، آپ خوب سمجھ سکتے ہیں۔ پہلی رات روتے روتے گزر گئی! وہ سارا دن کالج میں رہتے یا پھر کلب میں، اس کے بعد گھر یاد آتا بھی تھا تو تین بجے! سوتے بھی ہیں تو شُو کھولے بغیر کسی صوفے پر۔

ساجد صاحب! جو آنکھیں سدا مسکراتی تھیں، اُن آنکھوں نے رو رو کر اِتنے آنسو بہائے کہ اب رونے کو بھی جی چاہے تو آنسو کا

ایک قطرہ بھی آنکھ سے نہیں ٹپکتا۔

ایک ہفتہ بعد میں نے اُن سے ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا ــــ

"آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں، مانگنا چاہتی ہوں۔ آپ بُرا تو نہ مان جائیں گے؟"

"کہیے!"

"آپ میرا خیال کیوں نہیں کرتے؟"

"کیسا خیال؟"

"ایک بیوی کا حق مانگتی ہوں!"

"میں مجبور ہوں۔ مجھ سے آپ کا وہ حق ادا نہیں ہو سکتا!"

"پھر آپ نے مجھ سے شادی کیوں کی؟"

وہ کچھ سُنے بغیر ہی دروازے سے نکل کر چل دیئے۔ ساری خوشیوں کا خون ہوگیا، سارے ارمان سسکتے رہ گئے۔ ڈیڈی میری مایوسی کا سبب ہر وقت پوچھتے رہتے۔ میں بہانے بناتی۔ آخر ایک دن مجھ سے رہا نہ گیا۔ ڈیڈی کو خط کے ذریعہ سب کچھ بتادیا۔ میرا خط پڑھ کر وہ میرے ہاں دوڑے آئے۔ وہ بے تحاشا رونے لگے۔ میں نے ہی انھیں دلاسا دیا۔ لیکن وہ جانتے تھے میں سب کچھ زبان سے کہہ رہی ہوں، دل سے نہیں۔

ساجد! جانتے ہیں نا۔ ہر عورت کا دل آرزوؤں سے معمور رہتا ہے۔ صرف محبت کی آرزو! وہ اپنے شوہر سے پیار و محبت پانے کے لئے سب کچھ کرتی ہے۔ کھلونا بن کر اُس کا دل بہلانا چاہتی ہے۔ لیکن بے وفا مرد اُس سے کھیلنا نہیں جانتا۔ وہ اُس کی قدر نہیں جانتا۔ اُسے اپنے پیروں تلے کچل دیتا ہے۔ وہ کسی اور شئے سے کھیلتا ہے۔ کبھی شراب سے، کبھی طوائف کے مجرا سے۔ کسی کے ارمانوں کا خون ہوجائے، اُسے کیا پروا! جہاں عورت کے جذبات کی قدر نہیں ہوتی، جہاں جذبات کا خون ہوتا ہے وہاں سکون کیسے میسّر ہوگا؟ ایسی زندگی سے مجھے نفرت ہونے لگی۔ ساس سسر بھی قاتل نظروں سے دیکھتے۔ ایک مہینہ ایک صدی بن کر گزرا ــــ آخر طلاق لینا ہی بہتر سمجھا۔ میرے ڈیڈی بھی یہی چاہتے تھے۔ لیکن مجھ سے پہلے انھوں نے خود ہی طلاق دے دیا۔

ساجد! میں اپنی موت کا خیر مقدم کرتی ہوں۔ لیکن موت بھی مجھ پر ترس نہیں کھاتی!

اے ساجد! آج میں خونِ جگر پیتے ہوئے بھی مُسکراتی ہوں۔ لیکن مُسکراہٹ کے ساتھ ساتھ دل سے ایک کربناک آہ بھی نکلتی ہے جسے دُنیا سُن نہیں سکتی۔

کہیے ساجد صاحب! اب کہیے! کیا آپ مجھ سے پیار کرتے ہیں؟ ساری دُنیا میری طرف اُنگلیاں اٹھا اٹھا کر کہے گی "یہ تو پروفیسر تبسم کی بیوی تھی!" آپ اِن باتوں کو کیسے گوارا کریں گے؟ نہیں ساجد! نہیں۔ میری بات مانئے۔ میری زندگی ویران ہے۔ تاریک ہے۔ آپ اپنی زندگی کو کیوں ویران بنالینا چاہتے ہیں؟

ساجد صاحب! میں آپ کے پیار کو اپنی آنکھوں سے چومتی ہوں۔ لیکن پانے کے قابل نہیں۔ میں اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں آپ آگ سے نہ کھیلئے!

سُنئے ساجد! اختر میری زبان سے یہ شعر کہلواتے ہیں ؎

جل کے آشیاں اپنا خاک ہو چکا کب کا

آج تک یہ عالم ہے روشنی سے ڈرتے ہیں

دُعاؤں کی طالب

بدنصیب اختر تبسّم

خط پڑھنے کے بعد ساجد کے مُنہ سے ایک سرد آہ نکل گئی۔ اُس نے رومال سے اشکبار آنکھیں خشک کیں۔ پھر خط لکھنے لگا ــــ

بنگلہ نمبر ۲، کوارٹر نمبر ۴، حمایت نگر

"اختر! اسلام شوق! اسلام محبت!!

تمھارا خط ملا۔ تمھاری دردناک زندگی کی رُوداد پڑھ کر میں نے اپنے آپ کو آنسوؤں کے سمندر میں ڈبو دیا۔ اب بھی میری آنکھوں میں آنسو ہیں۔ کائنات کی ہر شئے مدھم مدھم نظر آرہی ہے۔ دل پر پہاڑ سا بوجھ ہے۔ جی چاہتا ہے بہت کچھ لکھوں۔ اتنا کہ پین کی سیاہی ختم ہوجائے، دل کے ارمان بجھ جائیں۔ لیکن کچھ لکھ نہیں پا رہا ہوں۔

میری جان! اگر تمھاری زندگی پر تیرگی چھائی ہے تو میں اپنے وجود کو جلا کر روشنی پیدا کروں گا! اپنی بہن کے ہاں بھی خط لکھ رہا ہوں تاکہ وہ والدین کو سمجھا کر ہمارا رشتہ طے کرلیں۔

ہاں اختر! اب خوب مُسکراؤ۔ تمھارے مُسکرانے سے فضائیں

مسکرا اٹھیں گی۔ بات بات پہ قہقہے بلند کرو۔ تاکہ دل کا سارا بوجھ جاتا رہے۔
پھر یہ شعر وظیفہ کی طرح پڑھو۔

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

یہ دُعا قبول ہوگی۔ زندگی میں نئی روشنی نئی بہار آجائے گی۔

ساجد"

اُس نے خط لفافے میں بند کیا۔ ڈیسک کھول کر ایک سفید کاغذ نکالا۔ پھر اپنی بہن کو خط لکھنے لگا ـــــ

"پیاری بہن! دُعائیں

کل ہی تمہارا خط ملا۔ میں ٹھیک ہوں۔ میری فکر نہ کرنا۔ اب تمہیں Holidays preparation مل گئے ہیں۔ ایک ماہ بعد امتحان ہوگا۔ خوب دُعا کرنا پھر دیکھنا تمہارا بھائی ایم۔ اے کس ڈویژن سے پاس کرتا ہے!

رشو! تمہیں ایک راز کی بات بتانا چاہتا ہوں۔ کسی اور سے نہ کہنا کہ میں نے خود تم سے یہ کہنے کو کہا ہے۔ تمہاری سفارش کے بغیر میرا کام نہ بنے گا۔ ذکی احمد صدیقی (سی۔ ای) کی اکلوتی بیٹی شمع تبسم ہمارے ہی کالج میں بی۔ اے فائنل میں پڑھ رہی ہے۔ گلابی رنگ، بڑی بڑی آنکھیں۔ اُن پر ریشمی پلکیں۔ شفاف جسم، گھنے بال ـــ کیا بتاؤں! تم دیکھو گی تو کہو گی: "واہ بھیا! کہیں آپ کو اتنی حسین لڑکی بھی ملے گی؟ اگر آپ کو یہ لڑکی نہ بھائی تو مجھے دُنیا کی کوئی لڑکی پسند نہیں آتی! آپ کو ضرور یہ رشتہ پسند کر لینا ہوگا۔ ورنہ آپ کی شادی میں نہ میں آؤں گی نہ وہ!" پیاری بہن! اِس طرح بھی خفا ہونے کی کیا بات ہے۔ تمہاری بات مانوں گا۔ مجھے وہ لڑکی پسند آگئی۔

رشو! دیکھوں گا تم کہاں تک کامیاب رہو گی! ہاں میری آرزوؤں کا خون نہ کرنا!

تمہارا بھائی
ساجد"

اُس نے اِس خط کو بھی لفافے میں بند کیا۔ دونوں پہ پتہ تحریر کیا اور بغل کے پوسٹ باکس میں ڈال کر واپس چلا آیا۔

تیسرے دن دروازے پر پوسٹ مین کی آواز سُنتے ہی ساجد پلنگ سے کود پڑا۔ دوڑتے ہوئے باہر نکلا۔ پوسٹ مین نے اُسے دو خط دیئے اور وہاں سے گزر گیا۔

ساجد کے ہاتھ خوف اور خوشی سے کانپ رہے تھے۔ وہ ایک لفافہ چاک کر کے پڑھنے لگا ــــــ

"ساجد! میرے بے حد پیارے ساجد! میرے محبوب شاہ! آداب

دل چاہتا ہے آپ کے پاؤں چوم لوں۔ جان نثار کر دوں۔ آپ اِس بدنصیب کی ویران زندگی میں بہار لانا چاہتے ہیں۔ آپ مجھے مُسکرانے کو کہتے ہیں! میں بے حد خوش ہوں۔ فرطِ مسرت سے آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکلنے لگے۔ بہتے رہے۔ اِنھیں روکنا نہیں چاہتی۔ یہ خوشی کے آنسو ہیں نا! لبوں پر مُسکراہٹ مچلنے لگی۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے دل کو تھام کر رکھا تاکہ دل کی دھڑکن حد سے گزر نہ جائے۔ میرا تو عجیب حال ہے۔ ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ میں اپنی خوشی کا اظہار کیسے کروں؟ کاش دل کی بھی کوئی زبان ہوتی!

آپ کی

اختر تبسم"

وہ دُوسرا لفافہ کھول کر پڑھنے لگا ــــــ

"بھیّا! آداب

نہ چاہتے ہوئے بھی میں آپ کی آرزوؤں کا خون کر رہی ہوں۔ خُدا کے لئے مجھے معاف کر دینا۔ آپ کے حُکم کے مطابق گھر میں ساری باتیں کہہ دیں۔ لیکن مایوسی ہی ملی۔ ذکی احمد صدیقی صاحب کا نام سُنتے ہی ابّا جان چونک پڑے۔ پُوچھنے لگے: 'وہ چیف انجینئر ہیں نا؟ اُن کی اکلوتی بیٹی کا نام اختر تبسم ہے نا؟' میں یہ سُن کر جھینپ گئی۔ سراپا حیرت بن کر سوچنے لگی۔ کہیں آپ کا خط ابّا جان کے ہاتھ تو نہیں لگ گیا؟ نہیں! نہیں۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا! وہ تو میرے ہی بکس میں محفوظ ہے۔ ابّا جان میری طرف جواب طلب نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنا سر جھکاتے ہوئے ہاں کہہ دی۔ پھر وہ کہنے لگے "کیا تو اپنے بھائی کی شادی اُس لڑکی سے کرنا چاہتی ہے؟ مجھے حیرت ہوتی ہے تیرے اِس خیال پر۔ شاید تو یہ نہیں جانتی کہ اُس لڑکی کی شادی پروفیسر نسیم سے ہوئی جو میرا شاگرد تھا۔ ایک ماہ بھی نہ بیت پایا کہ اُن پر ناآتفاقی کی چھائیاں چھا گئیں۔ کچھ ہی دنوں میں نسیم طلاق دینے پر مجبور ہو گیا۔ اُس نے ہمارے ہی کالج سے بی۔ اے کیا۔ میں جانتا ہوں وہ شرابی ہے۔ لیکن ہر شرابی کی بیوی کا یہی سلوک رہا تو دُنیا میں مرد کا کیا مقام رہے گا؟ خیر! اِن باتوں سے تجھے کیا لینا ہے؟ مجھے یہ رشتہ منظور نہیں! میں قطعی طور پر یہ فیصلہ کر چکا ہوں!" یہ سب سُن کر میں بوکھلا گئی۔ بھیّا! کیا یہ سچ ہے؟ اگر آپ کو اِن باتوں کا علم نہیں ہے تو اُس لڑکی سے پُوچھ لیجئے۔ ابّا جان کی باتیں سُن کر ماں بھی مجھ پر بُری طرح بھڑک اُٹھیں۔ بھیّا! اب گستاخی کی جرأت نہ مجھ میں ہے نہ آپ میں! ہم مجبور و محکوم ہیں۔

خُدا کرے وہ کوئی اور اختر تبسم ہو!

آپ کی مایوس بہن

رضیہ رحمٰن"

ساجد تھرتھراتے ہاتھوں سے خط موڑ رہا تھا۔ اچانک اختر کمرے میں داخل ہو گئی۔ اپنے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ کر بہت ادب سے بولی: "حضور! آداب۔ کیا میں آپ کا خط پڑھ سکتی ہوں؟" ساجد نے بجھی بجھی نظروں سے اُس کی طرف گھورتے ہوئے کہا: "لیجئے۔" وہ اپنے حنائی ہاتھوں سے خط کھول کر پڑھنے لگی۔ چہرے پر عجیب کیفیت طاری تھی۔ ہر لحہ رنگ بدل رہا تھا۔ کبھی سُرخ، کبھی زرد۔ آنکھوں میں آنسو اُمڈ آ رہے تھے۔ وہ اپنے آنسوؤں کو چُھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ خط پڑھ کر اُس نے ایک بار کھڑکی سے باہر خلاء میں دیکھا۔ دُوسرے ہی لمحے اُس کے ہونٹوں پر ہلکی مُسکراہٹ مچل رہی تھی۔ لیکن اُن میں بلا کا درد تھا۔

ساجد کے ذہن میں شادؔ کا یہ شعر گونج اُٹھا ؎

مُسکرانا گُل کی فطرت ہے
خون ہو کر بھی مُسکرائے گی

رینگتے قدموں سے ساجد کے قریب آ کر اُس نے کہا "نہیں ساجد! وہ کوئی اور اختر تبسم نہیں ہو سکتی!" اور دُوسرے ہی لمحہ سُرخ ساڑی کا آنچل ہوا میں لہراتے ہوئے دروازے سے گزر گئی۔ ساجد کے دل پر درد و غم کا غُبار چھا گیا۔ اُس کی زبان سے ایک کربناک آہ نکل کر فضا میں بکھر گئی۔

اختر تبسم چلی گئی لیکن دیر تک اُس کی سُرخ ساڑی کا آنچل ساجد کے سامنے لہراتا رہا!!


کرسٹل مسکراہٹ
کی دلکشی
کرسٹل کے چمکتے دانت
کرسٹل کی مہکتی سانسیں
KRISTAL TOOTH PASTE
کرسٹل
ٹوتھ پیسٹ
بھرپور جھاگ۔ بھینی بھینی خوشبو۔
everest/361y/ACW UR

غزل

علی احمد جلیل ایم۔ اے

لائی سامانِ جنوں فصلِ بہاراں کتنے
ایک اِک خار سے اُلجھے ہیں گریباں کتنے

یہ لطافت، یہ نزاکت، یہ جوانی، یہ بہار
تیرے عارض نے سمیٹے ہیں گلستاں کتنے

جب کبھی ترکِ تعلق کا خیال آیا ہے
روک کر راہ کھڑے ہو گئے ارماں کتنے

تیرے دامن سے جو نسبت ہے مرے اشکوں کو
ایک اِک بوند اُٹھا لائی ہے طوفاں کتنے

پھول برسے نہ ستارے ہی فلک سے ٹوٹے
رہ گئے ہاتھ میں پھیلے ہوئے داماں کتنے

آج اُڑتی ہے جہاں گردِ تمناؤں کی
کل تھے آباد یہاں شہرِ نگاراں کتنے

میری خلوت میں دبے پاؤں چلے آتے ہیں
لب و رُخسار کے مہکے ہوئے طوفاں کتنے

بارہا چھوٹ گئے آ کے علی ہاتھوں میں
کیا کہوں زیست کے لمحے تھے گریزاں کتنے

غزل

رازؔ الہ آبادی

چلا ہے کون یہ شمعِ وفا جلائے ہوئے
اندھیرے بھاگ رہے ہیں بدن چرائے ہوئے

زمیں کا چاند ہے رُخ سے نقاب اُٹھائے ہوئے
فلک کے چاند ستارے ہیں منہ چھپائے ہوئے

زمانہ گذرا ہے میکدے سے آئے ہوئے
ابھی تلک ہیں مگر پاؤں ڈگمگائے ہوئے

ہمارا نام بھی بیٹھے ہیں جو بھلائے ہوئے
اُنھیں کی یاد کو ہیں دل سے ہم لگائے ہوئے

فریبِ رنگ میں آنا نہ دیکھنے والو
یہ پھول اپنے لہو میں ہیں خود نہائے ہوئے

ہمیں بھی اے غمِ دوراں کبھی اجازت دے
کہ اِک زمانہ ہوا کھل کے مسکرائے ہوئے

تری طلب نے مجھے کتنا بے نیاز کیا
گلوں کے پاس ہوں، دامن مگر بچائے ہوئے

عطا ہوئی ہیں اُنھیں سربلندیاں کیا کیا
جو تیری راہ میں بیٹھے ہیں سر جھکائے ہوئے

افسانہ

تشنگی کا سفر

ممتاز شکیب بی۔ اے

آل انڈیا ریڈیو۔ جے پور

محترمی خوشتر صاحب: سلام و نیاز

ایک طویل عرصے بعد ——— پھر ایک بار آپ کی خدمتِ اقدس میں ایسی ناتراشی کہانی بھیج رہا ہوں جس کے اختتام پر میں نے خود بھی ایک ویرانی سی محسوس کی ہے ——— سیکس اور انسان کے تہذیبی شعور کے موضوع پر میں ایک ناول لکھنا چاہتا تھا۔ لیکن "بیسویں صدی" کے خاص نمبر کے لئے ایک اچھی کہانی لکھنے کے خیال سے میں نے اپنے اس ناول ہی کے پلاٹ کو کہانی کا روپ دے دیا ہے ——— اب دیکھنا یہ ہے کہ "تشنگی کا سفر" اور اس کے مرکزی کردار سیمی کی لامحدود خواہشوں سے معمور زندگی کا یہ نفسیاتی تماشا آپ اور قارئین کو کہاں تک متاثر کرتا ہے....

نیاز مند ——— ممتاز شکیب

★

ٹیگور تھیٹر ہال میں ہورہے ڈرامے کی خاص تقریب کے موقع پر میں اور ناصر ڈائز کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ہماری نظریں از خود بار بار اُس حسین جوڑے کی طرف اٹھ رہی تھیں جو کرسیوں کی خمیدہ رو کے دائیں جانب ہماری نظروں کی رینج میں تھا۔

امتیازی حُسن کا وہ دلکش و دلنواز پیکر جس کا نام مجھے ناصر نے سیمی بتایا تھا، ایک خوبرو اور توانا مرد کے پاس بیٹھی مجھے ایک ایسی باوقار عورت دکھائی دے رہی تھی جس کی خوبصورتی اور امتیازی حُسن و جمال کا دبدبہ شاہی خاندانوں کے مرعوب کُن جلال کے مترادف تھا اُس کے بھرے بھرے خوبصورت رُخساروں پہ ہلکے ہلکے غازے کی نکھری ہوئی شہابی رنگت شگفتہ گلاب کی طرح دمک رہی تھی اور تراشیدہ ہونٹوں پہ گہرے نارنجی رنگ کی شیفون کی ساڑی سے میچ کرتا ہوا لپ اسٹک کا گہرا رنگ ہال کی برقی روشنی میں انگارے کی مانند دہک رہا تھا۔

تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اپنی تنی ہوئی گردن کو جُنبش دے کر کبھی کبھی اپنی سحر انگیز آنکھوں پہ جُھکی ہوئی دراز پلکیں اُٹھا کر جب وہ اپنے مخصوص ملکوتی وقار سے ہماری طرف دیکھتی تو اُس کی چُبھتی ہوئی نظریں میرے دل میں اِس طرح کھٹکتی ہوئی رہ جاتیں جیسے کسی تیز دھار والے نشتر کی نوک سینے میں ٹوٹ کر رہ گئی ہے اور اس بار جب اُس نے ادائے بے نیازی سے اپنا جُوڑا سنوارتے ہوئے احمریں ہونٹوں پر خفیف سا دلنشیں تبسم پیدا کرتے ہوئے ہماری طرف دیکھا تو بیساختہ میرے مُنہ سے آہ نکل گئی۔

"اُف کتنی پُرکشش عورت ہے!"

"ہاں ——— " ناصر نے میرے قریب اپنا مُنہ لاکر آہستہ سے کہا تھا۔ "اگر تم اُس کی طرف اِس طرح دیکھتے رہے تو شاید پاگل ہو جاؤ گے!"

"تم ٹھیک کہتے ہو" میں نے پھر سانس بھرتے ہوئے مُنہ کھولا تھا۔ لیکن میری نظریں اُسی طرح اُس پر جمی ہوئی تھیں۔ شاید ناصر خاموش ہو کر ڈرامے پر بولتے ہوئے مقرر کی تقریر سننے لگا تھا۔ لیکن میں اُس شعلہ بار حُسن کے دہکتے ہوئے شبستانوں میں کھویا ہوا اُس کے تراشیدہ یاقوتی ہونٹوں پہ دمکتے ہوئے تبسم کو دیکھ کر میں محسوس کرتا رہا جیسے سیمی کے

لبوں پر فائر روز کی سُرخی کا دہکتا ہوا رنگ میری جانب ایک شعلے کی طرح بڑھ رہا ہے۔ ہال میں تقریر گونج رہی تھی اور میں سیمیں کے حسین تصور کی رعنائیوں میں گم تھا۔

"تم نے یہ بھی اندازہ کیا راحت! یہ اُدھر کس کی طرف دیکھ رہی ہے؟"

"تمہاری طرف!" ـــــــ یہ بات برجستہ کہتے ہوئے میں نے ایک کسک سی محسوس کی تھی۔

"یہ تم وثوق کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہو ـــــ؟" تقریر کے دوران ہماری سرگوشیاں برابر جاری تھیں۔

"ظاہر ہے۔ تمہاری پرسنلٹی مجھ سے زیادہ چارمنگ ہے!" میں نے اُس کے سُرخ و سپید چہرے پر نظریں ڈالتے ہوئے کہا تو ناصر کے ہونٹوں پر مخصوص مُسکراہٹ اُبھری ـــــــ اور پھر کچھ توقف کے بعد اُس نے میرے کانوں کے نزدیک اپنا مُنہ لا کر کہا۔

"شاید تم نہیں جانتے اُس کے قریب بیٹھے ہوئے اُس کے شوہر کی اپنی پرسنلٹی ہم دونوں سے زیادہ چارمنگ ہے!"

"کیا کہا یہ اِس کا شوہر ہے ـــــ؟" حیرت سے میرا مُنہ کھلا رہ گیا تھا۔

"وہ چونکہ ہر دلچسپ بات کو SUSPENSE کے ساتھ کہنے کا عادی تھا اِس لئے میں اُسے گھور رہا تھا اور ناصر اپنی سرگوشی کے سلسلے کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی شریر مُسکراہٹ کو ہونٹوں میں دبائے بول رہا تھا۔

"یہ لوگ حال ہی میں حیدرآباد سے آئے ہیں۔ اِس کے شوہر نے یہاں کچھ مائنز خریدی ہیں۔"

"کیا تم اِنھیں جانتے ہو؟" ناصر نے بہت دیر بعد اِس راز کا انکشاف کیا تو میں نے اضطراری کیفیت سے پوچھا تھا۔

"ہاں ـــــ اِس خوبصورت عورت کا نام سیمیں ہے، اور یہاں آنے کے بعد میرے ایک ریڈیائی ڈرامے میں میرے ساتھ ہیروئن کا پارٹ کر چکی ہے۔"

"کیا ـــــ؟" میرے سینے پر ایک چوٹ سی پڑی تھی اور وہ ظالم میری حالت کو تاڑتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر پھیلتی ہوئی مُسکراہٹ کو دبانے کی سعی کر رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اِس ناصر کے بچے کی یہ چٹکیاں لینے کی عادت بھی کبھی مجھے کتنی اذیت پہنچاتی ہے!"

"ایک بات بتاؤ راحت؟" تم نے عورت کی نفسیات پر بہت سی کہانیاں لکھی ہیں اور تم سیمیں کا بہت دیر سے جائزہ لے رہے ہو!"

"ہاں!"

"تو پھر بتاؤ سیمیں کیسی عورت ہے؟"

"شاید اِس کی تشنہ رُوح آج تک کسی سراب کی طرف دوڑ رہی ہے۔ اگر تم اِس کی طرف غور سے دیکھو تو سیمیں کی دلکش اور دل آویز شخصیت میں تمہیں اِس کے اندر کی عورت کا خاموش سراپا کچھ خاص پابندیوں کے الاؤ میں سُلگتا ہوا دکھائی دے گا۔ اِس خوبصورت عورت کی زندگی میں کوئی زبردست خلا ہے!"

"غلط! میں سیمیں کو بہت قریب سے دیکھ چکا ہوں۔ جو کچھ تم نے کہا وہ بالکل غلط ہے!"

"تو پھر صحیح کیا ہے؟" میں نے بوکھلا کر ناصر کی طرف دیکھا۔

"یہی کہ سیمیں صرف ایک فراڈ ہے! ایک کوکیٹ! جو محض مردوں کے قرب اور اُن کی رومانٹک باتوں میں گم ہو کر دُنیا و مافیہا سے بے نیاز ہونا چاہتی ہے اور ـــــــ" ناصر نے ابھی اپنا جملہ پورا بھی نہ کیا تھا کہ ہال تالیوں سے گونج گیا۔ پروفیسر بھلّہ اپنی تقریر ختم کر کے جا رہے تھے اور مسٹر زبیر مائیک پر اناؤنس کر رہے تھے۔

"اب آپ ریڈیو اور اسٹیج کے ماہر فنکار اور مشہور ڈراما نگار جناب ناصر محمود سے اُن کی تقریر سُنیں گے۔"

ناصر نے بولنا شروع کر دیا تھا۔ وہ گفتار کا غازی تھا اُس کی آواز کا ڈرامائی تاثر الفاظ کو جلا بخشتا ہوا سامعین کے دلوں میں اُترتا چلا جا رہا تھا۔ اِس وقت وہ اور بھی زیادہ موڈ میں آ کر ڈرامے کے موضوع پر ایک جامع تقریر کر رہا تھا اور سیمیں ہمہ تن گوش اُس کی طرف اِس طرح دیکھ رہی تھی جیسے اُس کے اندر کی تشنہ رُوح کو اچانک گنگناتا ہوا ایک ایسا آبشار مِل گیا ہے جس کی روانی کے دوش پر وہ بہی چلی جا رہی ہے۔ سیمیں کی اِس دگرگوں حالت کو دیکھ کر میرا شک یقین میں بدل گیا تھا۔

واقعی سیمیں اب تک میری بجائے ناصر کی دلکش شخصیت میں دلچسپی لے رہی تھی۔ یہ سوچتے سوچتے میرے اندر ایک ایسی کسک سی پیدا ہونے لگی جس نے چند ہی ساعت میں بڑھ کر میرے سارے وجود کو اپنی حدوں میں سمیٹ لیا تھا۔

"دراصل ڈراما اور آدمی کی باتوں کا تمثیلی انداز"
(ناصر شاید اپنی تقریر ختم کر رہا تھا اور سیتیں ابھی تک ٹکٹکی باندھے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی)
"دوسروں پر اپنی شخصیت کی گہری چھاپ لگانے اور اپنی بات منوانے کا ایک انتہائی پاورفل میڈیم ہے یہی وجہ ہے کہ انسان ڈرامے کا سہارا لے کر زندگی کے ہر شعبے میں کامیابی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے مقاصد کی تکمیل بھی نسبتاً آسانی سے کر سکتا ہے۔"
ناصر کی تقریر ختم ہوتے ہی سارا ہال پھر تالیوں سے گونج گیا تھا۔ "یہ میرے دوست سعد راحت تسنیم ہیں اِ مشہور کہانی کار!" تقریبات کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد سیتیں ناصر کو کانگریچولیٹ کرتی ہوئی میرے ساتھ تھیئٹر کے ریستوران تک آ گئی تھی اور ہال میں کوئی فل لینتھ پلے شروع ہونے والا تھا۔
"میں نے آپ کی بہت سی کہانیاں پڑھی ہیں" سیتیں نے ہمارے نزدیک کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے میری طرف بہت بڑی عقیدت سے دیکھا تو میں اُس کے رُعبِ حُسن کے باعث اپنے مُنہ سے کچھ بھی نہ کہہ سکا، صرف اُس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔
"آپ بہت اچھا لکھتے ہیں راحت صاحب!"
"ذرہ نوازی کا شکریہ!" میں نے بمشکل تمام گھِسا پِٹا جملہ کہہ کر اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی سعی کو خاص طور سے مدِنظر رکھا تھا۔ "اور آپ کی آواز کا جادو آپ کے ڈراموں ہی تک محدود نہیں ہے ناصر صاحب! ہر صنف پر اُس کی گہری چھاپ ہے۔" مجھ سے نظریں ہٹا کر سیتیں ناصر کی طرف متوجہ ہو گئی تھی اور اُس کی تقریر، اُس کی گفتار، اُس کے لب و لہجے کے متاثر کرنے والے ہر انداز کی جی بھر کے تعریفیں کرتی رہی۔ اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اُس کا خوبصورت شوہر ہم سے دُور کاؤنٹر کے پاس اکیلا چُپ چاپ کھڑا سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے فضا میں دھوئیں کے مرغولے بنا رہا اور ہماری گفتگو کے دوران نہ تو ہماری میز ہی کے پاس آیا اور نہ سیتیں ہی اُس کی طرف متوجہ ہوئی۔ اِس کے برعکس ناصر کی طرف جھکی ہوئی اُس کی آنکھوں میں ڈوب کر لئے جیسی کیفیت میں ناصر کی پُراثر آواز کی تعریف اور اُس کی جادو بیانی کے قصیدے الاپتی رہی۔ ناصر جو ایسے موقعوں پر کچھ زیادہ بن کر بولنے کا عادی تھا سیتیں کو اپنی آواز کے بہاؤ میں بہائے لئے چلا جا رہا تھا۔ اور وہ اُس کی لامتناہی باتوں میں گُم ہو کر بالکل ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے



کوئی پرندہ پنجرے سے باہر آ کر فضا میں اپنے پر تول رہا ہے اور ناصر سیتیں کی آنکھوں میں کھویا ہوا اُس کے ساتھ پیار کا یہ ناٹک اِس کمالِ فن کیساتھ کھیل رہا تھا جس طرح اِس سے پہلے کئی بار بہت سی لڑکیوں کیساتھ کھیل چکا تھا۔ ناصر فطرتاً انتہائی لاابالی، غیر سنجیدہ تھا۔ اُس کی محبت کا یہ دیرینہ ناٹک جو اکثر لڑکیوں کو پھانسنے کے لئے کھیلا کرتا تھا، میں کئی بار دیکھ چکا تھا اس لئے ایسے موقعوں پر مجھے ناصر کی سنگدل وحشیانہ فطرت کے وہ پوشیدہ خدوخال واضح طور سے دکھائی دینے لگتے تھے جو اپنے شکار کو مقابل پا کر کسی وحشتناک درندے کے بدن پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ڈرامہ ڈے کی تقریب کے بعد سے سیتیں کئی دنوں تک میرے ہوش و حواس پر چھائی رہی۔ لیکن ناصر کے تئیں اُس کے اُس دن کے رویے سے مجھے ایک اندازہ یہ بھی ہو گیا تھا کہ وہ ایک ایسی ندی کے مانند ہے جو اچانک برسات کے پانی کی فراوانی سے بپھر کر اپنا رُخ بدل دیتی ہے۔ اُس دن کی ملاقات کے بعد میں نے جب کبھی سیتیں کو ناصر سے باتیں کرتے ہوئے پایا تو مجھے اُس کی اضطراری کیفیات کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے یہ حسین عورت شعلے کے

"اسکائی لارک" کی اُس بے چین اور مضطرب طائرکی روح کی طرح ہے جو اذیت کوش دُنیا سے بیزار ہوکر سکونِ خاطر کی تلاش میں آفاق کی بیکراں وسعتوں کی سمت اُڑتی چلی جارہی ہے۔" خدا کے لئے مجھے اپنی آواز کے طلسمی حصاروں میں قید کرلو ناصر! مجھے زندگی کے اِس زنداں سے نکال لو جہاں برسوں سے میرا دم گھٹ رہا ہے!" میں ناصر کے فلیٹ میں داخل ہوا تو سیمیں کو پہلی بار تنہائی میں ناصر کے ساتھ دیکھ کر بھونچکا رہ گیا تھا۔

"میں تم سے اب دُور نہیں رہ سکتی! میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں ناصر! میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی!" اور یہ کہتے ہی وہ ناصر کے سینے سے لگ کر اُس میں ایسے کھو گئی جیسے دھیمی رفتار سے بہنے والی ندی اچانک طغیانی کے باعث بپھرتی ہوئی کسی بہت بڑے دریا کے تیز دھاروں میں ضم ہوجاتی ہے۔

آج سیمیں میری نظروں سے گرچکی تھی۔

"بیشک وہ ایک فراڈ ہے، ایک کوکٹ اور بیوفا عورت! اِس زمانے کی ایسی قلوپطرہ جو اپنے زہریلے حُسن سے نہ جانے کتنے انیطونیوں کا خون کرنا چاہتی ہے —— اور یہ احساس اُس دِن میرے سینے میں انتہائی شدید ہوکر کھٹکنے لگا تھا جس دن مجھے یہ معلوم ہوا کہ سیمیں اپنے پہلے شوہر کو چھوڑ کر ناصر سے شادی کرکے ماؤنٹ ابو چلی گئی ہے!

پچھلے کئی دن سے سیمیں کے پہلے شوہر کو ہوٹل سٹیر ساگر، فیروزا اور نٹراج کے علاوہ کافی ہاؤس میں پاگلوں کی طرح الگ تھلگ سگریٹ پھونکتے ہوئے اِس سمپرسی کی حالت میں دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ناصر نے اُسے زندگی کی صلیب پر لٹکا دیا ہے۔

سیمیں نے میری سوچوں کے دھاروں کو بدل کر رکھ دیا تھا یہی وجہ تھی کہ میں اُسے مدِنظر رکھتے ہوئے پہلی بار ڈی ایچ لارنس اور البرٹ موراویا کی تقلید کرتے ہوئے عورت کی کشش، اُس کی جسمانی خوبصورتی اور نفسیاتی خواہشات کی بنیاد پر "موم کی گڑیا" کے نام سے ناول لکھ کر محبت کو محض ایک جنسی تقاضہ ثابت کرنا چاہتا تھا۔

سیمیں سے شادی کے بعد سے ناصر نے کبھی مجھ سے کھُل کر بات نہ کی تھی۔ طویل عرصہ کے بعد ایک دوست کی شادی کے موقع پر ہم دونوں ایک ٹیبل پر تھے۔ سیمیں کچھ مضمحل اور اُداس سی ہمارے سامنے بیٹھی ہوئی ہمیں گہری نظر سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی دوسری شادی کو شاید ایک سال گذر چکا تھا۔ لیکن نہ مجھے آج بھی ویسی ہی دلکش اور حسین دکھائی دے رہی تھی جیسی ڈرامہ ڈے کی تقریب میں تھی۔ یہ اور بات تھی کہ وہ اُس دِن کی طرح شگفتہ اور شوخ نہ تھی، اُس کی وجہ شاید ناصر اور اُس کے درمیان کی بڑھتی ہوئی وہ کشیدگی تھی جس کے بارے میں پچھلے دنوں مجھے اُن کے ایک دوست نے بتایا تھا۔

"لو یہ تمہارا SHARE ہے سیمیں ——" میں نے دانستہ ٹیس کرنے کی غرض سے وہسکی کا گلاس اُس کی طرف بڑھا دیا تھا۔

"نہیں! میں شراب نہیں پیتی راحت صاحب!" اُس نے چبھتی ہوئی نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"حیرت ہے —— اتنی ایڈوانس ہونے کے باوجود تم اِس شوق سے مبرا ہو ——؟"

"اِس لئے تو میں سیمیں کو اپنے ساتھ جرمنی کے اِس ٹور میں نہیں لے جا رہا ہوں راحت!" ناصر نے اپنا گلاس خالی کرتے ہوئے کہا تھا۔

"تو کیا تم واقعی جرمنی جا رہے ہو؟" میں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ناصر سے طنزیہ پوچھا تھا۔ "آف کورس میں ناٹک اکاڈمی کی طرف سے کلچرل ڈیلیگیشن کا لیڈر ہوکر اگلے ہفتہ ہی فلائی کرنے والا ہوں اور خیال ہے کہ وہیں SETTLE —— ہونے کی بھی کوشش کروں!"

"لیکن مجھے یقین آتا ——" یہ کہہ کر میں نے سیمیں کی طرف دیکھا تو وہ اپنے سامنے رکھے ہوئے گلاس کو منہ سے لگا کر اپنے حلق میں اُنڈیل رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ انسان کی محرومی اور ناکامی کی اِنتہا اُسے بغاوت کرنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔

"کمال ہے! تمہیں ابھی تک میرے اِس فارن ٹور کا یقین نہیں آیا!" ناصر اب بہکنے لگا تھا۔

"کیوں نہیں —— بہرحال تم ایک عظیم فنکار ہو اِس لئے کسی بھی ملک کے ٹور پر جا سکتے ہو۔ لیکن یہ میرا دعویٰ ہے ناصر کہ تم انسانیت کی معراج کو ہرگز نہیں پا سکتے!" —— "اِس لئے کہ یہ شرف محض ایک عظیم انسان کو حاصل ہوتا ہے!"

"سیمیں نے اپنا گلاس خالی کرکے میز پر رکھا تو ناصر چہکا۔

"ویری گڈ سیمیں! میں ابھی امپورٹڈ وہسکی لاتا ہوں —— تمہارے لئے ——!"

ناصر لڑکھڑاتا ہوا پارٹی کے ہنگامے میں گم ہوگیا اور میں سیمیں کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

"راحت صاحب!" سیمیں نے اپنی مخمور آنکھیں اُٹھا کر مجھے مخاطب کیا تو میں اُس کی دراز پلکیں دیکھنے لگا۔ "آپ جیسے مشرقی نظریئے کے ماننے والے ادیب کو موم کی گڑیا" جیسا ناول لکھ کر مشرقی عورت پر کیچڑ نہیں اُچھالنا چاہئے تھا!"

"یہ تم کہہ ——— رہی ہو ——؟" میں نے پوچھا تھا۔

ہاں ——— ں!" سیمیں نے اتنا کہتے ہی نظریں جُھکا لیں تھیں۔ اُسی وقت جھومتا ہوا ناصر ہاتھ میں وہسکی کی بوتل لئے میز کے قریب آگیا تھا۔

اُس پارٹی کے تین دن بعد ——— میں آدھی رات کے وقت لکھنے کے لئے بیٹھا تو مجھے کچھ سردی محسوس ہوئی۔ کمرے کی کھڑکیاں بند کر کے ہیٹر آن کیا اور ڈریسنگ گاؤن کو ٹھیک کرتا ہوا لیٹنے کی غرض سے سہری کی طرف بڑھا تو دروازے پر دستک ہوئی۔

"اِس وقت کون ہو سکتا ہے ——؟" میں نے یہ سوچتے ہوئے جیسے ہی چٹخنی کو قبضے سے ہٹایا تو ایک جھٹکے کے ساتھ دروازہ فوراً کھل گیا۔

میرے سامنے سیمیں کھڑی تھی!

"تم ——؟!" سیمیں کو اِس وقت خلافِ توقع دیکھ کر میرے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔ "ہاں ——ں ——" سیمیں نے اندر آتے ہی دروازہ بند کر دیا اور میرے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اُس کے چہرے کی خوبصورتی، تیکھے نقوش کی کشش اور جسم کی دل آویزی ایک بار مجھے پھر متزلزل کرنے لگی تھی۔

"میں آپ سے تنہائی میں ملنا چاہتی تھی ——" اُس نے اپنے سُرخی مائل ہونٹوں کو جُنبش دیتے ہوئے کمرے کا جائزہ لیا اور پھر میری طرف ملتجی نظروں سے اِس طرح دیکھنے لگی کہ میرے مارلسٹ ہونے کا احساس زائل ہوتا چلا گیا۔

"اِس وقت تم —— کچھ زیادہ پریشان نظر آرہی ہو ——!؟" میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے اُس کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے کہا تھا۔

"ہاں!" اُس کی آواز بھر آگئی تھی۔ اور پھر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے صوفے کی طرف بڑھی تو مجھے محسوس ہوا جیسے وہ ہلکے ہلکے نشے میں سرشار ہے۔

"ناصر تو ٹھیک ہے؟" میں نے اُس کے قریب بیٹھتے ہوئے غیر ارادی طور پر منہ کھولا تو یہ الفاظ از خود میرے ہونٹوں سے پھسل گئے۔

"اُس کمینے کی بات مت کیجئے!"

"کمینے؟"

"ہاں! وہ انتہائی کمینہ اور سنگدل ہے! اُس روز آپ نے ٹھیک کہا تھا کہ وہ غیر ملک کے دوروں پر تو جا سکتا ہے لیکن انسانیت کی معراج کو نہیں!"

"لیکن جو الفاظ آج تم ناصر کی شان میں کہہ رہی ہو شاید تمہارے سابق شوہر ملک آفاق نے بھی کل تمہیں اِنھیں الفاظ سے یاد کیا ہوگا!"

"بیشک آپ صحیح کہتے ہیں۔ ملک آفاق نے مجھے بھی اِنھیں الفاظ سے یاد کیا ہوگا؟"

سیمیں کی آواز کے اِس کھوکھلے آہنگ نے اُس کی آنکھوں میں جاگتی ہوئی تیز چمک کو ماند کر دیا تھا۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں تم نے اچھے شوہر کے ہوتے ہوئے ایک بیہودہ آدمی کو اپنا کر عورت کی شاندار تاریخ پر دھبہ اور اپنے خاندانی وقار کی پیشانی پر کلنک کیوں لگایا؟"

"اِس لئے کہ مجھے ایک دن اِن سب کے مقتل پر آنکھیں موند کر چڑھا دیا گیا تھا ——" وہ پھر بپھر گئی تھی۔

"کیا مطلب؟"

"شاید آپ نہیں جانتے راحت صاحب! جس ملک آفاق کی دولت سے مرعوب ہو کر میرے والدین نے مجھے اُس کے ساتھ منسوب کیا تھا وہ پیدائشی گونگا اور بہرہ تھا! اور یہ بھی سُن لیجئے کہ مجھ جیسی باتونی اور آزاد پنچھیوں کی طرح چہچہانے والی سخن فہم لڑکی پانچ سال تک ایک ایسے انسان کے ساتھ خاموشی کے زنداں میں گھُٹتی رہی ہے جو پہلے ہی سے اِس سزا کو بھگت رہا تھا۔" میں خاموشی سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ کہے جا رہی تھی۔

"میں نے سالوں خاموش رہ کر اپنے آپ پر جبر کیا ہے راحت صاحب! اور جب میرے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو چکا تو لفظ تہذیب، شرافت اور خاندانی وقار یہ سب مجھے ایک فریب دکھائی دینے لگے۔ جن دِنوں میں پُوری طرح بغاوت پر آمادہ تھی اُنھیں دِنوں مجھے ناصر ملا اور جب میں نے اُس کی آواز سُنی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کی آواز کا تیشہ میرے دل و دماغ پر کھڑے ہوئے رسموں کے اُس پہاڑ کو کاٹ رہا ہے۔ جس میں ایک مدّت سے میری خاموش آرزوؤں کا ایک سوتا سا مچل رہا تھا!"

"اور معلوم ہوتا ہے شاید آج تم اُس ناصر سے بھی اوب گئی ہو!"

"ہاں! آج پہلی بار مجھے ملک کی یاد انتہائی شدت سے آرہی ہے!"

یہ کہتے ہی وہ پھوٹ پڑی تھی۔

میں اُسے روتے دیکھ کر اپنے آپ پر بُری طرح جھنجلا رہا تھا۔
"تم چاہو ـــــ تو ملک آفاق کو پھر بُلا سکتی ہو ـــــ؟"
"ملک اب اِس دُنیا میں نہیں ہے راحت صاحب ـــــ!! یہ کہہ کر وہ پھر سسکنے لگی تھی۔
"کیا ـــــ!؟"
"ملک نے پرسوں خودکشی کر لی ہے!" میں چُپ رہا اور ملک آفاق کی موت کے اِس المیئے پر غور کرتا رہا اور سیمیں سسکتی رہی۔
"میں نہیں جانتی تھی۔ ملک میرے غم میں جان دے کر ایک دن میرے دِل پر اپنی محبت کی اتنی گہری چھاپ لگا دے گا!"
"کیا ملک نے خودکشی کر لی؟"
"ہاں اور اُسی کے ساتھ اپنی ساری دولت میرے نام کر دی! آج صبح آفاق کی موت کا تار آیا ہے۔ وہ اب اِس دنیا میں نہیں ہے وہ مر چکا ہے" راحت صاحب! یہ کہہ کر وہ پھوٹ پڑی تھی اور میرے ذہن میں اُس وقت ملک آفاق، سیمیں اور ناصر۔ تین متضاد کرداروں کا بُجھتا ہوا ایک مثلث اُبھر رہا تھا۔
سیمیں روتے روتے بیہوش ہو گئی تھی۔
"سیمیں ـــ سیمیں ـــ!؟" میں نے گھبرا کر اُسے جھنجھوڑا تو وہ آنکھیں کھول کر مجھے گھورنے لگی۔
"گھبراؤ مت تم اکیلی نہیں ـــــ میرے ساتھ ہو! بیشک میں نے تم سے محبت کی ہے تم میرے ساتھ رہ سکتی ہو ـــــ!" میں اُس کی پھٹی پھٹی سوگوار آنکھوں میں ڈوب کر اپنے آپ سے بے نیاز ہو کر آج خود فراموشی کے عالم میں وہ سب کچھ اُگل دیا تھا جس کا اظہار میں نے کبھی کسی کے سامنے نہ کیا تھا اور یہ سب کچھ کہنے کے بعد جب میں اُس کی آنکھوں کی رعنائیوں سے اُبھرا تو اُس کے خشک ہونٹوں پر ایک پھیکی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔
"تم شاید میری بات پر ہنس رہی ہو ـــــ!" شاید تم سمجھتی ہو میں بھی تمہیں ناصر کی طرح فریب دوں گا ـــــ"
"نہیں ـــــ" یہ کہہ کر اُس نے ایک لمبی سانس کھینچی اور پھر اِس طرح منہ بنانے لگی جیسے وہ کوئی تلخ شے اپنے گلے سے نیچے اُتار رہی ہو۔
"نہیں ـــ مجھے ـــ آفاق ـــ بُلا رہا ہے!؟ وہ خلاؤں میں دیکھ رہی تھی۔
"لیکن آفاق اب اِس دُنیا میں نہیں ہے ـــ!" یہ سُن کر بھی وہ خلاؤں میں دیکھتی رہی۔
"یہ اور بات ہے کہ تمہیں ناصر کا اندیشہ تھا!"
"زندہ اب وہ بھی نہیں ہے!"
"کیا کہا ـــــ ناصر زندہ نہیں ہے ـــ؟!"
"اُس کمینے کو میں نے زہر دے دیا ہے!" سیمیں نے دانت پیستے ہوئے جواب دیا تھا۔
"یہ تم کیا کہہ رہی ہو ـــــ!؟ میں کانپ گیا تھا۔
"ایسے ذلیل انسان کا اِس دُنیا میں کوئی کام نہیں ـــ تم بھی اپنے کسی ناول میں ایسے گمراہ کردار کو زندہ مت رکھنا۔ ورنہ وہ اِس معاشرے کی فضا کو زہریلی کر دے گا!"
"لیکن تم نے ناصر کو زہر دے کر اِتنا بڑا جُرم کیوں کیا ـــ؟
"یہ جُرم نہیں ـــــ انتقام ہے! وہ بیوفا تھا۔ میں نے اُسے مار دیا، لیکن میں بیوفا نہیں ہوں راحت! زہر میں نے بھی پیا ہے!"
"سیمیں ـــ؟" یہ سُنتے ہی میرے مُنہ سے چیخ نکل گئی اور سارے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔
"یہ میری تحریر ہے ـــ اپنی ـــ موت کی ـــ ذمے دار میں ـــ خود ـــ ہوں!" اُس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک رقعہ میری طرف بڑھایا تو میں نے اُسے صوفے پر لٹا دیا کیونکہ وہ اب فینٹ (FAINT) ہوتی جا رہی تھی اور یہ دیکھ کر میرے اندر دوڑتی ہوئی سُرور کی آنچ سرد ہو گئی تھی۔
"آپ سے بس ـــ ایک التجا ہے!" وہ کانپتی ہوئی آواز میں گویا ہوئی تھی۔ "میری لاش ـــ کو لا ـــ وارث ـــ قرار ـــ نہ ـــ دیا ـــ جا ـــ ئے پوسٹ ـــ مارٹم ـــ کے بعد ـــ مجھے ـــ آ ـــ فا ـــ ق ـــ کے ـــ پہلو میں ـــ دفنا ـــ دیا ـــ جا ـــ ئے!"
"نہیں۔ میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا!" میں نے مشتعل ہو کر پھر اُسے باہوں میں لے لیا تھا۔
"نہیں۔ ر ـ ا ـ حت ـ مجھے ـ اب ـ آفاق بُلا رہا ہے!"
یہ کہہ وہ خاموش ہو گئی تھی۔ شاید اُس کی روح کا تشنہ طائر شیلے کے "اِسکائی لارک" کی طرح دنیاوی غموں سے گھبرا کر آفاق کی بلندیوں میں گم ہو گیا تھا
وہ میرے سامنے بے حس و حرکت پڑی تھی اور میں اُس کی طرف دیکھ کر سوچ رہا تھا ـــــ زندگی تشنگی کا ایک ایسا سفر ہے جس کا اختتام انسان کی موت پر ہوتا ہے!"

غزل

نافع رضوی ایم۔اے۔بی۔ایڈ۔ایل ایل۔بی

تمہارے عاشق بھلا چکے ہیں وہ قیس اور کوہکن کی باتیں
اب ایک افسانہ بن چکی ہیں فرازِ دار و رسن کی باتیں

یہ دشتِ غربت یہ سخت راہیں کوئی ملے تو اسے سنائیں
کسی غزالِ ختن کی باتیں کسی نگارِ وطن کی باتیں

ہزاروں پھولوں نے اپنے سر کو حیا کے مارے جھکا لیا ہے
اگر گلستاں میں چھڑ گئی ہیں کبھی کسی گل بدن کی باتیں

نہ جانے کیوں دل کی وادیوں میں وفا کی خوشبو بکھر گئی ہے
ابھی ابھی مجھ سے کہہ رہی تھی صبا ترے بانکپن کی باتیں

کسی بشر کی مجال کیا ہے بھلا فرشتے تو بھول جائیں
وہ آپ کے گیسوؤں کی خوشبو وہ آپ کی انجمن کی باتیں

کہاں وہ گل رخ ہیں آج نافع کہاں ہیں وہ شوخ و شنگ دلبر
خیال یا خواب ہو گئی ہیں دیارِ گنگ و جمن کی باتیں

غزل

پروفیسر محمود رحمانی سنبھلی ایم۔اے علیگ۔بی ایڈ

جنوں کی راہ میں جب اہلِ دل نکل آئے
حیات و موت کا مفہوم ہی بدل آئے

نہ راستہ ہے نہ منزل نہ کوئی نقشِ قدم
یہ کس مقام پہ وحشی ترے نکل آئے

کسی کے لب پہ جو بھولے سے میرا نام آیا
نہ جانے وقت کے ماتھے پہ کتنے بل آئے

چمن چھٹا تو چھٹا ہم سے باغباں لیکن
کلی کلی کے خیالات ہم بدل آئے

کبھی خزاں کو گلے سے لگا لیا ہم نے
کبھی بہار سے بچتے ہوئے نکل آئے

کیے طے ہیں محبت میں منزلیں محمود
جہاں کبھی قرب ہوا فاصلے نکل آئے

غزل

مسعودہ حیات ایم۔اے۔بی۔ٹی

کیوں جلائیں کوئی دل شعلۂ عریاں کی طرح — آؤ اک رات جلیں شمعِ فروزاں کی طرح
کیا ستم ہے کہ وہی دشمنِ جاں ٹھہرے ہیں — جن کو سمجھا تھا کبھی ہم نے رگِ جاں کی طرح
داستاں آبلہ پائی کی سنائیں کس کو — شاخِ گل بھی ہے یہاں خارِ مغیلاں کی طرح
دہر میں کون ستم کش نہیں اپنوں کا مگر — کیا اٹھائے گا کوئی غم مہِ کنعاں کی طرح
فصلِ گل میں ہمیں حاصل ہے یہی فیضِ بہار — پھول کھلتے ہیں مگر چاکِ گریباں کی طرح

ایک اک لمحہ غنیمت ہے محبت میں حیات
وقت بہہ جائیگا اک قطرۂ مژگاں کی طرح

ایک پاؤڈر
جو کپڑوں اور ہاتھوں کیلئے
نہایت محفوظ ہے

ایک پاؤڈر
جو رنگین کپڑوں کو
زیادہ چمکدار بناتا ہے

ایک پاؤڈر
جو کپڑوں کو
نہایت سفید دھوتا ہے



نیا تین طرفہ عمل والا ڈیٹ

نیا ڈیٹ جس میں دُھلائی کے بعد کپڑوں کو نہایت سفید بنانے کیلئے ایک زائد سفیدی لانیوالا جز شامل ہے۔
نیا ڈیٹ کپڑوں کو زیادہ صاف بنانے کی قوت سے مالامال ایک پاؤڈر ہے۔ کپڑوں میں جمی میل کچیل کو بھی دُور کرتا اور رنگین کپڑوں کو نہایت چمکدار بناتا ہے۔
نیا ڈیٹ بھرپور جھاگ دیتا ہے جس میں کپڑوں کو ملائم رکھنے کیلئے ایک خاص جز شامل ہے۔
یہ آپکے کپڑوں کو نہایت محفوظ طریقے سے دھوتا ہے... اور آپکے ہاتھوں کو نہایت ملائم رکھتا ہے!



نیلا ڈیٹ
سفید ڈیٹ
نئی سائزیں: ۲۰۰، ۴۰۰، ۶۰۰، ۸۰۰، ۱۰۰۰ کے پیکٹ میں۔ چھوٹے نمونے کے پیکٹ بھی ملتے ہیں۔

ایک اور اعلیٰ درجہ کی ڈیٹ مصنوعات
ڈیٹ ٹکیہ



صابنوں کے مقابلہ میں ۲ گنا زیادہ کپڑے دھوتا ہے اور پہلے سے بہت زیادہ سفید — پانی میٹھا ہو یا کھارا۔

چپکے سے بہار آئی

رضیہ دستگیر ایم۔ اے

۶۱۷/۲۰۔ ورتک نگر گورنمنٹ کالونی، تھانہ (مہاراشٹر)

محترم خوشتر صاحب! تسلیمات

"شکستِ آرزو" اور "ریشمی کفن" سے متعلق قارئین کے خطوط اب تک موصول ہو رہے ہیں۔ جو قارئین کے بے پناہ خلوص اور آپ کی ہمہ گیر مقبولیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ طویل عرصے تک "بیسویں صدی" کی بزم سے غیر حاضر رہی۔ جس کا مجھے بہت افسوس ہے۔ کیا بتاؤں سالِ گذشتہ کتنا پریشان کن تھا! والد صاحب کے اچانک حادثہ نے ذہنی طور پر مفلوج کر دیا تھا۔ اسی لئے قارئین کے مسلسل اصرار کے باوجود کچھ نہ لکھ سکی۔ اُس کے بعد امتحانات نے مصروف رکھا۔ سمجھ میں نہیں آتا اُن قارئین کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں جو اِس تمام عرصے میں مجھے یاد کرتے رہے۔ شاید انھیں کے پیہم اصرار نے مجھے قلم سنبھالنے پر مجبور کیا۔ جنبشِ قلم نے اِس کہانی کو جنم دیا۔ آپ چاہیں تو اِسے "خوابوں کا نخلستان" کہیں یا "چپکے سے بہار آئی"۔ امید ہے کہانی آپ کی نظروں میں پسندیدگی حاصل کر لے گی۔۔۔ نیک خواہشات کے ساتھ

آپ کی چھوٹی بہن

رضیہ

★

کانپتے ہاتھوں سے فریدہ نے اُس کے فلیٹ کی گھنٹی بجائی۔ جیسے جیسے قدموں کی چاپ قریب ہوتی جاتی۔ اُس کے دل کی دھڑکن تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ آخر دروازہ کھلا اور وجیہہ و پُر وقار شخصیت کا مالک عامر نمودار ہوا۔

"اوہ آپ! تشریف لایئے!"

اِس دوران فریدہ نے اپنے آپ پر قابو پا لیا تھا۔ آہستہ سے کہا: "غالباً یہ آپ کا Illustrated Weekly ہے جو غلطی سے ہمارے ہاں پہنچ گیا تھا۔"

"جی ہاں میرا ہی ہوگا۔ آج سارا دن یہی سوچ رہا تھا کہ ویکلی کیوں نہیں آیا؟ شکریہ، بہت بہت شکریہ!"

وہ میگزین دے کر پلٹنے لگی۔ لیکن عامر کے ملتجیانہ لہجے نے اُسے روک لیا: "آپ تشریف نہ لائیں گی کیا؟"

وہ ہچکچائی۔ اُس کی ہچکچاہٹ کو محسوس کرتے ہوئے عامر نے کہا: "میری امی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔ اندر آجایئے فریدہ صاحبہ!"

اپنے خوبصورت پیکر کی چاندنی میں نہائی ہوئی وہ اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ وہ ایک پھول تھی۔ پاکیزہ، حسین، خوشنما! ڈرائنگ روم میں اُسے بٹھا کر وہ کچن میں اپنی ماں کے پاس چلا آیا۔ اُس کے لوٹتے ہی فریدہ نے بے تابی سے پوچھا۔

"آپ میرا نام کیسے جانتے ہیں؟"

"دِلوں کو چھو لینے والی حقیقی تاثر رکھنے والی کہانیوں کی

یاد

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں —— فیض احمد فیض

دنیا کے ستم یاد نہ اپنی ہی وفا یاد
اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد —— جگر مراد آبادی

آج کیوں ہچکیاں آتی ہیں دلِ ناشاد مجھے
شاید اُس شوخ نے بھولے سے کیا یاد مجھے —— نامعلوم

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں —— فراق گورکھپوری

کوئی بادل پاس سے گزرا کہ تری یاد آئی
وہی مہتاب سا چہرہ، وہی خوشبو سے بدن —— محمود ایاز

مرسلہ:۔ محبوب مسرت ناندیری

تخلیق کار کو کون نہیں جانتا اس لئے آپ میرے لئے اجنبی نہیں ہیں۔ آرام سے بیٹھئے۔ امی چائے بنا رہی ہیں۔"

"آپ تو تکلف کر رہے ہیں۔ امی کو آپ خواہ مخواہ تکلیف دے رہے ہیں۔ میں ابھی چلی جاؤں گی۔" مقابل کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے فریدہ نے کہا۔ عامر کو ایسا محسوس ہوا اُس کے کمرے کی فضا نکہت و نور میں ڈوبی جا رہی ہے!

"آپ کی کہانیاں مجھے پسند ہیں۔ عرصہ دراز سے سوچتا تھا کہ آپ سے شرفِ ملاقات حاصل کروں لیکن پھر یہ خیال ہوتا تھا کہ شاید آپ پسند نہ کریں۔ ویسے ایک بات پوچھوں؟"

"کہیئے!"

"آپ کی کہانیوں میں اتنا درد کیوں ہوتا ہے؟" اُس کی آنکھوں میں بے پناہ تجسس جھلک رہا تھا۔

"تاکہ کہانی آپ جیسے درد مندوں کے دلوں میں جگہ پا سکے۔ حالات سے سمجھوتہ کر لینے کے بعد دل کی وادی اتنی تنگ ہو جاتی ہے کہ درد، آہ و فغاں کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی اور وہ قلم کے سہارے کاغذ پر بکھرنے کو بے تاب ہو جاتا ہے۔ غم کی انفرادی کیفیت بدل جاتی ہے۔ غم بٹ جاتا ہے اور کم ہو جاتا ہے۔ اس طرح دل کو سکون اور آسودگی ملتی ہے۔" فریدہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ ہونٹ بھینچ لئے لیکن آنسو بے تاب ہو کر رخساروں پر چھلک پڑے۔ آنسو پینے کی ناکام کوشش پر عامر کا دل پگھل گیا۔ پُر ندامت لہجے میں کہا۔

"معاف کیجئے فریدہ صاحبہ! میں نے آپ کے نازک جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے۔"

"ٹھیس تو انھیں لگ سکتی ہے جو زندہ ہوتے ہیں۔ ایک جذبۂ نفرت کے سوا میرے سارے جذبات مر چکے ہیں۔ مجھے نفرت ہے اپنے وجود سے! اور جب ہستی سے نفرت کا یہ جذبہ اپنی اِنتہا کو پہنچے گا تو میں موت کی آغوش میں رہوں گی۔ اپنے رب سے یہی دُعا مانگتی ہوں کہ جلدی سے موت کی پُرسکون وادی میں پہنچا دے۔"

"چھی چھی چھی!!! آپ کیسی باتیں کرتی ہیں۔ اپنے وجود سے نفرت! فریدہ صاحبہ یہ آپ کی کمزوری ہے۔ زمانہ ایسا ہے کہ اگر آپ کمزوری ظاہر کریں گی تو لوگ آپ کی کمزوری سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کریں گے۔ اگر آپ زمانے کے سامنے جھک جائیں گی تو لوگ اور جھکائیں گے، ٹھوکر لگائیں گے۔ پھر آپ کی بے بسی پر دل کھول کر ہنسیں گے۔ اِس لئے کمزور نہ بنئے۔ آپ کا نازک اور چھوٹا دل اِس قابل نہیں کہ غم برداشت کر سکے۔ اِس لئے اپنے سارے غم مجھے دے دیجئے۔ میری ایک بات سُنو گی؟"

جھکی ہوئی بھیگی بھیگی پلکیں اُوپر اُٹھیں۔ عامر کو ایسا محسوس ہُوا اُس کے معصوم چہرے پر آنکھیں نہیں جلتی ہوئی شمعیں ہیں جو اُس کے دل میں چھپے ہوئے درد سے جل رہی ہیں۔ عامر نے سِلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"اُس ہستی سے نفرت کرو جس نے تمھارے دامن میں کانٹے بھر دیئے۔ جس نے تمھارے نازک دل کو ٹھیس پہنچائی۔ موت کی دُعا اُس کمینہ اور ذلیل شخص کے لئے مانگو جس نے تمھارا سکون چھین لیا۔ جس نے تمھاری زندگی کو جہنم بنا دیا ہے!"

"عامر صاحب! میں نے آج تک کسی سے نفرت نہیں کی۔ میں اپنے آپ سے نفرت کر سکتی ہوں، کسی دُوسرے سے نہیں۔"

"عامر کی نظر میں تمھارا وجود نہ صرف قابلِ تکریم ہے بلکہ

قابلِ محبت بھی ہے۔ اس لئے اگر تم اپنے وجود سے نفرت کرو گی تو
یہ سمجھ لو کہ تم عامر سے نفرت کر رہی ہو!"

اُس کے یوں کہنے پر عامر کی آنکھ بھر آئی۔ اُس کی آنکھوں پر لگا ہُوا سیاہ چشمہ بھی آنسوؤں کا اِخفا نہ کر سکا۔ اِتنے میں چائے آ گئی۔ امّی آکر فریدہ کے پاس بیٹھ گئیں۔ چائے کے دَوران اِدھر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی۔ اِس لئے فضا کا تکدّر اور بوجھل پن کچھ کم ہو گیا۔ فریدہ کے اخلاق اور اندازِ گفتگو سے وہ بھی بہت متاثر ہوئیں۔ اُسے روز آنے کی تاکید کی۔

وہ تقریباً روزانہ شام کے وقت عامر کے گھر جانے لگی۔ عامر میکانیکل انجینئر تھا۔ لیکن اُسے ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ اُس کی لائبریری انگریزی، اُردو ادباء کی بہترین تخلیقات سے بھری ہوئی تھی۔ فرصت کے اوقات کہانیاں پڑھنا اور کہانیاں لکھنا اُس کا محبوب مشغلہ تھا۔ شاید یہی مشترک شغل تھا جو دونوں کو قریب سے قریب تر لا رہا تھا۔ دونوں اپنی لکھی ہوئی کہانیاں ایک دُوسرے کو سُناتے۔ تنقید و تبصرہ کرتے۔ فریدہ اُس کے خلوص سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ وہ اُس کی بہت عزّت کرتی تھی۔ اُس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ کیونکہ عامر نے جس خلوص اور پیار سے نفسیاتی طور پر اُس کا علاج کیا تھا وہ ناقابلِ فراموش تھا۔ وہ اُس کا مسیحا تھا۔ عامر کے پیار نے اُسے نئی زندگی دی تھی۔ وہ اب پہلے کی طرح مُرجھائی ہوئی دل شکستہ فریدہ نہ رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر نکھار آتا جا رہا تھا۔ اُس کی پژمردگی شگفتگی میں بدلتی جا رہی تھی۔ جس کا اُسے شدّت سے احساس تھا اور جس کے لئے وہ عامر کی احسان مند تھی۔

ایک حسین شام تھی۔ چاروں طرف قُدرتی حُسن بکھرا ہُوا تھا۔ مغربی گھاٹ کے سرسبز پہاڑی سلسلے دُور دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔ چمن پر ہلکی ہلکی سُورج کی کرنیں نُور کی بارش برسا رہی تھی۔ تنگ کچے راستہ کے دونوں طرف آم اور املی کے گھنے درخت سایہ کئے ہوئے تھے۔ دُور دُور تک ہرے بھرے میدان پھیلے ہوئے تھے۔ سایہ دار درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں سے لُطف اندوز ہوتے ہوئے وہ تالاب کے کنارے پہنچ گئے۔ تالاب کی منڈیر پر بیٹھ گئے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا پانی میں ہلکی ہلکی لہریں پیدا کر رہی تھی۔ لیکن عامر کے دل میں خیالات کا طوفان اُٹھ رہا تھا اور فریدہ خاموش تھی۔ قدرت کے بکھرے ہوئے سحر انگیز نظارہ میں کھو گئی تھی۔ عامر نے سکوت توڑا۔

"فریدہ امّی چاہتی ہیں اس سال امّی کو حج کے لئے بھیج دوں۔ لیکن۔۔۔" وہ کچھ سوچ کر رُک گیا۔

"لیکن کیا عامر صاحب؟ کیا وہ نہیں جانا چاہتیں؟"

"ہاں فریدہ! میں اپنے فرض سے سُبکدوش ہونا چاہتا ہوں۔ اور وہ اپنے فرض سے۔"

"یعنی؟" اُس کے چہرے پر معصومیت کھیل رہی تھی۔

"یعنی وہ چاہتی ہیں کہ جلد از جلد شادی کر لوں۔ کئی لڑکیاں اُنہوں نے دیکھ رکھی ہیں۔ وہ تذکرہ کرتی رہتی ہیں اور میں بہت مشکل سے جان بچا کر بھاگ جاتا ہوں۔ لیکن اب اُن کی خوشی کی خاطر مجھے۔۔۔" جان بُوجھ کر عامر نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ فریدہ گھبرا گئی۔ ہزاروں وسوسے اُس کے دل میں پیدا ہو گئے کہ کوئی اُس کے عامر کو اُس سے چھین نہ لے۔ لیکن خاموش ہی رہی۔

اُجالا

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

"فریدہ! تم میرا ساتھ دو گی؟"

"کہئے میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں؟ آپ جو کہیں گے وہی کروں گی۔"

"فریدہ! میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ جس لڑکی کو میں نے پسند کیا ہے وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے یا نہیں؟ میں نے اُس لڑکی کو پسند کیا ہے جو زندگی کی حقیقتوں سے آشنا ہے۔ جو میرے خوابوں میں بسی ہوئی ہے۔ جس کے بغیر میری زندگی ادھوری ہے!" جذبات کی روانی میں وہ بہتا جا رہا تھا۔

"کون ہے وہ؟" رشک و اشتیاق کے مِلے جُلے لہجے میں فریدہ نے پوچھا۔

"تمھارے سوا کون ہو سکتا ہے؟"

فریدہ کا چہرہ شرم سے سُرخ ہو گیا۔ اُس کی خوبصورت آنکھوں پر حیا سے بوجھل پلکیں چلمن بن کر گر گئیں۔ وہ لاجواب سی ہو کر بے خیالی میں زمین پر لکیریں کھینچنے لگی۔

"میں تمھارا جواب چاہتا ہوں تاکہ امی کو آگاہ کر دوں۔"

"عامر! مجھے اپنی قسمت سے ڈر لگتا ہے۔ میں بہت بدنصیب ہوں۔ آپ شیعہ ہیں اور میں سُنّی!"

"یہ تم کہہ رہی ہو فریدہ! حیرت ہے کہ تم بھی ان لغویات کو مانتی ہو۔ یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ ہم سب انسان ہیں۔ صرف انسان!"

"میں اِن امتیازات کی قائل نہیں عامر! لیکن مجھے سماج سے ڈر لگتا ہے، تمھارے خاندان سے ڈر لگتا ہے۔ اگر کسی نے میری طرف اُنگلی اُٹھائی تو میری زندگی تلخ تر ہو جائے گی۔ ویسے بھی کیا کم تلخیاں میری زندگی میں گھلی ہوئی ہیں!" اُس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"فریدہ! کیا تمھیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟ یقین مانو میرے گھر والے بہت روشن خیال ہیں۔ وہ اِن باتوں کو نہیں مانتے۔ لیکن تمھارے گھر والے مخالفت کریں تو تمھیں اُن کی مرضی کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ کیونکہ تم لڑکی ہو۔ اپنے خاندان کی مخالفت برداشت نہ کر سکو گی۔ ویسے میرے اپنے متعلق یہ عرض ہے کہ میرا مذہب انسانیت ہے۔ دُوسروں کا دُکھ دُور کرنا میرا ایمان ہے۔ کیا تمھیں میرا مذہب پسند نہیں؟"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟" اُس نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔ "آپ کی ہر بات مجھے پسند ہے۔ میں آپ کا احترام کرتی ہوں۔ آپ صرف انسان ہی نہیں فرشتہ ہیں! میرے محسن ہیں۔ میرے مسیحا ہیں! میں ڈوب رہی تھی۔ آپ نے مجھے سہارا دیا۔ جی چاہتا ہے ساری زندگی آپ کے قدموں میں گزار دوں۔ آپ کے قدموں کی دھول بن کر رہوں!"

عامر نے جلدی سے اُس کے گلابی ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "ایسا مت کہو فریدہ! تم میرے سر کا تاج بن کر رہو۔ تمھاری جگہ میرے قدموں میں نہیں میرے دل میں ہے! تم میرے دل کی مکین ہو۔"

وہ چُپ ہو گیا۔ دونوں بہت دیر تک خاموش رہے۔ ایک دُوسرے کے محبت بھرے الفاظ کے طِلسم میں کھوئے ہوئے! آخر عامر نے خاموشی کا طِلسم توڑا۔

"فریدہ! اپنی ایک فُل پوز تصویر مجھے دو گی؟"

وہ کچھ سوچ میں پڑ گئی تو عامر نے فوراً کہا۔ "نہیں دینا ہے تو صاف اِنکار کر دو۔ بہانہ بنا کر ٹالنے کی کوشش مت کرو۔" اُس کے لہجے کی ناراضگی کو فریدہ برداشت نہ کر سکی۔

"خُدارا آپ ناراض نہ ہوں۔ میں دے دوں گی۔ چلئے شام گہری ہوتی جا رہی ہے۔"

اِس طرح کئی ہفتے گزر گئے۔ اب وہ عامر کے سامنے بہت کم آتی۔ یوں تو روزانہ اُس کے گھر جاتی۔ لیکن عامر کے کمرے کو آراستہ کرنے کے بعد فوراً ہی واپس چلی آتی۔ عامر اُس سے مِلنے کے لئے بے چین تھا۔ لیکن موقع ہی نہیں مِل رہا تھا۔ ایک دن وہ جلد ہی گھر لوٹ آیا۔ فریدہ گھر میں موجود تھی۔ شِکوے شکایت کے دفتر کھول دئے اور پھر تصویر کے متعلق اُس کا وعدہ یاد دلایا۔

"آپ میری تصویر لے کر کیا کریں گے؟ میں مجسّم آپ کے سامنے ہوں!"

"یہ ٹھیک ہے جناب! لیکن کراچی میں بھائی صاحب کے پاس آپ کا فوٹو بھیج کر تعارف کروانا ہے۔"

ایک ادائے بے نیازی سے فریدہ نے کہا۔ "کہہ دیجئے نا بھائی صاحب سے کہ میں ایک سیدھی سادی سی لڑکی ہوں۔ جیسی بھی ہوں بس ٹھیک ہوں۔ کانی، اندھی، لنگڑی، لُولی نہیں ہوں۔"

"وہ تو میں جانتا ہوں فریدہ! میں تمھارے اُوپر دباؤ تو نہیں ڈال سکتا۔ ایک درخواست تھی، ایک التجا تھی۔ تم نے اُسے قبول نہیں کیا۔ ٹھیک ہے تمھاری مرضی!" وہ چُپ ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد گہری سوچ سے اُبھر کر عامر نے کہا: "فریدہ! میری طرف دیکھو" اُس نے اپنی آنکھوں پر سے سیاہ چشمہ ہٹایا۔ فریدہ چونک اُٹھی۔ عامر کی ایک آنکھ بھیانک طور سے اندر دھنسی ہوئی تھی۔

"فریدہ! میرے اس انکشاف پر کہ میں کانا ہوں۔ کیا تم پشیمان نہیں ہو؟ کیا یہ جاننے کے بعد کہ مجھ میں جسمانی عیب ہے، تم مجھ سے مِلنا گوارا کرو گی؟"

فریدہ خاموش تھی۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا جواب دے۔ اُسے نہیں معلوم تھا کہ عامر اُس کی معمولی بات کا اِتنا اثر لے گا۔ اُس نے سوچا بھی نہ تھا کہ اُس کے معمولی مذاق پر عامر کا یہ ردِ عمل ہو گا۔

وہ کہہ رہا تھا: "آج میں تمھیں اپنی کہانی سُنانا چاہتا ہوں۔ اپنے دل کا درد بتاتا ہوں اور پھر تم سے ایک درخواست کروں گا۔ مجھے اُمید ہے تم میری درخواست قبول کرو گی۔"

عامر کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر فریدہ دَم سادھے چُپ چاپ بیٹھی رہی۔ عامر نے سگریٹ کا گہرا کش لیا۔ دُھواں فضا میں مرغولے بناتا ہوا پھیل رہا تھا اور عامر دُور خلاء میں گھورتا ہوا اپنے ماضی کو ڈھونڈ رہا تھا۔

"آج سے ٹھیک پانچ سال پہلے میں برٹش انجینئرنگ ورکس میں سروس کرتا تھا۔ وہیں Administrative cadre میں ایک انگریز لڑکی بھی سروس کرتی تھی۔ مِس ٹریسا۔ گورا گداز بدن، سُنہرے بال، سُنہری آنکھیں، سُتواں ناک، گُلابی چہرہ۔ مجھے وہ بہت پیاری معلوم ہوئی۔ وہ بھی مجھے پسند کرنے لگی۔ آفس سے باہر ہم ہوٹلوں میں، پارکوں میں اور کلبوں میں مِلنے لگے۔ وہ میرے کہنے پر شادی کے لئے تیار ہو گئی۔ اُس کے گھر والوں نے مجھے ہندوستانی سمجھ کر خوب مخالفت کی۔ لیکن وہ ہر طرح کی مخالفت کی پروا کئے بغیر مجھ سے وابستہ ہونے کے لئے رضامند ہو چکی تھی۔ لیکن اچانک اُف!" وہ اندرونی درد سے کراہ اُٹھا اور ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔

"آہ! کاش۔۔۔!! وہ منحوس حادثہ نہ ہوتا۔ اُس حادثے نے میری ایک آنکھ چھین لی اور میری محبوبہ بھی مجھ سے چھین گئی! قِسمت میرا مذاق اُڑا رہی تھی۔ میں نے لندن چھوڑ دیا۔ ہمیشہ کے لئے اور ہندوستان چلا آیا۔ لیکن تلخ یادیں میرا پیچھا نہ چھوڑ سکیں۔ میں اُس کی بے وفائی پر آنسو بہاتا رہا اور اپنے آپ کو دھوکا دیتا رہا۔ امّی کے اصرار کو خوبصورتی سے ٹالتا رہا۔ کیونکہ میں نے تہیّہ کر لیا تھا کہ زندگی کے صحرا میں تنہا ہی رواں دواں رہوں گا۔ جب دُنیا میں خلوص، محبت، وفا کا چلن نہیں تو ایسی دُنیا سے دل لگا کر کیا فائدہ؟ لیکن۔۔۔ اچانک مجھے تم مِلیں۔ تمھارے دُکھ درد دیکھ کر میں اپنا دُکھ بھول گیا۔ تمھارے مہکتے ہوئے زخموں پر مرہم رکھتے رکھتے میں اپنے زخموں کو بھول گیا۔ تمھارے اخلاق، اخلاص اور سادگی سے میں بہت متاثر ہوا۔ تمھاری درد بھری کہانی سُن کر میں تم سے قریب ہوتا گیا۔ کاش! میں تم سے متاثر نہ ہوتا۔ کاش! تم میرے اِتنے قریب نہ آجاتیں۔"

اُس نے اپنا سر پکڑ لیا۔ پھر اچانک وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑکی کے پاس جا کر رُک گیا۔ کچھ ہی لمحہ بعد پلٹ کر آیا۔ فریدہ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔

"تم بھی مجھ سے نفرت کرو۔ فریدہ! میں کِسی قابل نہیں۔ میں کِسی کے کام نہیں آسکتا۔ میں ناکارہ ہوں

نہ کِسی کی آنکھ کا نُور ہوں، نہ کِسی کے دل کا قرار ہوں
جو کِسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مُشتِ غُبار ہوں"

فضا میں اپنی درد بھری آواز بکھیر کر وہ خاموش ہو گیا۔ فریدہ جو اب تک خاموشی سے سُن رہی تھی اور اُس کی دِلی کیفیات کا اندازہ لگا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"عامر! یہ آپ کا احساسِ کمتری ہے۔ جو نہ صرف آپ کو پست ہمت، کمزور اور بزدل بنا کر ساری زندگی سِسکتے رہنے پر مجبور کرے گا میری زندگی کا بھی خاتمہ کر دے گا۔ اِس طرح تڑپ تڑپ کر سِسک سِسک کر جینے سے کیا فائدہ؟ اپنی صلاحیتوں کو پہچانئے عامر! آپ کیوں یہ سمجھتے ہیں کہ آپ ناکارہ و ناقابل ہیں؟ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ آپ میرے سفینۂ حیات کے ناخدا ہیں! میں منجدھار میں ڈوب رہی تھی،

آپ نے اپنے خلوص اور پیار سے مجھے بچا لیا اور ساحل تک پہنچایا۔ اب ساحل پہنچا کر پھر پانی میں کیوں دھکیل رہے ہیں؟" جذبات کی شدت سے اس کا گلا رندھ گیا۔

"نہیں فریدہ نہیں! میں اس قابل کہاں کہ تمہارا سہارا بن سکوں۔ مجھے بھول جاؤ۔ میں تمہارے قابل نہیں ہوں تم سے!"

دن گزرتے جا رہے تھے۔ عامر فریدہ سے ملنا جلنا بند کر دیا۔ کبھی کبھی وہ گھر سے غائب رہنے لگا۔ فریدہ کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ عامر کی امی الگ پریشان تھیں۔ ایک دن وہ شام کے وقت عامر کی امی سے ملاقات کر کے لوٹ ہی رہی تھی کہ عامر گھر میں داخل ہوا۔ پریشان بال، داڑھی بڑھی ہوئی۔ بے ترتیب کپڑے اس کی پریشان خاطری کی غمازی کر رہے تھے۔ اپنے کمرے میں جاتے ہی وہ پلنگ پر لیٹ گیا۔ فریدہ بھی پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی اور مقابل کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ عامر کی حالت دیکھ کر وہ تڑپ اٹھی۔ لیکن کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ فریدہ اس مجتمع کر کے ہمت بہت پیچھے ہٹ رہا۔

"عامر صاحب! آپ نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ اگر کسی نے آپ کو تڑپایا۔ بے وفائی کا گہرا داغ دیا ہے تو آپ اس کے جرم کی سزا اپنے آپ کو اور مجھے کیوں دے رہے ہیں؟ کیا آپ کو میرے پیار، میرے خلوص پر اعتبار نہیں ہے؟"

"فریدہ! مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں اس قابل نہیں کہ کسی کی محبت کو پا سکوں۔ جس سے بھی میں نے محبت کی وہ چھن گیا۔ جسے بھی میں نے چاہا مجھ سے دور ہو گیا۔ تم بھی مجھ سے نفرت کرو۔ میں مجبور ہوں!"

"مجبور تو لڑکیاں ہوا کرتی ہیں۔ آپ تو مرد ہیں عامر! آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ نے تو ساری زندگی مجھ غم نصیب کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ فریدہ! میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا! تمہاری پلکوں کے ہر آنسو کو اپنی پلکوں میں سجا لوں گا۔ تمہارے دل کا ہر زخم اپنے سینے پر لے لوں گا۔ پھر آج آپ..."

"ہاں فریدہ! میں نے تم سے پیار کیا تھا، کیا ہے اور کرتا رہوں گا۔ لیکن میں مجبور ہوں نا! تمہارے کام نہیں آ سکتا۔ میں تمہاری خوشیاں دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں ہمیشہ تمہیں خوش و خرم، شاد و آباد دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہارا مستقبل تابناک دیکھنا چاہتا ہوں۔ اسی لئے میں نے اپنے دوست سے تمہارے لئے بات چیت کی ہے۔ وہ مجھ سے زیادہ قابل اور خوبصورت ہے!"

"عامر! مجھے غلط نہ سمجھئے۔ میں ظاہری خوبصورتی کی قائل نہیں ہوں۔ مجھے خوبصورت دل رکھنے والا مخلص و ہمدرد انسان چاہئے اور یہ عامر کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہیں تو موقع دیجئے کہ آپ کے قدموں میں بکھرے ہوئے خوشیوں کے پھول چن چن کر اپنی مانگ سجا لوں۔ میری خوشیاں صرف آپ کی ذات سے وابستہ ہیں!"

"اوہ فریدہ! تم کتنی عظیم ہو! میری خاطر اتنی بڑی قربانی دینے کو تیار ہو! لیکن میں اس قابل نہیں۔ میرے دوست احمد مجھ سے ہر لحاظ سے بہتر ہیں اور..."

"خاموش رہئے! مجھے اتنی بڑی گالی مت دیجئے" وہ بپھر گئی۔

آپ نے عورت کو کیا کھلونا یا دل بہلاوے کی کوئی چیز سمجھ رکھا ہے . . . کاش! آپ میرے احساسات، میرے دلی جذبات کو سمجھنے کی کوشش کرتے!"

"معاف کیجئے فریدہ صاحبہ! میں نے آپ کو دوستانہ مشورہ دیا تھا جس کا مجھے کوئی حق نہیں۔ آپ کی دل شکنی ہوئی جس کے لئے دست بستہ معافی چاہتا ہوں۔"

لیکن فریدہ غصّہ میں بپھری ہوئی جواب دیئے بغیر تیر کی طرح باہر نکل گئی۔ عامر چاہتے ہوئے بھی اُسے نہ روک سکا۔

کئی دن بیت گئے۔ عامر کو فریدہ کی کوئی خبر نہ ملی۔ ایک شام وہ جلد ہی گھر لوٹ آیا۔ ڈرائنگ رُوم میں کسی لڑکی کو بیٹھے دیکھ کر پلٹنے لگا کہ امّی نے آواز دی: "عامر بیٹے! آجاؤ یہ کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ تم بیٹھو میں چائے بھجوا رہی ہوں۔"

لڑکی نے نگاہ اُٹھا کر عامر کی طرف دیکھا۔ مردانہ وجاہت کا شاہکار۔ وہ فریدہ کے انتخاب پر داد دیتی رہ گئی۔ عامر سوچ میں پڑ گیا کہ وہ کون ہے؟ کیوں آئی ہے؟ آخر اُسی لڑکی نے مشکل حل کر دی۔

"عامر صاحب! شاید آپ مجھے نہیں جانتے لیکن میں آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ مجھے مسز جعفری کہتے ہیں۔ فریدہ میری بچپن کی دوست ہی نہیں، میری چھوٹی بہن ہے۔ مجھ سے زیادہ اچھی طرح اُسے اور کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ افسوس ہے کہ آپ اُس کے احساسات کی بلندی، اُس کے خیالات کی رفعت اور اُس کے جذبات کی گہرائی کا اندازہ نہ لگا سکے۔ میں نے اُس کی ڈائری پڑھی۔ ڈائری کیا ہے؟ آپ دونوں کی محبت کی داستانِ پارینہ ہے۔ جب وہ اپنے پیار کی اِنتہا کو پہنچ گئی، آپ کا رویّہ اچانک بدل گیا۔ آپ کا احساسِ محرومی جاگ اُٹھا اور آپ نے بے اعتنائی برتنا شروع کر دی۔ یہ بھی نہ سوچا کہ اُس فریدہ کا کیا حال ہوگا جس نے آپ کو دل کی گہرائیوں میں بسا لیا ہے، جو آپ کو پرستش کی حد تک چاہتی ہے۔ لیکن آپ نے اُس کے خلوص کا مذاق اُڑایا۔ اُس کی وفا پر اعتماد نہ کر کے اُس کے یقین کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ اُس کی اَنا کو مجروح کیا اور اُس کے ارمانوں کو سِسکنے پر مجبور کیا۔ اُس کی رُوح بے چین ہو اُٹھی اور اُس نے خودکُشی کا سہارا لیا۔ اپنی وصیت میں یہ لکھا ہے کہ اُس کی آنکھیں عامر صاحب کو تحفہ میں دی جائیں!"

"تو کیا فریدہ مر گئی؟" عامر چیخ اُٹھا۔

"ہاں مرنے کی پُوری کوشش کی تھی۔ سارا جسم نیلا ہو گیا تھا۔ لیکن وقت پر اُسے اسپتال پہنچا یا گیا۔ سول اسپتال کے کئی ممتاز ڈاکٹروں کی بیک وقت کوشش سے وہ بچ گئی لیکن وہ مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہوئی ہے۔ ہوگی بھی تو کیسے؟ جبکہ وہ اپنے زندہ بچ جانے پر افسوس کر رہی ہے۔"

"فریدہ! تم نے یہ کیا کیا؟" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

عابدہ سے اُس کا حال نہ دیکھا گیا تو اُس نے کہا: "فریدہ سے ملنا ہے تو ہاسپٹل کے رُوم نمبر ۱۲ میں آجایئے۔ میں وہیں جا رہی ہوں۔"

عابدہ کے جاتے ہی اپنی امّی کو لے کر عامر اسپتال پہنچا۔ فریدہ آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔ پیشانی کی اُبھری ہوئی لکیریں اُس کے تفکّرات کو ظاہر کر رہی تھیں۔ آنکھوں کے پاس سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ کانوں میں مانوس سی آواز پڑی تو آنکھیں کھول دیں۔ عامر کی امّی کو دیکھ کر اُٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن نقاہت کی وجہ سے اُٹھ نہ سکی۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر عامر کی رُوح کراہ اُٹھی۔ دل رو پڑا اور آنکھ آنسو برسانے لگی۔ لیکن فریدہ اُسے نہ دیکھ سکی۔ کیونکہ اُس کی طرف پُشت تھی۔ کچھ دیر تک تسلّی دینے کے بعد عامر کی امّی فریدہ کی امّی اور عابدہ کو لے کر باہر چلی آئیں۔ لیکن عامر وہیں بیٹھا رہا۔ اِن کے جانے کے بعد وہ اُٹھ کر پلنگ کی پائینتی پر بیٹھ گیا۔

"آپ بھی آ گئے۔ اچھا ہی ہُوا۔ مرنے سے پہلے آپ کا دیدار تو نصیب ہُوا۔ ورنہ یہ بھی حسرت رہ جاتی کہ مرنے سے پہلے . . ."

تیزی سے اُس کی بات کو کاٹتے ہوئے عامر نے کہا: "پگلی کہیں کی! ہر وقت مَوت کی رٹ تمہارے مُنہ سے اچھی نہیں لگتی۔"

"جب تم جینے نہیں دیتے تو پھر مرنے سے کیوں روکتے ہو؟ جب تم میری حیات کے سفینے کو پار نہیں لگا سکتے تو ڈوبنے سے کیوں بچاتے ہو؟"

"میری فریدہ! مجھے معاف کر دو۔ میں تمہیں سمجھ نہ سکا۔ اپنی محرومی کے باعث زندگی میں اِتنا بڑا دھوکا کھایا کہ ہر قدم پر مجھے

... کو محسوس ہوتا تھا کہ ... دھوکا دے ...
مجبور ہو گیا تھا کہ محبت سراب ہے، دھوکا ...
میں ریاکاری و خود غرضی مضمر ہے!"

ہم سے پُوچھو کہ زندگی کیا ہے
ہم نے ہنس ہنس کے غم اُٹھائے ہیں
ایک لفظِ خلوص کی خاطر
زندگی بھر فریب کھائے ہیں!

اِسی لئے میں تمھارے پیار، تمھارے خلوص کی قدر نہ کر سکا۔ مجھے معاف کر دو۔ آئندہ سے موت کی خواہش کبھی نہ کرنا۔ سمجھیں!"

فریدہ کی آنکھوں کے چراغ جھلملا اُٹھے۔ ہونٹوں پر فاتحانہ مُسکراہٹ رینگنے لگی۔ عامر نے سُرخ ڈبیہ میں سے انگوٹھی نکال کر

فریدہ کی ... مسرت کا نو... ... فاتحِ عالم، ذہن ... ٹک کر ... سماں پیدا کر رہے تھے۔ وہ بہت خوش تھی جیسے صحرا میں بھٹکتے بھٹکتے کسی نخلستان میں پہنچ گئی ہو! جیسے اچانک اُس کے خزاں زدہ چمن میں چُپکے سے بہار چلی آئی ہو! اور عامر سوچ رہا تھا کتنا فرق ہے ثریا اور فریدہ میں! فرطِ انبساط سے اُس کا رُواں رُواں جھوم رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے ... ہی پھول بکھر گئے!!

مدیر بیسویں صدی کے نام خط لکھتے وقت اختصار سے کام ... آپ ... کی تعمیل فوراً ہو سکے۔ طویل خطوط ... ...

سنگھار کمرے میں

پروفیسر کرشنا کمار ایم۔ اے کے بہترین دلچسپ جذبات آفریں افسانوں کے اِس مجموعہ کے ہر صفحے پر مستیوں کا ایک طوفان اور جذبات کا ایک محشر انگڑائیاں لے رہا ہے۔ اِس میں آرزو کے پُرکیف گیت بھی ہیں، آہوں کا دُھواں بھی اور چھلکتے ہوئے آنسوؤں کی نمی بھی۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

ایک عورت ہزار دیوانے

جناب کرشن چندر کا غیر فانی شاہکار ناول جس میں جادو نگار و سحر طراز فنکار نے فن کی ساری بلندیوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ یہ بے مثل ناول شاخِ گُل کی سی نازک اور پتھر سی سخت ایک حسین خانہ بدوش لڑکی کی ایسی حسین کہانی ہے جس میں پھول بھی ہیں اور انگارے بھی، شعلے بھی ہیں اور شبنم بھی۔ قیمت صرف تین روپے پچاس پیسے۔ محصول ڈاک علاوہ۔

بیسویں صدی کی کشیدہ کاری

وہ کتاب جو یورپ کی بہترین کتب کے مقابلہ میں پیش کی جا سکتی ہے۔ اِس مفید کتاب میں کشیدہ کاری کے وہ تمام نمونے پیش کئے گئے ہیں جو ہندوستان اور ولایت میں رائج ہیں اور جنھیں ہندوستانی اور یورپین عورتیں بہت پسند کرتی ہیں۔ اونچے گھرانے کی معزز خواتین اور چوٹی کے زنانہ رسائل کی رائے ہے کہ کشیدہ کاری پر اِس سے بہتر کتاب آج تک مارکیٹ میں پیش نہیں کی گئی۔ اُردو ہندی مشترکہ زبانوں میں شائع کی گئی ہے۔ تحفے میں دینے کے لئے بہترین چیز ہے۔ معزز گھرانے کی خواتین یہ مفید کتاب اپنی پیاری لڑکیوں کو جہیز میں دیتی ہیں۔ قیمت فی جلد صرف چار روپے۔

پریم شاستر H کام شاستر H ...

اِن کتابوں میں ایسے ایسے راز اور بھید بیان ... جوڑوں کے لئے بہت ضروری ہے ... تجربہ کار خاوندوں کو بھی معلوم نہیں اور جنھیں جاننے کے بعد ... کی اصل مسرتیں حاصل ہوں گی۔ گھر کو بہشت بنانے کی تدابیر تفصیل ... لکھ دی گئی ہیں۔ خاوند اور بیوی کے لئے اِن کتب کا مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے جتنی ایک انسان کے لئے ہوا اور غذا ضروری ہے۔

اِن کتب کی خوبیوں کا اندازہ آپ اِس بات سے لگا سکتے ہیں کہ ہندوستان جیسے غریب مُلک میں اِن کتب کی چھ لاکھ سے زائد جلدیں فروخت ہو چکی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ کوئی چیز کسی خاص خوبی کے بغیر اتنی بھاری تعداد میں فروخت نہیں ہو سکتی۔

پریم شاستر باتصویر ——— قیمت اُردو تین روپے ہندی تین روپے
کام شاستر باتصویر ——— قیمت اُردو تین روپے ہندی تین روپے
گرہستھ شاستر باتصویر ——— قیمت اُردو تین روپے ہندی تین روپے

رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۶

غزل

کاشف الہاشمی اوجینی

سرگذشتِ دلِ بیتاب تو سنتے جاؤ
جاتے جاتے مرا اک خواب تو سنتے جاؤ

جس میں افسانے کی رگ رگ سے ٹپکتا ہے لہو
میرے افسانے کا وہ باب تو سنتے جاؤ

[illegible] ان کی بت [illegible]
[illegible] وہ خواب تو سنتے جاؤ

جانے پھر ہو کہ نہ ہو میرے لبوں کو جنبش
[illegible] تو سنتے [illegible]

[illegible] شمعوں کی [illegible]
حادثۂ شبِ مہتاب تو سنتے جاؤ

زاہدو، جاؤ سوئے میکدہ جاؤ لیکن!
مجھ سے میخانے کے آداب تو سنتے جاؤ

تم نہ کرنا سرِ مجرگئے ہوئے حالات کا غم
میری بربادی کے اسباب تو سنتے جاؤ

میرا افسانہ دلآویز بھی دلدوز بھی ہے
اس کو سُن کے اگر تاب، تو سنتے جاؤ

کچھ سہرو سا نہیں حالات کا شہرہ کاشف
حالِ بے مہریِ احباب تو سنتے جاؤ

رشی پٹیالوی

جلوے کے لئے پردا بھی پردا نہیں ہوتا
پردے میں جو چھپ جائے وہ جلوا نہیں ہوتا

وہ درد جو بن جائے ہر اک درد کا درماں
ہر شخص کے سینے میں تو پیدا نہیں ہوتا

آزارِ محبت ہے کہ اعجازِ محبت
اچھا وہی ہوتا ہے جو اچھا نہیں ہوتا

رہزن سے نظر اُن کی ملا دے مقدر
لٹنے ہی کا سامان مہیا نہیں ہوتا

[illegible] جائیں گے بیگانہ روی سے
[illegible] ہوا اکٹھا نہیں ہوتا

مل کر بھی وہ ملنا ہے نہ ملنے کے برابر
آپس میں اگر درد کا رشتا نہیں ہوتا

ہر ڈوبنے والے نے کہا، ڈوبنے والا
دریائے محبت کا کنارا نہیں ہوتا

لفظوں میں جو ڈھل جائے وہ فریاد نہیں ہے
لب سے جو گزر جائے وہ نالا نہیں ہوتا

دیکھیں تو سہی ڈوب کے کالب کی نگاہیں
فطرت کے وہ کس نقش سے اُبھرا نہیں ہوتا

وہ پاس نہ ہو کر بھی ہم آغوشِ نظر ہیں
تنہا بھی رشی دل کبھی تنہا نہیں ہوتا

یہی خوف رہتا تھا کہ کوئی مجھے دھوکا نہ دے۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ محبت سراب ہے، دھوکا ہے اور خلوص کے پردے میں ریاکاری و خود غرضی مضمر ہے!"

ہم سے پوچھو کہ زندگی کیا ہے
ہم نے ہنس ہنس کے غم اٹھائے ہیں
ایک لفظِ خلوص کی خاطر
زندگی بھر فریب کھائے ہیں!

اسی لئے میں تمھارے پیار، تمھارے خلوص کی قدر نہ کر سکا۔ مجھے معاف کر دو۔ آئندہ سے موت کی خواہش کبھی نہ کرنا۔ سمجھیں!"

فریدہ کی آنکھوں کے چراغ جھلملا اٹھے۔ ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ رینگنے لگی۔ عامر نے سرخ ڈبیہ میں سے انگوٹھی نکال کر فریدہ کی انگلی میں پہنا دی۔ فریدہ کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ مسرت کا نور اس کے چہرے پر پھیل گیا۔ اقبال کے الفاظ "محبت فاتحِ عالم" ذہن کی وادی میں بھٹک بھٹک کر صدائے بازگشت کا سماں پیدا کر رہے تھے۔ وہ بہت خوش تھی جیسے صحرا میں بھٹکتے بھٹکتے کسی نخلستان میں پہنچ گئی ہو! جیسے اچانک اس کے خزاں زدہ چمن میں چپکے سے بہار چلی آئی ہو! اور عامر سوچ رہا تھا کتنا فرق ہے ثریا اور فریدہ میں! فرطِ انبساط سے اس کا رواں رواں جھوم رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پھول ہی پھول بکھر گئے!!

مدیر بیسویں صدی کے نام خط لکھتے وقت اختصار سے کام لیا کریں تاکہ آپ کے ارشاد کی تعمیل فوراً ہو سکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً [illegible] نہیں جاتے۔

غزل

کاشف الہاشمی اوجینی

سرگذشتِ دلِ بیتاب تو سنتے جاؤ
جاتے جاتے مرا اک خواب تو سنتے جاؤ

جس میں الفاظ کی رگ رگ سے ٹپکتا ہے لہو
میرے افسانے کا وہ باب تو سنتے جاؤ

نہ میں پوچھوں گا نہ تم ان کی بتانا تعبیر
میں نے جو دیکھے ہیں وہ خواب تو سنتے جاؤ

جانے پھر ہو کہ نہ ہو میرے لبوں کو جنبش
میری اک خواہشِ بیتاب تو سنتے جاؤ

نہ سناؤں گا میں تاریک شبوں کی روداد
حادثاتِ شبِ مہتاب تو سنتے جاؤ

زاہدو، جاؤ سوئے میکدہ جاؤ لیکن!
مجھ سے میخانے کے آداب تو سنتے جاؤ

تم نہ کرنا مرے بگڑے ہوئے حالات کا غم
میری بربادی کے اسباب تو سنتے جاؤ

میرا افسانہ دلآویز بھی دلدوز بھی ہے
اس کو سننے کی اگر تاب، تو سنتے جاؤ

کچھ سمجھ رسا نہیں حالات کا شہرو کاشف
حالِ بے مہریٔ احباب تو سنتے جاؤ

غزل

رشی پٹیالوی

جلوے کے لئے پردا بھی پردا نہیں ہوتا
پردے میں جو چھپ جائے وہ جلوا نہیں ہوتا

وہ درد جو بن جائے ہر اک درد کا درماں
ہر شخص کے سینے میں تو پیدا نہیں ہوتا

آزارِ محبت ہے کہ اعجازِ محبت
اچھا وہی ہوتا ہے جو اچھا نہیں ہوتا

رہزن ہے نظر اُن کی مگر وائے مقدر
لٹنے ہی کا سامان مہیا نہیں ہوتا

کب دل پہ بنا جائیں گے بیگانہ روی سے
اپنوں کے کبھی چہرے پہ تو لکھا نہیں ہوتا

مل کر بھی وہ ملنا ہے نہ ملنے کے برابر
آپس میں اگر درد کا رشتا نہیں ہوتا

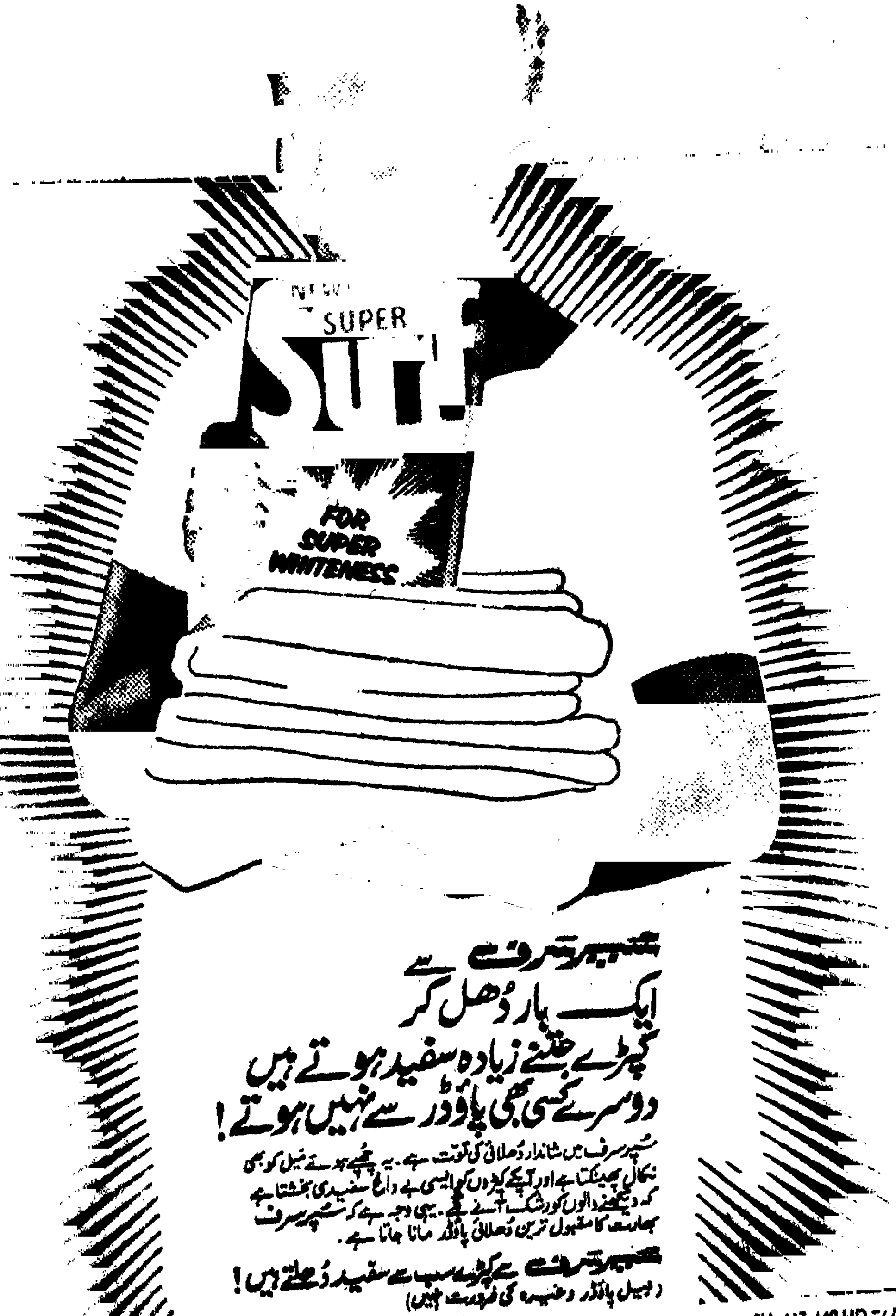
ہر ڈوبنے والے نے کہا، ڈوبنے والو!
دریائے محبت کا کنارا نہیں ہوتا

لفظوں میں جو ڈھل جائے وہ فریاد نہیں ہے
لب سے جو گزر جائے وہ نالا نہیں ہوتا

دیکھیں تو سہی ڈوب کے کالب کی نگاہیں
فطرت کے وہ کس نقش سے اُبھرا نہیں ہوتا

وہ پاس نہ ہو کر بھی ہم آغوشِ نظر ہیں
تنہا بھی رشی دل کبھی تنہا نہیں ہوتا

بیسویں صدی دہلی اپریل ۱۹۷۳ء


NEW SUPER
Surf
FOR SUPER WHITENESS
سپر سرف سے
ایک بار دُھل کر
کپڑے جتنے زیادہ سفید ہوتے ہیں
دوسرے کسی بھی پاؤڈر سے نہیں ہوتے!
سپر سرف میں شاندار دُھلائی کی قوت ہے۔ یہ چھپے ہوئے میل کو بھی نکال پھینکتا ہے اور آپکے کپڑوں کو ایسی بے داغ سفیدی بخشتا ہے کہ دیکھنے والوں کو رشک آنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ سپر سرف بھارت کا مقبول ترین دُھلائی پاؤڈر مانا جاتا ہے۔
سپر سرف سے کپڑے سب سے سفید دُھلتے ہیں!
(نیل پاؤڈر وغیرہ کی ضرورت نہیں)
لنٹاس - SU. 117.140 UD

پیار کی رُوح

ابواللیث جاوید بی کام

چکندی آفس پوسٹ آفس بیدلپور ضلع مظفرپور (بہار)

قبلہ! سلام و نیاز!!

پیہم مصروفیتوں کے بے ہنگم سے لمحات سے "پیار کی روح" چُرا کر آپ کے حضور حاضر ہو رہا ہوں۔ اُمید ہے میری اس چوری کو آپ ہمیشہ کی طرح اِس بار بھی شرفِ قبولیت بخشیں گے۔ اپریل ۷۲ء کے شمارہ میں شائع ہونے والا میرا افسانہ "رشتے کا الزام" بہت پسند کیا گیا ہے۔ میں اُن سارے کرم فرماؤں کا "بیسویں صدی" کے توسط سے شکر گذار ہوں جنہوں نے مجھے بہت ہی پیارے پیارے خطوط لکھے ہیں۔ یہ ساری کامیابیاں در اصل "بیسویں صدی" ہی کی ہیں! ——— میرے چھوٹے بھائی انیس رُہتاسی کچھ دنوں پہلے بمبئی سے گھر آئے ہوئے تھے۔ آپ کے بمبئی کے قیام کے دوران وہ گائتری کالونی چیمبور کے سفر میں آپ کے ساتھ تھے اور اُن سے میرے متعلق آپ کی پُر خلوص اور مشفقانہ باتیں ہوئیں۔ میں اِس کے لئے آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ آپ جتنی محبت اور شفقت اپنے سارے لکھنے والوں کے لئے اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ شاید اُس کا اظہار الفاظ و بیان کے دائرے سے بالاتر ہے۔ میں نے بھی اپنے حالیہ بمبئی کے سفر کے دوران آپ کی شخصیت کی چھاپ محترم کرشن چندر، مہندر ناتھ، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ کے یہاں دیکھی۔ اُن کے دلوں میں بھی آپ کی کتنی قدر و منزلت ہے، اِس کا احساس مجھے اُس وقت ہوا کرتا تھا جس وقت آپ کا ذکر آتے ہی خلوص اور پیار کی ایک پیاری سی مسکراہٹ اُن کے چہروں پر کھِل اُٹھتی تھی۔ آپ اِس دور میں اپنی مثال آپ ہیں!.... پُر خلوص خواہشات کے ساتھ ———

آپ ہی کا ——— ابواللیث جاوید

★

جیسے سیل تیزی سے بھاگا جارہا تھا!

اور میرا ذہن حالات کی پیچیدگیوں میں اُلجھا ہوا مشکلوں کا حل ڈھونڈنے میں منہمک تھا۔ آسام کے جنگلی علاقوں میں پورے ایک سال تک جیولاجیکل سروے میں سر مارنے اور دیدہ ریزی کرنے کے باوجود مجھے پھر مدھیہ پردیش کے ایک غیر آباد علاقہ میں جانے کا حکم صادر کر دیا گیا تھا۔ آسام کے دور دراز علاقوں میں جن صبر آزما گھڑیوں میں میرے دن رات کٹے تھے اُس کا تصور بھی اب میرے لئے بے حد اذیت ناک تھا۔ اُس حکم کے بعد ذہنی سکون اور جسمانی آرام حاصل کرنے کی خواہش ایک دیوانے کا خواب بن کر رہ گئی تھی۔ سروے گروپ کے تقریباً سبھی افراد بالکل بوجھل سے دل و دماغ کے ساتھ کلکتہ صدر دفتر واپس ہوئے تھے۔ اِس بار گروپ میں کچھ رد و بدل کر کے مجھے گروپ کے دوسرے افراد سے پہلے ہی بلاس پور پہنچ جانے کو کہا گیا تھا اور دوسرے ہی دن میں چل پڑا۔

فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں میرے علاوہ دو اور مسافر تھے۔

ایک ہندوستان سٹیل پروجیکٹ کے انجینئر مسٹر گوند راجن اور دوسرے ناگپور کے بہت بڑے تاجر مسٹر وی۔ سی۔ دارُوکہ۔ میرے ڈبّہ میں داخل ہونے کے چند ہی ثانئے بعد اُن دونوں کی سوالیہ نگاہوں نے مجھے اُن سے متعارف ہونے کو اُکسایا اور پھر ہم تینوں اِس طرح گھُل مِل گئے جیسے مدّتوں کے پُرانے ساتھی ہوں۔

نومبر کی ہلکی پھُلکی سنہری دھوپ ہر طرف پھیل چکی تھی، پھر بھی فضا بوجھل سی معلوم ہو رہی تھی۔ نہ جانے کیوں؟!

جب ٹرین کسی بڑے اسٹیشن پر رُکی تو ریفرشمنٹ روم کے بیرے ناشتہ اور چائے لئے ڈبّہ میں داخل ہوئے۔ ہم تینوں نے ایک ساتھ ناشتہ کیا اور گرم گرم چائے کی چُسکی لے ہی رہے تھے کہ ایک صاحب اندر داخل ہوئے ––– "یہ تو اجیت ہے ––– ! میرا اجیت –––!!" میرے دل نے کہا۔

"ارے یار اجیت؟! تم کہاں سے نکل پڑے –––!!؟"

میں اجیت سے لپٹ گیا۔ اجیت بھی فرطِ انبساط سے کھِل پڑا تھا۔ مجھے سینے سے لگائے دیر تک کھڑا رہا۔ جب میں اُس سے جُدا ہوا تو وہ میری برتھ پر بیٹھ گیا اور بولا ––– "عظیم! تم اتنی مدّتوں تک کہاں غائب رہے؟ ارے یار –––! اپنے اجیت کی بھی تو کبھی خبر لی ہوتی –––!!"

"میں نے تمہیں بہت ڈھونڈا میرے دوست ––– لیکن تم نہ ملے!!"

ہم بہت دیر تک بہت ساری باتیں کرتے رہے ––– اجیت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ وہ آج بھی کالج کا وہی اوباش، بے فکر اور ہنس مکھ سا نوجوان تھا جو آج سے دس برس پہلے تھا۔ بات بات پر اُس کے قہقہوں کا فوارہ پھوٹ پڑتا تھا۔ میری ساری اُداسی، ساری تھکان اجیت سے اچانک ملاقات سے کافور ہو گئی۔ بہت لطف آ گیا تھا۔

اجیت میرا کلاس میٹ تھا۔ ہم دونوں ہوسٹل میں بھی ایک ہی روم میں رہتے تھے۔ روم کے باہر اجیت نے AZIM & AJIT کا نیم پلیٹ لگا رکھا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم کالج میں A & A کے نام سے مشہور ہو گئے۔ ہم دونوں کے مزاج میں حیرت انگیز ہم آہنگی تھی، حیرت انگیز یگانگت تھی۔ میری ساری پسندیدہ چیزیں اجیت کو بھی پسند تھیں یہاں تک کہ ہمارے لباس کے شیڈ بھی ایک جیسے ہوا کرتے تھے۔ ایک ہی فلمیں دیکھتے اور ہم دونوں کا تصور بھی ایک ہی ہوا کرتا تھا۔ [illegible] ہمارا پسندیدہ ادیب تھا۔ اُس کی کتابیں ہم ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھا کرتے تھے۔ اجیت جب بھی تعطیل میں جاتا مولا [illegible] کی بہت ساری کتابیں خرید لاتا۔

ایک بار جب اجیت اپنے ڈیڈی کے پاس گوا میں چھٹیاں گزارنے گیا تو اُس نے مجھے ٹیلیگرام دیکر بلا لیا۔ جگہ بہت ہی رومان انگیز تھی۔ سمندر کے ساحل پر دُور تک پھیلے ہوئے شہر میں بلا کی رعنائی تھی، بلا کی رنگینی تھی۔ یہاں کی شام بہت رنگ پرور ہوتی تھی۔ سمندر کے کنارے بڑے بڑے ہوٹلوں کی عمارتیں جب روشن ہوتیں تو سمندر کے صاف و شفاف پانی کی سطح پر گنگا جمنی قوسِ قزح سی بکھر جاتی اور فضا خود بخود گنگنا اُٹھتی تھی۔ جیسے جیسے رات کے سائے بڑھتے جاتے شہر کی جوانیاں سمندر کی ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر بکھر جاتیں اور جب چھوٹی چھوٹی کشتیاں اپنے دامن میں حسین و جمیل جوڑوں کو سمیٹے سمندر میں مچلتی لہروں کے سینے پر تیرنے لگتیں تو ایسا معلوم ہوتا سطحِ آب پر رنگ برنگے کنول کھِل اُٹھے ہیں اور دیکھنے والوں کے دل و دماغ میں ایک ہیجان برپا ہو جاتا۔

اجیت خلافِ معمول بہت سنجیدہ نظر آیا۔ میں نے پہلے تو اتنا خیال نہیں کیا۔ لیکن باتوں ہی باتوں میں وہ اُبل پڑا۔ وہ ایک کرسچین لڑکی سے پیار کرنے لگا تھا۔ میں نے جب اُس کے ڈیڈی سے کہہ کر دھمکی دی تو اُس نے بہت معصومیت سے کہا ––– "یار! بگڑتے کیوں ہو؟ اُس کی بڑی بہن کو تمہارے لئے بھی پسند کر رکھا ہے!"

مجھ سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی اور میں اُس کی اِس سادگی پہ دیر تک ہنستا رہا اور وہ کھڑا اُلو سا ہوتا رہا۔

چھُٹیاں ختم ہو گئیں اور ہم ہوسٹل چلے آئے۔ اجیت کھویا کھویا رہنے لگا۔ لیکن اپنے دل کی کیفیت مجھ سے کہتا رہا۔ میں نے سوچا کچھ دِنوں میں بہل جائے گا۔ یہ پیار کا روگ ہوتا ہی کچھ ایسا ہے، اچھے اچھوں کو اس نے نکما کر دیا ہے۔

دسمبر میں کالج کے فنکشنز کا دور شروع ہوا۔ پہلے تو [illegible] آرٹس سوسائٹی کی طرف سے ڈرامہ کا پروگرام تھا پھر اُردو مجلس [illegible] کا مشاعرہ اور آخر میں یوتھ فیسٹول۔ یوتھ فیسٹول [illegible] اجیت [illegible]



سپنا کو جولیٹ کے رول کے لئے چن لیا گیا تھا۔ پھر مسئلہ یہ تھا کہ اجیت کو میراجی کا بھی رول کرنا ہوگا۔ اجیت نے بیک وقت دونوں رول نبھانے کی ٹھان لی۔ مشاعرہ میں مجھے مجاز بننا پڑا۔ اب رول کے الاٹمنٹ کے بعد ہم کالج میں MAJAZ & MIRAJI (M&M) سے مشہور ہو گئے۔

ڈرامہ کے لئے ریہرسل شروع ہو گئی۔ اجیت نے بڑی لگن اور اُمنگ سے کام کیا۔ جب ڈرامہ اسٹیج ہوا تو اجیت نے فن کو بے مثال بنا دیا۔ اُس نے رومیو کے کردار میں زندگی ڈال دی تھی۔ اُس کا فن کامیابی کی اُن بلندیوں پر تھا جہاں پہنچ کر فنکار اُسی کردار میں ضم ہو جاتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ وہ اسٹیج کا ایک اداکار ہے۔ اجیت کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ نئے دور کا مشاعرہ اپنی مثال آپ تھا۔ میراجی کی آزاد نظم اور مجاز کی پُرجوش انقلابی نظموں نے سماں باندھ دیا تھا۔ اسٹیج کی دُنیا میں یہ نئے دور کا مشاعرہ واقعی ایک جدت تھی۔ مشاعرہ کے فوراً بعد ایک قوالی پیش کی گئی۔ ایم اے فائنل کی شام، کے نام۔ میں نے اور اجیت نے کافی داد پائی۔ جب یوتھ فیسٹول کی ٹیم دلی جانے لگی تو مجھے دیگا تا، اجیت کو رومیو اور کلپنا سنہا کو جولیٹ کیلئے منتخب کیا گیا۔ فوک ڈانس کے لئے چھ طلبا اور چھ طالبات پر مشتمل ایک گروپ تیار ہوا۔ جب یہ چھوٹا سا فنکاروں کا کارواں پروفیسر شرما اور پروفیسر ریاض کی رہنمائی میں روانہ ہوا تو جنوری کی سرد سرد ہوائیں شروع ہو چکی تھیں۔ سفر بہت ہی خوشگوار رہا۔

دلی یوتھ فسٹول میں ہم سب نے بہت سارے انعامات حاصل کئے۔ اجیت نے فسٹول سے واپس آتے ہی ایک بہت ہی اہم اعلان اِن لفظوں میں کیا۔

رومیو کو جولیٹ مل گئی ——! اور یہ ڈرامہ اجیت کی زندگی میں حقیقت بن گیا۔ اجیت نے کلپنا سے شادی کر لی!

جب ہمارے فائنل امتحانات ختم ہو گئے تو اجیت مجھ سے جُدا ہو گیا۔ جُدائی کی شام کافی سوگوار تھی۔ میں نے اجیت کو بہت سمجھایا مگر وہ شدتِ جذبات میں روتا رہا۔ میرے آنسو بھی تھم نہ سکے۔

ہمارے ریزلٹ نکلے تو ہم دونوں کامیاب تھے۔ اجیت نے کلکتہ یونیورسٹی میں کیمسٹری کے پوسٹ گریجویٹ میں داخلہ لیا اور میں نے بی ایچ او میں ڈپلوما لیا۔ ہم دونوں نے ماسٹر ڈگریاں ایک ہی سال حاصل کیں۔ اجیت اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ چلا گیا اور میری تقرری جیولاجیکل سروے آف انڈیا میں ہو گئی۔ اجیت کا کوئی خط میرے پاس اس درمیان نہ آیا۔

وقت بیت گیا!

اور آج پورے بیس برسوں بعد اجیت میرے ساتھ تھا؛ وہی کالج کا اوباش، بے فکر اور ہنس مکھ سا نوجوان!

یہ ساری باتیں یادوں میں بجلی کی سی سرعت سے کوند گئیں۔

مجھے ایسا محسوس ہوا یہ کل کی باتیں ہیں۔ اجیت اب بھی ویسا ہی تر و تازہ تھا، ویسا ہی شگفتہ ——!!

جب بجے میں گھر لوٹ کر جنکشن پہنچا تب اجیت نے اپنی کتابیں بند کیں اور مجھے اپنے ساتھ گھر لے چلنے کی ضد کی۔ میں لاکھ عذر بتاتا رہا مگر اُس نے میری ایک بھی نہ سُنی۔ مجبوراً مجھے یہ ٹرین چھوڑ دینا پڑی۔ اجیت نے ٹیکسی ہائر کی اور ہم دونوں روانہ ہو گئے۔ اجیت کہنے لگا ——"ڈیڈی نے ریٹائر ہو کر یہیں ایک بنگلہ بنوایا ہے۔ جب میں امریکہ سے واپس ہوا تو یہ جگہ مجھے بہت پسند آئی۔ میں نے اپنی لیباریٹری بھی یہیں بنوائی ہے۔ تم ہی اُسے نہ دیکھو گے تو میرا کام ادھورا ہی رہ جائے گا!"

ٹیکسی چلتی رہی اور شہر سے کافی دُور ایک آباد سے علاقہ میں رُکی۔ اجیت کے ساتھ میں بھی اُتر پڑا۔ سڑک کے پاس کافی چہل پہل تھی۔ دونوں طرف دوکانیں بہت سلیقے سے سجی ہوئی تھیں۔ اجیت نے بتلایا

یہ جگہ آئی آئی ٹی کی وجہ سے اتنی پرکشش ہو گئی ہے۔ آئی آئی ٹی کی عمارتیں دور ہی سے نظر آنے لگی تھیں۔ واقعی جگہ بہت ہی خوبصورت تھی۔

شام کا دھندلکا گہرا ہوتا جا رہا تھا اور فضا میں قدرے نمی سو گئی تھی۔ تھوڑی دور چل کر ہم ایک بنگلہ کے احاطہ میں پہنچ گئے۔ بے حد آراستہ کوٹھی تھی۔ سول انجینئرنگ کا بہترین شاہکار! اجیت کا بلند ذوق کوٹھی کے گرد و پیش سے عیاں تھا۔ گیٹ کے اندر ہری ہری گھاس سے گھری ہوئی حسین پھولوں کی کیاریاں بہت بھلی معلوم ہو رہی تھیں۔ بیچ میں بنے پختہ حوض میں چھوٹا سا فوارہ اُبل رہا تھا۔ مگر کوٹھی بالکل سنسان تھی۔ پورٹیکو سے ہو کر جب میں برآمدہ میں داخل ہوا تو مجھے احساس ہوا جیسے کوٹھی مدتوں سے ویران ہو۔ ہر طرف مکڑوں نے اپنے جال بُن رکھے تھے۔ فرش پر جا بجا گرد جمی ہوئی تھی۔ دیوار پر چڑھا ہوا روغن دھندلا سا ہو چلا تھا۔ میں ماحول کا بغور جائزہ لیتا رہا۔ اجیت نے پیچھے کے ایک روم کو کھول کر مجھے پکارا۔ جب میں اندر داخل ہوا تو سارا روم دھواں ہی دھواں تھا۔ بڑی بڑی میزوں پر بہت سارے اپریٹس، شیشیاں، اسٹو اور ادویات بے ترتیبی سے بکھرے پڑے تھے۔ ساری کی ساری چیزیں دھندلی نظر آ رہی تھیں۔ اجیت ہمیں سمجھاتا رہا۔ اُس نے بتایا کہ امریکہ میں اس نے می چی گن یونیورسٹی میں ایک ریسرچ کا سبجیکٹ رجسٹرڈ کرا لیا ہے اور وہ اپنی اِس نجی لیبارٹری میں کچھ تجربات کر کے پھر چند برسوں کے لئے امریکہ چلا جائے گا۔ وہ ایک ایک نکتہ مجھے باریکی سے سمجھاتا رہا۔ جب اُس نے ایک بڑے سے فلاسک میں رکھے ہوئے رنگین سے محلول کو اپنے ہاتھوں میں اُٹھایا تو ایک بہت ہی تیز سی چمک ہوئی اور زوروں کے دھماکے کے ساتھ فلاسک پاش پاش ہو گیا۔ اُس میں رکھا ہوا تمام کا تمام محلول اجیت پر بُری طرح پڑ چکا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے اجیت کا جسم موم کی طرح پگھلنے لگا اور پھر بالکل نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اور پورے کمرے میں دھواں دھواں اِس طرح پھیل گیا کہ کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ یہ سب کچھ اتنی سُرعت سے ہوا کہ میں کچھ سمجھ نہ سکا۔ میرا دماغ ماؤف ہو گیا اور میں کمرے کی چوکھٹ پر بُری طرح گر کر بے ہوش ہو گیا۔

جب میری آنکھیں کھُلیں تو میں ہسپتال میں پڑا تھا۔ ڈاکٹر میرے بیڈ کے پاس ہی تھا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے ماحول کو گھور رہا تھا۔ سارے چہرے اجنبی تھے۔ ماحول میرے لئے بالکل نیا تھا۔

ڈاکٹر نے میری نبض تھامے تھامے کہا — "ڈونٹ وری! آپ ہسپتال میں بالکل محفوظ ہیں —!"

"اجیت محفوظ ہے یا نہیں ڈاکٹر —؟ مجھے اجیت سے ملائیے پلیز —!" میں نے بیٹھے بیٹھے تقریباً اٹھتے ہوئے کہا۔ "ابھی آپ کو مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ اجیت کیلئے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔" ڈاکٹر نے مجھے بیڈ پر لٹاتے ہوئے کہا۔

دوپہر تک میری طبیعت بالکل ٹھیک ہو گئی۔ مگر اجیت سے ملاقات نہ ہوئی۔ میں نے ڈاکٹر سے بار بار پوچھا مگر وہ ہمیں تسلیاں دیتا رہا۔ میرے دل میں کھٹکا پیدا ہوتا رہا۔ تقریباً ڈھائی بجے ڈاکٹر مسکراتے ہوئے میرے قریب آ کر بیٹھ گئے اور بولے "ہیلو —! آپ کیسے ہیں؟"

"میں تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں ڈاکٹر —! مگر اجیت کہاں ہے؟ خدارا جلدی بتائیے گا —!"

"مسٹر عظیم —! شاید آپ کو علم نہیں کہ اجیت آج سے چار سال پہلے ہی اُس کوٹھی میں بنی اپنی اُس لیبارٹری میں کسی ضروری ریسرچ کرتے ہوئے ہلاک ہو گیا ہے اور آپ جیسے اُس کے کتنے دوست اُس کی بھٹکتی ہوئی روح کے فریب میں آ کر اُس کوٹھی میں بے ہوش پائے گئے ہیں۔ یہ اسپتال قریب ہے اس لئے شام کے وقت جب بھی دھماکے کی جگر خراش آواز اُس کوٹھی سے بلند ہوتی ہے ہم وہاں پہنچ جاتے ہیں اور کسی نہ کسی کو بے ہوشی کے عالم میں پاتے ہیں۔ اجیت کی موت ٹھیک شام کے وقت ہوئی تھی جس وقت اب بھی یہ دھماکہ سننے میں آتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کسی کو خبر نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو بُری خبریں سُنا رہا ہوں مگر موت نے کس کو چھوڑا ہے —؟!"

میں غم کے اتھاہ سمندر میں غوطے لگاتا رہا۔ اجیت کل تک میرے ساتھ تھا۔ میں کیسے یقین کر لیتا کہ وہ اب زندہ نہیں۔ وہ تو زندہ ہے میری طرح — آپ کی طرح —! ڈاکٹر پاگل ہو گیا ہے۔ اگر اجیت کو موت آ گئی ہوگی تو مجھ کو موت کیوں نہ آ جاتی۔ میرا دل ہرگز نہیں مانتا کہ میرا دوست، میرا بھائی، اِس دُنیا میں اب نہیں ہے۔ وہ تو امر ہے۔ ہوا کی راگنی، موسم کی جاذبیت، چاند کی چاندنی اُسی کے پیار کی محتاج ہے۔ میں ہرگز ہرگز نہیں مانوں گا کہ اجیت زندہ نہیں۔ اچھا ہے نہ پوچھ کر وہ مر گیا۔ ورنہ میں اپنا سر در و دیوار سے دیوانہ وار ٹکرا ٹکرا کر چور چور کر لوں گا!

مجھ پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ سارا ماحول مجھے ماتمی معلوم ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر کافی دیر تک مجھے بہلانے کی کوشش کرتا رہا مگر میرے دل کو نہ بہلنا تھا نہ وہ بہلا۔ شام کا اخبار میں سرسری طور پر پڑھ رہا تھا کہ ایک سرخی پر نظر جم گئی۔

"رڈرکیلا فرقہ وارانہ فسادکی زہریلی آگ کی زد میں۔ سارے شہر میں کرفیو نافذ۔ کل پنجاب میل پر شرپسندوں کا حملہ۔ مسافروں کو بلا امتیاز قوم و ملت بُری طرح لُوٹا اور قتل کیا گیا۔ فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ سے دو لاشیں برآمد....."

میرا سر چکرا گیا۔ مسٹر گوندرا جن اور دَمی سی دار وکا کے چہرے میری نظروں میں گھوم گئے۔ میری سمجھ میں آیا کہ اجیت نے کیوں مجھے ٹرین سے زبردستی اُتارا تھا۔

اجیت عظیم ہے!

اجیت کے پیار نے مجھے ہمیشہ کی زندگی دی ہے! وہ مر کر بھی امر ہے! اُس نے پیار کی روح میری محافظ تھی یا بُدھ گوتم اور کرشن کی دھرتی پر پیار کی صداقت گاندھی کے دیش میں اہنسا کا راگ اور نہرو کے ملک میں امن و شانتی کا پیغام تو گونج رہا ہے مگر ہمارے دل و دماغ باہمی نفرت کی گندگی سے میلے ہو گئے ہیں۔ اُن رہنماؤں کا سندیش میرے پاپی من کو نہیں سمجھا۔ ہم نے ایورسٹ تو فتح کر لیا ہے مگر دل میں چھپی کدورت، نفرت اور حسد کی چنگاریوں کو سرد نہیں کر پائے۔ ان چنگاریوں سے ہمارے دل و دماغ جُھلس کر سیاہ ہوتے جا رہے ہیں۔ قدرت بھی ہمارے اس چلن سے ناراض ہے۔ قحط و خشک سالی نے ہماری دھرتی کو پیاسی کر دیا ہے۔ کسانوں کے کھلیان اناج سے نہیں بھرتے۔ گاؤں کی کوئی البیلی گوری کھیتوں کی کیاریوں پر اٹھلاتی، مچلتی ہوئی دھان اور گیہوں کی بھری بالیوں سے اب نہیں کھیلتی۔ فضا میں کسانوں کے مست گیت نہیں گونجتے۔ پانی سے بھرے سیاہ بادل کھیتوں کی جوانی دیکھ کر امرت کی بوندیں نہیں برساتے۔ کسانوں کے چہرے پژمردہ اور جسم بے جان ہیں۔ آخر کیوں——؟

ہمیں نئی زندگی شروع کرنی ہوگی۔

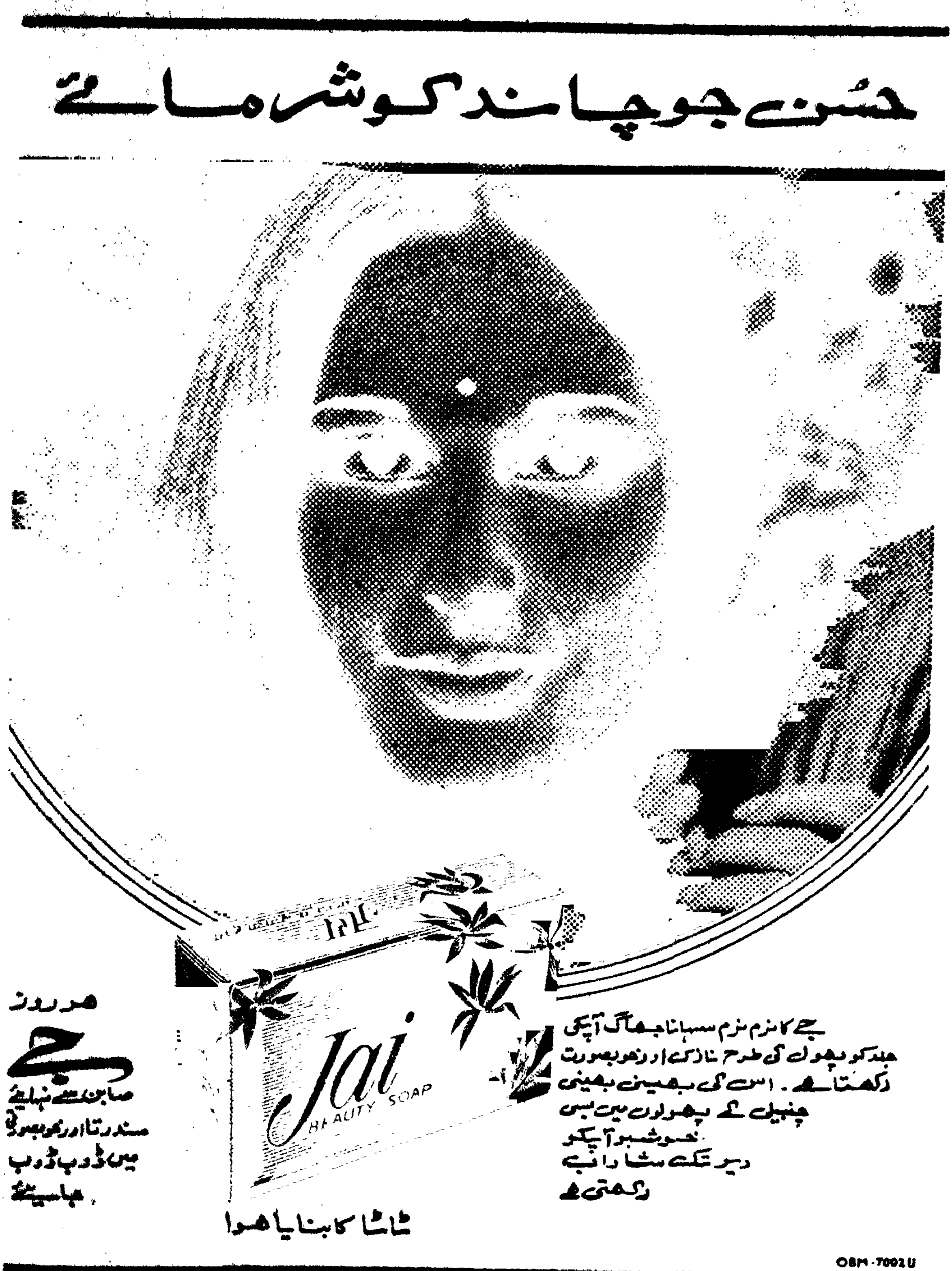
پیار و محبت کی —— ایثار و قربانی کی!

گاندھی اور نہرو کے خوابوں کا ہندوستان سجانا ہوگا جہاں امن و شانتی ہوگی، جہاں ہر عظیم کے لئے اجیت اور ہر اجیت کے لئے عظیم ہوگا اور دیش کا ہر نوجوان A.S.A کہلائے گا۔

میں بہت دیر تک سوچتا رہا۔

اجیت ایک دیوتا تھا —— پیار کا دیوتا!!

شام کی ٹرین سے میں کلکتہ واپس چلا گیا۔ اجیت جب بھی یاد آتا ہے میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے ہیں۔ مجھے ایسا احساس ہوتا ہے یہ زندگی میری نہیں، اجیت کی ہے —— اور میری سانسوں کے تار میں اجیت ہی کا راگ ہے!


حسن جو چاند کو شرمائے
Jai BEAUTY SOAP
ہر روز
جے
صابن سے نہایئے
سندرتا اور خوبصورتی
میں ڈوب ڈوب
جائیے.
جے کا نرم نرم سہانا جھاگ آپکی
جلد کو پھول کی طرح نازک اور خوبصورت
رکھتا ہے۔ اس کی بھینی بھینی
چنبیلی کے پھولوں جیسی
خوشبو آپکو
دیر تک شاداب
رکھتی ہے
ٹاٹا کا بنایا ہوا
OBM-7002 U

غزلیں

عبدالقدوس ناطقؔ

جنونِ عشق نے کیا کیا اثر دکھایا ہے
بہار دل میں ہے رقصاں، نظر میں صحرا ہے
جمالِ حسن محبت طراز کیسا ہے
یہ وہ بتائے گا جس نے کہ تم کو دیکھا ہے
نمودِ ہستیٔ ناپائدار کیا کہئے
کسی نے خواب دکھایا ہے میں نے دیکھا ہے
پرائی چیز کا کیا اعتبار اے ناصح
یہ دل وہ دل ہے جو اپنا نہیں پرایا ہے
عدو کی یاد کبھی آپ کو نہیں آتی
زباں پہ نام مگر بار بار کس کا ہے
کوئی جواب کہیں "بیسویں صدی" کا نہیں
مذاقِ خوشترِ عالی وقار کیسا ہے
لگا کے دل کو پشیماں ہو کس لئے ناطقؔ
فریب خوردۂ چشمِ کرم تو دنیا ہے

رزمیؔ عابدی شاہجہاں پوری

دیکھ کر تیرا آستانِ ناز
خود بخود جھک گئی جبینِ نیاز
رفعتِ بامِ ناز کیا کہئے
ٹوٹ جائے نہ ہمتِ پرواز
جوششِ وحشت نے کر دیا رسوا
راز کا غم نہ اب غمِ ہمراز
کچھ نہ کچھ دادِ بندگی مل جائے
اک اچٹتی نگاہ بندہ نواز!
کون سمجھا ہے کون سمجھے گا
زندگانی کے یہ نشیب و فراز
اشکِ غم آنکھ میں لبوں پہ ہنسی
زندگی کا ہے یہ بھی اک انداز
رنگ بھر دے غزل میں رزمیؔ کی
تیرے قربان چشمِ عشوہ طراز

دلؔ پہانوی

بیتے گا کس طرح دلِ ناداں ترے بغیر
مشکل ہے میرے درد کا درماں ترے بغیر
ہر پھول میرے چاکِ جگر پر تھا خندہ زن
راس آ سکی نہ سیرِ گلستاں ترے بغیر
اب ماجرائے وحشتِ قلب و جگر نہ پوچھ
گلشن بھی ہے نظر میں بیاباں ترے بغیر
یا رشکِ گل گدا تھا کبھی دامنِ مراد
یا پھر رہا ہوں اشک بداماں ترے بغیر
کل ہر نفس تھا دل کیلئے اک پیامِ زیست
اب ہر نظر ہے موت کا عنواں ترے بغیر

وقارؔ ادیب رامپوری ایم۔اے۔بی۔ٹی

شکایت میں کروں اُن کی جفا کی
بڑی توہین ہے میری وفا کی
شعورِ حسن خود بیدار ہوتا
نگاہِ شوق نے کیوں التجا کی
مٹا کر عشق میں ہستی کو میری
حیاتِ جاوداں تم نے عطا کی
خودی کو ہم نے جب بیدار پایا
ملی دولت دلِ بے مدعا کی
بجز ذلت نہ پایا کچھ بھی وقارؔ
کسی سے جب بھی ہم نے التجا کی

فلم اینڈ ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا

پونہ - ۴

داخلہ نوٹس

یکم جولائی 1973ء سے شروع ہونے والے تعلیمی برس کے لئے درج ذیل باقاعدہ کورسوں کے پہلے سال میں داخلہ کے واسطے مجوزہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں:-

1۔ فلم ڈائریکشن (3 برس)۔ کم از کم تعلیمی قابلیت: آرٹ / سائنس میں یونیورسٹی ڈگری یا اس کے برابر۔ عمر 19 سے 30 برس

2۔ سکرین پلے رائٹنگ (3 برس) کم از کم تعلیمی قابلیت آرٹ / سائنس میں یونیورسٹی ڈگری یا اس کے برابر۔ عمر 19 سے 30 برس۔

3۔ موشن پکچر فوٹوگرافی (3 برس) کم از کم تعلیمی قابلیت، فزکس اور کیمسٹری کے مضامین کے ساتھ انٹرمیڈیٹ یا فزکس اور کیمسٹری کے مضامین کے ساتھ سائنس میں تین سالہ ڈگری کورس کا پہلا برس یا اس کے برابر یا کسی یونیورسٹی یا سرکاری منظور شدہ ادارہ سے فنون لطیفہ (مصوری) میں ڈگری / ڈپلومہ کے ساتھ ایس، ایس، سی یا کسی یونیورسٹی، ریاستی سرکار کے ادارہ یا مرکزی / ریاستی سرکار کے منظور شدہ ادارہ سے فوٹوگرافی میں ڈپلومہ کورس کے ساتھ ایس ایس سی (فوٹوگرافی میں ڈپلومہ کورس دو برس کا ہونا چاہیئے)۔ عمر 17 سے 30 برس۔

4۔ ساؤنڈ ریکارڈنگ اور ساؤنڈ انجینئرنگ (3 برس) کم از کم تعلیمی قابلیت، فزکس، کیمسٹری اور ریاضی کے مضامین کے ساتھ انٹرمیڈیٹ یا فزکس، کیمسٹری اور ریاضی کے ساتھ تین سالہ ڈگری کورس کا پہلا برس یا اس کے برابر۔ عمر 17 سے 30 برس۔

5۔ فلم ایڈیٹنگ (دو برس) کم از کم تعلیمی قابلیت: انٹرمیڈیٹ یا آرٹ / سائنس میں تین سالہ ڈگری کورس کا پہلا برس یا اس کے برابر۔ عمر 17 سے 30 برس۔

6۔ فلم ایکٹنگ (دو برس) کم از کم تعلیمی قابلیت: انگریزی کے مضمون کے ساتھ میٹریکولیشن یا اس کے برابر۔ ہندی / اردو میں کام کرنے کی صلاحیت لازمی۔ خاص خاص حالتوں میں خواتین امیدواروں کے لئے قابلیت کی شرائط نرم کی جا سکتی ہیں۔ عمر لڑکیوں کے لئے 16 سے 25 برس اور لڑکوں کے لئے 18 سے 26 برس۔

نوٹ:- عمر یکم جولائی 1973ء تک شمار ہوگی۔

مختلف کورسوں میں داخلہ، ایک داخلہ امتحان کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ ایک امیدوار جس نے یونیورسٹی / بورڈ کا امتحان دے رکھا ہو یا اپریل، مئی یا جون 1973 میں دینا ہو اور جس کا نتیجہ درخواست بھیجنے کے وقت دستیاب نہ ہو، وہ انسٹی ٹیوٹ کے داخلہ امتحان میں بیٹھنے کا مستحق ہوگا۔ درخواست کے ہمراہ پرنسپل / ہیڈ ماسٹر کا اس مطلب کا سرٹیفکیٹ ہونا چاہیئے۔ داخلہ کے امتحان میں پاس ہو جانے پر امیدوار کو عارضی داخلہ دے دیا جائے گا لیکن اسے 31 جولائی 1973ء تک مطلوبہ امتحان میں پاس ہونے کا دستاویزی ثبوت مہیا کرنا ہوگا۔ ایسا نہ ہونے کی صورت میں عارضی داخلہ خود بخود منسوخ ہو جائے گا اور ادا شدہ فیس واپس نہیں کی جائے گی۔

فلم ڈائریکشن، سکرین پلے رائٹنگ، موشن پکچر فوٹوگرافی، ساؤنڈ ریکارڈنگ و ساؤنڈ انجینئرنگ اور فلم ایڈیٹنگ میں کورسوں کیلئے امتحان، تحریری امتحان اور انٹرویو پر مشتمل ہوگا۔ تحریری امتحان الہ آباد، بمبئی، کلکتہ، دہلی، مدراس اور رانچی میں اتوار 13 مئی 1973ء کو ہوگا۔ تحریری امتحان میں مطلوبہ نمبر حاصل کرنے والے تمام امیدواروں کو انٹرویو دینا ہوگا جو سوموار 26 جون 1973ء سے انسٹی ٹیوٹ میں شروع ہوگا۔

فلم ایکٹنگ میں کورس کے لئے داخلہ امتحان آڈیشن / سکرین ٹیسٹ پر مشتمل ہوگا۔ یہ ٹیسٹ بمبئی، کلکتہ، دہلی اور مدراس میں مئی 1973ء میں ہوگا۔ منتخبہ امیدواروں کو صحیح تاریخوں کے بارے میں مناسب وقت پر مطلع کر دیا جائے گا۔

جو امیدوار متعلقہ کورسوں کے لئے خصوصی صلاحیت کے مالک ہوں گے اور اس مطلب کے لئے تسلی بخش ثبوت مہیا کر سکیں گے ان کے معاملہ پر خاص طور پہ غور کیا جائیگا۔

مرکزی حکومت اور آندھرا پردیش، آسام، بہار، گجرات، کیرل، مہاراشٹر، میسور، مدھیہ پردیش، ہریانہ، اڑیسہ، پنجاب، اتر پردیش اور مغربی بنگال کی سرکاروں نیز تامل ناڈو سنگیت ناٹک سنگم اور پانڈیچری و گوا، دمن، دیو کے مرکزی علاقوں کی طرف سے مستحق امیدواروں کو متعدد وظائف دیئے جاتے ہیں۔ فلم ایکٹنگ کورس کے لئے زائد وظائف ہیں یعنی 250 روپے ماہانہ کا ہندوستان لیور سکالرشپ۔ ایک لڑکی کے لئے اور 150 روپے ماہانہ کا گوروت میموریل سکالرشپ کسی ایک مستحق طالب علم کے لئے۔ میسرز اور دو (پی) لیمیٹڈ نے موشن پکچرز فوٹوگرافی کورس میں بہترین طلبا کے لئے 100 روپے ماہانہ کے وظیفے شروع کئے ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے لڑکے و لڑکیوں کے لئے الگ الگ ہوسٹلوں کا انتظام ہے۔

پراسپیکٹس، جس میں درخواست فارم کورس، داخلہ امتحان، وظائف وغیرہ کی تفاصیل شامل ہوں گی، تحریری درخواست پر انسٹی ٹیوٹ سے حاصل کئے جا سکتے ہیں درخواست کے ہمراہ ایک روپیہ کا کراس پوسٹل آرڈر بنام ایڈمنسٹریٹو آفیسر فلم اینڈ ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا، پونہ اور اپنا پتہ لکھا ایک لفافہ (25 سینٹی میٹر × سینٹی میٹر) جس پر 60 پیسے کے ڈاک ٹکٹ اور 5 پیسے کا فوجی امداد کا ٹکٹ لگا ہوا بھیجا جانا چاہیئے۔ نقد روپیہ، منی آرڈر یا چیک قبول نہیں کیا جائے گا۔ پراسپیکٹس کی بہم رسانی کے لئے درخواستیں 20 مارچ 1973ء تک وصول کی جائیں گی۔ پراسپیکٹس بھیجنے کیلئے جو درخواستیں مذکورہ بالا ہدایت کے مطابق نہیں ہونگی، انہیں نامنظور کر دیا جائے گا اور انسٹی ٹیوٹ اس بارے میں کسی انکوائری کا جواب نہیں دے گی۔

داخلہ کے لئے ہر لحاظ سے مکمل درخواستیں جن کے ہمراہ متعلقہ دستاویزات اور پانچ روپے کا کراس پوسٹل آرڈر ہونا چاہیئے۔ یکم اپریل 1973ء تک انسٹی ٹیوٹ میں پہنچ جانی چاہئیں۔ نامکمل اور یکم اپریل 1973ء کے بعد موصول ہونے والی درخواستوں کو مسترد کر دیا جائے گا اور اس بارے میں خط و کتابت کا جواب نہیں دیا جائے گا۔

نوٹ:- نئے امیدواروں کے لئے ایسے ٹیلی ویژن کورس فی الحال دستیاب نہیں ہیں۔ ضروری انتظامات مکمل ہونے پر ان کے بارے میں اعلان کر دیا جائے گا۔ اس وقت تک کسی پوچھ تاچھ کا جواب نہیں دیا جائے گا۔

davp 72/483

نریش کمار شاؔد، حالؔی اور میرؔ کے ساتھ

فضل جاوید ایم۔ اے

۱۰۰۰۔ این ۲، کستوربا ہاسپٹل، ڈاکخانہ حبیب گنج، بھوپال نمبر ۳ (ایم۔ پی)

بزرگوارم جناب خوشتر گرامی صاحب! آداب

نریش کمار شاد کو ہم سب بھولتے جارہے ہیں۔ اس لئے "نریش کمار شاؔد، حالؔی اور میرؔ کے ساتھ" لے کر "بیسویں صدی" کی بزم میں شریک ہورہا ہوں۔ اُمید ہے مضمون پسند آئے گا—— میں نے ایم۔ اے میں اُردو میں پیروڈی کے موضوع پر مقالہ لکھا تھا جو ہندو پاک کے مقتدر رسائل میں شائع ہوچکا ہے۔ حیدرآباد کے مزاحیہ رسالے "شگوفہ" کے لئے پابندی سے لکھتا ہوں۔ علی گڑھ کے "ہیپی پنچ" کے لئے بھی لکھ رہا ہوں۔ بھوپال ریڈیو سے میرے مزاحیہ مضامین نشر ہوتے ہیں—— پسند آجائے تو زیرِ نظر مضمون کو کسی قریبی اشاعت میں جگہ دیں۔ آپ کی گرانقدر رائے کا مُنتظر رہوں گا—— خُدا کرے آپ بعافیت ہوں۔

نیاز مند—— فضل جاوید

★

نریش کمار شاؔد نے جب مشہور ادیبوں اور شاعروں سے اِنٹرویو لینا شروع کیا تو بہت سوں نے اُن کے حق میں بد دُعائیں کیں اور کہا کہ کمبخت مرکیوں نہیں جاتا! ہمیں سرِ بازار رُسوا کرنے پر تُلا ہُوا ہے۔ لیکن شاد مُسکرا کر کہتے رہے کہ جتنی بد دُعائیں ہیں وہ صرف شاد کو دو۔ لیکن اِن بد دُعاؤں کے اثر کرنے تک شاؔد نے بہت سے ادیبوں اور شاعروں سے اِنٹرویو لے لئے۔ پتہ نہیں وہ کون خوش قسمت ادیب یا شاعر تھا جس کا اِنٹرویو شاؔد نے لیا اور جس کے دل سے نکلی ہوئی بد دُعا بارگاہِ ربّ العزت میں قبولیت کا شرف حاصل کرسکی۔ اِس طرح بہت سے ادیب و شاعر اپنے آپ کو رُسوائی سے بچانے میں کامیاب ہوئے اور خود شاؔد جو اِس دُنیائے فانی میں ہمیشہ نا شاد رہے اپنے آپ کو عالمِ برزخ میں دیکھ کر خوشی سے ناچنے لگے۔ یہاں چین ہی چین تھا۔ دُختِ رز بہ افراط موجود۔ آنکھوں کی ٹھنڈک، دل کا سرور سب مہیّا۔ غمِ روزگار کا احساس تک نہیں۔

یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ جب انسان کو سکون ہی سکون میسّر ہو تو وہ ہنگاموں کا متلاشی ہوتا ہے۔ عالمِ برزخ میں شاد کا یہی حال ہُوا۔ یکسانیت سے طبیعت اُکتائی، کچھ لکھنے کو طبیعت چاہی۔ سامنے حُوروں کو دیکھ کر شاعری میں محو ہوئے۔ لیکن جب اپنا لکھا آپ پڑھا تو اُنھیں احساس ہُوا کہ شاعری حُوروں سے وجود میں نہیں آتی۔ کتنے پھیکے پھیکے اور پژمُردہ شعر ہوئے! لوح و قلم ایک طرف پھینک کر افسردہ نظروں سے حُوروں کو تکنے لگے۔ ہر حُور مجسّم نُور تھی، حسین و دلکش، تقدّس کا نمونہ۔ لیکن وہ دل لُبھانے والی ادائیں تھیں اور نہ وہ جھیل سی آنکھیں جن میں ڈوب ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے۔ جن کی ایک ادائے دلبری کتنی ہی نظموں کی تخلیق بن کر فیاض مُدیروں کی وساطت سے اُن کی شکم پری کرتی تھیں۔ اُن حُوروں میں حُسن و جمال تو تھا۔ لیکن وہ بات نہ تھی جس سے دوئی مِٹ جاتی ہے، فاصلے کم ہوجاتے ہیں۔ شاد کو اُن حُوروں سے

چند روحیں سی ہوگئیں اور وہ سوچنے لگے کاش اب حوریں کسی طرح یہاں پہنچ جائیں۔ ان کے نور، تقدس اور حُسن و جمال کو مناسب طریقوں سے تراش کر انھیں کہاں سے کہاں پہنچایا جا سکتا ہے۔ پھر اچانک اُن کی رگِ شرارت پھڑکی۔ اپنے آپ سے کہا چلو میاں شاد! آج مرحومین سے انٹرویو لیا جائے۔ کچھ دُور پر ایک شخص کو دیکھ کر اُن کی آنکھیں چمکیں۔ غور کرنے لگے [illegible] وہ شخص [illegible] تھا۔ شاد نے قریب پہنچ کر کہا۔

شاد:۔ "معاف کیجئے آپ کے شغل میں مخل ہوا۔ آپ کی تعریف جاننے کی جسارت کر سکتا ہوں؟"

وہ شخص:۔ "کیوں نہیں برخوردار! میں الطاف حسین حالی ہوں اور اب تم اپنا تعارف کرا دو۔"

شاد:۔ "آپ سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ مجھے نریش کمار شاد کے نام سے ادبی دُنیا جانتی ہے۔"

حالی:۔ "اس دُنیا میں ابھی تو وارد معلوم ہوتے ہو۔"

شاد:۔ "جی بجا فرمایا۔"

حالی:۔ "آنے کا مُدعا کہو؟"

شاد:۔ "یہاں کے ماحول سے اکتا گیا ہوں۔ سوچا جی بہلانے کو آپ سے کیوں نہ انٹرویو لوں۔"

حالی:۔ "پُوچھو کیا پُوچھنا چاہتے ہو؟"

شاد:۔ "دُنیا والوں نے آپ کو اچھی طرح نہیں پہچانا۔ آپ کی صحیح قدر نہیں کی۔ بچے بڑے بوڑھے سب آپ کو مسدّس اور مدّ و جزرِ اسلام کی وجہ سے جانتے ہیں لیکن میرے خیال میں آپ کا نام غزل کے ساتھ آنا چاہئے تھا۔ یہ آپ کے ساتھ نا انصافی ہوئی کہ ناقدوں نے آپ کی غزل کو زیادہ نہیں سراہا۔"

حالی:۔ "میاں ناقدوں کو چھوڑو۔ میں خود ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پایا کہ میں کیا تھا اور کیا ہوں۔"

شاد:۔ "معاف کیجئے۔ آپ کے خیالات میں کچھ انحطاط سا محسوس کر رہا ہوں۔ اچھا یہی بتائیے کہ آپ کو غالب کی شاگردی کا شرف حاصل رہا۔ لیکن اصلاحِ سخن ہمیشہ شیفتہ ہی سے

کیوں لیتے رہے؟ آپ نے ایک جگہ خود اس بات کا اعتراف کیا ہے ؎

حالیؔ سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں
شاگردِ میرزا کا مقلد ہوں میر کا"

حالیؔ:- "میاں کیوں اُن دنوں کی یاد دلاتے ہو ـــــ راست گوئی میں ہے رُسوائی بہت!"

شادؔ:- "پھر بھی کچھ تو فرمایئے؟"

حالیؔ:- "لیکن یہ سب باتیں اپنے ہی تک رکھنا۔"

شادؔ:- "آپ مجھ پر اعتماد کرسکتے ہیں۔"

حالیؔ:- "غالبؔ کافی ضعیف ہوچکے تھے۔ بینائی معدوم ہوچکی تھی۔ ہمیشہ لیٹے رہتے تھے۔ میں انھیں اپنا تازہ کلام سُنایا کرتا تھا۔ وہ تعریف کرتے جاتے اور فوراً ہی ان اشعار کو فارسی میں موزوں کرنے لگتے اور ہر آنے جانے والے کو اس طرح سُناتے کہ جیسے وہ اشعار انھیں کے ہوں۔ اس طرح میرے بہت سے اردو کے شعر اُن کی فارسی دانی کی نذر ہوکر انہی کے نام سے موسوم ہوگئے۔ حد تو یہ کہ میرے سامنے ہی وہ دوسروں کو شعر سُناتے اور خود مجھ سے پوچھتے: کہو میاں حالیؔ! کیسا مضمون باندھا ہے؟' تب سے غالبؔ کو اپنا اُستاد مان لیا ہے۔"

شادؔ:- "بہت خوب! گویا غالبؔ اس فن کے بھی اُستاد تھے! آپ نے پھر شیفتہ کو اصلاحِ سخن کے لئے کیوں چُنا؟"

حالیؔ:- "ایک دن مصطفٰی خاں شیفتہ بضد ہوگئے کہ اپنا کلام انھیں سُناؤں۔ تغزل میں ہم دونوں کا رنگ ایک سا تھا اس لئے ہم دونوں ایک دوسرے کی غزلیں بدل لیا کرتے تھے۔ شیفتہ دوسروں کے کلام پر اصلاح کرنا اپنا اوّلین فرض سمجھتے تھے۔ نواب تھے اس لئے ہم بے چوں وچرا اُن کی اصلاح پر واہ واہ کرنے پر مجبور تھے۔ اس فرمانبرداری کا نتیجہ یہ ہوا کہ نواب شیفتہ نے خوش ہوکر مجھے اپنے بیٹوں کا اتالیق مقرر کیا اور ایک اچھی تنخواہ مقرر کردی۔"

شادؔ:- "اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کا کلام خود آپ کا نہ ہوتا تھا



جیسا کہ آپ نے ابھی ابھی فرمایا کہ رنگِ تغزل کی یکسانیت کی وجہ سے آپ غزلیں بدل بھی لیا کرتے تھے۔"

حالیؔ:- "نہیں یہ بات نہیں۔ یہ تو ہمارا آپس کا معاملہ تھا۔ نواب شیفتہ کو خوش کرنے کے لئے میں اُن کی کوئی بات نہ ٹالتا تھا۔ لیکن اُن کی جو بھی غزل مجھے بدلے میں ملتی اُسے فوراً نذرِ آتش کردیتا تھا۔ ہاں میری بعض ایسی غزلیں ضرور میرے دیوان میں ہیں جو اُن کی اصلاح شدہ ہیں۔ جسے تبرک کے طور پر رکھ چھوڑا ہے۔"

شادؔ:- "کیا آپ اُن غزلوں کی نشاندہی کرسکتے ہیں؟"

حالیؔ:- (ناراض ہوتے ہوئے) "اب تم میرے نجی معاملات میں بہت زیادہ دخیل ہوتے جارہے ہو۔"

شادؔ:- "میں نے محسوس کیا ہے کہ اس عالم میں پہنچ کر ہماری تخلیقی اُپج رفتہ رفتہ ختم ہوجاتی ہے۔ شاید یہاں کی آب وہوا کا اثر ہو۔ ویسے یہاں کی شراب میں بھی وہ نشہ نہیں جو دُنیا کے دیسی ٹھرّے میں ہوتا ہے۔ جیسے

شوخی

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شائد کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات ——— اقبال

آنکھوں ہی میں رہتے ہو، دل سے نہیں گئے ہو
حیران ہوں، یہ شوخی آئی تمہیں کہاں سے ——— میر

اِس سے بھی شوخ تر ہیں اُس شوخ کی ادائیں
کر جائیں کام اپنا لیکن نظر نہ آئیں ——— جگر مراد آبادی

وہ شوخی محتاط کے بچتے ہوئے انداز
دنیا بھی نہ رہنے دے قیامت بھی نہ ڈھائے ——— فراق گورکھپوری

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا ——— غالب

مرسلہ: سلطان احمد ساحل ہرگانوی، جمشید پور

نوش کر کے ہم شاعر و ادیب زمانے کی ناانصافیوں کو بھولنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

حالی:۔ "ناخلف! یہ کیا شراب اور نشہ کی بات لے بیٹھا۔ چل دفع ہو جا میری نظروں کے سامنے سے!"

شاد:۔ "حضرت! آپ خواہ مخواہ خفا ہو رہے ہیں۔ میں نے کیا غلط کہا ہے۔ کیا شراب یہاں نہیں ملتی۔ کیا اُسے آپ نہیں پیتے۔"

حالی:۔ "یہ شراب عرفان کی شراب ہے۔ تیرے دیسی ٹھرّے والی نہیں۔ سمجھا؟"

نریش کمار شاد حالی کو اپنے حال پر چھوڑ کر آگے بڑھتے ہیں۔ ایک بزرگ آسمان پر نظریں گاڑے کچھ بڑبڑا رہے تھے۔ شاد اُن کے قریب پہنچ کر دھیمی آواز میں شعر پڑھتے ہیں ؎

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

وہ شخص:۔ "کون ہے تو اے نامراد شخص! کیوں میری تنہائی میں مخل ہوا؟"

شاد:۔ "آپ کو آسمان میں چاند تلاش کرتے دیکھ کر فوراً سمجھ گیا کہ آپ وہی میرؔ ہیں۔ ویسے آپ کی فلمی فوٹو بھی دیکھ چکا ہوں۔ سوچا آپ سے انٹرویو لوں۔"

میرؔ:۔ "کیا کہا؟ میرا انٹرویو اور تو لے گا؟"

شاد:۔ "خدائے سخن! زبان سنبھالئے۔ آپ حدِ ادب سے آگے بڑھ رہے ہیں۔"

میرؔ:۔ "کبھو کسو کے پاس ادب سیکھا بھی ہے تو نے؟ کسی کی تنہائی میں مخل ہونا کتنی بے ادبی ہے، اس کا علم ہے تجھے؟"

شاد:۔ "میں معافی کا خواستگار ہوں میرؔ صاحب!"

میرؔ:۔ "خیر جاؤ معاف کیا۔ پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟ ویسے اپنی تعریف تو بیان کرو۔"

شاد:۔ "مجھے نریش کمار شاد کہتے ہیں۔ ہر صنفِ سخن پر آزمائش کر چکا ہوں۔ نثر پر بھی قدرت حاصل ہے۔ ادب میرا محبوب مشغلہ ہے۔"

میرؔ:۔ "ادب کی تعریف کر سکتے ہو؟"

شاد:۔ "عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں!"

میرؔ:۔ "شعر کا مفہوم سمجھتے ہو؟"

شاد:۔ "میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ میں شاعر ہوں۔"

میرؔ:۔ "شعر گوئی اور شعر فہمی دونوں الگ الگ صفات ہیں۔ ایک اچھا شاعر اپنے خیالات کو اپنے ایک خاص انداز سے پیش کرتا ہے۔ اُن خیالات کو سمجھنے کے لئے شاعر ہونا ضروری نہیں۔ شعر کے مفہوم تک پہنچنا ایک آرٹ ہے۔ تو کہو، شعر کے معنی و مفہوم سمجھتے ہو؟"

شاد:۔ "شاعری اور شعر فہمی اِن دونوں صلاحیتوں کو خدا نے ایک ہی ذہن میں مدغم کر کے اُس کا نام نریش کمار شاد رکھا ہے۔"

میرؔ:۔ "تو بتاؤ اس شعر کا مطلب کیا ہے؟"

شاد:۔ "ارشاد!"

میرؔ:۔ "تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا"

شاد: "آپ اپنے محبوب سے فرماتے ہیں کہ جب بھی ..."

میر: "بیٹے دو میاں! تم بھی وہی کہنے والے ہو جو آج تک دوسرے کہتے آئے ہیں۔ شاعر کے دل کی بات صرف وہی جان سکتا ہے۔ مجھ سے سنو اس کا مطلب۔ عہد جوانی کا ایک رنگین زمانہ تھا۔ آس پاس حسینوں کا ایک جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ میں جس کمرے میں رہتا تھا اُس کے عین نیچے ایک بڑا تہہ خانہ تھا جس کا علم کسی کو نہ تھا۔ میں خوبصورت مہ جبینوں کے ساتھ تہہ خانوں میں گھنٹوں پڑا رہتا تھا۔ اُسی زمانے میں ایک حسینہ کو دل دے بیٹھا۔ میں ہمیشہ اُسے تنہا ہی ملتا۔ بارہا ایسا ہوا کہ خوش گپیوں کے بعد سب قتالانِ دل وجاں رخصت ہوتے اور وہ آدھمکتی۔ میری رنگین مزاجی کا علم اُسے نہ تھا۔ خیر سے وہ شاعرہ بھی تھی۔ ادبی ذوق نکھرا ہوا تھا۔ ایک دن وہ بہت ترنگ میں تھی۔ ہونٹوں سے بار بار ایک مصرع ادا ہوتا تھا ؎

جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

آخر جب مصرع اولیٰ سمجھ میں نہ آیا تو مجھے گرہ لگانے کو کہا۔ میں نے حسبِ حال یہ مصرع لگا دیا ؎

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا

اِس مصرع سے وہ اِتنا خوش ہوئی کہ اپنا وہ مصرع میرے پیوند کے ساتھ مجھے ہی سونپ دیا۔"

شاد: "کتنی عجیب بات ہے! آج تک محققوں اور ناقدوں کی نظر اِس حقیقت تک نہ پہنچ سکی۔"

میر: "اچھا کچھ اور پوچھو!"

شاد: "آپ شعر کس طرح کہتے ہیں۔ میرا مطلب ہے شعر کہتے وقت کس طرح کی کیفیت اپنے پر طاری رکھتے ہیں؟"

میر: "یہ بہت نامعقول سوال ہے۔ کوئی دوسرا سوال پوچھو۔"

شاد: "میر صاحب! آپ کا فرمایا ہوا ہمیشہ مستند مانا گیا ہے۔ کیا آپ اپنی زبان سے اِس اسکینڈل پر کچھ روشنی ڈالیں گے جو آپ کے اور چاند کے تعلق سے ہے۔ سنا ہے آپ پاگل ہو کر چاند کو ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتے تھے۔"

ساقی

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا ——— غالب

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی ——— اقبال

کہاں سے لاؤں صبر حضرت ایوب اے ساقی
خم آئیگا صراحی آئیگی تب جام آئے گا ——— شاد عظیم آبادی

ترے قربان ساقی! بزم کی ترتیب پھر کرنا
ذرا مستوں کے آگے رکھ تو دے جام و سبو پہلے ——— شاد عظیم آبادی

ماہ و انجم نچوڑ دے ساقی
کل سنہری یہ رات ہو کہ نہ ہو ——— ساغر

مرسلہ: سید ضیاء الرحمٰن ضیا پٹنہ

میر: "یہ دشمنوں کی اُڑائی ہوئی ہے میاں! بعض شرپسندوں نے بدنصیب میر کو مرکز مان کر اُس کے گرد تہمتوں کا دائرہ کھینچ لیا۔ اب یہی دیکھو چند تذکرہ نویسوں کے علاوہ محمد حسین آزاد نے بھی مجھے پاگل اور سودائی بنا ڈالا۔ سنا ہے ایک شاطر کنھیا لال کپور بھی ہے جس نے مجھے مالیخولیا کا مریض بنا دیا ہے!"

شاد: "جی ہاں کنھیا لال کپور نے آپ کی نفسیات کا جائزہ لیا ہے اور آپ ہی کے اشعار کی روشنی میں مدلل انداز میں آپ کو مالیخولیا کا مریض ثابت کر دیا ہے!"

میر: "ہاں تو میاں! اِنہی لوگوں نے مجھے بدنام کر رکھا ہے۔ جہاں تک چاند کو ٹکٹکی باندھے دیکھنے کا تعلق ہے وہ میرا اپنا نجی معاملہ ہے۔ چاند میں جو بوڑھی عورت بیٹھی چرخہ کات رہی ہے اُس پر میں ریسرچ کر رہا تھا۔ عمر نے وفا نہ کی ورنہ میں اُس عورت کو دنیا سے متعارف کراتا۔"

شاد: "یعنی لوگوں نے بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ ایک آخری

سوال اور ہے"

میرؔ:- "پوچھو!"

شادؔ:- "ہماری اِس کالونی میں کسی عورت کا وجود نظر نہیں آتا جو عالمِ فانی سے یہاں آئی ہو۔ کیا اُن کی کوئی الگ کالونی ہے؟"

میرؔ:- "بہت معصوم ہو میاں! یہ جو سامنے حُوروں کو دیکھ رہے ہو یہی تو وہ عورتیں ہیں جو دہرِ فانی سے یہاں پر آئی ہیں"

شادؔ:- "لیکن اِن میں وہ گلیمر نہیں ہے جو عورتوں میں ہُوا کرتا ہے"

میرؔ:- "یہ سب مصلحتِ خُداوندی ہے۔ اگر اِن میں گلیمر ہوتا تو میرے کتنے دواوین منظرِ عام پر آ چکے ہوتے!"

شادؔ:- "بجا فرمایا خُدائے سخن! جس دُنیا نے آپ کو ہر طرح سے ستایا۔ خون کے آنسو رُلائے اُسی زمانے نے آپ کے فن کو سراہا ہے۔ مومنؔ اور غالبؔ تک نے آپ کا لوہا مانا ہے۔ نہیں نہیں میرؔ صاحب! اِس طرح نہ مُسکرایئے۔ میں جھوٹ نہیں کہہ رہا ہوں"

میرؔ:- "مجھے صرف تمہاری نادانی پر ہنسی آتی ہے میاں شادؔ! میں نے اشارۃً تم سے کہا نا کہ میں وہ نہیں جو میری شاعری ہے۔ میری شخصیت اور شاعری میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہ فرنگیوں کے پیدا کئے ہوئے اصول ہوں گے جِن میں شخصیت کو ادب اور شاعری سے جوڑا جاتا ہے۔ میری زندگی بہت خوشحال گُزری۔ رنج و الم کا سایہ بھی مجھ پر نہیں پڑا۔ شاعرانہ طبیعت تھی۔ اپنے ہم عصروں سے اپنے آپ کو جُدا کرنے کا ایک دن خیال پیدا ہُوا اور میں نے اپنی شاعری میں مظلومیت کے جذبہ کو اُبھار کر پیش کیا جو میرے ہم عصروں میں مفقود تھا اور یہ فارمولا مجھے بقائے دوام کے دربار میں پہنچانے میں کامیاب رہا"

شادؔ:- "لیکن جب میں نے آپ کو پہلی دفعہ ابھی کچھ دیر پہلے دیکھا تو آپ آسمان پر ٹکٹکی باندھے کیسے دیکھ رہے تھے؟ اب تو چاند بھی دکھائی نہیں دیتا کہ آپ اُس بڑھیا کو تلاش کر رہے ہوں جو چرخہ کات رہی ہے"

میرؔ:- "دیکھا نا ——— تم بھی دھوکا کھا گئے! میں انگور کے اِن خوشوں کو دیکھ رہا تھا۔ اِس بیل کے انگور بہت میٹھے ہوتے ہیں۔ کبھی وقت فرصت میں آنا تو اِن کے بارے میں بہت کچھ بتاؤں گا۔ ابھی تو مجھے انگور کے اِن خوشوں سے نپٹنے دو"

شادؔ:- "بہت بہت شکریہ میرؔ صاحب! میرا انٹرویو پورا ہوگیا۔ ایک مُدیر کے احسانوں کو چکانے کے لئے یہ انٹرویو بہت کار آمد ثابت ہوگا"

میرؔ:- "کیا کہا؟"

شادؔ:- "جی کچھ نہیں۔ آداب عرض!"



بیسویں صدی دہلی اپریل ۱۹۷۳ء

غزلیں

پروفیسر افتخار احمد فخرؔ ایم۔ اے

ہمیشہ کھنچتے آئے ہیں اُن کی زلفِ برہم سے
اُلجھا سوچ کرتے گردشِ شام و سحر ہم سے
وہ دیوانے ہیں ہم، آباد ہے وحشت کا گھر ہم سے
خزاں کا دور ہم سے موسمِ دیوانہ گر ہم سے
...کر میں بیٹھ کر کہتا ہے یہ تیرِ نظر ہم سے
...یہ وہ زخم ہے ہوتا نہیں اچھا جو مرہم سے
رواں ہے ہر رگِ گُل میں لہو اے باغباں کس کا
یہ ثابت ہے چمن میں ہے بہاروں کا گزر ہم سے
...وہ ہیں ہم کشتۂ تیغِ تغافل فخرؔ اُلفت میں
...کترا کر گزرتا ہے غبارِ رہ گزر ہم سے

پروفیسر مختار شمیم ایم۔ اے

زندگی کے مارے ہیں گردشوں کے پالے ہیں
اے غمِ محبت اب ہم ترے حوالے ہیں
زندگی گزرتی ہے کچھ حسین خوابوں میں
ذہن کے دریچے میں یاد کے اُجالے ہیں
اُس کے عارض و گیسو یعنی برملا کہیے!
”اِک طرف اندھیرے ہیں اِک طرف اُجالے ہیں“
پھول کھِل گئے دل میں دیپ جگمگا اُٹھے
جب سے یہ سُنا ہم نے آپ آنے والے ہیں
اب وہ دل مقدر کے پیچ و خم میں اُلجھا ہے
اے شمیمؔ اُن زلفوں کے جس نے بل نکالے ہیں

پروفیسر عکس فیروزپوری ایم۔ اے

مانتا ہوں میں وہ مجھ پہ مہرباں کچھ کم نہ تھا
ظلم ڈھانے میں بھی لیکن آسماں کچھ کم نہ تھا
کیوں قفس میں لا کے رکھا ہے مجھے صیاد نے
میری آزادی میں حائل آشیاں کچھ کم نہ تھا
آہ کیوں آئی ہے لب تک آنکھ کیوں پرنم ہوئی
ضبط کچھ لازم تھا گو دردِ نہاں کچھ کم نہ تھا
لاکھ میں نے دل میں رکھا درد کو پنہاں مگر
جو نہاں تھا دل میں وہ رُخ سے عیاں کچھ کم نہ تھا
سود بھی اے عکسؔ ہوگا عشق میں کوئی ضرور
میں تو کہہ سکتا ہوں یہ اِس میں زیاں کچھ کم نہ تھا

سیدہ زہرہ دیولالوی

چاندنی میں غسل کر کے جب سنور جائیگی رات
میرے خوابوں کی طرح خود ہی بکھر جائے گی رات
بس اِسی احساس سے اب ڈوبتا جاتا ہے دل
مجھکو تنہائی میں تنہا چھوڑ کر جائے گی رات
نیلگوں ساغر میں چاندی کی طرح پگھلے گا چاند
اور راتوں کی طرح یہ بھی گزر جائے گی رات
ہوگیا مانوس زہرہ سے اندھیروں کا وجود
اِس کے گھر کو چھوڑ کر اب کس کے گھر جائے گی رات

مشہور مصنفین کے مشہور ناول اور کتابیں

تیر ار بستہ	قیس رامپوری	۵/۰۰	ایشیا جاگ اٹھا	سردار جعفری	./۷۵	صبائے عشق	میر تقی میر
انقلاب اوّلیں	خان محبوب طرزی	۵/۰۰	زندگی کا میلہ	اختر حسین طاہپوری	۲/۲۵	نقش غالب	اسلوب احمد انصاری
آبادی سے دور	ایم صدیقہ تبسم	۲/۰۰	اجنبی	وشوا ناتھ درد	۵/۰۰	یلغار	نسیم حجازی
دوشیزہ مصر	اشرف صبوحانی	۲/۵۰	رومانِ بہار (ناولٹ)	اشفاق احمد	۱/۵۰	غالب اور آہنگ غالب	ڈاکٹر یوسف حسین
انجانی راہیں	ضیا عظیم آبادی	۵/۰۰	چند تصویرِ بتاں	شمیم احمد	۴/۲۵	لکھنؤ کی زبان	شمس لکھنوی
دشمن کون	〃	۲/۰۰	دیوان خواجہ میر درد	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	۶/۰۰	محمود و سلمیٰ	صادق سردھنوی
رقصِ حیات (نظم)	پرویز شاہدی	۳/۵۰	باقیاتِ فانی	فانی بدایونی	۳/۵۰	حضرت عائشہ صدیقہؓ	مولانا عبدالحلیم شرر
جامع الشواہد	مولانا ابوالکلام آزاد	۱/۷۵	اکبر الہ آبادی اور اُن کا کلام	نور الرحمٰن	۲/۰۰	ثریا	فاطمہ مبین
قولِ فیصل	〃	۲/۵۰	مجاز کے لطیفے	احمد جمال پاشا	۲/۷۵	انور	فیاض علی
زلف و شمشیر	مہدی نظمی	۴/۰۰	میرے بہترین افسانے	پریم چند	۴/۰۰	شکار بیتی	ریحان احمد عباسی
دوشیزہ کابل	محمد صادق سردھنوی	۱۲/۰۰	کربل کتھا کا لسانی مطالعہ	خلیق انجم و جی سی نارنگ	۴/۰۰	خیبر شکن	مولانا محمد ابراہیم شہید
سفینہ و ساحل	عزیز وارثی	۴/۰۰	میراث	پرکاش پنڈت	۳/۵۰	کینسر وارڈ	الیگزنڈر سولینشتین
راہ کا کانٹا	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	۳/۰۰	ٹیگور کی کہانیاں	ٹیگور	۴/۰۰	اوراقِ زندگی	بسمل سعیدی
غالب اور ابوالکلام	عتیق احمد صدیقی	۱۵/۰۰	چین کی بہترین کہانیاں	ظ۔ انصاری	۲/۰۰	شہلا	عطیہ پروین
اقبال حیات و شاعری	عدیل عباسی	۶/۰۰	سیندور کی راکھ	کشمیری لال ذاکر	۱/۲۵	کلیاتِ جگر	جگر مراد آبادی
ملاقاتیں	بدر فاضلی	۳/۹۵	پہلی محبت	تورگنیف	۱/۲۵	باقیاتِ اقبال	ڈاکٹر اقبال
بساطِ رقص	مخدوم محی الدین	۵/۰۰	دل ہی تو ہے	ایمل زولا	۱/۲۵	دو قدم ایک منزل	شائستہ قدوائی
افاداتِ سلیم	مولانا وحید الدین سلیم	۳/۰۰	پروفیسر بدھو	فکر تونسوی	۳/۷۵	اناجوں کا بادشاہ گیہوں	اندرجیت لال
دوشیزہ پاکستان	ایم اسلم	۶/۵۰	تشنگی	رشید اختر ندوی	۳/۵۰	حروف	بدیع الزماں خاور
سرخ حاشیے	نریش کمار شاد	۲/۷۵	تعلیم الدین	مولانا اشرف علیؒ	۱/۵۰	شہرِ خیال	جلیس نجیب آبادی
انشاء اللہ خاں انشاء	ڈاکٹر اسلم پرویز	۴/۰۰	دیہات کے افسانے	پریم چند	۳/۵۰	افکارِ سودا	شارب ردولوی
چنگ و رباب	کنہیا لال کپور	۲/۵۰	نیا دیش بنگلہ دیش	اندرجیت گاندھی	۳/۵۰	مطالعۂ دکی	〃
روحِ صحافت	مولانا امداد صابری	۷/۵۰	گلستانِ ہزار رنگ	سید بہاؤ الدین	۲۰/۰۰	روحِ افکار	واجد سحری
تذکرہ شعراء حجاز اردو	〃	۱۲/۰۰	بالِ جبریل	ڈاکٹر اقبال	۳/۵۰	سحرِ نغمہ	ساحر ہوشیارپوری
امراؤ جانِ ادا	مرزا رسوا	۴/۵۰	اس دیوانگی میں	سلمیٰ کنول	۸/۰۰	گونگا سے بھگوان	کوثر چاند پوری
آج کی سائنس	اندرجیت لال	۳/۰۰	اردو ادب میں سکھوں کا حصہ	سید امام مرتضیٰ نقوی	۱۵/۰۰	پتھر کا گلاب	

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۲

سچّی خوشی

طارق بن منظور

معرفت حکیم منظور احمد صاحب منگل بازار پرانی بستی ضلع بستی (یوپی)

مشعلِ علم و ادب خوشتر صاحب! ہدیۂ خلوص

خطوط پر مشتمل ایک افسانہ پیش خدمت ہے۔ خدا جانے قابلِ اشاعت ہوگا کہ نہیں۔ اگر آپ کے بلند معیار پہ پورا اترتا ہو تو شائع فرما کر ممنون فرمائیں۔ خوشتر صاحب! آپ کے لئے سچّی خوشی بھیج رہا ہوں۔ اور اِس اُمید کے ساتھ کہ آپ بھی مجھے حقیقی مسرت سے نوازیں گے۔ میری خوشی اِسی بات پر منحصر ہے کہ میرا افسانہ "بیسویں صدی" کے قیمتی صفحات کی زینت بن جائے۔ آپ کے مفید مشوروں کے ساتھ ہی ساتھ بلند ذوق قارئین کی گراں قدر رائے کا شدّت سے انتظار کروں گا۔ خدا کرے آپ بخیر ہوں!

نیک تمنّاؤں کے ساتھ

منتظرِ کرم ——— طارق بن منظور

★

حسرت کدہ۔ ٹانڈہ۔ فیض آباد

محترم! سلامِ عقیدت

"فلم و کلی" میں آپ کا افسانہ "شکستِ آرزو" پڑھا۔ بے حد پسند آیا۔ سمجھ میں نہیں آتا، فن کی تعریف کروں یا فنکار کی؟ واقعی افسانہ بہت خوب ہے! ایک ایک لفظ نگینے کی طرح جڑا ہوا ہے۔ نیز مقصدی اعتبار سے بھی افسانہ اپنی مثال آپ ہے۔ اِتنے اچھے موضوع پر آپ نے جس کامیابی کے ساتھ قلم اٹھایا ہے، وہ آپ ہی کے بس کی بات ہے۔ بہر حال میری جانب سے مبارکباد قبول فرمائیے اور اِس خواہش کے ساتھ ؏

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

آپ کی عقیدتمند ———

ناہید

حسرت کدہ۔ ٹانڈہ۔ فیض آباد

محبوب صاحب! سلام بصد احترام

میں آپ کے لئے اجنبی ضرور ہوں۔ لیکن میری تحریر سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ خط لکھنے کی ضرورت اِس لئے محسوس ہوئی کہ آپ اپنے افسانوں کے ساتھ جو ظلم کر رہے ہیں اُسے باذوق قارئین کبھی معاف نہیں کر سکتے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ اپنے معیاری افسانے غیر معیاری پرچے میں کیوں شائع کراتے ہیں؟ ——— یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟ سچ پوچھئے تو آپ کا افسانہ "فلم و کلی" میں دیکھ کر یہی محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے جان بوجھ کر ایک بیش قیمت نگینے کو پیتل کی انگشتری میں جڑ دیا ہے۔

زیرِ نظر افسانہ "پامالِ تمنّا" بھی آپ کے سابقہ افسانوں کی طرح بہت خوب ہے۔ لیکن اسے کسی اچھے رسالے کی زینت بننا چاہیے تھا۔ میرا خیال ہے آئندہ اپنے افسانے آپ "بیسویں صدی" کی نذر کیجئے! کیونکہ "بیسویں صدی" ادبی دنیا میں سب سے زیادہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ویسے "بیسویں صدی" سے میرا جذباتی لگاؤ بھی ہے۔ اُمید ہے کہ

آپ بھی رائے سے اتفاق کریں گے۔

فقط ——— ناہید

حسرت کدہ۔ٹانڈہ۔فیض آباد

محترم محبوب صاحب!

میں آج بہت خوش ہوں۔ خوشی میں میں نے آپ کو سلام تک نہ لکھا! لیجے اپنی مسرت کا سبب ظاہر کر رہی ہوں۔ "بیسویں صدی" میں آپ نے اپنی نظم "مسیحا" شائع کرا کے میری دیرینہ خواہش کی تکمیل کر دی۔ مزید خوشی اس لئے ہے کہ میرا محبوب فنکار نثری و شعری ادب دونوں پر یکساں قدرت رکھتا ہے۔ "مسیحا" صحت مند ادب میں گراں قدر اضافہ ہے۔ میں اب اپنے

- بے شک نیک لوگ چین میں ہوں گے۔ (قرآن مجید)
- جو لوگ زندگی میں میانہ روی اختیار کرتے ہیں کسی کے محتاج نہیں ہوتے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- خدا کے نزدیک وہ نیک عمل اچھا ہے جو ہمیشہ کیا جائے چاہے وہ تھوڑا ہی ہو۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- ہم نے بزرگی کو تقویٰ میں پایا، تونگری کو یقین میں اور عزت کو تواضع میں۔ (حضرت ابوبکر صدیق رض)
- بندگی یہ ہے کہ خدا کے حکموں کی پابندی کی جائے۔ عہد پورا کرو، جو مل جائے اس پر قناعت کرو جو نہ ملے اس پر صبر اختیار کرو (حضرت عثمان غنی رض)

محبوب صحیفہ "بیسویں صدی" میں اپنے محبوب فنکار محبوب کا افسانہ بھی دیکھنا چاہتی ہوں۔ یہی میری آرزو ہے۔

نیک تمناؤں کے ساتھ ———

ناہید

حسرت کدہ۔ٹانڈہ۔فیض آباد

میرے محبوب! سلامِ اُلفت

کسی نے کہا ہے "تکلف محبت کی کمی کا سبب بن جاتی ہے"۔ اِس لئے میں آپ سے بے تکلف ہو رہی ہوں۔ اُمید ہے معاف فرمائیں گے۔ فرودی تحریر یہ ہے کہ امسال میرے کالج میں سالانہ فنکشن کے موقع پر مشاعرہ کا پروگرام بھی رکھا گیا ہے جس کا اہتمام کالج کی ادبی سوسائٹی "اردو بزم ادب" کر رہی ہے۔ اس میں مجھے بھی حصہ لینا پڑ رہا ہے۔ اگر آپ تھوڑی سی میری مدد کر دیں تو میں شہرت کے بامِ عروج پر پہونچ سکتی ہوں۔ شاید آپ میرا اشارہ سمجھ گئے ہوں۔ لیکن بات بے تکلفی تک آ پہونچی ہے اس لئے اپنا مقصد واضح کئے دے رہی ہوں۔ بات یہ ہے کہ شعر کہنا میرے بس کی بات نہیں۔ اس لئے آپ اپنی کوئی غیر مطبوعہ غزل بھیج دیں تو کام بن جائے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میری التجا کو ٹھکرائیں گے نہیں۔ جواب کا شدت سے انتظار کروں گی۔

منتظرِ جواب ——— ناہید

حسرت کدہ۔ٹانڈہ۔فیض آباد

محبوب صاحب! سلام و آداب

سُنا تھا "اچھا ادیب اچھا انسان بھی ہوتا ہے"، لیکن اس قول سے میرا یقین اٹھ چکا ہے۔ میں نے آپ کو اپنا سمجھ کر تعاون چاہا تھا لیکن ابھی تک جواب سے محروم رہی۔ جب کہ مشاعرہ کو صرف دس دن باقی رہ گئے ہیں۔ مجھے آپ سے ایسی امید قطعی نہ تھی کہ آپ مجھے مایوسی کے غار میں دھکیل دیں گے لیکن حقیقت سے انکار بھی تو نہیں کیا جا سکتا۔

سوگوار ——— ناہید

حسرت کدہ۔ٹانڈہ۔فیض آباد

عزیز از جان محبوب! میری خوشیاں آپ کے ساتھ ہیں!

آپ کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں؟ عین موقع پر غزل بھیج کر آپ نے میری آبرو رکھ لی! آپ کی بدولت مجھے جو عزت و شہرت حاصل ہوئی ہے اُسے میں تاحیات فراموش نہیں کر سکتی! کتنی پیاری غزل آپ نے ارسال کی ہے۔ یہ اشعار تو مجھ سے بار بار پڑھوائے گئے ؎

کاش احساس میرا مر جاتا
جان لیوا ہے کلپنا میری
جب سے دل میں کوئی سمایا ہے
مجھ سے روٹھی ہے چتینا میری

محبوب ڈیر! ابھی تک تو میں آپ کی عقیدت مند ہی تھی لیکن اب احسان مند بھی ہوں! مشاعرہ کی کامیابی کی خوشی میں آپ کو کون سا تحفہ پیش کروں؟ اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑتی ہوں۔ جواب سے ضرور نوازیئے گا۔

اپنی ـ ـ ـ ناہید

حسرت کدہ۔ ٹانڈہ۔ فیض آباد

میرے محبوب! سلام شوق

ابھی ابھی میں خواب سے چونک اٹھی ہوں ——— دیکھا کہ آپ میرے کمرے میں موجود ہیں اور آپ کی بغل میں کرسی پر ایک نہایت ہی حسین و جمیل لڑکی بیٹھی ہے۔ وہ آپ کو معنی خیز نظروں سے دیکھ رہی ہے اور اُس کے ہونٹوں پر ہلکا ہلکا تبسم بھی ہے۔ مجھے لڑکی کا یہ انداز بہت بُرا معلوم ہوا اور غصے کی تاب نہ لاکر اپنی پوری قوت سے میں نے اُس کی گردن مروڑ دی۔ پھر آنکھ کھل گئی، دیکھتی ہوں میری گرفت میں "کلیاتِ اقبال" ہے جس کے اوراق بیدردی سے بُری طرح مسل گئے ہیں۔ مجھے اپنے اس خواب پر بے اختیار ہنسی آئی اور پھر اپنی بے بسی پر میری آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ میں پوچھتی ہوں محبوب! آخر یہ کون سا جذبہ ہے؟ کہیں اِسے محبت تو نہیں کہتے؟

پریشان حال ———

ناہید

حسرت کدہ۔ ٹانڈہ۔ فیض آباد

میری پاکیزہ محبت کے شہزادے! سلامِ محبت!!

کسی نے ارشاد فرمایا ہے "اظہارِ تمنا محبت کی توہین ہے" لیکن اظہار کے بغیر تکمیلِ تمنا بھی تو ناممکن ہے محبوب! میں تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہوں، تم سے محبت کرتی ہوں۔ اپنی محبت کا اظہار والدین سے بھی کر چکی ہوں۔ کیونکہ مجھے تم پر پورا پورا اعتماد ہے۔ اُمید ہے اپنے خیال سے مطلع کرو گے۔

طالبِ کرم ———

ناہید

حسرت کدہ۔ ٹانڈہ۔ فیض آباد

سنگ دل محبوب!

جس طرح تمہاری بے رُخی سے مضطرب ہوں، میری آرزو ہے کہ خلش تمہارا مقدر بن جائے! محبوب! ابھی تک جس قلم سے تمہاری سلامتی کی دعائیں تحریر کرتی رہی، تمہاری شان میں قصیدے لکھتی رہی، اب اِسی قلم سے تمہیں کوسنے کا سہارا لے رہی ہوں۔

محبوب! عورت ہزاروں ارمان لے کر محبت کی حدود میں داخل ہوتی ہے۔ میں نے بھی اپنے دل کے نہاں خانے میں آشاؤں کے ان گنت چراغ روشن کر کے تم سے محبت کی ہے۔ لیکن آج تمہاری بے اعتنائیوں کی تیز آندھی میں میرے ارمانوں کے چراغ بجھنے لگے ہیں۔

سنگ دل! تقریباً ایک سال سے تم نے میرے کسی بھی خط کا جواب نہیں دیا! آخر اِس کی وجہ کیا ہے؟ کس جرم کی مجھے اتنی بڑی سزا دے رہے ہو؟ سچ کہتی ہوں، میں آج اپنی ہی نظروں میں گر گئی ہوں۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے۔ محبوب! تم اپنے افسانوی کردار میں جتنے مخلص نظر آتے ہو عملی زندگی میں اُس کے برعکس ہو۔ کاش! میں نے اپنی محبت کا اظہار اپنے والدین سے نہ کیا ہوتا!! محبوب! میں ذلت کی زندگی پر موت کو ترجیح دیتی ہوں۔ یہ میری خودداری کا

- دوسروں کی عیب جوئی کے بجائے اپنی کمزوریوں پر نظر رکھو (مہاتما بدھ)
- بُرے کاموں سے شرم کرنا انسان کے لئے بہبودی اور سلامتی کا موجب ہے، ایسے نیک انسان کو اسی زندگی میں نجات حاصل ہو جاتی ہے وہ گویا حیاتِ جاوید پا لیتا ہے۔ (گورو نانک جی)
- بھوکوں کو روٹی دینے، غریبوں کی حاجت روائی کرنے سے انسان نرک سے بچ سکتا ہے۔ (سوامی سار شہرانند جی)
- جو انسان غرور اور تکبر سے سر اٹھاتا ہے وہ سر کے بل گرتا ہے۔ (مہابھارت)
- نفرت جرم سے کرو مجرم سے نہیں (مہاتما گاندھی)

تقاضہ ہے۔ یہ میرا آخری خط ہے۔ اگر تم نے اِس خط کا جواب نہ دیا تو شاید میں ایسی جگہ پہونچ جاؤں جہاں سے لوٹنا ناممکن ہوتا ہے اور میرا خونِ ناحق تمہاری ہی گردن پر ہوگا۔ اِسے محض دھمکی نہ سمجھنا یہ میرا اٹل فیصلہ ہے!

بدنصیب ——— ناہید

آگرہ - ۱۲ اگست ۷۲ء

سوگوار ناہید! خدا تمہیں صبر عطا فرمائے

میرا خط پڑھکر تم حیرت میں پڑ جاؤ گی اور تمہارے ذہن کو شدید جھٹکا لگے گا۔ ناہید! حقیقت یہ ہے کہ اب تک تمہارے خطوط کے جتنے بھی جواب تمہیں موصول ہوئے ہیں وہ میرے قلم سے تحریر کئے گئے ہیں۔ میرے بھیّا یعنی

محبوب کو اس بات کا قطعی علم نہیں۔ اب تمہارے ذہن میں ایک سوالیہ نشان ہوگا کہ آخر میں نے ایسی حرکت کیوں کی؟

ناہید! اس دنیا میں بھیا کے سوا میرا کوئی نہیں ہے۔ میرے بھیا نے بیک وقت مجھے بھائی کا پیار، ماں کی مامتا، اور باپ کی شفقت جیسی نعمتوں سے نوازا ہے۔ انہیں کے زیر سایہ میں پروان چڑھی ہوں۔ اس لئے میں کبھی یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ میرے مخلص بھائی جان کے خلاف کوئی غلط رائے قائم کرے۔

ناہید! تمہیں یاد ہوگا کہ ایک بار تم نے اپنے خط میں بھیا سے ایک غزل مانگی تھی اپنے کالج کے مشاعرہ میں پڑھنے کے لئے اور جب تمہیں غزل ملی نہیں تو بھیا کے متعلق لکھا تھا —— "سنا تھا کہ اچھا ادیب اچھا انسان بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس قول سے میرا یقین اٹھ چکا ہے۔" تمہارے اس جملے سے مجھے شدید تکلیف پہونچی اور میں نے بھیا کی لاعلمی ہی میں اُن کی بیاض سے ایک تازہ غزل Select کر کے بھیج دی۔ اُس کے بعد تو تم نے خطوط کی جھڑی لگا دی اور میں تمہارے ہر خط کا جواب بھیا کی جانب سے لکھتی رہی۔ لیکن جب آگے چل کر تمہارے خطوط تمہارے دل کی دھڑکنوں کے شاہد تمہاری محبت کے ترجمان ہونے لگے تو میں نے جواب تحریر کرنا بند کر دیا۔ لیکن آج تم نے میرے بھیا کو سنگ دل کا خطاب عطا کر کے ایک بار پھر میرے جذبات کو مجروح کر دیا ہے۔ ایسی صورت میں میرے لئے راز فاش کرنا لازم ہو گیا۔ اُمید ہے مستقبل میں تم میرے بھیا کو کچھ نہ کہو گی۔

ناہید! میرا مشورہ ہے کہ حوصلے سے کام لو۔ جذبات کی رَو میں زندگی سے فرار چاہنا غیر دانشمندانہ اقدام ہے۔ مجھے تم سے دلی ہمدردی ہے اور میں اپنی اس غیر اخلاقی حرکت پر نادم بھی ہوں۔ خدارا مجھے معاف کر دو۔

تمہاری شریکِ غم ——

سلمیٰ

حسرت کدہ۔ ٹانڈہ۔ فیض آباد

سلمیٰ!

مجھے مغالطے میں رکھ کر میرے جذبات کو جو تم نے ٹھیس پہنچائی ہے، اِسے میں کبھی معاف نہیں کر سکتی! جس طرح میرے ارمان ٹوٹے ہیں، میرا دل پارہ پارہ ہوا ہے اور میری زندگی مجھ پر بارِ گراں ہے، خدا کرے تمہاری زندگی بھی تم پر بوجھ بن جائے۔ موت مانگے اور تو موت کو ترسے۔ یہی میرے دکھی

دل کی آواز ہے!

غمگین ——

ناہید

تاج گنج۔ آگرہ

ڈیر ناہید! شبھ کامنائیں

میرا یہ خط تمہارے لئے حیرت کا سبب بھی ہوگا اور سچی خوشی کا علمبردار بھی۔ تمہیں میری بات پر یقین نہ آئے گا لیکن یہ حقیقت ہے ناہید! کہ میں تمہارے ہر جائز و ناجائز مطالبات پورا کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔ میں تمہاری تمناؤں کا محل مسمار نہیں ہونے دوں گا۔ کیوں کہ تمہاری تکمیلِ آرزو پر ہی موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا میری عزیز بہن سلمیٰ کی زندگی کا انحصار ہے۔ ناہید! جب سے تمہارا خط سلمیٰ کو ملا ہے اس پر تین بار دل کے دورے پڑ چکے ہیں۔ ڈاکٹروں کی تشخیص ہے کہ وہ کسی شدید صدمہ سے دوچار ہے اور آخر کار میں نے صدمے کی وجہ دریافت کر لی۔ مجھے سلمیٰ سے سب معلوم ہو چکا ہے اور میں اُسے زبان دے چکا ہوں ناہید کہ میں تمہارے ارمان بکھرنے نہ دوں گا۔ اب سلمیٰ کی حالت تیزی سے سدھر رہی ہے۔ پوری طرح صحتیاب ہوتے ہی میں تمہاری ہر خواہش کی تکمیل کر دوں گا۔ تم مطمئن رہو۔ ہاں! سلمیٰ کی صحت کے لئے تم بھی دعا کرتی رہنا۔ والدین کی خدمت میں سلام کے ساتھ!

تمہارا ہی —— محبوب

غزلیں

دھرم پال عاقل ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی

دلِ و نگاہ کو جلووں سے جگمگا کے چلو
تم اپنے روئے حسیں سے نقاب اُٹھا کے چلو

ابھی نہ جاؤ، ابھی شوقِ دید ہے دل میں
شرابِ حسن سے بیخود ہمیں بنا کے چلو

رہے شگفتہ مصیبت میں بھی کلی دل کی
ہجومِ رنج والم میں بھی مسکرا کے چلو

بلند اور ہو تہذیب ابنِ آدم کی
فضا میں پرچمِ انسانیت اُڑا کے چلو

تمہاری فکر میں ہے تازگی بڑی عاقل
چلے جہاں بھی غزل اِک نئی سنا کے چلو

سان سنگھ خیال ایم۔ اے۔ ایم۔ ایڈ

شمع نے زلف کیا کھول دی
رات تاریک تر ہو گئی

اب تو آنکھیں ذرا کھولئے
دیکھئے تا سحر ہو گئی

جس نظر نے تمہیں چھو لیا
وہ نظر دیدہ ور ہو گئی

اُس خطا کو خطا مت کہو
جو خطا، جان کر ہو گئی

اب نہیں کچھ بھی آتا نظر
روشنی اِس قدر ہو گئی

آزاد عمروہی

اہلِ غم پر آپ کا لطف و کرم پیہم ہوا
پھر بھی احساسِ غمِ اُلفت نہ دل سے کم ہوا

عشق کی ہر صبح جاگی ہے تری آنکھوں کے
جب جھکی ہیں تیری پلکیں شام کا عالم

اَن گنت دشواریاں یہ، اَن گنت یہ اُلجھنیں
جادۂ ہستی تری زُلفوں کا پیچ و خم ہوا

مجھ کو اتنا ہوش ہے اِک برق سی لہرا گئی
پھر خدا جانے تری محفل کا کیا عالم

شدتِ احساسِ غم میں بھی ہنسا ہوں بارہا
اور کبھی آزاد میں خود ہی اسیرِ غم ہوا

حضور سبزواری

ہم سرِ کوہِ طور کیوں جائیں
تم ہو دل میں تو دور کیوں جائیں

حشر میں دیکھنی ہے شانِ کرم
ہم وہاں بے قصور کیوں جائیں

دل تو سرمستیوں کی دنیا ہے
دل سے کیف و سرور کیوں جائیں

تیرے کوچے سے تیرے دیوانے
کہیں نزدیک و دور کیوں جائیں

اُن کی محفل میں جب گزر ہی نہیں
ہم وہاں اے حضور کیوں جائیں

کیا آپ

کسی یونیورسٹی کے طالب علم
یا
تعلیم یافتہ
بیروزگار ہیں؟

ہمیں آپ ہی کی تلاش ہے!

ہمیں ایسے نوجوان اور باہمت مردوں اور عورتوں کی ضرورت ہے جو بھارت سرکار کے نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ اور میعادی ڈیپازٹ کھاتے بیچنے کا کام کرنے کو تیار ہوں۔ آپ کا کام ان سرکاری کفالتوں کے لئے کنویسنگ کرنا ہوگا۔
ان پر سود 7½% سالانہ تک دیا جاتا ہے۔ یہ ایک ہمت کا کام ہے جس پر آپ کو 1.75% کمیشن ملے گا اور نئے لوگوں سے رابطہ پیدا کرنے اور اپنی شخصیت کو اُجاگر کرنے کا موقع بھی ملے گا۔

وہ برسرِ روزگار افراد جو اپنی آمدنی میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں، بھی درخواست بھیج سکتے ہیں۔

اگر آپ کو اس کام سے دلچسپی ہو
تو آج ہی
نیشنل سیونگز کمشنر، پوسٹ بکس نمبر 96، ناگپور
کے پتے پر درخواست بھیجیں۔

davp 72/507

درد نہ جانے کوئی

عابد ضمیر ایم ۔ اے ۔ بی ٹی

اسلام پور، آسنسول (بردوان)

برادرِ محترم! خلوص و عقیدت

" بیسویں صدی " کی بزم سے طویل غیر حاضری کے بعد ایک افسانہ " درد نہ جانے کوئی " لے کر حاضر ہو رہا ہوں۔ آج کی دنیا میں محبت جیسی انمول شے کو بھی دولت کے ترازو میں تولا جاتا ہے! دولت کی چمک دمک کے آگے ناہید کا پیار ماند پڑ جاتا ہے اور وہ ساجد کے پیار بھرے دل کو ٹھکرا کر اشرف سے شادی کر لیتی ہے! اُمید ہے میرے دوسرے افسانوں کی طرح یہ بھی آپ کو اور " بیسویں صدی " کے بلند ذوق قارئین کو پسند آئے گا ———— میں بے حد نادم ہوں کہ آپ ہر ماہ میرے نام " بیسویں صدی " بھیجتے رہے اور میں ایک طویل عرصے تک افسانے کیا آپ کو ایک خط بھی نہ لکھ سکا۔ میں آپ کی محبت اور ادب نوازی کا تہہ دل سے معترف ہوں۔ جلد ہی کوئی دوسرا افسانہ بھیجنے کی کوشش کروں گا..........

بندۂ خلوص ———— عابد ضمیر

★

گھر میں شادی کا ہنگامہ تھا۔

میری چھوٹی بہن انجم کی شادی تھی۔ دوسرے رشتہ داروں کے علاوہ ممانی کے ساتھ اُن کی بڑی لڑکی ناہید بھی آئی تھی۔ میں نے اِس بار ناہید کو پانچ سال کے بعد دیکھا تھا۔ میرے ساتھ کھیلنے والی بچپن کی ناہید اور اِس ناہید میں زمین آسمان کا فرق تھا سیدھی سادی، تپلی دُبلی اور شرمیلی لڑکی کی جگہ اِس اسمارٹ اور سڈول جسم والی ناہید کو دیکھ کر میں متحیر رہ گیا۔ وہ حُسن و رعنائی کی مُسکراتی شفق تھی! حُسن و شباب کی اُس جیتی جاگتی خوب صورت تصویر کو دیکھ کر میرا دل خوشی سے کھِل اُٹھا۔ اُس نے اپنا خوب صورت ہاتھ اُٹھا کر دل فریب انداز میں مجھے " تسلیم " کہا تو اُس کے گلابی رُخساروں اور شفق گوں ہونٹوں کو دیکھ کر میری نگاہوں کے سامنے یکایک قوسِ قزح کے ساتوں رنگ بکھر گئے ———— گُذرے ہوئے حسین لمحات کے دھندلے سائے سرسرانے لگے۔ اور کسی اندرونی جذبے کے اظہار کے لئے میرے لب کپکپانے لگے۔

" اِن پانچ برسوں میں تم کتنی بڑی ہو گئی ہو! " میں نے اُس کے حسین سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

" اور کیا آپ اب تک اپنے آپ کو بچہ ہی سمجھ رہے ہیں! ؟ " اُس نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے شوخ لہجے میں کہا۔

" کاش! ہم دونوں بچے ہی رہتے! میں تمہارے لئے رنگین تتلیاں پکڑا کرتا اور تم میرے لئے باغ سے رنگ برنگے پھول چنا کرتیں میں کبھی شرارت سے تمہاری چوٹی پکڑ کر کھینچ لیتا تو تم امی سے شکایت کر کے میرے کان کھنچوا دیتیں! " میں نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

" آپ کو یہ سب باتیں اب تک یاد ہیں! ؟ " اُس نے بے حد معصومیت سے کہا۔ اُس کی خوب صورت آنکھوں میں حیرت و مسرت کی چمک تھی۔

" یادیں دل کا سرمایہ ہوتی ہیں ناہید! " میں نے خوابناک لہجے میں کہا اور اُس کی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں میں جیسے کنول کھل اُٹھے ۔ وہ

کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اُس کی امی آ گئیں۔ وہ اُٹھ کر اُن کے ساتھ چلی گئی اور میں ڈرائنگ روم میں تنہا اُس کی حسین یادوں سے کھیلتا رہا۔

کئی دنوں تک اُس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میں شادی کے ہنگاموں میں پھنسا ہوا تھا۔ شادی کے سارے انتظامات میرے ذمے تھے۔ وہ بھی عورتوں کے خاطر تواضع میں معروف تھی۔ اُس دَوران مجھے معلوم ہوا کہ کس طرح قربتیں فاصلوں میں بدل جاتی ہیں!

وہ بہار کے رنگین اور خوش گوار جھونکے کی طرح میرے پاس سے گزر جاتی تھی اور سب کی موجودگی میں اُسے روک کر اُس سے باتیں کرنا مناسب نہ معلوم ہوتا۔ میں اپنے بیتاب دل کی دھڑکنیں سینے میں سمیٹے شادی کے ہنگاموں میں معروف رہا اور وہ مجھ سے دُور دُور ایک رنگین اور حسین تتلی کی طرح اِدھر اُدھر اُڑتی پھری۔

جب انجم کو پھولوں سے سجی ہوئی کار میں بٹھا دیا گیا تو میں نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اُس کے سر پر رکھ دیا اور رُندھے ہوئے لہجے میں کہا ——

"آج تم یہ گھر چھوڑ کر ایک نئی دنیا میں قدم رکھ رہی ہو۔ اب وہی دنیا تمہارے لئے سب کچھ ہے۔ اگر میری ذات سے تمہیں کبھی کوئی تکلیف پہنچی ہو تو مجھے معاف کر دینا!"

انجم کے چہرے پر شدید غم کے آثار ظاہر ہوئے اور اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔ اُسے روتی دیکھ کر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں اپنے کمرے میں آ کر بستر پر گر پڑا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد مجھے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ میں نے نگاہیں اُٹھا کر دیکھا۔ سامنے ناہید کھڑی تھی۔ آسمانی رنگ کی ساری اور اُسی رنگ کے بلاؤز میں ملبوس وہ اور دنوں کی بہ نسبت زیادہ حسین دکھائی دے رہی تھی۔ اُس کا چہرہ شبنم سے دُھلے ہوئے تازہ گلاب کی طرح کِھلا ہوا تھا اور اس کے انگ انگ سے حسن و شباب کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں میں اپنا غم بھول کر اُس کے دلکش و دل نواز حسن میں کھو گیا۔

"آپ اِس طرح کیا دیکھ رہے ہیں!؟" ناہید نے شرماتے ہوئے کہا اور نگاہیں جُھکا لیں۔

"قدرت کا حسین شاہکار!" میرے مُنہ سے نکل گیا۔

"میں نہیں جانتا تھا کہ تم مجھے اجنبی اور غیر سمجھو گی!" میں نے اُس کے دل کا راز جاننے کی کوشش کی۔

"میں بھی نہیں —— !"

اُس نے چونکتے ہوئے کہا اور حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے تم مجھ سے اس طرح کھنچی کھنچی رہو گی [illegible] پیار بھری قربتوں کو اجنبیت کے فاصلوں میں بدل دو گی اور مجھے [illegible] میں مجھے تنہا تڑپنے کے لئے چھوڑ دو گی —— تم سے [illegible] میں نے یہ سوچا بھی نہ تھا —— !"

میں نے اپنی آواز کو جذبات میں بھگوتے ہوئے کہا۔

"ساجد! یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میں شادی کے ہنگاموں میں [illegible] تھی۔ تم سے نہ مل سکی۔ مجھے اجنبیت کا طعنہ نہ دو۔ تم نہیں جانتے میں — تمہاری جُدائی میں پانچ سال کا طویل عرصہ کس طرح گزارا ہے!"

اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ناہید! تو کیا تم بھی —— !؟"

میں نے کہنا چاہا۔ لیکن میرا جملہ پُورا ہونے سے پہلے ہی وہ [illegible] سے سُرخ ہو کر تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ میرا دل فرطِ مسرت سے کِھل [illegible] اور میں آنکھیں بند کر کے ماضی کے سمن زاروں میں کھو گیا۔

دوسرے دن میں نے اُسے خانہ باغ میں دیکھا۔ وہ بے [illegible] تھی۔ شام کی پھیلتی ہوئی تاریکی میں باغ میں اُس کا وجود ایک مہکتی ہوئی [illegible]

مجھے صبح کی طرح معلوم ہوا۔ وہ گلاب کے پودے کے سامنے کھڑی محویت کے عالم میں خوب صورت اور دلکش پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔ بلکہ حسنِ گلاب کے حسن میں کھویا ہوا تھا۔ شام کے دھندلکے میں بھی ناہید کے حسین رخساروں پر گلاب کی سرخی جھلک رہی تھی۔ اُس کی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں میں اُداسیاں کروٹیں لے رہی تھیں۔

میں دبے قدموں سے چلتا ہوا اُس کے سامنے جاکر کھڑا ہوگیا۔

مجھے یکایک اپنے سامنے دیکھ کر وہ چونک اٹھی اور اُس کے غمگین چہرے پر پھیکی پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"حسن جب خود محوِ حسن ہوتا ہے تو اُس کی خوب صورتی میں چار چاند لگ جاتے ہیں!"

میں نے جذبات سے بھیگے لہجے میں کہا۔ لیکن اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور بے نیازی سے پھولوں کی طرف دیکھتی رہی۔

میں نے ایک شاداب گلاب شاخ سے توڑ کر اُس کی ریشمی زلفوں میں لگا دیا — اس کا اُداس چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

"سنا ہے کل تم واپس جا رہی ہو؟" میں نے مغموم لہجے میں کہا۔

"ہاں ساجد! ہم لوگ کل جا رہے ہیں۔" ناہید نے میری جانب دیکھتے ہوئے یاس بھرے لہجے میں کہا۔ اُس کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

"کاش ہم کبھی ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوتے!" میں نے پیار بھری نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کاش! ہم ہمیشہ کے لئے ایک ہو جائیں!"

اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور میں نے پہلی بار جذبات سے مغلوب ہو کر اُس کی صندلی باہوں کو تھام لیا اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ناہید! میری نس نس میں تمہاری محبت سرایت کر گئی ہے۔ میری ہر سانس اور دل کی ہر دھڑکن میں تمہارا خیال بس گیا ہے۔ تمہاری محبت میرے سارے وجود پر چھا گئی ہے۔ میں ایک پل بھی تمہارے بغیر چین سے نہیں رہ سکتا"

"ساجد! میں بھی تمہاری ہی پرستش کرتی ہوں۔ تمہارے بغیر میں جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی!"

ناہید نے جذبات سے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا اور اُس کی ریشمی پلکوں پر آنسوؤں کے دو موتی لرزنے لگے۔ یکایک میں نے آگے بڑھ کر اپنے جلتے ہوئے ہونٹ اُس کی بھیگی پلکوں پر رکھ دیئے۔ وہ چونک اٹھی۔ اس کے رخساروں پر شفق کی سرخی پھیل گئی اور وہ بھاگتی ہوئی حویلی کے اندر چلی گئی۔ لیکن میں اُس کی حسین یادوں میں گم دیر تک وہیں بُت بنا کھڑا رہا۔

دوسرے دن وہ اپنی والدہ کے ساتھ اپنے گھر واپس چلی گئی۔

اِس واقعہ کو پانچ سال گزر چکے ہیں۔ پلنگ پر جو عورت لیٹی ہوئی ہے وہ میری بیوی ہے۔ لیکن وہ فرزانہ ہے! ناہید نہیں!!

ناہید جو کبھی میری پوجا کرتی تھی جو میرے بغیر جینے کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی، وہ اب ناہید اشرف ہے! ریت پر بنائے ہوئے محبت کے تاج محل کو توڑ کر وہ اب ایک شاندار بنگلے میں رہتی ہے اور اپنے دولت مند شوہر کے ساتھ قیمتی موٹر کاروں میں گھومتی پھرتی ہے!!

رات کے بارہ بج رہے ہیں۔ میری نازدار اور وفا شعار بیوی پلنگ پر سوئی ہوئی ہے۔ لیکن میری آنکھوں سے نیند اُڑ چکی ہے۔ سینے میں ناکام محبت کا زخم ناسور بن کر آہستہ آہستہ رِس رہا ہے اور درد کی لہریں دل سے اٹھ کر دماغ تک پہنچ رہی ہیں۔

میں حسبِ معمول میز کے سامنے بیٹھا ہوں۔

میز پر سنہرے فریم میں لگی ناہید کی خوب صورت تصویر مسکرا رہی ہے، اور میں اُس بے وفا کی یاد میں درد کی محفل سجائے چپکے چپکے آنسو بہا رہا ہوں —— !

بیسویں صدی دہلی مارچ ۱۹۷۳ء

غزل

خان آسمان

غم کے دوزخ میں جھلس جائے تصور تیرا
اے مری جنتِ گم گشتہ، مجھے یاد نہ آ

یوں اُسے ٹوٹ کے چاہا کہ نہ کچھ دھیان رہا
وہ بھی حیران کہ ایسا کبھی دیکھا نہ سُنا

اِس طرف دشت ہے غربت کا، اُدھر شہرِ ملال
کیسے دوراہے پہ اک شخص، مجھے چھوڑ گیا

میں تو نا عاقبت اندیش تھا، میرا کیا ذکر!
احتیاط اُس کی ادا تھی، اُسے کیوں روگ لگا

شمعِ غم دیدہ بتا، کیوں ترے پروانے نے
صبح سے پہلے تری گود میں دم توڑ دیا!

غزل

مومن خاں شوق بی۔ کام

جب کسی کا خیال آیا ہے
کیف سا کیف دل پہ چھایا ہے

حادثوں کو دُعائیں دیتا ہوں
غم نے جینا مجھے سکھایا ہے

اُس نے دکھلا کے اک جھلک ایسی
شوقِ دیدار کو بڑھایا ہے

کل تھا دِل کے قریب غم اُن کا
آج اُن کو قریب پایا ہے

شوق احسان مندِ غم ہوں میں
شعر کہنا مجھے سکھایا ہے

غزل

غلام محمد انور بسلوڈی

اپنی نظر میں آپ کو ڈھونڈھا کریں گے ہم
آئینہ رکھ کے سامنے دیکھا کریں گے ہم

کُنجِ قفس کے سامنے صحنِ چمن بھی ہے
نظارۂ بہار تو دیکھا کریں گے ہم

تدبیر نے کئے ہیں بلند اپنے حوصلے
تقدیر جو دکھائیگی دیکھا کریں گے ہم

لے دے کے آسرا ہے فقط تیری ذات کا
ٹھکرا دیا جو تُو نے تو پھر کیا کریں گے ہم

اشکوں کی روشنی سے شبِ غم کی تیرگی
انورؔ بہ ذوق و شوق مٹایا کریں گے ہم

غزل

سید ارشاد حمید ایم۔ اے

یاد کی جب برکھا آجائے بادل بن کر غم چھا جائے
نقشِ ماضی موج کی صورت بنتا جائے مٹتا جائے
یہ جیون بس ایک دِیا ہے جب تک بھی یہ جلتا جائے
کیسی اُداسی پھیل رہی ہے
آؤ یہ منظر دیکھا جائے

بیسویں صدی دہلی اپریل ۱۹۶۳ء

مُلک کے مایۂ ناز ادیبوں کے لکھے ہوئے نئے شاہکار ناول

جنھیں ادارۂ "بیسویں صدی" نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے

ایک بے حد دلچسپ، مسرت انگیز اور صحت مند رُومانی تخلیق جس کی ہر سطر سے چاندنی راتوں کی پُر بہار فضائیں اور حیات بخش زندگی کی رعنائیاں نغمہ بار ہیں۔ اُن مَردوں کی کہانی جو عورت کو ایسے عُریاں انداز میں دیکھنے کے تمنائی ہیں جس پر سے نظریں پھسل پھسل جائیں۔ اپنی اُجڑی ہوئی تہذیب کی دھڑکنوں کا درد لئے، اپنی تلخ اور شیریں یادوں کے رنگین نقوش اُبھارنے والے ایک ایسے نوجوان کی حقیقت افروز کہانی جس کے ہاتھوں نے عورت کو حُسن بخشا اور لباس پہننا سکھایا تھا لیکن سماج کے ٹھیکیداروں نے اُسے ننگا کرنے کے لئے مجبور کیا۔ اعلیٰ کتابت و طباعت۔ نفیس ولایتی کاغذ۔ قیمت فی جلد صرف دو رُوپے۔

پیاسے بادل

جنم جنم کی پیاسی ایک پہاڑی دوشیزہ کے پیار کی کہانی جو اپنی محبت اور محبوب کی تلاش میں بار بار پہاڑی وادیوں میں جنم لیتی رہی۔ ایک حسّاس نوجوان کی داستانِ محبت جس نے اپنے بڑے گھرانے کی رنگینیاں، رعنائیاں اور مسرت کوشیاں چھوڑ کر رُومان پرور وادیوں کی خاموش کہانیوں کو اپنایا تاکہ اپنی محبوبہ کی شبنمی سانسوں سے اپنے تشنہ خیالوں کی پیاس بُجھا سکے۔ پاکیزہ اور دلآویز رُومان کی ایک درد انگیز داستان ہے۔ پہاڑی رُومانوں کے ترجمان نے ایک بار پھر پہاڑی دوشیزاؤں کی پیار بھری مسرتوں اور حسرتوں کو "پیاسے بادل" میں سمویا ہے۔ دیدہ زیب کتابت و طباعت۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے ۵۰ پیسے۔

آج کی بات

آپ کے محبوب افسانہ نگار جناب جگدیش بمل کے دلچسپ بلند پایہ رُومان پرور افسانوں کا حسین مجموعہ جس کے افسانے آج کے سماج، آج کے معاشرے اور آج کے ماحول کی رنگینیوں، مسرت کوشیوں اور اُلجھنوں کی ایک ایسی تصویر ہے جس کے خدوخال کو حقیقت کی ایک دلچسپ ترتیب دیا گیا ہے۔ آپ ان میں بسے ہوئے قہقہے اور چٹپٹے قہقہے ان میں سسکتی ہوئی آہوں کو اپنی آہیں اور ان کے کرداروں کی پلکوں پر لرزتے ہوئے آنسوؤں کو اپنے آنسو سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ قیمت فی جلد صرف [illegible] روپے۔

بھیگی راتیں

فرانس کے عدیم المثال ناول نگار ایمل زولا کا عظیم ترین ناول جسے عالمی ادب میں بلند ترین مقام حاصل ہے۔ اس ناول کا انگریزی، جرمن، اطالوی، روسی، چینی، جاپانی اور دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور اس کی پانچ کروڑ سے زائد جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔ اس ناول کی انگریزی اور فرانسیسی زبان میں فلمیں بن چکی ہیں جنھیں کروڑوں انسانوں نے دیکھا اور عش عش کر اُٹھے۔ مترجم محمود جالندھری۔ نظر فریب گرد پوش، دیدہ زیب کتابت و طباعت، قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

فرانس کے عظیم ترین ناول نگار ابیے پریوو کا غیر فانی شاہکار

راہیں شباب کی

- جس کا ترجمہ دُنیا کی تمام زبانوں میں ہو چکا ہے۔
- جس کی دس کروڑ جلدیں فروخت ہو چکی ہیں۔
- جسے عشق و محبت کی بے نظیر داستان تسلیم کیا جاتا ہے۔
- جسے اُردو میں پہلی مرتبہ ادارۂ بیسویں صدی نے شائع کیا ہے۔
- جس کی اشاعت پیرس کے رنگین ماحول میں ایک زلزلہ [illegible]
- جسے نوخیز لڑکیاں ہی نہیں بڑے بھی [illegible]

عشق و محبت کا جاوداں افسانہ جس کے سامنے [illegible] لیلیٰ مجنوں [illegible] قصے [illegible] ہیں۔ اس ناول کا ہر [illegible] مترجم جناب محمود جالندھری۔ نظر فریب کتابت و طباعت قیمت فی جلد صرف [illegible] روپے

پتھر کا قلب

[illegible]

قیمت [illegible] روپے

پتہ: [illegible] بیسویں صدی۔ دریا گنج۔ دہلی

ایک لَو لیٹر

فکر تونسوی

میری جانِ بہارِ خزاں!

پرسوں جب تم اپنے بچوں کی قطار باندھے "نیشنل گڑیا گھر" کی طرف بڑھ رہی تھیں تو بالکل کمانڈر انچیف معلوم ہو رہی تھیں۔ بے اختیار میرا جی چاہا تھا تمہارے ڈسپلن کی داد دوں کہ یہ بچے کس حسنِ ترتیب سے، عالمِ وجود میں آئے ہیں! ایسا معلوم ہو رہا تھا بچے نہیں جا رہے ہیں، سیڑھیاں جا رہی ہیں جو پے بہ پے بلندی کی طرف بڑھ رہی ہیں۔

اور میں تمہیں روک کر مسکرا دیا تھا۔ پوچھا تھا

"منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی"

تم نے ایک پوپلی مسکراہٹ سے جواب دیا تھا۔ "اب تو مسافر تکان سے چور ہو گیا ہے۔ یہی چھ بچے کافی ہیں اور وہ سامنے رہی میری منزل ...."

یہ کہہ کر تم نے گڑیا گھر کی طرف اشارہ کر دیا تھا ——— اتنا خوب صورت فقرہ سن کر حیرت ہوئی۔ تم تو کافی احمق تھیں۔ برا مت ماننا ڈارلنگ! حسن اگر احمق نہ ہو تو کافی مشکوک ہوتا ہے۔ تم میں حسن ضرور تھا، شعریت نہیں تھی۔ یاد ہے میں نے تمہیں ایک بار کہا تھا، چلو، تمہیں ایک مشاعرے میں لے چلوں، تو تم نے اپنی گلابی ناک سکوڑ کر کہا تھا۔ "نہیں، سنا ہے، مارکیٹ میں اسمگلنگ کی جاپانی ساڑیاں آئی ہیں چلو ان کا بھاؤ پوچھ آئیں۔"

لیکن پرسوں مجھے بڑا شاک لگا۔ جب تم نے ڈاکٹر اقبال کے شعر کا جواب میر تقی میر کے لہجے میں دیا۔ میرا خیال تھا، تم نے اپنی حماقت کا سٹیٹس کو، ابھی تک قائم رکھا ہوگا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے شادی کے بعد تمہارا حسن مر گیا، شعریت زندہ ہو گئی۔ شاید چھ بچوں کے بعد ہی انسان شعر سمجھنے کے قابل ہوتا ہے ——— شاک کی بات تو تھی ہی۔

پیاری! پچیس برس کی ایک طویل شبِ فراق تھی، جو میرے اور تمہارے درمیان گزر گئی۔ لیکن کبھی تمہیں لو لیٹر لکھنے کا خیال نہ آیا۔ فرصت ہی نہ ملی۔ لیکن اس دن تمہیں گڑیا گھر میں دیکھ کر ایک خیال آیا کہ ہجر کی اس لمبی رات میں ہم دونوں کی صورت اور خصلت میں خاصا انقلاب آگیا ہے۔ اگر لوگ آج ہمیں ایک ساتھ میونسپل پارک میں بیٹھے، مونگ پھلیاں کھاتے دیکھیں تو انہیں ہم پر بہن بھائی کا گمان ہونے لگے۔

محبوبِ دل نواز! مونگ پھلیاں تو ہم اُس وقت بھی کھاتے تھے، جب تمہاری بلوریں انگلیوں سے ایک نشیلا سینگ سا آتا تھا اور وہی سینگ میری آواز میں سرایت کر جاتا تھا اور دیپک راگ بن کر ملتا تھا۔ تمہیں یاد ہے ایک بار تمہاری انگلی میں چھوٹا سا کانٹا چبھ گیا تھا تو کائنات کی ساری موسیقی جیسے ایک دم گونگی ہو گئی تھی۔ ایک دھیمی دھیمی سی خاموش سی بے چینی چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ مونگ پھلیوں سے لے کر چمپی تیل مالش کرنے والے چیتے رام تک میں ——— اور میں نے تمہارے کانوں کے جھمکے کو ایک رومانٹک سا ہلکورا دے کر کہا تھا۔ "نیپالن! جانتی ہو۔ تمہاری وجہ سے یہ تمام بحر و بر دکھی ہو رہے ہیں۔"

اور تم نے پوچھا تھا "یہ بحر و بر کیا ہوتا ہے؟"

میں نے اسی موڈ میں جواب دیا تھا۔ "یہ جاپانی ساڑیوں کے دو دوکانداروں کے نام ہیں اور یہ سب دکھی ہیں"

"کیوں؟ میں تو ساڑیوں کے کسی دکاندار سے نہیں لڑتی۔ انہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچاتی۔"

"تم پہنچاتی ہو۔ جب محبت کی گلابی انگلی سے لہو کا ایک قطرہ بہتا ہے تو آوازوں، نغموں، مسکراہٹوں، خوشبوؤں اور لذتوں سب کو تکلیف پہنچتی ہے۔ سب کی رگوں میں کانٹے چبھ جاتے ہیں، سبھی خلش سے کراہنے لگتے ہیں۔"

اور پیاری! تم (ایک بار پھر معاف کرنا) میری طرف الوؤں کی طرح دیکھنے لگی تھیں اور کہا تھا۔ "نہ جانے تم کیا کہہ رہے ہو مجھے تکلیف ہو رہی ہے فوراً کسی ڈاکٹر کے پاس مرہم پٹی کے لئے لے چلو۔"

"چاہتا ہوں۔ مجھے دو چار سیکنڈ شاعری تو کرنے دو۔"

"اگر شاعری کرنی تھی تو مجھ سے کیوں محبت کی تھی؟"

"محبت کسی سے بھی کی جائے۔ اُس میں شاعری ضرور کرنی پڑتی ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا، یہ گلابی پوریں میرے شعر کو بے وزن کر دیں گی چلو ڈاکٹر کے یہاں تمہاری مرہم پٹی کروا دوں۔"

پھر میں نے تمہاری زخمی انگلی کو بوسہ دے دیا تھا۔ یہ بوسہ تمہاری سمجھ میں فوراً آ گیا تھا۔ تم جذباتی ہو گئی تھیں اور اِدھر اُدھر دیکھ کر اپنی نئی، مرمریں نارنجی چوڑیوں والی باہیں میری گردن میں حمائل کر دی تھیں۔ جب بھی تمہارے اندر پیار کے لمحے دھڑکنے لگتے تھے تم احتیاطاً اِدھر اُدھر دیکھ لیتی تھیں کہ کوئی کوا، کوئی چوہا، کوئی مرغا تو نہیں دیکھ رہا، بد خدانخواستہ

- کوئی معاملہ درپیش ہو تو پہلے ہی اُس کے انجام و عواقب پر غور و فکر کرنا چاہیے تاکہ بعد میں تاسف نہ ہو۔ (حضرت محمد بن حنیفہؒ)
- علم سے زیادہ کوئی چیز عزت بخشنے والی نہیں۔ بادشاہوں کی حکومت لوگوں پر ہوتی ہے، علماء کی اُن بادشاہوں پر۔ (حضرت ابوالاسود دولیؒ)
- میں نے کسی کو نہیں دیکھا کہ اُس نے دنیا چاہی ہو اور اُسے آخرت بھی مل گئی ہو، لیکن جو آخرت کا طالب ہوتا ہے بسا اوقات اُسے دنیا بھی مل جاتی ہے۔ (حضرت خواجہ حسن بصریؒ)
- اگر تم چاہتے ہو کہ نعمت کا زوال نہ ہو، تو نعمت کا شکر ادا کرتے رہو۔ (شیخ ابو یعقوب بن اسحٰقؒ)

تمہارے ڈیڈی کے پاس جا کر رپورٹ کر دے۔ تم اس دنیا میں اپنے ڈیڈی سے ڈرتی تھیں یا میرے عشق سے! کہ کاش! یہ عشق بیاہ تک زندہ سلامت رہے۔

بہرکیف میری کثیر الاطفال محبوبہ! نو ٹیڈ لکھتے لکھتے میں بغیر کسی معقول وجہ کے عاشقانہ لب و لہجے میں ڈوب گیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ عشق میں کسی معقول وجہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن ماضی کی یادوں نے میرے اندر کے مُرجھاتے ہوئے عاشق کو ایک پل کے لئے پھر زندہ کر دیا۔ یادیں اور محبوبہ چاہے کتنی ہی کیوں نہ ہوں اپنا جادو جگائے بغیر نہیں رہتیں اور پھر پیاری! عاشق چاہے چھ بچوں کا باپ ہو جائے۔ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔ باپ بن جانے سے یادوں کا حُسن مر نہیں جاتا...... ورنہ

یہ نوٹیڈ تو ایک اور مقصد کے لئے تھا۔ اُس دن گویا گھر میں تم نے ایک رسمی سا سوال کیا تھا۔ "سناؤ آج کل کیسے گذر رہی ہے؟"

اور میں نے بھی رسماً مُسکرا کر کہا تھا۔ "اچھی گذر رہی ہے۔"

لیکن نیپالن ڈارلنگ! ہم دونوں کے رسمی لہجے کے پیچھے چھپی ہوئی برسوں کی تھکان تھی۔ تم اپنی گرہستی زندگی کی بے کیف ساعتوں سے بور ہو کر اس لمحے کی طرف لپکنا چاہتی تھیں۔ جو تمہاری اور میری زندگیوں میں سے پچیس برس پہلے نکل گیا تھا۔ لیکن ہمارے اُس لپکنے میں ایک درماندگی سی تھی۔ میری رسمی مسکراہٹ میں درماندگی سی تھی۔ وہ لمحہ تمہارے اور میرے لہجے میں ایک پل کو چمکا اور پھر مر گیا۔ شاید یہ اُس کی دوسری موت تھی۔ یا شاید اُس کی قطعی موت تھی۔ اُکتا دینے والی لمبی ازدواجی زندگی میں وہ لمحہ ہم دونوں کے کسی گوشے میں پڑا، پڑا اونگھتا رہا۔ مرا رہا۔ لیکن یہ اُس کی ادھوری موت تھی۔ اس لئے وہ اپنی موت کی تکمیل کے لئے زندہ رہا اور اُس دن.........

.... ہاں اُس دن وہ لمحہ راکھ میں سے آخری، ناتواں، نیم مُردہ چنگاری کی طرح چھن بھر کے لئے چمکا اور پھر ہمیشہ کے لئے بجھ گیا لیکن بجھتے وقت جیسے میرے عشق کی لاش میں گدگدی سی کر گیا۔ یہ نوٹیڈ وہی گدگدی ہے۔ ایک ایسی گدگدی جس میں ایک موہوم سی اُمید مضمر ہے کہ شاید .... ہاں شاید ہماری محبت ایک بار پھر جوان ہو جائے۔

کتنی خام خیالی ہے میری۔ نہ جانے تمہاری ناقص سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ نہیں کہ عشق کسی بھی منزل پر ہو، خام خیالی کے بل بوتے پر ہی اپنی دھڑکنیں قائم رکھتا ہے۔ ورنہ محبت کی جوانی تو ایک ایسے مُردے کی نوحہ خوانی ہے جسے کوئی بھی مسیحا لوٹا نہیں سکتا۔

نیپالن ڈارلنگ!

عین ممکن ہے۔ تم میرے متذکرہ بالا خیالات کو ایک بے معنی تبسم میں اُڑا دو۔ کیونکہ ہو سکتا ہے تمہارے سوال میں نہ گہرائی ہو نہ جذبہ نہ لطافت۔ گرہستی زندگی ان سب چیزوں کو آہستہ آہستہ قتل کر دیتی ہے۔ اس لئے تمہارے سوال میں ایک سطحی سی رسم موجود ہو اور کچھ بھی نہ ہو۔

"سناؤ آج کل کیسے گذر رہی ہے؟"

لیکن میری ٹریجڈی (جس کا علم تمہیں کبھی نہ ہو سکا) ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ میں تمہاری ہر رسمی بات، ہر معمولی حرکت، ہر بے معنی لہجے کو اپنے ہی مفہوم کا جامہ پہنا دیا کرتا ہوں۔ تاکہ میرے عشق میں جان پڑ جائے، وہ پہلے کا اُس

میں حسن اور لطافت پیدا ہو جائے۔ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں تم سے نہیں اپنے آپ ہی سے عشق کر رہا ہوں۔ تم میری محبوبہ نہیں تھیں، ایک ذریعہ اپنے عشق میں دیوانگی پیدا کرنے کا ذریعہ! جیسے پھولوں میں خوشبو پیدا کرنے کا ذریعہ۔ تمہاری وجہ سے میری لہروں میں رقص پیدا ہو جاتا تھا، میرے ستاروں میں چمک پیدا ہو جاتی تھی میری آواز میں نغمہ جنم لے اٹھتا تھا اور تم سمجھتی تھیں میں تم سے عشق کر رہا ہوں۔ لیکن تم اتنا بھی نہ سمجھ پائی تھیں کہ ذریعے سے کوئی عشق نہیں کرتا۔ تم میرے لئے میرے اندر کے تڑپتے ہوئے عاشق کے اظہار کا ایک بہانہ تھیں۔ اگر تم نہ ہوتیں تو کوئی اور ہوتی۔ کوئی بنگالن، کوئی پنجابن، کوئی بہارن، کوئی بھی کملا، ارملا، نیلا میرے اظہار کا بہانہ بن سکتی تھی۔

کیا میری اس راست گفتاری سے تمہیں تکلیف پہنچی؟ لیکن ڈارلنگ! کیا کروں۔ میں اگر اب اس راست گفتاری سے کام نہ لیتا تو مجھے سخت تکلیف ہوتی، اور پھر ہم عشق کی اس منزل پر پہنچ گئے ہیں جب زندگی کا سارا سسپنس ختم ہو چکا ہے اور سچ کہہ دینے سے کوئی بھی اچھا یا برا تاثر پیدا نہیں ہو سکتا۔ پچیس برس کی ازدواجی حیات نے ہمارا سارا رس نچوڑ لیا ہے۔ ہم بغیر رس کی پھانکیں ہیں اور سماج چوسی ہوئی پھانکوں میں برائی بھلائی نہیں دیکھتا۔ انسان ہر طرح کے جذبے اور تاثر سے محروم ہو جائے تو اُسے سچ بول دینا چاہیئے

جانِ من نیپالن! تم نے اچھا کیا کہ اُس بے رنگ سرکاری کارندے کانتی لال سے بیاہ کر لیا کیونکہ اُس میں کئی خوبیاں تھیں۔ مثلاً وہ بال بچے پیدا کر کے سماج میں معزز کہلانا چاہتا تھا، ہر مہینے چند کرنسی نوٹ لا کر تمہارے پرس میں ڈال سکتا تھا تاکہ تم اُن سے اناج، گھی، تیل اور بچوں کی نیکریں لا سکو۔ میں نے سنا ہے، کہ عشق کے بعد یعنی بیاہ کے بعد تم مندر میں بھی جانے لگی تھیں اور کانتی لال نے تمہیں کبھی منع نہیں کیا۔ بچے گاڑیاں، سبزی منڈی کے تازہ ترین ریٹ، نت نئی ساڑیوں کے ڈیزائن، ریڈیو سیٹ، صوفہ، ریفریجریٹر، یہاں تک کہ صبح چھت پر جا کر چڑیوں کو دانہ دنکا ڈالنے میں بھی ——— یعنی اپنی عشق تم کی ہر چیز کے متعلق کانتی لال کا نقطۂ نگاہ بے حد تازہ اور صحت مند تھا۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میرے اندر یہ صلاحیتیں موجود نہیں تھیں۔ میں کسی بھی عورت سے بیاہ کر کے اِن صلاحیتوں کو بیدار کر سکتا تھا اور میری موجودہ چھ بچوں کی مادرِ محترم بڑے فخر سے اِس کا اعتراف کرتی ہے کہ میرے اندر یہ صلاحیتیں موجود تھیں جو اُس کی وجہ سے بیدار ہو گئیں۔ نیپالن ڈارلنگ! اگر میں تم سے بھی بیاہ کر لیتا جس کا اظہار تم نے کئی بار مجبوبانہ لمحوں کو روک کر کیا تھا تو تم بھی میری یہ صلاحیتیں بیدار کر سکتی تھیں۔

لیکن میں تم سے بیاہ نہ کر سکا کیونکہ میں تم سے صرف عشق کرتا تھا۔ عشق کے خوبصورت لمحوں کو جو بھی رنگ دیتا وہ میری جذباتی موت کا باعث بنتا اور میں تمہیں چاہتا تھا کہ تم میری موت کا باعث بنو۔ کیونکہ تم مجھ سے عشق کرتی تھیں۔ میرے لئے موت کا اعلان نہیں تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ تمہیں مایوسی ہوئی ہے میرا انکار تمہیں کانتی لال کے پاس لے گیا تھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ بنیادی طور پر تم محبوبہ نہیں ہو۔ بلکہ عزت گرہستی عورت بننے کے لئے ہی محبت کر رہی ہو۔ جب تمہارا عشق اِس گرہستی جذبے کی منزل تک پہنچا میں یہی سمجھا کہ اب تم دانائی کی تمنا کرنے لگی ہو۔ تمہارے عشق کے لمحے مختصر تھے اور اب اپنے فطری انجام تک آ پہنچے ہیں۔ اِس لئے تمہیں ہنسی خوشی، اناج، آلو، شاپنگ، بال بچوں کے جہنم کی طرف جانے کی اجازت دے دوں۔ کیونکہ میں نے تم سے کئی بار کہا تھا۔

- وہ لوگ مایوسی کا شکار ہوتے ہیں جو بدی کی وجوہ نہیں سمجھتے، اُس سے باہر نکلنے کا راستہ نہیں جانتے، جدوجہد نہیں کرتے۔ (لینن)
- اُمید کا دوسرا نام غریبوں کی قوت ہے۔ (بیکن)
- زندگی کی مصیبتیں ہلکی کرنا چاہتے ہو تو زیادہ سے زیادہ مصروف و مشغول رہو (والٹیر)
- ہم دولت سے نعمتیں حاصل کر سکتے ہیں دوست نہیں۔ (بقراط)
- صبر تلخ ہے لیکن اُس کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ (روسو)
- ضبط اور محنت انسان کے دو اعلیٰ ترین معالج ہیں۔ محنت سے بھوک تیز ہوتی ہے، ضبط کھانے سے روکتا ہے۔ (روسو)

تمہاری خوشی ہی میری خوشی ہے!

اور یاد کرو جس دن تمہاری ڈولی روانہ ہوئی میں نے اُس پر پھول برسائے تھے۔ کیا کوئی عاشق اتنی فراخ دلی کر سکتا ہے؟ سنا ہے ایسے نازک موقعوں پر تو وہ خودکشی کر لیتے ہیں۔

لیکن میں نے خودکشی کی بجائے ایک اور لڑکی سے بیاہ کر لیا بالکل تمہارے جیسی لڑکی تھی۔ صرف نام ذرا سا مختلف تھا۔ لیکن نام رکھنا تو ماں باپ کے اختیار میں ہوتا ہے۔ خاوندوں کے نہیں۔ خاوند تو ریفریجریٹر، گوبھی، نیکریں اور بال بچوں کے لئے دنیا میں قائم رکھے جاتے ہیں۔

قصہ مختصر نیپالن ڈارلنگ! ہم نے عشق کیا۔ جو پچیس برس بعد احمقانہ

معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مجھے اِس بیوگاری کا افسوس نہیں۔ اُمید ہے، تمہیں بھی نہ ہوگا۔ کیونکہ حماقت تو عشق کے نصیب میں ازل سے لکھ دی گئی تھی۔ لیکن ہم دونوں نے دانش مندی یہ دکھائی کہ شادیاں کریں۔ بال بچے، اناج اور گوبھی کی آغوش میں چلے۔ نہ خودکشی کی نہ رُسوا ہوئے اور نہ ہمارے عشق کے قصے ادب میں مشہور ہوئے۔ بعض لوگ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے عشق کی ہسٹری کو مسخ کیا۔ عشق کی حسین روایات پر چھری رکھ دی۔ لیکن ڈارلنگ! ہم شاید روایات توڑنے کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ روایات توڑنا ہر عاشق کے بس کا کام نہیں ہوتا۔ ہم اُن خاموش لیکن دُور اندیش عاشقوں کے قافلہ سالار تھے۔ جن کی دنیا میں اکثریت ہوتی ہے۔ ہم اکثریت کے نمائندے ہیں۔ عشق میں جل مرنا، یا ڈوب مرنا ضروری نہیں ہوتا۔ ہمارا طویل ہجر اناج اور گوبھی کی تلاش میں گزر گیا۔ اور سچ مانو، تو انسان اناج اور گوبھی کے لئے پیدا ہوتا ہے اور عشق تو اِن دونوں چیزوں سے فرار کا نام ہے۔ یہ فرار جتنا مختصر اتنا ہی نیچرل ہوتا ہے۔

لیکن ڈارلنگ! تو لیٹر ختم کرنے سے پہلے ایک دلچسپ مگر مضحکہ خیز حادثے کا ذکر ضرور کرنا چاہتا ہوں۔ کل ایک سینما ہال میں میرا نوجوان بیٹا ایک لڑکی کے گلابی پوروں والے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے کہہ رہا تھا——

"نیپالن! جب تم مشرقی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی ہو تو کائنات کی سانس رُک جاتی ہے!"

جانِ من! میں تم سے صرف اتنی التجا کرنا چاہتا ہوں کہ تم اپنی بڑی لڑکی سے ذرا استفسار تو کرو تاکہ کہیں کوئی لڑکا تمہیں نیپالن کے نام سے تو نہیں پکارتا؟"

میں یہ اِس لئے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کم بخت تاریخ کو دُہرائے جانے کی پرانی عادت ہے۔ چاہے یہ تاریخ عاشقوں کی ہو یا بادشاہوں کی۔

رسالہ نہ ملنے کی شکایت

دو مرتبہ پتے چیک کرنے کے بعد بیسویں صدی ہر ماہ باقاعدگی سے سپرد ڈاک کیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود شکایتی خطوط موصول ہونے پر رسالہ دوبارہ بھیج دیا جاتا ہے۔ ۲۵ تاریخ کے بعد شکایتی خطوط موصول ہونے پر دوبارہ پرچہ بھیجنے سے ہم معذور رہتے ہیں۔ رسالہ نہ ملنے کی شکایت محکمۂ ڈاک سے بھی کیجئے۔

(منیجر)

آئینۂ اصلاح

حضرت جوش ملسیانی کی شاگردوں کے کلام پر اصلاحیں مع توجیہ۔ کتاب زبان و بیان کے نکات سمجھنے کیلئے بے بہا نسخہ ہے۔ قیمت۔ پانچ روپے۔

پوسٹ مارٹم

جناب عرش ملسیانی نے مزاحیہ نثر کا ایک معیاری نمونہ اِس کتاب کے انشائیوں میں پیش کیا ہے۔ قاضی عبدالغفار مرحوم ایسے مستند ادیبوں نے اس کی داد دی تھی۔ قیمت صرف تین روپے فی جلد۔

جنون و ہوش

ابوالفصاحت جوش ملسیانی کا مجموعہ جس کا دوسرا ایڈیشن ختم ہو رہا ہے۔ ارفع و اعلےٰ کلام، ٹکسالی زبان اور بلند خیالات۔ یہ کتاب یونی ورسٹی کے اعلےٰ ترین امتحان میں کئی سال کورس میں رہی ہے۔ قیمت صرف چار روپے۔

شرارِ سنگ

عرش ملسیانی کے وجد آفریں کلام کا حسین و جمیل مجموعہ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے اس کی بہت داد دی تھی۔ خواجہ غلام السیدین۔ فراق۔ ڈاکٹر مسعود حسین اور اردو کے اکابر نے اِس کی بہت تعریف کی۔ قیمت آٹھ روپے۔

اُردو کی مزاحیہ شاعری (انتخاب)

اِسے جناب عرش ملسیانی نے مرتب کیا ہے۔ کتاب ہاتھوں ہاتھ نکل رہی ہے۔ ہندوستان و پاکستان کے نئے اور پرانے مزاح نگاروں کا کلام اور حالاتِ زندگی درج ہیں۔ قیمت آٹھ روپے۔

رُوحِ افکار

جناب واجد سحری نے ہند و پاک کے جدید شعراء کے کلام میں سے سینکڑوں مختلف موضوعات پر بہت حسن و خوبی سے منتخب افکار کا یہ مجموعہ کئی سال کی کاوش سے مرتب کیا ہے۔ جس میں ایک ہزار سے زائد اشعار ہیں۔ سائز بڑا، کتابت عمدہ، طباعت نفیس، سرورق دیدہ زیب۔ قیمت چھ روپے۔ محصول ڈاک علاوہ۔

ریگِ رواں

جناب رتنی پٹیالوی کا مجموعۂ کلام۔ مطلع تا مقطع مرصع غزلوں کے ہر شعر میں تغزل کی شان جلوہ گر ہے اور ہر شعر آئینہ دارِ معراجِ فکر و فن ہے۔ اعلیٰ پایہ کی کتابت، دیدہ زیب طباعت نیز منقش گرد پوش سے آراستہ یہ غزل دستہ ہر لائبریری کی زینت بننے کے قابل ہے۔ قیمت صرف چھ روپے۔ محصول ڈاک علاوہ۔

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۶

صحت و زندگی

۱۔ پپیتہ ۔۔ ایک مفید پھل

اِس کا مزاج گرم و تر ہے۔ قبض کُشا ہے۔ جگر اور آنتوں کو طاقت بخشتا ہے۔ غذا کو ہضم کرتا ہے۔ بھوک لگاتا ہے۔ جسم سے ریاح خارج کرتا ہے۔ آنتوں میں کیڑے ہوں تو اُنھیں ہلاک کرتا ہے۔ گُردہ و مثانہ میں پتھری ہو تو اُسے توڑ کر نکالتا ہے۔

پپیتہ بدن کو غذائیت دیتا ہے۔ بدن کی پرورش کرتا ہے۔ کیمیائی تجزیہ و تجربہ کرنے پر اِس میں غذائی اجزاء، مفید نمکیات اور وٹامنز اے، بی، سی پائے گئے۔ پکے پپیتے میں جو وٹامن اے ہوتے ہیں وہ بچوں کی نشوونما کے لئے اور اُن کی ہڈیوں کو مضبوط کرنے اور عام جسمانی کمزوری کو دُور کرنے کے لئے خاص طور پر فائدہ بخش ہیں۔ یہ وٹامن دودھ، مکھن، ملائی، پنیر، انڈے کی زردی، مچھلی اور مچھلی کے تیل میں پائے جاتے ہیں۔ غریبوں کے بچوں کو یہ قیمتی غذائیں کہاں میسّر آتی ہیں۔ غریب اپنے بچوں کو پکا ہُوا پپیتہ کھلا کر اُن کے جسم کی نشوونما کے لئے مفید غذائی اجزاء اور وٹامنز بآسانی مہیا کر سکتے ہیں۔

بچوں ہی کے لئے نہیں بڑوں کے لئے بھی پپیتہ بے حد فائدہ بخش پھل ہے۔ جن لوگوں کا معدہ کمزور ہو، جگر اور تلی بڑھے ہوئے ہوں، قبض رہتا ہو، اُنھیں پپیتہ کھانے سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔ یہ فوائد حاصل کرنے کے لئے پکے ہوئے پھل کو چھیل کر قاشیں کر کے کھانے کے بعد کھانا چاہیئے۔

جن عورتوں کی گود میں چھوٹے بچے ہوں، اُنھیں پکا ہُوا پپیتہ کھلانے سے اُن کا دُودھ بڑھ جاتا ہے۔ پپیتہ کی چٹنی، جیلی اور مُربّہ بھی بہت لذیذ اور مفید ہوتا ہے۔

۲۔ آپ ناکام کیوں رہتے ہیں؟

آپ اپنے دل میں کامیابی کی آرزو رکھتے ہیں۔ دن رات کامیابی سے ہمکنار ہونے کے خواب دیکھتے ہیں۔ اپنے تصوّر میں شب و روز کامرانی کا تاج محل تعمیر کرتے ہیں۔ لیکن آپ کا دامن کامیابی کے پھولوں سے نہیں بھرتا۔ کامیابی کی منزل سے آپ دُور ہی رہتے ہیں ۔۔ آپ نے کبھی سوچا ایسا کیوں ہوتا ہے؟

اِس کا جواب مشہور مفکّر ڈاکٹر نپولین ہل نے دیا ہے۔ اُس نے لکھا ہے ۔۔ "زندگی میں کامیابی کے لئے ایک واضح مقصد کا ہونا ضروری ہے۔ اگر کسی شخص کا واضح مقصد ہے لیکن اُس کے دل میں وہ مقصد حاصل کرنے کا جنون اور اُس کے سر میں وہ کام پُورا کرنے کا سودا نہیں ہے تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ایسا آدمی جو کسی مقصد کے تحت کام کرتا ہے اور زندگی کو بہتر طریقے سے بسر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اُس مقصد کے حصول کے لئے سرگرداں و پریشان رہتا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ اِس کام کا معاوضہ کیا ہے۔ میں کیوں خواہ مخواہ کسی فائدے کے بغیر ایک سائے کے پیچھے بھاگا جا رہا ہوں ۔۔ جیسے ہی یہ تصوّر اُس کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ وہ بلا مقصد اور بلا منافع کام کر رہا ہے تو اُس کا جنون کم، اُس کی رفتار سُست، اُس کا مقصدِ حیات پھیکا اور اُس کا عزم و ارادہ ضعیف ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو انسان کو کامیابی کی راہ سے بھٹکا دیتی ہے اور وہ ناکام رہتا ہے۔"

۳۔ کیا آپ دماغی کمزوری کا شکار ہیں؟

اگر آپ دماغی کمزوری کا شکار ہیں تو اُس کی طرف سے

خلاصہ ہو برتنی چاہئے۔ دماغی کمزوری کی شکایت ہو تو آلو، گوبھی، بینگن، ماس، ماش کی دال اور ترش چیزوں سے پرہیز کرنا چاہئے۔ سگریٹ پینا بھی مُضر ہے۔ سارے دن میں ایک دو پیالوں سے زیادہ چائے بھی نہ پیئیں۔

دماغی کمزوری کا ایک بڑا سبب ناقص غذا ہے۔ غذا کے اوقات میں بے قاعدگی اور بے ترتیبی ہے۔ سارا دن دماغی کام کرنے والوں کو مناسب وقت پر ایسی غذا استعمال کرنی چاہئے جو غذائی اجزاء اور وٹامنز سے بھرپُور ہو۔ اگر ایسا آدمی بے وقت غذا کھائے اور وہ بھی ناقص قسم کی ہو تو ظاہر ہے کہ دماغ کمزور ہو جائے گا۔ دماغی کام کرنے والوں کے لئے آرام اور پُوری نیند ضروری ہے۔ چہل قدمی اور صُبح و شام کی سَیر اور گھاس پر چلنا دماغی کمزوری کے لئے بہت مفید ہے۔

دماغی کام کرنے والوں کے لئے کیلا بہت فائدہ بخش ہے۔ اِس لئے کہ اِس میں فاسفورس کافی مقدار میں ہوتا ہے۔ نہار مُنہ کیلا نہ کھانا چاہیئے۔ کیلا کھانے کے لئے اچھا وقت دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد سہ پہر کا وقت ہے۔

ضعف دماغ دُور کرنے کے لئے یہ عمل بے حد فائدہ بخش ہے ——— مغز بادام سات عدد، خشخاش تین ماشہ، چھوٹی الائچی ایک ماشہ ——— اِن تینوں چیزوں کو سِل پر خوب باریک پیس لیجئے اور تازہ مکھن پانچ تولہ مِلا کر مصری یا چینی سے میٹھا کر کے نہار مُنہ کھانا چاہیئے۔ اِس عمل کو معمول بنا لیا جائے تو دماغی کمزوری کی شکایت کبھی نہ ہو گی۔

۳ ـــ انسان کی سب سے بڑی طاقت

یقین انسان کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ یقین ہی کی طاقت سے انسان ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔

مشہور مفکّر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ——— "یقین ہی کامیابی و کامرانی کی کُنجی ہے۔ جو لوگ اِس راز، اِس حقیقت سے آشنا ہیں دُنیا کی کوئی طاقت اُنھیں ناکام نہیں بنا سکتی۔ اپنی ذات پر یقین و اعتماد رکھ کر ہم ناقابلِ تسخیر قوت حاصل کر سکتے ہیں۔ انسان کی صلاحیتیں محض ذریعہ ہوتی ہیں۔ سچّی طاقت یقین

۴۔ اگر آپ کامیابی و کامرانی کے بلند ترین مقام پر پہنچنا چاہتے ہیں تو اپنی کامیابی پر غیر متزلزل یقین اور اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ رکھئے۔ کامیابی یقیناً آپ کے قدم چُومے گی۔

اگر آپ قادرِ مطلق میں یقین نہیں رکھتے تو آپ ہرگز وہ نہیں بن سکتے جو آپ بننا چاہتے ہیں۔ تب آپ کی دُعائیں خلاؤں میں گونج کر لَوٹ آئیں گی۔ آپ کی بے یقینی ہی آپ کی دُشمن بن جائے گی، آپ کو کامیابی و کامرانی سے محروم رکھے گی۔"

ایک دُوسرے مفکّر ڈاکٹر نپولین ہِل نے لکھا ہے ——— "ایقان خیالات کو زندگی، طاقت اور قوّتِ عمل بخشتا ہے۔ ایقان ناکامی کے خلاف مؤثر عمل اور علاج ہے۔ ایقان انسان کے ذہن کے دروازوں کو کھول دیتا ہے۔ ایقان ہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے انسان اپنی تمام قوتوں کو جمع کر سکتا ہے اور کائنات کو تسخیر کر لیتا ہے۔"

۵ ـــ قُدرت کا سب سے بڑا انعام ـــ صحت

صحت قُدرت کا سب سے بڑا انعام سب سے بڑا عطیہ ہے۔

صحت ہی زندگی ہے۔ صحت نہ ہو تو زندگی تلخ ہی نہیں ہوتی، موت سے بدتر بن جاتی ہے۔ صحت سے محروم لوگوں کو آپ اپنے گرد و پیش دیکھتے ہوں گے جو حسرت سے صحت مند لوگوں کو دیکھتے ہیں۔

مشہور مفکر ڈاکٹر آئزک والٹن نے لکھا ہے ــــــ "اپنی صحت کی دیکھ بھال رکھو۔ اگر خوش قسمتی سے آپ کو صحت میسر ہے تو خُدا کا شکر ادا کرو اور اُسے عقل و شعور کے بعد سب سے بڑی نعمت سمجھو۔ زندگی کے بعد صحت ایک دوسرا انعام ہے جس سے قُدرت نے ہمیں نوازا ہے اور یہ ایک ایسی مسرت ہے جسے دَولت نہیں خرید سکتی۔ اِس لئے اِس کی قدر کرو اور اس پر خُدا کے شکر گُزار رہو۔"

ایک دُوسرے مفکر نے کہا ہے ــــــ "آپ کی عُمر خواہ کچھ بھی ہو، آپ جیسی بھی زندگی گزارتے ہوں، آپ کی ذمہ داریاں بے حد و حساب کیوں نہ ہوں، لیکن قُدرت نے ہر انسان کو صحت مند رہنے کی غیر معمولی صلاحیت عطا فرمائی ہے۔ صحت کا یہ سرچشمہ خود آپ کی ذات میں موجود ہے اور وہ ہے صحت مند رہنے کا پختہ ارادہ ــــــ محتاط زندگی!"

"صحت مند رہنے کے لئے کوئی عُمر کم ہے نہ زیادہ۔ آپ ہر عُمر میں صحت مند رہ سکتے ہیں۔ آپ جس طرح جوانی میں صحت مند تھے، بڑھاپے میں بھی صحت مند رہ سکتے ہیں۔ اِس کے لئے جوانی کی صحت پسندی اور صحت مند رہنے کے لئے قوّت ارادی برقرار رکھنی چاہیئے۔"

٦ ــــ ضبطِ نفس کا دامن نہ چھوڑیئے

ضبطِ نفس کا دامن کسی حالت میں نہ چھوڑنا چاہیئے۔ جو لوگ زندگی کے اِس زرّیں اصول پر عمل نہیں کرتے، زندگی میں بڑے بڑے نقصانات اُٹھاتے ہیں۔ بڑی بڑی مصیبتوں میں مُبتلا ہو جاتے ہیں۔

مشہور مفکّر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ــــــ "جوش و ولولہ ہی انسان کے اندر وہ خصوصیت ہے جو اُسے عمل پر اُکساتی ہے۔ لیکن ضبطِ نفس وہ پہیہ ہے جس کے ذریعہ جوش و خروش کی گرمی کو صحیح مقام پر پہنچایا جاتا ہے تاکہ اُس سے کام لیا جا سکے۔ اگر آپ

> ایسے نام نہاد ماڈرن دَور میں جبکہ ترک جھڑک اور نمود و نمائش ہی کو ادبِ عالیہ سمجھ لیا گیا ہے "بیسویں صدی" کا نیا سالنامہ بدستور اپنی متانت، سنجیدگی اور گہرائی کا حُدی خواں بن کر ادبی قافلے کی رہنمائی کرنے کے لئے اُبھر آیا ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ صرف مُسلّم اور قدیم فنکاروں کی تخلیقات کو جلو میں لئے ہوئے ہے، بلکہ جدید ترین ادیب اور شاعر بھی سالنامے کی بزم میں رونق افروز ہیں۔ قدیم و جدید ادب کا یہ امتزاج الگ الگ غزلوں کی نشاندہی نہیں کرتا۔ بلکہ ادبی روایات کے ایک فطری ارتقاء کو ظاہر کرتا ہے۔ جدید ادیبوں کی آواز میں اپنے پیش رو ادباء کی دھمک صاف سُنائی دیتی ہے۔ سالنامے کی اس جلی محفلِ رنداں میں نیا اندازِ فکر پیش کیا ہے۔ تصویریں، کارٹون اور دُوسرے مقبول فیچر سالنامے میں ایک نئی رعنائی سے جلوہ افروز ہیں . . .
>
> روزنامہ "ملاپ" نئی دِلّی

ایک نارمل انسان یا ایک اعلیٰ درجہ کا انسان بننا چاہتے ہیں تو آپ کو جوش و خروش کے ساتھ ضبطِ نفس کا بھی خیال رکھنا چاہیئے۔ جن لوگوں کے دماغ صحیح تربیت یافتہ نہیں ہوتے اُنھیں یہ عادت بہت نقصان پہنچاتی ہے۔ یہی جذبہ جو بہتر شکل میں اُن کی زندگی میں سنگِ میل بن سکتا تھا، غلط طریقہ سے استعمال کرنے سے غیض و غضب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ قوت جس کے ذریعہ انسان نے ستاروں کو اپنا محکوم بنایا، فضاؤں اور ہواؤں پر اپنا تسلط جمایا، پہاڑوں کو فتح کیا، سمندر کے سینہ میں اُتر گیا، اسی قوت کے غلط استعمال سے وہ اپنے لئے ہزاروں مصیبتیں پیدا کر لیتا ہے۔ اگر آپ کسی جیل میں جائیں اور وہاں کے قیدیوں سے ملاقات کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ آزادی جیسی نعمت سے محروم ہونے اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے میں جوش و خروش کے غلط استعمال کا کتنا بڑا ہاتھ ہے۔ ۹۲ فیصد لوگ اس لئے جیل جاتے ہیں کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اُٹھتے ہیں۔ مشتعل ہو جاتے ہیں۔ ذرا سے واقعہ سے بہت زیادہ متاثر ہو کر بڑے سے بڑا اقدام کر گزرتے ہیں جس کا نتیجہ دائمی تباہی ہوتا ہے۔"

زُلف کے سر ہونے تک

عشق و محبت اور حسن و شباب کی رعنائیوں اور زندگی کی مسرتوں اور حسرتوں کا سنگم۔

تین معصوم بھولی بھالی لڑکیوں اور تین سیدھے سادے لڑکوں کی حسین ترین کہانی جو اپنے لٹے ہوئے ماضی کے زندگی بخش سپنوں کو سنبھالے ہوئے اضطرابِ اطمینان کے تاریک اندھیرے خلاؤں میں وارد ہوتے ہیں اور ——— اُن ہزار ہا بھوکے، کمزور لیکن باہمت ہاتھوں کی کہانی جو تمام دنیا کی افلاس زدہ تاریکیوں کو چاندنی راتوں کا حسن اور حقیقی زندگی کا ابدی نور بخشنا چاہتے ہیں ——— ٹھاکر پونچھی جدید اردو ادب کے مقبول و محبوب ناول نگار ہیں اور زُلف کے سر ہونے تک مصنف کی ایک محبوب ترین تخلیق ہے۔ ایک ایسی دلچسپ داستان جس کے ورق ورق میں آپ کے اپنے دل کی دھڑکنیں چھپی ہوئی ہیں۔ قیمت فی جلد صرف تین روپے۔

- جب سائنس کے بل بوتے پر چاند، مریخ اور دوسرے سیاروں تک پہنچنا بچوں کا کھیل ہو جائے گا۔
- جب مرد نہ صرف عورت بلکہ ماں بن کر اولاد کی پرورش کریں گے۔
- جب پورا نظامِ زندگی حسن و شباب اور مستی و رعنائی کے زیرِ نگیں ہو جائے گا۔
- جب عورت، مرد کے پنجۂ اقتدار سے آزاد ہو کر معاشرے پر چھا جائے گی۔

اُردو ادب میں ایک انوکھا تجربہ۔ حیرت انگیز واقعات پر مشتمل ایک دل فریب ناول

فریدہ موہنی (ناول)

حقیقت اور طنز سے بھرپور عورتوں کے اس دیش کی کہانی جہاں مرد کا تصور بھی ایک جرم تھا۔

صدیوں بعد کی فضاؤں میں لکھی ہوئی عجیب و غریب داستان جو اوّل سے آخر تک دلچسپیوں اور حیرت آفرینیوں سے لبریز ہے۔ جنابِ کوثر چاندپوری کا لکھا ہوا بے حد شوخ دلچسپ ناول جو قاری کو کئی صدی آگے کی فضا میں پرواز کراتا ہے۔ اور نئی زندگی کا سنگِ بنیاد رکھتا ہے۔ انتہائی دلکش اور شگفتہ اندازِ نگارش۔ جاذبِ نظر کتابت و طباعت، بہترین کاغذ، دیدہ زیب سہ رنگا گردپوش۔ قیمت فی جلد محض تین روپے۔

گرمیِ اندیشہ

جنابِ بشیر احمد صوفی کا دوسرا مجموعۂ کلام۔ ان کی شاعری احساس کی شاعری ہے۔ احساس جو لطیف بھی ہے اور شدید بھی۔ صوفی صاحب نے اپنے ذہنی سفر میں جو کچھ محسوس کیا، شعر کے خوبصورت ساز میں ڈھال دیا۔ صوفی صاحب کی شاعری یقیناً فکر و خیال اور اسلوبِ بیان دونوں اعتبار سے تازہ دم ہے۔ کتابت، طباعت اعلیٰ، خوبصورت جلد۔ قیمت پانچ روپے۔

یادوں کے کھنڈر

جس میں اُن معصوم محبتوں کی ناکامیوں اور حسرتوں کی حسین داستانیں بیان کی گئی ہیں جنھوں نے اپنے کمسن خیالوں میں محبت کے حسین جگمگاتے محل تعمیر کیے لیکن حقیقی زندگی میں صرف یادوں کے کھنڈر ہی نصیب ہوئے۔ "یادوں کے کھنڈر" کے دردناک قہقہے، سسکتی ڈوبتی آہیں، خاموش پلکوں پر منجمد آنسو کس کے معاشرے کے وہ گھناؤنے نقوش اُجاگر کرتے ہیں، جو محبت کی موت ہیں اور زندگی کے قاتل۔ ایک ایک سطر میں جذبات اور آرزوؤں کا حسین طوفان مچل رہا ہے۔ دیدہ زیب کتابت و طباعت۔ عمدہ کاغذ، حسین و جمیل سرورق۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

پیاسے بادل

جنابِ ٹھاکر پونچھی کا دلچسپ ناول۔ ایک پہاڑی دوشیزہ کے پیار کی کہانی۔ دلآویز رومان کی ایک دردانگیز داستان۔ قیمت دو روپے پچاس پیسے

پروائی

شکیب للت۔ ایم۔ اے کا تازہ مجموعۂ کلام۔ عمدہ کتابت، بہترین طباعت، خوشنما گردپوش۔ قیمت چار روپے

ساحر ہوشیارپوری کا نغمہ ریز مجموعۂ کلام

سحر نغمہ

سالِ رواں کی حسین و جمیل ادبی تخلیق جس کا اجرا جشنِ ساحر ہوشیارپوری کے موقع پر ۱۵ اگست ۶۰ء کو اُردو کے عظیم ادیب و ماہرِ غالبیات جناب مالک رام صاحب نے کیا۔ وجد آور و کیف آفریں نظمیں، غزلیں، قطعات، رباعیات۔ عمدہ کتابت، خوبصورت طباعت سہ رنگا دلآویز گردپوش۔ و بیز آرٹ پیپر پر مصنف کی متعدد تصاویر سے مزیّن۔ مجلّد۔ اس کے بغیر آپ کی لائبریری مکمل نہیں۔ قیمت دس روپے۔

تصنیفات جناب محروم

کاروانِ وطن	۷/۵۰	بیکراں	۴/۵۰	اندھد	۱/۲۵
بہارِ غزل	۷/۵۰	تاروں کی ندیوں تک	۲/۷۵	ابوالکلام آزاد	-/۲۵
نیرنگِ معانی (نیا ایڈیشن)	۵/۰۰	وطن میں اجنبی	۲/۵۰	رفیع صاحب کے مزار پر	-/۲۵
شعلۂ نوا	۶/۵۰	نوائے پریشاں	۲/۵۰		
بچوں کی دنیا	۴/۵۰	اقبال اور اس کا عہد	۲/۵۰	ماتمِ سلک	-/۲۵
انتخاب کلامِ محروم	۱/۰۰	میرے گذشتہ شب و روز	۱/۲۵	شعلوں کی آواز	-/۲۵
تصنیفات جناب جگن ناتھ آزاد		ماتمِ نہرو	-/۷۵	جگن ناتھ آزاد / اقبال کی شاعری	۵/۰۰
		اجنتا	-/۷۵		
تلوک چند محروم	۴/۰۰	دہلی کی جامع مسجد	-/۲۵	آثارِ محروم	۶/۰۰

رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۶

سوال و جواب

سرگوشیاں

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ دھیان رکھیے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے۔ (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

محمد رفیع احمد سعیدی۔ دھنباد

س۔ اعتماد کس پر کرنا چاہیئے؟

ج۔ جو اعتماد کے قابل ہو۔

س۔ تقدیر کب ساتھ چھوڑ دیتی ہے؟

ج۔ جب انسان صرف تقدیر پر تکیہ کر کے تدبیر کا دامن چھوڑ دیتا ہے اور بے عمل ہو جاتا ہے۔

س۔ انسان شیطان کب بن جاتا ہے؟

ج۔ جب وہ بھول جاتا ہے کہ وہ انسان ہے! زمین پر خُدا کا خلیفہ ہے۔

نکہت نظامی۔ دریاپور، پٹنہ

س۔ عورت کو فساد کا گھر سمجھا جاتا ہے۔ ایسا کیوں؟

ج۔ کم فہم لوگ عورت کو فساد کا گھر سمجھتے ہیں۔ شیکسپیئر نے کہا ہے "عورت خوشبو، نغمہ، رقص اور روشنی کا مجموعہ ہے" ایک دوسرے مفکر گوئٹے نے کہا ہے۔ "انسان کے لئے خُدا کی سب سے قیمتی بخشش عورت ہے!"

س۔ لڑکیاں اپنے آپ کو کمتر کب سمجھنے لگتی ہیں؟

ج۔ جب کوئی بدذوق انھیں بدصورت کہہ دیتا ہے۔

س۔ لڑکیوں کی خوشی کا راز کیا ہے؟

ج۔ ہر لڑکی کے لئے ایک ہی بات نہیں کہی جا سکتی۔ کوئی لڑکی کسی بات سے خوش ہوتی ہے۔ کوئی کسی اور بات سے۔ ہاں اپنے حُسن کی تعریف و تحسین سے ہر لڑکی خوش ہوتی ہے۔

غلام حسین ایم۔ بنسا ولی

س۔ دَورِ حاضر کا انسان اِتنی تیزی سے اخلاقی پستی میں کیوں گرتا جا رہا ہے؟

ج۔ اِس لئے کہ آج کا انسان۔ انسان نہ رہا۔

س۔ انسان کا ضمیر کب جاگتا ہے؟

ج۔ جب اُسے کوئی ٹھوکر لگتی ہے۔

پرویز قادری سیوان (بہار)

س۔ خوشی غم میں کب بدل جاتی ہے؟

ج۔ جب انسان خوشی میں پاگل ہو جاتا ہے۔

س۔ دُنیا کی سب سے خوبصورت عمارت کہاں ہے اور اُسے کس نے تعمیر کروایا ہے؟

ج۔ دُنیا کی سب سے خوبصورت عمارت آگرہ میں تاج محل ہے۔ اُسے شاہجہاں نے تعمیر کروایا ہے۔

ایم۔ ذکی حیا گھاٹ

س۔ سیاستداں اور پہلوان میں فرق بتلایئے۔

ج۔ سیاستداں ایسا پہلوان ہوتا ہے جو اپنے حریف سے ہار کر بھی حوصلہ نہیں ہارتا۔

س۔ بُرائی کا علاج؟

ج۔ بھلائی!

س۔ سب سے ذلیل کام کیا ہے؟

ج۔ دُوسروں کو ذلیل سمجھنا، دوسروں کو ذلیل کرنا!

عبدالمجید بیدل۔ گنج ڈونڈوارہ

س۔ میرا دوست غمگین اور اُداس رہتا ہے۔ اُسے کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ وہ غم کو خوشی بنالیں، ساری اُداسی دُور ہو جائے گی۔

محمد ریاض الدین تبنگانوی۔ جنگاؤں

س۔ فکر تونسوی کا نام اور مذہب کیا ہے؟ یہ کہاں پیدا ہوئے؟

ج۔ فکر تونسوی کا مذہب انسانیت ہے۔ ان کا نام تو آپ جانتے ہی ہیں ـــــ فکر تونسوی! یہ مغربی پنجاب کے ایک مشہور مقام تونسہ میں پیدا ہوئے۔

س۔ کوئی حیات افروز شعر سنائیے۔

ج۔ سُنیئے ؎

زندگی کا راز پانے کے لئے
موت کو آنکھیں دکھانا چاہیئے

ایم۔ اشرف۔ علی گڑھ

س۔ میرے دوست نیاز کہتے ہیں خوشتر گرامی اور آسی رام نگری ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ کیا یہ حقیقت ہے؟

ج۔ خوشتر گرامی اور آسی رام نگری ایک جان دو قالب دو شخصیتوں کے نام ہیں۔

س۔ نیاز صاحب یہ بھی کہتے ہیں۔ چند سال ہوئے "بیسویں صدی" کے سالنامہ میں آپ نے خود ہی تحریر فرمایا تھا ـــــ "آسی رام نگری کا دوسرا نام خوشتر گرامی ہے۔" ذرا سمجھایئے یہ کیا معمہ ہے؟

ج۔ یہ معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا!

محمد ابو صالح۔ لوالگاں۔ سہرسہ

س۔ خوشتر بھیا! دُنیا میں آنے کی خبر تو نو مہینے پہلے مل جاتی ہے۔ لیکن دُنیا سے جانے کی ایک پل پہلے بھی نہیں ملتی۔ ایسا کیوں؟

ج۔ خُدا کی باتیں خُدا ہی جانے!

س۔ حسرت موہانی کا کوئی شعر سُنایئے۔

ج۔ یہ بھی آداب محبت نے گوارا نہ کیا
اُن کی تصویر بھی سینے سے لگائی نہ گئی

فرحت محمود خاں۔ بلرام پور (ایٹہ)

س۔ صورت اور سیرت میں کسے فوقیت دینی چاہئے؟

ج۔ سیرت کو۔

س۔ جس مُلک میں صبح و شام بے ایمان کو "شبھ" بولی جائے اُس مُلک کا انجام کیا ہوگا؟

ج۔ عبرت ناک!

سلیمان خاں پٹھوی۔ ناردی گنج (گیا)

س۔ بھائی جان! کیا امریکہ اور روس والے واقعی چاند پر گئے ہیں؟

ج۔ جی ہاں، یہ حقیقت ہے۔ آج کی دُنیا میں کتنی ایسی باتیں ہو رہی ہیں جن پہ یقین نہیں آتا۔ لیکن وہ حقیقت ہیں۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور کتنی ہی ایسی ایجادیں ہیں۔

س۔ دُنیا میں ہر جگہ لڑائی، جھگڑا، فساد اور فتنے بپا ہیں۔ امن و سکون کہیں نہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟

ج۔ اِس لئے کہ انسان، انسان نہ رہا ؎

آدمی آدمی کے پیکر میں
اور کچھ ہوگا آدمی نہ رہا

س۔ سب سے پہلا اُردو اخبار کس جگہ سے نکلا اور اُس کا نام کیا تھا؟

ج۔ اُردو کا سب سے پہلا اخبار مولانا محمد حسین آزاد نے جاری کیا تھا۔ اس کا نام "اُردو اخبار" تھا۔ کئی تذکروں میں لکھا ہے ـــــ اُردو کا سب سے پہلا اخبار مولوی باقر علی نے دہلی سے جاری کیا تھا۔ اُس کا نام "اُردو اخبار" تھا۔

کمال احمد۔ ڈلیسر گرڈھ، پروان

س۔ اگر محبت کرنا جرم نہیں ہے تو لوگ پیار کرنے والوں کو بُرا کیوں کہتے ہیں؟

ج۔ اس لئے کہ اب ہوس کا نام محبت ہے۔

شمیم۔ چاند پور

س۔ اگر انسان پیہم کوششوں کے باوجود ناکام رہے؟

ج۔ پھر بھی بد دل ہو کر حوصلہ کا دامن نہ چھوڑ دینا چاہئے۔ کامیابی حاصل کرنے کے لئے جدّ و جہد جاری رکھنی چاہئے۔

س۔ "بیسویں صدی" کی بزم میں جگہ پانے کے لئے کتنی تعلیم ضروری ہے؟

ج۔ "بیسویں صدی" کی بزم میں جگہ پانے کے لئے اعلیٰ تعلیم کی کوئی شرط نہیں۔ تخلیق "بیسویں صدی" کے معیار کے مطابق ہونی چاہئے۔

مقصود احمد۔ میدک (آندھرا پردیش)

س۔ چچا جان! فکر؟

ج۔ فکر بہت بری بیماری ہے۔ کسی نے کہا ہے ۔۔۔ چِنتا چِتا تک پہنچا دیتی ہے!

س۔ شاعری انسان کے لئے مفید ہے، یا...؟

ج۔ یہ تو شاعری کا ذوق رکھنے والے پر موقوف ہے۔ شاعری کو اپنے لئے مفید بنالے یا مضر۔

ہردیال کھنّہ۔ نئی دہلی

س۔ ہماری سرکار خاندانی منصوبہ بندی پر بہت زور دے رہی ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں ملک میں پیدائش اور اموات کا کیا تناسب ہے؟

ج۔ ہر روز تقریباً دو کروڑ بچے پیدا [illegible] ہو رہے ہیں اور تقریباً ۸۰ لاکھ اموات ہوتی ہیں۔

س۔ اِس وقت ہمارے ملک کی آبادی کتنی ہے؟

ج۔ ۸۰ کروڑ سے بھی زیادہ!

ناہید اسعد۔ مسقط (عرب)

س۔ روس میں کتنے مسلمان ہیں؟

ج۔ تقریباً ایک کروڑ ۵۰ لاکھ۔

س۔ چین میں کتنے مسلمان ہیں؟

ج۔ ۵ کروڑ۔

س۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد کا کیا تناسب ہے؟

ج۔ ۱۰ فیصد۔

نوشابہ پروین۔ پورولیا (بنگال)

س۔ بنگلہ دیش میں اُردو کا مستقبل؟

ج۔ بنگلہ دیش کی زبان بنگالی ہے۔ وہاں اُردو کے مستقبل کا کیا سوال۔

س۔ کسی سے خلوص سے ملنے پر لوگ اُنگلیاں کیوں اُٹھاتے ہیں؟

ج۔ اِس لئے کہ اب دُنیا میں خلوص کہاں ہے۔

س۔ عورت کی ذرا سی لغزش پر سماج اُسے پستی کے غار میں دھکیل دیتا ہے، لیکن مرد بڑی غلطی کرکے بھی سر بلند رکھتا ہے؟

ج۔ ایسا اِس لئے ہوتا ہے کہ سماج کے اجارہ دار مرد ہیں۔

نکہت سلطانہ۔ مراد آباد

س۔ بھائی جان! کچھ اچھی باتیں بتلایئے۔

ج۔ • کل وہی اچھی ماں بن سکتی ہے جو آج اچھی لڑکی ہے۔

• عقل کی حد ہو سکتی ہے، بے عقلی کی نہیں۔

• غیبت کرنے والا خدا کی بدترین مخلوق ہے۔

• زندگی کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ ہم پریشانیوں میں بھی پریشان نہ ہوں۔

ایم۔ ای۔ ایچ۔ کھرپال بسی پور۔ پورنیہ

س۔ لڑکی کو ماں سے زیادہ محبت ہوتی ہے، یا باپ سے؟

ج۔ ماں سے۔

س۔ جاہل لڑکی؟ تعلیم یافتہ لڑکی؟

ج۔ بہت سی جاہل لڑکیاں تعلیم یافتہ لڑکیوں سے اچھی ہوتی ہیں۔

عمران احمد مضطر۔ برونی

س۔ علامہ اقبال کا کوئی تاثر انگیز شعر سنایئے۔

ج۔ علامہ اقبال کے سارے اشعار تاثر انگیز ہیں۔ موصوف کا ایک شعر سنئے ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

س۔ اُردو ایک زبان نہیں ایک تہذیب ہے۔ اُس کا مستقبل کیا ہے؟

ج۔ یہ اُردو کے چاہنے والوں پر موقوف ہے۔ اُردو کے مستقبل کو تابناک بنالیں یا تاریک۔

[illegible]


سردیوں میں جلد خشک ہو جاتی ہے...
نیویا کے ذریعے
اُسے پُربہار بنائے رکھئے!
اس سال سردیوں میں نیویا کریم استعمال کیجئے
اور پھر دیکھئے آپکی جلد موسم بہار کی طرح
کتنی شگفتہ اور تروتازہ رہتی ہے!
کس نفاست سے نیویا آپکی جلد کو نہایت ملائم
اور حسین بنائے رکھتی ہے! نہ چکناہٹ
نہ چپچپاہٹ نہ تیلیا چمک۔ بدن پر
لگاتے ہی جذب ہو جاتی ہے اور
بڑی خوبصورتی سے آپکی جلد کی پرورش اور
حفاظت کرتی ہے۔ اس لئے اس سال اور ہر سال
نیویا کے سہارے سردیوں کا سامنا کیجئے!
نیویا — جلد کی صحت مندی
اور دلکشی کا راز!

شاہد لہر پوری۔ سیتا پور

س۔ قابلِ اشاعت یا ناقابلِ اشاعت افسانوں کا فیصلہ آپ خود پڑھ کر کرتے ہیں؟

ج۔ جی ہاں۔

س۔ کچھ عنوان بتایئے جن پر ہلکے پھلکے افسانے لکھے جا سکیں۔

ج۔ "گرتے ہوئے" "ڈوبتے ڈوبتے" "اندھیرا اُجالا" "اُجالا ہی اُجالا" "نئی زندگی"۔

محمد ظہیر نظامی۔ دھنباد

س۔ آج کے دور میں ہر انسان خود کو عقلمند، قابل اور ہوشیار سمجھتا ہے۔ ایسا کیوں؟ جب کہ وہ ایسا نہیں ہے۔

ج۔ ایسے لوگ بیوقوف ہوتے ہیں۔

س۔ جامن کے فوائد پر کچھ روشنی ڈالئے۔

ج۔ جامن ہاضم، اشتہا آور اور مقوی معدہ ہے۔ دانتوں کو مضبوط کرتی اور خون صاف کرتی ہے۔ معدہ، جگر اور طحال (تلی) کو قوت بخشتی ہے۔ ذیابیطس اور مثانے کی کمزوری کے لئے فائدہ مند ہے۔

شمیم احمد جعفر پوری۔ کلکتہ

س۔ آپ کی نظر میں بنگال کا سب سے بڑا شاعر کون ہے؟

ج۔ ٹیگور اور نذرالاسلام۔

س۔ اگر میں "بیسویں صدی" کے لئے عورتوں کی خوبصورت اور دلکش تصویریں بھیجوں تو آپ انھیں شائع کریں گے؟

ج۔ "بیسویں صدی" کے معیار اور مذاق کی ہوں گی تو شکریہ کے ساتھ شائع کی جائیں گی۔

شمیم عالم بشری پوری۔ بردوان

س۔ انسانیت کی موت؟

ج۔ انسانیت کبھی نہیں مرتی۔ انسان انسانیت سے دُور ہو جاتا ہے۔

کمال احمد صابر۔ اورنگ آباد، بہار

س۔ خاندانی منصوبہ بندی آپ کی نظر میں؟

ج۔ خاندانی منصوبہ بندی مُلک کی اہم ضرورت ہے لیکن اس میں خاطر خواہ کامیابی آسان نہیں ہے۔

س۔ "پانی پھل سنگھاڑا" کے بارے میں کچھ بتایئے۔

ج۔ سنگھاڑا طاقت بخش غذا ہے۔ دل کی کمزوری، گرمی کے دست، کھانسی اور لاغری کو دور کرتا ہے لیکن دیر ہضم اور قابض ہے۔ اس کا زیادہ استعمال معدہ کے لئے مضر ہے۔

محمد ابراہیم محسن۔ حیدرآباد دکن

س۔ "بیسویں صدی" کے لئے افسانہ بھیجوں تو اُسے آپ "بیسویں صدی" میں شائع فرمائیں گے؟ اور اس کے لئے کیا شرائط ہیں؟

ج۔ افسانہ "بیسویں صدی" کے معیار کا ہوگا تو شکریہ کے ساتھ شریکِ اشاعت کیا جائے گا۔ اس کے لئے صرف ایک شرط ہے۔ افسانہ غیر مطبوعہ اور معیاری ہونا چاہیئے۔

س۔ ضبط کا دامن کب چھوڑ دینا چاہیئے؟

ج۔ کبھی نہیں، کسی حالت میں نہیں۔

س۔ زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ زندگی کی تلخیوں کو مٹھاس بنا لینا چاہیئے۔

گوربچن سنگھ۔ انبالہ

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں ہماری سرکار پانچویں پلان پر کتنے روپے خرچ کرے گی؟

ج۔ ۵ کھرب، ۱۱ ارب، ۶۱ کروڑ روپے کا خاکہ منظور ہوا ہے۔

احمد جعفر کلاوگی۔ ہبلی (میسور)

س۔ آدمی اور انسان میں کیا فرق ہے؟

ج۔ ہر انسان آدمی ہوتا ہے، لیکن ہر آدمی انسان نہیں ہوتا۔

س۔ کیا یہ حقیقت ہے کہ پہلے انسان بندر تھا؟

ج۔ یہ حقیقت ہو یا نہ ہو، یہ حقیقت ہے کہ انسان جانور بنتا جا رہا ہے!

س۔ شاعر آپ کی نظر میں؟

ج۔ حقیقی شاعر وہم و گمان سے بھی بلند ہوتا ہے۔

ابوالحسن سعید۔ سہسرام

س۔ دنیا میں سب سے زیادہ کس مذہب کے ماننے والے ہیں؟

ج۔ عیسائی مذہب کے۔

اختر صدیقی۔ رتوا۔ پورنیہ

س۔ چچا جان! انسان تو اپنے خیالات کے جال میں پھنس جاتا ہے، لیکن مکڑی اپنے جال میں کیوں نہیں پھنستی؟

ج۔ اِس لئے کہ مکڑی انسان نہیں ہوتی۔

س۔ تنہائی میں گنگنانے کے لئے کچھ اشعار...

ج۔ ہم اِن اشعار کو تنہائی میں اکثر گنگناتے رہتے ہیں۔ آپ کو پسند آئیں تو آپ بھی گنگنا لیجئے ؎

کتنے طوفان حوادث تھے کہ سر سے گزرے
ہم مگر خندہ بہ لب گزرے جدھر سے گزرے

•

ڈوب کر بحرِ حوادث میں اُبھر آنے کا نام
زندگی ہے پے بہ پے موجوں سے ٹکرانے کا نام

•

ناسازگار وقت کے تیور کو دیکھ کر
ہم نے چراغِ عزم کی لَو کو بڑھا دیا

•

ہاں بالفطرت اربابِ وفا کو کمی ہے
اسے بے عملو لاؤ کوئی کام ہمیں دو

•

یہ فرشِ گل و لالہ ہے توہین ہماری
شعلوں پہ کوئی رقص کا پیغام ہمیں دو

س۔ سیب کے اوصاف پر کچھ روشنی ڈالئے۔

ج۔ سیب بہترین دماغی غذا ہے۔ جگر کے فعل کو درست کر کے سستی رفع کرتا ہے۔ ذہن اور دماغ کو فرحت بخشتا ہے۔ خون کی کمی اور اختلاج قلب کے لئے بھی بہت مفید ہے۔ اُس کے مسلسل استعمال سے خون صالح پیدا ہوتا ہے۔ رنگت نکھرتی اور رخساروں میں سُرخی پیدا ہوتی ہے۔ گردے اور دانتوں کے لئے بھی فائدہ بخش ہے۔ معدے اور ہاضمے کو تقویت دیتا ہے۔ سیب کا مربہ دل، دماغ اور خون کی کمی کے لئے مفید ہے۔

سید شہاب الدین بیدل۔ بنگلور

س۔ سمجھ دار انسان اپنی جھوٹی تعریف سن کر کیا محسوس کرتا ہے؟

ج۔ سمجھ دار انسان اپنی جھوٹی تعریف سے خوش نہیں ہوتا۔

س۔ آج کل ایک انسان کو دوسرے انسان سے اتنی نفرت کیوں ہے؟

ج۔ اِس لئے کہ انسان انسان نہ رہا۔

فیاض احمد آرزو۔ ڈیسرگڑھ۔ بردوان

س۔ انسان دَولت کو کب ٹھکرا دیتا ہے؟

ج۔ بھائی جان! آپ کس دُنیا میں رہتے ہیں جو یہ پُوچھ رہے ہیں۔ آج کا انسان دَولت حاصل کرنے کے لئے اپنا ایمان بھی دے دیتا ہے!

س۔ عورت پھُول ہے یا بھُول؟

ج۔ عورت پھُول ہے نہ بھُول! عورت عورت ہے۔

س۔ انسان کے لئے سب سے بڑا درجہ کون سا ہے؟

ج۔ صحیح معنوں میں انسان ہونا!

ڈاکٹر محمد حنیف اللہ چند وارہ [illegible]

س۔ خوشخبری چچا! ہماری شادی ہونے والی ہے۔ شادی کے متعلق کچھ نصیحت کی باتیں ہمیں بتلائیے۔

ج۔ ازدواجی زندگی کو [illegible] بنانے کے لئے اپنی ازدواجی زندگی میں کبھی بدگمانی کا سایہ بھی [illegible] ایسی کوئی بات نہ کرنی چاہئے جس سے بدگمانی پیدا ہو۔ ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے طرفین کو چاہئے کہ چھوٹی باتوں اور فروگذاشتوں کو نظر انداز کر دیا کریں۔

مظہر الدین۔ پرتاب گڈھ

س۔ یہ شعر کس کا ہے ؎

درد سے معمور ہوتی جا رہی ہے کائنات
اِک دلِ انساں مگر درد آشنا ہوتا نہیں

ج۔ یہ شعر حضرت جگر مراد آبادی کا ہے۔

محمود اقبال۔ بنارس

س۔ سیارہ مشتری کے بارے میں بتائیں، یہ سیارہ کیسا ہوتا ہے؟

ج۔ یہ مشہور ستارہ ہے۔ عام ستاروں سے روشن و تابناک ہے۔

س۔ مہاسوں کا کیا علاج ہے۔ اس سے کیسے بچا جاسکتا ہے؟

ج۔ مہاسوں سے بچنے کے لئے متوازن غذا کھائی جائے۔ کافی وغیرہ کے استعمال میں پورا اعتدال برتنا چاہئے ——— چہرے پر مہاسے کے داغ ہوں تو انھیں مٹانے کے لئے یہ اُبٹن استعمال کریں۔ دھلی ہوئی مونگ کی دال رات کو بھگو دیجئے اور صبح باریک سا پیس لیجئے۔ اس میں دو چمچہ ناریل کا تیل ملا لیجئے۔ آدھے کاغذی لیموں کا عرق نچوڑ کر اس میں خوب حل کر دیجئے۔ نہانے سے آدھ گھنٹہ پہلے چہرے پر اس کی اچھی طرح مالش کر لیا کیجئے۔ اس عمل سے مہاسوں کے نشان مٹ جائیں گے۔

محمد ندیم نوید۔ ناگپور

س۔ میں شاعری سیکھنے کے لئے کوئی اُستاد منتخب کرنا چاہتا ہوں۔ ناگپور کے کسی بہترین شاعر کا نام بتائیے۔

ج۔ آپ ناگپور میں رہتے ہیں۔ ناگپور کے شاعروں کو آپ ہم سے زیادہ جانتے ہوں گے۔ کسی کو منتخب کر لیجئے۔

س۔ نریش کمار شاد کے کچھ اشعار سنائیے۔

ج۔ اُن کا ایک قطعہ سُنئے ؎

شامِ غم اور صبحِ عشرت میں
کس طرح ہو سکے تمیز مجھے
گردشِ روزگار تیری قسم
تیرا ہر رنگ ہے عزیز مجھے

س۔ آج کل کی فلموں میں اُردو زیادہ اور ہندی بہت کم ہوتی ہے۔ پھر بھی اُن فلموں کو ہندی کہا جاتا ہے۔ ایسا کیوں؟

ج۔ اسی کو کہتے ہیں جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ لوگ اُردو کو ہندی کہتے ہیں۔

محمد طاہر نگینہ۔ بجنور

س۔ "بیسویں صدی" کی بزم میں باریاب ہونے کے لئے کسی سفارش یا رشوت کی ضرورت ہوتی ہے؟ اگر ایسا ہو تو اس کا بھی بندوبست کروں؟

ج۔ آپ کی تخلیقات کا معیاری ہونا بھی سب سے بڑی سفارش ہوگی۔

سید مشتاق عالم۔ گیا

س۔ میری عمر تقریباً بیس سال ہے لیکن مجھے بہت افسوس ہے کہ میرا قد صرف پانچ فٹ ہے۔ کیا کسی ورزش سے میرا قد کچھ اُونچا ہو سکتا ہے؟

ج۔ اب قد اُونچا ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ احساسِ کمتری سے بچنے کے لئے زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کر کے قد کی کمی بہت حسن و خوبی سے پوری کر سکتے ہیں۔

س۔ انڈے کے فوائد کیا ہیں؟

ج۔ انڈا بہترین مقوی غذا ہے۔ اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جو جسم کی ساخت اور اس کے نشوونما کے لئے ضروری ہے۔ انڈا دودھ سے زیادہ طاقت بخش ہے۔ انڈا خون صالح پیدا کرتا ہے۔ قوتِ باہ اور دل و دماغ کی کمزوری دُور کرنے کی بہترین دوا ہے۔

نواب اصغر علی۔ دھنباد

س۔ شادی کانٹوں کا جال ہے یا پھولوں کا ہار؟

ج۔ یہ تو شادی کرنے والے پر موقوف ہے، شادی کو اپنے لئے کانٹوں کا جال بنالے یا پھولوں کا ہار!

س۔ خواہش اکثر ادھوری رہ جاتی ہے، پوری نہیں ہوتی۔ ایسا کیوں؟

ج۔ جو لوگ اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے جدوجہد نہیں کرتے ہیں انھیں کی خواہش پوری نہیں ہوتی۔

رجسٹریشن آف نیوز پیپر ایکٹ کے مطابق

بیان بابت ملکیت و مجملہ تفصیلات "بیسویں صدی" دہلی

(۱) مقام اشاعت:۔ دہلی (۲) وقفہ اشاعت:۔ ماہوار

(۳) پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر:۔ خوشتر گرامی۔ قومیت ہندوستانی

پتہ:۔ دریا گنج دہلی (۴) ملکیت:۔ خوشتر گرامی

میں خوشتر گرامی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط خوشتر گرامی پرنٹر پبلشر

مورخہ یکم مارچ ۷۳ء ۱۹ء

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر: خوشتر گرامی ——— مطبوعہ: پربھات آفسیٹ پریس، ریبل آرٹ پریس، دہلی۔ تصاویر: ڈاٹا آفسیٹ، یا ہے کے پریس و برائٹ پریس، دہلی ——— پتہ: دفتر بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۶

اختر صدیقی۔ رتوا۔ پورنیہ

س۔ چچا جان! انسان تو اپنے خیالات کے جال میں پھنس جاتا ہے، لیکن مکڑی اپنے جال میں کیوں نہیں پھنستی؟

ج۔ اس لئے کہ مکڑی انسان نہیں ہوتی۔

س۔ تنہائی میں گنگنانے کے لئے کچھ اشعار...

ج۔ ہم ان اشعار کو تنہائی میں اکثر گنگناتے رہتے ہیں۔ آپ کو پسند آئیں تو آپ بھی گنگنائیے ؎

کتنے طوفانِ حوادث تھے کہ سر سے گزرے
ہم مگر خندہ بلب گزرے جدھر سے گزرے

•

ڈوب کر بحرِ حوادث میں ابھر آنے کا نام
زندگی ہے پے بہ پے موجوں سے ٹکرانے کا نام

•

ناسازگار وقت کے تیور کو دیکھ کر
ہم نے چراغِ عزم کی لو کو بڑھا دیا

•

ہاں! فطرتِ اربابِ وفا کو یہ کہنی ہے
اے بے عملو! لاؤ کوئی کام ہمیں دو

•

یہ فرشِ گل و لالہ ہے توہین ہماری
شعلوں پہ کوئی رقص کا پیغام ہمیں دو

س۔ سیب کے اوصاف پر کچھ روشنی ڈالئے۔

ج۔ سیب بہترین دماغی غذا ہے۔ جگر کے فعل کو درست کر کے سستی رفع کرتا ہے۔ ذہن اور دماغ کو فرحت بخشتا ہے۔ خون کی کمی اور اختلاجِ قلب کے لئے بھی بہت مفید ہے۔ اس کے مسلسل استعمال سے خونِ صالح پیدا ہوتا ہے۔ رنگت نکھرتی اور رخساروں میں سرخی پیدا ہوتی ہے۔ گردے اور دانتوں کے لئے بھی فائدہ بخش ہے۔ معدے اور ہاضمے کو تقویت دیتا ہے۔ سیب کا مربہ دل، دماغ اور خون کی کمی کے لئے مفید ہے۔

سید شہاب الدین بیدل۔ بنگلور

س۔ سمجھدار انسان اپنی جھوٹی تعریف سن کر کیا محسوس کرتا ہے؟

ج۔ سمجھدار انسان اپنی جھوٹی تعریف سے خوش نہیں ہوتا۔

س۔ آج کل ایک انسان کو دوسرے انسان سے اتنی نفرت کیوں ہے؟

ج۔ اس لئے کہ انسان، انسان نہ رہا۔

فیاض احمد آرزو۔ ڈیسرگڑھ۔ بردوان

س۔ انسان دولت کو کب ٹھکرا دیتا ہے؟

ج۔ بھائی جان! آپ کس دنیا میں رہتے ہیں جو یہ پوچھ رہے ہیں۔ آج کا انسان دولت حاصل کرنے کے لئے اپنا ایمان بھی دے دیتا ہے!

س۔ عورت پھول ہے یا بھول؟

ج۔ عورت پھول ہے نہ بھول! عورت عورت ہے۔

س۔ انسان کے لئے سب سے بڑا درجہ کون سا ہے؟

ج۔ صحیح معنوں میں انسان ہونا!

ڈاکٹر محمد جنید اللہ چندواسہ [illegible]

س۔ خوشتر چچا! ہماری شادی ہونے والی ہے۔ شادی کے متعلق کچھ نصیحت کی باتیں ہمیں بتلائیے۔

ج۔ ازدواجی زندگی کو کامیاب اور خوشگوار بنانے کے لئے اپنی ازدواجی زندگی پر کبھی بدگمانی کا سایہ بھی [illegible] ایسی کوئی بات نہ کرنی چاہئے جس سے بدگمانی پیدا ہو۔ ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے طرفین کو چاہئے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں اور فروگذاشتوں کو نظر انداز کر دیا کریں۔

مظہر الدین۔ پرتاب گڑھ

س۔ یہ شعر کس کا ہے ؎

درد سے معمور ہوتی جا رہی ہے کائنات
اک دلِ انساں مگر درد آشنا ہوتا نہیں

ج۔ یہ شعر حضرت جگر مرادآبادی کا ہے۔

محمد اقبال۔ پارس

س۔ سیارہ مشتری کے بارے میں بتائیے، یہ سیارہ کیسا ہوتا ہے؟

ج۔ یہ مشہور ستارہ ہے۔ عام ستاروں سے روشن و تابناک ہے۔

س۔ مہاسوں کا کیا علاج ہے۔ اس سے کیسے بچا جا سکتا ہے؟

ج۔ مہاسوں سے بچنے کے لئے متوازن غذا کھانی چاہئے۔ کافی وغیرہ کے استعمال میں پورا اعتدال برتنا چاہئے——
چہرے پر مہاسے کے داغ ہوں تو انھیں مٹانے کے لئے یہ اُبٹن استعمال کریں۔ دُھلی ہوئی مونگ کی دال رات کو بھگو دیجئے اور صبح باریک پیس لیجئے۔ اُس میں دو چمچہ ناریل کا تیل ملا لیجئے۔ آدھے کاغذی لیموں کا عرق نچوڑ کر اُس میں خوب حل کر دیجئے۔ نہانے سے آدھ گھنٹہ پہلے چہرے پر اُس کی اچھی طرح مالش کر لیا کیجئے۔ اس عمل سے مہاسوں کے نشان مٹ جائیں گے۔

محمد ندیم نوید۔ ناگپور

س۔ میں شاعری سیکھنے کے لئے کوئی اُستاد مُنتخب کرنا چاہتا ہوں۔ ناگپور کے کسی بہترین شاعر کا نام بتائیے۔

ج۔ آپ ناگپور میں رہتے ہیں۔ ناگپور کے شاعروں کو آپ ہم سے زیادہ جانتے ہوں گے۔ کسی کو مُنتخب کر لیجئے۔

س۔ نریش کمار شاد کے کچھ اشعار سُنائیے۔

ج۔ اُن کا ایک قطعہ سُنئے ؎

شامِ غم اور صبحِ عشرت میں
کس طرح ہو سکے تمیز مجھے
گردشِ روزگار تیری قسم
تیرا ہر رنگ ہے عزیز مجھے

س۔ آج کل کی فلموں میں اُردو زیادہ اور ہندی بہت کم ہوتی ہے۔ پھر بھی اُن فلموں کو ہندی کہا جاتا ہے۔ ایسا کیوں؟

ج۔ اسی کو کہتے ہیں جادُو وہ جو سر چڑھ کر بولے! لوگ اُردو کو ہندی کہتے ہیں۔

محمد طاہر۔ نگینہ۔ بجنور

س۔ "بیسویں صدی" کی بزم میں باریاب ہونے کے لئے کسی سفارش یا رشوت کی ضرورت ہوتی ہے؟ اگر ایسا ہو تو اُس کا بھی بندوبست کروں؟

ج۔ آپ کی تخلیقات کا معیاری ہونا بھی سب سے بڑی سفارش ہوگی۔

سید مشتاق عالم۔ گیا

س۔ میری عُمر تقریباً بیس سال ہے لیکن مجھے بہت افسوس ہے کہ میرا قد صرف پانچ فٹ ہے۔ کیا کسی ورزش سے میرا قد کچھ اُونچا ہو سکتا ہے؟

ج۔ اب قد اُونچا ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ احساسِ کمتری سے بچنے کے لئے زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کر کے قد کی کمی بہت حُسن و خوبی سے پُوری کر سکتے ہیں۔

س۔ انڈے کے فوائد کیا ہیں؟

ج۔ انڈا بہترین مقوی غذا ہے۔ اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جو جسم کی ساخت اور اُس کے نشوونما کے لئے ضروری ہے۔ انڈا دودھ سے زیادہ طاقت بخش ہے۔ انڈا خونِ صالح پیدا کرتا ہے۔ قوتِ باہ اور دل و دماغ کی کمزوری دُور کرنے کی بہترین دوا ہے۔

نواب اصغر علی۔ دھنباد

س۔ شادی کانٹوں کا جال ہے یا پھولوں کا ہار؟

ج۔ یہ تو شادی کرنے والے پر موقوف ہے، شادی کو اپنے لئے کانٹوں کا جال بنالے یا پھولوں کا ہار!

س۔ خواہش اکثر ادھوری رہ جاتی ہے، پُوری نہیں ہوتی۔ ایسا کیوں؟

ج۔ جو لوگ اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے جدوجہد نہیں کرتے ہیں اُنھیں کی خواہش پُوری نہیں ہوتی۔

رجسٹریشن آف نیوز پیپر ایکٹ کے مطابق

بیان بابت ملکیت و دیگر تفصیلات بیسویں صدی دہلی

(۱) مقامِ اشاعت:۔ دہلی (۲) وقفہ اشاعت:۔ ماہوار (۳) پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر:۔ خوشتر گرامی۔ قومیت ہندوستانی پتہ:۔ دریا گنج دہلی (۴) ملکیت:۔ خوشتر گرامی

میں خوشتر گرامی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط خوشتر گرامی پروپرائٹر

مورخہ یکم مارچ ۱۹۷۳ء

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر:۔ خوشتر گرامی —— مطبوعہ:۔ پربھات آفسیٹ پریس دیبل آرٹ پریس دہلی۔ تصاویر و ٹائیٹل:۔ پی۔ کے پریس و برائٹ پریس، دہلی —— پتہ:۔ دفتر بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۶

APRIL 197?
Regd. No. D. 100
Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 630/57
BISWIN SADI
37th YEAR OF PUBLICATION
Telephones Office. 271637 Residence.619927

RADIUM TONIC PILLS

نیا خون — نئی طاقت

کمزوری کا زبردست علاج

ریڈیم ٹانک پلز

نیا خون بکثرت پیدا کر کے نہ صرف کمزوری دور کرتی ہیں
بلکہ جسم میں زبردست طاقت بڑھاتی ہیں۔ وزن اور
خون کئی پونڈ بڑھ جاتا ہے کھوئی ہوئی طاقت اور
واپس لانے کے لئے ملک کے کونے کونے میں
مقبول ہیں اور لاکھوں انسان



کلکتہ ایجنٹ:۔
امین اینڈ اسمٰعیل پرائیویٹ لمٹیڈ
نمبر ۸۰ کولوٹولا اسٹریٹ کلکتہ

پتہ: ریڈیم کیمیکل ورکس (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ پوسٹ بکس نمبر


مئی
Biswin Sadi
DELHI



یُوں کلی کی چٹک میں پنہاں ہے   دلِ فصلِ بہار کی دھڑکن
جیسے دوشیزگی کے سینے میں   ایک گُمنام پیار کی دھڑکن

نریش کمار شاد .... فوٹو :- روشن لال وششٹ جے پور



جنابِ بمل کرشن اشکؔ کی غزلوں کے مجموعے "آئینہ اور پرچھائیں" کی رسمِ اجرا پر ہریانہ اُردو کلب رہتک نے اُن کے اعزاز میں ایک مُشاعرہ منعقد کیا۔ جنابِ ایس۔ایس۔چاولہ ایم۔اے (آکسفورڈ) نے رسمِ اجرا ادا کی۔ بمل کرشن اشکؔ غزل سرا ہیں۔

سچ ہے رستے میں جو تھا ترے اور مرے درمیاں رہ گیا
لیکن اے ہم سفر میں کبھی ہمراہ تھا میں کہاں رہ گیا

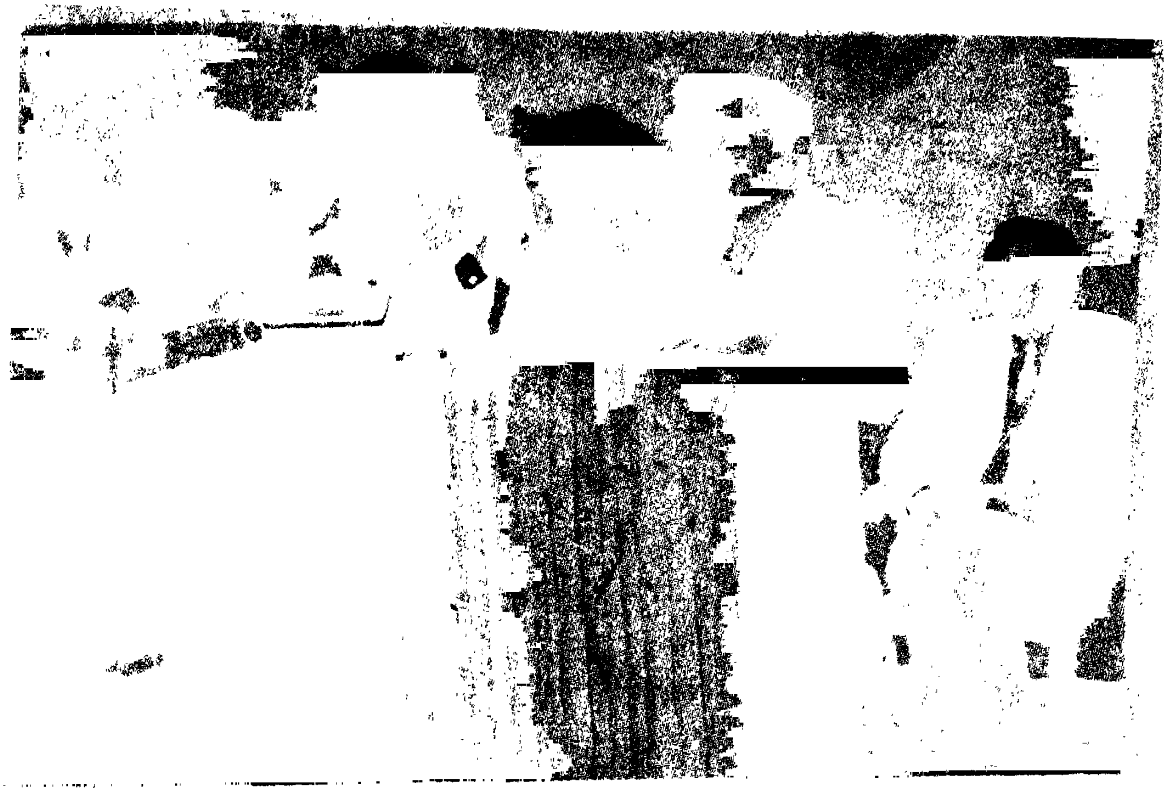
جسم اور رُوح دونوں ہی مجھ بند کمرے کی میراث تھے
میں نے کھڑکی جو کھولی زمیں اُڑ گئی، آسماں رہ گیا

دل دھڑکتا ہے لیکن کوئی آرزو کوئی حسرت نہیں
گھر کے جتنے بھی افراد تھے چل دیے بس مکاں رہ گیا

میں کہ میرے قلم نے ورق در ورق رنگ بکھرا دیے
میں وہی میں کتابوں کے صفحات پر بے نشاں رہ گیا

سامنے منزلوں کے نشاں ہیں تو کس درجہ تنہا ہوں میں
جو سفر میں مر[illegible] تھا وہ کہاں رہ گیا

اشکؔ اپنے مقدر میں گرمی، نہ سردی، نہ بر[illegible]
ایسے لگتا ہے اپنے لئے صرف عہدِ خزاں رہ گیا



نوجوان شاعر آزاد گلاٹی اپنا کلام سُنا رہے ہیں۔

اِس طرح سائے کی خواہش نے جلایا ہے مجھے
اب کڑی دُھوپ ہی ٹھہرا ہُوا سایا ہے مجھے

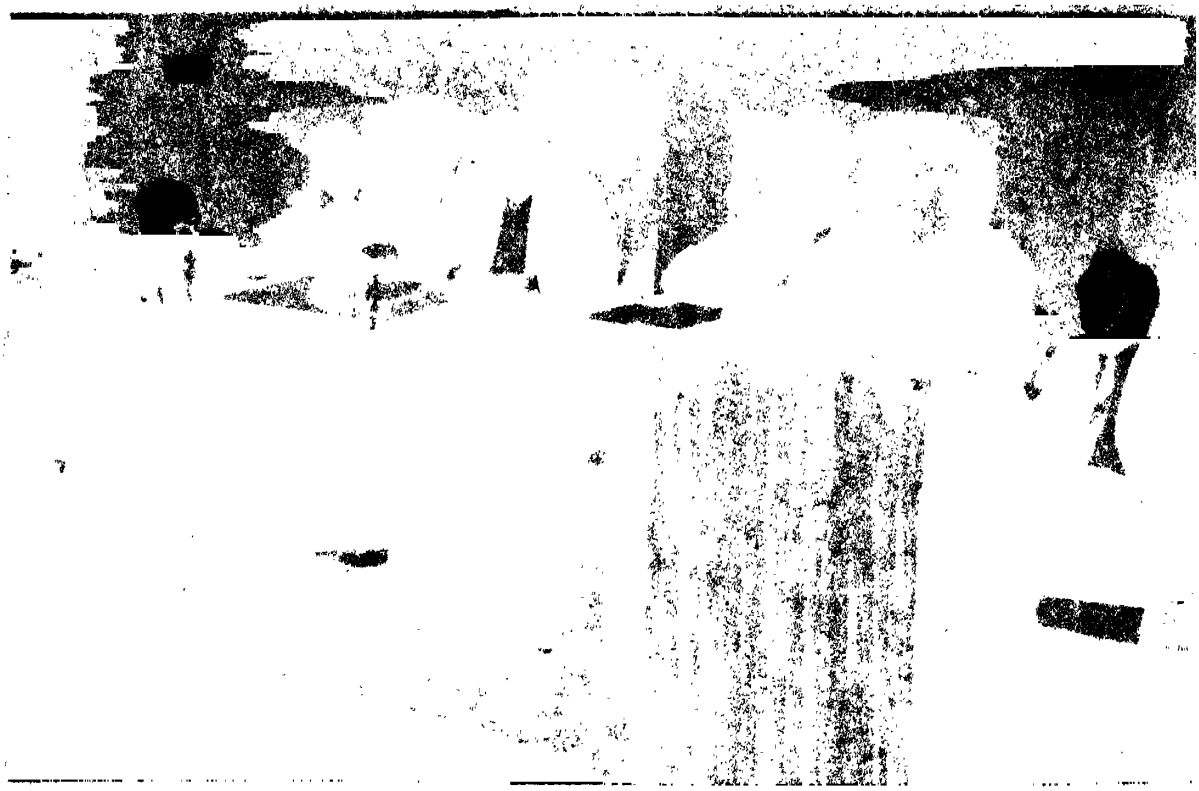
تاکہ خود اپنی بلندی کا ہو اِحساس اُسے
اُس نے کچھ سوچ کے نظروں سے گرایا ہے مجھے

میں جنم بھر بھی اگر ڈھونڈوں نہ پاؤں خود کو
ہائے! اِک شخص نے کِس طرح گنوایا ہے مجھے

اِس کے حصّے کے ابھی زخم ہیں باقی شاید
یہ مرا دل، جو ترے شہر میں لایا ہے مجھے

تیرے کمرے میں یہ اِک ننّھے کی پیاری تصویر
تُو نے اِک خواب کی صورت میں سجایا ہے مجھے

میں ہوں آزاد! مقدر کا کرشمہ ایسا
اُس نے کھویا ہے مجھے، جس نے کہ پایا ہے مجھے



"ماجھی دھیرے چل" کے شاعر جناب مصوّر سبزواری غزل سرا ہیں۔

کیسے ہو کس کے درد کے درماں میں گھِر گئے
ہم ہر طرف سے گردشِ دوراں میں گھِر گئے

کس وقت محملِ جرسِ گُل نے دی صدا
جب ہم سوادِ شامِ بیاباں میں گھِر گئے

سودائیانِ صبحِ بہاراں خبر تو لو
زنداں سے چل پڑے ہو کہ زنداں میں گھِر گئے

تُم کو مِلا نہ سیرِ لبِ جُو سے کچھ فراغ
ہم راہ دیکھ دیکھ کے طوفاں میں گھِر گئے

تُم آئے تو بڑھا ہیں پندارِ بے زری
ہم اہتمامِ شامِ غریباں میں گھِر گئے

اشکوں کی دارو گیر مصوّر نہ کم ہوئی
مژگاں سے چھُٹ کے حلقۂ داماں میں گھِر گئے



اُردو کے ممتاز شاعر جنابِ سلام مچھلی شہری جنہیں حال ہی میں صدرِ جمہوریہ نے پدم شری کے خطاب سے نوازا ہے، اپنے مخصوص انداز میں اپنا کلام سُنا رہے ہیں۔

جی کر رہے ہو، مُفت میں ہلکان چُپ رہو ⁞ اِس شہرِ گُل کے لوگ ہیں اَنجان چُپ رہو
جتنا ہی چھیڑتے ہو بہاروں کی داستاں ⁞ اُتنا ہی ہو رہا ہوں پریشان چُپ رہو
اِتنے حسین، اِتنے مہذّب جہان میں ⁞ ہم ایسے لوگ اَب بھی ہیں نادان، چُپ رہو
منظر ضرور نغمہ و سازِ بہار ہے ⁞ پسِ منظرِ بہار ہے سنسان، چُپ رہو
سگرٹ کی طرح حضرتِ غالبؔ کے شہر میں ⁞ بِکنے لگے ہیں میرؔ کے دیوان، چُپ رہو
اِک خامُشیِ صبر بھی فریاد ہو! کہ اَب ⁞ ہلنے لگے ہیں نقرئی ایوان چُپ رہو
بڑھنے لگا ہے زُہرۂ گیتی کا بانکپن ⁞ چھُونے لگا ہے چاند کو انسان، چُپ رہو

دُنیا کو آج فُرصتِ نغمہ نہیں سلامؔ

ٹیلیفون دفتر ——— ۲۷۱۶۳۸
ٹیلیفون رہائش ——— ۶۱۹۹۲۷

بیسویں صدی دہلی

تیر و نشتر

خوشتر گرامی



بلراج مدھوک کو جن سنگھ سے نکال دیا گیا

• "مرکزی وزیر کا مکان غرق" : ایک خبر ——— وزارت سلامت رہے اور بنالیں گے۔

• "یوپی کے وزیر کا بیٹا لُٹ گیا" ——— یعنی یوپی کے وزیر کی کمائی بیٹے نے گنوائی۔

• "یوپی کے وزیر کرپٹ اور رشوت خور ہیں" : چرن سنگھ کا سرٹیفکیٹ ——— سابق وزیر بھی اِسی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔

• "یوپی کے فسادات میں جن سنگھ کا ہاتھ نہیں" : ڈاکٹر فریدی کا بیان ——— تو پھر مسلم مجلس کا یا ڈاکٹر فریدی کا ہوگا۔

• "بھٹو مستعفی ہوجائیں تو میں مجیب سے بات چیت کے لئے ڈھاکہ جانے کو تیار ہوں" : سردار شوکت حیات کا بیان ——— آدھا پاکستان اور لاکھوں انسان کٹواکر تو صدارت ملی ہے پھر بھی اُسے چھوڑ دیں۔

• "ہریانہ میں نئے ٹیکس" : ایک خبر ——— نئے وزیروں کا اضافہ کرنا ہوگا۔

• "اناج کی تجارت میں دُشواریاں پیش آسکتی ہیں" ——— حصولِ آزادی کی دُشواریوں سے زیادہ نہیں۔

• "اپوزیشن نے مہنگائی پر گورنمنٹ کو آڑے ہاتھوں لیا" ایک خبر ——— اس لئے تو گورنمنٹ آڑی چلتی ہے۔ سیدھے ہاتھوں لو تو سیدھی چلے۔



زہریلے سانپ

"چھوٹی ریاستیں بنانے سے مُلک کا کوئی نقصان نہیں۔" ایک عنوان ——— بلکہ

- وزیروں کی تعداد بڑھتی ہے۔
- ممبرانِ اسمبلی کی تعداد بڑھتی ہے۔
- صُوبائی راجدھانیوں کی تعداد بڑھتی ہے۔
- صُوبائی سیکریٹریٹ کی تعداد بڑھتی ہے۔
- نئے نئے دفتر کھُلتے ہیں اور روزگار میں اضافہ ہوتا ہے۔
- نئی عمارتیں بنتی ہیں۔ ٹھیکیداروں کو کام مِلتا ہے۔
- اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خسارہ کا بجٹ بنتا ہے۔

"جاپان جہاں عورت پلاسٹک کی گڑیا ہے۔" ایک عنوان ——— اور ہندوستان جہاں مَردوں سے زیادہ دلاور ہے اور مَردوں پر حکمراں ہے۔

"ہریانہ میں غریب لوگوں کے لئے مکان۔ دس کروڑ کی رقم منظور۔" ایک خبر ——— وزیروں کے بھائی بھتیجے جلد توجہ کریں۔

"دِلّی مِلک اسکیم کا ملاوٹی دودھ۔ بوتل راجیہ سبھا میں پیش کی گئی" ——— خالص دودھ ثقیل اور دیر ہضم ہوتا ہے۔ اُسے ہلکا اور زود ہضم کرنے کا اقدام ہے۔

"کیرل کے بارے میں اندھا وکیل" ایک خبر ——— اندھے انصاف کے خلاف لڑے گا۔

"اسرائیل ایٹمی پالیسی نہیں بدلے گا۔" وزیرِ اعظم اسرائیل کا اعلان ——— اِس لئے کہ اُسے امریکہ کی مکمل حمایت حاصل ہے۔

• دیہات کے ٹیچروں کا مطالبہ: ایک خبر — انگلش بند کرو طلباء کو پاس کرواد ہمیں گھر بیٹھے تنخواہ دو۔

• بھٹو کے دل میں کیا ہے؟" ایک عنوان — جسے وہ زبان پر نہیں لاتا اور جو زبان پر لاتا ہے وہ دل میں نہیں۔

• ترپاٹھی گورنمنٹ کاہل اور کرپٹ ہے: ایک عنوان — اور اندھی بھی! جو اخبارات و رسائل پر انصاف معقدمے بناتی ہے۔

• قتل اور چوری کی وارداتوں میں دلّی دوسرے شہروں سے بازی لے گیا: ایک خبر — دلی کے حکام بھارت رتن کے اعزاز کے مستحق۔

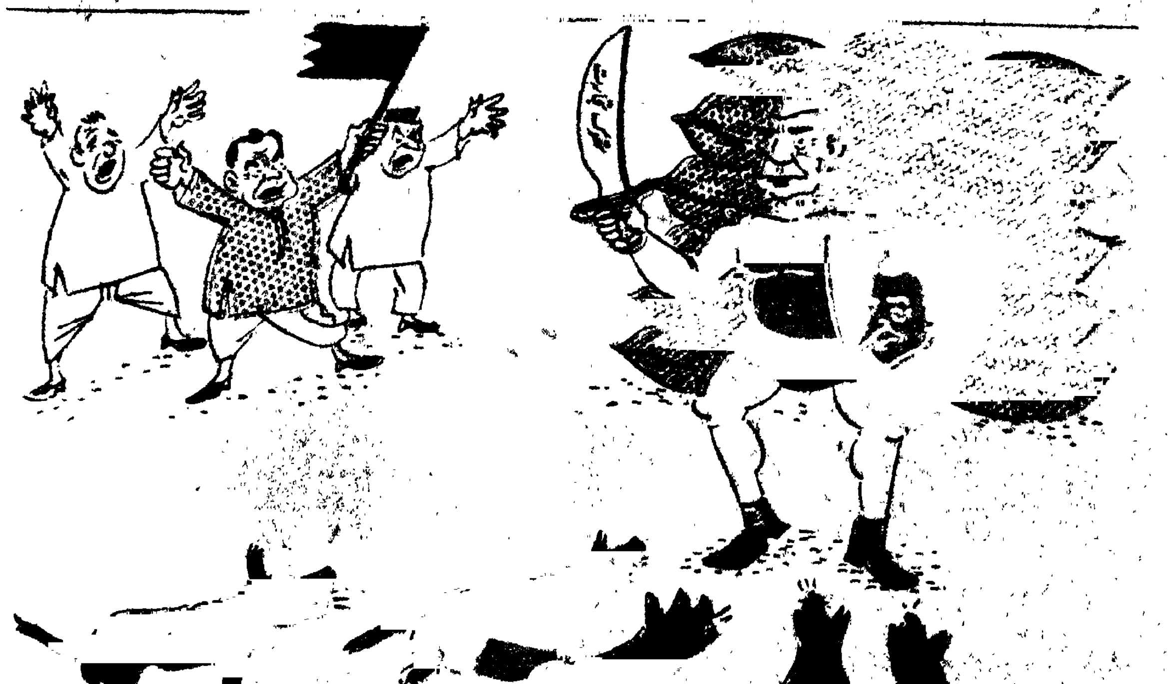
• بلراج مدھوک نے نئی پارٹی بنانے کا اعلان کر دیا: ایک خبر — اس سے بھی نکالے گئے تو کیا ہوگا؟

• پاکستان آتش فشاں کے دہانے پر: ایک خبر — جس دن پھٹ پڑا بھسم ہو جائیں گے۔

• فرقہ پرستی کے لئے ذمہ دار کون؟ ایک جن سنگھی اخبار — یہ سوال چوری اور سینہ زوری کے مصداق ہے۔

• گیانی ذیل سنگھ قصور وار نہیں: شریمتی اندرا گاندھی کا بیان — سانچ کو نہیں آنچ۔

• میرا اخراج جن سنگھ کی خود کشی کے مترادف ہے: مدھوک کا بیان — فی الحال تو آپ کی سیاسی موت ہو گئی ہے۔



گورنمنٹ کی غذائی پالیسی کی مخالفت



"پاکستان کو امریکی ہتھیاروں کی سپلائی سے شملہ معاہدہ خطرے میں": سردار سورن سنگھ

"امرتسر میں گڑبڑ کے لئے جن سنگھ ذمہ دار": پنجاب کے وزیرِ خزانہ کا الزام ——— ایک امرتسر کیا، ہر گڑبڑ کے پیچھے جن سنگھ کا ہاتھ ہوتا ہے۔

"بھاگنے والا مُلزم ہتھکڑی سمیت گرفتار": ایک خبر ——— وہ اُڑنے بھی نہ پائے تھے کہ گرفتار ہوگئے

"لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ": ایک خبر ——— خبر تو ہے، مگر تازہ اور نئی نہیں۔

"خراٹے لینے والے شوہر کا حشر۔ بیوی نے طلاق لے لی" ——— بیویوں کے سکون کو درہم برہم کرنے والے ہوشیار رہیں۔

"دُودھ میں چھپکلی" ——— جب تک ہاتھی نہ نکلے کوئی خبر نہیں بنتی۔

"برطانوی سرکار ہند اور پاکستان میں سمجھوتہ کے لئے مدد دینے کو تیار ہے" ——— برِّصغیر کے ٹکڑے کرانے کا کفارہ ادا کرنے کے لئے۔

"قوم کے معماروں سے غیر جمہوری سلوک": ایک عنوان ——— اِس لئے کہ گورنمنٹ مشینری میں ہزاروں جن سنگھی گھسے ہوئے ہیں۔

"میسور اسمبلی میں بلّی گھس آئی" ——— چوہے دیکھ کر سنڈیکیٹیوں نے کہا ہوگا کہ سرکاری بینچوں پر چوہے بیٹھے ہیں۔ اِس لئے بلّی آئی ہے۔

"کاریگروں کو حکومت کی طرف سے انعامات" ——— حکومت کی کاری گری۔

"چین بھارت سے بہتر تعلقات بحالی کی فکر میں ہے" ایک خبر ـــــ یقیناً کوئی اُلٹی چال ہے اِس میں۔

"گرودواروں میں موٹے کپڑے کی غلط تقسیم" ـــــ موٹی غلطی ہے۔

"بیٹے نے باپ کو اور بھائی نے بھائی کو قتل کر دیا" ـــــ قیامت قریب ہے دوستو!

"کملاپتی ترپاٹھی کا یو۔پی میں اُردو کو دوسری زبان کا درجہ دینے سے اِنکار" ـــــ اُردو کی مقبولیت اور چھا جانے کا خوف ہے۔

"نس بندی انجکشن لگانے سے مہلا کی موت" ایک خبر ـــــ مکمل فیملی پلاننگ ہو گیا۔

"بلیک اور ذخیرہ اندوزی ناقابلِ ضمانت جرم قرار دیے جائیں گے" ایک خبر ـــــ اُس وقت تک بلیک اور ذخیرہ اندوزی کرنے والے عوام کا خون چوس کر ادھ مرا کر چکے ہوں گے۔

"کیا بندروں سے انسانی اعضاء کے بنکوں کا کام لیا جا سکتا ہے؟" ایک عنوان ـــــ کیوں نہیں؟ بقول ڈارون انسان بندر ہی کی اولاد تو ہیں۔

"پانچویں پلان میں پینے کے پانی کا انتظام" ایک عنوان ـــــ اُس وقت تک پیاسے رہیے۔ اِس موسمِ گرما میں دِلّی اور بمبئی جیسے شہر کربلا کا نظارہ پیش کر رہے ہیں۔

"راج نرائن پارلیمنٹ کا الیکشن لڑیں گے" ـــــ اِس موسم کی سب سے گندی خبر۔



[illegible] قومی ملکیت میں نہیں لے گی" وزیر اطلاعات [illegible]

آر ایس ایس ـــــــــــ

خوشتر گرامی

> یہ مضمون نومبر ۱۹۷۰ء کے "بیسویں صدی" میں شائع ہوا تھا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لکھنؤ نے تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۱۵۳ اے کے تحت "بیسویں صدی" کے مدیر پر فوجداری مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ میں اِس مضمون کو دوبارہ شائع کر کے توہینِ عدالت کے جرم کا بھی مرتکب ہو رہا ہوں۔ روزنامہ "سویرا" والے کے مدیر محترم جناب جگناداس اختر نے بھی اِسے شائع کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ مجھے بھی گرفتار کرو اور مجھ پر توہینِ عدالت کا مقدمہ بھی بناؤ۔



پیشانی بے شمار گناہوں سے داغدار اور خود ہندوستان کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ۔ آنکھوں میں بغض و حسد کے شعلے۔ چہرہ مکروہ زبان پر پُرفریب نعرے۔ جسم بے گناہوں کے خون میں شرابور۔ یہ ہے قابلِ نفرت و ملامت مجسّمہ ـــــــ

آر ایس ایس

ہندوستان میں نازی اِزم کا رُوپ۔ سر پر سیاہ ٹوپی ماتم کا نشان۔ پیروں میں سفید جوتا امن و آشتی کو پیروں تلے روندنے کی دلیل۔ سفید قمیص، خاکی نیکر، ہاتھ میں چاقو۔ بھگوے کے سائے میں پروان چڑھے ہیں ــــ بھارت کی سبھیتا اور سنسکرتی کا جاپ کرنے والے بھارتی سبھیتا اور سنسکرتی کو بدنام کرتے ہیں۔ اتحاد کے دشمن ہیں، یکجہتی کے مخالف ہیں۔ انگریزوں سے لڑائی کے وقت یہ اُن کے پہناچیوں کی طرح بلوں میں گھسے ہوئے تھے یا اُن کے کاسہ لیس تھے۔ کل اکھنڈ بھارت کے ٹھیکیدار ہیں۔ نہ مسلمان بھاتے ہیں نہ عیسائی، نہ سکھ پسند ہیں نہ اچھوت ــــ مُلک اور آئین سے غداری کے تمام سامان درپیش۔ دُوسروں سے وفاداری کے خواہاں۔ ہندو کی بات کرتے ہیں لیکن مرہٹہ راج کے منصوبے بناتے ہیں۔ ہر فساد کے پیچھے ان کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ہر جھگڑے کو جنم دیتے ہیں اور پھر [illegible] پھیلاتے ہیں ــــ مزدور کی ہر تحریک کے دشمن اور سرمایہ کے حامی دھنوانوں کے پجاری ہیں۔ ہر طرف فسادات [illegible] ملامت کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ مختصر یہ کہ

لیے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

... اور کیا؟!

——— پروفیسر عابد صفی ایم اے (علیگ)

پریسیڈنسی کالج، مدراس نمبر ۵

برادرِ محترم! تسلیمات

ایک افسانہ "... اور کیا؟!" ارسالِ خدمت ہے۔ پسند آجائے تو اسے شریکِ اشاعت فرمالیں۔ میرے پچھلے افسانے "بار حیا" کو سرِ فہرست جگہ دے کر جہاں آپ نے مجھے زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا وہیں یہ بھی ثابت کر دیا کہ آپ کی بلند نگاہ فن پر پہنچ جاتی ہے اور فن کار پر بعد میں! "بار حیا" کے سلسلے میں جو ستائشی خطوط قارئین کی طرف سے مجھے ملے اُن میں کئی تو فل اسکیپ سائز کے دو دو تین تین صفحوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ خلوص و عقیدت کے اُن پھولوں کے لئے میں "بیسویں صدی" اور اُس کے قارئین کا بے حد ممنون ہوں...

آپ کا بھائی ——— عابد صفی

★

پروین دبے پاؤں کمرے میں چلی آئی اور جیسے ہی اُس کی نظر جاوید پر پڑی اُسے بے ساختہ ہنسی آگئی۔

جاوید چارپائی پر خراٹے بھر رہا تھا۔

وہ اُس کے قریب چلی آئی اور اُسے جگانے لگی۔

"بھائی جان!"

"اُٹھئے نا بھائی جان ———!"

نیند میں ہی جاوید کو محسوس ہوا کہ اُسے ایک نسوانی آواز بار بار پکار کر جگانے کی کوشش کر رہی ہے، اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ لیکن جیسے ہی آنکھیں کھلیں اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے گرم جلتی ہوئی آنکھوں پر انگارے رکھ دئے ہوں اور دوسرے ہی لمحے آنکھیں آپ ہی آپ بند ہو گئیں اور پھر کچھ لمحوں کے بعد جلن جب قدرے کم ہوئی تو اُس کے ہوش و حواس بجا ہوئے اور وہ کچھ غور کرنے لگا۔

پچھلے کئی ماہ سے وہ اپنے امتحانوں کی تیاری میں جاگتے رہنے کے بعد آج پہلی بار اُسے پوری بے فکری کے ساتھ سونے کا موقع ملا تھا اور آنکھوں کی جلن کے علاوہ آج چھٹی کا پہلا دن بھی تھا۔ اِس لئے بھی اُسے پوری ایک ماہ کی بلکہ ایک سال کی کسل اُتارنی تھی۔ لیکن پروین کی آوازیں تو صبح ہی صبح اُس کا پیچھا کرنے لگی تھیں۔ اُس کی پے بہ پے آوازیں جاوید کو دم لینے کی مہلت بھی نہیں دے رہی تھیں۔

"اوہو ——— بھائی جان!"

"اُٹھتے نہیں؟"

"اُٹھئے نا ——— بھائی جان؟"

اُس نے جھلا کے پروین کو ڈانٹ دیا اور کچھ دیر کے لئے پروین کی پھر کوئی آواز سنائی نہ دی تو آنکھیں کھولے بغیر بستر پر پڑے ہی پڑے یہ سوچنے لگا ——— ابھی اُٹھے یا نہ اُٹھے اور اُسی وقت دیوار کی گھڑی نے گیارہ بجائے تو وہ چونک پڑا اور معاً اُسے یاد آیا کہ آج اپریل کی پہلی تاریخ ہے اور اس سلسلے میں دوستوں کو

اپریل فول بنانے کے لئے نکلنا بھی ہے۔ اِس بات کے یاد آتے ہی جلن کی شدت کے باوجود اُس کی آنکھیں کھل گئیں اور آنکھیں کھلتے ہی اُسے پروین چارپائی سے لگی کھڑی نظر آئی۔

"آپ خفا ہو گئے بھائی جان؟"

پروین کے سہمے ہوئے لہجے پر جاوید کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔

"بتاؤ کیا ہے؟"

جاوید کے لہجے کو خوشگوار پاکر پروین کی مسکراہٹ پھر واپس آگئی۔

"پہلے ایک بات بتایئے" اُس نے شوخی سے کہا "کبھی آپ نے کوئی سپنا بھی دیکھا ہے؟"

"کبھی کیا اِس وقت بھی جب تم جگا رہی تھیں میں ایک سپنا ہی دیکھ رہا تھا۔"

وہ جھوٹ بول گیا۔

"اس وقت؟"

"ہاں!"

"کیا سپنا تھا بھلا!" وہ سراپا توجہ بن گئی۔

"تھا ایک بہت میٹھا سا سپنا!" جاوید نے ٹالنے کی کوشش کی۔

"بتایئے نا کیا سپنا تھا؟" وہ بضد ہو گئی۔

پروین کے اصرار پر وہ ایک لمحہ کے لئے پریشان ہو گیا کہ کیا کرے؟ کیا بتائے؟ لیکن دوسرے لمحے اُس میں آپ ہی آپ ہمت پیدا ہو گئی۔ جب امتحانوں کے پرچوں ہی میں گپ بازی سے نہیں گھبرائے تو پروین کس گنتی میں! اُس نے دل ہی دل میں سوچا اور بستر پر لیٹے ہی لیٹے ایک سُندر سے سپنے کے تانے بانے بُننے لگا۔

لگے لمحے وہ ایک میٹھا سا سپنا سُنا رہا تھا اور پروین مُنہ کھولے حیرت سے اُسے گھورے جا رہی تھی۔

"میں ایک خوبصورت چمن میں کھڑا ہوا تھا! رات کا وقت تھا۔ چاند پُورے آب و تاب کے ساتھ آسمان پر جھکا ہوا تھا۔ کہیں کہیں بادل کا ایک آدھ ٹکڑا سُرمئی رنگ میں ڈوبا اپنی منزل کی طرف دوڑ رہا تھا۔ آسمان کی نیلگوں سیاہی کے پس منظر میں ننھے منے تاروں کی جگمگاہٹ بہت پیاری معلوم ہو رہی تھی۔ دُودھیا چاندنی اور رات کی تاریکی دونوں نے مل کر ایک ہلکے سے اُجیالے کی شکل اختیار کر رکھی تھی جس نے چمن میں پھیلے ہوئے درختوں کے سایوں کو بہت ہلکا بنا دیا تھا۔ پتّوں پر ٹھہرے ہوئے شبنم کے قطرے چاند کے عکس میں موتیوں کا روپ دھارے ہوئے تھے اور ایسے میں شہانی سی پُروائی کے دوش پر نُور کے ہالے میں منوّر ایک تخت اُڑتا ہوا میری جانب آتا نظر آیا۔ اُس تخت پر ساحرہ بیٹھی مُسکرا رہی تھی۔ تخت میرے قریب آتے آتے نیچا ہوتا گیا یہاں تک کہ سر سے ایک ہاتھ کی بلندی پر پہنچ کر رُک گیا اور ساحرہ نے اپنا ایک ہاتھ بڑھا کر مجھے اُوپر آجانے کے لئے اشارہ کیا۔ میں نے اُس کی کلائی پکڑلی اور اُچک کر تخت پر چڑھ ہی رہا تھا کہ ـــــ تم نے جگا دیا!"

سپنا بہت اچھا بن گیا تھا۔ پُوری الف لیلیٰ کہانیوں کا مطالعہ آج کام آگیا تھا۔

"ارے بھائی جان تب تو ہاتھ ملایئے!" پروین خوشی سے چیخی۔

"ہاتھ مِلاؤں ـــــ کیوں؟" اُس نے چہرے پر بناوٹی غصّہ پیدا کرتے ہوئے کہا "اتنے خوبصورت سپنے کا ستیاناس کر کے رکھ دیا اور اب کہہ رہی ہو ہاتھ مِلاؤں!"

"بھائی جان! میں نے سپنے کا ستیاناس نہیں کیا ہے اُسے حقیقت بنالائی ہوں!"

پروین نے مچلتے ہوئے کہا۔ اُس کے ہونٹوں پر شریر اور معنی خیز مُسکراہٹ ناچ رہی تھی۔

"کیا مطلب؟" جاوید نے پلکیں جھپکائیں۔ وہ اُس کی بات سمجھ نہ سکا تھا۔

پروین مُسکرا اُٹھی۔

"آپ کی دوست کب سے آئی ہوئی ہیں اور آپ ہیں کہ اُٹھنے کا نام نہیں لیتے!"

وہ سوچنے لگا۔ وہ کون دوست ہو سکتی ہے؟

"پہچان گئے نا!"

پروین اُسی معنی خیز مُسکراہٹ کے ساتھ [illegible]

جاوید ابھی تک دسوچ سکا تھا کہ وہ کون دوست ہے؟ آخر اُس نے پوچھ لینا ہی بہتر سمجھا۔

"کون دوست ہے وہ؟"

جاوید کے اس سوال پر پروین زور سے ہنس پڑی اور پھر اپنا منہ اُس کے کان کے قریب لے گئی اور بولی۔

"ساحرہ!"

"ساحرہ؟" جاوید بستر سے اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"ہاں بھائی جان! ساحرہ بہت دیر سے آئی ہوئی ہیں اور اُن کی کچھ سہیلیاں بھی ساتھ آئی ہیں۔"

پھر اُس کا لہجہ یکایک بجھا بجھا سا ہو گیا۔

"میں آپ کو نہ جگاتی لیکن ـــــ دیکھئے نا کہ اِس وقت میرے پاس پیسے بھی نہیں رہ گئے ہیں کہ چائے پر بجانے کے لئے کچھ منگوا لیتی ـــــ"

"اوہ! کوئی بات نہیں ـــــ تم اِس کی فکر نہ کرو!" اُس نے پروین کی بات کاٹ دی۔ "وہ سب کچھ میں دیکھ لوں گا اور دیکھو تم اُن لوگوں سے باتیں کرتی رہنا۔ میں ابھی بازار ہو آتا ہوں۔"

جونہی پروین گئی جاوید نے بستر چھوڑا، کپڑے تبدیل کیے اور اُس نے وہ سارے روپے نکال لئے جو اُس نے آج شام کی تفریح کے لئے اُٹھا رکھے تھے اور بازار کی طرف چل پڑا ـــــ بھلا ساحرہ کے مقابلے میں تفریح کیا چیز تھی؟

ساحرہ تھی تو پروین ہی کی سہیلی۔ لیکن وہ جاوید سے بہت زیادہ گھل گئی تھی۔ اِس لئے تھوڑی دیر کے لئے تو وہ اُس پروگرام کو بھی بھول چکا تھا جو آج شام کے لئے اُس نے سوچ رکھا تھا۔ ویسے یاد ہوتا تو بھی وہ اُس کی پروا نہ کرتا ـــــ امرت چھوڑ کر کیچڑ کون چاٹے!

بازار سے واپسی پر پروین کچن ہی میں مل گئی۔ لائی ہوئی چیزیں اُس کے حوالے کر کے جاوید اپنے کمرے میں چلا آیا اور پھر بہت ہی احتیاط سے منہ ہاتھ دھویا، کھونٹی میں لٹکی ہوئی اسپورٹ ٹیرلین پینٹ اور اچھی سی قمیص پہنی اور پروین کے کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں ساحرہ اور اُس کی سہیلیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ لیکن راستے میں پروین خود اُس کی طرف آتی ہوئی مل گئی۔



اُس کی تیاری کو دیکھ کر پروین کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ناچ گئی۔

"آپ ہی کو لینے آ رہی تھی!" پروین نے اُس کے قریب پہنچتے ہوئے کہا۔

"بس۔ میں بھی اُسی طرف آ رہا تھا!"

"وہ تو میں آپ کو دیکھ کر ہی سمجھ گئی تھی۔ خوب بن ٹھن کر جو نکلے ہیں آپ!"

"چل ہٹ شریر کہیں کی!"

پھر دونوں ہنستے ہوئے ساتھ ساتھ پروین کے کمرے کی طرف قدم اُٹھانے لگے۔ راستے میں اچانک پروین رُک گئی۔

"ہائیں! میں تو بھول ہی گئی۔ ابا جان آپ کو یاد کر رہے تھے۔"

"کب؟" وہ پریشان ہو اُٹھا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے ـــــ آپ اُن سے پہلے مل لیجئے ورنہ وہ آپ کی راہ دیکھ رہے ہوں گے۔"

جاوید کی تو ابا جان کے نام ہی سے جان نکل جا رہی تھی۔ بھلا وہ ان کے بلاوے کو کیسے ٹال پاتا۔ فوراً وہ جل تو جلال تو کا ورد کرتے ہوئے ابا جان کے کمرے کی طرف بڑھا۔ اندر اس کے ابا جان اخبار دیکھ رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی انہوں نے یکایک کچھ اس طرح سے سوال کیا کہ وہ گھبرا گیا۔

"کہاں تھے۔ کہیں جا رہے تھے؟"

"جی۔۔۔ جی نہیں۔۔۔ جی ہاں، ذرا باہر جا رہا تھا" گھبراہٹ میں وہ ہکلانے لگا تھا اور جب ذرا اوسان بحال ہوئے تو وہ گویا ہوا۔

"آپ نے مجھے یاد فرمایا تھا۔۔۔ ابا جان؟"

"تمہیں۔۔۔ نہیں تو!"

یہ سنتے ہی وہ ابا جان کے کمرے سے نکل بھاگا۔ جان بچی لاکھوں پائے کے مصداق اسے اس وقت خوش ہو جانا چاہیے تھا لیکن پروین کی شرارت اسے یاد آ گئی اور وہ غصہ میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے پروین کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ لیکن کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اندر ہونے والی بات چیت کی آواز سن کر اس کے قدم رک گئے اور وہ اندر جانے کی بجائے وہیں دروازے سے ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔

"۔۔۔ یہاں بھی اتنے اچھے نہیں ملتے۔ بھائی جان شاید کہیں دور سے لائے ہیں" پروین کہہ رہی تھی "کیونکہ ساحرہ کھائے گی نا!!"

پھر کچھ لڑکیوں کے کھل کھلا کر ہنسنے کی آواز آئی۔ وہ سمجھ گیا کہ کیک کی تعریف ہو رہی ہے اور ساحرہ کو چھیڑا جا رہا ہے۔ اس کا پارہ کچھ اتر آیا اور وہ وہیں جم کر کھڑا ہو گیا۔

"تم اپنے بھائی جان کو خواہ مخواہ پریشان کر رہی ہو" کوئی لڑکی کہہ رہی تھی۔

"ہاں یہ تم نے ان پر بہت بڑا ظلم کیا ہے" کوئی دوسری ہمدردی جتا رہی تھی۔

"ارے واہ! یہ تو رسم ہے۔ ظلم کیسا؟" یہ پروین کی آواز تھی۔

"اب ایسی بھی کیا رسم جس میں کسی کا نقصان ہی نقصان ہو؟"

"نقصان ہی نقصان؟ ہونہہ۔ کھا کر تو دیکھو یہ پیسٹری کیسی لذیذ لگتی ہے!" یہ نہ جانے کس چنچل سہیلی کی آواز تھی جو مفت کا مال اڑا کر سینہ زوری دکھا رہی تھی۔

اور پھر کئی زوردار قہقہوں میں چمچوں اور پلیٹوں کی آواز دب کر رہ گئی۔

جاوید کا غصہ سرد پڑ گیا تھا۔ اس گفتگو سے اس کے سارے جذبات دھل سے گئے تھے۔ اب کمرے کے اندر سے آتے قہقہے اسے بہت بھلے معلوم ہو رہے تھے اور اندر جانے کی خواہش اس کے دل میں چٹکیاں لینے لگی تھی۔ اب باہر کھڑے رہنا اس کے ضبط سے باہر ہو رہا تھا۔ اس لئے اس نے کھنکارتے ہوئے کمرے کے اندر قدم رکھ ہی دیا۔ لیکن دو قدم بھی بڑھنے نہ پایا تھا کہ پروین اور دوسری لڑکیوں نے چیخوں سے کمرے کو سر پر اٹھا لیا۔ کچھ ان چیخوں نے اور کچھ اندر کے منظر نے اسے الٹے پاؤں باہر بھگا دیا اور پھر یکدم سے بلند ہوتی ہوئی ہنسی کی پھوار نے اس کے جسم کو تر بتر کر دیا۔ مرد ہوتے ہوئے بھی وہ اس وقت شرم سے پانی پانی ہو گیا تھا! پسینے میں وہ سر سے پیر تک نہا گیا تھا۔ کچھ دیر تک تو اس کا دماغ معطل رہا اور پھر جب اس کے ہوش یکجا ہوئے تو وہ محسوس کر پایا کہ پروین کی شرارت نے اس کی کیسی بری گت بنا ڈالی تھی۔ پروین پر اس کا غصہ تازہ ہو گیا۔ اس کا جی چاہا اسی وقت پروین کو باہر بلا کر اسے برابر کی سزا دے ڈالے!

اس نے فوراً پروین کو آواز دی۔ اس کی تیز آواز سن کر اندر ہنسنے کی آوازیں بند ہو گئیں۔ پھر پروین کی آواز آئی۔

"آتی ہوں بھائی جان!"

اس نے کمرے کے اندر ہی سے اتنے ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو!

وہ جل کر رہ گیا۔

کچھ ثانیے اسی طرح خاموشی میں گزر گئے۔

پھر پروین ہنستی ہوئی کمرے کے دروازے پر آکر رک گئی۔ وہ ایک ہاتھ سے منہ پر رومال رکھے ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

جاوید کا پارہ یکدم چڑھ گیا۔

"یہ سب کیا ہے؟" وہ دھاڑا۔

"اپریل فول!۔۔۔ اور کیا؟"

پروین کے جواب کے ساتھ ہی کمرے کے اندر سے قہقہوں کا فوارہ پھر چھوٹا اور اسے محسوس ہوا جیسے اس کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی ہو!!

غزل

فیاض احمد صاحب فیاض گوالیاری بی۔ اے

ہر کوئی جا رہا ہے مجھے دیکھتا ہوا
بیٹھا ہوں راستے میں تماشہ بنا ہوا

اک آس پر ہے سانس کا ڈورا لگا ہوا
تنکا ہے ڈوبتے کا سہارا بنا ہوا

سب کچھ مجھے ملا۔ جو ملا دل دکھا ہوا
جو داغ ہے، چراغ ہے ان کا دیا ہوا

یوں ہے تمہاری یاد مری زندگی کے ساتھ
کانٹوں میں کوئی پھول ہو جیسے کھلا ہوا

ساقی کی ہر ادا میں نشہ تھا شراب کا
میں بے پیے ہوئے بھی اٹھا جھومتا ہوا

ٹکرا کے گر پڑا وہ اجالوں کے شہر میں
سایہ جو میرے ساتھ چلا دوڑتا ہوا

ہر شخص چاہتا ہے کہ سجدہ کرے کوئی
ہر آدمی ہے حضرت آدم بنا ہوا

سمجھا تھا میں کہ میرے ہی گھر میں لگی ہے آگ
شعلوں میں اک جہان نظر آیا گھرا ہوا

وہ آئے تھے اور مجھ کو نہ پا کر چلے گئے
میں اپنے آپ ہی کو رہا ڈھونڈتا ہوا

ہلکی سی اک چمک تری آنکھوں میں دیکھ کر
پھر جل اٹھا کہیں کوئی تارا بجھا ہوا

تم اور مجھ پہ چشم عنایت! چلو ہوئی
تم سے کسی کے غم کا مداوا ہوا، ہوا

دھرتی کی گود میں تھیں ستاروں کی دھڑکنیں
انسان آسماں پہ پھرا ڈھونڈتا ہوا

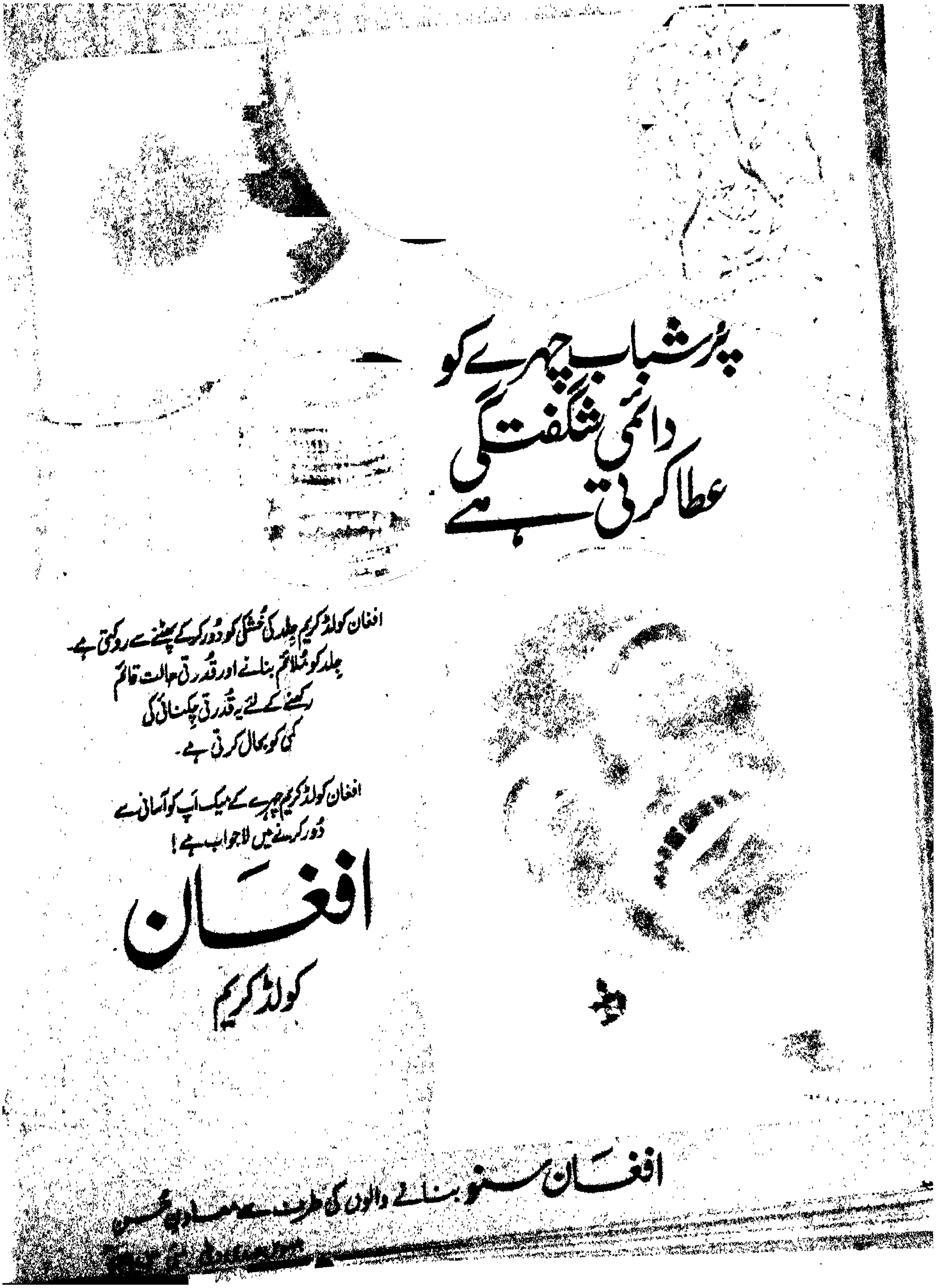
جنت کو چھوڑنے کی جسارت نہ کر سکا
انسان آدمی نہ بنا۔ یہ برا ہوا

سو بار لوٹ لی غم دوراں نے زندگی
سو بار زندگی کا مجھے حوصلہ ہوا

اک موج تھی، جو جھک کے سمندر میں رل گئی
اک قطرہ تھا جو پھیل گیا اور فنا ہوا

مجھ کو کسی سے کام، نہ دنیا کو مجھ سے کام
پھر کیوں ہے میری راہ میں میلا لگا ہوا

فیاض کر رہا ہے زمانہ مرا طواف
بیٹھا ہوا ہوں راہ میں کعبہ بنا ہوا


پُر شباب چہرے کو
دائمی شگفتگی
عطا کرتی ہے
افغان کولڈ کریم جلد کی خشکی کو دُور کر کے پھٹنے سے روکتی ہے
جلد کو مُلائم بنانے اور قُدرتی حالت قائم
رکھنے کے لئے یہ قُدرتی چکنائی کی
کمی کو بحال کرتی ہے۔
افغان کولڈ کریم چہرے کے میک اپ کو آسانی سے
دُور کرنے میں لاجواب ہے!
افغان
کولڈ کریم
افغان سنو بنانے والوں کی طرف سے

شکست

شمیم فاطمہ خان ایم۔ اے
ریسرچ اسکالر (اُردو) شعبۂ اُردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محترمی ایڈیٹر صاحب! تسلیم

"بیسویں صدی" کی بزم میں پہلی بار شریک ہونے کی جسارت کر رہی ہوں اور وہ بھی "شکست" کے ساتھ! اب "شکست" کے بارے میں کیا کہوں؟ "شکست" تو بہرحال شکست ہی ہوتی ہے، چاہے وہ جن حالات، جن وجوہ سے ہو۔ اگر پسندِ خاطر ہو تو کسی شمارے میں شامل کر کے ممنون فرمائیں۔ آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

——— شمیم فاطمہ خان

★

جہاز ساحل سے دُور ہوتا گیا اور رُومالوں کے کبوتر فضاؤں میں کہیں گم ہو گئے۔ میں ریلنگ کا سہارا لئے اُن میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔

"پروین!" تخیل میں ایک دلکش و دلنواز چہرہ اُبھرا۔ کاش اگر میں اُس کا خلوص کھو نہ چکا ہوتا تو وہ ساحل پر موجود ہوتی اور شاید ——— ارشد بھی!

ساحل پیچھے رہ گیا تھا اور سامنے نیلے آسمان اور سمندر کے سوا کچھ نہ تھا، جو میرے مستقبل کی طرح سپاٹ تھے لیکن میرا ذہن دُور کہیں ماضی کی گرد میں نشانوں کی تلاش میں مصروف تھا ———

پروین میری بات پہ بے ساختہ ہنس رہی تھی جیسے گلاب کا پھول چٹک کر کھل گیا ہو اور ارشد اُس کے چہرے کے نقوش میں کھو گیا تھا۔ میں بُری طرح جھنجھلا گیا۔

'یہ شخص پروین کو اِس طرح کیوں دیکھتا ہے؟'

لیکن وہ پروین کا دوست تھا۔ ایسا دوست جس کے ساتھ وہ اپنی فرصت کا ایک ایک لمحہ گزارنا پسند کرتی تھی۔

پروین میرے ماموں کی بیٹی تھی۔ ہم دونوں ہم عمر تھے اور بچپن کے دوست تھے۔ میں اُس پہ اپنا پورا حق سمجھتا تھا۔ اِس احساس میں میرا زیادہ قصور بھی نہ تھا۔ میں بچپن سے سُنتا آیا تھا کہ پروین میری ہے۔ امی بہت پیار سے ہم دونوں کو دیکھ کر کہا کرتی تھیں۔

'بھئی پروین تو میرے سلیم کے لئے بنی ہے! دیکھو کتنے پیارے لگتے ہیں دونوں ایک ساتھ!'

یہ احساس اتنا شدید تھا کہ میں اُسے کسی دوسرے کے ساتھ دیکھنا پسند نہ کرتا تھا ——— اور اسی بات پر ہم دونوں کی لڑائی ہو جاتی۔

یوں تو پروین بھی مجھے بہت چاہتی تھی، میری ہر بات کا خیال رکھتی، میری ذراسی تکلیف اُسے گوارا نہ تھی۔ لیکن جو بات مجھے پسند نہ تھی وہ یہ تھی کہ اُس نے کبھی میری برتری تسلیم نہیں کی۔ وہ ہمیشہ جتا دیتی تھی کہ وہ مجھ سے بڑی ہے۔ گو یہ بڑائی چند مہینے سے زیادہ نہ تھی۔

وہ فطرتاً خوش مزاج تھی۔ اُس کی چمکتی ہوئی آنکھیں اور مُسکراتے گلابی لب اُس کا حُسن تھے۔ جیسے کلیوں نے اپنی مُسکراہٹیں اُس کے ہونٹوں پر سجا دی ہوں! جیسے دُنیا کی ساری رعنائیاں اِس ایک پیکر میں سمٹ آئی ہوں۔ ہر ایک پر اُس کی مہربانی نہ جانے کیوں مجھے کرب

میں اکثر سوچتی تھی جب وہ [illegible] میں پھر احساس کو [illegible] وقت
گزر جاتا۔ وہ گھر [illegible] اِس طرح رچ بس جاتی تھی کہ اجنبیت کا کوئی
احساس باقی نہ رہتا تھا اور میں سوچا کرتا۔ وہ میری ہے۔ یہ گھر اُس کا
اپنا ہے جو وہ بھی یقیناً اِس بات کو جانتی ہے۔ میں اُس سے کھل کر
بات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن خواہش کے باوجود میں کبھی ہمت نہ کر سکا۔
اُس کی بے تکلفی میں عجیب تکلف تھا۔ وہ ہر بات کو ہنسی میں اُڑا دیتی
تھی۔ رکھ رکھاؤ کا یہ انداز مجھے تکلف کے پردے کو ہاتھ لگانے
سے بھی روک دیتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اُس کی شوخی سمندر کے جھاگ
سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔

گریجویشن کے بعد بھائی جان کی مرضی تھی کہ میں بزنس کورس
کے لئے باہر چلا جاؤں۔ لیکن میں نے ضد کر کے اُسی جگہ داخلہ لے لیا
جہاں پروین پڑھتی تھی۔ اُن لوگوں کے اصرار پر میں ہوسٹل سے
اُن کے گھر آ گیا۔ ہم دونوں کے موضوع مختلف تھے۔ لیکن کالج اور
گھر ایک تھا۔ اس لئے مجھے اُمید تھی کہ ہم زیادہ قریب آ سکیں گے
اور شاید ایک دن میں اِس پردے کو نوچ کر پھینک سکوں گا جو
ہمارے درمیان حائل ہے۔

یہیں ارشد سے پہلی ملاقات ہوئی۔ پروین نے تعارف کراتے
ہوئے کہا تھا۔

"سلیم! یہ ارشد صاحب ہیں۔ مجھ سے سینئر ہیں اور میرے
بہت اچھے دوست ہیں! ریسرچ کر رہے ہیں۔"

پھر ارشد سے مخاطب ہوئی۔

"ارشد صاحب! یہ میرے کزن سلیم ہیں۔ ہم دونوں بچپن کے
دوست ہیں۔ لیکن یہ مجھ سے چھوٹا ہے!"

پروین مجھے چھیڑنے کے لئے اکثر ایسے جملے کہہ دیتی تھی۔ لیکن
اُس دن نہ جانے کیوں مجھے غصہ آ گیا۔

"ٹھیک ہے تم نہیں چاہتی ہو کہ میں تمہاری اور تمہارے
دوست کی باتوں میں مخل ہوں تو میں چلا جاتا ہوں۔"

"کیا کہہ رہے ہو سلیم! دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟" پروین
حیران رہ گئی۔ میں اُٹھ کر چلا گیا۔ لیکن بعد میں مجھے اُس سے نہیں ارشد
سے بھی اپنے رویّے کی معذرت کرنا پڑی۔

رفتہ رفتہ میں ارشد اور پروین کو ساتھ دیکھنے کا عادی
ہو گیا۔ میں اب بھی اکثر اُن دونوں کے ساتھ ہوتا۔ کبھی [illegible]
بھی اُس گروپ میں شامل ہوتے۔ لیکن ارشد [illegible]
ایک ساتھ ضروری تھی۔ میں نے اکثر [illegible]
ہے جو پروین کو متاثر کرتی ہے۔ وہ ایک معمولی [illegible]
اُس سے گریز [illegible] اور [illegible]
اُس کی شخصیت پُرکشش ہرگز نہ تھی۔

ایک دن [illegible] پروین کے ساتھ بیٹھا تھا۔ [illegible]
طلعت کا کوئی ریکارڈ آ رہا تھا اور پروین آنکھیں بند کئے اُس کی
لے پر گنگنا رہی تھی کہ اچانک میں نے سوال کیا۔

"پروین! تمہاری اور ارشد صاحب کی دوستی کچھ عجیب سی
معلوم ہوتی ہے۔ بھئی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ دوستی ہو کیسے گئی؟"

پروین نے آنکھیں کھول کر چند لمحے دیکھا پھر مسکراتے
ہوئے سیدھی ہو بیٹھی۔

"سلیم! تم نے کبھی غور کیا ہے ارشد صاحب کو دیکھ کر
پگھلتی ہوئی شمع کا خیال آتا ہے؟"

"بھئی معاف کرنا یہ شاعرانہ ذہن ہمارے حصہ میں نہیں آیا ہے
اس لئے ہم سے سیدھی سادی زبان میں بات کیا کرو۔"

"ارے جاؤ تم تو رہے کورے کے کورے۔ [illegible]
کے لئے [illegible] الفاظ کا استعمال ہو سکتا ہے [illegible]
[illegible] جاتا ہے۔"

"اچھا تو جناب بہت نازک احساسات رکھتی ہیں ارشد
صاحب کے لئے؟"

"ہاں بس سمجھتے ہیں [illegible] کیا؟" وہ پھر آنکھیں بند کئے
گنگنانے لگی۔

تو یہ بات ہے۔۔۔ لیکن [illegible]
طرح پروین کو دیکھ رہا تھا۔ [illegible]
معلوم ہوتا ہے میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ارشد میں [illegible]
ایسا کچھ بھی نہ تھا۔ ارشد جو کوئی ایسی [illegible]
حسین لڑکی کو متاثر کرے۔ پروین [illegible]
لیکن ایسا تھا۔

[illegible]

'ارے ہاں مجھے یاد ہی نہ رہا!' وہ ہنس پڑی۔ میری نظر اُس کی خوبصورت اُنگلی پر جم کر رہ گئی جس میں ایک نازک سی انگوٹھی جگمگا رہی تھی! پروین نے شاید میری نظروں کے مرکز کو محسوس کر لیا تھا کیونکہ وہ میری توجہ ہٹانے کے لئے پتہ نہیں کیا کیا سنا رہی تھی اور ہنستی جا رہی تھی۔

میں اُس دن دیر تک بستر پر پڑا سوچتا رہا۔ میری تنہائیاں نہ جانے مجھ سے کیا کیا کہتی رہیں۔ مجھے زندگی میں پہلی بار شکست کا احساس ہُوا تھا۔ شام تک جذبۂ رقابت مجھے کمینگی کی حد تک پہنچا چُکا تھا۔ میں اُس سے کہہ رہا تھا۔

'پروین! یہ انگوٹھی تو بہت معمولی ہے۔ تمہارا ذوق اتنا پست کب سے ہو گیا؟'

اُس کے چہرے پر ایک لمحہ کے لئے دُکھ کی لہر نظر آئی۔ پھر ہلکے سے بل پیشانی پر آ گئے۔

'سلیم! تم شاید ذوق کا اندازہ محض قیمت سے لگاتے ہو۔ لیکن بعض کم قیمت نگینے بہت تابناک ہوتے ہیں۔' وہ بے نیازی سے کتاب پر جھک گئی۔ جیسے میرا وجود اُس کے سامنے ہی نہ ہو۔ شاید پہلی بار سنجیدگی سے میری کوئی بات اُسے بُری معلوم ہوئی تھی۔

زندگی لہروں کے دوش پر رواں تھی۔ لیکن تہہ میں ہلچل شروع ہو گئی تھی۔ میرا دل پڑھنے سے بیزار ہو چکا تھا۔ یوں بھی تعلیم سے میری دلچسپی ذاتی تھی۔ اِس احساس سے زیادہ تھی کہ میں پروین کے قریب بھی رہنا چاہتا تھا اور یہ بھی نہ چاہتا تھا کہ اُس سے کسی طرح کمتر رہوں۔ ارشد کا کام ختم ہو گیا تھا اور وہ جانے والا تھا۔ میں پروین کے جذبات کو محسوس کر رہا تھا . . . ایک دن اُس نے اطلاع دی۔

'ارشد آج جا رہے ہیں۔ تم ملوگے نہیں اُن سے؟'

'بھئی وہ . . . آج ذرا مجھے کام ہے۔ دیکھو اگر وقت نکال سکا تو ضرور ملوں گا۔ ورنہ تم میری طرف سے معذرت کر لینا۔'

'اچھا!' وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہوئی چلی گئی۔

ارشد چلا گیا، میں اُس سے نہ مِلا۔ مجھے معلوم تھا کہ پروین کے پاس ارشد کے خطوط آتے ہیں۔ میں اُن کے جذبات سے بھی واقف تھا۔ میری ذہنی کشمکش بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے جب بھی جس چیز کی خواہش کی تھی، مجھے مِل گئی تھی اور پروین ـــــ اُسے تو میں تصوّر کرتا تھا اگر میں اپنی ساری خصوصیات کے باوجود پروین کو اتنا متاثر نہ کر سکا تھا جتنا ارشد نے چند سال کے عرصہ میں کیا تھا۔ میں اُس کا ممنون تھا۔ بچپن کا دوست تھا۔ جسے وہ پسند بھی کرتی تھی۔ لیکن ارشد ـــــ اُس کے لئے کچھ اور معنی رکھتا تھا۔ یوں تو وہ ارشد کو بھی اکثر پریشان کرتی۔ خواہ مخواہ اُس کی رائے سے اختلاف کرتی۔ اُس سے بحث کرتی۔ لیکن وہ خاموشی سے مُسکراتے ہوئے سرِ تسلیم خم کر دیتا۔ وہ ہار کر بھی شاید جیت جاتا تھا ـــــ اور میں جانتا تھا۔ ارشد سے اُس کی دوستی میرے مقابلہ میں کہیں زیادہ سنجیدہ ہے، زیادہ گہری ہے۔

میں اُن دونوں سے دُور رہنے لگا۔ اِس لئے نہیں کہ میں اُنھیں ایک دُوسرے کے قریب آنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ بلکہ اِس لئے کہ میں اُن کا ساتھ برداشت نہ کر سکتا تھا۔

ارشد مجھ سے بڑے بھائی کا سا سلوک کرتا تھا۔ میری موجودگی میں دونوں میری طرف متوجہ رہتے۔ لیکن میں ذہنی طور پر کوفت میں مبتلا ہو جاتا۔ ہم دونوں گھر سے ایک ساتھ کالج کے لئے روانہ ہوتے، لیکن وہاں پہنچتے ہی ہمارے راستے مختلف ہو جاتے۔

کبھی کبھی میرے ذہن پر بچپن کا ضدی سلیم پُوری طرح حاوی ہو جاتا، جو پروین کو کسی دوسرے کے ساتھ کھیلتا دیکھ کر ہاتھ پکڑ کر کھینچ لاتا تھا۔ پروین ناراض ہو جاتی تھی۔ لیکن میں اُسے پھر منا لیتا تھا۔ میرے قدم بار بار اُس کی طرف بڑھتے ہوئے رُک جاتے۔ اب اُسے ہاتھ پکڑ کر کھینچ لانا میرے بس کی بات نہ تھی۔ اُس کی سنجیدگی چند ہی قدم پر روک دیتی تھی۔

ایک دن کالج سے واپسی پر میں پروین کو لینے گیا۔ ارشد حسبِ معمول اُس کے ساتھ میرا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن آج وہ مجھے ہمیشہ سے کچھ مختلف نظر آیا۔ کوئی تو تھی جو اُس کے چہرے کو روشن کئے ہوئے تھی۔ وہ زیادہ سنجیدہ اور پُروقار معلوم ہو رہا تھا۔ پروین کے رُخساروں پر سونا سا پگھل رہا تھا۔

'اوہو سلیم بھئی بہت بھوک لگ رہی ہے، تم نے بہت دیر کر دی!'

'تم چلی گئی ہوتیں، تمھیں تو معلوم تھا آج میرا کلاس دیر تک ہے۔'

بیسویں صدی دہلی مئی ۱۹۷۳ء

میں بھی کسی دوسرے کی نہ دیکھ سکتا۔ میں نے پاگلوں کی طرح بار بار سوچا تھا کہ میں اُس کی جان لے سکتا ہوں۔ لیکن وہ میرے سوا کسی اور کی ہو جائے یہ ممکن نہیں! میں نے خود کو سمجھانا چاہا۔ بچپن سے دی گئی اخلاقی تعلیمات کو دُہرایا۔ مجنوں اور فرہاد کی روایات کا جائزہ لیا۔ لیکن ـــــ امتحان ختم ہوتے ہی میں گھر گیا تو ایک دن میں نے امّی سے کہہ دیا کہ ابھی شادی نہیں ہو سکتی تو وہ پروین سے میری منگنی کر دیں۔ امّی میری اِس جلد بازی پر حیران بھی ہوئیں اور خوش بھی۔ کیونکہ میں ہی اُنھیں اِس سلسلہ میں روکتا رہا تھا۔ اب مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اِتنی دیر کیوں کی۔ ہمارے درمیان آنے والی دیوار ارشد تھا۔ ورنہ پروین مجھے ناپسند نہ کرتی تھی۔

پیغام بھیجے کافی دن ہو گئے لیکن اُدھر سے کوئی صحیح جواب نہ آیا۔ چھٹیوں کے بعد میں اُس کے گھر میں داخل ہُوا تو چاروں طرف طوفان سے پہلے کی خاموشی طاری تھی۔ ہر شخص ایک دُوسرے سے کھنچا کھنچا نظر آتا تھا۔ پروین سے سامنا ہُوا تو کچھ دیر ہم خاموش ایک دُوسرے کو دیکھتے رہے۔ میں الفاظ تلاش ہی کر رہا تھا کہ وہ بول پڑی۔

'سلیم! تم نے جانتے بُوجھتے یہ طوفان کیوں اُٹھایا؟'

'لیکن پروین . . . دیکھو میرا اِس میں کیا قصور ہے، یہ تو امّی کی خواہش تھی۔' میں اُس سے نظریں چُرا رہا تھا۔ اُس کے سامنے نہ جانے کیوں میں بُزدل بن جاتا تھا۔ آخر میں نے کہہ دیا۔

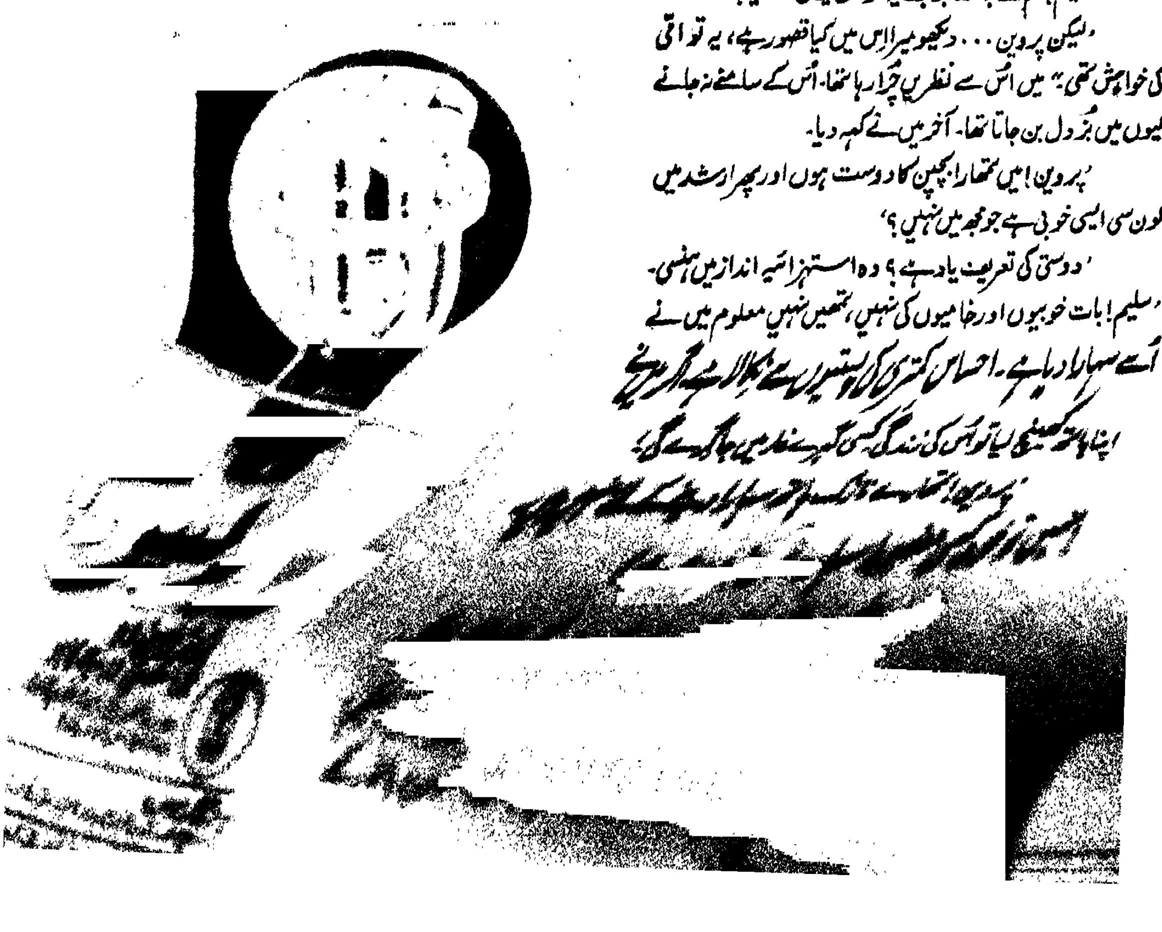
'پروین! میں تمھارا بچپن کا دوست ہوں اور پھر ارشد میں کون سی ایسی خوبی ہے جو مجھ میں نہیں؟'

'دوستی کی تعریف یاد ہے؟' وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ 'سلیم! بات خوبیوں اور خامیوں کی نہیں، تمھیں نہیں معلوم میں نے اُسے سہارا دیا ہے۔ احساسِ کمتری کی دلدل سے نکالا ہے۔ اگر میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تو اُس کی زندگی کس کرب میں [illegible] [illegible]

میں نے بہت سوچنے کے بعد امّی کو خط لکھا کہ وہ رشتہ واپس لے لیں۔ جواب میں وہ خود آ گئیں اور اِس شدّت سے میری [illegible] لے ڈالی کہ میں دیوانہ ہو گیا ہوں۔ اب وہ میری کوئی بات [illegible] نہ اپنی بات واپس لیں گی۔

پھر امّی سے مجھے معلوم ہُوا کہ میرے مقابلہ میں ارشد ہے۔ امّی کو حیرت تھی کہ ارشد کو میرے مقابلہ کے قابل کیوں سمجھا جا رہا ہے۔ اُنھیں معلوم نہ تھا کہ پروین کی رائے ارشد کے حق میں ہے۔ ممانی جان دل کی مریض تھیں اور آج کل شدید اُلجھن میں مُبتلا تھیں۔ اُدھر امّی کا اثر تھا جس کی وجہ سے پروین کے والد میری طرف جُھک رہے تھے اور دُوسری طرف پروین کی ضد تھی۔

اب میرے لیے اُس گھر کی فضا تکلیف دہ ہو گئی تھی۔ میں امّی کے ساتھ ہی واپس آ گیا اور تعلیم کا خیال چھوڑ کر میں نے کاروبار کی طرف توجّہ کی۔ بھائی جان بہت خوش ہوئے کیونکہ اِتنا بڑا کاروبار اکیلے سنبھالنے میں اُنھیں بہت دُشواری ہو رہی تھی۔ میں گھر کے افراد اور کام میں خود کو مصروف رکھتا۔ پھر بھی اکثر لمحات مجھ سے



سوال کرنے۔ کیا میں دوستی کا حق ادا کر رہا ہوں؟ پروین پہلے مجھے پسند تو کرتی تھی۔ مجھ پر مہربان تو تھی۔ اب تو شاید نفرت کرنے لگی ہے۔ میری طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی۔ اگر اس نے مجھے صاف دیکھا تو کیا ہوگا؟ اس کے باوجود میں انکار کی ہمت نہ کر سکا اور میں نے وقت کے بھنور میں خود کو بے دست و پا چھوڑ دیا۔

ایک دن مجھے اطلاع ملی کہ ان لوگوں نے رشتہ منظور کر لیا ہے۔ امی بہت خوش تھیں۔ لیکن میری سمجھ میں نہ آیا کہ خوش ہوں یا پریشان؟ امی منگنی کی رسم ادا کرنے کے لئے چلی گئیں۔ میری مصروفیات نے مجھے جانے کی اجازت نہ دی۔ لیکن انگوٹھی میں نے اپنی پسند سے بھیجی۔ وہاں سے آکر امی نے بتایا۔

'بھئی پروین تو بہت شرمیلی ہے۔ میرے سامنے بہت کم آئی۔ اِدھر امتحان کی مصروفیت کے باعث کمزور بہت ہو گئی ہے۔'

میں اس سے مل کر اس کے تاثرات جاننے کے لئے بیقرار تھا۔ پہلی فرصت میں کام کے بہانے میں نے وہاں جانے کا پروگرام بنایا۔ بھائی جان اور بھابی نے مجھے بہت چھیڑا، لیکن میں روانہ ہو گیا۔

گھر پہلے کی طرح پرسکون تھا۔ ممانی جان ویسی ہی خوش مزاج نظر آئیں۔ ہر فرد پہلے سے زیادہ تپاک سے ملا۔ پروین البتہ نظر نہ آئی اور نہ میں ہی اس کے بارے میں پوچھنے کی جرأت کر سکا۔

رات کے کھانے کے بعد لان پر مجھے اس کی جھلک نظر آئی اور میں دھیرے سے وہاں پہنچ گیا۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے رک کر میرے سامنے کرسی پر آبیٹھی۔

'کہئے سلیم صاحب کیسا مزاج ہے؟ بہت عرصہ بعد اِدھر آئے؟'

مجھے اس کے لہجہ کا یہ تکلف ناگوار گزرا۔

'شاید تم اب تک مجھ سے ناراض ہو۔ حالانکہ میں نے امی کو سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ ہاں اِس بات سے میں انکار نہیں [illegible] کہ یہ میری بچپن کی خواہش ہے کہ تم میری ہو جاؤ۔ پروین! کیا [illegible] خلوص کسی رحم کا مستحق نہیں ہوں؟ دیکھو مجھے بھی [illegible] ساتھ کی ضرورت ہے۔' میں [illegible]

[illegible] پہنچ گیا [illegible]

[illegible] سلیم [illegible] صرف اچھی [illegible]

[illegible]

'ہاں اِس کا افسوس ہے کہ یہ جانتے ہوئے کہ میرے ہاتھ کمزور ہیں، میں نے کسی کو سہارا دینے کی کوشش کی۔'

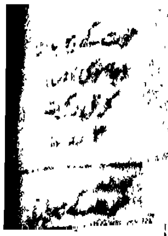
اس نے اپنے ہاتھوں کا جائزہ لیا اور میری نظر اس کی انگلی پر جم کر رہ گئی جہاں ارشد کی دی ہوئی انگوٹھی میرا منہ چڑا رہی تھی۔

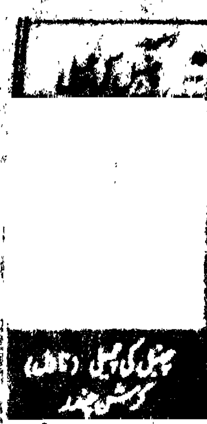
'پروین!... یہ کیا؟' میں تڑپ گیا۔

'انگوٹھی ایک ہی انگلی میں اچھی لگتی ہے اور اِس میں پہلے سے موجود ہے!' اس نے بہت سکون سے کہا اور اٹھ کر چلی گئی۔

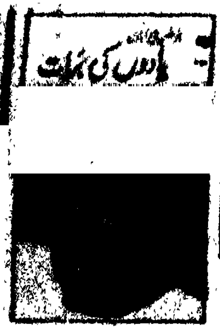
شکست کی تلخی زہر بن کر میرے وجود میں سرایت کر گئی۔ اور میں ایک لمحہ میں اس فیصلہ تک پہنچ گیا، جو مدت سے نہ کر پایا تھا۔

ایک اونچی لہر ریلنگ سے ٹکرائی اور ماضی کے نقوش کو مٹاتی چلی گئی۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ فضا میں اب کوئی کبوتر نہ تھا، جو کسی ساحل کی نشاندہی کرتا!!



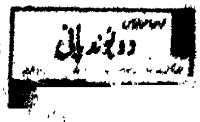


چمبل کی چمپا (ناول)
کرشن چندر
۲ روپے ۵۰ پیسے

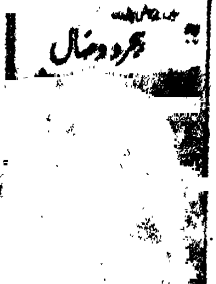


یادوں کی برات (سوانح)
جوش ملیح آبادی
۳ روپے ۵۰ پیسے

دو بوند پانی (ناول)
خواجہ احمد عباس
۲ روپے ۵۰ پیسے



ہند پاکٹ بکس کا نیا سیٹ



ہجر و وصال (شاعری)
مرتبہ: پرکاش پنڈت
۲ روپے ۵۰ پیسے

دیگر مطبوعات

ڈھائی روپیہ سیریز میں:

کارنیوال	(ناول)	کرشن چندر
آئینے کی چوری	"	
ایک عورت ہزار دیوانے	"	
سات ہندوستانی	"	
میں پھر آؤں گی	"	اے حمید
دیپ اور دل	"	عادل رشید
باسٹھ دن	"	دت بھارتی
رات اندھیری ہے	"	مہندر ناتھ
اُردو شاعری کی رنگینیاں	(شاعری)	مرتبہ: پرکاش پنڈت
اُردو غزل کے نئے رنگ	"	"

تین روپیہ سیریز میں:

نرملا	(ناول)	پریم چند
دل کی وادیاں سو گئیں	"	کرشن چندر
کٹی پتنگ	"	گلشن نندہ
پیاسا ساون	"	"
جھیل کے اس پار	"	"
ٹیڑھی انگلیاں	(جاسوسی ناول)	کرنل رنجیت
وہ کون تھا؟	"	"
خونی کنگن	"	"
بھیانک موتی	"	"
خون کے چھینٹے	"	"
آپ بیتی	(سوانح)	خان عبدالغفار خاں

ساڑھے تین روپیہ سیریز میں:

عجیب آدمی	(ناول)	عصمت چغتائی

گلکاریاں		فراق گورکھپوری

اختیارات

میری سیسو		خلیل جبران
انمول موتی		مرتبہ: ماتس بخش
جنسی تعلقات کے عجیب و غریب پہلو		ڈاکٹر لکشمی نارائن

ڈیڑھ روپیہ سیریز میں:

اُردو کی بہترین رومانی نظمیں	(شاعری)	مرتبہ: پرکاش پنڈت
اُردو کی بہترین غزلیں	"	"
شادی کے بعد	(جنسیات)	ڈاکٹر لکشمی نارائن
عورت	"	"
میاں بیوی کے تعلقات	"	"
قتل کا راز	(جاسوسی ناول)	کرنل رنجیت
چھ لاشیں	"	"

دو روپیہ سیریز میں:

ایک عورت ہزار دیوانے	(ناول)	کرشن چندر
دل کی وادیاں سو گئیں	"	"
پیار ایک خوشبو	"	"
پہلگام کا بدنام	"	"
خوشبو کا خواب	"	"
جنگلی کبوتر	"	اے حمید
کالے کوس	"	عصمت چغتائی
میلی چاندنی	"	بلونت سنگھ
سانپ کی بیٹی	"	گلشن نندہ
محبت اور قتل کے پراسرار مقدمے	(جاسوسی ناول)	کرنل رنجیت
میخانہ		پرکاش پنڈت
استاد شاعروں کا کلام	(شاعری) مرتبہ:	"
برتھ کنٹرول	(جنسیات)	ڈاکٹر لکشمی نارائن
جنسی مسائل	"	"

ایک روپیہ سیریز میں:-

ناول

شہید	ملک راج آنند
عورت اور آبشار	بلونت سنگھ
ایک معمولی لڑکی	"
خلش	امرتا پریتم
جگنو اور ستارے	جیلانی بانو
بند گلی	ہنس راج رہبر
محبت یا ہوس	ٹالسٹائی
یاد	پرل بک
قصہ چار درویش	میر امن دہلوی
فسانۂ عجائب	رجب علی بیگ سرور

افسانے

فرانس کے عظیم ناول	مرتبہ: رانگے راگھو
روس کے عظیم ناول	"
انگریزی کے عظیم ناول	"
پلنگ	اوپندر ناتھ اشک

طنز و مزاح

کامریڈ شیخ چلی	کنہیا لال کپور
گستاخیاں	"
وارنٹ گرفتاری	فکر تونسوی
بک رہا ہوں جنوں میں	پرکاش پنڈت
کانچ کے ٹکڑے	کرشن چندر
فلمی قاعدہ	"

شعر و شاعری

گیتانجلی	ٹیگور

انگلینڈ میں ہند پاکٹ بکس ملنے کا پتہ:- ورردی برادرز
59، ٹاؤن سینڈ روڈ، ساؤتھ آل، مڈلسیکس

ہند پاکٹ بکس پرائیویٹ لمیٹڈ

قطعات

پروفیسر ڈاکٹر امانت ایم اے، پی ایچ ڈی

آغوشِ فطرت:

ساقیا لا پلا شرابِ طہور | ہوں میں فطرت کی گود میں مسرور
ابر پاروں کا یہ خرامِ جمیل | رقص پر کر رہا ہے پھر مجبور

لمسِ حُسن:

حُسن کے لمس کا کرشمہ ہے | یا یہ جوشِ شباب ہوتا ہے
دستِ نازک میں شاخ سے آکر | کیا شگفتہ گلاب ہوتا ہے

تحفۂ گلاب:

میرے سادہ سے کچھ سوالوں کے | کتنے رنگیں جواب بھیجے ہیں!
دل مسرت سے جھوم اُٹھا ہے | یار نے کچھ گلاب بھیجے ہیں!

صہبِلی:

مٹتا جاتا ہے دل سے غم کا احساس | نشاط افزا ہیں باتیں شاعری کی
مئے و نغمہ میں ربطِ باہمی ہے | سہیلی ہے غزل بادہ کشی کی

فساد:

چاک پھر عظمتِ آدم کی رِدا ہے شاید | امن خطرے میں ہے، مخدوش فضا ہے شاید
سہمے سہمے سے نظر آتے ہیں گلیوں کے مکیں | شہر میں پھر کوئی ہنگامہ ہوا ہے شاید

عزم:

اِتنے بے بس تو ہم نہیں صیّاد | آشیاں پھر سے ہو نہ ہو آباد
ہو مُبارک تجھے قفس اپنا | اَب ہیں آزاد ہر چہ بادا باد

دُعائے شاعر:

پھر عطا ہو مرے معبود مجھے سوزِ تمام | ہو ودیعت مجھے اقبالؔ کی رُوحِ الہام
میرے افکار میں ہو رنگِ نوائے غالبؔ | میرے ساغر میں چلی آئے شرابِ خیّام

میں کبھی کسی [illegible] کی حد دیکھ سکتا۔ میں نے پاگلوں کی طرح بار بار سوچا تھا کہ میں اُس کی جان لے سکتا ہوں۔ لیکن وہ میرے سوا کسی اور کی ہو جائے یہ ممکن نہیں! میں نے خود کو سمجھانا چاہا۔ بچپن سے دی گئی اخلاقی تعلیمات کو دُہرایا۔ مجنوں اور فرہاد کی روایات کا جائزہ لیا۔ لیکن ــــ امتحان ختم ہوتے ہی میں گھر گیا تو ایک دن میں نے امّی سے کہہ دیا کہ ابھی شادی نہیں ہو سکتی تو وہ پروین سے میری منگنی کر دیں۔ امّی میری اِس جلد بازی پر حیران بھی ہوئیں اور خوش بھی۔ کیونکہ میں ہی انھیں اِس سلسلہ میں روکتا رہا تھا۔ اب مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اتنی دیر کیوں کی۔ ہمارے درمیان آنے والی دیوار ارشد تھا۔ ورنہ پروین مجھے ناپسند نہ کرتی تھی۔

پیغام بھیجے کافی دن ہو گئے لیکن اُدھر سے کوئی صحیح جواب نہ آیا۔ چھٹیوں کے بعد میں اُس کے گھر میں داخل ہُوا تو چاروں طرف طوفان سے پہلے کی خاموشی طاری تھی۔ ہر شخص ایک دُوسرے سے کھنچا کھنچا نظر آتا تھا۔ پروین سے سامنا ہُوا تو کچھ دیر ہم خاموش ایک دُوسرے کو دیکھتے رہے۔ میں الفاظ تلاش ہی کر رہا تھا کہ وہ بول پڑی۔

'سلیم! تم نے جانتے بُوجھتے یہ طوفان کیوں اُٹھایا؟'

'لیکن پروین ... دیکھو میرا اِس میں کیا قصور ہے، یہ تو امّی کی خواہش تھی۔' میں اُس سے نظریں چُرا رہا تھا۔ اُس کے سامنے نہ جانے کیوں میں بُزدل بن جاتا تھا۔ آخر میں نے کہہ دیا۔

'پروین! میں تمھارا بچپن کا دوست ہوں اور پھر ارشد میں کون سی ایسی خوبی ہے جو مجھ میں نہیں؟'

'دوستی کی تعریف یاد ہے؟' وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ 'سلیم! بات خوبیوں اور خامیوں کی نہیں، تمھیں نہیں معلوم میں نے اُسے سہارا دیا ہے۔ احساسِ کمتری کی پستیوں سے نکالا ہے۔ اگر میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تو اُس کی زندگی کسی گہرے غار میں جا گرے گی۔'

'پروین! تمھارے نازک ہاتھ سہارا دینے کے لئے نہیں ہیں۔ اِنھیں تو خود کسی مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔'

'نہیں سلیم! یہ تمھارا خیال ہے۔ عورت کے ہاتھ بظاہر نازک ہوتے ہیں، ورنہ اُنھی ہاتھوں سے وہ نئی دُنیائیں تعمیر کرتی ہے۔ سلیم! خُدا کے لئے تم میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔' وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے تیزی سے چلی گئی۔

میں نے بہت سوچنے کے بعد امّی کو [illegible] واپس لے لیں۔ جواب میں وہ خود آ گئیں اور [illegible] میری [illegible] سے ڈالی کہ میں دیوانہ ہو گیا ہوں۔ اب [illegible] اپنی بات واپس لیں گی۔

پھر امّی سے مجھے معلوم ہُوا کہ میرے مقابلہ [illegible] امّی کو حیرت تھی کہ ارشد کو میرے مقابلے کے قابل کیوں سمجھا جا رہا ہے۔ انھیں معلوم نہ تھا کہ پروین کی رائے ارشد کے حق میں ہے [illegible] دل کی مریض تھیں اور آج کل شدید اُلجھن میں مبتلا تھیں۔ پھر امّی کا اثر تھا جس کی وجہ سے پروین کے والد میری طرف [illegible] تھے اور دُوسری طرف پروین کی ضد تھی۔

اب میرے لئے اُس گھر کی فضا تکلیف دہ ہو گئی تھی۔ میں [illegible] کے ساتھ ہی واپس آ گیا اور تعلیم کا خیال چھوڑ کر میں نے [illegible] طرف توجہ کی۔ بھائی جان بہت خوش ہوئے کیونکہ [illegible] اکیلے سنبھالنے میں انھیں بہت دُشواری ہو رہی تھی۔ [illegible] افراد اور کام میں خود کو مصروف رکھتا پھر بھی اکثر [illegible]



[illegible]

[illegible] پسند [illegible] نفرت کرنے کی

[illegible] پسند نہیں کرتی [illegible]

[illegible]

دے کے بندھن میں [illegible] کو بے وقت ہی چھوڑ دیا۔

ایک دن مجھے اطلاع ملی کہ ان لوگوں نے پرشتہ منظور کر لیا ہے

امی بہت خوش تھیں۔ لیکن میری سمجھ میں نہ آیا کہ خوش ہوں یا پریشان؟

امی [illegible] منگنی کی رسم ادا کرنے کے لئے چلی گئیں۔ میری مصروفیت نے

مجھے جانے کی اجازت نہ دی۔ لیکن انگوٹھی میں نے اپنی پسند سے بھیجی

وہاں سے آکر امی نے بتایا۔

"بیٹی پروین تو بہت خوش ہے میرے سامنے بہت کم

آئی۔ ادھر امتحان کی مصروفیت کے باعث کمزور بہت ہو گئی ہے"

میں اس سے [illegible] کے حالات جاننے کے لئے بیقرار تھا

پہلی فرصت میں کام کے بہانے میں نے وہاں جانے کا پروگرام بنایا

بھائی جان اور بھابی نے مجھے بہت [illegible]

گھر پہلے کی طرح پرسکون تھا۔ [illegible]

نظر آئیں۔ ہر فرد پہلے سے زیادہ [illegible]

اور نہ میں ہی اس کے پاس [illegible]

رات کے کھانے کے بعد [illegible]

میں دھیرے سے وہاں پہنچ گیا۔ وہ [illegible] سامنے

کرسی پر آبیٹھی۔

"کیسے [illegible] کیسا مزاج ہے بہت [illegible]"

اس [illegible]

[illegible] حالانکہ میں نے اس کو

[illegible] بہت کوشش کی۔ ہاں اس بات سے میں انکار نہیں

[illegible] کی خواہش ہے کہ تم میری ہو جاؤ۔ پروین آکیا

[illegible] کسی خلوص، کسی رحم کا مستحق نہیں ہوں؟ دیکھو مجھے

تمہارے سہارے اور تمہارے ساتھ کی ضرورت ہے۔" میں

جذبات کی رو میں اس کے قریب پہنچ گیا۔

"تمہیں کوئی غلط فہمی نہ ہونی چاہئے سلیم! میں نے صرف اپنی

[illegible] کا حکم مانا ہے۔" وہ دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔

"ہاں اس کا افسوس ہے کہ یہ جانتے ہوئے کہ میرے ہاتھ

کمزور ہیں، میں نے کسی کو سہارا دینے کی کوشش کی۔"

اس نے اپنے ہاتھوں کو جانچ لیا اور میری نظر اس کی انگلی پر

جا کر رک گئی جہاں ادھر کی دی ہوئی انگوٹھی میرا منہ چڑا رہی تھی۔

"پروین! ... یہ کیا؟" میں تڑپ گیا۔

"انگوٹھی ایک ہی انگلی میں اچھی لگتی ہے اور اس میں پہلے

سے موجود ہے!" اس نے بہت سکون سے کہا اور اٹھ کر چلی گئی۔

شکست کی تلخی زہر بن کر میرے وجود میں سرایت کر گئی۔

اور میں ایک لمحہ میں اس فیصلہ تک پہنچ گیا جو مدت سے

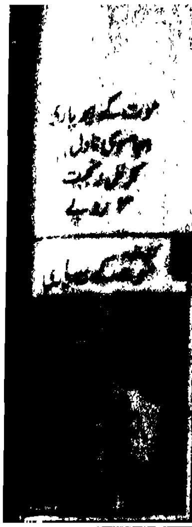
[illegible] کر پایا تھا۔

ایک اونچی لہر ریلنگ سے ٹکرائی اور ماضی کے نقوش کو

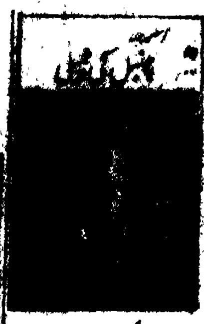
مٹاتی چلی گئی۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ فضا میں ایک تنہا کبوتر

[illegible] تھا، جو کسی ساحل کی تلاش کر رہا تھا!!

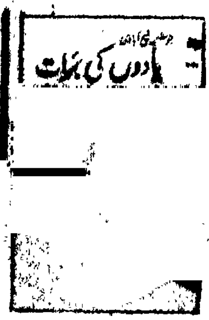
ہند پاکٹ بکس کا نیا سیٹ



عورت کے روپ ہزار
(ناول)
کرشن چندر
۴ روپے



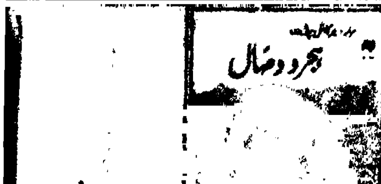
چنبل کی چمبیلی (ناول)
کرشن چندر
۲ روپے ۵۰ پیسے



یادوں کی برات (سوانح)
جوش ملیح آبادی
۳ روپے ۵۰ پیسے



دو بوند پانی (ناول)
خواجہ احمد عباس
۲ روپے ۵۰ پیسے



ہجر و وصال (شعر و شاعری)
مرتبہ: پرکاش پنڈت
۲ روپے ۵۰ پیسے

دیگر مطبوعات

ایک روپیہ سیریز میں:

ناول

شہید — ملک راج آنند
عورت اور آبشار — بلونت سنگھ
ایک معمولی لڑکی
خلش — امرتا پریتم
جگنو اور ستارے — جیلانی بانو
بندگی — ہنسراج رہبر
محبت یا ہوس — ٹالسٹائی
یاد — پرل بک
قصہ چار درویش — میر امن دہلوی
فسانۂ عجائب — رجب علی بیگ سرور

افسانے

فرانس کے عظیم ناول — مرتبہ: رانگے راگھو
روس کے عظیم ناول
انگریزی کے عظیم ناول
پلنگ — اوپندر ناتھ اشک

طنز و مزاح

کامریڈ شیخ چلی — کنہیا لال کپور
گستاخیاں
وارنٹ گرفتاری — فکر تونسوی
بک رہا ہوں جنوں میں — پرکاش پنڈت
کالج کے ٹکڑے — کرشن چندر
فلمی قاعدہ

شعر و شاعری

گیتانجلی — ٹیگور

اخلاقیات

میری سیز — خلیل جبران
انمول موتی — مرتبہ: مانس ہنس

جنسیات

جنسی تعلقات کے عجیب و غریب پہلو — ڈاکٹر لکشمی نارائن

ڈیڑھ روپیہ سیریز میں:

اردو کی بہترین رباعی نظمیں (شعر و شاعری) مرتبہ: پرکاش پنڈت
اردو کی بہترین غزلیں
شادی کے بعد (جنسیات) ڈاکٹر لکشمی نارائن
عورت مرد
میاں بیوی کے جنسی تعلقات
قتل کا راز (جاسوسی ناول) کرنل رنجیت
چھ لاشیں

دو روپیہ سیریز میں:

ایک عورت ہزار دیوانے (ناول) کرشن چندر
دل کی وادیاں سو گئیں
پیار ایک خوشبو
پھولوں کا بدنام
خوشبو کا خواب
جنگلی کبوتر — اے حمید
کالے کوس — عصمت چغتائی
میلی چاندنی — بلونت سنگھ
سانپ کی بیٹی — گلشن نندہ
محبت اور قتل کے پراسرار مقدمے (جاسوسی ناول) کرنل رنجیت
میخانہ (شاعری) مرتبہ: پرکاش پنڈت
استاد شاعروں کا کلام
برتھ کنٹرول (جنسیات) ڈاکٹر لکشمی نارائن
جنسی مسائل

ڈھائی روپیہ سیریز میں:

کارنیوال (ناول) کرشن چندر
آنکھ کی چوری
ایک عورت ہزار دیوانے
سات ہندوستانی
میں پھر آؤں گی
دیپ اور دل — اے حمید
باسٹھ دن — عادل رشید
رات اندھیری ہے — وت بھارتی
اردو شاعری کی رنگینیاں (شاعری) مرتبہ: پرکاش پنڈت — مہندر ناتھ
اردو غزل کے نئے رنگ

تین روپیہ سیریز میں:

نرملا (ناول) پریم چند
دل کی وادیاں سو گئیں — کرشن چندر
کٹی پتنگ — گلشن نندہ
پیاسا ساون
جھیل کے اس پار
ٹیڑھی انگلیاں (جاسوسی ناول) کرنل رنجیت
وہ کون تھا؟
خونی بنگلہ
بھیانک مورتی
خون کے چھینٹے
آپ بیتی (سوانح) خان عبدالغفار خاں

ساڑھے تین روپیہ سیریز میں:

عجیب آدمی (ناول) عصمت چغتائی

انگلینڈ میں ہند پاکٹ بکس ملنے کا پتہ: — و دردی بورڈز ، 59 ٹاؤن سینڈ روڈ، ساؤتھ آل، مڈلسیکس

ہند پاکٹ بکس پرائیویٹ لمیٹڈ

قطعات

پروفیسر ڈاکٹر امانت ایم اے، پی ایچ ڈی

آغوشِ فطرت:

ساقیا لا پلا شرابِ طہور | ہوں میں فطرت کی گود میں مسرور
ابر پاروں کا یہ خرامِ جمیل | رقص پر کر رہا ہے پھر مجبور

لمسِ حسن:

حسن کے لمس کا کرشمہ ہے | یا یہ جوشِ شباب ہوتا ہے
دستِ نازک میں شاخ سے آکر | کیا شگفتہ گلاب ہوتا ہے

تحفۂ گلاب:

میرے سادہ سے کچھ سوالوں کے | کتنے رنگین جواب بھیجے ہیں!
دل مسرت سے جھوم اٹھا ہے | یار نے کچھ گلاب بھیجے ہیں!

سہیلی:

مٹتا جاتا ہے دل سے غم کا احساس | نشاط افزا ہیں باتیں شاعری کی
مۓ و نغمہ میں ربطِ باہمی ہے | سہیلی ہے غزل بادہ کشی کی

فساد:

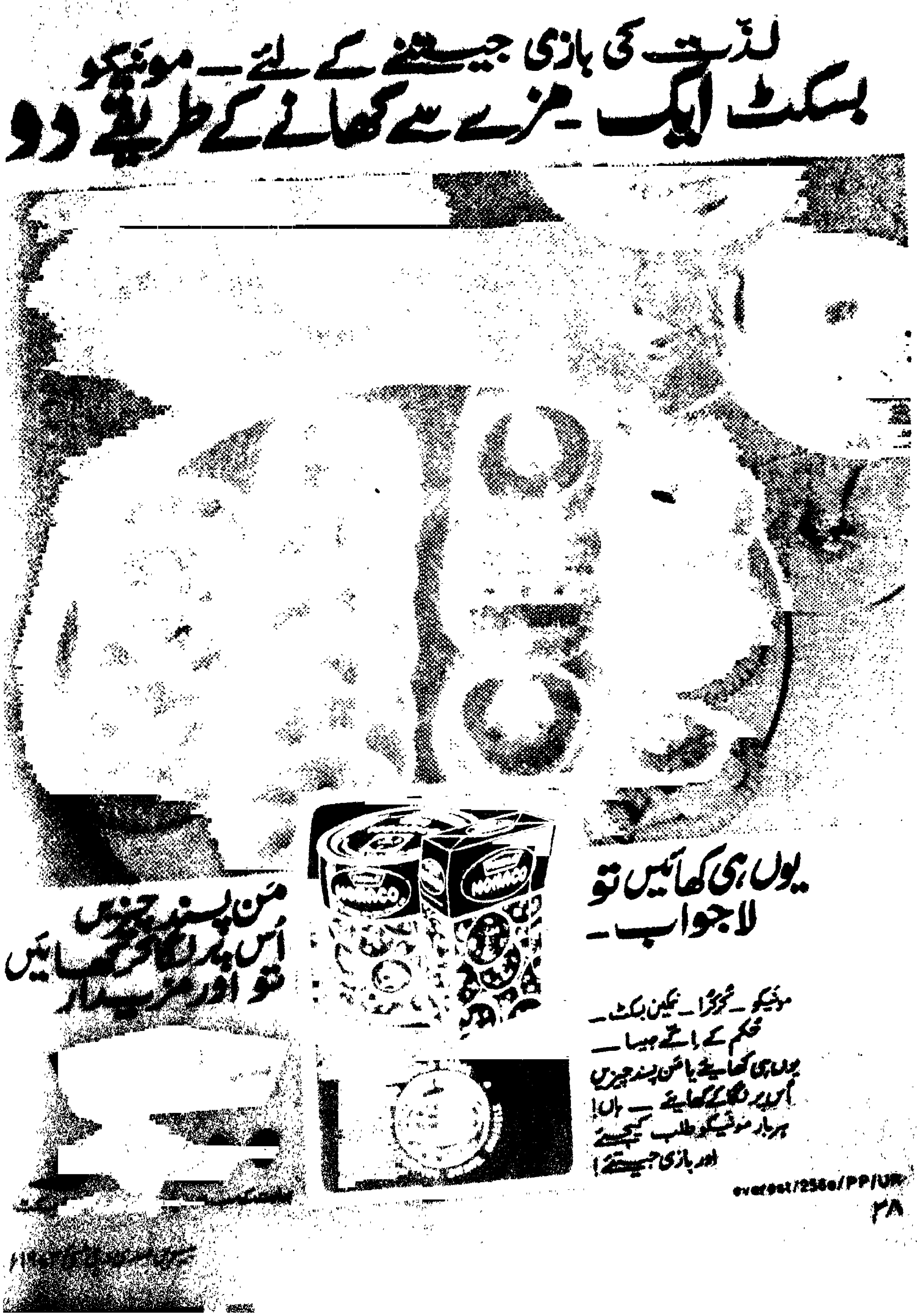
چاک پھر عظمتِ آدم کی ردا ہے شاید | امن خطرے میں ہے، مخدوش فضا ہے شاید
سہمے سہمے سے نظر آتے ہیں گلیوں کے مکیں | شہر میں پھر کوئی ہنگامہ ہوا ہے شاید

عزم:

اتنے بے بس تو ہم نہیں صیاد | آشیاں پھر سے ہو نہ ہو آباد
ہو مبارک تجھے قفس اپنا | اب ہیں آزاد ہرچہ باوا باد

دعائے شاعر:

پھر عطا ہو مرے معبود مجھے سوزِ تمام | ہو ودیعت مجھے اقبالؔ کی روحِ الہام
میرے افکار میں ہو رنگِ نوائے غالبؔ | میرے ساغر میں چلی آئے شرابِ خیامؔ


لذت کی بازی جیتنے کے لئے ــ مونیکو
بسکٹ ایک ـ مزے سے کھانے کے طریقے دو
یوں ہی کھائیں تو
لاجواب ـ
من پسند چیزیں
اُن پر لگا کر کھائیں
تو اور مزیدار
MONACO
مونیکو ـ کُرکُرا ـ نمکین بسکٹ ـ
نمکم کے ساتھ جیسا ـ
یوں ہی کھائیے یا من پسند چیزیں
اُن پر لگا کے کھائیے ــ ہاں!
ہر بار مونیکو طلب کیجئے
اور بازی جیتئے!
everest/256e/PP/UR

یادوں کا سفر

نسیم کوثر بی۔اے (آنرز) بی۔ایل، بی۔ایڈ

معرفت ڈاکٹر ایم۔اے رحمان سکھوانی پور زراعت، موتیہاری (بہار)

بھائی جان! خلوص و محبت

"یادوں کا سفر"— ایک خوبصورت سی کہانی بھیج رہا ہوں۔ اس اُمید کے ساتھ کہ میری پچھلی کہانیوں کی طرح یہ کہانی بھی آپ کو اور قارئین "بیسویں صدی" کو پسند آئے گی — ایک طویل چھٹی میں میں اپنے وطن مظفر پور چلا گیا تھا اور وہاں جا کر الجھنوں، مصروفیتوں اور بیماریوں نے ایسا جکڑا کہ دو مہینے کی چھٹی یوں ختم ہو گئی کہ مجھے ذرا احساس بھی نہ ہوا — یہاں اگر ادبی سرگرمیاں قریب قریب ختم سی ہو گئی تھیں۔ اب پھر اپنی دُنیا میں لوٹ آیا ہوں اور پھر — وہی تنہائی —! پھر بھی آپ برابر یاد آئے۔ میں کیسے کہہ دوں کہ آپ مجھے بھول رہے ہیں۔ 'یہ تاب یہ مجال یہ جرأت نہیں مجھے'!...

آپ کا بھائی — نعیم کوثر

کہ تمہارے اس ننھے سے رومال نے مجھے کتنا بے چین اور بیقرار کر دیا ہے جو ابھی ابھی میں نے مظفر بھائی کی میز پر دیکھا ہے۔

دیکھو مونا! میری آنکھوں میں آنسو جل رہے ہیں، پیار کا اتنا حسین چراغ ہوا کے ایک ہی جھونکے سے بجھ گیا۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو وہ روشنی کبھی نہیں بجھے گی جو تم نے مجھے بخشی تھی۔

میرے سینے پر سر رکھ کر سنو کوئی درد بھری آواز میں تمہیں پکار رہا ہے۔ کہاں کہاں [illegible] کے [illegible] خاموش ماحول سے گھبرا کر [illegible] [illegible] [illegible] تمہیں کہانی [illegible] [illegible] مونا [illegible] مجھے ایک بار [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

آبشاروں کو دیکھا اور سوچا وہ تمہاری آواز ہیں — لیکن وہ تم نہیں تھیں مونا! وہ تمہارے نقّال تھے۔ وہ بھی تمہاری طرح بے وفا نکلے — پھول مرجھا گئے، چاند نے اپنے چہرے کو بادلوں میں چھپا لیا اور آبشار پتھروں پر گر کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔

وہ رات کتنی حسین تھی، کتنی خوشگوار تھی۔ موسم گُل کی طرح! جس رات تم پہلی بار میرے کمرے میں آئی تھیں۔ میری نگاہوں کے سامنے پھول ہی پھول بکھر گئے تھے! اُن دنوں تم اُردو میں ایم۔اے کر رہی تھیں اور تمہیں نوٹس کی سخت ضرورت تھی۔ کالج کے مشہور اور ہر دلعزیز پروفیسر انیس الرحمٰن نے میرا نام بتایا تھا اور شاید میری ضرورت سے زیادہ تعریفیں بھی کر دی تھیں۔ میں نے تمہاری مدد کر دی۔ لیکن ساری زندگی کے لئے ایک روگ لگا بیٹھا۔ اُس رات میں تمہارے حسن و رعنائی سے بے حد متاثر ہوا تھا [illegible] جب تم میرے کمرے [illegible]

اور تم گھبرا کر پوچھ بیٹھی تھیں "کیا بات ہے نسیم ؟" تمہارے صبیح رُخسار شفق گوں ہو گئے۔

میں تمہارے اس اچانک سوال پر گھبرا گیا لیکن میرے ذہن نے بڑی حاضر جوابی کا ثبوت دیا اور میں نے کہا "میں تمہارے ہاتھ کی لکیریں دیکھ رہا ہوں!"

تم چلی گئیں لیکن میرے دل پر ایک نقش چھوڑ گئیں —— ایک لافانی نقش! میں تمہاری یاد میں شب و روز تڑپتا رہا۔ پڑھنے سے جی چرانے لگا اور ہر وقت تمہارے خیالوں میں کھویا رہنے لگا۔

وقت گزرتا گیا۔ لیکن تمہارا خیال اسی طرح میرے ذہن پر منعکس رہا۔ سنتے ہیں وقت کا تیز رَو سفینہ اپنے ساتھ بہت سی یادیں ذہن کے عمیق سمندر سے بہا کر لے جاتا ہے۔ لیکن وقت کا یہ تیز دھارا بھی میرے ذہن سے تمہارا خیال بہا کر نہ لے جا سکا۔

وہ دن کتنی خوشیاں سمیٹ کر آیا تھا! اس دن میں بے حد خوش تھا! کاش! تم میری خوشیوں کا اندازہ کر سکتیں۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور میرے قدم تیزی سے تمہاری جانب بڑھ رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ میں اپنی منزل سے ملنے جا رہا ہوں جس کی جدائی میں، میں نے کتنی راتیں جاگ کر بسر کیں اور جس کی یاد میں خلوت میں تڑپا ہوں، آج میں اسی سے ملنے جا رہا ہوں۔ میں نے اپنے گھر سے تمہارے گھر کا راستہ کس طرح طے کیا، مجھے معلوم نہیں۔

جب میں تمہارے گھر پہنچا تم مجھے اپنے کمرے میں لے گئیں۔ تم سفید ساڑی میں کتنی خوبصورت معلوم ہو رہی تھیں جیسے بہار کا پہلا پھول! جیسے چاندنی رات میں تاج محل! میں تمہارے قریب بیٹھ گیا۔ میری آنکھیں تمہارے حُسن کی پرستش میں مصروف تھیں۔ کمرے کا ماحول رُومان پرور بنا ہُوا تھا اور میری رگ رگ میں وہ تپش اور جلن تھی کہ سارا جسم پھنکا جا رہا تھا۔ میں نے اپنے سُلگتے ہوئے ہونٹ تمہاری پلکوں پر رکھ دیئے۔ تم نے شرما کر آنکھیں بند کر لیں اور ہم ایک دُوسرے میں کھو گئے۔ لیکن اچانک تم مجھ سے الگ ہو گئیں اور اپنے کمرے سے باہر چلی گئیں۔

تمہارے اس اچانک تغیّر سے میں گھبرا گیا اور سوچنے پر مجبور

پوچھا کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ لیکن دو دن تک کوئی حادثہ رونما نہ ہوا تو میرے ذہن میں ایک اچھوتے خیال نے جنم لیا اور سوچنے لگا تم مجھ سے پیار کرتی ہو اور جب میں تمھیں تلاش کرتا ہُوا تمھارے کمرے میں پہنچا تو تمھیں دیکھتا ہی رہ گیا! تمھاری ریشمی زُلفیں تمھارے شانے پر پریشان تھیں۔ تمھارے چہرے سے دلیری، خلوص اور رعنائی ٹپک رہی تھی۔ تمھاری آنکھوں کی مُسکراہٹ کہہ رہی تھی ــــ میں نے تو کچھ بھی خیال نہیں کیا اور تم اتنا گھبرا گئے؟ آؤ میرے خوابوں کی روشنی! میری زندگی مجھے پھر پیار کرلو، میری رُوح جنم جنم سے پیاسی ہے۔ میری پیاس بُجھا دو میرے دیوتا!" اور میں تمھارے ریشمی گیسوؤں سے کھیلنے لگا۔ تمھاری نظریں اُٹھیں اور پھر جُھک گئیں۔ نہ جانے اُس وقت تمھاری آنکھوں میں بے پناہ پیار کہاں سے سمٹ کر آگیا تھا۔ میں نے تمھیں پیار سے پُکارا "مونا!" ــــ موسیقی اور لوچ میں ڈوبی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی "کیا ہے؟" ایسا معلوم ہُوا جلترنگ بج اٹھا ہو!

"مونا! میری طرف دیکھو" تم نے مُسکرا کر مجھے دیکھا۔ تمھاری پیشانی سے مہربانی چمک رہی تھی۔ میں نے تمھاری ٹھوڑی کو اُوپر اُٹھاتے ہوئے کہا ــــ "مونا! تم کتنی خوبصورت ہو! تم مصر کی حسین دوشیزاؤں سے بھی زیادہ حسین ہو! تم کسی کلاکار کی خوبصورت تخلیق ہو، کسی سنگ تراش کا حسین شاہکار! تمھارا حُسن لازوال ہے!" تم آنکھیں بند کئے مُسکراتی رہیں۔ میری آنکھوں کے سامنے پھول ہی پھول بکھر گئے! فضا نکہت و نُور میں ڈوبی جارہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ جو جذبات میرے دل میں مچل رہے ہیں حرف بحرف بیان کردوں۔ لیکن کسی کی آہٹ نے میرے حسین خوابوں کو منتشر کر دیا اور ہم چونک کر الگ ہوگئے۔

تمھاری بڑی بہن کی شادی کی خبر سُن کر میں بے حد مسرور ہُوا۔ میری رگ رگ میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ میں مدہوش سا ہوگیا۔ میرا چھوٹا سا خاندان تقریب کی خوشی میں تمھارے گھر پہنچ گیا۔ گھر میں ہر طرف ہنگامہ برپا تھا۔ ہر سُو نقرئی قہقہے اُبل رہے تھے۔ نئی عمر کی الھڑ لڑکیاں اپنی دلکش آواز میں ماحول کو رُومان پرور بنائے ہوئے تھیں۔ برات آچکی تھی اور گھر میں ڈھولک ٹھنک رہی تھی۔ لڑکے ہنگاموں میں مشغول تھے اور لڑکیاں برات دیکھنے میں گم تھیں۔ تم بھی برات دیکھنے کے لئے آئی تھیں۔

اُس رات میں نے کہا تھا ــــ "مونا! ایک دن میں بھی تمھیں اسی طرح لینے آؤں گا! وہ دن انتہائی مسرّت کا ہوگا جب تم شرمائی لجائی خوشبوؤں میں بسی ہوئی میرا انتظار کرو گی" تم شرم سے دُہری ہوئی جارہی تھیں اور میں نے تمھیں اپنے سینے میں چھپا لیا تھا۔

کاش! تمھارے شیریں لب میری تنہائی کے غم کی تلخی سے واقف ہوتے جو میں نے تمھاری بہن کی شادی کے بعد گزارے تھے۔ میں تو چاہتا تھا کہ تمھارے ساتھ رہوں۔ جس طرح سایہ روشنی کے قدم چُومتا ہُوا چلتا ہے۔ میں اپنے دل کے گوشے میں تمھیں چُھپا لینا چاہتا ہوں تاکہ کوئی تمھیں دیکھ نہ سکے۔ لیکن میں تم سے دُور تھا، مجبور تھا اور تمھاری جُدائی میں بیقرار تھا۔

آج پُونم کی رات ہے۔ ہر طرف چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ چاند کی چاندنی میں لوگ خیالوں کے تاج محل تعمیر کرنے میں غرق ہیں۔ میں بھی اپنے اچھوتے تاج محل کے بارے میں سوچ رہا ہوں جو کبھی ہم دونوں نے تعمیر کئے تھے۔ لیکن آج چاندنی میرے لئے بے کیف ہے۔ میرا دل اُداس ہے۔ ماحول اور ماحول کی پُراسرار خاموشیاں فکر میں غوطہ زن ہیں اور میرے جذبات بھی چاندنی کی طرح ٹھنک، خاموش اور پُرسکون ہیں۔ لیکن آہ! مونا! میری قسمت تو دیکھو کہ میں خوبصورت چاندنی رات میں تنہا، اُداس، مضمحل بیٹھا ہوں۔ آج جیسی چاندنی میں ہم دونوں ایک دُوسرے میں کھو کر کتنی دیر تک باتیں کرتے تھے کبھی ــــ کہاں کھو گئے وہ حسین لمحات ــــ لیکن آج تم مجھ سے کوسوں دُور گہری نیند میں سو رہی ہوگی یا تم بھی میری طرح چاند کی چاندنی میں جل رہی ہوگی۔ کون جانے!

مونا! آج سے سات ماہ پہلے کی باتیں یاد کرو، میں تمھیں مجبور کرتا ہوں۔ میری خاطر صرف ایک بار ماضی کے رُخ سے نقاب اُٹھا دو۔ اُس پر جو گرد ہے اُسے اچھی طرح صاف کر دو۔ پھر اس میں جھانکو ــــ اُس دن تم اکیلی برآمدے میں ستون کے سہارے کھڑی تھیں۔ تمھاری پتلی پتلی نازک نازک مخروطی اُنگلیوں میں ننھا سا رُومال دبا ہُوا تھا۔

میں نے کہا ــــ "مونا! کیا تم مجھے یہ رومال دو گی؟"

تم نے مجھے رومال دے کر کہا تھا ـــ "کہیں آپ اسے کھو تو نہ دیں گے؟ بظاہر یہ ننھا سا ٹکڑا ہے لیکن اس میں کسی کی محبت پوشیدہ ہے!"

تمہارے بالوں سے کھیلتے ہوئے میں نے کہا تھا - ہاں موتا! یہ چھوٹا سا ٹکڑا تو ضرور ہے - لیکن نہ معلوم اس میں میری کتنی خوشیاں پوشیدہ ہیں۔ جب تک یہ رومال میرے پاس رہے گا تمہاری محبت کی خوشبو اس سے آتی رہے گی! تم یاد آتی رہو گی" تمہاری آنکھوں میں موتی موتی آنسو چھلک آئے تھے اور تم اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگ گئی تھیں۔

موتا! تمہیں وہ صبح یاد ہے جس صبح ڈاکٹر ظفر انگلینڈ سے بڑی بڑی ڈگریاں سمیٹ کر آئے تھے اور جنہیں خوش آمدید کہنے کے لئے تم ننگے پاؤں دروازے تک گئی تھیں اور پھر ناشتے کی میز پر تم نے میرا تعارف کرایا تھا "آپ ہیں ڈاکٹر ظفر ایم۔ آر۔ سی۔ پی۔ ڈی۔ ٹی، ایم اینڈ ایچ اور آپ ہیں نسیم قیصر! اردو کے مشہور افسانہ نگار اور بس!"

اسی صبح تم نے میری محبت کی توہین کی تھی اور میری محبت کا گلا گھونٹ دیا۔ اس دن تم اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی کیٹس کے خطوط پڑھ رہی تھیں جو اس نے اپنی محبوبہ فینی براؤن کے نام لکھے تھے اور جب میں نے تم سے کہا "موتا! میں جا رہا ہوں" تم پر میری باتوں کا کوئی ردِ عمل نہ ہوا جیسے تم نے میری کہی ان سنی کر دی۔ تم خاموش کتاب کے ورق سے کھیلتی رہیں۔ میں نے سوچا تھا جب تم سے کہوں گا کہ میں جا رہا ہوں تو تم تڑپ اٹھو گی۔ میرے سینے سے لگ کر اپنی محبت کی قسمیں دے کر مجھے روکو گی۔ لیکن یہ سب میرا وہم تھا، فریب تھا، ایک حسین دھوکا تھا! اور جب میں تمہارے بالوں میں شانہ کرنے لگا تو تم نے میرا ہاتھ بے رحمی سے جھٹک دیا اور کہا ـــ "نسیم! مجھے ایسی بدتمیزی قطعی پسند نہیں!"

میں نے سمجھا تم مذاق کر رہی ہو۔ میں نے چھیڑنے کے خیال سے چٹکی لی تو تم مجھے بے حد طیش و غضب کی نگاہوں سے دیکھ کر بولیں۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا آپ مجھ سے بدتمیزی کیوں کر رہے ہیں؟"

میں چونک پڑا۔ تمہارے الفاظ میں نیا پن تھا۔ تمہارے جملے میں سختی تھی۔ تمہاری اس بات سے میں تڑپ اٹھا میری روح کراہ اٹھی۔ چاروں طرف غم کی گھٹائیں چھا گئیں اور [illegible] کے پھول مرجھا گئے۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کا [illegible] نکلا۔ میں نے تمہارا رومال تمہیں واپس کرتے ہوئے کہا [illegible] میں جا رہا ہوں۔ لیکن اگر تمہارے دل میں اب بھی میرے لئے کوئی جگہ ہے تو ایک دن تم یہ رومال مجھے دینے ضرور آؤ گی"

لیکن آہ موتا! تمہارے اس ننھے سے رومال نے مجھے کتنا بے چین کر دیا ہے جو ابھی ابھی میں نے ڈاکٹر ظفر کی میز پر دیکھا ہے!!

غزل

محمد شفیع ملک نقشبندی ایم اے ایل ایل بی ممبر پارلیمنٹ

بجلی سی وہ نگاہ بھی کیا کام کر گئی
اک نور کی کرن تھی کہ دل میں اتر گئی

زُلفِ سیاہ دوش پہ کس کے بکھر گئی
بیٹھے بٹھائے دل پہ قیامت گذر گئی

کیا عشق نے سکھا دیئے آدابِ زندگی
آئینۂ خیال میں دُنیا سنور گئی

یہ سچ ہے زعمِ ترکِ محبت فریب تھا
اشکوں سے تیری یاد میں پھر آنکھ بھر گئی

کیا زندگی کی راہ میں کانٹے بچھا دیئے
کس منزلِ حیات میں دُنیا ٹھہر گئی

مجھ سے چھپا نہ سادگیِ حُسن کے فریب
شرم و حیا کے ساتھ نظر کام کر گئی

محفل میں اِک نظر تری عالم نواز تھی
پھولوں سے سب کے دامنِ اُمید بھر گئی

ہاں دیکھ لیں بہار کی رنگینیاں مگر
ہم جس کو رو رہے تھے وہ دُنیا کدھر گئی

رُخ پھیر دو نہ گردشِ لیل و نہار کا
دُہرا رہے ہو کیا جو قیامت گذر گئی

پہنچے ہیں تیری دُھن میں جہاں تک پہنچ سکے
دیکھا ہے تجھ کو جس کی جہاں تک نظر گئی

عارف کو مل سکیں نہ ابھی تیری منزلیں
دُنیا ترے خیال میں جانے کدھر گئی

۴۷- نارتھ ایونیو، نئی دہلی

بیسویں صدی دہلی مئی ۱۹۷۷ء

غزل

پروفیسر افتخار احمد فخر ایم اے

ہوش آیا بھی کبھی گر ترے دیوانے کو
چل پڑا، سر تری دیوار سے ٹکرانے کو

حُسن اور عشق کا اللہ رے ربطِ باہم
شمع روشن ہوئی پر لگ گئے پروانے کو

دور ہوتی ہے کہیں دل سے محبت کی خلش
عمر درکار ہے اِس زخم کے بھر جانے کو

اب یہ غم ہے کہ وہ ہو جائیں گے بیتاب وحزیں
کہہ گیا اُن سے غمِ دل تو میں کہہ جانے کو

تیری آنکھوں کی مئے ہوش رُبا کی سوگند
بے پئے ایک زمانہ ہے بہک جانے کو

روک لے اشکِ وفا دولتِ غم یوں نہ لٹا
کوئی مٹی میں ملاتا نہیں دُر دانے کو

یوں جنوں خیز نگاہوں سے نہ دیکھو ہم کو
اور اب طول نہ دو عشق کے افسانے کو

کیوں رہے چشمِ زلیخا کا پھر انداز وہی؟
کوئی یوسف تو ہو بازار میں بِک جانے کو

راز کی طرح چھپا رکھا تھا جس کو دل نے
سوزِ غم اب ہے وہ آنکھوں سے ٹپک جانے کو

عشق نے فخرؔ وہ بخشی ہے حیاتِ ابدی
بھول سکتی نہیں دُنیا مِرے افسانے کو

صبح کا بھولا

اظہار الحسن ایم۔ اے

جغرافیہ ڈیپارٹمنٹ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

محترمی خوشتر گرامی صاحب! تسلیمات

"تاریکیوں کے بعد" (بیسویں صدی سالنامہ ۸۳ء) کی پسندیدگی کے بارے میں مُلک کے مختلف گوشوں سے خوبصورت خوبصورت خط ملے جن میں سے بعض تو افسانے سے بھی زیادہ دلچسپ ہیں۔ کچھ قارئین نے تو میری تصویر دیکھ کر اپنی اپنی قیافہ شناسیوں کو بروئے کار لاکر میرے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ میں اُن تمام حضرات و خواتین کا ممنون ہوں جنھوں نے اِس دلچسپی سے میرا افسانہ پڑھا اور خط لکھے۔ "بیسویں صدی" کے ذریعہ میں اُن سب کا شکریہ ادا کر رہا ہوں ــــــ ایک تازہ افسانہ "صبح کا بھولا" پیش ہے۔ بزرگوں نے کہا ہے: "صبح کا بھولا شام کو واپس آئے تو اُسے بھولا نہیں کہتے"۔ اِسی ترقی یافتہ دَور میں نوجوان قدم قدم پر بھٹکتے ہیں اور ستاروں سے آگے جہاں آباد کرنے کی فکر میں شب و روز سرگرداں رہتے ہیں۔ بڑھتی ہوئی فیشن پرستی، ماڈرن تہذیب اور نئے کلچر نے نئے نئے راستے تراشے ہیں جو کچھ دُور چل کر مسدود ہو جاتے ہیں اور پھر اُس راہی کو لوٹ کر اپنی پُرانی ہی پگڈنڈی پر چلنا پڑتا ہے۔ زندگی کے سفر میں بہت سے موڑ آتے ہیں اور جو اُن پُر پیچ راہوں میں بھٹک جاتے ہیں اُنھیں زمانے کا تیز گام کارواں اپنی گرد میں ہمیشہ کے لئے دفن کر دیتا ہے ــــــ افسانہ کہاں تک کامیاب ہے اِس کا فیصلہ تو آپ کی گرانقدر رائے ہی کر سکے گی جس کا مجھے انتظار رہے گا...

آپ کا ــــــ اظہار الحسن

★

تلاطم کا وقت اُس کے سنہرے جسم پر تھپیڑیں لگاتا رہا۔ وہ تلملاتی رہی، تڑپتی رہی اور بے چارگی اُس کے حال پر آنسو بہاتی رہی۔ وہ منزل کی تلاش میں نئے راستے تراشتی رہی۔ راستے بھٹکاتے رہے وہ بھٹکتی رہی۔ وقت نے اُس کے قدموں کو جکڑ دیا۔ وہ بے بس پرندے کی طرح پھڑکتی رہی اور زمانہ آگے بڑھتا رہا ــــــ وقت گزرتا رہا لیکن ایک دن آیا جب تند و تیز طوفانی ہواؤں نے دَم لیا۔ گرد و غبار کے دبیز پردوں کی اوٹ سے اُمّید کا سورج طلوع ہوا اور منزل نے بڑھ کر اُس کا استقبال کیا۔

جب وہ گھر سے کالج آئی تھی، تو بُرقعہ میں ڈھکی چھپی آئی تھی۔ کالج کی چہار دیواری نے بُرقعہ ہمیشہ کے لئے بالائے طاق رکھ دیا۔ اپنی خوبصورتی کی بنا پر وہ بہت جلد پُورے کالج میں مشہور ہو گئی۔

اُس کی خوبصورتی کے لئے صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ وہ سنگِ مرمر کا ترشا ہوا دلکش و دلآویز مجسمہ تھی جسے فطرت نے اپنے فن کا بہترین نمونہ بنایا تھا۔

کالج کی سرسبز و شاداب پگڈنڈیوں سے جب وہ گزرتی تو کالج کی فضا میں طرح طرح کے بیباک و شوخ جملے اُس کے کانوں سے ٹکراتے۔ کالج کی سینئر لڑکیاں چلبلے جملے فضا میں بکھیرتیں۔ پہلے یہ جملے اُسے ناگوار گزرے تھے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہی جملے اُس کے کانوں میں رس گھولنے لگے۔ وہ انہیں سُننے کی متمنی رہنے لگی۔

خوبصورتی کے سالانہ مقابلے میں کالج میں وہ اوّل آئی تھی۔ آڈیٹوریم ہال میں جب ہزاروں تالیوں کے درمیان اُسے "کالج بیوٹی" کا خطاب ملا تھا تو اُس کے قدم ساتویں آسمان پر پڑ رہے تھے۔

کالج کے بعد جب وہ یونیورسٹی آئی تو کچھ تبدیلیاں نمودار ہوئیں۔ بظاہر رونما ہونے والی تبدیلی اُس کے تراشے ہوئے بال تھے جو خشک خشک، پیلے پیلے، اُس کے کانوں کے اِرد گِرد جھولتے رہتے اور جب کوئی لٹ رخسار کے گلاب چُرانے کی کوشش کرتی تو وہ اُسے جھٹکے سے پیچھے پھینک دیتی اور بالوں کی یہ لٹ ناگ کی طرح پھر کنارے پر تاک لگا کر بیٹھ جاتی۔

اب تک اُس نے صرف لڑکیوں ہی کی صحبت کا لطف اُٹھایا تھا۔ لیکن اب کلاس میں چھ سات لڑکیوں کے علاوہ سب لڑکے تھے۔ کچھ خوبصورت، کچھ اسمارٹ، کچھ بدصورت اور کچھ بس یونہی۔

یونیورسٹی کی راہوں سے جب وہ گزرتی تو اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے ہر نظر اُس کا تعاقب کر رہی ہے، ہر لڑکا اپنے کسی دوست سے اُس کا تعارف کرا رہا ہے۔ یہ سوچ کر وہ بوکھلا جاتی۔ اُس کے جسم میں سُوئیاں چُبھنے لگتیں، اُس کے دماغ میں چیونٹیاں رینگنے لگتیں۔ لیکن یہ احساس بھی رفتہ رفتہ ختم ہوتا گیا۔

پُوری کلاس میں اگر اُس کی بات چیت تھی تو بس جمال سے۔ جمال خوبصورت تھا، اسمارٹ تھا۔ اُس کے نکلتے ہوئے قد، رسیلی آنکھوں، کھلتے رنگ اور پھڑکتی ہوئی بازوؤں کی مچھلیوں نے اُسے متاثر کیا تھا۔ یہ قربت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ بڑھتی گئی۔

اب دونوں کی خوشگوار شامیں اور راتیں ساتھ ساتھ گزرنے لگی تھیں۔ کالج کی کینٹین، شہر کے کیفے اور ریستوران، چائے، کافی، لنچ اور ڈنر سے سجنے لگے۔ گرمیوں کی تعطیل کے دوران پہاڑی مقامات کی سَیر، سردیوں میں اسنو فال کے نظارے، برسات میں دریاؤں کی طغیانی کے مناظر اُن کے پسندیدہ مشغلے بن گئے تھے۔ وہ دو آزاد پنچھی تھے جو جہاں چاہتے چہکتے، پرواز کرتے، جس شاخ پر بسیرا لینا چاہتے، بسیرا لیتے۔ چمن چمن، گلشن گلشن، صحرا صحرا چہکتے پھرنا ہی اُن کی زندگی کا مقصد بن گیا۔

ایک دن ہر پنچھی کو آشیانے کی ضرورت ہوتی ہے، مسافر منزل کی خواہش کرتا ہے، کشتی ساحل تلاش کرتی ہے اور لڑکی شوہر۔

ایک شام اُس نے کہا تھا — "جمال! کب تک ہم یوں آزاد زندگی گزارتے رہیں گے۔ اب ہمیں سماجی بندھن میں بندھ جانا چاہیئے۔ اب دُنیا والوں کے سامنے بھی ہم ایک دُوسرے کا دامن ہمیشہ کے لئے تھام لیں۔ اب ہمیں بہت جلد شادی کر لینی چاہیئے۔"

"کیا بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو؟ آج یہ ہواؤں کا رُخ کس سمت بہہ رہا ہے؟" جمال نے جواب دیا تھا۔

"نہیں ڈیر جمال! بتاؤ کب شادی کر رہے ہو؟" نیلم نے منت کے ساتھ کہا تھا۔

جمال نے اُس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تھا — "بالکل پُرانے خیال! نیلم یہ شادی وادی تو بہت پُرانی باتیں ہیں۔ اِس ترقی یافتہ دَور میں، ایک ماڈرن گرل کے منہ سے ایسی دقیانوسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ آزاد زندگی کو قید کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ شادی کے بعد یہ خوبصورت زندگی اجیرن بن جاتی ہے۔ شادی کے خیال ہی سے مجھے تو بخار چڑھنے لگتا ہے۔ خانگی زندگی میں 'عشق' کا تصور بھی محال ہو جاتا ہے۔ خوبصورت، آزاد زندگی سماج کی چہار دیواری میں قید ہو کر رہ جاتی ہے . . ."

"لیکن جمال! ایک نہ ایک دن تو شادی کرنی ہی ہے پھر کیوں نہ . . .؟"

"شادی، شادی، شادی!! کیا اِس کے علاوہ [illegible] پاس

کوئی دُوسری بات نہیں ہے آج؟' جمال نے چیختے ہوئے کہا تھا۔

'ہاں جمال! آج ہی نہیں کبھی روز بھی شادی کے سوا اب میرے پاس کوئی دُوسری بات نہ ہوگی!' کہتی ہوئی نیلم جمال کے پاس سے اُٹھ گئی تھی اور جمال نے گھاس پر لیٹتے ہوئے ایک زہرآلود طنزیہ قہقہہ فضا میں بکھیر دیا تھا۔

دُوسرے دن جمال رخسانہ کے ساتھ تھا۔

نیلم تڑپ کر رہ گئی تھی۔ آج پہلی بار اُسے اپنی شکست کا احساس ہُوا تھا۔ جمال اور نیلم اب بہت دُور ہو چکے تھے۔ نیلم تلملا اٹھی تھی۔ اُس کے دل میں انتقام کی آگ سُلگنے لگی تھی اور اُسے یوں محسوس ہُوا جیسے کسی نے چاند کی دُنیا سے اُسے نیچے پھینک دیا ہو۔

جمال کو رقابت کی آگ میں جلانے کے لئے اُس نے اپنی توجہ فیروز کی جانب مبذول کر دی۔ بازی ہارا ہُوا جُواری شراب خانہ کا رُخ کرتا ہے اور ناکام شکاری خلاؤں کو نشانہ بناتا ہے۔

نیلم اور فیروز ہر جگہ ساتھ ساتھ دیکھے جانے لگے جب جمال رخسانہ کے ساتھ ہوتا تو نیلم فیروز سے قریب تر ہو جاتی۔ ایک زہرآلود مُسکراہٹ دونوں کے ہونٹوں پر مچلتی۔ وہ رقابت کے الاؤ میں جلنے لگے۔ انتقام کے لاوے اُن کے ذہنوں سے نفرت بن کر پگھلنے لگتے۔

نیلم فیروز سے قریب ہوتے ہوئے بھی بہت دُور تھی۔ وہ شکست خوردہ تھی۔ اُس کا ہر قدم ایک تجربہ تھا۔ اُس کی ہر بات نپی تُلی ہوتی تھی۔ جذبات کا طوفان جب ٹھاٹھیں مارتا وہ اپنے جہاز کا لنگر گرا دیتی۔ طوفان گُزر جاتا، جہاز ساکت و جامد رہ جاتا۔

یونیورسٹی کی زندگی اختتام پر تھی۔ ذہنوں میں امتحان! امتحان! کا شور تیز ہو گیا تھا۔ فیروز اپنا زیادہ تر وقت کتابوں کے ساتھ گزارنے لگا تھا۔ اُس کی راتوں کا بیشتر حصّہ برقی لیمپ کے سامنے کٹنے لگا تھا ـــــ اور نیلم ہاسٹل کے تنہا کمرے میں خیالات کے تانے بانے بُنتی رہتی تھی اور اپنے اس ڈرامہ کا انجام سوچتی جو اُس نے جمال کو احساس دلانے کے لئے اسٹیج کیا تھا لیکن یہ ڈرامہ صرف ڈرامہ ہی بن کر نہ رہ سکا اور بڑھتے بڑھتے حقیقت کی شکل اختیار کر گیا۔ نیلم کی اداکاری حقیقت بن کر اُسی کے دل میں

اُترنے لگی۔ سُوکھے پتے دُور سے آگ پکڑ لیتے ہیں۔

ایک شام جب اُفق پر گہرا دُھند لکا تھا، ماحول پُرسکون تھا۔ لان کی گھاس پر سُرخ و سفید پھول مُسکرا رہے تھے۔ نیلم فیروز کے قریب تھی، فیروز نیلم سے نزدیک تھا۔ جذبات کی بھڑکتی ہوئی آگ نے نیلم کے آہنی قدموں کو پگھلا دیا تھا۔ اُس نے نشہ توڑتے ہوئے نشیلی آواز میں کہا تھا: 'فیروز! تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو؟'

فیروز نے اپنا مُنہ اُس کے قریب لاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

'اتنی محبت جس کی کوئی مثال نہ دی جا سکے۔ جو کسی پیمانے سے ناپی نہ جا سکے!'

'سچ فیروز؟'

'ہاں نیلو! سچ!'

'مجھے تمھاری مضبوط بانہوں کی ضرورت ہے فیروز! مجھے اپنے دامن میں چُھپا لو۔ ساری دُنیا کے سامنے کہہ دو کہ میں تمھاری ہوں، تم میرے ہو، بس میرے! مجھ سے شادی کر لو فیروز!'

'نیلم!' فیروز چونک پڑا تھا۔ اُس کی رگوں میں دوڑتا ہُوا خون جمنے لگا تھا۔ اُس نے اپنے ہوش و حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا تھا۔

'لیکن نیلم! بیوی بنانے کے بعد میں تمھیں وہ سب کچھ نہ دے سکوں گا جس کی تم مجھ سے اُمید کرتی ہو۔ بیوی اور محبوبہ میں جو فرق ہوتا ہے شاید تم اُس سے واقف نہیں ہو۔ محبوبہ جب بیوی بن جاتی ہے تو وہ صرف 'بیوی' رہ جاتی ہے۔ شادی کے بعد عورت اپنے بچّوں کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ نہ وہ اپنے محبوب نما شوہر کی پروا کرتی ہے نہ خود اپنی۔ اُس کی ساری توجہ بچّوں پر آکر دم توڑ دیتی ہے۔ اُس کی دُنیا گھر کی چہار دیواری ہی محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ اُس کی حالت اُس قیدی جیسی ہو جاتی ہے جو عُمر قید کی سزا بُھگت رہا ہو اور جیل خانے کی بلند چہار دیواری سے باہر کی دُنیا کو جھانک بھی نہ سکتا ہو۔ کیا یہ سب کچھ تم جیسی آزاد لڑکی پسند کر سکے گی؟'

'یہ فرار کی ایک راہ ہے فیروز! کیا ایک عورت کی نگاہ میں اپنے سہاگ سے زیادہ کسی چیز کی اہمیت ہو سکتی ہے۔ عورت کا شوہر اُس کے بچّے، اُس کا جسم بن جاتے ہیں، رُوح کی گہرائیوں میں اُتر جاتے ہیں اور جب جسم کے کسی بھی حصّہ کو ایذا پہنچتی ہے تو سارا

جسم متاثر ہوتا ہے۔ بغیر شوہر کے ایک عورت کی زندگی خاموش نغمہ کی طرح ہے جو بے زبان ساز میں پنہاں ہوتا ہے۔ بے زبان کو زبان دینے کی طاقت مرد ہی میں ہوتی ہے اور یہ مرد عورت کا شوہر ہی ہونا چاہئے۔ برساتی دریا بہت جلد جھاڑیوں کی آغوش میں گم ہو جاتے ہیں، ریت کے تودوں میں جذب ہو جاتے ہیں۔'

'یہ سب منطقی باتیں ہیں نیلم! جن سے حقیقت کا دُور کا بھی رشتہ نہیں۔ اِن میں کوئی اصلیت نہیں ہے۔'

'اصلیت کہاں ہے اور کہاں نہیں، یہ تو مجھے اب معلوم ہُوا ہے۔ یہ مرد، عورت کو صرف دل بہلانے کے لئے ایک کھلونا سمجھتے ہیں۔ جب دل چاہا توڑ دیا، جب دل چاہا چھوڑ دیا اور پھر دُوسرے نئے کھلونے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔'

'اپنا اپنا تجربہ ہے۔ ہو سکتا ہے تم اپنی جگہ صحیح ہو۔' فیروز نے چٹکی لی تھی۔

'تجربہ! تجربہ تو عورت کو صرف مرد دیتے ہیں، مرد!'

اُس شام کے بعد فیروز نیلم سے پھر کبھی نہ ملا۔

نیلم اپنی دُوسری شکست کے بعد بمبئی آگئی۔ وہ ہر وقت اُداس اُداس رہنے لگی۔ تلخ حقیقتوں نے اُسے مرد سے نفرت دی تھی۔ اُس نے زندگی کے سنہرے خواب دیکھنا چھوڑ دیئے تھے۔ ماضی میں کھوئی کھوئی مستقبل سے بے خبر، گُم سُم رہنا ہی اُس کا مشغلہ ہو کر رہ گیا تھا۔

اُس کے سامنے والے فلیٹ میں زندگی رقص کرتی تھی، جوانی شراب لنڈھاتی تھی۔ حُسن کے لبریز پیمانے کیف و سُرود کی بارش کرتے تھے۔ عیش و عشرت کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ سریتا، بیس بائیس سال کی خوبصورت، صحت مند لڑکی خوابوں سے کھیلتی تھی۔ فلیٹ پُرکشش آرائشی سامان سے آراستہ تھا۔ وہ دن میں کئی کئی دیدہ زیب، خوش رنگ، خوبصورت وضع کے لباس زیب تن کرتی تو نیلم کا دل چاہتا وہ اُس کی تقدیر سے اپنی قسمت بدل لے۔ ہر شام آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر جب وہ گھنٹوں تک اُس طرح [illegible] جیسے کوئی [illegible] میدانِ جنگ میں جانے سے پہلے تیاری کرتا ہے تو اُس کے دل میں کسی انجانے خدشے کا جادو جاگتا۔ لیکن وہ اُسے اپنا وہم سمجھ کر نظر انداز کر جاتی۔

رات کے اندھیرے جیسے ہی اپنا دامن پھیلانے لگتے، ایک کا

ٹھیک بندھے ٹکے وقت پر ہر روز گلی اور سریتا [illegible] کے سُورج کی پہلی کرن نمودار ہونے سے پہلے وہ [illegible] سر اُبھارنے لگتا اور ایک دن نیلم نے [illegible] کہ سریتا [illegible]۔ نیلم کو سریتا کے وجود سے نفرت ہونے لگی۔

ایک دن سریتا نیلم کے فلیٹ میں [illegible] ہوئے بولی: 'واہ! کیا حُسن ہے! کیا جوانی ہے! اِس پر [illegible] چھی چھی چھی! ارے کچھ تو کہو بنو! کِس کی شکار ہو؟ کون ہے وہ ظالم شکاری جس نے اِس حُسن کی دیوی کو شکار کیا ہے؟'

نیلم اِس بے تکلفی پر بپھر گئی۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔

'آخر آپ چاہتی کیا ہیں؟ مجھے بے تکلفی بالکل پسند نہیں!'

'ارے ہم کیا چاہتے ہیں، یہ تو ہم بعد ہی کو بتائیں گے۔ ابھی تو صرف سرکار کی مزاج پُرسی کو حاضر ہوئے ہیں۔ حضور کو بُرا لگتا ہے تو لوٹ جاتے ہیں۔ لیکن ایک گلاس ٹھنڈا پانی تو پلوا ہی دیجئے۔ قسم بھگوان کی گلا سوکھ گیا ہے سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے!'

نیلم نے گلاس میں پانی دیا۔

'دیکھئے نیلم جی! ہمارا دل بھی ایسا ہی صاف ہے جیسا یہ شیشے کا گلاس! ہر چیز صاف صاف دکھائی دے گی آپ کو اِس آئینہ میں۔ خیر اب ہم چلتے ہیں، کوئی بات ناگوارِ خاطر ہوئی ہو تو معاف کر دیجئے گا!'

نیلم بہت دیر تک سریتا کے بارے میں سوچتی رہی۔ اُسے نہ جانے کیوں وہ بہت اچھی لگی۔ کمبخت کے بات کہنے کا انداز کتنا قاتلانہ ہے! خود تو پھر مرد ہیں، اِس نے تو مجھے بھی رِجھا لیا!' وہ بڑبڑاتی رہی۔

دُوسرے دن سریتا پھر نیلم سے ملنے آگئی۔ اِسی طرح اُس کا یہ معمول ہو گیا کہ وہ نیلم سے ملنے ضرور آتی۔ کچھ ہی دنوں میں اُس نے نیلم سے بے تکلفی پیدا کر لی اور ایک دن نیلم نے اپنی زندگی کی کتاب سریتا کے سامنے کھول کر رکھ دی۔

'نیلم! تمہاری داستان سُن کر مجھے اپنی کہانی یاد آگئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم سب عورتوں کی کہانی ایک جیسی ہے! مرد نے ہمیشہ عورت کو بدنامی اور گمنامی کے غار میں دھکیلنے کی کوشش کی ہے۔ وہ عورت کو اپنے عشرت کدے میں صرف سجانا چاہتا ہے، وہ عورت کو ایک پلاسٹک کے کھلونے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ وہ اُس کے دل میں کبھی جھانک کر نہیں دیکھتا۔ ہر عورت کی آرزو ہوتی ہے اُس کا اپنا [illegible]

اُس کے بچّے ہوں۔ اُس کی بھی اپنی کوئی دُنیا ہو۔ لیکن مرد کو انھیں سب باتوں سے نفرت ہوتی ہے۔ وہ محض کھیلنا چاہتا ہے؛ سریتا مرد سے اپنی نفرت کو الفاظ کا جامہ پہنا رہی تھی۔

"اگر میں بھی تمہاری طرح آنسو بہاکر بیٹھ جاتی تو نجانے کب کی موت کی آغوش میں سوگئی ہوتی۔ وقت بدل رہا ہے، زمانہ بدل رہا ہے عورت کو بھی بدلنا ہوگا۔ مرد کو سبق سکھانا ہوگا؟"

نیلم سریتا کی باتیں اُسی طرح سُن رہی تھی جیسے کلاس روم میں طالب علم اپنے اُستاد کا لیکچر سُنتے ہیں۔

"کیا تم یہ سمجھتی ہو نیلم کہ مجھے شوق ہے کہ میں روز اپنے گھر سے نکل کر حُسن و شباب کی دولت لُٹاتی ہوں ——— لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے۔ مجھے ایک طرح کا سکون ملتا ہے جب میرے لئے کوئی آغوش وا ہونا چاہتی ہے۔ اُسے بھرپور سزا دیتی ہوں۔ اُسے اُس کی آگ میں جلاتی ہوں، تڑپاتی ہوں اور عورت کی اہمیت کا احساس دلاتی ہوں۔"

"لیکن سریتا! یہ عورت کے ماتھے پر کلنک نہیں ہے؟ کبھی نہ چھٹنے والا بدنما داغ نہیں ہے؟ جو کچھ تم کرتی ہو؟" نیلم نے مداخلت کرتے ہوئے کہا تھا۔

"لیکن نیلم! کیا وہ مرد کے ماتھے پر کلنک نہیں ہے جو کچھ وہ کرتا ہے؟ اگر کلنک ہے تو دونوں کے لئے، داغ ہے تو دونوں کے ماتھے برابر متاثر ہونے چاہئیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک تو اپنا فرض ادا کرتے کرتے دَم توڑ دے اور دُوسرا اُس کا احساس تک نہ کر سکے۔ لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے، گرمی کو گرمی ہی مارتی ہے میں نے بھی بہت اپنا فرض نبھایا ہے، تم نے بھی اپنی وفاؤں پر اپنے آپ کو قربان کر دیا ہے۔ لیکن کیا مِلا ہے ہم دونوں کو ——— ؟ نیلم! اِس دُنیا کو تم نہیں پہچانتی ہو، میں جانتی ہوں۔ مرد ساری دُنیا بھر میں چاہے جو کچھ کرتا پھرے کسی کے کان پر جُوں تک نہیں رینگتی لیکن عورت کی ذراسی لغزش، ذراسی غفلت یہ سماج برداشت نہیں کر سکتا۔ ایسے اندھے سماج کو سبق سکھانے کی ضرورت ہے، اور طریقہ اِس سبق کا صرف یہی ہے کہ عورت کو بھی سینہ سپر ہوکر مقابلے کے لئے میدان میں اُتر آنا چاہیئے۔ جب تک تم یہ نہ کروگی، تنہائی کی اِس اندھیری کوٹھری کے یہ سانپ تمھیں ڈس جائیں گے۔ یہ روشن دُنیا کے رہنے والے تاریک ذہن کبھی احساس تک نہ کریں گے کہ ایک بےقصور جان نے مایوسیوں اور ناکامیوں کی تاریکیوں میں دَم توڑ دیا ہے۔ وقت کی رفتار بہت تیز ہے جو وقت کے تقاضوں کو نہیں پہچانتے، بچھڑ جاتے ہیں اور آگے جانے والوں کے قدموں کی گرد میں ہمیشہ کے لئے گم ہوکر رہ جاتے ہیں۔"

سریتا چلی گئی اور نیلم خلاؤں میں کھو گئی۔ سریتا کی باتوں نے اُسے اُس کی آدرش وادی دُنیا سے بہت دُور پھینک دیا تھا۔ اُس کی نگاہوں میں مختلف تصویریں بنتی رہیں، اُبھرتی رہیں اور مٹتی رہیں۔

رات اُس کے مستقبل کی طرح تاریک تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھی۔ اُس کے قدم آئینے نے پکڑ لئے۔ اُس کی شکل اُس راہی کی طرح تھی جو منزل کی تلاش میں راہ سے بھٹک جاتا ہے۔ وہ سوچنے لگی سریتا ٹھیک کہتی ہے۔ میرا غم، میرے آنسو، میری تنہائی، دُنیا سے بے نیازی، مجھے کہیں کا نہ رکھے گی۔ سریتا جیتی جاگتی دُنیا میں رہتی ہے اور میں خواب و خیال کی دُنیا میں! میں سریتا کے قدم بقدم چلوں گی، میں سریتا بنوں گی . . .

"یہ نہیں ہو سکتا نیلم!" آئینہ کہہ رہا تھا "تم سریتا نہیں بن سکتیں۔ سریتا سماج کے ماتھے پر کلنک ہے، عورت کے نام پر بدنما داغ! کبھی نہ دُھلنے والا داغ! تمھاری ایک لغزش، ایک غلط قدم، تمھاری پُوری زندگی پر بھاری ہوگا۔ تم نے جو کچھ زندگی سے لیا ہے وہ لُٹ جائے گا۔ تم برباد ہو جاؤ گی۔ لوگ تمھارا نام سُن کر مُنہ بنائیں گے نفرت نفرت ہی کو جنم دیتی ہے۔ عورت کو ایثار و محبت کی دیوی کا رُوپ ہی زیب دیتا ہے۔ اُس کی تو پُوری زندگی مجسّم قربانی ہوتی ہے!"

"تم ٹھیک کہتے ہو یہ سچ ہے! یہ سچ ہے!" نیلم نے چیختے ہوئے اپنی دونوں آنکھیں ہاتھوں میں چُھپالیں اور سسکیاں بھرتی ہوئی بستر پر گر گئی: "مجھے یہ گھر، یہ محلّہ، یہ شہر چھوڑنا ہوگا۔ یہاں صرف سریتا رہ سکتی ہے صرف سریتا! نیلم نہیں رہ سکتی!"

رات گئے تک اُس نے سفر کا سامان مکمّل کر لیا۔ اُسے نہ جانے کیوں آج کی رات جمال کی یاد ہر لمحہ آرہی تھی۔

صبح "کال بیل" نے اُسے بیدار کیا۔ وہ دروازے پر آئی۔ سامنے جمال سر جُھکائے کھڑا تھا! "میں ہار گیا ہوں نیلو! مجھے معاف کردو۔ میں تمھیں لینے آیا ہوں ہمیشہ کے لئے! کیا تم اپنے جمال کو معاف کر سکوگی؟" جمال گلوگیر آواز میں جذبات سے مغلوب ہوکر کہہ رہا تھا ——— نیلم جمال کے سینے سے لگ کر سسکیاں بھرنے لگی!!


حسن جو چاند کو شرمائے
جے کا نرم نرم سہانا جھاگ آپکی
جلد کو پھول کی طرح نازک اور خوبصورت
رکھتا ہے۔ اس کی بھینی بھینی
چنبیلی کے پھولوں میں بسی
خوشبو آپکو
دیر تک شاداب
رکھتی ہے
ہر روز
جے
ٹاٹا کا بنایا ہوا

غزل

[illegible] ایم ایس سی (علیگ)

حسن تیرا چمن چمن ہوگا
تیرا جلوہ کرن کرن ہوگا

بات تیری زباں زباں ہوگی
ذکر تیرا سخن سخن ہوگا

لاکھ چہرے ترے مقابل ہوں
تو ہی بس جانِ انجمن ہوگا

راہ روکے کھڑے ہیں رسم و رواج
اب تصور میں ہی ملن ہوگا

مل نہ پائے جو طالب و مطلوب
یہ بھی دنیا کا اک چلن ہوگا

باتوں باتوں میں روٹھ جانا بھی
دل نوازی کا کوئی فن ہوگا

تیرے دل میں مری محبت ہے
یہ بھی اس دل کا حسنِ ظن ہوگا

کوئی تنہائیوں کی محفل میں
بربطِ دل پہ نغمہ زن ہوگا

میرا ماحول میری نظروں سے
کوئی دیکھے کفن کفن ہوگا

غزل

قیصر واحدی ایم اے

آنسو جو اُس آنکھ سے چھلکے
نقش بنے سب تاج محل کے

آج کھلی آنکھوں سے اپنا
دیکھ رہا ہوں سپنے کل کے

اُٹھنے والا ہے کوئی فتنہ
بیٹھے ہیں وہ پہلو بدل کے

گلشن میں جو پھول کھلے ہیں
عکس ہیں اُس رنگیں آنچل کے

پریم جہاں ان مول ہے یارو
اُس نگری میں دیکھیں چل کے

پھیلے ہیں آکاش پہ تارے
کس کی آنکھ سے آنسو چھلکے

دیر و حرم تو دیکھ چکے ہو
اب میخانہ دیکھو چل کے

تجھ کو حاصل چاند ستارے
میری قسمت صرف دھندلکے

آتے ہو تو بیٹھ بھی جاؤ
مہماں ہم ہیں پل دو پل کے

ہم اُن کی محفل میں قیصر
روز آتے ہیں بھیس بدل کے

پُرشور خاموشی

پروفیسر آفاق احمد ایم - اے

E/182/3 پروفیسرز کالونی، بھوپال لائن، بھوپال نمبر ۲ (ایم - پی)

محترمی خوشتر صاحب! سلام خلوص

ایک طویل عرصے کے بعد پھر "بیسویں صدی" کی بزم میں شریک ہو رہا ہوں۔ میری پہلی کہانی ۵۴ء یا ۵۶ء میں آپ نے شائع کی تھی۔ درمیانی سولہ سترہ سالوں میں کوئی ایسی کہانی تخلیق نہ کر سکا جو آپ کو بھیجتا ___ اِس مُدت میں فِکر و شعور کی کتنی مسافت میں نے طے کی ہے اُس کا اندازہ آپ یہ کہانی پڑھ کر خود لگا سکیں گے ___ کہانی کا عنوان "پُرشور خاموشی" کچھ عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن جب آپ یہ کہانی پڑھ لیں گے تو مجھے یقین ہے کہ اِس عنوان کی معنویت کو کہانی کے مزاج سے بالکل ہم آہنگ قرار دیں گے ___ اب جو "چُپ" ٹُوٹی ہے تو اُمید ہے کہ آپ کو کئی اور کہانیاں بھی دے سکوں گا۔ اپنی رائے لکھیے تاکہ "کاروبارِ شوق" میں اور تیزی آئے۔

آپ کا ___ آفاق احمد

★

اُس سے میں نے کہا: "دیکھو سب گھوڑوں سے چل رہے ہیں۔ کیوں نہ ہم بھی انھیں سے چلیں؟"

وہ بولی: "نہیں۔ ہم پیدل چلیں گے۔"

"اور جو تھک گئیں تو؟"

"اُس کی فکر نہ کرو۔ میں تم سے سنبھالنے کو نہ کہوں گی!"

"لیکن صاحب کیسے پیدل چل پائیں گے؟" میں نے اُس کے شوہر کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کی۔

"کیا ضروری ہے کہ وہ بھی چلیں۔ یہاں تک آ گئے یہی بہت ہے۔"

اور اُس نے اپنے پتی کو فیصلہ سُنا دیا: "ہم پیدل چلیں گے۔"

"تو تم دونوں جاؤ۔ مجھے یہیں چھوڑ دو۔ یوں بھی مجھے پہاڑوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔" یہ کہتے وقت اُس نے پہلے اپنی بیوی کی طرف دیکھا، پھر میری طرف۔ اُس کی نِگاہوں میں سارے جہان کی اُداسیاں اُتر آئی تھیں۔

میں نے کہا: "آپ بھی چلتے تو بہتر رہتا اور پھر دُور ہی کتنا ہے۔ یہی کوئی دو ڈھائی میل۔"

"میلوں کا فاصلہ حوصلے سے ناپا جاتا ہے ینگ بوائے۔ مجھ میں اب اِتنا حوصلہ نہیں۔ میری خاطر تم میری مِسز کا ساتھ دو۔ پلیز۔" اُس کی نِگاہوں میں التجائیں تھیں، اُس کی آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی اور اُس کے دل میں... کون جانے کیا کیا کچھ تھا!

میں نے اُس کے شوہر سے آنکھیں چار کیے بغیر چوروں کے سے لہجے میں کہا: "ہم جلدی آ جائیں گے۔ شام کو چائے ساتھ ہی پئیں گے۔"

زُلف

ہم چھو بھی لیں زُلفوں کو تو ہوں موردِ الزام
گستاخ ہواؤں کو سزا کیوں نہیں دیتے —— اختر راشدی

کیا زُلف سیہ شانوں پہ لہرائی ہوئی ہے
لگتا ہے کہ ساون کی گھٹا چھائی ہوئی ہے —— پیر ظہیر حسن

ذرا اُن کی شوخی تو دیکھنا لئے زُلف خم شدہ ہاتھ میں
مرے پیچھے آکے دبے دبے مجھے سانپ کہہ کے ڈرا دیا —— جگر مراد آبادی

تمتماتے ہوئے رُخساروں پہ بکھری زُلفیں
جیسے بجلی کے چمکنے سے گھٹا جلتی ہے —— عاطف قتیبہ

طولِ شبِ فرقت سے بھی دو ہاتھ بڑی ہے
وہ زُلفِ مسلسل جو ترے رُخ پہ پڑی ہے —— نامعلوم

مُرسلہ —— نذیر احمد صفات حیدرآبادی

وہ مُسکرایا: "اوکے، اوکے۔ بس دیر مت کرو۔ جاکر آنا بھی تو ہے تم لوگوں کو ——"

ہم اُس پہاڑی کے لئے روانہ ہوئے، جس کے بارے میں اپنی حد تک میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ، ایک مُدت سے جسے دیکھنے اور جس کی دھرتی کو چُومنے کی خواہش میرے دل میں ارمان بن کر پل رہی تھی۔

دو راستے تھے۔ ایک سے پونی جاتے تھے، دُوسرے سے پیدل جانے والے۔

پونی والوں نے ہمیں گھیر لیا۔

میں نے پھر کہا: "پونی لے لیں؟"

"نہیں ——" اُس نے فیصلہ کُن انداز میں کہا۔

ہم پیدل ہی روانہ ہوئے۔

آگے پیچھے اور لوگ بھی تھے۔

وہ دھیرے دھیرے چلنے لگی —— "ذرا انھیں آگے نکل جانے دو۔ بھیڑ میں میرا دَم گھٹتا ہے۔"

میں نے اپنی رفتار دھیمی کر دی۔

بھیڑ چھٹی تو ہم پھر آگے بڑھے۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر وہ بولی: "تم بھی عجیب ہو، گروکر راہ کئے۔"

"کیا باتیں کر رہی ہو؟"

"یہی تو پوچھ رہی ہوں کہ پونی سے چلنے پر راضی کیوں نہیں ہوئے؟"

"کیوں راضی نہ ہوتیں؟"

"اِس لئے کہ اگر پونی سے گرتی تو پونی والا سنبھالتا، پیدل گری تو تم سنبھال لوگے!"

یہ کہتے کہتے اُسے ٹھوکر لگی۔ وہ لڑکھڑائی۔ میں نے اُسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

"دیکھا، تم نے سنبھال لیا، نا؟"

"اگر میں گرا تو مجھے کون سنبھالے گا؟"

"میں ——"

"تم؟"

"ہاں میں ——"

"تم مجھے سنبھالو گی؟"

"کیوں نہیں۔ یوں ہی ایک دوسرے کو سنبھالتے تو منزل تک پہنچنا ہے۔"

"مگر منزل تو ابھی دُور ہے۔"

"کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رُخ بھی بدل گئے۔"

اونچے نیچے راستے جہاں ہر پچاس قدم پر کوئی نیا موڑ منتظر ہوتا۔ کبھی بہت اچھے لگتے، کبھی جی اُکتانے لگتا۔ کبھی دل چاہتا اِن پر چلتے جائیں، یہ ختم نہ ہوں اور کبھی وہی دل کہتا یہ ختم ہوں تو پیچھا چھوٹے۔ ایسے ہی میں دائیں طرف کا وہ موڑ آگیا جہاں سے اوپر کی سڑک نظر آنے لگتی ہے۔ وہاں سے نیچے کی زمین یوں نظر آ رہی تھی جیسے کوئی مغرب شنہ پہاڑ سے کمر ٹوٹا ہو کہ اب کوئی بلندی سے گرے اور وہ اُسے نگل لے! مجھے خوف سا محسوس ہوا۔ میں نے اپنے اُس خوف میں اُسے بھی شریک کرنا چاہا۔

"ذرا نیچے دھرتی کی طرف تو دیکھو۔ تمھیں گرنے سے ڈر نہیں لگتا؟"

"لیکن تم یہ کیوں دیکھتے ہو ——— اوپر دیکھو نا ——— یہ بھی گرجانے کا اندیشہ ہے۔ نگاہیں تو اوپر کی طرف چڑھتے جانا ہے، چلتے جانا ہے۔ یہاں تک کہ منزل کے نشان نظر آنے لگیں، یہاں تک کہ ہم اُن نشانوں تک پہنچ جائیں، یہاں تک کہ ہم انھیں چھو لیں اور وہاں کے گھنیرے درختوں کے سایے میں بیٹھ کر راہ کی ساری صعوبتوں کو فراموش کر دیں اور تازہ ہوا کے جھونکے ہماری ساری کسل مندی کو دور کر دیں۔"

وہ بولتی رہی۔ میں حیرانی سے اُس کا مُنہ تکتا رہا۔ وہ جب بولتی تھی تو اسی طرح مسلسل بولے جاتی تھی۔ تھوڑی دیر کو سانس لینے کے لئے رُکی۔ جیسے تھک گئی ہو۔ پھر کہنے لگی۔

"آؤ کچھ دیر دَم لے لیں ——— اور آگے چلیں گے دَم لے کر!"

"یوں ہی سہی۔"

ہم ایک تنہا گوشہ میں ہری ہری نرم گھاس پر بیٹھ گئے۔ چمکیلی دھوپ سے ہمارے چہرے تمتما رہے تھے۔ اُس کا رنگ رُخ کچھ زیادہ ہی دمکا ہوا تھا۔ لیکن اس وقت ہم جہاں بیٹھے تھے وہاں سایے کی دبیز چادر ہمارے سروں پر تنی ہوئی تھی۔

اُس نے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ تھوڑی دیر تک آنکھیں بند کئے رہی۔ آنکھیں کھولیں، میری طرف دیکھا اور تیزی سے بولی۔ جیسے کوئی بات یکایک یاد آگئی ہو۔

"تم نے اُن سے چلنے کے لئے اصرار کیوں کیا تھا؟"

"کیوں؟ کیا اُن کا چلنا مناسب نہ تھا۔ میں تو یہ سوچتا ہوں کہ اگر صاحب بھی ساتھ آتے تو زیادہ بہتر رہتا۔"

"لیکن تم نے دیکھا۔ انھوں نے تو خود ہی ساتھ چلنے سے انکار کر دیا۔"

"ہاں۔ تم نے شاید نہ دیکھی ہو۔ مگر میں نے اُن کی وہ نظر بھی دیکھی تھی جس میں سارے جہاں کی حسرتیں چھپی ہوئی تھیں۔"

"جو ساتھ نہیں ہیں اُن کی اِتنی فکر، اُن پر اتنی گہری نظر ——— کاش تم کبھی میری نظروں کی گہرائی میں بھی ڈوب کر دیکھ سکتے ——— ! آؤ آگے بڑھیں۔"

اور وہ اُٹھ گئی۔

ہم پھر اوپر کی طرف چلنے لگے اور آخر منزل ہمارے زیرِ قدم

آنکھ

کچھ یاد کر کے آنکھ سے آنسو نکل پڑے
مُدت کے بعد گزرے جو اُس کی گلی سے ہم ——— نواب سعید

سو بار تیرا دامن ہاتھوں میں میرے آیا
جب آنکھ کھُلی دیکھا اپنا ہی گریباں تھا ——— اصغر گونڈوی

شاخِ گل جھوم کے گلزار میں سیدھی جو ہوئی
پھر گیا آنکھ میں نقشہ تری انگڑائی کا ——— شوق

ہر بزم کی جان ہو گئی ہے
وہ آنکھ جوان ہو گئی ہے ——— فراق گورکھپوری

فضا تبسمِ صبحِ بہار تھی لیکن
پہنچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی ——— فراق گورکھپوری

مرسلہ:- امیر انصاری، جمنا پاٹ (آسام)

آ ہی گئی!

"دیکھو منزل آگئی نا!"

"پڑاؤ کو تم منزل کہتے ہو؟"

"چلو اور آگے چلیں۔ میں نے تو دیکھا نہیں۔ سُنا ہے وہ جو برف کے لبادے اوڑھے پہاڑیاں نظر آرہی ہیں، وہاں کا منظر ہی کچھ اور ہے۔"

"ہوگا۔ مجھے ہر سفید چیز سے نفرت ہے۔ پتہ نہیں کیوں کفن کی یاد آتی ہے۔ ہر بے جان چیز میری جان جلاتی ہے۔"

"لیکن جب پہاڑوں پر برف پگھلتی ہے تب یہ احساس نہیں ہوتا کہ اُن کے سینہ میں بھی گرمی تھی، اور ایک دل بھی تھا جسے دھڑکنے کی ادا بھی آتی تھی اور اب جو دل دھڑکتا ہے تو وہ بھی اپنا لبادہ اُتار رہے ہیں۔"

"چھوڑو پہاڑوں کی باتیں۔ چلو دوسری طرف چلیں۔ اُس سڑک کی طرف آگے بڑھیں جہاں سے سارے لوگ گزر چکے ہیں۔ اور جو اب خالی خالی نظروں سے اپنی سُونی چھاتی پر کسی نئے انسان کے قدموں کی چاپ کی منتظر ہے۔ لیکن جس کا مقدر اب شام تک

یوں ہی بے دم ہو کر لیٹے رہتا ہے۔ آؤ کیوں نہ ہم اس کا مقدر بدل دیں۔ نصیبہ جگا دیں۔" وہ پھر مسلسل بولنے کی اپنی روایت کو آگے بڑھا رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں نے اس کے مشورہ کو مان لیا۔

ہم پھر ساتھ ساتھ اس نئے راستے پر چلنے لگے۔ بہت دیر تک خاموشی رہی۔

"کچھ بولو" میں نے خاموشی کو توڑا۔

"کیا بولوں؟"

"کچھ بھی ـــ کچھ نہیں تو اپنے بارے میں مجھے کچھ بتاؤ ـــ ہم دو دن سے ساتھ ہیں۔ لیکن تم نے مجھے کچھ بھی تو نہیں بتایا ـــ نہ اپنے بارے میں، نہ اپنے صاحب کے بارے میں۔"

"لیکن میں نے تو تمہارے بارے میں کچھ بھی نہیں پوچھا۔"

"پوچھو۔ میں بتاؤں گا۔"

"نہیں، تم مجھ سے کچھ نہ پوچھو، میں تم سے کچھ نہ پوچھوں ـــ ہم کون ہیں، کہاں سے آتے ہیں۔ یہ اکتانے والے سوالات نہ کرو۔ کیا یہ کافی نہیں ہے کہ تم میرے سامنے ہو، میں تمہارے سامنے ہوں۔ ہم ساتھ چل رہے ہیں۔ تھکے تھے تو بے دم ہو کر ساتھ بیٹھ گئے تھے اور پھر تازہ دم ہو کر چلنے لگے تھے۔ پھر تھکے تو بیٹھ جائیں گے اور پھر اٹھ کھڑے ہوں گے۔"

"چلو تو بیٹھ جائیں۔"

"کیوں تھک گئے؟"

"نہیں ... ہاں۔"

سڑک کے ایک کنارے پر پہاڑی سلسلہ تھا، دوسری طرف ڈھلان تھے۔ دائیں طرف کے پہاڑ کی چوٹی پر برف جمی ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا سیال چاندی کی ایک نہر تھی جو اب جم چکی ہے۔ نیچے کا منظر کچھ اور ہی تھا۔ زمین ایک تھی، موسم بھی ایک تھا اور آکاش پر چمکتا سورج بھی ایک تھا، لیکن سورج سے روشنی کی کرنیں کچھ اس انداز سے دائرے بنا رہی تھیں کہ زمین کا کوئی حصہ بالکل تاریکی میں ڈوبا محسوس ہو رہا تھا اور کہیں اجالا چمک رہا تھا۔

مجھے اس طرح نیچے دیکھتے دیکھ کر وہ بولی۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟"

"تم بھی دیکھو۔ یہ اُجالے، یہ اندھیرے ـــ یہ کیسے ساتھ ساتھ ہیں!"

"نیچے کیوں دیکھوں۔ میری تو زندگی ہی ان سے عبارت ہے۔ میری زندگی کے اندھیروں کو کس نے دیکھا ہے ـــ دیکھا ہی نہیں تو شمع کون جلاتا!"

وہ میرے بالکل نزدیک آگئی۔ اس نے میرے بازو کا سہارا لیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اب وہ بہت دیر تک کچھ بول نہ سکے گی۔ جیسے وہ بولتے بولتے تھک چکی ہے۔

یکایک میرے بازو پر اس کی گرفت سخت ہو گئی۔ اس نے بے صدا اپنے پن سے پوچھا ـــ "تم بتاؤ، اگر کسی کے جیون میں صرف تاریکی ہی تاریکی ہو۔ راستہ بالکل سجھائی نہ دے تو اندھیرے میں ڈوبا انسان کیا کرے؟"

"تمہاری بہت سی باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔" میں کیا جواب دیتا۔ میں نے بات ختم کرنا چاہی۔

[illegible] پہلا کے چلیں؟"
"ہم [illegible] ہے۔"

[illegible] (Blind Corner) [illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] ۔۔۔ [illegible]

"زندگی میں ہر موڑ سے پہلے دکھائی دیتا ہے۔ جب مڑنے [illegible] منظر [illegible] کہ کون رہ گیا [illegible] ایک بار انسان مڑ جائے تو سارے دکھوں سے چھوٹ جائے۔ [illegible] کیسی ہوتی ہے؟"

جب مڑ کے [illegible] ہم [illegible] کچھ دور پر ایک [illegible] شکل اختیار کر چکا تھا۔ [illegible] بہت بلندی سے نیچے گرنے [illegible] ہوتا ہی ہے ۔۔۔ یہاں تو مسلسل [illegible] دریا کا تیز شور ۔۔۔ اس کی آواز ہمیں پہلے بھی آتی تھی۔ لیکن کچھ باتیں اتنی گہری تھیں کہ غور ہی نہیں کیا اور کچھ خاموشی اتنی پُر شور تھی کہ اس شور کی طرف دھیان ہی نہ دیا۔ اب ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس شور میں ہم دونوں کا وجود گم ہو جائے گا۔ ہم اس شور ہی کا ایک حصہ بن کر اس میں تحلیل ہو جائیں گے۔

وہ بولی: "شور، ہر طرف شور! مجھے سکون چاہیے۔ چلو اس شور سے دور چلو!"

میں نے کہا: "لیکن اس شور سے دور تو ہم جب ہی ہو سکیں گے جب آگے بڑھیں، پیچھے کو [illegible] ہیں۔"

"[illegible] تو ہم [illegible] ۔۔۔ [illegible] فیصلے سننے والی عورت کا سا تھا۔

"ٹھیک ہے تو آگے بڑھو۔"

"[illegible] آگے ہی بڑھو۔"

میں نے بات چیت جاری رکھنے کی خاطر کہا: "اچھا تو صاحب [illegible] گے۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

اس کی عادی سی ہو گئی ہوں۔ ان چاروں طرف پھیلے ہوئے گھنیرے درختوں کی طرح جو صدیوں سے آبشاروں کا شور غل سن رہے ہیں، [illegible] جلنے والے موسموں اور رُتوں کی طرح جو اس شور کو اپنی سانسوں کی طرح اپنے وجود میں سموئے ہوئے ہیں ۔۔۔ اور یہ کہ جہاں یہ [illegible] گرتا ہے وہاں سے کچھ دور پر وہ ندی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ ندی کتنی حسین ہے، بہتی رہتی ہے ۔۔۔ اور [illegible] جب پہاڑ [illegible] تو [illegible] تیزی سے گرے گا۔ [illegible] تیزی سے بہے گی ۔۔۔ تم سن رہے ہو نا؟"

اسے مسلسل بولتے بولتے میری خاموشی کا احساس ہوا۔

اس نے چاہا میں بھی اس کی سوچ میں شریک ہو جاؤں۔

یکایک میری نظر [illegible] سے کچھ دور شمال میں ایک ایسی جگہ پڑی جہاں دو انسانی سائے، شاید دنیا کے شور سے تنگ آکر، فطرت کے اس شور کو اپنے سب سے رنگین، سب سے طرح دار رازوں کا امین بنانا چاہتے تھے۔

مجھے ایک خاص سمت میں اس طرح دیکھتے دیکھ کر اس نے بھی بے اختیار میری نظروں کا پیچھا کیا

میں نے گھبرا کر کہا ۔۔۔ "چلو بہت دیر ہو گئی، اب واپس چلیں۔ صاحب انتظار کر رہے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے انھوں نے کچھ کھایا بھی نہ ہو؟ اور بھوک تو تمہیں بھی لگ رہی ہوگی؟"

اس نے ایک عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا ۔۔۔ "ہاں! بہت زور کی بھوک لگی ہے!!"

مدیر [illegible] افسانے [illegible] تاکہ آپ کے ارشاد کی تعمیل [illegible] مصروفیت کے [illegible]

مضمون نگار حضرات [illegible]

[illegible]

اناج کی قیمتوں کو کم کرنے میں آپ مددگار ثابت ہو سکتے ہیں
کم اناج استعمال کر کے بھی آپ اپنے کھانے سے درست ضروری مقدار میں
بلکہ اس سے زیادہ مقدار میں بھی صحت کے لیے ضروری
عناصر حاصل کر سکتے ہیں۔
یہ بات بالکل آسان ہے۔ گیہوں اور چاول کم کھائیے اور آلو، شکرقندی
اور مکئی، جو، باجرہ، جوار اور راگی ایسے دوسرے اناجوں کا
زیادہ استعمال کیجئے۔

کم اناج استعمال کر کے
متوازن خوراک
کھائیں



ہرے پتوں والی سبزیوں اور موسم کے مطابق پھلوں کا استعمال
کر کے آپ اپنی خوراک کو زیادہ متوازن و مقوی بنا سکتے ہیں۔
معاشی نقطۂ نظر سے یہ بات ملک کے لئے بھی
زیادہ فائدہ مند ہوگی۔
اپنی روزمرہ کی خوراک میں ان کا استعمال کیجئے۔

ہفتے میں کم از کم ایک بار ایسا کھانا کھائیے
جس میں اناج شامل نہ ہو

davp 78/744

شگوفہ

پروفیسر مہندر پرتاپ چاند ایم۔ اے

گورو کشیتر یونیورسٹی، کوروکشیتر (ہریانہ)

محترمی و مخلصی ڈاکٹر صاحب آداب

اُمید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ دلّی سے واپسی پر یہاں کچھ مصروفیات رہیں جس کی وجہ سے آپ کو اب تک خط نہ لکھ سکا۔ ویسے آپ کی پیاری باتوں کا سحر ابھی تک دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے ــــ "شگوفے" ادبی حلقوں میں بے حد مقبول ہو رہے ہیں۔ اس کے اداریوں سے متعلق تحسین و توصیف آمیز خطوط کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ بہت سے قارئین نے انھیں بعد میں کتابی صورت میں شائع کرانے کی رائے دی ہے۔ یہ تجویز واقعی بہت حسین ہے بشرطیکہ آپ بھی اس سے متفق ہوں کیونکہ شائقین "بیسویں صدی" کی اس خواہش کی تکمیل آپ ہی کی توجہ پر موقوف ہے ــــ بھیجے کچھ اور "شگوفے" حاضر ہیں۔ حسب وعدہ اب کی بار انگریزی زبان کے ادیبوں کے لطائف بھیج رہا ہوں۔ ان میں بیشتر واقعات طنز و مزاح کے بادشاہ برنارڈ شا سے متعلق ہیں۔ مجھے یقین کامل ہے کہ قارئین "بیسویں صدی" اس تبدیلی ذائقہ سے ضرور لطف اندوز ہوں گے۔ ان لطائف کی ترتیب و تدوین میں میرے محترم احباب ڈاکٹر او۔ پی گرگ [illegible] اور خصوصاً پروفیسر تیجندر سنگھ [illegible] نے جو اعانت فرمائی ہے اس کے لئے میں اُن کا بے حد ممنون ہوں ــــ سالنامہ ہمیشہ کی طرح بے حد خوبصورت تھا۔ ہاں! اس میں میری سوانح حیات میں میرے والد محترم کا نام غلط چھپ گیا ہے۔ اصل نام کرور لال حسین ہے۔ براہ کرم اس کی تصحیح فرما دیجیے گا۔ زیادہ والسلام...

آپ کا مشکور و کرم

مہندر پرتاپ چاند

★

انگریزی کے مشہور مزاح نگار جارج برنارڈ شا عظیم ادیب تو تھے ہی۔ وہ بلا کے زر پرست بھی تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے۔ "میری تحریر کا ایک لفظ ایک پونڈ کی قیمت رکھتا ہے"۔ [illegible] ایک پونڈ [illegible] کے [illegible] براہ کرم مجھے اپنا ایک قیمتی لفظ عنایت فرما دیجئے؟"

شا نے جواب میں واقعی ایک لفظ ارسال کیا اور وہ تھا ــــ "شکریہ!"

شا کی زر پرستی کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے جس میں

[illegible] ادبیت بھی نمایاں طور پر ملتی
ہے [illegible] برنارڈ شا سے [illegible] دنیا میں بھی
[illegible]
[illegible] ہے۔"

ایک [illegible] ادیب جو بہت ذہین اور حسّاس تھا انگریزی کے مشہور ادیب آسکر وائلڈ کے پاس گیا اور یاس آمیز لہجہ میں اُن سے کہنے لگا: "میں ایک مدّت سے لکھ رہا ہوں اور اب تک بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے ملک کے سبھی تبصرہ نگاروں نے جیسے میرے خلاف کوئی سازش کر رکھی ہے کیونکہ کسی ایک بھی تبصرہ نگار نے میری نگارشات پر تبصرہ نہیں لکھا یا لکھ کر مجھے اپنی گرانقدر رائے سے نوازے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

آسکر وائلڈ نے قدرے توقف کے بعد سنجیدگی سے جواب دیا۔ "میاں! میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ بھی اس سازش میں شریک ہو جائیں!"

اور وہ بے چارہ نوجوان ادیب مایوس ہو کر پلٹ گیا۔

انگریزی زبان کے مشہور ادیب ڈاکٹر جانسن کو سکاٹ لینڈ اور وہاں کی ہر چیز سے نفرت تھی۔ کسی نے شاید جان بوجھ کر چھیڑنے کی غرض سے اُن سے پوچھا: "آپ کے خیال میں سکاٹ لینڈ کی سب سے زیادہ خوش نما اور خوبصورت چیز کون سی ہے؟"

جانسن نے فوراً جواب دیا: "صرف ایک چیز ___ اور وہ ہے وہاں کی وہ سڑک جو سیدھی لندن کو آتی ہے!"

برنارڈ شا کی اکیسویں سالگرہ پر مبارکباد دیتے ہوئے ایک نوعمر ادیب نے اُن سے پوچھا: "کیا میں ایسا خوش قسمت ہوں گا کہ آپ کا سوواں جنم دن بھی دیکھ سکوں؟"

برنارڈ شا نے [illegible] کہا: [illegible] اگر اور صحت [illegible] تو ضرور دیکھ سکو گے۔"

ایک شام ادیب نے اپنے ایک ڈرامہ کی سٹیج پرفارمنس (Stage Performance) پر برنارڈ شا کو دعوت دی کہ

[illegible]
[illegible]
[illegible]
چاہتا [illegible]
[illegible]
[illegible]
ایک [illegible] ہے؟"
کون جانے وہ [illegible]
سکتا یا نہیں!

الیگزینڈر پوپ اٹھارہویں صدی کے مشہور انگریزی شاعر تھے اور طنز و مزاح میں بھی بے مثال تھے۔ ایک دن ایک [illegible] موسوم بہ کیو اُن کے پاس تحفہ لائیں اور ان سے ایک شعر کی فرمائش کی جسے وہ اپنے کتے کے گلے میں ڈالنے [illegible] جس سے کتے پر اُن کی ملکیت بھی ظاہر ہو سکے۔ پوپ نے [illegible] اُنھیں ایک شعر لکھ دیا جس کا مفہوم تھا: "میں [illegible] کا کتا ہوں"

[illegible]

[illegible] نے خفا ہونے کی بجائے نہایت تحمل سے جواب دیا۔
سب سے پہلے اسے نہایت احتیاط سے چھیلا جائے اور پھر نہایت سلیقے سے اس کی خوبصورت قاشیں بنالی جائیں۔ بعد ازاں نمک، کالی مرچ، سرکہ اور سلاد آئل ڈال کر خوب ہلا لیا جائے ــــ اور پھر [illegible] کھڑکی سے نیچے پھینک دیا جائے۔ آخر یہ بھی کوئی کھانے کی چیز ہے؟
[illegible] جو نہایت اشتیاق سے یہ سب سن رہے تھے یکایک چونکے اور پھر بے حد نادم ہو کر خاموش ہو گئے۔

مشہور انگریزی ادیب جی۔ کے چیسٹرٹن بھی بلا کے بذلہ سنج تھے اور طنز و مزاح میں ید طولیٰ رکھتے تھے لیکن برنارڈ شا کے آگے ان کی ایک نہ چلتی تھی۔ کہتے ہیں ایک دن ایک تنگ سی گلی میں [illegible] آمنے سامنے سے گزر رہے تھے تو موٹے چیسٹرٹن نے [illegible] راستہ روکتے ہوئے کہا: میں بد مثال کو گزرنے نہیں دیا کرتا؟
[illegible]

ایک دن [illegible]
دونوں مل کر [illegible]
اس ادیب نے [illegible]
گھوڑے کو بھی ایک [illegible]
شا نے فوراً جواب دیا [illegible]

انگریزی زبان کے مشہور ادیب [illegible] اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں [illegible] گلی میں ایک [illegible] ماچس بیچنے والا آیا کرتا تھا۔ اس کی آواز اتنی کرخت اور بلند تھی کہ [illegible] ایڈیسن بیٹھے [illegible] چھوڑ کر [illegible] جاتے۔
ایک دن ایڈیسن نے اسے ٹھوکر دو پونڈ دیئے اور کہا: یہ رقم لو اور براہِ کرم کل سے اِس گلی میں نہ آیا کرو۔
وہ آدمی وعدہ کر کے چلا گیا اور اس نے واقعی اس دن سے اس گلی میں آنا چھوڑ دیا۔ لیکن اگلے دن اس گلی میں دوسرے ماچس بیچنے والوں کا ایک ہجوم تھا جو گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہے تھے۔
ایڈیسن معاملہ تو تاڑ گئے۔ لیکن بے چارے اپنے آپ ہی میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئے۔

جارج برنارڈ شا کی ذاتی لائبریری دیکھ کر ان کے ایک دوست بے حد متاثر ہوئے اور کہا: کاش! میرے پاس بھی اتنی خوبصورت لائبریری ہوتی۔
شا نے رازدارانہ لہجہ میں ان سے کہا: یہ تو بہت آسان ہے! بس دوستوں سے کتابیں اُدھار لو اور لوٹانے کا نام نہ لو!
”پھر؟“ اس نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔
”پھر کیا؟ پھر جو کچھ ہوگا وہ آپ کے سامنے ہے!“
خدا جانے وہ آدمی یہ راز کی بات سمجھ سکا یا نہیں!!

[illegible]

غزل

شکیل احمد عاصم بریلوی ایم۔اے، ایم۔کام، بی۔ٹی

ہم جن پہ دل و جان سے قربان رہے ہیں
وہ آج ہمیں غیروں میں گردان رہے ہیں

محفوظ رہا منتِ ساحل سے کہ طوفاں
خود میرے سفینے کے نگہبان رہے ہیں

اے اہلِ خرد چھیڑو نہ ہم اہلِ جنوں کو
اُلجھے ہیں جو ہم سے وہ پشیمان رہے ہیں

جو تیر کبھی آپ نے پھینکے تھے نظر سے
تا عمر مرے دل میں وہ مہمان رہے ہیں

تہذیب کی ضامن ہے تو اقدار کی خالق
اُردو کے مخالف بھی اِسے مان رہے ہیں

وہ اور ہیں جن کو ہے دلائل کی ضرورت
ہم دل سے تجھے اپنا خدا مان رہے ہیں

قدرت نے دیا ہے تجھے وہ حُسنِ مجسّم
آئینے جسے دیکھ کے حیران رہے ہیں

جو تم نے محبت سے کبھی پیش کئے تھے
وہ پھول سدا زینتِ گلدان رہے ہیں

[illegible] دکھا کے ہیں [illegible] عاصم
ہم [illegible] پہ قربان رہے ہیں

آنکھیں

احمد وصی بی۔اے۔ ایل ایل۔بی

پلکوں کی گھنی چھاؤں میں پیاری آنکھیں
گھبرائی ہوئی، نیند سے بھاری آنکھیں
آنکھوں کو حسیں خواب دکھا جاتی ہیں
جھکتی ہیں جو اُٹھ اُٹھ کے تمہاری آنکھیں

کس قدر بے وفا ہیں یہ آنکھیں
جس کو دیکھیں اُسی پہ وار کریں
کس کے چہرے سے آس [illegible]
کس کی آنکھوں کا اعتبار [illegible]

یوں آنکھ میں سما جیں نہ [illegible]
پھولوں کو نہ زلفوں میں [illegible]
نظروں [illegible]
[illegible]

لے کے انگڑائی اپنے بستر [illegible]
تم جب آنکھوں کو مل رہی ہوگی
صبح پہلو میں [illegible]
رات کروٹ بدل [illegible]

سرحد پر

واسو دیو ایم ۔ اے

19. WINNOCK ROAD WEST DRAYTON, MIDDX (U.K.)

برادرِ محترم خوشتر صاحب! آداب

ایک افسانہ "سرحد پر" حاضرِ خدمت ہے۔ افسانے کے بارے میں میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ یہ انسان دوستی، باہمی میل ملاپ اور بھائی چارے کا عکاس ہے۔ جو آپ کا نصب العین اور "بیسویں صدی" کا مقصدِ حیات ہے۔ انگلینڈ میں ہونے والے ایک سچے واقعہ سے متاثر ہو کر یہ افسانہ لکھا گیا ہے۔ بنیادی تخیل سے زیادہ کچھ نہیں لکھوں گا ورنہ افسانے کا چارم (Charm) چلا جائے گا۔ آپ کی اور قارئین "بیسویں صدی" کی گرانقدر رائے کا انتظار رہے گا —— افسانہ نمبر میں چھپنے والے میرے افسانے "اُس وقت کے لوگ" کے بارے میں قارئین "بیسویں صدی" کے خطوط ابھی تک آ رہے ہیں۔ اُن خطوط نے جہاں مجھے افسانے کے بارے میں پڑھنے والوں نے اپنی بیش بہا رائے سے نوازا ہے وہاں اس افسانے کے ذریعے میں دو بہت ہی پُرخلوص دوستوں سے بھی رُوشناس ہُوا ہوں۔ ایک تو یہیں پر ہے اور دُوسرا امریکہ میں —— میرے افسانوں کے مجموعے "آنسوؤں کا سمندر" کے بارے میں متعدد اخبارات و میگزین میں ہونے والے ریویوز کے جو تراشے آپ نے بھیجے ہیں وہ مجھے مل گئے ہیں۔ تبصرہ نگاروں نے کتاب کی جو تعریف کی ہے اُس کے لئے میں اُن سبھی کا ممنون ہوں۔ اس حوصلہ افزائی نے میرے اندر لکھنے کے لئے ایک نیا ولولہ، ایک نیا حوصلہ پیدا کر دیا ہے۔

دِلّی کا موسم کیسا ہے؟ پچھلے سال انہی دنوں میں دہلی میں تھا اور آپ کی پُرخلوص اور نصیحت آمیز باتوں سے اکثر لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔ دیکھئے اب کب پھر دہلی کی خاک آنکھوں سے لگانے کا موقع ملتا ہے . . .

آپ کے خط کا منتظر

واسو دیو

★

"ارے رشید یا کیا ہو گیا ہے تمھیں بس اتنے ہی بنڈل ... پسینہ آگیا؟ بڑا مردبنا پھرتا تھا!"

"پنڈت جی مہاراج کیا ہو گیا ہے آج آپ کو۔ ذرا جلدی جلدی ہاتھ چلاؤ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے آج کھیر کھانے کو نہیں ملی ہے۔ گھبراؤ نہیں آج کھیر کا میں بندوبست کر دوں گا۔ ہماری سٹریٹ میں ایک ہندو مر گیا ہے۔ اس کے گھر والوں کو شرادھ کھلانے کے لئے پنڈتوں کی ضرورت ہو گی۔ انھیں ایک پنڈت کا نام میں دے دوں گا!"

"میاں رشید خاں کہاں کہاں ہیر سلیٹی کی یاد میں کھو گئے ہو؟ واپس پاکستان سے ولایت آجاؤ اور اپنے کام کی طرف دھیان دو۔ دیکھو میں نے سبھی بنڈل باندھ کر رکھ دئے ہیں اور تم نے مشین کے

[illegible] طبیعت بھی نمایاں طور پر ملتا
[illegible] میں برنارڈ شا سے ذکر کیا: "دُنیا میں بس
[illegible]
[illegible] اور دُوسرا کون ہے؟"

[illegible] ادیب جو بہت ذہین اور محنتی تھا انگریزی کے مشہور ادیب آسکر وائلڈ کے پاس گیا اور یاس آمیز لہجہ میں اُس سے کہنے لگا: "میں ایک مُدت سے لکھ رہا ہوں اور اب تک بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے مُلک کے سبھی تبصرہ نگاروں نے جیسے میرے خلاف کوئی سازش کر رکھی ہے کیونکہ کسی ایک بھی تبصرہ نگار نے میری نگارشات پر تبصرہ نہیں لکھا۔ براہِ کرم مجھے اپنی گرانقدر رائے سے نوازئے کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے؟"

آسکر وائلڈ نے قدرے توقف کے بعد سنجیدگی سے جواب دیا۔
"میاں! میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ بھی اِس سازش میں شریک ہو جائیں!"
اور وہ بے چارہ نوجوان ادیب مایوس ہو کر پلٹ گیا۔

انگریزی زبان کے مشہور ادیب ڈاکٹر جانسن کو سکاٹ لینڈ اور وہاں کی ہر چیز سے نفرت تھی۔ کسی نے شاید جان بُوجھ کر چھیڑنے کی غرض سے اُن سے پُوچھا: "آپ کے خیال میں سکاٹ لینڈ کی سب سے زیادہ خوش نما اور خوبصورت چیز کون سی ہے؟"

جانسن نے فوراً جواب دیا: "صرف ایک چیز ——— اور وہ ہے وہاں کی وہ سڑک جو سیدھی لندن کو آتی ہے!"

برنارڈ شا کی اکیسویں سالگرہ پر مبارکباد دیتے ہوئے ایک نوعُمر ادیب نے اُن سے پُوچھا: "کیا میں ایسا خوش قسمت ہوں گا کہ آپ کا سوواں جنم دن بھی دیکھ سکوں؟"

برنارڈ شا نے اُسے غور سے دیکھ کر کہا: "برخوردار! تمھاری عُمر اور صحت کو دیکھ کر میں کہہ سکتا ہوں کہ تم ضرور دیکھ سکو گے!"

ایک ڈرامہ نویس نے اپنے ایک ڈرامہ کی سٹیج پرفارمینس (Stage Performance) پر برنارڈ شا کو دعوت دی کہ

[illegible]
چاہتا [illegible]
[illegible]
ایک طرح کی [illegible] ہے؟"
کون جانے وہ ڈرامہ نویس [illegible]
سکا یا نہیں!

الیگزینڈر پوپ اٹھارویں صدی کے مشہور انگریزی شاعر تھے اور طنز و مزاح میں بھی بے مثال تھے۔ ایک دن [illegible] موسوم [illegible] اُن کے پاس تشریف لائیں اور اُن سے ایک شعر کی فرمائش کی [illegible] وہ [illegible] جس سے [illegible] اُن کی [illegible] بھی ظاہر ہو سکے [illegible] انھیں ایک شعر لکھ دیا جس کا مفہوم تھا: "میں [illegible]

[illegible]

[illegible]

گیا [illegible]

[illegible] انہیں
[illegible]
بہت [illegible]

ڈاکٹر جانسن نے خفا ہونے کی بجائے نہایت تحمل سے جواب دیا:
"سب سے پہلے نہایت احتیاط سے چھیلا جائے اور پھر نہایت سلیقے سے اس کی خوبصورت قاشیں بنائی جائیں۔ بعد ازاں نمک، کالی مرچ، سرکہ اور سلاد آئل ڈال کر خوب ملا لیا جائے ——— اور پھر فوراً کسی کوڑے کی ٹوکری سے نیچے پھینک دیا جائے۔ آخر یہ بھی کوئی کھانے کی چیز ہے؟"

وہ حضرت جو نہایت اشتیاق سے یہ سب سن رہے تھے یکایک چونکے اور پھر بے حد نادم ہو کر خاموش ہو گئے۔

مشہور انگریزی ادیب جی۔ کے۔ چیسٹرٹن بھی بلا کے موٹے تھے اور طنز و مزاح میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ لیکن برنارڈ شا کے آگے ان کی ایک نہ چلتی تھی۔ کہتے ہیں ایک دن ایک تنگ سی گلی میں دونوں آمنے سامنے سے گزرنے لگے تو موٹے چیسٹرٹن نے ہاتھ پھیلا کر راستہ روکتے ہوئے کہا: "میں بدمعاش کو راستہ نہیں دیا کرتا!"

دبلے پتلے شا نے دیوار کے ساتھ ایک طرف لگ کر راستہ چھوڑتے ہوئے کہا: "لیکن میں بدمعاشوں کو راستہ دیا کرتا ہوں!"

ایک دن شا نے کسی اور مزاح نگار کو تجویز پیش کی: "آؤ ہم دونوں مل کر ایک کتاب لکھیں تاکہ مزاح کا لطف دوآتشہ ہو جائے؟"

اس ادیب نے جواب میں کہا: "شا صاحب! کبھی گدھے اور گھوڑے کو بھی ایک ساتھ جوڑا جا سکتا ہے؟"

شا نے فوراً جوابی حملہ کیا: "بھئی اگر یہ تجویز پسند نہیں آئی تو [illegible] مجھے خواہ مخواہ انسان سے گھوڑا کیوں بنا رہے ہو؟"

انگریزی [illegible]
آپ ایک مضمون میں لکھتے ہیں [illegible] زبان وضع کی [illegible] کا اندازہ [illegible]
ایک دن ایڈیسن [illegible] ڈھونڈتے [illegible] کہا: "یہ رقم لو اور براہ کرم گلی سے [illegible] کی [illegible] کرو۔"

وہ آدمی وعدہ کر کے چلا گیا اور اس نے واقعی اس دن سے اس گلی میں آنا چھوڑ دیا۔ لیکن اگلے دن اسی گلی میں [illegible] ماچس بیچنے والوں کا ایک ہجوم تھا جو گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہے تھے۔

ایڈیسن معاملہ تو تاڑ گئے۔ لیکن بیچارے اپنے آپ ہی میں بل کھا کر رہ گئے۔

جارج برنارڈ شا کی ذاتی لائبریری دیکھ کر ان کے ایک دوست بے حد متاثر ہوئے اور کہا: "کاش! میرے پاس بھی اتنی خوبصورت لائبریری ہوتی۔"

شا نے رازدارانہ لہجہ میں ان سے کہا: "یہ تو بہت آسان ہے! بس دوستوں سے کتابیں ادھار لو اور لوٹانے کا نام نہ لو!"

"پھر؟" اس نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"پھر کیا؟ پھر جو کچھ ہوگا وہ آپ کے سامنے ہے!"

خدا جانے وہ آدمی یہ راز کی بات سمجھ سکا یا نہیں!!

غیر طلبیدہ مضامین واپس منگوانے کے لئے پتہ لکھا ہوا [illegible] مضامین کی نقل اپنے پاس رکھئے۔ ہم واپسی سے معذور رہیں گے۔ (ادارہ بیسویں صدی)

[illegible] نمایاں طور پر بلشا [illegible] برنارڈ شا سے ذکر کیا: دُنیا میں بس [illegible]

[illegible] دُوسرا کون ہے؟"

ایک نوجوان ادیب جو بہت ذہین اور محنتی تھا انگریزی کے مشہور ادیب آسکر وائلڈ کے پاس گیا اور یاس آمیز لہجہ میں کہنے لگا: میں ایک مدت سے لکھ رہا ہوں اور اب تک بہت کچھ لکھ چکا ہوں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے ملک کے سبھی تبصرہ نگاروں نے جیسے میرے خلاف کوئی سازش کر رکھی ہے کیونکہ کسی ایک بھی تبصرہ نگار نے میری نگارشات پر تبصرہ نہیں لکھا۔ براہِ کرم مجھے اپنی گرانقدر رائے سے نوازئے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

آسکر وائلڈ نے قدرے توقف کے بعد سنجیدگی سے جواب دیا۔

"میاں! میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ بھی اس سازش میں شریک ہو جائیں!"

اور وہ بے چارہ نوجوان ادیب مایوس ہو کر پلٹ گیا۔

انگریزی زبان کے مشہور ادیب ڈاکٹر جانسن کو سکاٹ لینڈ اور وہاں کی ہر چیز سے نفرت تھی۔ کسی نے شاید جان بوجھ کر چھیڑنے کی غرض سے اُن سے پوچھا: آپ کے خیال میں سکاٹ لینڈ کی سب سے زیادہ خوش نما اور خوبصورت چیز کون سی ہے؟"

جانسن نے فوراً جواب دیا: صرف ایک چیز — اور وہ ہے وہاں کی وہ سڑک جو سیدھی لندن کو آتی ہے!"

برنارڈ شا کی اکیسویں سالگرہ پر مبارکباد دیتے ہوئے ایک نوعمر ادیب نے اُن سے پوچھا: کیا میں ایسا خوش قسمت ہوں گا کہ آپ کا سوواں جنم دن بھی دیکھ سکوں؟"

برنارڈ شا نے اُسے غور سے دیکھ کر کہا: برخوردار! تمہاری عمر اور صحت کو دیکھ کر میں کہہ سکتا ہوں کہ تم ضرور دیکھ سکو گے؟"

ایک ڈرامہ نویس نے اپنے ایک ڈرامہ کی سٹیج پرفارمینس (Stage Performance) پر برنارڈ شا کو دعوت دی کہ

[illegible] ڈرامے [illegible] قدر [illegible] چاہتا [illegible]

ایک [illegible]

کون جانے وہ ڈرامہ نویس [illegible] سکا یا نہیں!

الیگزینڈر پوپ اٹھارویں صدی کے مشہور انگریزی شاعر تھے اور طنز و مزاح میں اپنی مثال آپ تھے۔ ایک دن ایک [illegible] موسوم [illegible] اُن کے پاس [illegible] آیا اور اُن سے ایک شعر کی فرمائش کی [illegible] وہ اپنے کتے کے گلے میں [illegible] جس سے کتے پر اُن کی ملکیت بھی ظاہر ہو سکے۔ پوپ نے فی البدیہہ انہیں ایک شعر لکھ دیا جس کا مفہوم تھا: میں [illegible] کا کتا ہوں۔

[illegible]

[illegible] ایک [illegible]

[illegible] آپ کے خیال میں گائے کا گوشت پکانے کا بہترین طریقہ کیا ہے؟

[illegible] نے کھانا پکانے کی بجائے نہایت تحمل سے جواب دیا۔

"سب سے پہلے اسے نہایت احتیاط سے چھیلا جائے اور پھر نہایت سلیقے سے اس کی خوبصورت قاشیں بنائی جائیں۔ بعد ازاں نمک، کالی مرچ، سرکہ اور "سلاد آئل" ڈال کر خوب ہلایا جائے ——— اور پھر فوراً اسے کسی قریبی کھڑکی سے نیچے پھینک دیا جائے۔ آخر یہ بھی کوئی کھانے کی چیز ہے؟"

وہ حضرت جو نہایت اشتیاق سے یہ سب سن رہے تھے ایک دم چونکے اور پھر بے حد نادم ہو کر خاموش ہو گئے۔

مشہور انگریزی ادیب جی۔ کے۔ چیسٹرٹن بھی بلا کے [illegible] تھے اور طنز و مزاح میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ لیکن برنارڈ شا کے آگے ان کی ایک نہ چلتی تھی۔ کہتے ہیں ایک دن ایک تنگ سی گلی میں دونوں آمنے سامنے سے گزرنے لگے تو موٹے چیسٹرٹن نے [illegible] روکتے ہوئے کہا: "میں بدمعاش کو رستہ نہیں دیا کرتا!"

دبلے پتلے شا نے دیوار کے ساتھ ایک طرف لگ کر راستہ چھوڑتے ہوئے کہا: "لیکن میں بدمعاشوں کو رستہ دیا کرتا ہوں!"

ایک دن شا نے کسی اور مزاح نگار کو تجویز پیش کی: "آؤ ہم دونوں مل کر ایک کتاب لکھیں جو مزاح کا [illegible] ہو جائے۔"

اس ادیب نے جواب میں کہا: "شا صاحب! کہیں گدھے اور گھوڑے کو بھی ایک ساتھ جوڑا جا سکتا ہے؟"

شا نے فوراً جوابی حملہ کیا: "میری یہ تجویز پسند نہیں آئی تو [illegible] لیکن مجھے خواہ مخواہ انسان سے گھوڑا کیوں بنا رہے ہو؟"

انگریزی زبان کے مشہور ادیب [illegible] اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں [illegible] کی گلی میں ایک پرانی وضع کی [illegible] (Samuel [illegible]) [illegible] اور [illegible] کا ایک آدمی [illegible] جاتے اور [illegible]

ایک دن ایڈیسن نے اسے پکڑ کر دو پونڈ دیئے اور کہا: "یہ تم لو اور براہ کرم کل سے اس گلی میں نہ آیا کرو۔"

وہ آدمی وعدہ کر کے چلا گیا اور اس نے واقعی اس دن سے اس گلی میں آنا چھوڑ دیا۔ لیکن اگلے دن اسی گلی میں [illegible] ماچس بیچنے والوں کا ایک ہجوم تھا جو گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہے تھے۔

ایڈیسن معاملہ تو تاڑ گئے۔ لیکن بے چارے اپنے آپ ہی میں بل کھا کر رہ گئے۔

جارج برنارڈ شا کی ذاتی لائبریری دیکھ کر ان کے ایک دوست بے حد متاثر ہوئے اور کہا: "کاش! میرے پاس بھی اتنی خوبصورت لائبریری ہوتی۔"

شا نے رازدارانہ لہجہ میں ان سے کہا: "یہ تو بہت آسان ہے! بس دوستوں سے کتابیں اُدھار لو اور لوٹانے کا نام نہ لو!"

"پھر؟" اس نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"پھر کیا؟ پھر جو کچھ ہوگا وہ آپ کے سامنے ہے!"

خدا جانے وہ آدمی یہ راز کی بات سمجھ سکا یا نہیں!!

[illegible]

غزل

[illegible]

ہم بھی ... [illegible] رہے ہیں
[illegible] رہے ہیں
[illegible] رہا ... ساحل سے کنارا
... کے نگہبان رہے ہیں
اے اہلِ خرد چھوڑو نہ ہم اہلِ جنوں کو
اُلجھے ہیں جو ہم ... پشیمان رہے ہیں
... کبھی آپ نے پھینکے تھے نظر سے
تا عمر مرے دل میں وہ مہمان رہے ہیں
تہذیب کی ضامن ہے جو اقدار کی خالق
اُردو کے مخالف بھی اِسے مان رہے ہیں
للہ انہیں جن کو ہے دلائل کی ضرورت
ہم دل سے تجھے اپنا خدا مان رہے ہیں
قدرت نے دیا ہے تجھے وہ حسنِ مجسم
آئینے جسے دیکھ کے حیران رہے ہیں
جو تم نے محبت سے کبھی پیش کیے تھے
وہ پھول سدا زیبِ گلدان رہے ہیں
جو راہ دکھا کے ہمیں چلتا گیا ناظم
ہم اُس کی محبت کا عرفان رہے ہیں

بیسویں صدی دہلی مئی ۱۹۸۳ء

آنکھیں

[illegible] ایم اے، ایل ایل بی

پلکوں کی گھنی چھاؤں میں پیاری آنکھیں
گھبراتی ہوئی، نیند سے بھاری آنکھیں
آنکھوں کو حسیں خواب دکھاتی ہیں
جھکتی ہیں جو اٹھ اٹھ کے تمہاری آنکھیں

کس قدر بے وفا ہیں یہ آنکھیں
جن کو دیکھیں انہی پہ وار کریں
کس کے چہرہ سے آس باندھیں ہم
کس کی آنکھوں کا اعتبار کریں؟

یوں آنکھ میں کاجل نہ لگایا کیجے
پھولوں کو ... زلفوں میں سمایا کیجے
نظروں کو چرانے کا زمانہ ہے یہی
ہر ایک سے آنکھیں نہ ملایا کیجے

لے کے انگڑائی اپنے بستر پر
تم جب آنکھوں کو مل رہی ہوگی
صبح، پہلو میں ہنس رہی ہوگی
رات کروٹ بدل رہی ہوگی

سرحد پر

واسو دیو ایم۔ اے

19. WINNOCK ROAD WEST DRAYTON, MIDDX (U.K.)

برادرِ محترم خوشتر صاحب آداب

ایک افسانہ "سرحد پر" حاضرِ خدمت ہے۔ افسانے کے بارے میں میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ انسان دوستی، باہمی میل ملاپ اور بھائی چارے کا عکاس ہے جو آپ کا محبوب اسلوب اور بیسویں صدی کا مقصدِ حیات ہے۔ انگلینڈ میں ہونے والے ایک سچے واقعہ سے متاثر ہو کر یہ افسانہ لکھا گیا ہے۔ [illegible] افسانے کا چارم (Charm) مل جائے گا آپ کی اسلوب کو "بیسویں صدی" کی گرانقدر رائے کا انتظار رہے گا ——— افسانہ نمبر میں چھپنے والے میرے افسانے "اس وقت کے لوگ" کے بارے میں قارئین "بیسویں صدی" کے خطوط ابھی تک آ رہے ہیں۔ ان خطوط نے جہاں مجھے افسانے کے بارے میں پڑھنے والوں نے اپنی بیش بہا رائے سے نوازا ہے وہاں اس افسانے کے ذریعے میں دو بہت ہی پُرخلوص دوستوں سے بھی روشناس ہوا ہوں۔ ایک تو یہیں پر ہے اور دوسرا امریکہ میں ——— میرے افسانوں کے مجموعے [illegible] کے بارے میں متعدد اخبارات و میگزین میں ہونے والے ریویو کے جو تراشے آپ نے بھیجے ہیں وہ مجھے مل گئے ہیں۔ تبصرہ نگاروں نے کتاب کی جو تعریف کی ہے اس کے لئے میں ان کا ممنون ہوں۔ اس حوصلہ افزائی نے میرے اندر لکھنے کے لئے ایک نیا ولولہ، ایک نیا حوصلہ پیدا کر دیا ہے۔

دلی کا موسم کیسا ہے؟ پچھلے سال [illegible] اور نصیحت آمیز باتوں سے اکثر لطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔ [illegible] آنکھوں سے لگانے کا موقع ملتا ہے . . .

آپ کے خط کا منتظر

واسو دیو

★

"اوئے رشید یا! کیا ہو گیا ہے تمہیں بس اتنے ہی بنڈل باندھ کر پسینہ آ گیا۔ بڑا مرد بنا پھرتا تھا؟"

"پنڈت جی مہاراج کیا ہو گیا ہے آج آپ کو۔ ذرا جلدی جلدی ہاتھ چلاؤ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے آج کھیر کھانے کو نہیں ملی ہے۔ خیر گھبراؤ نہیں آج کھیر کا میں بندوبست کر دوں گا۔ ہماری سٹریٹ میں ایک ہندو مر گیا ہے۔ اس کے گھر والوں کو شرادھ کھلانے کے لئے پنڈتوں کی ضرورت ہو گی۔ انہیں ایک پنڈت کا نام میں بھی دے دوں گا!"

"میاں رشید خان کہاں کہاں [illegible] کی یاد میں کھو گئے ہو؟ واپس پاکستان سے ولایت آ جاؤ اور اپنے کام کی طرف دھیان دو۔ دیکھو میں نے سبھی بنڈل باندھ کر رکھ دئے ہیں اور تم نے مشین کے

"اندر کاٹنے کے لئے گتّے نہیں رکھے جاتے ہیں؟"

"او بھئی! یہ فیکٹری ہے، شوالہ نہیں ہے کہ جب مرضی ہوئی پوجا کر لی اور جب دل میں آیا کام کر لیا۔ یہاں ولایت میں تو ہر کام وقت پر ہوگا۔ اس لئے پوجا پاٹھ بند کرو اور کام کی طرف دھیان دو۔"

رشید خاں اور ہری رام دونوں گتّے کی فیکٹری میں کام کرتے تھے۔ اُن کا کام یہ تھا کہ جس سائز کے ڈبّے فیکٹری کو تیار کرنے ہوتے تھے وہ اُس سائز کے مطابق گتّے کاٹ کر اور اُن کے بنڈل باندھ کر رکھ دیتے تھے۔ باقی کام فیکٹری میں دُوسری مشینوں پر ہوتا تھا جن پر دُوسرے انگریز، ہندوستانی اور پاکستانی مزدور کام کرتے تھے۔ اُن کی مشین پر صرف دو ہی آدمیوں کا کام تھا اور دونوں کو ایک ہی جیسا بونس ملتا تھا۔ اس لئے وہ دونوں ادل بدل کر مشین پر کام کرتے تھے۔ ایک دن رشید خاں کی ڈیوٹی مشین کے پیچھے یعنی مشین میں کاٹنے کے گتّے [illegible] کرنے کی ہوتی تھی تو ہری رام کی ڈیوٹی مشین کے آگے یعنی کٹے ہوئے گتّوں کو اکٹھا کر کے اُن کے بنڈل باندھنے کی ہوتی تھی۔ دُوسرے دن دونوں کی ڈیوٹیاں بدل جاتی تھیں۔

رشید خاں پاکستان کا رہنے والا تھا۔ انگلینڈ آنے سے پہلے وہ لائل پور کے علاقے میں کھیتی باڑی کا کام کرتا تھا۔ اُس کی عمر پینتالیس سال کے قریب تھی۔ اُس کا ارادہ تھا کہ وہ پانچ دس سال ولایت میں گزار کر اور خوب روپے کما کر اپنے مُلک پاکستان میں واپس جا کر اپنی باقی ماندہ زندگی اپنے بچّوں کے ساتھ گزارے گا۔ اسی لئے اُس نے اپنی بیوی اور بچّوں کو انگلینڈ نہیں بلایا تھا۔

ہری رام کی عمر بھی رشید خاں کی عمر کے لگ بھگ ہی تھی۔ وہ انگلینڈ آنے سے پہلے ہندوستانی پنجاب کے شہر [illegible] میں ایک دُکان پر منیم تھا۔ اُس کی بیوی اور بچّے اُس کے پاس انگلینڈ میں تھے۔

چوبیس گھنٹوں میں بارہ گھنٹے ساتھ رہنے کی وجہ سے وہ دونوں آپس میں خوب گھل مل گئے تھے اور ایک دُوسرے کے اِتنے نزدیک آ گئے تھے کہ چائے پینے اور لنچ کھانے کے وقفوں میں وہ اکثر ایک دُوسرے کے گھریلو معاملات پر تبادلۂ خیال کرتے تھے اور ایک دُوسرے کے مسائل کو دو بھائیوں کی طرح حل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ ایک دُوسرے کے لئے [illegible] ایک دُوسرے سے مذاق بازی [illegible] دونوں کے لئے [illegible] ہنسی مذاق کا مقصد کسی کی تضحیک کرنا [illegible] زندگی کی [illegible] کو [illegible] کرنا تھا۔

لیکن جب سے ہندوستان [illegible] جھگڑے پر جنگ شروع ہوئی تھی تو دونوں نے [illegible] بند کر دیا تھا کیونکہ ہند پاکستان جنگ کا اثر انگلینڈ میں [illegible] ہندوستانی اور پاکستانی باشندوں پر بھی پڑا تھا۔ یہاں بھی دونوں مُلکوں کے باشندوں نے ایک دُوسرے کا بائیکاٹ شروع کر دیا تھا اور اِس کا اثر اِن دونوں پر بھی پڑا۔ چائے اور لنچ کے وقفوں میں اب وہ الگ الگ ہو کر بیٹھتے تھے۔ وہ ایک دُوسرے سے تب ہی بات کرتے تھے جب آپس میں کام کے سلسلے میں بات کئے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں اپنے اپنے مُلکوں کے اخبارات اکثر ہوتے تھے اور جب وہ اُنھیں پڑھتے تھے تو ایک دُوسرے کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے تھے۔

انگریز فورمین کو ہندوستان سے پیار تھا اور نہ پاکستان سے نفرت! اُس کے لئے تو وہ دونوں ایک ہی تھے۔ یعنی کالے اور سستے مزدور! اُسے تو کام چاہئے تھا۔ رشید خاں اور ہری رام ہنس کر اپنا کام پُورا کرتے ہیں یا ایک دُوسرے کا سر پھوڑ کر، اُسے اِس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اُسے اُن کا کام پُورا مل رہا تھا۔ [illegible] کام کرنے والوں سے مطمئن تھا۔

ہند پاک جنگ شروع ہوئی اور ختم ہو گئی۔ لیکن اُن دونوں کی خاموشی اور زہر آلود نگاہوں میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ مشین کے کل پرزوں کی طرح مشین بنے ہوئے وہ اپنی اپنی مشین کے آگے اور پیچھے معمول کی طرح [illegible] جاتے تھے۔ ایک دن بنڈل باندھنے کی باری رشید خاں کی تھی۔ وہ بنڈل باندھ تو رہا تھا لیکن اُس تیزی سے نہیں جتنی تیزی سے اُسے باندھنا چاہئے تھا۔ گتّوں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ اگر رشید خاں اُنھیں جلدی باندھ کر نہ ہٹاتا تو پھر دُوسرے مال کے لئے کوئی جگہ نہ رہ جائے گی اور مشین کو بند کرنا پڑے گا۔

"اگر مشین بند ہو گئی تو فورمین بھاگا بھاگا اُن کی طرف [illegible]

[illegible]

اور خواہ مخواہ اُن سے جواب طلب کرے گا" یہ سوچ کر ہری رام نے بہت ہی نرمی سے رشید خاں سے کہا۔

"رشیدیا! ذرا جلدی جلدی ہاتھ چلا۔ مال بہت اکٹھا ہو گیا ہے۔ ڈھیر دیکھ کر فورمین سر پر آکر کھڑا ہو جائے گا!"

"مجھے سب معلوم ہے۔ مجھ کو سمجھانے کی کوشش مت کرو۔ رہا فورمین وہ بھی تمہارا ہی آدمی ہے اِس لئے اُس کا خوف دلا رہے ہو" رشید خاں نے ہری رام کی بات سُن کر چڑتے ہوئے جواب دیا۔

"فورمین میرا آدمی؟ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ یہ انگریز کسی کا نہیں ہے یہ تو مطلب کا یار ہے!" ہری رام نے رشید خاں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"ہوئے دھوتی پرشاد! مجھے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ انگریز اور ہندوستانی دونوں بنیوں کی قوم ہے۔ اِس لئے ہمیں معلوم ہے کون کس کا ہے۔ چند غداروں کو روپیہ دے کر تم ہندوستانیوں نے پاکستان کی سالمیت پر بہت بڑی چوٹ ماری ہے اور یہ انگریز چپ چاپ تماشہ دیکھتا رہا ہے۔ چور کا بھائی جیب کترا! بنئے کا دوست بنیا! لیکن یاد رکھنا ہم پاکستانی بھی مٹی کے مادھو نہیں ہیں۔ اِس بار جنگ ہونے دو تم ہندوستانیوں کو وہ کڑی چوٹ ماریں گے کہ اگر محمد بن قاسم، محمود غزنوی اور دوسرے مسلمان غازیوں اور جہادیوں کی یاد تازہ نہ کرا دی تو ہمارا نام بدل دینا!"

"اچھا پاکستانی کے علاوہ کوئی اور نام سے کہلوانے کی بھی تمنّا ہے؟ ایک حصّے کا نام تو بنگلہ دیش ہو گیا ہے۔ دوسرے پاکستان کے حصّے کا کیا نام رکھ دیں۔ ذرا یہ بھی تو بتا دو"

ہری رام نے بات کو ہنسی میں اُڑاتے ہوئے رشید خاں سے پوچھا۔

"دیکھ اوئے پنڈت! اپنی دھوتی اور جنیؤ سنبھال کر رکھنا۔ وقتی شکستوں سے ہم پاکستانی گھبرانے والے نہیں ہیں! ہر قوم اور مُلک کی تاریخ میں ایسے تاریک لمحے آتے ہی ہیں۔ انشاء اللہ اِس بار پھر لڑائی ہونے دو، وہ شکستِ فاش تم ہندوؤں کو دیں گے کہ چھٹی کا دودھ یاد دلا دیں گے! اور اللہ پاک کی قسم اِس بار تو میں خود بندوق لے کر سرحد پر لڑنے جاؤں گا!"

رشید خاں بہت جوش و خروش سے کہہ رہا تھا۔ اُس کی بات سُن کر ہری رام کی وطن پرستی کو بھی جوش آ گیا اور اُس نے بھی رشید خاں کے نہلے کا جواب اپنے دہلے سے دیا۔

"ارے جا جا بہت دیکھا ہے تم جیسے غازیوں اور جہادیوں کو! کشمیر کے لئے چار بار لڑ چکے ہو ہندوستان سے! لے لیا کشمیر؟ کشمیر لیتے لیتے مشرقی پاکستان بھی اپنے ہاتھ سے گنوا بیٹھے ہو!"

"تم جیسے بنیوں اور دھوتی پرشادوں نے فتح کیا ہے مشرقی پاکستان؟ اُونہہ یہ مُنہ اور مسور کی دال!"

رشید خاں نے آنکھیں لال پیلی کر کے ترکی بہ ترکی ہری رام کو جواب دیا۔

رشید خاں کو گرم دیکھ کر ہری رام کا پارہ بھی اور چڑھ گیا۔

"اگر ہندوستان نے بنگلہ دیش بنانے میں بنگالیوں کی مدد نہیں کی اور اُن کے شانہ بہ شانہ نہیں لڑے تو کیا تمہارے جنرل نیازی اور اُس کے ساتھی لڑے تھے؟"

"وہ جو تمہارا باپ رُوس ہے اس نے فتح کروایا ہے مشرقی پاکستان! جب تک ڈھاکہ پر تم نے قبضہ نہیں کیا تھا اُس کا نمائندہ

شراب

تیری آنکھیں بھی مانگتی ہیں شراب
جن سے محروم بھی جام پیتے ہیں ——— عبدالحمید عدم

اب مے سے بڑھ چلا ہے مرا ذوقِ بے خودی
آنکھوں کی مستیاں بھی ملا دو شراب میں ——— امر چند قیس

نیند آگئی ہے ساقی کو آنکھیں جھپک رہی ہیں
لو بند ہو رہا ہے میرا شراب خانہ ——— شکیل بدایونی

غمِ زمانہ نہیں اک عذاب ہے ساقی
شراب لا مری حالت خراب ہے ساقی ——— اختر شیرانی

مستی بہ ذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے
موجِ شراب یک مژۂ خوابناک ہے ——— مرزا اسد اللہ خاں غالب

مرسلہ:- عارفہ تبسم برگانوی، رانچی

دلی میں جم کر بیٹھا رہا تھا۔ ۱۹۶۵ء کی لڑائی میں بھی اسی روس نے تمھیں بچالیا تھا ورنہ ہماری فوجیں دلی کو روند کر رکھ دیتیں۔ سالو! مرد ہو تو اپنے بل بوتے پر میدان میں آؤ پھر دکھاؤ ہندو دو اپنا دم خم!"

"بہت خوب! ہندوستان کو روس کی مدد لینے کا طعنہ دے رہے ہو؟ لیکن یہ مت بھولو کہ تمھارے دادا میاں امریکہ، چچا جان چین اور عربی و ایرانی بھائی سبھی آگئے تھے میدان میں اور دھڑا دھڑ اپنے چہیتے پاکستان کو ہتھیار پر ہتھیار دے رہے تھے۔ میاں جی! اب اگر پھر کبھی ہندوستان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو دیکھنے والوں کی آنکھیں نکال لیں گے! ہندوستان سے لڑائی لڑنے کا اب خواب میں بھی نام نہ لینا ورنہ بچے کھچے پاکستان کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیں گے!"

"مر گئے پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے والے! ایک بار اور پاکستان اور ہندوستان کی لڑائی ہوگی۔ خدا کی قسم اب کے لڑائی ہو تو ہونے دو۔ میں خود بندوق لے کر سرحد پر لڑنے کے لئے جاؤں گا!"

"ہاں بھائی پاکستان کی فوجوں نے تو تیر مار لیا ہے، اب یہ ولایت سے جا کر لڑیں گے!"

یہ تکرار اور بھی طول پکڑ جاتی اگر چھٹی ہونے کی سائرن کی آواز نہ آجاتی۔ ہری رام اپنی طرف کا کام ختم کر چکا تھا۔ اس لئے وہ اپنا کھانے کا تھیلا اٹھا کر چل دیا۔ اگر کوئی اور دن ہوتا تو وہ رشید خاں کی مدد کرتا۔ لیکن اتنا کچھ سننے کے بعد ذلیل سے ذلیل شخص بھی اس آدمی کی مدد نہ کرے گا جو اس کے ملک اور قوم کو گالیاں دے رہا ہو۔ پھر وہ رشید خاں کی کیسے مدد کر سکتا تھا؟

دوسرے دن جب دونوں پھر کام پر حاضر ہوئے اور اپنی مشین پر کام کرنے کے لئے تیار ہونے لگے تو فورمین نے انھیں بلایا۔

"یہ تو تم دونوں کو معلوم ہے کہ ہماری فیکٹری کے مالکوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اسے آہستہ آہستہ شمالی انگلینڈ کے ان حصوں میں لے جایا جائے جہاں مزدور سستے داموں اور آسانی سے مل سکتے ہیں۔ اس طرح ڈبے بنانے کی لاگت میں بھاری کمی ہو سکتی ہے۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے اولڈہم میں ایک فیکٹری خرید بھی لی ہے اور آہستہ آہستہ یہاں کی مشینیں وہاں پر منتقل کی جا رہی ہیں۔ اس ہفتے اولڈہم کی فیکٹری میں باقاعدہ کام شروع ہو گیا ہے۔ یہاں کا پورا کام اولڈہم میں منتقل کرنے میں دو تین سال لگ جائیں گے۔ جب وہاں پر کام شروع ہو گیا ہے تو یہاں کی فیکٹری میں کام کا کم ہو جانا ضروری ہے۔ اس لئے کمپنی نے اس ہفتہ پچاس آدمیوں کو نوکری سے ہٹائے جانے کا نوٹس دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس میں گورے کالے، ملکی و غیر ملکی کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ سینارٹی کے حساب سے ورکروں کو نوٹس دئے گئے ہیں۔"

یہ کہہ کر فورمین کچھ دیر کے لئے رکا۔ ہری رام اور رشید خاں دونوں کے دل دھڑک گئے۔

"ہم دونوں میں سے ایک کو نوٹس ملنے والا ہے!"
انھوں نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا۔
فورمین ایک لفافہ رشید خاں کی طرف بڑھاتے ہوئے پھر کہنے لگا۔

"مسٹر خان! مجھے افسوس ہے کہ ان پچاس آدمیوں میں آپ کا

نام بھی شامل ہے۔ اس لئے آپ کو بھی یہ نوٹس دیا جا رہا ہے۔ اگلے ہفتے سے آپ کو نوٹس ہے۔ گورنمنٹ کے قانون کے حساب اور قاعدے کے مطابق آپ کو جو معاوضہ دینا چاہئے وہ آپ کو اگلی تنخواہ کے ساتھ مل جائے گا۔

مجھے معلوم تھا یہ نوٹس مجھے ہی ملے گا۔ اس انگریز نے ہندوستانیوں کے ساتھ مل کر ہمارے مُلک کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ اس لئے یہاں بھی پاکستانی ہی کے گلے پر چھُری پھیرنا تھا۔ یہاں بھی انگریز اور ہندوستانی کی آپس میں ملی بھگت اگر ہے تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ خُدا کی قسم اِس بار پاکستان اور ہندوستان کی لڑائی پھر شروع ہونے دو میں خود سرحد پر جاکر اِن کافروں کا قلع قمع کر دوں گا!"

فورمین سے نوٹس کا لفافہ لے کر اور ہری رام کی طرف نفرت سے دیکھتے ہوئے رشید خاں نے کہا۔

فورمین کو رشید خاں کی بات کا کیا پتہ چلنا تھا۔ ہری رام نے معمول کی طرح اُس کے زہر بھرے الفاظ کی طرف دھیان نہ دیا۔ پھر اُس وقت رشید خاں کی باتوں کی طرف توجہ دینے کا بھی وقت نہ تھا۔ وہ تو دل ہی دل میں اپنی نوکری کے بچ جانے پر بھگوان کا شُکر ادا کر رہا تھا۔

اگلے ہفتے رشید خاں کام پر نہیں آیا۔ ہری رام کے ساتھ اب ایک انگریز مزدور کو کام پر لگا دیا گیا تھا۔ ہری رام انگریزی زبان اچھی طرح بول اور سمجھ نہ سکتا تھا اِس لئے انگریز کے ساتھ معمولی بات چیت میں بھی اُسے دِقّت پیش آتی تھی وہ اُس سے صرف مطلب ہی کی بات کرتا تھا۔ اُسے رہ رہ کر رشید خاں یاد آتا تھا جس کے ساتھ ہر وقت ہنسی مذاق اور چھَل بازی چلتی رہتی تھی۔ صرف جب سے ہندوستان اور پاکستان کے باہمی تعلقات کشیدہ ہوئے تھے اُن کے درمیان خلیج سی پیدا ہو گئی تھی اور وہ گزرے ہوئے دنوں کی طرح آپس میں ہنس کھیل نہیں رہے تھے۔ اُسے یقین تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ تعلقات کی خلیج پُر ہو جائے گی۔

اِسی طرح ایک ماہ گزر گیا۔ رشید خاں سے پھر مُلاقات نہ ہوئی۔ ایک شام وہ فیکٹری سے اپنے گھر لَوٹ رہا تھا کہ اچانک

خواب

ہوسِ سیرِ گُلستاں ہے خدا خیر کرے
خواب میں بھی نظر آتے ہیں بیاباں مجھ کو ——— جوش ملسیانی

آنکھوں میں جو بھر لوگے تو کانٹوں سے چبھیں گے
یہ خواب تو پلکوں پہ سجانے کے لئے ہیں ——— جاں نثار اختر

یوں سلسلۂ خیال کا ٹوٹا ہے تیرے بعد
جیسے کسی نے خواب سے چونکا دیا مجھے ——— نامعلوم

میں بھی سایہ ہوں سیہ رات میں کھو جاؤں گا
تُم بھی اِک خواب ہو پل بھر میں بکھر جاؤگے ——— محمود سعیدی

یہ جہاں خواب سہی پھر بھی حقیقت یہ ہے
ایک تعبیر بھی وابستہ ہے اِس خواب کے ساتھ ——— کرامت علی کرامت

مرسلہ:- صابرہ شبانہ۔ گیا (بہار)

ہائی سٹریٹ میں اُس نے دیکھا رشید خاں اُسی فٹ پاتھ پر اُس کی مخالف سمت سے اُسی کی طرف آ رہا تھا۔ جب وہ دونوں نزدیک آئے تو اُن کی آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ ایک دُوسرے کو اچانک ایک دوسرے کے آمنے سامنے دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ ہری رام نے دیکھا رشید خاں نے کئی دن سے شیو نہیں کی تھی۔ اُس کے سر کے بال بھی بڑھے ہوئے تھے اور اُس کے کپڑوں سے بھی کَسْمپُرسی جھلک رہی تھی۔ اُس کی حالت دیکھ کر اُسے یقین ہو گیا تھا کہ رشید خاں کو ابھی تک کام نہیں مِلا ہے۔ اُسے یہ بھی پتہ تھا کہ سردیوں میں انگلینڈ میں کام مِلنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ دسمبر سے لے کر اپریل ماہ کے آخر تک کے لئے موسمِ سرما کے آغاز ہی میں اکثر کارخانوں میں مزدوروں کی تخفیف ہو جاتی ہے۔ عمارتوں پر کام کرنے والے کاریگروں اور مزدوروں کو بھی سردی کی وجہ سے کام سے جواب مِل جاتا ہے۔ ایسی حالت میں انگریزی زبان نہ سمجھنے اور بولنے والے ادھیڑ عُمر کے ایشیائی تارکینِ وطن کو کئی کئی ماہ تک بیکاری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

"رشید میاں! کیا حال چال ہے؟" ہری رام نے اُس سے پُوچھا۔

"اللہ کا فضل ہے۔ فیکٹری سے آرہے ہو کیا؟" رشید خاں نے جواب دیا۔

"ہاں۔ تم کہیں کام پر جاتے ہو؟" ہری رام نے یہ بات رشید خاں سے پوچھنے کے لئے پوچھ لی، ورنہ رشید خاں کی حالت صاف بتا رہی تھی کہ وہ بیکار ہے۔ ایک ہی ماہ کی بیکاری نے رشید خاں کے سبھی کس بل نکال دیئے تھے۔

"نہیں ابھی تو کہیں کام نہیں ملا ہے۔ خدا سبھی کا نگہبان ہے۔ کبھی نہ کبھی ضرور کام دلوا دے گا۔"

ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ پاس سے گزرتے ہوئے ہری رام کے ایک دوست آتما سنگھ نے ہری رام کو فتح بلائی۔

"پنڈت جی ست سری اکال!"

"ست سری اکال آتما سنگھ! یار اتنی جلدی کہاں بھاگ رہے ہو؟ گھر کی طرف چل رہے ہو؟ رکو میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔"

ہری رام کی بات سن کر آتما سنگھ جو ہری رام اور رشید خاں کے پاس سے گزر کر آگے بڑھ گیا تھا، رک گیا اور ہری رام کے پاس آکر کہنے لگا۔

"پنڈت جی! گھر کی طرف نہیں جا رہا ہوں۔ ابھی جلدی میں ہوں۔" ہری رام نے دیکھا آتما سنگھ نے برا سا منہ بنا کر یہ کہا تھا۔

"خیر تو ہے آتما سیاں؟" ہری رام نے پوچھا۔

"خیر کاہے کی پنڈت جی! اپنی تو یہ حالت ہے کہ کوئلوں کی دلالی میں خواہ مخواہ منہ کالا!"

"کیا بات ہوئی؟"

"دلباغ کو تو آپ جانتے ہی ہیں وہ اونچے پنڈ والا!"

"ہاں کیا ہوا ہے اسے؟"

"ہونا کیا تھا۔ بہت دنوں سے بیکار تھا۔ کتنی بار میرے پاس آیا تھا کہ اپنی فیکٹری میں کام دلوا دو۔ اس کے لئے کئی بار پرسنل آفیسر سے میں نے سفارش بھی کی تھی۔ آج ہماری فیکٹری میں ایک آدمی کام چھوڑ کر گیا ہے۔ پرسنل کو یاد رہا کہ میں نے اپنے دوست کے بارے میں اس سے بہت کہا تھا سو اس نے خود مجھے آکر کہا کہ سنگھ کل صبح اپنے دوست کو کام پر لے آؤ۔ دلباغ کے گھر سے آرہا ہوں۔ وہ برمنگھم گیا ہوا ہے۔ اب اگر کوئی آدمی صبح لے کر پرسنل آفیسر کے پاس نہ گیا تو پھر کبھی اور کو کام دلوانے کے لئے میں اس کے پاس نہ جا سکوں گا۔ پنڈت جی! ہے کوئی آدمی آپ کی نگاہ میں جسے نوکری کی ضرورت ہو اور کل صبح میرے ساتھ جانے کو تیار ہو؟ بس اسی سلسلے میں میں کہیں جا رہا تھا۔"

"ہاں ہے تو سہی!"

"کون ہے وہ؟"

"یہ ہمارے خان صاحب! پچھلے ایک ماہ سے انہیں کام نہیں ملا ہے۔ یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے کہ ہم دونوں ساتھ کام کرتے تھے۔ وہاں پر کام کم ہو گیا ہے اس لئے انھیں جواب دے دیا گیا ہے۔"

"کیوں جی خان صاحب! کیا آپ میرے ساتھ کل کام پر جانا پسند کریں گے؟ ٹیکس اور انشورنس وغیرہ کٹ کٹا کر پینتیس پونڈ کے لگ بھگ مل جائیں گے۔"

"کام تو ٹھیک ہے۔ بہت گرم یا سخت تو نہیں ہے؟" رشید خاں نے کچھ دیر رک کر آتما سنگھ سے پوچھا۔ لیکن اس کے لہجے سے صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ بات وہ صرف پوچھنے ہی کی غرض سے پوچھ رہا ہے ورنہ اسے یہ نوکری چاہے جیسی بھی ہو منظور ہے۔

"خان صاحب! کام تو بہت آسان ہے بس ذرا تیز ضرور ہے۔ آپ جیسے تندرست شخص کے لئے تو یہ بہت ہی ٹھیک رہے گا۔" آتما سنگھ نے رشید خاں کو سمجھاتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ کی فیکٹری کون سی ہے اور کہاں پر ہے؟" رشید خاں نے پوچھا۔

"جہاں آپ کی گتے کی فیکٹری ہے اس کے اگلے روڈ پر پائنیر پلاسٹک فیکٹری جو ہے۔"

"اس پلاسٹک کی فیکٹری کو تو میں جانتا ہوں۔"

"رشید خاں تم وہیں رہتے ہو جہاں پہلے رہتے تھے؟" ہری رام نے پوچھا۔

"ابھی تک وہیں ہوں۔"

"تو پھر کل تم صبح سات بجے تیار رہنا میں اور آتما سنگھ دونوں تمھیں لینے آئیں گے۔"

رشید خاں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

دُوسرے دن شام کو جب چھٹی ہوئی تو رشید خاں نے دیکھا ہری رام اُس کی فیکٹری کے آگے کھڑا اُس کا انتظار کر رہا تھا۔

"کیوں بھائی کام پسند آیا؟" ہری رام نے رشید خاں سے پُوچھا۔

ہری رام کی بات سُن کر رشید خاں مُسکرا دیا۔

"پنڈت جی! ہم اور آپ ٹھہرے مزدور۔ مزدور کو تو کام چاہئے تاکہ وہ اپنا اور اپنے بچّوں کا پیٹ پال سکے۔ کام کے پسند یا ناپسند کا تو سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ پھر بھی تمہارا اور آتما سنگھ کا شکرگزار ہوں کہ وہ وقت کی روزی کا وسیلہ ہو گیا ہے۔"

"اس میں شُکریہ کی کیا بات ہے۔ انسانی ناطے سے ہمارا ایک دُوسرے کی مدد کرنا فرض ہوتا ہے۔ غیر مُلک میں دُوسروں کے درمیان ہم لوگوں کو مذہب، ذات پات اور مُلکی تفرقات کو نظر انداز کر دینا چاہئے۔ آتما سنگھ کو تمہارے ساتھ چھٹی نہیں ہوئی کیا؟" ہری رام نے آتما سنگھ کے بارے میں پُوچھا۔

"نہیں۔ وہ اوور ٹائم لگا رہا ہے۔ میرا آج پہلا دن تھا اِس لئے مجھے اوور ٹائم نہیں مِلا ہے، فورمین نے کہا ہے کہ کل سے اوور ٹائم کر لیا کروں۔"

رشید خاں تو وہیں سے اپنے گھر کو جانے لگا تھا۔ لیکن ہری رام نے بہت اصرار کے بعد اُسے اپنے ہاں رات کا کھانا کھانے پر راضی کر لیا۔ بہت دیر تک وہ گھنٹے کی فیکٹری میں، آپس میں گزارے ہوئے دنوں کی باتیں کرتے رہے۔

ہری رام کی بیوی لاجونتی نے ڈرائنگ رُوم میں کھانا لگا دیا۔ کھانا کھاتے ہوئے بھی وہ فیکٹری ہی کی باتیں کرتے رہے۔ باتوں ہی باتوں میں ہری رام نے ہنستے ہوئے رشید خاں سے پُوچھا۔

"کیوں رشید میاں! کیا اب بھی سرحد پر ہاتھ میں بندوق لے کر لڑنے کے لئے آؤ گے؟"

ہری رام کی بات سُن کر رشید خاں نے اپنے مُنہ کی طرف لے جاتے ہوئے روٹی کے لقمے کو روک لیا اور اُسے اپنے سامنے پڑی ہوئی پلیٹ میں پھینک دیا۔ غصّے سے اُس کا چہرہ تمتما گیا اور وہ گرج اُٹھا۔

"اوئے پنڈتا! تو مجھے کام پر لگوا کر اور کھانا کِھلا کر یہ سمجھتا ہے کہ میں اپنے مُلک اور اپنے ایمان سے غدّاری کروں گا! یہ ناممکن ہے۔ قسم ہے اپنے ایمان اور اپنے مُلک کی! اِس بار پاکستان اور ہندوستان کی لڑائی ہو گی اور ضرور ہو گی! اور قسم اللہ پاک کی اُس لڑائی میں، میں یہاں سے سیدھا سرحد پر جاؤں گا!"

رشید خاں کے غصّے کو دیکھ کر ہری رام ڈر گیا۔ اُس کا مطلب اُس کی دل آزاری نہ تھی۔ ہری رام نے سوچا تھا وہ دونوں پُرانی باتیں کر رہے تھے۔ اِس لئے کیوں نہ پُرانی چُہل بازی پھر سے شروع کر دی جائے۔ پھر ہندوستان اور پاکستان میں بھی آج کل دونوں امن اور باہمی بات چیت کی بڑے زور شور سے باتیں چل رہی تھیں۔ دونوں مُلکوں کے سربراہ کچھ ہی عرصے کے بعد باہمی تعلّقات کو سُلجھانے کے لئے گفت و شنید کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ اِس لئے اُس نے سوچا پُرانی باتوں سے وہ تلخی جو ہند و پاک لڑائی کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی اُسے کم کر دیا جائے۔ لیکن ہری رام کو ایسا محسوس ہوا رشید خاں کے دل میں وہ تلخی اب بھی ہے۔

ہری رام نے سُنا رشید خاں کہہ رہا تھا۔

"ہری رام! ہندوستان اور پاکستان میں ایک بار لڑائی ضرور ہو گی اور ہم سبھی کو اُس میں حصّہ لینا ہو گا۔ کیونکہ اِس بار جو لڑائی ہمیں لڑنا ہو گی وہ ایک دُوسرے کے خلاف نہیں، ہم دونوں مُلکوں کے مشترک دُشمن کے خلاف! اور ہند و پاکستان کے وہ مشترکہ دُشمن ہیں بیکاری، غریبی، مفلسی، ذات پات اور جہالت!! ہمیں اگلی لڑائی میں ایک دُوسرے کے شانہ بہ شانہ اِس دُشمن کے خلاف لڑنا ہے۔ میں اُس لڑائی کے لئے تیار ہوں۔ بول پنڈتا! کیا تو بھی پہنچے گا سرحد پر اُس لڑائی کے لئے؟"

یہ کہہ کر رشید خاں نے ہری رام کی طرف دیکھا۔

ہری رام اور رشید خاں کے ہاتھ ایک دُوسرے کی طرف یہ قول و اقرار کرنے کے لئے بڑھے کہ اگر اگلی جنگ ہندوستان اور پاکستان میں ہونا ہی ہے تو وہ واقعی ایسی ہی لڑائی ہو گی اور وہ دونوں اِس لڑائی کے لئے سب سے پہلے سرحد پر پہنچیں گے!!

چستی پھرتی

اور بہتر نشوونما

کا ضامن

فیراڈول

■ فیراڈول میں شامل فولاد اور لذیذ مالٹ بھرپور اور مسلسل قوت اور توانائی کا خزانہ ہیں جو آپ کو ہمیشہ چست اور پھرتیلا بنائے رکھتے ہیں۔

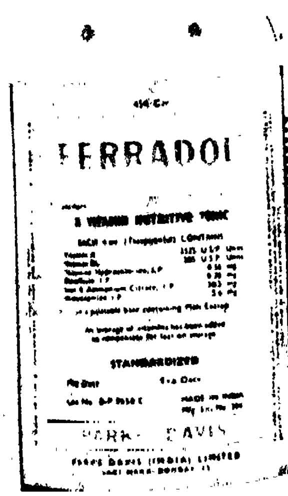
■ اس میں شامل ضروری وٹامنوں کا متوازن مرکب طاقتور اور صحتمند نشوونما کا ضامن ہے۔

فیراڈول

فولاد اور وٹامن آمیز ٹانک

مزیدار ذائقے دار





کا تیار کردہ۔

● رجسٹرڈ ٹریڈ مارک۔ رجسٹرڈ یوزرز۔ پارک۔ ڈیوس

(انڈیا) لمیٹڈ۔ بمبئی ۷۲۔ اے ایس

بیسویں صدی دہلی مئی ۱۹۷۲ء

نئی بہار

مس خورشید نکہت ایم۔اے

۸۴۳۔بردی وار پیٹھ، پونا سٹی نمبر ۲ (مہاراشٹر)

محترم جناب خوشتر گرامی صاحب! تسلیمات بصد خلوص و احترام

لیجیے "بیسویں صدی" کی بزم میں "نئی بہار" لیکر پھر حاضر ہو رہی ہوں۔ اپنی طویل غیر حاضری کے لئے بے حد شرمندہ ہوں۔ ذہنی اُلجھنوں نے کچھ لکھنے نہ دیا۔ بہر حال "بیسویں صدی" کے ذریعے اپنے تمام پڑھنے والوں سے معذرت خواہ ہوں، جو مجھے "بیسویں صدی" کی بزم میں حاضر ہونے کی یاد دلاتے رہے۔ اس سے "بیسویں صدی" کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے ___ آپ کی طبیعت کیسی ہے خوشتر صاحب؟ سُنا ہے آپ اب اکثر اپنے دولت خانے پر ہی رہ کر اُردو کی خدمت کر رہے ہیں۔ بہت کم دفتر میں آتے ہیں۔ ___ "نئی بہار" ایک ہلکا پھلکا سا افسانہ ہے۔ اُمید ہے آپ کو اور قارئین کو بھی پسند آئے گا۔ مجھے آپ کی اور قارئین کی رائے کا انتظار رہے گا...

پُرخلوص ___ مس خورشید نکہت

★

موسم بہت بھیگا بھیگا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ یوکلپٹس کی ڈالیوں سے خوشبو کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں۔ جس سے دل و دماغ کو ایک تازگی سی مل رہی تھی۔ دل و دماغ معطر ہو رہا تھا۔ چیڑ کے اُونچے اُونچے پیڑوں سے ٹکرا کر جب دھیمی دھیمی ہوائیں چلنے لگتیں تو فضا میں ایک عجیب سا سنگیت بکھر جاتا۔ سُہیل چیڑ کے پیڑ کے نیچے یاسمین کی گود میں سر رکھے لیٹا تھا۔ یاسمین آہستہ آہستہ اُس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیر رہی تھی۔

"یاسمین! قسمت بھی کبھی کبھی کتنی مہربان ہو جاتی ہے؟"

"وہ کیسے؟" یاسمین نے ایک عجیب دلربایانہ انداز سے پُوچھا۔

"اب دیکھو نا؟ آج میں تمھارے کتنے قریب ہوں۔ کل کتنی دُور تھا۔ آج میں تمھاری سانسوں کی رفتار اور دل کی دھڑکنیں تک گِن سکتا ہوں لیکن آج سے پہلے میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ہم تم اِس طرح ایک دُوسرے کے اتنے قریب ہوں گے۔ میں تو اِس پیار کو ترس ترس گیا تھا یاسمین! جو انسان پیار کا بھوکا ہو، جو بچپن سے سچّے پیار کو ترستا رہا ہو، جسے کسی نے بھُول کر بھی پیار کا ایک لفظ نہ کہا ہو، اگر اُس کی جھولی میں اِتنا سارا پیار، اِتنا خلوص اور اِتنی محبت ڈال دی جائے، تو کیا وہ اپنی قسمت پر ناز نہ کرے گا؟ بتاؤ یاسمین؟"

یاسمین خاموشی سے اُس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔

"تمھاری اِن گہری جھیل جیسی سیاہ آنکھوں میں کتنا پیار ہے! سمندر کی طرح اتھاہ اور گہرا پیار! جس میں ڈُوب کر پھر اُبھرنے کو دل نہیں چاہتا! سچ کہہ رہا ہوں یاسمین! تم میری بات پر یقین کر دو۔"

یاسمین اب بھی خاموشی سے اُس کی باتیں سُنتی رہی۔ سُہیل پھر کہنے لگا۔

"یاسمین! تم میری زندگی کی پہلی اور آخری لڑکی ہو۔ تمھارے پیار میں وہ سچّائی ہے کہ میں مر کر بھی اِسے بھُلا نہ سکوں گا۔ تم نے

میری شوخ زندگی میں ایک ہلچل سی مچادی ہے۔ تم میری زندگی میں روشنی کی کرن بن کر نمودار ہوئی ہو۔ تم میری رہبر بھی ہو اور رہنما بھی ——— میری زندگی کی ساری خوشیاں اب صرف تم سے وابستہ ہیں ——— صرف تم ———"

یاسمین نے درمیان میں بات کاٹ دی اور کہا۔

"سہیل ——— ایک بات پوچھوں؟"

"ضرور پوچھو ——— ایک نہیں ہزار باتیں پوچھو ——— میری کوئی بات تم سے چھپی ہوئی نہیں ہے ———"

"سہیل! یہ تم نے غلط کہا کہ میں ہی تمھاری زندگی کی پہلی اور آخری لڑکی ہوں" یاسمین نے کہا۔

"اس میں غلط کیا ہے؟" سہیل نے پوچھا۔

"آخری لڑکی والی بات تو ٹھیک ہے۔ لیکن پہلی لڑکی والی غلط ——— کیونکہ تم تو کہا کرتے تھے کہ تم مجھ سے پہلے کسی اور لڑکی سے محبت کرتے تھے؟"

"ہاں ——— ہاں ———" سہیل نے ہنستے ہوئے کہا" ہاں اُس سے مجھے محبت ہوئی تھی۔ لیکن بہت عجیب سی اور انوکھی سی محبت تھی وہ! تم بھی سنو گی تو حیران رہ جاؤ گی اور ہنسو گی۔ اب جب سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے اپنے آپ پر یاسمین! شاید تم یقین نہ کرو۔ لیکن یہ سچ ہے کہ میں نے اُس لڑکی کو دیکھا تک نہ تھا اور نہ اُس کی آواز ہی سُنی تھی ——— !"

"تو پھر محبت کیسے ہوئی؟" یاسمین نے حیرت سے پوچھا۔

"یہی تو ہنسی کی بات ہے تمھارے لئے ——— سب کے لئے بھی۔ لیکن میرے لئے نہیں ——— کیونکہ مجھے اُس سے محبت جو ہوئی تھی! آؤ تمھیں بتاؤں ——— لیکن شرط یہ ہے کہ تم ہنسو گی نہیں ———"

اور یاسمین نے وعدہ کر لیا۔

"یہاں آنے سے پہلے میں دہرہ دون میں رہتا تھا۔ وہاں میرا ٹرانسفر ہو گیا تھا۔ جس جگہ میں رہتا تھا اُس جگہ میرے مکان کے بالکل پڑوس میں ایک بہت اچھا خاندان رہتا تھا۔ اُن کے اور میرے کمرے کے درمیان ایک دروازہ تھا۔ دونوں گھروں کے درمیان چھت اور دیواروں کے بیچ میں کچھ جگہ خالی تھی۔ چھت کے قریب ہی کچھ چیزیں رکھنے کے لئے وہ لوگ سیڑھی لگا لیا کرتے تھے۔ سیڑھی پر کے ذریعے چیزیں رکھتے اور نکالتے تھے۔ سیڑھی پر چڑھنے کے بعد دوسرے کمرے میں بآسانی جھانکا جا سکتا تھا۔ وہ شہر کے مشہور وکیل صاحب کا گھر تھا۔ اُن کی پانچ لڑکیاں تھیں اور ایک لڑکا۔ وہ لڑکا فاروق میرا بہت اچھا دوست بن گیا تھا۔ وہ لوگ بہت ہی پُر خلوص تھے۔ میں اور فاروق جہاں جاتے اکثر ساتھ ہی جاتے۔ ہمارا بہت سا وقت ایک ساتھ گزرتا۔

ایک دن آفس میں کام کرنے کی زیادتی کی وجہ سے میں بہت تھک گیا تھا۔ میری یہ ایک عادت سی ہو گئی تھی کہ میں سونے سے پہلے کسی نہ کسی کتاب کا مطالعہ ضرور کرتا۔ اُس دن بھی تھک جانے کے باوجود میں کافی رات گئے تک پڑھتا رہا۔ پھر نہ جانے کب سو گیا۔ جب صبح سورج کی کرنیں میرے کمرے میں آنے لگیں تو میں گھبرا کر آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ بیٹھا۔ کافی دن چڑھ آیا تھا۔ شاید صبح کے نو بجے ہوں گے۔ اتوار کا دن تھا اس لئے آفس جانے کی کوئی جلدی نہ تھی۔ میں بستر پر آنکھیں ملتا بیٹھا ہی تھا کہ میں نے سُنا۔

"بھائی صاحب! آپ اتنی دیر سے اُٹھے ہیں؟"

میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا کہ آواز کہاں سے آئی؟ تب پتہ چلا۔ وکیل صاحب کی سات سالہ لڑکی سیڑھی پر چڑھی ہوئی ہے اور میرے کمرے کی طرف جھانک کر مجھ سے پوچھ رہی ہے۔

"ہاں رات میں دیر سے سویا تھا" میں نے جواب دیا۔

"آپ رات میں دیر سے کیوں سوتے ہیں؟" وہ لڑکی جس کا نام سلمیٰ تھا مجھ سے پوچھ رہی تھی اور پھر سوال کرنے کے بعد وہ سیڑھی سے نیچے جھانکنے لگی۔ جب میں نے کوئی جواب نہ دیا تو اُس نے اپنا سوال پھر دُہرایا ——— تب مجھے جواب دینا پڑا۔

"بس پڑھتا رہتا ہوں نا اس لئے ———" [illegible] لگی۔ تھوڑی دیر بعد پھر پوچھا۔

"بھائی صاحب! آپ پڑھتے کیوں ہیں؟"

"بس یونہی ———" میں نے مختصر سا جواب د[illegible] نیچے جھانکا اور پھر سوال کیا۔

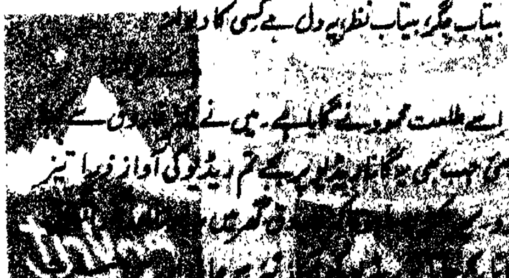
"کیا آپ کوئی امتحان دے رہے ہیں؟" [illegible] جھانکا۔



نہیں ــــ تو ــــ اور یہ کہہ کر میں اُٹھ کر ہاتھ روم چلا گیا منہ ہاتھ دھونے کے لئے لیکن میرے دماغ میں جیسے ہلچل سی مچ گئی۔ اُس چھوٹی سی بچی کا مجھ سے بار بار سوال کرنا، پھر سیڑھی سے نیچے بھاگنا، پھر دوبارہ نیا سوال کرنا پھر بھاگنا ــــ اُس کی اس بات نے میرے ذوق جستجو کو اور بڑھا دیا۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ ضرور کوئی اور بڑی لڑکی ہے جسے میری فکر رہتی ہے، جو میری ہر بات کی خبر رکھتی ہے اور اس لئے آج دیر سے اُٹھنے پر وہ اپنی چھوٹی بہن سلمیٰ کے ذریعے میری خبر لے رہی تھی۔ کیونکہ وہ براہ راست تو پوچھ نہ سکتی تھی۔ اُن کے گھر میں سخت پردہ تھا۔ لیکن اسی دن کے بعد سے میرا دل بھی اُس کی خبر لینے لگا۔ اُن کے گھر اور میرے کمرے کے درمیان ایک دروازہ تھا جو ہمیشہ مقفّل رہتا تھا۔ لیکن اُس کی درازوں سے مکینوں کی نقل و حرکت کا پتہ چل جاتا تھا۔ مگر کی اُس طرف چلنے والے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ میرے دل نے کئی بار چاہا کہ دروازہ میں سے جھانک کر دیکھوں کہ کون ہے وہ لڑکی جو میری فکر رکھتی ہے۔ لیکن میں نے اس طرح اخلاقی جرم کرنا پسند نہ کیا۔ میں جب بھی کہیں لیٹا ہوا کوئی کتاب پڑھتا رہتا۔ مجھے دروازے کے پیچھے کسی کا سایہ تھرتھراتا ہوا محسوس ہوتا۔ کسی کی چوڑیوں کی کھنک سنائی دیتی اور میرا دل دھڑک اُٹھتا۔ اُنہی دنوں مجھے ایک گانا بہت پسند تھا۔ جس کا ایک شعر ہے ؎

بیتاب جگر، بیتاب نظر، یہ دل ہے کسی کا دیوانہ



[illegible] لیے ملت محروسے گیا ہے۔ میں نے [illegible] سے [illegible] یہ گانا ریڈیو پر بجے تم ریڈیو کی آواز ذرا تیز کر [illegible] گھر میں [illegible] بیرہ جا [illegible] کرنے لگتا [illegible] شاید یہ [illegible] کی آواز تیز کر [illegible] اور [illegible] کر دیا سمین [illegible] ہی اُس ان دیکھی لڑکی کو چاہنے لگا۔ میرے دل میں آہستہ آہستہ اُس کی محبت پروان چڑھتی گئی۔ میں شدت سے یہ محسوس کرنے لگا کہ دیوار کے اُس طرف کوئی تو ہے جو مجھ سے محبت

کرتا ہے اور جب انسان کسی سے محبت کرتا ہے تو اُس کی ہر چھوٹی سے چھوٹی بات پر نظر رکھتا ہے اور اُس کی ہر بات کا خیال رکھتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے اُس کے خیال ہی سے دل ہی دل میں محبت ہو گئی۔ اُسے دیکھنے کی آرزو دل میں سر اُٹھاتی رہتی۔ میں نے بارہا چاہا کہ فاروق سے پوچھوں، یا فاروق سے کہہ دوں کہ مجھے تمہاری اُس بہن سے محبت ہو گئی ہے جو میرا خیال رکھتی ہے۔ لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری دوستی پر حرف آئے۔ فاروق مجھے غلط سمجھے۔ میں فاروق جیسے دوست کی نظروں میں گرنا نہ چاہتا تھا۔ میں نے اپنی محبت کو اپنے ہی سینے میں چھپا لیا لیکن اُسے بغیر دیکھے ہی شدت سے چاہنے لگا۔ وہ لڑکی مختلف روپ میں میرے ذہن کے پردوں پر چمکنے لگی۔ اچانک طور پر اُس نے میرے ہوش و حواس پر قبضہ کر لیا۔ مجھے اب ہر گھڑی اُسی کو دیکھنے کی تمنا، اُسی کی آواز سننے کی آرزو پیدا ہونے لگی۔ لیکن مجھے وہ کبھی دکھائی نہ دی۔ ہاں البتہ ایک دن میں نے اُس کی آواز سن لی تھی۔ اُس کی امّی نے اُسے پکارا تو اُس نے جواب دیا:

بھی اتی ___ ابھی آئی !" اور اپنی مترنم آواز کی لے میرے کانوں میں چھوڑ کر ایک سایہ دروازے کے پاس سے تھرکتا ہوا گزر گیا۔ اتنی پیاری تھی اس کی آواز جیسے ہزاروں نغمے ایک ساتھ بج اٹھے ہوں۔ جیسے کسی نے دلنواز ساز کے تاروں کو چھیڑ دیا ہو!

ایک دن فاروق نے مجھے بتایا اس کی بڑی بہن تسنیم کی شادی ہونے والی ہے۔ لیکن وہ اِس شادی سے خوش نہیں ہے۔ جب سے شادی کی بات سُنی، روتی رہتی ہے۔ تب مجھے احساس ہوا۔ شاید یہ وہی لڑکی ہے جو میرے حواس پر چھائی ہوئی ہے۔ شاید اُسی کا نام تسنیم ہے۔ اُس کی اتی نے ہی تو ایک دن اُسے پکارتے وقت یہی نام لیا تھا۔ کتنا پیارا نام ہے! میرے جی میں آیا فاروق سے کہہ دوں، تسنیم مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اِسی لئے اِس شادی سے خوش نہیں ہے۔ لیکن میں نے اپنی اِس خواہش کا گلا گھونٹ دیا۔ کیونکہ فاروق کی دوستی مانع تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی شادی کا جہیز اور میرے ارمانوں کا کفن تیار ہونے لگا۔ اُس کے گھر والے اُس کی شادی کی تیاریاں کر رہے تھے اور مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے لوگ میرے جنازے کی تیاریاں کر رہے ہوں!

ایک دن فاروق نے مجھ سے کہا، "شکیل! آؤ نا یار ذرا تسلیم باجی کے جہیز کی فہرست تیار کرنے میں میری مدد تو کر دو۔" اور میرا دم گھٹ کر رہ گیا۔ فاروق پر بے حد غصّہ آیا۔ جی چاہا کہنے لگا کہہ دوں "ظالم! تو میری محبت کا خون کر رہا ہے اور مجھ سے میرے خون کے قطروں کی فہرست تیار کروا رہا ہے؟"

لیکن میں خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا اور اُس کے ساتھ بظاہر مطمئن ہو کر فہرست بنانے لگا۔

ایک ہفتے بعد اُس کی شادی ہو گئی اور وہ اپنی سسرال چلی گئی۔ میں اپنی محبت کی لاش اٹھائے یونہی بے مقصد گھومتا رہا۔ اب رہ رہ کر وہ کمرہ مجھے کاٹنے کو دوڑتا۔ میرا دل اب اُس جگہ نہ لگتا۔ میں اپنا زیادہ تر وقت باہر ہی گزارتا۔ دل کی بے چینی بڑھنے لگتی تو میں کہیں دُور پہاڑوں کی طرف نکل جاتا۔ گھنٹوں تنہا بیٹھا نہ جانے کیا کیا سوچتا رہتا۔ میں نے وہاں سے اپنا تبادلہ کروا لیا۔ جگہ بدلنے کے بعد میں نے آہستہ آہستہ اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ اُس کی

پاکر بھڑے لگالیا۔ اُس کے قرب سے پیار کرنے لگا۔ کبھی کبھی تم اِتنا پیچھا کر کے میں دیر تک سوتا رہتا اور پھر یہ فیصلہ کر لیتا کہ اب کبھی کسی سے پیار نہ کروں گا! اس دل میں صرف تسلیم ہی کی یاد رہے گی۔ اس میں اب کوئی نہ آئے گا! اور پھر میں نے اپنے دل کے دروازے اچھی طرح بند کر لئے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ اُسے مقفّل نہیں کیا تھا۔ لیکن یاسمین! تم اس طرح دبے پاؤں بغیر دستک دیے میرے دل کے نہاں خانے میں چلی آئیں کہ دروازے خود بخود کھلتے گئے اور مجھے پتہ بھی نہ چلا؟"

اور پھر سہیل ایک لمحہ کے لئے رُک گیا۔ یاسمین کے چہرے کی طرف پیار بھری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا: "دیکھو نا میری پاگل محبت ——؟ یاسمین! تم ہی میری زندگی میں آنے والی وہ پہلی لڑکی ہو جس سے میں نے دل کھول کر بات کی ہے۔ جسے میں نے شدّت سے چاہا ہے اور مرتے دم تک چاہتا رہوں گا۔ تم ہی میری زندگی کی پہلی لڑکی ہو جسے میں نے جی بھر پیار بھری نظروں سے دیکھا ہے، جس کی گھنی زُلفوں کی چھاؤں تلے آرام کیا ہے۔ جس کی بانہوں میں سمٹ کر مجھے سکون مِلا ہے۔ تم ہی میری پہلی اور آخری محبت ہو! تم کبھی مجھ سے دُور نہ ہونا، کبھی ناراض نہ ہونا۔ ورنہ میری دُنیا اندھیری ہو جائے گی۔ تم ایسی حسین مُورتی ہو جسے میں نے اپنے سُونے مندر میں سجا رکھا ہے۔ تم دیوی ہو یاسمین! اور میں تمہارا پُجاری! تم ایک ایسا نگینہ ہو جسے میں نے اپنے دل کی انگوٹھی میں جڑ لیا ہے۔ ہاں —— یاسمین!"

"اچھا اچھا اب اُٹھئے بھی —— شام کے سائے بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہوا میں خُنکی بڑھ گئی ہے۔ چلو اب گھر چلیں ——" یاسمین نے کہا۔

"لیکن یاسمین! جب تم پاس ہو تو پھر خُنکی کا کیا ڈر؟ حُسن کی گرمی سے سردی کا احساس نہ ہوگا ——!" سہیل نے شرارت سے کہا۔

"اب اُٹھو بھی ——؟" یاسمین نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"لو اُٹھاؤ نا پھر؟ لو میرا ہاتھ تھام لو ——"

"نا —— تم خود اُٹھو ——"

"پلیز ——!" سہیل نے التجا کی اور یاسمین نے جیسے ہی اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اُٹھایا، اُس نے بڑھ کر یاسمین کو اپنی بانہوں میں لے لیا اور اُس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

"یاسمین! تم کتنی اچھی ہو، کتنی پیاری! تمہارے بغیر میری زندگی نامکمّل ہے۔ تم ہی نے میری زندگی سنواری ہے، مجھے بے انتہا پیار، محبت اور خلوص دیا۔ تم پیار، محبت اور وفا کا بے کراں سمندر ہو جس میں ڈوب کر میں سیراب ہونا چاہتا ہوں۔ تم نے میری زندگی کی خزاں کو بدل کر بہاروں سے بھر دیا۔ تم میری زندگی میں نئی بہار بن کر داخل ہوئی ہو —— تم ہی میری منزل ہو!!"



آگ سے بچاؤ کا دن .... 14 اپریل 1973ء

davp 72/739

غزلیں

نصیر صہبائی الہ آبادی ایم۔ اے

گیسوئے رُخ کی یاد میں شام گئی سحر گئی
کیسے حسین شغل میں عمرِ وفا گزر گئی

برق جلا کے آشیاں خانہ بدوش کر گئی
صبح کہیں گزر گئی شام کہیں گزر گئی

مجھ سے خفا ہے ناخدا مجھ کو بتائیگا بھی کیا
موجِ فنا تُو ہی بتا کشتیِ دل کدھر گئی

برق و شرر کے دور پر پوچھتا ہے تنکے پھر بھی تُو
صحنِ چمن کی طلعت ذہن سے کیا اُتر گئی

دیر و حرم کو چھوڑ کر طور سے رُخ کو موڑ کر
آپ جہاں تھے جلوہ گر میری نظر اُدھر گئی

تیغ تھی یا تھی نیشتر اُس کی نظر کو کیا کہوں
قلب و جگر سہالے نصیرؔ کام تمام کر گئی

عزیز خیرآبادی ایم۔ اے

چھٹ گیا قسمت سے دامن ہاتھ میں آنے کے بعد
پھر نہ آئے وہ تصور میں، چلے جانے کے بعد

خوش ہوئے تھے ہم کہ اب فصلِ بہار آنے کو ہے
کیا خبر تھی روئیں گے فصلِ بہار آنے کے بعد

کس کے دامن سے اُلجھ کر خارِ دل بہلائیں گے
کون زینت دیگا ویرانے کو دیوانے کے بعد

یُوں نہ ٹھکراؤ ہمیں محفل میں اپنی دیکھ کر
یاد بھی آئیں گے ہم تم کو چلے جانے کے بعد

کیا اُٹھو گا اب کہیں سائے میں اُن کی زُلف کے
کُو بہ کُو، صحرا بہ صحرا ٹھوکریں کھانے کے بعد

ڈھل کے اشکوں میں مرے ارمان نکلے اے عزیزؔ
سازِ ہستی پہ ترانہ عشق کا گانے کے بعد

سعید عارفی ایم۔ اے

کس درجہ گمبھیر فضا ہے ہم بھی چُپ ہیں تُم بھی چُپ
اندیشوں نے گھیر لیا ہے ہم بھی چُپ ہیں تُم بھی چُپ

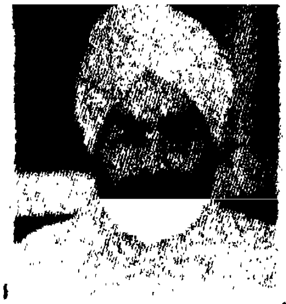
رنگ برنگی یادیں دل کا پیچھا کرتی رہتی ہیں
شاید کچھ ہونے والا ہے ہم بھی چُپ ہیں تُم بھی چُپ

برسوں پہلے انجانے میں کھیلا تھا اک کھیل کبھی
آج تلک اُس کا چرچا ہے ہم بھی چُپ ہیں تُم بھی چُپ

کس سے دل کی بات کریں گے کون ہمیں پہچانے گا
لفظوں کا پُل ٹوٹ گیا ہے ہم بھی چُپ ہیں تُم بھی چُپ

انسانوں کی اس دُنیا میں کون کسی کا ہوتا ہے
دل تھا وہ بھی ٹوٹ چکا ہے ہم بھی چُپ ہیں تُم بھی چُپ

تنہائی کی نم آنکھوں میں اک دن جھانک کے دیکھو تو
سنّاٹا ہی سنّاٹا ہے ہم بھی چُپ ہیں تُم بھی چُپ



گیانی ذیل سنگھ وزارت کا ایک سال

پنجاب کی ترقی کا شاندار ریکارڈ

صوبہ پنجاب زراعت۔ تعلیم، صحت، انڈسٹری اور ہریجن اصلاح جیسے تمام ترقیاتی پہلوؤں کے لئے گذشتہ ایک سال سے نمائندگی کر رہا ہے۔ گذشتہ سال مارچ میں حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد موجودہ وزارت کے خاص خاص کارہائے نمایاں اِس طرح سے ہیں۔

- انقلابی لینڈ ریفارم بل پاس کیا گیا۔
- دو ہزار ٹیوب ویل لگائے گئے۔
- ۱۶ کروڑ روپے مالیت کی فیکٹریاں لگائی گئیں۔
- ایک ہزار نئے سکول کھولے گئے اور ۲۷۵ سکولوں کا درجہ بڑھایا گیا۔
- ۴۸۰۰ میل لمبی منسلک سڑکیں تقریباً مکمل کر دی گئی ہیں۔
- ۱۵ اگست ۱۹۷۳ء سے پہلے ۱۷۵۰۰۰ غیر زمین یافتہ بے گھر دیہاتیوں کو مفت رہائشی پلاٹ الاٹ کرنے کے لئے ایک وسیع پروگرام عمل میں لایا گیا ہے۔
- ۲۱۰۰ گاؤں کے لئے دیہاتی پانی سپلائی سکیمیں تیار کی گئی ہیں۔
- ہریجنوں کو سُور پالن۔ ڈیری اور مرغبانی شروع کرنے کے لئے فراخدلی سے قرضہ جات دیئے گئے۔ نئی دھرم شالائیں تعمیر کی گئیں۔
- ۱۳۱۵ بڑے پیمانے کی درمیانی اور نچلی سطح کی صنعتی اکائیاں قائم کی گئیں۔
- مرکزی سرکار کی تنخواہوں کے سکیل کے برابر لانے کے لئے ملازمین کی تنخواہوں میں ترمیم کی گئی۔
- ۴۰۰۰ ایڈہاک ملازمین کی سروسز کو جاری رکھا گیا۔
- پنجاب نے قومی اناج بھنڈار میں ۳۲ لاکھ ٹن گیہوں اور ۷ لاکھ ٹن سے زائد چاول دیئے ہیں۔
- ریاست کے اندر سفید انقلاب کے لئے بڑے پیمانے پر اقدامات کئے گئے ہیں۔ اِس سے دودھ کی پیداوار ۵۰ لاکھ لیٹر سے بڑھ کر ۷۵ لاکھ لیٹر فی دن ہو جائے گی۔
- ۲۵۰۰۰ ٹیوب ویلوں کو بجلی دی گئی۔ ۳۶۰۰۰ ہزار دیگر کنیکشن دیئے گئے اور ۲۵۷ گاؤں کو بجلی دی گئی۔
- روزگار کے مواقع فراہم کئے گئے اور ۲۰۰۰۰ ہزار سے زائد اشخاص کو روزگار دیا گیا۔
- ۱۲۱ پرائمری سب ہیلتھ سینٹر کھولے گئے۔ ڈاکٹروں کی حوصلہ افزائی کی گئی اور ان کی خدمات کا تحفظ کیا گیا۔
- ۱۵ لاکھ ایکڑ کلر زمین کو قابل کاشت بنانے کے لئے کوششیں جاری ہیں۔
- ریاست نے گیانی ذیل سنگھ کی پُر وقار رہنمائی میں بُری بیماریوں اور بھوک کا قلع قمع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

جاری کردہ:-
ڈائریکٹر
اطلاعات و نشریات پنجاب
چنڈی گڑھ

PRD—253/73

بیسویں صدی دہلی مئی ۱۹۷۳ء

تنہائی کا درد

سلیم انجم

معرفت۔ غوث الدین احمد سب پوسٹ ماسٹر پرکال ضلع ورنگل۔ آندھرا

محترمی! تسلیمات

"پتھر کے دیوتا" (بیسویں صدی اگست ۷۲ء) کے بعد ایک اور افسانہ "تنہائی کا درد" ارسالِ خدمت ہے۔ پسند آئے تو شریکِ اشاعت کر کے ممنون فرمائیں۔ پچھلے افسانے کے متعلق بہت خطوط ملے۔ میں اُن سارے قارئین کا شکرگذار ہوں جنہوں نے مجھے خطوط لکھے اور حوصلہ افزائی کی ——— اُمید ہے یہ افسانہ بھی آپ کو اور قارئین کو پسند آئے گا۔

آپ کا ——— سلیم انجم

پروفیسر کھنہ راجیش کو اپنے ساتھ لئے پرنسپل کے چیمبر سے نکل کر اسٹاف روم میں داخل ہوئے۔

"یہ مسٹر راجیش ہیں۔ اکنامکس کے پروفیسر۔ مسٹر سُندھیر کی جگہ آئے ہیں۔ پروفیسر کھنہ نے اسٹاف روم میں بیٹھے ہوئے پروفیسر انل کمار اور سُریندر ناتھ سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"پلیز ٹو میٹ یو ———"

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی!"

یہ کہتے ہوئے انل اور سریندر نے راجیش سے باری باری ہاتھ ملایا۔

سریتا ——— جو اسٹاف روم کے آخری حصّہ میں الماری کی آڑ میں بیٹھی ہوئی کسی کتاب کے مطالعہ میں منہمک تھی۔ اُس نے کتاب پر سے نظریں ہٹا کر بے پروائی سے نئے پروفیسر کو دیکھا اور دوسرے ہی لمحہ چونک سی پڑی۔ پھر کتاب پر نظریں جمائے کچھ سوچنے لگی۔

"مسٹر راجیش آپ کہاں ٹھیرے ہوئے ہیں؟" ——— سریندر نے پوچھا۔

"کل دن بھر کھنہ صاحب کے لڑکے کے ساتھ سارا شہر چھان مارا لیکن کہیں مکان نہ مِلا ——— فی الحال ہوٹل سنگم میں ایک کمرہ لے لیا ہے اُسی میں قیام ہے۔"

"ہوٹل میں کب تک رہیں گے آپ؟ ——— تنہا رہنا پڑے گا۔ فیملی کو تو رکھ نہیں سکتے۔" انل نے کہا۔

"ایک دو ہفتہ کے بعد پارک لین میں ایک مختصر سا مکان ملنے کی اُمید ہے۔ مکان میں منتقل ہونے کے بعد بھی مجھے تنہا ہی رہنا پڑیگا۔" راجیش نے جواب دیا۔

"کیوں؟ کیا آپ فیملی کو نہ لائیں گے ———؟"

"جی ——— میری کوئی فیملی نہیں۔"

"تو کیا ——— آپ نے شادی نہیں کی؟ ابھی آپ کنوارے ہیں؟" سریندر نے پوچھا۔

"جی ہاں ———" راجیش نے سگریٹ جلاتے ہوئے بے پروائی سے جواب دیا۔

راجیش کا یہ جواب سُن کر دُور بیٹھی ہوئی سریتا ایک بار پھر چونک پڑی اور اپنی کرسی پر سے آگے ہٹ کر اُس سے کچھ فاصلے پر بیٹھے ہوئے

راجیش [illegible] گی۔ اچانک پروفیسر کھنّہ کی نظریں سرِتیا پر پڑیں [illegible] مس سرِتیا! آپ وہاں ہیں۔ میں نے آپ کو دیکھا نہ تھا ——— آیئے ——— آپ کا تعارف اپنے نئے پروفیسر مسٹر راجیش سے کراؤں ——— " پروفیسر کھنّہ نے کہا۔

تب ——— سرِتیا اپنی جگہ سے اُٹھی ——— اور دوسرے ہی لمحہ ہلکے نیلے رنگ کے کپڑوں میں ملبوس، ایک حسین اور دلکش چہرہ، جیسے جھیل کے نیلے پانی میں تیرتا مسکراتا ——— کنول ——— راجیش کے سامنے تھا۔

"مسٹر راجیش ——— یہ مس سرِتیا ہیں۔ سوشیل اسٹڈیز پڑھاتی ہیں اور آپ ہی کا شہر حیدرآباد ان کا وطن ہے۔" پروفیسر کھنّہ نے کہا۔

"نمستے" ——— راجیش نے نہایت اِنکساری اور سادگی سے کہا۔

——— جواب میں سرِتیا نے ایک لمحہ کے لئے راجیش کو سرتاپا دیکھا اور "نمستے" کہہ کر نظریں جھکا لیں۔

"آپ حیدرآباد میں کہاں رہتی ہیں؟" راجیش نے پوچھا۔

"ہیرے نگر کالونی میں۔ اور آپ شاید ملّے پلی میں رہتے ہیں ——— ؟" سرِتیا نے کہا۔

"جی ہاں" ——— راجیش نے مختصر سا جواب دیا۔

"تو آپ اِنھیں جانتی ہیں؟" پروفیسر کھنّہ نے پوچھا۔

"جی نہیں" ——— ملّے پلی میں میری ایک سہیلی رہتی تھی۔ میں اُس کے یہاں اکثر جایا کرتی تھی۔ کبھی کبھار راجیش صاحب نظر آجاتے تھے۔ لیکن ملنے یا بات کرنے کا اتفاق کبھی نہ ہوا۔" سرِتیا نے بات ختم کی تھی کہ کالج کا گھنٹہ بجا اور ساتھ ہی کھنّہ ——— سرِتیا ——— اور راجیش اِسٹاف روم سے نکل کر اپنے اپنے کلاس کی طرف چل دیئے۔

راجیش کو اُس کالج میں آئے ابھی ایک ماہ بھی نہ گزرا تھا کہ سارے کالج میں اُس کے متعلق قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔

"پروفیسر راجیش تنہائی پسند انسان ہیں۔"

"خشک اور سرد آدمی!" "ہمیشہ اُداس اور کھوئے کھوئے رہتے ہیں۔"

"سگریٹ زیادہ پیتے ہیں۔"

"اُنھیں کسی نے ہنستے یا مُسکراتے نہیں دیکھا۔"

"ہمیشہ غمگین اور ملول رہتے ہیں" ——— "شاید کسی کے ناکام عاشق ہیں۔"

"اِن کی شخصیت ایک راز ہے۔ ایک معمّہ ہے!"

لیکن سرِتیا ———

سرِتیا کے لئے راجیش کی شخصیت معمّہ نہ تھی۔ ایک کھلی کتاب تھی۔ وہ اُس کے دُکھ اور درد کا سبب ——— اُس کی اُداسی کی وجہ ——— اُس کی تنہائی اور خاموشی کا راز جانتی تھی۔ وہ اُس کی پچھلی [illegible] سے واقف تھی۔ اِسی لئے پہلی ہی ملاقات سے اُسے راجیش سے ایک [illegible] کی ہمدردی اور دلچسپی سی ہو گئی تھی ——— پھر وہ جانے وہ کون سی کشش تھی۔ وہ کون سا جذبہ تھا کہ سرِتیا ——— راجیش کی خاموشی، بے اعتنائی ——— اور بے التفاتی کے باوجود اُس کی طرف کھنچتی چلی گئی ———

ایک دن ———

راجیش کالج نہ آیا۔ اُس نے چُھٹی کی درخواست بھجوائی تھی۔ شام کالج سے گھر لوٹتے ہوئے۔ سرِتیا راجیش کے کالج نہ آنے کی وجہ معلوم کرنے کے لئے اُس کے گھر گئی ——— راجیش اپنے بستر پر دیوار کی طرف مُنہ کئے لیٹا تھا۔ اُس کی پُشت دروازے کی طرف تھی۔ پلنگ سے کچھ فاصلے پر دو چار کرسیاں اور اُن کے درمیان ایک چھوٹی سی میز پڑی ہوئی تھی ——— میز پر سگریٹ کا ٹِن کھلا اور فرش پر جابجا سگریٹ کے ادھ جلے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔

"کیا میں آسکتی ہوں ——— ؟" سرِتیا نے دروازے کے قریب کھڑے ہو کر پوچھا۔

"آجایئے سرِتیا دیوی!" راجیش نے پلٹ کر دیکھا اور کہا۔

سرِتیا کی آنکھیں راجیش سے چار ہوتے ہی وہ حیران اور ششدر سی رہ گئی۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر کرب اور بے چینی کے آثار تھے ——— آنکھیں سُرخ تھیں۔ جیسے وہ بہت دیر تک روتا رہا ہو۔

"تشریف رکھئے۔" راجیش نے کہا اور تولیے سے اپنا چہرہ اور آنکھیں صاف کرنے لگا۔

"شاید ——— آپ کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ آج آپ کالج نہیں آئے تھے اِس لئے پوچھنے چلی آئی۔"

"صبح سے طبیعت اچھی نہیں تھی سرِتیا دیوی۔ شاید آپ کو معلوم

[illegible]

مجھے [illegible] معذرت ہوں۔ آج صبح ہی دل کا دورہ پڑا تھا۔ سخت تکلیف تھی
اب [illegible] ہے۔"

"لیکن ابھی تک آپ کے چہرے پر کرب اور تکلیف کے آثار
ہیں۔ چلئے کسی [illegible] کے پاس چلیں" سریتا نے کہا۔

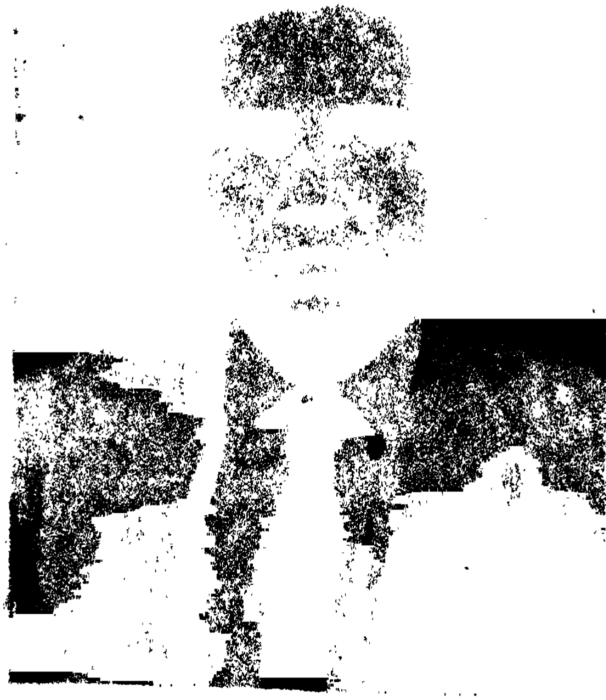
"نہیں ——— اب اس کی ضرورت نہیں۔ میں نے دوا کھائی ہے
اور [illegible] آرام بھی ہے۔"

"آپ نے ——— مسٹر کھنہ کو ——— یا مجھے۔ یا کسی اور کو بُلوا لیا
ہوتا [illegible] سے کوئی بھی آپ کے پاس آجاتا۔" سریتا نے پُرخلوص لہجہ میں کہا۔

"اس سے کیا ہوتا سریتا دیوی" ——— راجیش کہنے لگا۔ "میری
تکلیف کو میری اپنی بیمار تھی نا۔ یہ وہ دُکھ یا درد نہیں جو آپس میں بانٹ
لیں۔ [illegible] سال سے اس آزار میں مبتلا ہوں ——— یہ تکلیف مجھے زندگی اور
موت کی کشمکش میں مبتلا کر رہی ہے ——— اور اسی طرح کسی دن زندگی
[illegible] ——— میرا ——— پیارا کوئی نہیں ہے جو میری موت پر آنسو
بہائے۔ صرف تنہائی ہے اور میں ہوں ——— " راجیش کی آنکھیں بھر
آئیں ——— چند لمحوں کے لئے وہ چپ ہوگیا۔ پھر کہنے لگا ——— "ایک دل تھی۔
جس کے دل میں میرے لئے چند آرزوئیں تھیں۔ خوشیاں تھیں ———
تمنائیں تھیں ——— لیکن ——— وہ ——— انھیں پورا ہونے کی حسرت لئے ہوئے
اس دنیا سے چلی گئی ——— اور ایک دن ——— میں بھی ——— اپنی ناتمام اُمیدوں اور
ناکام آرزوؤں کا ماتم کرتے ہوئے ختم ہو جاؤں گا ——— زندگی کی تلخیوں
سے نجات تو مل جائے گی ——— "

راجیش کا درد میں ڈوبا ہوا ایک ایک جملہ، اُس کا ایک ایک لفظ
سریتا کے دل میں تیر بن کر اُترتا چلا گیا اور اُس کے دل کو مسوس کر رکھ دیا۔
اُف! کتنا دُکھی ہے یہ! ——— سریتا نے سوچا ——— اور چند لمحوں بعد کہا۔
"راجیش بابو ——— زندگی میں کتنی ہی تلخیاں۔ کتنے ہی دُکھ اور
درد کیوں نہ ہوں ——— زندگی موت سے بہتر ہوتی ہے۔ خوبصورت ہوتی
ہے۔ زندگی کی تلخیوں سے نجات پانے کے لئے آپ موت کی پناہ گاہ کیوں
ڈھونڈ رہے ہیں آپ ——— زندگی سے اتنے مایوس کیوں ہیں؟"

"میں سچ آپ مایوس نہیں ہوں مایوس کر دیا گیا ہوں۔" راجیش نے
کہا اور سگریٹ جلا کر تیز تیز کش لینے لگا ——— تب سریتا کے دل میں ایک
بات آئی ——— لیکن اُسے اپنے ہونٹوں تک لانے اور راجیش سے کہنے کی
ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ عجیب تذبذب میں تھی۔ وہ سوچتی رہی کہ کہے یا نہ



کہے ——— بالآخر راجیش کے ساتھ ہمدردی اور خلوص کے جذبے نے اُسے
کہنے پر مجبور کر دیا۔ وہ کہنے لگی ——— "راجیش بابو ——— آپ کب تک
یادوں کے ویران کھنڈروں میں بھٹکتے رہیں گے۔ ماضی مر چکا ہے۔
اُن دنوں کو ——— اُن ساعتوں کو یاد کرنے سے کیا فائدہ جو گزر چکے
ہیں اور کسی بھی قیمت پر واپس نہیں آسکتے ——— بھول جائیے شوبھا
کو ——— دفن کر دیجئے اُس سے وابستہ ساری یادوں کو ——— "

راجیش چونک پڑا ——— اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی برقی
تار اُس کے جسم سے چھو گیا ہو!

"آپ ——— آپ جانتی ہیں شوبھا کو ——— ؟"

"ہاں ——— میں آپ کی پچھلی زندگی سے، آپ کے ماضی سے
واقف ہوں ——— شوبھا کی بہن میری عزیز ترین سہیلی تھی۔" سریتا
اتنا کہہ کر چُپ ہو گئی۔

راجیش سوچتا رہا ——— اُس کا ذہن سوچوں کے سمندر میں
ڈوب گیا۔ یادوں کے کنول کھِلتے گئے۔ ماضی اپنے قدموں کے
نشان ڈھونڈتا اُس کی آنکھوں کے آگے آ گیا ——— دُھندلے دُھندلے

نقوش اُبھر کر بھرتے گئے پھر آپ ہی آپ اُن نقوش میں سے شوبھا کی تصویر اُبھر آئی ——— "شوبھا"!!

شوبھا ——— جو اپنے دل کی دھڑکن - بہار کا پہلا پھول - چاندنی کے نور میں تھرتھراتا شبنم کا پاکیزہ قطرہ - سماعت کی پہلی برسیں قرار پایا کرتا تھا ——— شہر کے ایک معزز جج کی بیٹی ——— جو کالج میں کسی کو بھی اپنی خاطر میں نہ لاتی تھی - اُس نے اُس کی طرف پیار اور دوستی کا ہاتھ بڑھا لیا ——— ملاقاتیں ہوتی گئیں - بڑھتی رہیں - وہ ایک دوسرے کے قریب آتے گئے - پھر دوستی پیار میں بدل گئی ——— دونوں اپنے اپنے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے محبت کے بے پناہ جذبات کو محسوس کرنے لگے - ایک دوسرے کو دیوانہ وار چاہنے لگے ———

- اپنے ہاتھوں خود کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ (قرآن مجید)
- کسی پر ظلم اور زیادتی نہ کرو۔ (قرآن مجید)
- معاہدہ خواہ مشرکوں سے ہو اُس کے پابند رہو۔ (قرآن مجید)
- علم کے ساتھ تھوڑا عمل بھی تیرے لئے مفید ہوگا۔ لیکن جہالت کے ساتھ زیادہ عمل بھی تجھے فائدہ نہ دے گا۔

(سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)

- سب سے محبت رکھو۔ آدھی عقل اسی میں ہے۔

(سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)

- سلطنت کفر سے نہیں ظلم سے جاتی ہے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)

جب راجیش نے بی۔ اے کا امتحان امتیازی درجہ سے پاس کیا تو اُس کے چند دن بعد اُس نے اپنی ماں کو جج صاحب کے گھر شوبھا کے ساتھ اپنے رشتہ کی بات طے کرنے کے لئے بھجوایا تھا اور سوچنے لگا تھا کہ ——— اگر جج صاحب اِس کی محبت کو دولت اور امارت کی کسوٹی پر پرکھ کر انکار کر دیں تو کیا ہوگا ———؟ وہ شوبھا کے بغیر کیسے زندہ رہ سکیگا ———؟ لیکن ایسا نہ ہوا۔ جج صاحب نے اِس کی اور اِس کی ماں کی توقعات کے خلاف رشتہ منظور کر لیا تھا۔ لیکن اُنہوں نے ایک شرط رکھی تھی۔ وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے راجیش کو امریکہ بھیجنا چاہتے تھے تاکہ وہ وہاں سے اچھی ڈگری لے کر لوٹ آنے کے بعد سوسائٹی میں عزت رُتبہ اور بلند مقام پا سکے اور اُسے ایک اچھا اور ممتاز عہدہ مل سکے۔

اعلیٰ تعلیم کے اخراجات، پاسپورٹ، روانگی کا سب انتظامات کا بوجھ انہوں نے اپنے ذمہ لے لی تھی۔ لیکن راجیش کی خودداری نے اسے گوارہ نہ کیا۔ اور وہ اپنا آبائی مکان فروخت کر کے اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ چلا گیا تھا ——— وطن سے دُور ——— شوبھا کی یادوں کو دل میں بسائے اپنے مقصد کی طرف بڑھتا گیا ——— اور ——— چار سال بعد جب وہ وطن واپس آیا تو یہاں اِس کا اپنا کوئی نہ تھا۔ شوبھا بھی اور اُس کی تمناؤں کا چمن لُٹ چکا تھا ——— اُمیدوں کا محل مسمار ہو گیا تھا آرزوؤں کی شمعیں بجھ گئیں تھیں ——— اُس کا دل ——— اُس کا دماغ ——— اُس کا سارا وجود یاس کی تاریک گہرائیوں میں ڈوب گیا اور مایوسیاں اُس کا مقدر بن گئیں۔

"راجیش بابو ——— "سریتا کی آواز پر وہ چونک پڑا۔ ماضی کی سوچوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

"کہاں ——— چلے گئے تھے آپ ———؟"

وہ نادم سا ہو گیا اور کہا ——— "میں ماضی کی یادوں اور اُس سے وابستہ یادوں میں کچھ اس طرح کھو گیا کہ مجھے آپ کی موجودگی کا احساس نہ ہو سکا ——— اور آپ مجھے اس طرح کھویا دیکھ کر نہ جانے میرے بارے میں کیا سوچتی رہی ہوں گی ———"

"میرے دل میں آپ کے لئے رحم اور ہمدردی کے جذبات آتے رہے اور میں سوچنے لگی "وہ شخص کتنا قابلِ رحم ہے جو مُردہ ماضی کو اپنے سینے سے لگائے اُس کا ماتم کر رہا ہو۔ "راجیش بابو ——— زندگی اتنی بے قیمت ——— اِتنی بے کیف نہیں ہوتی جیسا آپ سمجھ رہے ہیں۔ آپ کب تک جذبات اور احساسات کی آگ میں جلتے رہیں گے۔ کب تک بے چینیوں اور بے قراریوں کی بھٹی میں سُلگتے ہوئے سکون اور قرار کے لئے ترستے اور تڑپتے رہیں گے ——— پیار ——— شعلہ بھی ہے اور شبنم بھی! کانٹا بھی ہے اور پھول بھی! درد بھی ہے اور درد کا درماں بھی! زہر بھی ہے امرت بھی! ——— کوئی غم ——— کوئی درد ——— کوئی داغ ایسا نہیں جسے پیار نہ مٹا سکے ——— محبت کی وہ ساری آسائشیں ساری راحتیں ——— وہ ساری دلچسپیاں ——— سرور و شادمانی کی وہ ساری دولت جو لُٹ چکی ہے وہ آپ کو پھر مل سکتی ہے!"

اِتنا کہہ کر سریتا چُپ ہو گئی ———

سریتا کی باتوں نے راجیش کے دل میں ایک ہلچل سی پیدا کر دی۔
وہ چند لمحوں تک سوچتا رہا ——
پھر کہنے لگا —— "نہیں سریتا، اب میرے دل میں کبھی نئے بھی پیار کے جذبات نہیں جاگ سکیں گے۔ دل ٹوٹ چکا ہے۔ تمہارا سب کچھ جل چکا ہے۔ صرف راکھ کا ڈھیر ہے۔ کوئی تمنا نہیں۔ زندگی میں کوئی دلکشی اور خوبصورتی نہیں۔"

"چاند بھی تو راکھ کا ڈھیر ہے۔ لیکن اس میں سے ٹھنڈی ٹھنڈی پیار بھری چاندنی کا نور پھوٹتا ہے۔" سریتا نے کہا۔

راجیش تڑپ اُٹھا۔ کہنے لگا —— "حقیقت کو حقیقت ہی رہنے دیجئے۔ اُس پر شاعرانہ تخیل کا نقاب مت ڈالئے۔ میں مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں دفن کر دیا گیا ہوں۔ چاروں طرف تاریکی ہے۔ یاس اور نا اُمیدی کا اندھیرا ہے۔ اب چاندنی کا نور تو کیا روشنی کی ایک ہلکی سی کرن بھی نہیں پھوٹ سکتی —— " اتنا کہہ کر اُس نے سریتا کی طرف دیکھا۔ سریتا کی آنکھوں میں محبت کی بے شمار شمعیں فروزاں تھیں۔ پیار کا نور تھا۔ ان گنت ستاروں کی تابناکی تھی۔ وہ سہم گیا —— اُن نگاہوں کی تاب نہ لا سکا۔ چند لمحوں بعد پھر کہنے لگا —— "میں —— میں ایک ٹھکرایا ہوا انسان ہوں۔ صرف رحم اور ہمدردی کا مستحق ہوں۔ پیار کا نہیں، میں —— میں محبت کے قابل نہیں —— "

"لیکن میرے نزدیک رحم اور ہمدردی کے جذبوں کا دوسرا نام —— پیار —— اور —— محبت ہے۔" سریتا نے بھرائی آواز میں کہا اور اپنے دل میں ایک کسک اور آنکھوں میں آنسو لئے چلی گئی۔ وہ دیکھتا رہ گیا —— سوچتا رہ گیا۔

پورنماشی کی ایک رات تھی ——

سریتا اپنے آنگن میں کھڑی سدابہار کے پودوں کے درمیان اُداس اور تنہا کھڑے اُس ویران پودے کو دیکھ رہی تھی جو کبھی سُرخ سُرخ پھولوں سے لدا رہتا تھا اور اب خزاں کے باعث سوکھ گیا تھا۔ اُس کے پتے جھڑ چکے تھے۔ وہ بہت دیر تک اُس بے برگ و بار پودے کو دیکھتی رہی۔ سوچنے لگی ——

اِس پر پھر بہار آئے گی —— پھول کھلیں گے۔

بہار —— بہار!!

بہار —— دلوں میں بھی آتی ہے ——

اور —— اور راجیش کے دل میں بھی ایک دن بہار ضرور آئے گی۔ کسی کو چاہنے اور چاہے جانے کی تمنا ایک بار پھر ضرور پیدا ہوگی وہ سوچتی رہی۔

"سریتا —— " ایک ہلکی سی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔ گرم گرم سانسوں کا لمس اُسے اپنی گردن پر محسوس ہوا۔ ساتھ ہی اُس نے گھوم کر دیکھا ——

"راجیش بابو —— آپ! اتنی رات گئے؟"

"ہاں —— سریتا —— میں —— " راجیش نے کانپتی کپکپاتی آواز میں کہا اور اُس کے قریب آ گیا۔ اپنے دونوں ہاتھ اُس کے کندھوں پہ

- اپنی بھلائی چاہتے ہو تو کسی کی بُرائی نہ کرو۔ (شری کرشن جی)
- حقیقی راحت کے جویا ہو تو دل کو نیک خیالات کا نشیمن بناؤ۔ (مہاتما بدھ)
- تم خود ہمت سے کام لو، بُدھ تو صرف اچھی راہ دکھاتا ہے۔ (مہاتما بدھ)
- ہر نیکی کا پھل ضرور ملتا ہے۔ (گیتا)
- ہر طرف اُس کے جلوے بکھرے ہوئے ہیں، تمہاری آنکھیں ہی بصیرت سے محروم ہیں۔ (حضرت بابا نانک)
- بغیر محنت کے بغیر تکلیف اُٹھائے کوئی قوم آگے نہیں بڑھ سکتی (جواہر لال نہرو)

رکھ کر کہنے لگا —— "تنہائی کا درد —— شوبھا کی یادوں کا زہر میرے دل میں —— میرے دماغ میں۔ میرے سارے جسم میں۔ رگ رگ میں سما گیا ہے۔ رات کی اُداس تنہائیوں میں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے زہریلے خوفناک سانپ میرے دل کو ڈس رہے ہوں —— میں —— میں سکون کو تڑپ رہا ہوں۔ قرار کو ترس رہا ہوں —— یہ آتار پیاروں کے تانے بانے —— اِن میں اب لذت نہیں —— درد ہے! سریتا! مجھے سکون دو —— پیار دو —— مجھے پیار کے نام پر فریب ملا —— زہر ملا —— تم —— تم نے کہا تھا نا —— پیار زہر بھی ہے اور امرت بھی —— امرت کی دو بوند میرے ہونٹوں پر ٹپکا دو —— "
اُس نے سریتا کے ہاتھ کو چوم لیا —— سریتا کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

چند لمحوں کے لئے جیسے وقت رُک گیا ——— کائنات تھم گئی .....

پھر - اچانک طلسم ٹوٹ گیا ——— سریتا کی آنکھیں کھل گئیں۔

میرے خدا ——— ! وہ سوچنے لگی ——— کاش! یہ سپنا کاش ہو جاتے!

حقیقت ہی جاتے ——— کاش ——— ! اے کاش !!

دوسرے دن - صبح - سریتا اپنے دل میں رات کے سپنے کا خمار اور سرور لئے کالج جانے کے لئے اپنے ڈائننگ روم سے نکلنا ہی چاہتی تھی کہ اچانک پروفیسر کھنہ اور پرنسپل آ گئے۔ اِس سے پہلے کہ سریتا کچھ بولے، کچھ پوچھے ——— پروفیسر کھنہ نے بغیر کسی تمہید کے کہا ———

"مس سریتا! رات مسٹر راجیش کو دل کا شدید دورہ پڑا تھا ——— اُنھیں ہسپتال میں داخل کر دیا گیا اور آج ——— صبح ——— وہ ——— ہمیشہ کے لئے ہم سب کو چھوڑ کر چلے گئے!

"نہیں ——— !!" سریتا نے ہلکی چیخ کے ساتھ کہا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُن دونوں کو دیکھنے لگی ———

پھر ... چند لمحوں بعد پرنسپل اس کے قریب آئے اور کہنے لگے ——— "مسٹر کھنہ کہہ رہے تھے راجیش آپ کے ہم وطن تھے۔ اگر آپ کو اُن کے کسی عزیز یا رشتہ دار کا پتہ معلوم ہو تو بتا دیجئے تاکہ اُنھیں ٹرنک کال کر کے بلا سکیں۔

سریتا نے شعلہ بار نظروں سے پرنسپل کی طرف دیکھا اور کہا "اُن کا اِس دنیا میں کوئی نہیں سوائے ——— " اتنا کہہ کر وہ رُک گئی ——— اور سوچنے لگی ——— کیا وہ کہہ دے کہ سوائے شوبھا کے، جو آپ کی بہو ہے۔ جس نے اُنھیں پیار کے نام پر فریب دیا ——— دھوکہ دیا۔ درد دیا اور ——— موت کی آغوش میں سُلا دیا!

وہ سوچتی رہی ——— سوچتی رہی ———

آخر اُس نے کہہ دیا ——— "اِن کا کوئی دوست نہیں ——— کوئی عزیز یا رشتہ دار نہیں ——— اُن کی تنہائی اور اُس درد کے بوجھ نے اُن کی جان لے لی۔ وہ یہ کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئی اور بستر پر گر کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی!

خط و کتابت کرنے اور منی آرڈر بھیجنے کے لئے پتہ رسالے میں صفحہ ۲ پر لکھا ہوا ہے

غزل

مسرور حیات ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی

آشیاں اپنا سرِ طور بنائیں کیسے
حادثہ حضرتِ موسیٰ کا بھلائیں کیسے

جب کوئی شمع در و بام سجا دیتی ہے
لوگ یہ سوچتے ہیں اس کو بجھائیں کیسے

دل تڑپتا ہے تو زخموں کو ہوا ملتی ہے
ہم ترے ہجر کا احساس مٹائیں کیسے

ایک سادہ سی نظر نے ہمیں برباد کیا
کسی کافر سے نگاہوں کو ملائیں کیسے

چین لینے نہیں دیتے ہیں غزالوں کے تیور
ہم گلستاں میں کوئی جشن منائیں کیسے

کوئی پامال نہ ہو رقص و سرودِ حیات
آج دنیا کو عمل اپنا سکھائیں کیسے

غزل

مسز مبارکہ رحیم

چاہیں بھی تو کچھ اُن کو بتایا نہیں جاتا
غم دل میں ہے اتنا کہ چھپایا نہیں جاتا

الفاظ میں آتی ہے کہاں کیفیتِ دل
محسوس جو ہوتا ہے بتایا نہیں جاتا

وہ دل میں بسے ہیں مگر اُف رے یہ شرم
جب ہم کو بلاتے ہیں تو جایا نہیں جاتا

وہ کیسی کہانی تھی کہ مدہوش ہوئے ہم
اب سن کے اُسے ہم سے بھلایا نہیں جاتا

کس دل سے پشیمان انہیں دیکھ سکیں گے
یوں حالِ دلِ زار سنایا نہیں جاتا

ہر لمحہ نگاہوں کو تلاش اُن کی رہی تھی
وہ آئے تو پلکوں کو اُٹھایا نہیں جاتا

غزل

عبدالقدوس ناطق

میکشی کے واسطے کیا چاہئے
چشمِ ساقی کا اشارا چاہئے

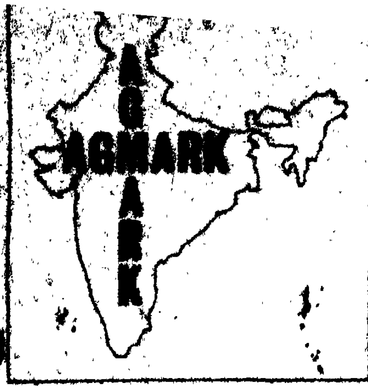
رنج و راحت کے لئے کیا چاہئے
عشق میرا حسن تیرا چاہئے

دشت کی تنگی سے دل گھبرا گیا
گھر کو اب صحرا بنانا چاہئے

کور آنکھیں ہوں تو کیا دیکھیں اُسے
دیکھنے کو چشمِ بینا چاہئے

دل میں پالا دل میں رکھا لیجئے
احترام و ادب کیا چاہئے

نطق دیکر تو نے سب کچھ دیدیا
اور ناطق کو بھلا کیا چاہئے



خالص اشیائے خوردنی
کے لئے
ایگمارک کی مہر دیکھئے

گھی، مکھن، تیل، پسے ہوئے مسالے، گندم کا آٹا،
شہد، انڈے اور روزمرہ کے استعمال کی دوسری
بکنے والی اشیاء پر ایگمارک کی مہر کا مطلب
یہ ہے کہ ان میں ملاوٹ نہیں ہے۔

خالص اشیائے خوردنی استعمال کریں۔
ایگمارک کی مہر والی اشیاء خریدیں۔

davp 32/98

ایڈیٹر کے نام لَو لیٹرز

فِکر تونسوی

ہندوستان دیش دردی گزشتہ پندرہ برس سے عوام کی بالوث اور بے لوث
دونوں قسم کی خدمت کر رہا ہے۔ یہ خدمات سے متاثر ہو کر عوام اکثر و بیشتر ایڈیٹر کو اپنے لَو لیٹرز
بھیجتے رہتے ہیں۔ ان لَو لیٹرز میں ایڈیٹر کے لئے تفریحِ طبع کا سامان زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے
قارئین کی تفریحِ طبع کے لئے ان میں سے چند خطوط پیش کر رہا ہوں۔ ایڈیٹر سے رسمی اجازت
بھی نہیں لی گئی کیونکہ وہ عوام اور لَو۔۔۔ دونوں کے بارے میں بڑا سینسیٹو Sencitiv ہے۔

گالیاں دے کے۔۔۔۔

اے او ایڈیٹر کے تخم!

میرے خیال میں تُو گیدڑ کی اولاد ہے! میں ہر روز تیرا اخبار پڑھ کر اس پر تھوکتا ہوں اور پھر میونسپلٹی کے اُس کوڑے دان میں پھینک دیتا ہوں، جس میں لوگ گلے سڑے گندے چھلکے اور کنواری ماؤں کے مُردہ بچے پھینکتے ہیں۔ کل تمہاری ماں چوراہے پر دو ہتڑ مار مار کر سیاپا کر رہی تھی ۔۔۔۔ ’ہائے رے لوگو! مجھ ابھاگن نے ایسے ناہنجار بیٹے کو کیوں جنم دے دیا جو اخبار کو طوائف سمجھ کر چکلے میں چلاتا ہے۔ کاش! چکلے کو جنم دینے کی بجائے میری کوکھ بانجھ ہو جاتی!‘

اور سُن! یہ میرا چودھواں خط ہے! اگر مجھے اِس کا بھی جواب نہ ملا تو میں سمجھوں گا تیرا سینہ انسانیت کا قبرستان ہے۔ رذالت تجھے اپنے باپ کے ورثے میں ملی ہے۔ اپنے باپ کو مزید گالیوں سے بچانا چاہتے ہو تو جواب دے دو۔ ورنہ پندرھویں خط کا انتظار کرو! سمجھے، سِیان، ٹپمیں!

تمہارا:۔
(میرا نام گزشتہ خطوط میں سے دیکھ لو)

تعریف اُس خدا کی۔۔۔۔

مُحترم و مُعزّز و مُوقّر ایڈیٹر دیش دردی صاحب!

آپ کے مُحترم و مُعزّز و مُوقّر اخبار کے ”ہولی نمبر“ کا اعلان پڑھ کر ہمارا سارا شہر پھولا نہیں سمایا۔ کیونکہ اسی اعلان پر بھروسہ کر کے ہمارا شہر ہولی مناتا ہے۔ اگر آپ یہ اعلان نہ کرتے تو ہولی کا سارا مزہ کِرکِرا ہو جاتا۔ اہلِ ذوق کی متفقہ رائے ہے کہ ہولی کی شان صرف آپ کے اخبار ہی کے دَم سے قائم ہے!

جیسا کہ آپ گزشتہ کئی برسوں سے دیکھتے آ رہے ہوں گے، میں صرف تہواروں ہی پر اپنی نظمیں آپ کو بھیجتی رہی ہوں۔ لوہڑی، دیوالی، دسہرہ یہاں تک کہ پندرہ اگست کو بھی ایک موسمی تہوار سمجھ کر نظم لکھ دیتی ہوں۔ کیونکہ تہواروں پر لکھنا میری ہابی ہے۔ گزشتہ پندرہ اگست پر میں نے جو نظم ”چودہ اگست کی رات“ آپ کو ارسال کی تھی۔ یاد دہانی کے لئے اُس کی نقل پھر بھیج رہی ہوں۔ یاد رہے کہ آپ نے یہ نظم نہیں چھاپی تھی۔ بلکہ صرف میرا فوٹو چھاپ دیا تھا اور لکھا تھا کہ ہم اپنے اخبار میں صرف حسین چیزیں چھاپتے ہیں ۔۔۔۔ میں آپ کے حُسنِ نظر کی داد دیتی ہوں اور اِس بار فوٹو کے ساتھ ہولی پر نظم بھی بھیج رہی ہوں۔ مقابلہ کڑا ہے، دیکھیں آپ کی

نگاہِ انتخاب کس پر پڑتی ہے!
میں اور میری سہیلیاں نظم چھپنے کی منتظر ہیں۔
آپ کی
زینت آراستہ جہاں

تیری شان جلِّ جلالہ ۔۔۔۔۔

جناب ایڈیٹر صاحب "آف ڈیلی درویش"
تحفۂ درویشاں سے چھپنے والا!
میں ہر روز آپ کا اخبار باقاعدگی سے خیرو حلوائی کی دکان پر پڑھتا ہوں۔ بلکہ کئی بار آپ کے ایڈیٹوریل مضامین چوری چھپے

- انسان باہم ایسے ہیں جیسے کنگھی کے دانے۔
(سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- جس کام میں نیک نیتی نہیں وہ کام ہی نہیں۔
(حضرت ابوبکر صدیقؓ)
- عقلمند کی پہچان کم گوئی ہے۔
(حضرت ابوبکر صدیقؓ)
- کسی کی دینداری پر اعتماد نہ کر جب تک طمع کے موقع پر اُسے آزما نہ لے۔
(حضرت عمر فاروقؓ)
- دوسروں سے محاسبے سے پہلے اپنے نفس سے حساب کر لو۔
(حضرت عمر فاروقؓ)

چرا کر گھر بھی لے جاتا ہوں اور اپنی بیوی بچوں کو سناتا ہوں۔ وہ انھیں کتھا پاٹھ کی طرح بہت عقیدت سے سنتے ہیں۔

میرا اندازہ ہے (اور میرا اندازہ کبھی بدنصیبی ہی سے غلط ہوتا ہے) کہ آپ کو دیش بدیش کے متعلق کافی معلومات حاصل ہیں۔ براہِ کرم اپنے بیش قیمت لمحات میں سے تھوڑا سا وقت نکال کر مجھے مندرجہ ذیل معلومات بہم پہنچانے کا کشٹ کریں۔

۱۔ آپ کے اخبار میں ڈینٹل کریم کا اشتہار چھپا ہے۔ کیا آپ نے اُس کا استعمال کیا ہے؟ کیا وہ کریم عمدہ ہے؟ اگر عمدہ ہے تو آپ اُس میں کتنے فیصدی رعایت دلوا سکتے ہیں؟ تھوک اور پرچون دونوں میں۔

۲۔ آپ نے پرسوں ایک مضمون میں لکھا تھا کہ [illegible] ہاتھیوں کو باہر نکال دیا ہے اور وہ ہاتھی شہروں کی [illegible] کھاتے پھرتے ہیں ۔۔۔ یہ ہاتھی کس شہر میں [illegible] ہیں؟ اس شہر کا نام لکھئے۔ میں ان میں سے ایک ہاتھی کو اپنے گھر لانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ مجھے ہاتھی پالنے کا بڑا شوق ہے۔

۳۔ رشوت لینے کی میری سادہ تکنیک کیا ہوتی ہے، آپ کو معلوم ہی ہوگی۔ میں ایک غریب کلرک ہوں۔ مہنگائی نے کمر توڑ دی ہے۔ [illegible] کہ عزت سے زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔

۴۔ آپ کے احباب کا حلقہ بہت وسیع ہوگا۔ یقیناً ہر مذہب [illegible] شامل ہوگا۔ کیا آپ اپنے حلقے میں سے کوئی شادی کے قابل لڑکا تلاش کر سکتے ہیں؟ لڑکا آپ کی طرح انسانیت پرست ہونا چاہئے۔ دراصل میری ایک کنواری لڑکی (عمر اٹھائیس سال) کے لئے [illegible] سال سے [illegible] کی ضرورت ہے۔ لڑکی ہر لحاظ سے [illegible] ہے صرف ایک آنکھ قدرے پتھر کی ہے۔ اس لئے میں انسان دوست لڑکا چاہتا ہوں۔ کیونکہ انسان دوست حضرات صرف خوبی دیکھتے ہیں، عیب نہیں! اور پھر بے عیب ذات تو صرف خدا کی ہے!

خاص نوٹ:۔ جب تک ہاتھ لگا کر محسوس نہ کیا جائے وہ آنکھ دوسرے پتھر کی بالکل نہیں معلوم ہوتی۔

میرے خط میں کوئی گستاخانہ فقرہ آگیا ہو تو معاف کر دیجئے۔
آپ اپنے بلند کیریکٹر کی طرف دیکھئے، میری طرف نہیں۔

آپ کا غلام ابنِ غلام
ج۔ ناتھ

یارب، وہ نہ سمجھے ہیں ۔۔۔۔۔

ایڈیٹر جی!
یہ آپ نے کیا غضب کیا۔ میں نے کل چوک بجر چھوبنساں میں جو تقریر کی تھی، وہ تو عوام کے مفاد میں تھی۔ لیکن آپ نے اُسے ایسا توڑ مروڑ کر شائع کیا کہ وہ عوام کے لئے ضرر رساں ہو گئی۔ میں نے یہ کبھی نہیں کہا تھا کہ میں اِس چوک کا مجرا خانہ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت بند کروا دوں گا۔ میں ایک ذمہ دار انسان یعنی ایم۔ایل۔اے ہوں۔

کوئی خط یا سلپ نہیں ہوں کہ جسے چاہیں ہنگر ردی میں چھپا ہوں
پڑا رہوں ——— میں نے تو صرف یہ کہا تھا اگر یہ گنگا بند ہو جائے
یا کھلا رہے، تو بھی دیش کی ترقی جاری رہے گی ——— مجھے سے
تو ویسٹس آف انڈیا ایکٹ بھی اس ترقی کو نہیں روک سکتا۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ کتنا بین فرق ہے دونوں میں۔ میری حقیقی تقریر میں پوری جمہوری سپرٹ قائم تھی۔ لیکن توڑ مروڑ کر چھپنے سے عوام میں میرا اسارا ایمج (image) برباد ہو گیا۔ مطلب یہ کہ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہا۔ بالخصوص جوئے خانے کے مالک مسٹری بھلے شاہ جی نے اس کا بہت برا اثر لیا ہے اور میں سمجھتا ہوں مالک کے برا ماننے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ میرے ووٹروں کو حق ہے کہ وہ کسی بھی بات پر برا مانیں۔ جوئے خانے برے نہیں ہوتے۔ صرف ان کے پیچھے جو نیت ہوتی ہے وہ بری ہوتی ہے اور پھر جوئے خانے جبر و استبداد سے نہیں، تہذیب اور شرافت سے بند ہونے چاہئیں۔ آپ سمجھ گئے میرا یہ جمہوری نکتہ؟

براہ کرم اس کی تردید شائع کر کے میرے مجروح ووٹروں پر پھایا رکھ دیجئے۔ میں جانتا ہوں یہ حماقت آپ کی نہیں ہو سکتی۔ آپ کے کسی رپورٹر کی ہے۔ نہ جانے اُسے مجھ سے کیا بغض ہے؟

گزارش:۔ کسی دن غریب خانے کا ڈنر قبول فرما کر تشریف لایئے تا اپنے اُس رپورٹر کو بھی ساتھ لایئے گا۔ میرے پاس سکم سے شاہی رم کا سٹاک آیا ہوا ہے۔

پچیس سالہ عوامی خدمتگار

رام رام بھروسے

جگ جگ جیو میرے ...۔

قابلِ عزت ایڈیٹر صاحب بہادر!

خدا آپ کو مرنے سے پہلے اور مرنے کے بعد دونوں جگہ جنت نصیب کرے۔ کیونکہ ہم نے آپ کے مقبول عوام و خواص اخبار میں خداوند تعالیٰ کے بھروسے پر اپنی فرم کی تیار کردہ دوائی "مردانہ قوت" کا اشتہار دیا تھا۔ اُس کا آپ کے قارئین نے ایسا شاندار استقبال کیا کہ پہلے ہی مہینے میں ہمیں دو ہزار روپے کے آرڈر موصول ہو گئے! نہ جانے آگے آگے کیا ہو گا؟ ——— یہ کامیابی "مردانہ قوت" کی نہیں ہے، آپ کے اخبار کی ہے!

اِس کامیابی سے مسرور ہو کر ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ اشتہار کے لئے دگنی جگہ مخصوص کر دی جائے تاکہ آپ کو اور ہمیں، دونوں کو عوام کی نوازشوں سے فائدہ ہو ——— اِس کے علاوہ فرم کی طرف سے آپ کو ایک شایانِ شان عشائیہ دیا جائے۔ تحریر فرمایئے کہ آپ کس دن اور کس وقت عشائیے کی شان میں اضافہ کر سکتے ہیں؟

ایک پیکٹ "مردانہ قوت" بطور تحفۂ درویش علیحدہ ڈاک سے اِرسال کیا جا رہا ہے۔ نتائج سے آگاہ کیجئے اور اُس کے

- میں اُن سے حسد نہیں کرتا، جو مجھ سے زیادہ علم رکھتے ہیں، لیکن اُن پر رحم آتا ہے جن کے پاس مجھ سے کم علم ہے۔ (ٹامس براون)
- ہر اچھا کام پہلے ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ (کارلائل)
- ایک دُور اندیش انسان آنے والے حالات کا پہلے ہی سے جائزہ لے لیتا ہے۔ (کارلائل)
- کوئی موقع چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا۔ چھوٹے موقعے کا صحیح استعمال اُسے بڑا بنا دیتا ہے اور بڑے موقعے کا غلط استعمال اُسے چھوٹا بنا دیتا ہے۔ (ڈاکٹر مارڈن)

بعد ایک سرٹیفکیٹ سے ممنون فرمایئے۔

آپ کا احسان شناس:۔
حکیم اللہ رکھا حاذق

ڈھونڈ اب مجھ کو ...۔

ایڈیٹر "دلیش دروہی" (کتنا واہیات نام ہے) جی!

میں آپ کے اخبار کو معیاری سمجھ کر اپنی تخلیقات اِرسال کرتا رہا۔ لیکن یہ میری جہالت تھی۔ کیونکہ میری تخلیقات معیاری تھیں، آپ کا اخبار نہیں۔ (اِس غلطی کی تصحیح کر لیجئے۔ میں نے کر لی ہے)
پہلے میں نے کہانیاں بھیجیں۔ ہر کہانی آپ نے ایک چھپی ہوئی

سلیپ چھپوا کے لوٹا دی تھیں کہ بوجوہ ہم اسے شائع کرنے سے قاصر ہیں — تو میں سمجھ گیا کہ کہانیاں گہری اور سبالک تھیں۔ اس لئے آپ کی سمجھ میں نہ آئی ہوں گی۔ اس لئے میں نے سیدھی سادی نظمیں بھیجیں۔ لیکن آپ نے ان کی تقدیر میں وہی منحوس سلپ الفادی بھر لیا ہے —؟ پھوں اِنشائیے .. بچاں اِدھلے ... کر کرو!

لیکن آپ کے پاس صرف وہی سلپیں تھیں، معیار نہ تھا۔ اس کے باوجود آپ کی متوجہ بوجوہ کا ریوڈن مجھ میں زندہ رہا اور میں ابھی اپنا بیش قیمت ناول بھیجنا چاہتا تھا کہ گزشتہ ہفتے کے "دیش دروہی" میں کسی زخمی ناظر آبادی کی نظم "گاتے کا گوبر شاعر اور گلے" دونوں کی شاندار بشانہ تصویر کے ساتھ شائع ہوئی تو میری آنکھ کھل گئی۔ کہ اوہو! اِن کا معیار تو گوبر سے آگے نہیں بڑھ پایا! اور شکر ہے پاک پروردگار کا کہ میں آپ کے اخبار میں چھپنے سے بال بال بچ گیا!

یہ خط صرف اپنی پوزیشن واضح کرنے کے لئے تحریر کر دیا ہے۔ ورنہ یہ میرا آخری خط ہے۔ میری طرف سے کسی مزید خط یا تخلیق کی توقع نہ کریں۔ بلکہ ؎

ڈھونڈ اب مجھ کو چراغِ رُخِ زیبا لے کر!

آپ کا معیاری دُشمن

پٹاخہ انگاروی

مُفت ہوئے بدنام .....

دفتر ڈدر بھاگیہ سنگھ صاحب، چیف منسٹر ڈورلبھ سٹیٹ

مسٹر ایڈیٹر!

ہمارے آنریبل چیف منسٹر نے مجھے ہدایت کی ہے کہ میں آپ کو یہ ارجنٹ لیٹر لکھ دوں۔ کیونکہ وہ بواسیر کی نئی ایجاد کردہ دوائی کے اُدگھاٹن کے لئے ایک ہل اسٹیشن پر تشریف لے گئے ہیں اور ایک ہفتہ تک اس سرکاری اُدگھاٹن میں مصروف رہیں گے۔

آپ کے اخبار میں ایک کہانی شائع ہوئی ہے جس کے ہیرو کا حُلیہ اور حرکات و سکنات یہاں تک کہ کھانسی تک چیف منسٹر شری ڈُربھاگیہ سنگھ جی سے ملتی ہے۔ کہانی میں ایک ہیرو بھی سانس لیتی ہے۔ لیکن صرف کہانی میں سانس لیتی ہے چیف منسٹر صاحب کی زندگی میں پہلوں تک اس کا کوئی وجود نہیں ہے اس لحاظ سے یہ دل آزار قسم کا ہے۔ اس سلسلے میں چیف منسٹر صاحب کو جو شکایت ہے، یہ کہانی پڑھ کر سٹیٹ کے عوام چیف منسٹر صاحب سے بہت مشتعل ہو گئے ہیں اور چیف منسٹر صاحب عوام کے ہاتھوں مطعون ہو رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آپ کو اپوزیشن پارٹی نے خرید لیا ہے اور یا پھر مسٹر ایڈیٹر! آپ انھیں بلیک میل کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ بھی آپ کو خرید لیں ——— بہرکیف دونوں میں سے جو پوزیشن نیچرل ہو آنریبل چیف منسٹر کو آگاہ کریں تاکہ آپ کے حق میں یا خلاف مناسب جمہوری کارروائی کی جا سکے۔

نوٹ :- آنریبل چیف منسٹر آپ کا اخبار نہیں پڑھتے۔ کوئی بھی اخبار نہیں پڑھتے۔ کیونکہ انھیں عوام کی خدمت سے فرصت نہیں ملتی۔ لیکن بدقسمتی سے آپ کا اخبار عوام پڑھتے ہیں۔ اس لئے وہ عوام کے اشتعال کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

دُوسرا نوٹ :- کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ آپ اُس کہانی

کی تردید شائع کریں۔ تاکہ آپ آنریبل چیف منسٹر کو اور عوام کو
[illegible]

آپ کا
بھگوڑا پرنسپل اسسٹنٹ

[illegible]

ایڈیٹر و پبلشر و پرنٹر صاحب "دیش درد" ...
[illegible] میں نے آپ کے اخبار میں اشتہار چھپوایا تھا کہ
میری آدھی بھوری اور آدھی کالی بھینس چوری ہو گئی ہے۔ (اشتہار کا
بل ادا کر چکا ہوں) آپ ہمیشہ لکھتے ہیں کہ "دیش درد" میں اشتہار
دے کر فائدہ اٹھائیں۔ مگر مجھے تو فائدہ کی بجائے نقصان ہوا۔
بھینس تو ملی نہیں۔ اُلٹے میرا خاندانی گدھا بھی رسّہ تڑا کر کہیں
بھاگ گیا۔

میں سمجھتا رہا یہ اخبار کا نہیں، میری تقدیر کا قصور ہے لیکن
کل میرے خالہ زاد بھائی نے انکشاف کیا کہ "دیش درد" تو ایک
فراڈ اخبار ہے۔ اس میں بال کالا کرنے والے تیل کا ایک اشتہار
چھپتا ہے، جس میں ایک ڈپٹی منسٹر کا تعریفی سرٹیفکیٹ بھی شامل
ہوتا ہے۔ تیل منگوانے پر بال کالے تو کیا ہوتے، سر کے بچے کھچے
بال بھی جھڑ گئے ——! اسی طرح ہماری گوجر برادری کے ایک اور
بھائی نے بتایا کہ ہم ایک اشتہار "کنیا کے لئے ور کی ضرورت ہے!"
پڑھ کر جب کنیا سے ملے تو معلوم ہوا وہ بھینگی ہے!"

اب ہماری برادری کی جنرل باڈی میٹنگ نے فیصلہ کیا ہے
کہ جب تک آپ میری بھینس والے اشتہار کی رقم پینتالیس روپے
ساٹھ پیسے نہیں لوٹائیں گے، ہم اخبار کا بائیکاٹ کر دیں گے۔
اطلاعاً عرض ہے کہ ہماری برادری معمولی چیز نہیں ہے۔ وہ گذشتہ
تین نسلوں ہی سے آپ کا اخبار پڑھتی چلی آ رہی ہے!

افسوس، اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ آپ کا اخبار بھینسیں بھی نہیں
پڑھتیں تو ہم تین نسلوں تک گمراہ نہ رہتے! شکر ہے کہ ہماری گم شدہ
بھینس نے ہمیں راہِ راست دکھا دیا۔

آپ کا
گھاسی رام جنتا ملک ڈیری

توہین! توہین! توہین! ——

[illegible] صاحب
بحوالہ کہ میرے مؤکل سیٹھ دولت رام مفلوک کے متعلق
آپ نے ایک غیر حلفی کی ہے جو بطور انکشاف ذیل ہے! آپ نے
جو لکھا ہے کہ انہیں سرکاری اعزاز "چاپلوس ستارہ" سے نوازا
گیا ہے، جبکہ وہ اتنا غیر مہذب ہے کہ تمباکو والا پان کھاتا ہے اور
جگہ جگہ تھوکتا پھرتا ہے۔

ہاں ہماری تہذیب کا حق رنگ ۔۔ ہے کا مفلسی ۔۔۔
میں تمباکو کھانے کی بھی ممانعت نہیں ہے —— اس کے علاوہ
آپ نے مفلوک صاحب کی شاعری کا بھی مضحکہ اڑایا ہے کہ ان کے
اس بیوپاری کے شعروں سے ہلدی کی باس آتی ہے۔ ان دونوں
الزامات سے میرے معزز مؤکل کی ادبی اور تجارتی ساکھ کو
سوشل مرتبے کو بھی سخت ٹھیس پہنچی ہے اور عوام میں ان کی جائز
مقبولیت ناجائز سی ہو گئی ہے۔

میرے مؤکل (معزز مؤکل) نے مجھے ہدایت کی ہے کہ یا تو
آپ اپنے اخبار میں پورے صفحے پر دست بستہ معذرت شائع کریں
ورنہ آپ کے خلاف ازالہ حیثیت عرفی کا کیس تیار کیا جائے۔ معذرت
میں سیٹھ صاحب کا فوٹو بھی شائع کیا جائے۔ جس میں آپ اپنے فوٹو
میں دست بستہ معافی مانگتے ہوئے نظر آئیں۔

معذرت چھپنے کے لئے آپ کو پندرہ دن کی مہلت دی
جاتی ہے اور اگر ان پندرہ دنوں میں میرے مؤکل کے دل پر
توہین کا شدید دورہ پڑ گیا تو اس کے میڈیکل ہرجے خرچے کی
ذمہ داری بھی آپ پر ہوگی!

آپ کا
بانکے لال نٹ، ایڈووکیٹ (لائسنس یافتہ)


ڈیٹ ٹکیہ
صابنوں کے مقابلے
زیادہ کپڑے
دھوتا ہے
پانی میٹھا ہو یا کھارا
صابنوں کی بہ نسبت
ایک اور اعلیٰ درجہ کی ڈیٹ مصنوعات : نیا تین طرفہ عمل والا ڈیٹ پاؤڈر
نہایت محفوظ ہے۔

شعلہ و شبنم

اظہار عثمانی بی۔ اے

194-G سری [illegible] پوری، نئی دہلی نمبر ۲۲

مکرمی خوشتر بھائی! تسلیم

ایک کہانی حاضر خدمت ہے۔ اُمید ہے پسند آئیگی۔ کہانی بیسویں صدی کے معیار کو ذہن میں رکھتے ہوئے خاص طور سے "بیسویں صدی" کے لئے لکھی ہے۔ میں اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب رہا ہوں یہ آپکی باریک بین نگاہ ہی بتائے گی ....

احقر ——— اظہار عثمانی

★

"کیا تھوڑا سا پانی دیں گے؟"

ایک [illegible] نے مجھے چونکا دیا۔

"پانی....؟" میں نے اپنے تھرمس کی طرف دیکھا۔

"جی ہاں....!" لڑکی نے بہت اعتماد سے کہا۔

"جی... جی نہیں....!" میں بہت مشکل سے کہہ پایا۔

لڑکی کے ہونٹ کچھ کہنے کے لئے پھڑ پھڑائے۔ لیکن اُس نے خاموشی سے دوسری طرف منہ پھیر لیا ——— میں اُس کے غصّہ اور حقارت کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ میرے انکار نے اُس کی انا کو زبردست ٹھیس پہونچائی

ایک خوبصورت لڑکی سے پانی کے لئے انکار ——— دوسرے [illegible] عجیب سی بات تھی۔

[illegible] ——— اس میں سے پلا دیجئے ——؟"

[illegible] ——"

[illegible] تھرمس لڑکی کی طرف بڑھا دیئے گئے۔

"جی نہیں! شکریہ ——" لڑکی نے پانی پینے ہی سے انکار کر دیا۔

[illegible] غصّہ کا ردِ عمل تھا۔

"توبہ توبہ ——— کیا زمانہ آگیا ——!"

"دو گھونٹ پانی بھی نہیں پلا سکتے ——!"

"پانی بھی اتنی بڑی چیز ہے؟"

"ہمدردی تو اب دُنیا میں رہی ہی نہیں ——!"

میں آنکھیں بند کئے سب سن رہا تھا۔ سارے مسافر مجھے گھور رہے تھے۔ جیسے میں نے کوئی بہت بڑا جرم کر دیا ہو!

میں نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے مسافر سے کہا:

"میرے تھرمس میں پانی نہیں ہے!"

"کیا امرت ہے؟" اُس نے بے حد طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"اس میں بیئر ہے!" میں نے [illegible] سچ کہہ دیا۔

لوگوں نے میری بات سُنی اور مسکرا دیئے۔ انہیں [illegible] بات کا یقین نہ آیا تھا۔

میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ اُسی طرح کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا ——— میں بھی کتنا بدنصیب ہوں۔ زندگی میں پہلی بار ایک خوبصورت لڑکی نے مجھ سے پانی مانگا اور میں پانی نہ دے سکا [illegible]

افسانوی واقعات میرے ذہن میں گھوم گئے۔ کتنی ہی افسانوی لڑکیاں میرے ذہن کی سطح پر تصویروں کی طرح اُبھرنے لگیں۔ لیکن یہ لڑکی جو میرے سامنے بیٹھی ہے —— جس نے مجھ سے پانی مانگا تھا —— افسانوی کرداروں سے کہیں زیادہ حسین تھی —— دراز قامت متناسب اعضاء —— ہلکی نارنجی رنگ کی ساڑھی میں لپٹا ہوا گداز اور گورا بدن —— سلیقے سے سنوارے ہوئے بال —— کتابی چہرہ —— اور غزالی آنکھیں۔ میں نے زندگی میں اتنی خوبصورت آنکھیں نہیں دیکھی تھیں —— بڑی بڑی ٹھہری آنکھیں، وہ سر سے پا تک ایک نشہ تھی —— مجسم نشہ —— یا خیام کی ایک رُباعی جو انسانی پیکر میں ڈھل گئی تھی! —— میرے تھرمس میں پانی ہوتا تو —— تو وہ پانی پی کر یقیناً میرا شکریہ ادا کرتی اور اس طرح بات چیت کا سلسلہ شروع ہوتا —— اور یہ سفر —— میری زندگی کا یادگار اور حسین ترین سفر بن جاتا۔ اور یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ یہ ملاقات میری ساری زندگی کی محرومی اور پیاس بجھا دیتی۔

لیکن شاید کسی لڑکی کا قُرب میری قسمت میں نہیں! میں شاید ساری زندگی پیاسا ہی رہوں گا!

میں سوچا کرتا تھا —— کاش! کبھی کوئی حسین حادثہ میرے ساتھ بھی ہو —— کہیں ٹرین میں —— بس میں، کسی بازار، یا ریسٹورنٹ میں، کسی پارک میں، کہیں کوئی خوبصورت سی لڑکی مجھے بھی ملے —— مجھ سے بھی ٹکرائے اور پھر —— میں بھی اپنے دوستوں میں بیٹھ کر اپنی محبت کی داستان فخریہ انداز میں بیان کروں —— لیکن یہ سب کچھ صرف فلموں اور ناولوں تک ہی محدود ہے۔ عام زندگی میں یہ ممکن ہی نہیں اور اسی لئے میں نے اپنے دوست چرنجیت کی داستانِ محبت کو مذاق میں اُڑا دیا تھا۔ اور چرنجیت نے غصے سے کہا تھا۔

”تم میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے؟“

میں ہنسنے لگا ——

”یقین کرو —— وہ مجھے ڈل جھیل کے کنارے ملی تھی —— !“

چرنجیت پھر اپنی کہانی سُنانے لگا تھا —— ”شام کا سُہانا وقت تھا۔ میرا شکارا جھیل کے کنارے پانی میں ہلکورے کھا رہا تھا کہ اچانک وہ ایک خوشبو کی طرح میرے شکارے میں داخل ہوئی تھی اور ....!“

میں نے چرنجیت کی کہانی غصے سے پھر روک دیا تھا۔

”بس کر دیار —— یہ سب فلموں کی باتیں ہیں!“

چرنجیت بُرا مان گیا تھا —— لیکن میں نے اُسے نرم الفاظ میں یہ مشورہ دیا تھا کہ ایک بار کسی پہاڑی اسٹیشن جیسے کشمیر اور وہاں پہلا سیزن گزارے جہاں سرسبز شاداب وادیاں ...... سیاحوں کا انتظار کرتی ہیں۔ جہاں فطرت کی ہر چیز زندہ حسین ترین نظر آتی ہے —— جہاں دُور دراز مقامات سے آئے ہوئے سیاحوں میں حسین و جمیل لڑکیاں بھی ہوتی ہیں —— اور لڑکے بھی اور پھر لڑکے اور لڑکی کے دل میں ایک طوفان پوشیدہ ہوتا ہے —— کسی کو پانے کی خواہش —— چرنجیت کے مشورے پر میں نینی تال جا رہا تھا۔ فطرت کی رعنائیوں سے ہم آغوش ہونے بھی اور اپنی قسمت آزمانے بھی —— شاید چرنجیت کی بات درست ہی نکلے اور کوئی لڑکی خوشبو کی طرح میرے دل کے شکارے میں چلی آئے!

بس بہت تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی —— مجھے بھی پیاس معلوم ہونے لگی تھی کئی بار میں نے سوچا تھرمس کھول کر بیئر کے دو چار گھونٹ حلق سے اُتار لوں۔ لیکن ہر بار لڑکی کی مترنم آواز میرے کانوں میں گونجنے لگتی اور اُس کا نفرت بھرا چہرہ میرے ذہن میں اُبھرتا۔ میرے انکار کے بعد اُس نے اب تک پانی نہیں پیا تھا!

نفرت —— !

نفرت —— !

نفرت —— !!

میں خیالوں کے اتھاہ ساگر میں غوطے کھا رہا تھا اُس کی نفرت کا احساس میرے ذہن میں کانٹے کی طرح چُبھ رہا تھا حالانکہ میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ میں نے کئی لڑکیوں کی تمنا کی تھی۔ لیکن میری تمنا کو ہر بار ناکامی کی صلیب ہی ملی اور اس لئے میں نے اپنی زندگی سے سمجھوتہ کر لیا تھا اور اُس سمجھوتے میں ”فلل“ پڑ گئی تھی لیکن سُلگتے ہوئے لب در خمار نہ تھے۔ میرا دل محبت کی گرمی سے ناآشنا تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتا قسمت جس سے کوئی انتقام لیتی ہے اُسے ایک حسین جسم دے کر محبت سے محروم کر دیتی ہے۔ میرے نزدیک یہ انتہائی اذیت ناک سزا ہے اور قدرت نے یہ سزا مجھے دی!!

"تو آپ کہاں جا رہی ہیں؟" لڑکی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ وہ کسی نوجوان سے مخاطب تھی۔

"نینی تال —— کیوں، آپ کو کیسے پتا چلا؟" نوجوان نے پوچھا۔

"آپ کا نام معلوم کر سکتی ہوں؟"

"مجھے جون ارشد کہتے ہیں!"

"جون ارشد —— جون ارشد —— اوہ —— آپ ہی جون ارشد صاحب ہیں؟"

"کیوں —— آپ کو کچھ شک ہے؟" لڑکی کے تحیر آمیز لہجے نے چند لمحوں کے لیے نوجوان کو پریشان کر دیا۔

"بہت خوشی ہوئی —— آپ سے مل کر!" لڑکی کے چہرے سے خوشی جھلکی پڑ رہی تھی۔

"مجھے بھی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی —!"

"میں آپ کی کہانیاں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ آپ بہت اچھی کہانیاں لکھتے ہیں۔ آپ کو دیکھنے —— آپ سے ملنے کی بڑی خواہش تھی ——" لڑکی کے لہجے میں بے حد شدت تھی۔ نہایت کا شدید احساس پوشیدہ تھا۔ وہ اُس وقت بہت مسرور نظر آ رہی تھی۔ جیسے اُسے کوئی انمول شے مل گئی ہو!

"ایک مدت سے سوچ رہی تھی آپ کو خط لکھوں —— لیکن ڈر سا تھا۔ معلوم نہیں آپ جواب دیں گے یا نہیں —— واقعی آپ کی کہانیاں حقیقت کے بہت قریب ہوتی ہیں!"

"شکریہ!" نوجوان نے کہا —— اُس وقت وہ بھی اپنے آپ کو دنیا کا سب سے زیادہ خوش نصیب انسان تصور کر رہا تھا۔

"آپ دہلی رہتے ہیں؟" لڑکی نے پوچھا۔

"جی —!"

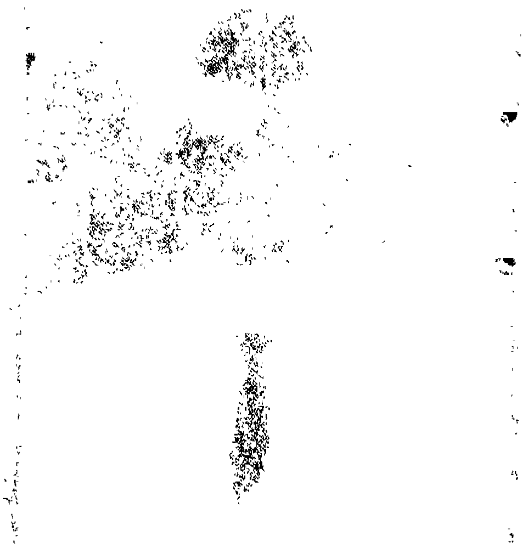
"نینی تال میں کہاں ٹھہریں گے؟"

"جہاں جگہ مل جائے!"

"آپ ہمارے ہاں ٹھہریئے ——"

"جی —— ؟" نوجوان نے حیرت اور مسرت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہا۔

"جی ہاں! آپ کو ہمارے یہاں ٹھہرنے میں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ ہماری کوٹھی 'آشیانہ' بے حد پُر فضا مقام پر ہے —— میرے ممی پاپ



بھی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے اور میری سہیلیاں بھی —— میں اُن سے اکثر آپ کا تذکرہ کرتی رہتی ہوں —— میرا مطلب ہے آپ کی کہانیوں کا .....!" لڑکی قدرے شرما گئی تھی۔ اُس نے گردن جھکا لی —— اُس کے چہرے پر حیا کے پھول مسکرانے لگے۔ اُس نے کنکھیوں سے نوجوان کو دیکھا اور دھیمے لہجے میں بولی۔

"آپ ہمارے ساتھ ٹھہریں گے نا؟"

"جیسے آپ کی مرضی!" نوجوان نے کہا۔

مجھے اپنے حلق میں کانٹے سے چبھتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ میرے ہاتھ تھرمس کی طرف بڑھ گئے اور پھر بیئر کے تلخ گھونٹ میرے حلق کے نیچے اترنے لگے۔ میں پیتا رہا۔ مسلسل پیتا رہا۔ یہاں تک کہ تھرمس خالی ہو گیا!

بیئر ختم ہو گئی تھی —— اور سفر بھی!

بس رُک گئی تھی۔ ایک ایک کر کے مسافر اُترنے لگے۔ لڑکی اُتر گئی تو نوجوان بھی اپنا بیگ اُٹھا کر دروازے کی طرف بڑھا۔ میں اُس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

نوجوان نے مجھے گھورا۔

میں نے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مجھ سے ملیے —— مجھے جون ارشد کہتے ہیں!"

نوجوان کے چہرے [illegible] آ گیا [illegible] تھا۔

"جی ۔۔۔ وہ ... !" نوجوان نے کچھ کہنا چاہا ۔۔۔ لیکن

اسی وقت لڑکی کی ترنم آواز نے ہم دونوں کو چونکا دیا۔

"آئیے نا ۔۔۔ آپ کیوں رُک گئے ۔۔۔ ارشد صاحب!"

میں نے لڑکی کو دیکھا اور پھر نوجوان کو ۔۔۔ زندگی کی تمام تر

مایوسی اور محرومی اُس کے چہرے میں سمٹ آئی تھی ۔۔۔

اُس کی آنکھوں میں [illegible] تھی ۔۔۔ [illegible] ۔۔۔ اُس وقت

اُس کے [illegible] چہرے کو دیکھ کر [illegible] زندگی

[illegible] سے گزرا ہوا

اور [illegible] اُس کے چہرے کو [illegible] تھا

تھا ۔۔۔ میں کہانی کار نہیں ہوں ۔۔۔ [illegible]

لیکن میری تنہا زندگی میں [illegible]

پسند کیا ہے ۔۔۔ [illegible]

سے جا رہی ہے ۔۔۔ آپ [illegible] ۔۔۔

آپ کو تو اور بھی بہت سی لڑکیاں [illegible]

پھر نصیب نہ ہوگا!"

اس کا ہاتھ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا [illegible]

سے اُس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"جائیے ارشد صاحب ۔۔۔ وہ آپ کی منتظر ہیں!"

نوجوان لڑکی کی طرف بڑھ گیا ۔۔۔ [illegible]

احساس میں شبنم کی خنکی محسوس کر رہا تھا اور شعلوں کی تپش بھی!

آہنگِ حجاز "قومی یک جہتی کے خیال سے ایک ہندو بھی اگر رسولِ کریم کے اوصاف عقیدت مندانہ انداز سے نعتوں کی شکل میں پیش کرے تو یہ بڑی مستحسن بات ہے" جناب عرش ملسیانی کی ان نعتوں کا دیباچہ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے۔ کتابچہ آرٹ پیپر پر چھپا ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ۔

آوازیں اُبھرتے ہوئے نوجوان سال شاعر [illegible] جوش کے قطعات اور نظموں کا مجموعہ جس میں زبان کی چاشنی کے ساتھ آپ کی اپنی آواز بھی ہے۔ قیمت [illegible] روپیہ۔

پوسٹ مارٹم جناب عرش ملسیانی نے مزاحیہ نثر کا ایک معیاری نمونہ اِس کتاب کے انشائیوں میں پیش کیا ہے۔ قاضی [illegible] مرحوم ایسے مستند ادیبوں نے اس کی داد دی تھی۔ قیمت صرف [illegible] روپے فی جلد۔

جنون و ہوش افصح الفصحاء جوش ملسیانی کا مجموعہ جس کا دوسرا ایڈیشن ختم ہو رہا ہے۔ ارفع و اعلیٰ کلام، ٹکسالی زبان اور بلند خیالات۔ یہ کتاب یونی ورسٹی کے اعلیٰ ترین امتحان میں کئی سال کورس میں رہی ہے۔ قیمت صرف چار روپے۔

شرارِ سنگ عرش ملسیانی کے بعد آخری کلام کا حسین و جمیل مجموعہ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے اس کی بہت داد دی تھی۔ خواجہ غلام السیدین، [illegible]، ڈاکٹر مسعود حسین اور اردو کے اکابر نے اس کی بہت تعریف کی۔ قیمت آٹھ روپے۔

گونگا ہے بھگوان حسرت کو کرشنا [illegible] ، [illegible] [illegible] [illegible] جناب [illegible] انسانی [illegible] کی عظمت کا اظہار کرتا ہے اور [illegible] [illegible] تصویر [illegible] [illegible] قیمت [illegible] روپے۔

اُردو کی مزاحیہ شاعری (انتخاب) اسے جناب عرش ملسیانی نے مرتب کیا ہے کتاب ہاتھوں ہاتھ نکل رہی ہے۔ ہندوستان و پاکستان کے نئے اور پرانے مزاح نگاروں کا کلام اور حالاتِ زندگی درج ہیں۔ قیمت آٹھ روپے۔

رُوحِ افکار جناب واجد سحری نے ہند و پاک کے جدید شعراء کے کلام میں سے سینکڑوں مختلف موضوعات پر بہت حسن و خوبی سے منتخب افکار کا یہ مجموعہ کئی سال کی کاوش سے مرتب کیا ہے جس میں ایک ہزار سے زائد اشعار ہیں۔ سائز بڑا، کتابت عمدہ، طباعت نفیس، سرورق دیدہ زیب۔ قیمت چھ روپے۔ محصول ڈاک علاوہ۔

ریگِ رواں جناب رتنی پنیالوی کا مجموعۂ کلام۔ مطلع تا مقطع غزلوں کے ہر شعر میں تغزّل کی شان جلوہ گر ہے اور ہر شعر آئینہ دارِ معراجِ فکر و فن ہے۔ اعلیٰ پایہ کی کتابت، دیدہ زیب طباعت نیز منقّش گرد پوش سے آراستہ یہ غزل دستہ ہر لائبریری کی زینت بننے کے قابل ہے۔ قیمت صرف چھ روپے۔ محصول ڈاک علاوہ۔

پتہ: [illegible] بیسویں صدی دریا گنج، دہلی نمبر

صحت و زندگی

۱ــــ کافی ــــ ایک مُضرِ صحت مشروب

ماہرینِ غذائیات کا متفقہ فیصلہ ہے کہ چائے کی طرح کافی کا عادی ہونا بھی صحت کو تباہ و برباد کر سکتا ہے۔ چائے کی طرح کافی پینے سے بھی خون پتلا اور گندا ہو جاتا ہے اور آہستہ آہستہ عصبی توانائی کم ہوتی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ خون اور اعصاب ہی کی دُرستی پر سارے اعمالِ حیات کی کارکردگی مُنحصر ہوتی ہے۔ چائے کے مقابلہ میں کافی میں کیفین کی مقدار زیادہ ہوتی ہے، جس کی زیادتی شدید دماغی ہیجان، بلکہ ہذیان تک پیدا کر سکتی ہے۔ جب سے کافی پینے کا رواج بڑھ گیا ہے، دل اور خون کے خلّیات کے امراض کی وجہ سے اموات کی اوسط دوگنی ہو گئی ہے۔

جرمن ڈاکٹر زینتّ نے لکھا ہے ــــ "دو تین کپ روزانہ کافی پینے سے ہائی بلڈ پریشر پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی لئے ہائی بلڈ پریشر کے مریض کو ڈاکٹر کا پہلا طبّی مشورہ کافی پینا ترک کر دینا ہوتا ہے۔"

امریکہ کے ایک ممتاز ڈاکٹر نے لکھا ہے ــــ "جو لوگ کافی پینے کے عادی ہیں، اُنھیں احساس نہیں کہ کافی پینے سے وہ ایسے امراض و عوارض کا شکار ہو سکتے ہیں جو اُن کی قبل از وقت موت کا باعث ہو سکتے ہیں۔"

ایک اور امریکی ڈاکٹر اوگس بائی پال نے لکھا ہے ــــ "کافی پینے کی عادت انسان کو جلد یا بدیر دل کے امراض میں مُبتلا کر دیتی ہے۔"

انگلینڈ کے ڈاکٹروں کی بھی رائے ہے کہ دل کے امراض و عوارض کا خاص باعث کافی پینا ہے۔ دل کے امراض سے واقع ہونے والی اموات میں کافی نوشی کا کافی حصّہ ہے۔

دُوسرے محقّقین کی رائے ہے کہ اعتدال کے ساتھ بھی کافی پینا مُضر ہے۔ اِس سے طبیعت میں اضمحلال پیدا ہوتا ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کافی کے عادی بن جائیں تو اُنھیں ایک ہی کپ سے معدے کا مرض لاحق ہو سکتا ہے۔ ابتدا میں مریض کو اِس مرض کا احساس نہیں ہوتا، جب تکلیف بڑھ جاتی ہے تو آنکھیں کُھلتی ہیں۔

زیادہ کافی پینے سے معدے میں جلن اور سوزش پیدا ہوتی ہے، لیکن کافی پینے والے کو محسوس نہیں ہوتا کہ اُس کے معدے میں ایک آگ اندر ہی اندر سُلگ رہی ہے، جو کبھی بھڑک کر خطرناک صُورت اختیار کر سکتی ہے۔ اُس کی صحت ہی نہیں، اُس کے وجود کے خرمن کو بھی جلا کر خاکستر بنا سکتی ہے!

۲ــــ کل کے عظیم انسان

کِسی کی پیشانی پر یہ نہیں لکھا ہوتا کہ وہ کل کیا ہے کل کیا بن جائے گا۔ ناز و نعم میں پلنے والا ایک بڑے باپ کا بیٹا بڑا ہو کر بے راہرو ہو جاتا ہے تو وہ عام انسانوں سے بھی پست اور بدحال ہو جاتا ہے۔ غُربت و افلاس کی گود میں پلنے بڑھنے والا ایک بدحال باپ کا بیٹا صحیح راہ پر لگ کر آگے بڑھنے کے مواقع سے فائدہ اُٹھا کر بڑا آدمی، قابلِ رشک انسان بن جاتا ہے۔

ایک مغربی مفکّر نے لکھا ہے ــــ "انسان جو چاہے بن سکتا ہے! تم جو چاہو بن سکتے ہو!" بظاہر یہ بات مبالغہ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ روشن حقیقت ہے۔ تاریخِ عالم اِس قول کی صداقت کی شاہد ہے۔"

مشہور مفکّر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ــــ "کوئی کچھ

سکتا ہے کہ کیوں جنتیں میں رہنے والے بہت پانے بچھڑوں سے پلنے بیشمار زہریب بزنں میں بیکا کل کی عظیم شخصیتیں وہ بچی ہوں گی جو تکمیلئے زندگی [illegible] میں جنہیں اپنی سوئی ہوئی ہمت کا احساس نہیں۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ [illegible] زرگوں میں ہی کل کی عظیم شخصیتیں چھپی ہوں گی یہ حقیقت ہے کہ تم وہ نہیں ہو جو آج ہو بلکہ وہ ہو جو تم کل بن سکتے ہو!

۳ — درازیٔ عمر کا راز

کیا امریکا غریب ہر آدمی زیادہ سے زیادہ دنوں تک زندہ رہنا چاہتا ہے — [illegible] صدر ریاستی [illegible] سائنس اکادمی نے لکھا ہے — محنت اور صرف محنت ہی درازیٔ عمر کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ ہمارے اسلاف سچ کہا کرتے تھے کہ کاہل قومیں دیر تک زندہ نہیں رہ سکتیں۔ جو لوگ درازیٔ عمر کے خواہاں ہیں یعنی جو لوگ زیادہ دنوں تک زندہ رہنا چاہتے ہیں انہیں چاہئے کہ سرگرم عمل زندگی گزاریں۔ سرگرم زندگی کے عمل

میں جاری رہنے کی تحلیل کا عمل انتہائی [illegible] یہ عام مشاہدہ ہے کہ ہر آدمی اس وقت تک صحت مند رہتا ہے جب تک کام کرتا رہتا ہے اور جب وہ کام ترک کر دیتا ہے تو بیمار ہونے لگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ محنت ہی زندگی ہے۔ محنت سے محروم انسان موت کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔

محنت اعصابی نظام کی حالت بہت کو بہتر [illegible] رکھتی ہے اور انسان کو اس کا ثبات نہیں بہت [illegible] کے کئی برس عطا کرتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا صحیح حقیقت ہوگا کہ محنت انسان کی زندگی کو ثبات نہیں زندگی کے کئی برس عطا کرتی ہے۔

گوئٹے اور طالسطائی اسّی سال کی عمر کو پہنچ جانے کے بعد بھی سرگرم عمل اور سرگرم کار رہے۔ اتنی طویل عمر کو پہنچ جانے کے بعد بھی ان میں کام کرنے کی صلاحیت ختم نہیں ہوئی تھی اور یقیناً ان کی درازیٔ عمر کا راز یہی تھا! اس طویل عمر کو بھی پہنچ کر

[illegible]

پروفیسر [illegible] نے لکھا ہے [illegible] اخبار نویس

[illegible] ہم ۱۵۰ برس تک زندہ رہیں گے "

بے شمار لوگ کتنے وقت مجھ سے پوچھا تھا کہ دُنیا کے کن مقامات پر

لوگ بے حد طویل عمریں پاتے ہیں۔ آپ کے خیال میں اُن کی عمر کی

درازی کا راز کیا ہے ؟ تو میں نے جواب میں صرف ایک لفظ میں

اُن کے اِس سوال کا یہ جواب دیا تھا ــــــ " کام "

۴ ــــ مسرت کی تلاش

دُنیا میں کون ایسا ہوگا جو خوش نہ رہنا چاہتا ہو، جسے خوشی کی تلاش نہ ہو۔ یقیناً آپ بھی اپنی زندگی کا دامن مسرت کے پھولوں سے بھر لینا چاہتے ہوں گے۔

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ــــ " انسان اشرف المخلوقات ہے جسے خُدا نے دُنیا کے سارے خزانوں کا مالک بنا کر بھیجا۔ پھر بھی انسان مسرت کی تلاش میں صدیوں سے بھٹک رہا ہے، سرگرداں اور پریشان ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ عام انسان اپنے اندر کی مسرت کو بھول کر سراب کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسرت کوئی باہر سے دستیاب ہونے والی شے نہیں، نہ مستقبل میں ملنے والی ہے۔ یہ تو آپ کے دل کا خزانہ ہے جسے آپ جب چاہیں استعمال کر سکتے ہیں۔ دُنیا کی بدقسمتی کی ایک بڑی وجہ یہ غلط فہمی ہے کہ جنت اور مسرت اِس دُنیا کی نہیں دُوسری دُنیا کی چیزیں ہیں جو زندگی میں نہیں موت کے بعد ہی حاصل ہو سکتی ہیں۔

ضرورت سے زیادہ سنجیدگی رُوحانی قوتوں کو اور کارکردگی کی صلاحیتوں کو ختم کر دیتی ہے۔ وہی انسان تندرست، خوش اور کامیاب رہ سکتا ہے جو کام کرتے ہوئے گنگناتا ہے اور سخت محنت میں بھی مُسکراتا ہے "

اِسی مفکر نے ایک دُوسری جگہ لکھا ہے ــــ " مُسکراؤ جب بھی موقع ملے۔ موقع کی مُسکراہٹ ہی جیت ہے "

۵ ــــ ایک فائدہ بخش عادت

معاوضہ کا خیال چھوڑ کر یا معاوضے سے زیادہ کام کرنے کی عادت بے حد فائدہ بخش عادت ہے۔ بظاہر یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے، لیکن تجربات سے ثابت ہو چکا ہے کہ یہ عادت بے حد فائدہ بخش ہے۔

مشہور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ــــ " جب آپ صرف وہی کام کرتے ہیں جس کے لئے آپ کو معاوضہ دیا جاتا ہے تو پھر یہ کوئی قابلِ توجہ اور خاص بات نہیں، لیکن اگر آپ اُس سے زیادہ کام کرنے کے لئے آمادہ ہیں اور اپنی تنخواہ یا معاوضے کا خیال کئے بغیر ہر کام مستعدی سے کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں اور اِسے اپنی عادت میں شامل کر لیتے ہیں تو آپ یقین کر لیجئے کہ کچھ ہی عرصے کی محنت کے بعد آپ کو آپ کی محنت کا معاوضہ ضرور ملے گا۔ آپ کی شہرت، آپ کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دے گی اور آپ بہت جلد کوئی اچھی جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے "

منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن میں کاغذ پر ضرور تحریر فرمائیے کہ رقم کس سلسلے میں بھیجی گئی ہے تاکہ تعمیلِ ارشاد میں دیر نہ ہو۔ خط و کتابت کرتے اور منی آرڈر بھیجتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

زنجیر ایک گناہ گار لڑکی کی حسین و جمیل داستان جس کے گناہ یہ تھے کہ وہ غریب تھی۔ وہ حسن و جمال کا مجسمہ تھی۔ وہ رقص کے ایک اسکول میں کام کرتی تھی۔ وہ تنہا تھی اُس کا دُنیا میں کوئی نہ تھا۔ وہ ایک شریف گھر کے لڑکے سے محبت کرتی تھی چنانچہ وہ ایک شریف وکیل صاحب کو گناہوں کی زنجیر میں جکڑی ہوئی نظر آئی اور وکیل صاحب نے اُسے اپنی بہو بنانے سے انکار کر دیا۔ عشق و محبت کی ایک ایسی پُر پیچ رومان پرور داستان، جسے پڑھ کر آپ عش عش کر اُٹھیں گے، جسے زکی انور نے لکھا اور ادارۂ بیسویں صدی دہلی نے شائع کیا ہے۔ قیمت فی جلد دو روپے۔

مُفت حاصل کیجئے

صحت اور جوانی صحت و جوانی اور حُسن و شباب کے وہ رموز جنہیں جاننا آپ کے لئے نہایت ضروری اور مفید ہے، اِس کتاب میں عام فہم زبان میں، تفصیل کے ساتھ درج کئے گئے ہیں۔ ایسے ایسے راز بیان کئے گئے ہیں جنہیں جاننے کے بعد آپ محسوس کریں گے کہ آپ کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ کتاب اشتہارات سے پاک ہے۔ محض بنی نوعِ انسان کی خدمت کے لئے مُفت تقسیم کی جا رہی ہے۔ آپ بھی خط لکھ کر بلا قیمت منگوا سکتے ہیں۔

پتہ :۔ رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۶

مشہور مصنفین کے مشہور ناول اور کتابیں

[illegible]	قیصر [illegible]	٥/٠٠
[illegible]	خلیل محبوب [illegible]	٥/٠٠
[illegible]	ایم صدیقہ تبسم	٣/٠٠
[illegible]	اشرف [illegible]	٢/٥٠
[illegible]	ضیا عظیم آبادی	٥/٠٠
دشمن کون	″	٣/٠٠
رقص حیات (نظم)	پرویز شاہدی	٣/٥٠
جامع الشواہد	مولانا ابوالکلام آزاد	١/٧٥
قول فیصل	″	٢/٥٠
زلف و شمشیر	مہدی نظمی	٤/٠٠
دوشیزۂ کابل	محمد صادق سرحدی	١٢/٠٠
سفینہ و ساحل	عزیز وارثی	٣/٠٠
مادہ کا کانٹا	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	٣/٠٠
غالب اور ابوالکلام	عتیق صدیقی	١٥/٠٠
اقبال حیات و شاعری	عدیل عباسی	٦/٠٠
ملاقاتیں	ندا فاضلی	٣/٩٥
بساط رقص	مخدوم محی الدین	٥/٠٠
افادات سلیم	مولانا وحید الدین سلیم	٣/٠٠
دوشیزۂ پاکستان	ایم اسلم	٦/٥٠
سرخ حاشیے	نریش کمار شاد	٣/٧٥
انشاء اللہ خاں انشاء	ڈاکٹر اسلم پرویز	٤/٠٠
چنگ و رباب	کنہیا لال کپور	٢/٥٠
[illegible]	مولانا امداد صابری	٧/٥٠
تذکرۂ شعرائے [illegible] اردو	″	١٢/٠٠
[illegible]	مرزا رسوا	٣/٥٠
آج کی سائنس	اندرجیت لال	٣/٠٠

ایشیا جاگ اٹھا	سردار جعفری	[illegible]
زندگی کا میلہ	اختر حسین [illegible]	٢/٢٥
اجنبی	وشوا ناتھ درد	٥/٠٠
[illegible] (ناولٹ)	اشفاق احمد	١/٥٠
چند تصویر بتاں	شمیم احمد	٣/٢٥
دیوان خواجہ میر درد	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	٦/٠٠
باقیات فانی	فانی بدایونی	٣/٥٠
اکبر الہ آبادی اور ان کا کلام	نور الرحمن	٢/٠٠
حجاز کے لطیفے	احمد جمال پاشا	٢/٧٥
میرے بہترین افسانے	پریم چند	٤/٠٠
کربل کتھا کا لسانی مطالعہ	خلیق انجم و جی سی نارنگ	٤/٠٠
میراث	پرکاش پنڈت	٣/٥٠
ٹیگور کی کہانیاں	ٹیگور	٤/٠٠
چین کی بہترین کہانیاں	ظ۔ انصاری	٣/٠٠
سیندور کی راکھ	کشمیری لال ذاکر	١/٢٥
پہلی محبت	تورگنیف	١/٢٥
دل ہی تو ہے	ایمل زولا	١/٢٥
پروفیسر بدھو	فکر تونسوی	٢/٧٥
تشنگی	رشید اختر ندوی	٢/٥٠
تعلیم الدین	مولانا اشرف علی	١/٥٠
دیہات کے افسانے	پریم چند	٣/٥٠
[illegible]	اندرجیت گاندھی	٣/٥٠
گلستان ہزار رنگ	سید صباح الدین	٢٠/٠٠
بال جبریل	ڈاکٹر اقبال	٣/٥٠
اس دیوانگی میں	سلمیٰ کنول	٦/٠٠
[illegible]	سید امام مرتضیٰ نقوی	١٥/٠٠

صہبائے عشق	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	١٥/٠٠
[illegible]	[illegible]	[illegible]
لکھنؤ کی زبان	[illegible]	[illegible]
محمود و سلمیٰ	صادق سرحدی	٣/٥٠
حضرت عائشہ صدیقہ	[illegible]	١/٢٥
ثریا	فاطمہ بیگم	٤/٠٠
[illegible]	فیاض علی	[illegible]
[illegible]	[illegible]	٣/٠٠
خیبر شکن	[illegible]	١/٥٠
کینسر وارڈ	[illegible]	٣/٠٠
اوراق زندگی	[illegible]	١٥/٠٠
شبنم	[illegible]	٦/٠٠
کلیات جگر	جگر مرادآبادی	٥/٠٠
باقیات اقبال	ڈاکٹر اقبال	٣/٠٠
دو قدم ایک منزل	[illegible]	٥/٠٠
[illegible]	اندرجیت لال	[illegible]
حروف	[illegible]	[illegible]
شہر خیال	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]
مطالعۂ ولی	″	١٠/٠٠
[illegible]	واجد سحری	٩/٠٠
سحر نغمہ	[illegible]	١٠/٠٠
[illegible]	کوثر چاند پوری	١/٥٠
پتھر کا گلاب	″	٧/٠٠

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی

آر۔ایس۔ایس کے حامی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لکھنؤ کو مُنہ کی کھانی پڑی

اور خوشتر گرامی مُلزموں کے کٹھرے میں پیش نہ ہو سکا

آزادیٔ تحریر و تقریر کے بلند بانگ دعووں کے ساتھ حکومتِ ہند نے اخبارات و رسائل کو شکنجے میں رکھنے کے لئے تعزیراتِ ہند کے اسلحہ خانے سے دفعہ ۱۵۳ الف کی تلوار تلاش کر کے اپنے حکّام کے حوالے کر دی ہے اور وہ اُس کو اُلٹا سیدھا اخبارات کے گلے پر پھیرنے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں۔ ۹۰ فیصدی مقدمات میں استغاثہ کو مُنہ کی کھانی پڑتی ہے اور حکومت کی سیکولر سوشلسٹ پیشانی پر بدنامی کے داغ لگتے ہیں۔ ہندوستان کے آئین میں اظہارِ خیال اور تقریر و تحریر کی جس آزادی کی ضمانت دی گئی ہے وہ مذاق بن کر رہ جاتی ہے ـــــ حال ہی میں اِس تلوار سے "بیسویں صدی" پر بھی وار کیا گیا اور خوشتر گرامی کو عدالت کے کٹھرے میں طلب کرنے کے لئے لکھنؤ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے عدالت سے سمن جاری کرا دئے۔ میری عدم موجودگی میں سمن دفتر "بیسویں صدی" میں پہنچے۔ واپسی پر مجھے علم ہوا، دوستوں سے ذکر آیا اور بات مُنڈیروں چڑھ کوٹھوں پہنچی۔ حکومت کے ایوانوں میں حیرت و استعجاب کے ساتھ تہلکہ مچ گیا۔ مرکزی حکومت کی سیکولر پیشانی پر بَل پڑ گیا اور جمہوری نظریں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لکھنؤ کی مکروہ حرکت پر قہر آلود ہو گئیں اور دفعہ ۱۵۳ الف کا وہ مقدمہ جو ہندو مُسلمانوں میں منافرت پھیلانے کے الزام میں میرے خلاف لکھنؤ میں چلنے والا تھا، واپس لے لیا گیا اور اِس طرح آپ کا خوشتر گرامی آزاد ہندوستان کی عدالت کے کٹھرے میں سیکولر ہندوستان کے ایک تاریخی مقدمہ میں بحیثیت مُلزم کھڑے ہونے کی سعادت سے محروم ہو گیا۔

ابتدائی کاپی جس میں آر۔ایس۔ایس کے "قلمی چہرے" کے ساتھ آپ نے یہ اعلان پڑھا ہو گا کہ اِس مضمون پر مُدیرِ "بیسویں صدی" پر دفعہ ۱۵۳ الف کے تحت مُسلمانوں میں ہندوؤں کے خلاف نفرت اور اشتعال پیدا کرنے کے الزام میں مقدمہ قائم کیا گیا ہے۔ کاپی پریس جا چکی تھی کہ مجھے یہ اطلاع مِلی کہ وہ مقدمہ واپس لے لیا گیا ہے اور اِس طرح ہماری سیکولر سرکار کی مشینری کا ایک رُو سیاہ پُرزہ اور اہم افسر بے نقاب ہونے سے رہ گیا۔ حیرت ہے کہ کس بے حیائی کے ساتھ اِس عقل کے اندھے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے آر۔ایس۔ایس کی حمایت میں مجھے مُلزموں کے کٹھرے میں پیش کرنے کی جُرأت کی ہے۔ اُس نے یہ سمجھ کر کہ خوشتر گرامی مولانا خوشتر گرامی ہوں گے، یہ الزام لگایا کہ میں نے مُسلمانوں میں ہندوؤں کے خلاف نفرت پیدا کی ہے اور اُن کے ایک مُقتدر لیڈر کو بدنام کیا اور اُس کے خلاف اشتعال دلایا ہے۔ اِس جاہل نے سمجھا ہو گا کہ خوشتر گرامی کو بھی دُوسرے اخبار نویسوں کی طرح ہراساں کیا جا سکے گا۔ لیکن اُسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ لوہے کے چنے ہیں جن کو چبانا مشکل ہے۔

خوشتر گرامی کی زندگی ایک کھُلی کتاب کی طرح آپ کے سامنے ہے اور "بیسویں صدی" اُس کے نظریات کا صحیح ترجمان ہے۔ میں نے پچھلے پچاس سال کے دَوران میں ہر فرقہ پرست جماعت کے خلاف لِکھا ہے خواہ وہ ہندو ہو، مُسلمان ہو، سِکھ ہو یا کوئی اور۔ میں نے سب فرقہ پرستوں کو ہمیشہ بے نقاب کیا ہے۔ یہ لوگ ہندوستان کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ہیں اور مُلک و قوم کے لئے بے حد مُضر۔ میں نے ہمیشہ اِن کے خلاف لِکھا ہے اور آئندہ بھی لِکھتا رہوں گا۔

دفعہ ۱۵۳ الف کا جو بے دریغ استعمال اُردو اخبارات بالخصوص مُسلم ایڈیٹروں کے خلاف ہُوا ہے وہ انتہائی بیہودہ اور شرمناک ہے۔ اِس کی بدترین مثال "ندائے مِلّت" لکھنؤ کے خلاف وہ مقدمہ ہے جو مولانا ابو الکلام آزاد کی ۲۵ سال پہلے کی تقریر چھاپنے پر قائم ہُوا۔ مولانا آزاد کی زبان سے نِکلے ہوئے ایک ایک لفظ میں حکومت کی پالیسی اور حکومت کی ترجمانی کی جاتی تھی۔ وہ ہندوستان کی آزادی کے جنم داتاؤں میں سے تھے اور حصولِ آزادی کی جدّوجہد میں انھوں نے

تاریخی کردار ادا کیا تھا۔

دفعہ ۱۵۳ الف کے مقدمات کے خلاف آل انڈیا نیوز پیپر ایڈیٹرز کانفرنس کئی بار صدائے احتجاج بلند کر چکی ہے۔ حال ہی میں آل انڈیا اُردو ایڈیٹرز کانفرنس نے بھی اس کے خلاف پُرزور آواز اٹھائی ہے۔

"بیسویں صدی" کے خلاف مقدمہ قائم ہونے کی خبر سے تو تہلکہ ہی مچ گیا۔ سب سے پہلے شریمتی سُبھدرا جوشی ایم۔پی جو خود آر۔ایس۔ایس اور جن سنگھ کے خلاف مستقل جہاد کر رہی ہیں اور دلّی میٹرو پولیٹن کونسل کے چیرمین جناب میر مشتاق احمد جنھوں نے زندگی بھر فرقہ پرستی کی زبردست مخالفت کی ہے، یہ خبر لے کر وزیرِ اعظم ہند شریمتی اندرا گاندھی اور وزیرِ داخلہ جناب اُما شنکر ڈکشٹ سے ملے اور اُنھیں یہ خبرِ وحشت اثر سنائی کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لکھنؤ نے سرکاری اخراجات پر آر۔ایس۔ایس کی صفائی میں خوشتر گرامی کے خلاف مقدمہ قائم کر دیا ہے۔ محترم محمد عثمان صاحب عارف ایم۔پی اور جناب گیانی گورمکھ سنگھ مسافر نے بھی وزیرِ داخلہ اور وزیرِ اطلاعات کو مقدمہ کے حالات گوش گزار کئے۔ دلّی میں آل انڈیا اُردو ایڈیٹرز کانفرنس کی مرکزی کمیٹی کا اجلاس مُدیرِ "بیسویں صدی" کی صدارت میں ہُوا تو اس میں بھی یہی مسئلہ دَورانِ بحث میں چھایا رہا۔ جب اُردو ایڈیٹروں کا وفد شریمتی اندرا گاندھی، صدرِ کانگریس، وزیرِ اطلاعات اور وزیرِ رسل و رسائل سے ملا تو ہر جگہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لکھنؤ کا یہ اقدام زیرِ بحث آیا ——— "بیسویں صدی" اور سیکولرزم کے لئے لکھنؤ کے نامور صحافی جناب جمنا داس اختر مُدیرِ روزنامہ "سویرا" نے بڑے مجاہدانہ انداز میں پیروی کی۔ بڑے صرف مذکورہ بالا رہنماؤں کے رُوبرو بلکہ اپنے اخبار میں بھی کئی مضامین لکھے اور اعلان کیا کہ میں بھی اُسی جُرم کا ارتکاب کرتا ہوں، مجھے بھی گرفتار کرو۔ انھوں نے شریمتی اندرا گاندھی سے بھی کہا "خوشتر گرامی نے کیا جُرم کیا ہے جو آپ اور صدرِ کانگریس کرتے ہیں۔ وہی باتیں آر۔ایس۔ایس کے متعلق لکھی ہیں جو آپ فرماتی ہیں۔ حیرت ہے کہ پھر آپ کے ایک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو یہ کیسے جُرأت ہوئی کہ وہ آر۔ایس۔ایس کی حمایت میں سرکاری طور پر مقدمہ دائر کرے" ——— جناب بہتار برنی ایڈیٹر "الجمعیت" دلّی، جناب ڈاکٹر خالد رشید صبا ایڈیٹر روزنامہ "ساتھی" پٹنہ، جناب غلام سرور ایڈیٹر روزنامہ "سنگم" پٹنہ، جناب حیات اللہ انصاری ایڈیٹر "سب ساتھ" دلّی اور "اسٹیٹسمین" دلّی کے ایڈیٹر جناب کلدیپ نیر نے بھی اُردو کاز کی زبردست حمایت کی اور نامور کمیونسٹ لیڈر جناب اسحاق سنبھلی نے لوک سبھا میں پُرزور صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لکھنؤ کی مذمت کی۔

سرگوشیاں

اس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شامل اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے ہر سوال کے بعد جواب کے لئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے۔

(ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

جمال شاہ۔ ویجاپور (مہاراشٹر)

س۔ آج کے شوہر؟
ج۔ بیوی کو جیون ساتھی نہیں باندی سمجھتے ہیں۔
س۔ آج کی بیویاں؟
ج۔ شوہروں کا یہ انداز دیکھ کر حیران و ششدر ہیں!
س۔ آج کے بچے؟
ج۔ ماں باپ کا یہ حال ہے اور معصوم بچے خاک بسر ہیں!

احمد تنویر۔ بمبئی

س۔ سیب میں کون کون سے اجزاء ہوتے ہیں۔ کیا سیب کے باسی ہونے پر وٹامن 'سی' ضائع ہو جاتا ہے۔
ج۔ سیب میں دوسرے پھلوں کی نسبت فاسفورس اور فولاد زیادہ مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ وٹامن 'بی' اور 'سی' بھی پورے تناسب سے پائے جاتے ہیں۔۔۔۔ سیب کے باسی ہونے پر اس سے وٹامن 'سی' جلد ہی ضائع ہو جاتا ہے، یہ خیال بے بنیاد ہے۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ ہر پھل تازہ کھانا بہتر ہے۔
س۔ کاجو چنے سے کیوں بہتر ہے؟
ج۔ کاجو اور چنے کا کیا جوڑ، کیا مقابلہ؟ دونوں کے خواص الگ الگ ہیں۔

لیلیٰ بانو۔ علی گڑھ

س۔ نہار منہ آم کھانا مفید ہے یا مضر؟
ج۔ نہار منہ آم کھانا مضر ہے۔ معدے کو نقصان پہنچاتا اور گرمی پیدا کرتا ہے۔

محمد مستان خاں خداوندی۔ چینچل گوڑہ

س۔ انسان کی ہر تمنا پوری کیوں نہیں ہوتی؟
ج۔ اس لئے کہ وہ اپنی تمنائیں پوری کرنے کے لئے جد و جہد نہیں کرتا
س۔ آج کل کی سیاست صحیح معنوں میں کیا ہے؟
ج۔ خوبصورت فریب!
س۔ اگر وزیروں کی خوراک ملک و قوم کا غم ہے تو غریبوں کی خوراک کیا ہے؟
ج۔ اپنا ہی خون!

چاند سلطانہ۔ عالم پور

س۔ انسان کس طرح ہمیشہ خوشی سے ہمکنار ہو سکتا ہے؟
ج۔ دوسروں کو خوشی دے کر!
س۔ غم کی گہرائیوں میں ڈوبا ہوا کوئی شعر سنایئے۔
ج۔ دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

آر۔ اے۔ سعیدی۔ گجوواٹا منڈ

س۔ دولت انسان کو کیا بنا دیتی ہے؟
ج۔ کسی کو ہوشیار اور ہوش مند بنا دیتی ہے، کسی کو پاگل! کسی کو قابلِ رشک بنا دیتی ہے، کسی کو قابلِ رحم!

پرتپال سنگھ۔ لدھیانہ

س۔ ایک عرصے کے بعد ویت نام کی جنگ ختم ہو گئی۔ انسانی جانوں کے ساتھ اِس طویل جنگ پر نہ جانے کتنے روپے خرچ ہوئے ہوں گے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں فوجی تیاریوں پر دُنیا کے ممالک کس تناسب سے خرچ کرتے ہیں؟

ج۔ آج کی دُنیا میں فوجی تیاریوں پر چالیس کروڑ ڈالر روزانہ خرچ ہو رہا ہے! دُنیا کے بیشتر ممالک اپنی آمدنی کا دس فیصدی حصّہ اسلحہ بندی پر خرچ کرتے ہیں۔

شفیع یاسن .....

س۔ میرا خیال ہے عورت اور شیطان میں کوئی فرق نہیں۔ آپ کی رائے؟

ج۔ مرد جس عورت کے بطن سے پیدا ہوتا ہے، جس کا دودھ پی کر پروان چڑھتا ہے جس کی آغوش میں پروان چڑھ کر جوان ہوتا ہے، اُسی عورت اور شیطان میں اُسے فرق نظر نہیں آتا! وہ اپنے گریبان میں مُنہ ڈال کر کیوں نہیں دیکھتا کہ اُس میں اور شیطان میں کوئی فرق ہے؟

ثریا پروین جانسی۔ ڈاکٹر جہانگیر جانسی کلکتہ

س۔ جینے کے لئے پیار کرنا ضروری ہے؟

ج۔ جی ہاں — جینے کے لئے زندگی سے پیار کرنا ضروری ہے۔ عزم و عمل سے پیار کرنا ضروری ہے۔ صحت سے پیار کرنا ضروری ہے۔

س۔ محبت میں پاکیزگی اور تقدس ہوتا ہے پھر کیوں انسان محبت پیار کرنا کیوں چاہتا ہے؟

ج۔ اِس لئے کہ
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا!

حسن رضوی مہربانو۔ امروہہ

س۔ جبکہ ہر سیاسی جماعت کے لیڈر اُردو زبان کو بہار اور اُتر پردیش میں ثانوی درجہ دینے کے حق میں ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ صوبائی حکومتیں اس معاملے میں پس و پیش کر رہی ہیں؟

ج۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

س۔ کیا تدبیر سے تقدیر بدل سکتی ہے؟

ج۔ ہاں — حسنِ تدبیر سے تقدیر سنور جاتی ہے!

مس نوشابہ رضوی۔ علی گڑھ

س۔ سید الشہداء حضرت امام حسینؓ کی شان میں کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ سنیئے ـ

اُٹھے گا جب بھی تن کے کوئی فوجِ جفا
ٹکر چلے گا جب بھی زمانے میں ظلم کا
ہوگا بشر کو جب بھی نہ جینے کا حوصلہ
بگڑے گا جب بھی سلسلۂ کارِ ارتقاء
اُس لمحہ آپڑے گی ضرورت حسینؓ کی
زندہ کرے گی حق کو شہادت حسینؓ کی

عبدالحمید بیدل۔ گنج ڈونڈ وارہ

س۔ میرا ایک دوست ہر وقت غمگین اور اُداس رہتا ہے اُسے کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ وہ غم کو خوشی بنالیں۔ ساری اُداسی دُور ہو جائے گی۔

س۔ کیا "بیسویں صدی" دُور دراز ملکوں میں بھی جاتا ہے؟

ج۔ "بیسویں صدی" تقریباً دُنیا کے سارے ممالک میں جاتا ہے۔

نظیر حسین۔ نئی دہلی

س۔ حضرت جگر مرادآبادی کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ آپڑا کچھ وقت ایسا گردشِ ایّام سے
زندگی شرما رہی ہے زندگی کے نام سے

ہدایت علی ساحل۔ جھری تلیّا

س۔ بھائی کا رشتہ زیادہ مقدس ہوتا ہے یا بہن کا؟

ج۔ دونوں۔

س۔ نیا سال ہمیں کیا سبق دیتا ہے؟

ج۔ گزر جانے والے سال پر نظر ڈال کر دیکھیں کہ اُس میں آپ نے کیا کھویا کیا پایا ــــ؟ گزر جانے والے سال میں آپ نے جو غلطیاں کی ہیں آنے والے سال میں اُن سے بچیں۔

شیام نرائن اگروال۔ رام پور

س۔ ویت نام کی جنگ کیسی جنگ تھی؟

ج۔ سیاسی۔

س۔ ویت نام کی جنگ میں کتنے انسان مارے گئے؟

ج۔ ۲۲ لاکھ۔

محمد اصغر علی۔ دھنباد

س۔ دَولت انسان کی کنیز ہے یا انسان دَولت کا غلام ہے؟

ج۔ دَولت جفاکش انسان کی کنیز ہے ــــ کاہل انسان دَولت کا غلام ہوتا ہے۔

س۔ زندگی پر اندھیرا چھا جائے تو کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ عزم و عمل سے اُسے دُور کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ یقیناً اندھیرا دُور ہو جائے گا۔

علی مخدوم۔ بیدک

س۔ زندگی کی ناؤ عزم سے چلتی ہے یا اِلتجا سے؟

ج۔ عزم سے!

س۔ اگر خوشی کی تلاش میں غم مل جائے تو بتائیے کیا کروں؟

ج۔ غم کو خوشی بنالیجئے۔

جمیل اختر۔ رتوا

س۔ اسٹوڈنٹ لائف میں افسانے اور ناول پڑھنا...؟

ج۔ اپنے کورس کی تیاری سارے مشاغل پر مقدم رکھنی چاہیئے۔ کورس کی تیاری کی طرف سے اطمینان ہو تو افسانے اور ناول بھی پڑھ سکتے ہیں۔

شہناز بیگم۔ دہلی

س۔ الجزائر کب آزاد ہوا؟ اُس کی سرکاری زبان کیا ہے؟

ج۔ الجزائر جولائی ۱۹۶۲ء میں آزاد ہوا۔ اُس کی سرکاری زبانیں عربی اور فرانسیسی ہیں۔

س۔ الجزائر کی آبادی کتنی ہے اور اُس میں کتنے مسلمان ہیں؟

ج۔ اُس کی آبادی ایک کروڑ، ۷۰ لاکھ ہے۔ مسلمانوں کی آبادی ۹۴ فی صد ہے۔

م۔م۔ع۔خاں۔ حیدرآباد دکن

س۔ کیا قوتِ فیصلہ، مستقل مزاجی، ہمّت و حوصلہ میں اضافہ کیا جاسکتا ہے؟

ج۔ زندگی آموز اور حیات افروز تحریریں پڑھنے سے قوتِ فیصلہ، مستقل مزاجی اور ہمّت و حوصلہ میں یقیناً اضافہ ہوسکتا ہے۔ "بیسویں صدی" میں "صحت و زندگی" عنوان کے تحت ایسی تحریریں ہر شمارہ میں آپ پاسکتے ہیں۔

بچت کے ساتھ بیمہ





اجتماعی میعادی ڈیپازٹ کھاتہ	10 روپے ماہانہ کے حساب سے بچت	675 روپے ملیں گے
مکرر ڈیپازٹ کھاتہ	10 روپے ماہانہ کے حساب سے بچت	710 روپے ملیں گے



فرض کیجئے کوئی بالغ فرد پانچسالہ اجتماعی میعادی ڈیپازٹ کھاتہ یا پانچ یا دس روپے کا مکرر ڈیپازٹ کھاتہ کسی ڈاکخانے میں کھولتا ہے اور اس میں 24 ماہانہ قسطیں جمع کراتا ہے۔ اگر بدقسمتی سے موت ہوجانے کی صورت میں وہ تمام قسطیں جمع نہ کرا سکے تو سرکار اس کے نامزد شخص یا وارث کو پوری رقم معہ سود ادا کرے گی جوکہ پانچویں سال کے آخر تک تمام ماہانہ قسطیں جمع کرانے کی صورت میں واجب الادا ہوتی۔

دیکھئے کیسے :-

باتحفظ بچت اسکیم سب کے لئے

سماجی تحفظ کا اقدام

قومی بچت ادارہ
بھارت سرکار

davp 72/513

شیخ نور جہاں۔ لوہار گلی۔ بیڑ

س۔ عورت کا حُسن عارضی ہوتا ہے یا مستقل؟

ج۔ عورت ہو یا مرد، ظاہری حُسن عارضی ہوتا ہے، باطنی حُسن مستقل ہوتا ہے۔

س۔ ماں کے قدموں میں جنّت ہے تو باپ کے؟

ج۔ باپ کے قدموں میں سعادت ہے۔

س۔ شرم و حیا عورت کا زیور ہے تو مرد کا زیور؟

ج۔ مرد کا زیور شائستگی اور سنجیدگی ہے۔

خالد یوسف۔ سہارنپور

س۔ مرزا غالب اور علامہ اقبال میں کون زیادہ مشہور ہے؟

ج۔ یہ دونوں یگانۂ روزگار شاعر ساری دُنیا میں مشہور ہیں۔

س۔ انار کے فائدے بتائیں۔

ج۔ انار معدے اور جگر کی کمزوری دُور کر کے طاقت بخشتا ہے۔ خون بکثرت پیدا کرتا ہے۔ خون کو صاف اور جسم کو فربہ کرتا ہے۔ پیاس کو تسکین دیتا ہے۔ بے چینی دُور کرتا ہے۔ قے، دست اور سنگرہنی کو روکتا ہے۔ شربتِ انار نہایت ٹھنڈا اور مفرّح ہوتا ہے۔ تمام صفراوی شکایتوں میں نافع ہے۔ تُرش انار معدے اور جگر کی گرمی اور سینے کی سوزش رفع کرتا ہے۔ جوشِ خون، یرقان میں نافع ہے۔

نکہت نظامی۔ دریاپور۔ پٹنہ

س۔ عورت کی کون سی ادا مرد زیادہ پسند کرتے ہیں؟

ج۔ بیشتر مرد عورت کی ایک ادا کو زیادہ پسند کرتے ہیں — عورت انھیں سارے مردوں سے زیادہ خوبصورت سمجھے!

س۔ عورت اپنے بچّے کو زیادہ پیار کرتی ہے یا اپنے شوہر کو؟

ج۔ اپنے بچّے کو۔

س۔ سب سے زیادہ مفید پھل کون سا ہے؟

ج۔ یہ کہنا مشکل ہے۔ سارے پھل مفید ہوتے ہیں۔ سیب، انگور، انار، سنگترہ، بادام زیادہ مفید ہیں۔

نہال چند۔ انبالہ

س۔ اُتر پردیش کی آبادی کتنی ہے۔

ج۔ ۹ کروڑ۔

س۔ ہندوستان میں مُسلمانوں کی تعداد کتنی ہے؟

ج۔ ۷ کروڑ۔

کمال احمد۔ ڈیسر گڑھ۔ بردوان

س۔ عورت شرافت کب چھوڑ دیتی ہے؟

ج۔ جب مرد اُسے چھیڑ کر شرافت کا دامن چھوڑ دینے، سینڈل سے نوازنے کے لئے مجبور کر دیتا ہے۔

س۔ اِس دَور میں کس کو اپنا جگری دوست ماننا چاہئے؟

ج۔ جو چین کے چاؤ جیسا نہ ہو!

غُلام جیلانی اعجاز۔ حیدرآباد دکن

س۔ مجھے مزاحیہ اشعار بے حد پسند ہیں۔ میں مزاحیہ اشعار کیسے حاصل کر سکتا ہوں؟

ج۔ اپنے اِس شوق کی تکمیل کے لئے 'بیسویں صدی' کے ادارے سے "اُردو کی مزاحیہ شاعری" منگوا لیجئے۔ یہ کتاب ہندو پاک کے نئے اور پُرانے مزاح نگاروں کا بلند پایہ انتخاب ہے۔ اِس کی قیمت آٹھ روپے ہے۔

س۔ کوئی مزاحیہ شعر سُنائیے۔

ج۔ مشہور طنز نگار حضرت اکبر الہ آبادی کا ایک شعر سُنئے ؎

جنابِ اکبر نے بحث پردے پر کی بہت کچھ مگر ہُوا کیا؟
نقاب اُلٹ ہی دی اُس نے کہہ کر کہ ہی لے گا مرا مُوا کیا؟

[illegible] خلیل سداسیو پیٹ

[illegible] بات سے کہاں تک [illegible]

[illegible] کا زمانہ اُسی کا
[illegible] ہو گیا کسی کا

ج۔ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
زندگی صرف محبت ہی نہیں ہے اے دوست!

سید مجید اللہ چنچل گوڑہ۔ حیدر آباد دکن

س۔ دل کو سکون بخشنے والی کچھ اچھی باتیں بتلائیے۔

ج۔ • بھلائی اور عافیت اسی میں ہے کہ دُنیا سے بقدرِ ضرورت تعلق رکھا جائے۔
• خوشی خوشی اُٹھائے جانے پر بھاری بوجھ بھی ہلکا ہو جاتا ہے۔
• جس کے پاس صحت ہے، اُس کے پاس اُمید ہے۔ جس کے پاس اُمید ہے، اُس کے پاس ہمت ہے اور جس کے پاس ہمت ہے اس کے پاس سب کچھ ہے۔

چاند پروین۔ بجنور

س۔ انسان زندگی میں کتنے رُوپ بدلتا ہے؟

ج۔ یہ ہم سے زیادہ سیاسی پارٹیوں کے ابن الوقت 'دَل بدلو' بتا سکتے ہیں۔

س۔ انسان شہرت پاکر مغرور ہوتا ہے یا دَولت پاکر؟

ج۔ شہرت اور دَولت دونوں انسان کو مغرور بنا دیتی ہے۔

س۔ آج کل کے نوجوان بڑوں کا ادب کیوں نہیں کرتے؟

ج۔ اس کی ذمہ دار آج کل کی غلط تعلیم و تربیت ہے۔ آج سے بہت پہلے حضرت اکبر الٰہ آبادی نے کہا تھا ـــ

ہم ایسی کُل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

این۔ اے۔ ندیم۔ دربھنگہ

س۔ انسان کا پہلا فرض کیا ہے؟ مذہب کا خیال یا وطن کی خدمت؟

ج۔ وطن کی خدمت۔ اس لئے کہ ہر مذہب کی عظمت کا معترف ہے۔

عبد الرحیم کارکل۔ بمبئی

س۔ اُردو کی عمر؟

ج۔ ایک انگریز مصنّف نے اپنی کتاب "ہندوستان فائلالوجی" میں لکھا ہے ـــ "اُردو کی بُنیاد چودھویں صدی عیسوی میں پڑی" ـــ ایک دُوسرے انگریز مصنّف نے لکھا ہے۔ "اُردو کی بُنیاد ستر ہویں صدی عیسوی کے اواخر میں پڑی" ـــ میر امّن نے اپنی کتاب "باغ و بہار" کے دیباچے میں لکھا ہے ـــ "اُردو کی بُنیاد اکبر کے عہد میں پڑی"۔

س۔ اِک سکونِ دل کی خاطر عُمر بھر تڑپا کئے

ج۔ سکونِ دل جہانِ بیش و کم میں ڈھونڈنے والے
یہاں ہر چیز ملتی ہے سکونِ دل نہیں ملتا!

پیاری سُلطانہ۔ وجے واڑہ۔ گنٹور

س۔ بھائی جان! یہ بتائیے ہم دُوسروں کو خوش [illegible] کرنا چاہئے؟

ج۔ آپ اپنا غم غلط کرنے کے لئے حقیقت پہ یقین کرنا چاہئے ـــ

خدا کی دین ہے جس کو نصیب ہو جائے
ہر ایک دل کو غم جاوداں نہیں ملتا

س۔ وہ کون سی چیز ہے جو کاٹی جاتی ہے، پیسی جاتی ہے، لیکن کھائی نہیں جاتی؟

ج۔ وہ چیز غصّے میں پیسے جانے والے دانت اور ہونٹ ہیں۔

محمد یٰسین رضوان۔ جھمری تلیا

س۔ کیا کسی لڑکی سے سچّی محبت کرنا اسلام کے خلاف ہے؟

ج۔ آج کی دُنیا میں کسی لڑکی سے سچّی محبت کہاں ہوتی ہے، یہ کہنا دُنیا کو فریب دینا ہے۔

س۔ سُنا تھا کبھی عورتیں اپنے شوہر کی چتا پر جل کر راکھ ہو جاتی تھیں، لیکن آج کل کی عورتیں کچھ اور ہی نظر آتی ہیں۔ ایسا کیوں؟

ج۔ آج کل کے مَردوں کے متعلق کیا خیال ہے آپ کا؟

حسنین علی باقر۔ نلگنڈہ

س۔ علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات بتائیے۔

ج۔ علامہ اقبال ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۸ء میں وفات پائی۔

س۔ ایک اچھا سا شعر سنائیے۔

ج۔ ناسازگارئ وقت کے تیور کو دیکھ کر
ہم نے چراغ عزم کی لَو کو بڑھا دیا

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر [illegible] مطبوعہ [illegible] پریس دہلی [illegible]

BISWIN SADI
37th YEAR OF PUBLICATION
Telephones Office 271637 Residence 619927

بیسویں صدی



Biswin Sadi

DELHI.

Rs. 130



رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

فوٹو۔ روشن لال وشِشٹ جے پور





پنجاب کے نامور شاعر جناب رشی پٹیالوی جنہیں اُن کے مجموعۂ کلام "ریگِ رواں" پر اُردو اکیڈمی (یو۔پی) لکھنؤ کی طرف سے ایک ہزار روپیہ بطور انعام دیا گیا ہے۔ رشی صاحب نے یہ رقم اُردو کی ترویج و ترقی کے لئے وقف کردی ہے۔

گذشتہ دنوں راشٹرپتی شری وی۔وی گری نے، راشٹرپتی بھون میں مختلف شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والے ممتاز افراد کو ۱۹۷۲ء کے لئے قومی اعزازات عطا کئے۔ تصویر میں راشٹرپتی اُردو کے ممتاز شاعر جناب سلاّم مچھلی شہری کو پدم شری کا اعزاز دے رہے ہیں۔



پچھلے دنوں ماہنامہ "روبی" کی طرف سے جناب ذکریا اگھاڑی کو ایک استقبالیہ دیا گیا جس میں دلّی کے منتخب ادبا، صحافی، شعرا اور دیگر معززین شریک ہوئے۔ فوٹو میں "روبی" کے مدیر جناب رحمٰن نیر ذکریا صاحب سے محوِ گفتگو ہیں۔



جنابِ کرشن موہن نے اپنی غزل میں کیفیاتِ عشق کی ترجمانی کی۔

عمر کاٹی ہے سہارے عشق کے
گائے ہیں جی بھر کے نغمے عشق کے

بحر و دریا، شہر و قریہ، کوہ و دشت
ہر جگہ دیکھے تماشے عشق کے

حسن کا ہر انگ محوِ رنگ ہے
اُٹھ رہے ہیں تند شعلے عشق کے

کس قدر سنگیں ہے فرسودہ سماج
کس قدر رنگیں ہیں جذبے عشق کے

خود ہے افسردہ دِل و کرب آشنا
حسن کیا ارماں نکالے عشق کے

حسن تھا غمگین، تھک کر سو گیا
کب تلک سنتا فسانے عشق کے

بے نیازِ عشق ہو جب چشمِ ناز
کیا کریں بارے تمہارے عشق کے

دُور کر دیں گے ترا بھی اِضطراب
سن ذرا اے حسن شکوے عشق کے

کام نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے عشق کے

طنز سے، طعنوں سے گھبراتا ہے کیوں
کرشن موہن یہ ہیں تحفے عشق کے



جنابِ مخمورؔ سعیدی اپنا کلام سُناتے ہوئے۔ برابر کھڑے ہیں جنابِ سلامت علی مہدی۔

بکھرتے ٹوٹتے لمحوں کو اپنا ہم سفر جانا
کہ تھا اِس راہ میں آخر ہمیں خود بھی بکھر جانا

سرِ دوشِ ہوا اِک ابر پارے کی طرح ہم ہیں
کسی جھونکے سے پوچھیں گے کہ ہے ہم کو کدھر جانا

پسِ ظلمت کوئی سورج ہمارا منتظر ہوگا
اِسی اِک وہم کو ہم نے چراغِ رہ گزر جانا

مِرے جلتے ہوئے گھر کی نشانی بس یہی ہوگی
جہاں اِس شہر میں کچھ روشنی دیکھو ٹھہر جانا

سُہانے موسموں کی یاد! سِکھلایا تجھے کِس نے
اُفق پر دیدہ و دل کے دھنک بن کر نکھر جانا

حصارِ ضبط میں رہ کر مآلِ حسرتِ دل کیا؟!
کِسی قیدی پرندے کی طرح گھُٹ گھُٹ کے مر جانا

دیارِ خامشی سے کوئی رہ رہ کر بُلاتا ہے
ہمیں مخمورؔ اِک دن ہے اِسی آواز پر جانا



جنابِ راج نرائن رازؔ غزل سرا ہیں۔

کیا بات ہے کہ بات ہی دِل کی اَدا نہ ہو — مطلب کا میرے جیسے کوئی قافیا نہ ہو
گُلدان میں سجا کے ہیں، ہم لوگ کتنے خُوش — وُہ شاخ ایک پھُول بھی جس پر نیا نہ ہو
ہر لمحہ وقت کا ہے، بس اِک غُنچۂ بخیل — مُٹھی جو اپنی بند کبھی کھولتا نہ ہو
اب لوگ اپنے آپ کو پہچانتے نہیں! — پیشِ نگاہ جیسے کوئی آئینا نہ ہو
ہر شخص ایک عالمِ حیرت میں غرق ہے — میں سوچتا ہوں، آپ نے کُچھ کہہ دیا نہ ہو
وحشی ہوا کی رُوح تھی دیوار و دَر میں رات — جنگل کی سمت کوئی دریچہ کھُلا نہ ہو

آتی ہے، میرے کان میں آواز جس کی رازؔ
وُہ قافلہ مرا ہی کہیں قافلہ نہ ہو

آئندہ پرچہ افسانہ نمبر ہوگا جس کی قیمت دو ... فی پرچہ ہوگی

ٹیلیفون دفتر ۲۷۱۶۳۷
ٹیلیفون رہائش گاہ ۶۱۹۹۲۷

بیسویں صدی
دہلی

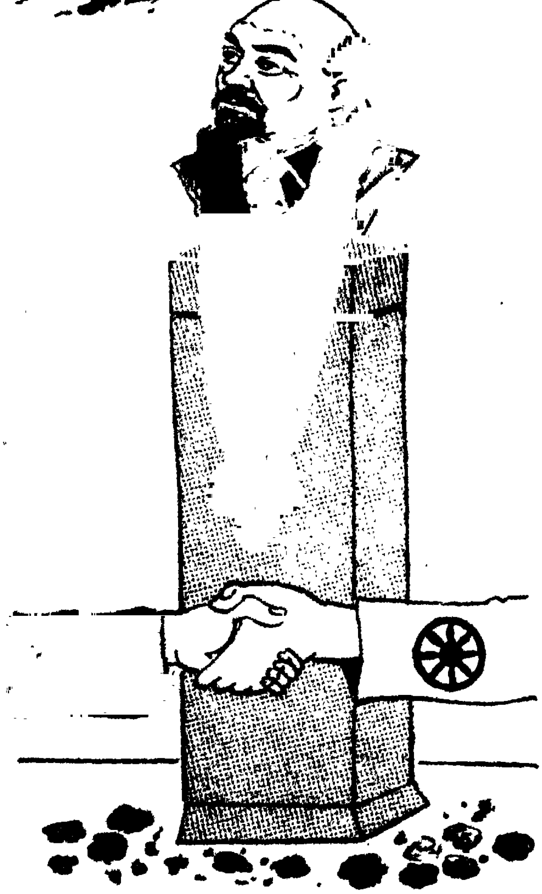
بیسویں صدی کی قیمت میں اضافہ

"بیسویں صدی" کی قیمت کے اضافہ کے ہم ہرگز حامی نہیں۔ دو سال ہوئے جب بعض رسائل نے سوا روپیہ سے ڈیڑھ روپیہ فی پرچہ قیمت کر دی تو ہم نے اس وقت بھی پانچ پیسے فی پرچہ ہی کا اضافہ کیا تھا۔ اب گورنمنٹ کی نئی پالیسی کے مطابق نیوز پرنٹ، گلیز ڈ پیپر اور آرٹ پیپر کی قیمتوں میں تکلیف دہ حد تک اضافہ ہو گیا ہے۔ پرنٹنگ سیاہی، اخراجات بلاکس اور دیگر سامانِ طباعت کے نرخ بھی ڈیڑھ گنا بڑھ چکے ہیں جس کے باعث "بیسویں صدی" کے اخراجات میں ساڑھے چار ہزار روپے ماہوار کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اندریں حالات ہم "بیسویں صدی" کی قیمت میں بیس پیسے فی پرچہ کا اضافہ کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ آئندہ پرچہ کی قیمت ایک روپیہ تیس پیسے کی بجائے ڈیڑھ روپیہ فی پرچہ ہوگی اور افسانہ نمبر کی قیمت دو روپے پچیس پیسے فی پرچہ کی بجائے دو روپے پچاس پیسے فی پرچہ ہوگی اور سالانہ قیمت پندرہ روپے کی بجائے سولہ روپے ہوگی۔ ممالک غیر سے سالانہ قیمت ۳۶ شلنگ ——— یہ اضافہ تاجران نیوز پرنٹ، کاغذی ڈیلروں اور سامانِ طباعت فروخت کرنے والوں کے یہاں جائے گا اور وہاں سے گورنمنٹ ایکسائز ڈیوٹی کی آڑ میں وصول کرے گی۔

تیرونشتر

خوشتر گرامی





ماسکو میں لینن کا جنم دن۔

• "جمہوریت خطرے میں پڑ گئی ہے" سنڈیکیٹ کانگرس کے لیڈروں کا واویلا ——— ان سب میں عہدے اور وزارتیں بانٹ دیجئے، جمہوریت کو خطرہ ٹل جائے گا۔

• "پانچواں پلان مہنگائی کا علاج ہے" دھر کا بیان ——— ایلوپیتھک علاج ہے، یونانی ہے، ہومیوپیتھک ہے یا آیورویدک۔

• "ساگر یونیورسٹی میں ہنگامہ، لاٹھی چارج، آنسو گیس" ——— یہ تینوں نئے کورس شروع ہوئے ہیں وہاں۔

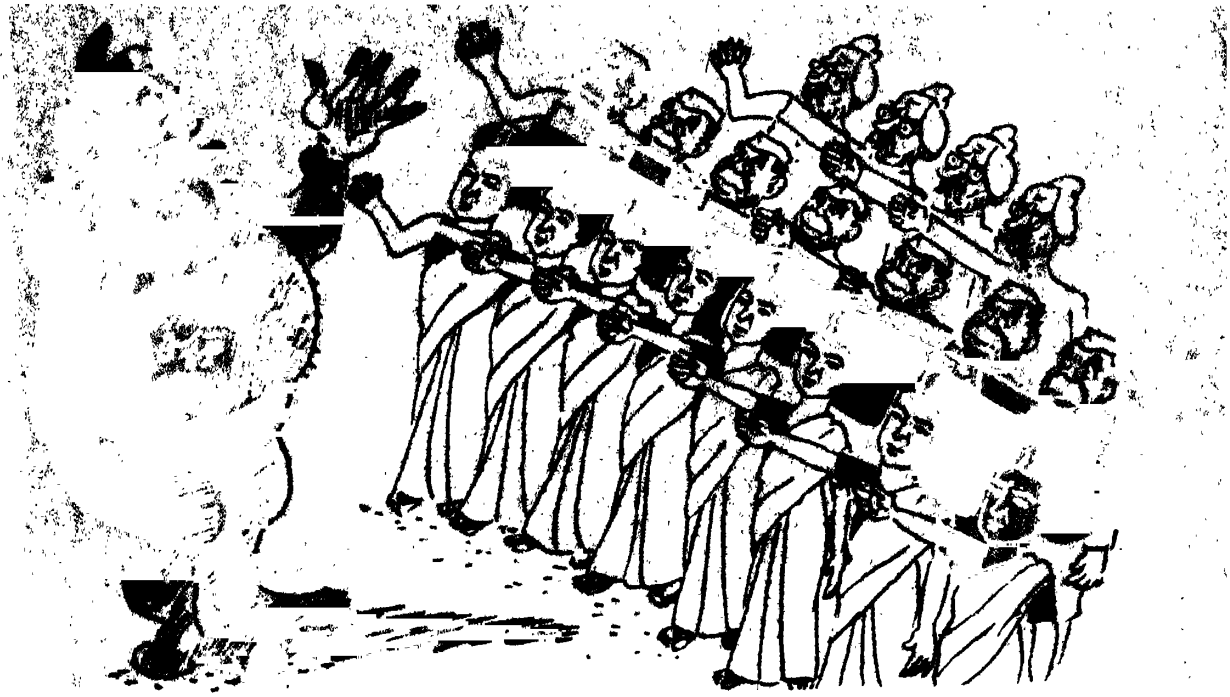
• "گجرات کے ناراض کانگرسیوں نے لیڈر شپ تبدیل کرنے کا مطالبہ ترک کر دیا" ایک خبر ——— اس لئے کہ موجودہ لیڈر نے ہی اقتدار میں حصہ دار بنانے کا وعدہ کر کے راضی کر لیا۔

• "جن سنگھ کا غلط اقدام" ایک عنوان ——— اس کا صحیح قدم کون سا ہے؟

• "پنجاب میں مڈل کے بوگس سرٹیفکیٹ" ایک خبر ——— سیاستدانوں کے لئے خصوصی رعایت ہوگی۔

• "پنجاب ملک بھر میں سب سے زیادہ خوشحال۔ عورتوں کی تعداد مردوں سے کم" ایک خبر ——— یہی خوشحالی کا راز ہے۔ عورتیں فضول خرچی کی جڑ ہوتی ہیں۔

• "امریکی شہروں میں چینی افیون کی اسمگلنگ" ایک خبر ——— نکسن کا چینیوں سے پینگیں بڑھانے کا نتیجہ۔



"فرقہ وارانہ کشیدگی کے مقابلہ کے لئے نگران دستے بنائے جائیں" وزیرِاعظم کی تقریر

"کانگریس سے اقتدار چھیننے کی کوشش کی جائے گی" ایک جن سنگھی لیڈر —— گویا اب تک آنجناب اقتدار مضبوط کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔

"کرانتی دل یو۔پی اسمبلی کا الیکشن اکیلا لڑے گا" ایک خبر —— کیونکہ وہ اپنی شکست میں کسی کو حصہ دار نہیں بنانا چاہتا۔

"دِلّی میں تاریخ کا قُدرتی عجائب گھر" ایک عنوان —— دِلّی کے سیاسی عجائب گھر سے بہتر نہیں ہو سکتا۔

"پارلیمنٹ اور اسمبلی کے ممبر فرقہ پرستی کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے لئے کمر بستہ ہو جائیں" اندرا گاندھی —— اور سب سے پہلے خود اپنے دل کو صاف کریں اور فرقہ پرستی چھوڑ دیں۔

"کانگریس کی ممبرشپ کے لئے شراب نہ پینا لازمی شرط" ایک عنوان —— جس پر چند فیصدی کانگریسی پورے اتریں گے۔

"دانشوروں کو دیش کا کوئی فکر نہیں" ایک عنوان —— وزیروں کی تقریریں سن سن کر فکر مفقود ہو جاتا ہے۔

"مہنگائی اور مِلاوٹ کے خلاف مِہلاؤں کی ملک گیر مہم" ایک خبر —— جو جھاڑو اور بیلن سے لیس ہو کر چلائی جائے گی۔

"آسامی کے ساتھ انگریزی بھی جاری رہے گی" ایک خبر —— لیکن ہندی کے ساتھ اُردو کے رہنے کی کوئی جگہ نہیں نکلے گی۔

• [illegible] حکومت میں مسلم لیگ کے لئے کوئی جگہ نہیں ہونی چاہئے [illegible] مسلم لیگ ہی نہیں، [illegible] شیڈیول [illegible] کل جماعت اسلامی [illegible] اور ہندو مہاسبھا کے لئے بھی کوئی جگہ نہیں ہونی چاہئے۔

• [illegible] اور بے روزگاری کیسے دور کی: ایک عنوان —— بھوکوں اور بے روزگاروں کو ختم کر کے۔

• امریکہ پاکستان کی حمایت جاری رکھے گا: ایک خبر —— تو پھر اب دشمن اس کا آسماں کیوں ہو۔

• کپڑا ملوں میں ہڑتال: ایک خبر —— وقت سے بچنے کے لئے لنگوٹیاں خرید لیجئے۔

• مرکز نے پنجاب کا کھانڈ کا کوٹہ بڑھا دیا: ایک خبر —— یہ برکتیں ہیں ذیل سنگھ راج کی۔ پنجابیو! دعا دو گیانی ذیل سنگھ کو۔

• پنجاب یونیورسٹی کے امتحان میں نقل بازی روکنے کے اقدامات: ایک خبر —— پاس کرنے کی گارنٹی سے بہتر نہیں ہو سکتے۔

• یو۔پی میں اناج کی کوئی قلت نہیں: ایک خبر —— وہاں قلت ہے ایک اچھے عذر [illegible] کی۔

• آٹھ ریاستوں اور دہلی میں اردو ذریعہ تعلیم امتحان: وزیر تعلیم کا اعلان —— یہ اعلان کاغذی ہے جب تک اسے سرکاری حیثیت حاصل نہ ہو۔



اناج کی سرکاری تجارت کو ناکام بنانے والوں کو وزیر زراعت فخرالدین علی احمد کی کڑی وارننگ۔



مہنگائی کے خلاف عورتوں کی مہم

"شاہجہانپور کے گاؤں میں عشق کے کرشمے" ـــــ ایک نیا تاج محل تعمیر ہوا۔

"یو۔پی انتظامیہ مشینری نااہل ہے" ایک عنوان ـــــ اور اس کا سہرا شری کملاپتی ترپاٹھی کے سر ہے۔

"دلّی میں مکانوں کا مسئلہ" ایک عنوان ـــــ قبرستان سے زیادہ گمبھیر ہے۔

"لڑکیوں کے اسکول کے پاس بوچڑ خانہ" ـــــ انھیں گھر گرہستن کی بجائے قصائی بنا دے گا۔

"لوگوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد دو" چوہان کی تقریر ـــــ اور بیساکھیوں کا سہارا نہ لینے دو۔

"عوام میں سماجی شعور پیدا کریں" ایک عنوان ـــــ عوام بے شعور ہی اچھے۔ شعور آگیا تو سب وزیر سفیر بننے کی کوشش کریں گے۔

"اُردو کو ہائر سیکنڈری میں ذریعۂ تعلیم بنانے کے اقدامات" ایک خبر ـــــ اُردو علاقائی زبان نہ بنے تو سب طفل تسلّیاں ہیں۔

"ڈاک گھر لوٹنے کی کوشش" ـــــ محبوب کی ڈاک نہ ملنے کا نتیجہ۔

"حکومت اُردو ایڈیٹرز کانفرنس کی تجاویز کا تفصیلی جائزہ لے رہی ہے" لوک سبھا میں شری گجرال کا بیان ـــــ اُردو کے دن پھرتے نظر آرہے ہیں۔ خدا نظرِ بد سے بچائے۔

• "غریبی نہیں ہٹ سکتی": ایک جن سنگھی لیڈر ——— جب تک آپ جیسے غریب دشمن موجود ہیں۔

• "آشنا کی بیوی کو زہر دے دیا": ایک خبر ——— حضرتِ عشق کی کرشمہ سازیاں۔

• "چین ہند سے سرحدی تنازعہ میں سابقہ پوزیشن پر قائم": ایک خبر ——— زمیں جُنبد نہ جُنبد گل محمد۔

• "ریلوے ایڈمنسٹریشن میں اصلاح": ایک عنوان ——— اِس جنم میں ممکن نہیں۔ عاقبت کی خدا جانے۔

• "پنجاب میں گندم کے نرخ گر گئے" ——— اناج کی سرکاری تجارت کے مخالفوں پر اوس پڑ گئی۔

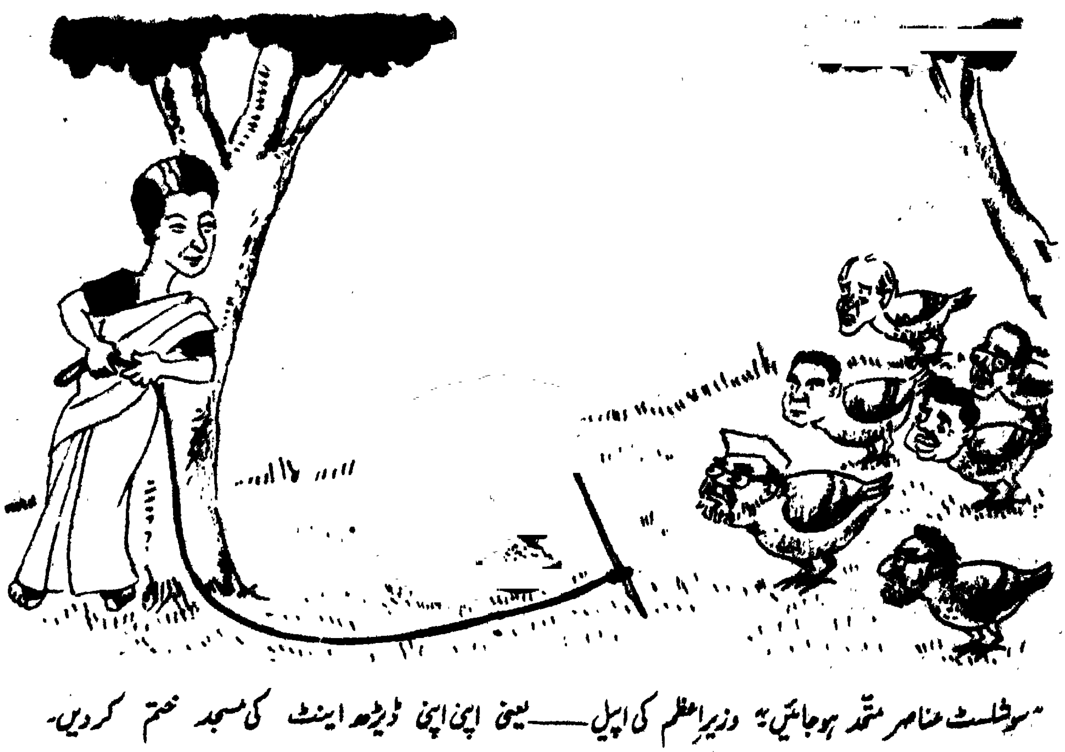
• "فرقہ پرستی کے خلاف جہاد کرو": وزیرِ اعظم کی اپیل ——— اِس لئے کہ اِس کا کاٹا پانی بھی نہیں مانگتا۔

• "۵۷ شہروں کا ماسٹر پلان": ایک خبر ——— یہ تو ہیڈ ماسٹر پلان بلکہ پرنسپل پلان ہُوا۔

• "کانگرس کی رُکنیت کی شرط": ایک خبر ——— بتری نات بتری کے استعمال پر پابندی لگائی جائے۔

• "بہت دُور کی سوجھی": ایک عنوان ——— اِس لئے کہ پاس کی آپ کی سمجھ میں نہیں آتی۔

• "دلّی ماسٹر پلان میں تبدیلی ضروری ہے": ایک عنوان ——— کوئی ہیڈ ماسٹر ہی کرے گا۔



"سوشلسٹ عناصر متحد ہوجائیں": وزیرِاعظم کی اپیل ——— یعنی اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ختم کر دیں۔

شیوسینا مُسلم لیگ ________

خوشتر گرامی

چہرہ سیہ کاریوں کا غماز، آنکھوں میں بے شرمی و بے حیائی۔ ناک بار ہاکٹی۔ زبان زہر آلود۔ ہونٹوں پہ مکر و دغا کے گلے۔ کانوں میں سیسہ کہ کوئی اچھی بات سُنائی نہ پڑے۔ دل و دماغ حبِّ وطن سے خالی خود پرستی اور مطلب پرستی سے معمور۔ اِن عناصر کے مجموعے کا نام ہے ________

شیوسینا مُسلم لیگ

مالابار ہلز اور شیواجی پارک کے ناجائز اختلاط سے بمبئی کی فضاؤں میں پروان چڑھی۔ اس کے دامن پر بے گناہوں کے خون کے لاکھوں دھبے۔ آستینوں میں ناگ چھپے ___ اسٹیج پر ایک دوسرے کے کھلے دُشمن۔ اقتدار کی کرسی پر گھی شکر اور چوں بہ خلوت می روند آں کار دیگری کنند ___ ہندوستان دُشمنوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی۔ قومی مفادات کے غدار، سیکولرزم کے باغی، سوشلزم سے متصادم، جمہوریت سے خائف۔ ہندو سے بھی دھوکا، مُسلمان سے بھی فریب۔ نہ مذہب، نہ دھرم ___ چاندی کے سِکّوں کے پُجاری۔ اقتدار کی کرسیوں کے لئے مکر و دغا اِن کا شیوہ۔ ایک نے بندے ماترم کی حمایت کا راگ الاپ کر اور دُوسری نے اِس کی مخالفت کا جھنڈا اُٹھا کر بمبئی کارپوریشن کا الیکشن لڑا اور کامیابی حاصل کی۔ مگر اُس کے بعد صبح کو جب ووٹروں کی آنکھ کھلی تو دونوں کو ہم آغوش و ہم کنار پاکر اپنی عقل و خرد کی نیلامی پر ماتم کناں اور غالب کی زبان میں نوحہ خواں کہ ؎

دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

اِتنا ہی

عظیم اقبال ایم۔ اے

گنج نمبر ۱، بتیا (بہار)

براد رِ محترم! آداب و نیاز

پچھلے دنوں میں ذہنی پریشانیوں اور جسمانی صعوبتوں سے دو چار رہا ہوں۔ اُس کی خبر آپ کو ہے۔ آپ نے بر موقع پر مجھے یاد کیا، اِس کے لئے ممنون ہوں۔ یہ پورا سال ہی میرے لئے نامساعد ثابت ہوا ہے۔ یکے بعد دیگرے اُلجھنوں کا شکار ہوتا آرہا ہوں، اب تک اُلجھنیں گھیرے ہوئے ہیں۔ مکمل طور پر صحت یاب بھی نہیں ہوں۔ آپ کا حکم نامہ وسط اگست میں ہی مل گیا تھا۔ لیکن ذہن کو کہانی لکھنے کی طرف مائل نہ کر پایا تھا۔ "اتنا ہی" ایک ذہنی مسئلہ ہے جس کی شکار آج کے معاشرہ کی بیشتر عورتیں ہیں —— دعوتِ نظارہ عام ہے، لیکن دیکھئے حد سے تجاوز نہ کیجئے ورنہ نظروں کی یہ جنت گم ہو جائے گی!

خیر طلب —— عظیم اقبال

★

وہ کچھ اور آگے جھکتی تو میری پلکیں بھی جھک جاتیں!

اِس معاملے میں مَیں کچھ زیادہ ہی شرمیلا ہوں! پھر بھی ایسا نہیں کہ کھلی آنکھوں کے سامنے بند پلکوں میں معدوم ہو جاتے ہوں!

اُس کے شانوں کے بیشتر حصّے کھلے تھے۔ ہنسلی کی ہڈیاں ذرا ذرا اُبھری تھیں۔ گریبان کی تراش ڈھیلی اور بہت نیچے تک تھی۔

کسی بھی عورت کا یہ علم کہ کسی مرد کی نگاہیں اُس کے جسم پر کہاں سے کہاں تک پھسل سکتی ہیں، اُس کے لئے باعثِ سکون ہوتا ہے۔

مُسَن تو مجھے بے حد قریب سے جانتی ہے۔ بہت اعتماد کے ساتھ وہ میری سانسوں کی تیزی اور دھڑکنوں کی رفتار کے متعلق اندازے بھی پیش کر سکتی ہے۔

اُس کے گلے کی سنہری زنجیر جھول کر آگے لٹک گئی تھی۔ لاکٹ کا تراشیدہ شیشہ جگ مگ کر رہا تھا۔ وہ اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے داب کر ہلکے سے ہنس دی۔

اُس کی کِھلتی کلیوں کی سی ہنسی بے حد دلکش ہوتی ہے۔ ہونٹوں کے سرے کچھ پھیل جاتے ہیں، رُخساروں میں کچھ خوبصورت خم سے پڑ جاتے ہیں۔ آنکھیں شراروں کی طرح چمک اُٹھتی ہیں۔

اُس کی شہابی رنگت میں ملاحت زیادہ ہی نمایاں ہے۔ اُس کی جِلد کی تابانی کبھی کبھی بڑھ بھی جاتی ہے۔ اُس کی بھویں گھنی اور پلکیں لانبی ہیں۔ ہونٹ نُسبک، گلابی اور پتلے ہیں۔ اُس کے ماتھے پر زخم کا ہلکا سا نشان ہے۔

وہ جُھکی تو ایک خوشبو سی اُڑی۔ سیاہ زُلف کی گھٹائیں اُمڈ پڑیں۔ آنچل سینے سے سرک کر ڈھلک گیا۔ ہلکی ہلکی چاندنی سی بکھر گئی۔ اُس کی پوشاک کے سلمے ستارے جھلملائے۔ اُس کی چوڑیاں ہولے سے بجیں اور جھنکار سی لہرائی۔

میں نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ منڈلاتی ہوئی خوشبو کی

[illegible] کی جانب لپک کر میری طرف بڑھ رہی تھی۔ آہستہ [illegible] ہتھیلیوں کی حدّت بڑھتی جا رہی تھی۔

سمن کی لویں دھیرے دھیرے سُرخ ہوتی جا رہی تھیں۔ اُس کے [illegible] کنول کھلے تھے، آنکھوں کی صہبا چھلک پڑنے کو [illegible] تھی۔ میرے لب کانپ کر رہ گئے۔

وہ شرارت سے مُسکرائی۔ اُس کے سفید دانتوں کی لڑیاں [illegible] چہرے پر جھول گئے بالوں کو جھٹک کر ہٹانے سے اُس کے [illegible] میں پھنسا ہوا سُرخ گلاب نیچے آ گرا۔

"ہائے!"

کچھ حیرت، کچھ پشیمانی بھری اُس کی آواز کھنک گئی۔

میں نے گلاب اُٹھا لیا۔ اپنے ہونٹوں کے قریب لا کر اُسے چوم لیا۔ ہونٹوں پر ہلکی ہلکی گدگدی سی ہوئی۔ مدھم سی خوشبو ناک میں سرسرائی۔ [illegible] کے لئے میں نے آنکھیں مُوند لیں۔

سمن نے پلکیں جھپکائیں۔ اُس کی ناک میں موتی پروئی ہوئی چھوٹی سی نتھ ڈول گئی۔ ہاتھ اُٹھا کر اُس نے نیلے رِبن کی گرہ ٹھیک کی۔ پھر باہیں پھیلا دیں۔ ساڑی کی شکنیں تھرتھرائیں۔ لچک کر انگڑائی لی۔ ایک آہ بھری ——— میرے اندر ایک ترنگ سی لہراتی چلی گئی۔

ہوا کا ایک لطیف جھونکا آیا۔ کہیں پاس ہی سے مدھم موسیقی کی لے لہراتی ہوئی چلی آئی۔ سمن کھڑکی سے پرے نظریں جمائے [illegible] تھی۔ چہچہاتی ہوئی دو چڑیاں پھدک کر دریچے سے روشن دان کی طرف اُڑ گئیں۔ سامنے چھت سے جالے بُنتی ہوئی ایک چھوٹی سی مکڑی سرکتی ہوئی نیچے چلی آ رہی تھی۔ بار بار اُڑا دینے کے بعد بھی ایک مکھی میری کُرسی کے ہتھے پر آ کر بیٹھ بیٹھ جا رہی تھی۔

اِدھر اُدھر سے بھٹک کر میری نظریں آخر کار سمن پر آ ٹکی تھیں۔ اُس کے جسم میں دل آویز سے خم تھے۔ کولہے اور سینے کے اُبھار میں [illegible] تناسب تھا۔ کمر کی لچک بے حد حسین تھی، گردن تو کسی پھول کی ڈال کی طرح جھکی تھی۔

دیوار گھڑی کی ٹِک ٹِک ماحول کو پُر اسرار بنا رہی تھی۔ کیلنڈر کے [illegible] والے اوراق پھڑپھڑا رہے تھے۔ سمن ایسے کھڑی تھی جیسے [illegible] کی پناہ کا انتظار ہو۔ چاہتی ہو کوئی آئے اور

[illegible] ذرا ذرا خم کھاتی ہوئی کمر ٹن آدھی [illegible] تھا۔ باریک شیفون [illegible] سامنے کر آ زریں [illegible] ساڑی کے کنارے فرش پر لوٹ رہے تھے۔

اندر ہی اندر کوئی برقی قوت [illegible] سمن کے ہونٹ کچھ پیچے ہیچے سے معلوم ہو رہے تھے [illegible] اُس کے رُخساروں پر اُبھر رہی تھیں۔ اُس کی آنکھوں میں [illegible] موجیں اُٹھتی تھیں، مچل جاتی تھیں۔ کانوں کے [illegible] جھول کر اُس کی شبک گردن کو چھوتے ہوئے چھو رہے تھے۔

میرے اور اُس کے بیچ کا فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا ——— بس چند قدموں کا فرق، کچھ سانسوں کی دیوار حائل تھی۔ کار نر کے آئینے میں اپنے آپ پر میری نظریں اُٹھیں۔ کنپٹیوں سے بہت نیچے تک [illegible] بال، آنکھوں میں پیاس، ہونٹوں پر پپڑیاں، کالر مُڑے ہوئے سامنے کے سارے بٹن کھلے، سینے کے لہلہاتے بال، چھوٹے چھوٹے گل بوٹوں سے آراستہ قمیص، قرمزی نگوں والی کف لنکس، میری دو انگلیوں میں امیٹیشن والی انگوٹھیاں تھیں۔

سمن کو پا لینے کی خواہش مجھ میں انگڑائی جاگتی ——— پاس آ کر بھی دُوریاں! کچھ پرے پرے سے وہ رہتی۔ قدم سے سنبھل سنبھل کر میں چلتا۔ دھڑکنیں تھم تھم کر رہ جاتیں۔

اب وہ دریچے کے قریب منی پلانٹ کی ہری ہری بیلوں کو دیکھ رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ اُس کی جانب بڑھا۔ اُس نے چہرہ گھما کے میری طرف نظر ڈالی، مسکرائی۔ دُوسرے لمحے میں نے اُسے اپنی بانہوں میں لے لینا چاہا۔ بل کھاتی ہوئی وہ مجھ سے دُور ہو گئی۔ اُس نے غصّہ بھری آنکھوں سے ایک پل مجھے دیکھا۔ پھر بھاگتی ہوئی راہداری میں جا گھسی۔

اُس کے دوڑتے ہوئے قدموں کی چاپ اب تک سُنائی دے رہی تھی۔

میں نے منی پلانٹ کی کتنی ساری پتیاں توڑ ڈالی تھیں، ریزہ ریزہ نوچ ڈالا تھا۔

[illegible] میری آنکھوں میں تیر رہی تھیں [illegible]

غزل

[illegible] ایم اے۔ ایل ایل بی۔ [illegible]

آ جاتے [illegible] تمہاری نگاہ میں
ہم نامرادِ عشق کہاں بیٹھے ہیں راہ میں

دنیا گنہگار ہے تیری نگاہ میں؟
زاہد ہے تیرا زہد بھی داخل گناہ میں

خوش ہوں کہ چل رہا ہوں محبت کی راہ میں
جانِ بہار کون ہے میری نگاہ میں

قدموں میں کیا نہیں ہے جو ہے مہر و ماہ میں
پستی نگاہ میں ہے بلندی نگاہ میں

عیش و نشاطِ زندگی دھوکا تھا خواب تھا
آنا پڑا ہمیں ترے غم کی پناہ میں

جلوے ہیں پردہ دار تری بزمِ حسن کے
دیکھا جو میں نے بجلیاں کوندیں نگاہ میں

در پردہ رہ کے خاک اڑا دی ہے عشق کی
شامل ہو تم بھی کیا مرے ذوقِ گناہ میں

مجھ کو بھی آ گئے تھے جوانی کے چار دن
میں بھی لٹا ہوں دوست محبت کی راہ میں

ہر منزلِ حیات سے گزرا چلا گیا
ہر مرحلے پہ آپ تھے میری نگاہ میں

دیوانگانِ عشق کو دنیا کی کیا خبر
دنیا کو چھوڑ گزرے، کہیں گردِ راہ میں

کونین میں سما نہ سکیں جن کی تجلیاں
کس کا ہے ظرف رکھ سکے اُس کو نگاہ میں

غارت وہ رہروانِ محبت ہی اور تھے
برسے تھے پھول جن پہ محبت کی راہ میں

غزل

پرکاش ناتھ پرویز ایم۔ اے

لذتِ دید کیا اے خدا جرم ہے؟
آنکھ دی ہے تو کیوں دیکھنا جرم ہے؟

زہر گھولو نہ جامِ محبت [illegible]
چاندنی رات میں روٹھنا جرم ہے

ایسے احباب سے کیا امیدِ وفا
جن کے مذہب میں رسمِ وفا جرم ہے

ڈوبتا ہے تو ڈوبے سفینہ مگر
دوستو! منتِ ناخدا جرم ہے

کون ترکِ محبت کرے حسن سے
ایسے موضوع پر سوچنا جرم ہے

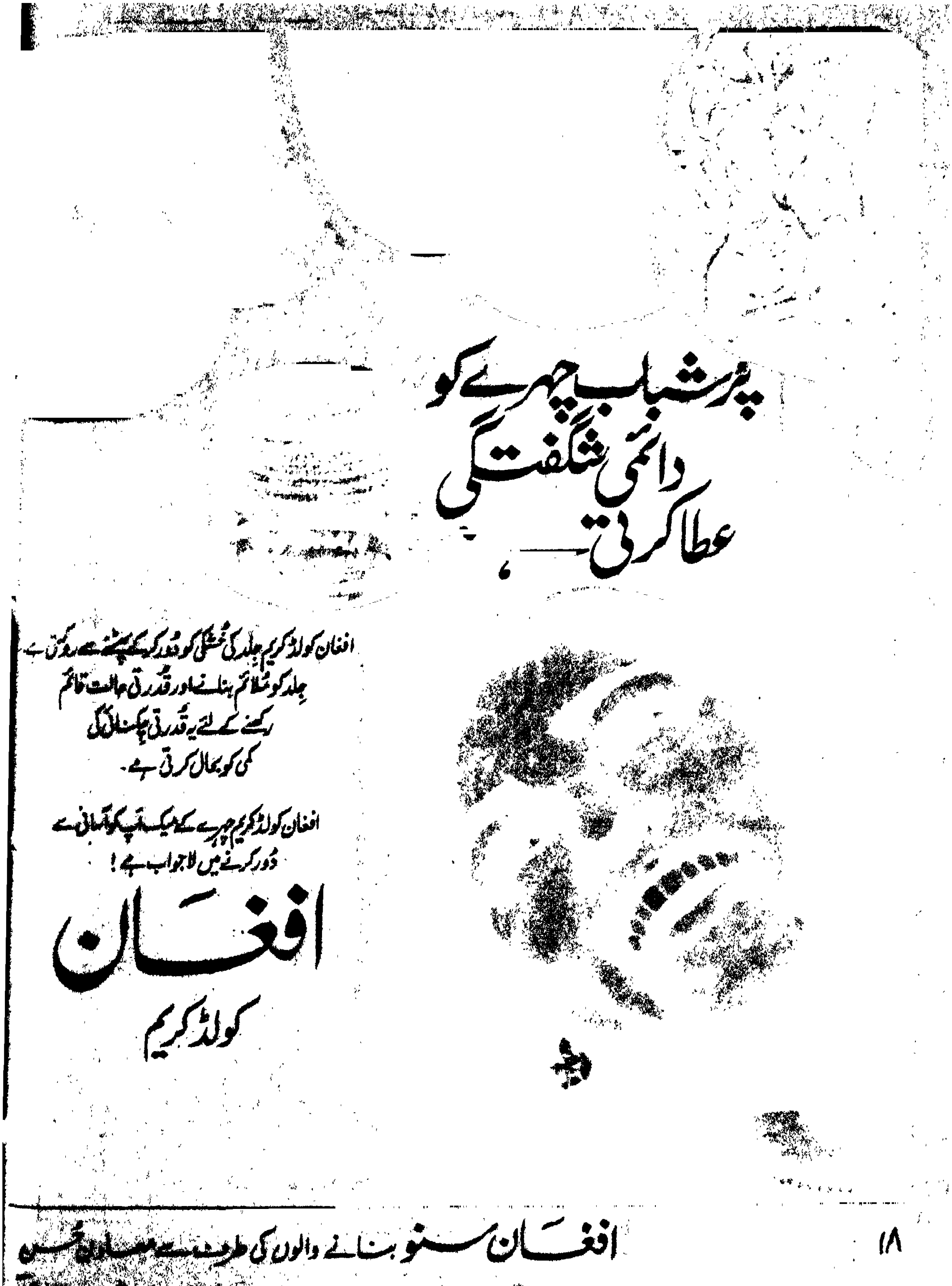
چھوڑیئے اب وفا کا زمانہ کہاں
بے وفاؤں میں ذکرِ وفا جرم ہے

خود بدل دیں گے ہم رنگِ تقدیر کو
اپنی بدبختیوں کا گلا جرم ہے

خوب تر ہے محبت کا یہ معجزہ
وہ بھی کہتے ہیں دل توڑنا جرم ہے

حرف آنے لگا نامِ اخلاص پر
یہ خطا ہے مری یا ترا جرم ہے

اُن کو لازم ہے قہرِ خدا سے ڈریں
وہ جو کہتے ہیں حرفِ خدا جرم ہے


پر شباب چہرے کو
دائمی شگفتگی
عطا کرتی ہے
افغان کولڈ کریم جلد کی خشکی کو قدرتی طریقے سے روکتی ہے
جلد کو ملائم بنانے اور قدرتی حالت قائم
رکھنے کے لئے یہ قدرتی چکناہٹ
کی کمی کو بحال کرتی ہے۔
افغان کولڈ کریم چہرے کے میک اپ کو آسانی سے
دور کرنے میں لاجواب ہے!
افغان
کولڈ کریم
افغان سنو بنانے والوں کی طرف سے معیاری تحفہ
۱۸

جیون ڈور

کوثر چاند پوری

ہمدرد ریسرچ کلینک اینڈ نرسنگ ہوم، آصف علی روڈ، نئی دہلی نمبر ۱
مکرمی! تسلیم

ایک تازہ افسانہ "جیون ڈور" ارسال ہے ——— ضلع کھرگون (ایم۔پی) مسٹر محمد الیاس کے بنگلہ پر ۲۳ جون کو ایک ادبی جلسہ مقامی کالج کے طلباء نے منعقد کیا تھا۔ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے مجھے دعوتِ شرکت دی گئی تھی۔ مختلف ادبی اور ہنگامی موضوعات کے علاوہ آپ کی ذات اور "بیسویں صدی" خاص طور پر معرضِ گفتگو آئے۔ مجھ سے آپ کے مذہب کے بارے میں سوال ہوا۔ میں نے کہا کہ ان کا مذہب ہے انسانیت۔ استقلال، دیانت ——— اور بیباکی بھی اس کی شاخیں ہیں۔ اس جلسہ میں اسمٰعیل بھائی آرٹسٹ نے تصویریں بھی لی تھیں۔ ایک تصویر ارسال کر رہا ہوں۔ غالباً "بیسویں صدی" میں اس کی اشاعت غیر موزوں نہ ہوگی۔

نیاز کیش ——— کوثر چاند پوری

★

راج رانی آئینہ کے سامنے بیٹھی گا رہی تھی ———

تارا ڈوبا سورج چمکا گھر گھر ناچی بھور
ساجن میرے توڑ نہ دینا تم جیون کی ڈور

لمبے اور سیاہ بال کمر اور شانوں پر بکھرے ہوئے تھے گیت کے بول درد بھرے نغموں میں ڈھل کر فضا میں کھنک رہے تھے نگاہیں آئینہ سے ہٹ کر میز پر رکھے منی پلانٹ پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ دونوں کونوں کے منی پلانٹ مرجھا گئے تھے۔ پتیوں پر زردی جھلک رہی تھی۔ وہ یرقان کے مریض کی آنکھوں کی طرح پیلے پڑ گئے تھے۔ مدن دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوا اور چپ چاپ رانی کے پیچھے کھڑا رہا وہ اسی طرح گنگنائے جا رہی تھی ———

توڑ نہ دینا تم جیون کی ڈور
جیون ڈور . . .

مدن نے آگے بڑھ کر رانی کی دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ دئے اور زور سے ہنس پڑا۔

"بس چھوڑو، سنی تم نے کتنی اچھی کویتا بنائی ہے!"

"میں نے؟"

"معلوم ہوتا ہے تم سنک گئیں رانی!"

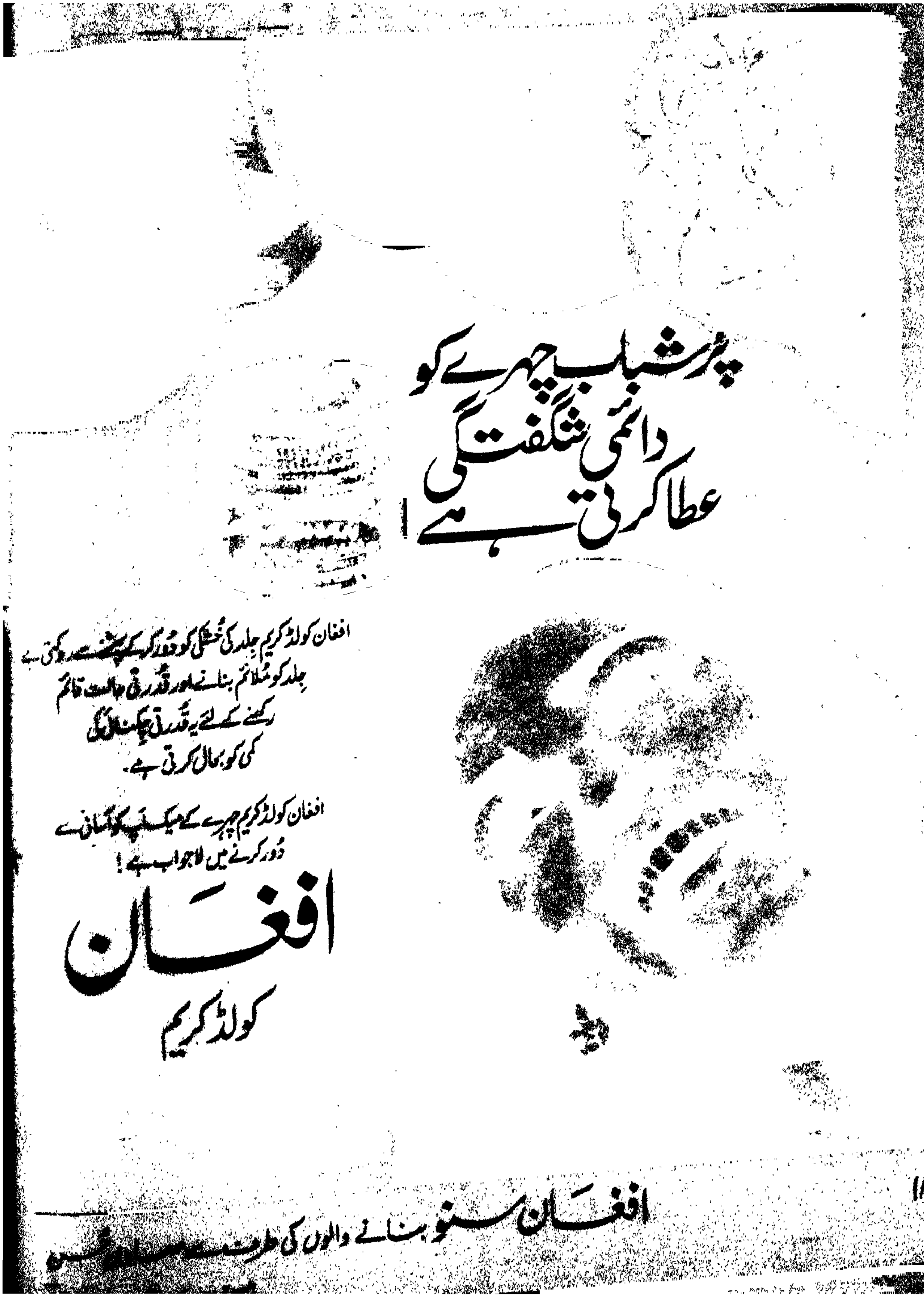
"سویرے ہی سویرے ایسی بدشگونی؟ اچھی بات سوچ ہی نہیں سکتے کبھی۔ سوچ رہی تھی پلانٹ کیوں سوکھ گئے؟"

"پانی نہیں بدلا ہوگا تم نے بوتل کا۔"

"وہ تو تیسرے دن بدل ڈالتی ہوں۔"

"روز بدلنا چاہئے۔ پودوں کو غذا نہ ملے گی تو سوکھ ہی جائیں گے۔"

"سبزی اور تازگی بھی کیا چیز ہے! اسی کا نام خوبصورتی اور کوملتا ہے۔ کل تک یہ پیڑ کتنے سجیلے دکھائی دے رہے تھے۔ نگاہیں کھنچی تھیں ان کی طرف۔ بلکہ دل بھی ایسی حال آدمی کا اس کا


پُرشباب چہرے کو
دائمی شگفتگی
عطا کرتی ہے!
افغان کولڈ کریم جلد کی خشکی کو دور کر کے پھٹنے سے روکتی ہے
جلد کو ملائم بنانے اور قدرتی حالت قائم
رکھنے کے لئے یہ قدرتی چکنائی کی
کمی کو بحال کرتی ہے۔
افغان کولڈ کریم چہرے کے میک اپ کو آسانی سے
دور کرنے میں لاجواب ہے!
افغان
کولڈ کریم
افغان سنو بنانے والوں کی طرف سے
۱۸

جیون ڈور

کوثر چاندپوری

ہمدرد ریسرچ کلینک اینڈ نرسنگ ہوم، آصف علی روڈ، نئی دہلی نمبر ۱
مکرمی! تسلیم

ایک تازہ افسانہ "جیون ڈور" ارسال ہے ——— ضلع کھرگون (ایم۔پی) مسٹر محمد الیاس کے بنگلہ پر ۲۲ جنوری کو ایک ادبی جلسہ مقامی کالج کے طلباء نے منعقد کیا تھا۔ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے مجھے دعوتِ شرکت دی گئی تھی۔ مختلف ادبی اور ہنگامی موضوعات کے علاوہ آپ کی ذات اور "بیسویں صدی" خاص طور پر معرضِ گفتگو آئے۔ مجھ سے آپ کے مذہب کے بارے میں سوال ہوا۔ میں نے کہا کہ ان کا مذہب ہے انسانیت۔ استقلال، دیانت ——— اور بیباکی بھی اس کی شاخیں ہیں۔ اس جلسہ میں اسمٰعیل بھائی آرٹسٹ نے تصویریں بھی لی تھیں۔ ایک تصویر ارسال کر رہا ہوں۔ غالباً "بیسویں صدی" میں اس کی اشاعت غیر موزوں نہ ہوگی۔

نیاز کیش ——— کوثر چاندپوری

راجدرانی آئینے کے سامنے بیٹھی گا رہی تھی ——

تارا ڈوبا سورج چمکا گھر گھر ناچی بھور
ساجن میرے توڑ نہ دینا تم جیون کی ڈور

لمبے اور بکھرے بال کمر اور شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ گیت کے بول [illegible] بھرے نغموں میں ڈھل کر فضا میں گنگنا رہے تھے۔ نگاہیں آئینے سے ہٹ کر میز پر رکھے منی پلانٹ پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ دونوں کونوں کے [illegible] پتے مرجھا گئے تھے۔ پتیوں پر زردی جھلک رہی تھی۔ وہ یرقان کے مریض کی آنکھوں کی طرح پیلے پڑ گئے تھے۔ مدن دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوا اور چپ چاپ راجدرانی کے پیچھے کھڑا رہا۔ وہ اسی طرح گنگنائے جا رہی تھی ——

توڑ نہ دینا تم جیون کی ڈور
جیون ڈور . . .

مدن نے [illegible] راجدرانی کی [illegible] آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے اور زور سے ہنس پڑا۔

"بس چھوڑو، تم نے کتنی اچھی کویتا بنائی ہے!"

"میں نے؟"

"معلوم ہوتا ہے تم سنک گئیں رانی!"

"سویرے ہی سویرے ایسی بدشگونی؟ اچھی بات سوچ ہی نہیں سکتے کبھی۔ سوچ رہی تھی پلانٹ کیوں سوکھ گئے؟"

"پانی نہیں بدلا ہوگا تم نے بوتل کا۔"

"وہ تو تیسرے دن بدل ڈالتی ہوں۔"

"روز بدلنا چاہیے۔ پودوں کو غذا نہ ملے گی تو سوکھ ہی جائیں گے۔"

"سبزی اور تازگی بھی کیا چیز ہے! اسی کا نام خوبصورتی اور [illegible] ہے۔ کل تک یہ پیڑ کتنے [illegible] تھے [illegible] کھینچی تھیں ان کی طرف۔ [illegible] بھی [illegible]

[illegible] ہے۔ جب گرد جاتی ہے تو گال اور بال سب [illegible] ہو جاتے ہیں۔"

[illegible] ہو گئے! بالوں کی نوکیں پھٹ گئیں، گال بے رونق [illegible]

"ایسا نہیں رانی! تمہارے بالوں کا کھردرا پن دیکھنے میں بہت اچھا معلوم ہوتا ہے اور گال تو سچ مچ گلاب کا پھول ہیں! ان میں رنگ [illegible] بھی!"

"ابھی تو کہہ رہے تھے سنک گئی ہوں میں!"

"وہ الگ بات ہے رانی! میرا مطلب تھا کہ تمہیں حسن فوبیا ہو گیا ہے۔"

"یہ دوسری بدخیالی ہوئی!" رانی چڑ گئی۔ اُس نے خفگی کے انداز سے مدن کو دیکھا۔ جلدی جلدی بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا باندھ لیا اور پھر آئینہ دیکھنے لگی۔ رخساروں پر قدرتی سُرخی جھلک رہی تھی۔ بالکل شفق سی بکھری ہوئی تھی۔ وہ سوچنے لگی — کیا یہ بھی کمھلا جائیں گے؟ اِن پر بھی زردی کھنڈ جائے گی؟

"چپ کیوں ہو گئیں؟"

"بتاؤں میں کیا گا رہی تھی؟"

"بالکل بھول گیا، شاید پتنگ کی ڈور والی بات تھی کوئی۔"

"بتاؤ اُسے توڑ تو نہ دو گے؟"

"نہیں جی! میں کبھی نہ توڑوں گا! آپ ہی کٹ گئی تو اُس کا جوڑنا شاید مشکل ہو جائے۔"

"ٹھیک کہتے ہو مدن! یہی سوچ کر تو جی اُداس ہو گیا تھا اور کومیتا ٹوٹنے لگی تھی۔"

"پوری سناؤ۔"

"تمہیں کیا سناؤں۔ کوئی جیسا لگتا ہی نہیں تمہارے دل میں۔"

اُسی لمحہ رانی کرسی چھوڑ کر کچن میں چلی گئی۔ اسٹوو سے نکلتے ہوئے شعلے دیر سے یاد دلا رہے تھے کہ ہمیں کیوں جلائے جا رہی ہو رانی! ہمارا کیا قصور ہے؟

رانی نے چائے کا پانی چڑھا دیا۔ لپٹیں مدھم پڑنے لگیں۔ پتیلی کی ٹھنڈی پیشانی چوم کر اُن کی گرمی ماند پڑ گئی۔ جیسے محبوب کو دیکھ کر دل کی جلن میں کمی آجاتی ہے۔ ذرا دیر بعد وہ دونوں ہاتھوں میں

[illegible] چائے [illegible] آئی [illegible] اُسے ملنا نہیں چھوڑا تھا۔ مدن خاموش [illegible] رنجیدہ کر دیا۔ وہ بہت جلدی تو ملنا [illegible] سمجھتی خاموشی اور سنجیدگی کا الزام [illegible]

"چائے پیو پھر گھومنے چلیں گے۔"

مدن چونک کر بولا: "ارے! چائے [illegible]؟"

"اسٹوو پہلے ہی جلا آئی تھی، پتیلی میں پانی [illegible] چائے تیار ہو گئی! دیر کا تصور ہی اِس زمانہ میں دماغ [illegible] ہے۔ زندگی بہت تیز رَو ہو گئی ہے۔ پہاڑی ندی کی طرح [illegible] کا سفر منٹوں میں طے کر لیتی ہے۔"

"سچ کہتی ہو رانی! زندگی بہت تیز رفتار ہو گئی ہے [illegible] بھی [illegible] نہیں سمجھا کرتے تھے جتنی جلدی اِس زمانہ میں زندگی گل ہو جاتی ہے، دیئے آندھی میں بھی ٹمٹماتے رہتے ہیں اور یہ ذرا پھونک ہی مارنے سے اڑ جاتی ہے!"

رانی اِس موضوع کو طول نہیں دینا چاہتی تھی [illegible] دیکھ رہی تھی کہ مدن اُسی کی طرح یاسیت کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ اُس نے چمچہ میں ذرا سی شکر لے کر ٹی پاٹ میں بھری ہوئی چائے کو ہلا دیا اور مدن کی پیالی میں چینی ڈالتے ہوئے بولی۔

"تم تو دو چمچے لیتے ہو — اور [illegible] چند دنوں سے نمک بھی تو ڈال رہے ہو۔ ارے بولو بھئی!"

"ہاں میرے بدن کو کلورائڈ کی ضرورت ہے۔"

رانی کرسی پر بیٹھ گئی۔ پیالیوں سے بھاپ اُٹھتی رہی۔ مدن سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔

"میں پوچھتی ہوں تم چائے میں دھواں کیوں گھول رہے ہو؟"

"اِس سے کڑواہٹ آجاتی ہے چائے میں اور یہی تلخی بہت اچھی لگتی ہے مجھے۔ تم میں اور اِس دھوئیں میں یہ فرق ہے کہ تم کبھی کبھی زیادہ کڑوی ہو جاتی ہو!"

"اور اُس وقت تم مجھے اُگل دینا چاہتے ہو؟"

"نہیں ایسا نہیں۔ میں تو کڑوی بھی مزے سے پی جاتا ہوں۔ اُس سے بخار ٹوٹ جاتا ہے نا!"

وہ چائے سِپ کرنے لگے۔ بار بار [illegible] کی

اُس وقت وہ ہنس دی لیکن کے لیے بہت سے پتّے خزاں کا تصور پیش کرتے ہیں جیسے خزاں بہار کے بعد ضرور آتی ہے۔ انسان کا دل کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو اس میں خزاں اور بہار کی تبدیلی کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ ساحل پر پھیلی ہوئی دنیا ذہن کو مست کئے بغیر نہیں رہتی۔

"میں ساڑی بدلتی ہوں، تم بھی کپڑے بدل ڈالو۔"

"کہاں چلنا ہے؟"

"کیا بتا سکتی ہوں ابھی سے۔"

راستہ میں اُن دنوں کی بات چل نکلی جب رانی نئی نئی مدن کے گھر آئی تھی اور سب نے اُسے دیکھ کر کہا تھا۔

'بہت سندر ہے بہو رانی!'

ایک بوڑھی عورت بول اُٹھی تھی۔

'بہو کیا ہے کیوڑے کا پھول ہے! خوشبو بکھر رہی ہے چاروں طرف؟'

یہ رائے غلط نہ تھی۔ رانی حسین تھی۔ اُس کے انگ انگ سے مہک پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ حسن اور خوشبو پر عورتوں سے بہتر اظہارِ خیال اور کون کرسکتا ہے۔ رانی کی سیدھی مانگ میں سیندور کی لکیر دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ سرخ مخمل کی پٹی بچھا دی گئی ہے جس پر کوئی بہت بڑا آدمی چلنے والا ہے اور وہ بڑا آدمی آخر آہی گیا! مدن ہی کو حق تھا کہ وہ سیندور کی اُس شاہراہ کو آنکھوں سے روند ڈالے، ایسی نگاہوں سے دیکھے کہ سیندور ہواؤں میں اُڑتا دکھائی دے

اُس شاہراہ کا ایک سرا مدن کے دل میں اُلجھا ہوا تھا، دوسرا رانی کے احساس میں بندھ گیا تھا۔ وہ اپنی خوبصورتی پر اتراسی رہی تھی۔ کھلے پارک میں ٹہلنے سے اُنھیں بہت فرحت ہوتی۔ چھاتی میں خوشی کے آبشار اُبلنے لگے، کافی دن چڑھے جب وہ گھر لوٹے تو گردن کے بلب جگمگا رہے تھے۔

"کیا لائٹ آف نہیں کی تھی رانی؟"

"یاد نہیں، شاید نہیں کی تھی۔"

"دل کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی تم میری جیب میں بھرے ہوئے نوٹ بھی جلا ڈالتی ہو!"

"جانتی ہوں میری کھول چھوڑی بچت کی اسکیم کے پرزے

آتا دیتی ہے؟"

مدن اور رانی کی شادی کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے مشکل سے چھ سات مہینے ہوئے ہوں گے۔ ان تھوڑے دنوں میں اتنی گہری محبت ہو گئی تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے جنم جنم سے ساتھ رہتے آئے ہیں۔ ان کا گھر بالکل الگ تھا، گھر کا کوئی آدمی اُدھر بغیر اجازت نہیں آسکتا تھا۔ بھائی بہن سب یہی خیال رکھتے تھے۔ ماں باپ نے جان بوجھ کر انھیں ساتھ رہنے کا موقع دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مدن نے اپنی پسند سے رانی کو جیون ساتھی نہیں بنایا تھا، اُس نے زندگی کو ماں باپ کے اشاروں کے حوالے کر دیا تھا۔ رانی دو تین بار مدن کو دیکھ چکی تھی، اُسے شکل و صورت میں کوئی خاص کشش محسوس نہ ہوئی تھی۔ بدصورتی کا بھی کوئی شائبہ نظر آیا تھا، پیشانی پر ایک طرح کا جال آمیز جلال ضرور تھا۔ رانی کو منزلِ زندگی کا خیال کرکے ہلکی سی گھبراہٹ کا احساس ضرور ہوا کرتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ سماج میں اس گھبراہٹ کی کوئی حیثیت نہیں۔ مرد اور عورت کسی نہ کسی مرحلہ پر ایک دوسرے سے منسلک ہو کر ہی رہتے ہیں۔ مدن اور رانی کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو محض گوارا ہی کیا تھا۔ اُن کے دلوں میں محبت کی آگ اُس وقت بھڑکی جب وہ جیون ساتھی بن گئے۔ رانی نے محسوس کیا کہ مدن کے لمبے قد میں بلا کی خوبصورتی ہے۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں سے شرارت جھلک رہی ہے۔ اِدھر مدن کا دل کہتا رانی کے جسم کا سوچ پھولوں کی سیج میں بھی نہیں ہوسکتا! اُس کی بانہوں کی سی گرمی نہ چاندنی میں ہے نہ دھوپ میں۔ وہ اپنی اپنی جگہ سمجھ چکے تھے کہ یہ کوئی ایسا رشتہ ہے جسے ازلی بھی کہا جاسکتا ہے اور ابدی بھی! روز بروز یہ تعلق گہرا ہوتا گیا۔ اِن میں گل و بلبل، چاند اور چکور کا سا ربط اور شمع و پروانہ کا سا عشق ہوگیا۔ رانی کو مدن کے بغیر چین نہ آتا اور مدن کو رانی کی جدائی گوارا نہ ہوتی۔ اُنھوں نے ایسی جنت بنائی تھی جس میں ہر لمحہ مسرتیں رقص کیا کرتی تھیں۔ اسی دوران میں منی پلانٹ آپ ہی آپ مرجھانے لگے۔ رانی اُنھیں بے حد پسند کرتی تھی۔ اُس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات کا ہجوم رہنے لگا۔ وہ بوکھلا کر اُنھیں دماغ سے

جسٹ دیکھ رنگین خیالات کی تتلیاں پھر پھڑکنے لگیں۔ اُن کی بھنبھناہٹ کانوں کو چبھنے لگی۔ رانی نے اپنے ذہن میں مستقبل کا جو نقشہ بنایا تھا اُس کی لکیریں دھیرے دھیرے محو ہونے لگیں۔ جیسے شفق کی رنگینیاں رات کی تاریکی میں گھل جاتی ہیں اور اُس صبح کو جب وہ گا رہی تھی ——

گھر گھر ناچی بھور،
تو اُس کے دل پر ایسی ہی تاریکیاں منڈلا رہی تھیں۔

ایک دن مدن آفس سے آیا تو رانی کپڑے تبدیل کئے بغیر مسہری پر پڑی تھی۔

"کیا بات ہے رانی؟"

"کچھ نہیں، جی ذرا اُداس ہے۔"

"چائے نہیں پیوگی؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"دل نہیں چاہتا۔"

"ایک کپ کافی ہی پی لو!"

"نہیں۔"

"ایسی بھی کیا بات ہے۔ آخر کافی کو تم نے ہمیشہ جیتا خون کہا ہے۔"

"ایک وقت آتا ہے جب اُن کے نام سے بھی طبیعت متلانے لگتی ہے!"

"کب آتا ہے وہ لمحہ؟"

"جب آدمی بیمار ہو جاتا ہے!"

"تم تو اچھی خاصی ہو!"

"تمہیں کیا پتہ میں کیسی ہوں!"

مدن یہ سنتے ہی غمگین ہو گیا۔ اُسے اپنی زندگی کے چمن میں خزاں کی سنسناہٹ سنائی دینے لگی۔

رانی ساری رات جسم میں درد کی شکایت کرتی رہی۔ اُس کی نس نس دُکھ رہی تھی۔ وہ بار بار پنڈلیاں دبانے لگتی کئی دن تک یہی کیفیت رہی۔ چہرے پر گہری سُرخی آ گئی۔ ناک کی نوک پر انگارا سا دہکتا محسوس ہوتا۔

ایک دن مدن ڈاکٹر کو لے آیا۔ وہ اُس کا بچپن کا دوست تھا۔ برسوں مدن کے ساتھ ہوسٹل میں رہ چکا تھا۔ اُس نے رانی کو دیکھ کر بہت تشویش کا اظہار کیا۔

رازداری کے لہجہ میں آہستہ سے بولا۔

"لیپرسی کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ مدن کسی اسپیشلسٹ کو دکھاؤ۔"

"ایسا نہ کہو شام!"

"بیماری کا چھپانا ٹھیک نہیں۔ مدن! میں تمہارا دوست ہوں۔"

"اسی لئے کہتا ہوں ایسی بات منہ سے مت نکالو۔ لیپرسی ہائے رام!"

"بیماری آپ بول رہی ہے مدن!"

"جھوٹ!" مدن نے جھلا کر کہا —— "چنبیلی کی کلیاں مسکرانے ہی کے لئے کھلا کرتی ہیں۔ وہ ہمیشہ ہنستی رہتی ہیں!" یہ کہتے کہتے اُس کی نگاہیں منی پلانٹ کی سمت اُٹھ گئیں۔ اُس کا دل بیٹھ گیا۔ دھڑکنیں دھیمی پڑ گئیں۔ رانی روز ہی ان کا پانی بدل ڈالتی ہے۔ جڑیں بھی پھوٹ رہی ہیں، پھر کیوں سوکھے جا رہے ہیں یہ پودے؟

شام جھوٹا ہے۔ ماکھن چور کہیں کا! اُس کی بیماری فریب دے رہی ہے۔ رانی اور لیپرسی! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا! یہ بالکل انہونی بات ہے!

آہستہ آہستہ رانی کے بدن کی رعنائی اِسی طرح کم ہونے لگی جیسے روشنی تاریکی میں گھلتی جا رہی ہو! ایک وقت ایسا بھی آیا جب رانی کو سب سے الگ تھلگ رہنے کا مشورہ دیا گیا۔

مدن کے دل نے کہا —— "میں رانی کو کبھی نہ چھوڑ سکوں گا! وہ میری زندگی ہے۔ اُس سے جُدا ہونا میرے لئے موت سے کم نہیں! میں اُس کا سارا زہر اپنے اندر جذب کر لوں گا!"

رانی کو پتہ چلا تو اُس نے بگڑ کر کہا۔

"مدن کو مجھ سے مت چھینو۔ اسے میرے ساتھ ہی رہنے دو۔ مہک پھول سے جُدا نہیں ہو سکتی!"

"رانی مدن پر ترس کھاؤ اُسے بیٹے دو اپنے ساتھ آگ میں مت جلاؤ!" شام نے کہا۔
یہ سُن کر وہ خاموش ہو گئی۔ سوچا ٹھیک ہے مدن کو آگ سے بچانا ہی عقلمندی ہے۔ میں اُس کے لئے ہر مصیبت برداشت کر لوں گی۔
ایک دن بسورتی شام کو جب سُرمئی دُھند کے سُورج کی دم توڑتی کرنوں کو نگل جانے کی کوشش کر رہے تھے، رانی نے مدن سے کہا۔
"میرے پاس نہ آیا کرو مدن!"
"کیوں نہ آیا کروں؟ تمھارے بدن کی خوشبو سے میرے اندر توانائی آتی ہے۔"
"وہ خوشبو آوارہ ہو چکی ہے مدن! اُسے گرفت میں لانے کی کوشش نہ کرو۔"
"ایسا نہیں ہو سکتا رانی! میں تم سے دُور نہیں رہ سکتا!"
"ضد نہیں کرتے مدن! میری رگوں میں جو الاکھول رہی ہے۔ نہ جانے کب لاوا پھوٹ پڑے!"
"ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ زلزلے آتے ہیں۔ لاوا اُبلتا ہے۔ لیکن زندگی مَوت کے سامنے سر نہیں جُھکاتی۔ اُس کی پیشانی سدا اُونچی ہی رہتی ہے۔"
"جذباتی نہ بنو مدن! حقیقت بہت سنگین ہوتی ہے!"
"اِرادہ اُس سے زیادہ سنگین ہوتا ہے! میں جذبات ہی سے حقیقت کی چٹانوں کو پگھلا کر رکھ دوں گا۔ جذبات کا سمندر سُوکھ نہیں سکتا۔ اُس کی لہروں سے روانی چھینی نہیں جا سکتی! مجھے دھکے دے کر یہاں سے نکالنے کی کوشش نہ کرو رانی! میں تمھاری سانسوں میں اپنی سانسیں سمو دینا چاہتا ہوں!"

مدن رانی کے ساتھ ہی رہا۔ اُس نے باپ سے بھی نہایت صفائی کے ساتھ کہہ دیا۔
"ڈیڈی! رانی میری زندگی ہے! وہ نہ رہی تو میں بھی نہ رہوں گا!"
اور مدن نے پُوری طاقت سے اُس شُعلہ کو اپنی سانسوں میں گھول کر پی لیا، جو اندر ہی اندر رانی کو پھونک رہا تھا۔
مجبور ہو کر دونوں کو لیپرسی سینٹر میں بھیج دیا گیا۔ مدن کے لئے جھونپڑیوں سے دُور خیمہ لگا دیا گیا تھا۔ وہ رانی کے ساتھ وہیں رہا۔ سینٹر آبادی سے دُور بہت پُرفضا مقام پر تھا۔ باہر سے کوئی شخص وہاں نہ آ سکتا تھا۔ مدن رانی کی دیکھ بھال کرتا جو روز بروز گھُلتی جا رہی تھی، بالکل اُس موم بتی کی طرح جس کے ایک کونے پر آگ لگی ہو، اُس کی گرمی لمحہ بہ لمحہ موم کو پگھلا رہی ہو۔ وہ اپنے ہاتھ سے رانی کو دوا کھلاتا، کپڑے بھی آپ ہی تبدیل کراتا۔ رانی رُندھے ہوئے لہجہ میں کہتی۔
"جیون ڈور اب ٹوٹنے ہی والی ہے!"
"نہیں، اُس کا ایک سرا میرے ہاتھ میں ہے۔ میں کبھی اُسے نہیں چھوڑوں گا۔"
"پتنگ کٹ جاتی ہے تو ڈور ڈھیلی ہو کر زمین پر آ پڑتی ہے۔"
مدن کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ وہ غور سے رانی کے بدلے ہوئے چہرے کو دیکھتا رہتا۔ اُسے اُبھری ہوئی پھنسیوں کے نیچے وہی خوبصورتی بکھری دکھائی دیتی جو رانی کے رُخساروں کا حصہ بن چکی تھی۔ مدن بڑی ہمّت کے ساتھ بیماری سے لڑ رہا تھا۔ رانی سپر ڈال چکی تھی۔ اُس کا حوصلہ مٹی کے کھلونے کی طرح ٹُوٹ گیا تھا۔
ایک دن رانی نے پُوچھا۔
"وہ پَودے تو اب بالکل سُوکھ گئے ہوں گے۔ پانی کون بدلتا ہو گا اُن کا؟ ایک دن میں بھی سُوکھ جاؤں گی!"
"اور میں؟"
"تم پھر ہرے ہو جاؤ گے۔ تمھارے لئے میں جو سُوکھ رہی ہوں! میرا اِس جہنّم سے زندہ نکلنا ممکن نہیں۔"
"جہنّم نہیں رانی! جہاں ہم دونوں ساتھ ہوں اُسے جنّت کے سوا کچھ اور نہیں کہا جا سکتا!"
دو برس یونہی بیت گئے۔ مدن کے باپ سوہن نے

[illegible] ساری دولت پانی کی طرح بہا دی۔ وہ روس، لندن اور امریکہ سے [illegible] منگاتا، ڈاکٹروں کو بیش قیمت [illegible]۔

ایک بہت بڑے ڈاکٹر نے نہایت قیمتی دوا تجویز کی۔ اُس کا ایک ہی کورس لندن سے مل سکا۔ مدن بولا۔

"یہ پورا کورس رانی کے لئے ہے۔"

"نہیں اسے تم استعمال کرو گے۔"

"ہرگز نہیں!"

"پھر ہم دونوں کھائیں گے!"

تیسرے سال رانی اور مدن کو سینٹر سے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ وہ اچھے ہو چکے تھے۔ مدن رانی کو لے کر گھر آیا تو اُس نے دیکھا منی پلانٹ بالکل سرسبز ہو چکے تھے۔ جڑوں کے باریک ریشے پانی میں تیر رہے ہیں۔

"پودے ہرے ہو گئے!" رانی خوشی سے اچھل پڑی۔

"بھابی! میں نے ان کی بڑی دیکھ بھال کی ہے" [illegible] نے داد طلب انداز میں کہا۔

"جیتی رہو شیل!" مدن نے خوش ہو کر کہا۔

"چلو جیون ڈور ٹوٹتے ٹوٹتے رہ گئی!" [illegible] نے [illegible] دیکھ کر کہا۔

اور مدن اُس کے رخساروں کی رنگتوں میں کھو گیا۔

مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے! مضمون [illegible] لکھا کریں اور دو سطروں کے درمیان فاصلہ چھوڑنا بے حد ضروری ہے [illegible] چھپنے سے رہ جاتے ہیں۔ ہمیشہ غیر مطبوعہ مضامین بھیجیں اور ایڈیٹر کی [illegible] کے خاتمے پر غیر مطبوعہ لکھیں۔ بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں یہ نہایت نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اپنے پاس مضمون کی نقل ضرور رکھیں کیونکہ ناقابل اشاعت مضامین ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔ ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے مضمون کے ساتھ ٹکٹ [illegible] اپنا پورا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا نام [illegible] ارسال کریں ورنہ ہم مضمون کی واپسی سے معذور ہوں گے۔ مدیر

رباعیات

کرشن موہن ایم اے

م کو بھی تنا پیار ملا کچھ ہوتا
پ سے ہیں بھی نہ گلا کچھ ہوتا
کچھ اپنی بھی تقدیر میں راحت ہوتی
اے کاش وفاؤں کا صلا کچھ ہوتا

بت کی وہ نکہت ہے نہ گونا گونی
اجن گئے پردیس سڑک ہے سونی
ایسے میں ستم اور بھی ڈھاتی ہے بہار
موسم سے ہوئی میری اُداسی دُونی

ھلتا ہے فسوں کا راز کونپل کونپل
بنتا ہے جنوں کا ساز کونپل کونپل
پھلے ہیں شباب و حسن گلشن گلشن
آئی ہے بہارِ ناز کونپل کونپل

من ہے خیالوں پہ تو باتوں میں گھٹن
ذن ہی سے ہویدا ہے تہذیبِ سخن
کھل کر کبھی کرتا نہیں اظہار اپنا
احساس ہمارا بھی ہے کیا غنچہ دہن

چکے سے زمانے کے شداید سہنا
اور شا ... ستمگر میں بیکل رہنا
دو دوروں میں کیا حالت دل ہم کو لیں
یہ سچ ہے کہ مشکل ہے بُرا ہی کہنا

غزل

شاکر حکیمی کامٹوی

حسرتِ پرسشِ حالات بھی کچھ ٹھیک نہیں
وہ نہ چاہیں جسے وہ بات بھی کچھ ٹھیک نہیں

یہ بھی اچھا ہی کیا تم نے جو رُخ پھیر لیا
ہاں بظاہر مرے حالات بھی کچھ ٹھیک نہیں

وہ بھی کیا شوق جو رسوا سرِ بازار کرے
اِس قدر شورشِ جذبات بھی کچھ ٹھیک نہیں

خیر رندی تو برا شغل ہے لیکن یہ ریا
شیخ جی آپ کی یہ بات بھی کچھ ٹھیک نہیں

اِک نہ ہونے سے ترے اے مرے خورشید جمال
دن کا کیا ذکر مری رات بھی کچھ ٹھیک نہیں

بار بار ایک طلب ایک تقاضہ بے سود
روز روز اُن سے ملاقات بھی کچھ ٹھیک نہیں

ضبطِ گریہ نے کیا اور بھی کچھ دل کا زیاں
اِس طرح بندشِ جذبات بھی کچھ ٹھیک نہیں

میرے اشعار کا مطلب نہ سمجھ لیں کچھ اور
آج کل اُن کے خیالات بھی کچھ ٹھیک نہیں

اِس سے کم ہوتی ہے توقیر محبت شاکر
کھل کے جو بات ہو وہ بات بھی کچھ ٹھیک نہیں

اپنی ساری دولت پانی کی طرح بہا دی۔ وہ روس، لندن اور امریکہ سے نئے نئے [illegible] انجکشن منگاتا، ڈاکٹروں کو بیش قیمت تحفے دیتا۔

ایک بہت بڑے ڈاکٹر نے نہایت قیمتی دوا تجویز کی۔ اُس کا ایک ہی کورس لندن سے مِل سکا۔ مدن بولا۔

"یہ پورا کورس رانی کے لئے ہے۔"

"نہیں اسے تم استعمال کرو گے۔"

"ہرگز نہیں!"

"پھر ہم دونوں کھائیں گے!"

تیسرے سال رانی اور مدن کو سینٹر سے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ وہ اچھے ہو چکے تھے۔ مدن رانی کو لے کر گھر آیا تو اُس نے دیکھا منی پلانٹ بالکل سرسبز ہو چکے تھے۔ جڑوں کے باریک ریشے پانی میں تیر رہے ہیں۔

"پودے ہرے ہو گئے!" رانی خوشی سے اچھل پڑی۔

"بھابی! میں نے اِن کی بڑی دیکھ بھال کی ہے" شیل نے داد طلب انداز میں کہا۔

"جیتی رہو شیل!" مدن نے خوش ہو کر کہا۔

"چلو جیون ڈور ٹوٹتے ٹوٹتے بچ گئی" [illegible] دیکھ کر کہا۔

اور مدن اُس کے رخساروں کی رنگتوں میں ڈوب گیا!

مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ مضمون [illegible] لکھا کریں اور دو سطروں کے درمیان فاصلہ چھوڑیں۔ یہ بہت ضروری ہے [illegible] سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں ہمیشہ غیر مطبوعہ مضامین بھیجیں اور یا [illegible] کے خاتمے پر غیر مطبوعہ لکھیں۔ بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین [illegible] نہایت نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اپنے پاس مضمون کی نقل ضرور رکھیں [illegible] ضائع کر دئے جاتے ہیں۔ ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے مضمون کے ساتھ [illegible] اپنا پورا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا لفافہ ارسال کریں ورنہ ہم مضمون کی واپسی [illegible]

رباعیات

کرشن موہن ایم اے

م کو بھی تما پیار ملا کچھ ہوتا
ب سے ہمیں بھی نہ گلا کچھ ہوتا
کچھ اپنی بھی تقدیر میں راحت ہوتی
اے کاوش وفاؤں کا صلہ کچھ ہوتا

ہت کی وہ نکہت ہے دگونا گونی
ساجن گئے پردیس سڑک ہے سونی
ایسے میں ستم اور بھی ڈھاتی ہے بہار
موسم سے ہوئی میری اداسی دونی

کھلتا ہے فسوں کا راز کونپل کونپل
بجتا ہے جنوں کا ساز کونپل کونپل
چھلکے ہیں شباب و حسن گلشن گلشن
آئی ہے بہارِ ناز کونپل کونپل

دمن ہے خیالوں پہ تو باتوں میں گھٹن
دغن ہی سے ہویائی ہے تہذیبِ سخن
کھل کر کبھی کرتا نہیں اظہار اپنا
احساس ہمارا بھی ہے کیا غنچہ دہن

چپکے سے زمانے کے شدائد سہنا
اور شا [illegible] ضبط میں بیکل رہنا
دو بولوں میں کیا حالتِ دل ہم کھولیں
یہ سچ ہے کہ مشکل ہے رباعی کہنا

غزل

شاطر حکیمی کامٹوی

حسرتِ پرسشِ حالات بھی کچھ ٹھیک نہیں
وہ نہ چاہیں جسے وہ بات بھی کچھ ٹھیک نہیں

یہ بھی اچھا ہی کیا تم نے جو رُخ پھیر لیا
ہاں بظاہر مرے حالات بھی کچھ ٹھیک نہیں

وہ بھی کیا شوق جو رسوا سرِ بازار کرے
اس قدر شورشِ جذبات بھی کچھ ٹھیک نہیں

خیر رندی تو برا شغل ہے لیکن یہ ریا
شیخ جی آپ کی یہ بات بھی کچھ ٹھیک نہیں

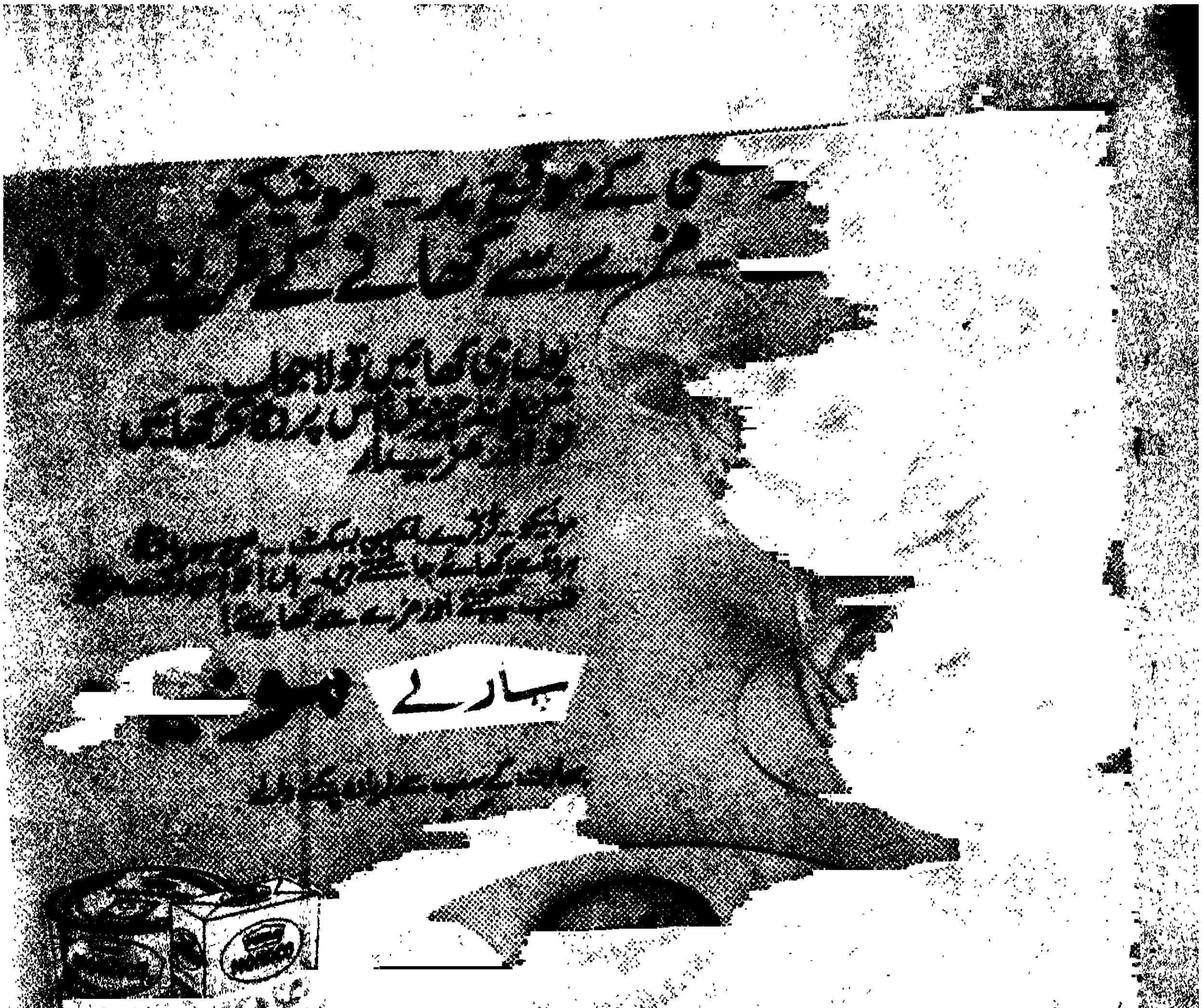
اِک نہ ہونے سے ترے اے مرے خورشید جمال
دن کا کیا ذکر مری رات بھی کچھ ٹھیک نہیں

بار بار ایک طلب ایک تقاضہ بے سود
روز روز اُن سے ملاقات بھی کچھ ٹھیک نہیں

ضبطِ گریہ نے کیا اور بھی کچھ دل کا زیاں
اس طرح بندشِ جذبات بھی کچھ ٹھیک نہیں

میرے اشعار کا مطلب نہ سمجھ لیں کچھ اور
آج کل اُن کے خیالات بھی کچھ ٹھیک نہیں

اس سے کم ہوتی ہے توقیرِ محبت شاطر
کھل کے جو بات ہو وہ بات بھی کچھ ٹھیک نہیں


ہمارے

کلر بلائنڈ

مس صفیہ سلطانہ ایم۔ اے، بی۔ ایڈ
معرفت قاری عبدالخالق صاحب، محلہ شیرازان، سہارنپور

محترم المقام: خلوص و احترام

ایک تازہ ترین کہانی "کلر بلائنڈ" ارسالِ خدمت ہے۔ پسند آئے تو شریکِ اشاعت کرکے ممنون فرمائیں ——— کہانی کیسی ہے؟ یہ آپ کی بلند نگاہ ہی بتا سکتی ہے! . . .

مخلص ——— صفیہ سلطانہ

★

شاہی باغ پر ایک چھوٹا سا بس اسٹاپ ہے۔ بس ابھی آکر رکی ہے۔ یہاں مسافروں کی گہما گہمی نہیں ہے۔ یہاں ہاکروں کا بے ہنگم شور نہیں ہے۔ یہاں فقیروں کی دردناک صدائیں نہیں ہیں۔ کتنی خاموشی ہے، کتنا سکون ہے۔ شاہی باغ ایک پک نک اسپاٹ ہے۔ یہ چھوٹا سا پُرفضا مقام ہے۔ دس بارہ میل کے علاقے سے لوگ یہاں پک نک منانے آتے ہیں۔ شام گہری ہو رہی ہے۔ اس لئے یہاں کوئی مسافر نہیں اترا۔ میں بس کی اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوں۔ کھڑکی کے دھندلے شیشے سے میں اونچے درختوں میں [illegible] ہوئے باغ کے دروازے کی طرف دیکھتا ہوں۔ یہ دروازہ [illegible] سیڑھیوں کی بلندی پر بنا ہوا ہے۔

[illegible] ماحول میں اچانک کچھ آہٹیں جاگ اٹھتی ہیں۔ [illegible] کی سیڑھیوں پر کچھ لڑکیاں اترتی نظر آتی ہیں۔ ان کا رُخ [illegible] ہے۔ میں سنبھل کر بیٹھ جاتا ہوں۔ پچھلے دروازے [illegible] میں داخل ہو جاتی ہیں۔ ان کی باتوں اور قہقہوں [illegible] ایک دم جاگ اٹھتی ہے۔ بس میں ایک عجیب سی [illegible] خوشبو بکھر گئی ہے۔ شام کے دھندلکے میں خوشبوؤں کی [illegible] کاک ٹیل میرے حواس پر چھاتی جا رہی ہے۔ میں گردن گھمائے [illegible] ان لڑکیوں کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ یہ کسی کالج کی طالبات معلوم ہوتی ہیں۔ یہ مختلف قسم کے لباس پہنے ہوئے ہیں۔ غرارہ، بیل باٹم، چوڑی دار پاجامہ، تہمد اور ساڑی سب ایک نظر میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ میری گردن دُکھ رہی ہے۔ لیکن مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ ایک خوبصورت لڑکی اچانک میری طرف بڑھتی ہے۔ میرا دل جھوم اٹھتا ہے۔ لڑکی کے بال کمر پر بکھرے ہوئے ہیں۔ کالے بالوں کے پس منظر میں اس کا شہابی چہرہ بہت بھلا معلوم ہو رہا ہے۔ مجھے رنگوں کی پہچان نہیں ہے۔ میں بچپن ہی سے کلر بلائنڈ ہوں۔ لیکن میں شرط لگا سکتا ہوں کہ لڑکی کے چہرے کا رنگ ضرور شہابی ہوگا! میں نے کئی افسانوں میں پڑھا ہے ہیروئن کے چہرے کا رنگ شہابی ہوتا ہے۔ لڑکی نہ جانے کس رنگ کی شرٹ اور تہمد پہنے ہوئے ہے۔ شرٹ پر جس رنگ کا پرنٹ ہے۔ تہمد کا بارڈر بھی اسی رنگ کا ہے۔ رنگ کا نام چاہے جو ہو لیکن بہت اچھا معلوم ہو رہا ہے۔ دوپٹہ غائب ہے۔ لڑکی مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر دوسری طرف والی کھڑکی کے قریب بیٹھ گئی ہے۔ میری گردن کو کچھ آرام ملا ہے۔ اب مجھے پیچھے گھوم کر دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف نظریں گھمانے ہی سے اسے دیکھ لوں گا۔ میرے اور لڑکی کے درمیان دو بچے بیٹھے ہیں۔ دونوں لڑکے ہیں۔ دونوں کی عمریں سات اور چار سال کے درمیان ہوں گی۔ ان کے سخت گیر



پیارے مونیکو
MONACO
everest/257c PP/UR

کلر بلائنڈ

مِس صفیہ سُلطانہ ایم۔ اے، بی۔ ایڈ

معرفت قاری عبدالخالق صاحب، محلّہ شیرازان، سہارنپور

محترم المقام! خلوص و احترام

ایک تازہ ترین کہانی "کلر بلائنڈ" ارسالِ خدمت ہے۔ پسند آئے تو شریکِ اشاعت کرکے ممنون فرمائیں ——— کہانی کیسی ہے؟ یہ آپ کی بلند نگاہ ہی بتا سکتی ہے! . . .

مخلص ——— صفیہ سُلطانہ

★

شاہی باغ پر ایک چھوٹا سا بس اِسٹاپ ہے۔ بس ابھی آکر رُکی ہے۔ یہاں مسافروں کی گہما گہمی نہیں ہے۔ یہاں ہاکروں کا بے ہنگم شور نہیں ہے۔ یہاں فقیروں کی دردناک صدائیں نہیں ہیں۔ کتنی خاموشی ہے، کتنا سکون ہے۔ شاہی باغ ایک پِک نِک اِسپاٹ ہے۔ یہ چھوٹا سا پُرفضا مقام ہے۔ دس بارہ میل کے علاقے سے لوگ یہاں پِک نِک منانے آتے ہیں۔ شام گہری ہو رہی ہے۔ اِس لئے یہاں کوئی مسافر نہیں اُترا۔ میں بس کی اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوں۔ کھڑکی کے دُھندلے شیشے سے میں اُونچے درختوں میں گھرے ہوئے باغ کے دروازے کی طرف دیکھتا ہوں۔ یہ دروازہ آٹھ دس لمبی سیڑھیوں کی بلندی پر بنا ہُوا ہے۔

پُرسکون ماحول میں اچانک کچھ آہٹیں جاگ اُٹھتی ہیں۔ دروازے کی سیڑھیوں پر کچھ لڑکیاں اُترتی نظر آتی ہیں۔ اُن کا رُخ بس کی طرف ہے۔ میں سنبھل کر بیٹھ جاتا ہوں۔ پچھلے دروازے سے لڑکیاں بس میں داخل ہو جاتی ہیں۔ اُن کی باتوں اور قہقہوں سے زندگی ایک دم جاگ اُٹھتی ہے۔ بس میں ایک عجیب سی ملی جلی خوشبو بکھر گئی ہے۔ شام کے دُھندلکے میں خوشبوؤں کی یہ کاک ٹیل میرے حواس پر چھاتی جا رہی ہے۔ میں گردن گھمائے لگاتار اُن لڑکیوں کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ یہ کسی کالج کی طالبات معلوم ہوتی ہیں۔ یہ مختلف قِسم کے لباس پہنے ہوتے ہیں۔ غرارہ، بیل باٹم، چُوڑی دار پاجامہ، تہمد اور ساری سب ایک نظر میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ میری گردن دُکھ رہی ہے۔ لیکن مجھے اِس کی پروا نہیں ہے۔ ایک خوبصورت لڑکی اچانک میری طرف بڑھتی ہے۔ میرا دل جھُوم اُٹھتا ہے۔ لڑکی کے بال کمر پر بکھرے ہوئے ہیں۔ کالے بالوں کے پس منظر میں اُس کا شہابی چہرہ بہت بھلا معلوم ہو رہا ہے۔ مجھے رنگوں کی پہچان نہیں ہے۔ میں بچپن ہی سے کلر بلائنڈ ہوں۔ لیکن میں شرط لگا سکتا ہوں کہ لڑکی کے چہرے کا رنگ ضرور شہابی ہوگا! میں نے کئی افسانوں میں پڑھا ہے، ہیروئن کے چہرے کا رنگ شہابی ہوتا ہے۔ لڑکی نہ جانے کِس رنگ کی شرٹ اور تہمد پہنے ہوئے ہے۔ شرٹ پر جس رنگ کا پرنٹ ہے۔ تہمد کا بارڈر بھی اُسی رنگ کا ہے۔ رنگ کا نام چاہے جو ہو لیکن بہت اچھا معلوم ہو رہا ہے۔ دوپٹہ غائب ہے۔ لڑکی مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر دوسری طرف والی کھڑکی کے قریب بیٹھ گئی ہے۔ میری گردن کو کچھ آرام مِلا ہے۔ اب مجھے پیچھے گھُوم کر دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف نظریں گھُمانے ہی سے اُسے دیکھ لوں گا۔ میرے اور لڑکی کے درمیان دو بچّے بیٹھے ہیں۔ دونوں لڑکے ہیں۔ دونوں کی عمریں سات اور چار سال کے درمیان ہوں گی۔ اُن کے سخت گیر

ماں باپ پچھلی سیٹ پر ہیں۔ اُنھوں نے بچّوں کو کھڑکی کے پاس نہیں بیٹھنے دیا ہے۔ باپ دو تین بار بچّوں کو ڈانٹ چکا ہے ــــ ماں گود والے بچّے میں مشغول ہے۔

بس اِسٹارٹ ہو گئی ہے۔ کونے والی کھڑکی سے ہَوا کا تیز پریشر میرے چہرے پر پڑتا ہے۔ میں اُٹھ کر کھڑکی بند کر دیتا ہوں۔ ڈرائیور کنکھیوں سے مجھے دیکھتا ہے۔ خوبصورت لڑکی میری طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ اُسی وقت پیچھے سے اُس کی ہم سفر لڑکی آواز دیتی ہے۔

"رانی! میرے پاس تھوڑی سی جگہ خالی ہے۔ چاہو تو یہاں آجاؤ!"

"نو تھینکس۔ میں یہاں آرام سے بیٹھی ہوں!" خوبصورت لڑکی گھوم کر جواب دیتی ہے۔

میں سوچتا ہوں۔ اِس کا نام تو مہارانی ہونا چاہئے تھا۔ یہ سب لڑکیوں سے زیادہ چارمنگ ہے۔ اِس کے جسم کا ہر زاویہ گولائی مائل ہے۔ چہرہ گول ہے۔ ناک بھی ہلکی سی گولائی لئے ہوئے ہے۔ تیز دھار دار ناکیں مجھے یوں بھی پسند نہیں ہیں۔ اُس کی قدرے چھوٹی اور گولائی مائل آنکھوں میں بلا کی کشش ہے۔ اِس لڑکی کی آنکھیں بڑی ہوتیں تو چہرہ کا تناسب ہی بگڑ جاتا۔ جس چہرے پر جیسی آنکھیں ہوتی ہیں بس وہی مناسب ہوتی ہیں۔ تصوّر میں کسی چہرے پر دُوسری آنکھ ناک سیٹ کر کے دیکھو تو وہی چہرہ کارٹون نظر آنے لگتا ہے۔ اگر ممتاز کے چہرے پر سائرہ بانو کی ناک اور وحیدہ رحمان کی آنکھیں لگا کر دیکھو تو وہ کتنی عجیب نظر آئے گی!

رانی مجھے دیکھ رہی ہے۔ میں خوش ہو کر ٹائی کی گرہ چیک کرنے لگتا ہوں۔ میں اِس وقت کیسا معلوم ہو رہا ہوں گا صُبح آئینہ میں دیکھا ہُوا اپنا ریفلیکشن ذہن میں لہرانے کی کوشش کرتا ہوں۔ جس جگہ سے اور جس زاویہ سے رانی مجھے دیکھ رہی ہے میں تصوّر میں ٹھیک اُسی جگہ سے اور اُسی زاویہ سے خود کو دیکھتا ہوں۔ میں بہت اِسمارٹ نظر آ رہا ہوں۔ رانی کی نِگاہیں میرے خیال کی تائید کر رہی ہیں۔ وہ بہت گہری نِگاہوں سے مجھے دیکھ رہی ہے۔ جہاں کالے کالے درخت بھوتوں کی فوج کی طرح بھاگے جا رہے ہیں۔

کِسی نے بس کی لائٹ آن کر دی ہے۔ لڑکی کے چہرے پر بھرپُور روشنی پڑتی ہے۔ چہرے کی روشنی میری آنکھوں میں سے ہوتی ہوئی میرے خون میں اُتر کر گھل مل گئی ہے۔ کیسا پیارا اتفاق ہے کہ اُس لڑکی کی آنکھیں بالکل میری جیسی ہیں! اُس کی آنکھوں میں پیار کا رنگ ہے۔ اگر زندگی میں کسی راستہ پر ہم قدم سے قدم مِلا کر چلے تو لوگ ہماری قسمت پر رشک کریں گے۔ اِتنا خوبصورت پیچ اُنھیں زندگی میں کبھی دیکھنے کو نہ مِلا ہوگا!

کسی لڑکی نے ٹرانسِسٹر کا سوئچ آن کر دیا ہے۔ ایک پُرانا گیت فضا میں جھنجھنا اُٹھتا ہے۔ میں دل ہی دل میں گیت کے بول گنگناتا ہوں ؎

"گائیں ہم تم ملہار پیار چھلکے
..... پیار چھلکے!"

گانے کی آواز سُن کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے گلاس میں تیرتے ہوئے برف پر رنگین شربت کی دھار ڈال دی ہے اور رنگ کی باریک دھاریاں گلاس میں گھوم گھوم کر نئے نئے راستے بنا رہی ہیں۔ میں کلر بلائنڈ ضرور ہوں۔ لیکن بے حد Sensitive ہوں۔ خوبصورت چیزوں کو Appreciate کرنا جانتا ہوں۔ خوبصورتی کے احساس سے مجھے بہت سکون مِلتا ہے۔ میری Catagory کے دُوسرے لوگ شاید بے حِس بھی ہوتے ہوں گے۔ میں تو بس نیلے رنگ کو سُرخ، ہرے رنگ کو زرد، گلابی رنگ کو بادامی بتا کر شرمندہ ہوتا ہوں۔ کالے اور سفید رنگ کی مجھے بہت اچھی شناخت ہے۔ میں نے اِس سلسلہ میں کبھی دھوکا نہیں کھایا۔

رانی پھر مجھے دیکھ رہی ہے۔ میرے ماتھے پر دلیپ کمار کی طرح بال پہلے ہی بکھرے ہوئے ہیں۔ اب میں اپنے ہونٹ ڈھیلے چھوڑ کر آنکھیں ذرا اُوپر کو چڑھا لیتا ہوں۔ گالوں پر زیادہ گوشت نہیں ہے۔ اِس لئے مجبوری ہے۔

ٹرانسسٹر پر پاکیزہ کا گانا آ رہا ہے ؎

"یونہی کوئی مِل گیا تھا سرِ راہ چلتے چلتے"

میں معنی خیز نِگاہوں سے رانی کی طرف دیکھتا ہوں۔ وہ

نظریں جھکا لیتی ہے۔

پچھلی سیٹوں پر مینا کماری کا تذکرہ چھڑ گیا ہے۔ کچھ لڑکیاں مینا کے انجام پر افسوس ظاہر کر رہی ہیں۔ کچھ رشک کر رہی ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے میں کھڑا ہو کر کہوں "اے خود فریب لڑکیو . . . ! یہ مینا کماری نے نہیں لتا منگیشکر نے گایا ہے! تمہیں شکر کرنا چاہیئے کہ لتا زندہ سلامت ہے۔ خدا کرے تم سب کی عمر لتا کو لگ جائے!"

پھر میں سوچتا ہوں اتنی بہت سی لڑکیوں کی عمر مل کر سینکڑوں سال بنے گی۔ پھر میں وہ ساری عمر لتا کی عمر میں جوڑ کر تصور کی نظر سے لتا کو دیکھتا ہوں تو مجھے رائیڈر ہیگرڈ کی بڑھیا "SHE" نظر آتی ہے جو آگ کے شعلوں میں گھری ہوئی کھڑی ہے۔ میں گھبرا کر تصور کو بریک لگا دیتا ہوں۔

بار بار پیچھے مڑ کر دیکھنا مناسب نہیں ہے۔ رانی پر اس حرکت کا غلط امپریشن پڑے گا۔ لیکن رانی میری کیا ہوتی ہے جو میں اُس کی رائے کی پروا کروں . . .

پھر بھی میں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا۔ اگر کسی پر یوں ہی اچھا امپریشن پڑ رہا ہے تو اُسے بگاڑنے کی کیا ضرورت ہے۔

رانی کچھ لمحوں تک مسلسل مجھے دیکھتی رہتی ہے۔ میں قسم کھا سکتا ہوں اُس کی آنکھوں میں پیار کا رنگ ہے۔ رانی کچھ سوچتی رہتی ہے۔ پھر اپنے پرس میں سے نوٹ بک اور پنسل نکال کر کچھ لکھنے لگتی ہے۔ میرا دل کہہ رہا ہے —— یہ پرچہ میرے لئے ہے! لیکن میری زبان خاموش رہتی ہے۔ میں راجکمار کی طرح تھوک کا گھونٹ نگل کر خالی خالی نظروں سے اُسے لکھتے ہوئے دیکھتا رہتا ہوں۔

رانی پرچہ پھاڑ کر اُس کی چھوٹی چھوٹی تہیں بناتی ہے۔ پھر پنسل اور ڈائری پرس میں ڈال لیتی ہے۔ پرچہ اُس کی مٹھی میں ہے۔ اب وہ اُن دونوں بچوں کی طرف دیکھتی ہے جو میرے اور اُس کے درمیان حائل ہیں۔ اُس کی آنکھوں میں کشمکش ہے۔ میں اُسے اپنی نگاہوں سے سمجھاتا ہوں —— "اچھی لڑکی، گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ پرچہ مجھے دے دو۔ میں اِس پرچہ کا صحیح حقدار ہوں!"

رانی تھوڑا بہت سمجھ جاتی ہے۔ وہ آرام سے پُشت کی طرف سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ شاید مناسب موقع کی منتظر ہے۔

میں بھی رانی جیسا پوز بنا کر مستقبل کے خوابوں میں ڈوب جاتا ہوں۔ میں خیالوں میں رانی کے ترشے ہوئے ہیرے جیسے جسم کو مختلف لباس پہنا کر دیکھتا ہوں۔ کبھی اُس کے جسم پر ساری لپیٹ دیتا ہوں۔ کبھی غرارہ اور کبھی بیل باٹم پہناتا ہوں۔ پھر میں بہت جتن سے اُسے شادی کا جگمگاتا ہوا لباس پہناتا ہوں۔ اُسے بہت سارے زیوروں سے سجا دیتا ہوں۔ اُس کے ماتھے پر بندیا لگا کر اُس کی مانگ میں سیندور بھر دیتا ہوں۔

اچانک بس کسی جنگل میں رُک جاتی ہے۔ میں چونک کر بیٹھ جاتا ہوں۔ ڈرائیور بس کا انجن چیک کر رہا ہے۔ رانی اُسی طرح بیٹھی ہے۔ لیکن اُس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ بجلی کی روشنی میں وہ بہت غمزدہ نظر آ رہی ہے۔ جانے کہاں سے اتنی بہت سی مایوسی اُس کے چہرے پر آ گئی ہے۔ شاید وہ محبت کے انجام سے خوف زدہ ہے۔ شاید وہ مستقبل کے غموں سے گھبرا رہی ہے۔ پگلی کہیں کی . . . ! مجھ سے وابستہ ہونے کے بعد اِن فضول اندیشوں کی کوئی گنجائش ہی نہ رہ جائے گی۔ میرا قرب پا جانے کے بعد یہ لڑکی دُنیا کے ہر غم سے دُور ہو جائے گی۔ مجھے خود پر اِتنا اعتماد ہے۔ اِتنا ہی بھروسہ اِس لڑکی کو مجھ پر ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ ساری باتیں میں اِسے کس طرح بتاؤں؟ بات چیت کے لئے تو کوئی بھی بہانہ بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ لڑکی جب اِتنی احتیاط برت رہی ہے تو مجھے خاموش ہی رہنا چاہیئے۔ میں مایوسی سے پچھلی سیٹوں پر نظر ڈالتا ہوں۔ رانی کی ساتھ والی لڑکیاں تھکی ہاری سی بیٹھی ہیں، کچھ اُونگھنے لگی ہیں، کچھ باہر اندھیروں کو گھور رہی ہیں۔ میں بھی باہر دیکھنے لگتا ہوں۔ کالے درختوں پر بے شمار جگنو جھلملا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے آج رات جنگل میں ستاروں کی بارش ہوئی ہے! رانی کی نگاہیں میری نظروں کا ساتھ دیتی ہیں۔ بس پھر اِسٹارٹ ہو گئی ہے۔ شہر پہنچنے میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی ہے۔

راستہ خاموشی سے طے ہو رہا ہے۔ رانی کبھی کبھی میری طرف دیکھ لیتی ہے۔ میرے برابر بیٹھا ہوا چھوٹا بچّہ مجھ سے ٹیک لگا کر سو گیا ہے۔ میں آہستہ سے اُسے اپنے بازو کا سہارا دے دیتا ہوں۔

بچّے کے باپ نے میری اِس حرکت کو دیکھ لیا ہے۔ شاید اُسے میری ہمدردی پسند نہ آئی۔ وہ غصّے سے مجھے دیکھتا ہے۔ پھر سوتے ہوئے بچّے کو گھسیٹ کر سیدھا بٹھا دیتا ہے۔ بچّہ گھبرا کر اُلٹ ہو گیا ہے۔ ماں گود میں ہلتے ہوئے بچّے کو تھپکیاں دینے لگی ہے۔

اب جنگل ختم ہو گیا ہے۔ شہر کی روشنیاں دُور سے نظر آ رہی ہیں۔ چند منٹ بعد یہ سفر ختم ہو جائے گا۔ میں دل بھر کر رانی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ اُس کی آنکھوں میں بھی میرے لئے یہی جذبہ ہے۔

بس رُک گئی ہے۔ سب لوگ اُتر رہے ہیں۔ میں رانی کے پیچھے پیچھے سیٹوں کے درمیان سے گزر رہا ہوں۔ رانی کا ٹھنڈا ہاتھ میرے گرم ہاتھ سے ٹکرایا ہے۔ پرچہ میرے ہاتھ میں منتقل ہو گیا ہے۔ رانی تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی بس سے اُتر جاتی ہے۔ میرے قدم بھاری پڑ گئے ہیں۔ لڑکیوں کا حسین کارواں رکشوں میں سوار ہو رہا ہے۔ میں تھوڑے فاصلہ پر کھڑا رنگین پرچھائیوں کو جاتے ہوئے دیکھتا رہتا ہوں۔

آخری رکشا روانہ ہونے کے بعد میں ایک ڈرگ اسٹور کے سامنے جا کر پرچہ کی تہیں کھولتا ہوں۔ پرچہ میں ایک مختصر پیغام ہے۔

"کل شام چار بجے مجھ سے گھر پر مل لیجئے۔ میں انتظار کروں گی۔ . ."

نیچے ایک مقامی پتہ درج ہے۔ رانی کے گھر کے سامنے سے میں شاید سینکڑوں بار گزرا ہوں گا۔ بہت سے گھروں کے سامنے سے میں سینکڑوں بار گزرتا ہوں۔

ساری رات مجھے خوبصورت خواب نظر آتے رہتے ہیں۔ صبح اُٹھ کر میں جس سین کو یاد کرنے کی کوشش کرتا وہی میری یاد کی گرفت سے پھسل کر میرے لاشعور میں گر جاتا ہے۔ ایسے موقع پر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں کسی ہری بھری پہاڑ کی چوٹی پر پیٹ کے بل لیٹا ہوں۔ برابر کی ڈھلوان پر ایک بہت بڑی شیشے کی گیند پھسل رہی ہے۔ جسے میں اپنے ہاتھوں سے کوشش کر رہا ہوں۔ گیند کو انگلیوں کی مدد سے اُوپر لانے میں بہت دشواری ہو رہی ہے۔ جب گیند میرے بالکل نزدیک آجاتی ہے اور میں اُسے اپنے بازوؤں کی گرفت میں لینا چاہتا ہوں تو وہ اچانک پھسل جاتی ہے۔ میں بے بسی سے شیشے کی گیند کو گھاس کے ڈھلوان پر پھسلتے دیکھتا رہتا ہوں۔ مجھے جاگنے پر کبھی نیند میں دیکھا ہوا خواب نظر نہ آسکا۔ لیکن میں جاگتے میں خواب دیکھ کر اُسے یاد رکھ سکتا ہوں۔ اِسی لئے سارا دن رانی کے گرد خوابوں کے نئے نئے جال بُنتا رہتا ہوں۔

شام کو بہت اہتمام سے سفید کُرتا اور پاجامہ پہن کر رانی کے گھر جانے کے لئے تیار ہو جاتا ہوں۔ رنگین کپڑے پہننے کی رِسک میں بہت کم لیتا ہوں۔ گھر میں بھی کوئی ایسا نہیں ہے جس سے میچنگ کے سلسلہ میں مشورہ لیا جاسکے۔ لے دے کر ایک پاپا جی ہیں۔ لیکن انھوں نے زندگی میں شادی کے دن کے سوا کوئی رنگین کپڑا نہیں پہنا۔ بہرحال اب تو گھر میں رانی آجائے گی۔ اُس کے آتے ہی میری بے شمار مشکلیں ایک دم دُور ہو جائیں گی!

میرا دماغ بھولی صورت بنا کر دبے دبے سے لہجے میں میرے دل سے پوچھتا ہے ——— "کہیں رانی تمہیں بے وقوف تو نہیں بنا رہی ہے؟"

میرا دل فوراً دماغ کو ایک زوردار جھاڑ لگاتا ہے: "کیا تم نے اُس کی آنکھیں نہیں دیکھی تھیں؟ کون سا جذبہ بھرا ہُوا تھا اُن آنکھوں میں . . . ! تم سے کتنی بار کہا ہے وقت بے وقت مجھے مت ٹوکا کرو۔ تمہاری یہ عادت مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔ کبھی کبھی آرام سے خاموش بھی بیٹھنا چاہئے۔ ہر وقت عقلمندی کی باتیں زیب نہیں دیتیں۔"

دماغ بُرا سا مُنہ بنا کر ایک کونے میں خاموش بیٹھ جاتا ہے۔ میں آرام کی سانس لے کر اسکوٹر نکالتا ہوں اور رانی کے گھر کی طرف چل دیتا ہوں۔

گیٹ پر مالی ملتا ہے۔ میں اُس سے کہتا ہوں۔

"رانی صاحبہ سے کہنا ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔"

"کیا نام بتاؤں؟" مالی پوچھتا ہے۔

"نام . . . میرا نام اٹل سرکار ہے۔"

مالی سر ہلا کر چلا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں ڈرائنگ رُوم میں پہنچا دیا جاتا ہوں۔ آراستہ ڈرائنگ رُوم میں رانی ایک بڑا سا ڈیکوریشن پیس معلوم ہو رہی ہے۔ اِس نے آج بھی ہلکے رنگ کی ڈبل بارڈر والی ساری پہن رکھی ہے۔ بال آج بھی کمر تک بکھرے ہوئے ہیں۔

مجھے دیکھتے ہی وہ کھڑی ہو کر کہتی ہے "مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور آئیں گے . . . تشریف رکھئے . . . میں ابھی آتی ہوں۔"

میں ہزاروں اُمیدیں دل میں سجا کر اُس کا انتظار کرتا ہوں۔ وہ واپس آ رہی ہے۔ دھیرے دھیرے . . . آنچل سر پر ڈالے ہوئے۔ ہاتھوں میں پُوجا کی تھالی لئے۔

میرے سامنے چھوٹی میز سرکا کر وہ تھالی رکھ دیتی ہے۔ تھالی میں پُوجا کی سامگری ہے۔ جلتا ہُوا چراغ ہے۔ فریم میں لگی ہوئی ایک لڑکے کی تصویر ہے اور ایک راکھی ہے۔

رانی تصویر کا فریم میرے ہاتھ میں دے دیتی ہے۔ میں غور سے دیکھتا ہوں اور چونک جاتا ہوں۔ تصویر میں میری بہت زیادہ مشابہت ہے۔ رانی مجھے بتاتی ہے "یہ میرے بڑے بھیا منوج کی تصویر ہے۔ اب سے دو سال پہلے اچانک دماغ کی رگ پھٹ جانے سے اُن کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔ کل اتفاقاً آپ سے ملاقات ہو گئی تو مجھے ایسا محسوس ہُوا جیسے منوج بھیا چتا کے شعلوں میں سے نکل کر میرے پاس چلے آئے ہیں! آپکے خدوخال اور جسم کی ساخت منوج بھیا سے بہت ملتی ہے۔ چہرے کا اُوپر کا حصّہ تو بالکل وہی ہے! کل میں نے آپ سے کئی بار بات کرنی چاہی، لیکن کر نہ سکی۔ آج رکھشا بندھن کا تیوہار نہیں ہے لیکن میں آج اپنے منوج بھیا کے راکھی ضرور باندھوں گی . . . !"

رانی برستی ہوئی آنکھوں کے ساتھ میری آرتی اُتار رہی ہے۔ میرے ماتھے پر ٹیکہ لگا رہی ہے اور میری کلائی پر راکھی باندھ رہی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے رانی کلائی کی بجائے یہ راکھی میری گردن کے گرد لپیٹ کر اتنے بل دے کہ میرا دم نکل جائے۔ میں نے اپنا کانپتا ہُوا ٹھنڈا ہاتھ اُس کے سر پر رکھ دیا ہے۔ میرے دل کی ندامت قطرہ قطرہ کرکے میری آنکھوں سے بہہ رہی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں ——— میں نے رانی کی آنکھوں میں پیار کا رنگ ضرور دیکھا تھا۔ لیکن میں یہ نہ پہچان سکا اُن آنکھوں میں محبوبہ کے پیار کا رنگ ہے یا بہن کے پیار کا! میں نے آج رنگوں کے معاملہ میں زندگی کا سب سے بڑا دھوکا کھایا ہے۔ میں دُنیا کا سب سے بڑا کلر بلائنڈ ہوں!!"

غزل

ڈاکٹر محمد منصور منشاء الرحمٰن خاں منشا ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی

...کو متاعِ رنج و اذیت ملی تو ہے
...تے ہیں جس کو تم وہی نعمت ملی تو ہے

فرطِ حیا سے ہونٹ نہیں ہل سکے مگر
نیچی نظر سے دادِ محبت ملی تو ہے

...ے یارِ دلنواز تری یاد کے طفیل
...لامِ روزگار سے فرصت ملی تو ہے

قسمت کی نارسائی کا شکوہ نہیں ہمیں
اِک لازوال درد کی دولت ملی تو ہے

...ل سا حسین آئینہ ٹوٹا تو کیا ہوا
...زِ نگاہ و ناز کی لذت ملی تو ہے

ہر چند زخمِ تازہ کی صورت ہی ہیں ہی
اپنے خلوص کی ہمیں قیمت ملی تو ہے

فیاضیٔ بہار کے قربان جائیے
پھولوں کو مسکرانے کی حسرت ملی تو ہے

منشاؔ عزیز کیوں نہ ہو ذوقِ سخن ہمیں
اس کے طفیل عزت و شہرت ملی تو ہے

غزل

حباب ہاشمی ایم۔ اے، بی۔ ایڈ

جذبۂ شوق نے یوں دادِ طلب پائی ہے
کھنچ کے منزل مرے قدموں میں چلی آئی ہے

زندگی موت کا پیغام دیئے جاتی ہے
کیا یہی آپ کا اعجازِ مسیحائی ہے

آئینہ توڑ کے ہاتھوں میں لئے بیٹھے ہیں
عبرت انگیز یہ انجامِ خود آرائی ہے

آپ آئیں بھی نہیں، مجھ کو بلائیں بھی نہیں
آپ کی یاد رفیقِ شبِ تنہائی ہے

مُلتفت وہ ہیں تو کچھ لوگ پریشاں کیوں ہیں؟
میری اور اُن کی تو برسوں کی شناسائی ہے

کوئی نغمہ، کوئی سنگیت، کوئی گیت نہیں
زندگی درد میں ڈوبی ہوئی شہنائی ہے

جن کو انکار تھا اب وہ بھی تو کہتے ہیں حباب
تیرے اشعار میں گہرائی ہے، گیرائی ہے



زندگی
کی ساتھی
رچبرو
اور ذائقے دار ہے
رچبرو ہی سے زندگی کا مزہ ہے۔
اس بڑھیا چائے کا بڑھیا ذائقہ
آپ کو ضرور پسند آئے گا۔
رچبرو کے ہر پیکٹ سے
آپ بہت زیادہ پیالیاں
حاصل کر سکتے ہیں۔
صرف پیکٹوں میں بند چائے
ہی بہت دنوں تازہ اور
ذائقے دار رہتی ہے۔
LIPTON'S
RICHBRU
TOP QUALITY LEAF TEA
لپٹن کی
رچبرو
LRC-10 72 URDU

چھوٹا سا جُرم

—— مدثّر حسین رضوی ایم۔ اے، ایم۔ اے ایڈ

دانش کدہ، امروہہ (یو۔پی)

مکرّمی و محترمی! تسلیمات

تعلیمی نفسیات کی اعلیٰ کتب میں طرح طرح کے نفسیاتی مریضوں کے دلچسپ اور عجیب و غریب احوال کے مطالعہ نے گزشتہ دنوں میرے ذہن میں خوابیدہ تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار کیا جس کے نتیجہ میں اِس کہانی کی تخلیق عمل میں آئی۔ اُمید ہے کہ یہ مختصر کہانی "چھوٹا سا جرم" آپ کو ضرور پسند آئے گی۔ آپ کی پسندیدگی میری محنت کا صِلہ ہوگی —— برادرم صدّیقی صاحب کی نوازش سے ٹیلیفون پر آپ سے جو گفتگو ہوئی تھی وہ ابھی تک کانوں میں گونج رہی ہے۔ آپ نے اپنے مُلک کی سیاست اور یہاں کے سیاستدانوں کا جس عمیق نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ آپ ہی کا حصّہ ہے! اب تک آپ کے تحریر شدہ "تیرونشتر" ہی پڑھے تھے اُس دن آپ کی زبانی تیرونشتر سُنے اور وہ لمحے زندگی کے یادگار لمحے بن گئے —— ایک خوشخبری یہ ہے کہ "اُردو ادب میں سکھوں کا حصّہ" کو حکومت ہریانہ نے بھی پانچ سو روپے کے "مالی انعام" سے نوازا ہے —— پروین کا علاج جاری ہے۔ ہولی فیملی کے ڈاکٹر جناب بی۔ بی۔ ماتھر صاحب نہایت توجّہ سے علاج کر رہے ہیں۔ اُن کے علاج اور آپ کی دُعاؤں کی بدولت اب یہ قریب قریب صحت یاب ہوگئی ہیں۔ آپ کو آداب کہہ رہی ہیں . . .

نیاز کیش —— مدثّر حسین رضوی

★

میرا ذہن سوچتے سوچتے تھک جاتا اور میں کِسی نتیجہ پر پہنچنے میں ناکام رہتا۔ شوبی اب بھی میری سوچوں کی سطح پر ایک سوالیہ نشان کی طرح اُبھری ہوئی تھی۔ وہ میرے لئے ایک ایسا اُلجھا ہوا مسئلہ بن گئی تھی جِس نے میرے ذہن کو منتشر کرکے میرا سکون چھین لیا تھا۔ مجھے آج اپنی زندگی کا فیصلہ کر لینا تھا کیونکہ کل مجھے شوبی سے جُدا ہوکر لندن جانا تھا جہاں نفسیات کے ایک اہم موضوع پر ریسرچ کرنی تھی اور مجھے صحیح اندازہ نہ تھا کہ وہاں سے کِتنی مُدّت بعد واپسی ممکن ہو سکے گی۔

شوبی میرے پڑوس میں رہنے والی ایک نازک اور معصوم سی لڑکی تھی جِس نے اِسی سال انگریزی میں ایم۔ اے کیا تھا۔ ہمارے درمیان صدیوں پُرانی اختلاف کی نظریاتی خلیج حائل تھی۔ ایک ایسی خلیج جو اُبھرتے ہوئے صحت مند سماج کے لئے ایک ناسور بن چکی تھی۔ میری نظر میں اُس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ اپنے دلکش حُسن، سڈول اور پُرکشش جسم، اپنی بے پناہ ذہانت اور دلکش شخصیت کی انفرادیت کے باعث میرے ذہن کے پردوں پر ایک مکمل تصویر کی طرح اُبھر چکی تھی۔ وہ ملکوتی حُسن کی مالک تھی۔

اُس کی چال میں نسیم صبح کی سی نرم روی اور بادِ صبا کی سی سبک خرامی تھی۔ وہ بولتی نہ تھی۔ آواز کے گھنگھرو بکھیرتی تھی۔ اُس کی آواز ——

شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

کی مصداق تھی۔ اُس کی کم گوئی اور متانت اُس کی شخصیت کی انفرادی شان کی غماز تھی۔ بارہا تنہائیوں میں اُس نے اپنی آنکھوں کو زبان بنا کر مجھ سے وہ سب کچھ کہہ دیا تھا جو وہ الفاظ میں کبھی نہ کہہ پائی۔ میں نے بھی محبت کے نرم و نازک جذبوں کو اپنے دل کے نہاں خانوں میں پوشیدہ رکھا تھا۔ میں نے ایک بار بھی اپنے جذبوں کو اُس پر عیاں نہ کیا۔ شوبی کے نظریات، اُس کی آرزوئیں، اُس کی تمنائیں اور اُس کے سہانے خواب کھلی کتاب کی طرح مجھ پر ظاہر تھے۔ لیکن وہ میرے دل کی گہرائیوں تک نہ پہنچ پائی تھی۔ اُس نے میری شخصیت کے ظاہری رُوپ سے متاثر ہو کر مجھے اپنے خوابوں کا شہزادہ مان لیا تھا۔ اپنے خیالوں کا محور بنا لیا تھا۔ اپنے مستقبل کے سارے خواب، رنگین تصورات میری ذات سے وابستہ کر دیئے تھے۔

شوبی بے حد خوبصورت تھی۔ حُسن و جمال کی مکمل تصویر تھی۔ اُس کے ہونٹوں میں گلاب کا دہکتا ہوا رنگ تھا، لپکتے شعلوں کی چمک اور شبنم کے قطروں کی تازگی و شگفتگی تھی، اُس کی بانہیں جیسے صندل سے تراش کر بنائی گئی تھیں۔ وہ بہت سی خوبیوں کی مالک تھی۔ اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ تھی لیکن صدیوں پُرانے سماجی نظام کے بنائے ہوئے اصولوں کے اعتبار سے کسی ممتاز حیثیت کی حامل نہ تھی۔ درمیانی طبقہ میں پیدا ہو کر جیسے اُس نے کوئی جُرم کیا تھا۔ معاشی بدحالی جیسے اُس کی شاہد ہو۔ اُس کی شخصیت پر افلاس و غربت کا باریک غلاف چڑھا ہوا تھا۔ وہ تنہائی پسند بن گئی تھی۔ اُس کا کوئی دوست نہ تھا۔ اپنی حیثیت کے لوگوں کو اُس کی ذہانت نے مُنہ نہ لگانے دیا اور بلند طبقہ کے افراد تک اُس کا گزر ممکن نہ تھا۔ صرف میری ایک ذات تھی جو اُس کے اِتنا قریب آئی کہ سماج کے بنائے ہوئے سارے فاصلے قربتوں میں بدل گئے۔

پہلے تو یونیورسٹی سے واپسی پر اتفاقاً آزاد لائبریری کے سامنے سے اُس کا ساتھ ہو جایا کرتا تھا۔ پھر یہ اتفاقات دانستہ ہونے لگے۔ کبھی لائبریری سے واپسی میں اور کبھی فیکلٹی کے آرٹس کی دوسری منزل سے نیچے آتے میں! ہمارے تعلقات قدم بقدم آگے بڑھتے رہے اور یہاں تک کہ اُس کے نقشِ پا کی شوخی ہمارے کوٹھی کے مختلف گوشوں سے نمایاں ہونے لگی۔ کنیڈی ہاؤس سے نقوی پارک تک اور قلعہ سے کوٹھی کے پائیں باغ تک، درجنوں مقامات ہماری ملاقاتوں کے راز دار بن گئے۔ پتہ نہیں وہ کون سی نفسیاتی گرہ تھی جو اُسے زیادہ سے زیادہ میرے ساتھ رہنے پر اُکساتی تھی۔ وہ مجھ سے مختلف موضوعات پر بحث کرتی۔ اپنے اور میرے مستقبل کے مسائل پر تبصرہ کرتی۔ اختلافی مسائل میں جیت اُس کی ہوتی کیونکہ میں اکثر خاموشی اختیار کر لیتا تھا۔

میری یہ خاموشی عموماً اُس کے اُن نامساعد حالات کے باعث ہوا کرتی تھی جنھوں نے اُسے اپنی مضبوط گرفت میں لے رکھا تھا۔ مجھے اُس کے احساسات کو ٹھیس پہنچانا گوارہ نہ تھا۔ وہ بے حد نازک احساسات کی مالک تھی۔ اُس کا ایک آئیڈیل تھا جس کے حصول کو اُس نے اپنی زندگی کا مقصد بنا رکھا تھا۔

اُس نے اپنے دل کے نہاں خانوں میں جیون ساتھی کے رُوپ میں ایک روایتی شہزادے کو بسا رکھا تھا۔ ایک باوقار، خوب رُو، سنجیدہ اور بے خوف مرد —— جس کے ذریعہ وہ اُن تمام آسائشوں کو اپنے دامن میں سمیٹ سکے جو متمول طبقہ میں ضروریاتِ زندگی کا لازمی جُز و مانی جاتی ہیں۔ وہ زمین کی پستیوں سے آسمان کی رفعتوں پر پہنچنا چاہتی تھی۔ اپنے گھر میں جس سکون اور محبت سے وہ محروم تھی اُسے پانے کے لئے اُس کے ذہن نے ایک آئیڈیل تخلیق کر لیا تھا جو اُس کی تشنہ تمناؤں کو سیراب کرنے کا ذریعہ بنتا۔ میں نے اکثر شدت سے محسوس کیا کہ اُس کی نگاہ میں اِن آرزوؤں کی تکمیل کرنے والا مرد، اُس کے خوابوں کے شیش محل کا وہ روایتی شہزادہ کوئی اور نہیں میں خود تھا! اُس نے اپنی حسین آرزوؤں اور تشنہ تمناؤں کو اور اپنے رنگین خوابوں کو میری ذات سے وابستہ کر رکھا تھا۔

بھلے ہی اُس کے دل میں میرے لئے روایتی عشق و محبت کے جذبات موجزن نہ رہے ہوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ شریک

زندگی کی حیثیت سے میرا انتخاب کر لیا تھا مگر اُس نے مجھے اپنے خوابوں کا شہزادہ بنا لیا ہوتا تو کبھی مجھ سے پی ایچ۔ ڈی کرنے کے لئے اصرار نہ کیا ہوتا۔ دولت کے ساتھ ساتھ وہ میری ذات کو تعلیمی دُنیا میں بھی خصوصی حیثیت کا حامل دیکھنا چاہتی تھی۔ اسی لئے اُس نے بضد ہو کر مجھے نفسیات میں ریسرچ کے لئے آمادہ کیا تھا ورنہ میں بزنس مینجمنٹ میں ڈپلومہ لے کر اپنے کاروبار کو مزید ترقی دینا چاہتا تھا۔

مجھے اِس سے انکار نہیں کہ شوبی میری نس نس کا ترنم بن چکی تھی۔ وہ کچھ اِس طرح میرے احساسات پر چھا گئی تھی کہ مجھے اُس کے بغیر اپنی زندگی نامکمل سی محسوس ہوتی تھی۔ میں اپنے دل کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ اُس سے محبت کرتا تھا۔ کبھی کبھی میرے دماغ کی سطح پر ایک نیا خیال اُبھرنے لگتا تھا اور میں اپنے جذبات پر شبنمی ٹھنڈک سی پڑتی ہوئی محسوس کرتا۔ میں جانتا تھا کہ زندگی ایک حقیقت ہے! جس میں قدم قدم پر مسائل ہیں، جن سے نہ تو نظر بچائی جا سکتی ہے اور نہ جن سے فرار ممکن ہے لیکن شوبی زندگی کی حقیقتوں اور اُس کے مسائل کو کوئی اہمیت نہ دیتی تھی۔ وہ تو جیسے خوابی جزیرے میں سفر کر رہی تھی۔ میں نے بارہا منطقی استدلال سے اُس کے تصوراتی قصر کے خوابی ستونوں کو حقیقت کے سنگریزوں سے مسمار کرنے کی کوشش کی تھی۔

"شوبی! زندگی سہانا خواب نہیں، تلخ حقیقت ہے۔ جب خوابوں کے شیش محل حقیقت کے سنگریزوں سے ٹکرا کر چکنا چور ہوتے ہیں تو . . ؟"

"خوابوں کے بغیر منزل نہیں ملتی ——" وہ میری بات کاٹ دیتی۔

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے!"

"لیکن کتنی خوبصورت ——!" وہ اُفق کے اُس پار آکاش کی وسعتوں میں جھانکنے لگتی۔

اور میں وہ طریقہ سوچنے لگتا جس سے شوبی زندگی کی تلخ حقیقتوں کو سمجھنے لگے۔ زندگی کی تلخیوں کو محسوس کرنے لگے۔ وہ خوابوں کی دُنیا میں سفر کرنا چھوڑ دے۔ سوچتے سوچتے میرا ذہن مستقبل کی وادیوں میں بھٹکنے لگتا۔ طرح طرح کے خیالات دماغ میں اُبھرتے اور دل و دماغ میں کشمکش شروع ہو جاتی!

طبقاتی فرق کے علاوہ ہم دونوں میں نظریاتی اختلاف بھی تھا۔ وہ جاگتے میں خواب دیکھتی تھی۔ خوش آیند خواب جیسے اُس کی زندگی بن گئے ہوں۔ وہ خوابوں کو اپنی زندگی کی معراج سمجھ رہی تھی اور میں زندگی کے بارے میں حقیقت پسندانہ نظریہ اپنائے ہوئے تھا۔ اپنی اپنی زندگی ایک دوسرے کے سپرد کرنے کے بعد کیا ہم اِس اختلاف کو ختم کر سکیں گے؟ کیا یہ اختلاف زندگی کی مسرتوں میں زہر نہ گھول دے گا! خدشات اور وسوسے مجھے ڈرانے لگتے۔ شوبی ایک غمگسار اور انتہا محبت کرنے والی مخلص شریکِ حیات بننے کے بجائے ڈرائنگ رُوم میں آویزاں ایک قیمتی اور خوبصورت پورٹریٹ بن کر تو نہ رہ جائے گی۔ اگر کسی وقت میں موجودہ مادی بلندی سے نیچے گر پڑا تو . . . تو اِس تصور سے ہی میری رُوح کانپ اُٹھتی . . . اُس وقت شوبی کا کیا ہوگا؟ کیا وہ مجھے بھرپور محبت دے سکے گی؟ بس سوچوں کی اِسی منزل پر آکر ——

میرا ذہن سوچتے سوچتے تھک جاتا اور میں کسی خوشگوار نتیجہ پر پہنچنے میں ناکام رہتا! میں اپنی زندگی کے ایک اہم موڑ کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کر پایا۔ ایک طرف محبت کی دلکش وادیاں تھیں، دُوسری جانب ازدواجی زندگی کی کٹھن اور سنگلاخ راہوں کا تصور! میں نے سوچا لندن کے لئے روانگی سے پہلے شوبی کو اپنی محبت کا امین بنا لوں۔ لیکن مستقبل کے بھیانک تصور نے مجھے ڈرا دیا۔ طبقاتی خلیج کی مجھے پروا نہ تھی۔ مجھے خوابوں کی پالکی میں سفر کرنے والی شوبی پسند نہ تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بھی سمجھے۔ خوابوں ہی کو زندگی نہ بنائے۔ اِس لئے میرا دل چاہتا تھا کہ کوئی طوفان آئے اور اُس کے خوابوں کا شیش محل زمیں بوس ہو جائے۔ کوئی تلاطم آئے اور اُس کے سپنوں کا سفینہ اُلٹ دے۔ اُس کی شخصیت کا خوابی خول پہاڑوں پر جمی برف کی طرح پگھل کر بہہ جائے اور وہ کسی جوئے دلنشیں کی طرح اطلاتی گنگناتی میری زندگی کے سمندر میں پناہ لے!

میں سوچتا ہی رہا اور شوبی سے اپنے دل کی بات نہ کہہ سکا۔ ہوا کے دوش پر سوار ہو کر میں لندن پہنچ گیا۔

وقت زندگی کی فضاؤں میں شبنم کی مانند تحلیل ہوتا رہا۔
یہاں تک کہ میں نے تھیسس مکمل کر کے وطن واپسی کا پروگرام بنا لیا۔
لندن میں قیام کے دوران مجھے شوبی کے بے شمار خطوط ملے۔
وہ یونیورسٹی کے ویمنس کالج میں انگریزی کی لیکچرر ہو گئی تھی۔ یہ نوکری اُس نے اپنے ریٹائرڈ باپ کا سہارا بننے کے لئے قبول کی تھی۔ اُس کے ہاتھ پیلے کرنے کی کئی بار کوشش کی گئی۔ لیکن ہر بار اُس نے انکار کر دیا۔
میں برابر اُسے خط لکھتا رہا۔ اُن میں دو خط خصوصی اہمیت کے حامل تھے۔ پہلے خط میں ہندوستان سے روبینہ کی لندن میں آمد کی اطلاع تھی جو گھریلو آرائش کا ڈپلومہ کرنے وہاں پہنچی تھی۔ دوسرا خط غیر معمولی طور پر اہم تھا۔

"میں نے اپنی زندگی روبینہ سے وابستہ کر لی ہے۔"

یہ میرے خط کا ماحصل تھا!

شوبی نے جواب میں بے حد مختصر مُبارکباد دی تھی۔ اُس مُبارکباد کو پڑھ کر میرے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔ یادوں کے بے شمار جگنو تصور کے آکاش پر جگمگا اُٹھے۔ اُس دن میں مُسلسل اُسی کے بارے میں سوچتا رہا۔

ہوائی جہاز کی سیٹ پر بھی اُس کی ذات سے وابستہ شیریں یادیں میرے جذبات میں ہلچل برپا کرتی رہیں۔ میں شوبی میں اُن متوقع تبدیلیوں کے تصور میں ڈوب گیا جو میرے اُس خط نے اُس میں کر دی ہوں گی، جس میں روبینہ سے زندگی وابستہ کرنے کی اطلاع دی تھی۔

اُس کے خواب بِکھر گئے ہوں گے۔ اُس کی شخصیت پر چڑھا ہُوا خول پگھل گیا ہوگا۔ وہ سپنوں کی دُنیا سے حقیقت کے ریگ زار میں آگئی ہوگی۔ زندگی کی ایک تلخ حقیقت نے اپنے اصل رنگ میں سامنے آکر خود کو اِس طرح متعارف کرایا ہوگا کہ آکاش کی رفعتوں میں گُم رہنے والی آنکھیں پلکیں جھپکانا بھول گئی ہوں گی اور وہ کسی کٹے پِٹے مسافر کی طرح نامعلوم مقام پر کھڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے آسماں کی بلندیوں میں گُم شُدہ منزل کے نشانوں کو دیکھتی رہ گئی ہوگی!

اور تب۔۔۔!

میں خیالات کے دھارے میں بہتا رہا، یہاں تک کہ ہوائی جہاز نے میرے وطن کی زمین کو چُوم لیا۔ جب میں کسٹم آفس سے باہر نِکلا تو خلافِ توقع شوبی مجھے ریسیو کرنے آئی ہوئی تھی۔ وہ گُلاب کے پھُولوں کی طرح شگفتہ و شاداب اور موسمِ بہار کے جھونکوں کی طرح فرحت بخش نظر آئی ــــــ وہی زُلفیں، وہی شانے، وہی بازو، وہی ریشمیں بال، وہی خوبصورت خدوخال، وہی رخساروں کی آنچ، وہی جبیں کی تازگی!

"روبینہ ساتھ نہیں آئیں؟" اپنی سوالیہ نگاہیں میری آنکھوں میں ڈال کر اُس نے پھُولوں کا ایک ہار میرے گلے میں ڈال دیا۔

اِس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا ایک دُوسرا ہار میرے گلے کی زینت بن چُکا تھا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ وہ ایک خوبرُو، دراز قامت اور باوقار نوجوان تھا۔

میری آنکھوں میں تیرتے ہوئے سوالوں کو پڑھ کر شوبی نے اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"میں نے اپنی زندگی اِن سے وابستہ کر لی ہے۔ آپ مسٹر قیصر ہیں۔ میرے شوہر! یونیورسٹی کے کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ میں لیکچرر ہیں۔ جلد ہی ہم دونوں امریکہ جا رہے ہیں جہاں یہ ڈاکٹریٹ کریں گے اور میں۔۔۔"

شوبی کے الفاظ سیسے کی طرح میرے کانوں میں پگھل رہے تھے۔ میں کچھ نہ بول سکا۔ پتھر سا بن گیا۔ قوتِ گویائی جیسے سلب ہو گئی ہو! میں اُسے اِتنا بھی نہ بتا سکا کہ روبینہ ایک فرضی نام تھا جس سے اپنی زندگی وابستہ کرنے کی خبر دے کر میں نے تمہارے خوابوں کے شیش محل کو مسمار کرنے کی نفسیاتی کوشش کی تھی۔ میں نے تمہیں زندگی کی حقیقتوں سے رُوشناس کرانے کا جُرم کیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے اُس چھوٹے سے جُرم کی اِتنی بڑی سزا بھی ہو سکتی ہے!!

جواب طلب امُور کے لئے ہمیشہ اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ یا پوسٹ کارڈ بھیجئے ورنہ ہم جواب دینے سے قاصر رہیں گے۔ (منیجر بیسویں صدی)

رسالہ نہ ملنے کی شکایت

دو مرتبہ پتے چیک کرنے کے بعد بیسویں صدی ہر ماہ باقاعدگی سے سپردِ ڈاک کیا جاتا ہے۔

اِس کے باوجود شکایتی خطوط موصول ہونے پر رسالہ دوبارہ بھیج دیا جاتا ہے۔ ۲۵ تاریخ کے بعد شکایتی خطوط موصول ہونے پر دوبارہ پرچہ بھیجنے سے ہم معذور رہتے ہیں۔ رسالہ نہ ملنے کی شکایت محکمۂ ڈاک سے بھی کیجئے۔ (منیجر)

غزلیں

قاضی محمد ریاض الدین انصاری ریاضؔ ایم۔ اے بی ٹی

یہیں دُنیا سے ہی دُنیا کے عیش ہنگاں ہوں گے
یہ سب ہوگا مگر اے عمرِ فانی! ہم کہاں ہوں گے
اِدھر ہوں گے، اُدھر ہوں گے، یہاں ہوں گے وہاں ہوں گے
ہمارے غم کے نغمے ہر جگہ وردِ زباں ہوں گے
قیامت تک ہمارے غم کے افسانے بیاں ہوں گے
زمانہ در زمانہ داستاں در داستاں ہوں گے
خبر کیا تھی کہ ایسے بھی ہمارے مہرباں ہوں گے
ہمارے ہم زباں جنگِ عدو کے ہم عناں ہوں گے
اب آئے ہو تو بیٹھو بھی ذرا اس دل کی خیر کیا ہے
نہ جانے تم کہاں ہو گے نہ جانے ہم کہاں ہوں گے
ریاضؔ آؤ چلو، بزمِ سخن میں آج سُنتے ہیں
یہیں سے اہلِ دل، اہلِ نظر، اہلِ زباں ہوں گے!

پروفیسر سراج الحسن سراجؔ قادری ایم۔ اے

تجھ پہ ہیں دل سے فدا اے جلوۂ جانانہ ہم
کر رہے ہیں اختیار اب مسلکِ پروانہ ہم
تھی توقع جن سے غم خواری کی وہ بھی خفا
کس سے اپنا غم کہیں اب اے دلِ دیوانہ ہم
جانِ محفل ہیں ہماری قدر ہے دونوں جگہ
آبروئے کعبہ ہم ہیں رونقِ بتخانہ ہم
لگ گئی ہے ہم سے کچھ پھر وہ اچٹتی سی نظر
پھر مرتب کر رہے ہیں اک نیا افسانہ ہم
سوزشِ پنہاں میں جل کر خاک آخر ہو گئے
ساتھ لائے تھے ازل سے قسمتِ پروانہ ہم
جذبۂ مہر و خلوص اب لے کے آئے ہیں سراجؔ
بارگاہِ ناز میں اُن کی پئے نذرانہ ہم

جرار چھولسی

مرے دل کو آسرا دو یہ نقابِ رُخ اُٹھا دو
مرے شہرِ آرزو کے در و بام جگمگا دو
دلِ شیخ و برہمن میں جو ہے کشمکش مٹا دو
مرے میکدے میں لا کر اُنھیں دو گھڑی بٹھا دو
جو پڑے ہیں سنگریزے اُنھیں چن کے جگمگا دو
مرے گھر کے راستے کو کبھی کہکشاں بنا دو
تمھیں بے وفا کہا تھا اسی بات پر خفا ہو
چلو بے وفا سہی میں چلو اب تو مُسکرا دو
مرا جذبۂ خلیلی ابھی مر نہیں گیا ہے
غمِ زندگی کے شعلو! مجھے پھونک دو جلا دو

قہقہوں کی موسیقی

شکیل جاوید

۱۲۷، گذری - امروہہ (یوپی)

برادر محترم! آداب!

میرا نام آپ کے لئے یا "بیسویں صدی" کے قارئین کے لئے نیا نہیں، برسوں بعد اپنی تخلیق "قہقہوں کی موسیقی" لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ بھولے نہ ہوں گے۔ امید ہے کہ میری یہ تخلیق اپنے عجیب و غریب اختتام پر آپ کے اور قارئین "بیسویں صدی" کے دلوں کو چھوئے گی۔ میں نے اس کہانی میں محبت کی پرخلوص اور سچی کیفیت میں چھپے ہوئے ایک نامعلوم جذبے کو چھونے اور منفرد انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہانی نے اگر آپ کے معیار اور پسند کو چھو لیا تو مجھے خوشی ہوگی کہ میری کوشش رائیگاں نہیں گئی اور میں نے اپنے مقصد کو پا لیا.....

العارض ——— شکیل جاوید

★

ڈھولک کی تھاپ پر عورتیں گیت گائے جا رہی تھیں۔ لے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ لڑکیاں ان گیتوں میں قوالی کا رنگ پیدا کرنے کے لئے تالیوں کی تھاپ کی سنگت دے رہی تھیں۔ گیت کی لے میں ایک عجیب دلکش انداز تھا۔ جو ماحول میں مسرتوں کی لہریں، موجزن کر کے رنگین احساس کے خوش تاروں کو مرتعش کر رہا تھا۔ گیت کے ہر بول سے زندگی کی رعنائیاں پھوٹ کر جینے کا پیغام دے رہی تھیں۔ لیکن انور اس مسرت بکنار ماحول سے بے نیاز اپنے مکان کے بالائی کمرے میں بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا۔

"کیا تنہائی اور وہ بھی مستقل تنہائی کو ڈس لیتی ہے؟"

گیت کا ہر بول اسے چیخ چیخ کر بتا رہا تھا ———

"زندگی نام ہے ایک قہقہے کا، ایک ایسے گہوارے کا جس میں مسرتیں ناچتی، گاتی اور مسکراتی ہیں ——— وہ گہوارہ جس کی ڈور مرمریں ہاتھوں کی مرہون منت ہوتی ہے۔ اور ایک دن ہر مرد کو اس حسین گہوارے میں جھولنا پڑتا ہے۔ یہی تو وہ تصور کا گہوارہ ہوتا ہے جس کے خیال کے سہارے تنہائیوں کی تلخی اور زندگی کی مایوسیوں کے زہر کو ہر مرد با مسرت جان کر پی جاتا ہے اور اسے یوں محسوس ہونے لگتا ہے۔ زندگی نام ہے غنچوں کے تبسم اور پھولوں کی مہک کا جس میں کانٹوں کی چبھن ہوتی ہے تو شاداب پھولوں کی شگفتگی بھی۔ کانٹے تو اسے آزمائشوں کی کسوٹی بن کر راہ فرار سے روکتے ہیں۔ اور پھول خوشیوں کے امین ہوتے ہیں جو اسے زیست کی حقیقت سے روشناس کراتے رہتے ہیں۔"

انور انہی سوچوں میں مستغرق تھا کہ اسے خیال آیا کل عظیم کی بھی شادی ہو جائے گی اور رضیہ اس کی دلہن بن کر اس کے گھر میں آ جائے گی۔ کاش اس کی زندگی میں بھی یہ پرمسرت لمحہ آ جاتا، کاش! شہناز بھی اس کے گھر میں دلہن بن کر آ سکتی شہناز! شہناز!!

اچانک گیتوں کی لے پھر تیز ہو گئی اور لے کی تیزی نے اس کے خیال کو پھر ماضی سے ہٹا کر حال کی دنیا میں پہنچا دیا اور وہ سوچنے لگا۔

شرارت

حسرت! تری نگاہِ محبت کو کیا کہوں
محفل میں اُن سے رات شرارت نہ ہو سکی ——— حسرت موہانی

عشووں کو چین ہی نہیں آفت کئے بغیر
تم اور مان جاؤ شرارت کئے بغیر ——— مجاز

ہنگامۂ غم سے تنگ آ کر اظہارِ مسرت کر بیٹھے
مشہور تھی اپنی زندہ دلی دانستہ شرارت کر بیٹھے ——— شکیل بدایونی

ناصح کو بلاؤ مرا ایمان سنبھالے
پھر دیکھ لیا اُس نے شرارت کی نظر سے ——— حفیظ جالندھری

ناز و ادا و غمزہ، عشوہ، حیا، شرارت
یہ سب چھپے ہوئے ہیں اِک تیرے بانکپن میں ——— بیدم

مرسلہ:- سلطان احمد ساحل ہرگانوی، جمشید پور نمبر ا

کنواری لڑکیاں شادی کے گیت اِتنے ذوق و شوق سے کیوں گاتی ہیں؟ کہ اُن کی ساری چاہتیں اور آرزوئیں سمٹ کر عروسی نغموں میں ڈھل جاتی ہیں اُن کے لبوں سے نکلے نغموں کے میٹھے مدھر بول سُننے والوں کو نہ جانے کیوں اپنے ماضی اور حال کی دنیا میں لے جاتے ہیں اور کنواریاں گردو پیش سے بے پروا بوڑھی عورتوں سے حجاب، اُنکا ادب سب اِس "رت جگے" کی رات میں پسِ پشت ڈال دیتی ہیں۔ شادی کی رسموں کے سہارے وہ وہ سوانگ بھرے جاتے ہیں کہ بس توبہ ہی بھلی۔

اُس نے سوچا ——— اُس کی زندگی میں بھی کبھی وہ دن آئے گا یا نہیں جب اُس کی شادی ہوگی اور کنواریوں کے دلوں کی دھڑکنیں اِسی طرح ڈھولک کی تھاپ پر عروسی گیت بن جائیں گی ——— ؟ اُس نے جیسے خود سے سوال کیا۔

اُس نے اپنی آنکھوں سے زندگی میں کتنی بہاریں، کتنی مسّرتیں دیکھی تھیں۔

بزرگوں سے ورثے میں ملی یہ قدیم حویلی جس کے ہر بام و در کی کہانی اُسے یاد تھی ——— اِس حویلی میں سب سے پہلے اُس کی بڑی باجی انجم کی شادی ہوئی تھی۔ اُس وقت وہ بہت چھوٹا تھا۔ لیکن اُسے کچھ کچھ یاد تھا۔ بارات کہاں بیٹھی تھی، کھانا کہاں کھلایا گیا تھا۔ انجم کے بعد اِس حویلی میں نسرین کے لئے عروسی گیت گائے گئے ——— پھر بدری کا ڈولا بھی اِسی دروازے سے نکلا اور وہ اب تک کنوارا ہی تھا۔ اور اب صبح ہوتے ہی عظیم کی بارات جانے والی تھی۔ اُس کے والد بھی اُس کی شادی کی آرزو کرتے کرتے موت سے جا ملے تھے۔ جس جگہ عظیم کی شادی طے ہوئی تھی اُنہوں نے بھی انور کو چاہا تھا۔ لیکن اُس نے تو جیسے اپنی شادی کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اِس لئے کہ اُس نے شادی نہ کرنے کا عہد کر رکھا تھا۔ خاندان والوں کے لئے انور کی زندگی بڑا سراِر بن گئی تھی۔ جو بھی انور کو اتنا سنجیدہ دیکھتا حیرت میں ڈوب جاتا لفظ جانے یہ سنجیدگی کا ملمع کب سے انور کے چہرے پر چڑھ گیا تھا؟ ورنہ کبھی وہ بڑے شوخ و شنگ لڑکوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں اُسکی شوخیاں نقطۂ عروج کو چھو چکی تھیں۔ فقرے بازی میں کوئی لڑکا اُس کے سامنے مشکل سے ٹھہر پاتا تھا۔ لیکن افسردگی اور خاموشی اُس کا مقدر کیوں بنی؟ یہ خاندان کا کوئی شخص نہ جانتا تھا ——— نہ جانے وہ کون سے ناکردہ گناہ تھے۔ جن کا کفّارہ وہ اپنی بے کیف زندگی کو تنہائیوں کے سُپرد کر کے ادا کر رہا تھا۔ اکثر اُس کے بارے میں یہ بھی سوچا گیا کہ انور کی تنہائی پسندی میں اُس کی ذات کو بھی دخل ہے یا پھر اُس کی اپنی تلاش میں کوئی کمی ہے؟ جو وہ اپنی منزل تک نہ پہنچ سکا، اُس کی چاہتوں اور مسّرتوں کے قافلے راہ میں لُٹ گئے۔ ہو سکتا ہے وہ اُن قافلوں کے لُٹ جانے سے اُس راہی کی طرح بن گیا ہو جو بے یار و مددگار تن تنہا کسی صحرا میں کھڑا ہو جہاں زندگی کی کڑی دھوپ ہو، اور دھوپ کی تمازت سے جلتی ریت نے اُسے آبلہ پا کر دیا ہو۔

کوئی انور کو دیکھ کر یہ نہ سمجھ سکتا تھا کہ اُس کے سینے میں بھی ارمانوں بھرا دھڑکتا دل ہوگا، اُس کے دل نے بھی کسی کی چاہت کی ہوگی اُس کی گہری خموش آنکھوں نے پلکوں پر کسی کے انتظار کے کرب ناک لمحوں کی چبھن محسوس کی ہوگی۔

انور نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا، سگریٹ کے دھوئیں میں اچانک اُسے شہناز کا چہرہ نظر آنے لگا۔ اُسے یاد آیا، شہناز جس کی آنکھیں جھیل کی طرح گہری تھیں۔ جس میں ڈوب کر اُس نے جینے کا راز جانا تھا، انداز سمجھا تھا۔ اُس کے لمبے لمبے سیاہ بال جس میں ساون کی گھٹائیں تھیں، مشک و عنبر کی خوشبوئیں تھیں جن کی قربت نے اُسے مسحور کر دیا تھا۔ اُس کے

یا پھر آپ ہی سے کچھ آواز کہ جو اُس کے کانوں میں شہد گھول دیا کرتا۔ خوبصورت مخروطی انگلیاں ہیں کہ جب اُس کے اُلجھے بالوں میں شانہ کیا کرتا ہے۔ یکایک اُس وقت ایسا لگتا ہے جیسے نسیم سحری پھولوں سے لدی شاخ کے پاس سے گزر جائے اور شاخ لہرا جائے، بل کھا جائے۔

اور یہ سب کچھ پہلی ہی ملاقات میں ہوا کے کسی جھونکے کی طرح انور کے شعور میں سما گیا تھا اور پھر کئی ملاقاتوں کے بعد ——— شہناز نے ایک دن اُس کے قدم سے قدم ملا کر زندگی کی راہ پر چلنے کے عہد و پیمان کئے تھے۔ اُسی وقت انور نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ شہناز اُس کی منزل ہے اور وہ شہناز کی منزلوں کا آخری نشان ہے ——— اور ایسے کسی نشان کے موڑ پر اُس نے شہناز سے یہ کہہ دیا تھا ———

"شہناز! تمہاری اِن روشن آنکھوں میں میرے سفر کی صبح اور تمہاری عنبریں زلفوں میں میری محبت کے سفر کی شام ہے۔"

شہناز نے وفورِ جذبات میں اپنی سیاہ زلفوں کا سایہ انور کے چہرے پر ڈال دیا۔ جن میں اُس کا چہرہ چھپ گیا تھا۔

اور جواب میں اُس نے کہا تھا۔

"انور! مجھے راہ میں تنہا تو نہ چھوڑو گے؟"

"منزل! چھوڑنے کی چیز نہیں ہوتی، منزل پانے کی ———"

انور نے کہا تھا۔

"انور! میں جب بھی ایسا سوچتی ہوں تو مجھے اپنے دل کی دھڑکن رکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ہم حالات کی حدود سے اتنی دور نکل آئے ہیں جہاں سے واپس ہونا ممکن نہیں۔"

اور اِن لمحوں میں اُس نے فرطِ مسرت سے شہناز کا ہاتھ تھام لیا تھا جس پر مہندی سے خوبصورت گل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ اُن لمحوں میں اُسے وہ پورے ایسے محسوس ہوئے تھے جیسے کچے دودھ میں گلاب کا سرخ پھول ڈال دیا گیا ہو ——— اُس نے شہناز کی منقش ہتھیلی چوم کر اُس پر اپنی محبت کی مہر ثبت کر دی تھی۔

"شہناز! میں نے تمہارا ہاتھ زندگی کے طویل سفر کو ایک ساتھ طے کرنے کے لئے تھاما ہے"، شہناز خاموش رہی اور پھر اُس نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا ——— "تم بتاؤ! تم تو مجھے دھوکہ نہ دوگے؟"

"انور! میری زندگی اور میری زندگی کی ہر خواہش، مستقبل کا ہر خواب تمہیں پانے کی تعبیروں میں مدغم ہے۔"

عشق

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا ——— غالب

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی ——— اقبال

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے ——— غالب

عقل پہ ہم کو ناز بہت تھا لیکن کب یہ سوچا تھا
عشق کے ہاتھوں یہ بھی ہوگا لوگ ہمیں سمجھائیں گے ——— احمد ہمدانی

عشق کیا ہے، حسن ہی کی اِک ادائے مضطرب
شمع ہی کا عکسِ لرزاں ہے، یہ پروانہ نہیں ——— ضیا

مرسلہ:- سید ضیاء الرحمٰن ضیاؔ، صادق پور پٹنہ نمبر ۹

اور پھر دونوں زمانے کی نگاہوں سے بچ کر تنہائیوں میں ایک دوسرے سے ملتے رہے۔

لیکن کسی طرح انور کے گھر والے اِس بات سے واقف ہو گئے۔ شہناز کے گھر والوں کو بھی اِن ساری باتوں کا علم ہو گیا۔ اِس لئے کسی نے کسی وقت کوئی احتجاج نہ کیا تھا۔ ڈگری کالج کے طلباء کے لئے یہ بات کوئی خاص بات نہ تھی۔ ایسے ماحول میں اِس طرح کی قربت کوئی معنی نہ رکھتی تھی۔ لیکن جب شہناز نے بی۔ اے کر لیا اور اُس کے بعد وہ مزید تعلیم جاری نہ رکھ سکی تب اُس کے گھر والے کو معلوم ہوا کہ انور اور شہناز کی قربت اپنے دل میں کیا راز چھپائے ہوئے ہے۔ یہ ساری باتیں اُن پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئیں۔ اِدھر انور نے بھی شہناز سے شادی کی خواہش کا اظہار کر دیا جبھی سے انور اور شہناز کے بارے میں اُنہیں تشویش تھی۔ شہناز کے گھر والے اِس حق میں تھے کہ وہ شہناز کے انتخاب پر اُس کی زندگی کو اُس راستے پر ڈال دیں جس پر نہ جانے مسرتوں کے پھول تھے یا زندگی کو دُکھ پہنچانے والے کانٹے! ——— شہناز کے اور اُن کے گھر والوں کے انتخاب میں زمین و آسمان کا سا فرق تھا۔ وہ زندگی کے تجربات اور گہرے مشاہدے کو وقتی سہارے یا لمحاتی خوشیوں کی دین پر ترجیح دینے کے حق میں نہ تھے۔ اِس لئے اُنہوں نے شہناز کے سامنے

ایک ہی رات جب کیا شن کے والدین نے کہا۔

"شہناز! ہمیں تمہاری پسند سے کوئی بحث نہیں، انور کو ہم بھی پسند کرتے ہیں لیکن ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اپنی زندگی کے اس انتخاب میں" ازدواجی زندگی کی دھوپ چھاؤں کی تم خود ذمہ دار ہوں گی، ہم کو صرف اسی پر اکتفا کرتے ہیں کہ رخصتی کے بعد اس گھر کے دروازے تمہارے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں گے۔" ——— انہوں نے شہناز کو خاموش دیکھ کر پھر پوچھا تھا۔ "بتاؤ! تمہیں اپنی پسند کا رشتہ منظور ہے یا ہماری مرضی پر اپنی زندگی کی کشتی کا رُخ موڑنا چاہتی ہو؟"

جب شہناز کے سامنے یہ فیصلہ آیا تو اُس نے خود کو مجبوریوں کی صلیب پر چڑھا دیا۔ اور وہ اُس فیصلے کے سامنے ہار گئی اور پھر ——— انور کو ہار گئی، سب کچھ ہار گئی!

اچانک سلمہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس کے ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی۔ انور کے خیالات کا شیرازہ بکھر گیا۔

"لیجئے! انور ماموں! چائے پی لیجئے۔ نیچے بہت مزیدار ناچ ہو رہا ہے۔ لڑکیوں نے طرح طرح کے بھیس بدلے ہیں اور ایک لڑکی نے تو آپ کا سوٹ پہن رکھا ہے!" یہ کہہ کر سلمہ جلدی سے نیچے بھاگ چلی گئی۔ انور کو پھر یاد آ گیا۔

ایک بار شہناز نے بھی اپنی خالہ زاد بہن کی شادی میں مردانہ کپڑے پہنے تھے۔ شہناز نے انور سے اُس کا سوٹ مانگا تھا۔ میرا سوٹ شہناز کے ایک دم فِٹ آیا ہوگا؟ اُس نے شہناز کو مردانہ لباس پہنے دیکھنے کی کتنی چاہت کی تھی۔

اور پھر ایک شام اپنے حالات اور پابندیوں کی ساری زنجیریں توڑ کر شہناز نے انور کو بتاتے ہوئے کہا تھا ———

"انور! مجھے معاف کر دو! خدارا مجھے بھول جاؤ! قسمت نے مجھے دو سٹیشنوں پر کھڑا کر دیا ہے۔ ایک کو اُٹھاتی ہوں تو دوسرے کا ٹوٹ جانا یقینی ہے، میں نہ پیچھے لوٹ سکتی ہوں، نہ آگے بڑھنے کی ہمت کر سکتی ہوں، کیونکہ ہر صورت میں ویرانیاں میرا مقدر بن رہی ہیں۔ میں کیا کروں؟"

"میں جانتا تھا شہناز! یہ محبت کا سفر بہت دشوار ہوتا ہے۔ تم راہ کی اذیتوں سے ضرور گھبرا جاؤ گی۔"

"خدا کے لئے انور! مجھے الزام نہ دو! میں مجبور ہوں۔ میں اپنی تباہی و بربادی کا موجب نہیں بن سکتی۔"

"تباہی! ——— بربادی!! اب میری زندگی میں باقی رہا کیا ہے؟ شہناز! کچھ خوشیاں، چند قہقہوں کی یادیں ہیں جو تم نے میری جھولی میں محبت کی سوغات سمجھ کر گرا دیے تھے۔ اب یہی میرے لئے عظیم سرمائے سے کم نہیں، شاید میں اُس کے سہارے جینے کی بات سوچنے لگوں۔"

"جو دل سدا تمہارے لئے دھڑکا ہے انور! اُس دل پر زندگی کے آخری لمحات تک تمہارا ہی نام رہے گا!"

"نہیں! نہیں شہناز! خدا کے لئے یہ گناہ اپنے سر نہ لو۔" وہ کانپ گیا تھا۔ "اگر تم میری زندگی سے جا رہی ہو تو اس طرح جاؤ جیسے بادِ صبا کسی خزاں رسیدہ درخت کے پاس سے گزرے اور اُسے پتہ بھی نہ چلے۔"

شہناز اُس کے شانے پر اپنا سر رکھے سسک رہی تھی۔ اُس کا کندھا شہناز کے آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔ اُس نے شہناز کی پیٹھ تھپتھپائی اور جُدا ہوتے ہوئے اُس سے کہا۔

"ایسے حالات میں تمہیں پانے کے لئے میں تمہاری زندگی کو غلط راستوں پر نہ ڈالوں گا۔ شہناز! میں اُن جھوٹے اور بے حد جذبوں کا شیدائی نہیں جن میں لب پر کسی کا نام ہو، اور دل میں کسی اور محبت کی قندیل روشن ہو۔" اُس نے شہناز کے بازوؤں کو تھامتے ہوئے کہا تھا "اب میری یہ نصیحت ہے کہ جب تم کسی دل کے آنگن میں قدم رکھو تو اپنی ساری خوشیاں اُس پر نچھاور کر دینا، اپنے ذہن سے ماضی کی ایک ایک بات، ایک ایک یاد حرفِ غلط کی طرح مٹا دینا۔"

جواب میں شہناز کے آنسوؤں کی روانی نے شدت اختیار کر لی تھی ——— انور نے اپنے ضبط کی بندشیں نہ ٹوٹنے دیں، وہ کسی مضبوط چٹان کی طرح کھڑا رہا۔

"بھول جاؤ شہناز! تم نے کسی انور سے کوئی وعدہ کیا تھا۔"

اُس نے شہناز کی انگلی سے اپنی محبت کی دی ہوئی اُس نشانی کو اُتار لیا۔ جسے اُس نے اپنی تمام تر چاہتوں کے ساتھ اُس کی انگلی میں پہنایا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کوئی ایسی چیز شہناز کے پاس باقی رہ جائے جس سے اُس کی شادمان زندگی پر مایوسیوں کی پرچھائیاں پڑیں۔

اور ایک دن جب شہناز کی بارات آئی تو وہ اس شہر کو چھوڑ ...

[illegible]

کر چکا تھا۔ کچھ دنوں تک کے لئے وہ اپنے ایک دوست کے یہاں چلا گیا تھا۔ وطن واپس آکر اپنے کمرے میں وہ عبادت کرتا تھا۔ وہ اب پرائی ہو چکی تھی۔ اُس نے اس سانحہ کے بعد اپنے دل میں کسی کو جھانکنے کا موقع نہ دیا اور شہناز کی یاد کو گلے لگائے جیتا رہا جیسے اُس کے سامنے زندگی کا مقصد صرف شہناز کی یاد تھی ——— اور اُسی وقت سے اُس نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اچانک سلمہ ماموں جان کہتی ہوئی اوپر آئی۔

انور کے خیالات کا سلسلہ پھر ٹوٹ گیا ——— اور یکلخت شہناز کا حسین اور معصوم چہرہ اُس کی یادوں کے شبستان کی محرابوں میں معدوم ہو گیا۔

" انور ماموں! آپ کے وہ لکھنؤ والے دوست احمد شکور آ گئے ہیں اور وہ دروازے پر کھڑے ہیں۔"

زینے کی سیڑھیاں اُترتے ہوئے انور نے سلمہ سے کہا۔

" جاؤ سلمہ! نیچے پردے کے لئے کہہ دو!"

گیت بند ہو گئے۔ ڈھولک کی تھاپ بھی بند تھی۔ نیچے چائے کا دور چل رہا تھا۔ صحن میں کھڑی لڑکیاں چائے پینے کے درمیان خوش گپیاں کر رہی تھیں۔ جن لڑکیوں نے اپنی چائے پہلے ختم کر لی تھی۔ وہ دوسری لڑکیوں کی چائے پر جھپٹ رہی تھیں۔

" انور ماموں آ رہے ہیں جنہیں پردہ کرنا ہے پردہ کر لیں" سلمہ نے اونچی آواز سے کہا۔

انور سیڑھیاں اُتر کر جیسے ہی صحن میں کھڑی لڑکیوں کے قریب سے گزرا۔ اچانک کسی لڑکی کی آواز اُس کی سماعت سے ٹکرائی۔

" ارے اِن سے کیا پردہ! پردہ تو مردوں سے کیا جاتا ہے!"

اور کئی لڑکیوں کے قہقہوں کی موسیقی فضا میں بکھر گئی ——— !

آ[illegible] کو [illegible] میں کبھی بار ڈاکٹر کا کام بھی کرنا پڑتا ہے۔

گھریلو دواؤں کے خانے میں تیز اثر اور بھروسے لائق اناسن رکھئے یہ بڑے کام کی چیز ہے۔

کوئی کوئی دن ایسا ہوتا ہے کہ سارے کام ہی الٹے ہوتے ہیں۔ آج آپ پہلے تو دیر سے اٹھیں پھر دیکھا کہ باورچی خانے میں کئی چیزیں ختم ہیں۔ اور اوپر سے آپکے لڑکے کو ایسی شدید سردی ہو رہی ہے جیسے اب اسکو فلو ہو جائے گا۔

دوسرے کام تو ہوتے ہی رہینگے۔ پہلے اسے گرما گرم مشروب کے ساتھ اناسن دیکر آرام سے بستر پر لٹا دیجئے۔ اناسن تیزی سے اثر کرتی ہے، اور سردی، زکام اور فلو کی تکلیف سے جلدی آرام ہو جاتا ہے۔ اناسن بھروسے لائق بھی ہے، کیونکہ یہ آپکے ڈاکٹر کی قابل اعتبار دوا کی طرح دواؤں کا ایک نپا تلا مرکب ہے۔



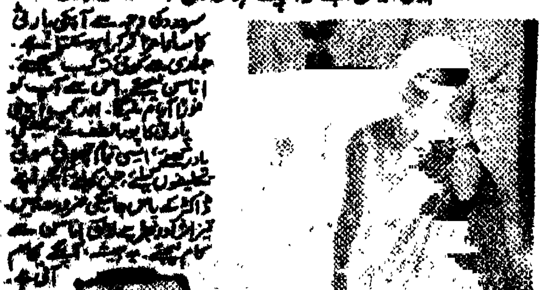
آج آپکی لڑکی اسکول سے جلدی آگئی ہے۔ [illegible] آرام کی وجہ سے بالکل [illegible]

[illegible]



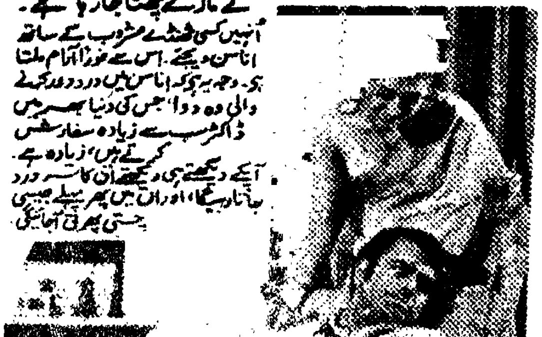
آج آپکے گھر میں پارٹی ہے اور اس کے لئے آپکو تھوڑے سے وقت میں کتنے ہی کام کرنے تھے۔ اسی لئے تو آپ تھک کر سر درد میں مبتلا ہیں۔ لیکن اب تو آپکے مہمان بھی آتے ہی ہوں گے۔

[illegible]



آج آپ کے شوہر کی اپنے افسر سے گرما گرمی ہو گئی جس سے ان کا سر درد کے مارے پھٹا جا رہا ہے۔

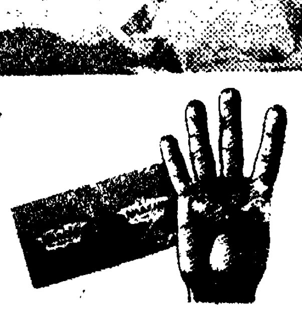
انہیں کسی ٹھنڈے مشروب کے ساتھ اناسن دیجئے۔ اس سے فوراً آرام ملتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اناسن میں درد دور کرنے والی وہ دوا، جس کی دنیا بھر میں ڈاکٹر سب سے زیادہ سفارش کرتے ہیں، زیادہ ہے۔ آپکے دیکھتے ہی دیکھتے ان کا سر درد جاتا رہیگا، اور ان میں پھر پہلے جیسی چستی پھرتی آجائیگی۔



تیز اثر اور بھروسے لائق

اناسن

ہندوستان کی مقبول ترین درد سے نجات دلانے والی دوا



Regd. User of TM: Geoffrey Manners & Co. Ltd.

تصویرِ کرب

محمد بہادر علی بی۔ اے عثمانیہ

عقب دیول ہزار ستون مکان نمبر ۴-۱۰-۰ ہنمکنڈہ ورنگل (آندھرا پردیش)

آداب مدیر، محترم و معظم جناب خورشید گرامی صاحب! تسلیمات

"بیسویں صدی" کے لئے پہلی بار ایک افسانہ "تصویرِ کرب" لئے حاضرِ خدمت ہوں۔ مجھے یقین ہے یہ تصویرِ کرب ضرور آپ کو اور لاکھوں قارئین "بیسویں صدی" کو متاثر کرے گی۔ میں اپنی کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔ میں آپ کے فیصلے کا انتظار کروں گا۔ یقین ہے مجھے بھی حوصلہ افزائیوں سے نوازیں گے۔ میں نے اس بات پر یہ جسارت کی ہے کہ دوسرے نئے ادیبوں کی طرح آپ میرے قلم کو بھی زندگی دیں گے، جلا بخشیں گے۔

خلوص آگیں ——— محمد بہادر علی

★

دل سے عزیز، نکہت

کچھ دیر کے لئے میں تمہاری مصروفیت میں مخل ہو رہا ہوں۔ اس کی معافی چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس ادھورے جملے کے ساتھ ہی جان گئی ہو گی کہ میں کون ہوں؟ نکہت! میں وہی ہوں جسے کبھی تم نے آرٹسٹ کے نام سے جانا تھا۔ میں تمہارا بنایا ہوا آرٹسٹ ہوں۔ آرٹ فطرت ہے، لیکن میں آرٹسٹ تمہارے بنانے پر بنا۔ اگر تم میرے ساتھ کچھ لمحات نہ رہتیں تو یہ آرٹسٹ کا لقب مجھے کبھی نہ ملتا۔ میرے اندر کا آرٹسٹ تو تمہاری ملاقات کے بعد جاگا۔ میں تو کہتا ہوں، آرٹسٹ تم ہو! کیونکہ تم نے میرے دل کے کورے کینوس پر ایک لکیر کھینچ دی جو میرے وجود کے ساتھ رہے گی۔ اس لکیر کو کیا کہوں؟ کیا یہ لکیر میری قسمت ہے؟ یا میری آرزو؟ نہیں۔ یہ لکیر تو کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن وقت اور فاصلے نے اسے بہت گہری بنا دیا ہے۔ میں نے اس لکیر میں اپنی زندگی کو ابھرتے دیکھنا چاہا تھا۔ وہ تو صرف لکیر کی زندگی تھی۔ لو آج وہ لکیر گہری ہو گئی۔ نکہت! سچ تو یہ ہے کہ میرا دل تمہارے لئے ایک کورا کینوس تھا جس پر تم نے بے شمار رنگ پھیلا دیئے۔ کیا ان رنگوں میں کوئی میری پسند کا بھی رنگ ہے؟ نہیں ——— مجھے تمہارے یہ تمام رنگ اس رنگ کے سامنے پھیکے لگتے ہیں۔ تم نہ جانے سکو گی یہ لکیر کیوں کر گہری ہو گئی۔ تم تو صرف ہنسنا اور ہنسانا جانتی تھیں۔ سہانے کتنے دل تمہاری ہلکی سی مسکراہٹ پر دھڑکنے لگتے۔ ان میں میرا بھی ایک دل تھا جو تمہارے لئے دھڑکتا ہے۔ گو کہ یہ باتیں بہت پرانی ہو گئیں لیکن میرے لئے اتنی ہی نئی ہیں جیسے کل ہی کی بات ہے۔ ان دنوں کے بعد سے میرے ذہن کے قرطاس پر عجیب و غریب خاکے ابھرتے ہیں اور مٹ جاتے ہیں۔ ان خاکوں میں نہ جانے کیوں میری زندگی پھیکی دکھائی دیتی ہے۔ خوبصورت خاکے جن میں حقیقت بھری ہوئی ہے۔ وہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔ انہی خوابوں کے چند خاکے جنہیں میں ہر رات دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے خواب بہت پسند ہیں۔ خواہ کیسے بھی کیوں نہ ہوں۔ یہ بات مجھے معلوم بھی تھی کہ خواب حقیقت نہیں ہوا کرتے پھر بھی خواب ہی میرا سب کچھ ہیں۔ مجھے خواب کیوں پسند ہیں اس لئے کہ خوابوں میں میں نے ان خاکوں کو ابھرتے دیکھا تھا۔ یوں تو خواب انسانی خواہشات کا رنگین و سنگین ہالہ ہے۔ لیکن خواب زندگی سے الگ نہیں ہو پاتے۔ ایک نئی چیز کے ذہن میں آتے ہی خواب پھر نئے رنگ میں آتے ہیں۔ میں کہتا ہوں

عام انسانی زندگی میں خوابوں کا شرمندۂ تعبیر ہونا قدرے ناممکنات میں سے ہے۔ پھر وہ آرزو ہی کیا جو پوری ہو۔ سوچا تھا کہ میں نے زندگی میں کچھ نہ پایا۔ صرف سپنے ہی میری زندگی ہیں۔ واقعی خواب زندگی میں ایک نیا وجدان لاتے ہیں، جینے کے لئے اُکساتے ہیں۔ لیکن وہی خواب مجھے ایک ایسی پھانس میں چھوڑ گئے ہیں جس سے نکلنا میرے لئے ممکن نہیں اور یہاں میں چاہتا بھی نہیں کہ آج اُن چند خاکوں کو اپنے ذہن سے دور کر دوں، ہلکے سے مدھم خاکے جن میں مسکراہٹیں بھی ہیں تلخیاں بھی۔ یہ سب مجھے پسند ہیں۔ میں نے زندگی کو ہر روپ میں دیکھنا چاہا۔ تلخ گھونٹ پینا بھی مجھے پسند ہے۔ غم میری فطرت سی ہو گئی ہے اور اور غم مجھے پسند ہے۔ جب سے کہ اُن خاکوں میں رنگ بھرنے کی

- کیا تم دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود کو بھول جاتے ہو؟
(قرآن پاک)
- کھانا بیماری کا سب سے بڑا سبب ہے اور پرہیز تمام دواؤں کی ایک دوا۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- جو رزق کے لئے محنت مزدوری کرتا ہے اور رات تھک کر گزارتا ہے، اللہ اُس سے راضی ہوتا ہے۔
(سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- لوگوں سے خندہ جبینی سے پیش آنا بڑی نیکی ہے۔
(حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

خواہش ہو گئی ہے سوچتا ہوں اُن خاکوں میں اپنا ہی رنگ بھر دوں جو شاہکار بن جائے۔ نکہت! تم اچھی طرح جانتی ہو یہ کون سے خاکے ہیں اور ان خاکوں سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟ آج پھر کرید کر تمہیں سوچنے پر مجبور نہیں کرنا چاہتا۔ تم بھی تو اُن خاکوں میں رنگ بھرنا چاہتی تھیں۔ لیکن وہ رنگ شروع ہی سے پھیکے تھے۔ آرٹ گیلری کی وہ تصویر جس نے تمہیں قدرے متحیر کر دیا تھا، یاد ہے تم نے اُس تصویر کو تصویرِ کرب، کا نام دیا تھا۔ وہ تصویر میں نے ہی بنائی تھی جس کا تمہیں بعد میں پتہ لگا۔ تم نے اِس تصویر میں مصوّر کو دیکھا تھا اور تمہیں نے تو کہا تھا کہ یہ تصویر خاموش ہے لیکن اِس تصویر میں بہت سی باتیں پوشیدہ ہیں جن سے ہلکے سے اشارے پر نہ جانے کتنے سمندر ٹوٹ پڑیں گے۔ میں نے اُسی لمحہ بہ جھجکتے انداز میں کہا تھا کہ صرف مصوّر ہی جانتا ہے اور خالق اپنی تصویر کے کرب کو محسوس کر سکتا ہے۔ تم نہ سمجھ سکو گی۔ میری باتیں قدرے تمہیں تلخ سی معلوم ہوئیں اور تم چند لمحوں کے لئے روٹھ گئیں۔ روٹھ جانے کی تمہاری عادت سی ہو گئی تھی۔

نکہت! تمہیں وہ شام یاد ہے جس شام کالج ڈے کے ختم ہوتے ہی بارش شروع ہو گئی تھی۔ اوڈیٹوریم ڈرامے کے بعد بے ہنگم ہجوم سے بھر گیا تھا۔ لڑکیاں ایک ایک کر کے سواریوں میں جا رہی تھیں۔ بارش کی وجہ سے وہاں چند سواریوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ یوں تو بہت سی لڑکیاں اپنی اپنی کاروں میں آتی تھیں لیکن تم اُس شام کار رکھتے ہوئے بھی اپنی کار کالج نہ لائی تھیں۔ کیونکہ تمہارے پاپا نے تمہیں کار ڈرائیو کرنے سے منع کیا تھا اور تم برابر کار لے جانے پر بچوں جیسی ضد کرتی تھیں۔ اُس وقت تم کار نہ لانے پر ڈرائیور کو کوس رہی تھیں۔ پھر تھوڑی دیر بعد ایک دم ہال میں روشنی ختم ہو گئی۔ یہ لڑکیوں کی شرارت تھی۔ کیونکہ بالکونی پر ابھی چند لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ اُنھیں دیکھ کر لڑکے شور برپا کر رہے تھے۔ تم یہ سب دیکھ کر گھبرا گئی تھیں اور بار بار مجھے گھر لے چلنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ آخر میں تمہارے ساتھ ہو گیا۔ ہم دونوں اُس رات کافی بھیگ چکے تھے۔ راستے میں کوئی سواری نہ ملی اور بارش تیز ہوتی گئی۔ غالباً اب یاد آیا ہوگا اُس بھیگی رات تم اپنی ہی مرضی سے میرے گھر رُک گئی تھیں۔ میرا گھر قریب ہی تھا۔ بارش ختم ہونے تک تم نے میرے گھر پر رُکنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اُس رات ماں گھر پر نہ تھیں۔ میں نے گھر چلنے سے پہلے تمہیں بتا دیا تھا کہ میں گھر پر تنہا ہوں جب بھی تم نے رُکنے کا فیصلہ کر لیا۔ ویسے میں نے تمہارے اِس فیصلے پر ہاں مزید کر دی تھی۔ لیکن دل نہیں چاہتا تھا کہ تم آج رات میرے گھر رُکو۔ کیونکہ ماں نے جاتے ہوئے کہا تھا کہ وہ ضرور آج رات بھائی کو لے کر آئیں گی چاہے رات کے دو کیوں نہ بج جائیں ——! پھر بھی میں آپ ہی آپ مطمئن ہو گیا کہ ابھی تو گیارہ بج رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے ایک گھنٹہ بعد بارش ختم ہو جائے پھر تمہیں چھوڑ آؤں گا۔

اب ہم دونوں گھر پہنچ چکے تھے۔ میں نے بتی جلائی اور تمہیں اندر آنے کے لئے کہا۔ تم اندر آ گئیں، پھر میں نے تمہیں کپڑے بدلنے

کہنے لگیں تو تم قدرے شرما گئیں۔ تمہارے چہرے پر عجیب شفق گوں ہو گئے۔ فضا جیسے نکہت و رنگ میں ڈوب گئی۔ میں نے تمہیں اپنی ماں کی کپڑوں کی الماری بتا دی۔ تھوڑی ہی دیر میں تم سفید ساری پہن کر آ گئی تھیں۔ اس کے بعد تم گھر کی مالک بن گئیں۔ تم نے اسٹو جلایا اور چائے گرم کرنے لگیں، اُس وقت میں نے شرارتاً تمہاری طرف مخاطب ہو کر کہا تھا "نکہت جلدی کرو دیر ہو رہی ہے!" تم میرے یہ الفاظ سُن کر مسکرائیں اور پھر ساتھ ہی بول پڑیں۔ "ایسا حکم دے رہے ہو جیسے مجھ پر تمہارا کوئی حق ہے!" تم اِس طرح بولنے میں کبھی جھجک محسوس نہ کرتی تھیں۔ پھر ہم دونوں چائے پینے لگے۔ ابھی میں نے دو ہی گھونٹ چائے کے لئے تھے کہ تم اپنی چائے کی پیالی ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولیں کہ — "اب جناب یہ نہ کہو کہ چائے بہت اچھی ہے!"

"واقعی تمہارے ہاتھ سے بنی ہوئی چائے میرے لئے حیات بخش ہے!"

"سچ نکہت! تمہارے ہاتھ سے بنی ہوئی . . . ."

"ارے ارے یہ کیا تم پھر تعریف کرنے لگے!"

تمہارے اِس ارے ارے پر میں بے ساختہ ہنس دیا تھا۔ ساتھ تم بھی ہنس پڑیں۔ میں حیران تھا کہ بھیگی رات کے اُن تنہا لمحات میں تم ذرا بھی ہراساں نہ تھیں۔ مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا ہم نے ایسی کتنی راتیں ایک ساتھ گزار دی ہوں — رات حسین سے حسین تر ہو گئی!

میں نے چپکے سے مسکراتے ہوئے تم سے کہا تھا، کیا تمہیں مجھ پر واقعی بھروسہ ہے؟"

"کس بات کا"

"یہی کہ میں ایک شریف آدمی ہوں!"

"نا با — تم تو ایک نمبر کے — کیا کہوں، شریف یا بدمعاش — یہ فیصلہ تو تمہیں ہی کرنا ہوگا؟"

تم یہ کہتے ہوئے میرے ہاتھ سے انگلش ناول — THE SERPENT AND THE ROPE — چھیننے لگیں۔ پھر ناول کا ٹائٹل پڑھتے ہوئے بولیں۔ "اوہو ..... یہ ناول، راجہ راؤ کا لکھا ہوا ہے۔ میں تو اسے ضرور پڑھوں گی!"

"ہاں، ہاں ضرور پڑھ لینا۔ لیکن کیا تم میرا فیصلہ نہ سُنو گی؟

"کیوں نہیں!" پھر تم اپنی نظریں کتاب پر سے ہٹاتے ہوئے بولیں۔ "کیا فیصلہ کیا؟"

"بدمعاش —!" اِس پر پھر ہم دونوں بے ساختہ ہنس پڑے۔ سچ کہتا ہوں نکہت! میں تو صرف تمہیں ہر وقت ہنستے دیکھنا چاہتا تھا۔ اگر کوئی بات ہم دونوں کے درمیان ہنسی کی نہ بھی ہوتی تو کسی نہ کسی بہانے میں تمہیں ہنسانے کی کوشش کرتا۔ جب تم ہنسنے لگتیں تو نہ جانے کیوں میں خاموش ہو جاتا۔ تمہاری ہنسی میں میں اپنی زندگی کی مسکراہٹوں کو ڈھونڈنے لگتا۔ لیکن تم نے کبھی میری طرف غور نہ کیا اور نہ خاموشی کی وجہ پوچھی۔ واقعی تم کتنی معصوم تھیں۔ کیا اُن قہقہوں میں میری مسکراہٹیں تھیں؟ کیا اُن باتوں میں

- <u>نفس کو مال و دولت کے لئے ذلیل نہ کرو۔</u>
(حضرت بابا فریدالدینؒ)
- جب کوئی بندہ کوئی چیز اللہ کے لئے چھوڑ دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے اُس سے بہتر چیز دیتا ہے۔ (حضرت مخدوم نظام الدین اولیاؒ)
- جسم کی سلامتی کم کھانے میں، روح کی سلامتی گناہ سے بچنے میں ہے۔ (شیخ بہاءالدین زکریاؒ ملتانی)
- سب سے زیادہ عذاب عالم بے عمل پر ہوگا۔
(شیخ احمد سرہندیؒ)
- دین کا کام آج ہی کر لو۔ دنیا کا کام کل پر اُٹھا رکھو (شیخ احمد سرہندیؒ)

حقیقت تھی؟۔ لیکن نہ جانے کیوں حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ پھر اُسی رات میں نے تمہاری تصویر بنانے کے لئے کینوس تیار کیا تھا۔ بغیر رنگوں کی تصویر تمہیں بہت پسند تھی۔ اِس لئے تمہاری خواہش کو پوری کرنے کے لئے میں نے پنسل ہی سے تمہاری تصویر اُتار دی۔ جسے تم نے صبح ہوتے ہی پھاڑ دیا تھا۔ اُس تصویر میں میں نے تمہارے دل کی جگہ اپنا دل رکھ دیا تھا جو تمہارے ہی ہاتھوں چاک کر دیا گیا۔ ہاں مجھے وہ بات یاد آ رہی ہے جسے تم کبھی سُننا گوارہ نہ کرتی تھیں۔ تم تصویر کی اِن لکیروں میں ایک ایسی حقیقت کو دیکھ چکی تھیں جو تمہیں کسی طرح پسند نہ تھی۔ تم ہر وقت، غالباً اب بھی اُس حقیقت سے گھبراتی ہو۔ اُس حقیقت میں کیا حق ہے۔

ایک دلکش ہے ایک دلکش تل جو تمہارے دائیں گال پر ہے جسے
کالج کا ہر لڑکا سنگِ اسود کہتا تھا۔ اُن دنوں تم اِس حقیقت سے
پریشان ہو گئی تھیں۔ کبھی تم پریشان ہو کر مجھ سے کہتیں "انجم! اِس
حقیقت کو مٹانے کی کوئی دوا لے آؤ"، میں تمہارے اِن معصوم الفاظ پر
مُسکرا دیتا تھا۔ حقیقت کبھی مٹ سکتی ہے نکہت! کبھی نہیں! چاہے
کتنی بھی کوشش کریں حقیقت مٹ کر بھی اپنا وجود چھوڑ دیتی ہے اور
یہ تو تل ہے جو خوبصورتی کی ایک اچھی دلیل ہے۔ نکہت میں نے بھی
کئی بار اِس تل کو رحیم اور اصغر کی طرح سنگِ اسود کے نام سے دل ہی
دل میں موسوم بھی کیا تھا۔ اُسی لمحہ تمہارے دل میں نہ جانے کیا آیا
کہ ریزر سے اُس تل کو کھرچنے لگیں اگر میں اُس لمحہ تمہیں نہ روک لیتا تو
نہ جانے تم کیا کر بیٹھتیں۔ میں نے اُس وقت تمہاری ضد دیکھ لی تھی۔
تم تو ایک معصوم بچے کی طرح میرے روکنے پر بلکنے لگی تھیں۔ تم پھر
اپنی ساری کا آنچل اُس تل پر رکھتے ہوئے بولیں۔ "انجم کسی طرح اِس
داغ کو مٹا دو!" پھر ایک نئی بات تمہارے ذہن میں آگئی تھی۔ "اگر
خوبصورتی داغ ہے تو پھول کی پنکھڑیوں کو دیکھو جن پر چمکتے ہوئے
شبنم کے موتی جیسے پاک و شفاف قطرے جن کی پاکی پنکھڑیوں
پر آکر نکھرتی ہے۔ حسن ایک نعمت ہے جسے پاکر بھی تم اِس احساس سے
دُور ہو جانا چاہتی ہو تو مزید اِس تل کو مٹا کر داغ بنا دو۔ جو چیز قدرت
کا تحفہ ہے وہ انسان اپنے ہاتھوں سے مٹا دے تو وہ ہر وقت کیلئے
عذاب بن جاتی ہے۔ یہ داغ مٹ کر بھی داغ رہیگا۔ کیونکہ یہ حقیقت
ہے"، میں یہ کہتے ہوئے قدرے جذباتی ہو گیا تھا اور نہ جانے کیوں
تمہارے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔

"انجم! تم دن پر دن فلسفی بنتے جا رہے ہو اور ان دنوں تو
کچھ زیادہ ہی، اور سُنو کل سے میں تمہیں بجائے آرٹسٹ کے فلسفی
کہوں گی کیسا رہے گا؟" یہ کہتے ہوئے تمہارا چہرہ گلابی ہو گیا تھا۔

تم جو کچھ بھی کہتیں میں خاموشی سے سُن لیتا۔ نہ جانے کیوں
جب تم کچھ کہنے لگتیں تو میرا ذہن کچھ ماؤف ہو جاتا۔ تمہارا ہر لفظ میرے
ذہن میں کھُب جاتا لیکن میری اپنی سوچ گُم ہو جاتی۔ کیا یہ سچ نہیں کہ
تم نے ایک بار کھلے الفاظ میں مجھے ٹوکا بھی تھا کہ "مجھے! اِس طرح نہ
دیکھو کہ کہیں ایک عرصہ بعد میرا وجود پھیکا نہ ہو جائے!"
"ایسا کبھی نہ ہوگا!"

پھر اُس رات کے بعد تم سے ملاقات نہ ہو سکی۔ کالج کے آخری
دن یوں دیکھتے دیکھتے گزر گئے اور امتحان قرضخواہ کی طرح سامنے آگیا
جب ایک ماہ بعد امتحان ہال میں ملے بھی تو ایسے جیسے کبھی اِس کالج میں ساتھ نہ
رہے ہوں صرف رسماً گفتگو رہی اور تم اپنی سہیلیوں میں گُم ہو گئیں۔
تم نے مجھے فلسفی کہا نہ آرٹسٹ! میں حیران تھا تمہاری اِس اچانک تبدیلی
پر۔ دوسرے دن بھی میں نے تم سے بات کرنے کی بہت کوشش کی۔
لیکن تم نے موقعہ ہی نہ دیا۔ اِس کے علاوہ ہر روز کے بدلتے ہوئے
رول نمبر ہماری ملاقاتوں میں دیوار بن گئے۔ امتحان بھی ختم ہو گئے۔ ملاقات
کی حسرت رہ گئی۔ اب تو تم نے کالج آنا بھی بند کر دیا تھا۔ امتحان ختم ہوتے
ہی میرے ذہن میں یہ سوال کئی بار اُبھرا کہ تمہارے گھر جاؤں اور خفگی
کی وجہ دریافت کروں۔ لیکن میرا سوال سوال ہی رہ گیا۔ دوسرے دن
تمہارے نوکر سے معلوم ہوا کہ تم امتحان ختم ہوتے ہی اُسی دن حیدرآباد
چلی گئیں۔ اِس کے بعد تم نے سوچا ہوگا کہ بات یہیں ختم ہو گئی۔ بات
کیسے ختم ہوتی۔ بات تو اب شروع ہوئی تھی۔ جس تصویر میں رنگ
بھرنے کا تصور جو پہلے سے میرے ذہن میں تھا اب یہ تصور حقیقت
کی دنیا میں تصویرِ کرب بن کر پیش ہونے لگا۔ کیا میری بنائی ہوئی تصویر
جھوٹ بول سکتی ہے؟ نہیں۔ کیا وہ تصویر خاموش ہے۔ جس کے چہرے
سے پتہ لگتا تھا کہ وہ کچھ کہنے کے لئے بے چین ہے۔ کیا یہ تصویر آج کچھ نہ
کہے گی۔ بہت کچھ کہے گی، آج اِس کی زبان معتبر نہیں صرف تم ہی سمجھ
سکتی ہو۔ ہاں تو نکہت! آج میرے دل کی وہ لکیر گہری ہو گئی ہے جس کا
مجھے برسوں انتظار تھا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ زندگی تصویرِ کرب
کیسے بنتی ہے۔ جس تصویر کا میں خالق ہوں کیا میری تصویر حقیقت
کی زبان ہے یا نہیں۔ آج اُس تصویر کا رنگ مجھے پھیکا سا معلوم ہوتا ہے
جس رنگ کے بنانے میں کئی دن صرف کئے تھے۔ کینوس پر بکھری
ہوئی تمہاری چند لکیریں آج تقریباً مٹ رہی ہیں۔ لیکن وہ لکیر جو تم
اپنی آنکھوں کے قلم سے میرے دل پر کھینچی تھیں وہ ایک داغ بن گئی
ہے۔ اگر آج میں اِس داغ کو مٹانا بھی چاہوں تو یہ داغ مٹ نہ سکے گا۔
میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ شہکار کی زبان کھول دوں۔ لیکن آج
اُس نے اپنی زبان آپ کھول دی ہے۔ میرا شہکار وقت کا تقاضہ
پورا کر چکا ہے۔ جو بھی باتیں اُس تصویر میں پوشیدہ تھیں وہ سب
سامنے آگئیں۔ اب تم پھر کبھی نہ کہوگی کہ اِس تصویر میں بہت

سی باتیں پوشیدہ ہیں۔

کل شام مجھے یہ معلوم ہوا کہ تم دہلی سے اپنے میکے آگئی ہو تو یہ خبر سن کر خوشی بھی ہوئی ساتھ ہی دوسرے لمحہ یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر زیدی نے تمہیں ہمیشہ کے لئے میکے بھیج دیا ہے! یہ خبر میرے لئے اچھی نہ رہی۔ مجھے یہ سن کر ایسا محسوس ہوا، میرے دل سے خون رسنے لگا ہے۔ سچ کہتا ہوں نکہت! میری آنکھوں نے خون کے آنسو روئے۔ یہ سب کیسے ہو گیا؟ ڈاکٹر زیدی تو اچھے آدمی ہیں۔ مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ تمہارے ساتھ بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ میں نے اس سے پہلے تمہیں خط کیوں نہ لکھا؟ اس لئے کہ میں تو ہمیشہ یہی سوچتا آیا ہوں کہ تم جہاں بھی رہو خوش رہو۔ تمہاری خوشی ہی میری خوشی ہے۔ یوں بھی تمہاری خبر مجھے برابر ملتی رہی۔ اس خبر کیسا تھ ہی میری بے چینی بڑھ گئی اور بے ساختہ میں نے اپنی اس مختصر سی حیات کو کاغذی پیرہن بنا دیا۔ اس خط سے پہلے میرے ذہن میں پھر ایک سوال اُبھرا کہ تم سے اور زیدی سے ملاقات کروں۔ لیکن یہ سوال بھی صرف سوال ہی رہ گیا۔ نہ جانے کیوں زندگی میں اتنے سوال ملے کہ بس زندگی ہی ایک سوال بن گئی۔ ایک معمہ بن گئی! پھر ملاقات کرنے کی ہمت کیسے ٹوٹ گئی۔ میں نہیں جانتا۔ ڈاکٹر زیدی کا نام میں نے بہت سُنا ہے۔ وہ ایک اچھے ڈاکٹر ہی نہیں ایک اچھے انسان بھی ہیں۔ میں نے مختلف سائنسی ڈائجسٹ میں اُن کے آرٹیکل بھی پڑھے ہیں۔ کافی اچھی ریسرچ ہے اور ہاں! حال ہی میں کینسر پر زیدی کا ایک آرٹیکل میں نے ریسرچ یونیورسٹی کے میگزین میں پڑھا تھا۔ واقعی کتنی باریک باریک گتھیوں کو انہوں نے کس انداز سے سُلجھایا ہے۔ ان کے پاس زندگی کی کتنی اہمیت ہے۔ وہ دل کو کتنا عزیز جانتے ہیں۔ جب کبھی زیدی کا ذکر آتا ہے تو میرے ذہن میں تمہاری خوشیوں کے ہزاروں پھول کھل اُٹھتے ہیں۔ یہ ایک ہی خوشی مجھے چاہئے تھی۔ لیکن آج خدا نے تمہیں زیدی سے علیحدہ کر کے مجھے شرمندہ کر دیا۔ ڈاکٹر زیدی نے تم پر جو تہمت لگائی ہے وہ غلط ہے بالکل غلط ہے! میرا دل نہیں مانتا کہ تم نے ڈاکٹر کے احساس کو مجروح کیا ہے۔ یہ تو ڈاکٹر زیدی کی بے بصری اور نادانی ہے جو کسی کے بہکاوے میں آکر تم جیسی وفا شعار بیوی کو طلاق دینے کی دھمکی دی ہے۔ غالباً تم بھی جانتی ہوگی۔ ڈاکٹر رفیق جو پچھلے وقتوں میں یہاں دو گل میڈیکل کالج میں لکچرار تھے، وہ ہم دونوں کو اچھی طرح سے جانتے ہیں، اب ان دنوں دہلی میں ریسرچ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ وہ ڈاکٹر زیدی کے دوستوں میں سے ہیں۔ انہوں نے یہ خبر مجھے دی تھی۔ انہوں نے ایک اور بات بتائی تھی وہ یہ کہ اشرف جو ان دنوں تمہارے مکان کے قریب کہیں رہتا ہے وہ زیدی کا گہرا دوست بن گیا ہے۔ اُس کی دوستی ہر دوست کے لئے باعث خطرہ رہی۔ گو کہ دیکھنے میں بہت شریف آدمی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہاں کتنے گھر اجاڑے ہیں وہ یہاں کی ماڈرن سوسائٹی جانتی ہے۔ ڈاکٹر رفیق ان دنوں یعنی جمعہ کی شب میں ڈاکٹر زیدی کیساتھ ہمارے یہاں آرہے ہیں۔ میں نے ڈاکٹر رفیق سے وعدہ لیا تھا کہ وہ ضرور زیدی کو یہاں کسی بہانے سے لائے۔ سُنا ہے زیدی نے بھی میری پینٹنگس دیکھنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ تم فکر مت کرو میں ڈاکٹر زیدی کو تمہارے بارے میں کچھ نہ بتاؤں گا۔ اتوار کو یہاں میری پینٹنگس کی نمائش بھی ہے۔ کاش تم بھی آجاتیں! کتنا خوبصورت اتفاق ہوگا! یہ سچ ہے نکہت! یہ آنکھیں تو صرف تمہیں دیکھنے کے لئے بے چین ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ دو ایک دن کے لئے تم یہاں آجاؤ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمہارے آنے کے بعد میرے دل کے سارے زخم مندمل ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر کہتا ہے اب میں زیادہ باتیں نہ کروں کیونکہ دل کا کینسر بہت بُرا ہوتا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟ چلو یہ بھی ٹھیک ہوا کوئی ساتھی تو بن گیا۔ کینسر کتنا خوبصورت نام ہے! دیکھونا مجھے باتیں کرنے سے بھی روکتا ہے۔ اس وقت تو اس ساتھی کا مجھ پر سختی سے پہرہ ہے۔ نمائش پر اسٹینڈیم تک آ بھی نہ سکوں گا۔ پھر میری بیسویں نمائش اگلے مہینے میں بمبئی میں ہونے والی ہے۔ اس نمائش کے لئے میں نے اپنی زندگی کی تلخیوں کو پینٹنگس کا روپ دے دیا ہے۔ ان پینٹنگس کا ہر ایک لمحہ فکر میری زندگی سے کافی قریب ہے۔ آج ان پینٹنگس کو دنیا ہزاروں روپیوں میں خریدنا چاہتی ہے۔ لیکن یہ تو کسی کے دیئے ہوئے عنوان کی تکمیل ہے۔ ان پینٹنگس میں مجھے تو وہ تصویر پسند ہے جسے تم نے پسند کیا تھا۔ وہی تصویر کرب چھوڑے جا رہا ہوں۔ جسے تم مُسکرا کر بھلا دینا اور ہاں! اس تصویر کے آغاز اور اختتام کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ زیدی سے بھی نہیں، اب وقت کم رہ گیا ہے۔ مجھے خوف ہے نکہت اگر میں نے جن مُسکراہٹوں کے لئے اپنا لہو خشک کیا ہے کہیں وہ تمہارے آنے سے پہلے ہی مٹی نہ بنجا!۔

تمہارا منتظر ——— انجم

غزل

رشی پٹیالوی

مری بے خودی کا حاصل اگر آگہی نہ ہوتی
تری بندگی پہ مائل مری بے خودی نہ ہوتی

جو تری عطا نہ ہوتی جو ترا کرم نہ ہوتا
تری فیض بخشیوں سے مجھے آگہی نہ ہوتی

غمِ عشق اگر نہ ہوتا پسِ پردہ کار فرما
تو جہانِ رنگ و بُو میں کہیں دل کشی نہ ہوتی

ہیں دل و نگاہ روشن ترے پرتوِ نظر سے
جو تری نظر نہ اُٹھتی کہیں روشنی نہ ہوتی

تری خود نمائیوں کو تھا اگر حجاب لازم
تو یہ جراتِ نظر بھی مجھے تُو نے دی نہ ہوتی

یہ مری ہی خامیاں ہیں جو نفس نفس گراں ہیں
ترے پاس آکے ورنہ کوئی بات بھی نہ ہوتی؟

تری یاد اگر نہ ہوتی شبِ غم کی ظلمتوں میں
تری آرزو کے صدقے شبِ غم کٹی نہ ہوتی

جو قریبِ قلب ہو کر بھی دور دور رہتے
جو ہوئی ہے دل کی حالت کبھی اے رشی نہ ہوتی

غزل

نسیم شاہجہانپوری

عبرت کا ہے مقام نہ حیرت کی بات ہے
پیاسا ہوں میکدے میں یہ قسمت کی بات ہے

مانا کہ اشک آنکھ میں خود آگئے مگر
اے ضبطِ غم! یہ کتنی ندامت کی بات ہے

کچھ سوچ کر ہی غم سے نواز آگیا ہوں میں
میرے لئے یہ کتنی مسرت کی بات ہے

کشتی کو نا خدا کے سہارے پہ چھوڑنا
خوددار کے لئے بڑی غیرت کی بات ہے

ہے کل کی بات ترکِ تعلق کا واقعہ
محسوس ہو رہا ہے کہ مدت کی بات ہے

یوں سُن رہا ہے شیخِ حرم لاکر میکدہ
جیسے مری زبان پہ جنت کی بات ہے

پیتا ہے کوئی اشک، بہاتا ہے کوئی اشک
یہ اپنے اپنے ظرفِ محبت کی بات ہے

وہ اور مجھ پہ مائلِ جود و ستم نسیم
یہ انتہائے لطف و عنایت کی بات ہے

نفرت کی قبر

ایم۔ اے تشنہ

سرائے مچھلی۔ قائم گنج۔ ضلع فرخ آباد (یوپی)

محترم! آداب و نیاز

ایک کہانی "نفرت کی قبر" بھیج رہا ہوں۔ سُنا ہے آپ فن کو دیکھتے ہیں فنکار کو نہیں۔ اسی اعتماد سے حوصلہ پاکر پہلی بار "بیسویں صدی" کی بزم میں شریک ہونے کی جُرأت کر رہا ہوں۔ یقین ہے کہ یہ کہانی آپ کو پسند آئے گی۔ اور آپ اِسے "بیسویں صدی" کے بلند معیار کے مطابق پائیں گے۔

نیاز آگیں ——— ایم۔ اے تشنہ

★

"مسافر! تم کہاں جا رہے ہو؟"

"کیوں؟ تمہارا کیا کام ہے؟"

"میں پوچھتی ہوں کہ تم سامنے والی پہاڑی کے اُس پار تو نہیں جا رہے ہو؟"

"جا تو رہا ہوں"

"تو میری ایک بات سُنتے جاؤ۔ میرے شہباز سے کہہ دینا کہ تیری ریشماں تجھے بُلاتی ہے۔ جلدی چلا جا اب تو سیب کے درختوں میں شگوفے بھی آگئے ہیں۔"

مسافر نے حیرت سے اُس معصوم لڑکی کو دیکھا اور اُس کی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی ویرانی کو دیکھ کر فوراً سمجھ لیا کہ وہ پاگل ہے۔ وہ اقرار میں سر ہلا کر آگے بڑھنے لگا تو لڑکی اُس اونچی چٹان سے کود کر نیچے آگئی اور مسافر کے قریب آتے ہوئے بولی۔

"ارے سُنو تو! اِتنا کام اور کرنا۔ یہ روٹیاں لیتے جاؤ میرے شہباز کو دے دینا۔ وہ بھوکا ہوگا"

مسافر اُس کی بات کو اَن سُنی کرکے آگے بڑھنے لگا تو لڑکی نے چلّاتے ہوئے اُس کا دامن پکڑ لیا۔ اور اُسے ڈانٹنے لگی ———

"تم کیسے آدمی ہو؟ میرا اِتنا کام نہیں کر سکتے؟ مجھے جانتے نہیں ہو۔ میں خان جبار خاں کی لڑکی ریشماں ہوں ریشماں!"

مسافر نے پیچھا چھڑانے کے لئے اُس کے ہاتھ سے روٹیوں کی پوٹلی لے لی اور تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

وہ واقعی پاگل تھی۔ روزانہ صبح کو اپنے گھر سے نکل کر پہاڑ کے اُس ٹیلہ پر آکر بیٹھ جاتی جو کوہاٹ جانے والی پتھریلی سڑک کے کنارے آنے جانے والوں کے لئے سنگِ میل کا کام دیتا تھا۔ وہ اُس ٹیلے پر بیٹھ کر دُور سامنے والی پہاڑی کو مسلسل تکتی رہتی جس کے شمالی سرے پر جاکر یہ پتھریلا راستہ اِس طرح ختم ہوگیا تھا جیسے کوئی پہاڑی چشمہ کچھ دور جاکر ایک دم پتھروں کے نیچے چھپ جاتا ہے۔ ایک دن اُس کا محبوب شہباز خاں اسی پہاڑی کے اُس پار چلا گیا تھا اور اُسے صرف ایک اُمید کا سہارا دے گیا تھا کہ وہ ایک دن بہت سی دولت کما کر شہر سے لوٹ آئے گا۔ پھر ایک ترکی گھوڑا خریدے گا اور اُس پر سوار ہو کر دولہا بنا ہوا اُس کے دروازے پر اُس سے شادی کرنے کے لئے آئے گا۔ کیونکہ قبیلے کی رسم کے مطابق، سردار کی بیٹی سے وہی نوجوان شادی کر سکتا تھا جس کی سواری میں ترکی نسل کا نوجوان گھوڑا ہو۔ شہباز خاں قبیلہ کا ایک بہادر لیکن غریب

نوجوان تھا جس کے پاس اپنے پرانی رائفل کے سوا جو اُس کے دادا مرحوم کی نشانی تھی اور کوئی [illegible] نہ تھا۔ جنگی گھوڑا خریدنے کے لئے اُس نے شہر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جہاں وہ بہت سی دولت کمائے گا اور ترکی نسل کا گھوڑا خرید کر ریشماں کو حاصل کرنے کا حقدار بن جائے گا، جو اُسے اپنی جان سے زیادہ چاہتی تھی۔ لیکن محبت ہر دور میں رسم و روایات کی پابند رہی ہے۔ غریب شہباز بھی اُس سے دامن نہ بچا سکا۔ شہر جا کر اُس نے کام تلاش کیا اور بہت کوشش کے بعد سڑک بنانے والے مزدوروں میں پتھر توڑنے کا کام مل گیا۔ خارا شگافی عشق کا قدیم مشغلہ رہ چکا ہے فرہاد نے بھی دودھ کی نہر نکالنے کے لئے پہاڑ کو کاٹا تھا۔ شہباز پوری لگن کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہو گیا اور ایک دن اتفاقاً ایک وزنی چٹان اوپر سے لڑھک کر شہباز کے اوپر گر گئی اور وہ اُس کے نیچے دفن ہو گیا۔ عشق نے ایک قربانی اور لے لی تھی۔

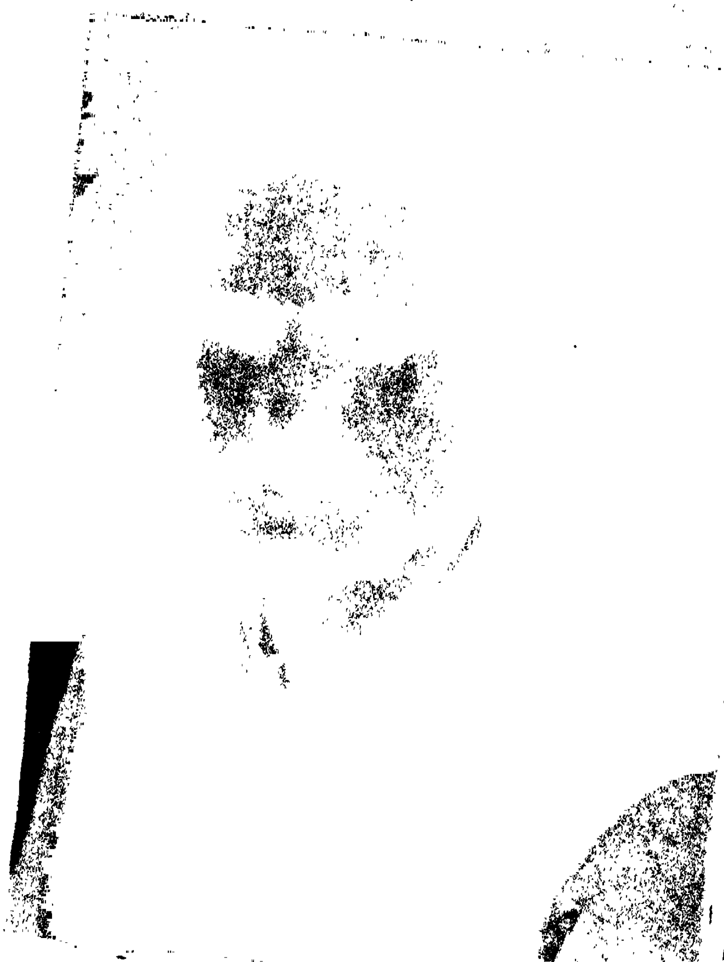
اُمید بڑی سخت جان ہوتی ہے۔ ریشماں پورے حوصلے کے ساتھ اُس کا انتظار کرتی رہی۔ شہباز جب گیا تھا اُس وقت درختوں پر لگے ہوئے کچے سیب ریشماں کے گالوں کی طرح سرخ ہو گئے تھے۔ شہباز نے کہا تھا کہ اگلے سال جب سیب کے درختوں میں شگوفے آنے لگیں گے وہ واپس آ جائے گا۔ لیکن موت نے شگوفوں کی آمد کا انتظار نہ کیا اور ایک دن بستی کا ایک نوجوان جو شہر میں پتھر توڑنے کا کام کرتا تھا شہر سے واپس آیا تو اُس نے یہ خبر سُنائی کہ پہاڑوں کی گود میں پلا ہوا نوجوان پہاڑوں ہی کی گود میں ہمیشہ کے لئے سو گیا ہے۔ یہ خبر ریشماں کو انہونی سی معلوم ہوئی۔ وہ گم سُم سی خاموش رہ گئی۔ اُس کے منہ سے ایک چیخ بھی نہ نکلی۔ آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہ ڈھلکا۔ دل پر غم کا ہلکا سا بھی غبار نہ آیا تو اُس طوفان نے اُس کے دماغ کی طرف راستہ بنا لیا تھا اور وہ پاگل ہو گئی۔ اُس دن کے بعد وہ اپنی بستی سے نکل کر روزانہ اُس ٹیلے پر آ کر بیٹھ جاتی۔ صبح سے شام تک پہاڑی کی جانب نظریں جمائے ہوئے تکتی رہتی اور پہاڑی کی طرف جانے والے ہر مسافر کو شہباز تک اپنا پیغام پہنچانے کی تاکید کر دیتی اور سب سے پہلے جانے والے مسافر کو ایک پوٹلی میں باندھ کر دو روٹیاں بھی دے دیتی جنہیں وہ خاص اہتمام سے پکاتی اور گھی میں چپڑ کر گھر سے اپنے ساتھ لاتی تھی۔

ریشماں کا گھر سڑک کے دوسری جانب بسے ہوئے ایک چھوٹے سے قریئے میں تھا۔ جہاں غلزئی پٹھانوں کا ایک چھوٹا سا قبیلہ آباد تھا۔

اُس قریہ کا نام بازیدہ تھا۔ بازیدہ سڑک پر گزرنے والوں کی نظروں سے پرے اُس چھوٹی سی پہاڑی کی پشت پر تھا جو سڑک کے کنارے ایک دیوار کی طرح کھڑی ہوئی تھی۔ ریشماں اُس قبیلے کے سردار خان جبار خان کی لڑکی تھی۔ اپنے چار بھائیوں کی اکلوتی بہن، لاڈ پیار میں پلی ہوئی۔ بڑے خان نے اپنی بیٹی کا دل رکھنے کے لئے ہی اُسے شہباز خان جیسے غریب نوجوان سے ایک معمولی سی شرط پوری کرنے کے بعد شادی کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ لیکن تقدیر کے اُس مذاق پر جبار خان اور اُس کے بیٹے تلملا کر رہ گئے۔ وہ ریشماں کی حالت دیکھ کر غم کے آنسو پی کر رہ جاتے تھے۔ اُس پہاڑی علاقہ میں جہاں پتھروں کی چوٹ کے لئے مرہم بھی پتھروں سے بنتا ہے انہوں نے ریشماں کے علاج کے لئے سارے جتن کر ڈالے۔ لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ وہ جانتے تھے کہ اِس کا علاج صرف شہباز خان کا وجود تھا۔ جو اب معدوم ہو چکا تھا۔ اِس لئے اب ریشماں کا علاج بھی ناممکن تھا۔

زندگی اپنے معمول پر آگے بڑھتی رہی۔ بازیدہ میں بظاہر کوئی کمی نہ آئی تھی۔ مرد اپنی چھوٹی چھوٹی کلہاڑیاں پتھروں پر گھس کر انہیں تیز کرتے رہتے تھے۔ یا اپنے آتشیں اسلحہ کی صفائی اور مرمت میں مصروف رہتے تا کہ کسی وقت موقع پڑنے پر جو ہر وقت پڑ سکتا تھا وہ دھوکا نہ دے سکیں اور عورتیں خالی کارتوسوں میں چھرے اور بارود بھر کر انہیں دوبارہ استعمال کے قابل بناتی رہتی تھیں۔ ویسے ان لوگوں کی معاش پھلوں کی باغبانی اور تجارت پر منحصر تھی۔ قریہ کے چاروں طرف سیب، ناشپاتی، انگور، آڑو، خوبانی، لیچی، گلاس اور رس بھری وغیرہ کے باغات پھیلے ہوئے تھے۔ جو انہیں دشمنوں سے بچنے کے لئے بہترین کمین گاہ کا کام بھی دیتے تھے۔ باغبانی کے علاوہ وہ اپنی عزت کے نازک شیشہ کی حفاظت کیلئے دشمنی کرنا، دشمنی پالنا اور دشمنی نبھانا بھی اُن کا آبائی پیشہ تھا، جس پر وہ اپنی روزی سے زیادہ توجہ دیتے تھے۔ اکثر اِس طرح کے واقعات ہوتے رہتے تھے۔ جب پہاڑوں کی خشک اور پیاسی زمین اُن غیرت مند پٹھانوں کے خون سے سرخ ہو جاتی تھی۔

انہیں اپنی عزت عزیز تھی تو وہ دوسروں کی عزت کرنا بھی جانتے تھے۔ جو قبیلے ایک دوسرے کے حلیف بن جاتے تھے اُن کے درمیان دوستی اور یگانگت کے وہ روح پرور مناظر دیکھنے میں آتے تھے کہ آسمان جو اور زمینوں کے مقابلہ میں وہاں سے کچھ زیادہ قریب تھا اُن کے انتہا پسند مزاج اور سیمابی فطرت کو دیکھ کر حیرت سے تکتا رہ جاتا تھا۔



میل کے فاصلے پر مشرق کی جانب
میسں نامی ایک دوسری پہاڑی پر خوشہ پیر کی درگاہ تھی
جہاں سال میں ایک بار بہت بڑا میلہ لگتا تھا۔ یہ وہ زمانہ
ہوتا تھا جب کہ سارے قبیلوں کے نوجوان شہر میں سیبوں کی
فصل بیچ کر اور سال بھر کے لئے ضروریاتِ زندگی کا سامان
خرید کر اپنے گھروں کو واپس آجاتے تھے۔ سیبوں کی فصل
اُس علاقے کی سب سے بڑی فصل ہوتی تھی۔ اس لئے خوشہ پیر
کی درگاہ پر بہت بڑا اور بارونق میلہ لگتا تھا۔ چاروں طرف
سے بوڑھے جوان اور بچے بہترین اور نئی پوشاکیں پہن کر آتے تھے
سرخاب کلاہوں کی سنہری چمکدار کلیاں اور رنگ برنگ کی
جیکٹیں پہنے ہوئے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی کلہاڑیاں لئے
ہوئے پُرجوش باغی اور بے فکر انسان موجیں مارتے ہوئے سمندر
کی طرح نظر آتے تھے۔ یہ چھوٹی چھوٹی کلہاڑیاں گویا ان کے
لباس میں شامل ہوگئی تھیں۔ چہروں پر جاہ و جلال اور آنکھوں
میں خلوص کی نرمی۔ زبان سے نکلتے ہوئے کرخت الفاظ میں
محبت کی شیرینی اور ہونٹوں پر بکھرتے ہوئے قہقہے۔ یہ ساری
چیزیں مل کر عجیب سا کیف انگیز نظارہ پیش کرتی تھیں۔
خان جبار خاں کا بڑا بیٹا خاں نصرت خان بھی
خوشہ پیر کی درگاہ پر میلہ دیکھنے آیا ہوا تھا۔ وہ اپنے دوست
اشرف خان کے ساتھ نانبائی کی دوکان سے ہرن کے سیخ
کباب کھا کر پہاڑی کے شمالی جانب بہنے والے چشمہ کی طرف
پانی پینے جا رہا تھا کہ راستہ میں ایک جگہ کچھ دیکھ کر وہ رُک گیا۔ اس نے
اُسے پھر دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ اشرف خان اُسے اس طرح رُکتے دیکھ کر
حیرت زدہ سا ہوگیا۔ نصرت خان نے اُس سے کہا وہ اکیلا ہی چشمہ پر
چلا جائے اور پھر ایک گھنٹہ کے بعد درگاہ کے مغربی گوشہ میں بنے ہوئے
چشمے کے دروازے پر اُسے ملے۔ یہ کہتا ہوا وہ تیزی سے اُس جانب مُڑ گیا۔
جہاں کسی چیز نے اُس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلی تھی۔ یہ ایک نوجوان
تھا۔ پورا لمبا قد، بڑی بڑی آنکھیں، اونچی پیشانی، سُرخی لئے ہوئے
تابناک شہابی رنگت۔ ہونٹوں پر باریک ترشی ہوئی خوب صورت
مونچھیں، گلابی رنگ کی مخملی جیکٹ پہنے ہوئے اور کندھے پر ایک ہلکی
سی ایرگن لٹکائے ہوئے مردانہ وجاہت کا بے مثال اور مکمل نمونہ تھا۔

نصرت خاں نے اُس کے پاس پہونچ کر اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے
بہت نرمی سے کہا۔
"السلام علیکم خان! تم کہاں سے آئے ہو؟"
"وعلیکم السلام۔ میں شیر دیہ کا رہنے والا ہوں خان برادر! یہ
سامنے جو پہاڑی نظر آتی ہے اُس کی پشت پر دو میل آگے ایک چھوٹا سا
قریہ آباد ہے اُس کا نام شیر دیہ ہے۔ میرے خان بابا کا نام خان تہور
خان ہے اور میرا نام اکمل خاں۔" نوجوان نے بے حد خوش مزاجی
سے جواب دیا۔
"او۔ خان! تمہارا نام اکمل خاں نہیں ہوسکتا۔ تمہارا نام
شہباز خاں ہے!"

درد

آرزو بھی، حسرت بھی، درد بھی، شدت بھی
سیکڑوں ہیں ہنگامے زندگی مگر تنہا! ——— ناصلم

اے دلِ درد آشنا کیوں درد سے گھبرا گیا
زندگی تو در حقیقت درد ہی کا نام ہے ——— جمال

دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا ——— صبا

جس کے دل پہ بیت رہی ہے اُس سے دل کی بات نہ پوچھو
کون کسی کے درد کو سمجھے یہ سب کہنے کی باتیں ہیں ——— رشتی

درد کو اس لئے سینے سے لگا رکھا ہے
زندگی ایک انگوٹھی ہے نگینہ ہے یہی ——— عاجز

مُرسلہ:۔ مس زیبا محمود، د عضباد

"وہ کیسے؟ خان برادر!"

"میں تمہیں بتاؤں گا دوست! کیا تم میرے ساتھ نیچے اُس چٹان تک چل سکتے ہو۔ ہم تنہائی میں بیٹھ کر کچھ باتیں کریں گے۔"

"کیوں نہیں دوست! تم نے مجھے دوست کہا ہے۔"

دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے میلے کے ہجوم سے باہر نکل آئے اور ایک چٹان پر لوکاٹ کے ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ گئے۔ نصرت خاں نے کہا۔

"دوست! تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔ تم شہباز خاں بن کر میرے گھر آؤ گے اور میری پاگل بہن کو یہ یقین دلاؤ گے کہ تم اب اُس سے محبت نہیں کرتے۔ تمہاری شکل میری بہن کے مرحوم شہباز خاں سے ایک دم ملتی ہے۔ ریشماں کو تمہیں شہباز مان لینے میں ذرا بھی تامل نہ ہوگا۔ بولو تم میرا یہ کام کرو گے؟"

اکمل خاں نصرت کی باتیں سُن رہا تھا اور اُس کے چہرے کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اُسے خود نصرت پر پاگل ہونے کا گمان ہو رہا تھا کچھ دیر رُک کر اُس نے کہا۔

"میں تمہاری بات سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟"

"ہاں مجھ سے غلطی ہوئی۔ بات یہ ہے کہ میری ایک چھوٹی بہن ہے ریشماں۔ وہ ہمارے قبیلہ کے ایک نوجوان شہباز خاں کا انتظار کرتے کرتے پاگل ہو گئی ہے۔ جو ریشماں کے ساتھ شادی کی تیاریاں کرنے کے لئے دولت کمانے شہر گیا تھا۔ لیکن وہاں ایک حادثہ میں اُس کا انتقال ہو گیا۔ اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گا اور میری بہن کی زندگی بھولی بھٹکی اندھیرے میں بھٹکتی ہوئی ایک دن ختم ہو جائے گی۔ لیکن تم اُس کی زندگی بچا سکتے ہو۔ میں تمہاری شباہت میں مرحوم شہباز خاں کی صورت دیکھ رہا ہوں۔ بالکل وہی! کوئی فرق نہیں۔ اگر تم شہباز خاں کا نام اختیار کر کے اُسے یہ یقین دلا دو کہ اب تم ایک بڑے آدمی بن گئے ہو اور اُس کے بجائے کسی دوسری لڑکی سے شادی کرنے کی تیاریاں کر رہے ہو تو وہ خود فریبی کے اُس بھیانک غار سے نکل کر ہوش و حواس کی روشنی میں آجائیگی اور وہ شہباز خاں سے نفرت کرتے ہوئے اپنی زندگی کو معمول پر لے آئیگی، تو ہم اُس کی شادی کسی مناسب جگہ کر دیں گے۔"

"مجھے تم سے ہمدردی ہے لیکن میں یہ دل توڑنے والا کام کس طرح کر سکوں گا۔"

"اُس کا دل تو پہلے سے ہی ٹوٹا ہوا ہے۔ اب اُس کی اُس موہوم اُمید کو توڑنا ہے جسے وہ اپنے پاگل پن میں سینے سے لگائے بیٹھی ہے۔ اُس کے بعد وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ مومیائی ہے جو ٹوٹی ہوئی ہڈی کو جوڑ دیتا ہے۔"

"میں بڑی اُلجھن میں پڑ گیا ہوں۔"

"اُلجھن کو دُور پھینک دو میرے دوست! اور وعدہ کرو کہ تم یہ کام ضرور کرو گے۔ ہمارے خاندان پر تمہارا یہ بہت بڑا احسان ہوگا۔ ریشماں ہم چار بھائیوں کی ایک اکیلی بہن ہے۔ میں اُسکی خاطر تم سے اس مہربانی کی بھیک مانگتا ہوں۔"

"نہیں۔ نہیں۔ خان! ایسا مت کہو۔ میں یہ کام ضرور کرونگا۔"

"تو تم میرے گھر آؤ گے؟"

"یقیناً آؤں گا۔"

"وعدہ کرتے ہو؟"

"وعدہ کرتا ہوں۔"

"وعدہ کی اہمیت جانتے ہو؟"

"جانتا ہوں۔ ہم خشک ہیں اور خشک پٹھان اپنے وعدہ کی

قیمت اپنی جان سے زیادہ سمجھتے ہیں!"

"شکریہ! میرے دوست! شکریہ!!"

یہ کہتے ہوئے فرطِ مسرت سے اُس نے اکمل خان کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

"ہاں تو اکمل خان! نہیں شہباز خان! تم کل میرے گھر آجاؤ۔ یہاں سے تین میل مغرب کی طرف کوہاٹ والی سڑک پر ایک قریہ بالیدہ نام کا ہے۔ ہم لوگ وہاں رہتے ہیں۔ یہاں سے چل کر کوہاٹ کی سڑک پر جب پہلا نشیب ملتا ہے اُس جگہ سے پچاس قدم آگے طرف جنوبی پہاڑیوں میں سے ایک راستہ بالیدہ کو گیا ہے۔ میں تمہیں سڑک پر ہی انتظار کرتا ہوا مل جاؤں گا۔ تم کس وقت آؤ گے میرے دوست؟"

"سورج جب سیب کے درختوں سے ایک نیزہ اونچا ہو جائے گا میں تمہاری بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے میں تمہیں وہیں سڑک پر انتظار کرتا ہوا ملوں گا!"

دوسرے دن نصرت خان بہت بے چینی سے سڑک پر ٹہل رہا تھا۔ سورج کافی اونچا ہو گیا تھا۔ اچانک اُسے مشرقی پہاڑیوں میں گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز گونجتی ہوئی سنائی دی اور تھوڑی دیر کے بعد سامنے کے موڑ سے نکل کر اکمل خان اُس کی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔ اکمل خان کل ہی والے لباس میں تھا۔ صرف اُس کے کاندھے پر ایرگن کی جگہ رائفل نے لے لی تھی۔ قریب آتے ہی وہ گھوڑے سے کود پڑا اور نصرت خان نے دوڑ کر اُسے گلے سے لگا لیا۔

"تم آگئے شہباز خان! خوش آمدید! خان اعظم خوش آمدید!"

اور پھر دونوں پیدل جنوب کی طرف مڑنے والے راستے پر ہو لئے۔ نصرت خان جوش اور مسرت کے ملے جلے لہجے میں مسلسل باتیں کئے جا رہا تھا اور اکمل خان گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے اُس کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ پہاڑی کے بعد ہی آبادی تھی اور پہلا مکان خان جبّار خان کا تھا۔ پگڈنڈی سے ہٹ کر چند سیڑھیاں چڑھنے کے بعد بوڑھے خان بابا کی نشست گاہ تھی۔ اندر ایک وسیع و عریض ہال نما کمرہ تھا جسے بوڑھے خان کی نفاست پسند طبیعت نے اپنے ذوق کے مطابق سجا رکھا تھا۔ کمرے کے باہر سرکنڈوں سے بنی ہوئی کھپریل پڑی تھی۔ بوڑھا خان کھپریل کے نیچے ایک مونڈھے نما کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے سامنے دس بارہ مونڈھے دو رویہ پڑے ہوئے تھے۔ خان

ہجر

ہجر میں وصل کا ملتا ہے مزہ عاشق کو
طوق کا مرتبہ جب حد سے گذر لیتا ہے ——— آتش

کیا ہی ستم ظریف ہے وہ شوخ چشم بھی
یہ پوچھتا ہے ہجر میں تکلیف کیا ہوئی ——— احسن مارہروی

مری زندگی تو گذری ترے ہجر کے سہارے
مری موت کو بھی پیارے کوئی چاہئے بہانہ ——— جگر مرادآبادی

اے حسن! ہم کو ہجر کی راتوں کا خوف کیا
تیرا خیال جاگے گا سویا کریں گے ہم ——— معین احسن جذبی

دل دے دیا ملنگی مگر اس کی خبر نہ تھی
پینا پڑے گا ہجر میں خونِ جگر مجھے ——— ملنگی لکھنوی

مرسلہ: امیر انصاری، جورہاٹ (آسام)

نے دونوں کو آتے دیکھا تو از راہِ شفقت آنے والے مہمان کا استقبال کیا۔ نصرت خان اُسے ساری بات پہلے ہی بتا چکا تھا۔ بوڑھا خان بہت غور سے اکمل کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر نوجوان کو اپنے سینے سے لگایا اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بہت شفقت سے اپنے برابر بٹھا لیا اور کہا ———

"او خان بچے! تم تو واقعی شہباز خان معلوم ہوتے ہو! نصرت خان کہتا ہے تم شیرو کے رہنے والے ہو۔ کس کے بیٹے ہو تم؟"

"جی! میں خان تہوّر خان کا بیٹا ہوں!"

"یقیناً۔ یقیناً! تم تہوّر خان کے بیٹے ہو۔ کسی وقت خان تہوّر خان میرا بہت اچھا دوست تھا۔ ۱۹۳۶ء کے مورچہ میں ہم نے شرط لگا کر فرنگیوں کو مارا تھا۔ کسی دن میرا شکار زیادہ ہوتا تھا کسی دن تہوّر خان کا۔ لیکن مورچہ ختم ہونے پر آخر میں ہم دونوں کے شکار کی گنتی برابر تھی۔" بوڑھے خان نے بڑے فخریہ انداز میں کہا۔ اُس کی نظریں دُور خلاء میں کسی موہوم نقطہ پر جمی ہوئی تھیں اور آنکھوں میں بیتے دنوں کی شاندار اور زندگی بخش یادیں جھلک رہی تھیں۔

دونوں نوجوان خاموش بیٹھے تھے کہ اچانک بوڑھے خان

نے چونکتے ہوئے کہا۔

"او نصرت خان! اپنے معزز مہمان کے لئے ناشتہ کا انتظام کرو۔"

"سب کچھ تیار ہے خان بابا! بس آپ کی اجازت درکار ہے۔"

"یقیناً۔ یقیناً! تم دونوں جاکر ناشتہ کرلو۔ اس کے بعد دوسری باتیں ہوں گی۔"

ناشتہ میں شیر خورمہ، پنیر، تیتر کا گوشت اور قہوہ تھا۔ ناشتے کے بعد دونوں دوست باہر نکل آئے۔ نصرت خان نے کہا۔

"ریشماں سڑک کے کنارے ایک ٹیلہ پر بیٹھی ہوگی جہاں ہم تم ابھی ملے تھے۔ وہ وہیں بیٹھ کر شام تک شہباز کا انتظار کرتی ہے تم اس کے پاس اکیلے جاؤ۔ دیکھو دوست! تم نے ایک نازک کام اپنے ذمہ لیا ہے۔ اُسے اِس طرح انجام دو کہ ہماری ریشماں، پہلے والی ریشماں ہمیں واپس مل جائے۔"

"میں کوشش کروں گا کہ تمہارے کام آسکوں۔"

"جاؤ خدا تمہاری مدد کرے"

اور اکمل خاں گھوڑے کی لگام پکڑ کر آہستہ آہستہ سڑک کی جانب چل دیا۔ نصرت خاں ایک دوسرے راستے سے پہاڑی پر چڑھ کر ایک چٹان کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ جس کے دامن میں وہ چھوٹا سا ٹیلہ تھا جہاں ریشماں بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس نے اپنے آپ کو اِس طرح چھپا لیا تھا کہ اکمل خاں یا ریشماں کی نظر اُس پر نہ پڑسکے۔

اکمل خاں پہاڑی درّے میں ہوتا ہوا سڑک کی جانب جا رہا تھا۔ وہ اپنے ذہن میں اُن الفاظ کو دُہرا رہا تھا جو اُسے ریشماں سے کہنے تھے۔

"مجھے بھول جاؤ ریشماں! ...."

اپنی اور ریشماں کی متوقع گفتگو کا سارا منصوبہ اُس نے پہلے سے تیار کر لیا تھا اور جب وہ اِس چھوٹے سے درّہ سے نکل کر سڑک پر آیا تو اُس کی دائیں جانب سڑک کے کنارے ایک ٹیلہ پر ایک لڑکی پاؤں لٹکائے ہوئے بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ اُس کی نظریں دُور سامنے والی پہاڑی کے دامن میں جذب ہو جانے والے راستہ پر لگی ہوئی تھیں۔ اکمل خاں اور اُس کا گھوڑا بہت آہستہ آہستہ قدم رکھ رہے تھے۔ ریشماں نے اُن کی آہٹ بھی محسوس نہ کی اور جب وہ بالکل قریب جاکر اُس کے سامنے رُکا تو ریشماں نے نظریں گھما کر اکمل کی جانب دیکھا جو

بہت [illegible] اُسے دیکھ رہا تھا [illegible] ریشماں نے جیسے اُسے پہچان لیا اور [illegible] نیچے کود کر اُس سے لپٹ گئی۔ اکمل کی [illegible] سے کیا کہنا تھا اُس موقع پر وہ سب کچھ بھول گیا [illegible] اور اُس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو [illegible] نے کہا ـــــ

"ریشماں! کیوں روتی ہو! آنسو پونچھ ڈالو ریشماں! میں آگیا ہوں شہباز! تمہارا شہباز!!"

ریشماں نے اپنی چھلکتی ہوئی آنکھیں اُٹھائیں تو اکمل نے اپنے دامن میں اُس کے آنسو جذب کر لیئے۔ ریشماں نے رُندھے ہوئے گلے سے کہا۔ "پہلے ایک بات بتاؤ شہباز! اب تو مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ گے؟"

"جاؤں گا لیکن تمہیں چھوڑ کر نہیں، تمہیں ساتھ لے کر چلوں گا۔ تمہیں لینے آیا ہوں!"

اکمل کے ذہن میں ایک آندھی سی چل رہی تھی۔ وہ کیا کر رہا ہے اور اُس کے نتائج کیا ہوں گے یہ سب سوچنے کے لئے اُس کے پاس وقت نہ تھا۔ اُس نے سہارا دے کر ریشماں کو گھوڑے پر بٹھایا اور رکاب میں پیر رکھ کر خود بھی سوار ہوگیا۔ گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا اور اُس کی ٹاپوں کی آواز پہاڑیوں میں گونج پیدا کرنے لگی۔ نصرت خاں نے پہاڑی کی چوٹی سے دوڑتے ہوئے گھوڑے کی آواز بازگشت سُن تو جھک کر نیچے دیکھا۔ گھوڑا اگلے موڑ پر سے غائب ہو چکا تھا اور اُس کی ٹاپوں کی آواز دُور اور دُور ہوتی جا رہی تھی۔ نصرت خاں نے نیچے ٹیلے کو دیکھا وہاں ریشماں بھی نہ تھی اُس کا جی چاہا وہیں سے چھلانگ لگا کر سڑک پر آجائے لیکن بلندی بہت کافی تھی۔ عقلِ سلیم جذبات پر غالب آگئی اور وہ پیچھے کے راستے سے چٹانوں پر چڑھتا ہوا خندقوں اور گڑھوں کو پھلانگتا ہوا درمیانی درّہ میں اُترا اور دوڑتا ہوا سڑک پر آیا۔ ٹیلے کے چاروں طرف دیوانہ وار پھر کر اُس نے دیکھا لیکن ریشماں کہیں نہ تھی۔ اب اُسے حالات کی نزاکت کا احساس ہو چکا تھا۔ وہ اُلٹے قدموں دوڑ کر بستی میں آیا۔ اپنی رائفل اُٹھائی اور گھوڑا تھان سے کھول کر اُس پر سوار ہوگیا اور اکمل کے متوقع راستے پر تیزی سے دوڑنے لگا۔ آگے جانے والے کا کوئی نشان اُسے نہیں مل رہا تھا۔ پہاڑوں میں کسی کا نقش پا ملنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اُسے ٹاپوں کی آواز بازگشت بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ

بیٹھ کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ [illegible]
تھا۔ [illegible] کی ہوائیں [illegible] سے [illegible]
اُس نے سوچا ہو سکتا ہے اکمل یہاں تک پہنچنے سے [illegible]
مارا اُس [illegible] کر کے نکلا۔ لیکن وہ کہیں نہ گئے۔ وہ
تیزی سے پھر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور اُس کی باگ شیر دیہہ کی طرف موڑ
دی۔

یہاں سے شیر دیہہ تک زمین قدرے ہموار تھی۔ کہیں کہیں صرف چھوٹے چھوٹے ٹیلے نظر آتے تھے۔ چاروں طرف پھیلا ہوا کسی حد تک ہری بھری گھاس تھی اور کہیں کہیں گندم کے کھیت بھی دکھائی دیتے تھے۔ نصرت کو جا بجا لوگ اپنے کھیتوں میں کام کرتے ہوئے نظر آئے لیکن اُس نے اُن سے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ تھوڑی دیر کے بعد انگوروں کے کنج کی پشت پر اُسے ایک بستی کے آثار دکھائی دیئے۔ اُس نے اندازہ لگایا کہ یہی شیر دیہہ ہو سکتا ہے۔ پھر بھی اُس نے راستے کے کنارے چلتے ہوئے ایک آدمی سے پوچھا "کیا یہی شیر دیہہ ہے؟" اُس آدمی نے اُسے حیرت سے دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا اور وہ گھوڑے کی رفتار کم کئے بغیر آگے بڑھ گیا۔ چند ثانیوں میں وہ شیر دیہہ میں داخل ہوا۔ اب اُس نے رفتار دھیمی کر کے تہور خان کے گھر کا پتہ پوچھا۔ ایک شخص نے اشارے سے اُسے تہور خان کا مکان بتا دیا۔ اُس نے گھوڑے کو مردانہ نشست والے چبوترے کے برابر میں روک دیا اور خود گھوڑے سے اُچھل کر چبوترے پر آ گیا۔ چبوترے پر ایک بوڑھا شخص بیٹھا تھا۔

"کیا میں تہور خان سے مخاطب ہوں؟"

"ہاں۔ ہاں میرے عزیز! آؤ بیٹھو۔ تم بہت پریشان معلوم ہوتے ہو!"

"میں یہاں بیٹھنے کے لئے نہیں آیا۔ مجھے بتاؤ کہ تمہارا بیٹا اکمل کہاں ہے؟"

"وہ تو آج سویرے ہی بغیر کچھ بتائے ہوئے کہیں چلا گیا ہے۔ لیکن تم اُسے کیوں پوچھتے ہو۔ کہاں سے آئے ہو میرے عزیز!" تہور خان کا لہجہ انتہائی نرم اور پُر اخلاق تھا۔ لیکن نصرت خان کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

"میں بازیدہ سے آیا ہوں اور تمہارے بیٹے کے خون کی پیاس مجھے یہاں تک لائی ہے!"

"تم مرے آگے بڑھ رہے ہو نوجوان! روئے زمین پر کوئی ایسا نہیں جو میرے ہوتے ہوئے میرے بیٹے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے؟"

"لیکن وہ ہمارا مجرم ہے!"

"کیا کیا ہے اُس نے؟"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ مجھے پوری بات بتاؤ!"

"اُس نے ہمارا ناموس چرایا ہے!"

"آج ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ میری بہن کو ورغلا کر اپنے ساتھ گھوڑے پر بٹھا کر لایا ہے اور تم نے اُسے گھر میں چھپا رکھا ہے۔ اُسے ہمارے حوالے کر دو!"

"نہیں! وہ یہاں نہیں آیا ہے اور تم جو کچھ کہہ رہے ہو یہ سب بہتان ہے۔ میرا بیٹا ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ تم میرے بیٹے کے بلند کردار پر کیچڑ اُچھال رہے ہو نوجوان! مجھے افسوس ہے کہ تم میرے گھر آئے ہو ورنہ اس بہتان طرازی کی سزا تمہیں ضرور دیتا!" اب تہور خان کی بوڑھی آنکھیں بھی غصے سے سُرخ ہو گئی تھیں اور وہ کسی سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا۔

"تم چلے جاؤ۔ نوجوان! مجھے تمہاری جوانی پر ترس آ رہا ہے۔ چلے جاؤ۔ مجھے ڈر ہے میرے اوپر مہمان کُشی کا الزام نہ لگ جائے!"

"میں جا رہا ہوں۔ لیکن ہم اپنے ناموس پر ہاتھ ڈالنے والوں کو سزا دینا بھی جانتے ہیں!"

اتنا کہہ کر نصرت خان پلٹا اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اُسے آگے بڑھانا ہی چاہتا تھا کہ تہور خان کی آواز گونجی۔

"ٹھہرو۔ نوجوان!" تہور خان اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُس کے پاس آیا اور اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگا۔ "نوجوان! اکمل خان اب تک یہاں نہیں آیا ہے۔ اگر تمہارا الزام واقعی صحیح ہے تو اُس کے آنے پر اُسے خوفناک ترین سزا دی جائے گی۔ یقین رکھو! اب تم جا سکتے ہو۔"

نصرت خان نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور آگے بڑھ گیا۔

ریشماں کو دیکھ کر اکمل خان کا ذہن مفلوج ہو گیا تھا۔ اُس کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اب اُس کے سارے وجود پر دل کی حکمرانی تھی اور اُسی کے اشارے پر وہ غیر متوقع فیصلے کرتا چلا گیا۔ پختون قبائل کے آہنی قوانین سے بغاوت کے سنگین نتائج کا خیال بھی اُس کے ذہن میں نہ آیا اور وہ ریشماں کو گھوڑے پر بٹھا کر ایک نامعلوم منزل کے لئے روانہ ہو گیا۔ مشرق کی جانب کچھ دور نشیب میں چل کر ایک شمالی درّے میں

اُس نے اپنے گھوڑے کی باگ موڑ دی۔ اُس کے ذہن میں ایک طوفان برپا تھا لیکن کسی طرح کا خوف نہ تھا ——— اور ریشماں! اُسے تو اپنا کھویا ہوا پیار مل گیا تھا۔ وہ ایک نڈھال ہرنی کی طرح سہمی ہوئی اپنے "شہباز" کے سینے سے لگی بیٹھی تھی۔ تقدیریں یوں بھی اچانک بدل جاتی ہیں اِس کا اُسے احساس بھی نہ تھا۔ یاس کی بے پناہ تاریکیوں میں ایک سورج اپنی پوری تابناکی سے چمک اُٹھا تھا جس نے اُس کے ذہن کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ اور اب وہ آہستہ آہستہ بے ہوش ہوتی جا رہی تھی۔ ریشماں کی بے ہوشی سے اکمل کے بازوؤں پر مزید وزن پڑنے لگا تو اُس نے ایک اونچی چٹان کی آڑ میں اپنے گھوڑے کو روک دیا اور ریشماں کو دونوں ہاتھوں پر اٹھائے ہوئے نیچے کود پڑا اور ایک ہموار جگہ پر اُسے لِٹانے کے بعد پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو کچھ فاصلے پر ایک چشمہ بہتا ہوا دکھائی دیا۔ اکمل کو دوڑ کر اپنے دونوں ہاتھوں میں پانی بھر لایا اور ریشماں کے چہرے پر ڈال دیا ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ ریشماں کی بے ہوشی ٹوٹ گئی اور اکمل نے اُسے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔

"چلو ریشماں! جلدی کرو۔ منزل دور ہے اور تمہیں نیند آ رہی ہے"

وہ اُسے دونوں ہاتھوں میں اُٹھا کر گھوڑے تک لایا کہ اُس کے کانوں نے کسی دوسرے گھوڑے کے دوڑنے کی آوازِ بازگشت سُنی۔ وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ یہ نصرت خاں تھا جو اُس کے تعاقب میں سڑک سڑک دوڑ رہا تھا۔ سڑک یہاں سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر تھی۔ آواز دھیمی ہوتی گئی اور پھر ختم ہو گئی۔ اُس نے ریشماں کو گھوڑے پر بٹھایا اور خود بھی اُس کے پیچھے بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ شدّتِ جذبات نے ریشماں کی زبان گنگ کر دی تھی۔ وہ پیار بھری نظروں سے اپنے شہباز کے چہرے پر دوڑتی ہوئی خون کی موجیں دیکھ رہی تھی اور خاموش تھی۔ اکمل خاں اپنے ترکی گھوڑے کی باگیں سخت اور سخت کرتا جاتا تھا۔ وہ مسلسل دوڑتا رہا اور دوڑتا رہا۔ سورج سر پر آ گیا تھا اور اُس کی عمودی کرنیں نیزوں کی طرح جسم میں چبھنے لگی تھیں۔ لیکن اُنہیں کوئی احساس نہ تھا۔ چلتے چلتے سورج آسمان کی بلندی سے دوسری جانب لڑھک گیا لیکن وہ نہ رُکے۔ اونچے نیچے پہاڑی راستے، خندقیں اور کھائیاں، چشمے اور آبشار، دیو قامت چٹانیں اور تحت الثریٰ کو چھونے والے مہیب غار۔ کوئی چیز اُن کا راستہ نہ روک سکی۔ سورج کی تپش اب کم ہو گئی تھی۔ پہاڑی دروں میں اب دھوپ کا نام و نشان نہ تھا۔ لیکن ابھی اکمل خاں کی منزل دُور تھی۔ ویسے اب وہ کسی تعاقب کا خطرہ محسوس نہ کر رہا تھا۔ پھر بھی گھوڑا بہت تیزی سے اپنی منزل کی طرف گامزن تھا۔ حالانکہ اُس کی رفتار میں پہلی جیسی شدّت نہ رہی تھی۔ بلکہ احساسِ فرض اُسے دوڑائے جا رہا تھا۔ اکمل خاں نے بھی اُسے اپنی رَو پر چھوڑ دیا تھا۔

ملودار اور رشاہ بلوط کی اونچی شاخوں پر دُھوپ کے چند قطرے باقی رہ گئے تھے۔ سورج اپنی منزل سے ہمکنار ہونے لگا تھا اور اکمل خاں نے بھی ایک اونچی پہاڑی پر لگے ہوئے سیبوں کے باغ میں اپنا گھوڑا موڑ دیا۔ باغ کے درمیان ایک جھونپڑی کے سامنے وہ رُکا۔ ریشماں کو نیچے اُتار کر گھوڑا ایک درخت کی شاخ سے اٹکا دیا۔ جھونپڑی میں سے ایک نوجوان نکلا وہ اکمل کا دوست صولت خان تھا جس سے پہلی بار خور بندر کے بازار میں ملاقات ہوئی تھی جہاں وہ دونوں اپنی اپنی فصل بیچنے کے لئے گئے تھے۔ صولت خان اکمل کو دیکھتے ہی اُس سے لپٹ گیا۔

"او خان! تم کہاں سے آ گئے؟ میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ تم اِس طرح اچانک آ جاؤ گے!"

"ہاں دوست! میں اِس وقت تمہاری پناہ میں آیا ہوں!"

"خوش آمدید! خوش آمدید!! میری پناہ میں زمین کی ہوائیں اور آسمان کی بجلی بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ کس نے تمہیں ستایا ہے ——— لیکن ٹھہرو۔ پہلے آرام سے بیٹھ جاؤ۔ یہ لڑکی تمہاری خانم ہے شاید؟"

"ہاں میرے دوست! یہ بہت تھکی ہوئی اور بھوکی ہے!"

"اوہ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے! خواہر! تم اندر جھونپڑی میں جاؤ سرکنڈوں کے نرم ریشوں کا آرام دہ بستر پڑا ہوا ہے۔ آرام کرو جب تک میں تم لوگوں کے لئے کھانے کا انتظام کرتا ہوں۔"

"ریشماں! جاؤ۔ آرام کر لو۔ یہ اپنا ہی گھر ہے" اکمل خاں نے کہا۔

ریشماں جھونپڑی کے اندر چلی گئی اور گھاس کے نرم بستر پر لیٹ گئی۔ سکون اور آرام کا احساس جو ملا تو اُسے نیند آ گئی۔

صولت خاں نے جھونپڑی کے باہری جانب ایک چھوٹی سی کھپریل میں اسٹوو جلا کر کھانا پکانے اور قہوہ بنانے کی تیاری شروع کر دی۔ اکمل خاں بھی اُس کے پاس بیٹھ گیا۔

"ہاں۔ اب سناؤ میرے دوست! کہاں سے آ رہے ہو تم؟"

اکمل خاں نے اُسے ساری کہانی بے کم و کاست سُنا دی۔ صولت خاں خاموشی سے سُنتا رہا اور آخر میں بولا۔

"تو اس کا مطلب ہے تم آج سے اکمل خان نہیں شہباز خان ہو؟"

"ہاں! مجھے اب شہباز خان ہی بن کر جینا ہے کیونکہ یہ ایک معصوم کی زندگی کا سوال ہے۔ دوسرا اور سب سے بڑا مسئلہ میرے سسرال کا ہے۔"

"اس کے لئے فکر نہ کرو میرے دوست! تم دونوں کی زندگی میری پناہ میں ہے۔ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ ایک چھوٹا بھائی تھا جو اٹھارہ سال کی عمر میں مجھ سے ناراض ہو کر چلا گیا اور آج تک اُس کا کوئی پتہ نہ چلا۔ سیبوں کا یہ باغ بہت بڑی فصل دیتا ہے۔ آج سے تم اِس کے آدھے کے مالک ہو۔ نیچے بستی میں میرا ایک مکان ہے۔ تم اُس میں رہو گے اور میں لوگوں کو بتاؤں گا کہ میرا بھائی آٹھ سال کے بعد اپنی دُلہن کے ساتھ واپس آگیا ہے۔"

"تم اتنی بڑی قربانی کرو گے میری خاطر دولت خان!"

"یہ کوئی قربانی نہیں ہے میرے دوست! میرا خیال ہے کہ اتنا سب کرنے کے بعد بھی میں تمہارے اُس احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔ جب تم نے خود بلدیہ سے واپسی میں قزاقوں کے ہاتھوں سے میری جان بچائی تھی۔ میری کلہاڑی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی اور قزاقوں نے مجھے بے بس کر دیا تھا۔ اُس وقت اگر تم آکر اپنی رائفل سے انہیں موت کی نیند نہ سُلا دیتے تو وہ کمبخت یقیناً میری ساری فصل کی آمدنی چھین کر مجھے قتل کر دیتے۔ تم نے مجھے نئی زندگی دی ہے اور پھر آج تم میری پناہ میں ہو! مجھے اپنا فرض ادا کرنے دو میرے دوست!"

مسرت سے اکمل خان کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔

خان جبار خان اپنی کھپریل والی نشست گاہ میں انتہائی متفکر اور غمگین بیٹھا ہوا تھا کہ ایک آدمی نے آکر ایک خط اُسے دیا۔ یہ ایک کاغذ تھا جس کی پیشانی پر خون کی ایک لکیر کھینچی ہوئی تھی۔ اور نیچے لکھا تھا ——

"شیرویہ کے غیور پٹھانوں کی طرف سے بازیدہ والوں کے نام!

ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تم نے آج سے تین دن پہلے ہمارے اکلوتے بیٹے خان اکمل خان کو فریب دیکر اپنے یہاں بُلایا۔ اور کسی پُرانی دشمنی کا بدلہ چکانے کے لئے اُسے قتل کر دیا۔ مزید یہ کہ تم مرحوم پر اپنی بیٹی کے اغوا کا الزام لگا کر ہماری عزت کو بھی داغدار کرنا چاہتے ہو۔ یہ ہماری غیرت کے لئے ایک تازیانہ ہے۔ ہم مرحوم کا قصاص اور اپنی بے عزتی کا بدلہ ضرور لیں گے۔ اگر تم مرد ہو تو آج کے پانچویں دن اگلے دوشنبے کو میدان میں آجاؤ۔ ہم تم سے مبارزت طلب کرتے ہیں۔ ہم مرد ہیں۔ شب خون مارنا ہمیں نہیں آتا۔ یاد رکھنا ہم خٹک پٹھان ہیں جو پختون قبائل کی ناک سمجھے جاتے ہیں۔ ناک جو آدمی کے چہرے پر ناموس کی نشانی ہوتی ہے۔ جب ہمارے مقابلے کے لئے نکلو تو اپنا کفن سلوا کر گھروں میں رکھ دینا!

مبارزت خواہ

خان تہور خان"

خط پڑھتے ہی بوڑھے خان کی آنکھوں میں شعلے دہکنے لگے۔ اُس کے ماتھے اور کنپٹیوں کی رگیں پھڑکنے لگیں۔ اُس نے دھاڑتے ہوئے اپنے بیٹوں کو پکارا۔

شیرویہ میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ ایک ہنگامہ برپا تھا۔ ہر شخص اپنے ہتھیاروں کی مرمت اور صفائی میں منہمک تھا۔ خان تہور خان بہت بے چینی سے اپنی نشست کے سامنے والے چبوترے پر ٹہل رہا تھا کہ اچانک اُس کے پیروں کے پاس ایک چھوٹا سا پتھر آکر گرا جو شاید کسی نے غلیل میں رکھ کر پھینکا تھا۔ اُس پتھر میں ایک کاغذ لپٹا ہوا تھا۔ خان نے جھک کر اُسے اُٹھایا اور کھول کر پڑھنے لگا۔

"بازیدہ کے عقابوں کی جانب سے شیرویہ کی بزدل چوہوں کے نام!

بزدلوں کی اولاد بھی بزدل ہوتی ہے۔ تمہارا بیٹا انتہائی بزدلی کے ساتھ ہماری بیٹی کو ورغلا کر لے گیا۔ ہم روئے زمین کا چپہ چپہ چھان ماریں گے اور اُسے پکڑ کر اُس کے وجود کو نیست و نابود کر دیں گے۔ لیکن تم نے ہم سے مبارزت طلب کی ہے حالانکہ یہ کام ہمیں کرنا تھا۔ اچھا ہوا کہ تم نے پہل کر دی۔ ہم تمہاری آواز پر لبیک کہتے ہیں۔ دوشنبہ کو ہم تمہارے سامنے ہوں گے! ہماری طرف سے پچیس آدمی اِس مورچہ میں شریک ہو رہے ہیں۔ مردانگی کا تقاضہ یہ ہے کہ تم بھی پچیس آدمی لیکر خیلیت کی پہاڑی پر آجاؤ۔ ہم اُس کے سامنے والی پہاڑی پر تمہارا انتظار کرتے ہوئے ملیں گے۔ جن کے درمیان خطار کا پہاڑی نالہ بہتا ہے۔

ہم پختون قبائل کی آنکھیں ہیں۔ آنکھیں جو آدمی کے جسم کا حساس ترین عضو ہوتی ہیں۔ تم نے ہماری غیرت کو للکارا ہے۔ تم نے ہمیں نہیں اپنی موت کو پکارا ہے! آؤ تمہاری موت تمہارا انتظار کر رہی ہے!

خان جبّار خاں "

سارے علاقے میں دُور دُور تک دوشنبہ کو ہونے والے معرکے کی خبریں گونج رہی تھی۔ پختون قبائل کی تاریخ میں پوری چوتھائی صدی کے بعد ایسا معرکہ ہو رہا تھا۔ ہر قریہ اور ہر بستی میں ہر شخص کی زبان پر اُسی کا تذکرہ تھا۔ خٹک کی چھوٹی سی دُور دراز بستی میں جہاں اکمل خاں اور رشیاں اطمینان کی پہلی ہی سانس لینے پائے تھے۔ یکشنبہ کی رات میں یہ خبر اُڑتے اُڑتے پہونچ گئی۔ دوشنبہ کے دن سویرے جب اکمل خان کو یہ معلوم ہوا تو اُس نے وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ صولت خاں کو جب اُس نے اپنے ارادے سے باخبر کیا تو اُس نے اُس کی مخالفت کی لیکن اکمل نے کہا۔

"یہ سارا خون خرابہ میری وجہ سے ہو رہا ہے۔ میں وہاں پہونچ جاؤں تو شاید یہ مورچہ رُک جائے۔"

"لیکن میرا خیال ہے کہ تمہاری موجودگی سے مورچوں اور شدّت اور ہیجان پیدا ہو جائے گا اور پھر آج تو تمہارا نکاح ہونا ہے!"

"اگر میرے خون سے اُن کے انتقام کی آگ بجھ جائے تو یہ بہتر ہوگا۔ میری اکیلی جان سے پچاس آدمیوں کی جانیں زیادہ قیمتی ہیں۔ مجھے جانے دو، میرے دوست! زندہ رہا تو ضرور آ کر ملوں گا۔"

صولت خان کی مخالفت کے باوجود اکمل خاں رشیاں کو لے کر روانہ ہو گیا۔

خیلوں کی پہاڑی پر شیردیہ کے پچیس جانباز وارد ہوئے۔ پہلے اُنہوں نے خوشہ پیر کی درگاہ پر جا کر اپنی فتح و نصرت کی دعائیں مانگیں اور پھر اپنے ہتھیار کاندھوں سے لٹکائے ہوئے پہاڑی کی چوٹی پر آ گئے۔ سامنے والی پہاڑی پر بازیدہ کے سورما اُن کا انتظار کرتے ہوئے پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ دونوں طرف کی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں نے اپنے مورچے سنبھال لئے۔ دونوں پہاڑیوں کے درمیان تقریباً سو گز کا فاصلہ تھا اور بیچ میں خطار نام کا ایک پہاڑی نالہ پورے زور شور سے بہہ رہا تھا۔ ڈھال زیادہ تھا۔ اس لئے نالے کے پانی میں چھوٹے بڑے پتھر بھی ایک دوسرے سے ٹکراتے اور شور مچاتے بہتے ہوئے چلے جاتے تھے

خان جبّار خاں اپنے بہادر ساتھیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اُن کی رائفلیں اُن کے ہاتھوں میں تھیں۔ بوڑھے خان نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے خان تہوّر خاں کو مخاطب کیا۔ اُس کی گرجدار آواز پہاڑیوں سے ٹکرا کر گونج پیدا کرنے لگی۔

"خان! ہم آج ایک مدت کے بعد [illegible] کرنے کے لئے! چلو پہلا فائر تم کرو تاکہ ہماری رائفلوں کے سینوں میں جو آگ دہک رہی ہے۔ اُسے باہر نکلنے کا موقع مل سکے!"

"پہلا فائر تم کرو خان!"

"نہیں! مبارزت طلبی میں پہل تم نے کی ہے۔ پہلا فائر تم کرو!"

"نہیں! ہم نہیں چاہتے کہ تمہارے دل میں فائر کرنے کی حسرت رہ جائے!"

خان جبّار خاں غصّے سے کانپ رہا تھا۔ اُس نے جنگی دستور کے مطابق پہلا فائر ہوا میں کر دیا اور پھر دونوں طرف کی رائفلیں آمنے سامنے ہو کر ایک دوسرے کے سینوں کو نشانہ بنانے لگیں۔ پہلی ہی باڑھ میں دونوں طرف کے دس دس بارہ بارہ آدمی گر کر پہاڑی کی ڈھلانوں پر لڑھکنے لگے۔ خون کی دھاریں چاروں طرف بہہ نکلیں اور برسوں کی پیاسی پہاڑی چٹانیں انسان کا تازہ تازہ گرم خون پینے لگیں۔ فائرنگ کی شدت اور بڑھنے لگی۔ جبّار خاں نے تہوّر خاں کے سینے کو نشانہ بنایا۔ اور تہوّر خاں جو فرطِ جوش میں پہاڑی کے بالکل سرے پر آ گیا تھا۔ رائفل کی گولی سینے میں دبا کر آگے کی طرف لڑھک پڑا اور اُس کی لاش نیچے نالے کے پانی میں گری۔ عین اُسی وقت جب کہ جبّار خاں اپنی کامیابی کا [illegible] رہا تھا ایک گولی اُس کے سر میں لگی اور وہ بھی ایک [illegible] لڑکھڑا کر نیچے گرا اور اُس کی لاش نیچے نالے کے پانی میں گر کر بہتی ہوئی خان تہوّر خاں کی لاش سے جا کر مل گئی جو تھوڑی دُور جا کر ایک بڑے سے پتھر سے اٹک کر رک گئی تھی۔ اب چند نفوس ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ جو بچ بچ کر ایک دوسرے پر فائر کر رہے تھے۔ جبّار خاں کے تین بیٹے پہلے ہی اپنے خاندان کے ناموس پر قربان ہو چکے تھے اور اُن کی لاشیں دوسری لاشوں کے ساتھ ملی ہوئی جابجا بکھری پڑی تھیں۔ اب فائرنگ رُک رُک کر ہو رہے تھے۔ دونوں طرف کے باقی ماندہ جانبازوں کی یہ کوشش تھی کہ اُن میں سے کوئی ایک زندہ بچ جائے تو فتح و شکست کا فیصلہ ہو سکے۔ آخر میں بازیدہ کی طرف صرف نصرت خاں باقی رہ گیا جو کافی زخمی ہو چکا تھا اور اُس کے سامنے شیردیہ کے تین جانباز موجود تھے۔ اپنے زخموں کے باوجود اُس نے دو حریفوں کو ٹھکانے لگا دیا اور تیسرے کو بھی زخمی کر دیا۔ لیکن اس دوران میں اُس کے زخموں

[illegible] ہو گیا تھا۔ اس پر اُس کے پیروں نے زمین چھوڑ دی [illegible] کنارے کی [illegible] زمین پر گر پڑا [illegible] گر گیا اور [illegible] گیا۔

اب میدانِ کارزار میں سناٹا چھا گیا تھا۔ دونوں پہاڑیوں پر [illegible] آخری [illegible] ختم ہو چکی تھی۔ صرف پہاڑی نالہ پہلے کی طرح شور مچاتا ہوا بہہ رہا تھا۔ ماحول میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

اچانک پہاڑیوں میں کسی گھوڑے کے دوڑنے کی آواز بازگشت سنائی دی اور تھوڑی دیر بعد خیلوں کی چوٹی پر ایک گھوڑا آ رکا۔ اُس پر سے ایک نوجوان اور ایک دوشیزہ کود کر نیچے اُترے۔ یہ اکمل خان اور ریشماں تھے۔ انہوں نے چاروں طرف نظریں دوڑا کر ماحول کا جائزہ لیا۔ سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ وہ دیر سے پہنچے تھے۔ دونوں گھوم پھر کر لاشوں کو دیکھنے لگے۔ ریشماں کے لئے یہ لاشیں اجنبی تھیں لیکن اکمل خان انہیں پہچان رہا تھا۔ یہ شیر خان ہے۔ یہ جبت خان ہے ...... یہ نور خان ہے ...... اور یہ جانباز خان ہے۔ بہت سی لاشیں اس طرح مسخ ہو گئی تھیں کہ اُن کی شناخت مشکل ہو گئی تھی۔ اکمل خان کو تہور خان کی تلاش تھی۔ اچانک اُس کی نظر نیچے نالے میں پڑی ہوئی دو لاشوں پر گئی۔ وہ ریشماں کو لے کر آہستہ آہستہ نیچے اُترا۔ نالے کے دونوں کناروں پر کئی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ اچانک چلتے چلتے ریشماں نے ایک چیخ ماری اور پھلانگ مار کر نالے کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئی اور گرتے ہوئے ایک لاش سے لپٹ کر رونے لگی۔ یہ اُس کے چھوٹے بھائی شوکت خان کی لاش تھی! اکمل خان نے اُسے دیکھا اور پھر آنکھیں چُرا کر آگے چل دیا۔ نالے میں ایک پتھر سے اُلجھی ہوئی دو لاشیں پڑی تھیں۔ اور اُنہی سے [illegible] خون نکل کر نالے کے شفاف پانی کو ارغوانی بنا رہا تھا۔ اُس نے [illegible] نکالیں اور اُنہیں زمین پر ایک دوسرے کے برابر رکھ دیا۔ پھر اُس نے ریشماں کو آواز دے کر بلایا۔

"ادھر آؤ ریشماں! کیوں اپنے آنسو ضائع کرتی ہو۔ آؤ انہیں دیکھو۔ یہ نفرت کے دو بڑے دیوتا مرنے کے بعد کس طرح ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے ہیں۔ انہیں ہمارا پیار پسند نہ آیا۔ یہ تو نفرت کے پجاری تھے۔ ان کے لئے رونا بے کار ہے۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہئے کہ نفرت کے دیوتا مر گئے!"

ریشماں ایک نظر دونوں کو دیکھتی رہی اور پھر چیخ مار کر ان سے لپٹ گئی۔ اکمل خان دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ آس پاس کی چٹانوں کو دیکھنے لگا۔ ایک جگہ پر ایک چٹان میں چھوٹا سا غار نظر آیا جو تقریباً تین گز لمبا اور دو گز گہرا تھا۔ وہ اُس غار میں گھس گیا۔ اُس نے جا بجا پڑے ہوئے پتھروں کو اُٹھا کر باہر پھینک دیا۔ کونوں میں اُگی ہوئی گھاس کے پودے اکھاڑ کر پھینک دیئے۔ غار کو پوری طرح صاف کر کے وہ باہر نکل آیا۔ روتی ہوئی ریشماں کو لاشوں سے الگ کر کے اُس نے جبار خان کی لاش کو اُٹھا کر غار میں رکھ دیا اور اُس کے بعد تہور خان کی لاش بھی اُس کے برابر میں رکھ دی اور غار کے مُنہ پر بڑے بڑے پتھر رکھ کر اُسے بند کر دیا۔

اِس کام سے فارغ ہو کر وہ ریشماں کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔

"ریشماں! یہ قبر ہے۔ نفرت کی قبر! نفرت مر چکی! اب محبت زندہ ہو گی۔ اے خیلوں کی بوڑھی پہاڑی! ہم نفرت کی لاشیں تیرے سینہ میں دفن کئے جاتے ہیں۔ تو گواہ رہنا کہ اِن کی نفرتوں کے بیج سے یگانگت اور محبت کا پودا جنم لے گا۔ جس میں پیار کے پھول کھل کر ساری دنیا کو اپنی خوشبو سے معطر کرتے رہیں گے۔ آؤ ریشماں! چلیں۔ قاضی صاحب ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔"


چستی پھرتی
اور بہتر نشوونما
کا ضامن
فیراڈول
فیراڈول
فولاد اور وٹامن آمیز ٹانک
مزیدار ذائقے دار
FERRADOL
A VITAMIN NUTRITIVE TONIC
STANDARDISED
PARKE-DAVIS

پگلی

ش۔ نذیرالدین

(معرفت غوث محی الدین صاحب، مکان نمبر ۳/۹ - طبیب لینڈ، روڈ نمبر ۲، ہبلی (ضلع دھارواڑ))

محترم بھائی صاحب: آداب و نیاز

...... لیجئے آج ایک اور کہانی "پگلی" ارسال کر رہا ہوں۔ "پاگل لڑکی" تو آپ دیکھ چکے ہیں۔ اس "پگلی" کو بھی دیکھئے۔ کہانی کے بارے میں کچھ اور نہ لکھوں گا۔ آپ ہی اپنی گراں قدر رائے سے نوازئیے گا.........

آپ کا بھائی ——— ش۔ نذیرالدین

★

"کبھی کوئی چیز ختم نہیں ہوتی۔ کسی دوسری چیز میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ عجب صورتیں یادوں میں، یادیں نغموں میں، نغمے گونج میں، گونج فضاؤں میں، فضا لہروں میں، اور لہروں کو کون مٹا سکتا ہے؟"

——— کرشن چندر

مہندی کی باڑھ کے اس طرف لان پر مسز پرساد کیاری میں کھلے ہوئے خوش رنگ گلاب کی طرح کھلی ہوئی بیٹھی چائے پر میرا انتظار کر رہی تھیں۔ وہ ہر روز چائے پر میرا انتظار کرتی رہتی ہیں۔

میری آہٹ پاتے ہی انہوں نے گھوم کر میری طرف دیکھا اور ان کے لبوں پر دل آویز مسکراہٹ پھیل گئی۔ جواب میں میں بھی مسکراتے ہوئے دوسری لان چیئر پر بیٹھ گیا۔

"مہندر جی، آج آپ نے بہت دیر کر دی!" ہر عورت کی طرح انہوں نے میری طرف گلہ بھری نظروں سے دیکھا۔ میں نے کہا۔

"آج ذرا دوستوں میں گھر گیا تھا۔" ٹرے میں رکھی ہوئی پیالیوں کو سیدھی کرتے ہوئے آلو کے چپس کی پلیٹ میری طرف بڑھا کر انہوں نے کہا۔

"لیجئے" میں نے ہاتھ بڑھا کر ایک پیس اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ نمکین چپس بڑے خوش ذائقہ تھے۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ جیسے میرے تعریفی جملوں کی منتظر ہوں۔ میں نے ایک اور پیس منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"بہت لذیذ ہیں۔ کیا آپ نے بنائے ہیں؟" ان کے رخسار سرخ ہو گئے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور کہا۔

"کیا آپ کو پسند ہیں؟" میں نے کہا

"یہ تو میری من پسند چیز ہے!" وہ ہنس پڑیں۔

"مہندر جی! آپ کی ہر پسند پرساد سے ملتی ہے! انہیں بھی آلو کے چپس بہت پسند ہیں۔ اکثر شام کو جب وہ دفتر سے لوٹ آتے تھے تو میں انہیں چائے کے ساتھ یہی پیش کرتی تھی۔" ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ اپنے شوہر سے میرا موازنہ کر رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کاش! پرساد کی جگہ میں ہوتا! نہ جانے یہ خوش نصیب پرساد کیسا ہے۔ جس کی بیوی اتنی پیاری ہے! میں ابھی تک اس سے ملا نہ تھا۔ مسز پرساد کے کمرے میں اس کی تصویر دیکھی تھی۔ وہ یہاں نہیں رہتا تھا۔ ہم دونوں کو یہاں آئے ہوئے تقریباً ایک سال کا عرصہ ہو رہا

تھا۔ لیکن اس دوران میں ایک بار بھی اُن کا شوہر یہاں نہ آیا تھا۔

مسز پرساد بہت ہی پیاری سی عورت ہیں۔ باتیں کرتی ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے پھول جھڑ رہے ہوں۔ بہت باتونی ہیں لیکن اُن کا اندازِ گفتگو اتنا مترنم اور شائستہ ہے کہ اُن سے باتیں کرنے والا بور ہونے کی بجائے اُن کے گفتار کے ترنم میں کھو سا جاتا ہے۔ میں باتونی لوگوں سے ہمیشہ دُور بھاگتا رہا ہوں لیکن اُن کی باتوں سے میں کبھی بور نہ ہوا۔ وہ مجھ سے دُنیا بھر کی باتیں کرتی رہتی ہیں۔ مجھے اُن کا یہ انداز بہت پسند ہے۔ میں بہت ہی کم گو ہوں۔ خاموش اور سنجیدہ طبیعت کا مالک۔ میری یہ سنجیدگی انہیں بہت پسند ہے۔ اس لئے ہم دونوں گہرے دوست ہو گئے ہیں۔

ہماری پہلی ملاقات ٹرین میں ہوئی تھی۔ وہ پونا جنکشن پر ٹرین میں بیٹھی تھیں۔ ایک ہاتھ میں چھوٹا سا اٹیچی تھا۔ تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں تھا۔ بہت ہی بھیڑ تھی۔ ساری سیٹیں بھری ہوئی تھیں۔ کچھ مسافر راستے میں بھی کھڑے ہوئے تھے۔ وہ لوگوں سے بچتی بچاتی میری سیٹ تک آ گئی تھیں۔ اُنہوں نے ہاتھ اُٹھا کر اوپر کی برتھ پر اپنا اٹیچی رکھ دیا تھا اور میرے پاس کمپارٹمنٹ کی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ ٹرین اسٹارٹ ہونے تک میں نے اُن کا بھرپور جائزہ لیا۔ دُبلی پتلی سی نازک اندام حسینہ، لائٹ بلو کلر کی ساری اور بلاوز میں بہت جچ رہی تھیں۔ اُنہوں نے اپنے لانبے لانبے ریشمیں بالوں کو صرف ایک ربن سے باندھ کر شانوں پر کھلا چھوڑ دیا تھا۔ ماتھے پر ٹیکہ اور مانگ میں سیندور تھا بدن پر کوئی زیور نہ تھا۔ صرف ایک ہاتھ کی کلائی میں ساری کے رنگ سے میچ کھاتی ہوئی چوڑیاں تھیں اور دوسرے ہاتھ کی کلائی پر چھوٹی سی واچ! وہ کھڑے ہی کھڑے ناول کھول کر پڑھ رہی تھیں۔

جب ٹرین اسٹارٹ ہوئی تو اُنہوں نے ناول بند کر دیا۔ میں نے سوچا بے چاری اس طرح کب تک کھڑی رہے گی۔ اس لئے میں نے اپنی سیٹ سے اُٹھ کر انہیں بیٹھ جانے کے لئے کہا۔ اس پر وہ مسکرا پڑیں۔

”شکریہ! آپ بیٹھ جائیے، میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔“

میں نے کہا ”آپ اس طرح کب تک کھڑی رہیں گی؟“ لیکن انہوں نے پھر انکار کر دیا تو میں نے اوپر کی برتھ سے اپنا سوٹ کیس اُٹھا کر وہیں نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا اس پر بیٹھ جائیے!“ وہ مسکراتے ہوئے میرے سوٹ کیس پر بیٹھ گئیں اور کہنے لگیں۔

”کہیں یہ میرے بوجھ سے ٹوٹ تو نہ جائے گا؟“

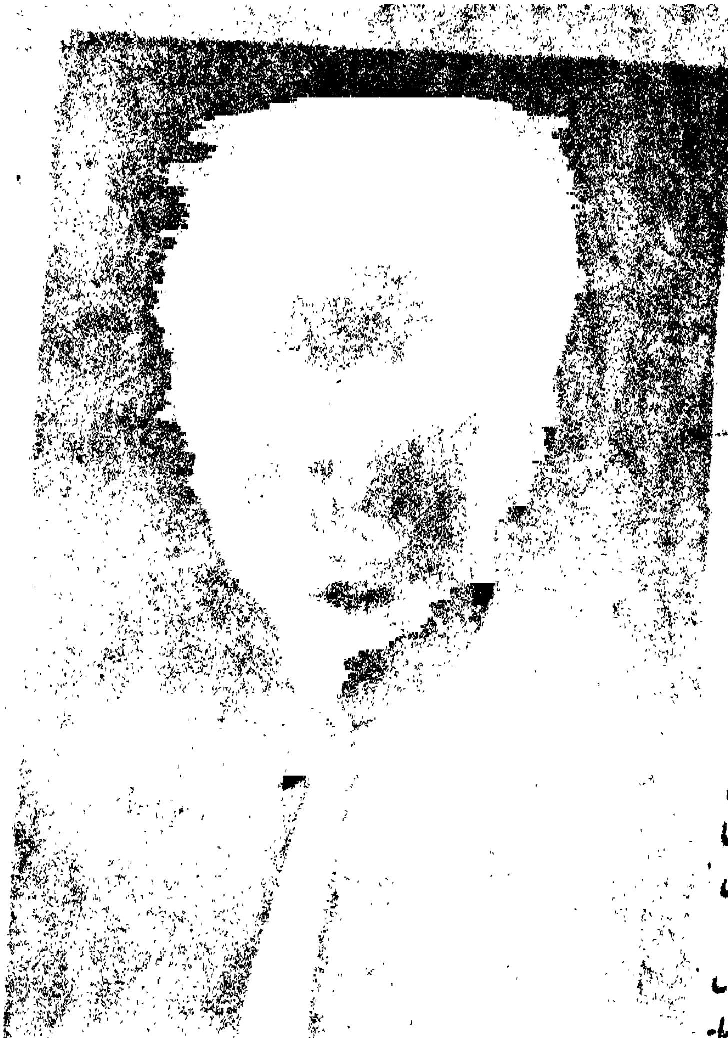
”گھبرائیے نہیں یہ کافی مضبوط ہے۔“ میں نے کہا۔

پھر باتوں کے دوران جب میں نے انہیں بتایا کہ میرا تقرر پنجم (گوا) کی اسٹیٹ بینک آف انڈیا میں ہوا ہے اور میں ڈیوٹی جوائن کرنے جا رہا ہوں تو وہ بہت خوش ہو گئیں کیونکہ انہیں بھی پنجم ہی جانا تھا اور وہ بھی ڈیوٹی جوائن کرنے جا رہی تھیں۔ اُن کا تقرر وہاں کے ہائی اسکول میں بطور ٹیچر ہوا تھا۔

سفر بہت ہی دلچسپ رہا۔ وہ دورانِ سفر دُنیا بھر کی باتیں کرتی رہیں۔ پنجم پہنچ کر ہم ایک ہی ہوٹل میں الگ الگ کمروں میں دو ماہ تک رہے۔ پھر مسز پرساد نے ایک چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ ہوٹل سے شفٹ ہو کر ہم دونوں اُس فلیٹ میں آ گئے۔ نیچے کے حصے میں وہ رہتی تھیں اور اوپر کے حصے میں میں۔ وہ بہت ہی صاف دل اور اعلیٰ کردار کی عورت ہیں۔ ایک ساتھ ایک ہی فلیٹ میں رہ کر بھی ہم دونوں کے درمیان کوئی ایسی ویسی بات نہ ہوئی تھی۔ میں ہوٹل پر کھاتا تھا لیکن اُنہوں نے اصرار کر کے مجھے اپنے ہی ساتھ کھانے کے لئے مجبور کیا۔

ڈیوٹی کے بعد ہم شام ایک ساتھ گزارتے تھے۔ کبھی باہر اور کبھی گھر پر لان پر بیٹھے۔ چھٹی کے دن ہم بیچ پر چلے جاتے اور گھنٹوں سمندر کے کنارے ریت پر بیٹھے رہتے۔ وہ باتیں کرتی رہتیں اور میں سنتا رہتا۔ وہ اکثر مجھ سے اپنے شوہر کے بارے میں باتیں کرتی رہتی ہیں۔ اُنہیں اپنے شوہر سے بہت محبت ہے۔ ہر تیسرے چوتھے دن اُن کے شوہر کا خط آ جاتا ہے اور جب خط آتا ہے تو وہ سارا دن اپنے شوہر ہی کا ذکر کرتی ہیں۔ اُن کا شوہر پرساد بھی اُن سے بے انتہا محبت کرتا ہے۔ وہ کہتی ہیں پہلے جب وہ پونہ میں رہتی تھیں تو پرساد ایک پل بھی اُن کی جدائی برداشت نہ کرتا تھا لیکن ملازمت کی مجبوری سے اُنہیں یہاں آنا پڑا۔

باتوں کے دوران وہ اکثر اپنے شوہر کا مجھ سے موازنہ کرنے لگیں تو اُس وقت میرے دل میں یہ خواہش شدت سے اُبھری کہ کاش میں اُن کے شوہر کی جگہ میں ہوتا! کبھی کبھی مرد کے دل میں ایسی خواہشیں اُبھرتی رہتی ہیں لیکن اِن خواہشوں کے پیچھے کوئی بُرا جذبہ نہیں ہوتا۔ میں اپنی



[illegible] کہانی میں دھا دیا کسی بڑی خواہش کا احترام اس
وقت کیا جانا چاہئے جب وہ [illegible] ہو اور اس کے تکمیل
تک پہنچنے کا امکان ہے۔
"کہاں کھو گئے آپ، چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے!"
میں نے چونک کر مسز پرشاد کی طرف دیکھا۔ انہوں نے میری
پیالی میں چائے بنا دی تھی اور اپنی پیالی لئے ہلکے ہلکے
سِپ کر رہی تھیں۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر کپ اٹھا لیا۔ پھر
چائے پیتے تک ہم دونوں خاموش رہے۔
چائے پینے کے بعد میں نے سگریٹ سلگایا تو
مسز پرشاد نے کہا۔
"مہندر جی! کل اسٹیشن چلنا ہے۔ میری چھوٹی
بہن آ رہی ہے۔"
"کون اُرملا؟"
"ہاں وہی!" مسز پرساد نے کئی بار مجھ سے اپنی
بہن کا بھی ذکر کیا تھا۔ وہ بی۔ اے پاس تھی اور آگے پڑھنا
چاہتی تھی۔ لیکن اس سال کسی وجہ سے وہ ایم۔ اے میں
داخلہ نہ لے سکی تھی۔ میں نے کہا۔
"آپ نے اچھا ہی کیا جو اُرملا کو بلا لیا۔ اکیلے یہاں
آپ بور ہو جاتی ہوں گی۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"نہیں۔ وہ مستقل طور پر نہیں آ رہی ہے۔ اُسے گرا
دیکھنے کی بہت خواہش تھی۔ اس لئے دو چار دنوں کے لئے میں نے
اُسے بلا لیا ہے۔ وہ مستقل طور پر آ گئی تو پھر پتا جی کی دیکھ بھال کون کرے
گا۔ بور ہونے کا تو سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ کیوں کہ میں یہاں مزے میں ہوں"
"یہ بات تو آپ اپنی مجبوریوں کے پیشِ نظر کہہ رہی ہیں" میں
نے کہا۔ "عورت فطرتاً جذباتی اور باتونی ہے۔ تنہائی سے وہ بہت جلد
گھبرا جاتی ہے۔ اس کی زبان کچھ دیر کے لئے بھی بند رہنا گوارا نہیں کرتی۔
اس لئے تنہائیوں میں بھی عورتیں گنگنایا کرتی ہیں۔ آپ کو ایک لطیفہ سناؤں۔
There were four womens and
there was pindrop silence
کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔
"تب تو آپ مجھ سے بہت بور ہو جاتے ہوں گے!"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"عورتیں باتیں کرتی ہوئی اچھی لگتی ہیں۔ مجھے خاموش عورتوں سے بہت
کوفت ہوتی ہے۔ خاموش اور سنجیدہ عورت مجھے کسی بے جان گڑیا کی
طرح معلوم ہوتی ہے" میرے اس انکشاف پر وہ کچھ جھینپ گئیں اور پھر
موضوع بدلتے ہوئے اُنہوں نے کہا۔
"اچھا تو کل آپ میرے ساتھ اسٹیشن چل رہے ہیں نا؟"
"جی ہاں۔ ضرور چلوں گا!" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ مسز
پرساد مسکراتے ہوئے کرسی سے اُٹھ گئیں اور پیالیاں سمیٹ کر کچن کے
اندر چلی گئیں۔

دوسرے دن مسز پرساد کی چھوٹی بہن اُرملا آ گئی۔ وہ ہو بہو

اپنی بڑی بہن کی کاربن کاپی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اُس کا رنگ مسز پرساد کے رنگ کی طرح [illegible] تھا اور چہرہ [illegible] مسز پرساد کا چہرہ سویرے شبنم میں دُھلے ہوئے گلاب کی طرح شگفتہ تھیں اور اب ڈھلتی ہوئی دھوپ میں مرجھائے ہوئے پھول کی طرح پژمُردہ۔ وہ بھی اپنی بہن کی طرح کچھ ہی گھنٹوں کے بعد مجھ سے مانوس ہو گئی۔

چار دنوں تک ہم دونوں نے اُسے خوب سیر کرائی۔ کراچی کی کوئی ایسی جگہ نہ تھی جو اُس نے نہ دیکھی ہو۔ چوتھے دن رات کا کھانا کھانے کے بعد مسز پرساد تھکن کی وجہ سے جلدی ہی کافی پئے بغیر سونے کے لئے چلی گئیں۔ کمرے میں میں اور اُرملا رہ گئے۔ کافی پینے کے بعد میں نے سگریٹ سلگایا تو اُرملا نے کہا۔

"مہندر جی! کل میں جا رہی ہوں۔ جانے سے پہلے میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ آپ میری باتوں کا بُرا تو نہ مانیں گے؟"

"اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے۔ آپ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں بے جھجک کہئے۔"

"مہندر جی! یہاں آنے کے بعد دیدی کو اور آپ کو دیکھ کر مجھے بہت ہی مسرت ہوئی۔ دیدی آپ سے بہت گھل مل گئی ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے۔ جیسے آپ دونوں ایک مدت سے ساتھ رہے ہوں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ دونوں کا یہ ساتھ ہمیشہ کے لئے ہو جائے؟ میرا مطلب ہے کہ آپ دونوں شادی کر لیں۔"

"کیا......؟" میں چونک اٹھا۔ "آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟ آپ کا دماغ تو ٹھیک ہے؟ آپ ایک عورت سے مجھے بیاہ کرنے کے لئے کہہ رہی ہیں جس کی شادی ہو چکی ہے!"

اُرملا نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا "شاید دیدی نے آپ کو نہیں بتایا۔ مجھے افسوس ہے مہندر جی کہ میں نے آپ کو ناحق پریشان کیا۔ آپ کو اور دیدی کو اتنا قریب دیکھ کر میں سمجھی تھی کہ شاید دیدی نے اُنہیں بھلا دیا ہے۔"

"میں نے آپ کا مطلب اب بھی نہیں سمجھا؟" میں نے کہا "نہ جانے آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

"مہندر جی بات یہ ہے کہ دیدی اب سہاگن نہیں رہی۔ دو سال پہلے ایک حادثے میں [illegible] چل بسے تھے۔ جب سے دیدی کی یہ حالت ہے [illegible]

اُسے اس بات کا ذرا بھی احساس نہیں کہ وہ بیوہ ہو چکی ہے [illegible] ہے کہ اس گہرے صدمے سے اُس کے دماغ پر اثر ہو گیا ہے۔"

بہت دیر تک میں خاموش بُت بنا بیٹھا رہا۔ اُرملا بھی خاموش تھی۔ پھر میں کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا آیا۔ رات بہت دیر تک میں مسز پرساد کے بارے میں سوچتا رہا۔ اُن کا یہ پاگل پن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

دوسرے دن دوپہر کی ٹرین سے اُرملا جا رہی تھی۔ صبح ناشتہ کے بعد اُرملا جانے کی تیاری کرنے کے لئے چلی گئی تو میں نے مسز پرساد کو مخاطب کیا۔

"شانتی دیوی!" وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگیں۔ آج پہلی بار میں نے انہیں اُن کے نام سے مخاطب کیا تھا۔

"آپ مجھے اپنا بہت ہی اچھا دوست کہتی ہیں۔ مجھے دوستی پر آپ کو ناز ہے۔ پھر بھی آج تک آپ نے مجھ سے جھوٹ کہا۔ نہ جانے اس کی کیا وجہ ہے کہ آج تک آپ نے پرساد کی موت کو مجھ سے چھپائے رکھا۔ آج مجھے اس بات کا بہت دُکھ ہوا ہے۔" میری بات سن کر وہ کچھ دیر تک خاموش بیٹھی رہیں۔ پھر انہوں نے کہا۔

"شاید اُرملا نے آپ کو بتا دیا ہے۔ آپ کی یہ بات ٹھیک ہے۔ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ پرساد کی موت کو میں نے آپ سے چھپایا۔ مہندر جی پرساد کی موت آپ سب کے لئے ایک حقیقت ہے۔ لیکن میرے لئے نہیں۔ پرساد آج بھی میرے دل میں زندہ ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ابھی ابھی دفتر گئے ہوں اور واپس آتے ہی مجھے اپنی بانہوں میں لے لیں گے۔ وہ میرے احساس پر چھائے ہوئے ہیں۔ سب یہی کہتے ہیں کہ وہ مر گئے ہیں لیکن میرا احساس اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ جب میرا احساس پرساد کی موت کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہے تو پھر یہ سچ میرے لئے جھوٹ ہے۔ اس جھوٹ میں سب کے سامنے کیوں کہوں۔ سب مجھے پاگل کہتے ہیں۔ مہندر جی! آپ ہی بتائیے کہ کیا میں پاگل ہوں؟" مسز پرساد میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ اُن کا چہرہ جذبات سے سُرخ ہو گیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ اگر میں کچھ دیر اور بیٹھا رہا تو اپنے آپ کو سنبھال نہ سکوں گا۔ میں نے اُن کے قریب جاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "نہیں مسز پرساد! آپ پاگل نہیں ہیں۔ پاگل تو ہم سب ہیں جو آپ سے آپ کا احساس چھیننا چاہتے ہیں۔" وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر [illegible] تیزی سے کمرے سے نکل گئیں۔

غزل

سید منصور وقار شمیم ایم۔ اے

نگہیں ملیں نہ دل سے ملے ہم سے صبح و شام
ہم زندگی کے تلخ حقائق سے شاد کام

بس تیری یاد، تیری تمنا، ترا خیال
دیوانگانِ شوق کو دنیا میں ایک کام

میرے دلِ خراب کی سرمستیاں نہ پوچھ
آج اُس نگاہِ ناز نے کیا کیا دیے پیام

اب ان کے دل کی بات مرے دل کی بات ہے
اس "حسنِ اتفاق" کو دیجے بھلا سا نام

کیا کیا ہمیں نہ اُن سے شکایت رہی مگر
جب سامنا ہوا تو ہوئے سب گلے تمام

اک نقشِ آرزو تھا جو دل سے مٹا دیا
ہم نے شمیم خوب لیا خود سے انتقام

غزل

خالد ندیم ایم۔ اے (علیگ)

دلِ فسردہ کو کچھ اور بے قرار کریں
کسی نے وعدہ کیا ہے تو انتظار کریں

کہو تو ہاتھ اُٹھا لیں جنونِ شوق سے ہم
کہو تو پیشۂ فرہاد اختیار کریں

سُنائیں اپنے تعلق کی داستاں ہم بھی
بیان پاکیٔ دامانِ حسنِ یار کریں

جنوں کو ضد ہے کہ آوارگانِ شہرِ وفا
اُٹھیں تو چادرِ مہتاب تار تار کریں

عقیدتوں کے جہاں میں ترا قیام تو ہو
بجائے دیدہ و دل تجھ پہ جاں نثار کریں

تمہارے شہر سے وابستگی تو ختم ہوئی
جو داغ دل پہ لگے ہیں انھیں شمار کریں

غزل

نصر قریشی ایم۔ اے۔ ایل۔ ٹی

کس کے کوچے سے نسیمِ سحری آئے ہے
بزمِ احساس کا ہر گوشہ مہک جائے ہے

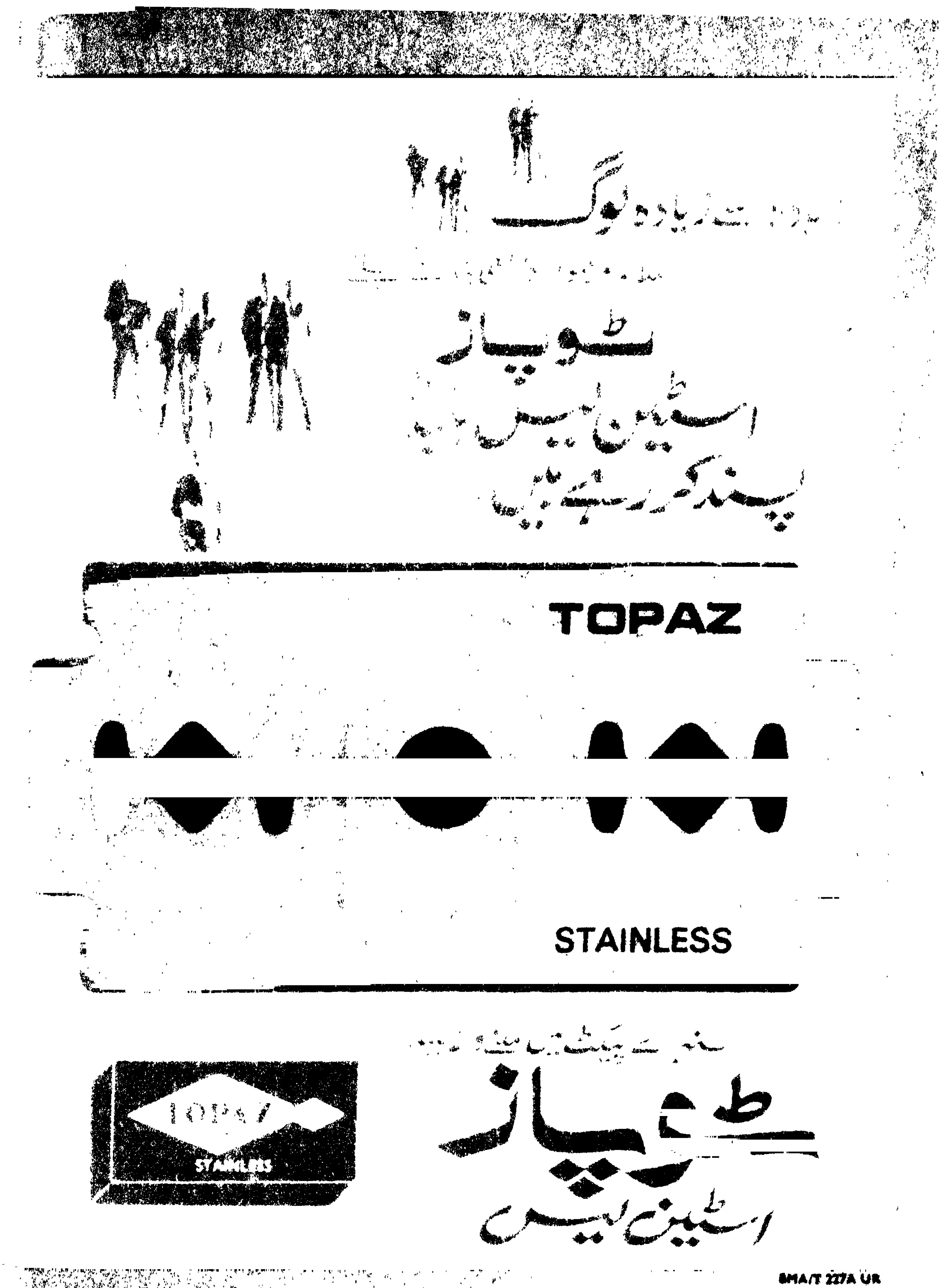
زخم مہکے کبھی نہیں پھول جلے گیت بجھے
فصلِ گل اب کے برس آگ ہی برسائے ہے

بزمِ اخلاص و وفا سونی ہوئی تیرے بعد
ہائے ویرانی کہ ویرانی بھی ڈر جائے ہے

اب بھی اک یاد کا جھونکا شبِ تنہائی میں
دشتِ تخیل کو گلزار بنا جائے ہے

گیا غم بھی ترا وقت کے ہنگاموں میں
اپنے حالات پہ خود مجھ کو ہنسی آئے ہے

میرا احساسِ غمِ ذات، خودی کا پیکر
مقتلِ وقت میں ہر آن لرز جائے ہے


زیادہ لوگ
ٹوپاز
اسٹین لیس
پسند کرتے ہیں
TOPAZ
STAINLESS
TOPAZ
STAINLESS
ٹوپاز
اسٹین لیس

BMA/T 227A UR

قہقہے

قمر زیدی بی۔کام

۱۷۔ کھارا ٹینک روڈ، بمبئی نمبر ۳

محترم خوشتر گرامی صاحب! آداب و نیاز

ایک افسانہ "قہقہے" کر بزم "بیسویں صدی" میں شریک ہونے کی جسارت کر رہا ہوں۔
افسانہ پسند آجائے تو شائع کرکے شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں . . .

نیاز مند ——— قمر زیدی

★

"میں کہتی ہوں وہ یہاں آتا ہی کیوں ہے؟"

"لیکن میں اُسے منع بھی کیسے کر سکتا ہوں؟ وہ میرا باس ہے۔"

"باس ہے تو ہوا کرے۔ یہاں اُس کی کیا ضرورت ہے؟"

"وہ ہمارے ساتھ کچھ دیر ہنس بول کر اپنا تھوڑا وقت گزار لیتا ہے تو اس میں ہمارا جاتا ہی کیا ہے ——؟ جب سے بیچارے کی بیوی مری ہے، کتنا کھویا کھویا سا رہتا ہے۔ ابھی اُسی دن کہتا تھا اروکن! میں تمہارے یہاں آکر اپنا سارا غم بھول جاتا ہوں۔"

"ہمارا گھر کوئی ہوٹل یا کلب تو نہیں ہے جو غم غلط کرنے چلا آتا ہے۔"

"ہوٹل یا کلب میں وقت تو گزر سکتا ہے انجنی! غم غلط نہیں ہو سکتا۔ دُکھی دل کو تو ہمدرد دوست کی ضرورت ہوتی ہے جو اُس کے غم کو اپنا غم سمجھے۔"

"کچھ بھی کہئے۔ لیکن مجھے اُس کا یہاں آنا جانا ایکدم پسند نہیں!"

دونوں اپنے بنگلے کے سامنے چھوٹے سے لان کی مخملی گھاس پر باتیں کرتے ہوئے چہل قدمی کر رہے تھے۔ شام کی فضا خوشگوار تھی۔ لیکن انجنی کے چہرے پر ناخوشگواری کے تاثرات تھے۔ وہ بہت دیر سے اِسی بات پر اروِن سے جھگڑ رہی تھی اور اروِن اُسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے دونوں گلاب کی کیاریوں کے بیچ میں جوہی کی پھیلی ہوئی لتاؤں کے نیچے پڑی بید کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"سُنو انجنی! اب زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ آج کا ہر انسان ایڈوانس ہو گیا ہے۔ ہمارے سماج اور معاشرے کا طور طریقہ بدل چکا ہے۔ ہمیں بھی اُسی معاشرے میں رہنا ہے۔ اُسی سماج کے ساتھ چلنا ہے۔ اِس لئے ہمیں بھی سوچ اور فکر کے دھارے کو بدلنا ہی ہوگا۔ دقیانوسی خیالات کو ذہن سے نکالنا ہی ہوگا۔ اِس زمانہ میں تمہیں ہر چیز پر ملمع نظر آئے گا۔ ہر چہرے پر میک اَپ دکھائی دے گا۔ اِس لئے کہ شو اور دکھاوے کے بغیر اِس سماج میں کوئی مقام حاصل کرنا ناممکن ہے —— یہ حقیقت بھی تم سے چھپی نہیں ہے کہ آرائش و آسائش کے یہ سارے سامان جو آج ہمارے پاس ہیں وہ مہندر بابو ہی کی بدولت ہیں۔ ہم اُن کے احسان مند ہیں۔"

"اِس میں اُن کا احسان کیا ہے۔ گھر بیٹھے تو وہ چیک نہیں دے دیتے۔ تیس دن جب آپ محنت کرتے ہیں تب کہیں پیسہ ملتا ہے۔"

"یہ نہ کہو انجنی! مجھ سے بھی کہیں قابل اور محنتی لوگ اُس فیکٹری میں پڑے ہیں۔ پیسہ کمانے کے لئے محنت اور قابلیت کے ساتھ ساتھ کچھ پالیسی بھی اپنانی پڑتی ہے۔ دولت پیدا کرنا بھی ایک فن ہے —— سچ تو یہ ہے کہ میری کامیابی کا راز صرف تم ہو انجنی! آج جو کچھ بھی میرے پاس ہے

وہ سب تمھارے حُسن کا صدقہ ہے، تمھاری دلفریب مُسکراہٹ کی دین ہے ورنہ میرے پاس تھا ہی کیا؟ شاعر کے تخیل میں عورت چاہے شعلہ ہو چاہے شبنم۔ لیکن میرے خیال میں عورت مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہے! پھر تم جیسی حسین عورت پاکر بھی اگر میں دُنیا کو اپنے قدموں پر نہ جھکا سکا تو یہ میری بدقسمتی اور تمھارے حُسن کی توہین ہوگی!" اپنے حُسن کی تعریف سُن کر انجنی کے چہرے پر شرم و حیا کی سُرخی شفق کی طرح پھیل گئی۔ عورت اپنے حُسن کی تعریف سُن کر شعلہ سے شبنم بن جاتی ہے۔ یہی عورت کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔

"اب باتوں میں نہ بہلایئے۔ میں اتنی بھی ناسمجھ نہیں ہوں۔"

اُس نے ارون سے اپنی یہ کمزوری چھپانے کی کوشش کی۔

"انجنی! تم اِسے جو بھی سمجھو، لیکن یہ سچ ہے کہ تم میری تقدیر کی دیوی ہو جس نے میری زندگی کی خزاؤں کو بہاروں سے بدلا ہے۔ تمھاری آنکھوں کی یہ چمک میرے روشن مستقبل کی غماز ہے۔ تمھارے اِن یاقوتی ہونٹوں پر مچلتی مسکراہٹ میری زندگی ہے!"

"آپ صرف میری آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں کی مُسکراہٹ ہی دیکھ رہے ہیں۔ کاش! میرے ضمیر کی آواز بھی سُن سکتے میرے بھگوان! کہیں میں اپنی ہی نظروں میں نہ گر جاؤں۔ دُوسرے مَردوں کے ساتھ ہنسنا بولنا تو بازاری عورتوں کا کام ہے۔"

"تم کیسی باتیں کرتی ہو انجنی! کسی کے ساتھ ہنسنا بولنا کوئی پاپ نہیں ہے۔ بس انسان کا دل صاف ہونا چاہیئے۔ دل کی پاکیزگی ہی کردار کی بلندی ہے۔ کلبوں میں دیکھو بغیر کسی جان پہچان کے بھی مرد اور عورتیں ایک ساتھ ڈانس کرتے ہیں۔ گھنٹوں بے تکلفی سے ہنستے بولتے ہیں۔ لیکن انھیں کوئی غلط نہیں سمجھتا، انھیں کو مہذب سمجھا جاتا ہے اور اُس ماحول سے جو دُور ہیں انھیں لوگ بیک ورڈ کہتے ہیں، جاہل سمجھتے ہیں۔ پھر ہم تو کلبوں میں بھی نہیں جاتے۔ آپس ہی میں ہنس بول کر گھر کی گھٹی ہوئی فضا کو خوشگوار بنا لیتے ہیں۔ مہندر بابو کا دُکھی دل بھی بہل جاتا ہے اور اپنا اُلّو بھی سیدھا ہو جاتا ہے۔"

"کسی کو فریب دینا کہاں کی شرافت ہے؟"

"اِسے فریب نہیں کہتے انجنی! موقع سے فائدہ اُٹھانا ہی تو عقلمندی ہے۔ آج یہ جتنے بھی سفید پوش نظر آتے ہیں سب اِسی طرح موقع سے فائدہ اُٹھا کر ہی تو آگے بڑھے ہیں۔ ورنہ محنت اور ایمانداری کی کمائی میں اِتنی وسعت کہاں؟"

"وہ دیکھئے آپ کے مہندر بابو آگئے!" مہندر بابو کی کار گیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔

"بھئی! معاف کرنا۔ شاید میں بے وقت آگیا ہوں۔"

"نہیں! نہیں! ہم تو آپ ہی کا تذکرہ کر رہے تھے۔ ابھی ابھی انجنی کہہ رہی تھی کہ مہندر بابو ابھی تک نہیں آئے!"

مہندر بابو کا چہرہ کھِل اُٹھا۔ اُنھوں نے ممنون نظروں سے انجنی کو دیکھا اور انجنی کے ہونٹوں پر مصنوعی مُسکراہٹ بکھر گئی۔

"مسٹر ارون! کل تمھیں پونہ جانا ہی ہوگا!" اُنھوں نے بیٹھتے ہوئے کہا: "آج پھر پونہ برانچ سے ٹرنک کال آیا ہے۔ وہاں ورکروں نے مکمل اِسٹرائک کر دی ہے۔ میں تمھیں وہاں منیجر کی پوسٹ پر اپوائنٹ کر رہا ہوں۔ میرے خیال میں تمھارے لئے یہ ایک اچھا چانس ہے۔ ویسے بھی تم ہوشیار اور ذہین ہو، حالات پر جلد ہی قابو پا لوگے۔"

وہ ایک لمحہ کے لئے رُک کر انجنی کے چہرے کا جائزہ لینے لگے اور

انجمی کا ہاتھ [illegible]

"میرا خیال ہے تم دونوں کو میرے فیصلے پر خوش ہونا چاہیے۔" مہندر بابو اٹھتے ہوئے بولے۔

"بیٹھیے تو سہی آپ اٹھ کیوں گئے؟" انجمی نے اصرار کیا۔

"نہیں ابھی! آج فرصت نہیں ہے اور بھی کام ہیں دنیا میں۔۔۔"

"پھر بھی اس خوشی میں تو ایک ایک پیگ۔۔۔!" ارون نے زور دیا۔

"آج موڈ ٹھیک نہیں ہے۔" مہندر بابو مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

دونوں مہندر بابو کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ جب کار گیٹ سے باہر نکل گئی تو ارون نے انجمی کو شرارت سے دیکھتے ہوئے اپنی بائیں آنکھ دبا دی۔ انجمی نے ارون کو گھور کر دیکھا اور پھر ہونٹوں پر آئی ہوئی مسکراہٹ چھپانے کے لئے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

ارون ایک ہفتے کے بعد پونہ سے لوٹ رہا تھا۔ اس نے وہاں کے حالات پر قابو پا لیا تھا۔ وہ جلد سے جلد اپنی اس کامیابی کی خبر انجمی کو سنا دینا چاہتا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ لیکن بڑے ہال میں پہنچتے ہی اس کے قدم جہاں تھے وہیں جم گئے۔ ہال کے ساتھ والے بند کمرے سے انجمی اور مہندر بابو کے ملے جلے قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ سامنے دیوار پر لٹکی فادر کی الیکٹرک گھڑی کی ٹِک ٹِک نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ گھڑی گذشتہ سال مہندر بابو نے انجمی کو اس کی سالگرہ پر دی تھی۔ دن کے دو بج رہے تھے۔ اس وقت تو انھیں فیکٹری میں ہونا چاہیے تھا۔

اس کا دل انجانے خوف سے کانپ اٹھا۔ ذہن میں طرح طرح کے خیالات طوفان بن کر اٹھنے لگے۔ جیسے اس کے دل و دماغ کو کسی نے جھنجھوڑ دیا ہو۔ اسی وقت انجمی اور مہندر بابو کے قہقہے اس کے کانوں سے پھر ٹکرائے۔

ایک خط ——— گنہگار فرشتے

صدر شعبۂ انگریزی، ڈونگر کالج، بیکانیر (راجستھان)

برادرِ معظم و محترم و مکرّم! تسلیم و نیاز

بیسویں صدی کے مارچ ۱۹۴۳ء کے شمارے میں اردو کی مشہور و مقبول و مستند افسانہ نگار پروفیسر مس نگہت ریحانہ کا افسانہ بعنوان "گنہگار فرشتے" میں نے خاص توجہ سے پڑھا۔ افسانے کے مطالعے کے دوران میرے ذہن کی سطح پر انگلینڈ کے عظیم وکٹورین شاعر رابرٹ براؤننگ (Robert Browning) کی پوری کی پوری نظم مائی لاسٹ ڈچیس (My Last Duchess) مطبوعہ ۱۸۴۲ء ابھر آئی۔ افسانے کے شروع کے حصّے کا یہ اقتباس ——— "یہی ہے اس کا عکس میرے چاند کا عکس... کیسے نہیں؟ میرا نہیں سب کا چاند! اپنے حُسن میں بھی یہ چاند کی طرح بے مثال ہے اور اپنے اوصاف میں بھی چاند ہی کی طرح سیال جو بکھرتا ہے تو اپنی چاندنی کسی ایک پر نہیں سب پر بکھیرتا ہے کسی ایک کا ہو کر نہیں رہتا..." براؤننگ کی ایک دوسری نظم اینڈریا ڈیل سارٹو (Andrea del Sarto) مطبوعہ ۱۸۵۵ء کی مندرجہ ذیل سطروں کا کم و بیش لفظی مگر نہایت شستہ اردو ترجمہ ہے ———

"My face, my moon, my everybody's moon
Wich everybody looks on and calls his
And, I suppose, is looked on by, in turn,
While she looks, no one's;......... ...."

"گنہگار فرشتے" کے تمام پر تمائی حصّے پر مائی لاسٹ ڈچیس کا مزید حصّہ صاف چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ کئی جملے براؤننگ کی اس نظم کی سطروں کا محض لفظی ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ افسانے کا پورا پلاٹ اور ڈرامیٹک مانولاگ Dramatic Monologue کی تکنیک (جس میں براؤننگ کو خاص مہارت حاصل تھی) سب کچھ مائی لاسٹ ڈچیس پر مبنی ہے۔ براؤننگ کی نظم میں جو نفسیاتی پہلو ہے، اس کی گہرائی اور اس کی باریکی کو محترمہ نگہت اپنے افسانے میں پوری طرح سمو نہیں سکیں ——— ویسے کہیں سے کوئی پلاٹ لے لینا یا کسی عظیم فنکار کی تکنیک کو اپنا لینا کوئی بڑا گناہ نہیں ہے۔ شیکسپیئر (Shakespeare) نے بھی یہی کیا تھا، لیکن اس کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آسکتا ——— ایک لحاظ سے پروفیسر نگہت ریحانہ نے براؤننگ کے ڈرامیٹک مانولاگ کی تکنیک میں اپنے افسانے کو پیش کر کے ایک بہت بڑا کام کیا ہے۔ اردو افسانہ نگاروں کے لئے شاید یہ تجربہ مشعلِ راہ ثابت ہو ——— جس حسین اور دلآویز انداز میں محترمہ نگہت نے براؤننگ کی نظم کو اردو جامہ پہنایا ہے وہ یقیناً قابلِ داد و تحسین ہے۔ زبان کا ستھراپن، اسلوبِ بیان کی جاذبیت، خوبیٔ منظر کشی، شدتِ محسوسات کی اثر انگیزی ——— اِن سب پر قابل افسانہ نگار کی اپنی مخصوص مہر نمایاں طور پر ثبت ہے ——— ہماری شکایت محترمہ نگہت ریحانہ سے صرف اتنی ہے کہ انھوں نے قبلہ خوشتر گرامی صاحب کو عقیدت سے لکھے گئے خط میں براؤننگ کی نظم کا حوالہ کس مصلحت کے تحت نہیں دیا؟ کاش وہ اپنے خط میں یہ اعتراف کر لیتیں کہ اُن کا افسانہ "گنہگار فرشتے" براؤننگ کی نظم "مائی لاسٹ ڈچیس" سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے! اس اعتراف سے اُن کے افسانے کی اہمیت میں نہ کوئی فرق پڑتا، نہ اس پر کسی قسم کی آنچ آتی۔ بلکہ یہ اعتراف تو ایک طبعزاد، کہنہ مشق اور مقبولِ خاص و عام افسانہ نگار کی دیانتداری کا نہایت خوشگوار ثبوت ہوتا۔

پریم شنکر سریواستو

وہ ... حُسن کا صدقہ ہے، تمھاری دلفریب مُسکراہٹ کی
دیوی ہے ... پاس تھا ہی کیا؟ شاعر کے تخیّل میں عورت چاہے
شعلہ ہو چاہے شبنم۔ لیکن میرے خیال میں عورت مرد کی سب سے
بڑی کمزوری ہے! پھر تم جیسی حسین عورت پاکر بھی اگر میں دُنیا کو اپنے
قدموں پر نہ جھکا سکا تو یہ میری بدقسمتی اور تمھارے حُسن کی توہین
ہوگی!" اپنے حُسن کی تعریف سُن کر انجنی کے چہرے پر شرم و حیا کی
سُرخی شفق کی طرح پھیل گئی۔ عورت اپنے حُسن کی تعریف سُن کر شعلہ
سے شبنم بن جاتی ہے۔ یہی عورت کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔
"اب باتوں میں نہ بہلایئے۔ میں اتنی بھی ناسمجھ نہیں ہوں۔"
اُس نے ارون سے اپنی یہ کمزوری چھپانے کی کوشش کی۔
"انجنی! تم اِسے جو بھی سمجھو لیکن یہ سچ ہے کہ تم میری تقدیر کی
دیوی ہو جس نے میری زندگی کی خزاؤں کو بہاروں سے بدلا ہے۔
تمھاری آنکھوں کی یہ چمک میرے روشن مستقبل کی غمّاز ہے۔ تمھارے
اِن یاقوتی ہونٹوں پر مچلتی مُسکراہٹ میری زندگی ہے!"
"آپ صرف میری آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں کی مُسکراہٹ ہی
دیکھ رہے ہیں۔ کاش! میرے ضمیر کی آواز بھی سُن سکتے۔ میرے بھگوان!
کہیں میں اپنی ہی نظروں میں نہ گِر جاؤں۔ دُوسرے مَردوں کے ساتھ
ہنسنا بولنا تو بازاری عورتوں کا کام ہے۔"
"تم کیسی باتیں کرتی ہو انجنی! کسی کے ساتھ ہنسنا بولنا کوئی
پاپ نہیں ہے۔ بس انسان کا دل صاف ہونا چاہیئے۔ دل کی پاکیزگی
ہی کردار کی بلندی ہے۔ کلبوں میں دیکھو بغیر کسی جان پہچان کے بھی
مرد اور عورتیں ایک ساتھ ڈانس کرتے ہیں۔ گھنٹوں بے تکلّفی سے
ہنستے بولتے ہیں۔ لیکن اُنھیں کوئی غلط نہیں سمجھتا، اُنھیں کو مہذّب
سمجھا جاتا ہے اور اُس ماحول سے جو دُور ہیں اُنھیں لوگ بیک ورڈ
کہتے ہیں، جاہل سمجھتے ہیں۔ پھر ہم تو کلبوں میں بھی نہیں جاتے۔ آپس
ہی میں ہنس بول کر گھر کی گھُٹی ہوئی فضا کو خوشگوار بنا لیتے ہیں۔
مہندر بابو کا دُکھی دل بھی بہل جاتا ہے اور اپنا اُلّو بھی سیدھا ہو جاتا
ہے۔"
"کسی کو فریب دینا کہاں کی شرافت ہے؟"
"اِسے فریب نہیں کہتے انجنی! موقع سے فائدہ اُٹھانا ہی تو
عقلمندی ہے۔ آج یہ جتنے بھی سفید پوش نظر آتے ہیں سب اِسی طرح
موقع سے فائدہ اُٹھا کر ہی اُونچے بنے ہیں ... اور
ایمانداری کی کمائی میں اِتنی وسعت کہاں؟"
"وہ دیکھئے آپ کے مہندر بابو آ گئے۔" مہندر بابو کی کار
گیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔
"بھئی! معاف کرنا۔ شاید میں بے وقت آ گیا ہوں؟"
"نہیں نہیں! ہم تو آپ ہی کا تذکرہ کر رہے تھے۔ ابھی ابھی
انجنی کہہ رہی تھی کہ مہندر بابو ابھی تک نہیں آئے!"
مہندر بابو کا چہرہ کھِل اُٹھا۔ اُنھوں نے ممنون نظروں سے
انجنی کو دیکھا اور انجنی کے ہونٹوں پہ مصنوعی مُسکراہٹ بکھر گئی۔
"مسٹر ارون! کل تمھیں پُونہ جانا ہی ہوگا!" اُنھوں نے بیٹھتے
ہوئے کہا۔ "آج پھر پُونہ برانچ سے ٹرنک کال آیا ہے۔ وہاں ورکروں نے
مکمل اِسٹرائک کر دی ہے۔ میں تمھیں وہاں منیجر کی پوسٹ پر اپوائنٹ
کر رہا ہوں۔ میرے خیال میں تمھارے لئے یہ ایک اچھا چانس ہے۔
ویسے بھی تم ہوشیار اور ذہین ہو، حالات پر جلد ہی قابو پا لوگے۔"
وہ ایک لمحے کے لئے رُک کر انجنی کے چہرے کا جائزہ لینے لگے اور



[illegible]

"میرا خیال ہے تم دونوں کو میرے فیصلے پر خوش ہونا چاہئے" مہندر بابو اُٹھتے ہوئے بولے۔

"بیٹھئے تو سہی آپ اُٹھ کیوں گئے؟" انجنی نے اصرار کیا۔

"نہیں بھئی! آج فرصت نہیں ہے اور بھی کام ہیں دُنیا میں..."

"پھر بھی اِس خوشی میں تو ایک ایک پیگ...!" ارون نے زور دیا۔

"آج موڈ ٹھیک نہیں ہے" مہندر بابو مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

دونوں مہندر بابو کو جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ جب کار گیٹ سے باہر نکل گئی تو ارون نے انجنی کو شرارت سے دیکھتے ہوئے اپنی بائیں آنکھ دبا دی۔ انجنی نے ارون کو گھور کر دیکھا اور پھر ہونٹوں پر آئی ہوئی مُسکراہٹ چھپانے کے لئے اپنا مُنہ دُوسری طرف پھیر لیا۔

ارون ایک ہفتہ کے بعد پُونہ سے لَوٹ رہا تھا۔ اُس نے وہاں کے حالات پر قابو پا لیا تھا۔ وہ جلد سے جلد اپنی اِس کامیابی کی خبر انجنی کو سُنا دینا چاہتا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ لیکن بڑے ہال میں پہنچتے ہی اُس کے قدم جہاں تھے وہیں جم گئے۔ ہال کے ساتھ والے بند کمرے سے انجنی اور مہندر بابو کے مِلے جُلے قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ سامنے دیوار پر لٹکی خاور کی الیکٹرک گھڑی کی ٹِک ٹِک نے اُسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ گھڑی گذشتہ سال مہندر بابو نے انجنی کو اُس کی سالگرہ پر دی تھی۔ دن کے دو بج رہے تھے۔ اِس وقت تو انھیں فیکٹری میں ہونا چاہئے تھا۔ اُس کا دل انجانے خوف سے کانپ اُٹھا۔ ذہن میں طرح طرح کے خیالات طوفان بن کر اُٹھنے لگے۔ جیسے اس کے دل و دماغ کو کسی نے جھنجھوڑ دیا ہو۔ اُسی وقت انجنی اور مہندر بابو کے قہقہے اُس کے کانوں سے پھر ٹکرائے۔

ایک خط —— گنہگار فرشتے

صدر شعبہ انگریزی، ڈونگر کالج، بیکانیر (راجستھان)

برادرِ معظم و محترم و مکرم! تسلیم و نیاز

بیسویں صدی کے مارچ ۱۹۷۳ء کے شمارہ میں اردو کی مشہور و مقبول و مستند افسانہ نگار پروفیسر مس نکہت ریحانہ کا افسانہ بعنوان "گنہگار فرشتے" میں نے خاص توجہ سے پڑھا۔ افسانے کے مطالعہ کے دوران میرے ذہن کی سطح پر انگلینڈ کے عظیم و کثیر پیشاعر رابرٹ براؤننگ (Robert Browning) کی پوری کی پوری نظم "مائی لاسٹ ڈچیس" (My Last Duchess) مطبوعہ ۱۸۴۲ء ابھر آئی۔ افسانے کے شروع کے حصّہ کا یہ اقتباس —— "یہی ہے اُس کا عکس، میرے چاند کا عکس... تیری چھبی، میرا نہیں سب کا چاند۔ اپنے حُسن میں بھی یہ چاند کی طرح بے مثال ہے اور اپنے اوصاف میں بھی چاند ہی کی طرح دریا دل۔ جو بکھرتا ہے تو اپنی چاندنی کسی ایک پر نہیں سب پر بکھیرتا ہے کسی ایک کا ہو کر نہیں رہتا..." براؤننگ کی ایک دوسری نظم "اینڈریا ڈیل سارٹو" (Andrea del Sarto) مطبوعہ ۱۸۵۵ء کی مندرجہ ذیل سطروں کا کم و بیش لفظی مگر نہایت شستہ اردو ترجمہ ہے ——

"My face, my moon, my everybody's moon
Wich everybody Looks on and calls his
And, I suppose, is Looked on by. in turn,
While she Looks, no one's; ...."

"گنہگار فرشتے" کے تہائی حصّہ پر "مائی لاسٹ ڈچیس" کا مزید حصّہ صاف چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ کئی جملے براؤننگ کی اِس نظم کی سطروں کا محض لفظی ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ افسانہ کا پورا پلاٹ اور ڈرامیٹک مانولاگ Dramatic Monologue کی تکنیک (جس میں براؤننگ کو خاص مہارت حاصل تھی) سب کچھ "مائی لاسٹ ڈچیس" پر مبنی ہے۔ براؤننگ کی نظم میں جو نفسیاتی پہلو ہے اُس کی گہرائی اور اُس کی باریکی کو محترمہ نکہت اپنے افسانہ میں پوری طرح سمو نہیں سکیں —— ویسے کہیں سے کوئی پلاٹ لے لینا، یا کسی عظیم فنکار کی تکنیک کو اپنا لینا کوئی بڑا گناہ نہیں ہے۔ شیکسپیر (Shakespeare) نے بھی یہی کیا تھا، لیکن اُس کی عظمت پر کوئی حرف نہیں لا سکتا —— ایک لحاظ سے پروفیسر نکہت ریحانہ نے براؤننگ کے ڈرامیٹک مانولاگ کی تکنیک میں اپنے افسانہ کو پیش کرکے ایک بہت بڑا کام کیا ہے۔ اُردو افسانہ نگاروں کے لئے شاید یہ تجربہ مشعلِ راہ ثابت ہو —— جس حسین اور دلآویز انداز میں محترمہ نکہت نے براؤننگ کی نظم کو اُردو جامہ پہنایا ہے، وہ یقیناً قابلِ داد و تحسین ہے۔ زبان کا ستھرا پن، اسلوبِ بیان کی جاذبیت، خوبیٔ منظر کشی، شدّتِ محسوسات کی اثر انگیزی —— اِن سب پر قابل افسانہ نگار کی اپنی مخصوص مُہر نمایاں طور پر ثبت ہے —— ہماری شکایت محترمہ نکہت ریحانہ سے صرف اتنی ہے کہ انھوں نے قبلہ خوشتر گرامی صاحب کو عقیدت سے لکھے گئے خط میں براؤننگ کی نظم کا حوالہ کس مصلحت کے تحت نہیں دیا؟ کاش وہ اپنے خط میں یہ اعتراف کر لیتیں کہ اُن کا افسانہ "گنہگار فرشتے" براؤننگ کی نظم "مائی لاسٹ ڈچیس" سے متاثر ہوکر لکھا گیا ہے! اِس اعتراف سے اُن کے افسانہ کی اہمیت میں نہ کوئی فرق پڑتا، نہ اُس پر کسی قسم کی آنچ آتی۔ بلکہ یہ اعتراف تو ایک طبعزاد، کہنہ مشق اور مقبولِ خاص و عام افسانہ نگار کی دیانتداری کا نہایت خوشگوار ثبوت ہوتا۔

پریم شنکر سریواستو

غصّے سے اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اُس نے حلق پھاڑ کر چیخنا چاہا۔ لیکن اُس کی آواز گلے میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ اُس کے ہونٹ جیسے سِل گئے تھے۔ اُس کا جی چاہا بند دروازے پر اتنی زور سے پاؤں مارے کہ وہ ٹوٹ کر انجنی اور مہندر بابو کے سر پر جا گرے تاکہ اُن دونوں کی آواز ہمیشہ کے لئے دب جائے! لیکن اُس کے قدم اپنی جگہ سے ہِل بھی نہ سکے۔ وہ بے بس ہو کر وحشیانہ انداز میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے محسوس کیا جیسے کمرے کی ایک ایک چیز اُس کی بزدلی کا مضحکہ اُڑا رہی ہے، اُس کی بے بسی پر قہقہے لگا رہی ہے۔ اُس کا دل سینے میں بیٹھا جا رہا ہے اور دماغ کی رگیں جیسے پھٹی جا رہی تھیں۔ اُس نے صوفے پر بیٹھنا چاہا۔ لیکن قدموں میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ دو قدم چل کر صوفے تک پہنچتا۔ وہ وہیں مخملی قالین پر ڈھیر ہو گیا۔ اُسکی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ آج اُسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ ساری چیزیں جنھیں دیکھ کر وہ خوش ہوتا رہا، جنھیں وہ اپنی سمجھتا رہا۔ حقیقت میں وہ سبھی پرائی ہیں۔ جن پر اُس کا کوئی اختیار نہیں، کوئی زور نہیں — انجنی، مہندر بابو — یہ بنگلہ یہ آسائش اور زیبائش کے قیمتی سامان۔ یہاں تک کہ اُس کی آواز، اُس کا دل و دماغ، اُس کے جسم کا ایک ایک عضو آج اُس کا نہ تھا! وہ دَم توڑتے ہوئے زخمی شیر کی طرح پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ انجنی اور مہندر بابو کے قہقہے اُسی طرح بلند ہوتے رہے۔ اُس نے یوں محسوس کیا جیسے موت کے بھیانک سائے اُس کے چاروں طرف ناچ رہے ہوں، تھرک رہے ہوں، قہقہے لگاتے اُس کی طرف بڑھ رہے ہوں! اُس نے خوف زدہ ہو کر اپنی آنکھیں زور سے بند کر لیں اور کانوں میں اُنگلیاں ڈال دیں۔ لیکن قہقہے اُس کے ذہن میں اُسی طرح گونجتے رہے، بلند ہوتے رہے — بے ہنگم قہقہے — بے معنی قہقہے — بے باک قہقہے — اُس کی بیوی اور اُس کے باس کے قہقہے!!

غیر طلبیدہ مضامین واپس منگوانے کیلئے اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ ضرور بھیجیے بصورت دیگر اپنے مضامین کی نقل اپنے پاس رکھئے۔ ہم واپسی سے معذور رہیں گے۔ (ایڈیٹر بیسویں صدی دہلی)

غزل

کاوش خیرآبادی بی۔ اے کامل (علیگ)

میں سپئے شکوہ لب کشا نہ ہوا
یہ بھی اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا

کہتے ہو! مہرباں ذرا نہ ہوا
یہ بھی کیا کم ہے وہ خفا نہ ہوا

مقصدِ زندگی وہ کیا جانے
غم کا جو لذت آشنا نہ ہوا

خود وہ اپنے پہ آج مر مٹتے
سامنے کہئے! آئینہ نہ ہوا

آکے بیٹھے سبھی نشانے پر
تیر اُس کا کوئی خطا نہ ہوا

مجرمِ عشق کی سزا کے لئے
عمر بھر کوئی فیصلہ نہ ہوا

جام خالی ہی ہم کو دے دیتا
تجھ سے اِتنا بھی ساقیا نہ ہوا

لڑتے لڑتے بھی نظر اُن سے
ہوتے ہوتے یہ حادثہ نہ ہوا

غم کو اپنا بنا لیا کاوش
جب کوئی اور آسرا نہ ہوا

غزل

بہار الہ آبادی

جسے سب کہہ رہے ہیں آسماں ہے
ہماری آہِ سوزاں کا دھواں ہے

کرشمہ حسنِ جاناں کا عیاں ہے
محبت اب خدا رکھے جواں ہے

وہی شاخِ شجر کیوں باغباں نے
قلم کی جس پہ میرا آشیاں ہے

حسیں تاروں کے جھرمٹ میں کسی کا
تصور اب خدا رکھے جواں ہے

زمانہ کبر و نخوت کا ہے خوگر
محبت کا فقط وہم و گماں ہے

جہاں بجلی چمک جاتی ہے اکثر
اُسی گوشے میں میرا آشیاں ہے

یہ کس کی یاد میں، کچھ منھ سے بولو
تمہاری آنکھ سے آنسو رواں ہے

اناج کی قیمتوں کو کم کرنے میں آپ مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔
کم اناج استعمال کر کے بھی آپ اپنے کھانے سے نہ صرف اسی مقدار میں
بلکہ اس سے زیادہ مقدار میں بھی صحت کے لئے ضروری
عناصر حاصل کر سکتے ہیں۔
یہ بات بالکل آسان ہے۔ گیہوں اور چاول کم کھائیے اور آلو، شکرقندی
اور مکی، جو، باجرہ، جوار اور راگی ایسے دوسرے اناجوں کا
زیادہ استعمال کیجئے۔

کم اناج استعمال کر کے متوازن خوراک کھائیں



ہرے پتوں والی سبزیوں اور موسم کے مطابق پھلوں کا استعمال
کر کے آپ اپنی خوراک کو زیادہ متوازن و مقوی بنا سکتے ہیں۔
معاشی نقطہ نظر سے یہ بات ملک کے لئے بھی
زیادہ فائدہ مند ہوگی۔
اپنی روزمرہ کی خوراک میں ان کا استعمال کیجئے۔

**ہفتے میں کم از کم ایک بار ایسا کھانا کھائیے
جس میں اناج شامل نہ ہو۔**

احمقانہ جواب

فکر تونسوی

اے ۲۳/۱۸ موتی نگر۔ نئی دہلی

خوشتر صاحب ڈی گریٹ گرامی!

حماقت کسی کی میراث نہیں، میرے ایسے دانش مند شرفا بھی اس کی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں اور جہاں تک میری سوجھ بوجھ کام کرتی ہے سوسائٹی عقل مندانہ سوالات اور احمقانہ جوابات کے مجموعے ہی کو کہتے ہیں۔ اس مجموعے میں حماقت ہمارے حصے میں آئی ہے۔ اس "ہمارے" میں آپ بھی شامل ہونا پسند کرتے ہیں یا نہیں؟ بس، اسی جواب پر سوسائٹی کا انحصار ہے۔ اپنی پسند سے آگاہ کیجئے۔

فکر تونسوی

★

سوال:۔ "میں اپنی محبوبہ کو اس کی شادی پر کوئی بہترین تحفہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ کون سی چیز موثر اور معقول رہے گی؟"

جواب:۔ "اس کے لولیٹر!"

سوال:۔ "عاشق کی شکار حسینہ، حسینہ کی الجھن بچہ، اور بچے کا مستقبل؟"

جواب:۔ "یتیم خانہ!"

سوال:۔ "کانگریس پارٹی میں جو کالی بھیڑیں ہیں، ان کی شناخت کیسے کی جائے؟"

جواب:۔ "وہ بھیڑیئے بن کر میاتی ہیں۔"

سوال:۔ "بڑے بڑے سرمایہ دار سوشلزم کا نعرہ کیوں لگاتے ہیں؟"

جواب:۔ "کل آپ اعتراض کریں گے کہ بھرشٹاچاری حضرات عبادت گاہیں کیوں تعمیر کرتے ہیں؟"

سوال:۔ "جب شمع محفل میں جلتی ہے تو پروانے کہاں جاتے ہیں؟"

جواب:۔ "پرانے پروانے وہیں بیٹھ کر شمع کی قسمت کو روتے۔ نئے پروانے حاضری لگا کر کھسک جاتے۔"

سوال:۔ "کسی ایسی بوڑھی لڑکی کا نام بتائیے، جس نے آپ سے پیار کیا ہے۔"

جواب:۔ "میری رفیقۂ حیات کی سوکن۔"

سوال:۔ وہ کون سی چیز ہے جو صاف چھپتی بھی نہیں سامنے آتی بھی نہیں!"

جواب:۔ "کانگریس کا سوشلزم!"

سوال:۔ "اگر لیڈر ہی عوام کے دشمن بن جائیں تو عوام کہاں جائیں؟ ——— جہنم میں؟"

جواب:۔ "اوں ہوں ——— وہاں تو لیڈر موجود ہوں گے!"

سوال:۔ "بیوہ عورت کی پہچان یہ ہے کہ اس کی پیشانی کا سیندور مٹا ہوا ہوتا ہے تو رنڈوے مرد کی کیا پہچان ہے؟"

جواب:۔ "جو سیندور کی شیشیاں بیچتا نظر آئے۔"

سوال:۔ "ہنسنے والے کے ساتھ سبھی ہنستے ہیں لیکن رونے والے کے ساتھ سبھی کیوں نہیں روتے۔"

جواب:۔ "ہنسنا بے وقوفی کی علامت ہے، رونا عقل مندی کی۔ اور دنیا میں سبھی آدمی عقل مند نہیں ہوتے۔"

سوال:۔ "جب گورنمنٹ امیر و غریب دونوں پر ٹیکس لگاتی ہے، تو

غریب رو سکتے ہیں، امیر کیوں نہیں روتے ؟"

جواب :۔ "یہ غریبوں کی عادت ہے اور امیروں کی شرافت۔"

سوال :۔ "میری بیوی مجھے ہمیشہ طعنہ دیتی ہے کہ آپ گھر میں جو بھی چیز لاتے ہیں ۔ گھٹیا ہوتی ہے ۔ میں اُسے کیا جواب دوں ؟"

جواب :۔ "اُس سے ایک دن پوچھئے کہ میں تمہیں بھی تو گھر لایا تھا۔"

سوال :۔ "کیا کتابوں کا مطالعہ کرنے سے انسان ذہین ہو جاتا ہے ؟"

جواب :۔ "ایک شرط پر، اگر مطالعہ کرنے والا ذہین ہو !"

سوال :۔ "ڈکشنری میں وہ کون سا لفظ ہے، جس کا کوئی معنی بھی صحیح نہیں ہوتا ؟"

جواب :۔ "ڈپلومیسی"

◆ جس نے افتادہ اور بنجر زمین پر کھیتی کی تو اُس کا بھی اجر و ثواب ہے۔ (سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)

◆ اعتدال کو اپنا شیوہ بناؤ۔ دولت مند ہو کر آپے سے باہر اور غریب ہو کر شکستہ خاطر نہ ہو جاؤ۔ (حضرت حسان بن ثابت رضی)

◆ سیر ہو کر کھانا مباح ہے، اِس سے زیادہ ممنوع ہے۔ (مولانا اشرف علی)

◆ ذلیل وہی ہے جو بخیل ہے۔ (حضرت امام حسین رض)

◆ صحت مند رہنا چاہتے ہو تو کھانے کی حرص سے بچو۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

◆ اپنے کام کے صلہ کی واجب سے زیادہ اُمید نہ رکھو (حضرت امام حسین رض)

سوال :۔ "اگر ایک گلاس میں شراب پڑی ہو اور دوسرے گلاس میں زہر ——— تو آپ دونوں میں کون سی چیز نوش کرنا پسند کریں گے ؟"

جواب :۔ "جس میں ملاوٹ نہ ہو گی !"

سوال :۔ "دشمنوں میں سے بدترین دشمن کون ہے ؟"

جواب :۔ "جو آپ کا بہترین دوست رہا ہو۔"

سوال :۔ "آپ ہمیشہ حسین لڑکیوں کو بے وقوف کہتے ہیں ۔ لیکن میری ایک محبوبہ ہے جو بیک وقت عقل مند بھی ہے اور حسین بھی۔"

جواب :۔ "تو اِس کیس میں آپ خود بے وقوف ہوں گے !"

سوال :۔ "وہ کون سی ایسی ماں ہے جو اپنے ایک بچے کو چیتھڑے پہناتی ہے اور دوسرے کو ٹیرالین ؟"

جواب :۔ "بھارت ماتا !"

سوال :۔ "میں نے ایک جوتشی کو پچاس پیسے دیئے تو اُس نے میرے ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر کہا کہ تم منسٹر بننے والے ہو !"

جواب :۔ "اگر آپ پورا روپیہ دے دیتے تو چیف منسٹر بننے کا چانس پیدا ہو جاتا !"

سوال :۔ "شباب ڈھل جائے تو کیا دل بھی ڈھل جاتا ہے ؟"

جواب :۔ "نہیں غروبِ آفتاب کے بعد اُس کی شعاعیں کچھ دیر تک کانپتی رہتی ہیں۔"

سوال :۔ "ہمارے ملک کے لوگ محنت کرنے کے باوجود غریب کیوں ہیں ؟"

جواب :۔ "محنت کرنے والے ہمیشہ غریب ہوتے ہیں۔"

سوال :۔ "عورت تو خود ایک آئینہ ہے پھر وہ آئینہ کیوں دیکھتی ہے ؟"

جواب :۔ "کیونکہ آئینہ جھوٹ بولتا ہے اور عورت جھوٹ کو بہت پسند کرتی ہے"

سوال :۔ "میرا جی چاہتا ہے، ہندوستان میں ایسا دَور دوبارہ آ جائے کہ ہر گھر میں ایک گائے بندھی ہو۔"

جواب :۔ "ہرج تو کوئی نہیں ۔ لیکن بھینسیں اعتراض کریں گی ۔"

سوال :۔ "اگر دل کی کتاب کوری ہو تو کیا کیا جائے ؟"

جواب :۔ "کتاب کوری نہیں ہوتی اُسے پڑھنے والی آنکھیں کوری ہوتی ہیں"

سوال :۔ جو حسینائیں کسی سے پیار نہیں کرتیں وہ کیا کرتی ہیں ؟"

جواب :۔ "پیسے کی پوجا کرتی ہیں ۔"

سوال :۔ "وہ کون سے دو نعرے ہیں جو ہندوستان میں بے حد مقبول ہوئے اور بے حد فیل ہوئے ؟"

جواب :۔ "ہندی چینی بھائی بھائی ——— اور غریبی ہٹاؤ"

سوال :۔ "کیسے معلوم ہو کہ جس حسینہ سے میں عشق کرتا ہوں وہ بھی مجھ پر جان چھڑکتی ہے۔"

جواب :۔ "اُس سے اُدھار پیسے مانگ کر دیکھ لیجئے"

سوال :۔ "لڑکا اگر ایک کلومیٹر ہو ۔ تو لڑکی .... ؟"

جواب :۔ "ٹومیٹر پیچھے"

سوال :۔ "محبوبہ اور لیڈر کے وعدے میں سے کس پر زیادہ اعتبار کیا جائے ؟"

جواب :۔ "جس کا عاشق زیادہ بے وقوف ہو۔"

سوال: "میں زندگی کو عشرت کدہ بنانا چاہتا ہوں، آپ —؟"

جواب: "آپ کو سفر کرتے دیکھ کر!"

سوال: "کیا کالج کی لڑکیاں بھی فیشن ایبل ہوتی ہیں؟"

جواب: "ہاں اپنے ڈیڈی سے مانگ کر!"

سوال: "آزادی کے بعد مسلمانوں کا مستقبل؟"

جواب: "ہندوستانی مسلمان، پاکستانی مسلمان، بنگالی مسلمان!"

سوال: "کسی آرٹسٹ کو خوش کرنے کے کون سے طریقے مقبول ہیں؟"

جواب: "پیسہ — سینہ — شراب — خوشامد!"

سوال: "میری محبوبہ محبت کی بات کرنے سے پہلے ہمیشہ خدا کا نام لیتی ہے — کیوں؟"

جواب: "اُسے خدا پر اعتماد ہے، آپ پر نہیں۔"

سوال: "اگر سارا ہندوستان سول میرج کا قائل ہو کر عدالتوں میں جانے لگے تو قاضی اور پنڈت کیا کریں گے؟"

جواب: "وہ اُنہی عدالتوں کے جج بن جائیں گے۔"

سوال: "عشق میں دل دیکھا جاتا ہے یا دولت؟"

جواب: "دونوں میں سے کس چیز سے بھی عشق ہو جاتا ہے۔"

سوال: "کیا فکر تونسوی آپ کے ماں باپ کا رکھا ہوا نام ہے؟"

جواب: "نام میں کام دیکھا جاتا ہے، ماں باپ نہیں۔"

سوال: "سڑک پر چلتے ہوئے لڑکی دائیں بائیں کیوں جھانکتی رہتی ہے؟"

جواب: "بیچاری کیا کرے آپ کبھی دائیں مڑ جاتے ہیں تو وہ بائیں طرف دیکھنے لگتی ہے اور بائیں مڑ جاتے ہیں تو دائیں طرف۔"

سوال: "کوٹھے پر ناچنے والی کو طوائف کیوں کہا جاتا ہے آرٹسٹ کیوں نہیں؟"

جواب: "فقط آرٹسٹ صرف فلم اسکرین پر ناچنے والیوں کے لئے ریزرو ہے۔"

سوال: "موت اور زندگی میں کیا فرق ہے؟"

جواب: "سفر اور منزل کا۔"

سوال: "من کی شانتی کا کوئی آسان طریقہ بتائیے۔"

جواب: "اخبار پڑھنا بند کر دیجئے!"

سوال: "بلیک مارکیٹیئے بھگوتی جاگرن کروا کر تسکین حاصل کر لیتے ہیں، لیکن اُن کے بیٹے کیا کرتے ہیں؟"

جواب: "کیبرے ڈانس دیکھ کر تسکین حاصل کرتے ہیں۔"

سوال: "جو لوگ شبنم کو موتی کہہ دیتے ہیں؟"

جواب: "وہ یا تو شاعر ہوتے ہیں یا جوہری —— دونوں سے شبنم کو خطرہ ہوتا ہے۔"

سوال: "غریبی ہٹاؤ کے نعرے کی کیا اہمیت ہے؟"

جواب: "امیروں کی کرکٹ کھیل کے ایک چھکے کے برابر!"

سوال: "گیدڑ شہر کی طرف آنے سے کیوں گھبراتا ہے؟"

جواب: "گیدڑ شریف ہے اور ہر شہر شرافت کا قبرستان ہے!"

سوال: "وہ لوگ کہاں گئے جو کہا کرتے تھے، ہم ہندوستان میں انقلاب لائیں گے؟"

- دانا وہ ہے جو کم بولے اور زیادہ سنے۔ (اقلیدس)
- دنیا ایک خوبصورت کتاب کی طرح سبق آموز ہے لیکن اُس کے لئے بالکل بیکار ہے جو اسے پڑھ نہیں سکتا۔ (جان رسکن)
- جب شراب اندر جاتی ہے تو ذہانت باہر آتی ہے۔ ([illegible])
- دل میں یہ وہم کبھی نہ لاؤ کہ تم کامیاب نہ ہو گے۔ جو دل سے کامیابی کو چاہتا ہے اسے ضرور کامیابی ملتی ہے۔ (ڈاکٹر مارڈن)
- جس چیز کا علم نہ ہو وہ مت کہو، جس چیز کی ضرورت نہیں اس کی جستجو مت کرو، جو راستہ معلوم نہیں اس پر مت سفر کرو۔ جو بات جو کہے اسے غور سے سنو، یاد رکھو، عمل کرو۔ (سقراط)

جواب: "ایسے لوگ دو مقامات پر مل جائیں گے (۱) پبلک پارک میں گلی سڑی مونگ پھلیاں کھاتے ہوئے (۲) راج محلوں میں پستے بادام کھاتے ہوئے۔"


ایک پاؤڈر
جو کپڑوں اور ہاتھوں کیلئے
نہایت محفوظ ہے
ایک پاؤڈر
جو رنگین کپڑوں کو
زیادہ چمکدار بناتا ہے
ایک پاؤڈر
جو کپڑوں کو
نہایت سفید دھوتا ہے
نیا
تین طرفہ عمل والا
ڈیٹ
نیا ڈیٹ جس میں دھلائی کے بعد کپڑوں کو نہایت سفید بنانے کیلئے ایک زائد سفیدی لانیوالا اجزشامل ہے۔
نیا ڈیٹ کپڑوں کو زیادہ صاف بنانے کی قوت سے مالا مال ایک پاؤڈر ہے۔ کپڑوں میں جمی میل کچیل کو بھی دُور کرتا اور رنگین کپڑوں کو نہایت چمکدار بناتا ہے۔
نیا ڈیٹ بھرپور جھاگ دیتا ہے جس میں کپڑوں کو ملائم رکھنے کیلئے ایک خاص جز شامل ہے۔
یہ آپکے کپڑوں کو نہایت محفوظ طریقے سے دھوتا ہے۔۔۔
اور آپکے ہاتھوں کو نہایت ملائم رکھتا ہے!
NEW!
TRIPLE ACTION
det
WASHES WHITEST
نیلا ڈیٹ
سفید ڈیٹ
نئی سائز میں ۔۔۔ کے پیکٹ میں۔ چھوٹے نمونے کے پیکٹ بھی ملتے ہیں۔
ایک اور اعلیٰ درجہ کی ڈیٹ مصنوعات
ڈیٹ ٹکیہ
det

غزلیں

[illegible]

دل میں طوفاں اُٹھا ہو جیسے
ہر نفس موجِ بلا ہو جیسے

کس نے پھر ذکرِ وفا کا چھیڑا
سازِ دل نغمہ سرا ہو جیسے

اُس نے وہ پہلی محبت کی نظر
عمر بھر ساتھ رہا ہو جیسے

عشق میں ایسے بھی گزرے لمحات
ایک جُگ بیت گیا ہو جیسے

آج ناؔمی جو نہیں رندوں میں
رنگِ محفل کا اُڑا ہو جیسے

— غزال چند نسیم

کچھ ایسے تُند دا شرار ہے سینہ کو رسا نکلے
یکایک سوئے تقاضا کیش میرے پاس آ نکلے

حیات و مرگ اک پھیر ملتے دو کنارے ہیں
کبھی اِس پار آئے ہم کبھی اُس پار جا نکلے

بہیں شاید بلا کے تحت جاں بھی نہ آئی الم
تو سے ترکش سے جتنے تیر نکلے بے خطا نکلے

گھما کر پھر وہیں آخر مذاقِ دید لے آیا
بصد تذلیل ہم جس انجمن سے بار ہا نکلے

مرا باغِ وطن بھی اے نسیم اب ہو تر و تازہ
اِدھر سے بھی برستی جھومتی کوئی گھٹا نکلے

— قیس رام پوری

اُنھیں کو یہاں بس اُنھیں کو ملے گی متاعِ منزلِ زندگی
مصیبتوں کے ہجوم میں بھی لبوں پہ جن کے ہنسی ملے گی

قفس کی تاریک خلوتوں پر بہا ہے عرقِ گیوں جینے والے
چمن میں بھی آشیاں جلیں گے تو پھر کہیں روشنی ملے گی

اگر اُجالوں کی ہے تمنا، نہ بجھنے پائے چراغ دل کا
کہ دل میں جب روشنی نہ ہوگی تو ہر طرف تیرگی ملے گی

میں تیری آنکھوں کے آسرے ہی پہ کب سے اُٹھا تھا لیکن
یہ کیا خبر تھی کہ تیری آنکھوں سے اور بھی تشنگی ملے گی

یہ لوگ جو خندہ زن ہیں مجھ پر انھیں کچھ اس کی خبر نہیں ہے
کہ میری روداد گم رہی سے زمانے کو رہبری ملے گی

شوراج بہار

غم ترا جس کو سازگار نہیں
عشق کا اُس کے اعتبار نہیں

اُن کی ہمدردی نظر معاذ اللہ
کسی دل کو ذرا قرار نہیں

آؤ کچھ کرلیں پیار کی باتیں
زندگی کا کچھ اعتبار نہیں

ہم وہ حرماں نصیب ہیں جن کو
لطفِ خوباں بھی سازگار نہیں

وقت سے فائدہ اٹھا غافل!
وقت کا کوئی اعتبار نہیں

آپ کیوں منتظر ہیں اُس پہ بہارؔ
جو ڈگر اُن کی رہ گزار نہیں



بچت

ساتھ

بیمہ

اجتماعی میعادی ڈپازٹ کھاتہ	10 روپے ماہانہ کے حساب سے	675 روپے ملیں گے
مکرر ڈپازٹ کھاتہ	10 روپے ماہانہ کے حساب سے بچت	710 روپے ملیں گے



فرض کیجیے کوئی بالغ فرد پانچسالہ اجتماعی میعادی ڈپازٹ کھاتہ یا پانچ یا دس روپے کا مکرر ڈپازٹ کھاتہ کسی ڈاکخانے میں کھولتا ہے اور اس میں 24 ماہانہ قسطیں جمع کراتا ہے۔ اگر بدقسمتی سے موت ہو جانے کی صورت میں وہ تمام قسطیں جمع نہ کرا سکے تو سرکار اس کے نامزد شخص یا وارث کو پوری رقم مع سود ادا کرے گی جو کہ پانچویں سال کے آخر تک تمام ماہانہ قسطیں جمع کرانے کی صورت میں واجب الادا ہوتی۔

دیکھئے کیسے!۔

باتحفظ بچت اسکیم سب کے لئے

سماجی تحفظ کا اقدام

قومی بچت ادارہ

حکومت ہند

davp 72/513

ع کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لکھنؤ

"بیسویں صدی" میں آر۔ ایس۔ ایس کے خلاف تین سال قبل ایک مضمون کی اشاعت پر مدیرِ بیسویں صدی پر مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف نفرت اور اشتعال پیدا کرنے کے الزام میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لکھنؤ کی طرف سے جو مقدمہ دائر ہوا تھا اُس سے حکومت کے ایوانوں میں زلزلہ آ گیا اور مُلک کے طول و عرض میں ایک تہلکہ مچ گیا کیونکہ اِس مضمون میں آر۔ ایس۔ ایس کے قابلِ نفرت فرقہ وارانہ کرداروں کی پُر زور مذمت کی گئی تھی ــــ اِس سلسلہ میں ہمیں ہزارہا خطوط اور سینکڑوں تار موصول ہوئے ہیں جن میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لکھنؤ کے اِس مذموم فعل کی مذمت اور مدیر "بیسویں صدی" اور جناب محترم جناداس اختر مدیر روزنامہ "سویرا" دِلّی کے مجاہدانہ اقدام کو مستحسن قرار دیا گیا ہے ــــ مدیرِ بیسویں صدی کو افسوس ہے کہ وہ موجودہ سیکولر گورنمنٹ کے عہدِ حکومت میں "فرقہ پرستی" کے الزام میں جیل یاترا کی سعادت سے محروم رہا۔ اِس سلسلہ میں مُلک کے متعدد اخبارات نے جن ہمدردانہ جذبات کا اظہار کیا اُس کا اختصار نذرِ قارئین کیا جا رہا ہے۔

اُتر پردیش میں کانگریس کی حکومت ہے۔ اِس کے باوجود وہاں کتنی ہی لغویاتیں ہو رہی ہیں۔ لیکن اُن میں لغو ترین بات یہ ہوئی کہ دہلی کے ممتاز اُردو ماہنامہ "بیسویں صدی" پر اور اُس کے ایڈیٹر شری خوشتر گرامی پر زیرِ دفعہ ۱۵۳۔ الف مقدمہ دائر کر دیا گیا۔ اِس دفعہ کے تحت اُن لوگوں پر مقدمہ چلایا جاتا ہے جن کے متعلق یہ الزام ہو کہ وہ مذہبی فرقوں کو آپس میں لڑانے اور اُن کے درمیان منافرت پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جس مضمون کی بِنا پر یہ مقدمہ چلانے کا نوٹس دیا گیا وہ "بیسویں صدی" میں آج سے تین برس پہلے شائع ہوا تھا اور اُس میں [illegible] سویم سیوک سنگھ پر اس لئے نکتہ چینی کی گئی تھی کہ یہ جماعت [illegible] اور فرقہ پرستی کی حامی ہے، مسلمانوں کی مخالف ہے اور ملک کے [illegible] جمہوریت کے لئے خطرہ ہے..... اِس مضمون میں [illegible] افسر صاحب یا افسران کو جنہوں نے یہ مقدمہ چلانے کا فیصلہ کیا [illegible]... یہ مقدمہ اب واپس ہو چکا ہے۔ یو۔پی [illegible] اس کے افسر یا افسران کوئی لغویات کر رہے [illegible] اس مقدمے کو واپس لے لینے سے یو۔پی سرکار کے اِن افسر صاحب یا افسران کے احمق پن کی تلافی نہیں ہوتی جنہوں نے شری خوشتر گرامی جیسے دیش بھگت اور اتحاد پرور پر مقدمہ چلانے کا فیصلہ کیا۔ اگر اُن میں شرافت ہے تو انہیں شری خوشتر گرامی سے اپنی لغویت کے لئے معافی بھی مانگنی چاہئے...

رنبیر (روزنامہ "ملاپ" نئی دِلّی)

"بیسویں صدی" کے ایڈیٹر جناب خوشتر گرامی کے خلاف ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لکھنؤ نے دفعہ ۱۵۳۔ الف کے تحت جو مقدمہ دائر کیا تھا اُسے حکومت کی مداخلت کے نتیجہ میں واپس لیا جا چکا ہے۔ اِس اقدام کے لئے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو کریڈٹ نہیں دیا جا سکتا۔ کریڈٹ ملنا چاہئے پردھان منتری مسز اندرا گاندھی، صدر کانگریس ڈاکٹر شنکر دیال شرما کو جنہوں نے اِس مقدمہ کی اطلاع ملتے ہی مداخلت کرنے کا یقین دلایا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لکھنؤ، جنابِ خوشتر گرامی کو اُن کی دیش بھگتی اور سیکولرزم پر اُن کی عقیدت اور فسطائیت ازم سے اُن کی نفرت کی بِنا پر انہیں مُلزموں کے کٹہرہ میں کھڑا ہونے کے لئے مجبور

کرنے پڑتے ہوتے تھے۔ مقدمہ تو واپس ہو گیا مگر اصولی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے فرائض میں کسی فسطائی جماعت کے لیڈر کے لئے کسی بے گناہ شہری کو مقدمہ میں پھانسنا بھی شامل ہے؟ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے نہ صرف راشٹریہ سنگھ کے گورو جی کا وقار قائم رکھنے کے لئے جناب خوشتر گرامی پر مقدمہ چلانے کا فیصلہ کر کے اپنے اختیار سے تجاوز کیا۔ بلکہ یہ الزام لگا کر سراسر لغو بیانی سے کام لیا کہ خوشتر صاحب نے ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی ہے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی یہ حرکت انتہائی قابلِ اعتراض ہے۔ انصاف، اخلاق اور ڈسپلن کا تقاضا ہے کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اپنی اس حرکت کے لئے نہ صرف ریاستی سرکار سے معافی مانگنے کے لئے مجبور کیا جائے بلکہ انھیں خوشتر صاحب پر سراسر جھوٹا مقدمہ دائر کرنے کی بنا پر اُن سے بھی معافی مانگنے کے لئے مجبور کیا جائے۔

جمنا داس اختر (روزنامہ سویرا، دہلی)

اور قابلِ گرفت فعل پر پردہ پڑ گیا۔۔ مقدمہ اگرچہ واپس لے لیا گیا ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اُس ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی گوشمالی کی جائے جس نے دفعہ ۱۵۳۔ الف کا استعمال آر۔ ایس۔ ایس کے دفاع کے لئے کیا تھا۔ اس سے پوچھا جائے کہ جب وہ حکومت کی پالیسیوں کا ذمہ دار نہیں ہے تو کیوں نہ اُس کو بیک بینی و دو گوش ملازمت سے خارج کر دیا جائے؟ دوسری طرف خوشتر صاحب کو اس مجسٹریٹ کے خلاف اہانت اور صدمہ پہنچانے کا مقدمہ دائر کرنا چاہئے، جس نے اُن پر فرقہ پرستی کا لیبل چسپاں کرنے اور اُن کی حب الوطنی اور قوم پرستی کو مجروح کر کے دلی صدمہ پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ بیچارے خوشتر صاحب کو اس بڑھاپے میں اپنی قوم پرستی کے لئے تامرپتر یا کوئی پدم بھوشن، پدم شری کا اعزاز تو کیا ملتا، اُلٹا فرقہ پرستی کا الزام لگا کر ایک معمولی مجسٹریٹ نے منہ چڑانے کی ضرور کوشش کی ہے۔

روزنامہ الجمعیۃ، دہلی

۔۔۔ لیکن اس سے بھی زیادہ شرمناک بات یہ ہے کہ دفعہ ۵۳، الف کا استعمال آر۔ ایس۔ ایس کے دفاع اور تحفظ کے لئے کیا جائے۔ "بیسویں صدی" کے مدیر محترم جناب خوشتر گرامی کے خلاف مقدمہ اسی ضمن میں قائم کیا گیا اور یہ قدم کسی جن سنگھی حکومت کے دور میں نہیں اٹھایا گیا بلکہ یو۔ پی کی موجودہ کانگریسی حکومت کے دور میں لکھنؤ کے ایک مجسٹریٹ نے اٹھایا۔۔ ہمیں افسوس یہ ہے کہ یہ مقدمہ چلنے سے پہلے ہی واپس لے لیا گیا اور اس طرح سے فرقہ پرستی اور سیکولرزم کے درمیان جو معرکہ ہندوستان کی ایک عدالت میں ہونے والا تھا وہ نہ ہو سکا۔ جہاں تک خوشتر گرامی صاحب کا تعلق ہے انھیں کسی صفائی کی ضرورت نہیں۔ اُن کے نظریات کا ترجمان اور اُن کے فکر و عمل کا آئینہ دار اُن کا گرانقدر صحیفہ "بیسویں صدی" ہے اور سبھی جانتے ہیں کہ وہ ہر قسم کی تنگ نظری اور ہر فرقہ کی فرقہ پرستی کے خلاف ہمیشہ شمشیر بکف رہتے ہیں۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ انھوں نے شاید فرقہ پرستی کے خلاف جہاد اور سیکولرزم کے استحکام کا حلف لے رکھا ہے۔ اس مقدمہ کی واپسی سے یہ نقصان بھی ہوا کہ لکھنؤ کے اس ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی اپنی فرقہ پرستی اور راشٹریہ سنگھی ذہنیت بے نقاب نہ ہو سکی اور اُس کے اس قابلِ نفرت نہیں قابلِ مذمت

یہ جان کر ایک عام آدمی سے لے کر وزیرِ اعظم تک سبھی کو حیرت ہوئی کہ خوشتر گرامی صاحب ایڈیٹر "بیسویں صدی" کے خلاف لکھنؤ کے ایک مجسٹریٹ نے دفعہ ۱۵۳۔ الف کے تحت آر۔ ایس۔ ایس کے بارے میں شائع شدہ ایک مضمون پر جو تین سال قبل "بیسویں صدی" میں شائع ہوا تھا مقدمہ قائم کیا ہے اور دعویٰ یہ ہے کہ انھوں نے اس مضمون کے ذریعے ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفرت پھیلانے اور اشتعال پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ــــــ خوشتر صاحب کی ذاتی زندگی اور نظریات سے جو لوگ واقف ہیں اور اُن کے مشہور رسالے "بیسویں صدی" کا جو لوگ مطالعہ کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اُن کے خیالات، نظریات و افکار بہت صاف اور ہزاروں نام نہاد کانگریسیوں سے زیادہ بہتر اور سیکولر ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ ہر قسم کی فرقہ پرستی کی مخالفت کی ہے اور اس کا قلع قمع کرنے میں مستعد رہتے ہیں اس لئے اُن پر نفرت پھیلانے اور اشتعال پیدا کرنے کا الزام یقیناً لغو، بیہودہ اور سراسر بہتان ہے۔ سب سے زیادہ حیرت اس پر ہے کہ یہ قدم آر۔ ایس۔ ایس اور اُس کے گرو کے دفاع میں اٹھایا گیا ہے۔ جبکہ اُس مضمون میں کوئی بھی بات ایسی نہیں کہی گئی جو اس سے پہلے اُس کے مخالفوں اور سیکولرزم کے علم برداروں کی جانب سے نہ کہی گئی ہو۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُس مجسٹریٹ کو آر۔ ایس۔ ایس

[illegible] ... میں کہ دکروں میں سنگھیں یا ظاہر سنگھی حکومت کا چندہ نہیں ہے ... کہ جیسی ایسی جماعت حکومت کا افسر ہے مگر کہ ... ایسی کے خلاف لکھنا بھی قابلِ تعزیر ہو سکتا ہے تو پھر ... کانگریس کی جانب سے اگر ایسی ایسی کی مذمت بھی قابلِ تعزیر قرار دی جائے گی۔ اس افسر نے اپنی راشٹریہ سنگھی ذہنیت کی بدولت اپنے صوبے کی کانگریس حکومت کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ لگایا ہے جس کو دھونا اور اس افسر کی فہمائش نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے ورنہ آئندہ بھی اس طرح کی حماقتیں رونما ہو سکتی ہیں۔

"ایشیا" ویکلی دلی

... مجاہدِ اتحاد خوشتر گرامی زندہ باد ... ہم "بیسویں صدی" کی اس کامیابی کو دیانتدارانہ صحافت اور سیکولرزم کی فتح سمجھتے ہیں جنابِ خوشتر گرامی ایڈیٹر "بیسویں صدی" کو دفعہ ۱۵۳-الف تعزیراتِ ہند کے تحت سمن جاری کرتے ہوئے شاید جاننے کی زحمت بھی گوارا نہ کی کہ خوشتر گرامی ہندو مسلم اتحاد اور سیکولرزم کے آسمان کا وہ درخشندہ ستارہ ہے جس کی رفعت سے آزادی کی تقدیر جگمگا اٹھی ہے "ملک و ملت" دل کی گہرائیوں سے "بیسویں صدی" اور جنابِ خوشتر گرامی کو اس عظیم کامیابی پر ہدیۂ مبارکباد پیش کرتا ہے۔

روزنامہ "ملک و ملت" دلی

... یو۔پی میں ہمارے معزز دوست اور ممتاز اخبار نویس جنابِ خوشتر گرامی کو بھی اسی شکنجے میں کسنے کی کوشش کی گئی۔ ان کے خلاف جس بہانے پر دفعہ ۱۵۳ الف کے تحت مقدمہ قائم کیا گیا ہے اس میں انھوں نے نہایت جرأت و مردانگی کے ساتھ فرقہ پرستوں اور جن سنگھیوں کو ننگا کیا تھا کہ وہ اپنی فرقہ پرستی کے ذریعہ ملک سے ناانصافی اور غداری کرتے ہیں ... شری خوشتر گرامی جیسے محب الوطن، نیک سیرت بہادر اور باشعور اخبار نویس کی تحریرات کے خلاف دفعہ ۱۵۳-الف کا استعمال حکومتِ یو۔پی کی بزدلی اور کم ظرفی قرار دینی چاہیے اور اس کے لئے جتنا بھی پروٹسٹ کیا جائے واجب ہے۔

"شیرِ پنجاب" دلی

... اُسے اس پر پشیمان ہونا پڑا۔ حکومت یو۔پی کو مسٹر خوشتر گرامی کے خلاف مقدمہ واپس لینا پڑا ... لیکن صرف مقدمہ کی واپسی ہی کافی نہیں ہے۔ حکومت یو۔پی کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ مسٹر خوشتر گرامی سے معافی مانگے اور باقاعدہ اپنا توبہ نامہ داخل کرے۔

"شکایت" دلی

... خوشتر گرامی کے خلاف ہندو آزاری کا الزام سیکولر فرقہ پرستی کی ایک دلچسپ مثال ہے ... ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لکھنؤ کو اس قدم پر پدم وبھوشن ملنا چاہیے ...

"آئینہ" سری نگر

دلّی کو بہتر اور خوب صورت بنانے کیلئے

آیئے

عہد کریں

★ بجلی کی موجودہ کمی کے پیشِ نظر میں انفرادی طور پر اپنے بس بھر بجلی کے خرچ میں کفایت کروں گا اور اس بات کی کارگر کوشش کروں گا کہ جن تنظیموں سے میں منسلک ہوں وہ بھی بجلی کے استعمال میں کفایت کریں گی۔

★ میں انفرادی طور سے اور جن انجمنوں سے متعلق ہوں انکے ذریعہ اناج کی کمی اور پارٹیوں اور سماجی تقریبات میں اشیائے خوراک کو برباد ہونے سے بچانے کی کوشش کروں گا۔

میں خود اور مجھ سے منسلکہ اداروں تنظیموں کے ذریعہ بلا وجہ بڑھتی ہوئی قیمتوں اور تجارت میں ذخیرہ اندوزی مہنگائی اور منافع خوری کو ختم کرنے کے لئے کارگر قدم اُٹھاؤں گا۔

★ میں حتی الامکان تشدد، فرقہ واریت اور سماج کے ناپسندیدہ عناصر کے ذریعہ پبلک املاک کو تباہی سے نجات دلانے کی کوشش کروں گا۔

★ مجھ سے منسلک اداروں وتنظیموں کے ذریعہ غریبی مٹانے، ذات پات کے فرق کو مٹانے، سماجی، اقتصادی نابرابری دور کرنے کی اسکیموں کی تئیں جذبہ پیدا کرنے اور انھیں عملی جامہ پہنانے کی پوری پوری کوشش کروں گا

★ میں دلّی شہر کو سماجی، اقتصادی اور خوشگوار ماحول کے پیشِ نظر اسے بہتر بنانے کی کوششوں میں اپنا بھرپور تعاون دوں گا۔

صنعت، تجارت، سوشل ورک تعلیم اور محنت اور دیگر اہم شعبوں سے متعلقہ سبھی اشخاص اور تنظیموں اور انجمنوں سے اپیل ہے کہ وہ اپنے مادرِ وطن کی راجدھانی کی عظمت وشوکت صحت مند سماجی فلاح اور خوشگوار ماحول پیدا کرنے کے لئے مندرجہ بالا حلف اٹھائیں۔

مثالی اور نمونہ کی راجدھانی بنانے میں آپ ہمیں اپنا تعاون دیں

دلّی انتظامیہ دِلّی

صحت و زندگی

۱۔ دماغی کام کرنے والوں کے لئے

دماغی کام کرنے والوں کے لئے بہترین تفریحی مشاغل سیر و تفریح، باغبانی، سیاحت، مچھلی کا شکار اور کھلے میدان میں چہل قدمی ہیں۔

جو لوگ بہت زیادہ دماغی کاموں میں مصروف رہتے ہیں ان کے لئے زیادہ دیر تک سونا مفید ہے۔

بیشتر دماغی کام کرنے والے نشہ آور چیزوں کے استعمال کے عادی ہوتے ہیں۔ انھیں یاد رکھنا چاہئے کہ نشہ آور چیزوں کا استعمال جسم کی مزاحمت کی قوت کو کم کر دیتا ہے اور بہت سی بیماریوں کا سبب بن جاتا ہے۔ پان میں تمباکو کھانا اور سگریٹ پینا بھی مضرت رساں ہے۔

زیادہ محنت کا دماغی کام کرنے سے دورانِ خون تیز ہو جاتا ہے اور اس طرح دوسرے اعضائے رئیسہ کو مناسب مقدار میں خون نہیں پہنچتا۔ دماغی محنت سے پیدا ہونے والی کمزوری اور دوسرے عوارض سے بچنے کے لئے مشہور امریکی ڈاکٹر کیلاگ نے یہ ہدایات لکھی ہیں۔

- کوئی دماغی کام خصوصاً لکھنے پڑھنے کا کام لیٹ کر نہ کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ اس سے دماغ پر زیادہ بار پڑنے سے دماغ کمزور ہو جاتا ہے اور بینائی پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔
- دماغی کام کھلی روشن اور ہوادار جگہ پر بیٹھ کر کرنا چاہئے۔
- ہمیشہ لمبی سانس لینی چاہئے۔ خصوصاً دماغی کام کرنے کے بعد کچھ دیر تک مسلسل لمبی سانسیں لینی چاہئیں تاکہ آکسیجن زیادہ مقدار میں اندر پہنچ جائے اور خون صاف ہو جائے۔
- سبزے پر نگاہ ڈالنے سے دماغ کو فرحت حاصل ہوتی ہے۔

اس لئے دماغی کام کرنے والوں کے لئے باغ کی سیر نہایت مفید ہے۔

- کچھ دیر تک دماغی کام کرنے کے بعد آسمان کی طرف دیکھنے سے سر کی طرف دورانِ خون کم ہوتا ہے اور آسمان کی نیلی روشنی آنکھوں کو ٹھنڈک اور دماغ کو تقویت پہنچاتی ہے۔
- دماغی کام کرنے کے بعد کھلی ہوا میں گہری سانس لینے سے تکان دور ہو جاتی ہے۔ چاند اور ستاروں کی چمک بھی دماغ کو فرحت بخشنے میں خاص اثر رکھتی ہے۔
- دماغی محنت سے تھکنے کے بعد کھلی ہوا میں سر کو دونوں ہاتھوں سے آہستہ آہستہ ملنے سے تکان کم ہو جاتی ہے۔

۲۔ موسم گرما کے لئے مفید مشورے

موسم گرما میں ہوا میں خشک زہریلی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ دھوپ میں چلتے ہوئے جب انسان گرم ہوا کی زد میں آتا ہے تو اکثر اسے لو لگ جاتی ہے۔ اکثر اوقات جسم میں پانی کی کمی سے بھی یہ مرض ہو جاتا ہے۔ اس مرض میں پہلے مریض کو دردِ سر کی تکلیف ہوتی ہے۔ پھر بخار ہو جاتا ہے۔ شدت کی پیاس محسوس ہوتی ہے۔ مریض بار بار پانی پیتا ہے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکتا ہے۔ اکثر مریضوں کو متلی اور قے ہونے لگتی ہے۔ بعض مریض مرض کی شدت سے بے ہوش بھی ہو جاتے ہیں۔

لو لگ جائے تو اس کا فوری علاج کرنا چاہئے۔ ہرگز غفلت نہ برتنی چاہئے۔ مریض کو ٹھنڈے ہوادار کمرے میں رکھیں۔ سر، گردن اور ریڑھ پر ٹھنڈا پانی ڈالیں۔ عرق کیوڑہ اور گلاب کو برف میں ٹھنڈا کر کے منہ پر چھینٹے ماریں۔ روغنِ گل ایک تولہ، عرقِ گلاب اور کیوڑہ پانچ تولے، سرکہ دو تولے کو برف سے ٹھنڈا کریں اور اس میں نرم کپڑے کی موٹی گدی بھگو کر سر اور

پیشانی پر رکھیں۔ پیاس کی شدت کو تسکین دینے کے لئے تربوز کے پانی میں عرق کیوڑہ اور عرق بید مشک ملاکر برف سے ٹھنڈا کر کے پلائیں۔ قے کی صورت میں مریض کو برف کے ٹکڑے چوسنے کے لئے دیں۔

لو کے مریض کے لئے سب سے موثر دوا کچا آم ہے۔ کچے آم کو چولہے کی گرم راکھ یا نرم آگ میں دبا دیں۔ کچھ دیر کے بعد نکال کر، اس کا چھلکا اتار کر گودا الگ کر دیں۔ اس گودے کو پانی میں حل کر لیں۔ اس میں برف اور چینی ملاکر پلائیں۔ غذا میں مونگ کی کھچڑی، ساگودانہ وغیرہ ہلکی، زود ہضم اور ٹھنڈی چیزیں دیں۔

موسم گرما اپنے شباب پر آجاتا ہے تو احتیاط نہ برتنے والے لو لگنے کے علاوہ اور کئی امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں —— صفراوی بخار، صفراوی قے، ہیضہ، پیچش، تپ محرقہ، بخار کی شدت بڑھ جائے تو سرسام کا بھی اندیشہ ہے۔

اس موسم میں ضروری احتیاط برتی جائے اور ان ہدایات پر عمل کیا جائے تو موسم کے مضر اثرات سے خود کو بہت حد تک بچایا جا سکتا ہے۔

- اس موسم میں نظام ہضم کمزور ہو جاتا ہے اس لئے زود ہضم اور ہلکی پھلکی غذائیں کھائیں۔
- جہاں تک ممکن ہو گرم غذاؤں سے پرہیز کریں۔ سبز ترکاریاں لوکی، توری، کدو، ٹنڈا، ککڑی، پالک، پرول کھائیں۔
- زیادہ گرم کھانا نہ کھائیں۔ گرم کھانا کھانے کے بعد زیادہ مقدار میں سرد پانی نہ پیئیں۔ کھانے کے ساتھ سرکہ، پیاز، پودینہ، آم یا املی کی چٹنی ضرور کھائیں۔
- برف زیادہ استعمال نہ کریں۔ اس کا بکثرت استعمال معدہ اور جگر کے لئے ضرر رساں ہے۔
- دھوپ میں پھرنے کے بعد فوراً پانی نہ پیئیں۔ بہت زیادہ پانی ایک ساتھ نہ پیئیں۔ یہ ضعف کا باعث ہوتا ہے۔

۳ —— درازیٔ عمر کا راز

کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صحت مند رہنے اور طویل عمر پانے کا بہترین ذریعہ آرام کرنا ہے۔ لیکن یہ غلط فہمی ہے۔

جارجیا کے پروفیسر گریگوری پشن خیلوری کہتے ہیں:
"فرانسیسی اخبار نویس گلبر بلانغ نے اپنی کتاب "ہم ۱۵۰ برس تک زندہ رہیں گے" کے لئے مواد جمع کرتے وقت مجھ سے پوچھا تھا کہ جارجیا میں لوگوں کی عمر زیادہ ہونے کا سبب کیا ہے؟ تو میں نے صرف ایک لفظ میں ان کے اس سوال کا یہ جواب دیا تھا —— کام؟ سائنٹفک تحقیق سے یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ کوئی کاہل آدمی طویل عمر نہیں پا سکتا۔ انہی لوگوں نے طویل عمر پائی جو ساری عمر کام کرتے رہے۔

بوڑھے آدمیوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ باقاعدہ کچھ ہلکی ورزش روزانہ کریں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ جوانوں کی طرح ڈنڑ پیلیں، مگدر پھیریں۔ انھیں چاہئے کہ کھلے میدانوں میں صبح و شام لمبی سیر کیا کریں۔

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے —— "حرکت زندگی ہے اور جمود موت۔ حرکت زندگی کا بنیادی اصول ہے۔"

طویل عمر تک پہنچنے کا اہتمام پچاس ساٹھ برس کی عمر ہو جانے کے بعد نہ ہونا چاہئے۔ بچے کی پیدائش ہی کے وقت سے اس کی فکر شروع ہو جانی چاہئے۔ مشاہدات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ ہر آدمی بڑھاپا آنے کی رفتار کو دھیمی کر کے اپنی زندگی میں کئی برسوں کا اضافہ کر سکتا ہے۔

۴ —— آپ ناکام کیوں ہوتے ہیں؟

کامیابی کا راز جاننا جتنا اہم ہے، ناکامی کا سبب جاننا اس سے کم اہم نہیں۔ بہت سے ایسے آدمی ہوتے ہیں جو بہت سی ڈگریاں حاصل کر لینے کے بعد بھی بیکار پھرتے ہیں۔ دفاتر میں ملازمت کی تلاش میں جاتے ہیں اور ٹکا سا جواب پاکر ناکام و نامراد لوٹ آتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ صرف اس لئے کہ وہ جہاں جاتے ہیں اپنے اندازِ گفتگو سے، اپنی چال ڈھال سے اپنی کمزوریوں کا اعتراف و اظہار کرتے ہوتے جاتے ہیں۔ وہ اس بات کا اعلان کرتے ہوئے جاتے ہیں کہ ہمیں اپنے اوپر اعتماد نہیں ہے۔ ان کے چہروں پر ناکامی کی پیشین گوئی جلی حرفوں میں لکھی ہوتی ہے۔ وہ اپنے خلاف

سہے جاتے ہیں کہ یار پہنچتے ہیں جب وہ کسی سے ملازمت کے
سوالی ہوتے ہیں اور وہ اُن کے طور و طریق میں یا اُن کے چہرے پر
صاف الفاظ میں یہ لکھا ہوا دیکھتا ہے — خدا کے لئے مجھے
ملازمت دے دو، میں پریشان حال ہوں، بدقسمت ہوں۔ کہیں
تم بھی مجھے اپنے در سے ناکام واپس نہ کر دینا، تو وہ اُس کی صورت
دیکھتے ہی اُس سے متنفر ہو جائے گا اور جلد سے جلد اُس سے پیچھا
چھڑانے کی کوشش کرے گا۔

ملازمت کی تلاش میں ہر جگہ سے ناکام و نامراد لوٹ آنے
والے نہیں جانتے کہ ملازمت اِس طرح نہیں ملتی۔ ملازمت کی
بھیک مانگنے سے اُن پر رحم کھا کر کوئی انھیں ملازمت نہ دے گا۔
ایک بھکاری کی طرح نہیں، ایک سائل کی طرح نہیں، وہ کسی دفتر میں
ایک فاتح، ایک کامیاب جنرل کی طرح داخل ہوں۔ خود اعتمادی کی
لہریں اُن کی ہر حرکت سے نکلتی ہوئی ہوں، اُن کے چہرے سے
یہ بات واضح ہو رہی ہو کہ یہ شخص چاق و چوبند ہے، جوشِ حیات
سے لبریز ہے، خوش طبع ہے، زندہ دل ہے۔ جوش و ولولے اور
سرگرمی سے کام کرنے کا عادی معلوم ہوتا ہے، تو پھر شاید ہی کسی
دفتر کا کوئی افسر ایسا ہو جسے اُس کی ضرورت نہ ہو۔

خیالات میں قوت ہوتی ہے۔ اگر آپ کو یقین ہے کہ آپ
کامیاب رہیں گے تو آپ کا یہ یقین ناسازگار حالات اور بے مہر
ماحول کو موافق اور سازگار حالات میں بدل دے گا اور آپ
یقیناً کامیاب ہوں گے۔

۵ — ایک غلط فہمی

ممتاز ماہرِ غذائیات لیلارڈ کارڈیل نے لکھا ہے —
"بہت سے تنومند لوگ خاص طور سے عورتیں اِس غلط فہمی میں
مبتلا ہوتے ہیں کہ ناشتہ ترک کر دینے سے اُن کے بدن کی
چربی کم ہو کر وزن گھٹ جائے گا۔ یہ بے بنیاد خیال اور غلط فہمی ہے۔"

ایک اور ماہرِ غذائیات ایڈا جین کین نے لکھا ہے — کیا آپ
سمجھتے ہیں کہ بدن کی چربی کم کرنے کے لئے یا تو پرہیزی غذا کھانی چاہئے یا
فاقے کرنے چاہئیں۔ یاد رکھئے کہ چربی صرف ضرورت سے زیادہ کھانے
سے جمع ہوتی ہے۔ اپنی غذا کی مقدار کم کر دیجئے اور کھانے کے بعد کوئی میٹھی
چیز کھانا ترک کر دیجئے۔ اِس سے بدن کی زائد چربی خود بخود کم ہو جائے گی۔
کسی میٹھی چیز کے بجائے تازہ پھل کھایئے۔ ثقیل اور مُرغن غذاؤں سے پرہیز کیجئے۔
زود ہضم ہلکی پھلکی، خوشگوار، متوازن غذائیں کھایئے اور بقدرِ ضرورت مقدار
میں کھایئے تو موٹاپا دُور کرنے کے لئے کسی خاص پرہیزی منصوبہ کی ضرورت
ہی نہ ہوگی۔ پرہیزی غذا نہ تو پسندیدہ ہوتی ہے اور نہ توانائی بخش۔ جلد ہی
آپ اُسے چھوڑ دیتے ہیں اور من مانی چیزیں کھانے لگتے ہیں، جس سے جسم کا
وزن پھر بڑھ جاتا ہے۔

۶ — انسان کی سب سے بڑی تمنّا

انسان کی تمناؤں اور حسرتوں کی انتہا نہیں ہے کسی نے کہا ہے —
ہزاروں حسرتیں ایسی کہ ہر حسرت پہ دم نکلے! لیکن انسان کی سب سے بڑی حسرت،
سب سے بڑی تمنّا مسرت حاصل کرنا ہے — مشہور مفکر بی۔ جی۔ ڈوکان نے
لکھا ہے — بنیادی طور پر ہم سب لوگ چاہے امیر ہوں چاہے غریب خوشی
ہی کے سہارے زندہ رہتے ہیں۔ خوشی ہماری سب سے بڑی تمنا ہے۔ انسان کی
ساری تگ و دو مسرت ہی حاصل کرنے، خوشی ہی پانے کے لئے ہوتی ہے۔

خوشی ہزاروں بھیس میں آپ کے سامنے آتی ہے۔ کبھی آپ جذبۂ ایثار
میں خوشی محسوس کرتے ہیں، کبھی سب کچھ لٹا کر بھی آپ کا دل مسرت سے
جھومتا ہے اور کبھی دولت ہاتھ لگنے پر بھی آپ کا دل مطمئن نہیں ہوتا۔ کبھی
آپ اِس خود غرضی میں بھی خوشی کا عنصر ڈھونڈ لیتے ہیں۔ انسان عجیب
مخلوق ہے۔ عجیب چیزوں سے جن پر خوشی کا گمان تک نہیں ہوتا اُن سے بھی
مسرت حاصل کر لیتا ہے۔

پیشانی پر رکھیں۔ پیاس کی شدت کو تسکین دینے کے لئے تربوز کے پانی میں عرق کیوڑہ اور عرق بید مُشک ملاکر برف سے ٹھنڈا کرکے پلائیں۔ قے کی صورت میں مریض کو برف کے ٹکڑے چوسنے کے لئے دیں۔

لُو کے مریض کے لئے سب سے موثر دوا کچا آم ہے۔ کچے آم کو چولہے کی گرم راکھ یا نرم آگ میں دبادیں۔ کچھ دیر کے بعد نکال کر اُس کا چھلکا اُتار کر گودا الگ کر دیں۔ اُس گودے کو پانی میں حل کرلیں۔ اُس میں برف اور چینی ملاکر پلائیں۔ غذا میں مونگ کی کھچڑی، ساگودانہ وغیرہ ہلکی، زود ہضم اور ٹھنڈی چیزیں دیں۔

موسم گرما اپنے شباب پر آجاتا ہے تو احتیاط نہ برتنے والے لُو لگنے کے علاوہ اور کئی امراض میں مُبتلا ہو جاتے ہیں ـــــ صفراوی بخار، صفراوی قے، ہیضہ، پیچش، تپ محرقہ، بخار کی شدت بڑھ جائے تو سرسام کا بھی اندیشہ ہے۔

اِس موسم میں ضروری احتیاط برتی جائے اور ان ہدایات پر عمل کیا جائے تو موسم کے مُضر اثرات سے خود کو بہت حد تک بچایا جاسکتا ہے۔

- اس موسم میں نظامِ ہضم کمزور ہو جاتا ہے اِس لئے زود ہضم اور ہلکی پھلکی غذائیں کھائیں۔
- جہاں تک ممکن ہو گرم غذاؤں سے پرہیز کریں۔ سبز ترکاریاں لَوکی، توری، کدو، ٹنڈا، ککڑی، پالک، پرول کھائیں۔
- زیادہ گرم کھانا نہ کھائیں۔ گرم کھانا کھانے کے بعد زیادہ مقدار میں سرد پانی نہ پیئیں۔ کھانے کے ساتھ سرکہ، پیاز، پودینہ، آم یا اِملی کی چٹنی ضرور کھائیں۔
- برف زیادہ استعمال نہ کریں۔ اِس کا بکثرت استعمال معدہ اور جگر کے لئے ضرر رساں ہے۔
- دُھوپ میں پھرنے کے بعد فوراً پانی نہ پیئیں۔ بہت زیادہ پانی ایک ساتھ نہ پیئیں۔ یہ ضعف کا باعث ہوتا ہے۔

۳ ـــ درازیٔ عمر کا راز

کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صحت مند رہنے اور طویل عمر پانے کا بہترین ذریعہ آرام کرنا ہے۔ لیکن یہ غلط فہمی ہے۔

جارجیا کے پروفیسر گریگوری پشی شیلاری کہتے ہیں "فرانسیسی اخبار نویس گلبر بلاغ نے اپنی کتاب 'ہم ۱۵۰ برس تک زندہ رہیں گے' کے لئے مواد جمع کرتے وقت مجھ سے پوچھا تھا کہ جارجیا میں لوگوں کی عمر زیادہ ہونے کا سبب کیا ہے؟ تو میں نے صرف ایک لفظ میں اُن کے اِس سوال کا یہ جواب دیا تھا ـــ کام۔" سائنٹفک تحقیق سے یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ کوئی کاہل آدمی طویل عمر نہیں پاسکتا۔ اُنہی لوگوں نے طویل عمر پائی جو ساری عمر کام کرتے رہے۔

بوڑھے آدمیوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ باقاعدہ کچھ ہلکی ورزش روزانہ کریں۔ اِس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ جوانوں کی طرح ڈنڑ پیلیں، مگدر پھیریں۔ اُنھیں چاہئے کہ کھلے میدانوں میں صُبح وشام لمبی سیر کیا کریں۔

مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ـــ "حرکت زندگی ہے اور جمود موت۔ حرکت زندگی کا بُنیادی اصول ہے۔"

طویل عمر تک پہنچنے کا اہتمام پچاس ساٹھ برس کی عمر ہو جانے کے بعد نہ ہونا چاہئے۔ بچے کی پیدائش ہی کے وقت سے اُس کی فکر شروع ہو جانی چاہئے۔ مشاہدات سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہے کہ ہر آدمی بڑھاپا آنے کی رفتار کو دھیمی کرکے اپنی زندگی میں کئی برسوں کا اضافہ کرسکتا ہے۔

۴ ـــ آپ ناکام کیوں ہوتے ہیں؟

کامیابی کا راز جاننا جتنا اہم ہے، ناکامی کا سبب جاننا اُس سے کم اہم نہیں۔ بہت سے ایسے آدمی ہوتے ہیں جو بہت سی ڈگریاں حاصل کرلینے کے بعد بھی بیکار پھرتے ہیں۔ دفاتر میں ملازمت کی تلاش میں جاتے ہیں اور ٹکا سا جواب پاکر ناکام و نامراد لوٹ آتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ صرف اِس لئے کہ وہ جہاں جاتے ہیں اپنے اندازِ گفتگو سے، اپنی چال ڈھال سے اپنی کمزوریوں کا اعتراف و اظہار کرتے ہوئے جاتے ہیں۔ وہ اِس بات کا اعلان کرتے ہوئے جاتے ہیں کہ ہمیں اپنے اُوپر اعتماد نہیں ہے۔ اُن کے چہرے پر ناکامی کی پیش گوئی جلی حرفوں میں لکھی ہوتی ہے، وہ اپنے خلاف

... ہیں۔ جب وہ کسی سے ملازمت کے ... سے اُن کے طور و طریقوں یا اُن کے چہرے پر مایوس نظر آتے ہیں یہ لکھا ہوا دکھتا ہے ــــ "خدا کے لئے مجھے ملازمت دے دو! میں پریشان حال ہوں، بدقسمت ہوں۔ کہیں تم بھی مجھے اپنے در سے ناکام واپس نہ کر دینا، تو وہ اُس کی صورت دیکھتے ہی اُس سے متنفر ہو جائے گا اور جلد سے جلد اُس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرے گا۔

ملازمت کی تلاش میں ہر جگہ سے ناکام و نامراد لوٹ آنے والے نہیں جانتے کہ ملازمت اِس طرح نہیں ملتی۔ ملازمت کی بھیک مانگنے سے اُن پر رحم کھا کر کوئی انہیں ملازمت نہ دے گا۔ ایک بھکاری کی طرح نہیں، ایک سائل کی طرح نہیں، وہ کسی دفتر میں ایک فاتح، ایک کامیاب جنرل کی طرح داخل ہوں۔ خود اعتمادی کی لہریں اُن کی ہر حرکت سے نکلتی ہوئی ہوں، اُن کے چہرے سے یہ بات واضح ہو رہی ہو کہ یہ شخص چاق و چوبند ہے، جوشِ حیات سے لبریز ہے، خوش طبع ہے، زندہ دل ہے، جوش و ولولے اور سرگرمی سے کام کرنے کا عادی معلوم ہوتا ہے، تو پھر شاید ہی کسی دفتر کا کوئی افسر ایسا ہو جسے اُس کی ضرورت نہ ہو۔

خیالات میں قوت ہوتی ہے۔ اگر آپ کو یقین ہے کہ آپ کامیاب رہیں گے تو آپ کا یہ یقین ناسازگار حالات اور بے مہر ماحول کو موافق اور سازگار حالات میں بدل دے گا اور آپ یقیناً کامیاب ہوں گے۔

۵ ــــ ایک غلط فہمی

ممتاز ماہرِ غذائیات لیلارڈ کار ڈیل نے لکھا ہے ــــ "بہت سے تنومند لوگ خاص طور سے عورتیں اِس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ناشتہ ترک کر دینے سے اُن کے بدن کی چربی کم ہو کر وزن گھٹ جائے گا یہ بےبنیاد خیال اور غلط فہمی ہے۔"

ایک اور ماہرِ غذائیات ایڈ ابین کین نے لکھا ہے ــــ "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بدن کی چربی کم کرنے کے لئے یا تو پرہیزی غذا کھانی چاہئے یا فاقے کرنے چاہئیں۔ یاد رکھئے کہ چربی صرف ضرورت سے زیادہ کھانے سے جمع ہوتی ہے۔ اپنی غذا کی مقدار کم کیجئے اور کھانے کے بعد کوئی میٹھی چیز کھانا ترک کر دیجئے۔ اِس سے بدن کی زائد چربی خود بخود کم ہو جائے گی۔ کسی میٹھی چیز کے بجائے تازہ پھل کھائیے۔ ثقیل اور مرغن غذاؤں سے پرہیز کیجئے۔ زود ہضم، ہلکی پھلکی، خوشگوار، متوازن غذائیں کھائیے اور بقدرِ ضرورت مقدار میں کھائیے تو موٹاپا دور کرنے کے لئے کسی خاص پرہیزی منصوبے کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ پرہیزی غذا نہ تو پسندیدہ ہوتی ہے اور نہ توانائی بخش۔ جلد ہی آپ اُسے چھوڑ دیتے ہیں اور من مانی چیزیں کھانے لگتے ہیں، جس سے جسم کا وزن پھر بڑھ جاتا ہے۔

۶ ــــ انسان کی سب سے بڑی تمنا

انسان کی تمناؤں اور حسرتوں کی انتہا نہیں ہے کسی نے کہا ہے ــــ

ہزاروں حسرتیں ایسی کہ ہر حسرت پہ دم نکلے لیکن انسان کی سب سے بڑی حسرت، سب سے بڑی تمنا مسرت حاصل کرنا ہے ــــ مشہور مفکر سی۔ جی۔ ڈوکان نے لکھا ہے ــــ "بنیادی طور پر ہم سب لوگ چاہے امیر ہوں، چاہے غریب خوشی ہی کے سہارے زندہ رہتے ہیں۔ خوشی ہماری سب سے بڑی تمنا ہے۔ انسان کی ساری تگ و دو مسرت ہی حاصل کرنے، خوشی ہی پانے کے لئے ہوتی ہے۔

خوشی ہزاروں بھیس میں آپ کے سامنے آتی ہے۔ کبھی آپ جذبۂ ایثار میں خوشی محسوس کرتے ہیں، کبھی سب کچھ لٹا کر بھی آپ کا دل مسرت سے جھومتا ہے اور کبھی دولت ہاتھ لگنے پر بھی آپ کا دل مطمئن نہیں ہوتا۔ کبھی آپ اِس خود غرضی میں بھی خوشی کا عنصر ڈھونڈ لیتے ہیں۔ انسان عجیب مخلوق ہے۔ عجیب چیزوں سے جن پر خوشی کا گمان تک نہیں ہوتا اُن سے بھی مسرت حاصل کر لیتا ہے۔

سرگوشیاں

اس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ بیسویں صدی کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے۔ (ایڈیٹر بیسویں صدی، دہلی)

فاروق علی ذاکر۔ کریم نگر۔ دکن

س۔ ککڑی کا موسم آگیا۔ اس کے بارے میں کچھ بتایئے۔

ج۔ ککڑی پوٹاشیم کا خزانہ ہے۔ اس میں تقریباً ۲۲ فیصد پوٹاشیم ہوتا ہے جو خون کے سرخ ذرات کی تعمیر میں بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ککڑی میں سوڈیم، کیلشیم، فاسفورس، گندھک، میگنیشیم، کلورین اور تھوڑی مقدار میں فولاد اور وافر مقدار میں وٹامن 'بی' اور 'سی' بھی پائے جاتے ہیں۔ ککڑی میں جمادی نمکیات کی مقدار بھی خاصی ہوتی ہے۔

ایم شرف الدین گیہواں۔ پورنیہ

س۔ آدمی دوسروں کی نظر میں کب اچھا ہوتا ہے؟

ج۔ جب دوسروں کی برائی کو نظر انداز کر کے انھیں اچھا کہتا ہے۔

س۔ آج کل لوگ دوسروں کی برائی تلاش کرتے ہیں، اپنی برائی کیوں نہیں دیکھتے؟

ج۔ آج ہی کل نہیں، ہر زمانہ میں، ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے، ہمیشہ یہی ہوتا رہے گا۔

س۔ شادی دولت دیکھ کر کرنی چاہئے یا خاندانی شرافت دیکھ کر؟

ج۔ خاندانی شرافت دیکھ کر۔

ظہیر رحمت۔ کریم نگر۔ دکن

س۔ انسان کو دلی مسرت کب حاصل ہوتی ہے؟

ج۔ دوسروں کو خوشی دے کر!

س۔ بزرگانِ دین اور دانشوروں کے ایسے اقوال بیان کیجئے جن پر عمل کر کے انسان کامیاب اور نیک نام زندگی گزارے؟

ج۔ • برائی کا جواب بھلائی سے دو۔ نیکی کی قوت سے بدی پر غلبہ حاصل کرو۔

• بھلائی اور عافیت اسی میں ہے کہ دنیا سے بقدرِ ضرورت تعلق رکھا جائے۔

• دوسروں کی عیب جوئی کے بجائے اپنی کمزوری پر نظر رکھو۔

• یہ یاد رکھو ہر کام کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ جس نے اس مقصد کو پالیا کامیاب ہو گیا۔

مبین انصاری۔ بنگلور

س۔ کوئی حق بات کہے تو لوگ برا کیوں مانتے ہیں؟

ج۔ اس لئے کہ حق بات تلخ ہوتی ہے۔ عربی زبان کا ایک قول ہے "الحق مرّ"

س۔ کردار بنانے میں مذہب کا دخل ہے کہ نہیں؟

ج۔ کردار بنانے میں مذہب بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔

[illegible] بنیو گنگائی

س۔ زندگی کا اصل کرن کون سا ہے؟
ج۔ جو انسانیت کی خدمت اور حق و صداقت کی حمایت میں گزرے۔

س۔ انسانی زندگی کا خوبصورت موڑ کون سا ہے؟
ج۔ جو برائی سے بھلائی کی طرف لے جائے۔

س۔ کامیاب اور پُرمسرت زندگی کا راز؟
ج۔ جن لوگوں کی زندگی کامیاب اور پُرمسرت ہے ان کے نقشِ قدم پر چلنا۔

محفوظ عالم ماہر گسترہ۔ پورنیہ

س۔ شرم آنکھوں میں ہوتی ہے تو عورت آنکھ بند کر لیتی ہے لیکن پھر گھونگھٹ کیوں نکال لیتی ہے؟
ج۔ شرم کو دو آتشہ بنانے کے لئے!

س۔ نادان دوست سے دانا دشمن کیوں بہتر ہے؟
ج۔ اِس لئے کہ نادان دوست اپنی نادانی سے کبھی ایسی بات کر گزرتا ہے جو دشمن کی دشمنی سے بھی زیادہ نقصان دِہ ہوتی ہے۔

س۔ مطلب پرست آدمیوں سے کِس طرح کا تعلق رکھا جائے؟
ج۔ اگر مجبوری نہ ہو تو مطلب پرست آدمی سے کوئی تعلق نہ رکھنا چاہئے۔

ایم۔ ای۔ ایچ۔ ماطلعت۔ کھریال بی پور

س۔ میں آئی۔ اے کا طالب علم ہوں۔ میں سیاست سے تعلق رکھوں یا لائبریری سے؟
ج۔ لائبریری سے۔

س۔ ہر روز صبح دو چار چھوہارا یا کھجور کھانا کیسا رہے گا؟
ج۔ بے حد فائدہ بخش ہوگا۔ رات کے وقت دو تین چھوہارے دودھ میں بھگو دیں۔ صبح دودھ کو ہلکا جوش دے کر چھوہارے کھالیں اور دودھ پی جائیں۔ اِس طرح اور بھی فائدہ بخش ہوگا۔

س۔ حافظہ اور دماغ کو قوت دینے والی کوئی غذا بتائیں۔
ج۔ مغز بادام ۷ عدد، تخم خشخاش سفید ۳ ماشہ، الائچی خورد ایک ماشہ۔ تینوں چیزیں سِل پر باریک پیس لینے کے بعد تازہ مکھن ۵ تولہ مِلا کر چینی یا مِصری سے میٹھا کر کے ہر روز صبح کے وقت کچھ کھانے سے پہلے کھا لیا کیجئے۔ یہ مقوّیٔ دماغ دوا بھی ہے، لذیذ ناشتہ بھی۔

ذ۔ م۔ اندور

س۔ محبت اور ہوس میں فرق بتائیں؟
ج۔ بھائی جان! اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا! ـــــ زندگی صرف محبت ہی نہیں ہے اے دوست!

س۔ زندگی کو قابلِ رشک زندگی کیسے بنایا جائے؟
ج۔ جن لوگوں کی زندگیاں قابلِ رشک ہیں اُن کے نقشِ قدم پر چل کر۔

س۔ انجان خوف کو کِس طرح دُور کیا جائے؟
ج۔ یہ یقین کر کے کہ انجان خوف کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

کمال احمد ڈیسر گڑھ۔ بردوان

س۔ مرنے کی دعا کب مانگی جاتی ہے؟
ج۔ جب آنکھیں زندگی کا حُسن دیکھنے سے محروم ہو جاتی ہیں۔

س۔ چاندنی راتیں اچھی ہوتی ہیں یا اندھیری؟
ج۔ یہ اپنے اپنے ذوق کی بات ہے۔ کچھ لوگوں کی نظروں میں چاندنی راتیں اچھی ہوتی ہیں۔ کچھ لوگوں کی نظروں میں اندھیری راتیں۔

محمد احمد علی روشن۔ نلگنڈہ۔ دکن

س۔ بیکاری سے چولی دامن کا رشتہ رکھنے والے مُلکوں میں ہندوستان کا کونسا نمبر ہے؟
ج۔ پہلا!

س۔ ہمارے مُلک میں جہاں اُردو پیدا ہوئی، پروان چڑھی، اُردو کے زوال کے کیا اسباب ہیں؟
ج۔ اُردو دُشمن اربابِ وطن کا تعصّب و تنگدلی، حکومت کی مصلحت اندیشی!

جمیل انور۔ علی گڑھ

س۔ یہ شعر کِس کا ہے ؎

بے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں

ج۔ یہ شعر حالی کا ہے۔

پیاری سلطانہ۔ وجے واڑہ گنٹور

س۔ بھائی جان! مولی، گاجر اور ٹماٹر ان تینوں میں کون سبزی زیادہ فائدہ بخش ہے؟

ج۔ یہ تینوں سبزیاں بے حد مفید ہیں۔ مولی اتنی فائدہ بخش ہے کہ پیٹنٹ دواؤں کی بڑی بڑی شیشیاں اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ گاجر وٹامنز کا بہترین ذخیرہ ہیں۔ اس میں وٹامن اے، بی، سی، فولاد، فاسفورس، چونا، نشاستہ اور شکر وغیرہ اجزاء ہوتے ہیں۔

ٹماٹر سبز ترکاریوں میں سب سے زیادہ صحت پرور اور مفید ہے۔ مغربی ڈاکٹر ٹماٹر کو سیب کا بدل کہتے ہیں۔

اجیت کور۔ بھٹنڈہ

س۔ حال میں ہونے والے بنگلہ دیش کے الیکشن میں کتنی عورتیں کامیاب ہوئیں؟

ج۔ عورتوں کے لئے ۱۵ نشستیں تھیں۔ اُن ۱۵ نشستوں کے لئے عوامی لیگ کی اُمیدوار ۱۵ عورتیں بلامقابلہ منتخب ہوئیں۔

س۔ بنگلہ دیش کے بدیش منتری کا کیا نام ہے؟

ج۔ ڈاکٹر کمال حسین۔

چودھری علی اصغر۔ گیا

س۔ اس دُنیا میں سب سے اچھا ساتھی کون ہو سکتا ہے؟

ج۔ جو بُرے وقت میں کام آئے۔

بھگوت دیال ترپاٹھی۔ دہلی

س۔ دُنیا کی آبادی کتنی ہے؟

ج۔ تین ارب ۵۰ کروڑ۔

درشن سنگھ۔ انبالہ

س۔ انڈونیشیا اور ملائیشیا کہاں ہیں؟

ج۔ جنوب مشرقی ایشیا میں۔

سید فداء الحق رازؔ۔ دربھنگہ

س۔ عرب کا مستقبل؟

ج۔ عرب ممالک کے عزم و حوصلہ پر موقوف ہے۔ وہ متحد ہو جائیں تو عرب کا مستقبل روشن ہے۔ متحد نہ ہو جائیں گے تو تاریک ہو جائے گا۔

اُردو کی مزاحیہ شاعری مرتبہ جناب عرشؔ ملسیانی۔ میرؔ سے لے کر دورِ حاضر تک کے مزاحیہ اور طنزیہ کلام کا بے نظیر انتخاب۔ اس قسم کی کوئی کتاب اُردو ادب میں موجود نہیں۔ پڑھئے اور لُطف اُٹھائیے۔ پُرانے شعراء کے ساتھ ساتھ سید محمد جعفری، مجید لاہوری، راجہ مہدی علی خاں، دلاور فگار، واہی، شاد عارفی اور بیسیوں شعراء کا کلام اس میں درج ہے۔ اعلیٰ و ارفع مزاح۔ ابتذال نام کو نہیں۔ مبسوط مقدمہ۔ کتاب نہایت دلچسپ بھی ہے اور تاریخی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ اُردو ادب میں اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔ قیمت محض آٹھ روپے۔ محصول ڈاک علاوہ۔

ساحرؔ ہوشیار پوری کا نغمہ ریز مجموعۂ کلام

سحرِ نغمہ سالِ رواں کی حسین و جمیل ادبی تخلیق جس کا اجراء جشنِ ساحرؔ ہوشیار پوری کے موقع پر ۱۵ اگست ۷۰ء کو اُردو کے عظیم ادیب و ماہرِ غالبیات جناب مالک رام صاحب نے کیا۔ وجد آور دکیف آفریں نظمیں، غزلیں، قطعات، رُباعیات۔ عمدہ کتابت، خوبصورت طباعت، سہ رنگا دلآویز گرد پوش۔ دبیز آرٹ پیپر پر مصنف کی متعدد تصاویر سے مزین۔ مجلّد۔ اس کے بغیر آپ کی لائبریری مکمل نہیں۔ قیمت دس روپے۔

سنگھار کمرے میں پروفیسر کرشنا کماری ایم۔ اے کے بہترین دلچسپ جذبات آفریں افسانوں کے اس مجموعے کے ہر صفحے پر مستیوں کا ایک طوفان اور جذبات کا ایک محشر انگڑائیاں لے رہا ہے۔ اس میں آرزو کے پُرکیف گیت بھی ہیں، آہوں کا دُھواں بھی اور چھلکتے ہوئے آنسوؤں کی نمی بھی۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

گرمیٔ اندیشہ جناب مغیر احمد صوفی کا دوسرا مجموعۂ کلام۔ ان کی شاعری احساس کی شاعری ہے۔ احساس جو لطیف بھی ہے اور شدید بھی۔ صوفی صاحب نے اپنے ذہنی سفر میں جو کچھ محسوس کیا، شعر کے خوبصورت ساز میں ڈھال دیا۔ صوفی صاحب کی شاعری یقیناً فکر و خیال اور اسلوب بیان دونوں اعتبار سے تازہ دم ہے۔ کتابت، طباعت اعلیٰ۔ خوبصورت جلد۔ قیمت پانچ روپے۔

نذرِ ابر اس کتاب میں حضرت مولانا ابرؔ احسنی کا فوٹو مع مکمل سوانح حیات، اُن کی سحر انگیز شاعری کا انتخاب اور اُن پر مضامین، چند شاگردوں کے کلام پر اصلاح نیز توجیہہ۔ تلامذہ کی دو دو غزلوں کے اشعار اور تصاویر شامل ہیں۔ عوام کی دلچسپی کے علاوہ یہ کتاب مبتدی اور فن سے کم آشنا شعراء کے لئے بیک وقت تفریح طبع اور رہنما کا کام دے گی۔ قیمت فی جلد دس روپے۔

قیصر رضوان۔ دریاپور۔ پٹنہ

س۔ شباب خود شراب ہے پھر بھی لوگ شباب میں شراب کیوں پیتے ہیں؟

ج۔ شباب کے نشہ کو دو آتشہ بنانے کے لئے۔

س۔ فراق گورکھپوری کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ حیات بیداریِ مسلسل تھا اک خواب جو نہ ٹوٹے
نشاط کی غفلتوں سے بہتر وہ غم جو انسان کو جگائے

پرنس امتیاز خاں۔ دھنباد

س۔ گہری دوستی دشمنی کا باعث کب ہو جاتی ہے؟

ج۔ جب دوستی میں خلوص کی بجائے خود غرضی شامل ہو جاتی ہے۔

س۔ خدا نے مرد کو ہر طرح سے عورت کے مقابلہ میں برتر کیوں بنایا ہے؟

ج۔ خدا نے مرد کو عورت سے برتر بنایا ہے اور ہمسر بھی بنایا ہے — قرآن پاک میں خدا نے عورت اور مرد کو ایک دوسرے کا لباس فرمایا ہے۔

س۔ غم غلط کرنے کی اچھی اور آسان تر تدبیر کیا ہے؟

ج۔ غم کو خوشی بنا لے — اس حقیقت پر یقین کرے ؎
خدا کی دین ہے جس کو نصیب ہو جائے
ہر ایک دل کو غمِ جاوداں نہیں ملتا
غم نہ ہو تو حیات کچھ بھی نہیں!

ہدایت علی ساحل۔ جھری تلیا

س۔ اردو ادب میں عورت کا مقام؟

ج۔ بہت بلند ہے۔ علامہ اقبال نے فرمایا ہے — وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ!

س۔ دنیا میں کتنے مذاہب ہیں؟

ج۔ دنیا کے مشہور مذاہب یہ ہیں — عیسائی، اسلام، یہودی، ہندو، بدھ، جین، آتش پرست۔

س۔ زندگی بوجھ کب بن جاتی ہے؟

ج۔ جب انسان اسے بوجھ بنا لیتا ہے۔

مس یاسمین۔ بحرین

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں یہ خوبصورت قطعہ کس کے حسین تخیل کا مرہونِ منت ہے؟
ہر کلی مستِ خواب ہو جاتی
پتی پتی گلاب ہو جاتی
تو نے ڈالیں نہ مے فشاں نظریں
ورنہ شبنم شراب ہو جاتی

ج۔ یہ قطعہ نریش کمار شاد کا ہے۔

س۔ کوئی ایسی کتاب ملنے کا پتہ بتائیے جس میں خوبصورت قطعات ہوں۔

ج۔ "بیسویں صدی" کے مکتبہ سے شاد کے قطعات کا مجموعہ "قاشیں" طلب فرمائیے، جس میں حسین قطعات ہیں اور حیات افروز بھی۔

س۔ علامہ اقبال بڑے شاعر تھے یا ٹیگور؟

ج۔ دونوں بڑے شاعر تھے۔ دونوں نازشِ مشرق تھے۔

نوشاد احمد۔ جونی بستی۔ بدنیرہ

س۔ کیا علامہ اقبال کو پیغمبرِ عصر کہا گیا ہے؟

ج۔ علامہ اقبال کو بہت کچھ کہا گیا، وہ بہت کچھ تھے۔ انھیں ترجمانِ حقیقت کہا گیا، شاعرِ مشرق کہا گیا، نازشِ مشرق کہا گیا۔ کسی نے پیغمبرِ عصر بھی کہا ہوگا۔

س۔ علامہ اقبال کا کوئی اچھا سا شعر سنائیے۔

ج۔ علامہ اقبال کے سارے اشعار اچھے ہیں۔ ایک شعر سنئے ؎
عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

سید ثروت حسین۔ سیتاپور

س۔ کوئی فنکار دولت سے محروم ہو تو؟

ج۔ دولت کی پرستار دنیا دولت سے محروم فنکار کے فن کو بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھتی۔

س۔ انسان کی عزت کس سے ہوتی ہے؟

ج۔ آج کی دنیا میں دولت کے پیمانے سے عزت ناپی جاتی ہے۔

س۔ مجبوری انسان کو کیا سکھاتی ہے؟

ج۔ انسان خوددار ہو تو مجبوری میں بھی خودداری کا دامن نہیں چھوڑتا۔ خوددار نہ ہو تو سب کے سامنے اپنا دامن پھیلاتا ہے۔

اندرجیت سنگھ۔ لدھیانہ

س۔ کیا یہ سچ ہے کہ ہمارے دیش میں ایک کروڑ تیس لاکھ افراد دماغی مریض ہیں؟

ج۔ جی ہاں۔ صرف یو۔پی میں ایسے لوگوں کی تعداد دس لاکھ ۶۰ ہزار ہے۔

جاوید مسعود۔ جمشید پور

س۔ خوشی کب اچھی لگتی ہے؟

ج۔ آپ نے شاید یہ نہیں بتایا کہ اپنی خوشی یا پرائی خوشی؟ بہت کم لوگوں کو دوسروں کی خوشی اچھی لگتی ہے۔

س۔ غالب کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ سنئے ؎

مُنہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے مُنہ پر کھلا

نواب اصغر علی محمد علی۔ دھنباد

س۔ سچائی کب ننگی ہوتی ہے؟

ج۔ سچائی ننگی نہیں ہوتی، نمایاں ہوتی ہے۔ جب کسی حق پرست کی زبان باطل کے مقابلہ میں شعلہ بار و شرر فشاں ہوتی ہے۔

س۔ قانون کب حیران و ششدر ہوتا ہے؟

ج۔ جب قانون کا محافظ ہی ذاتی مفاد کے لئے قانون کو رُسوا کر دیتا ہے۔

ایم۔ جے۔ احمد بھٹکلی۔ گنتور

س۔ مَردوں کی دُنیا ہے، مَردوں کا زمانہ ہے۔ پھر بھی ہندوستان جیسے بڑے ملک میں عورت کا راج کیوں ہے؟

ج۔ یہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ مرد غلط کہتے ہیں کہ عورت ناقص العقل ہے۔ قدرت نے عورت کو ناقص العقل اور مرد سے کمتر نہیں بنایا ہے۔

سیف الدین انصاری . . .

س۔ ایس۔ ایس۔ سی کے طالب علم کو کون سا کام سیکھنا چاہیئے؟

ج۔ جو اُس کے ذوق و مزاج کے موافق ہو۔

س۔ میں خواب میں اپنے آپ کو بلندی پر پاتا ہوں۔ کیا میں بلندی پر پہنچ جاؤں گا؟

ج۔ صرف بلندی پر پہنچنے کا خواب دیکھنے سے کوئی بلندی پر نہیں پہنچ سکتا۔ خواب کو حقیقت بنانے کے لئے جدّوجہد کرنے سے خواب حقیقت بنتے ہیں۔

محمد شعیب عالم۔ گیا

س۔ سائیکل کس نے اور کب ایجاد کی؟

ج۔ ۱۸۴۰ء میں اسکاٹ لینڈ کے میکملن نے ایجاد کی۔

س۔ مولی کے کیا کیا فوائد ہیں؟

ج۔ مولی یرقان، درد گردہ و مثانہ کی پتھری، بواسیر، معدہ کی کمزوری میں بہت مفید ہے۔ زیادہ گوشت کھانے سے گردے اور مثانے پر یکایک بوجھ بڑھ رہا ہو تو مولی کا استعمال نہایت مفید ہے۔ مولی کھانے سے چہرے کی رنگت نکھرتی ہے۔

تنویر حسین۔ لال کنواں، لکھنؤ

س۔ حکومت بہت ساری اصلاحات کر رہی ہے کیا آپ بتا سکتے ہیں لکھنؤ کی گندی بستیوں کی اصلاح کے لئے حکومت کیا کرے گی؟

ج۔ لکھنؤ اور کانپور کی گندی بستیوں کی صفائی کی اسکیموں کو عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ لکھنؤ میں اس اسکیم پر ایک کروڑ اور کانپور میں گندی بستیوں کی صفائی پر ایک کروڑ ۳۶ لاکھ روپیہ صرف کیا جائے گا۔

ڈکشنریاں، صنعت وحرفت، کشیدہ کاری اور خانہ داری کی بہترین کتابیں

کشیدہ کاریاں و ڈکشنریاں

بیسویں صدی کشیدہ کاری کرشنا کماری ایم۔ اے	۴/-
چمپا کشیدہ کاری	۵/-
پیو کشیدہ کاری البم	۹/-
سنگھار کڑھائی کلا	۹/-
ونود جھنی ، ،	۷/۵۰
کشمی کشیدہ کاری	۲/۵۰
رانی کشیدہ کاری	۶/-
سرلا بھارتی کشیدہ کاری	۷/-
دسوتی کشیدہ کاری	۳/-
کامیاب درزی خانہ	۲/۵۰
زینت کروشیا ڈیزائن بک	۵/-
قدسیہ کشیدہ کاری	۱/۵۰
حسین کشیدہ کاری	۳/-

ڈکشنریاں

مصباح اللغات	عربی۔ اُردو	۲۸/-
لغات کشوری	فارسی۔ اُردو	۱۸/-
اُردو عربی لغت	اُردو	۱۲/-
فرہنگ عامرہ	،	۷/۵۰
نقاد اللغات	،	۸/۵۰
کریم اللغات	مولوی کریم الدین	۲/۵۰
انگلش اُردو ڈکشنری	عبدالحق	۱۵/-
، ،	سنت سنگھ	۱۲/-
اُردو انگلش	، ،	۱۱/-
اُردو ہندی ،	فیاض احمد	۳/۵۰
جیمز آکسفورڈ ڈکشنری	انگلش اُردو	۴/۵۰

صنعت وحرفت

الیکٹرک انجینئرنگ بک	۱۸/-
الیکٹرک گائیڈ	۱۲/-
الیکٹرک وائرنگ	۶/-
موٹر کار وائرنگ	۶/-
بوٹ پالش سازی	۴/۵۰
الیکٹرک فٹنگ	۸/۲۵
بغیر بجلی کا ریڈیو	۱/۵۰
تجارتی مرغی خانہ	۴/۵۰
آئل و گیس انجن گائیڈ	۱۵/-
آئل انجن گائیڈ	۸/۲۵
درزی ماسٹر	۵/-
وائرلیس ریڈیو گائیڈ	۸/۲۵
ریڈیو سروسنگ (ریڈیو مکینک)	۱۰/۵۰
ٹانکا لگانے کا ہنر	۴/۵۰
چھوٹے ڈائنمو و الیکٹرک موٹر بنانا	۶/-
پریکٹیکل آرمیچر وائرنگ	۱۰/۵۰
ریفریجریٹر گائیڈ	۱۲/-
ٹرانسفارمر گائیڈ	۸/۲۵
الیکٹرک موٹرز	۱۲/-
خراد شکشا یعنی ٹرنر گائیڈ	۶/-
ورکشاپ گائیڈ	۶/-
خراد اور ورکشاپ گیان	۱۲/-
پریکٹیکل گھڑی سازی	۴/۵۰
سائیکل ریپئرنگ	۴/۵۰
ڈیری فارمنگ	۴/۵۰

صنعت وحرفت وخانہ داری

موم بتی کاروبار	۴/۵۰
کاروبار بڑھانے کی ترکیبیں	۴/۵۰
انڈو یورپین کُکری جس میں دیسی انگریزی کھانے	۶/-
تمباکو کا کاروبار	۴/۵
پان کی دُکان	۴/۵۰
حلوائی ماسٹر	۴/۵۰
اسمال اسکیل انڈسٹری	۱۸/-
آتش بازی کا کاروبار	۴/۵۰
وارنش سازی	۴/۵۰
پرفیومری ماسٹر	۴/۵۰
فن مصوری	۴/۵۰
بیکری بہار (بسکٹ، ڈبل روٹی، کیک)	۴/۵۰
پینٹری کا کام	۴/۵۰
اپٹوڈیٹ بوٹ پالش سازی	۴/۵۰
پلاسٹک گائیڈ	۴/۵۰
رنگ سازی	۴/۵۰
کنفیکشنری (انگریزی مٹھائیاں)	۴/۵۰
اپٹوڈیٹ انک ماسٹر روشنائیاں بنانا	۴/۵۰
خوشبودار تیل بنانا	۴/۵۰
فائن ٹیلر ماسٹر	۲/-
عصمتی دسترخوان	۳/۵۰
رضیہ کا شاہی دسترخوان	۴/-
پریکٹیکل انگلش ٹیچر	۶/-

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۶

Registered with the Registrar of Newspapers at R.N.No. 630/57 Regd. No.D.T.
AB
BISWIN SADI
37th YEAR OF PUBLICATION
Telephones
Office 271637
Residence €19927

RADIUM TONIC PILLS

نئی طاقت

نیا خون

کمزوری کا زبردست علاج

ریڈیم ٹانک پلز



نیا خون بکثرت پیدا کر کے نہ صرف کمزوری دور کرتی ہیں
بلکہ جسم میں زبردست طاقت بڑھاتی ہیں۔ وزن اور
خون کئی پونڈ بڑھ جاتا ہے۔ کھوئی ہوئی طاقت اور صحت
واپس لانے کے لئے ملک کے کونے کونے میں مشہور و
مقبول ہیں اور لاکھوں انسان روزانہ استعمال کرتے ہیں۔
کمزوری خواہ کسی وجہ سے ہو کمزور سے کمزور انسان کو بھی
نئی طاقت حاصل ہوتی ہے۔ تندرست نوجوان ریڈیم ٹانک پلز
کے علاج سے اپنی طاقت کئی گنا بڑھا سکتے ہیں۔ قیمت مکمل
علاج صرف چھ روپے۔ محصول ڈاک علاوہ۔

کلکتہ ایجنٹ:-
امین اینڈ اسمعیل پرائیویٹ لمیٹڈ
نمبر ۸۰ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ ۱

پتہ: ریڈیم کیمیکل ورکس (پرائیویٹ) لمیٹڈ پوسٹ بکس نمبر ۱۰۱۵ ...



Biswin Sad[illegible]

DELHI.

Rs.150



تِری مخمور نظر کے یہ انوکھے انداز   جیسے کچھ خواب کسی رند کے برہم ہو جائیں
جیسے حافظ کے خیالات کو مل جائے شبیہہ   جیسے خیّام کے اشعار مجسّم ہو جائیں

اختر بستوی —— فوٹو: جگ موہن، لکھنؤ



پچھلے دنوں جنابِ ساحرؔ ہوشیارپوری کے مداحوں اور اُردو زبان کے بہی خواہوں کی طرف سے غالب اکاڈمی نئی دلّی میں ایک استقبالیہ دیا گیا۔ اور ساحرؔ صاحب کی تازہ تصنیف "سحرِ نغمہ" نقرئی جلد میں اُنھیں پیش کی گئی جس پر مُلک کے ممتاز شعرا و ادبا کے دستخط کندہ ہیں۔ "سحرِ نغمہ" پر حکومتِ ہند کی وزارتِ تعلیم کی طرف سے گزشتہ سال اوّل انعام اور سرٹیفکیٹ آف میرٹ دیا گیا تھا۔ تصویر میں لالہ پریم نرائن، سرپرست انجمن عروجِ ادب ساحرؔ صاحب کو کتاب پیش کر رہے ہیں۔



عروجِ ادب دلّی کے جنابِ ابرار حسین قریشی
احرؔ صاحب کا خیر مقدم کر رہے ہیں۔



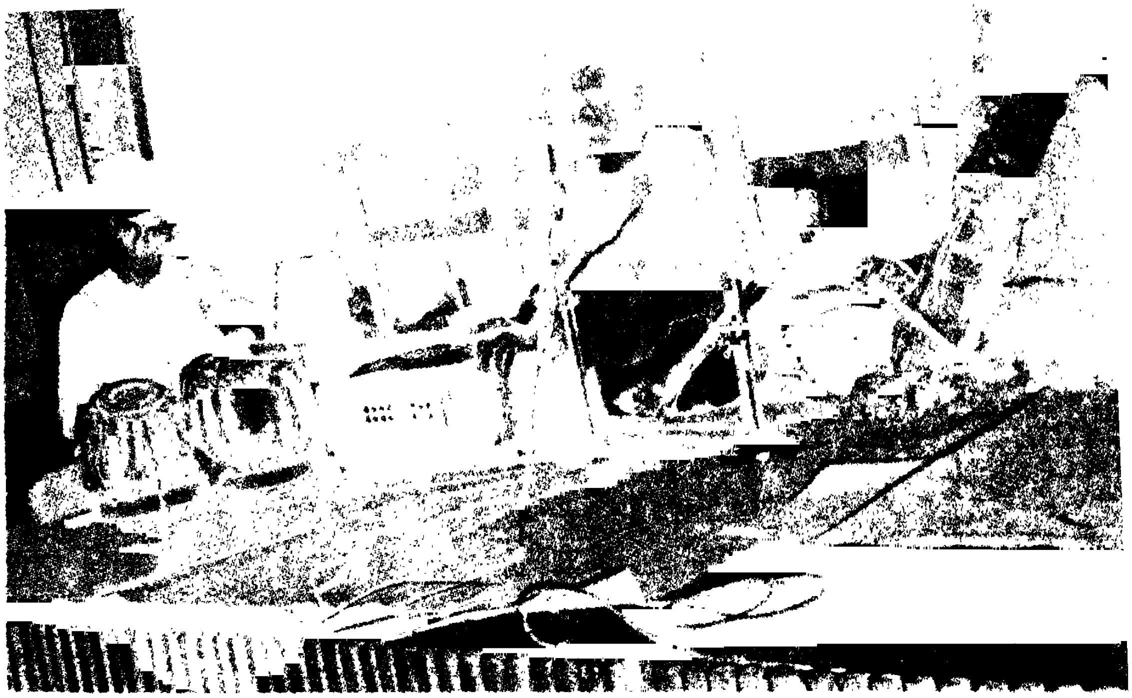
ساحرؔ صاحب کے شاگردِ رشید رازؔ لائل پوری
ساحرؔ صاحب کو ہار پہنا رہے ہیں۔



آل انڈیا ریڈیو کی آرٹسٹ محترمہ سنیتا درما نے اپنی مترنم آواز میں ساحر صاحب کی یہ غزل سامعین کے سامنے پیش کی۔

مثلِ رقصِ شرر نہیں آتی ؛ زندگی لوٹ کر نہیں آتی
دل دہی کا ہی کوئی ساماں کر ؛ دل رُبائی اگر نہیں آتی
ہجر میں موت ڈھونڈنے والے ؛ ایسی شب کی سحر نہیں آتی
یہ طبیعت ہے حضرتِ ناصح ؛ یہ سمجھ سوچ کر نہیں آتی
اپنی حالت اگر میں خود نہ کہوں ؛ کیا انھیں بھی نظر نہیں آتی
تم کو آتے ہیں سب جفا و جور ؛ اک وفا ہی مگر نہیں آتی
جس نظر سے وہ دیکھتے تھے کبھی ؛ وہ نظر اب نظر نہیں آتی
عالمِ بے دلی سے بھی یا رب ؛ دل کی کوئی خبر نہیں آتی
دردِ دل میں اگر نہ ہو، ہمدم ؛ شاعری عمر بھر نہیں آتی

آہ وہ آرزوئے دلِ ساحر
تا قیامت جو بر نہیں آتی



مُلک کے نامور موسیقار اور آل انڈیا ریڈیو کی ایکسٹرنل سروسز میں موسیقی کے پروڈیوسر اُستاد حفیظ احمد خاں نے ساحر صاحب کی یہ غزل سُنا کر سامعین کو مسحور کر دیا۔

مری چُپ کو گِلہ سمجھے، دُعا کو وہ فغاں سمجھے
نہ طرزِ خامشی سمجھے نہ اندازِ بیاں سمجھے

کسی سے کیا شکایت اپنی خوش فہمی کا ماتم ہے
وہی نا مہرباں نِکلا جسے ہم مہرباں سمجھے

مرے سجدوں پر اپنی عظمتیں قُربان کر ڈالے
مرے سجدوں کی عظمت کو جو تیرا آستاں سمجھے

ہوا ہے اپنا دل کچھ اِس قدر مانوسِ ناکامی
کہ ہر افسانۂ غم کو ہم اپنی داستاں سمجھے

دلِ ناشاد کی مجبوریوں کو تُم نہ سمجھو گے
اِسے کچھ وُہ سمجھ سکتا ہے جو دِل کی زباں سمجھے

چمن پر ناز تھا ہم کو، چمن کو ناز تھا ہم پر
چمن سے ہم چلے صیّاد! تجُھ سے باغباں سمجھے

کبھی اہلِ نظر یوں بھی فریبِ شوق کھاتے ہیں
میں اُن کو مہرباں سمجھا، وہ مُجھ کو مہرباں سمجھے

کہیں دُنیا میں ربطِ حُسن و عشق ایسا بھی دیکھا ہے
کہ میری داستاں کو خود وہ اپنی داستاں سمجھے

ہماری خوش خیالی ہی وبالِ جاں ہوئی ساحر
وہی ثابت ہوا رہزن جسے ہم پاسباں سمجھے



'اُردو پرلشیدؔ' کے زیرِ اہتمام چنڈی گڑھ میں ایک آل انڈیا مشاعرہ زیرِ صدارت مشہور افسانہ نگار جنابِ رام لعل منعقد ہوا۔ جنابِ ڈاکٹر نرتیش نظم پڑھتے ہوئے۔

گِھرے ہیں پھر تری یادوں کے نیلگوں بادل
جواں جواں ہے اندھیرا اُداس اُداس ہوں میں
سکوت چھایا ہوا ہے کہ محوِ یاس ہوں میں

زمانہ ہو گیا تجھ سے جدا ہوئے لیکن
چِتا ابھی بھی سُلگتی ہے میرے سینے میں
مرے دماغ میں پازیب سی چھنکتی ہے
کسک ابھی بھی مچلتی ہے میرے سینے میں

تری وفا تو مجھے لوریاں سُناتی ہے
مگر سہاگ دہکتا ہے میرے خوابوں میں
یہ چوڑیاں کہ سبھی ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہیں
دُھواں دُھواں سا اُبھرتا ہے میرے خوابوں میں

اذان ہو کہ ہو ناقوس کی صدا لیکن
مجھے یہ وہم کہ تُو نے مجھے پکارا ہے
جو دیکھتا ہوں تو پیشِ نظر وہی صحرا
مری شکست کی گرمی سے آنچ دیتا ہے

یہ سوچتا ہوں تجھے کیسے بھول پاؤں گا
نفس نفس تری یادیں جھنجھوڑتی ہیں مجھے
نفس نفس تری یادیں کچوٹتی ہیں مجھے

ٹیلیفون دفتر ——— ۲۷۱۶۲۴
ٹیلیفون رہائش ——— ۶۱۹۹۴۲

تیر و نشتر

خوشتر گرامی

"پارٹی کا ڈیموکریٹائزیشن کیسے ؟" ایک عنوان —— بیساکھیوں کے سہارے۔

"طلباء سرگرم سیاست میں حصّہ نہ لیں" صدر جمہوریہ ہند —— سیاست کو ان پڑھ جاہل یا پڑھے لکھے بیوقوفوں کے لئے چھوڑ دیں۔

"بادل سابق چیف منسٹر پنجاب کی اقربا پروری" ایک مقالہ —— اپنوں کے کھیتوں پر برسے۔

"اتر پردیش میں بجلی کی کٹوتی ختم۔ گھریلو استعمال کے لئے چوبیس گھنٹے بجلی ملے گی" ایک خبر —— ترپاٹھی راج کی اندھیر گردی ختم ہونے کا نتیجہ۔

"گورنر جنرل کنیڈا کے لئے دِلّی کے پاپڑ" ایک خبر —— اب وہ بھی اندازہ کر سکیں گے کہ دِلّی والے کیسے کیسے پاپڑ بیلتے ہیں۔

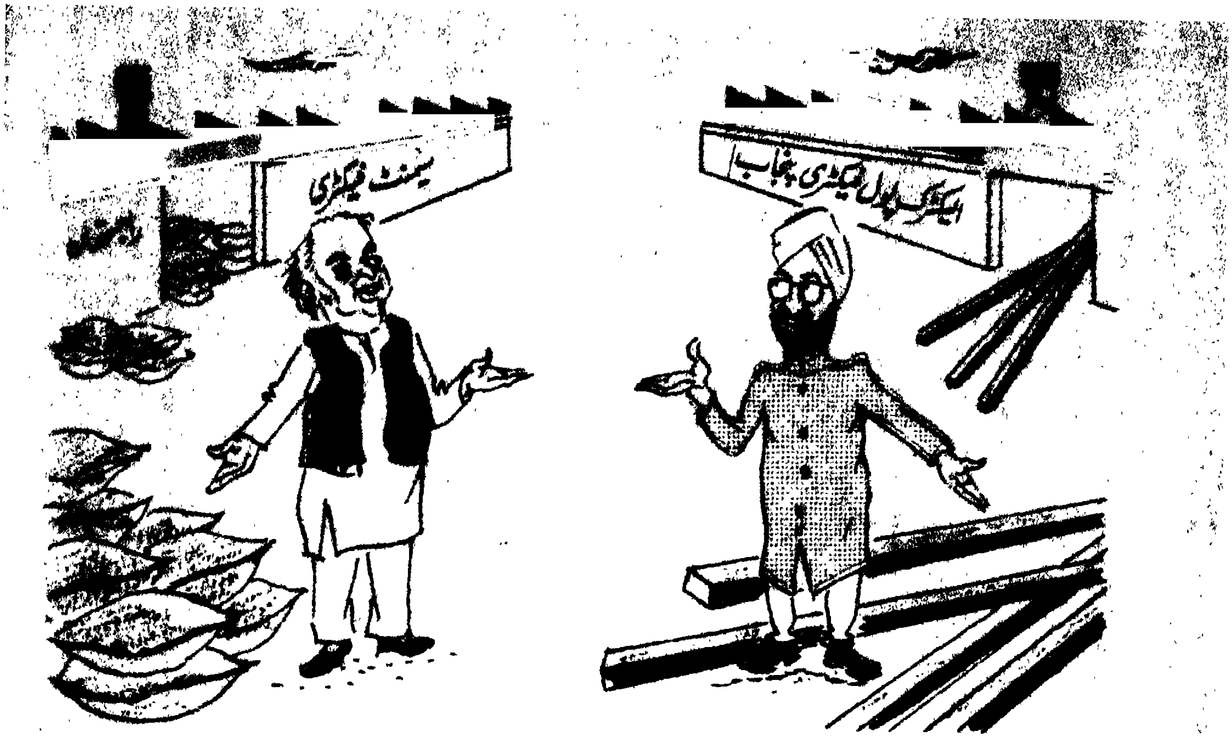
"پنجاب کے تمام باشندوں کی ڈاکٹری معائنہ کی اِسکیم" ایک خبر —— اور ابتدا سیاست والوں سے ہوگی۔

"اتر پردیش میں پاپولر گورنمنٹ کی بحالی کا فوری امکان نہیں" ایک خبر —— اِس لئے کہ تین گورنمنٹیں "ان پاپولر" ہو چکی ہیں۔

"یو۔ پی کانگریس کو بھی او ورہال کرو" ایک مطالبہ —— تاکہ ترپاٹھی کے چیلے چانٹوں کی وہاں بھی چھٹائی ہو سکے۔



"اندرا گاندھی عالمی تاریخ کی عظیم ترین خاتون" کنیڈا کی پارلیمنٹ کا خراجِ تحسین۔



راجستھان اور پنجاب میں سیمنٹ اور بجلی کا لین دین۔

"کرپشن اور ضروری اشیا کی نایابی پہ پنجاب میں اندولن ہوگا۔" ایک خبر ـــــ یعنی پنجاب کی یہ خصوصیت واقعی اندولن چلانے کی مستحق ہے کہ وہاں ضروری اشیاء کے ساتھ کرپشن بھی نایاب ہے۔

"دلّی میں جن سنگھی ورکروں کی ہلڑبازی سے بیوپاریوں کو لاکھوں کا نقصان" ایک خبر ـــــ بیوپاری اِسی دن کے لئے یہ آستین کے سانپ پال رہے تھے کیا؟

"ذخیرہ اندوزوں اور منافع خوروں کے خلاف کانگرس ورکر مظاہرے کریں" صدرِ کانگرس کی ہدایت ـــــ اور اگر اِن میں خود کانگرسی شامل ہوں تو؟

"اُتر پردیش مجرموں کا سب سے بڑا صوبہ" ایک عنوان ـــــ پچھلا تھا اب نہیں۔ سب مجرموں کا پتا کٹ چکا ہے۔

"پنجاب سارے مُلک کا پیٹ بھر سکتا ہے" گیانی ذیل سنگھ کا اعلان ـــــ زندہ باد! یہ برکتیں ہیں گیانی راج کی۔

"شریمتی اِندرا گاندھی تاریخِ عالم کی عظیم ترین عورت" کنیڈا کی پارلیمنٹ کا خراجِ تحسین ـــــ نجلنگپا، کامراج، پاٹل، مرارجی ڈیسائی، اتلیہ گھوش، اَٹل بہاری باجپئی، راج نرائن، چرن سنگھ وغیرہ کی طرف سے کنیڈا کی پارلیمنٹ سے پُرزور پروٹسٹ۔

"اُردو کے لئے ہمیں بہت کچھ کرنا ہے" ایک عنوان ـــــ جی ہاں مشاعرے کرنے ہیں۔ کچھ نئی انجمنیں بنانی ہیں۔ کچھ نئے اخبار نِکالنے ہیں۔

"شوتی دھاگا کنٹرول آرڈر" ایک خبر ـــــ دھاگہ سے زیادہ مضبوط نہ ہوگا۔

• روس اور امریکہ امن کے لئے کام کریں گے۔" ایک خبر ——— [illegible] والے خوش فہمی میں نہ رہیں۔ امریکہ بذریعہ گولی اس کام کو سرانجام دیتا ہے۔ جیسا کمبوڈیا میں کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔

• "۱۹۷۱ء کی ٹریجڈی کا ہیرو بھٹو ہی ہے۔" ایئر مارشل اصغر خاں کا بیان ——— بیان نہیں سرٹیفکیٹ۔

• "اترپردیش میں کرپٹ اور نااہل افسروں کو الگ کرنے کی تجویز۔" ایک خبر ——— نااہل وزیرِ اعلیٰ کی علیحدگی کے بعد لازمی ہے۔

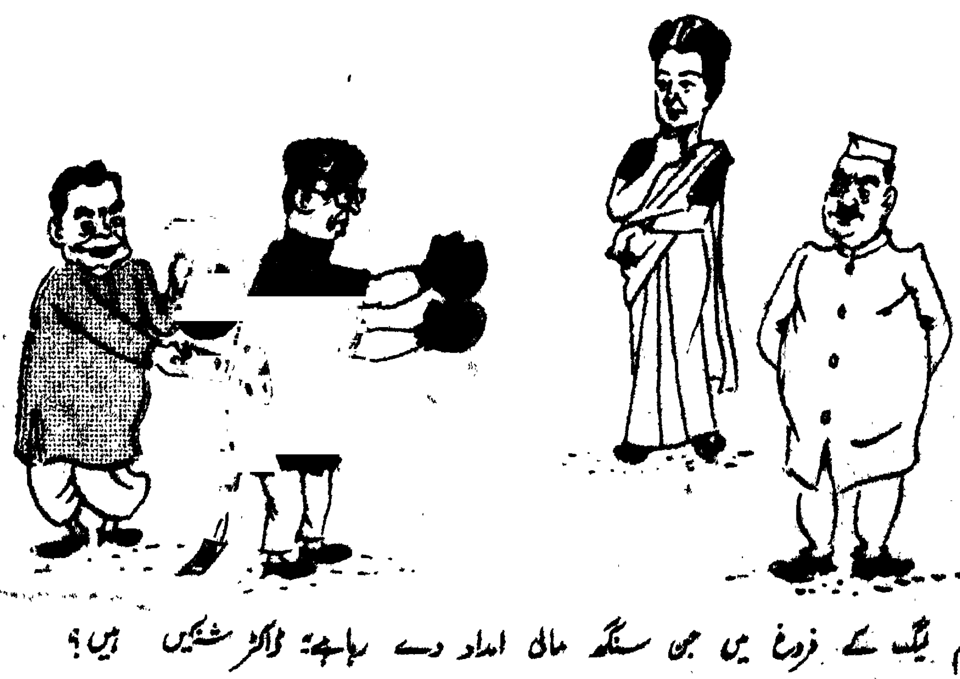
• "سرکاری کارخانے نے بلیک مارکیٹ سے سیمنٹ خریدا۔" ایک خبر ——— بلیک مارکیٹ نیشنلائز ہو گئی۔

• "فسادات حکومت کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکا ہیں۔" ایک مسلم لیگی اخبار ——— اور مسلم لیگ جیسی ہندوستان کو تباہ کرنے والی مسلمان دشمن جماعت کو برداشت کرنے والی حکومت نااہل ہے۔

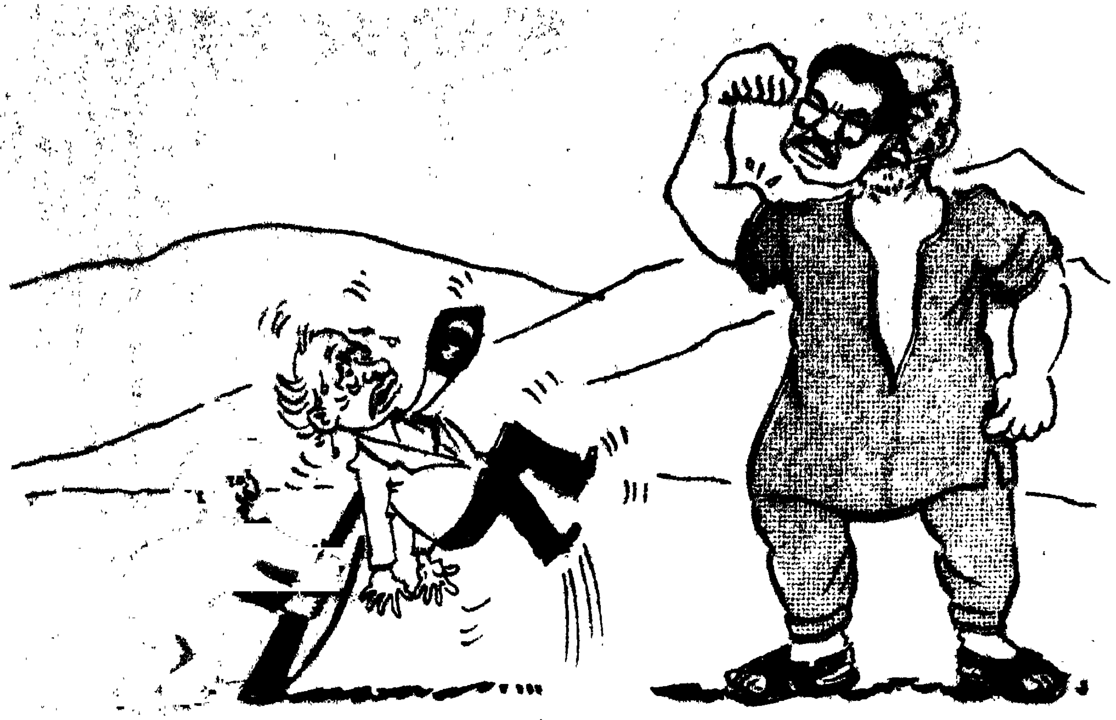
• "محبوب سے جھگڑ کر خود کو آگ لگالی۔" ایک خبر ——— آتشِ عشق میں رفتہ رفتہ سلگنے کی بجائے ایک ہی دم قصہ تمام کر لیا۔

• "نالاگڑھ میں ڈگری کالج۔" ایک خبر ——— ندی نالوں سے متعلق خصوصی تعلیم ہوگی۔

• "نکسلی پھر سرگرم۔" ایک خبر ——— موسم میں گرما گرمی کا نتیجہ۔



"مسلم لیگ کے فروغ میں جن سنگھ مالی امداد دے رہا ہے۔" ڈاکٹر شنکیں ہیں؟



"خان عبد الغفّار خاں مجیب کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں"

"راجدھانی میں بیر کی قلّت۔ مے کشوں کی قطاریں" ایک خبر ——— اور پھر اِس پر گھنگھور گھٹائیں، موروں کی صدائیں۔ بادلوں کا گرجنا اور برسنا۔

"سنبھل میں انجمن ترقّیٔ اُردو کا قیام" ایک خبر ——— بے عمل اور بے جان جماعت کی ایک شاخ کا اضافہ۔

"نکسن نے دو ماہ کے لئے اشیائے ضروریہ کی قیمتیں جام کر دیں" ایک خبر ——— اِس لئے کہ دو ماہ سے واٹر گیٹ اسکینڈل نے نکسن کا دماغ جام کر رکھا ہے۔

"اسٹیٹ گورنمنٹوں کی نا اہلیت کی وجہ سے گیہوں کی سرکاری تجارت فیل ہوئی" ایک خبر ——— کانگرس کے اندر چھپے ہوئے جن سنگھیوں کا کارنامہ۔

"ہندی کو ترقّی دی جائے" ایک عنوان ——— اور اُردو کا گلا گھونٹ دیا جائے۔

"جن سنگھ دیش میں گڑبڑ کر رہا ہے" ڈاکٹر شنکر دیال شرما کا بیان ——— اور سرکار ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہے۔

"پانی پت کے کسانوں کو پریشانی" ایک خبر ——— کہ پانی نہیں مِلتا۔

"فاضلکا کے گاؤں میں قتل" ایک خبر ——— فاضل آبادی سے نجات کے لئے۔

"امریکی خلاء باز دِلّی میں" ایک خبر ——— مگر خالی ہاتھ۔

"بھارت اور پاکستان کے جھگڑے طے کرنا خود اُن کی
ذمہ داری ہے" صدر نکسن کا بیان ——— غنیمت ہے کہ اب بھی
…ل آگئی۔

"پنچوں کی جنت" ایک عنوان ——— اور سرپنچوں کا
دوزخ۔

"منی پور کا ڈھاکہ کے ساتھ تعلق ختم" ایک خبر ———
صدر نکسن کے مُنہ پر ایک اور طمانچہ۔

"چلتا پھرتا گھر" ——— آج تیرا کل میرا۔

"جیل سے بھاگے ہوئے مجرم گرفتار" ——— اُڑتے بھی
…پاتے تھے کہ گرفتار ہو گئے۔

"پانچویں پلان کی لاگت بڑھ جائے گی" وزیر خزانہ
——— کوئی غم نہیں، دس بیس ارب کے ٹیکس اور
بڑھ جائیں گے اور ہماری بہادر قوم اُس کا بوجھ ہنسی خوشی
اُٹھالے گی۔

"جہاں قانون ہے مگر عمل نہیں" ایک عنوان ——— ظاہر ہے
جس دیش میں گنگا بہتی ہے

"ہریانہ سرکار نے کورو کشیتر میونسپلٹی کو تیس ہزار روپے
کی گرانٹ شیخ چلی کے مزار کی مرمت کے لئے دی ہے" ایک خبر ———
شیخی کی بات ہے۔

"بحرہ روم مُردہ سمندر بن جائے گا" ایک خبر ——— ہم
اُس کا نام بحرہ مُردار رکھ دیں گے۔



کیا چین اور امریکہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے حق میں ہیں؟

فسادی

خوشتر گرامی

چہرہ پر پھٹکار، آنکھوں میں بے حیائی، پیشانی پر داغ کی اکھڑ داں، مونچھ داڑھی کبھی ہے کبھی نہیں۔ نہ ناک کٹنے کی پروا نہ گلا کٹنے کا خوف۔ زبان گالی گفتار کی عادی۔ کان اچھی باتوں سے بیزار۔ ان خصوصیات اور اوصاف سے متصف ہوتے ہیں ——

فسادی

ان کا کوئی دین دھرم نہیں۔ ان کی کوئی نسل اور قومیت نہیں بغل میں چھری ہوتی ہے منہ میں رام رام۔ انھیں نہ مسجد سے تعلق ہوتا ہے نہ مندر سے واسطہ۔ گرجا کا احترام ہے نہ گوردواروں کا ان کو لحاظ۔ لیکن فساد کرنا ہو تو پھر با مسلمان انشاء اللہ یا برہمن رام رام۔ یہ خدائی فوجدار اور اللہ کے فدا کار، بھگوان کے پجاری، واہگورو کے علمبردار، قوم کے محافظ بن جائیں۔ جب کبھی خلوت خانے میں ہوں شراب و کباب کی میز پر ہوں۔ جوئے خانے میں یا سٹے کے اڈے پر ہوں تو پھر نہ قرآن کی تعلیم کا خیال نہ گیتا کا درس انھیں یاد، نہ گورو گرنتھ صاحب کی پروا اور نہ بائبل کا احترام —— یہ سرمایہ داروں، مفاد پرستوں، جاگیرداروں، صنعت کاروں اور سیاسی لیڈروں کے ہاتھوں بکتے ہیں اور عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کی جان، مال، عزت و ناموس سے کھیلتے ہیں۔ چاقو چھری، دستی بم، سوڈے کی بوتلیں، تیزابی بلب ان کے ہتھیار ہیں۔ خنجر زنی، آگ لگانا، دوشیزاؤں کی عصمت لوٹنا، بچوں کو یتیم بنانا، فلک بوس عمارتوں کو راکھ کر دینا ان کے محبوب مشاغل۔ بات کا بتنگڑ اور رائی کا پہاڑ بنانے میں یکتائے روزگار۔ ہڑتالوں، مظاہروں، جلسوں، جلوسوں میں یہ کمینے گھات لگاتے ہیں۔ فرقہ وارانہ اور نسلی بنیادوں پر جھگڑے ان کا پیشہ ہے۔ مختصر یہ کہ ان کے ہاتھوں ؏

شب ــــ ننگ و ملت چاک ــــ نہ چاک



سکنڈ شِفٹ

رضاالجبار ایم۔کام، ایل ایل۔بی

کیرآف سی۔آر۔ڈی اسٹیشن، مجگاؤں ڈاک لمٹیڈ، ڈاک یارڈ روڈ، مجگاؤں، بمبئی نمبر ۱۰

محترم خوشتر بھائی! تسلیمات

"تازہ افسانہ" سکنڈ شِفٹ" کے ساتھ ایک طویل عرصہ کے بعد بیسویں صدی" کی بزم میں آرہا ہوں۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میرے افسانوی مجموعہ" روشنی کی کرن" پر گورنمنٹ آف مہاراشٹر نے مجھے ۷۲-۱۹۷۱ء کے لئے ایوارڈ و سرٹیفکیٹ سے نوازا ہے۔ روشنی کی کرن" سترہ افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں سے بیشتر افسانے" بیسویں صدی" میں شائع ہوکر داد و تحسین پاچکے ہیں . . .

آپ کا مخلص ——— رضاء الجبار

★

دُوسری منزل کی راہداری اور رائس کے بعد سیڑھیاں طے کرکے میں بہت تیزی سے نیچے آگیا۔ ٹونی وہیں کھڑا تھا جہاں میں نے اُسے چھوڑا تھا۔ سگریٹ کا کش لے کر وہ دُھواں چھوڑ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر سگریٹ میری طرف بڑھا دیا۔ ہم اکثر ایک ہی سگریٹ سے کش لیتے ہیں۔ میں نے ہاتھ اُٹھا کر انکار کیا۔

ٹونی نے پوچھا: "رعنا آرہی ہے کیا؟"

سر ہلا کر میں نے دوبارہ انکار کیا اور آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

"تم شالیمار ہوٹل چلے جاؤ ٹونی! ایڈنا کے ساتھ وہاں رقص کر لینا۔ میں سکنڈ شِفٹ کا مزدور ہوں۔ میرا وقت نہیں آیا۔ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ ساونت فورمین سے معافی مانگ کر میں ڈیوٹی جوائن کرلوں گا۔ اپنی نیو ٹکسٹائل مل کی طرف اب میں جا رہا ہوں۔ مجھے معاف کر دینا ٹونی!"

میرے پیچھے تیزی سے آتے ہوئے ٹونی بولا: "تم سکنڈ شِفٹ کے کہاں؟ تم فرسٹ شِفٹ کے آدمی ہو۔ لیکن آج تو میری برتھ ڈے ــــ"

میں ٹونی سے بھی زیادہ تیز بھاگ رہا ہوں تاکہ اُس کے اور میرے درمیان کا فاصلہ بڑھتا جائے اور کاندیولی جانے والی لوکل مجھ سے چھوٹ نہ جائے۔

بڑا پاگل ہے یہ ٹونی بھی! بے وقوف میری بات کو سمجھتا ہی نہیں کہ میں کس مشین کی بات کر رہا ہوں۔ چلو اچھا ہی ہُوا۔

ٹونی کی گرل فرینڈ ایڈنا کو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ میری محبوبہ رعنا کا تعارف بھی کبھی ٹونی کے ساتھ نہ ہُوا۔ اُن لڑکیوں کے آگے ہم دونوں نے اپنے دوستوں کا صرف غائبانہ تعارف کرایا ہے۔ ساتھ پروگرام بنانے کا کوئی موقع ہاتھ نہ آیا۔ مصروف مشینی زندگی کے ڈھانچے میں ایک مزدور کی حیثیت ایک اِسکرو کے برابر ہوتی ہے۔ ٹونی اور میں ایک ہی مشین کے دو اِسکرو ہیں۔ ایک اِسکرو ڈرائیور جس کا نام فورمین ساونت ہے وہ ہمیں الگ الگ شِفٹ میں ایک مشین کے اندر جَڑ دیتا ہے اور شِفٹ ختم ہو جاتی ہے تو نِکال کر پھینک دیتا ہے۔

کاندیولی کی نئی ٹکسٹائل مل میں میں پہلی شفٹ کا مزدور ہوں اور ٹونی دُوسری شفٹ میں مجھ سے چارج لینے کے لئے آتا ہے۔ میں نے کبھی دُوسری شفٹ کا مطالبہ نہیں کیا اور ٹونی نے کبھی پہلی شفٹ کی مانگ نہیں کی۔ کیونکہ ہم دونوں عارضی مزدور ہیں۔ تکارام نے ایک بار اپنی شفٹ کی بدلی کا مطالبہ کیا تھا تو اُسے گھساہوا اِسکرو سمجھ کر ہمیشہ کے لئے مل سے نکال کر پھینک دیا گیا تھا۔ اِس لئے ہم دونوں میں شفٹ کو بدلنے کا مطالبہ کرنے کی ہمت کبھی نہ پیدا ہوئی۔

ہر شام کو چار بجے ٹونی مجھ سے چارج لینے کے لئے آتا ہے۔ پانچ منٹ کے لئے ساتھ بیٹھتے ہیں۔ ایک چالو چائے کی پیالی کے دو حصے کرکے پیتے ہیں۔ میں چائے منگواتا ہوں تو پیالی سے طشتری میں اُس کے لئے آدھی چائے ڈال دیتا ہوں اور جب وہ منگواتا ہے تو مجھے طشتری اُٹھاکر آدھی چائے پینی پڑتی ہے۔ اِس کے بعد میں چلا جاتا ہوں۔

ایڈنا اور رعنا کی باتیں اِن پانچ منٹوں کے درمیان کبھی ہوتی بھی ہیں اور کبھی نہیں بھی ہوتیں۔ لیکن اُس وقت ضرور ہوتی ہیں جب ٹونی رات کے بارہ بجے اپنی ڈیوٹی سے چھوٹ کر اور ڈیڑھ گھنٹے کا فاصلہ طے کرکے ہم دونوں کے مشترک کمرے میں آجاتا ہے۔ رات کے ڈیڑھ بجے سے صُبح کے پانچ بجے تک ہم دونوں اپنے کمرے میں رہتے۔ میری اپنی مرضی پر اب اِس بات کا انحصار ہے کہ صُبح پانچ بجے تک نیند لوں اور اُٹھ کر ٹکسٹائل مل جانے کی تیاری کروں یا ٹونی کے ساتھ گپ لڑاؤں۔ رعنا کے بارے میں باتیں کرنے کے لئے جب میری خواہش شدید تر ہو جاتی ہے تو میں جاگا ہوا رہتا ہوں اور جب ٹونی بھی ایڈنا کے متعلق باتیں کرنے کے لئے کچھ بے چین سا دکھائی دیتا ہے، جب بھی میں سوتا نہیں ہوں۔

ٹونی کو ایڈنا ایک شراب خانے میں ملی تھی جہاں ٹونی "بلاک پینتھر" پینے کے لئے گیا تھا۔ سارے ٹیبل بھرے ہوئے تھے کیونکہ شراب پر سے پابندی ہٹائے بہت تھوڑے دن ہوئے تھے اور لوگ کھُلے بندوں پینے کا لُطف لینے کے لئے بے چین تھے۔ صرف ایک ٹیبل خالی تھی جس پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ بلاک پینتھر کا آرڈر دے کر ٹونی اُس ٹیبل کی طرف گیا تھا جس پر ایڈنا اکیلی اُداس اُداس بیٹھی ہوئی رم سِپ کر رہی تھی۔ ٹونی نے بیٹھنے کی اجازت مانگی۔ پہلے موسم کی بات ہوئی۔ پھر شراب پر سے پابندی ہٹ جانے کی باتیں ہوئیں۔ ٹونی باتیں کرنے میں بڑا مشاق ہے۔ اِس لئے تھوڑی دیر میں ایڈنا اِس بات پر راضی ہوگئی کہ بلاک پینتھر کی بوتل کو خالی کرنے کے لئے بھی ایڈنا ٹیبل پر ٹونی کا ساتھ دے گی۔ ایڈنا کی ننگی سڈول بانہوں، سکرٹ کے نیچے سے نظر آنے والی گوشت پوست سے بھری بھری خوبصورت پنڈلیوں، گھٹنوں اور گھٹنوں سے ذرا اُوپر کے چمک دار حصّوں کو وہ دیکھتا رہا۔ اُس کے بعد ٹونی نے محسوس کیا کہ ایڈنا پھر بھی بلاک پینتھر کی بوتل سے کم نہیں ہے۔ ذرا سا کیف زیادہ ہوا تو ایڈنا کئی بوتلوں کا مجموعہ معلوم ہوئی۔ دونوں نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ وہ ہوٹلوں میں ملتے تھے۔ کلب میں جایا کرتے تھے۔

اتوار کے دن ہم دونوں میں سے کسی ایک کو اپنی باری سے ٹکسٹائل مل کو ڈیوٹی کے لئے جانا پڑتا تھا۔ جس اتوار کو میں جاتا ٹونی فری رہتا اور جس اتوار کو ٹونی جاتا تو میری چھٹی رہتی۔ اپنے فری اتوار کو ٹونی ایڈنا کے ساتھ کوئی نہ کوئی پروگرام بناتا۔ وہ سنیما جاتے، کسی قیمتی ہوٹل میں "جام سیشن" پر ڈانس کرتے۔ ایڈنا ٹونی کی بانہوں میں گر گر کر رقص کرتی اور کافی کی چُسکیاں لیتے وقت ٹونی ایڈنا کے گال پر چمکنے والے اُس خوبصورت سیاہ تل کو دیکھتا جس کے بارے میں کئی بار اُس نے شاعرانہ انداز میں بتایا تھا۔ ٹونی کو ایڈنا کے گھر کا پتہ معلوم نہ تھا۔ وہ بہت پابندی کے ساتھ گھر سے دُور ہی اُسے وقت دیا کرتی تھی اور اِس بات کا وعدہ کیا تھا کہ جب اُسے انگوٹھی پہنانے کا وقت آئے گا تب ٹونی کو وہ اپنے گھر لے جائے گی اور اپنی ماں سے مِلائے گی۔ انگوٹھی پہنانے کی بات چھیڑنے کی غرض سے ٹونی نے قیمتی تحفے دینے کے کئی مواقع پیدا کر لئے تھے۔ ایڈنا اُن تحفوں کو قبول کرکے ٹونی پر احسان کرتی رہی۔

رعنا دُوسری لڑکیوں سے بہت مختلف لڑکی ہے۔ شرم و حیا کی پُتلی ہے۔ اُس کی سادگی میں بے حد دلربائی ہے۔ لپ اسٹک لگانے کا اُسے سلیقہ نہ آیا۔ پان کی سُرخی ہی سے اُس کے ہونٹ سُرخ رہتے ہیں۔ شعر کہنے کا اُسے سلیقہ ہے۔ غزل سُناتی ہے تو میں بے خود ہو جاتا ہوں۔ یونیورسٹی کے قریب بس اسٹینڈ کے چمن میں وہ مجھ سے

متعارف ہوئی تھی۔ اُس کے بعد سے اپنی چھٹی کے اتواروں میں میں اُس کے گھر پر چلا جاتا ہوں۔ اُس کی لجائی ہوئی آنکھوں میں جھانکتا ہوں۔ وہ محجوب ہو کر جھک جاتی ہے۔ تب میں اُس کے ہاتھ کو اُٹھا کر اپنے ہاتھ میں رکھ لیتا ہوں۔ میں نے رعنا کے بازوؤں کو نہیں دیکھا۔ چاند ستاروں، بیل اور بوٹوں سے مزیّن ساڑیوں ہی کو دیکھا ہے، جسے وہ پہنتی ہے۔ اُس کی چوڑیوں کی کھنک سنی ہے، جس میں مَیں ڈھولک کی تھاپ اور شہنائی کی لَے پاتا ہوں۔ اُس کے گندھے ہوئے بالوں میں لگے ہوئے پھول کو دیکھ کر اپنے چہرے پر کبھی سجائے جانے والے سہرے کا خواب بُنتا ہے۔ میں نے رعنا کو کوئی قیمتی تحفہ نہیں دیا۔ ہاں ایک بار اُس کی زبان سے اتفاقاً نکلا تھا کہ گھر کا خرچ چلانے کے لئے اُسے کسی قدر دِقّت کا سامنا ہو رہا ہے۔ مجھے بہت شرم آئی تھی اس لئے اُس دن کے بعد سے میں ہر مہینہ اپنی تنخواہ کا ایک حصّہ زبردستی اُس کے گھر پہنچا دیتا ہوں۔

مشین کے کل پُرزے بھی جب کام کرتے کرتے اپنے اندر سے بھاپ چھوڑنے لگتے ہیں تو اُن کی تھکن کا اندازہ کر کے اُنھیں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ایک اچھا مکینک اپنی مشین میں وقتاً فوقتاً تیل کے قطرے ٹپکاتا ہے۔ لیکن ہم ایسے اِسکرو ہیں جنھیں کبھی بھاپ کرنے، کبھی تیل کے قطرے ٹپکانے کا کِسی کو خیال نہ آیا۔ ایسے اِسکرو جب اُنھیں فٹ کیا جاتا ہے یا نِکالا جاتا ہے تو اکثر دلخراش آواز نِکال کر دُہائی دیتے ہیں۔ ایڈنا اور رعنا ہم دونوں کی زندگی میں کچھ ایسے ہی وقتوں میں آئیں۔ زندہ رہنے کے لئے اُنھوں نے جو ذرا سی شگفتگی اور دلچسپی دی ہے، وہ ہمارے لئے بہت بڑی بات ہے۔ لیکن شگفتگی اور دلچسپی بھی اگر مشین کی طرح ایک دیئے ہوئے وقفے اور بچے تُلے ہی انداز میں آتی رہے تو بہت بے لُطفی پیدا ہو جاتی ہے۔ انسانی زندگی اپنے حالات میں غیر متوقع اُتار چڑھاؤ کا بھی انتظار کرتی ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ ایک بنک ہالی ڈے کا دن تھا۔ ہمیں چھٹی نہ تھی۔ بہت التجا کر کے ٹونی نے پہلی بار رخصت لی تھی۔ کیونکہ اُس دن اُس کی سالگرہ تھی۔ رات کو ٹونی نے مجھے سونے نہ دیا۔ اگلے دن کے لئے اُس کے ہاں مصروف پروگرام تھا۔ ہوٹل میں کافی پینے کا، ایڈنا کے ساتھ رقص کرنے کا اور اُس کے بعد سنیما۔ سنیما کے بعد وہ ایڈنا کے ساتھ بیٹھ کر وہ خود بھی اپنے آپ کو فضا میں شامل محسوس کرے گا۔ اُس نے سرگوشی کر کے بہت سی راز و نیاز کی باتیں بھی بتائیں اور لُطف لیتا رہا۔ اچانک ٹونی نے چاہا کہ میں بھی دُوسرے دن رعنا کو لے کر آؤں اور اُس کا ساتھ دوں۔ رقص نہ کروں تو نہ سہی، ٹیبل پر ہی کافی کی چُسکیاں لیتے ہوئے بیٹھوں۔ رعنا کی ماں سے اجازت لے کر سنیما دیکھنے آؤں۔ ٹونی نے کہا تھا کہ وہ قطعی طور پر ایڈنا سے انگوٹھی پہنانے کی بات طے کرے گا۔ اپنی زندگی کے خُشک چکر سے واقعی وہ بہت بیزار ہو گیا تھا۔ اُس کی تمنّا تھی کہ اب اُس کی شادی ہو جائے۔ ایڈنا اُس کی بیوی بنے۔ اُس کے گھر کے آنگن میں اُس کے بچّے کھیلیں —— ٹونی اپنے بچّوں سے کھیلے۔

مِل سے ہم دونوں کے رُخصت لینے کا سوال بہت مشکل تھا۔ اِس لئے میں ٹالتا رہا اور کہتا رہا کہ کسی دوسرے موقع پر ہم ایک ساتھ پروگرام بنا کر رعنا اور ایڈنا کو ساتھ ساتھ دیکھیں گے۔ لیکن ٹونی اُس دن بہت سنجیدہ ہو رہا تھا۔ اُس نے کہا۔

"میں جانتا ہوں ڈیر کہ ہم مزدوروں کے لئے اپنی سالگرہ منانا ایک مضحکہ خیز بات ہے۔"

"نہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں۔" میں نے ٹونی کو روکنا چاہا۔ لیکن وہ رُکا نہیں اور بولا۔

"ہم مزدور صرف پیدا ہوتے ہیں اور اقساط سے ہر برس مرتے رہتے ہیں۔ کل میرے مرنے کی ستائیسویں قسط ہے۔ کیا میری مَوت پر میرا مُنہ نہ دیکھو گے؟"

ٹونی کے الفاظ کے تاثّر نے مجھے جھنجوڑ دیا۔ میرے دل میں اُس کے لئے ہمدردی پیدا ہوئی۔ اپنے لئے نفرت بھی پیدا ہوئی۔ ہمدردی اور نفرت کے جذبات کی آمیزش سے ایک اور جذبہ پیدا ہُوا۔ وہ تھا بغاوت کا جذبہ۔ میں نے فوراً پلان بنایا کہ صبح میں بھی مِل کو نہ جاؤں گا بلکہ کِسی تیسرے آدمی کے ذریعے فورمین ساونت کو فون کروا دوں گا کہ میری طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ میں ڈیوٹی پر حاضر نہ ہو سکوں گا۔

دس بجے ٹونی ایڈنا سے شالیمار ہوٹل میں مِلنے والا تھا۔

اِس لئے نو بجے میں اور ٹونی رعنا کے گھر کے پاس آگئے۔ رعنا کا گھر دُوسری منزل پر تھا۔ میں نے ٹونی کو نیچے چھوڑا تاکہ پہلے میں جا کر رعنا سے مِلوں اور بتاؤں کہ میرا دوست ٹونی آیا ہے۔ رعنا کو اطلاع دینے کے بعد میں واپس آ کر یا اُوپر ہی سے آواز دے کر ٹونی کو بُلا لوں گا۔ رعنا کو میری آمد کی اطلاع نہ تھی۔ ہاں یہ ضرور پتہ تھا کہ صبح مِل میں میری ڈیوٹی ہے۔ اِس لئے پہلے میرا اکیلا جانا اور اُس کے بعد ٹونی کو اُوپر بُلانا ہی مجھے مناسب معلوم ہو رہا تھا۔ میں اِس بات پر پھُولا نہیں سما رہا تھا کہ آج ہمارے ساتھ رعنا اور ایڈنا بھی رہیں گی۔ اگر رعنا کی ماں سنیما چلنے کے لئے اجازت نہ دیں گی تو کم از کم شام کو پارک میں تو ساتھ رہے گا۔ اگر شام کے لئے اجازت نہ دیں گی تو دس بجے شالیمار ہوٹل میں ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لئے ضرور اجازت مِل جائے گی۔ مجھے یقین تھا کہ کسی حد تک تو رعنا ضرور اجازت حاصل کرے گی۔

سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ایک چھوٹی سی راہداری تھی۔ راہداری طے کر کے میں دروازے پر پہنچا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔

تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھُلا۔ رعنا کی ایک کم سِن نوکرانی دروازے پر نمودار ہوئی۔

مجھے دیکھ کر وہ محوِ حیرت ہو گئی اور بولی: "ارے آپ تو شام کے آدمی ہیں، صبح کو کیسے چلے آئے؟"

"اری ہٹ! جو شام کو ڈھونڈ لیتا ہے، اُسے صبح بھی پا لیتی ہے۔ سمجھی؟" بے تکلفی سے میں نے اُسے جواب دیا اور اندر گھُس گیا۔

رعنا اپنے کمرے میں تھی۔ کھڑکی میں سے مجھے نظر آیا لیکن میں سکتے میں آگیا۔

[illegible] کھڑی تھی۔ اُس کے بازو ننگے تھے [illegible] کے ہونٹوں پر [illegible] سے اُبھرا ہوا تھا۔ بال ایک ربن سے بندھے تھے۔ بڑے آئینے کے سامنے کھڑی شاید وہ اپنے گال پر ایک تِل کو چھپا رہی تھی۔

ملازمہ چیخی۔

"بائی جی! وہ آپ کا شام کا آدمی صبح آگیا ہے!"

رعنا چلّائی: "باہر ہی روک کر رکھنا، کہنا میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ میں سو رہی ہوں۔"

دروازے پر آ کر میں نے پُوچھا: "تمہاری طبیعت اچھی نہیں ہے کیا؟"

ہڑبڑا کر رعنا بولی: "اطلاع اور اپائنٹمنٹ کے بغیر آنے والوں کو میں اور کیا کہہ سکتی ہوں۔"

اپنے سارے احساسات کو اپنے قابُو میں لے کر اور اُنھیں ساکت و مُردہ کر کے میں بولا: "اپائنٹمنٹ تو ہے! میں ٹونی کا دوست ڈیبر ہوں۔ تمھیں یہ اطلاع دینے کے لئے آیا ہوں ایڈنا کہ آج ٹونی کی ستائیسویں سالگرہ ہے۔ آج اُسے جی بھر کر خوش ہونے دو۔ چاہے یہ خوشی کسی صدمہ یا رنج پر پھیلا ہُوا مُلمّع ہی کیوں نہ ہو۔ میری تمنّا ہے کہ آج اُس پر اُداسی کی کوئی پرچھائیں نہ پڑے۔ اچھا میں چلتا ہوں۔"

غزل

پروفیسر علامہ جمیل مظہری ایم۔ اے

آتش سے تری اور دیدۂ تر ہے اے دوست
اب مرے اشک کا قطرہ بھی گہر ہے اے دوست

شوق ابھی جبرئی شمس و قمر ہے اے دوست
ابھی پردے کے اسی پار نظر ہے اے دوست

دور جانا ہے، گھڑی بھر کو یہاں دم لے لیں
عشق اک نخلِ سرِ راہ گذر ہے اے دوست

تھا وہ اک دور کہ تھے داغِ جبیں سے سرخوش
زندگی اب ہوسِ زخمِ جگر ہے اے دوست

دمِ رخصت تری پلکوں کا یہ مغموم جھکاؤ
اک مسافر کے لئے زادِ سفر ہے اے دوست

عقل اور عشق میں مدت سے ہے اک حالتِ جنگ
اور مرا دل نہ ادھر ہے نہ اُدھر ہے اے دوست

اک نگاہِ غلط انداز سے ہوئے زخمِ جمیل
نارسیدہ یہ محبت کا ثمر ہے اے دوست

غزل

پروفیسر بیتاب سہیلی بھیتی ایم۔ کام (علیگ)

حسن غمزہ بھی ہے ادا بھی ہے
ہم نے دیکھا بھی ہے سنا بھی ہے

زندگی صرف گل کدہ ہی نہیں
زندگی کرب بھی بلا بھی ہے

جرم ہے عشق گر زمانے میں
عشق ہی جرم کی سزا بھی ہے

تیرا حسنِ سلوک میرے دوست
کچھ روا بھی ہے ناروا بھی ہے

میں ہی رسوا نہیں زمانے میں
ساتھ میں نام آپ کا بھی ہے

دل مرا صرف بتکدہ ہی نہیں
دل مرا خانۂ خدا بھی ہے

آدمی یہ بھلا چکا شاید
آدمی سے بڑا خدا بھی ہے

سچ ہے رنگِ سخن ترا بیتاب
سب سے جدا بھی ہے نیا بھی ہے

آج ہی اپنے گرتے بالوں کا کوئی علاج کیجئے!





کل غالباً بہت دیر ہو چکی ہوگی!

آج ہی سے پیور سلویکرین کا استعمال شروع کر دیجئے۔ یہ فارمولا سائنسی طور پر تحقیق کرنے اور آزمانے کے بعد ترتیب دیا گیا ہے جو (۱) گرتے بالوں کو روکنے میں مدد دیتا ہے (۲) ۱۷ انہایت ضروری پروٹینوں کو ملا کر بنایا گیا ہے تاکہ آپ کے بالوں کی جڑوں کے نیچے تک پہنچ کر انہیں ایسی قوت عطا کرے کہ بال پھر سے صحت مند اور گھنے پیدا ہونے لگیں۔





اس بات کا ثبوت کہ پیور سلویکرین بالوں کا گرنا روک دیتا ہے:
بال باریک اور غیر صحت مند پیدا ہوتے ہیں کیونکہ ان کی جڑوں میں نہایت اہم امینو ایسڈ نہیں ہوتی۔ اگر اس کی اصلاح نہیں کی گئی تو نتیجتاً بال کمزور ہوا کرتے اور گرنے لگتے ہیں۔



پیور سلویکرین کا ایک قطرہ (بڑا کر کے) تمام کے تمام ۱۷ امینو ایسڈ پر مشتمل ہے۔ اور اس میں وہ قدرتی پروٹین بھی ہیں جو صحت مند بالوں کی پیدائش کے لئے ضروری ہیں۔ پیور سلویکرین تیزی کے ساتھ بال کی جڑوں میں [illegible] جا پہنچتا ہے اور انہیں وہ اہم پروٹین فراہم کرتا ہے جو آپ کے بالوں کی [illegible] اور صحت مند پیدا [illegible] کے لئے ضروری ہیں!

[illegible] پیور سلویکرین کے ذریعے علاج شروع کر دیجئے!
[illegible] کے ساتھ کیا جانا چاہئے تاکہ بہترین نتائج حاصل ہوں۔ [illegible] دن میں ۲ بار [illegible] پیور سلویکرین سے کر [illegible] کیجئے [illegible] بال [illegible] ہیں اور [illegible] صحت مند دکھائی دیتے ہیں۔ [illegible] پیور سلویکرین کے علاج کی بدولت آپ کے بال [illegible] اصلی بالوں کی طرح [illegible] جائے گی۔

پیور سلویکرین

بالوں کے لئے قدرتی پروٹینی غذا

ٹھنڈی چھاؤں

شاہد فریدی بی۔ ایس سی (اگیری)

مومن پورہ، میدک گلی، گلبرگہ (میسور اسٹیٹ)

محترم و معظم چچاجان! آداب

اپنی طویل خاموشی کے لئے شرمندہ ہوں۔ وہ ہستی (میری والدہ محترمہ) جو بچپن میں مجھے کہانیاں سنایا کرتی تھی (جن کہانیوں نے مجھے افسانہ نگار بنا دیا) مجھے بے پناہ غم دے کر کبھی نہ آنے کے لئے اِس دنیا سے چلی گئی۔ اِس عظیم سانحے کے بعد ایک طرف لکھنے پڑھنے کا سلسلہ معمول پر نہیں آ رہا تھا اور دُوسری طرف آپ کے خلوص و محبت کا احساس بھی دل و دماغ پر طاری تھا۔ مجھے بے حد مسرت ہے کہ آپ کے بے پایاں خلوص و محبت میں کوئی فرق نہ آیا اور آپ کا خلوص ہر ماہ مجھے "بیسویں صدی" کے تازہ شمارہ کی صورت میں ملتا رہتا ہے۔ اِسی خلوص اور پیار کے زیر اثر جو کچھ بھی لکھ سکا ہوں، آپ کی نذر کرتا ہوں

آپ کا بھتیجہ ——— شاہد فریدی

★

ریشماں لیبارٹری سے نکل کر شمشاد کے ساتھ لائبریری میں داخل ہو رہی تھی۔ زینے طے کرتے وقت پیچھے سے کسی نے اُس کی پیٹھ پر ایک زور کی دھپ لگائی۔ ریشماں کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا۔ یونیورسٹی میں اُس نے چار برس گزارے تھے۔ لیکن آج تک بھی کسی نے اُس کے ساتھ ایسی حرکت نہیں کی تھی۔ وہ غصّے سے پیچھے کی طرف مُڑی۔

"ریشماں! میں کب سے تجھے تلاش کرتی پھر رہی ہوں اور تیرا پتہ ہی نہیں چلتا۔ کب تک یوں دُور رہے گی اور اب تو تجھے ہمیشہ کے لئے ہمارے ہی گھر تو آنا ہے!" شبانہ ایک ہی سانس میں کہہ گئی۔

"تم یہاں پوسٹ گریجویشن کرنے آئی ہو، جب تک یہاں رہو، اِتنا ضرور یاد رکھو کہ یہ ہمارے ضلع کا کالج نہیں، یونیورسٹی ہے! جب بھی کسی سے ملو تو شائستگی سے ملا کرو!"

شبانہ حیرت زدہ سوچتی رہ گئی، ابھی ابھی جو لڑکی یہاں سے گئی ہے، کیا وہ ریشماں نہیں تھی؟ ریشماں! اُس کی عزیز سہیلی جو آج سے چند ہی برس پہلے اُس کے ساتھ ایک ہی رکشے میں کالج آیا کرتی تھی۔ پہلے ریشماں کتنی شوخ تھی۔ شرارتوں اور لڑکوں کو بے وقوف بنانے میں سب سے آگے۔ لیکن اب یونیورسٹی کے ماحول نے اُسے اپنی خوبصورتی کا احساس دلایا ہے اور شاید اب اُسے خود کو پوز کرنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ اِسی لئے اُس کے چہرے پر عینک کا بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پی ایچ۔ ڈی ہونے کے احساس نے ریشماں کو مغرور بنا دیا ہو۔ وہ ریشماں سے بہت جونیئر تھی اور اِسی برس اُس نے ایم۔ ایس سی میں داخلہ لیا تھا۔

ریشماں اپنے تھیسس پر شمشاد سے ڈسکس کرنے کے بعد لائبریری میں ریفرنس کے لئے جا رہی تھی، لیکن شبانہ نے اُس کا سارا موڈ آف کر دیا تھا، اِسی لئے وہ شمشاد سے معافی مانگ کر لیشن

چلی آئی اور اپنے لئے کافی کا آرڈر دے کر سوچنے لگی ــــ 'یہ شبانہ بھی عجیب بے وقوف لڑکی ہے! اُسے کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ پیچھے سے ایک زور کی دھپ رسید کرے اور وہ بھی لائبریری جیسی جگہ پر جہاں ہر وقت طلباء اور طالبات کی آمد و رفت رہتی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر سنہا نے بھی شبانہ کو اُس کی پیٹھ پر مارتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اور شبانہ کی بکواس بھی سُن لی تھی، شاید وہ اسی لئے مسکرا کر آگے بڑھ گئے تھے، ورنہ ڈاکٹر سنہا ہمیشہ کی طرح اُس سے اُس کے تھیسس پر ضرور بات کرتے۔ چار برس کے عرصے میں پہلی بار اُس نے ڈاکٹر سنہا کو دیکھ کر وِش نہیں کی تھی۔ نہ جانے شمشاد نے شبانہ کی بکواس کا کیا مطلب نکالا ہوگا!'

کافی ختم کرکے ریشماں ہاسٹل چلی آئی۔ اپنے رُوم کا دروازہ بند کرتے وقت اُس کی نظر سامنے رُوم تک گئی۔ اُسے دیکھ کر جب شبانہ کاریڈور تک آئی تو ریشماں نے جلدی سے اپنے رُوم کا دروازہ بند کرلیا۔

شبانہ، ریشماں سے معافی مانگنا چاہ رہی تھی لیکن جب ریشماں نے اُسے دیکھ کر اپنا رُوم بند کرلیا تو شبانہ اپنے رُوم میں واپس آگئی۔ اُس نے سوچا ـــ 'اب ریشماں اتنی مغرور ہوگئی ہے اور اُسے اپنے بڑے پن کا اتنا احساس ہوگیا ہے کہ اپنی پُرانی اور عزیز سہیلی سے بات کرنا بھی اُسے گوارہ نہیں! کل ہی وہ اپنی ممی کو خط لکھے گی کہ اگر ریشماں کے گھر والے ریشماں کا بیاہ اُس کے بھائی جان سُہیل سے کرنے کے لئے تیار بھی ہوجائیں تو وہ ہرگز بھائی جان کی شادی ریشماں کے ساتھ نہ کریں! بھلا ریشماں اُس کے بھائی جان کو کیا خوش رکھ سکے گی جب اُسے خود خوش رہنا نہیں آتا!

'میں نے ریشماں کے ساتھ کیا غیر شائستگی کی تھی؟ یہی نا کہ پیچھے سے ایک دھپ لگائی تھی۔ اگر سہیل کے ساتھ ریشماں کا بیاہ ہوجاتا تو کیا وہ ہمیشہ کے لئے ہمارے گھر نہ آجاتی؟' پھر شبانہ کا خیال اُس نوجوان کی طرف گیا جو ریشماں کے ساتھ تھا۔ شبانہ نے سوچا: 'تو یہاں بھی ریشماں نے کسی کو بے وقوف بنا رکھا ہے۔ ابھی تک اُس کی عادت نہیں گئی!' ہر برس ریشماں کسی فرسٹ کلاس اور ذہین لڑکے کو ضرور بے وقوف بناتی تھی۔ اُس کی خوبصورتی کی وجہ سے لڑکے بے وقوف بھی بن جایا کرتے تھے اور ریشماں امتحان ختم ہونے تک اُس لڑکے کو خوب بے وقوف بناتی تھی اور امتحان کے بعد وہ پھر اُس لڑکے سے بات بھی نہ کرتی تھی۔ واجد بھی ایک دن ریشماں کی دل لگی کو دل کی لگی سمجھ بیٹھا۔ وہ ریشماں کے عشق میں فرہاد تو نہ بن سکا، البتہ وقت اور ریشماں کے عشق نے اُسے تجریدی آرٹسٹ ضرور بنا دیا تھا۔

ایک شام ریشماں بہت دیر تک لیبارٹری میں کام کرتی رہی اور تھک کر ٹیبل پر سر رکھے سو گئی تھی۔ جب آنکھ کھلی تو سات بج چکے تھے۔ وہ لیبارٹری سے نکل آئی اور اپنے چیمبر میں آکر بیٹھ گئی۔ جب سامنے پڑے ہوئے دعوت نامے پر اُس کی نظر گئی تو اُسے محسوس ہوا جیسے دعوت نامہ اُسے مُنہ چڑا رہا ہو۔ آج شبانہ کی شادی تھی۔ کالج کی ساری لکچررس شبانہ کی شادی میں گئی ہوئی تھیں۔ لیکن وہ نہ جا سکی تھی۔

آج سے ڈھائی برس پہلے اُس دن وہ کتنی خوش تھی جس دن اِسی ویمنز کالج میں اُس کا تقرر "اسسٹنٹ پروفیسر" کی حیثیت سے ہُوا تھا۔ اُس دن تھیوری کی کلاس ختم کرکے شام کو جب وہ گھر لوٹی تھی تو اُسے ایک عجیب سے سکون کا سا احساس ہُوا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں آج ڈھائی برس بعد اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ اب تک اُسے جو سکون ملا ہے وہ دائمی نہیں ہے اور آج شبانہ کا دعوت نامہ دیکھ کر نہ جانے کیوں بار بار شمشاد یاد آرہا تھا۔ اُس نے سوچا ـــ

'ایک شمشاد ہی کیا سب ہی مرد بے وفا ہوتے ہیں!'

اُس نے شبانہ کا دعوت نامہ اُٹھا کر دیکھا، شبانہ کا بیاہ ایک ایسے نوجوان سے ہو رہا تھا جو صرف گریجویٹ تھا اور شبانہ ایم۔ ایس سی تھی۔ 'کیا شبانہ اُس نوجوان کے ساتھ خوش رہ سکے گی؟' اُس کے دل کے کسی گوشے سے ایک آواز اُبھری۔

'یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ شبانہ خوش ہے یا نہیں! لیکن کیا تم خود خوش رہ سکو گی اگر تمھارا بیاہ ایک ایسے نوجوان سے ہوجائے جو تعلیم میں تم سے کم ہو؟' ریشماں کو اِس سوال کا جواب نہ مل سکا، اُسے صرف اِتنا یاد تھا کہ وقت تیزی کے ساتھ بھاگ رہا ہے۔

اُس دن ریشماں لائبریری میں کسی کتاب کی تلاش کے

گئی تھی۔ لائبریری کے ایک گوشے میں شبانہ اپنی ساتھی لکچرر سے باتیں کر رہی تھی۔ اپنی مطلوبہ کتاب لے کر ریشماں واپس جا رہی تھی، لیکن شبانہ کی بات سن کر اُس کے قدم رُک گئے اور وہ کھڑی کتاب دیکھتی رہی:

'ہاں یاسمین! یہ سچ ہے کہ شادی کے بغیر عورت کی زندگی ادھوری رہتی ہے اور اب میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ دِلی اور دائمی سکون تو عورت کو اُسی وقت ملتا ہے جب اُس کی شادی ہو جاتی ہے، اور پھر مرد! عورت کے لئے دریا کے اُس پانی کی طرح ہے جو زمین کو سرسبز و شاداب بناتا ہے!'

'ہونہہ!' ریشماں نے حقارت سے اپنے دل میں کہا۔

'بے وقوف! مرد تو اُن سمندری موجوں کی طرح ہے جو اچھی خاصی زمین پر جب آتی ہیں تو نمک کی تہہ چھوڑ کر چلی جاتی ہیں اور زرخیز زمین بیکار ہو جاتی ہے'

ریشماں نے پھر سُنا——

'اور یاسمین! جب کبھی میں اُن کے قدموں میں ہوتی ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے اُن کے قدموں میں ایک ٹھنڈی چھاؤں ہے اور وہی چھاؤں میرے لئے ایک جنت ہے!'

ریشماں نے اپنے دل میں کہا: بے وقوف عورت! مرد کا وجود ایک زہر آلود کانٹے کے سوا کچھ بھی نہیں! اگر مرد کے قدموں سے لپٹ کر تمھیں اتنی خوشی ہوتی ہے تو تم میں اور ایک گنوار عورت میں فرق ہی کیا ہے؟ اور پھر تمھیں ایسی ہی خوشی چاہئے تھی تو ایم۔ ایس سی کرنے کی کیا ضرورت تھی!' ریشماں چُپ چاپ لائبریری سے چلی آئی۔

اُس دن ریشماں کالج جانے سے پہلے اپنے لکچر کے نوٹس تیار کر رہی تھی۔ اُس کی چھوٹی بہن آہستہ سے آ کر اُس کے قریب کھڑی ہو گئی اور اُس نے ڈرتے ڈرتے اُس سے پوچھا: 'باجی! میں یہ گڈا لے لوں؟' اُس نے دیکھا اُس کی بہن کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا گڈا تھا۔

'ارے! لاؤ یہ گڈا مجھے دے دو میں تمہیں ایک اچھا گڈا لا دوں گی تمھیں!' ریشماں نے وہ گڈا لے لیا

اور کشکش باندھے چند لمحوں تک گڈے کو تکتی رہی پھر اُسے اپنے پرس میں ڈال کر کالج چلی آئی۔ اپنے چیمبر میں آ کر اُس نے پرس سے گڈا نکال لیا۔ آج سے کوئی بیس برس پہلے اُس نے اس گڈے کا بیاہ رچایا تھا۔ کتنا چاؤ تھا اُسے گڈیوں کے بیاہ رچانے کا! ریشماں نے سوچا۔ یہ وقت بھی کتنا ظالم ہوتا ہے! انسان سے بچپن کے ساتھ ساتھ اُس کے کھلونے بھی چھین لیتا ہے اور زبردستی جوانی کی دہلیز کے پار لا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ بچپن اور کھلونوں کے بدلے ایک ہاتھ میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری تو ضرور تھما دیتا ہے لیکن دوسرے ہاتھ میں تھامے ہوئے تمناؤں کے کاسے میں کچھ بھی نہیں ڈالتا۔ نہ جانے کیوں ریشماں کو اپنی ساتھی لکچرر یاسمین کی بات یاد آ گئی جو اُس نے ایک دن لائبریری میں شبانہ سے کہی تھی۔

'تیرے وہ ایک برس کے لئے تجھ سے دور جا رہے ہیں تو کیا ہوا۔ جب تم دونوں کا مُنّا تیری گود میں آ جائے گا تو اُسے اپنے سینے سے لگا کر خوب پیار کرنا۔ پھر جب تمھیں اپنے مُنّے میں اُن کی صورت نظر آئے گی تو تمھیں محسوس ہوگا جیسے تمھارے وہ تمھارے پاس ہی ہیں!' ریشماں نے بے جان گڈے کو اپنے سینے سے لگا لیا جیسے ایک ماں مامتا کے جذبے سے اپنے بچے کو سینے سے لگا لیتی ہے۔ پھر نہ جانے کیوں ریشماں کو ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی کوکھ میں چند لمحوں کے لئے ایک انجانے اور میٹھے درد کی لہر اُٹھی اور غائب ہو گئی ہو۔ کاش . . . ریشماں دونوں ہاتھوں میں اپنا مُنہ چھپائے روتی رہی اور اُس وقت چونکی جب اُس کے کانوں سے ٹرین کی آواز ٹکرائی۔ اُس نے بے جان گڈے کو ٹیبل پر سے اُٹھایا اور کھڑکی میں آ کر پوری قوت سے ریل کی پٹریوں کی طرف پھینک دیا، پٹریاں بہت دور تھیں۔ گڈا وہاں تک تو نہ جا سکا اور اِس سے پہلے کہ وہ کالج کی چار دیواری میں گرتا نیم کے درخت سے ایک چیل گڈے کی طرف جھپٹی اور اپنے پنجوں میں دبا کر اُڑتی ہوئی دُور چلی گئی۔ ریشماں اپنے چیمبر میں چلی آئی اور اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ کر ٹیبل پر رکھی ہوئی گھنٹی بجائی اور تھوڑی دیر بعد جب اُس نے اپنی نظریں اُٹھائیں تو اُسے محسوس ہوا جیسے اُس کے ٹیبل کے پاس واجد کھڑا ہے۔ واجد جو اُس کی خاموش پرستش

کرتا تھا۔ لیکن جسے ریشماں نے بے وقوف بنایا تھا۔ جو ریشماں کی دل لگی کو دل کی لگی سمجھ بیٹھا تھا اور جسے ریشماں کی محبت نے ایک تجریدی آرٹسٹ بنا دیا تھا۔ واجد کو دیکھ کر ریشماں کو ایسا محسوس ہوا جیسے زندگی کے صحرا میں چلچلاتی ہوئی دھوپ میں چلتے چلتے اچانک وہ کسی نخلستان کے قریب پہنچ گئی ہو۔ پھر اچانک ہی ریشماں اپنی کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہو گئی اور بڑی چاہت کے ساتھ اُس کے کوٹ کے کھلے ہوئے بٹن لگاتی رہی اور اس سے پہلے کہ وہ والہانہ انداز سے اپنا سر اُس کے سینے پر رکھ دیتی۔ اُس نے کہا۔

"بہن صاحبہ! یہ آپ کیا کر رہی ہیں ۔۔۔۔؟"

ریشماں اپنے خیالات سے چونک گئی۔ اُسے محسوس ہوا جیسے پھر کسی نے اُسے زندگی کے تپتے ہوئے صحرا میں لا کر پٹک دیا ہو، جس کے سینے پر وہ والہانہ اپنا سر رکھنے جا رہی تھی وہ واجد نہیں کالج کا چپراسی تھا!

"یو ڈرٹی سوائن!" وہ زور سے چیخی اور ساتھ ہی ایک زور کا چانٹا اُس کے گال پر لگا کر اُس سے کہا۔

"گیٹ آؤٹ!" پھر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپائے روتی رہی ۔۔۔۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا وہ نخلستان کی ٹھنڈی چھاؤں سے زندگی کے تپتے صحرا میں آ گئی!!

غزل

پروفیسر کرامت علی کرامت ایم۔ایس سی

بکھری ہوئی ہر ایک طرف اپنی ذات ہے
کتنا حسین سلسلۂ کائنات ہے

ہے اِس کا حوصلہ کہ جلے گی تمام رات
صرصر کی زد میں گرچہ یہ شمعِ حیات ہے

یوں تو عروجِ آدمِ خاکی کی دھوم ہے
لیکن عروج اصل میں عرفانِ ذات ہے

روزِ ازل سے تیرہ نصیبی کا ہوں شکار
سورج ہے سر پہ، پھر بھی گماں ہے کہ رات ہے

لب پر مرے حسین سا نغمہ مچل گیا
شاید کسی لطیف تبسم کی بات ہے

دوشیزۂ بہار کی انگڑائیوں کی خیر
ہر سمت رنگ و نور کی دلکش برات ہے

تنہائیوں کے بوجھ سے دبنے لگا ہوں میں
یادوں کا اِک ہجوم مگر پھر بھی سات ہے

جس شے کو دیکھتا ہوں، فریبِ خیال ہے
دُنیا میں کس کی جیت ہے اور کس کی مات ہے

کیوں ہم کو بے ثباتیٔ عالم کا ہو ملال؟
آخر غمِ حیات بھی تو بے ثبات ہے

لذتِ عشق...

عُمر عادل

جامع مسجد، قلعہ، بریلی (اُتر پردیش)

خوشتر بھائی! تسلیم

. . . عشقِ بلاخیز کی آشفتہ سری، ہجر میں آنکھ سے ٹپکے لہو اور راحتِ وصل کی یہ داستان غالبؔ کے ایک شعر کی تشریح کرتی ہے جو فطرتِ عشق کے اُس انتہائی نازک اور پوشیدہ پہلو کو اُجاگر کرتا ہے جو معاملاتِ دل کی ایک حقیقت ہے۔ شعر نہیں بتاؤں گا ورنہ کہانی بے لطف ہو جائے گی۔ صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ کہانی کا عنوان اُس شعر کا ایک حصّہ ہے ــــ ریاض، جس سے آسیہ کو بہت شکوہ ہے، اپنے جذبۂ عشق میں کامل ہے۔ اُس کے جذبات میں کوئی کھوٹ نہیں، ہوس کا غلبہ بھی نہیں۔ حقیقت میں وہ تو اُس 'چیز' کی کمی کے احساس کا شکار ہے جو عشق کا سب سے بیش قیمت اور لطیف حاصل ہے اور جسے کچھ وہی جان سکتا ہے جس نے 'عشق' کیا ہو۔ 'رومان' لڑایا ہو۔ بہ الفاظِ دیگر اِس کردار کی سچائی کو صرف صاحبِ دل ہی جان سکتا ہے اور آپ کے صاحبِ دل ہونے میں شک نہیں۔ اِس لئے عشق کی یہ داستان آپ کو بھیج رہا ہوں۔ اِس یقین کے ساتھ کہ آپ اور "بیسویں صدی" پڑھنے والے 'لذّتِ عشق' سے لطف اندوز ہوں گے۔۔ "بیسویں صدی" پڑھنے والوں نے "پرائی چیز" کو اپنی سمجھ کر، اپنی رائے سے مجھے جس طرح نوازا اُس سے حوصلہ افزائی ہوئی . . .

آپ کا ــــــــ عُمر عادل

★

آسیہ کہتی ہے ــــ

"ریاض بھائی آپ تو وہی ہیں جس پر چراغ رکھا جاتا ہے ــــ یعنی ڈیوٹ ــــ میرا مطلب ہے بدّھو ــــ آپ بدّھو ہی تو ہیں ــــ کبھی آپ نے دیکھا کہ میرے بال کتنے سیاہ، کتنے لمبے اور چمکیلے ہیں۔ میں مُسکراتی ہوں تو میرے دائیں رُخسار میں کیسا خوبصورت گڑھا پڑ جاتا ہے اور میرے ہونٹوں کے نیچے یہ ننھا سا سیاہ تل . . . اُونہہ! آپ تو کچھ دیکھتے ہی نہیں ــــ

بدّھو کہیں کے!

"ریاض بھائی! آپ تو بالکل جے، غین، دال ہیں ــــ میرا مطلب ہے نِرے چُغد ــــ آپ کے لئے میں نے مہندی رچائی یہ سُرخ چُوڑیاں پہنیں، بالوں میں جُوہی کی کلیاں لگائیں اور یہ سُرخ رنگ کی لونگ، یہ بالیاں، یہ گلے میں نازک سی سُنہری زنجیر ــــ یہ سب آپ کے لئے سجایا۔ لیکن آپ نے جیسے دیکھا ہی نہیں۔"

"ریاض بھائی! آپ تو بے دال کے بودم ہیں ــــ

جی ہاں نہیں لگاؤ دی — میں پہروں آپ کی راہ تکتی ہوں اور آپ کو کلب، آرٹ اکیڈمی اور احباب سے فرصت ہی نہیں — گھر آئیں تو وہی کتابیں اور تصویریں — کتنی کتنی دیر آپ کے سامنے بیٹھی لیکن آپ کو بھی تصویریں بنانے سے فراغت ہی نہ ہوئی — [illegible] بیکار چیز کی طرح ایک طرف ڈال دیا ہو — کبھی تو دیکھا ہوتا کہ جب نگاہیں ٹکراتی ہیں تو روح کی گہرائی تک کیسی بازگشت پیدا ہوتی ہے۔"

کتنی بار چاہا کہ ریاض بھائی سے کہہ دوں — بھلا یہ بھی کوئی تک ہے کہ میں سامنے ہوں اور وہ لہنگا پہنے دیہاتی عورت کے بسورتے چہرے کو اور بھی مسخ کر رہے ہیں — اونہہ! ہر وقت تصویریں، کبھی برش سے، کبھی تصور میں تصویری — بھلا آرٹسٹ کہیں ایسے ہوتے ہیں — پتھر دل کہیں کے —! فنکار تو بہت حسّاس اور حسن شناس دل رکھتے ہیں — پھر بھلا عورت کے پیار کے بغیر فن میں سچائی کہاں سے آئے گی — یونہی جھوٹی تصویریں بناتے رہیں گے عمر بھر کوئی گھاس نہ ڈالے گا۔ جب انھوں نے دیکھا ہی نہیں کہ جب کسی کا ہاتھ تھام کر چپکے سے کچھ کہا جاتا ہے تو دل کیسے دھڑکتا ہے اور لووں پر کیسی سرخی ابھرتی ہے اور نگاہیں کس ادا سے جھک جاتی ہیں اور جب کوئی لڑکی خود کو اپنے ہی وجود میں چھپانے کی کوشش کرتی ہے تو جسم کس طرح سکڑ کر گٹھری بن جاتا ہے — بھلا انھوں نے دیکھا ہی کیا — جانتے ہی کیا ہیں — سب تصویریں جھوٹی ہیں — بے روح اوٹ پٹانگ تصویریں بناتے رہیں گے ساری زندگی اور کوئی پوچھے گا بھی نہیں کہ ہیں کس کھیت کی مولی — ہونہہ

ریاض کہتا ہے —

کتنی پُرسکون تھی میری زندگی۔ خوشحالی اور بے فکری — نہ کوئی غم نہ اندیشہ — کلب، آرٹ، اکیڈمی — احباب کی محفلیں — کتابیں اور تصویریں — کیسا رنگ روپ تھا زندگی میں۔

لیکن سعید نے میری زندگی میں چنگاریاں بھر دیں۔

کبھی ہم ساتھ کھیلا کرتے تھے — اُن دنوں حویلی میں کتنی رونق تھی۔ اسّی برس کے دادا ابا سے لے کر آٹھ برس کی آسیہ تک، حویلی میں کتنے افراد تھے — میں، سعید اور آسیہ، ایک بہن اور دو بھائیوں کی اولاد تھے جس نے ایک ساتھ پرورش پائی تھی۔

لیکن اب حویلی کتنی سونی ہے — خالو جان، خالہ جان، میں اور امّاں جی — اب سعید لکھنؤ سے تبادلے کے بعد یہاں آگیا تو حویلی میں کچھ رونق آئی — مگر میری زندگی جیسے سونی ہو گئی۔

ہر صبح آسیہ میرے کمرے میں آکر مجھے جگاتی تھی اور ہم دونوں ساتھ ناشتہ کرتے تھے — گھنٹوں میرے کمرے میں بیٹھی وہ مجھے بور کرتی تھی۔

'ریاض بھائی! آپ بھی کمال کرتے ہیں! بھلا یہ لہنگا پہنے دیہاتی عورت کیسے ہو گئی۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ نے کھلی ہوئی چھتری بنائی ہے!'

'ارے سچ!! یہ عورت کی ناک ہے! میں تو سمجھی کہ آپ نے اپنی ریزر مشین بنا دی ہے۔ سچ کہتی ہوں اگر یہ عورت کی ناک ہے تو بہت خطرناک ہے —'

آسیہ کو میری تصویروں سے چڑ تھی۔ وہ ہمیشہ اُن کا مذاق اُڑاتی، کتابوں اور تصویروں میں میری دلچسپی اور مصروفیت پر طنز کرتی اور اکثر مجھے اُس طنز اور مذاق میں رقابت کی بُو آتی تھی جیسے وہ محسوس کرتی ہو کہ میری یہ دلچسپی اُس کا حق تھی جسے ان کتابوں اور تصویروں نے چھین لیا ہو اور کون جانے کہ میری یہ دلچسپی اُسے حاصل ہوتی تو کیا ہوتا — آسیہ کے ساتھ میرا عشق یقیناً بہت قیامت خیز ثابت ہوتا۔ اتنی لق و دق حویلی میں اگر تین بوڑھوں کے درمیان دو جوان دل ایک دوسرے کے لئے دھڑکتے تو حویلی کا سکوت کیسے خاموش ہنگامے میں بدل جاتا — میں چاہتا تو آسیہ کے جسم کے اُجالے میری تنہائیوں کو منوّر کر دیتے اور اگر چاہتا کہ اُس کے جسم کے اُجالے کسی گناہ سے داغدار نہ ہوں تو صرف اظہارِ تمنّا کی دیر تھی اور آسیہ کو میری دُلھن بنا کر میری تنہائی میں بھیج دیا جاتا۔

لیکن میں نے آسیہ کے لئے ایسا کبھی نہ سوچا۔ مجھے یہ احساس ہی نہ ہوا کہ آسیہ کیا سے کیا ہو گئی۔ میرے نزدیک تو وہ

ایک بچی ہی کی طرح رہی جس نے بچپن میں سعید کی شہ پاکر میری ڈرائنگ کی کاپی پر پانی ڈال دیا تھا۔

سعید کے آنے پر میں خوش ہُوا تھا۔ لیکن جلد ہی خوشی [illegible] رنگ میں گھل گئی۔ آسیہ کے ساتھ مل کر سعید نے میری مفلسی کا مذاق اڑایا، مجھ پر حاوی ہونے کی کوشش کی اور آسیہ نے اپنی زندہ دلی کے اظہار کے لئے مجھے تختۂ مشق بنانا چاہا تو میں نے ایک انجانی سی شکست کا احساس کیا اور یہ احساس جلد ہی اِس حد کو پہنچ گیا کہ میرا جی چاہا سعید کو ٹھوکریں مار کر اپنے کمرے سے نکال دوں۔ کہہ دوں

'تین سو روپلی کا علم فروش تو کیا جانے فن کیا چیز ہوتی ہے —— نکل جا میرے کمرے سے!'

لیکن میں نہ یہ کہہ سکا نہ سعید کو ٹھوکریں مار کر نکال سکا۔ البتہ آہستہ آہستہ اُس کے لئے میرا رویّہ اتنا خشک ہو گیا کہ ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی ہماری ملاقات محض اتفاقیہ ہونے لگی۔

سعید کو اپنے سے دُور رہتا کر میں نے ایک سکون محسوس کیا۔ لیکن جلد ہی مجھے احساس ہُوا کہ میں کچھ تنہا سا رہ گیا ہوں جیسے میری کوئی قیمتی چیز تھی جسے سعید میرے کمرے سے اُٹھا کر لے گیا! اور تب پتہ چلا کہ آسیہ کو میرے کمرے میں قدم رکھے کئی دن گزر گئے!

اُس دن بھی جب آسیہ کی بجائے خادمہ ناشتہ لے کر آئی تو میں بہت جھنجلایا ہُوا تھا۔

'آسیہ بی کہاں ہیں —— اِتنے دن سے کیوں نہیں آئیں —— اب ناشتہ پر بھی نہیں آتیں کیا بات ہے؟'

'مجھے پتہ نہیں ——' خادمہ نے ایسی نگاہوں سے مجھے دیکھا کہ اسی لمحے میں نے محسوس کیا کہ مجھے یہ بات خادمہ سے نہیں پوچھنا چاہیئے تھی۔

'اچھا جاؤ اُنھیں بھیج دو ——' میں نے کہا اور خادمہ ناشتہ رکھ کر چلی گئی تو میں آسیہ کا انتظار کرنے لگا —— پھر چائے ٹھنڈی ہو گئی —— کمرے میں رہنے والی چڑیاں ریزہ ریزہ کر کے نمک پارے کھا گئیں لیکن آسیہ نہ آئی۔

میں نے ناشتہ نہیں کیا۔

بہت دیر بعد آسیہ نے اِس طرح کمرے میں قدم رکھا جیسے کسی بھولی ہوئی جگہ پر آئی ہو۔

'ارے آپ نے ناشتہ نہیں کیا —— ؟ آج تو میں نے بہت چٹ پٹے نمک پارے بنائے تھے۔ سعید بھائی تو ہونٹ چاٹتے رہ گئے!' آسیہ ناشتہ کی ٹرے دیکھتے ہوئے بولی۔

'تم نے تو غالباً صبح کا ناشتہ چھوڑ دیا ہے ——' میں نے طنز کیا۔

'ارے نہیں ——' آسیہ مسکرائی —— 'سعید بھائی کالج جاتے ہیں نا اُن کی وجہ سے ناشتہ بہت سویرے تیار کرنا پڑتا ہے۔ میں اُنھیں کے ساتھ ناشتہ کر لیتی ہوں —— آپ تو دن چڑھے سو کر اُٹھتے ہیں۔' آسیہ نے یوں کہا جیسے معمول کی یہ تبدیلی کوئی خاص بات نہ ہو۔

'تمھارے جمپر کا ڈیزائن بہت اچھا ہے،' میں نے موضوع بدلنا چاہا۔

'ہاں مجھے بھی بہت پسند آیا۔ سعید بھائی نے لاکر دیا تھا۔ اُن کا انتخاب اچھا ہے نا —— ؟' آسیہ بولی۔

'ہاں —— سعید کا انتخاب اچھا ہے ——' میں نے کہا تو مجھے محسوس ہُوا جیسے ایک احساس شکست میرے دل کو دبا رہا ہے۔

پھر یہ دباؤ بڑھتا ہی گیا اور اُس دن اپنی انتہا پر پہنچ گیا جب میں نے سُنا

'آسیہ! تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ میں تمھیں کتنا چاہتا ہوں ——!'

'آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ آپ کو پاکر میں کیا محسوس کرتی ہوں —— ؟'

'کیا محسوس کرتی ہو؟'

'محسوس ہوتا ہے جیسے برسوں گرم ریت پر دھوپ میں پیاسی چلتے چلتے کسی سایہ دار ٹھنڈے چشمے کے کنارے آگئی ہوں!'

'وعدہ کرو کہ اب اِس کنارے سے واپس نہ جاؤ گی۔ یہیں ہم ایک گھر بنائیں گے ——'

پھر سعید نے اپنا ہاتھ آسیہ کی طرف بڑھا دیا جسے آسیہ نے

ہونٹوں سے لگالیا۔

میں بہت بوجھل قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں آکر مسہری پر گر گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے جو کچھ سعید نے آسیہ سے کہا وہ سب میرے دل میں تھا اور جو کچھ آسیہ نے اُس سے کہا وہ سب سُننے کے لئے ایک عرصہ سے میرے کان ترس رہے تھے۔ لیکن اِن سب باتوں سے میں بے خبر تھا ۔۔۔ اُس رات میں صبح ہونے تک جاگتا رہا اور صبح جب سعید کالج چلا گیا تو میں آسیہ کے کمرے میں گیا۔

"ارے آپ ۔۔۔؟" مجھے دیکھ کر آسیہ حیران ہوئی۔

"ہاں ۔۔۔ بہت دن ہو گئے تھے تم سے باتیں کئے ۔۔۔ تم نہ آئیں تو میں ۔ ۔ ۔"

"کیا بتاؤں ۔۔۔ فرصت ہی نہیں ملتی ۔۔۔" آسیہ میری بات کاٹ کر بولی۔

"ہاں ۔۔۔ میں جانتا ہوں اب تمہیں فرصت نہیں ملتی ۔۔۔" میرے لہجے پر آسیہ نے اِس طرح چونک کر میری طرف دیکھا جیسے میں نے وہ سب دُہرا دیا ہو جو گزشتہ شب سُنا تھا۔

"آپ کی آنکھیں سُرخ ہو رہی ہیں جیسے ساری رات جاگے ہوں ۔۔۔" آسیہ بولی۔

"پتہ نہیں ۔۔۔ کبھی کبھی انسان جاگتے میں بھی سویا رہتا ہے اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ سوتے میں بھی جاگتا ہے ۔۔۔ میں برسوں سویا رہا اور اب ایسا ہونے لگا ہے کہ سونے میں بھی جاگتا ہوں ۔۔۔" میں نے اپنی دانست میں آسیہ سے جیسے سب کچھ کہہ دیا۔

"اوہو ۔۔۔ اب تو آپ مصوّر ہونے کے ساتھ ساتھ فلسفی بھی بن گئے ۔۔۔!" آسیہ نے مُسکرا کر کہا اور اُس کی یہ مُسکراہٹ مجھے بہت ناگوار گزری ۔۔۔

سعید نے میری زندگی میں چنگاریاں بھر دیں۔

میں آسیہ کو چاہتا ہوں ۔۔۔ آسیہ سعید سے محبت کرتی ہے اور سعید اُسے اپنانا چاہتا ہے ۔۔۔ یہ حقیقتیں کتنی ٹھوس تھیں جنھوں نے تیز نشتروں کی طرح میرے وجود کو ہر طرف سے گھیر لیا تھا ۔۔۔ ذرا سی جنبش پر بھی یہ نشتر میرے چُبھ جاتے تھے اور اُن کے اندر چنگاریاں پھوٹنے لگتی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ چنگاریاں بڑھتی گئیں۔ انھوں نے میری تصویروں اور کتابوں کو چاٹ لیا ۔۔۔ پھر یہ چنگاریاں کلب میں بلیرڈ کی میز پر پھیل گئیں ۔۔۔ آرٹ اکیڈمی میں بکھر گئیں اور میرا سب کچھ جلنے لگا۔

"شریں میں نے چاہا آسیہ کو بتا دوں کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے ۔۔۔ کیسا دھواں سا میرے سینے کے اندر گھُٹ رہا ہے ۔۔۔ کیسا بوجھ دل پر آپڑا ہے کہ میری رُوح تک دبی جا رہی ہے ۔۔۔ میرا سب کچھ جل رہا ہے۔ میرا فن، میرا شوق، میری دلچسپی سب کچھ مجھ سے چھنتا جا رہا ہے!

لیکن میں آسیہ سے کیا کہتا۔ آسیہ تو سعید سے محبت کرتی تھی۔ اُس کے ہاتھوں میں ہاتھ دئے تیزی سے آگے بڑھتی جا رہی تھی اور اب بہت دُور نکل گئی تھی اور میں خاموش اور آشفتہ سر کھڑا اُسے جاتے دیکھ رہا تھا ۔۔۔ میں اُسے آواز دیتا بھی تو وہ کب سُن پاتی اور سُن بھی لیتی تو واپس کیوں لوٹتی۔ بھلا پیچھے رہ جانے والوں کی صدا کون سُنتا ہے، کون اُن کی خاطر پلٹتا ہے!

میرے دن ویران اور راتیں بے خواب ہو گئیں ۔۔۔

جب سعید کالج چلا جاتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ کسی تاریک زنداں سے نکل کر کھلی فضا میں کچھ دیر رہنے کا مجھے موقع مل گیا ہو۔ میں آسیہ کے پاس جاتا اور محسوس کرتا کہ وہ میری ہے اور پھر جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا میرے دل پر ایک بوجھ بڑھنے لگتا ۔۔۔ اب سعید واپس آئے گا ۔۔۔ اس کمرے میں وہ اور آسیہ پیار بھری باتیں کریں گے اور میں اپنے کمرے میں گرد آلود اور نامکمل تصویروں کے بیچ خاموش پڑا آسیہ اور سعید کی تنہائی کی سرگوشیوں اور سرگرمیوں کے تصوّر کی آگ میں جلتا رہوں گا ۔۔۔ یہ سوچ کر میرا دل ڈوبنے سا لگتا اور آسیہ کے پاس ہی رہنے کی خواہش شدید ہو جاتی۔

میں خود کو اُس کمزور بچے کی طرح محسوس کرتا تھا جس کے کسی من چاہے کھلونے پر کسی طاقتور بچے نے زبردستی قبضہ کر لیا ہو اور وہ بہت حسرت سے اُسے اپنے کھلونے سے کھیلتا دیکھتا ہو۔ جب تھوڑی دیر کے لئے طاقتور بچہ کہیں چلا جاتا ہو تو

وہ ڈرتے ڈرتے کھلونے سے کھیلنے لگتا ہوا اور پھر طاقتور بچے کو آتا دیکھ کر کھلونا چھوڑ کے دُور ہٹ جاتا ہو۔

سعید نے میرا سب کچھ چھین لیا ـــــ میری تصویروں اور مصوری کے سامان پر دھول جم گئی۔ میں نے کلب جانا چھوڑ دیا، آرٹ اکیڈمی بند کر دی ـــــ [illegible] یا کسی ریسٹورنٹ کے تنہا گوشے میں بیٹھ سوچا کرتا ـــــ [illegible] دوں؟

لیکن میں کر ہی کیا سکتا تھا؟

ایک دن ـــــ

میرے ایسے ہی لب دیکھ کر کہا ہو گا

نازکی اُس کے لب کی کیا کہیے

پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

سعید نے کہا اور آسیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

'کتنے نرم، کتنے نازک ہیں یہ ہاتھ ـــــ اِن پر مہندی رچے گی تو کتنے خوبصورت معلوم ہوں گے اور آدھے چاند جیسی اِس پیشانی پر جھومر لگے گا تو یہ کیسی حسین نظر آئے گی ـــــ اِن رخساروں کی شفق میں جب حیا کا رنگ گھُلے گا تو کیسی قیامت جاگ اُٹھے گی!'

میں نے دیکھا سعید کے بازو آسیہ کے گرد پھیلے اور جیسے پھولوں سے لدی شاخ لچک گئی ـــــ پھر سعید کے ہونٹوں نے آدھے چاند کو چھوا اور شفق میں رنگ گھولتے ہوئے گلاب کی پنکھڑی پر ٹھہر گئے۔

اور پھر آسیہ سعید کے بازوؤں کا سہارا لئے کمرے سے نکلنے لگی تو دل کو ایک ہاتھ سے دبائے ہوئے بے جان قدموں سے میں اپنے کمرے میں آیا اور پھر ساری رات اُن تصویروں سے نظریں بچانے کا جتن کرتا رہا جن میں سعید کے ہونٹ آدھے چاند کو چھو رہے تھے، شفق میں رنگ گھول رہے تھے اور گلاب کی پنکھڑی پر ٹھہر گئے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ یہ تصویریں تو میری تھیں جنھیں سعید نے چھین لیا ـــــ میں بہت پہلے سے جانتا تھا کہ آسیہ کے لبوں کو گلاب کی پنکھڑی سے کیا نسبت ہے۔ اُس کی آنکھوں میں کیسا جادو ہے ـــــ رخساروں پر کیسا رنگ ہے اور جسم کے خطوط میں کون سی قیامت سوتی ہے ـــــ میں تو برسوں سے اِس تمام حُسن کو اپنی تصویروں میں ڈھال رہا تھا لیکن مجھے خود معلوم نہ تھا۔

صبح جب میں بستر سے اُٹھا تو سب سے پہلے میں نے اُس تصویر کے دو ٹکڑے کر کے الماری کے پیچھے ڈال دئے جو لہنگا پہنے ایک دیہاتی عورت کی تھی جسے آسیہ چھتری سمجھتی تھی اور میں اپنا شاہکار!

وقت گزرتا گیا اور میں اپنی آگ میں خاک ہوتا رہا ـــــ آسیہ سعید کا ہاتھ تھامے زندگی کی راہ پر آگے بڑھتی رہی اور اُن کے قدموں سے اُڑنے والی دھول میرے سارے وجود پر جمتی گئی۔ میرے سینے میں دھواں بن کر گھٹتی رہی، اور میں بہت حسرت اور بے بسی کے ساتھ خاموشی سے سب کچھ دیکھتا رہا ـــــ میں نے چاہا اِس دلخراش منظر سے آنکھیں پھیر لوں۔ لیکن ایسا نہ کر سکا ـــــ میں نے سب کچھ فراموش کرنا چاہا ـــــ اپنی دُنیا، اپنی زندگی میں لوٹنے کی کوشش کی ـــــ میں نے دل کو اِس پر آمادہ کرنے کے جتن کئے، سوچا حویلی ہی نہیں شہر تک چھوڑ دوں اور جب میں یہ سب نہ کر سکا تو بہت بے بسی سے میں نے خود کو یہ سمجھانا چاہا کہ اگر آسیہ سعید سے محبت کرتی ہے تو اِس میں میرے لئے دُکھ کی کوئی بات نہیں ـــــ اِس خود فریبی کا شکار ہونا چاہا کہ میں آسیہ سے نفرت کرتا ہوں اور اپنے کو یہ احساس دلانا چاہا کہ آسیہ میرے قابل نہ تھی۔ مجھے تو ایسی لڑکی چاہیئے جسے فن سے پیار ہو۔ آڑی ترچھی لکیروں اور ہلکے گہرے رنگوں کی زبان سمجھ سکے۔

لیکن میں اپنی ہر کوشش میں ناکام ہو گیا۔

اور پھر ایک وقت آیا کہ مجھے اپنی اِس آگ ہی میں ایک سکون ملنے لگا ـــــ راتوں کی بے خوابی، دل کا بوجھ، سینے کی ہُوک اور دل تک پھیل جانے والا دھواں مجھے کہ ایسی راحت بخشنے لگا جسے واضح طور پر میں خود نہ سمجھ سکا۔ آسیہ اور سعید کے دلی رشتے سے جو اذیت مجھے ہوئی اُسی میں ایک ایسی لذت میں پانے لگا جس کا کوئی نام نہیں ـــــ آہستہ آہستہ یہ سکون، یہ راحت اور یہ لذّت مجھے ایک قیمتی سرمایہ محسوس ہونے لگی اور میں نے یہ خواہش کی کہ یہ سب کچھ یونہی رہے۔ یہی لذت جو میں پانے لگا تھا، میرے پیار کا حاصل تھی ـــــ اپنا سب کچھ کھو کر میں نے راتوں کی بے خوابی کا جو سکون اور جو لذّت پائی تھی یہی میری

سب سے بڑی دولت تھی جو ہجر کی بیقراریوں سے ملتی ہے اور وصل کی دلفریبیوں میں لُٹ جاتی ہے —— سعید کیا جانے کہ اُس نے [illegible] کیا کھو دیا اور میں نے آسیہ کو کھو کر کیا پا لیا!

لیکن پھر بھی کبھی کبھی غم سے گھبرا کر میں آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا لیتا —— 'معبود! مجھے اُٹھا لے یا سعید کو کہ اب ایسے جیا نہیں جاتا ——!'

اور ایک انتہائی جان لیوا رات کی یہ دُعا ربِّ کریم نے سُن لی۔

سعید ایک کار کے حادثے میں ہلاک ہو گیا۔

سعید کی موت سے آسیہ پر ایک قیامت ٹوٹی اور میرے لئے ایک قیامت ختم ہو گئی!

سعید کی موت آسیہ کے لئے اتنی شدید ٹھوکر تھی جس سے شاید وہ کبھی سنبھل نہ پاتی۔ اگر میری محبت اُسے تھام نہ لیتی اور میری دلجوئی اُسے سہارا نہ دیتی —— صبح سے رات تک میں آسیہ کے پاس رہتا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اگر میں نے اُسے تنہا چھوڑ دیا تو موت اُسے مجھ سے چھین لے گی اور وہ مر گئی تو میں جی نہ سکوں گا۔

میں آہستہ آہستہ اُس کے ذہن سے سعید کی یادیں ہٹاتا رہا —— اُس کے زخم پر اپنی محبت کا مرہم رکھتا رہا اور آہستہ آہستہ اُس سے وہ سب کچھ کہتا رہا جو اُس کی چاہ میں مجھ پر گزری تھی اور وہ بہت غور سے سب کچھ سُنتی رہی۔ وقت گزرتا رہا ——

آسیہ آخر ایک انسان تھی جس کی فطرت میں کسی کو چاہنا بھی ہے اور اپنے کو چاہے جانے کی تمنا کرنا بھی —— ایک دن آیا کہ میری محبت کی سرگوشیوں نے آسیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کو اُبھارا اور فطرت نے اُس مسکراہٹ کی حفاظت کی۔

پھر میں نے دیکھا کہ آدھے چاند کو جب ہونٹ چھوتے ہیں تو رُوح تک کیسی ٹھنڈی چاندنی پھیل جاتی ہے، رُخساروں کی شفق میں جب کسی کے لب حیا کا رنگ گھولتے ہیں تو رنگ کس طرح رُوح تک رچ بس جاتا ہے اور جب ہونٹ گلاب کی پنکھڑی پر ٹھہرتے ہیں تو ساری زندگی کس طرح مہک اُٹھتی ہے۔

رفتہ رفتہ آسیہ میری والہانہ محبت میں کھو گئی ——

میں نے اپنے جذبات کی پُوری شدت اور سچائی سے اُس کی فطرت کے اُس خلاء کو پُر کر دیا تھا جو سعید کی موت نے پیدا کیا تھا اور ہمارے درمیان دل کا یہ رشتہ دونوں کے لئے ایک ایسی نئی زندگی بن گیا تھا جو ہر انسان کا فطری حق اور ضرورت ہے۔

لیکن ——

رفتہ رفتہ میں نے اپنی رُوح میں ایک انجانے خلاء کا احساس کیا اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ یہ خلاء بڑھتا گیا —— محسوس ہوتا تھا جیسے میں نے کوئی ایسی قیمتی چیز کھو دی ہے جس سے میں خود واقف نہیں۔

آسیہ کہتی ہے ——

'جی چاہتا ہے کھٹمل مارنے کا یہ زہریلا لوشن ریاض کے کھانے میں مِلا دوں اور جب وہ دَم توڑنے لگے تو پوچھوں —— بتاؤ یہ کیسا مذاق تھا —— کیسا کھیل تم نے کھیلا —— کون سا انتقام لیا گیا مجھ سے ——؟'

کاش دل لے کر اگر پہروں میں نے ریاض کی محبت بھری نظروں کا انتظار کیا تھا تو یہ کوئی جُرم تو نہ تھا۔ ریاض کی محبت کی

طلب گار تو ہر عورت ہوتی ہے ——— گدائے عشق تو ہر انسان ہوتا ہے یہ الگ بات ہے کہ کوئی سوال کر دیتا ہے اور کوئی خاموش رہتا ہے۔

پھر یہ کاسۂ دل اگر سعید نے اپنی محبت سے بھر دیا اور میں نے اس بخشش کو متاعِ حیات سمجھ کر اپنے سینے میں چھپا لیا تو کیا یہ خطا کی تھی اور تب اگر ریاض تڑپ اٹھا تو اس میں میرا دوش کیا تھا ——— میں جانتی تھی کہ ریاض ایک آگ میں جل رہا ہے لیکن میں اُسے کیسے بچا سکتی تھی ——— محبت کوئی ایسی چیز تو نہ تھی جسے میں دُوسروں میں تقسیم کر دیتی ——— میں نے محبت کو کھیل یا مشغلہ نہیں بنایا تو کیا بُرا کیا ——— پھر میری متاعِ حیات لُٹ گئی اور میں نے زندہ رہنے کے لئے ریاض کی اُس محبت میں پناہ ڈھونڈی جو میرے گرد ایک حصار بنتی جا رہی تھی تو کیا یہ گناہ تھا۔ زندگی سے پیار تو سب کرتے ہیں ——— زندہ رہنے کو سہارا کون نہیں چاہتا۔ پھر اتنی شدید محبت سے دامن بچانا ایک عورت کے لئے ممکن بھی تو نہیں ہوتا ——— میں نے سعید کو پُوری سچّائی سے چاہا ——— میری رُوح اُس کے لئے سوگوار رہی ——— اور پھر میں نے اتنی ہی سچّائی سے ریاض کو اپنا سمجھا اور زندگی سکون سے گزارنا چاہی تو یہ سب فطری بات تھی ——— پھر ریاض نے یہ سب کیوں کیا ——— میں جانتی ہوں وہ آج بھی مجھے چاہتا ہے ——— اُس کی محبت میں پُوری سچّائی ہے ——— لیکن پھر بھی اُس کی محبت میرے لئے پناہ بن کر سزا کیوں بنتی جا رہی ہے ———؟

کبھی جی چاہتا ہے ریاض سے اِس قدر دُور چلی جاؤں کہ وہ پھر اُسی بے تابی اور دیوانگی سے میری آرزو کرے ——— نجانے وہ بیتابیاں، وہ ہر لمحہ مجھ پر رہنے والی نِگاہیں، وہ مجھ سے بات کرنے کے بہانے، مجھے چھُونے کی وہ تمنّا اور میرا انتظار ——— رفتہ رفتہ وہ سب کچھ نہ جانے کہاں کھو گیا!

کبھی جی چاہتا ہے اُس کمرے کو میں آگ لگا دوں جِن کی ہر شے کو ریاض نے پھر اِس طرح سنوارا ہے جیسے اُس کے اندر وہی سب کچھ ہے ——— تصویریں اور کتابیں پھُونک دوں، حویلی کے دروازے میں تالا ڈال دوں اور ریاض کے پیروں میں زنجیر بن جاؤں ——— کہ مت جاؤ ——— خُدارا آرٹ اکیڈمی پھر بند کر دو۔ کلب پھر چھوڑ دو ——— اِن تصویروں کو جلا دو اور ایک بار پھر اُسی انداز سے میرے پاس آؤ جیسے سعید کی زندگی میں اور اُس کی موت کے بعد آتے تھے ——— خُدا کے لئے مجھے بتا دو کہ اُس دن تم اپنے دوست سے کِسی کھوئی ہوئی لذّت اور رُوح میں کِس خلاء کا ذکر کر رہے تھے ———؟

جس دن ریاض نے الماری کے پیچھے سے اُس تصویر کے ٹکڑے نِکال کر پھر جوڑے جس میں لہنگا پہنے دیہاتی عورت کھڑی تھی، اور وہ اُس تصویر کو پھر بنانے لگا تو ایک بار پھر میں نے خود کو ریاض کے کمرے میں پڑی ہوئی کِسی بیکار تصویر کی طرح محسوس کیا۔

میں جانتی ہوں ریاض پُوری سچّائی سے مجھے آج بھی چاہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جھُوٹ نہیں بولتا۔ لیکن پھر بھی میں اِس احساس کو کیا کروں جو مجھے کھائے جا رہا ہے ——— ایک عجیب سی کمی کا احساس ——— کچھ کھو جانے کا احساس ——— اپنے لئے ریاض کی اُس دیوانگی کو کہاں سے پاؤں جو کتابوں، تصویروں، کلب اور آرٹ اکیڈمی میں کھو گئی۔ وہ کون سا خلاء ہے جس کا احساس اُسے ستانے لگا ——— وہ لذّت اُسے کہاں سے دوں جس کے کھو جانے کا اُسے ملال ہے۔ میں تو کچھ جان نہیں پاتی پھر کیا کروں، کیسے کروں ———؟

کبھی جی چاہتا ہے چیخ چیخ کر ریاض سے پُوچھوں ——— ایسا بھی کیا کہ میں تمھاری راہ تکوں اور تم کلب میں بلیرڈ کی میز پر گیندیں لُڑھکاتے رہو ——— امیں گھنٹوں تمھارے سامنے رہوں اور تم بے ہنگم تصویریں بناتے رہو ——— بتاؤ کیا میرا کوئی وجود نہیں ———؟

اور کبھی جی چاہتا ہے ریاض کے قدموں میں سر رکھ دوں ——— "سُنو ریاض! تم مجھ سے شادی مت کرو ——— امّاں جی سے کہو کہ وہ پیام واپس لے لیں۔ لیکن خُدارا اِس چھتری نما عورت کی اِس تصویر کو اب مت بناؤ ———!!"

مُدیرِ بیسویں صدی کے نام خط لکھتے وقت اختصار سے کام لیا کریں تاکہ آپ کے ارشاد کی تعمیل فوراً ہو سکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے۔

غزل

شباب للت ایم اے

بجھ چلا ہوں نہ پھر جلا مجھ کو
کر دے اب قید سے رہا مجھ کو

ریزہ ریزہ بکھر نہ جاؤں کہیں
یوں نہ آنکھوں سے تو گرا مجھ کو

اس شکستہ غرور کے صدقے
جس نے انساں بنا دیا مجھ کو

جانے اب کس جنم میں ہوگا ملن
ہو سکے گر تو بھول جا مجھ کو

اشتیاق اجنبی جزیروں کا
پھر سمندر میں لے گیا مجھ کو

مسکراتا بھی ہوں تکلف سے
لگ گئی شہر کی ہوا مجھ کو

میں نے سب کا سلوک دیکھ لیا
اب کسی سے نہیں گلا مجھ کو

خاک لوٹوں میں زندگی کی طرف
کوئی تجھ سا نہ جب ملا مجھ کو

آہ کن راستوں پہ ڈال گیا
تیرا مڑ مڑ کے دیکھنا مجھ کو

ہیں گھڑی بھر ملا تھا اُس سے شباب
عمر بھر کی ملی سزا مجھ کو

غزل

محمد حامد، حامدؔ سہارنپوری

دل راہِ طلب میں جو پریشان رہا ہے
یہ بھی غمِ جاناں ترا احسان رہا ہے

جس طرح رہا کرتی ہے خوشبو گلِ تر میں
یوں دل میں ترے پیار کا ارمان رہا ہے

کوئی نہ ہوا جس کا نگہبان جہاں میں
اُس شخص کا اللہ نگہبان رہا ہے

انساں کو فرشتوں نے کیے ہیں کبھی سجدے
مسجودِ ملائک کبھی انسان رہا ہے

ممکن ہے پہنچ جائے وہ رہروِ سرِ منزل
جو خاکِ رہِ شوق ابھی چھان رہا ہے

اِس دور کا انساں تجھے اے شاہدِ فطرت
پہچاننا مشکل سہی، پہچان رہا ہے

مسمار کیا جس نے مرے کعبۂ دل کو
دل ہے کہ اُسی بُت کو خدا مان رہا ہے

کچھ ہم بھی زمانے سے پریشان رہے ہیں
کچھ ہم سے زمانہ بھی پریشان رہا ہے

کونین کے جلوے نہ ہوں کیوں اُس پہ نچھاور
جس دل میں تری دید کا ارمان رہا ہے

ہو جائیگا حامدؔ کبھی بیزارِ طلب بھی
انسان ابھی رازِ طلب جان رہا ہے

چمیلی کی شاخ

اظہار الاسلام بی۔ کام

"شہرِ افسانہ"۔ جامع مسجد لین، رانی گنج (ویسٹ بنگال)

گرامی قدر قبلہ خوشتر صاحب! ہدیۂ خلوص و عقیدت

میں ایک ندی اور آپ ایک سمندر۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ سے ملوں۔ میں صفر ہوں اور آپ اِکائی۔ کاش! آپ سے ملنے کی کوئی سبیل پیدا ہو۔ سُنا ہے آپ جسے چھُو دیتے ہیں وہ جادو داں ہو جاتا ہے۔ واقعی آپ بیسویں صدی میں "بیسویں صدی" کے سفینہ کے ایک ایسے نا خُدا ہیں جس پر مسافروں کو پُورا اعتماد ہے۔ میں بھی تو ایک مسافر ہوں اور آپ کی بدولت کنارے لگ کر فنِ افسانہ نگاری کی بلندیوں کو چُھونا چاہتا ہوں۔ لیجئے ایک افسانہ حاضر ہے "چمیلی کی شاخ"۔ اُمید ہے آپ اِسے ضرور شائع کریں گے۔ مجھے آپ پر پُورا اعتماد ہے اور اِس اعتماد کی وجہ ہے نئے افسانہ نگاروں کے ساتھ آپ کا بے پایاں خلوص . . . !

آپ کا ——— اظہار الاسلام

★

میں نے کال بیل پر اُنگلی رکھی ہی تھی کہ ایک چمیلی کی شاخ باہر آئی۔ میں نے اُس کے ہاتھ میں دُودھ کی بوتل تھما دی۔ دروازہ پھر بند ہو گیا۔ میں نہ جانے کتنی دیر تک وہاں کھڑا اُس کے بارے میں سوچتا رہا۔ کون تھی وہ . . . ؟ کیا نام تھا اُس کا . . . ؟ وہ شوخ تھی کسی رنگ کی طرح، معصُوم تھی کسی لکیر کی طرح، خاموش تھی کسی تصویر کی طرح، سادہ تھی کسی حقیقت کی طرح!

شہر میں نیا نیا ڈیری فارم کھلا تھا۔ میرے ہاسٹل کے رُوم میٹ اختر کے گھر سے اُس کے لئے بہت قلیل رقم آتی تھی۔ اِس لئے اُس نے اپنی ضرورتیں پُوری کرنے کے لئے اُس فارم سے رشتہ جوڑ لیا تھا۔ اُسے بس ہر صُبح پچاس ساٹھ گھروں میں دُودھ کی بوتل پہنچانا پڑتی تھی، جس کے عوض خاصی آمدنی ہو جاتی تھی لیکن اچانک گذشتہ رات اُس کی طبیعت علیل ہو گئی اور صُبح وہ اِس قابل نہ رہا کہ ڈیوٹی پر جا سکے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے دوست کی آمدنی میں تخفیف ہو۔ اِس لئے اُس کی جگہ میں ڈیوٹی پر چلا گیا۔ اختر سے مجھے گہرا اُنس تھا۔ وہ کالج کا ایک ہونہار طالب علم ہی نہ تھا، اُس کے سینے میں پُر خلوص دل بھی تھا جو ہر وقت دُوسروں کی مدد کے لئے تڑپتا رہتا تھا۔

مجھے اُس کام کا قطعی تجربہ نہ تھا۔ ناموں کی لِسٹ نہ ہوتی تو سارا حساب چوپٹ ہو جاتا۔ صُبح صُبح عجیب عجیب لوگوں سے واسطہ پڑا۔ کسی دروازے پر آنکھیں مَلتی ہوئی بیویاں ملیں تو کہیں روتے چنگھاڑتے بچّے، کہیں کوئی مُنہ پھٹ دربان مِلا تو کہیں خونخوار کُتّے۔ کسی دروازے پر کوئی اَلھڑ دوشیزہ ملی تو کہیں کھوسٹ بُڑھیا۔ لیکن آخری دروازے پر جو لڑکی ملی وہ میرے ہوش و حواس پر پکاسو کی تصویر کی طرح چھا گئی اور مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔

اُس دن کالج میں میرا ذرا بھی دل نہ لگا۔ میری نظروں کے

سامنے بار بار اُس کی شبیہ اُبھرتی اور مجھ پر نشہ سا طاری ہو جاتا۔ کلاس میں پروفیسر کا لکچر بھی بور معلوم ہُوا۔ لائبریری میں بھی طبیعت نہ جمی۔ کینٹین کا شور بھی ڈسنے لگا تو گھبرا کر میں نے انجنا میں میٹنی شو کا ٹکٹ لے لیا۔ لیکن وہاں سے بھی فلم ادھوری چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ دل چاہتا تھا کہ بس صبح ہو جائے اور میں اُڑ کر اُس کے پاس پہنچ جاؤں!

دُوسرے دن بھی اختر کی طبیعت علیل رہی۔ میں نے اُس دن اپنا سب سے بہترین لباس زیب تن کیا اور نیونڈر کی پُوری شیشی اُس پر خالی کر دی۔

آخری دروازے پر پہنچنے سے پہلے میں نے اپنے لباس کو ٹھیک کیا۔ بالوں پر ہاتھ پھیرے اور کال بیل پر میں نے اُنگلی رکھ دی۔ دروازہ کُھلا اور اُسی چمپئی کی شاخ نے میری طرف دیکھے بغیر دُودھ کی بوتل لی اور دروازہ بند ہو گیا۔

اُف! اُس نے میری طرف دیکھا تک نہیں! نہ میرے کپڑوں پر نظر ڈالی نہ لیونڈر کی خوشبو ہی سُونگھی۔ میں بوجھل قدموں سے لَوٹ پڑا۔

پھر تیسرے چوتھے پانچویں دن بھی وہی ہُوا۔ البتہ چھٹے دن اُس نے ایک اُچٹتی نگاہ مجھ پر ڈالی۔ ساتویں دن اُس نے کچھ رُک کر دیکھا۔ آٹھویں دن اُس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک تھی۔

ایک دن صبح جب میں اُس کے دروازے پر پہنچا تو بیل کی آواز سُن کر کسی اور نے دروازہ کھولا۔ میں اتنے زور سے چونکا کہ میرے ہاتھ سے دُودھ کی بوتل چھوٹتے چھوٹتے بچی۔

اگلے دن بھی دروازے پر وہ نہ تھی۔ میں نے دُودھ کی بوتل دیتے ہوئے لڑکے سے اُس کے بارے میں پُوچھا تو اُس نے بتایا کہ وہ بیمار ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی انکشاف ہُوا کہ وہ اِس گھر کی مُلازمہ تھی۔

اُس کے دُوسرے دن اختر چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔ میں نے اختر سے کہا کہ وہ مجھے بھی اِس کام میں اپنا ساتھی بنا لے لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہُوا۔ اُس نے میری بات کو قہقہے میں اُڑا دیا۔

میں کالج کی راہ سے ہاسٹل لوٹ۔ ! تاکہ وہ راستے میں

پکار دی۔ وہی تھی! وہی چھوٹی موٹی جیسی! جسے چھو دو تو سمٹ کر رہ جائے۔
وہ میرے قریب سے گزری۔ مجھ پر ایک اجنبی سی نگاہ ڈالتے ہوئے۔
اُس وقت اُس کی آنکھوں میں کچھ نہ تھا۔ نہ اپنائیت، نہ غصہ، نہ یگانگت، نہ بے تعلقی، نہ کرب نہ انبساط۔ عجیب سی کھوئی کھوئی خالی خالی آنکھیں۔ میں بہت دیر تک اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ میرے دل میں خلش کی ایک لکیر کھینچتی ہوئی وہ حدِ نگاہ سے اوجھل ہو گئی۔

ہاسٹل پہنچا تو ٹیبل پر پڑا ایک تار میری راہ دیکھ رہا تھا۔ والد صاحب کی طبیعت تشویشناک تھی۔ مجھے فوراً بلایا گیا تھا۔ میں اُسی وقت بیڈنگ وغیرہ کس کر اسٹیشن کی طرف بھاگا۔ جلدی میں اختر سے بھی نہ مل سکا۔ ویسے اُس کی اطلاع کے لئے میں نے وہ تار ٹیبل پر چھوڑ دیا تھا۔

گھر پہنچا تو والد صاحب بسترِ مرگ پر پڑے تھے۔ دیکھتے دیکھتے اگلے ہی دن وہ ہمیں چھوڑ کر دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

گھر کی افراتفری، بزنس کی دیکھ بھال، میں گھر میں سب سے بڑا تھا، اِس لئے ساری ذمہ داریاں میرے ناتواں کندھے پر آ پڑیں اور میں دب کر رہ گیا۔

دو سال بعد مجھے کولفیلڈ ایکسپریس سے کلکتہ جانا پڑا۔ اگلے اسٹیشن پر جب گاڑی رُکی تو کمپارٹمنٹ میں ایک ایسا شخص داخل ہوا جسے دیکھ کر میں خود کو نہ روک سکا اور دوڑ کر اُس سے لپٹ گیا۔ اُس نے بھی غالباً مجھے پہچان لیا تھا۔ سارے مُسافر حیران تھے۔ وہ اختر تھا! میرے ہاسٹل کا ساتھی، میرا جگری دوست جسے وقت کی بے رحم آندھی نے کہیں دور پھینک دیا تھا۔ لیکن آج پھر ہم گلے مل رہے تھے۔

"سُناؤ یار کیا حال ہے؟ کیسی گزر رہی ہے زندگی؟" میں نے سیٹ پر اُس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے پُوچھا۔

"ارے یار! بس سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ لیکن تم اُس دن جو ہاسٹل سے بھاگے تو آج شکل دکھا رہے ہو!"

میں نے اُسے سارے حالات بتا دیئے۔ جنھیں سُن کر اُس نے گہرے تاسّف کا اظہار کیا۔

بردوان اسٹیشن آ گیا تھا۔ اُس نے زبردستی مجھے ٹرین سے اُتار لیا۔ اب میں ایک رکشے میں بیٹھ کر اُس کے گھر جا رہا تھا۔

سڑک کے دونوں طرف دھان کے کھیت تھے۔ تالابوں میں پانی بھاپ کے پتّے تیر رہے تھے۔ اُن کے کنارے دُور دُور تک کیلے اور ناریل کے درخت تھے۔

اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں یار! شادی وادی کی یا ابھی تک سنگل ہو؟"

"نہیں ابھی تک کوئی ایسی لڑکی نہ ملی۔ پھر بزنس کی مشغولیت میں اُدھر دھیان بھی نہ گیا"

اُس کا گھر آ گیا تھا۔ ہم رکشے سے اُتر گئے۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اُس نے آواز لگائی۔

"ماں! دیکھو ظفر آیا ہے! میرے کالج کا ساتھی جس کا ذکر میں تم سے اکثر کرتا تھا"

ایک بُوڑھی عورت جو چٹائی پر بیٹھی گدڑی سی رہی تھی میری طرف متوجہ ہوئی۔

میں نے سلام کیا۔ اُس نے مجھے بہت ساری دُعائیں دیں۔ اختر میرا ہاتھ کھینچتے ہوئے کچن میں لے گیا۔

"ان سے ملو یہ ہمارے گھر کی مہارانی ہیں!" اختر نے شوخی سے کہا۔

میں نے دیکھا ایک لڑکی میری طرف پیٹھ کئے کھانا پکا رہی تھی۔

"ارے!" میں چونک پڑا۔ یہ تو وہی چمپلی کی شاخ ہے جسے میں کبھی دُودھ کی بوتل دیا کرتا تھا۔

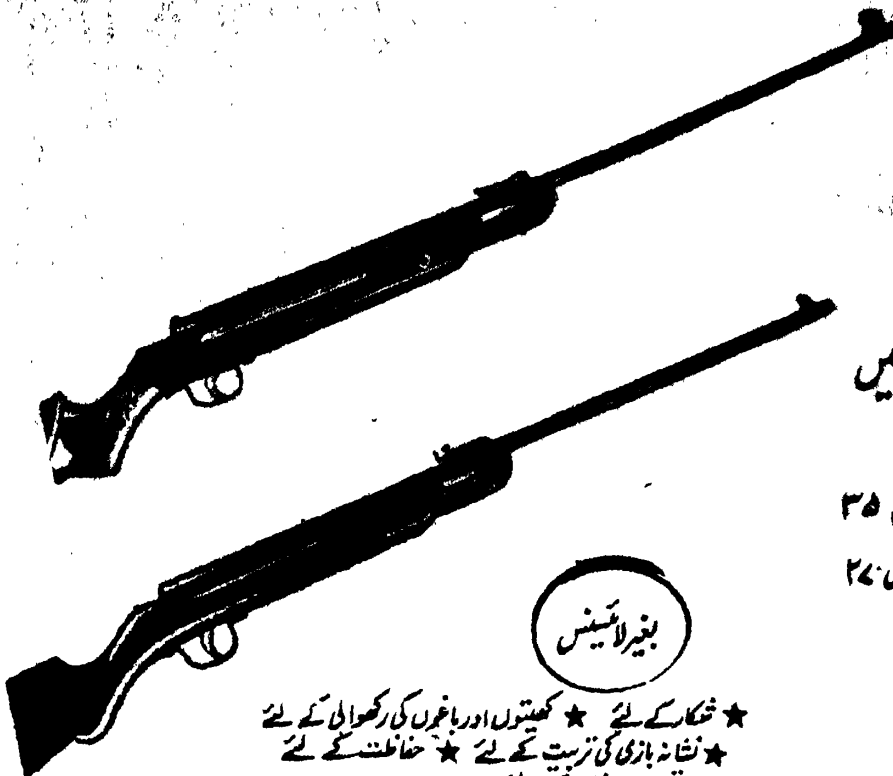
اب بھی وہ بالکل ویسی تھی۔ چھوٹی موٹی جیسی!

میں نے اُسے آداب کرتے ہوئے پُوچھا "کیا آپ نے مجھے پہچانا؟ میں کبھی آپ کو دُودھ کی بوتل دیا کرتا تھا"

وہ خاموش تھی۔ پھر میں نے کئی سوال کئے۔ لیکن وہ اب بھی خاموش تھی۔

تب اختر نے اُداس لہجے میں کہا۔

"اپنی بھابی کو صرف تم دیکھ سکتے ہو، کوئی بات نہیں کر سکتے کیونکہ یہ نہ تمھاری بات سُن سکتی ہے نہ تم سے بات کر سکتی ہے۔ یہ قید میری طرف سے نہیں، قُدرت کی طرف سے ہے!!"



غزل

شکیل احمد عاصم بریلوی ایم۔ اے، ایم۔ کام، بی۔ ٹی

...تی ہے یاد جب بھی تری انجمن مجھے
...نٹوں کی سیج لگتا ہے صحنِ چمن مجھے

جو ابتدائے عشق میں بخشی تھی آپ نے
ہے جان سے عزیز وہ دِل کی جلن مجھے

...ٹنے لگے ہیں راہِ وفا سے قدم مرے
لوٹا دے اے خدا مرا دیوانہ پن مجھے

قلب و جگر میں آگ کے شعلے بھڑک اٹھے
پردیس میں جب آئی ہے یادِ وطن مجھے

میں نے وفا کی لاج رکھی دے کے جان و دل
...یوں ڈھونڈتے ہیں آج بھی دار و رسن مجھے

دیتا ہے انگ انگ ترا دعوتِ گناہ
کافر بنا رہا ہے ترا بانکپن مجھے

...دل سہتے سہتے خوگرِ آلام ہو گیا
...تنے ملے ہیں عشق میں رنج و محن مجھے

عاصم غم و الم نے تعاقب کیا مرا
جب بھی دکھائی دی ہے خوشی کی کرن مجھے

غزل

عزیز وارثی

سوزشِ غم کے سوا کاہشِ فرقت کے سوا
عشق میں کچھ بھی نہیں درد کی لذت کے سوا

دل میں اب کچھ بھی نہیں اُن کی محبت کے سوا
سب فسانے ہیں حقیقت میں حقیقت کے سوا

کتنے چہروں نے مجھے دعوتِ جلوہ بخشی
کوئی صورت نہ ملی آپ کی صورت کے سوا

غمِ عقبیٰ غمِ دوراں غمِ ہستی کی قسم
اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

وہ شبِ ہجر وہ تاریک فضا وہ وحشت
کوئی غمخوار نہ تھا درد کی شدت کے سوا

جو تہی دست بھی ہے اور تہی دامن بھی
وہ کہاں جائیگا تیرے درِ دولت کے سوا

مجھ سے یہ پوچھ رہے ہیں مرے احباب عزیز
کیا ملا شہرِ سخن میں تمہیں شہرت کے سوا

آنسوؤں کے ستارے

خواجہ معین الدین نلگنڈوی

مکان نمبر 7-2-27M مانیم، چلکہ، نلگنڈہ (اے۔پی)

محترمی و مکرمی چچاجان! ہدیۂ خلوص و عقیدت

"بیسویں صدی" دیکھتے ہی دل باغ باغ ہوجاتا ہے۔ بے ساختہ دل سے دُعا نکلتی ہے خُدا کرے سپہرِ ادب کا یہ آفتاب اسی طرح چمکتا رہے! دُنیا کے تمام اُردو بولنے والے اس بلند پایہ رسالہ کو اپنے دل سے لگا کر دل کی آنکھوں سے پڑھتے ہیں اور آپ کے حق میں ہر دل سے یہی دُعا نکلتی ہے۔ آپ کی ادبی کاوش قابلِ ستائش ہے ـــــ آپ نے میرے افسانے "ادھورا سپنا" اور "بے جان تبسم" قبول کئے۔ اس کے لئے میں ممنون ہوں۔ لیجئے افسانہ نمبر کے لئے ایک تاثر انگیز تخلیق "آنسوؤں کے ستارے" حاضرِ خدمت ہے۔ اُمید ہے آپ کی بلند نگاہ پسند فرمائے گی۔ آپ کی اور قارئین "بیسویں صدی" کی گرانقدر رائے کا شدت سے انتظار رہے گا...

آپ کی دُعاؤں کا محتاج بھتیجا

معین الدین

★

زرینہ خاموش بستر پر پڑی چھت کو گھور رہی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر خفیف مُسکراہٹ تھی۔ پہلو میں دو چار انگریزی میگزین تھے۔ وہ کسی سوچ میں ڈوبی تھی۔ سُرخ لباس میں ملبوس صبا سمندر کی موج کی طرح کمرے میں داخل ہوتی ہوئی بولی ـــــ "آداب عرض ہے زرینہ صاحبہ!" اُس کے شاعرانہ انداز پر زرینہ کے ہونٹ کھل اُٹھے۔

"اوہ! ڈیر۔ تم آگئیں!"

"ہاں۔ تمہاری یاد آگئی۔ ہم آگئے . . . لیکن آج تو تم بہت خوش نظر آرہی ہو۔ کیا بات ہے؟"

"کچھ بھی تو نہیں!"

"ہم سے نہ چھپانا حضور! ہم سب کچھ سمجھ جاتے ہیں!" صبا نے کہا۔

"وہ کیسے؟"

"تمہارے چہرے پر کھلتی غیر معمولی مُسکراہٹ خود بتا رہی ہے!"

"اچھا!" زرینہ اپنی ریشمی جھالر سی پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔

"یہ اچھا وچھا سے بات نہ بنے گی۔ کچھ تو کہنا ہوگا۔"

"ایسا معلوم ہوتا ہے صاحبہ آج موڈ میں ہیں!"

"بھئی زرّو! بتا دو نا! ہم اتنی عاجزی کرتے ہیں اور تم بہانے تراشتی ہو؟"

زرینہ شرم و حیا کی پتلی بن کر آہستہ سے بولی: "آج اقبال صاحب سے مُلاقات ہوئی۔"

"کون اقبال؟ کہاں کے اقبال؟" صبا نے متحیر لہجہ میں پُوچھا۔

یاد

خلش تھی دل میں مگر اتنی بے کلی تو نہ تھی
ضرور آج انھیں یاد آ رہا ہوں میں ——— عندلیب شادانی

حالِ دل کہنے بڑی شان سے آئے تھے خمار
اب جو سننے کو وہ بیٹھے ہیں تو کچھ یاد نہیں ——— خمار

یاد کرتے ہوئے ڈرتا ہوں کسی کی صورت
اور جو چاہوں کہ بھلا دوں تو بھلا بھی نہ سکوں ——— نظام رامپوری

میں آج صرف محبت کے غم کروں گا یاد
یہ اور بات کہ تیری بھی یاد آ جائے ——— فراق گورکھپوری

یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا ——— میر تقی میر

مرسلہ: سید حسن محمد عابدی امروہوی

"وہ ہمارے کالج میں نفسیات کے لکچرر ہیں۔ ہمارے ہی مکان کے سامنے والی بلڈنگ کے بالائی حصہ میں رہتے ہیں۔" زرینہ نے شرماتے ہوئے کہا۔

"ہائے! اتنی شرماتی کیوں ہو۔۔۔؟ کہیں نازو کو عشق تو نہیں ہوگیا؟"

زرینہ کے رخسار شفق گوں ہوگئے۔ اُس کی پلکیں جھک گئیں۔

"ہائے ہائے! اِدھر دیکھو۔۔۔ خیر بھئی۔ ملاقات کب ہوئی، کیسے ہوئی؟" رُکتے رُکتے صبا نے زرینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کالج کی چھٹی ہوتے ہی میں گھر آ رہی تھی۔ وہ رکشے میں بیٹھے سڑک سے گزر رہے تھے۔ نہ جانے کیسے اُن کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ رکشا سے اُتر کر میرے ساتھ ہو لئے۔"

"پھر؟"

"پھر کیا۔ باتیں کرتے ہوئے گھر پہنچ گئے۔"

"لیکن کیسی باتیں ———؟" صبا کی باتوں میں بلا کا اضطراب تھا۔

"اُفوہ! کیا یہ بھی بتانا پڑے گا؟"

"نہیں تو کیا میں یونہی مان جاؤں گی؟"

"خیر بتاتی ہوں۔ پہلے اُنھوں نے موسم بہار کی بات چھیڑی۔"

"پھر پیار کی باتیں ———" زرینہ کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی صبا نے کہا۔

"مجھے کہنے بھی دو گی کہ نہیں۔"

"کہئے میم صاحب! ہم بیقرار ہیں تمھارے پیار کی کہانی سننے کو۔"

"کہنے کو خاص بات تو کچھ نہیں۔ اُنھوں نے کالج کی باتیں کیں۔ پھر۔۔ میری تعلیم کے بارے میں پوچھا۔"

"تو جناب میں ابھی سے خصوصیت جھلکتی ہے۔۔۔ اوہ! مُنہ نہ بناؤ میری جان ——— پھر اُنھوں نے کیا کہا؟"

"پھر ——— پھر گھر آگیا۔"

"اُفّو! تم مجھے بور کرتی ہو۔ یہ سب سُن کر کیا کروں گی۔ کچھ عشق و محبت کی باتیں بھی ہوئیں؟"

"نہیں تو!"

"پھر آج تم اتنی خوش کیوں ہو؟ تمھارے چہرے پر غیر معمولی مُسکراہٹ کیوں ہے؟"

"میں کیا جانوں!"

"کچھ تو ہوگیا ہوگا!"

"کچھ بھی تو نہیں۔"

"خیر بھئی، ہم آپ کے معاملے میں کیوں دخل دیں! ہم اپنی بیوقوفی کا اظہار کر رہے ہیں۔"

صبا کا چہرہ ایک دم اُداس ہوگیا۔ اُس نے زرینہ سے اپنی نگاہیں پھیر لیں۔ زرینہ نے آہستہ سے اپنی حنائی انگلیاں صبا کے بالوں میں پھیرتے ہوئے کہا۔

"رُوٹھ گئیں۔۔۔؟ اِدھر دیکھو صبو! ارے دیکھنا! میں سب کچھ بتا دوں گی۔ لیکن تم درمیان میں مجھ پر طنز آمیز جملے نہ کسنا۔ میں شرم و حیا سے کٹ جاؤں گی ——— اقبال صاحب مجھے بہت پسند ہیں۔ میں انھیں بے انتہا پیار کرتی ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے صبو! ——— میں اُن کی شخصیت میں گھل گئی ہوں۔ میرا کوئی وجود ہی نہیں۔۔۔ کب سے، یہ نہ پوچھو۔ جب سے میں نے انھیں دیکھا ہے، میرے دل و دماغ میں محبت کے شعلے دہکتے ہیں۔ لیکن میں نے کبھی اُن کے سامنے نہیں کہا کیسے کہوں؟

"تمھیں بتاؤں ——— میں لڑکی ہوں نا! بھلا یہ میرے بس کی بات ہے؟"
"لڑکی! لڑکی! لڑکی!! ——— لڑکی ہے تو کیا منہ کھولنے کی جرأت نہیں کرسکتی؟" صبا نے جھنجھلا کر کہا۔
"سماج انھیں وہ حق نہیں دیتا صبو؟"
"گھٹ گھٹ کر مرنے کا حق تو دیتا ہے"
"خیر مجھے زمانے سے کیا لینا ہے۔ میں اقبال صاحب سے پیار کرتی ہوں۔ میرے جذبات سچے ہیں، میری محبت سچی ہے۔ وہ میرے ہوں گے۔ میرا پیار انھیں ضرور پائے گا!"
"پاگل پن کی بھی حد ہوتی ہے۔ انھیں پتہ بھی ہے تمھاری محبت کا؟"
"نہیں صبو! شاید وہ نہیں جانتے"
"اُن کے سامنے کہنے میں شرم آتی ہے تو خط کیوں نہیں لکھتی؟"
"یہ اخلاق سے گری ہوئی حرکت ہوگی"
"لیکن فطرتِ انسانی کے خلاف تو نہیں"
"وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے؟"
"وہ نفسیات کے لکچرر ہیں۔ اُن کی وسیع النظری تمھیں مجرم نہ کہہ سکے گی"
"مجھے تو ڈر لگتا ہے ——— خیر بھئی، اِن باتوں کو چھوڑ دو۔ اب یہ بتاؤ تمھارا کیا حال ہے؟"
"میرا! میرا حال بھی سن لے۔ میں تو بٹروتنڈ (Betrothed) ہوں"
"ہاں لیکن تم نے یہ نہیں بتایا تمھارے سرتاج کیا کرتے ہیں اور کہاں کے رہنے والے ہیں؟"
"اِن سرتاج ورتاجوں کو دُور رکھئے حضور! ہمیں یہ القاب پسند نہیں۔ کہیں سے آئے ہیں اور کسی کو لے اُڑتے ہیں"
"تو کیا میری صبو سسرال نہ جائے گی؟"
"سسرال ہی کیا تمھیں چھوڑ کر جنت میں بھی نہ جاؤں گی! لیکن دیکھو نا۔ یہ ظالم گھڑی وقت سے پہلے ہی آٹھ بجا رہی ہے۔ گھر میں انتظار ہوگا ——— خدا حافظ!"

وفا

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کرکے
تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی ——— مومن

وفا کا نام کوئی بھول کر نہیں لیتا
ترے سلوک نے چونکا دیا زمانے کو ——— جگر

چلو ہم بھی وفا سے باز آئے
محبت کوئی مجبوری نہیں ہے ——— نامعلوم

ذرا بھی جس کی وفا کا یقین آیا ہے
قسم خدا کی اُسی سے فریب کھایا ہے ——— نامعلوم

ماضی نے جز فریب وفا کچھ نہیں دیا
ماضی کی لاش پھر بھی اُٹھائے ہوئے ہیں ہم ——— زہیر کنتی پوری

مُرسلہ: کہکشاں [illegible]

اقبال صاحب! اسلام نیاز

آپ میرا یہ خط پاکر یقیناً حیران ہوں گے۔ سرسری نظر سے سارے خط کا جائزہ لے رہے ہوں گے۔ میرے بارے میں آپ نے جو رائے قائم کی تھی، وہ لڑکھڑا رہی ہوگی۔ آپ مجھے کسی بھی القاب سے نوازئے، میں سر جھکائے آپ کی باتیں سنوں گی۔ اُن میں چھپے سچے جذبات کی کھوج کروں گی۔ آپ میں مستور فرشتہ صفات کو یکجا کرکے اپنی تاریک زندگی کو روشن کردوں گی۔ میں آپ کے سامنے اپنے دل کی بات کہہ رہی ہوں۔ اگر آپ مجھ سے خفا ہیں تو میری خطائیں معاف کر دیجئے۔ میں آپ کی شکر گزار رہوں گی۔

حضور! آپ نے کبھی میری آنکھوں میں چھپی چاہت کبھی دیکھی ہے ——— ؟ نہیں۔ شاید آپ میرے بارے میں ایسا [illegible] برا سمجھتے ہوں۔ لیکن اِتنا تو آپ جانتے ہیں، میں بھی ایک لڑکی ہوں جس کے دل میں ہزاروں ارمان ہوتے ہیں۔ لیکن پروان چڑھنے سے پہلے ہی سماج کی تپتی دھوپ میں جل جاتے ہیں۔ لیکن آج میں بہت ہمت کرکے اپنے آپ کو سماج کے دائروں سے دُور رکھ کر یہ خط لکھ رہی ہوں۔

آپ نے دو سال پہلے اِس شہر میں قدم رکھے۔ مکان تلاش کرتے کرتے ہمارے گھر پہنچ گئے۔ ابّا جان سے آپ نے کرایہ کے مکانوں کے بارے میں دریافت کیا۔ انھوں نے ہمارے مکان کے سامنے والی دو منزلہ عمارت بتائی۔ اُسی دن میں نے آپ کو کھڑکی کے چلمن سے دیکھا۔ آپ سفید سوٹ میں ملبوس تھے۔ مسکراتا ہوا چہرہ، پُر وقار شخصیت میرے دل و دماغ پر چھا گئی۔ پھر خوش قسمتی بھی دیکھئے کہ آپ ہی ہمارے لکچرر بن کر آگئے! کتنا حسین اتفاق تھا!

سرکار! میں نے دن رات اپنے رب سے یہی دُعا مانگی ہے۔ "خدایا! اقبال میرے ہو جائیں! صرف میرے! کوئی اور اُن کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ اُن کی خوشیاں اور شادمانیاں میری ہوں، رنج و الم میرے ہوں۔ خوشیوں میں مَیں اُن کی مسکراہٹ بن کر چہرے پر رقص کرتی رہوں۔ رنج و غم میں آہ بن کر اُن کی سانسوں میں سماتی رہوں۔" میں اپنے آقا سے پوچھتی ہوں —— "کیا میرے دل سے نکلی ہوئی دعا قبول نہ ہوگی؟"

آپ کی —— زرینہ

زرینہ صاحبہ! تسلیم

تھوڑی دیر پہلے کالج سے گھر آیا۔ دروازہ کھولتے ہی سامنے دو چار قدم پر ایک لفافہ نظر آیا۔ اُسے اٹھاتے ہوئے اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ لیکن اُس پر نہ کوئی پوسٹل سٹامپ تھا نہ کسی لکھنے والے کا نام۔ میں حیران تھا۔ لفافہ چاک کیا۔ خط نکال کر پڑھنے لگا۔ آخری سطر پر نظر پڑی تو آپ کا نام دیکھ کر محوِ حیرت رہا۔ اِس لئے نہیں کہ آپ نے وہ باتیں کہہ ڈالیں جو کہی نہیں جاتیں، بلکہ اِس لئے کہ آپ جیسی نازک اندام خوبصورت لڑکیاں بھی پیار کر سکتی ہیں! یہ میرے لئے ناقابلِ یقین ہے۔ سُنا ہے "عورت کا دل موم سا ہوتا ہے" —— مجھے بھی کبھی اِس پیارے جملے پر یقین تھا لیکن اب ایسی باتوں پر ہنسی آتی ہے۔

زرینہ صاحبہ! عورت بھی پیار کرتی ہوگی۔ لیکن پیار کے بدلے پیار نہیں دیتی۔ پیار کرتی بھی ہے تو اپنی تمنّاؤں کو زندگی دینے کے لئے، اپنی زندگی سنوارنے کے لئے۔ دُوسروں کی محبت اور چاہت کا خون ہوتا رہے اُسے کوئی پروا نہیں۔ ہر وقت اپنے ہی دل کو دل سمجھتی ہے، اپنی ہی محبت کو معراجِ محبت کہتی ہے۔

زرینہ جی! آپ بھی عورت ہیں۔ شاید آپ میری ان باتوں سے خفا ہوں۔ لیکن ٹھنڈے دل سے سوچئے تو آپ کا دل حقیقت کی وضاحت کرے گا۔ میں نے آپ کے سامنے ایک تلخ حقیقت رکھی ہے جس سے میری ہی زندگی آشنا ہے۔ میں نے بھی ایک بیدرد ہستی کو نادانستگی میں اپنے دل میں چھپا رکھا۔ میں بنگلور میں ایم۔ اے کر رہا تھا۔ وہ کسی ویمنز کالج میں بی۔ اے کر رہی تھی۔ ہم ہر روز صبح دس بجے کالج جاتے وقت آمنے سامنے ہو جاتے۔ اُس کے حُسن و شباب نے میرے دل و دماغ میں طوفان برپا کر دیا۔ لبوں پر بکھری مُسکراہٹ نے دل میں پیار پیدا کر دیا۔ میری محبت کی معصومیت دیکھئے —— میں ہر وقت اِسی مغالطہ میں مبتلا رہا "صبا کو مجھ سے محبت ہے!" میں نے اُس سے ایسی ایسی اُمیدیں باندھ رکھیں جنہیں سمجھنے کی صلاحیت صبا میں ذرا بھی نہ تھی۔ اُس کے ہر تبسّم کا مفہوم اپنی بیقرار محبت کے لئے ایک اُمید افزا تسکین سمجھنے لگا۔ وہ میرے دل و دماغ پر، خواب و خیال پر چھا گئی۔ دن پر دن میرا اضطراب بڑھتا رہا، بڑھتا گیا۔ رات دن اُس کی سوچ میں ڈوبا رہتا۔ دو سال تک میری سنجیدہ محبت شوق اور اِشتیاق میں گھُٹتی رہی۔ آخر کار مجھ سے رہا نہ گیا۔ ایک دن دھڑکتے دل سے خط لکھا۔ اُس نے جواب میں میرے جذبات کو پامال کر دیا۔ مجھے مایوس کر دیا۔ حسرت و یاس سے بھرپور آہیں ملیں۔ رنج و الم سے پُر آب آنکھیں ملیں۔ ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ارمان کی تشنگی بجھ نہ سکی۔ ذہنی اذیّت بڑھ گئی۔ کاش میں اپنی محبوب محبت کا اظہار نہ کرتا تو بہتر ہوتا۔ اب تو صرف درد و غم، حسرت و یاس اور سِسکتی یادیں ہی میری زندگی بن گئی ہیں!

زرینہ صاحبہ! آپ نے لکھا ہے "حضور! آپ نے کبھی میری آنکھوں میں چھپی چاہت بھی دیکھی ہے ——؟" نہیں دیکھی۔ مجھ میں اب وہ صلاحیت نہیں رہی۔ صبا نے میرے دیدۂ دل کی بینائی چھین لی ہے۔ پھر آپ ہی کہئے میں کیسے دیکھ سکتا ہوں؟ یہ دل زخموں سے بھرا ہے۔ بھلا ایسا دل آپ کے کیا کام آئے گا؟ اِس زخمی دل پر مرہم بھی نہیں لگا سکتے۔ زخم اور جل اٹھیں گے۔ راکھ میں چھپے شرارے شعلے بن جائیں گے!

زرینہ! میں نے آپ کے سامنے اپنی محرومیوں اور ناکامیوں کی ساری داستان رکھ دی۔ میں آپ سے نظر بھی ملانے کے قابل نہیں۔ میری ان باتوں سے آپ کے دل و دماغ کو ضرور ٹھیس پہنچی ہوگی۔ لیکن جلد از جلد آپ مجھے اپنے خیالوں سے نکال کر نئے سرے سے زندگی بسر کریں گی۔

ہاں! آپ نے جذبۂ صادق کے تحت خط لکھا، بُرا تو نہیں کیا۔ میں نے بھی اپنے دل کی بات کہی تاکہ آپ یہ نہ سمجھیں میں نے محبت کو ٹھکرا دیا ہے۔ اِس طرح کا بوجھ بھی کچھ تو ہلکا ہو گیا ہے۔

ریاضِ دہر میں ناآشنائے بزمِ عشرت ہوں
خوشی روتی ہے جس کو میں وہ محرومِ مسرت ہوں

بس اور کیا لکھوں! خدا آپ کو ضبط و شائستگی سے کام لینا سکھا دے۔

خیر طلب ——— اقبال

سورج مغرب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُس کی زرد کرنیں کھڑکی سے چھن چھن کر آ رہی تھیں۔ حسبِ معمول لوگ آفسوں، کارخانوں اور کالجوں سے گھروں کو لَوٹ رہے تھے۔ ریڈنگ رُوم میں خموشی تھی۔ زرینہ ایزی چیئر پر بیٹھی کھڑکی سے خلاء میں گھور رہی تھی۔ سامنے میز پر دو چار ادبی رسالے پڑے ہوئے تھے۔ اُلجھے ہوئے ریشمیں بال پیشانی اور گالوں کو چُوم رہے تھے۔ وہ آج کالج نہیں گئی تھی۔ اُس کا چہرہ مغموم و محزون نظر آ رہا تھا۔ اُس کی سُرخ آنکھیں صاف کہہ رہی تھیں کہ وہ رات بھر سوئی نہیں۔ گورے گالوں پر سُرخی بار بار تمتماتی ہوئی نظر آتی۔ زرینہ نے اپنے دونوں ہاتھ اور سر میز پر رکھ دیئے۔ کچھ دیر وہ اُسی عالمِ سکوت میں بیٹھی رہی۔ پھر آہستہ سر اُٹھا دیا جیسے کسی کے جھنجوڑنے پر اُٹھی ہو۔ ہاتھ بے اختیار میز کے خانہ میں چلے گئے۔ دوسرے ہی لمحہ وہ خط کھول کر پڑھنے لگی۔ اُس نے اب تک خط کو پانچ بار پڑھا تھا۔ اب بھی اُس کے چہرے پر کئی رنگ اُبھرتے اور غائب ہو جاتے۔ اُس کے دل و دماغ کو بیشک صدمہ پہنچا تھا۔ لیکن اقبال کی سِسکتی محبت اُس کی آنکھوں میں گھومتے ہی اُس قابلِ رحم شخصیت کے لئے آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ اب اُس کے دل میں محبت اور چاہت کی جگہ ایک نامعلوم ہمدردی بس گئی۔ پھر وہ بے رحم صبا کے بارے میں سوچنے لگی۔ یہ صبا کون ہے؟ اتنی بیدرد! کہیں وہ میری صبو تو نہیں؟

زرینہ ابھی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ اچانک صبا کمرے میں دستک دیئے بغیر داخل ہو گئی۔ زرینہ کا اُترا ہوا چہرہ، بے ترتیبی سے اُلجھے ہوئے بال، سُرخ آنکھیں دیکھتے ہی وہ سہم گئی۔ اس کا چنچل پن اور بیباکی ہَوا ہو گئی۔ اُس نے زرینہ کے پاس آکر پُوچھا۔

"زرّو! بہت اُداس معلوم ہوتی ہو۔ مزاج تو بخیر ہے نا ——؟" پھر اُس نے زرینہ کے جسم پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔

"ارے مجھے کیا ہُوا ہے۔ میں تو ٹھیک ہوں" ہونٹوں پر مصنوعی مُسکراہٹ بکھیرتے ہوئے زرینہ نے جواب دیا۔

"تو پھر تم... تمھارا چہرہ، تمھارے بال... یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟ ذرا آئینہ میں تو دیکھ لو!"

"....."

"بھئی، تم آج بہت افسردہ معلوم ہوتی ہو۔ کیا بات ہے؟ کہیں اقبال صاحب سے گستاخی تو نہیں ہوئی؟" ہنسانے کی کوشش کرتے ہوئے صبا نے کہا۔ لیکن زرینہ پر یہ وار بھی نہ چل سکا۔

"دیکھو صبو! میں تم سے ایک اہم سوال کرنا چاہتی ہوں۔ کیا تم جواب دو گی؟"

"کیوں نہیں میری جان؟ یہ جان بھی قُربان ہے تم پر سے!" صبا نے پُرجوش لہجہ میں کہا۔

"کیا تم اقبال صاحب کو جانتی ہو؟" زرینہ نے سوال کیا۔

"ہاں تمھیں نے تو اُن کے بارے میں کہا تھا نا؟"

"میرا مطلب ہے... میرے کہنے سے پہلے..." زرینہ نے رُکتے رُکتے کہہ دیا۔

"نہیں تو... میں نے اُنھیں آج تک نہیں دیکھا" صبا نے حیرت انگیز نگاہوں سے زرینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ زرینہ ایک پُرسکون سانس فضا میں چھوڑتی ہوئی خط ڈیسک سے نکال کر صبا کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ اُس نے ایک لمحہ کے لئے

مبہوت نگاہوں سے زرینہ کی طرف دیکھا پھر خط پڑھنے لگی۔ زرینہ بغور صبا کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ اُس کا گلاب سا چہرہ کمھلایا جا رہا تھا۔ ہر لمحہ نئے رنگ اُبھرتے نظر آرہے تھے۔ کبھی سُرخ، کبھی زرد، کبھی سیاہ۔ ذہن کا گرد و غبار چھٹتا نظر آیا۔ اُس نے خط پڑھ کر تھوڑی دیر عالمِ سکوت میں مجسّم حیرت بنی رہی۔ پھر بھرّائی آواز میں پُوچھا۔

"کیا تم مجھے اقبال صاحب کو دکھا سکتی ہو؟"

"کیا تم اُنھیں دیکھ کر پہچان پاؤ گی؟"

"نام سے تو واقفیت نہیں ہے۔ شاید چہرے سے . . ."

"اوہ! تو چہرہ . . ." زرینہ نے طنز آمیز انداز سے کہا۔ صبا کا گلنار چہرہ اور بھی گلنار ہو گیا۔ پھر اُس نے کہا۔

"جب تک میں اُنھیں نہ دیکھ پاؤں گی . . . اور کچھ کہنے ہی والی تھی کہ زرینہ نے کہا۔

"میں دکھا دوں گی" وہ آہستہ سے ایزی چیئر سے اُٹھ کر بُک شیلف سے کالج میگزین اُٹھا لائی۔ صبا کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"ڈھونڈ نکالنے میں کہیں مشکل تو پیش نہ آئے گی؟"

"خود سے وابستہ رُوح کو بھی ڈھونڈ نکالنے کی صلاحیت رکھتی ہوں" کہتی ہوئی صبا میگزین کے اَوراق اُلٹنے لگی۔ تیسرے ہی صفحہ پر اُس کی نظریں جم کر رہ گئیں۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں کے سمندر میں ڈوب گئیں۔ آنسو پی جانے کی ناکام کوشش میں دو چار قطرے تصویر پر ڈھل گئے۔ ضبط کرنے سے دل کا بوجھ اور بڑھ رہا تھا۔ آنسو اُمڈے آرہے تھے۔ پھر اُس سے رہا نہ گیا۔ تصویر کو اپنے سینے سے لگا کر سِسک سِسک کر رونے لگی۔ زرینہ محوِ حیرت تھی کہ ایک ہنس مُکھ لڑکی رو رہی ہے۔ بھلا صبو کے دل میں بھی زخم ہو سکتے ہیں!

صبا تھرّائی آواز میں کہہ رہی تھی: "زرّو! مجھے اِس تصویر سے گہرا تعلق ہے۔ لیکن اِس رُوحانی تعلق سے زمانہ بے خبر ہے۔ زمانے کی بات کیوں کروں؟ خود اقبال صاحب مجھے بیدرد، بے رحم سمجھتے ہیں۔ تم بھی تو مجھے سنگ دل ہی کہو گی۔ لیکن میں اِتنی بیدرد نہیں ہوں جتنی لوگ سمجھتے ہیں۔ میں نے بھی اُنھیں دل سے چاہا۔ لیکن زمانہ کی زنجیریں مجھے جکڑے ہوئے تھیں۔ اِس لئے خود اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹ دینے پر مجبور ہو گئی ——— زرّو! میں نے تمھیں سماج کے بندھنوں کو توڑ ڈالنے کو کہا۔ لیکن سچ پُوچھو تو مجھ میں بھی وہ ہِمّت نہیں۔ مجھ میں کیا کسی عورت میں وہ صلاحیت و طاقت نہیں پائی جاتی۔ جو عورت سر جُھکائے سماج کی باتوں اور اِشاروں پر عمل کرے گی وہی دُنیا میں کامیاب رہے گی ——— تم نہیں جانتیں زرّو! اُسی برس میری منگنی میرے خالہ زاد بھائی سے ہو گئی تھی۔ میری ساری تمنّائیں خاک میں مِل گئیں۔ اِسی لئے اپنے دل پر پتّھر رکھ کر اقبال صاحب کو خیرباد کہنے کے لئے مجبور ہو گئی ———" صبا کہتی جا رہی تھی۔ زرینہ خاموش اُس کی درد بھری آواز میں کھو گئی!!

"بیسویں صدی" میں وہی مضامین شائع ہو سکتے ہیں جن کے نیچے "غیر مطبوعہ" لکھا ہو۔ بعض مضمون نِگار مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں۔ یہ نہایت نامناسب اور غیر ذمّہ دارانہ حرکت ہے ——— ایڈیٹر

آئینۂ کلام سامنے رکھ کر

جوشؔ ملیح آبادی سے اِنٹرویو

آذر بارہ بنکوی بی۔ اے، ایل ایل۔ بی

محلہ کٹرہ امام باڑہ، بارہ بنکی (یو۔پی)

پیکرِ خلوص حضرتِ خوشترؔ صاحب! آداب و خلوص

بہت دنوں کے بعد "بیسویں صدی" کی بزم میں "جوشؔ ملیح آبادی سے اِنٹرویو" کے ساتھ حاضر ہو رہا ہوں۔ اِتنے دنوں تک غیر حاضر رہنے کا دِلی افسوس ہے۔ حضرتِ جوشؔ ملیح آبادی ماضی کے شاعرِ شباب اور عہدِ حاضر کے مایہ ناز شاعرِ انقلاب ہیں۔ شاعرِ شباب سے شاعرِ انقلاب تک کُل سفر اُنھوں نے مُلک کے سیاسی اور سماجی تغیرات کی بنا پر کیا ہے، ورنہ موصوف کے جمالیاتی ذوق میں ذرّہ برابر فرق نہیں آیا ہے۔ عجیب بات ہے کہ عہدِ حاضر کے مقبول ترین عہد ساز شاعر کے بارے میں نقّادانِ فن ابھی تک ایک مرکزِ خیال پر جمع نہ ہو سکے۔ حضرتِ جوشؔ کے تمام نقادوں کو پڑھیئے تو اُن کی رایوں کا تضاد ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہی حال جوشؔ کے کلام کا بھی ہے۔ حقیقتاً اُس میں متضاد عناصر کی بھرمار ہے جس کا اعتراف وہ خود فرماتے ہیں ؎

اے محرمانِ کہنہ ولے دوستانِ نَو | اِک وضع پر نہیں ہے مرے ولولوں کی رَو
کعبے کا نور ہوں تو کبھی بتکدے کی ضَو | گرتی ہے گاہ برق نکلتی ہے گاہ لَوا

دریا ہوں اِک مقام پر رہتا نہیں کبھی
اِک خطِ مستقیم پہ بہتا نہیں کبھی

بہرحال حضرتِ جوشؔ کے کلام اور اُن کی شخصیت کو سمجھنے کے لئے اُن کی زندگی کے واقعات اور حالات کا مطالعہ ضروری ہے۔ اِس کے لئے اُن کی تصنیف "یادوں کی برات" بہت اہم ہے۔ اس کتاب سے میں نے بھی پُورا پُورا فائدہ اُٹھایا ہے۔ ذرا حضرتِ جوشؔ کی دیانت داری دیکھئے کہ کیسے کیسے رازہائے سربستہ کا انکشاف کر ڈالا ہے اور کسی راز کو راز نہیں رہنے دیا۔ حضرتِ جوشؔ نے یہ کتاب لِکھ کر اُردو زبان و ادب اور اپنے قارئین و سامعین پر ایک غیر معمولی احسان کیا ہے۔ "یادوں کی برات" کا مطالعہ آپ یقیناً کر چکے ہوں گے۔ ایک بات اور عرض کروں کہ حضرتِ جوشؔ عرصہ دراز سے بزمِ "بیسویں صدی" میں جلوہ افروز نہیں ہوتے۔ اِس لئے زیرِ ترتیب افسانہ نمبر کے لئے یہ اِنٹرویو پیشِ خدمت کر رہا ہوں، حالانکہ تاخیر بہت ہو چکی ہے۔ لیکن اب بھی گنجائش نکل آئے تو خوش نصیب . . . !

نیاز مند ——— آذر بارہ بنکوی

آذر:۔ "بقولِ حضرت میر تقی میرؔ سرِ راہ گفتگو کرنا شریفوں کا شیوہ نہیں" لیکن کیا کروں جناب کہ حُسنِ اتفاق سے آپ سے سرِ راہ ملاقات ہو گئی تو کم از کم اپنا پروگرام ارشاد فرماتے جائیے تاکہ دولتکدے پر نیاز حاصل کر سکوں؟"

جوشؔ:۔ "اے شخص! اگر جوشؔ کو تو ڈھونڈنا چاہے
وہ پچھلے پہر حلقۂ عرفاں میں ملے گا
اور صبح کو وہ ناظرِ نظارۂ قدرت
طرفِ چمن و صحنِ بیاباں میں ملے گا
اور دن کو وہ سرگشتۂ اسرار و معانی
شہرِ ہنر و کوئے ادیباں میں ملے گا
اور شام کو وہ مردِ خدا، رندِ خرابات
رحمت کدۂ بادہ فروشاں میں ملے گا
اور رات کو وہ خلوتیِ کاکل و رخسار
بزمِ طرب کوچۂ خوباں میں ملے گا
اور ہو گا کوئی جبر تو وہ بندۂ مجبور
مُردے کی طرح کلبۂ احزاں میں ملے گا"

آذر:۔ "آداب... بجا لاتا ہوں جوشؔ صاحب! ــــ حسبِ ارشاد حاضر ہوں ــــ خوشا یہ سرزمینِ ملیح آباد جس کے ذرّے ذرّے پر آپ کے شاندار ماضی نے زرّیں نقوش چھوڑے ہیں اور مرحبا سایۂ رحمت کی طرح چھایا ہوا یہ افقِ نیلی فام کہ اسی افق سے آفتابِ علم و آگہی، شاعرِ شباب اور شاعرِ انقلاب طلوع ہوا ہے ــــ اور اللہ رے آپ کا یہ شاندار آبائی مکان "قصرِ سحر" ــــ یہ جگمگاتے ہوئے بام و در، یہ بلند و بالا ڈیوڑھی ــــ کیا کہنا اِس مکان کی عظمت کا؟"

جوشؔ:۔ "ہاں یہی ہے وہ مکاں وہ جنّتِ دَورِ کُہن
کل تھا جس کی انجمن میں حُسن صدرِ انجمن
چُبھ رہی ہے دل میں مثلِ نیشتر کمبخت سانس
یہ مکاں ہے یا کوئی چبھتی ہوئی سینے کی پھانس
آہ یہ در جس پہ شمعِ زندگی کا نور تھا
حیف یہ گھر، جو کلیمِ عصرِ نو کا طور تھا

آج غربتناک ہے، بے رُوح ہے، بے ہوش ہے
کل حیاتِ نغمہ تھا، اب سرد ہے خاموش ہے!"

آذر:۔ "بجا ارشاد جوشؔ صاحب! جو کل تھا وہ آج نہیں ہے اور جو آج ہے وہ کل نہ رہے گا اور اسی کا نام ہے گردشِ حالات لیکن آپ کی اِسی ڈیوڑھی نے اُردو زبان و ادب کو مایۂ ناز شاعرِ شباب و شاعرِ انقلاب بخشا ہے ــــ اور ایسا شاعر جس کی بارگاہ میں بلند تخیلات، گہرے معنی و مطالب اور موتیوں کی طرح آبدار اور خوبصورت الفاظ صف در صف، دست بستہ ادب سے سر جھکائے کھڑے رہتے ہیں!"

جوشؔ:۔ "لوگ کہتے ہیں کہ میں ہوں شاعرِ جادو بیاں
صدرِ معنی، داورِ الفاظ، امیرِ شاعراں
اور خود میرا بھی کل تک خیر سے تھا یہ خیال
شاعری کے فن میں ہوں منجملۂ اہلِ کمال
لیکن اب آئی ہے جب اِک گونہ مجھ میں پختگی
ذہن کے آئینے پر کانپا ہے عکسِ آگہی
آسماں جاگا ہے سر میں اور سینے میں زمیں
اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں!"

آذر:۔ "جنابِ والا! آپ کے رُو برو زبان کھولنا مناسب ہی نہیں، بے ادبی ہے۔ پھر بھی اِس منکسرانہ اعترافِ عجز سے پہلے اپنے اِن اشعار پر غور فرما لیتے تو بہتر ہوتا ؎
آج کہنے کے لئے آیا ہوں تجھ سے ایک بات
جوشؔ اے میری زمیں کے آسمانِ ذی حیات!
رُوح کو میری چھُوا ہے تیرے دل کی پھانس نے
غنچۂ ہمت کو چٹکایا ہے تیری سانس نے
تیری مدحت کے لئے اے شاعرِ شیریں نوا
گوندھ چُکا ہے ہار کب سے بہترین الفاظ کا
رُوح میں نغمے تپاں ہیں لب تک آنے کے لئے
مضطرب ہوں تجھ پہ لعل و زر لُٹانے کے لئے"

جوشؔ:۔ "دُکھ شعر سے بے حساب پائے میں نے
ہر سانس میں سَو عذاب پائے میں نے

ٹکرائے جب بحرِ دل سے توسل وگہر
تحسین کے کچھ حباب پائے میں نے!"

آذرؔ:۔ "محترم! آپ کا اندازہ صحیح نہیں ہے۔ دراصل ہر کس وناکس جو اُردو زبان وادب سے واقف ہے آپ کی زبان سے نکلے ہوئے ہر ہر لفظ پر اپنی جان چھڑکتا ہے"

جوشؔ:۔ (طنزیہ مُسکراہٹ کے ساتھ)
"دل بےکسیِ ادب پہ بھر آتا ہے
مرطوب فضا میں دَم گھٹا جاتا ہے
فردوسی و رودکی سمجھتا ہوں اُسے
مصرع بھی مرا آج جو دُہراتا ہے"

آذرؔ:۔ "اچھا! تو کیا آپ کے نزدیک دورِ حاضر اُردو شعروادب کے لئے سازگار نہیں ہے اور کیا اِس زمانے میں رموزِ شعروسخن کے پرکھنے والے موجود نہیں ہیں؟"

جوشؔ:۔ "باقی نہیں اِک شعور رکھنے والا
صہبائے کہن سال کا چکھنے والا
کیا اپنے معانی کا میں رونا روؤں
الفاظ نہیں کوئی پرکھنے والا!"

آذرؔ:۔ "لیکن جوشؔ صاحب! اِس کا سبب؟"

جوشؔ:۔ "دل رسم کے سانچے میں نہ ڈھالا ہم نے
اسلوبِ سخن کا نیا نکالا ہم نے
ذرّات کو چھوڑ کر حریفوں کے لئے
خورشید پہ بڑھ کے ہاتھ ڈالا ہم نے!"

آذرؔ:۔ "بےشک! لیکن جناب! اگر آپ خود اِس پست مذاقی کو ختم کرنے کے لئے ذرا بھی سعی فرماتے تو اعلیٰ مذاقی کی تجدید ہو سکتی تھی"

جوشؔ:۔ "جودت کی فضا ابھی نہیں ہے گل بار
ذہنوں کی ابھی سطح نہیں ہے ہموار
میری اور میری منزلت کے مابین
خود میری حیات کی کھڑی ہے دیوار"

آذرؔ:۔ "پھر بھی مسلسل جدّوجہد سے تو ناممکن بات بھی ممکن ہو سکتی تھی"

جوشؔ:۔ "ہر انجمن اِک گور ہوئی جاتی ہے
جو آنکھ ہے وہ کور ہوئی جاتی ہے
شمعوں پہ جلا رہا ہوں پیہم شمعیں
ظلمت ہے کہ گھنگھور ہوئی جاتی ہے"

آذرؔ:۔ "محترمی! آپ کو اللہ رہتی دُنیا تک سلامت رکھے۔ اگر اُردو علم وادب کا یہ حال اب ہے تو خدا نہ کرے آپ کے بعد ——؟"

جوشؔ:۔ "نہ وہ الفاظ کے نغمے نہ وہ معنی کا سُرور
گنگ ہے مطربِ اندازِ بیاں میرے بعد
زرد ہے چہرۂ گُل رنگ، نگارِ دانش
تیرہ ہے محفلِ صاحب نظراں میرے بعد
اپنے الفاظ کی میّت کو سرِ دوش اُٹھائے
محوِ فریاد ہے سلمائے زباں میرے بعد"

آذرؔ:۔ "اچھا جوشؔ صاحب! موجودہ دَور کے نامور شعراء جگرؔ، فراقؔ اور مجازؔ کی طرح بادہ نوشی تو آپ کی بھی زندگی رہی ہے۔ لیکن ذرا یاد تو فرمایئے وہ لمحۂ رنگیں اور وہ ضبط آزما گھڑی جب انسان تو انسان ہے فرشتہ بھی ہوتا تو بہک جاتا —— ارے وہی حادثۂ رنگیں جو آپ پر اپنے نانیہال میں گزرا تھا۔ جب آپ اپنے دوست سردار مہابیر سنگھ کے ساتھ اُن کے گھر پر بیٹھے تھے۔ سردار جی، تارا چرن اور رُوپ سنگھ سب کے سب بادہ خواری میں مشغول تھے۔ اُن سبھوں نے آپ کو بھی دعوتِ مے نوشی دی۔ اُس طرف سے اِصرار بڑھتا گیا اور آپ برابر اِنکار کرتے رہے —— یہاں تک کہ سردار مہابیر سنگھ کے اشارے پر حریری پردوں کے پیچھے سے لانبی لانبی پلکوں والی اِک کم سِن دوشیزہ، عروسِ بہار، فتنۂ روزگار، پیکرِ انسان میں ڈھلی ہوئی ایک کڑکتی بجلی، بصد ناز وادا چھم چھم کرتی آئی اور پتلی پتلی، لانبی لانبی سُرخ سُرخ اُنگلیوں سے لبریز ساغر اُٹھا کر اور نغمۂ جاں فزا چھیڑ کر رقص کرنے لگی —— اُدھر تارا چرن نے بھی سِتار چھیڑ کر آگ پر تیل چھڑک دیا اور "جھنن جھنن، جھن جھان" عود کی لپٹوں، سِتار کے جھالوں اور اُس فتنۂ دَوراں کی

مسحورکن تانوں سے در و دیوار جھومنے لگے۔ آخرکار اسی عالمِ کیف و نغمہ میں اُس ظالم نے آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، نشۂ شباب سے سرشار ہوکر، آپ کے گلے میں نقرئی بانہیں ڈال کر، مئے ارغوانی سے چھلکتے ہوئے ساغر کو آپ کے لبوں سے لگا ہی دیا۔ اُس عالم کی تشریح الفاظ میں تو ممکن نہیں مگر جوشؔ صاحب! آپ کا وجود تو ضرور متزلزل ہوگیا ہوگا؟"

جوشؔ:۔ "صد شکر کہ ہر صبح ہے روشن اب تک

ہر شام ہے مہتاب بداماں اب تک

نغموں سے ہیں دہکے ہوئے جذبات ہنوز

بانہوں سے ہے مہکی ہوئی گردن اب تک!"

آذرؔ:۔ "قبلہ! اگر یہ سچ ہے کہ آپ نے محض اسی غیر معمولی حسین حادثے کے تحت شراب پی لی تھی تو پھر آپ نے یہ سلسلہ جاری کیوں رکھا؟"

جوشؔ:۔ "ہر سانس کو اِک عذاب پایا میں نے

عشرت کی طلب سے ہاتھ اٹھایا میں نے

جب سینہ ہوا خروشِ دل سے محروم

بوتل کو کلیجے سے لگایا میں نے"

آذرؔ:۔ "حضور! آپ بہرحال پیروِ اسلام ہیں اور اسلامی عقیدے کے بموجب شراب خواری کی سزا دوزخ کی آگ ہے۔"

جوشؔ:۔ "کیا شیخ ملے گا گُل فشانی کر کے

کیا پائے گا توہینِ جوانی کر کے

تو آتشِ دوزخ سے ڈراتا ہے اُنھیں

جو آگ کو پی جاتے ہیں پانی کر کے!"

آذرؔ:۔ "سبحان اللہ جوشؔ صاحب! جب یہ بلند جو لگی ہے تو کیا عرض کروں۔ لیکن ذرا اس پہلو پر بھی غور فرمائیے کہ حکومت نے ترکِ شراب کی پالیسی پر زور ہی نہیں دیا ہے، بہت سے شہروں کو تو ڈرائی ایریا قرار دے چکی ہے۔"

جوشؔ:۔ "اے ترکِ شراب کے سِیَہ قلب وکیل

تو جبرِ حکومت کو سمجھتا ہے دلیل

تیری دہشت سے چھوڑ دے گا پینا؟

انسان کو اس قدر سمجھتا ہے ذلیل؟"

آذرؔ:۔ "لیکن بندہ پرور! حکومت ترکِ شراب کی پالیسی ہی پر نہیں اَڑی ہوئی ہے، اِس قانون کو سختی سے برتے جانے کے احکامات بھی صادر کر چکی ہے!"

جوشؔ:۔ (طنزاً مسکراکر)

"آتے نہیں جن کو اور دھندے ساقی

اوہام کے بُنتے ہیں وہ پھندے ساقی

جس مے کو چھڑا سکا نہ اللہ اب تک

اُس مے کو چھڑا رہے ہیں بندے ساقی!"

آذرؔ:۔ "کیا کہنا ــــ اچھا یہ فرمایئے کہ یہ شغلِ مے و جام ہمہ وقت جاری رہتا ہے یا کوئی وقت اِس کے لئے مخصوص ہے؟"

جوشؔ:۔ "دل کی جانب رجوع ہوتا ہوں میں

سر تا بقدم خضوع ہوتا ہوں میں

جب مہرِ مبیں غروب ہو جاتا ہے

پیمانہ بکف طلوع ہوتا ہوں میں"

آذرؔ:۔ "آپ ٹھہرے ماشاءاللہ شاعرِ شباب۔ آپ کا نفس نفس حُسن کا پرستار، ازل کے دن سے آپ حُسن کے پجاری ــــ اِسی لئے تو آپ کے پہلے مجموعۂ کلام "رُوحِ ادب" کا مطالعہ کرنے کے بعد ڈاکٹر اقبال نے آپ کی مدح سرائی کرتے ہوئے آپ کو خط لکھا تھا جس میں حافظ و ٹیگور کی پیروی ترک کر کے فکری شاعری کی طرف مائل ہونے نیز حافظ و خیّام کی طرح تھپک تھپک کر سُلانے کے عوض انسان کو جگانے کا پُرخلوص مشورہ بھی دیا تھا ــــ تو حضرت! ذرا ماہ و سال کے دبیز پردوں کو حافظے کی انگلیوں سے ہلکی سی جنبش دے کر اور اِک لمحے کے لئے اپنے سازِ شکستہ کے تاروں کو چھیڑ کر ماضی کے ایوانِ رنگ و رامش میں جھلکتے ہوئے نکیلے اور صبیح مُکھڑوں کی جھلک الفاظ کی مدد سے مجھے بھی دکھا دیجئے تاکہ میں بھی آپ کی جوانی کے گونجتے، گرجتے، گنگناتے رنگین اور شاداب لمحات سے تھوڑا سا اندازہ کر سکوں۔"

جوش: "دل کی چوٹوں کو ہواؤں نے دبا کر دیکھا
پھر جوانی نے مجھے آنکھ اٹھا کر دیکھا
یاد تازہ ہوئی رنگین ملاقاتوں کی
تربتیں دل میں اُبھر آئیں جواں راتوں کی
عشق کے طور، محبت کے وطیرے اُبھرے
دل میں ڈوبی ہوئی یادوں کے جزیرے اُبھرے
کیا کہوں چرخ سے کیا بارشِ تنویر ہوئی
کن لحافوں کی مہک آ کے بغلگیر ہوئی"

آذر: "اچھا جناب! خنک نسیم سے اُبھرے ہوئے رنگیں نقوشِ شباب، مے ارغواں میں ڈوبی ہوئی نیم باز آنکھیں، اور اُن نرگسی آنکھوں کے سرخ سرخ ڈوروں میں چمن کے حسین ترین گلوں کا لہو رواں دواں، صندلیں شانوں پر لہراتے ہوئے شب رنگ گیسوئے دراز، عود و عنبر کی لپٹوں میں بسی ہوئی وہ معطر سانسیں اور وہ رشکِ مہتاب صبیح مکھڑے دل کی دنیا میں اب بھی ہلچل مچاتے ہیں یا نہیں؟"

جوش: "دشتِ سیاسیات میں آتش چکاں بھی ہوں
کوئے جمالیات میں گوہر فشاں بھی ہوں
گل برگ و شاخسار بھی، تیغ و سناں بھی ہوں
ہاں منکرِ خدا بھی، مطیعِ خزاں بھی ہوں
کب صبح و شام راہ سے ہٹتا نہیں ہوں میں
پر مرکزِ جمال سے ہٹتا نہیں ہوں میں"

آذر: "گستاخی معاف ہو تو عرض کروں کہ ہر چند کاروانِ ماہ و سال تیزی سے گزرتا جا رہا ہے، آپ کی تیز روی میدانِ حیات میں جسمانی طور پر ماند پڑتی جا رہی ہے اور رخِ نشاط پر رنگِ جمود چھاتا جا رہا ہے پھر بھی مشغلۂ شباب اور کاروبارِ چنگ و رباب میں مطلق فرق نہیں آیا۔"

جوش: "پکار دو یہ جوانانِ پیرِ فطرت میں
کہ ہوں دیارِ جوانی کا شہریار ہنوز
مری جناب میں ہیں سرنگوں نگار اب تک
مری جلو میں ہیں صف بستہ گلعذار ہنوز
مری حیات کے شانوں پہ اس غبار میں بھی
مچل رہی ہے کوئی زلفِ مشکبار ہنوز
خزاں کا دور ہے پھر بھی مرے تعاقب میں
رواں ہیں جوش رسولانِ صد بہار ہنوز!"

آذر: "سبحان اللہ! خیر یوں تو آپ نے ماشاءاللہ اٹھارہ عدد معاشقے فرمائے ہیں لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ غالباً آپ اُس فتنۂ ادا، ماہ پیکر نگار خوش اطوار کی مفارقت سے بہت زیادہ متاثر ہوئے جنھیں بحمد للہ ایک عظیم اور دولت مند ریاست کی شاہزادی ہونے کا شرف بھی حاصل تھا اور منجملہ دیگر وجوہ کے غالباً آپ کا یہی معاشقہ اُس ریاست سے آپ کے اخراج کا ایک خاص سبب تھا۔ اُسی ریاست نے آپ کو کتب بینی اور مطالعے کی دعوت دے کر آپ کی شاعری کو آب و رنگ بخشا، علم و فکر کا راستہ دکھایا اور وہیں اُس فتنۂ روزگار، جانِ بہار کی شب رنگ کاکلوں کی روح پرور چھاؤں نے آپ کو جمالیاتی شاعری کا خزانہ بخشا۔ اس لئے یہ تو فطری امر ہے کہ اُس ریاست سے آپ کا اخراج آپ کے لئے انتہائی دردناک ثابت ہوا ہوگا —— اور خصوصاً اُن حالات میں جب ایک طرف معاش کی شمع بجھ کر دھواں دے رہی ہو اور دوسری طرف معاشقے کا چاند گہنا کر اُداسی برسا رہا ہو —— اور پھر سامنے پلیٹ فارم پر ایک پری پیکر آنکھوں میں آنسو بھرے آنکھوں آنکھوں میں آپ کو الوداع کہہ رہی ہو۔ ہائے کیا عالم گزر گیا ہوگا دلِ صد چاک پر؟"

جوش: "تجھ سے رخصت کی وہ شام اشک فشاں ہائے ہائے
وہ اُداسی وہ فضائے گریہ ساماں ہائے ہائے
وہ مری نظروں میں کچھ کہنے کی حسرت وائے شوق
وہ تری آنکھوں میں کچھ سننے کا ارماں ہائے ہائے
اللہ اللہ آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ کہنا ترا
جوش میرا دل ہوا جاتا ہے ویراں ہائے ہائے"

آذر: "اور ذرا زحمت فرما کر وہ واقعہ بھی بیان فرمائیے جب آپ بذریعہ ریل اجمیر سے جے پور کا سفر کر رہے تھے اور راستے

میں کہیں چودھویں کے چاند کی طرح ایک سیمیں بدن دوشیزہ اپنے یاقوتی لبوں پر تبسم کی گلابی چاندنی چھٹکائے اور اپنی معطر سانسوں سے گلہائے صحرا کو مہکائے، رہزنِ ہوش و خرد بن کر کھڑی ہوئی ملی تھی، اُس وقت آپ کے عاشق مزاج دل پر کیا بیتی تھی؟"

جوش:۔ "تھیں نرم سی کرن سے سب وادیاں سنہری
ناگاہ چلتے چلتے جنگل میں ریل ٹھہری
کانٹوں پہ خوبصورت اک بانسری پڑی ہے
دیکھا کہ ایک لڑکی میدان میں کھڑی ہے
گاڑی سے پھر اُتر کر اُس کے قریب آیا
طوفانِ بے خودی میں پھر یہ زباں سے نکلا
اے درسِ آدمیت، اے شاعری کی جنت
اے صانعِ ازل کی نازک ترین صنعت!
سُن کر مری چھلکتی آنکھوں کی داستانیں
اُس کی نگاہ میں بھی غلطاں ہوئی زبانیں
تاریک کر کے میری آنکھوں میں اِک زمانہ
جنگل سے سر جھکا کر ہونے لگی روانہ
مُڑ کر جو میں نے دیکھا اُمید مر چکی تھی
پٹری چمک رہی تھی گاڑی گزر چکی تھی"

آذر:۔ "سبحان اللہ حضرت! غالباً ۱۹۱۸ء میں محمد مستقیم صاحب کے کہنے پر آپ پہلی بار قومی تحریک سے وابستہ ہوئے تھے اور احمد آباد میں کانگریس کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوئے۔ جبھی شاید پہلی بار آپ کو تحریکِ آزادی کے سب سے بڑے رہنما مہاتما گاندھی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ گاندھی جی کا فرسٹ امپریشن تو آپ کے جمالیاتی ذوق پر یقیناً نہایت گراں گزرا ہوگا۔ لیکن جب اُنھوں نے مختلف قومی مسائل پر زبان کھولی ہوگی تو اُن کی رائے کی صحت اور اُن کے لہجے کی پختگی اور صلاحیت نے آپ کو یقین دلا دیا ہوگا کہ ہند کو جس مردِ میداں کا انتظار تھا وہ یقیناً مہاتما گاندھی ہیں!"

جوش:۔ "اے زمیں کی جیب کے آئینۂ الماس بار
اے فلک بزم کے مہرِ درخشانِ بہار
اے وطن کی سرزمیں کے آسمانِ ذی وقار
اے زمانے کے صدف کے گوہرِ انجم شکار
اے صفا کی موج کے لعلِ درخشاں السلام
السلام اے ہند کے شاہِ شہیداں السلام!"

آذر:۔ "مرحبا جوش صاحب! — خوش قسمتی سے رہبرانِ قوم مہاتما گاندھی کی قیادت میں کاروانِ آزادی جوش و خروش کے ساتھ اپنی منزلِ مقصود کی طرف رواں دواں ہوا کہ بالآخر قصرِ جبر و ظلم کی سنگلاخ دیواریں ہل کر رہ گئیں اور غلامی کی آہنی زنجیریں چھن چھن ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئیں — لیکن جنابِ والا! میں محسوس کر رہا ہوں جیسے اِس تابناک حکمِ رہائی کے باوجود آپ شاد و مسرور ہونے کے بجائے پریشان و ملول نظر آ رہے ہیں آخر ایسا کیوں ہے؟"

جوش:۔ "اِس داغِ دل پہ غور کر، اِن آنسوؤں کو دیکھ
کیونکر مِلا ہے گوہرِ ہندوستاں نہ پوچھ
ہر سانس موجِ فتنہ ہے، ہر سانس طبلِ جنگ
کیونکر مِلی ہے دولتِ امن و اماں نہ پوچھ
لاشوں پہ جو نشان ہیں فقط اُن کو دیکھ لے
اور یہ کہ ہیں یہ کِس کے تبر کے نشاں نہ پوچھ
قبروں پہ جا کے دیکھ ذرا جگنوؤں کا رقص
گھر کتنے بے چراغ ہیں یہ داستاں نہ پوچھ"

آذر:۔ "بجا ارشاد — یقیناً آزادی کی پہلی کرن پھوٹتے ہی انسان اِس طرح حیوانیت پر آمادہ ہو گیا کہ شورش کی ہر میتی نو یلی کرن شبنم کے بجائے بے گناہ معصوم بچوں اور عفت مآب عورتوں کے مقدس خون میں نہا گئی۔ انسانیت کی دردناک کراہوں سے خوش الحان طیور کی نغمہ سنجی دب کر رہ گئی۔ ہند کی پُر ہول فضا میں چھٹکی ہوئی چاندنی پر بربریت کی ظلمتیں غالب آ گئیں۔"

جوش:۔ (سرد آہ بھر کر)
"دولت مِلی تو اور بھی نادار ہو گئے
صحت ہوئی نصیب تو بیمار ہو گئے
اُترا جو بار اور گراں بار ہو گئے
آزاد یوں ہوئے کہ گرفتار ہو گئے"

پگھلا جو آسمان تو زمیں سنگ ہو گئی
یوں پو پھٹی کہ صبحِ چمن دنگ ہو گئی!"

آذر:۔ "آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر ـــــ حقیقت یہی ہے کہ اہلِ ہند کا یہ خونیں ڈرامہ انسانی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ پھر بھی وطن کی آزاد فضا میں برستی ہوئی خنک شبنم نے نفرت کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو بجھا کر ہی دم لیا۔ دُوری کی خلیج رفتہ رفتہ پٹ گئی اور لوگ پہلے کی طرح بہت حد تک پھر شیر و شکر ہو گئے۔ خوشی کی بات ہے کہ غلامی کے دور میں فرنگیوں نے زبانوں پر جو تالے ڈال رکھے تھے اور خیالات کے اظہار پر جو پابندی عائد کر رکھی تھی وہ اب ختم ہو چکی ہے ـــــ چشمِ بد دور اب شاعرانِ قوم کی مفلوک الحالی بھی دور ہو جائے گی اور ہر ادیب اور ادب کو پروان چڑھنے کا موقع حاصل ہو گا۔"

جوش:۔ "وہ شاعرانِ قوم، گراں قدر و معتبر
رہتے ہیں جن کی جیب میں اسرارِ بحر و بر
سورج پہ جن کا ہاتھ ہے اور پاؤں چاند پر
روٹی وہ ڈھونڈتے ہوئے پھرتے ہیں دربدر
کیا چیز ہے ادب یہ کوئی جانتا نہیں
جانے وہ کیا جو حرف بھی پہچانتا نہیں!"

آذر:۔ "اچھا جناب! جب شاعرانِ قوم کا یہ حشر ہوا تو بے چاری اردو زبان کا کیا حال ہوا؟"

جوش:۔ "چلنے لگی لغت پہ چھری انتقام کی
چھانٹی گئیں تمام جو لفظیں تھیں کام کی
رحمٰن ہی کی بات چلی اور نہ رام کی
گدّی سے کھینچ لی گئی جو زباں تھی عوام کی
حیوان بوکھلا گئے، منہ کھولنے لگے
انسان بولیاں وہ نئی بولنے لگے"

آذر:۔ "حصولِ تعلیم کی غرض سے تو آپ نے بچپن ہی میں ملیح آباد چھوڑ کر لکھنؤ میں رہائش اختیار کر لی تھی ـــــ اور وہیں اپنی کھلائی 'بڑی بی' کی زبانی فرنگیوں کے ظلم و جبر کی رُوداد سن کر اور ایک مخصوص واقعہ کو خود دیکھ کر بچپن ہی میں آپ کے دل میں فرنگیوں کے خلاف نفرت کا شدید جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ پھر سنِ بلوغ کو پہنچ کر اور قومی تحریک سے وابستہ ہو جانے کے بعد نفرت کا یہ جذبہ شدید تر ہو گیا۔ جبھی تو آپ نے کسی نظم میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کی دو رنگی اور پُر فریب پالیسی اور اُن کے ظلمِ بے نہایت کا پردہ بڑی بے جگری اور ولولہ انگیز انداز میں فاش کیا تھا۔ کیا یاد ہوں گے کچھ اشعار اُس نظم کے؟"

جوش:۔ "کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو!
دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو
سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمہاری اور یہ ذکر؟
نوعِ انسانی کے مستقبل کی اب کرتے ہو فکر؟
جب یہاں آئے تھے تم سوداگری کے واسطے
نوعِ انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے؟
ہندیوں کے جسم میں کیا رُوحِ آزادی نہ تھی
سچ بتاؤ کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی؟"

آذر:۔ "جوش صاحب! عام طور سے کہا جاتا ہے کہ اب اردو زبان و ادب کا مستقبل تاریک ہے اور یہ کہ اردو شعر و ادب کے پروان چڑھنے کے دن اب گئے۔ لیکن میرا اندازہ یہ ہے کہ زمانۂ ماضی کو دیکھتے ہوئے زمانۂ حال میں شعرائے کرام کی تعداد میں ماشاءاللہ کافی اضافہ ہوا ہے۔ اب تو گلی گلی دس بیس مترنم لوگ مل ہی جائیں گے اور خدا جھوٹ نہ بلائے دریافت کرنے پر وہ سب کے سب شاعر نکلیں گے! اگر خدانخواستہ تعلیم بھی اُن کی بس یوں ہی سی ہوئی تب تو وہ یقیناً شاعر ہوں گے! ـــــ قبلہ! آپ نے تو لاکھوں مشاعروں میں شرکت فرمائی ہے۔ کہیے کیا رائے ہے اِن شعرائے کرام کے بارے میں آپ کی؟"

جوش:۔ "گاتے پھرتے ہیں پاؤ سیری شاعر
چھوٹی ریوڑی، بڑی گنڈیری شاعر
شاید ایک آدھ تو ہے شاعر واقعی
باقی لاکھوں ہیں آنریری شاعر!"

آذر:۔ "اچھا جنابِ والا! اب اگر آپ اِس حقیر کی صاف گوئی کو محسوس نہ فرمائیں تو عرض کروں کہ ہند کے مستقبل کو روشن اور تابناک سمجھتے ہوئے بھی آپ نے ایک پڑوسی ملک کی شہریت قبول فرما کر نہ صرف اپنی ذات پر ظلم کیا ہے بلکہ اُردو زبان و ادب پر بھی غیر معمولی ستم ڈھایا ہے ——— اور ہند کی دھرتی سے پُشت در پُشت اور صدیوں کے استوار روابط کو منقطع کر کے اپنے آباء و اجداد کے وطن اور اُن کی اُداس قبروں سے مُنہ موڑ کر اپنے دوستوں اور پرستاروں کے علاوہ اُن مقدّس رُوحوں کو بھی صدمہ پہنچایا ہے جن کی ہزاروں اُمیدیں صرف آپ کے دَم سے وابستہ تھیں۔ وہ امانی گنج کا سنسان میدان جہاں سے آپ طلوعِ صبح کے زرّیں مناظر کا نظارہ فرماتے تھے، ملیح آباد کے وہ افسردہ باغات، وہ لہلہاتے ہوئے سرسبز کھیت اور وہ اُجڑا ہُوا اُداس 'قصرِ سحر' اور اُس کے ویران بام و در بزبانِ خاموشی آپ کی ہجرت کا پُردرد مرثیہ پڑھتے رہتے ہیں۔ جوشؔ صاحب! کچھ بھی سہی۔ لیکن وطن کی دلآویزی کا بدل ممکن نہیں!"

جوشؔ:۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر)

"آگاہیٔ علم و فن نہیں ہے اے جوشؔ
اصطبل ہے، انجمن نہیں ہے اے جوشؔ
ہوتا ہے وطن ہر اِک بشر کا ——— لیکن
میرا کوئی وطن نہیں ہے اے جوشؔ"

آذر:۔ "آپ کا یہ ارشاد اور یہ اُداسی بجائے خود آپ کے بے اِنتہا رنج و ملال کی غمّازی کرتی ہے۔ ترکِ وطن کے باوجود نہ دل کا سکون نصیب ہُوا نہ دماغ کو راحت، ایک طرف فکرِ معاش تو دُوسری طرف آپ کی خودداریٔ مزاج اور اُن ادب ناشناس، بدنصیب عوام کو کیا کہوں جو آپ کی عزّت افزائی تو خیر کیا کرتے آپ کی قدر و منزلت کو پہچان بھی نہ سکے ——— ورنہ ماہ وشوں اور زہرہ جبینوں کے ناز اُٹھانے والے ہمہ وقت سرشار، مدہوش و بےخود،

گھر یز اور نغمہ بار رہنے والے دل کو حزن و ملال سے کیا
نسبت؟"

جوش:۔ "عہد عیش جو اک شہر طرب تھا اک روز
اب جوش اُداس اُداس رہتا ہے وہ دل!"

آذر:۔ "تو کیا حضرت! واقعی آپ کی ہر سانس حشر بدوش ہے اور کیا حقیقتاً آپ کی عمر کا لمحہ لمحہ رہینِ درد و غم ہو چکا ہے؟ میں تو ذاتی طور پر آپ کو فاتحِ غمِ لیل و نہار، ضربتِ سبو سے مصائب کے پتھروں کو توڑ دینے والا رندِ قدح کش اور نشیب و فرازِ حیات کی ہنسی اڑانے والا مردِ صف شکن سمجھتا تھا!"

جوش:۔ "حضور اہلِ ہمت آبرو کھونا نہیں آتا
غمِ ہستی پہ ہنسنے کے سوا رونا نہیں آتا!"

آذر:۔ "کیوں نہ ہو جناب! آپ ٹھہرے ماشاء اللہ جہانِ حسن کے شہریار! خدا رکھے شانِ طرب آپ کی آنکھوں میں اب بھی جھلک رہی ہے اور آپ کا جمالیاتی ذوق اب بھی اپنی قدیم وضع پر قائم ہے، لیکن بندہ نواز! اب تو آپ کے سیاہ بالوں میں سفیدی نمودار ہو چلی ہے اور مقراضِ ماہ و سال نے قطع و برید کر کے آپ کے شباب کو بزرگی کا خلعت پہنا دیا ہے؟"

جوش:۔ "مرضی ہو تو سولی پہ چڑھانا یارب
سَو بار جہنم میں جلانا یارب
معشوق کہیں، آپ ہمارے ہیں بزرگ
ناچیز کو یہ دن نہ دکھانا یارب!"

آذر:۔ "سبحان اللہ! ظاہر ہے کہ ماضی کے شاعرِ شباب سے مخاطب ہوں، آپ کا یہ زاویۂ نگاہ بھی تسلیم مگر یہ فرمائیے کہ جب نگارِ مہتاب کی نشیلی نگاہیں خنک راتوں میں جادو جگاتی ہیں اور نرم و نازک ہواؤں کے مست و ہوش جھونکے آپ کے عاشق مزاج دل کو چھیڑتے ہیں تو کیا اس بزرگی کے باوجود گل رُخ، سمن پوش، ماہ پیکر، خوش وضع، خوش رُو، پری وش، سیمیں عذار، یاقوت لب اور آہو چشم نگارانِ سیمیں بدن کا عشق آپ کا دل دھڑکاتا ہے اور کیا بندہ نواز! یہ سلسلہ یونہی جاری و ساری رہے گا؟"

جوش:۔ "عشق کی چھاؤں بھی دیکھوں گا تو کترا اؤں گا
کعبۂ عقل سے باہر نہ کبھی جاؤں گا
اب رہِ عشق کی بازار میں کھوتے ہیں کہیں
جنسِ حکمت کے خریدار بھی روتے ہیں کہیں؟
اب نہ تڑپوں گا کبھی عشق کے افسانوں پر
اب جو روؤں گا تو روندے ہوئے انسانوں پر
اب تمنا پہ نہ ارمان پہ دل دھڑکے گا
اب جو دھڑکے گا تو انسان پہ دل دھڑکے گا!"



everest/257c PP/UR

غزل

امرچند قیس جالندھری

محبت عام ہوتی جا رہی ہے
بہت بدنام ہوتی جا رہی ہے

سیہ بختی سے میری اب سحر بھی
جوابِ شام ہوتی جا رہی ہے

بالآخر میرے دل کی بے قراری
سکوں انجام ہوتی جا رہی ہے

خوشی کی جستجو یہ رنگ لائی
خوشی گُم نام ہوتی جا رہی ہے

سزائے عشق یوں وہ دے رہے ہیں
سزا، انعام ہوتی جا رہی ہے

مسرت اِس جہانِ رنگ و بُو کی
الم انجام ہوتی جا رہی ہے

نظر رکھیے ذرا اپنی نظر پر
"حیا" بدنام ہوتی جا رہی ہے

جنابِ قیس، فیضِ باطنی سے
غزل، اِلہام ہوتی جا رہی ہے

غزل

پرکاش ناتھ پرویز ایم۔ اے

دمِ آخر خیالِ حُسنِ جاناں کم نہیں ہوتا
نظر آتے ہیں جلوے جب نظر میں دم نہیں ہوتا

ہوائیں چل رہی ہیں ہر طرف سے نااُمیدی کی
مگر پھر بھی چراغِ آرزو مدھم نہیں ہوتا

بچا لیتی ہے دامن ہر خوشی اہلِ محبت سے
کوئی غم کے سوا اِن کا شریکِ غم نہیں ہوتا

وہ دردِ زندگی بخشا ہے تم نے دردمندوں کو
تمہارے چاہنے سے بھی یہ اب تو کم نہیں ہوتا

عطا کی ہے تمہارے آستاں نے وہ خودی ہم کو
ہمارا سر کسی کے آستاں پر خم نہیں ہوتا

نگاہِ شوق کو تجھ سے بس اتنی ہی شکایت ہے
ترا دیدار ہوتا ہے مگر پیہم نہیں ہوتا

ہمیں اپنی محبت میں کمی محسوس ہوتی ہے
کبھی پرویز جب وہ فتنہ گر برہم نہیں ہوتا

زرد پتوں کا بن

شاہد پرویز

کوارٹر نمبر ایف، بلاک نمبر ۴۴، پولیس کوارٹرز، بڑی مور سرائے، دہلی نمبر ۶

محترمی خوشتر صاحب! خلوص و نیاز

ایک کہانی "زرد پتوں کا بن" "بیسویں صدی" کے افسانہ نمبر کے لئے بھیج رہا ہوں۔ اُمید ہے آپ کو پسند آئے گی — اُمید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ "کردار کے زخم" کی اِشاعت کے لئے ممنون ہوں۔

مخلص — شاہد پرویز

★

کلب کے ہر ممبر کو یہ بات معلوم تھی کہ اُس کا رومانس آج کل چترکار برجیشور سے چل رہا ہے۔

اُس کا پُورا نام رتنا چودھری تھا۔

مَردوں کی طرح بات کرنا اُس کی عادت تھی۔

کُتّے پالنا اُس کا شوق تھا۔

شادی کرنا اُس کی کمزوری اور طلاق لینا اُس کی بدنصیبی تھی۔

ٹیک کا تیسرا راؤنڈ لینے کے بعد وہ دونوں ہی اپنی اپنی نِشستوں پر آکر بیٹھ گئے۔ برجیشور کچھ زیادہ ہی ہانپ رہا تھا۔

رتنا چودھری جو پانچویں بار طلاق لے کر چھبّیس بار برس بنی تھی مُسکراتے ہوئے بولی "سگریٹ نِکالو یار!"

برجیشور نے سگریٹ کا پیکیٹ نِکالا۔ ایک ہی سگریٹ تھا۔ اُس نے پیکیٹ رتنا کی طرف بڑھا دیا۔

"جلاؤ یار! تم جلاؤ، آدھا آدھا پیئیں گے" وہ بولی۔

برجیشور سگریٹ جلا چکا تو رتنا نے اپنے سامنے رکھے بیئر کے گلاس کو ہونٹوں سے لگا کر ایک بڑا سا گھونٹ بھرا، پھر بیئر کے جھاگ اپنے لب سے دباتے ہوئے اُس نے برجیشور کے سفید اور بے داغ کالر پر لگے لپ اسٹک کے نارنجی داغ کی طرف اُنگلی اُٹھادی۔ برجیشور نے قمیص کے کالر پر لگے لپ اسٹک کے نارنجی دھبّے کو دیکھا اور جھینپ کر گردن جھکالی۔

رتنا پُورے لب کھول کر کسی قدر زور سے ہنسی، پھر اُس کے ہاتھ سے جلتا ہُوا سگریٹ لے کر بولی "یار، برجیشور! تم سے پہلے میں نے سات آٹھ بار رومانس کیا ہے، پانچ بار شادی بھی کی۔ لیکن یہ کبھی نہ سوچا تھا ہر بار طلاق لینی پڑے گی۔ میں نے اپنے ہر شوہر کو ٹوٹ کر چاہا، اُنھیں بھرپُور عورت کا پیار دیا ——" اِتنا کہہ کر اُس نے برجیشور کی طرف دیکھا جو اُس کے اِسکرٹ سے باہر جھانکتی سڈول پنڈلیوں کو گھور رہا تھا "سب ہی مرد ندیدے ہوتے ہیں" وہ ہنس کر بولی۔

برجیشور نے رتنا کی طرف دیکھا ضرور لیکن اُس سے آنکھیں نہ مِلائیں۔ رتنا سے آنکھیں مِلا کر بات کرنا کوئی آسان بات بھی نہ تھی۔ تیس بتّیس برس کی رتنا پانچ مَردوں سے طلاق لینے کے بعد بھی اپنی عُمر سے پانچ سات برس کم ہی معلوم ہوتی تھی۔ چہرے کی فِطری معصومیت اور آنکھوں کی چمک میں کچھ ایسی بات ضرور تھی جسے شادی کے پانچ تجربوں نے کم نہ کیا تھا۔ بھروسے اور خود اعتمادی

نظر

اب تک نہ خبر تھی مجھے اُجڑے ہوئے گھر کی
تُم آئے تو گھر بے سر و ساماں نظر آیا ـــــ جوش ملیح آبادی

وہ شرما کے بیٹھے ہیں گردن جھکائے
غضب ہو گیا اِک نظر دیکھ لینا ـــــ حسرت موہانی

غمِ عشق رہ گیا ہے، غمِ جستجو میں ڈھل کر
وُہ نظر سے چھُپ گئے ہیں مری زندگی بدل کر ـــــ شکیل بدایونی

ہم نے پلا متوں پہلو میں ہم کچھ بھی نہیں
تُم نے دیکھا اِک نظر اور دل، تمہارا ہو گیا ـــــ آسی رامنگری

رکھ کر نظر کے سامنے تصویرِ خوابِ ناز
پہروں ترے خیال میں بیٹھا رہا ہوں میں ـــــ افسر میرٹھی

مرسلہ۔ آمیر انصاری، جوہاٹ (آسام)

کی ایسی تیکھی چمک جو سیدھی دل میں پیوست ہو جائے مُسکراتی تو خبر ہی نہ ہوتی کہ ہونٹوں کے ایک سرے سے دُوسرے سرے تک مُسکراہٹ نے اپنا فاصلہ کب طے کر لیا۔ بس سامنے والے کے پُورے وجود میں اُتھل پُتھل ہونے لگتی۔

"تم مجھ سے شادی کر سکتے ہو؟" رتنا بولی۔

برجیشور نے رتنا کی جھیل جیسی آنکھوں میں ڈوب جانے کا اِرادہ وقتی طور پر ملتوی کر کے جواب دیا: "کیوں، کیا تم چھٹی بار طلاق لینا چاہتی ہو؟"

"نہیں، ساری زندگی ساتھ رہنے کے لئے!" رتنا نے کہا۔

"وہ تو ہم شادی کے بغیر بھی رہ سکتے ہیں!"

"یوں نہیں، مجھے آوارگی پسند نہیں۔"

برجیشور ہنس کر بولا: "تو تم سیتا بننا چاہتی ہو!"

"ہاں!"

"ٹھیک ہے، تم سیتا بن سکتی ہو لیکن میں رام نہیں بن سکتا!"

"تم رام نہیں بن سکتے تو مجھے بھی نہیں پا سکتے!"

برجیشور ایک پل چپ رہا، پھر بولا: "تم جانتی ہو رام نے سیتا کو پانے کے لئے دھنش توڑا تھا؟"

"ہاں۔"

"لیکن میں کوئی دھنش نہیں توڑ سکتا۔"

"آخر کیوں؟"

"میں بہت بکھر چکا ہوں رتنا!" وہ دھیمے لہجے میں بولا: "میرے اندر ہی اندر میرے وجود کا ایک ایک ذرّہ بکھرا ہوا ہے اور اُسے کسی رسمی سچائی کے لئے سمیٹنا میرے بس کی بات نہیں۔"

"تم رسموں کو مجبوری سمجھتے ہو برجیشور! ورنہ میں تمہارے اندر بکھرے ہوئے انسان کا ایک ایک ذرّہ اپنی پلکوں سے چُن لوں گی۔" رتنا بولی۔

اُس کے لہجے میں طنز کے باوجود اتنی شائستگی تھی کہ برجیشور کو بُرا نہ معلوم ہُوا۔

"کچھ بھی ہو، میں رام نہیں بن سکتا، ہاں راون بن سکتا ہوں! تم کہو تو تمھیں اِس شہر سے اغوا کر کے لے چلوں؟"

"کہاں؟" رتنا نے پُوچھا۔

"کہیں بھی، یہ دُنیا بہت بڑی ہے رتنا! ساری زندگی بھٹکیں گے، کہیں تو سکون ملے گا!"

"نہیں برجیشور! میں کل میں بھروسہ نہیں رکھتی۔ نہ مجھے ہپیوں کی طرح جینا پسند ہے۔"

برجیشور اب رتنا کی باتوں سے اُکتا گیا تھا ــــ خوبصورت ورتیں بھی جب بہت بولتی ہیں تو کتنی بُری لگنے لگتی ہیں۔ اُس نے رتنا کی بات کا جواب دئے بغیر کہا: "آؤ چلیں۔"

"کہاں جاؤ گے؟"

"جہاں روز جاتا ہوں۔"

"تنہا فلیٹ میں تمہارا دل نہیں گھبراتا؟"

"میں اکیلا کب ہوں۔"

"اچھا، اور کوئی بھی ہے تمہارے ساتھ؟" رتنا حیرت سے بولی: "تم تو کہتے تھے میں بالکل تنہا رہتا ہوں؟"

برجیشور نے ہنس کر کہا: "میری بنائی ہوئی تصویریں ہیں، تاریخ بتلانے والا کیلنڈر ہے، ریڈیو ہے اور ایک الارم گھڑی جو روز صبح کسی ہندوستانی بیوی کی طرح مجھے وقت پر جگا دیتی ہے۔"

"آج مجھے چھوڑنے نہ چلو گے؟" رتنا نے پوچھا۔
"کیوں نہیں، چلو۔"
وہ اٹھ کر کلب سے باہر آگئے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ رتنا کی لمبریٹا میں بیٹھا مال روڈ کی طرف جا رہا تھا۔ سرد ہوا کے جھونکوں نے بیئر کے خماریں اور اضافہ کر دیا تھا۔ اُس نے نیم وا آنکھوں سے رتنا کی طرف دیکھ کر کہا: "گاڑی آہستہ چلایا کرو۔"
"کیوں؟" رتنا نے اپنے رخسار پر آئی ہوئی بالوں کی ایک لٹ کو جھٹکے سے پیچھے پھینکتے ہوئے پوچھا۔
"تیز رفتاری کسی حادثے کا پیش خیمہ بھی ہو سکتی ہے!" وہ بولا۔
رتنا نے اُس کی بات کا جواب صرف ہنس کر دیا ——— پھر ہنومان روڈ کا کراسنگ پار کرتے ہوئے بولی: "بجلی کے کھمبوں میں جلتی ہوئی اِن ٹیوب لائٹس کو دیکھ رہے ہو؟"
"ہاں۔"
"تاروں کے گچھوں میں بندھے ہوئے یہ بجلی کے کھمبے دیکھ کر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کھمبے لمبے لمبے چاقو ہوں اور جلتی ہوئی ٹیوب لائٹس اِن کے چمکتے ہوئے پھلکے جو آہستہ آہستہ میرے وجود میں اُترتے جا رہے ہوں۔"
برجیشور نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سوچنے لگا رتنا یقیناً عام عورتوں سے کچھ مختلف ہے، یا پھر اُن عورتوں سے تو بالکل الگ ہے جن کا تجربہ اُسے شہر کی چار سالہ زندگی میں اب تک ہو چکا تھا۔
برجیشور جب تک رتنا سے نہ ملا تھا اُسے بس تین قسم کی عورتوں کا تجربہ تھا ——— پہلی قسم تو وہ جو صرف اپنے شوہر کی بیوی ہوتی ہیں، جن کی موجودگی میں ریڈیو سننے، کیلنڈر لگانے اور الارم گھڑی خریدنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دُوسری وہ جو کلب تو اپنے شوہروں کے ساتھ آتی ہیں۔ لیکن اُن کی واپسی اکثر اپنے شوہر کے دوستوں کی گاڑیوں میں ہوتی تھی۔ برجیشور جانتا تھا کہ یہ دُوسری قسم کی شریف عورتیں غیر مردوں کے ساتھ رقص کرنے کے علاوہ بیئر سِپ کرنے کے بہانے ایک آدھ پیگ وسکی پینے کو بھی بُرا نہیں سمجھتیں۔

پھول

تو پھول کے شیشوں کو یہی چن چن کے اٹھا لے
یہ پھول جو بچھڑے ہیں، عجب توبہ شکن ہیں ——— نسیم میسوری

فضا حسین ہے کہیں آپ مسکرائے ہیں
وگرنہ پھولوں کا چہرہ اُتر گیا ہوتا ——— شکیل نقانی

میں ہوں وہ پھول کہ اب حُسنِ تمنا یہ ہے
تو بہاروں کے زمانے نہ کریں یاد مجھے ——— جگن ناتھ آزاد

تبسم کے یہ کس نے پھول پھینکے
مری ہر آرزو ہلکی ہوئی ہے ——— علی احمد جلیلی

میں نے جو پھول چنے تھے ترے قدموں کیلئے
اُن کا دُھندلا سا تصور بھی مرے پاس نہیں ——— ساحر لدھیانوی

مرسلہ: کے رحمت اللہ خاں، بنگلور

عورتوں کی جس تیسری قسم سے برجیشور واقف تھا وہ گھٹیا ضرور تھی۔ لیکن سو پچاس روپے خرچ کرکے جتنا خلوص اُن سے ملتا تھا وہ برجیشور کو ابھی تک کہیں نہ مِلا تھا۔
لیکن رتنا سے مِل کر اُسے شدّت سے یہ احساس ہوا تھا کہ عورتوں کی ایک چوتھی قسم بھی ہے جو مرد کو اپنا سب کچھ سونپ کر بھی کچھ نہیں دیتیں، ایسا کچھ ضرور بچا لیتی ہیں جو بہت معمولی ہوتے ہوئے بھی انمول ہوتا ہے۔
برجیشور نے سوچا، رتنا میں بھی کہیں نہ کہیں کوئی ایسی گرہ ضرور ہے کہ وہ وہیں سے کھلے گی ——— لیکن اِس گرہ کو کھولنے کے لئے اُس کا رام بننا ضروری تھا۔
"کیا سوچ رہے ہو؟"
رتنا کی آواز نے اُسے چونکا دیا ——— "کچھ نہیں۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا۔
"کیا رام بننے کا فیصلہ کر رہے تھے؟" رتنا ہنسی۔
برجیشور نے رتنا کے ہوا میں اُڑتے ہوئے بال اور تمتماتے رخساروں کی طرف غور سے دیکھا، پھر بولا: "میں نے چار برسوں میں

اپنی پُوری زندگی کی تاریخ تمھارے شہر کی اِن جلتی ہوئی سڑکوں پر پیدل چل کر اپنے پَیروں سے لکھی ہے۔ چار برس تک نہ جانے کتنی بار میں ٹُوٹ ٹُوٹ کر بکھرا ہوں تو تمھاری مہذّب سوسائٹی نے مجھے پہچانا ہے۔ یہ میرے خوبصورت مستقبل کی ابتدا ہے اور تم کہتی ہو میں رام بن جاؤں۔"

اِس بار رتنا کچھ نہ بولی ــــ گاڑی میں ایک بار پھر خاموشی چھاگئی ــــ صرف چلتی ہوئی کار کے انجن کی آواز کے ساتھ برابر سے گُزر کر اوورٹیک کرنے والی کسی دُوسری گاڑی کا ہارن سنّاٹے کی چادر میں شگاف پیدا کر دیتا۔

سیڈان رتنا کے پورچ میں رُکی تو وہ انجن بند کرکے نیچے اُترتے ہوئے بولی: "اندر نہ آؤگے؟"

"کیوں نہیں؟" وہ دُوسری طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اُتر آیا۔

برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے رتنا نے دودھ کی بوتل کا ایک گندا سا نپل سیڑھیوں پر سے اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔ "یہ مالی کی گھر والی رُکمنی بھی بہت پھوہڑ ہے۔ ساری بیکار چیزیں اِدھر اُدھر پھیلاتی پھرتی ہے۔ کمبخت پانچ بچّوں کی ماں ہے ــــ"

اب برجیشور رتنا کے ساتھ دروازے تک پہنچ چکا تھا۔

رتنا نے بیڈ رُوم کا دروازہ کھولا تو برجیشور اندر جانے سے پہلے کچھ جھجک رہا تھا۔ ایسا نہ تھا کہ وہ آج رتنا کے گھر پہلی بار آیا تھا ــــ اِس سے پہلے بھی وہ رتنا کو کئی بار اُس کے گھر چھوڑنے آچکا تھا۔ لیکن رتنا کے ساتھ ڈرائنگ رُوم سے اندر جانے کا یہ پہلا موقع تھا۔

رتنا نے اُسے صوفے پر بیٹھنے کا اِشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بیٹھو میں رُکمنی سے کھانے کے لئے کہہ کر ابھی آئی۔"

رتنا کے جاتے ہی اُس نے پُورے بیڈ رُوم کا جائزہ لیا ــــ نفیس ترین فرنیچر کے علاوہ اُس کے ہاتھ کی بنائی ہوئی ایک پینٹنگ بھی کمرے میں تھی۔ یہ پینٹنگ رتنا اور اُس کے قُرب کی پہلی کڑی تھی۔ سامنے آتشدان پر رتنا کے پانچ سابقہ شوہروں کی تصویریں فریم کی ہوئی رکھی تھیں ــــ تصویروں کے بالکل قریب سُرخ فراک میں

ایک پلاسٹک کی چھوٹی سی گڑیا اور ایک ووڈکا کی بوتل رکھی تھی — اُس خالی بوتل کے پاس ہی وہ گندا سا نپل رکھا تھا جو ابھی رتنا باہر سے اٹھا کر لائی تھی۔

برجیشور کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا — وہ رتنا کی واپسی کا انتظار کئے بغیر اُس کے بیڈ روم سے باہر نکل آیا — اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کے پیروں میں کسی نے پر لگا دئے ہوں اور وہ ہوا میں اُڑ رہا ہو . . .

اُس رات کے بعد برجیشور دس روز تک کلب نہ آیا تو رتنا گھبرا کر اُس کے فلیٹ پر پہنچ گئی۔

بکھرے بال، بڑھے ہوئے شیو اور ملگجے سلیپنگ سُوٹ میں اُس نے برجیشور کو دیکھا تو ہنس کر بولی — "کیا سنیاس لینے کا ارادہ ہے؟"

برجیشور نے اپنی بے خواب سُرخ آنکھیں اٹھا کر جواب دیا۔ "سنیاس نہیں، بن باس!"

"کیا —؟"

"آؤ تمھیں اپنی تصویر دکھاؤں، رات ہی پُوری کی ہے۔"

برجیشور اُس کا ہاتھ تھام کر ایزل کے پاس لے گیا — پھر تصویر پر پڑا ہوا کپڑا ہٹا کر اُس نے رتنا سے کہا۔ "بتاؤ کیسی ہے؟"

رتنا نے دیکھا یہ تو اُس کی اپنی تصویر ہے! تیز چمکیلی دھوپ میں وہ ایسے اُجاڑ اور سُوکھے ہوئے پیڑوں کے بیچ کھڑی تھی جن کی خشک ٹہنیوں پر سائے کے لئے ایک بھی پتّہ نہ تھا۔ زمین پر اُس کے پیروں میں خزاں رسیدہ زرد پتّوں کا ایک ڈھیر تھا۔ تصویر میں رتنا کو اپنا چہرہ بھی کسی خزاں رسیدہ پتّے کی طرح زرد معلوم ہوا۔ اُس نے غور سے اُن سُوکھے ہوئے پیڑوں کو گِنا — اُن کی تعداد پانچ تھی۔

کچھ دیر تک تصویر دیکھنے کے بعد وہ ایک اِسٹول پر بیٹھ کر اِس طرح کانپنے لگی جیسے اُس کے جسم کا ریشہ ریشہ بکھر جائے گا۔

برجیشور نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "میں نے اپنی الارم گھڑی اور ریڈیو اپنے ایک بیچلر دوست کو دے دیا۔"

"اور کیلنڈر؟" رتنا نے نظریں اُٹھا کر پُوچھا۔

"وہ پھاڑ دیا، اُسی رات کو، تمھارے یہاں آنے کے بعد۔"

"لیکن کیوں؟"

"میں نے تمھیں بتایا تھا نا کہ بیوی کی موجودگی میں اِن چیزوں کی ضرورت نہیں رہتی۔"

"سچ؟" رتنا کی آواز مسرت سے لرز رہی تھی۔

"ہاں، لیکن میری تصویر اپنے بیڈ روم میں لگانے سے پہلے تمھیں اُن پانچ مَردوں کی تصویریں اپنے بیڈ رُوم سے نکالنی ہوں گی۔"

اِتنا کہہ کر برجیشور نے اسٹینڈ سے بُرش اُٹھایا اور اُسے رنگ میں ڈبو کر اُس تصویر میں چمکتی تیز دھوپ میں تپتے آسمان پر ایک چھوٹا سا بادل بنانے لگا — کاسنی رنگ کا بادل!!

آپ کو گھر میں کئی بار ڈاکٹر کا کام بھی کرنا پڑتا ہے۔

گھریلو دواؤں کے خانے میں تیز اثر اور بھروسے لائق اناسن رکھئے۔ یہ بڑے کام کی چیز ہے۔

کوئی کوئی دن ایسا ہوتا ہے کہ سارے کام ہی الٹے ہوتے ہیں۔ آج آپ پہلے تو دیر سے اٹھیں پھر دیکھا کہ باورچی خانے میں کئی چیزیں ختم ہیں۔ اور اوپر سے آپکے لڑکے کو ایسی شدید سردی ہو رہی ہے جیسے اب اسکو فلو ہو جائیگا۔



دوسرے کام تو ہوتے ہی رہینگے۔ پہلے اسے گرما گرم مشروب کے ساتھ اناسن دیکر آرام سے بستر پر لٹا دیجئے۔ اناسن تیزی سے اثر کرتی ہے۔ اور سردی زکام اور فلو کی تکلیف سے جلدی آرام دلاتی ہے۔ اناسن بھروسے لائق بھی ہے۔ کیونکہ یہ آپکے ڈاکٹر کی قابل اعتبار دوا کی طرح دواؤں کا ایک نپا تلا مرکب ہے۔

آج آپکی لڑکی اسکول سے جلدی آگئی ہے۔ بیچاری کرکے درد سے ... بے آرامی کی وجہ سے بالکل مرجھائی ہوئی ہے۔



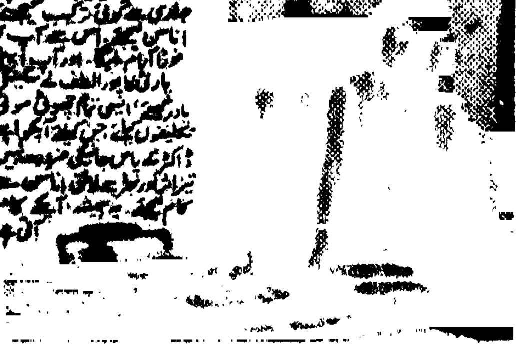
اسے گرم پانی کی بوتل سے سینک کرانے کے ساتھ ساتھ اناسن بھی دیجئے۔ اس سے اسے جلد ہی آرام اور چین ملیگا۔ اسکا پھول سا چہرہ پھر کھل اٹھیگا۔ اناسن ایسے نازک دنوں میں درد کی بے چینی اور بے آرامی کو کم کرتی ہے اور پہلے جیسی چستی لاتی ہے کیونکہ یہ صرف درد کو ہی نہیں روکتی بلکہ درد کے ساتھ پیدا ہونیوالی تھکان کو بھی ختم کرتی ہے۔

آج آپ کے شوہر کی اپنے افسر سے گرما گرمی ہو گئی جس سے ان کا سر درد کے مارے پھٹا جا رہا ہے۔



انہیں کسی ٹھنڈے مشروب کے ساتھ اناسن دیجئے۔ اس سے فوراً آرام ملتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اناسن میں درد دور کرنے والی وہ دوا جس کی دنیا بھر میں ڈاکٹر سب سے زیادہ سفارش کرتے ہیں، زیادہ ہے۔ آپکے دیکھتے ہی دیکھتے ان کا سر درد جاتا رہیگا، اور ان میں پھر پہلے جیسی چستی پھرتی آجائیگی۔

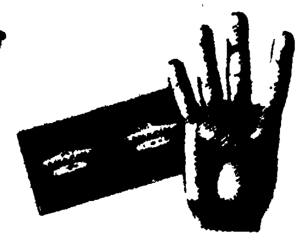
آج آپکے گھر میں پارٹی ہے۔ اور اس کے لئے آپکو تھوڑے سے وقت میں کتنے ہی کام کرنے ہیں۔ اسی لئے تو آپ تھک ہار کر سر درد میں مبتلا ہیں۔ لیکن اب تو آپکے مہمان بھی آتے ہی ہوں گے۔



سر درد کی وجہ سے آپکی پارٹی کا سارا مزا کرکرا ہو سکتا ہے۔ جلدی سے کوئی ترکیب کیجئے۔ اناسن لیجئے۔ اس سے آپ کو فوراً آرام ملیگا۔ اور آپ اپنی پارٹی کا پورا لطف لے سکیں گی۔ یاد رکھئے۔ ایسی ہی چھوٹی موٹی تکلیفوں کیلئے جن کیلئے اکثر آپ ڈاکٹر کے پاس جاتی ہیں ہمیشہ تیز اثر اور بھروسے لائق اناسن سے کام لیجئے۔ یہ ہمیشہ آپکے کام آئی ہے۔

تیز اثر اور بھروسے لائق

اناسن



ہندوستان کی مقبول ترین درد ... سے نجات دلانے والی دوا

Regd. User of TM Geoffrey Manners & Co. Ltd.

A-58

تصویر

سیّد شمیم اشرف

کشمیری، پوسٹ آفس رام سنیہی گھاٹ (بارہ بنکی)

محترم خوشتر صاحب! آداب

میرے دوستوں کو گلہ ہے کہ میں رومانی کہانیاں نہیں لکھتا۔ "تصویر" کہانی کہاں تک اُن کی توقعات پوری کر سکے گی اِس کا فیصلہ اُنہیں کو کرنا ہے۔ قبلہ! میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ ہمارا معاشرہ ترقی پذیر ہے۔ جب تک مُلک کی نصف سے زیادہ آبادی غریبی کی سطح سے بہت نیچے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے اور بھوک باقی ہے اُس وقت تک مسائل بھی باقی ہیں۔ اونچا طبقہ اب بھی جمہوریت کا مفہوم اپنی تجوریوں میں تلاش کرتا ہے اور اُس کا عوام سے وہی رشتہ ہے جو سورج کی شعاعوں کا ایک ذرّۂ بے مقدار سے۔ عورت بھی محبت کی اُتنی ہی بھوکی ہے جتنا ایک مرد۔ محبت کے نازک کھیل اولمپک کے میدانوں میں نہیں کھیلے جاتے۔ دونوں تشنہ ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے کچھ چاہتے ہیں لیکن اُن کی اِس مقدس خواہش میں جاگیردارانہ نظام اپنی ٹانگ اڑائے ہوئے ہے۔ افسانہ نمبر میں گنجائش ہو تو میری دونوں کہانیوں میں سے کسی کو جگہ دے دیجئے گا...

طالبِ دعا —————— سیّد شمیم اشرف

★

وہ چار دروازوں والی ایک لمبی سی خوشرنگ پونٹیاک تھی۔
کار سے تین لڑکیاں نیچے اُتریں۔ سب سے آگے والی لڑکی کافور کا زندہ اور متحرک مجسمہ نظر آرہی تھی۔ اُس کے جسم پر چولی اور غرارے سے انسپائر کیا ہوا جدید فیشن کا لباس تھا۔ آنکھوں میں شراب کی ارغوانی لہروں کے سائے لرز رہے تھے۔ عریاں بانہوں کے اُجالے میں ساری کائنات اُس کے ساتھ چلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ حسین ہی نہ تھی اُس کے وجود میں انفرادیت تھی۔ وہ اِس وقت اپنے صحت مند حسین جسم کی نمائش کر رہی تھی۔ کیونکہ ہر عورت تکمیل کے مراحل طے کرنے کے بعد اِسی جبلّی خواہش کی آگ میں جلتی رہتی ہے کہ اُسے چاہا جائے۔ اُس کے عورت ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ وہ اپنے کو حسین سمجھتی ہے۔ اِس طرف اُس کا جھکاؤ بنیادی اور فطری عمل ہے۔

قریب ہی ایک ٹریفک کانسٹیبل اپنی مونچھوں پر اِس انداز میں ہاتھ پھیر رہا تھا جیسے وہ اُن میں جوہری توانائی پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ لڑکی فٹ پاتھ کے اُس گوشہ تک پہونچ کر رُک گئی جہاں ایک آرٹسٹ اپنی ایک تصویر کو آخری ٹچ دے رہا تھا۔ اُلجھے ہوئے بے ترتیب بال۔ تھکی تھکی آنکھوں میں کراہتے ہوئے اُداسی کے دیئے، جسم پر ایک ڈھیل ڈھالا بش شرٹ جو رنگ کے بڑے بڑے دھبّوں سے داغدار تھا۔

"اِن لوگوں نے فٹ پاتھ کو بھی نگار خانہ بنا رکھا ہے!"

لڑکی نے اپنی ایک ساتھی کو مخاطب کر کے کہا۔

آرٹسٹ نے چونک کر نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ لڑکی نے محسوس کیا کہ اُس کی آنکھوں میں احتجاج ہے۔

"مادام!" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا "میرا بس چلے تو میں پورے شہر کے چہرے پر اپنا برش پھیر دوں!"

"اوہو!" لڑکی چہک کر بولی "شاعر بھی معلوم ہوتے ہو!"

"مادام" وہ خیال انگیز انداز میں بولا "بھوک دنیا کی عظیم ترین طاقت ہے جو بھینس کو بھی شاعری کرنے پر مجبور کر دیتی ہے"

لڑکی ہنس پڑی اور اس کے دانت سلک مروارید کی طرح چمک گئے۔

•••——•——•••——•——•••

- شک اور غیبت سے بچو۔ (قرآن پاک)
- بھلائی کا حکم دو۔ (قرآن پاک)
- سچ کہو اگرچہ وہ تلخ ہی ہو۔ (سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں۔ (سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)
- جو اللہ کی محبت کا مزہ چکھ لیتا ہے، اُسے طلبِ دنیا کی فرصت نہیں ملتی۔ (حضرت ابوبکر صدیقؓ)
- ہمیشہ اللہ سے مدد مانگتے رہنا۔ (حضرت ابوبکر صدیقؓ)

•••——•——•••——•——•••

وہ تصویروں کے انبار کو الٹ پلٹ رہی تھی اور اُس کے گلابی جسم سے لپٹتے ہوئے خوشبو کے جھونکے آرٹسٹ کو اپنی روح کی گہرائیوں میں اُترتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ لڑکی نے ایک تصویر اٹھائی۔ اُس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ تصویر میں ایک عورت کے اغوا کی منظر کشی کی گئی تھی۔

"تمہاری یہ پینٹنگ بہت دلکش ہے" لڑکی دل آویز انداز میں مسکرائی۔

"شکریہ مادام!"

"ایک بات اور —— تمہیں صرف نیلے، سبز، سُرخ اور زرد رنگ پسند ہیں۔ پوری پینٹنگ انہیں رنگوں میں ہے لیکن رنگوں کی حلاوت، تخلیقی توازن کے خوبصورت اشارے اور موضوع کا پسِ منظر سے حسین ربط۔ کیا مانگتے ہو؟"

وہ اس سوال پر کچھ نروس نظر آنے لگا۔ اُس کی بے لاگ تنقید۔ وہ اُس سے کیا مانگے؟ ایک سوالیہ نشان اُس کے شعور پر ضرب لگا رہا تھا۔ وہ خود نقاشِ ازل کا ایک زندہ اور متحرک شاہکار تھی۔ اپنے لیے بھی اور مرد کے لئے بھی ایک ابدی خوشبو ایک درخشاں موتی ایک گلاب ——!

"بیٹی رو پلے!!" وہ سوچ رہا تھا کہ یہ جملہ اُس کے منہ سے نکلا ہے یا دماغی نصف کرہ سے طلوع ہوا ہے۔ لڑکی نے سو کا ایک مُڑا تُڑا نوٹ اُس کی طرف اُچھال دیا اور اپنی کار کی طرف مُڑ گئی۔

آنند کی پلکیں بھیگ گئیں۔ اُس کا نام آنند ہی تھا۔ وہ اپنا کوئی آرٹسٹک نام رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن فاقوں کے بے رحم ہاتھوں نے اُس کے شعور و ادراک کی روشنی چھین لی تھی۔ اُسے زندگی بیحد خستہ، گھٹیا اور بد ہیئت نظر آرہی تھی۔ سو کا نوٹ اُس کے ہاتھ میں تھا۔ سو کا نوٹ! ایک خوبصورت لینڈ اسکیپ ٹھنڈی ریت، بیکراں سمندر، پرندوں کی تیز اڑانیں۔ وہ خود موٹر بوٹ ڈرائیو کر رہا تھا اور وہ گلعذار رخسار لڑکی سیاہ بیدنگ سوٹ میں ملبوس سرف رائیڈنگ کر رہی تھی، اپنے جسم کا سونا لٹاتی ہوئی جہاں اُفق کے پیچھے ہوئے رنگوں کی لکیر سمندر کی نیلگوں وسعتوں میں تحلیل ہو گئی تھی!

کاغذ کے اس ٹکڑے کا وجود اُسے کسی قتالۂ عالم کے قرب سے زیادہ لذت انگیز محسوس ہو رہا تھا۔ عورت کے متعلق اُس کا نظریہ تھا کہ وہ جسم رکھتی ہے۔ لیکن اُس میں آتش فشانی نہیں رکھتی۔ لیکن وہ لڑکی؟ اپنے جسم میں نسائیت کا الاؤ روشن کئے ہوئے تھی۔

پھر وہ خیالوں کے تانے بانے توڑ کر ایک ریستوران میں گھس گیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اُس نے ایک پان کی دوکان سے چارمینار سگریٹ کا ایک پیکٹ خریدا۔ وہ فٹ پاتھ پر کھڑا سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لگاتا رہا اور سوچتا رہا۔

پانچویں دن اُسی جگہ کار کی کھڑکی سے ایک گلابی ہاتھ باہر نکلا۔ آنند کار کی طرف لپکا۔

"اوہ!" اُس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"تم کیا کر رہے ہو؟" لڑکی مترنم آواز میں بولی۔

"تی الماس تنو کے نوٹ سے فاقوں تک کا فاصلہ ناپ سکا تھا!"

"خوب! آؤ میرے ساتھ۔ اپنا نگار خانہ کار کی ڈکّے میں رکھ دو۔"

آنند نے بالکل مشینی انداز میں لڑکی کے حکم کی تعمیل کی۔

"میرے قریب بیٹھ جاؤ۔" لڑکی اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

آنند نرم گدیلوں میں دھنستا چلا گیا۔ کار حرکت میں آگئی۔

آنند کا دل شدّت سے دھڑک رہا تھا۔ ہالی وُڈ کی کسی ایڈونچر فلم کے کلائمکس کی طرح تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے زیر و بم نے اُس کے شعور کو منجمد کر دیا تھا۔ لڑکی اس وقت کریم کلر کی See Through ساری میں قوسِ قزح کے چلتے پھرتے رنگوں کی حسین مخلوق نظر آرہی تھی۔

"میری چھوٹی بہن کو آرٹ کا خبط ہے۔ کیا تم اُس کے لئے وقت نکال سکو گے؟"

"بسروچشم!" آنند فوراً بول اُٹھا۔

ایک طویل و عریض کمرہ اسٹوڈیو میں تبدیل ہو چکا تھا۔ شہرِ آرزو کی طرح آباد، جس میں قوسِ قزح کے قرمزی شعلوں کی انگڑائیاں تھیں۔ آبشاروں کے نم آلود لبوں کا شہد تھا اور شعور کی دہلیز پر انمٹی لمحات کی خوشگوار دستک! آنند دھوئیں کے ننھے ننھے دائرے بناتا رہا اور سوچتا رہا۔ سوچنے کے لئے ان گنت موضوع تھے، جو ستیاں رنگوں میں ڈھل کر ایک حسین وجود بن سکتے تھے۔ لیکن وہ صرف کویتا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں دہکتی ہوئی شرابی لہروں کی کتاب اُس نے پڑھ لی تھی۔ اُس کے رسیلے ہونٹوں کا آبِ حیات کچھ مفہوم بھی رکھتا تھا۔ ساعتوں کے زیر و بم میں سلگتی ہوئی خوشبو زبان بھی رکھتی تھی۔ وہ کویتا کو دیکھتا ہی رہ جاتا جب وہ آئینے کے اندر کی متوازی کائنات کی رعنائیوں میں غرق ہوتی اور اپنا حسین عکس چُننے کی کوشش کرتی۔ عورت کا آئینے سے بہت نازک اور جذباتی رشتہ ہوتا ہے۔ وہ ایک خوبصورت مکان، خوش ذائقہ کھانوں اور حسین فرنیچر سے زیادہ اپنے ہونٹوں کو شعلہ زار بنانے کے لئے لپ اسٹک استعمال کرنا زیادہ پسند کرتی ہے۔

"عورت۔" وہ خیال انگیز انداز میں بولا۔ "اعداد و شمار سے بلند ہے۔"

کویتا کی کوشش سے جہانگیر آرٹ گیلری میں آنند کی تصویروں کی نمائش ہوئی اور اُس کی تصویر "انتہا" کو ۱۹۷۲ء کی بہترین تصویر قرار دیا گیا۔ آنند خوش تھا کہ اب وہ اپنے فن کی بلندیوں کی طرف گامزن ہے۔ وہ تصویر جو اُس نے فٹ پاتھ کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر جسم پر میلے چیکٹے چیتھڑوں کی نفرت انگیز فضا میں بنائی تھی اُسے قومی ایوارڈ ملا۔

اور ——— ایک دن کویتا اُس کے اسٹوڈیو میں داخل

- ایک طرف سے شہنشاہ آرہا ہو، دُوسری طرف سے عورت آرہی ہو تو شہنشاہ کا فرض ہے کہ ایک طرف کو ہٹ جائے، عورت کو راستہ دے دے۔ (منوسمرتی)
- قتل، چوری اور زنا جسمانی گُناہ ہیں۔ جھوٹ، بدگوئی اور بدکلامی زبان کے گُناہ ہیں۔ دولت کی خواہش، دُوسروں کی بُرائی کی خواہش، جھوٹ، تشدّد اور بے رحمی ذہنی گُناہ ہیں۔ (مہاتما بُدھ)
- قابل شوہر اپنی بیوی کو قابل بنا لیتا ہے۔ (مہاتما منو)

ہوئی۔ خوبصورت آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہونٹوں میں کپکپی تھی اور جسم میں ایک معنی خیز تھرتھری۔

"میں تمہیں ایک بُری خبر سُنانے آئی ہوں۔" وہ کھنچی کھنچی آواز میں بولی۔ آنند خاموشی سے اُس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

"جلد ہی میری شادی ہو رہی ہے۔ ڈیڈی کا خیال ہے کہ تم مہذّب ہو، خوبصورت ہو، تعلیم یافتہ ہو۔ لیکن تمہاری رگوں میں عوام کا خون رواں دواں ہے۔ تم اچھی پینٹنگ کر سکتے ہو۔ احتجاجی جلوس کی قیادت کر سکتے ہو اور چاند پر بھی پہونچ سکتے ہو۔ لیکن اپنے وجود کو سونے کی چمک نہیں دے سکتے۔ تم پستی میں بہنے والے پانی کی اولاد ہو اس لئے تمہارا رشتہ پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کی بلندیوں سے

نہیں جوڑا جا سکتا۔ پھر اسکیچز اُنہیں بادلوں میں رہنا ہے جو سونا بکھیرتے ہیں۔ آنند! اپنے گوشت میں سونے کی چمک رکھنا سب سے بڑا آرٹ ہے اور یہ رہا پچیس ہزار کا چیک!"

"تم جا سکتی ہو!" آنند نے نفرت سے منہ سکوڑ کر کہا "میرا عوامی خون سرمایہ پرستی میں بہنا چاہتا ہے - تم اس کاغذ کی ناؤ بنا کر اس میں چھوڑ سکتی ہو۔"

آنند نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنا وہ ٹوٹا ہوا بکس کھولا جس میں اس کا تعفن آمیز ماضی محبوس تھا۔ ماضی! جس کے میلے چیتھڑوں میں راستوں کی گرد سو رہی تھی۔ ان گنت رنگوں کے زخم جاگ رہے تھے۔ اس نے اپنے جلتے ہوئے ہونٹ بش شرٹ پہ رکھ دیئے اور اس کا ذہن ماضی کی خوشبو میں ڈوب گیا۔

ایک بار پھر وہ فٹ پاتھ کے اسی گوشہ میں بیٹھا ہوا ایک تصویر کی نوک پلک درست کر رہا تھا۔ وہی اُلجھے ہوئے بے ترتیب بال، آنکھوں میں خزاں کی اُداس شاموں کا سکوت، شکست کے احساس سے مجروح لمحات، ہونٹوں میں دبا ہوا سگریٹ آہستہ آہستہ شہرِ آرزو کی طرح جل رہا تھا۔

"ڈارلنگ! یہ تو تمہاری تصویر ہے!" مرد کی آواز۔

"نہیں مسٹر!" آنند ہاتھ اُٹھا کر بولا "یہ میری کوتیا ہے! میں نے اسے خوبصورت رنگوں کی زنجیر پہنا دی ہے۔ میں یہ تصویر ہرگز فروخت نہ کروں گا!"

غیر ارادی طور پر اس کی نگاہیں اُٹھ گئیں اور برش اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

"کوتیا!" اس کے ہونٹوں میں خفیف سی لرزش پیدا ہوئی۔

یہ وہ کوتیا تو نہ تھی جس کا جوان جسم زندگی سے بھرپور تھا۔ آنکھیں شراب کے ٹوٹے ہوئے جاموں کی مانند بے کیف۔ نازک لبوں کا آبِ حیات خشک ہو چکا تھا۔ رخساروں کے اُفق سے طلوع ہوتی ہوئی صبحوں کی جگہ وقت کی سیاہی نے لے لی تھی۔

کوتیا نے بیہوش آنند پر ایک اچٹتی نظر ڈالی اور اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑ کر کار کی طرف مڑ گئی۔

اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے —— اس کی تصویر آنند کے قدموں میں پڑی تھی! جیسے کوتیا اس کے قدموں میں پڑی ہو!!

غزل

نسیم شاہجہانپوری

بار لگے، چراغ لگے ہے، گہر گئے
آنسو مژہ پہ آکے بہ شکلِ دگر گئے

ہر سانس ایک رشتۂ نامعتبر لگے
مجھ کو چراغِ زیست، چراغِ سحر لگے

آگاہی فریبِ مسلسل کے باوجود
ہر اک بھی رہگذر جو تری رہگذر لگے

روزِ حساب دیترے تصوّر کے ہیں شمار
صدیوں کا فاصلہ بھی بہت مختصر لگے

اے زندگی بتا کہ ترا کیا خیال ہے؟
تُو بھی مجھے اجل کی طرح معتبر لگے

شاید پھر اُن کے گیسو و رخ کی چھڑی ہے بات
ٹھہری ہوئی سی گردشِ شام و سحر لگے

آ اے غمِ حبیب مرا تُو ہی ساتھ دے
تنہا رہِ حیات بڑی پُر خطر لگے

شبنم ہو، گُل ہو، غنچہ ہو یا سبزۂ چمن
ہر شے بھری بہار میں خلوِ نظر لگے

سب سے یہ پوچھتا ہوں کہ منزل ہے کتنی دور
مجھ کو ہر ایک شریکِ سفر راہبر لگے

اس دورِ کشمکش میں کسے فرصتِ حیات
انسان کا وجود فریبِ نظر لگے

غنچے اُداس، پھول پریشاں، فضا خموش
سارا چمن خزاں ہی کے زیرِ اثر لگے

اُن کا ہر ایک وعدۂ شام و سحر نسیم
نامعتبر بھی ہو کے مجھے معتبر لگے

غزل

عبدالقدوس ناطق

رہی ہے مہرباں بادِ صبا اوّل سے آخر تک
رہے کیوں کر نہ زخمِ دل ہرا اوّل سے آخر تک

رہا اپنا دلِ غم آشنا اوّل سے آخر تک
تجلی گاہِ عرفانِ وفا اوّل سے آخر تک

جنونِ فتنہ ساماں کا ہے اندازِ کرم کیسا
دہائی راس گلشن کی فضا اوّل سے آخر تک

یہاں آغاز ہی آغاز کی جلوہ نمائی ہے
محبت کی نہیں ہے انتہا اوّل سے آخر تک

کٹی ہے بندگیٔ عشق میں عمرِ عزیز اپنی
رہے ہم ناز بردارِ وفا اوّل سے آخر تک

وفورِ گریۂ پیہم کہیں روکے سے رُکتا ہے
جو برسی ہے تو برسے گی گھٹا اوّل سے آخر تک

سلیقہ تجھ کو جینے کا نہ آیا عُمر بھر زاہد
رہا تُو پارسا کا پارسا اوّل سے آخر تک

رہے ہیں عُمر بھر ہم آشنائے عظمتِ ہستی
رہا احسان ہم پر عشق کا اوّل سے آخر تک

نگاہوں کی نوازش، والہانہ عشق کا عالم
رہی اوّل سے آخر تک رہا اوّل سے آخر تک

غزل سُن کر کہا نقادِ فن نے حضرتِ ناطق
زبانِ نقد پر ہے مرحبا اوّل سے آخر تک

نہیں چل جا سکتا۔ میرا منگیتر اُنہیں بادلوں میں رہتا ہے جو سونا بکھیرتے ہیں۔ آنند! اپنے گوشت میں سونے کی چمک رکھنا سب سے بڑا آرٹ ہے اور یہ رہا پچیس ہزار کا چیک!"

"تم جا سکتی ہو!" آنند نے نفرت سے ہونٹ سکوڑ کر کہا "میرا عوامی فن امراء کے پیٹ میں بہایا جاتا ہے۔ تم اس کاغذ کی ناؤ بنا کر اس میں چھوڑ سکتی ہو!"

آنند نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنا وہ ٹوٹا ہوا بکس کھولا جس میں اُس کا تعفن آمیز ماضی محبوس تھا۔ ماضی! جس کے میلے چیتھڑوں میں راستوں کی گرد سو رہی تھی۔ ان گنت رنگوں کے زخم جاگ رہے تھے۔ اُس نے اپنے جلتے ہوئے ہونٹ برش ٹرے پر رکھ دیئے اور اُس کا ذہن ماضی کی خوشبو میں ڈوب گیا۔

ایک بار پھر وہ فٹ پاتھ کے اُسی گوشہ میں بیٹھا ہوا ایک تصویر کی نوک پلک درست کر رہا تھا۔ وہی اُلجھے ہوئے بے ترتیب بال، آنکھوں میں خزاں کی اُداس شاموں کا سکوت، شکست کے احساس سے مجروح لمحات، ہونٹوں میں دبا ہوا سگریٹ آہستہ آہستہ شہرِ آرزو کی طرح جل رہا تھا۔

"ڈارلنگ! یہ تو تمہاری تصویر ہے!" مونیکا بولی۔

"نہیں مسٹر!" آنند ہاتھ اُٹھا کر بولا "یہ میری کویتا ہے! میں نے اِسے خوبصورت رنگوں کی زنجیر پہنا دی ہے۔ میں یہ تصویر ہرگز فروخت نہ کروں گا!"

غیر ارادی طور پر اُس کی نگاہیں اُٹھ گئیں اور برش اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

"کویتا!" اُس کے ہونٹوں میں خفیف سی لرزش پیدا ہوئی۔ یہ وہ کویتا تو نہ تھی جس کا جوان جسم زندگی سے بھرپور تھا۔ آنکھیں شراب کے ٹوٹے ہوئے جاموں کی مانند بے کیف۔ نازک لبوں کا آبِ حیات خشک ہو چکا تھا۔ رخساروں کے اُفق سے طلوع ہوتی ہوئی صبحوں کا ہجوم وقت کی تیز ہوا نے لے لی تھی۔

کویتا نے بیہوش آنند پر ایک اچٹتی نظر ڈالی اور اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑ کر کار کی طرف مڑ گئی۔

اُس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے ——— اُس کی تصویر آنند کے قدموں میں پڑی تھی! جیسے کویتا اُس کے قدموں میں پڑی ہو!!

غزل

نسیم شاہجہانپوری

تارا گئے، چراغ گئے ہے، گہر گئے
آنسو مژہ پہ آکے بہ شکلِ دگر گئے

ہر سانس ایک رشتۂ نامعتبر لگے
مجھ کو چراغِ زیست، چراغِ سحر لگے

آگاہیٔ فریبِ تسلسل کے باوجود
لوٹی سبھی رہگذر جو تیری رہگذر لگے

رعذرِ حساب! تیرے تصوّر کے ہیں نثار
صدیوں کا فاصلہ بھی بہت مختصر لگے

اے زندگی بتا! کہ ترا کیا خیال ہے؟
تو بھی مجھے اجل کی طرح معتبر لگے

شاید پھر اُن کے گیسو و رخ کی چھڑی ہے بات
ٹھہری ہوئی سی گردشِ شام و سحر لگے

آ اے غمِ حبیب! مرا تو ہی ساتھ دے
تنہا رہِ حیات بڑی پُر خطر لگے

شبنم ہو، گُل ہو، غنچہ ہو یا سبزۂ چمن
ہر شے بھری بہار میں خلدِ نظر لگے

سب سے یہ پوچھتا ہوں کہ منزل ہے کتنی دور
مجھ کو ہر اک شریکِ سفر راہبر لگے

اس دورِ کشمکش میں کسے فرصتِ حیات
انسان کا وجود فریبِ نظر لگے

غنچے اُداس، پھول پریشاں، فضا خموش
سارا چمن خزاں ہی کے زیرِ اثر لگے

اُن کا ہر ایک وعدۂ شام و سحر نسیم
نامعتبر بھی ہو کے مجھے معتبر لگے

غزل

عبدالقدوس ناطق

رہی ہے مہرباں بادِ صبا اوّل سے آخر تک
رہے کیوں کر نہ زخمِ دل ہرا اوّل سے آخر تک

رہا اپنا دلِ غم آشنا اوّل سے آخر تک
تجلّی گاہِ عرفانِ وفا اوّل سے آخر تک

جنونِ فتنہ ساماں کا ہے انداز کرم کیسا
حنائی راس گلشن کی فضا اوّل سے آخر تک

یہاں آغاز ہی آغاز کی جلوہ نمائی ہے
محبت کی نہیں ہے انتہا اوّل سے آخر تک

کٹی ہے بندگیٔ عشق میں عمرِ عزیز اپنی
رہے ہم ناز بردارِ وفا اوّل سے آخر تک

وفورِ گریۂ پیہم کہیں رو کے سے رُکتا ہے
جو برسی ہے تو برسے گی گھٹا اوّل سے آخر تک

سلیقہ تجھ کو جینے کا نہ آیا عمر بھر زاہد
رہا تو پارسا کا پارسا اوّل سے آخر تک

رہے ہیں عمر بھر ہم آشنائے عظمتِ ہستی
رہا احسان ہم پر عشق کا اوّل سے آخر تک

نگاہوں کی نوازش، والہانہ عشق کا عالم
رہی اوّل سے آخر تک رہا اوّل سے آخر تک

غزل سُن کر کہا نقادِ فن نے حضرتِ ناطق
زبانِ نقد پر ہے مرحبا اوّل سے آخر تک

پیار کی رہگذر

شاکر کریمی

گنج نمبر ۱، بتیا، چمپارن (بہار)

برادرم! سلام نیاز

اِس بار "پیار کی رہگذر" لے کر حاضر ہوا ہوں۔ اُمید ہے میری پہلی کہانیوں کی طرح یہ کہانی بھی آپ کو پسند آئے گی ـــــ "پھول اور خوشبو" (افسانہ نمبر ۷۲ء) خلافِ توقع کافی مقبول ہوئی۔ اِس سلسلے میں مُلک اور بیرونِ مُلک سے بے شمار خطوط موصول ہوئے ہیں۔ یہ سب آپ ہی کی کرم فرمائیوں کا نتیجہ ہے ـــــ کہانی کے بارے میں آپ کی گرانقدر رائے اور قارئین کی آراء کا منتظر ہوں۔ خُدا کرے آپ مع الخیر ہوں۔

آپ کا اپنا ـــــ شاکر کریمی

★

نشاط کیفے میں قدم رکھتے ہی اُس کی نظر ہال کے جنوبی کنارے کی ایک ٹیبل پر پڑی۔ وہ ٹھٹک گیا اور غور سے اُس لڑکی کو دیکھنے لگا جو کافی کے ہلکے ہلکے گھونٹ کے ساتھ اپنے سامنے پھیلے ہوئے کسی رسالے کے مطالعہ میں محو تھی۔ اُس کے لب تھرتھرائے۔

"پروین!"

اور وہ سوچنے لگا ـــــ وہی، بالکل وہی! جیسے وقت ٹھہر گیا ہو، عُمر کی جس منزل پر تھی وہیں تھم گئی ہو ـــــ وہی بل کھائی گھنیری زُلفیں، وہی گھنی پلکوں کے نیچے بڑی بڑی نشیلی آنکھیں، وہی تمتمائے رخسار، وہی شبنم سے دُھلے گُلاب کی پنکھڑی سے ہونٹ، وہی رنگ، وہی رُوپ، وہی قد، وہی قامت ـــــ جہاں تھی وہیں ہے۔ کچھ بھی تو فرق نہیں!

وہ قریب آیا۔ پروین سامنے پھیلے ہوئے رسالے میں اِس طرح کھوئی تھی کہ اُسے پتہ ہی نہ چلا کہ کوئی اُس کے بہت قریب کھڑا ہے!

وہ جُھک کر آہستہ سے بولا۔

"آپ نے پہچانا مجھے؟"

وہ چونک گئی۔ سر اُٹھا کر دیکھا اور چند ثانیے اُس کی طرف غور سے دیکھتی ہوئی بولی۔

"نہیں تو!"

لیکن وہ اُس مُسکراہٹ کو نہ چھپا سکی جو ضبط کے باوجود غُنچے کی طرح اُس کے ہونٹوں پر چٹک گئی تھی۔

"تم مجھے نہیں پہچانتیں، لیکن یہ مُسکراتے ہوئے ہونٹ مجھے ضرور پہچانتے ہیں!" اُس نے اُنگلی سے پروین کے ہونٹوں کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے کہا اور اُس کے سامنے والی کُرسی پر بیٹھ گیا۔

"کتنی عجیب بات ہے پروین! میں محسوس کرتا ہوں جیسے ہم معمول کے مطابق کالج سے نکل کر ریسٹورنٹ میں چائے کے لئے آئے ہوں۔ حالانکہ ہم تین سال بعد مل رہے ہیں!"

"تم یہاں کیسے؟" پروین نے رسالہ بند کرتے ہوئے پُوچھا۔

"میں یہاں راجدھانی یونیورسٹی میں لکچرر ہوں!" اُس نے پروین کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"اور تم . . . ؟"

"میں یہاں ابّو کے ساتھ ہوں۔ اُن کا تبادلہ یہیں ہوگیا ہے!" پروین نے دُور کھڑے ویٹر کو قریب آنے کا اِشارہ کیا۔

"کب سے ہو یہاں ؟"

"قریب ایک سال سے۔ کیا منگاؤں تمھارے لئے ؟"

"صرف کافی !"

پروین نے ویٹر کو تلے ہوئے کاجو اور کافی کا آرڈر دیا اور ویٹر کے جانے کے بعد اُس سے مخاطب ہوئی۔

- تواضع اہلِ کرم کی علامت ہے۔ (حضرتِ امام شافعیؒ)
- اظہارِ عجز عبادت ہے۔ (حضرتِ غوث پاکؒ)
- عورت کی بد اخلاقی پر صبر کرنا اُس کی ضروریات مہیّا کرنا اور راہِ شرع پر اُسے قائم رکھنا بہترین عبادت ہے۔ (حضرتِ امام غزالیؒ)
- غریبوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔ غریبی کوئی عیب نہیں ہے۔ (حضرت خواجہ اجمیریؒ)
- بہت بُرا ہے وہ آدمی جس سے آدمی ڈریں۔ (عربی کہاوت)

"اور تم یہاں کِتنے دِنوں سے ہو ؟"

"تم سے بچھڑنے کے بعد یہیں چلا آیا تھا !" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اُس نے کہا۔

"پروین ! تین برسوں کے اِس طویل عرصے میں مَیں تمھیں یاد بھی آیا ہوں کبھی ؟"

"کیوں نہیں۔ تم، الکا، ریشماں، نلنی برابر یاد آتی رہیں۔" پروین نے نظریں نیچی کئے ہوئے کہا۔

وہ اُداس ہوگیا۔ جیسے پروین نے الکا، ریشماں، نلنی کے ساتھ اُس کا نام لے کر اُسے کوئی اہمیت نہ دی ہو۔

پروین نے اُس کی اُداسی کو محسوس کیا اور بات کا رُخ بدلتے ہوئے بولی

"تم یہاں اکیلے تو نہ رہتے ہوگے ؟"

"مطلب ؟"

"مطلب یہ کہ تمھارے ساتھ تمھاری بیگم تو ہوں گی اور . . . !" پروین نے قصداً اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور مسکراتی ہوئی اُس کی طرف اِس طرح دیکھنے لگی جیسے اُس کی آنکھوں میں اپنے ادھورے سوال کا پُورا جواب ڈھونڈ رہی ہو۔

وہ پروین کی طرف غور سے دیکھنے لگا اور پھر اِس طرح چونکا جیسے پروین کی بات اب اُس کی سمجھ میں آئی ہو۔ ایک ہلکی ہنسی کے بعد اُس نے بے تکلّفی سے کہا۔

"کیوں نہیں —— کیوں نہیں —— جہاں میں وہاں وہ !"

"کیسی ہیں وہ ؟"

وہ پروین کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں بولا۔

"بہت خوبصورت، بالکل تمھاری طرح !"

"کیا ؟" وہ چونک گئی۔

"سچ کہتا ہوں۔ یقین نہ ہو تو کسی دن میرے گھر آکر دیکھ لو !" وہ مسکرانے لگا۔

"ضرور آؤں گی، لیکن . . . !" وہ خاموش ہوگئی۔

"ہاں بولو —— چُپ کیوں ہوگئیں ؟"

"نہیں، میں کہہ رہی تھی ایسا نہ ہو وہ مجھے غلط سمجھیں، تم پر شک کریں !" پروین کا لہجہ سپاٹ اور سنجیدہ تھا۔

"نہیں، ایسا نہ ہوگا۔ تم سے مِل کر تو اُنھیں خوشی ہوگی !"

"کیا اُنھیں معلوم ہے کہ کبھی تم مجھ سے . . . !" پروین کا جملہ پھر ادھورا رہ گیا۔ اُس کی نِگاہیں جھُک گئیں۔

"کیا ؟"

وہ خاموش رہی۔

"بولو —— بولو نا بھئی !" اُس نے ضد کی۔

وہ اُس کی طرف اُداس نظروں سے دیکھتی ہوئی ٹھہر ٹھہر کر بولی۔

"یہی کہ کبھی تم مجھے چاہتے تھے !"

"ہاں —— اُنھیں معلوم ہے کہ میں آج بھی تھیں . . . !" وہ خاموش ہوگیا۔ جیسے الفاظ حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئے ہوں۔ اس کے چہرے پر کرب کی پرچھائیاں لہرانے لگیں، آنکھوں میں مایوسیوں کے اندھیرے گہرے ہوگئے۔ اس نے ہونٹوں کو بھینچ لیا۔

دونوں کے درمیان خاموشیوں کے لمحے طویل اور طویل تر ہوتے گئے۔

رات سرد اور تاریک تھی۔ کمرے کی تاریکی نے اس تاریکی میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ وہ اپنے نرم و ملائم بستر پر لیٹا اس طرح کروٹیں بدل رہا تھا جیسے انگاروں پر لیٹا ہو۔ گزرے ہوئے دنوں کی جاں گسل یادوں نے اُسے مضطرب کر دیا تھا۔ ماضی کی راکھ تلے دبی پیار کی چنگاری ایک بار پھر شعلہ بن کر بھڑک اُٹھی تھی اور وہ جل رہا تھا، سُلگ رہا تھا۔ تین برسوں تک وہ جسے بھول جانے کی مُسلسل کوششیں کرتا رہا تھا وہ ایک بار پھر اِس طرح اُس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی کہ یادوں کے زخم پھر ہرے ہوگئے تھے۔ دَم توڑتی ہوئی تمنائیں چیخ اُٹھی تھیں، آرزوؤں کے لپکتے ہوئے شعلے اُس کے زخم خوردہ وجود کو خاکستر کر دینے پر آمادہ ہوگئے تھے۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اِس اندھیرے میں کوئی اُس کے کانوں میں سرگوشی کر رہا ہو۔ پروین —— پروین —— پروین !!! اور جیسے یہ سرگوشی نہ ہو، ایک ضرب ہو، کاری، جان لیوا! ایک نشتر ہو، تیز تر ! جو ہر آن دل کی گہرائیوں میں اُتر کر اُس کے مضطرب اور بے چین وجود کو چھلنی کئے دے رہا ہو۔

اُف خدایا —— میں کیا کروں —— ؟ اب کہاں جاؤں ؟

اُس نے آنکھیں میچ لیں۔ تکیہ میں مُنہ چھُپا لیا۔ اندھیرا اور گہرا ہوگیا —— اور اِس گہرے اندھیرے میں ذہن کے اُفق پر ماضی کی یادیں ایک خوبصورت پیکر کے سانچے میں ڈھل کر اُجاگر ہونے لگیں، واضح —— اور واضح —— اور احساس کی زبان کانپنے لگی —— پروین !

وہ ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہ تھے۔ دوستوں کی طرف سے ترتیب دئے گئے ہر پروگرام میں وہ ساتھ ساتھ ہوتے تھے۔ اُن کی اکثر شامیں ایک ساتھ گزرتی تھیں۔ بیڈ منٹن، ٹینس، کیرم اور تاش کے کھیلوں میں وہ ایک دوسرے کے پارٹنر ہوا کرتے تھے۔ وہ گھنٹوں کسی تنہا گوشے میں بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے۔ کسی موضوع پر بحث کرتے رہتے اور وہ بحث کے آخری مرحلے پر پروین کو لاجواب اور مایوس ہوتی دیکھ کر قصداً کوئی ایسی بات کہہ دیتا تھا کہ وہ کھِل اُٹھتی تھی، مُسکرا دیتی تھی اور وہ محسوس کرنے لگتا تھا جیسے پروین کی یہ مُسکراہٹ اُس کی جیت کی علامت نہیں اُس کی اپنی فتح کا اعلان ہو۔ وہ نہرو پارک سے بہت سے پھول توڑ کر پروین پر پھولوں کی بارش کر دیتا تھا۔ وہ کھِل کھِلا کر ہنس پڑتی تھی اور وہ جھُوم اُٹھتا تھا۔

- دُوسروں کی بدقسمتی سے احتیاط کا درس لو (سائرس)
- ہر شخص سچّا دوست ڈھونڈتا ہے لیکن سچّا دوست بننے کی تکلیف کوئی بھی گوارا نہیں کرتا۔ (شیلر)
- سچے دوست کی پہچان یہ ہے کہ ہر حالت میں دوست رہتا ہے۔ (سولیمن)
- جن کے پاس بے انتہا دوست ہوتے ہیں، دراصل اُن کے پاس کوئی دوست نہیں۔ (للی)
- بیوی کے انتخاب میں اور تلوار کی خریداری میں دُوسروں پر بھروسہ نہ کرنا چاہیئے۔ (سر فرانس بیکن)

جیسے یہ پروین کے قہقہے نہ ہوں، بادۂ کیف و نشاط ہو اور وہ اِس بادۂ کیف و نشاط سے سرشار ہو کر کہتا ——

"دیوی خوش ہو تو پجاری سمجھ لیتا ہے اُس کی پُوجا سپھل ہوگئی !"

شام کے ملگجے اندھیرے میں دونوں ایک دُوسرے کا ہاتھ تھام کر گنگا کے کنارے ریت پر دُور تک دَوڑتے چلے جاتے تھے اور پھر پروین اُس کے ہاتھ سے ہاتھ چھُڑا کر ریت پر لیٹ جاتی تھی اور اپنی اُکھڑی اُکھڑی منتشر سانسوں کو سمیٹتی ہوئی اُس کی طرف اپنی محبت پاش نظروں سے دیکھتی ہوئی کہتی تھی ——

"میں یہاں راجدھانی یونیورسٹی میں لکچرر ہوں!" اُس نے پروین کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"اور تم ۔۔۔؟"

"میں یہاں ابو کے ساتھ ہوں۔ اُن کا تبادلہ یہیں ہوگیا ہے!"

پروین نے دُور کھڑے ویٹر کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔

"کب سے ہو یہاں؟"

"قریب ایک سال سے۔ کیا منگاؤں تمھارے لئے؟"

"صرف کافی!"

پروین نے ویٹر کو تلے ہوئے کاجو اور کافی کا آرڈر دیا اور ویٹر کے جانے کے بعد اُس سے مخاطب ہوئی۔

- ◆ تواضع اہلِ کرم کی علامت ہے۔ (حضرت امام شافعیؒ)
- ◆ اظہارِ عجز عبادت ہے۔ (حضرت غوث پاکؒ)
- ◆ عورت کی بد اخلاقی پر صبر کرنا اُس کی ضروریات مہیا کرنا اور راہِ شرع پر اُسے قائم رکھنا بہترین عبادت ہے۔ (حضرت امام غزالیؒ)
- ◆ غریبوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔ غریبی کوئی عیب نہیں ہے۔ (حضرت خواجہ اجمیریؒ)
- ◆ بہت بُرا ہے وہ آدمی جس سے آدمی ڈریں۔ (عربی کہاوت)

"اور تم یہاں کتنے دنوں سے ہو؟"

"تم سے بچھڑنے کے بعد یہیں چلا آیا تھا!"

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اُس نے کہا۔

"پروین! تین برسوں کے اِس طویل عرصے میں مَیں تمھیں یاد بھی آیا ہوں کبھی؟"

"کیوں نہیں۔ تم، الکا، ریشماں، نلنی برابر یاد آتی رہیں ـــ"

پروین نے نظریں نیچی کئے ہوئے کہا۔

وہ اُداس ہوگیا۔ جیسے پروین نے الکا، ریشماں، نلنی کے ساتھ اُس کا نام لے کر اُسے کوئی اہمیت نہ دی ہو۔

پروین نے اُس کی اُداسی کو محسوس کیا اور بات کا رُخ بدلتے ہوئے بولی

"تم یہاں اکیلے تو نہ رہتے ہوگے؟"

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تمھارے ساتھ تمھاری وائف بھی تو ہوں گی اور ۔۔۔!" پروین نے قصداً اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور تکتی ہوئی اُس کی طرف اِس طرح دیکھنے لگی جیسے اُس کی آنکھوں میں اپنے ادھورے سوال کا پورا جواب ڈھونڈ رہی ہو۔

وہ پروین کی طرف غور سے دیکھنے لگا اور پھر اِس طرح چونکا جیسے پروین کی بات اب اُس کی سمجھ میں آئی ہو۔ ایک ہلکی ہنسی کے بعد اُس نے بے تکلفی سے کہا۔

"کیوں نہیں ـــ کیوں نہیں ـــ جہاں میں ہوں وہاں وہ!"

"کیسی ہیں وہ؟"

وہ پروین کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں بولا۔

"بہت خوبصورت، بالکل تمھاری طرح!"

"کیا؟" وہ چونک گئی۔

"سچ کہتا ہوں۔ یقین نہ ہو تو کسی دن میرے گھر آکر دیکھ لو!" وہ مُسکرانے لگا۔

"ضرور آؤں گی، لیکن ۔۔۔!" وہ خاموش ہوگئی۔

"ہاں بولو ـــ چپ کیوں ہوگئیں؟"

"نہیں، میں کہہ رہی تھی ایسا نہ ہو وہ مجھے غلط سمجھیں، تم پر شک کریں!" پروین کا لہجہ سپاٹ اور سنجیدہ تھا۔

"نہیں، ایسا نہ ہوگا۔ تم سے مل کر تو اُنھیں خوشی ہوگی!"

"کیا اُنھیں معلوم ہے کہ کبھی تم مجھ سے ۔۔۔!" پروین کا جملہ پھر ادھورا رہ گیا۔ اُس کی نگاہیں جھک گئیں۔

"کیا؟"

وہ خاموش رہی۔

"بولو ـــ بولو نا بھئی!" اُس نے ضد کی۔

وہ اُس کی طرف اُداس نظروں سے دیکھتی ہوئی ٹھہر ٹھہر کر بولی۔

"یہی کہ کبھی تم مجھے چاہتے تھے!"

"ہاں ــــ انھیں معلوم ہے کہ میں آج بھی تمھیں . . . !" وہ خاموش ہوگیا۔ جیسے الفاظ حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئے ہوں۔ اُس کے چہرے پر کرب کی پرچھائیاں لہرانے لگیں، آنکھوں میں مایوسیوں کے اندھیرے گہرے ہوگئے۔ اُس نے ہونٹوں کو بھینچ لیا۔

دونوں کے درمیان خاموشیوں کے لمحے طویل اور طویل تر ہوتے گئے۔

رات سرد اور تاریک تھی۔ کمرے کی تاریکی نے اِس تاریکی میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ وہ اپنے نرم و ملائم بستر پر لیٹا اِس طرح کروٹیں بدل رہا تھا جیسے انگاروں پر لیٹا ہو۔ گزرے ہوئے دنوں کی جاں گسل یادوں نے اُسے مضطرب کر دیا تھا۔ ماضی کی راکھ تلے دبی پیار کی چنگاری ایک بار پھر شعلہ بن کر بھڑک اٹھی تھی اور وہ جل رہا تھا، سُلگ رہا تھا۔ تین برسوں تک وہ جیسے بھول جانے کی مسلسل کوششیں کرتا رہا تھا وہ ایک بار پھر اِس طرح اُس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی کہ یادوں کے زخم پھر ہرے ہوگئے تھے۔ دم توڑتی ہوئی تمنّائیں چیخ اٹھی تھیں، آرزوؤں کے لپکتے ہوئے شعلے اُس کے زخم خوردہ وجود کو خاکستر کر دینے پر آمادہ ہوگئے تھے۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اِس اندھیرے میں کوئی اُس کے کانوں میں سرگوشی کر رہا ہو۔ پروین ــــ پروین ــــ پروین !! اور جیسے یہ سرگوشی نہ ہو، ایک ضرب ہو، کاری، جان لیوا! ایک نشتر ہو، تیز تر! جو ہر آن دل کی گہرائیوں میں اُتر کر اُس کے مضطرب اور بے چین وجود کو چھلنی کئے دے رہا ہو۔

اُف خدایا ــــ میں کیا کروں ــــ؟ اب کہاں جاؤں؟

اُس نے آنکھیں میچ لیں۔ تکیہ میں مُنہ چھپا لیا۔ اندھیرا اور گہرا ہوگیا ــــ اور اِس گہرے اندھیرے میں ذہن کے اُفق پر ماضی کی یادیں ایک خوبصورت پیکر کے سانچے میں ڈھل کر اُجاگر ہونے لگیں، واضح ــــ اور واضح ــــ اور احساس کی زبان کانپنے لگی ــــ پروین!

وہ ایک دُوسرے کے لئے اجنبی نہ تھے۔ دوستوں کی طرف سے ترتیب دئے گئے ہر پروگرام میں وہ ساتھ ساتھ ہوتے تھے۔ اُن کی اکثر شامیں ایک ساتھ گزرتی تھیں۔ بیڈمنٹن، ٹینس، کیرم اور تاش کے کھیلوں میں وہ ایک دُوسرے کے پارٹنر ہُوا کرتے تھے۔ وہ گھنٹوں کسی تنہا گوشے میں بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے۔ کسی موضوع پر بحث کرتے رہتے اور وہ بحث کے آخری مرحلے پر پروین کو لاجواب اور مایوس ہوتی دیکھ کر قصداً کوئی ایسی بات کہہ دیتا تھا کہ وہ کھِل اُٹھتی تھی، مُسکرا دیتی تھی اور وہ محسوس کرنے لگتا تھا جیسے پروین کی یہ مُسکراہٹ اُس کی جیت کی علامت نہیں اُس کی اپنی فتح کا اعلان ہو۔ وہ نہرو پارک سے بہت سے پھول توڑ کر پروین پر پھولوں کی بارش کر دیتا تھا۔ وہ کھِل کھلا کر ہنس پڑتی تھی اور وہ جھوم اُٹھتا تھا۔

- دُوسروں کی بدقسمتی سے احتیاط کا درس لو (سائرس)
- ہر شخص سچّا دوست ڈھونڈتا ہے لیکن سچّا دوست بننے کی تکلیف کوئی بھی گوارا نہیں کرتا۔ (شیلر)
- سچّے دوست کی پہچان یہ ہے کہ ہر حالت میں دوست رہتا ہے۔ (سولیمن)
- جن کے پاس بے انتہا دوست ہوتے ہیں، در اصل اُن کے پاس کوئی دوست نہیں۔ (للی)
- بیوی کے انتخاب میں اور تلوار کی خریداری میں دُوسروں پر بھروسہ نہ کرنا چاہیئے۔ (سر فرانسس بیکن)

جیسے یہ پروین کے قہقہے نہ ہوں، بادۂ کیف و نشاط ہو اور وہ اِس بادۂ کیف و نشاط سے سرشار ہو کر کہتا ــــ

"دیوی خوش ہو تو پجاری سمجھ لیتا ہے اُس کی پُوجا سپھل ہوگئی!"

شام کے ملگجے اندھیرے میں دونوں ایک دُوسرے کا ہاتھ تھام کر گنگا کے کنارے ریت پر دُور تک دَوڑتے چلے جاتے تھے اور پھر پروین اُس کے ہاتھ سے ہاتھ چھڑا کر ریت پر لیٹ جاتی تھی اور اپنی اُکھڑی اُکھڑی منتشر سانسوں کو سمیٹتی ہوئی اُس کی طرف اپنی محبت پاش نظروں سے دیکھتی ہوئی کہتی تھی ــــ

"اب اور نہیں، میں تھک گئی ہوں!"

اور وہ اُس کے قریب ہی بیٹھ کر اُس کے شفق گُوں چہرے کے نیچے سینے کے زیر و بم اور ڈوبتی اُبھرتی سانسوں کو دیکھنے لگتا تھا اور اُسے محسوس ہونے لگتا جیسے اُس کے اندر جوار بھاٹا سا اُٹھ رہا ہو ——— اور جذبات کی بیکراں لہریں صبر و ضبط کے بند توڑ کر اُسے بہالے جائیں گی۔ دُور ——— بہت دُور ——— جہاں کیف ہی کیف ہے ——— مستی ہی مستی ہے!

یہ خیال ہی اُس کے لئے حیات آفریں تھا کہ پروین کی مُسکراہٹیں میری ہیں، اُس کے نُقرئی قہقہے میرے لئے ہیں، اُس کا مہکتا ہُوا خوبصورت مرمریں پیکر میرا ہے ——— صرف میرا!

ایک شام ———

پروین خوش تھی ——— بہت خوش! آج وہ اُسے معمول سے زیادہ حسین اور دلکش نظر آرہی تھی۔ جیسے کلیوں نے اپنی مُسکراہٹیں اُس کے باریک ہونٹوں پر سجادی ہوں، گُلوں نے اپنی تازگی و شگفتگی اُسے عطا کردی ہو۔ ڈوبتے سُورج نے اپنی آخری چھپی کرنوں کا عکس اُس کے شگفتہ رخساروں کو بخش دیا ہو، بادِ نسیم کے خُنک جھونکوں نے اپنی نازک خرامی اُس کے حوالے کردی ہو، جیسے دُنیا کی ساری رعنائیاں اِس ایک پیکر میں سمٹ آئی ہوں۔

آج اُس کی نِگاہیں پروین پر نثار ہوتی جارہی تھیں۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" وہ اُس کی نِگاہوں کو اپنے چہرے پر محسوس کرکے بولی۔

"تمھیں ——— آج تو بہت ہی خوبصورت نظر آرہی ہو!" وہ ضبط نہ کرسکا۔ دل کی بات زبان پر آگئی۔

"سچ!" وہ اِٹھلائی۔

"ہاں، اور آج تم بہت خوش ہو، کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"ہاں!" وہ مُسکرائی۔

"میں بھی تو سُنوں؟"

وہ ایک بھرپُور انگڑائی لے کر بولی۔

"آج میں خوش ہوں ——— بہت خوش! ——— آج خط مِلا ہے کل صبح وہ آرہا ہے!"

"کون؟" ایک انجانے خوف سے اُس کا دل دھڑکنے لگا۔

"ساجد ——— میرا ساجد ———!" اُس نے سر جُھکا لیا جیسے شرماگئی ہو۔

اُس کے ذہن کو زبردست جھٹکا لگا اور اُسے محسوس ہُوا جیسے کسی نے اُس کا دل مُٹھی میں لے کر زور سے دبادیا ہو اور خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا ہو۔

"کل شام میں تمھیں اُس سے مِلاؤں گی۔ دیکھنا کتنا اچھا ہے وہ!" اُس کا چہرہ خوشی سے گُلنار ہو رہا تھا۔ وہ ایک پھُول کی طرح کھِل اُٹھی تھی۔

پروین کا یہ انکشاف کڑکتی ہوئی بجلی کی طرح اُس کے دل پر گِرا تھا اور دل میں پھُول بننے کے لئے بیتاب تمنّاؤں اور آرزوؤں کی معصوم کلیاں جھُلس گئی تھیں۔ شدّتِ کرب سے اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اُس نے دل کی بے چین دھڑکنوں کو سنبھالنے اور آنکھوں میں اُمڈ آنے والے آنسوؤں کو پی جانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔

"مُبارک ہو پروین! لیکن میں ساجد سے نہ مِل سکوں گا۔ آج ہی رات کی گاڑی سے مجھے دہلی جانا ہے، انٹرویو کے لئے!"

اُس نے جھُوٹ کہا تھا۔ حالانکہ اُسے دو روز بعد دہلی جانا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ساجد سے مِل کر اُسے خوشی نہ ہوگی۔ اُس کا غم اور بڑھ جائے گا، وہ خود کو سنبھال نہ سکے گا۔

اور پھر وہ پروین سے اِس طرح جُدا ہوا کہ پھر نہ مِل سکا۔ لیکن ہزار کوششوں کے باوجود وہ پروین کو نہ بھُلا سکا۔ اُس کی یاد کو دل سے نہ نکال سکا، اُس کے ساتھ گزرے ہوئے دنوں اور لمحوں کے تصوّر سے فرار حاصل نہ کرسکا۔

اور ایک سال کے بعد پروین کے لُٹ جانے، برباد ہوجانے، اُس کی خوشیوں اور اُمنگوں سے بھرپُور زندگی کے شیرازے کے بکھر جانے کی خبر سُن کر وہ اور بھی مضطرب ہوگیا، بے چین ہوگیا ——— اُف کتنی رُوح فرسا تھی وہ خبر ——— کاش میں پروین کے کام آسکتا ——— کاش!

اور تین سال بعد پروین زندگی کے ایک موڑ پر پھر اِس طرح اچانک اُس کے سامنے آئی تھی کہ وہ ایک بار پھر

خود کو سنبھالنے سے مجبور ہو گیا تھا۔ پروین کے ساتھ گزرے ہوئے دنوں اور لمحوں کا تصور ایک بار پھر پوری شدت سے بیدار ہو گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کیوں نہ پروین سے وہ ساری باتیں کہہ دے ــــــ لیکن وہ ڈر رہا تھا۔ اگر پروین نے انکار کر دیا تو؟؟

وہ بہت بے چینی سے پروین کا انتظار کر رہا تھا۔ اپنے فلیٹ میں ٹہلتے ہوئے وہ کبھی کمپاؤنڈ کے آہنی گیٹ کی طرف دیکھنے لگتا تو کبھی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف۔ چھ بجنے کو تھے۔ پروین نے پانچ ہی بجے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ اُس کی بے چینی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوتی جا رہی تھیں۔ آنکھوں میں نااُمیدی اور مایوسی کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ وہ انتظار کی صعوبتوں سے نڈھال ہو کر خود کو ایزی چیئر پر گرا دینا چاہتا تھا کہ وہ چونک پڑا۔ جیسے اندھیرے کو چیر کر روشنی کی کرن جلوہ گر ہو گئی ہو اور ہر طرف اُجالا پھیل گیا ہو۔ وہ برآمدے کی سیڑھیاں طے کر کے آہنی گیٹ کی طرف تیز تیز بڑھنے لگا۔ پروین ڈولی کو سنبھالے اُس کی طرف آ رہی تھی۔ اُس کے خوبصورت اور باریک ہونٹوں پر مُسکراہٹ تھی۔ ہلکی معصوم سی مُسکراہٹ۔

"بہت دیر کر دی تم نے۔ میں کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں!" اُس نے محبت آمیز لہجے میں شکایت کی۔

"اوہ! معاف کرنا۔ اِس کی وجہ سے دیر ہو گئی!" پروین نے ڈولی کی طرف اِشارہ کیا۔

"کچھ بھی ہو، دیر سے آئی ہو تو دیر تک نہ جانے دوں گا!"

"کیوں؟" اُس کی مُسکراہٹ اور نکھر گئی۔

"بس، باتیں کریں گے، بہت ساری باتیں!" وہ ٹپٹا گیا۔

دونوں کی نِگاہیں مِلیں اور جُھک گئیں۔ پروین کے ساتھ وہ بھی خاموش رہا۔ جیسے سمجھ نہ پا رہا ہو کہ بات کہاں سے شروع کرے، کس طرح شروع کرے؟

"کہاں ہیں؟" ڈرائنگ رُوم کا جائزہ لیتی ہوئی پروین آہستہ سے بولی۔

"کون؟" وہ پروین کی طرف دیکھنے لگا۔

"تمہاری وہ۔۔۔!"

"مِلوگی اُن سے؟" اُس نے کچھ سوچتے ہوئے تھوڑے توقف سے کہا۔

"کیوں نہیں!" وہ سر جُھکائے ہوئے بولی۔

"تو پھر آؤ!" وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ گیا۔

پروین اُس کے ساتھ چلتی ہوئی اُس کے بیڈ رُوم میں آئی۔

"یہاں تو کوئی نہیں ہے!" وہ بیڈ رُوم میں چاروں طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

"یہیں ہیں وہ، جن کے سہارے میں اپنی زندگی گزار رہا ہوں۔ لو دیکھو!" اُس نے آگے بڑھ کر دیوار سے لٹکی ہوئی ایک ریشمی ڈور کو پکڑ کر کھینچا۔ دیوار کے وسط میں تنا ہُوا پردہ ایک طرف سرک گیا۔ ایک صورت سامنے اُبھر آئی۔

"یہ۔۔۔!" پروین بُری طرح چونک گئی۔ اُس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ اُس نے صوفے کا سہارا لیا اور بیٹھ گئی اور حیرت و استعجاب میں ڈُوبی نِگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی۔

وہ کہنے لگا۔

"پروین! اگر میں ایسا نہ کرتا تو یقین کرو میری زندگی کا سُونا پن مجھے نِگل لیتا، میری تنہائیاں مجھے ڈس لیتیں۔ تم سے بچھڑ جانے کا غم ناقابلِ برداشت ہو جاتا اور میں اِس سِسکتی بِلکتی زندگی سے گھبرا کر اپنا گلا گھونٹ لیتا، غموں کی تیز آنچ مجھے جلا کر خاک کر دیتی۔ یہ جانتے ہوئے کہ تم ساجد کی ہو چکی ہو اور میرے لئے تمہارا تصوّر بھی گُناہ ہے۔ میں یہ گُناہ کرتا رہا، تمہاری تصویر کی پرستش کرتا رہا۔ یہ سوچ کر خود کو بہلاتا رہا کہ کسی صورت سہی تم میرے پاس تو ہو۔"

اُس کی آواز بھرا گئی، گلا رُندھ گیا، پلکیں نم ہو گئیں۔

وہ اپنی جگہ بُت بنی بیٹھی اِس طرح اُس کی باتیں سُنتی اور اُس کی طرف دیکھتی رہی جیسے وہ سانس لیتی ہوئی عورت نہیں سنگِ مرمر کا مُجسّمہ ہو۔ حیرت و استعجاب میں ڈُوبا ہوا۔

چند لمحوں بعد وہ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔

"پروین! میں جانتا ہوں ساجد کی اچانک موت نے تمہاری زندگی کی ساری خوشیاں تم سے چھین لی ہیں۔ تمہارا سکون درہم برہم ہو گیا۔ تمہارے گِرد غم و آلام کے دائرے تنگ

ہوگئے ہیں اور تم کانٹوں سے بھری راہوں سے گزرتی زندگی کے اُس سفر پر تنہا نکل پڑی ہو جس کی کوئی منزل نہیں۔

"پروین! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم ایک منزل کا تعین کریں اور زندگی کی راہ پر قدم سے قدم مِلا کر چلیں، ایک دُوسرے کا غم بانٹ لیں؟"

"بولو پروین! بولو" اُس نے پروین کو جھنجوڑ دیا۔

پروین نے نظریں نیچی کر لیں۔ اُس کی پلکوں پر آنسوؤں کے سِتارے جِھلملانے لگے۔

اُس نے پروین کی آنکھوں میں اُمڈ آنے والے آنسوؤں کو دیکھا اور اُسے محسوس ہوا جیسے پروین کے آنسوؤں نے اُس سے سب کچھ کہہ دیا ہو۔ جیسے پروین کے اِن آنسوؤں نے اُس کے اندر سُلگتی ہوئی غموں کی تیز آنچ کو سرد کر دیا ہو۔ جیسے پروین کے اندر کا کرب آنسو بن کر قطرہ قطرہ ٹپک رہا ہو۔ اُس کے دل پر رکھی غموں کی سِل رفتہ رفتہ پِگھل رہی ہو۔

ڈولی فرش پر بیٹھی اُس کے لائے ہوئے کھلونوں سے کھیل رہی تھی۔ اُس نے ڈولی کو گود میں اُٹھا لیا اور اُسے پیار کرتے ہوئے بولا۔

"میں کون ہوں بیٹی؟"

ڈولی معصوم نگاہوں سے اِس طرح اُسے دیکھنے لگی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

"کہو ابّو!" اُس نے ڈولی کے کان میں سرگوشی کی اور اپنا سوال پھر دُہرایا۔

"میں کون ہوں بتاؤ ـــــ بتاؤ نا میری گُڑیا بیٹی!"

"ابّو!" ڈولی نے اپنی توتلی زبان سے کہا اور مسکرانے لگی۔ اُس کا پھول جیسا معصوم چہرہ کِھل اُٹھا اور وہ اپنی ننھی ننھی باہوں کو اُس کے گلے میں ڈال کر اُس کے سینے سے لگ گئی۔

اُس نے پروین کی طرف دیکھا۔

اشک آلود آنکھوں کے نیچے پروین کے مُرجھائے ہوئے ہونٹوں سے تبسم کی رنگا رنگ کرنیں پھوٹ پڑی تھیں۔

اور اُسے محسوس ہوا جیسے یاس کے گھنگھور اندھیروں میں آس کی کتنی ہی قندیلیں فروزاں ہو گئی ہوں۔ اُس نے ڈولی کو سینے سے لگا لیا اور اپنے ہونٹ اُس کی پیشانی پر رکھ دیئے!!

غزلیں

[illegible] ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی

[illegible] جب گیا قریب تو وہ دور ہو گئی
[illegible] ہے جیسے ہر خوشی مفرور ہو گئی

جس تشنگی سے رُوح کبھی آشنا نہ تھی
وہ تشنگی حیات کا دستور ہو گئی

اُس نے مجھے چھُوا تو بدن جگمگا اُٹھا
تاریک جو فضا تھی وہ پُر نور ہو گئی

ہم نے جسے سنبھال کے رکھا تھا عمر بھر
وہ شے ابھی کچھ ایسی گری چُور ہو گئی

میں آپ اپنے قتل سے منکر رہا مگر
یہ بات سارے شہر میں مشہور ہو گئی

احمد میں اُجالوں کے ہمراہ جب چلے
پرچھائیں ساتھ چلنے پہ مجبور ہو گئی

مظہر امام ایم۔ اے

منزلوں کی دھن میں دیوانے رہے
عقل والے چادریں تانے رہے

تشنگی نے ہاتھ پھیلائے نہیں
دیر تک گردش میں پیمانے رہے

باغ میں اکثر بہار آتی رہی
پھول کی حسرت میں ویرانے رہے

موسمِ گُل میں یہ وضعِ احتیاط
ہم بھی دیوانے کے دیوانے رہے

دوستوں کو دشمنی راس آگئی
آپ اچھے تھے کہ بیگانے رہے

ہو گئے دیر و حرم ویراں امامؔ!
شکر ہے، آباد مے خانے رہے

پروفیسر نازؔ قادری ایم۔ اے

جلوہ اپنا دکھا گیا کوئی
مجھ کو بے خود بنا گیا کوئی

دِل کی دُنیا پہ چھا گیا کوئی
مجھ کو اپنا بنا گیا کوئی

دیکھ کر نیم باز آنکھوں سے
جامِ اُلفت پلا گیا کوئی

اللہ اللہ شعلہ سامانی
خرمنِ دِل جلا گیا کوئی

بدنا شکوں کی کیا بجھائے گی
آگ دِل میں لگا گیا کوئی

چہرۂ زیست ہے اُداس اُداس
آج پھر یاد آ گیا کوئی

جھک گئی خود بخود جبینِ نیاز
جب تصور میں آ گیا کوئی

بجھ گئی شمعِ آرزو اے نازؔ
میری محفل سے کیا گیا کوئی

پھر احمقانہ جواب!

فکر تونسوی

سوال — "غریبی ہٹاؤ نعرے کی کتنی اہمیت ہے؟"

جواب — "جتنی امیروں کی ڈائننگ ٹیبل کے ایک تنکے کی!"

سوال — "وہ لوگ کہاں گئے جو کہا کرتے تھے، ملک میں انقلاب لائیں گے؟"

جواب — "وہ مندرجہ ذیل مقامات پر مل جائیں گے۔

(۱) پبلک پارک میں گلی سڑی مونگ پھلیاں کھاتے ہوئے۔

(۲) راج محلوں میں پستے کھا کر مونگ پھلیوں پر آنسو بہاتے ہوئے۔"

سوال — "عاشقوں اور بوڑھوں کو نیند کیوں نہیں آتی؟"

جواب — "عاشقوں کو محبوبہ اور بوڑھوں کو موت کے انتظار میں۔ دونوں نجانے کب ٹپک پڑیں۔"

سوال — "وہ کونسی آنکھ ہے جو روتی نہیں مگر آنسو بہاتی ہے؟"

جواب — "لیڈر کی آنکھ"

سوال — "جب کوئی فلم ہیروئن کسی منسٹر کے گلے میں ہار ڈالتی ہے تو دونوں کیسے معلوم ہوتے ہیں؟"

جواب — "ایک ہی فرم کے شیئر ہولڈر!"

سوال — "عوام کو الیکشن میں سب سے زیادہ احمق کون بناتا ہے؟"

جواب — "اس کا اپنا ووٹ!"

سوال — "بے ایمان لوگ عزت پانے کے لئے کرپشن کر رہے ہیں تو ایماندار کیا کریں؟"

جواب — "پانچ وقت کی نماز پڑھا کریں۔"

سوال — "پچھلے زمانے میں کبوتر ہی لو لیٹر لے جایا کرتا تھا۔ آج کل یہ کبوتر کہاں رہتا ہے؟"

جواب — "ٹیلی فون میں۔"

سوال — "چاند ہر رات میری کھڑکی کے راستے داخل ہو جاتا ہے۔ اور کہتا ہے ....؟"

جواب — "....کہ آپ سسکیاں کیوں بھر رہے ہیں۔ شادی کیوں نہیں کر لیتے۔"

سوال — "میری بیوی اپنے بیٹے سے محبت کرتی ہے۔ بیٹی سے نہیں کرتی۔ کیوں؟"

جواب — "کوئی عورت دوسری عورت سے محبت نہیں کر سکتی۔"

سوال — "اس دنیا سے ناطہ کب توڑنا چاہیئے؟"

جواب — "جب دنیا آپ سے ناطہ توڑ لے۔"

سوال — "میری محبوبہ مجھ سے عشق کی قیمت مانگتی ہے۔ کیا کروں؟"

جواب — "اسے قیمت دے دیجیئے، عشق واپس لے لیجیے۔"

سوال — "اپنے حسن کا ٹھیکرا لے کر میں نے کئی مکانوں کے کواڑ کھٹکھٹائے، لیکن کسی نے مجھے بھیک نہیں دی؟"

جواب — "آپ نے خالی مکانوں کے در کھٹکھٹائے ہوں گے۔"

سوال — "گھاسلیٹ کی خدمت کرنا بہتر ہے یا انسان کی؟"

جواب — "گائے کی — کیونکہ انسان کی خدمت کریں گے تو وہ آپ کی گائے بھی چرا لے گا۔"

سوال — "میں اپنے کرپٹ افسر کو گالی دینا چاہتا ہوں، لیکن ہمت نہیں پڑتی۔ کوئی طریقہ بتائیے؟"

جواب — "ٹیلی فون پر گالی دے کر رسیور فوراً رکھ دیجیے۔"

سوال — "نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بار بار آئینہ کیوں دیکھتے ہیں؟"

جواب — "کیونکہ آئینہ ہی ایسا جھوٹ بول سکتا ہے جو حسین ہو۔"

سوال — "کیا یہ سچ ہے کہ محبوبہ کی آواز کانوں میں رس گھول دیتی ہے؟"

جواب — "یہ کانوں کی کوالٹی کے اوپر منحصر ہے"

سوال — "عورت کب تک جوان رہتی ہے؟"

جواب — "جب تک اس کے بچے جوان نہیں ہو جاتے۔"

سوال — "عوام سوشلزم تک پہنچنا چاہتے ہیں اور سوشلزم عوام سے ملنا چاہتا ہے تو درمیان میں رکاوٹ کس چیز کی ہے؟"

جواب — "لیڈر کی۔"

سوال — "سنا ہے کرپٹ لوگوں کا ناش کرنے کے لیے شیو جی اپنی تیسری آنکھ کھولنے والے ہیں۔"

جواب — "میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کیونکہ کرپٹ لوگوں نے شیو جی سے سلیو کا کنکشن ہی کاٹ دیا ہے۔"

سوال — "ایک ہاؤس وائف اور ایک ملازمت پیشہ بیوی میں کیا فرق ہے؟"

جواب — "ایک وزیر داخلہ اور دوسری وزیر خارجہ۔"

سوال — "پڑھی لکھی بیوی اور ان پڑھ بیوی میں کیا فرق ہوتا ہے؟"

جواب — "پڑھی لکھی بیوی — دردِ سر!

ان پڑھ بیوی — دردِ سر کی گولی!"

سوال — "اگر لیڈر کو ایک نفیس سگریٹ سے تشبیہ دی جائے تو عوام کو کیا کہا جائے گا؟"

جواب — "ایش ٹرے۔"

سوال — "عورت بناؤ سنگار کیوں کرتی ہے؟"

جواب — "کل آپ کہیں گے، بلی میاؤں میاؤں کیوں کرتی ہے۔"

سوال — "برات کسی کی بھی ہو، محلے کی لڑکیاں بالخصوص دولہا کو کیوں دیکھتی ہیں؟"

جواب — "یہ شک دور کرنے کے لیے کہ کہیں یہی لڑکا تو میرے سپنوں میں نہیں آیا تھا۔"

سوال — "میں نے بلیک مارکیٹ میں دس لاکھ روپے کمائے ہیں، میں اُن سے ایک فلم بنانا چاہتا ہوں، بتائیے کس موضوع پر بناؤں؟"

جواب — "بلیک مارکیٹ کے خلاف۔"

سوال — "ہمارے ملک کے بڑے بڑے لیڈر جو کالا دھن پیدا کرتے ہیں، اسے کس طرح خرچ کرتے ہیں؟"

جواب — "وزیروں کے اعزاز میں کاک ٹیل پارٹیوں پر۔"

سوال — "اگر کشمیر اس دھرتی کی جنت ہے تو اس دھرتی کا جہنم کیا ہے؟"

جواب — "کشمیر کے محنت کش۔"

سوال — "میرے دل میں ہر وقت ایک خواہش رہتی ہے کہ ہر بات میں سچ بولنا شروع کر دوں۔"

جواب — "اسے جنتا ہی جھکتی ہیں — یہ خواہش کتنے سالوں سے ہے؟"

سوال — "کئی وزیروں پر بھرشٹاچار کے الزامات لگتے ہیں لیکن وہ ثابت کیوں نہیں ہوتے؟"

جواب — "کیونکہ وہ قانون کی حدود میں بھرشٹاچار کرتے ہیں۔"

سوال — "عشق صادق کون کر سکتا ہے؟"

جواب — "جو سوچتا کم ہو۔"

سوال — "غنچے اگر غنچے نہ بنتے تو کیا بنتے؟"

جواب — "تمہاری بہار۔"

سوال — "وہ کونسی تالی ہے جو ایک ہاتھ سے بجتی ہے؟"

جواب — "راہ چلتی خوبصورت لڑکی کا تھپڑ!"

سوال — "ہمارے لیڈروں کا نیگیٹو اسپارٹیو پہلو کیا ہے؟"

جواب — "(۱) ووٹ لینے سے پہلے پیدل یاترا کرتا ہے۔

(۲) ووٹ لینے کے بعد ہوائی جہاز پر سفر کرتا ہے۔"

سوال — "موت سے چند منٹ پہلے کسے یاد کرنا چاہیے؟"

جواب — "اگر آپ غریب ہیں تو خدا کو یاد کیجیے۔

اگر آپ امیر ہیں تو وکیل کو بلوائیے۔"

سوال — "گیدڑ ساری رات جنگل میں کہتا رہتا ہے کہ میرا باپ بادشاہ تھا"

جواب — "شیر کو ڈرانے کے لیے۔"

سوال — "جو فلم سٹار انکم ٹیکس کا لاکھوں روپیہ ہڑپ کر جاتے ہیں انہیں کیا سزا دینی چاہیے؟"

جواب — "انہیں پدم شری بنا دینا چاہیے۔"

سوال — "مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان کے مسز بھٹو باہر سے سیاہ کے ایجنٹ ہیں اندر سے قسمت کے اچھے نہیں؟"

جواب — "آپ اوپر کا چھلکا کھا لیا کیجیے، گودا پھینک دیا کیجیے۔"

سوال — "سوشلزم اس ملک میں کب آئے گا؟"

جواب — "اب تک تو اسے آ جانا چاہیے تھا۔ شاید بس ڈبل ہوگی۔"

سوال — "آج کل کے چور چوری کا مال لے کر کہاں غائب ہو جاتے ہیں، پولیس کو علم ہی نہیں؟"

جواب — "پولیس اسٹیشن میں۔"

سوال — "میرے ایک دوست کی بیوی ہے جو ایک بند کتاب کی طرح ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اسے کسی نے کھول کر نہیں دیکھا۔"

جواب ـــ "کئی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جن کا سر ورق دیکھ کر ہی الگ رکھ دیتے ہیں ـــ!"

سوال ـــ "ایماندار آدمی بے ایمان کیونکر بنتا ہے ؟"

جواب ـــ "کوئی ایماندار آدمی ہی بتا سکتا ہے جو آجکل ملنا ہی نہیں۔"

سوال ـــ "انسان دوسروں کی نظر میں گرنا کیوں ناپسند نہیں کرتا ؟"

جواب ـــ "کیونکہ اپنی ہی نظر میں گرنا کافی سمجھتا ہے ۔"

سوال ـــ "شری جے پرکاش نرائن کے سامنے مدھیہ پردیش کے ڈاکوؤں نے ہتھیار ڈال دیئے تو کیا پولیٹیکل ڈاکو اُن کے سامنے ہتھیار نہیں ڈال سکتے ؟"

جواب ـــ "نہیں ! کیونکہ جے پرکاش جی خود اُن کے سامنے ہتھیار ڈال چکے ہیں"

سوال ـــ "بہادر شاہ ظفر نے یہ شعر کیوں لکھا تھا ـ

ہے کتنا بدنصیب ظفرؔ دفن کے لئے
دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں "

جواب ـــ "اُن دنوں دہلی میں زمین بہت مہنگی ہو گی، اور بہادر شاہ ظفر کی اقتصادی پوزیشن کچھ نازک ہو گی ۔"

سوال ـــ "کہتے ہیں پالیٹکس بہت غلیظ گیم ہوتی ہے تو پھر اچھے آدمی اس میں پھنستے ہیں ؟"

جواب ـــ "آپ سے کس نے کہا کہ وہ اچھے آدمی ہوتے ہیں ۔"

سوال ـــ "پھول کب پتھر بن جاتے ہیں ؟"

جواب ـــ "جب کوئی خوبصورت لڑکی لیڈی پولیس میں بھرتی ہو جاتی ہے ۔"

سوال ـــ "رسمیں اور قسمیں کب ٹوٹتی ہیں ؟"

جواب ـــ "جب وہ بس میں نہ رہیں ۔"

سوال ـــ "اگر آپ کو الہ دین کا چراغ دے دیا جائے تو آپ اس سے پہلا کونسا کام لیں گے ؟"

جواب ـــ "چراغ کو بیچ کر دعائیں خرید لوں گا ۔"

سوال ـــ "پہلے زمانے میں انقلاب زندہ باد کا نعرہ پاپولر تھا۔ آجکل کونسا نعرہ پاپولر ہے ؟"

جواب ـــ "دم مارو دم "

سوال ـــ "میں اپنے آپ کو احمق ثابت کرنا چاہتا ہوں، کوئی شارٹ کٹ بتایئے "

جواب ـــ "سچ بولنا شروع کر دیجئے ۔"

سوال ـــ "ہندوستان میں کونسی ایسی چیز بچ گئی ہے جسمیں ابھی ملاوٹ نہیں ہوتی ؟"

جواب ـــ "موت "

سوال ـــ "اہلِ محبت تاج محل کی طرف کیوں بھاگتے ہیں ؟"

جواب ـــ "تاج محل ـــ اہلِ محبت کا شرنارتھی کیمپ ہے ۔"

سوال ـــ "میں کسی بھینس کے آگے بین بجانا چاہتا ہوں کسی معقول بھینس کا پتہ بتایئے ؟"

جواب ـــ "ملک تونسوی، معرفت بیسویں صدی ـ دہلی ۲ "

سوال ـــ "ماڈرن فیشن ترقی کی علامت ہے یا پستی کی ؟"

جواب ـــ "فیشن بدلتے رہتے ہیں لیکن ترقی اور پستی کبھی نہیں بدلتی ۔"

سوال ـــ "کہتے ہیں گدھا بیوقوف ہوتا ہے اور گھوڑا عقلمند، تو انسان کیا ہے !"

جواب ـــ "خچر! جس میں دونوں کی صفات پائی جاتی ہیں ۔"

سوال ـــ "انسان اپنی خود اعتمادی کب کھو دیتا ہے ؟"

جواب ـــ "یہ تو ایسا ہی سوال ہے جیسے چور میرے گھر میں نقب کب لگائے گا ؟"

سوال ـــ "عشق کا آغاز کیسے ہوتا ہے اور انجام کہاں ؟"

جواب ـــ "اُس عشق کا آغاز ہی نہیں ہوتا جس کا انجام ہو جائے ۔"

سوال ـــ "کہتے ہیں، جوانی بچپن میں چھپی رہتی ہے تو بچپن کہاں چھپا رہتا ہے ؟"

جواب ـــ "بڑھاپے میں "

سوال ـــ "میرے عشق کا سورج غروب ہو گیا ہے یعنی میری محبوبہ کی شادی ہو گئی ہے لیکن وہ ابھی تک میرے خوابوں میں کیوں آ جاتی ہے ؟"

جواب ـــ "سورج ڈوبنے کے بعد کچھ دیر تک اُس کی کرنیں کانپتی رہتی ہیں ۔"

سوال ـــ "ٹو میرج کے بعد کونسی منزل ہوتی ہے ؟"

جواب ـــ "آلو گوبھی کی ۔"

سوال ـــ "وہ کونسی چیز ہے جس کے بغیر انسان دو کوڑی کا بھی نہیں رہتا ؟"

جواب ـــ "دو کوڑیاں ۔"

سوال ـــ "جوانی دیوانی ہے تو بڑھاپا کیا ہے ؟"

جواب ـــ "دیوانگی کی سمادھ !"

سوال ـــ "جب لیڈر سٹیج پر تقریر کر رہا ہوتا ہے تو کیا سوچتا ہے ؟"

جواب ـــ "لیڈر سوچے بغیر تقریر کرتا ہے "

منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن میں آرڈر پر ضرور تحریر فرمایئے کہ رقم کس سلسلے میں بھیجی گئی ہے تاکہ تعمیلِ ارشاد میں دیر نہ ہو خط و کتابت کرتے وقت اور منی آرڈر بھیجتے وقت پتہ رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۲ لکھنا لازمی ہے ـ منیجر

سوال — "عوام سوشلزم سے ملنا چاہتے ہیں اور سوشلزم عوام سے ملنا چاہتا ہے تو درمیان میں رکاوٹ کس چیز کی ہے ؟"

جواب — "لیڈر کی"

سوال — "سنا ہے کرپٹ لوگوں کا ناش کرنے کے لئے شیو جی اپنی تیسری آنکھ کھولنے والے ہیں"

جواب — "میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کیونکہ کرپٹ لوگوں نے شیو جی کے ٹیلیفون کا کنکشن ہی کاٹ دیا ہے"

سوال — "ایک ہاؤس وائف اور ایک ملازمت پیشہ بیوی میں کیا فرق ہے ؟"

جواب — "ایک وزیر داخلہ اور دوسری وزیر خارجہ"

سوال — "پڑھی لکھی بیوی اور ان پڑھ بیوی میں کیا فرق ہوتا ہے ؟"

جواب — "پڑھی لکھی بیوی —— دردِ سر!

ان پڑھ بیوی —— دردِ سر کی ٹکیہ!"

سوال — "اگر لیڈر کو ایک نفیس سگریٹ سے تشبیہ دی جائے تو عوام کو کیا کہا جائے گا ؟"

جواب — "ایش ٹرے"

سوال — "عورت بناؤ سنگھار کیوں کرتی ہے ؟"

جواب — "کل آپ کہیں گے، بلی میاؤں میاؤں کیوں کرتی ہے"

سوال — "برات کسی کی بھی —— محلے کی لڑکیاں بالخصوص دولہا کو کیوں دیکھتی ہیں ؟"

جواب — "یہ شک دور کرنے کے لئے کہ کہیں یہی لڑکا تو میرے سپنوں میں نہیں آیا تھا"

سوال — "میں نے بلیک مارکیٹ میں دس لاکھ روپے کمائے ہیں، میں ان سے ایک فلم بنانا چاہتا ہوں، بتایئے کس موضوع پر بناؤں ؟"

جواب — "بلیک مارکیٹ کے خلاف"

سوال — "ہمارے ملک کے بڑے بڑے اسمگلر جو کالا دھن پیدا کرتے ہیں، اسے کس طرح خرچ کرتے ہیں ؟"

جواب — "وزیروں کے اعزاز میں کاک ٹیل پارٹیوں پر"

سوال — "اگر کشمیر اس دھرتی کی جنت ہے تو اس دھرتی کا جہنم کیا ہے ؟"

جواب — "کشمیر کے محنت کش"

سوال — "میرے دل میں ہر وقت ہوک اٹھتی رہتی ہے کہ ہر بات میں سچ بولنا شروع کر دوں"

جواب — "اسے جنون ہی سمجھتے ہیں —— ناش [illegible]"

سوال — "کئی وزیروں پر بھرشٹاچار کے الزامات لگتے ہیں لیکن وہ ثابت کیوں نہیں ہوتے ؟"

جواب — "کیونکہ وہ قانون کی حدود میں رہ کر بھرشٹاچار کرتے ہیں"

سوال — "عشق صادق کون کر سکتا ہے ؟"

جواب — "جو سوچتا کم ہو"

سوال — "غنڈے اگر غنڈے نہ بنتے تو کیا بنتے ؟"

جواب — "تھانیدار"

سوال — "وہ کونسی تالی ہے جو ایک ہاتھ سے بجتی ہے ؟"

جواب — "راہ چلتی خوبصورت لڑکی کا تھپڑ"

سوال — "ہمارے لیڈروں کا پسندیدہ اور پیارا مشغلہ کیا ہے ؟"

جواب — "(۱) ووٹ لینے سے پہلے پیدل یاترا کرتا ہے۔

(۲) ووٹ لینے کے بعد ہوائی جہاز پر سفر کرتا ہے"

سوال — "موت سے چند منٹ پہلے کسے یاد کرنا چاہیئے ؟"

جواب — "اگر آپ غریب ہیں تو خدا کو یاد کیجئے۔

اگر آپ امیر ہیں تو وکیل کو بلوایئے"

سوال — "گیدڑ ساری رات جنگل میں کہتا پھرتا ہے کہ میرا باپ بادشاہ تھا"

جواب — "شیر کو ڈرانے کے لئے"

سوال — "جو فلم سٹار انکم ٹیکس کا لاکھوں روپیہ ہڑپ کر جاتے ہیں انہیں کیا سزا دینی چاہیئے ؟"

جواب — "انہیں پدم شری بنا دینا چاہیئے"

سوال — "مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان کے مسٹر بھٹو باہر سے جتنے اچھے ہیں اندر سے ذہنیت کے اچھے نہیں ؟"

جواب — "آپ اوپر کا چھلکا کھا لیا کیجئے، گودا پھینک دیا کیجئے"

سوال — "سوشلزم اس ملک میں کب آئے گا ؟"

جواب — "اب تک تو اسے آ جانا چاہیئے تھا۔ شاید بس نہ ملی ہوگی"

سوال — "آج کل کے چور چوری کا مال لے کر کہاں غائب ہو جاتے ہیں پولیس کو ملتے ہی نہیں ؟"

جواب — "پولیس اسٹیشن میں"

سوال — "میرے ایک دوست کی بیٹی ہے جو ایک بند کتاب کی طرح ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کسی نے کھول کے نہیں دیکھا"

جواب — "کئی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جن کا سرورق دیکھ کر ہی لوگ رکھ دیتے ہیں —!"

سوال — "ایماندار آدمی بے ایمان کیوں بن جاتا ہے؟"

جواب — "کوئی ایماندار آدمی ہی بتا سکتا ہے جو آجکل ملتا ہی نہیں۔"

سوال — "انسان دوسروں کی نظر میں گرنا کیوں پسند نہیں کرتا؟"

جواب — "کیونکہ اپنی ہی نظر میں گرنا کافی سمجھتا ہے۔"

سوال — "شری جے پرکاش نرائن کے سامنے مدھیہ پردیش کے ڈاکوؤں نے ہتھیار ڈال دیئے تو کیا پولیس والے ڈاکوؤں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈال سکتے؟"

جواب — "نہیں! کیونکہ جے پرکاش جی خود اُن کے سامنے ہتھیار ڈال چکے ہیں۔"

سوال — "بہادر شاہ ظفر نے یہ شعر کیوں لکھا تھا

ہے کتنا بدنصیب ظفر دفن کے لئے

دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں"

جواب — "اُن دنوں دہلی میں زمین بہت مہنگی ہوگی، اور بہادر شاہ ظفر کی اقتصادی پوزیشن کچھ نازک ہوگی۔"

سوال — "کہتے ہیں پالیٹکس بہت غلیظ گیم ہوتی ہے تو پھر اچھے آدمی اس میں پھنستے ہیں؟"

جواب — "آپ سے کس نے کہا کہ وہ اچھے آدمی ہوتے ہیں۔"

سوال — "پھول کب پتھر بن جاتے ہیں؟"

جواب — "جب کوئی خوبصورت لڑکی لیڈی پولیس میں بھرتی ہو جاتی ہے۔"

سوال — "رسمیں اور قسمیں کب ٹوٹتی ہیں؟"

جواب — "جب وہ بس میں نہ رہیں۔"

سوال — "اگر آپ کو ایک دن کا جہاں خدا دے دیا جائے تو آپ اس سے پہلا کونسا کام لیں گے؟"

جواب — "چراغ کو بیچ کر دوائیں خرید لوں گا۔"

سوال — "پچھلے زمانے میں انقلاب زندہ باد کا نعرہ پاپولر تھا۔ آجکل کونسا نعرہ پاپولر ہے؟"

جواب — "دم مارو دم۔"

سوال — "میں اپنے آپ کو احمق ثابت کرنا چاہتا ہوں، کوئی شارٹ کٹ بتایئے۔"

جواب — "سچ بولنا شروع کر دیجئے۔"

سوال — "ہندوستان میں کونسی ایسی چیز بچ گئی ہے جس میں ابھی ملاوٹ نہیں ہوئی؟"

جواب — "موت"

سوال — "اہل محبت تاج محل کی طرف کیوں بھاگتے ہیں؟"

جواب — "تاج محل — اہل محبت کا شرنارتھی کیمپ ہے۔"

سوال — "میں کسی بھینس کے آگے بین بجانا چاہتا ہوں، کسی معقول بھینس کا پتہ بتایئے؟"

جواب — "مکرّر تونسوی، معرفت بیسویں صدی، دہلی ۶"

سوال — "ماڈرن فیشن ترقی کی علامت ہے یا پستی کی؟"

جواب — "فیشن بدلتے رہتے ہیں لیکن ترقی اور پستی کبھی نہیں بدلتی۔"

سوال — "کہتے ہیں گدھا بیوقوف ہوتا ہے اور گھوڑا عقلمند، تو انسان کیا ہے؟"

جواب — "خچر! جس میں دونوں کی صفات پائی جاتی ہیں۔"

سوال — "انسان اپنی خود اعتمادی کب کھو دیتا ہے؟"

جواب — "یہ تو ایسا ہی سوال ہے جیسے چور میرے گھر میں نقب کب لگائے گا؟"

سوال — "عشق کا آغاز کیسے ہوتا ہے اور انجام کہاں؟"

جواب — "اُس عشق کا آغاز ہی نہیں ہوتا جس کا انجام ہو جائے۔"

سوال — "کہتے ہیں، جوانی بچپن میں چھُپی رہتی ہے تو بچپن کہاں چھپا رہتا ہے؟"

جواب — "بڑھاپے میں"

سوال — "میرے عشق کا سورج غروب ہو گیا ہے یعنی میری محبوبہ کی شادی ہو گئی ہے لیکن وہ ابھی تک میرے خوابوں میں کیوں آجاتی ہے؟"

جواب — "سورج ڈوبنے کے بعد کچھ دیر تک اُس کی کرنیں کانپتی رہتی ہیں۔"

سوال — "لو میرج کے بعد کونسی منزل ہوتی ہے؟"

جواب — "آلو گوبھی کی۔"

سوال — "وہ کونسی چیز ہے جس کے بغیر انسان دو کوڑی کا بھی نہیں رہتا؟"

جواب — "دو کوڑیاں۔"

سوال — "جوانی دیوانی ہے تو بڑھاپا کیا ہے؟"

جواب — "دیوانگی کی سمادھ!"

سوال — "جب لیڈر سٹیج پر تقریر کر رہا ہوتا ہے تو کیا سوچتا ہے؟"

جواب — "لیڈر سوچے بغیر تقریر کرتا ہے۔"

منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن منی آرڈر پر ضرور تحریر فرمایئے کہ رقم کس سلسلے میں بھیجی گئی ہے تاکہ تعمیل ارشاد میں دیر نہ ہو، خط وکتابت کرنے اور منی آرڈر بھیجنے کے لئے پتہ: رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۶ لکھنا لازمی ہے۔

غزل

محمد افتخار الحق دلگیر عثمانی امروہوی ایم۔ اے

سہیں دل نے مرے چوٹیں بلا کی
ستم کی حد کی غم کی جفا کی

گیا صحرا کو مجنوں تو خطا کی
نہ چھانی خاک کوئے دلربا کی

اندھیرا ہی اندھیرا چار سُو تھا
سیاہی، تھی شبِ فرقت بلا کی

سرِ بزم ان کو حالِ دل سُنایا
شکایت ہم نے جو کی برملا کی

زمیں پر پاؤں کیوں رکھنے لگے وہ
کہ شوخی لے اُڑی رنگِ حنا کی

یہ دل ارمان و حسرت کا مزار
تلاشش اُن کو دلِ بے مدعا کی

جفا بھی کی دلگیر اُس نے اگر کچھ
محبت میں بھی بھرپور کی

غزل

محمد سلیم شیدا بی۔ اے

شورشِ موجِ حوادث میں سکوں پانی ہے
کشتیِ دل جو کنارے سے پلٹ جاتی ہے

اپنی ناکامیِ تقدیر پہ رونے والو
حسنِ تدبیر سے تقدیر سنور جاتی ہے

سعیِ ادراک حوادث سے گریزاں ہے کیوں؟
آتے آتے، دلِ نافہم، سمجھ آتی ہے

جب تصور میں ہوا کرتی ہیں باتیں تجھ سے
خامشی وسعتِ کونین پہ چھا جاتی ہے

میں وہ بیمارِ محبت ہوں کہ جس سے شاید
موت بھی آنکھ ملاتے ہوئے گھبراتی ہے

جب گھٹا جھوم کے اُٹھتی ہے فلک پہ ساقی
زندگی شیشۂ بے خوار میں ڈھل جاتی ہے

لیکن واسطے شیدا کو بُرا کہتے ہیں
اُس میں کیا بات بُرائی کی نظر آتی ہے

اندھیرا اُجالا

ظفر اقبال

۱۷۰۔ خیلدار، فتح پور (یوپی)

مکرمی و محترمی خوش ختر صاحب! آداب و خلوص

"بیسویں صدی" کے لئے ایک کہانی "اندھیرا اُجالا" ارسالِ خدمت ہے۔ اُمید ہے کسی قریبی اشاعت میں شامل فرماکر ممنون فرمائیں گے...

آپ کا ——— ظفر اقبال

★

زخموں کی دولت ہی میری کُل کائنات ہے ——— اور میں اسے اپنے سینے میں چھپائے پھر رہی ہوں۔ ڈرتی ہوں کوئی اسے بھی نہ چھین لے اور یکسر تہی دامن بن کر رہ جاؤں۔ اندر ہی اندر سُلگتی ہوئی زندگی ——— جہاں زخم آبلے بن بن کر پھوٹتے رہتے ہیں اور یہی میرے لئے درد بھی ہے اور درماں بھی ——— میں انہیں کے سہارے تو زندہ ہوں۔ اُن کی ٹیس ہی سے تو مجھے تسکین ملتی ہے۔

پورے دس سال سے میں زندگی کی غم نصیبی کا شکار ہوں۔ تنہائی میرا مقدر بن چکی ہے اور آنسو میری قسمت ——— صرف یادیں، میری غمگسار زندگی کی ساتھی ہیں ——— تنہائی میں ذہن کے اُفق پر یادوں کے ستارے جگمگانے لگتے ہیں اور میں ماضی کے سمن زاروں میں کھو جاتی ہوں۔

ساری کائنات میرے لئے اندھی ہے۔ میں نہیں جانتی کہ میرا دُنیا میں کوئی ہے بھی یا نہیں؟ تاریک ماضی، تاریک حال، تاریک مستقبل ——— پورا وجود تیرگی میں لپٹا ہے۔ اُجالے کی ذرا سی شعاع بھی نہیں۔ اُمید و یاس کی جو ہلکی سی کرن باقی بھی تھی وہ دُکھ کے دُھندلکوں میں ڈوب گئی ہے اور اب میں اُس غار کی طرح ہوں جس کے چاروں طرف دیو ہیکل پہاڑ احاطہ کئے ہوئے ہوں۔ میری کُل کائنات لُٹ چکی ہے۔ سارے خواب بکھر چکے ہیں اور زندگی ایک تپتا ہُوا صحرا ہے۔ جہاں ویرانی کے سوا کچھ نہیں۔ وہ آس ختم ہو چکی ہے جس کے سہارے میں زندہ تھی۔ وہ جانفزا لمحے جو کبھی رنگینیٔ حیات اور سرمایۂ زیست تھے۔ میرا ذہن اُن لمحوں کی رعنائیوں میں ڈوبتا جا رہا ہے۔

موسمِ گُل کی طرح دسمبر کی وہ ایک خُنک سی شام تھی۔ میں تاجی کے ساتھ فلم دیکھ کر لوٹی تھی۔ تاجی کو اُس کے گھر چھوڑ کر جب میں اپنے گھر میں داخل ہوئی تو ڈرائنگ رُوم میں ایک اجنبی نوجوان کو دیکھ کر ایک لمحہ کے لئے ٹھٹک گئی۔ وہ صوفہ پر نیم دراز، ایک ہاتھ میں جلتا ہُوا سگریٹ اور دوسرے ہاتھ میں کوئی اُردو میگزین لئے مجھے مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔ مجھے اُس کا اس طرح دیکھنا بہت عجیب سا معلوم ہُوا اور میں اُس کی سحر طراز شخصیت میں کھو سی گئی۔ فراخ، شفاف پیشانی پر بالوں کی اُلجھی ہوئی، آوارہ سی لٹ، مخمور آنکھوں میں ذہانت کی چمک، کھلتا ہُوا گندمی رنگ اور بھرا بھرا شاداب چہرہ، صحت مند جسم پر سُرمئی رنگ کا سُوٹ، اُس کی شخصیت کو اور نکھار رہا تھا۔ میں مسحور انداز میں جامد و ساکن کھڑی اُسے دیکھتی رہی۔

"ارے انجو تم کب آئیں؟" پیچھے سے آتی ہوئی بھیّا کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

اور میں اپنی اُس کیفیت کا خیال ترک کر کے شرما گئی۔ وہ بھی اب سیدھا ہو کر صوفہ پر بیٹھ گیا تھا۔ جلتا ہُوا سگریٹ اُسی طرح اُس کی گندمی اُنگلیوں کی پوروں کو جُھلسا رہا تھا اور میگزین اُس کے ہاتھ سے آزاد ہو کر گود میں آ پڑا تھا۔

"آؤ انجو بیٹھو" بھیّا اُس کے برابر صوفہ پر بیٹھتے ہوئے بولے اور میں اُن کے سامنے دُوسرے صوفہ پر بیٹھ گئی۔

"یہ میری چھوٹی بہن انجم ہے" بھیّا نے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر ہلکا ہلکا تبسّم رقصاں تھا۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ میرے دوست شہزاد ہیں۔ جن کے بارے میں مَیں نے تم سے بتایا تھا کہ شام کی گاڑی سے آنے والے ہیں۔ اب یہ یہیں رہیں گے۔ ریفریجریشن انجینئر کی حیثیت سے اِن کا تقرر ہمارے ہی شہر میں ہو گیا ہے۔"

میں نے بارِ حیا سے جھکی پلکیں اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔ میری نظریں اُس سے ٹکرا گئیں اور مجھے ایسا محسوس ہوا میں اُس کی آنکھوں کی گہرائی میں ڈوبتی جا رہی ہوں۔

"انجو! چائے نہ پلاؤ گی؟" بھیّا کی آواز اُبھری۔

"اوہ! ابھی لائی!" کہتے ہوئے میں تیزی سے نکل گئی۔ کچن رُوم میں بڑی بی کو چائے کی ہدایت کر کے جب میں اپنے کمرے میں پہنچی تو میرے دل کا عجیب عالم تھا۔ وہ اِس طرح دھڑک رہا تھا جیسے میں طویل مسافت طے کر کے پیدل آئی ہوں۔ سردی کے باوجود مجھے اپنے چہرے پر ہلکے ہلکے پسینے کا لمس محسوس ہوا اور میں آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ میرے چہرے کا انگوری رنگ انگارے کی طرح دہک اُٹھا تھا اور سیاہ لانبی پلکوں کے نیچے جھیل جیسی گہری آنکھوں میں خواب کی سی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ گہرے فیروزی رنگ کی ساری کے اُوپر سفید فر کے کوٹ میں مَیں حُسن و رعنائی کا دلاویز مجسّمہ تھی۔ میں اپنا خوبصورت پیکر آئینہ میں دیکھ کر غرور سے تن گئی۔

سرور اور شرم کے مِلے جُلے جذبات سے ہمکنار ہو کر جب میں کچن رُوم میں داخل ہوئی تو بڑی بی نے چائے تیار کر لی تھی۔ میں نے انڈے کا حلوہ، ٹوسٹ اور نمکین وغیرہ پلیٹ میں سجایا اور خود ہی ٹرے لئے ہوئے پہنچ گئی۔ وہ بھیّا سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ اُس کے ہنسنے کا انداز بہت دلکش تھا۔

"آپ کی چائے میں کتنی شکر ڈالوں؟" میں نے پیالی میں شکر گھولتے ہوئے شیریں آواز میں اُس سے پُوچھا اور سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

"دو چمچہ!" اُس نے میری مخروطی اُنگلیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اُس کی آواز میں مردانہ وقار تھا۔ میں اُس کی آواز کی گونج میں کھو گئی۔

"آپ کس کلاس میں پڑھتی ہیں؟"

میں نے اپنی خوبصورت اور سحر آگیں آنکھوں سے اُسے دیکھا۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکرا رہا تھا۔ میری پلکیں جھکتی چلی گئیں۔

"ایم۔ اے فرسٹ ایئر" میری لرزتی آواز اُبھری۔

"سبجیکٹ؟"

"اُردو!" میں نے چائے کی پیالی اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

"یار ماجد! یہ تو اپنے ٹیس (Taste) کی ہیں" اُس کی آواز کی بازگشت میں مجھے اپنا وجود ڈولتا ہوا محسوس ہوا۔

"انجو! شہزاد کو اُردو ادب سے گہرا لگاؤ ہے۔ یہ اُردو کے بہت اچھے شاعر بھی ہیں"

"تب تو مجھے آپ سے بہت مدد ملے گی" میں ایکدم بول اُٹھی۔

"مجھے خوشی ہو گی" وہ چائے کی چُسکی لیتے ہوئے بولا۔

چائے پینے کے بعد بھیّا شہزاد کو لے کر باہر چلے گئے اور میں خوابوں کی دُنیا میں کھو گئی۔ وہ شہزاد کے رُوپ میں میرے تخیّل کا شہزادہ بن کر آیا تھا اور میری زندگی میں محبت کے پھُول مہک اُٹھے تھے۔ فضا جیسے نکہت و نُور میں ڈوب گئی تھی۔

چند ہی ملاقاتوں میں ہم ایک دُوسرے کے احساسات پر

چھاگئے اور دل کے ساز پر پیار کے نغمے مچلنے لگے۔ گھر، پارک، کیفے، گارڈن، لائبریری، ہر جگہ ہماری سانسوں کی خوشبو پھیلنے لگی اور ہر طرف رنگ و نُور کی سی کیفیت چھاگئی۔

اُس کی دلکش شخصیت کی طرح اُس کی شاعری میں بھی جادُو تھا۔ جو میرے کنوارے جذبات میں ہلچل پیدا کر دیتی جب وہ اپنے دلکش ترنم سے کوئی غزل پڑھتا تو ایک ایسی جذباتی لہر جیسے کانوں کی لَو سے شروع ہو کر گردن اور پھر گالوں کو گلنار بناتی ہوئی پُورے جسم میں دوڑ جاتی۔

شام کے رُومان پرور ملگجے اندھیرے میں جب ہم ایک دُوسرے سے ملتے اور میری بارِ حیا سے جُھکی ہوئی آنکھیں جب گرگر کر اُٹھتیں تو اُس کی نبضِ حیات میں ارتعاش سا پیدا کر دیتیں اور وہ جذبات سے مغلوب ہو کر میرے حسین پیکر کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لینا چاہتا اور میرے چہرے پر شرم کی سُرخی کی تہہ اور بھی گہری ہو جاتی۔

نکہت و نُور سے معمور ایک سال کا عرصہ یوں گزر گیا جیسے آسمان پر قوسِ قزح لہرا کر غائب ہو گئی ہو۔ بھیّا کو ہماری ملاقاتوں کا علم تھا لیکن وہ انجان سے بنے رہے۔ وہ ہمیں مذہبی و سماجی رِشتے میں پرونا چاہتے تھے۔ بھیّا اور گھر کے دُوسرے افراد کے چہرے پر شادابی کی لہر دیکھ کر مجھے اپنی محبت کے گُلاب کِھلتے نظر آتے۔

وہ ایک بہت ہی اُداس صُبح تھی۔ میں کالج جانے کی تیّاری کر رہی تھی کہ بھیّا کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"انجو!"

میں نے مُڑ کر دیکھا۔ بھیّا نے ایک رُقعہ میری طرف بڑھا دیا۔

"ڈیر ماجد!

ابھی ابھی ٹیلیگرام کے ذریعہ نادر کی سیریس علالت کی خبر ملی ہے۔ میں گھر جا رہا ہوں۔ تم لوگوں سے مِل کر نہ جانے کا افسوس ہے۔ دُعاؤں میں یاد رکھنا۔

تمہارا ــــــ شہزاد"

بھیّا جاچکے تھے۔ میرے ہاتھوں میں پرچہ تھرتھرا رہا تھا۔ شہزاد کی شبیہہ میری آنکھوں میں گھوم رہی تھی۔ میرا دل کالج میں نہ لگا۔ تاجی کے ساتھ فلم کا پروگرام بنایا۔ وہاں بھی طبیعت نہ لگی۔ گھر آکر شہزاد کے تصوّر میں لیٹ رہی۔ اندھیرا کب پھیلا۔ رات کب آئی اور کب گزر گئی مجھے کچھ خبر نہ ہوئی۔ ایک ہی دن کی جُدائی نے میرا یہ حال کر دیا تھا۔ آج مجھے احساس ہُوا تھا کہ شہزاد میری رُوح میں رچ بس گیا ہے کہ اُس کے بغیر میں زندہ رہنے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی۔

دن، ہفتے، مہینے ــــ اور پُورے چھ ماہ گزر گئے! شہزاد کی جُدائی کے لمحات طویل ہوتے گئے۔ آفس میں پتہ لگانے پر معلوم ہُوا کہ اُس نے اپنا تبادلہ دُوسری جگہ کرا لیا ہے۔ اِس خبر نے میرے دل میں درد و یاس اور بھر دیا۔ میری کیفیت اُس پھُول کی سی تھی جِس کی خوشبو چھین لی گئی ہو۔ اُس چراغ کی مانند جِس کی لَو کتر دی گئی ہو۔

پھر اُداسیوں کے بوجھل دنوں میں شہزاد کا ایک مختصر سا خط مِلا ــــ

"انجم!

حالتِ نزع میں باپ کی خواہش کے احترام میں مَیں نے اپنی زندگی کا دامن صُوفیہ کے آنچل سے باندھ لیا ہے۔ صُوفیہ میرے والد کے مرحوم بھائی کی نشانی اور مجھے تم سے دُور کرنے والی وہ خلیج ہے، جِس کے ایک کنارے پر میں ــــ اور دُوسرے کنارے پر تم ہو۔

مجھے تمہارے غم کا اندازہ ہے۔ لیکن . . . وہ الفاظ مجھے نہیں مِل رہے ہیں جو تمہارے دل کو تسکین دے سکیں۔ مجھے بھُول جاؤ اور ہو سکے تو معاف کر دینا۔

غم نصیب ــــ شہزاد"

شہزاد کی تحریر کا ایک ایک لفظ مجھے اپنے دل میں پیوست ہوتا محسوس ہُوا۔ میں سکتے کے عالم میں گھنٹوں اپنی جگہ پر بیٹھی رہی اور میری غیر متحرک آنکھیں تحریر کو گھُورتی رہیں۔ میرا سارا جسم پتھر کی طرح ساکت تھا۔

دن کا اُجالا دھیرے دھیرے سیاہی میں ڈھلتا گیا اور پھر وہی سیاہی میرا مقدّر بن گئی! بھیّا اور گھر والوں نے بہت چاہا کہ میری شادی کہیں کر دیں۔ لیکن میرا دل شہزاد کے سِوا کِسی کو قبول کرنے پر رضامند نہ ہُوا اور میں یہ بھی گوارہ نہ کر سکی کہ گھر والوں پر

بو جھ بنی رہوں۔ اِس لئے ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج میں ملازمت کرلی۔

زندگی کسی چاہت اور اُمنگ کے بغیر گزرتی رہی۔ دو سال بعد میرا تبادلہ دُوسرے شہر میں ہوگیا۔ دن بھر کالج میں لڑکیوں کے ساتھ سرکھپاتی اور جب تاریک و ویران رات اپنے ساتھ شہزاد کی یاد لے کر آتی تو میں شمع کی مانند سُلگتی رہتی۔

سُلگنا اور تڑپنا ہی میرا مقدر تھا۔ اپنی جوانی کی تمام آرزوؤں اور تمناؤں کو دفن کرکے صرف شہزاد کی یاد کو سینے سے لگائے زندہ تھی۔ شہزاد جو میرا نہ تھا، کسی اور کا تھا۔ یہ کیسی محبت تھی جس میں خود کو جلاکر مجھے تسکین ہوتی تھی۔

درد و کرب سے بھری ہزاروں راتیں گزارنے کے بعد اچانک ایک دن نوید مسرت ملی۔ میرا دل ایک عجیب جذبے سے بھر گیا اور سوئے ہوئے جذبات کے خاموش تاروں میں دلنواز جھنکار پیدا ہوگئی۔ میری زندگی کے بہتے ہوئے دھارے کا رُخ کسی نے موڑ دیا ہو۔ چند لفظوں کی تحریر —— جس نے میری حیات کے ریگستان کو سرسبز و شاداب کردیا تھا۔ میری تشنہ آرزوئیں سیراب ہوتی نظر آنے لگیں۔ میری بجھی بجھی تاریک زندگی جھلملا اُٹھی تھی ——

"انجو!

صوفیہ کو مرے ہوئے دو سال کا عرصہ ہو رہا ہے۔
اور میں تمہارے سہارے کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔
میں نئے سال کی پہلی کرن کے ساتھ تمہاری ویران اور اُداس زندگی میں پیار کی سوغات لے کر آرہا ہوں!
تمہارا گنہگار —— شہزاد"

زندگی میں چاروں طرف اُجالا بکھر گیا اور ہر شئے پر بہار چھاگئی۔ گھر کے درو دیوار مُسکرا اُٹھے۔ مُرجھاتے ہوئے چہرے پر تبسّم کی لالی رقص کرنے لگی۔ اُمنگیں جوان نظر آنے لگیں۔ نئے سال کی پہلی کرن کے درمیان حائل ایک ایک پل مجھے ایک ایک صدی معلوم ہونے لگا۔

میرا شہزاد آرہا ہے! میرے خوابوں کا دلنشیں شہزاد ——!!
دس سال کے بعد اُسے دیکھوں گی۔ کیسا ہوگا؟ کتنا بدل گیا ہوگا؟

اِنھیں خیالات میں شب و روز محو رہتی اور پھر وہ شب آگئی جس کا طلوع ہونے والا سُورج اپنے ساتھ شہزاد کو لا رہا تھا۔ میں نے ساری رات گھر کی آرائش و زیبائش اور خود کو سنوارنے میں گزار دی۔

اور جب صبح کی پہلی کرن نے کھڑکی سے آکر میرے ملیح رُخساروں کو چُوما تو میں آپ ہی آپ شرما گئی۔ چہرے پر شفق کی سُرخی بکھر گئی۔ ابھی میں شوقِ انتظار کے جذبے سے سرشار اپنے خوابوں کے شہزادے کے تصوّر میں ڈُوبی ہوئی تھی کہ اچانک ریڈیو سے نشر ہوتی ہوئی یہ خبر سُن کر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاگیا۔

"بمبئی سے دہلی آنے والا طیّارہ اچانک ٹنکی پھٹ جانے سے شعلوں کی نذر ہوگیا۔ ہلاک ہونے والے مسافروں کے نام یہ ہیں۔ کیلاش بھاٹیہ، سیٹھ بھوپت نرائن، کملا کپور، شہزاد ہاشمی۔۔؟

اِس کے آگے میں نہ سُن سکی۔ میرا لرزتا ہوا جسم صوفے پر لڑھک گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو نئے سال کا سُورج ڈھل رہا تھا۔ ساری کائنات گہرے اندھیرے میں ڈُوبتی جارہی تھی! صبحِ مسرت کی پہلی کرن بھی اُسی اندھیرے میں ڈُوب گئی —— ! میں سوچنے لگی —— میرے معبود! اندھیرا اُجالا کا یہ کیسا کھیل ہے؟؟

مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ مضمون حاشیہ چھوڑ کر روشن سیاہی سے خوشخط لکھا کریں اور دو سطروں کے درمیان فاصلہ چھوڑنا بہت ضروری ہے۔ بعض اچھے مضامین محض بدخطی کی وجہ سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں۔ ہمیشہ غیر مطبوعہ مضامین بھیجیں اور ایڈیٹر کی اطلاع کے لئے مضمون کے خاتمے پر غیر مطبوعہ لکھیں۔ بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں یہ نہایت نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اپنے پاس مضمون کی نقل ضرور رکھیں کیونکہ ناقابلِ اشاعت مضامین ضائع کردیے جاتے ہیں۔ ناقابلِ اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے مضمون کے ساتھ ٹکٹ لگا ہوا اپنا پورا پتہ لکھا ہوا پوسٹ آفس کا لفافہ ارسال کریں ورنہ ہم مضمون کی واپسی کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ منیجر

غزلیں

نجم مظفر نگری

جو نظر سے دل کے بچھڑ گئی مجھے اُس نظر کی تلاش ہے
میں ہوں رہبر رہِ عاشقی کسی ہمسفر کی تلاش ہے
مجھے ذوقِ سجدہ ہے کس قدر میرا انہماک تو دیکھیے
کبھی نقشِ پا کی تلاش ہے کبھی سنگِ در کی تلاش ہے
تجھے جستجو کا ہے شوق اگر تو تو خیر و شر میں تلاش کر
کوئی باخدا بھی ہے ہم نفس، اک بشر میں بشر کی تلاش ہے
میں مریضِ عشق ہوں دوستو مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو
مرے دل کے زخم جو دیکھ لے اُسی چارہ گر کی تلاش ہے
نہ خوشی کا اُس کو پیام دو کہ مذاقِ نجم ہے مختلف
اُسے ہر قدم پہ جہان میں غمِ معتبر کی تلاش ہے

اخلاق سہسوانی

ہر اک نقشِ پا پر نشانِ جبیں ہے
کہیں یہ تری رہگذر تو نہیں ہے؟
ستارے چھپے، ہو گئی صبح لیکن!
مجھے اُن کے وعدے کا اب بھی یقیں ہے
کن آنکھوں سے دیکھوں گا تم کو پشیماں!
نہیں، میرے دل میں کوئی غم نہیں ہے
ذرا آ گیا تھا لبوں پر تبسم!
ابھی تک غمِ عشق چیں بر جبیں ہے
کمی آ گئی کیا کسی کے ستم میں:
اب اخلاق غم میں وہ لذت نہیں ہے

ظفر دِل سہسانوی

ظرفِ دل لے کے طلبگارِ کرم آئے ہیں
آج ساقی ترے میخانے میں ہم آئے ہیں
انجمن سے تری ممنونِ کرم آئے ہیں
جب بھی ہم آئے ہیں بیگانۂ غم آئے ہیں
غزلِ شوق کی ہر راہ ہے پُر پیچ، مگر
کھا کے ہم گیسوئے پُر خم کی قسم آئے ہیں
ساقیٔ رفعت سے کہہ دو کہ نوازش فرمائے
آج میخانۂ آلام میں ہم آئے ہیں
گردشِ وقت سے کہہ دو کہ ٹھہر جائے ذرا
دِل کے حسرت کدے میں ان کے قدم آئے ہیں

خان ارمان

جس سے پوچھیے، اُسے، بے وفا بتائے ہے — وہ نظر تو اور ہی، داستاں سنائے ہے
کاروانِ صبح کا، دُور تک پتہ نہیں — ایک رات آئے ہے، ایک رات جائے ہے
پہلو فرار میں، لاکھ منہ چھپا لیجے — بار بار زندگی، آئینہ دکھائے ہے
اے نسیمِ خوش خرام، تجھ کو کچھ خبر نہیں — تیری ایک شوخ ادا، کتنے گل کھلائے ہے

چشمِ بے قرار کو، انتظار ہے ترا
اور انتظار میں عمر بیت جائے ہے

اگلا بچہ ہونے سے پہلے
ذرا سوچئے



کیا آپ اس بچے
کی صحیح دیکھ بھال
نہیں کرنا چاہیں گے ؟

اس کے روشن مستقبل کیلئے اعلیٰ تعلیم کی شروعات اور باقی سبھی ضرورتوں کو پورا کرنے کا انتظام... لیکن اگر بچہ جلد ہو گیا تو یہ سب کچھ کرنا آپ کے لئے مشکل ہوگا۔ آپ اس پریشانی سے ضرور بچنا چاہیں گے۔

نِرودھ کی مدد سے اب آپ اگلے بچے کی پیدائش کو تب تک ٹال سکتے ہیں، جب تک آپ اسکی پوری دیکھ ریکھ کرنے لائق نہیں ہو جاتے۔ نِرودھ مردوں کیلئے ہے۔ ربڑ سے بنا حمل روکنے کا یہ آسان ذریعہ برسوں سے ساری دنیا میں مقبول ہے۔ آپ بھی نِرودھ استعمال کیجئے۔

نِرودھ ہر جگہ ملتا ہے۔ سرکاری رعایتی دام، 15 پیسے میں 3



جب تک نہ چاہیں تب تک نہ پائیں سنتان

▼ نِرودھ

لاکھوں میں مقبول، بے ضرر اور آسان

کریانہ فروشوں، دوا فروشوں، پنساریوں، پان و سگریٹ کی دکانوں وغیرہ کے یہاں بکتا ہے۔

davp 72/658

صُلح

سیف سہسرامی

نور گنج، سہسرام (بہار)

برادرِ محترم! گلہائے عقیدت و محبت

"بیسویں صدی" لاکھوں دلوں کی دھڑکن بن چکا ہے! اِس کا ثبوت وہ خطوط ہیں جو مختلف جگہوں سے میری کہانی "شیشے میں بال" کے سلسلے میں آئے ہیں۔ "بیسویں صدی" اپریل ۷۲ء میں شائع ہونے والی میری پہلی کہانی "کوشش" پنجابی زبان میں ترجمہ ہو کر پنجابی زبان کے رسالہ "مینار" میں شائع ہو چکی ہے۔ اِس بار "صُلح" لے کر حاضر ہو رہا ہوں۔ اِس کا موضوع آج کے نئے معاشرہ کی دین ہے۔ اُمید ہے آپ اور قارئینِ "بیسویں صدی" اِسے ضرور پسند کریں گے . . .

آپ کا ——— سیف سہسرامی

★

زینو ڈارلنگ!

آج ہماری شادی کی تیسری سالگرہ کا دن ہے اور آج تمھیں رُوٹھے ہوئے پُورے چھ مہینے گزر گئے! اِن چھ مہینوں میں میرے دل پر، اِس تنہا اُداس زندگی پر اور اِس ویران گھر پر، یہاں کی اِک ایک چیز پر کیا کچھ نہ گزری! جب بھی دفتر سے گھر آتا ہوں دروازے پر لٹکتا ہُوا گرد آلود پردہ لرز لرز کر تمھاری بے رُخی کا شکوہ کرنے لگتا ہے۔ آنگن میں مُرجھائے ہوئے گُلاب کے پَودے اور اُن میں لگے بے رنگ سے پھُول اپنی کمھلائی ہوئی خاموش زبان سے یہ گِلہ کرنے لگتے ہیں کہ اُن سے تمھارے پیار کی خوشبو رُوٹھ گئی ہے۔ کمرے میں بِکھری کتابیں، اُداس اور بے نُور آئینے، اُجڑی ہوئی سِنگار میز گرد و غبار میں اَٹی ہوئی کُرسیاں، شِکن آلود بستر جس کی لکیریں چیخ چیخ کر میری شبِ غم کا قصّہ سُناتی رہتی ہیں اور میں اِن کے درمیان ایک گنہگار کی طرح سہما سہما صرف تمھاری یاد کے سہارے جیسے تیسے جئے جاتا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں نظر سے دُور دل سے دُور! لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ تم نظر سے دُور ہو کر دل سے اور قریب ہو گئی ہو!

بس اب آ بھی جاؤ۔ مجھ سے اکیلے اِس زندگی کا بوجھ نہیں سنبھالا جاتا۔

تمھارا ——— شاہد

شاہد میاں!

زینو کے نام تمھارا خط مِلا۔ بہت خوب! اب تمھیں یہ احساس ہُوا کہ زندگی کا بوجھ اکیلے نہیں اُٹھایا جاتا۔ برخوردار! یہ خط لکھتے ہوئے تمھیں شرم نہ آئی؟ تم نے میری بیٹی کو بھی اپنی کاغذی ہیروئنوں کی طرح کھِلونا سمجھ لیا ہے کہ جب جی چاہا کسی افسانے کا کردار بنا کر رکھ دیا، جس رنگ میں چاہا رنگ دیا۔ غلطی دراصل میری تھی جو میں نے تمھارے جیسے ناکارہ لڑکے کے ہاتھ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ دے دیا اور سچ پُوچھو تو غلطی میری بھی نہ تھی۔ خُدا سمجھے میر صاحب سے جنھوں نے کنکر کو ہیرا بنا کر دکھایا۔ پھُول میں کانٹا چھپا کر گلے کا ہار بنا دیا۔ میں تو اُسی وقت چونکا تھا جب معلوم ہُوا تھا کہ صاحب زادے خیر سے شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔ لیکن لوگوں نے بہکا دیا۔ آدمی کا شیطان آدمی ہوتا ہے۔ میں بھی لوگوں کی باتوں میں آ گیا اور اِس بات پر یقین کر لیا کہ

افسانے اور نظمیں لکھ کر تم ہزاروں ہزار کماتے ہو۔ خیر اِس سے بھی غرض نہیں کہ تم کتنا کماتے ہو۔ بات تو یہ تھی کہ تم جو کچھ کرو گے یہاں رہ کر ہی کرو گے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ جس طرح تم اپنے افسانوں کے ذریعہ ہر روز نیا جھوٹ تراش لیتے ہو اُسی طرح میں بھی تمہاری چال میں آجاؤں گا۔ ہوش تو اُس وقت آیا جب زینو کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں نے تمہارے مکر و فریب کی کہانی سنائی۔ میرے خوابوں کا تاج محل ریت کی دیوار ثابت ہوگا۔ یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ورنہ میں کسی قیمت پر اپنی بیٹی کی شادی تم سے نہ کرتا۔ بہرحال اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ آئندہ زینو کو کوئی خط نہ لکھنا۔ وہ تم سے دُور رہ کر اچھی اور خوش ہے۔

______ ممتاز احمد

محترمی! تسلیم

محبت نامہ باعثِ تسکینِ نظر ہوا۔ شکریہ!

آپ نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی ورنہ اس طرح دل دکھانے والی باتیں نہ لکھتے۔ ویسے بھی بزرگوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ بچوں کی لڑائی میں دخل دیں۔ زینو میری شریکِ حیات ہے۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ جینے اور زندگی گزارنے کا عہد کیا ہے جس پر میں تادمِ مرگ قائم رہوں گا۔ اس لئے آپ کا فرض ہے کہ زینو کو سمجھا بجھا کر میرے پاس بھیج دیں۔ ایک بار پھر کہوں گا کہ آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں افسانے لکھتا ہوں اور ہر افسانے کی ہیروئنیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ لیکن یہ غلط ہے کہ میں نے زینو کو بھی کسی افسانہ کا کردار بنانا چاہا ہے۔ اگر زینو کسی افسانے کا کردار ہے تو وہ میری زندگی کا افسانہ ہے جس کی وہ ہیروئن ہی نہیں رُوح ہے! اُس کے بغیر میرا ہر افسانہ بے رُوح اور بے نظم ہے، بے رنگ ہے۔ شادی کے بعد جو کچھ میں نے لکھا ہے اُس کے ہر لفظ میں زینو کی تصویر جھلکتی ہے۔ میرے فن کی پھلواری اُسی کی خوشبو سے مہکتی ہے۔ اِس لئے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ میری نامکمل زندگی کی کہانی کو تکمیل تک پہنچانے میں میری مدد کریں اور میری شریکِ حیات، میری ہمسفر زینو کو میرے پاس بھجوانے کی زحمت گوارا فرمائیں۔

طالبِ دُعا ______ شاہد

شاہد میاں!

شاباش! تم سے یہی اُمید تھی۔ اِس عمر میں کوئی مجھے نالائق کہنے والا تو پیدا ہُوا! عزیزم! یہ صحیح ہے کہ میں نے تمہیں نہیں پہچانا ورنہ آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ رہ گئی زینو کے تمہارے پاس بھیجنے کی بات تو تم ابھی بچّے ہو جیسا کہ تم نے خود ہی لکھا ہے۔ اِس لئے اُس وقت تک زینو کا تم سے دُور ہی رہنا اچھا ہے جب تک تم سنِ شعور کو نہیں پہنچ جاتے۔ کیونکہ میری بیٹی ابھی اِس لائق نہیں ہے کہ وہ کسی ننھے بچّے کو سنبھال سکے۔ بہتر ہوتا کہ تم اس کا خیال چھوڑ دیتے اور اگر واقعی وہ تمہاری زندگی کا ایک اہم حصّہ ہے، تمہاری نظموں، تمہارے افسانوں کی رُوحِ رواں ہے تو پھر یہ ضد کیسی۔ تم یہاں رہ کر بھی اپنے فن کی تکمیل کر سکتے ہو۔ یا تم جہاں رہنا چاہو رہو اور جب زینو کے ساتھ کی ضرورت محسوس ہو یہاں آجاؤ۔ اختلافات ختم ہونے کی اِس سے بہتر کوئی صورت نہیں۔

______ ممتاز احمد

محترم! تسلیم و نیاز

شرائط نامہ موصول ہُوا۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا اور آج بھی کہوں گا کہ مجھے سسرال کا کُتّا بن کر رہنا منظور نہیں۔ دُنیا کا دستور ہے کہ شادی کے بعد لڑکیاں اپنی سسرال میں جاکر رہتی ہیں۔ اُن کا گھر اُن کی جنّت، شوہر کی خوشی پر منحصر ہے نہ کہ مرد ہی سسرال میں جاکر بستا ہے۔ یہ شرط مجھے منظور نہیں۔ دوسری شرط ہے کہ جب زینو کے ساتھ کی ضرورت محسوس ہو میں آپ کے دروازہ پر کاسۂ اُمید لئے صدا لگاؤں تو جواباً عرض ہے کہ زینو کا ساتھ مجھے ہر قدم پر چاہئے۔ وہ میری شریکِ زندگی ہے۔ عورت اور مرد ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ جب تک دونوں ساتھ نہ دیں زندگی کا راستہ نہیں کٹتا۔ اس لئے آپ کی یہ شرط بھی مہمل ہے جسے کوئی ذی ہوش اور خوددار آدمی تسلیم نہیں کر سکتا۔ بہتر تو یہ ہوتا کہ آپ میری درخواست قبول کر لیتے اور زینو کو یہاں بھیجنے پر آمادہ ہو جاتے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب کبھی آپ زینو کو دیکھنا چاہیں گے یا زینو آپ سے ملنا چاہے گی میں خود پہنچا دوں گا۔ اُمید ہے آپ میری تمام باتوں پر غور کرکے اپنی رضامندی کا خط لکھیں گے۔

نیازمند ______ شاہد

شاہد میاں!

خدا تمھیں عقلِ سلیم دے۔ تم اپنی ضد سے ذرا بھی ہٹنے پر تیار نہیں۔ اِس لئے اب اِس کے سِوا کوئی صورت نہیں کہ تم سے خط وکتابت کا جو رشتہ ہے اُسے بھی ترک کر دیا جائے۔ میرے پاس اِتنا فضول وقت بھی نہیں کہ تمھاری بکواس سُنتا رہوں۔ تمھارے بیہودہ خطوط کے جواب لکھنے میں کاغذ اور روشنائی برباد کرتا رہوں۔ لہٰذا آئندہ تمھیں خط لکھنے کی ضرورت نہیں، یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔

——— ممتاز احمد

محترم ممتاز احمد صاحب! آداب تسلیم

آپ حیران ہوں گے کہ میں کون ہوں، تو میرا مختصر تعارف یہ ہے کہ میں شاہد بھائی کا دوست اور زینت بھابی کا خیر خواہ ہوں۔ ہو سکتا ہے زینت بھابی نے شاہد بھائی کی زبان سے میرا نام سُنا ہو ویسے میں زیادہ تر باہر ہی رہتا ہوں۔ شاہد بھائی اور بھابی کے درمیان اختلافات کا مجھے عِلم ضرور ہے۔ لیکن بات شاہد بھائی کی دوسری شادی تک پہنچ جائے گی، یہ کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ وہ تو کل میرے چچا جمیل احسن صاحب نے بتایا کہ اُن کی لڑکی سلمیٰ کے ساتھ شاہد بھائی کی نسبت طے پائی ہے اور اگلے ہی مہینے عقد ہونے والا ہے تو میں چونک پڑا۔ حالانکہ سلمیٰ میری بہن ہے۔ لیکن میرا ضمیر اِس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ میں ایک معصوم عورت کی مانگ سے افشاں چھڑا کر اپنی بہن کی مانگ بھر دوں۔ شاہد بھائی کی دوستی کا خیال کرتے ہوئے میں چچا جان کو منع بھی نہیں کر سکتا اور نہ اِس کا اختیار مجھے ہے۔ ہاں یہ بات میرے اختیار میں تھی کہ آپ کو تمام حالات سے باخبر کر دوں، اِس لئے یہ خط لِکھ رہا ہوں تاکہ آپ کوئی مناسب حل تلاش کر کے زینت بھابی اور میری بہن سلمیٰ دونوں کو بچا سکیں۔

نیاز مند ——— خالد انجم

عزیزمن شاہد میاں!

تمھاری ضد سے تنگ آ کر میں نے کچھ سخت باتیں اپنے خط میں لِکھ دی تھیں جو یقیناً تمھارے ادبی مزاج پر گراں گزری ہوں گی —
عزیزم! بزرگوں کی خفگی میں بھی دُعا کی تاثیر چھُپی ہوتی ہے اور تم تو ماشاء اللہ تعلیم یافتہ ہو، شاعر ہو، افسانہ نِگار بھی ہو۔ ذرا ذرا سی بات پر بگڑنا رُوٹھنا اچھا نہیں۔ ویسے بچّوں کی یہ عادت بہت پیاری ہوتی ہے۔ لیکن تم نے خط لکھنا بند کر دیا۔ اِس سے ظاہر ہُوا کہ کچھ زیادہ ناراض ہو بیٹھے ہو۔ اِدھر جب سے زینو کو اِس کا عِلم ہُوا ہے کہ میں نے تمھیں غصہ میں کچھ لِکھ دیا تھا، ہر وقت اپنے کمرے میں پڑی چُپ چاپ روتی رہتی ہے۔ میں لاکھ اپنے اصول کا پابند سہی، لیکن بچّوں کی خوشی کے لئے کبھی کبھی اصولوں کو توڑنا بھی پڑتا ہے اور پھر زینو میری بیٹی اور تم مجھے کِتنا عزیز ہو اس کا اندازہ اِس خط سے لگا سکتے ہو۔ اگر بیمار نہ ہوتا تو اب تک زینو کو لے کر تمھارے پاس آجاتا۔ لیکن کمزوری بہت ہے اِس لئے بہتر ہوتا کہ یہ خط دیکھتے ہی تم آجاتے اور میں زینو کو تمھارے ساتھ رخصت کر دیتا۔ تو تم آرہے ہو نا؟

دعا گو ——— ممتاز احمد

ڈیر خالد!

تم مجھ سے بڑے فنکار ہو! تمھاری فنکاری کامیاب رہی۔ میں تمھاری بھابی زینت کو لے کر آج ہی سہسرام پہنچا ہوں۔ قبلہ ممتاز صاحب کی علالت کی وجہ سے ایک ہفتہ سُسرال میں رُک جانا پڑا۔ واپسی پر معلوم ہُوا تم کلکتہ جا چکے۔ بہرحال تمھیں مُبارکباد تو دینی ہی تھی۔

پھر کب آرہے ہو، لِکھنا۔

تمھارا ——— شاہد


NEW SUPER
Surf
سپر سرف سے
ایک بار دُھل کر
کپڑے جتنے زیادہ سفید ہوتے ہیں
دوسرے کسی بھی پاؤڈر سے نہیں ہوتے!
سپر سرف میں شاندار دُھلائی کی قوت ہے۔ یہ چھپے ہوئے میل کو بھی نکال پھینکتا ہے اور آپکے کپڑوں کو ایسی بے داغ سفیدی بخشتا ہے کہ دیکھنے والوں کو رشک آنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ سپر سرف بھارت کا مقبول ترین دُھلائی پاؤڈر مانا جاتا ہے۔
سپر سرف سے کپڑے سب سے سفید دُھلتے ہیں!
(نیل پاؤڈر وغیرہ کی ضرورت نہیں)
لنٹاس - SU. 116-140 UD
ہندوستان لیور کی ایک اعلیٰ پیشکش

صحت و زندگی

۱ — خوبصورت زہر

سگریٹ کو خوبصورت زہر اور سگریٹ کے دھوئیں کو موت کا دھواں کہنا غلط نہ ہوگا۔ شراب نوشی کے بعد سگریٹ نوشی سب سے خطرناک، سب سے تباہ کن شغل ہے۔

امریکن کینسر سوسائٹی کے ڈاکٹر ایڈورڈ ہیمنڈ نے لکھا ہے — "تمباکو نوشی سے سرطان کی افزائش اتنی اہم نہیں ہے جتنے دُوسرے نقصانات، جو تمباکو نوشی سے ہوتے ہیں۔" انھوں نے لکھا ہے — "اِس میں شک نہیں کہ ہر سال ہزاروں اموات پھیپھڑے کے سرطان سے ہوتی ہیں، جو سگریٹ نوشی سے بلا واسطہ یا بالواسطہ پیدا ہوتے ہیں۔ اگر سگریٹ کا دھواں بہت زیادہ اندر کھینچا جائے تو پھیپھڑوں، قلب اور شرائن میں داخل ہو جاتا ہے اور قبل از وقت موت کا سبب بن جاتا ہے۔"

سگریٹ کے دھوئیں کو زور سے سانس کے ساتھ کھینچنے سے پھیپھڑوں کے خورد ترین خانوں کی سطح کے خلیات میں سوزش پیدا ہو جاتی ہے۔ اُن خانوں کی دیوار موٹی ہو کر اپنی لچک کھو دیتی ہے۔ اور اُس میں آکسیجن اور کاربن ڈائی کے باہمی تبادلے کی استعداد باقی نہیں رہتی اور ناگہانی تکلیف جیسے کھانسی یا چھینک سے شق ہو جاتی ہے۔ اُس کے بعد پھیپھڑے کا وہ حصہ ماؤف ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر ڈکسن نے لکھا ہے — "تجربات کے بعد یہ حقیقت واضح ہوئی ہے کہ ایک سگار کے دھوئیں میں بارہ سے اٹھارہ سگریٹوں کے دھوئیں سے زیادہ نکوٹین ہوتی ہے لیکن سگریٹ اُس سے زیادہ ضرر رساں ہے۔ اِس لیے کہ اُس میں کاغذ کا مُضرِ صحت دھواں بھی شامل ہوتا ہے۔ سگار کے تمباکو میں تقریباً آٹھ فیصدی تک نکوٹین ہوتی ہے اور اگر اُسے سگار سے الگ کر کے انجکشن کے ذریعے سے دو انسانوں کے جسم میں داخل کیا جائے تو اُنھیں ہلاک کر سکتی ہے۔"

سگار اور پائپ سگریٹ سے کم ضرر رساں ہیں۔ حقہ سب سے کم نقصان دِہ ہے۔ کیونکہ تمباکو کے بہت سے زہریلے اجزاء حُقّے کی نلکی میں رہ جاتے ہیں اور کچھ پانی میں۔ پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ تمباکو کسی صُورت میں بھی استعمال کیا جائے نقصان دِہ ہے۔ اُس سے خون پتلا ہو جاتا ہے۔ خون کی سُرخی زائل ہو کر رنگت زردی مائل ہو جاتی ہے۔ دماغ کمزور اور بوجھل ہو جاتا ہے۔ سر چکرانے اور دردِ سر کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ بینائی کمزور ہو کر آنکھوں میں غبار، لال نقطے اور ڈورے نمودار ہو جاتے ہیں۔

تمباکو دل، دماغ اور پھیپھڑے کو نقصان پہنچاتا، ہاضمے کو کمزور کرتا اور معدے کی قوت کو گھٹا دیتا ہے۔ اِس لیے ضعفِ معدہ لاحق ہوتا ہے۔ بُھوک کم ہو جاتی ہے۔ بے خوابی، چڑچڑاپن اور تُند مزاجی بھی تمباکو کے عام اثرات ہیں۔

تمباکو کے زہریلے اثرات سے سِل اور دِق بھی ہو جاتی ہے۔ لندن کے ڈاکٹر سی۔ آر۔ ڈولڈیل نے لکھا ہے — "چھوٹی عُمر میں تمباکو پینا دِق کا ایک عام سبب ہے۔ خواہ تمباکو نوشی سے خون کے دباؤ یا شرائن میں انجمادِ خون کی بیماریاں براہِ راست نہ پیدا ہوتی ہوں۔ پھر بھی تمباکو نوشی سے اِن امراض میں اضافہ ضرور ہوتا ہے اور اگر ایسی صُورت میں انفلوئنزا، نمونیا یا سِل و دِق جیسے امراض کا حملہ ہو جائے تو ہلاکت کے اِمکانات میں قطعی طَور پر اضافہ ہو جاتا ہے۔"

۲ — کامیابی کا راز

دُنیا میں کون ہے جو لیلائے کامیابی کا دیوانہ نہیں ہے۔ دُنیا کے سارے انسانوں کی ساری تگ و دَو عروسِ کامیابی سے ہمکنار

ہونے کے لئے ہے۔

ایک مغربی مفکّر نے کامیابی کا راز ان الفاظ میں بتایا ہے ——

"آپ کامیابی چاہتے ہیں تو پہلے فیصلہ کیجئے آپ چاہتے کیا ہیں؟ کامیابی کا پہلا قدم یہی ہے کہ آپ اپنی منزل متعین کر لیں۔ اپنی خواہش اور اپنے نصب العین کو واضح طور پر لکھ لیجئے۔ لکھ لینے سے آپ کا مقصد واضح اور متعین ہو جائے گا۔ لکھنے میں کسی ابہام یا اُلجھاؤ کو راہ نہ دیجئے۔

• اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ مقصد حاصل کرنے کے لئے پہلا قدم کیا ہونا چاہیئے۔ آپ سب سے پہلے کیا کرنا چاہتے ہیں؟

• یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے پروگرام کو حصّوں میں تقسیم کر لیجئے۔ پھر ایک ایک حصّے کی تکمیل کے لئے کام کرتے جایئے۔

• ایک بار فیصلہ کر لینے کے بعد اپنے ارادے کو پوری طرح کام میں لایئے اور اعتماد کے ساتھ عمل شروع کر دیجئے۔

• اپنے مقصد کو پوری طرح حاصل کیجئے۔ منزل کے قریب آکر مطمئن نہ ہو جایئے کہ اب تو کام ہو گیا۔ منزل پر پہنچ کر ہی دَم لیجئے۔

• مقصد پورا ہو جائے اور کامیابی حاصل ہو جائے تو اُسے محسوس کیجئے۔ ایسا نہ ہو آپ کامیابی کو پہچان نہ سکیں اور اُس کی خوشی سے محروم رہیں"۔

مشہور مفکّر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ——"کامیابی بکتی ہے، خریدو گے؟ تمھیں کامیابی کی خواہش ہے تو بتاؤ تم اُس کی قیمت ادا کر سکتے ہو؟ تم کتنی دل شکنی کا مقابلہ کر سکتے ہو؟ تم کامیابی حاصل کرنے کے لئے کتنی تکلیفیں برداشت کر سکتے ہو؟

• مشکلات کے مقابلہ میں تم کتنا عرصہ استقلال سے ٹھہر سکتے ہو؟

• کیا تم میں اتنی ہمّت ہے کہ جو کام اور لوگ نہیں کر سکتے تم انھیں انجام تک پہنچا سکو گے؟

• کیا تم اتنے بلند حوصلہ ہو کہ جو باتیں دُوسروں کے خواب و خیال میں بھی نہ آئی ہوں تم انھیں کرنے کی کوشش کرو۔

• کیا تم میں اتنا استقلال ہے کہ ناکامیوں کے باوجود تم اپنی مساعی کو جاری رکھ سکتے ہو؟

کامیابی زندگی کے بازار میں بکتی ہے تم بھی اسے خرید سکتے ہو۔ ہیں، تم اور ہر آدمی اُسے خرید سکتا ہے، لیکن وہی آدمی جو اُس کی قیمت ادا کر سکتا ہے!"

۳—— مسرّتوں کے پھول

اگر آپ اپنی زندگی کا دامن مسرت کے پھولوں سے بھرنا چاہتے ہیں تو مشہور مفکّر ڈاکٹر نپولین ہل کی زندگی سے روشنی حاصل کیجئے۔

ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے —— "میں خوش نصیب ہوں کہ میں دُوسروں کے مقابلہ میں بہتر حالات میں ہوں۔ میں نے دُوسروں کی مدد کر کے یہ مسرّت حاصل کی ہے۔

میں خُدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے مجھے صحت کی نعمت سے نوازا ہے، صحت کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔

میری مسرّت کا راز یہ ہے کہ میں کسی شخص، نسل، قبیلہ یا کسی خیال کے انسان سے نفرت نہیں کرتا، ہر انسان سے محبت کرتا ہوں۔ میں ایسا کام کر رہا ہوں جس سے مجھے بے انتہا لگاؤ ہے۔

اس لئے میں اُس سے کبھی نہیں اُکتاتا اور نہ تھکن سے چُور ہوتا ہوں۔
میرا کوئی دشمن نہیں۔ کیونکہ میں کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتا۔
بلکہ ہر شخص کو فائدہ پہنچانے اور اُس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔

میں روزانہ پابندی سے خُدا کے حضور میں اپنا سر جھکاتا ہوں کہ اُس نے اپنی گوناگوں نعمتوں اور دولتوں سے مجھے نوازا ہے۔
میری زندگی کا دامن مسرت کے پھولوں سے بھر دیا ہے۔"

۴۔۔۔ کیا آپ جانتے ہیں؟

لیموں گوناگوں طبّی خواص کا حامل ہے۔ لیموں صفرا کو دفع کرتا ہے۔ صفرا کی زیادتی سے کسی کو متلی کی شکایت رہتی ہو تو اُسے چاہیئے کہ ایک گلاس پانی میں آدھے لیموں کا عرق نچوڑ کر دن میں دو تین بار پی لیا کرے۔ اُس کے معدے سے صفراوی اثرات زائل ہو جائیں گے، معدے کی اصلاح ہو جائے گی۔ موسمی بخاروں میں صفرا کی شدت ہوتی ہے۔ منہ کڑوا ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں لیموں کاٹ کر اُس پر نمک اور سیاہ مرچوں کا سفوف چھڑک کر چوسنے سے منہ کا ذائقہ بدل جاتا ہے۔ بہت جلد صفرا کی شدت کم ہو جاتی ہے۔

لیموں کے عرق میں تھوڑا سا باریک پسا ہوا نمک ملا کر پائریا سے ماؤف مسوڑھوں پر ملنے سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔ اس عمل سے مسوڑھوں سے پیپ اور خون آنا بند ہو جاتا ہے۔

وٹامن 'سی' ہماری غذا کا نہایت اہم جُز ہے۔ کسی کی غذا میں یہ نہ ہو تو دانت اور مسوڑھے کمزور ہو جاتے ہیں۔ ہڈیوں میں نقص پیدا ہو جاتا ہے، قلب کو نقصان پہنچتا ہے، عضلات کمزور ہونے لگتے ہیں ۔۔۔ ایک بالغ آدمی کو ۵۰ ملی گرام وٹامن 'سی' کی یومیہ ضرورت ہوتی ہے۔ ایک بڑے لیموں کے عرق میں پچاس ملی گرام وٹامن 'سی' ہوتا ہے۔

۵۔۔۔ زندگی میں اندازِ فکر کی اہمیت

زندگی میں اندازِ فکر کی بڑی اہمیت ہے۔ انسان کا اندازِ فکر ہی اُسے کامیاب یا ناکام بنا دیتا ہے۔ اُسے خوش حال یا بدحال بناتا ہے۔ انسان کا اندازِ فکر ہی اُسے صحت مند یا بیمار بنا دیتا ہے۔

مشہور مفکر ڈاکٹر نپولین ہل نے لکھا ہے ۔۔۔ ضبطِ نفس بڑی دولت ہے۔ اس کے ذریعہ انسان اپنے جذبات پر پُورا پُورا قابو حاصل کر سکتا ہے اور وہ یہ جان سکتا ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنے دماغ سے اپنے مقصدِ حیات کی تکمیل کر سکتا ہے۔ اندازِ فکر ہی ایسی دولت، ایسی طاقت ہے جس کے ذریعہ انسان عقلِ مطلق تک پہنچ سکتا ہے۔

انسان کے لئے صحت بہت بڑی دولت ہے۔ بلکہ سب سے بڑی دولت ہے۔ اس لئے کہ صحت ہی زندگی ہے ۔۔۔ صحت کا انحصار بھی ہمارے اندازِ فکر پر ہے۔ اگر ہم صحت کے متعلق سوچتے ہیں تو صحت مند رہتے ہیں۔ اگر ہم بیماریوں کے متعلق سوچنے لگتے ہیں تو بیمار ہو جاتے ہیں۔ ہمارے مزاج اور عادات، غذا اور مشاغل کا بھی ہماری صحت کے بنانے یا بگاڑنے میں بڑا دخل ہے۔ لیکن ان کا تعلق بھی اندازِ فکر ہی سے ہے۔"

سرگوشیاں

اِس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اِس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے۔ (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

فیاض احمد آرزو۔ ڈیسرگڑھ۔ بردوان

س۔ انسان اپنی انسانیت کب کھو بیٹھتا ہے؟

ج۔ جب انسانیت کا دامن چھوڑ دیتا ہے، جب درندہ بن جاتا ہے۔

س۔ بیوی حسین کب نظر آتی ہے؟

ج۔ جب اُس کی خوبصورت پیشانی شکن آلود ہوتی ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

طلوعِ جام بھی دیکھا ہے خندۂ گل بھی
حسین کوئی نہیں اُن کی برہمی کے سوا

س۔ اگر دُنیا میں عورت کا وجود نہ ہوتا تو؟

ج۔ یہ دُنیا ویران وادی ہوتی۔ علامہ اقبال نے فرمایا ہے ——

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ!

س۔ بیوی کو غصہ کی حالت میں کون سا تحفہ پیش کرنا چاہیئے؟

ج۔ دلنواز مسکراہٹ کے ساتھ اُس کے حُسن و جمال کی تعریف! چاہے سو فیصدی جھوٹی ہو۔

س۔ خُدا نے عورت کو مرد سے پہلے کیوں نہیں بنایا؟

ج۔ اِس لئے کہ مرد سے پہلے عورت کی ضرورت نہ تھی۔ عورت مرد کی دلجوئی کے لئے پیدا کی گئی —— ویسے حضرتِ آدم کے سوا ہر مرد عورت کے بعد پیدا ہُوا۔ عورت کے بطن سے پیدا ہُوا۔

عباس آرزو کریم نگری۔ کریم نگر

س۔ زندگی ایک خواب ہے، مگر . . موت؟

ج۔ زندگی خواب نہیں، تابناک حقیقت ہے، اور موت ——؟ علامہ اقبال نے فرمایا ہے ؎

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اِک پیغام ہے

س۔ انسان کو کس راہ میں کامیابی ہوتی ہے؟

ج۔ یقینِ محکم اور عزمِ پیہم کے ساتھ جدّ وجہد کی جائے تو ہر راہ میں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

س۔ ہر خواب تعبیر آشنا کیوں نہیں ہوتا؟

ج۔ خواب کو حقیقت بنانے کے لئے جدّ وجہد کی جائے تو ہر خواب تعبیر آشنا ہو سکتا ہے۔ زمین پر رہنے والا انسان چاند پر پہنچ سکتا ہے!

محمد فرحت اللہ انور۔ میدک

س۔ میری زندگی تاریک صحرا کے مانند ہے، بتایئے کیا کروں؟

ج۔ اُسے اپنے عزم و عمل سے روشن و تابناک بنایئے۔ نُور و ضیاء بخشئے۔

ارشاد احمد صدیقی۔ سیلم پور

س۔ آج کل عورتوں کے اندر سے وفا کہاں چلی گئی؟

ج۔ مَردوں کی وفا تلاش کرنے!

محمد اطہر حسین صنوبر مشکور عالم گیری۔ گیا

س۔ تقدیر کب ساتھ نہیں دیتی؟

ج۔ جب انسان تدبیر کا دامن چھوڑ دیتا ہے ——

دستِ تدبیر سے تقدیر سنور جاتی ہے!

پروین سلطانہ۔ گنٹور

س۔ میں بہت دُبلی ہوں۔ ڈاکٹروں کا علاج کراکے تھک گئی ہوں۔ آپ ہی کوئی ایسا نسخہ بتایئے جس سے تھوڑی موٹی ہو جاؤں۔

ج۔ لوگ موٹاپا دُور کرنے کے لئے قیمتی دوائیں استعمال کرتے ہیں۔ آپ اس لئے فکرمند ہیں کہ دُبلی ہیں! آج کل آموں کا موسم ہے۔ میٹھے آم کھایئے۔ آم جسم کو فربہ کرتا ہے۔ انڈے اور مچھلی کھایئے —— آپ کا دُبلا پن دُور کرنے کے لئے سب سے بہتر، سب سے مؤثر نسخہ یہ ہے کہ اپنے دُبلے پن کی فکر چھوڑ دیجئے۔

شریفہ مشعون علی۔ اندور

س۔ بھیّا! کیا روزے صحت کے لئے مُضر ہیں؟

ج۔ روزے صحت کے لئے بے حد مفید ہیں۔

س۔ بچّوں کی تعلیم مادری زبان سے شروع کرنی چاہیئے یا انگریزی سے؟

ج۔ مادری زبان سے۔

س۔ کیا زیادہ پان کھانا آج کی تہذیب کے خلاف ہے؟

ج۔ جی ہاں۔ زیادہ پان کھانا آج کی تہذیب کے خلاف ہے۔ بہت زیادہ پان کھانا مُضر بھی ہے۔

مظفر شیدا۔ منبھا

س۔ کیا انسان حالات کا تابع ہوتا ہے؟

ج۔ بلند حوصلہ انسان حالات کا تابع نہیں ہوتا، حالات اُس کے تابع ہوتے ہیں۔

س۔ نفس پر انسان کا پورا اختیار ہے؟

ج۔ نیک انسان اپنے نفس کو قابو میں رکھتا ہے۔

سیّد احمد قادری۔ اورنگ آباد بہار

س۔ سر کے بال گرنے لگیں تو کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ اگر عام جسمانی کمزوری کے باعث بال گرتے ہوں تو مقوّی غذائیں، دودھ، گھی، نیم برشت انڈے اور تازہ میٹھے پھل کھانے چاہیئں۔ عام جسمانی کمزوری سے بال نہ گرتے ہوں تو سر پہ گلیسرین اور عرقِ گُلاب ہموزن مِلا کر لگانا چاہیئے۔ غسل کے بعد بالوں کو خشک کرکے سر میں تیل لگانا چاہیئے۔ روغنِ آملہ بالوں میں لگانے سے بالوں کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔

ششی کلا۔ لکھنؤ

س۔ کوئی مزاحیہ شعر سُنایئے۔

ج۔ سُنیئے ایک 'موسمی' شعر ؎

پھینک دی بیگم نے جب غلّے کی جھولی تاؤ سے
پھر گئی آنکھوں میں ہر تحریر راشن کارڈ کی!

س۔ اِن دنوں غضب کی گرمی پڑ رہی ہے۔ دُنیا میں سب سے ٹھنڈی جگہ کہاں ہے؟

ج۔ سائبیریا میں دریائے کلوننک۔

سیّد خورشید ہاشمی۔ گیوال بیگہ۔ گیا

س۔ کھانا کھانے کے کتنی دیر بعد دودھ پینا چاہیئے؟

ج۔ کم سے کم تین گھنٹے کے بعد۔

س۔ دودھ پینے کے بعد فوراً پانی پینا کیسا ہے؟

ج۔ مُضر ہے۔

مظفر مشتاق۔ حیدر آباد

س۔ جدّوجہد کی حد بتایئے؟

ج۔ جدّوجہد کی کوئی حد نہیں۔

س۔ کیا مُسلمان خُدا کو بھُول گئے ہیں یا خُدا مُسلمانوں کو بھُول گیا ہے؟

ج۔ مُسلمان خُدا کو بھُول گئے ہیں۔ خُدا کسی کو نہیں بھُولتا۔

مِس کہکشاں نوری۔ دربھنگہ

س۔ انسان کے جذبات کو ٹھیس کب پہنچتی ہے؟

ج۔ جب کوئی بات اُس کی توقّع کے خلاف ہوتی ہے؟

س۔ بے عزّتی کا بدلہ کیسے لیا جائے؟

ج۔ بے عزّتی کرنے والے کی بے عزّتی نہ کرکے۔

س۔ زندگی کا نصب العین کیا ہونا چاہیئے؟

ج۔ زندگی کو قابلِ رشک بنانا۔

کرشن موہن بھاٹیہ۔ شملہ

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں مُلک بھر کے روزنامہ اخباروں پر کتنا کاغذ صرف ہوتا ہے؟

ج۔ مُلک بھر کے روزناموں کو مجموعی طور پر ایک لاکھ ۹۳ ہزار ٹن اخباری کاغذ اِس سال دیا گیا۔

شاہینہ پروین۔ مونگیر

س۔ اُردو کے پہلے شاعر سُلطان محمد قلی قطب شاہ معانی ہیں یا شیخ فرید الدین گنج شکر؟

ج۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ معانی۔

س۔ علامہ اقبال یا مرزا غالب؟

ج۔ مرزا غالب! علامہ اقبال نے مرزا غالب کی عظمت کا اعتراف اِن الفاظ میں کیا ہے ——

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریّا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدّق ہے ترے انداز پر

کمال احمد۔ ڈیسر گڑھ۔ بردوان

س۔ انسان کیوں کسی حالت میں بھی خوش نہیں رہتا؟

ج۔ سمجھدار انسان ہر حالت میں خوش رہتا ہے۔ وہ غم کو بھی خوشی بنا لیتا ہے۔

س۔ جب کسی کام میں اُلجھن پیدا ہو جائے تو اُس وقت انسان کو کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ حوصلہ کا دامن نہ چھوڑنا چاہیئے۔

محمد غالب حسین۔ دھوما۔ رانچی

س۔ بنگلہ دیش میں اُردو کی کیا پوزیشن ہے؟

ج۔ بنگلہ دیش کی زبان بنگالی ہے۔ وہاں اُردو کی پوزیشن کا کیا سوال؟

ہدایت علی ساحل۔ جھمری تلیا

س۔ خود غرض انسان زندگی میں ٹھوکریں کب کھاتا ہے؟

ج۔ خود غرض انسان زندگی میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے۔

س۔ ذہنی انتشار سے بچنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ ذہن کو اچھے خیالات سے معمور رکھنا چاہیئے۔

س۔ آم کے فوائد بیان کیجیئے۔

ج۔ آم مقوّی اور زود ہضم پھل ہے۔ اعضائے رئیسہ کو قوت بخشتا ہے، نیا خون پیدا کرتا ہے، آنتوں کو طاقت بخشتا ہے، جسم کو فربہ کرتا ہے۔ دافعِ قبض اور پیشاب آور ہے۔ آم کھانے کے بعد دودھ پینے سے طاقت پیدا ہوتی ہے۔ سونے سے کچھ دیر پہلے آم کھا کر دودھ پینے سے بے خوابی کی شکایت رفع ہوتی ہے —— تازہ اور میٹھے آم تھوڑی مقدار میں کھانا حاملہ عورت کے لئے سود مند ہیں۔ اس سے طاقتور اور تندرست بچہ پیدا ہوتا ہے۔

عرفان حیدر۔ نوادروی

س۔ کیا وجے لکشمی پنڈت، پنڈت جواہر لال نہرو کی بیوی کا نام تھا؟

ج۔ وجے لکشمی پنڈت جواہر لال نہرو کی بہن ہیں۔ اُن کی بیوی کا نام کملا نہرو تھا۔

س۔ وجے لکشمی پنڈت کا دیہانت کہاں ہُوا؟

ج۔ وجے لکشمی پنڈت ابھی زندہ ہیں۔

آواز۔ نرملی

س۔ ناموری اور شہرت حاصل کرنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ اچھے کام، کوئی بڑا کام! لیکن بُرے لوگ سوچتے ہیں
بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا!

شکیل قیصر۔ سُورت

س۔ راہی جب تھک جائے تو؟

ج۔ جب بھی حوصلہ نہ ہارے تو منزل خود قدموں میں آجاتی ہے۔

س۔ آس کی ڈور؟

ج۔ خُدا سے دعا کیجیئے کہ آس کی ڈور کبھی نہ ٹوٹے۔ اِس لئے کہ اُمید وقت کا سب سے بڑا سہارا ہے۔

ظفر چلبلا۔ رکاس پیٹھ (بودھن)

س۔ وہ کون سی طاقت ہے جو انسان کو بُرے خیالات سے بچا سکتی ہے؟

ج۔ ضمیر!

س۔ انسان گناہ کرنے سے پہلے یہ کیوں نہیں سوچتا کہ گناہ کا انجام بُرا ہوتا ہے؟

ج۔ گناہ کی کشش انسان کو انجام و عواقب سے بے خبر رکھتی ہے۔

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر خوشتر گرامی —— مطبوعہ: پربھات آفسیٹ پریس دہلی۔ تصاویر: ڈائمنڈ ... کے پریس و برائٹ پریس، دہلی —— پتہ: دفتر بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۶

مِس شہناز۔ لکھنؤ

س۔ مُغنّیہ کس زبان کا لفظ ہے؟

ج۔ عربی زبان کا۔

س۔ اور مفتی کس زبان کا لفظ ہے؟

ج۔ یہ بھی عربی زبان کا لفظ ہے۔

عائشہ ساحل۔ جھمری تلیا

س۔ زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے انسان کو کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ جن لوگوں کی زندگی خوشگوار ہے، اُن کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیئے۔

س۔ پان کھانا مفید ہے یا مُضر؟

ج۔ پان اعتدال سے کبھی کبھی کھا لیا جائے تو اچھی چیز ہے۔ پان کی کثرت مُضر ہے۔

س۔ کچھ اچھی باتیں بتایئے۔

ج۔ • بُرائی کو بھلائی سے رفع کرو۔

• خاموشی دانائی کی علامت ہے۔ تکلم بقدرِ حاجت ہونا چاہیئے۔

• وہ خُدا سے بہت قریب ہے، جو خوش خلق اور دوسروں کا بوجھ اُٹھانے والا ہے۔

• جس گھر میں عورت دُکھی رہتی ہے وہ گھر جلدی تباہ ہو جاتا ہے۔

• عورت کی تباہی دُنیا کی تباہی اور بربادی کا پیش خیمہ ہے۔

ایس۔ ایس۔ جی۔ نظام آباد دکن

س۔ کیا شہرت سازی میں کوئی ملک ہندوستان کا مقابلہ کر سکتا ہے؟

ج۔ جی نہیں، ہندوستان کا نام سرِ فہرست ہے اس نیک نامی میں ہندوستان کا کوئی حریف نہیں!

بدنام سمیع۔ ۲۴ پرگنہ

س۔ یہ شعر کس کا ہے ؎

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

ج۔ یہ شعر مجروحؔ سُلطانپوری کا ہے۔

BISWIN SADI
37th YEAR OF PUBLICATION
Telephones   Office 271637   Residence 619927

RADIUM TONIC PILLS

نئی طاقت

نیا خون

کمزوری کا زبردست علاج

ریڈیم ٹانک پلز



نیا خون بکثرت پیدا کرکے نہ صرف کمزوری دور کرتی ہیں بلکہ جسم میں زبردست طاقت بڑھاتی ہیں۔ وزن اور خون کئی پونڈ بڑھ جاتا ہے۔ کھوئی ہوئی طاقت اور صحت واپس لانے کے لئے ملک کے کونے کونے میں مشہور و مقبول ہیں اور لاکھوں انسان روزانہ استعمال کرتے ہیں۔ کمزوری خواہ کسی وجہ سے ہو کمزور سے کمزور انسان کو بھی نئی طاقت حاصل ہوتی ہے۔ تندرست نوجوان ریڈیم ٹانک پلز کے علاج سے اپنی طاقت کئی گنا بڑھا سکتے ہیں۔ قیمت مکمل علاج صرف چھ روپے۔ محصول ڈاک علاوہ۔

کلکتہ ایجنٹ:-
امین اینڈ اسمعیل پرائیویٹ لمٹیڈ
نمبر ۸۰ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ ۱

پتہ:- ریڈیم کیمیکل ورکس (پرائیویٹ) لمیٹیڈ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۳۵۱

بیسویں صدی



Biswin Sa
DELHI
Rs



نِگاہ چند قدم جا کے رہ گئی لیکن
خیال اُن کے تعاقب میں دُور تک پہنچا ـــــ مخمور سعیدی

فوٹو: دیوداس کُسم، چیمبور کالونی، بمبئی



گذشتہ دِنوں چنڈی گڑھ میں انجمن ترقیٔ اُردو پنجاب اور کلا درپن پنجاب کی جانب سے ڈاکٹر گل پردیسی کی کتاب "سلگتی یادیں" کی رسمِ اجرا کا اہتمام ہوا۔ اِس ادبی اجتماع کی صدارت پنجاب کے وزیرِ خزانہ جنابِ ہنسراج شرما نے فرمائی۔ "سلگتی یادیں" بہ یک وقت اُردو ہندی اور پنجابی رسم الخط میں شائع کی گئی ہے۔ اِس موقعہ پر وزیرِ خزانہ پنجاب نے اپنے "اختیاری فنڈ" سے پانچ ہزار روپیہ کی گرانقدر رقم چنڈی گڑھ اور پنجاب میں انجمن ترقیٔ اُردو کو اُردو زبان کی ترویج و ترقی کے منصوبوں کو عملی شکل دینے کے لئے مرحمت فرمائی۔ تصویر میں وزیرِ خزانہ پنجاب اور انجمن کے جنرل سکریٹری جنابِ سورج تنویر، ڈاکٹر گل پردیسی کو "سلگتی یادیں" کی جلد پیش کرتے ہوئے۔ اِس موقعہ پر وزیرِ خزانہ نے اعلان کیا کہ پنجاب میں اُردو کی بقا و بہبود کے لئے سالِ رواں کی بجٹ مد میں پانچ لاکھ روپیہ کی رقم وقف کی گئی ہے۔



"سلگتی یادیں" کے اجرا کے موقعہ پر ایک مُشاعرہ سا اہتمام بھی ہوا۔ ڈاکٹر گل پردیسی غزل سرا ہیں۔

چل رہی ہے ہوا کدورت کی | بات چھیڑو نہ اب محبت کی
محض مصروفیت ہے نامِ حیات | مجھ کو فرصت کہاں ہے راحت کی؟
دولتِ دہر کا جنوں نہ رہا | دِل نے جب صبر پر قناعت کی
بات کرتے ہیں پھول جھڑتے ہیں | واہ کیا بات اِس لطافت کی؟
آج انساں ہے دشمنِ انساں | آج کیا قدر آدمیت کی
اِس جہانِ غرض پرست ہیں کیوں | جستجو ہے ہمیں محبت کی؟
کوئی اپنا نہ کوئی بے گانہ | کتنی اچھی فضا ہے غربت کی

ایسے فتنے بپا ہیں پردیسی
جیسے ہو یہ گھڑی قیامت کی



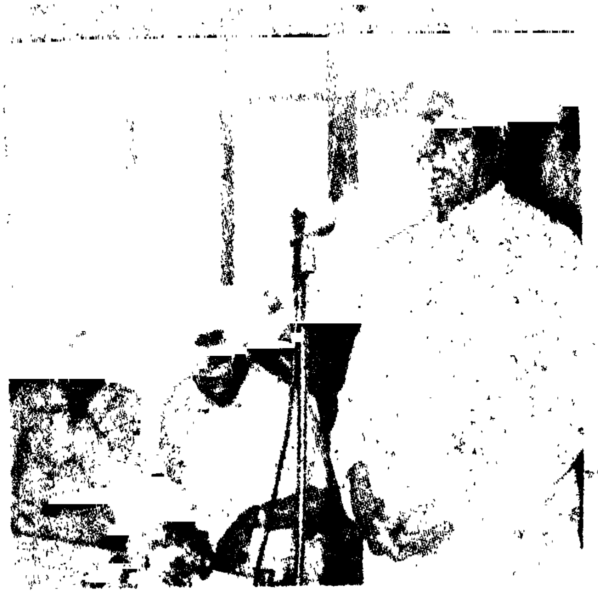
جنابِ رشیؔ پٹیالوی نغمہ سرا ہیں۔

میرے کفرو ایماں پر آپ ہی کا سایا ہے ۔۔۔ آپ ہی اُٹھائیں گے آپ نے گرایا ہے
بجلیوں کی پُرسش پر مطمئن سے بیٹھے ہیں ۔۔۔ بجلیوں کی خاطر ہی آشیاں بنایا ہے
بے غرض نہیں ملتے اپنے ہوں کہ بیگانے ۔۔۔ "یاد" کے لئے کوئی کِس کو یاد آیا ہے
دِل کی بات اُس دِن سے ہم بھی اب نہیں سُنتے ۔۔۔ اپنا حال جس دن سے آپ کو سُنایا ہے
حُسن کی نگاہوں میں یہ بھی سنگ ریزے ہیں ۔۔۔ آسماں سے تارے بھی عشق توڑ لایا ہے
جو بشر زمانے میں حادثوں سے ٹکرائے ۔۔۔ منزلوں نے خود اُن کو راستہ دِکھایا ہے
کیا عجب طریقہ ہے کاروبارِ اُلفت کا ۔۔۔ مِٹ گیا نشاں جس کا اُس نے نام پایا ہے

اے رشیؔ محبت کا یہ کرم نہ بھولے گا
اِک ذرا سے ہنسنے پر عمر بھر رُلایا ہے



اُردو اکیڈمی اُتر پردیش نے جناب کوثرؔ چاندپوری کے ناولٹ "گونگا ہے بھگوان" پر ایوارڈ دیا۔ اِس سلسلہ میں کارکنان ہمدرد نرسنگ ہوم نے جناب کوثرؔ چاندپوری کو اِستقبالیہ دیا۔ جلسہ کی صدارت مدیر "بیسویں صدی" نے اور نظامت کے فرائض حضرت عزیزؔ وارثی نے انجام دیئے۔ مدیر "بیسویں صدی" نے صدارتی تقریر میں کہا کہ جناب کوثرؔ چاندپوری نے وقت کی رفتار کو سمجھ کر زمانہ کے رجحانات کی عکاسی کی ہے اور معاشرے کے مطالبات کا احترام کیا ہے اِسی لئے افسانوی تاریخ میں اِن کا ذکر ناگزیر ہے۔



جنابِ عزیزؔ وارثی نے حضرت کوثرؔ چاندپوری کی شخصیت اور فن پر روشنی ڈالی۔ حضرت کوثرؔ چاندپوری نے جنابِ حکیم عبدالحمید صاحب کی ہمہ گیر شخصیت اور اُن کے اَدبی کارناموں کا تذکرہ کیا اور اپنے اَدبی ذوق کے محرکات، افسانوی اَدب سے وابستگی اور اَدبی زندگی کے پس منظر سے متعارف کرایا اور انگریزی کے ایک مفکر کا یہ قول دُہرایا کہ تاریخ میں ناموں کے علاوہ ہر چیز جھوٹی ہوتی ہے جبکہ افسانے میں ناموں کے سوا ہر چیز سچی ہوتی ہے۔

۱۰



اُردو مجلس آل انڈیا ریڈیو دہلی کے پروڈیوسر اور مقبول ادیب و شاعر جنابِ رفعتؔ سروش نے حضرت کوثرؔ چاندپوری کی اَدبی بصیرت اور وسعت نگاہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا "کوثرؔ صاحب شاعر کا مزاج ادیب کا قلم طبیب کی نگاہ اور ایک انسان کا دردمند دل رکھتے ہیں۔"



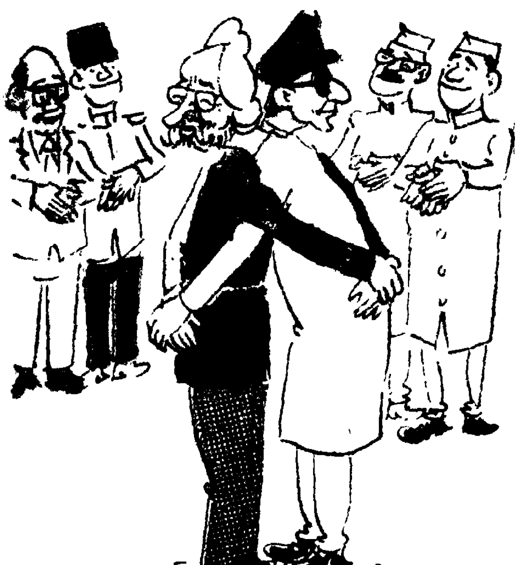
پدم شری اور مقبول عام شاعر حضرت سلامؔ مچھلی شہری نے فرمایا کہ اُتر پردیش اکاڈمی نے اِس طویل مختصر کہانی کو انعام کا مستحق قرار دے کر انصاف پسندی کا ثبوت دیا ہے۔

بیسویں صدی دہلی

تیرونشتر

خوشتر گرامی





کیا سردار سورن سنگھ کے دورِ ایران سے ہند ایران تعلقات مضبوط ہوئے؟

"غلّہ کی سرکاری تجارت ختم کی جائے" ہندو مہاسبھا کا مطالبہ ـــــ اور ہندو مہاسبھا یا اُس کے ایجنٹوں کے حوالے کی جائے۔

"جن سنگھ اپنا ریڈیو اسٹیشن قائم کرے گا" ایک خبر ـــــ امریکہ سے براہِ راست رابطہ قائم کرنے کے لئے۔

"ہریانہ میں بیئر کا نیا کارخانہ" ایک خبر ـــــ برسرِ اقتدار لوگوں کو اقتدار کا نشہ ہے ہی، یہ اپوزیشن کے لئے ہے۔

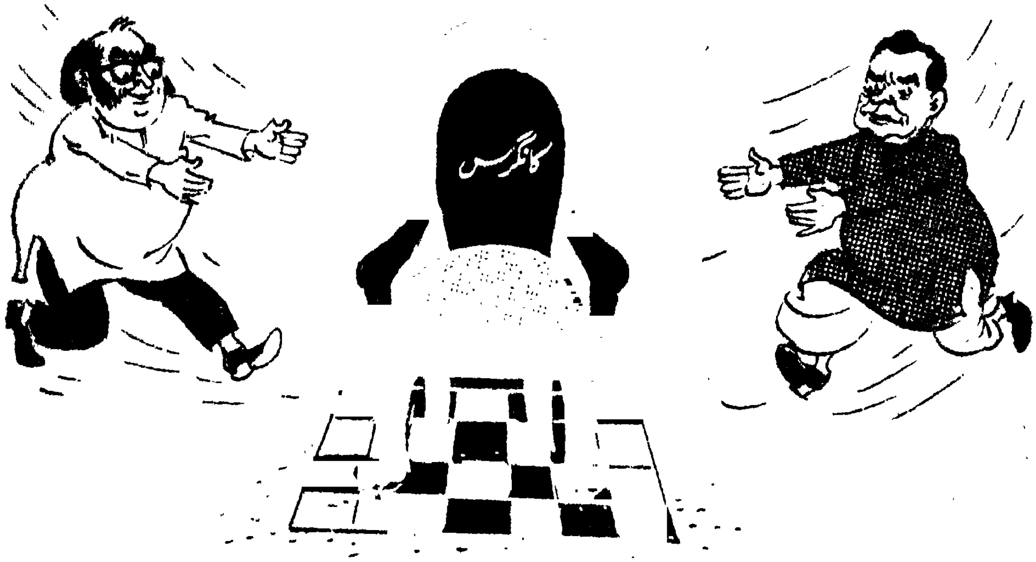
"مرکزی حکومت کئی صوبوں کے اندرونی حالات کی وجہ سے فکرمند" ایک عنوان ـــــ اور صوبوں کے لوگ وزارتیں حاصل کرنے اور اقتدار کی رسّہ کشی جاری رکھنے کے لئے سخت فکرمند۔

"یو۔پی کے پلان میں کٹوتی نہ ہوگی" ایک خبر ـــــ اِس لئے کہ راشٹرپتی راج کی وجہ سے وزیروں کی تنخواہوں اور الاؤنسوں کی بھاری بچت ہوئی ہے۔

"کانگرس کی گروہ بندی سے انتظامیہ متاثر" ایک عنوان ـــــ اور انتظامیہ کی غفلت سے سارا سماج متاثر۔

"جن سنگھ کا شغل" ایک سُرخی ـــــ نت نئے عنوانوں سے ایجی ٹیشن چلانا اور وہ ٹائیں ٹائیں فِش ہو جائے تو دم کھینچ کر بیٹھ جانا۔

"ہندوستان میں انگور کی پیداوار بڑھی" ایک خبر ـــــ اور انگور کی بیٹی کی مقبولیت بھی بڑھی۔



جن سنگھ اور سوتنتر پارٹی کا دعویٰ کہ وہ کانگرس کا متبادل بنیں گی۔

"مرکز میں کھیل کود وزارت بنانے کا مطالبہ" ایک خبر ـــــ یعنی رسہ کشی کا جو کھیل صوبوں میں جاری ہے وہ مرکز میں بھی شروع ہو جائے۔

"میں بے گناہ ہوں پنجاب کے سابق وزیر رتن سنگھ کا بیان" ایک خبر ـــــ بے گناہ ہی نہیں مظلوم بھی۔ گناہگار صرف جنتا ہے۔

"صرف کرسیوں کا جھگڑا" ایک عنوان ـــــ کرسی مل جائے تو میز خود بخود مل جائے گی۔

"گجرات میں صنعتوں کو فروغ دیا جائے گا" نئے وزیر اعلیٰ کا اعلان ـــــ صنعتِ رسہ کشی کو۔

"بہار کی ندیوں میں سیلاب" ـــــ سیاسی سیلاب ختم ہو جانے کے بعد۔

"ہند ایران تعلقات زیادہ مستحکم ہو گئے" سردار سورن سنگھ ـــــ بھٹو کے ایوانِ صدارت میں زلزلہ۔

"اگلے دو ماہ بڑے مشکل ہوں گے" وزیر اعظم کا انتباہ ـــــ پچھلے دو ماہ کون سے آسان تھے؟

"ذخیرہ اندوزوں کی پکڑ دھکڑ متوقع" ایک خبر ـــــ یہ وہم اور خلل ہے دماغ کا۔

"گیہوں کی تھوک تجارت" ایک عنوان ـــــ بڑے بڑے کانگرسی زمینداروں کی وجہ سے ناکام۔

"ہندو مہاسبھا" ایک عنوان ـــــ ایک مردہ لاش ہے۔ اب اس کا جانشین جن سنگھ ہے۔

"سنڈیکیٹ کانگریس یو۔پی کا انتخاب نہیں لڑے گی"۔ ایک خبر
—— ایک لعنت تو کم ہوئی۔

"یو۔پی میں ہر طرف بارش"—— کملاپتی ترپاٹھی کے گناہ دھونے کے لئے۔

"گجرات وزارت نے حلف لے لیا" ایک خبر—— آپس میں ایک دوسرے کی کاٹ کرنے کا۔

"اردو کا بھوشیہ (مستقبل) کیا ہے؟" ایک عنوان۔—— ہمیں حال کی فکر ہے، آپ مستقبل کی بات کر رہے ہیں۔

"آج ٹیلی ویژن پر" ایک عنوان—— فحش گانے اور کیبرے ڈانس۔

"مدھیہ پردیش کے ناراض وزیروں نے اپنے استعفے واپس لے لئے" ایک خبر—— منہ میٹھا ہونے کے بعد یا ویسے ہی۔

"پردھان منتری نے کیا کہا تھا" ایک عنوان—— کانگریسی ایک دوسرے کی ٹانگ گھسیٹنے سے باز آجائیں۔

"وشو سندری کا انتخاب۔ فلپائن کی حسینہ اول آئی"—— ہندوستانی سندریوں کو خبر نہ ہوئی ہوگی۔

"کھاری باولی دلی میں بناسپتی گھی کے خریداروں میں جھگڑا"—— جھگڑا بھی بناسپتی نوعیت کا ہوگا۔

"کیرالا کے سیلاب زدگان کے لئے ۲۵ لاکھ کی منظوری" ایک خبر—— یعنی سیلاب زدگان ۲۵ لاکھ سے اوپر نہ ہوں گے۔



ہرچند کمیٹی کی رپورٹ پر دلیرانہ اقدام کے لئے مرکزی لیڈروں کی طرف سے گیانی ذیل سنگھ کو خراجِ تحسین۔



شاہِ ایران کا جدید ترین اسلحہ کے لئے امریکہ کا دورہ۔

"دِلّی میونسپل کارپوریشن میں ملازمت دلانے کا اسکینڈل"
ایک عنوان —— یوں تو کارپوریشن ساری کی ساری اسکینڈل ہے۔

"ضلع شاہجہانپور قحط کا شکار" ایک خبر —— جبکہ عہدِ شاہجہانی فراخی اور فارغ البالی کا دور تھا۔

"دِلّی کی سڑکوں کے ناموں کے بورڈ اُردو میں لکھے گئے تو جن سنگھ اُس کے خلاف مہم چلائے گا" اٹل بہاری باجپائی کا اعلان —— اور اِس پر دعویٰ ہے کہ جن سنگھ اُردو کا مخالف نہیں۔

"سنڈیکیٹ کو نکالنے والی انڈیکیٹ آج خود سنڈیکیٹ بن چکی ہے" ایک عنوان —— عینک بدلوا کر پھر دیکھئے۔

"یو۔پی میں تعزیری ٹیکس" ایک خبر —— کلاپتی کے گناہوں کا تاوان۔

"اُردو کے ساتھ نا انصافی" ایک عنوان —— ۲۵ برس سے ہو رہی ہے۔ آپ کو اب پتہ چلا ہے۔

"مُسلم لیگ پر یورش" جماعتِ اسلامی کے اخبار کی سُرخی —— کنویں کا گواہ مینڈک۔

"اُردو تعلیم کی سہولت دیہاتی علاقوں میں بھی دی جائے" کانپور جمعیتہ علماء کا مطالبہ —— بلکہ پہاڑی، دریائی، سمندری، ریگستانی، جنگلی، دلدلی، سیلابی، نشیبی غرض کہ ہر علاقے اور زمین کے ہر چپّہ پر دی جائے۔ اِس لئے کہ ؎

سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

"فرقہ واریت سر اُٹھا رہی ہے۔ جگہ جگہ فساد کرانے کی سازش ہو رہی ہے" اٹل بہاری باجپائی ـــــ

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

"ملک میں ایمرجینسی ابھی نہیں ہٹائی جائے گی" وزیرِ داخلہ ڈکشٹ ـــــ لیکن فرقہ پرست تو ایمرجینسی کے باوجود جگہ جگہ گڑبڑ کر رہے ہیں۔

"گورنر یو۔پی نے پی۔اے۔سی کے پانچ جوانوں کو برطرف کر دیا" ـــــ اب وہ پانچویں سواروں میں ہو گئے۔

"ایران کی فوجی تیاریاں کس لئے؟" ایک عنوان ـــــ امریکن اسلحہ فروخت کرنے والے کارخانے داروں کی تجوریاں بھرنے کے لئے۔

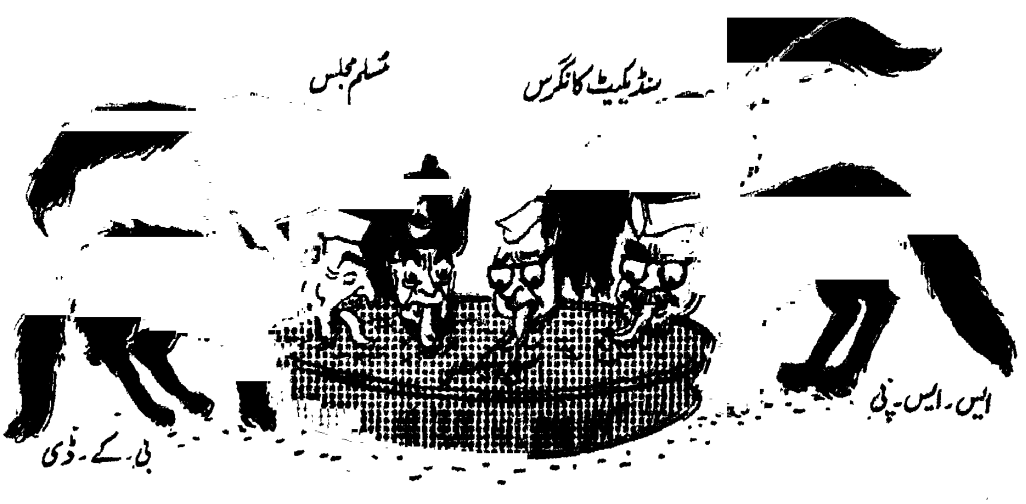
"یو۔پی میں کسی وقت بھی چناؤ ہو سکتے ہیں" ایک خبر ـــــ ذرا کملا پتی ترپاٹھی کے ڈالے ہوئے گھاؤ بھر جانے دو۔ ورنہ مار کھاؤ گے۔

"پولیس کو مال ضبط کرنے کا اختیار نہیں" ایک عنوان ـــــ البتہ وہ چھینا جھپٹی کر سکتی ہے، ہڑپ کر سکتی ہے اور کسی بھی غیر قانونی طریقہ سے دبا سکتی ہے۔ لیکن بحقِ سرکار ضبط کرنے کا اختیار نہیں۔

"جنگلی جانوروں کے تحفظ کا قانون دِلّی میں بھی لاگو" ایک خبر ـــــ یہاں انسان کے تحفظ کی تو ضرورت نہیں۔ کیونکہ وہ قانون سے باہر ہو چکا ہے۔ اِس لئے جانوروں ہی کا تحفظ ہو جائے۔

"دس سال میں گیارہ بچے ـــــ

نرخ بالا کُن کہ ارزانی ہنوز



یو۔پی میں الیکشن لڑنے کے لئے چار پارٹیوں کا متحدہ محاذ۔

ہڑتال

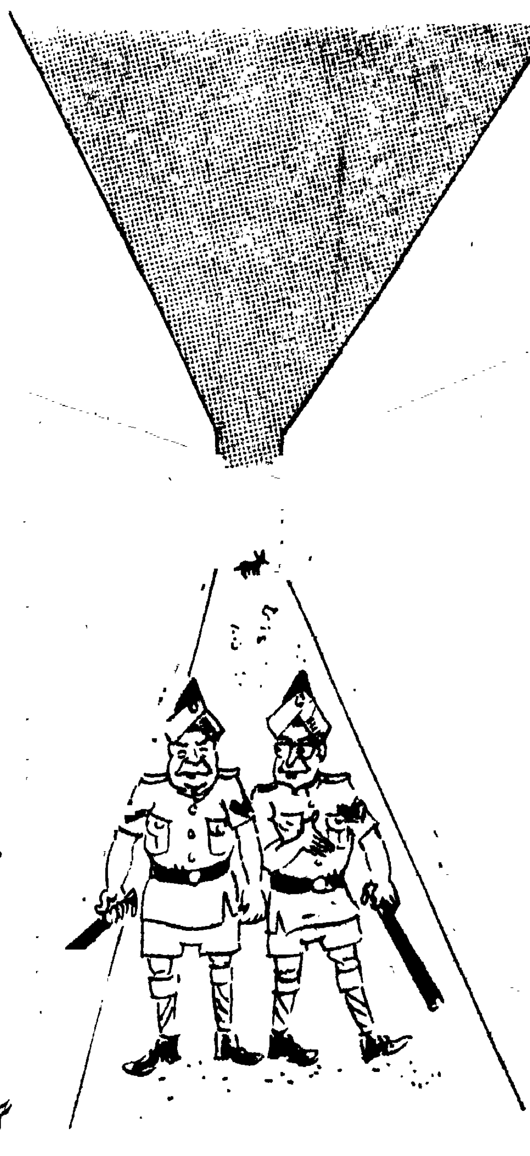
خوشترگرامی

آنکھ کی اندھی بلکہ اندھے کی لاٹھی۔ کبھی سُرخرو، کبھی مُنہ سیاہ۔ پیشانی پر مزدور کے خون پسینہ کی بُوندیں۔ سر پر پولیس کی لاٹھیاں۔ دست و بازو میں جان نہیں تو ہڑتال کی بھی آن نہیں۔ زبان پر زندہ باد، مُردہ باد کے نعرے۔ یہ نظارے ہیں ——

ہڑتال

کے۔ خون چُوسنے والے مزدور کُش، غریب دُشمن، سرمایہ داروں، کارخانہ داروں، صنعت کاروں کے خلاف ایجاد ہونے والے اس ہتھیار کو مزدوروں کی قُربانیوں اور اتّحاد نے سرکار سے قانونی تحفظ دلایا مگر جب اِس بِلّی نے سرکار سے بھی میاؤں کرنا شروع کیا تو سرکار پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت —— ہڑتال کا نعرہ لگتے ہی آنسو گیس، لاٹھی چارج اور فائرنگ سب ہتھیار کُند اور بیکار ہو جاتے ہیں۔ نہ لازمی سروسوں کا قانون کام دیتا ہے اور نہ ایمرجینسی۔ حتیٰ کہ جیل کی کوٹھڑی بھی بے اثر ہو گئی ہے۔ اِس لئے کہ ہڑتال کھُلتی ہے تو پُوری تنخواہ، نوکری کی بحالی، مُلازمت کا تسلسل، گرفتار شُدگان کی رہائی، پھُولوں کے ہار، جلسے، جلوس، دعوتیں اور زندہ باد کے نعروں سے فضا گُونج اُٹھتی ہے —— ہڑتال کے قاعدے اور ضابطے داخل دفتر ہو چُکے ہیں۔ کوئی سمے، کوئی وقت نہیں۔ نوٹس بغیر نوٹس ہر طرح جائز۔ مذہب کے نام پر ہڑتال، زبان کے نام پر ہڑتال —— رکشاؤں، ٹانگوں، اسکوٹروں، فورسیٹروں، ٹیکسیوں، ریلوں، ہوائی جہازوں کی ہڑتال سے لے کر پولیس، پی۔اے۔سی، کلرکوں، انجینئروں، گزیٹیڈ، نان گزیٹیڈ، ملازموں، ہوٹلوں، سینماؤں کو بھی چارہ نہیں۔ اِس لئے اب ؏

کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا



ساحل کے آس پاس

سیف الرحمٰن (عبّاد) ایم۔ ایس سی (علیگ)

۱۰/۱۔ حویلی اعظم خاں، جامع مسجد، دہلی نمبر۶

محترم خوشتر صاحب! آداب

"پیامِ زیرِ لب" کی اشاعت کا شکریہ۔ اُس کی پذیرائی کے بہت سے خطوط مجھے ملے ہیں۔ میں "بیسویں صدی" کے توسّط سے اُن تمام کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اپنی قیمتی آراء سے نوازا ——— زیرِ نظر افسانہ ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو اپنا ساحل نہ پا سکی۔ یہی افسانے کا مرکزی خیال ہے۔ میں نے یہاں جس عورت کے نفسیات کی عکاسی کرنے کی سعی کی ہے وہ محض خیالی نہیں، میں نے تو اُسے فلش (Flesh) اور بلڈ (Blood) میں دیکھا ہے۔ اُمید ہے آپ اور "بیسویں صدی" کے بالغ نظر قارئین اِس کاوش کو پسند کریں گے ——— آپ کی گرانقدر رائے کا منتظر ہوں . . .

نیازمند

سیف الرحمٰن (عبّاد)

★

گھنٹے نے دُوسرے پیریڈ کا اعلان کیا تو ایم۔ اے سائیکلوجی کی کلاس میں یکلخت ایک انتشار پیدا ہو گیا۔ ایک طوفان سا ہر سُو موجزن ہو گیا۔ طلباء جو پیریڈ خالی ہونے کی وجہ سے اِدھر اُدھر سیٹوں پر بیٹھے خوش گپّیوں میں مصروف تھے دَوڑ دَوڑ کر اپنی سیٹوں پر بیٹھنے لگے۔ کلاس سیکریٹری اعظم نے اُٹھ کر بلیک بورڈ صاف کیا۔ پھر چاک کے ڈبّے کا جائزہ لیا اور ہر طرح سے مطمئن ہونے کے بعد چُپ چاپ آکر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ کلاس میں اب ایک پُراسرار خاموشی چھا گئی تھی۔ ہر لڑکا اپنی جگہ بُت بنا پروفیسر مِس سلطنت کی آمد کا منتظر تھا۔ سبھی کے دل دھڑک رہے تھے۔ چالیس منٹ کی قیدِ بامشقّت کے تصوّر سے ہر چہرے پر اُلجھن، خوف اور پریشانی کی لکیریں اُبھر آئی تھیں۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ ہر روز دُوسرے پیریڈ کے شروع ہونے سے ختم تک شریر سے شریر لڑکا بھی اپنی جگہ یوں ساکت و جامد بیٹھا رہتا جیسے اُس کا وجود کوئی بند گھڑی ہو۔ بے حرکت، بے آواز۔ کلاس رُوم میں صرف پروفیسر سلطنت کی باوقار آواز گونجتی رہتی۔

نپے تُلے قدموں کی آہٹ کے ساتھ کلاس رُوم کا دروازہ آہستہ سے کُھلا اور دُوسرے ہی پَل پروفیسر سلطنت اپنے مخصوص انداز میں کلاس میں داخل ہوئیں۔ لڑکوں نے کنکھیوں سے ایک دُوسرے کی طرف دیکھا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی بے بسی اور خوف کا اظہار کر رہے ہوں، پھر ہر نگاہ اُن کی طرف اُٹھتی چلی گئی۔ وہ شانِ بے نیازی سے اپنے حُسن کا خراج وصول کرتی ہوئی میز تک آئیں، رجسٹر اور کتابیں ایک طرف رکھ کر ساری کا پلّو دُرست کیا اور جسم سمیٹتی ہوئی کُرسی پر بیٹھ گئیں۔ لڑکوں نے ہوم ورک کی کاپیاں کھول کر اپنے سامنے رکھ لیں۔ جو کسی وجہ سے ہوم ورک کرنے سے قاصر رہے تھے، اپنے لئے دس منٹ کا لیکچر یا کلاس سے باہر چلے جانے کا حُکم یا دُوسری کسی سزا کا انتظار

کرنے لگے۔

پروفیسر سلطنت نے طائرانہ نگاہ سے کلاس کا جائزہ لیا۔ پھر رجسٹر کھول کر حاضری لینے لگیں۔ لڑکے مودبانہ انداز میں یس میڈم! کہتے۔ رول کال ختم ہوتے ہی اُن کی تیز آواز کلاس روم میں گونجی: "جن صاحبان نے ہوم ورک نہیں کیا ہے برائے مہربانی کلاس سے باہر چلے جائیں۔" دو چار لڑکے اپنی جگہ سے اٹھے اور نظریں جھکاتے ہوئے کلاس سے باہر نکل گئے۔ پروفیسر سلطنت کی حقارت بھری نظر دروازے تک اُن کے ساتھ گئی۔

"مسٹر شہزاد! ذرا دروازہ بند کر دیجئے۔"

شہزاد جو کلاس کا سب سے ذہین لڑکا تھا اپنی جگہ سے اٹھا۔ دروازہ بند کر کے وہ بیٹھنا ہی چاہتا تھا کہ دوسرا حکم صادر ہوا۔

"میرے دئے ہوئے سوالات کے جواب میں آپ نے کیا لکھا، پڑھئے!"

شہزاد سر جھکائے اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ ایک پل کو اس نے پروفیسر سلطنت کی طرف دیکھا پھر نظریں جھکا لیں۔ کئی سیکنڈ اسی طرح گزر گئے۔

"مسٹر شہزاد! کیا آپ نے ہوم ورک نہیں کیا؟"

"جی وہ بات۔ . . !"

"آپ جانتے ہیں مسٹر شہزاد کہ میرے سوال کا جواب صرف ہاں یا نہیں میں ہوا کرتا ہے۔"

"نہیں میڈم!"

"تو پھر آپ کلاس سے باہر کیوں نہیں گئے؟"

"میڈم! آپ جانتی ہیں کہ میں اِس سے پہلے کبھی بغیر ہوم ورک کئے کلاس نہیں آیا۔ میں نے سوچا تھا پہلی غلطی کو آپ ضرور معاف کر دیں گی۔ ویسے بھی یہ غلطی میں نے دانستہ نہیں کی۔ کل ایک ضروری کام میں اُلجھا رہا ورنہ آپ کو خفا ہونے کا موقع نہ دیتا۔"

پروفیسر سلطنت کو آج تک کسی نے اِتنا لمبا جواب دینے کی جرأت نہ کی تھی۔ لیکن شہزاد آج اُن سے آنکھیں مِلائے ہوئے اِتنا کچھ کہہ گیا۔ وہ کہتا رہا، اُن کے چہرے کی رنگت بدلتی گئی اور آخر کار سُرخ ہو کر رہ گئی۔ غصّے کی شدّت سے اُن کے خمیدہ ہونٹ کپکپانے لگے تھے۔ شہزاد اپنی بات ختم کر کے بیٹھنے ہی والا تھا کہ اُن کی کرخت آواز کلاس روم میں گونج اُٹھی۔

"سٹینڈ اَپ!"

شہزاد کھڑا ہو گیا۔

"مسٹر شہزاد! آپ کو پڑھنے کا مشورہ کس نے دیا؟ کسی پارٹی کے لیڈر بن جایئے۔ وہاں زبان چلانے کا موقع زیادہ مِلے گا۔ یہ کلاس ہے آپ کو اپنے ٹیچر سے زبان درازی کرتے ہوئے شرم نہیں آئی؟ جھوٹ بولنے سے تو اچھا تھا کہ آپ کچھ نہ کہتے۔ وجہ مجھ سے سُنئے۔ آپ نے سوچا ہوگا میں کلاس کا سب سے ذہین لڑکا ہوں اِس لئے مجھے ہر طرح کی آزادی ہے۔ کام کروں یا نہ کروں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن یاد رکھئے میرے کلاس میں ایسی کوئی بات نہیں۔ یہاں سب لڑکے برابر ہیں۔ آپ لوگوں کو اگر تعلیم کا شوق نہیں تو ماں باپ کی مشقت کی کمائی کو اِس طرح مٹی میں مِلانے سے کیا فائدہ۔ جایئے سڑکوں پر تفریح کیجئے۔ یہاں کلاس روم میں تو آپ لوگوں کو بہت گھٹن محسوس ہوتی ہوگی۔ باہر جا کر آزادی سے سانس لیجئے۔ جب آپ لوگ ایک گھنٹہ بھی پڑھنے کے لئے نہیں بیٹھ سکتے تو میرے پڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

پروفیسر سلطنت پیر پٹختی ہوئی کلاس سے باہر نکل گئی۔

کلاس میں اب بھی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ شہزاد سر جھکائے ہوئے اپنی فائل درست کر رہا تھا۔ دھیرے دھیرے کلاس کے سارے لڑکے اس کے گرد جمع ہو گئے۔

اعجاز جوشیلے انداز میں بولا: "شہزاد! تمھاری یہ تذلیل ہم سے برداشت نہ ہوگی! پہلی غلطی کو تو خُدا بھی معاف کر دیتا ہے پھر یہ کیا ہیں۔ پڑھنے کے لئے ایک ہی گھنٹہ نہیں ہم کئی کئی گھنٹے دیتے ہیں۔ لیکن وہ یہ سمجھتی ہیں کہ ہم سب کالج صرف تفریح کی غرض سے آتے ہیں۔ بات بات پر بلاوجہ نصیحت کرنے کا اُنھیں کیا حق ہے؟ ہم کچھ نہ کچھ کر کے رہیں گے!"

توصیف بولا: "ہاں ہاں بالکل! حُسن کے اِس غرور کو توڑنا ہی ہوگا۔ وہ حسین ہوں گی اپنے گھر کی۔ ہم پہ یہ رعب نہ چلے گا۔ سب سے ذہین لڑکے کا اگر یہ حال ہوگا تو ہم سب تو بغیر کسی وجہ کے ہی چکّی میں پیس دئے جائیں گے۔"

قاضی لڑکوں کی بھیڑ سے نکلتے ہوئے بولا: "ہم لوگ اتنی محنت کرتے ہیں۔ ہر طرح سے میڈم کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اپنے آگے تو وہ ہمیں گندی نالی کا کیڑا سمجھتی ہیں۔ ہمیں احتجاج کرنا ہی ہوگا۔"

شہزاد کچھ نہ بولا۔ ساری باتیں سُن کر اُس نے خالی خالی نظروں سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو: "دوستو! تم لوگ کچھ نہ کر سکو گے!"

پروفیسر سلطنت کا تقرر پچھلے ہی سال ہوا تھا۔ اِس میں شک نہیں کہ حُسن و جاذبیت کا وہ ایک جیتا جاگتا شاہکار تھیں۔ وہ کشمیر کی رہنے والی تھیں۔ سُرخ سپید رنگت، بڑی بڑی نشیلی آنکھیں، پتلے پتلے گلابی ہونٹ، سیاہ اور دراز زُلفوں میں گلمرگ کی اَن گنت شاموں کے دھندلکے جذب تھے۔ فراخ پیشانی پر آوارہ بالوں کے چھلّوں میں قریب آنے والوں کا دل اُلجھ کر رہ جاتا۔ اپنی خوبصورت آواز میں ہونٹوں کو اِک ادا سے جنبش دیتے ہوئے جب وہ روانی سے انگریزی

بولتیں تو سننے والے پہلے تو اُن کی قابلیت کے قائل ہوتے، پھر کچھ دیر کے لئے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتے۔ ایسا کرکے اُن کی آنکھوں میں غرور کا ایک ہلکا سا عکس ابھرنے لگتا۔ وہ ہر ملنے والے کی نظر میں اپنی صلاحیتوں کی داد تلاش کرتیں۔ لباس کے معاملے میں ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ اُن کے حُسن کے خفیہ رعب کو نمایاں کرتا۔ خوبصورت چہرے پر ہلکا سا میک اَپ ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی خوبصورت کلی کے مُنہ کو شبنم نے دھو دیا ہو!

پروفیسر سلطنت کی عُمر پچیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ نوعُمری اور خشک مزاجی کا یہ امتزاج کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ اُن کے تقرر سے کالج میں ہر کوئی خوش تھا۔ پرنسپل صاحب نے بھی اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم آپ لوگوں کو سائیکلوجی کی ایک ایسی ٹیچر دے رہے ہیں جس پر ہمارے کالج کو خاص طور سے سائیکلوجی ڈیپارٹمنٹ کو فخر ہوگا۔ ایم۔ اے سائیکلوجی کے طلباء نے بہت بے صبری سے اپنے ہونہار ٹیچر کا انتظار کیا تھا اور اُنھیں دیکھ کر واقعی ہر کوئی اُن کی شخصیت سے مرعوب ہو گیا۔ لیکن اُن کی فطرت اور ذہنیت سے لڑکے دو ہی دن میں اوب گئے۔ ہر لڑکا اُن کے رویّے سے پریشان تھا۔ روز روز کے ہوم ورک اور ایک ہی دن میں دو دو یا تین تین ٹیسٹ سے لڑکے عاجز تھے۔ اوّل تو اُن کے خوف سے کوئی لڑکا کلاس میں دیر سے نہ آتا لیکن کبھی اتفاقاً کسی کو ایک منٹ کی بھی دیر ہو جاتی تو اُسے کلاس میں آنے کی اجازت نہ ملتی۔ وہ ایم۔ اے کی کلاس میں لڑکوں سے ایسا سلوک کرتیں جیسے وہ پرائمری اسکول کے بچّے ہوں۔ خاص طور سے شہزاد کو جسے اپنے مضمون پر قریب قریب عبور حاصل تھا اتنا نروس کرتیں کہ اُسے اپنی محنت و ذہانت پر شک ہونے لگتا۔ پرنسپل صاحب کے پاس شکایت بھی بھیجی گئی۔ لیکن اُنھوں نے لڑکوں ہی کو قصور وار ٹھہرایا۔ اُن کا کہنا تھا کہ خامی آپ ہی لوگوں میں ہے۔ اُسے دُور کیجیے۔ سائیکلوجی کے اسٹاف کا خیال تھا کہ پروفیسر سلطنت احساسِ برتری کا شکار ہیں۔ وہ سب پر حاوی ہو کر رہنا چاہتی ہیں اور یہی کومپلکس اُن کے جذبۂ انانیت کی تسکین کا سامان ہے۔ غرض کہ وہ کالج میں ایک مُعمّہ تھیں۔ اُن کے بارے میں ہر ایک کی رائے الگ تھی۔ اپنی انفرادی خصلت کی وجہ سے وہ ہمیشہ موضوعِ سخن بنی رہتیں۔

دُوسرے دن وہ کلاس میں دس منٹ لیٹ آئیں اور آتے ہی ٹیسٹ کا اعلان کر دیا۔ لڑکے اِس ٹیسٹ کے لئے بالکل تیار نہ تھے کیونکہ اِس کے بارے میں اُنھوں نے کل کچھ نہیں بتایا تھا۔ اُن کا یہ طریقہ بھی عجیب تھا۔ جب چاہتیں ٹیسٹ لے لیتیں۔ ابھی ٹاپک ختم ہُوا اور ابھی ٹیسٹ لے لیا۔ خواہ لڑکے اِس کے لئے تیار ہوں یا نہ ہوں۔

شہزاد کھڑا ہُوا۔ "میڈم اجازت ہو تو کچھ عرض کروں۔"

پروفیسر سلطنت نے عجیب نظروں سے اُسے دیکھا پھر جیسے سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے بورڈ پر ٹیسٹ کے سوالات لکھنے لگیں۔ بغیر اجازت کے شہزاد کہنے لگا ——

"میڈم برائے مہربانی اِتنا بتا دیجیے کہ آپ کا مقصد ہمیں تعلیم دینا ہے یا برباد کر دینا ہے۔ اِس طرح ٹیسٹ لینے کا طریقہ کسی کالج میں نہیں ہے۔ ہمارے سیشنل مارکس (Sessional marks) روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں۔ ٹیسٹ سے پہلے تھوڑا وقت ٹاپک کی تیاری کے لئے بھی ضروری ہے۔ ہم انسان ہیں کوئی مشین نہیں۔ آپ نے ہم پر اِتنا دباؤ ڈال رکھا ہے کہ وہ رِشتہ جو ایک ٹیچر اور اسٹوڈنٹ کے درمیان ہوتا ہے کبھی نہ بن سکا۔ ہم آپ سے خائف رہتے ہیں۔ ہم میں اتنی جُرأت نہیں کہ آپ سے کوئی مشورہ لے سکیں یا کسی ٹاپک پر کھل کر تبادلۂ خیال کر سکیں۔ آپ کو ہم سے کوئی ہمدردی نہیں۔ ہمارے مستقبل سے آپ کو کوئی دلچسپی نہیں۔ ہم سب نے مل کر فیصلہ کیا ہے کہ اب آپ سے نہیں پڑھیں گے!"

لڑکے حیرت سے شہزاد کی باتیں سُن رہے تھے۔ آج نہ جانے اُسے کیا ہو گیا تھا۔ پھر بھی وہ بہت خوش تھے۔ میڈم کو مُنہ توڑ جواب مل رہا تھا۔

پروفیسر سلطنت کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ بے بسی کی حالت میں وہ اپنا نچلا ہونٹ چبانے لگی تھیں۔ غصّے کی شدّت سے پسینے کی بُوندیں اُن کی شفاف پیشانی پر اُبھر آتیں جسے وہ بار بار رُومال سے صاف کرنے لگتیں۔

شہزاد اپنی بات ختم کرکے بیٹھنے ہی والا تھا کہ پروفیسر سلطنت کی چیختی ہوئی آواز کلاس رُوم کی دیواروں سے ٹکرائی۔

"سٹینڈ اَپ!"

شہزاد بیٹھتے بیٹھتے کھڑا ہو گیا۔

"مسٹر شہزاد! آپ پہلے انسان ہیں جس نے میرے پڑھانے کے طریقے کو فرسودہ اور بیکار کہا ہے۔ آپ کتنے پانی میں ہیں پہلے اِس کا اندازہ لگائیے۔ آپ مجھے نیچا دکھانا چاہتے ہیں۔ لیکن یاد رکھئے آپ اپنے اِس ارادے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ میں اپنی یہ توہین ہرگز برداشت نہ کروں گی۔ کالج سے رسٹیکیشن (Rustication) نہ کرا دیا تو میرا نام سلطنت نہیں!"

دُوسرے دن شہزاد اور پروفیسر سلطنت کے درمیان تصادم کی خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے کالج میں پھیل گئی۔ پرنسپل صاحب کی طرف سے نوٹس آ چکا تھا کہ کالج کے سارے طلباء یونین ہال میں اِکٹھے ہو جائیں۔ لڑکوں نے بے دِلی سے پہلا پیریڈ اٹینڈ کیا اور ایک ایک کرکے یونین ہال میں جمع ہونے لگے۔ پرنسپل

صاحب نے لڑکوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا: "پروفیسر سلطنت کی یہ شکایت ہے کہ شہزاد نے اُن کے لئے نازیبا الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اگر شہزاد نے واقعی اُن کی توہین کی ہے تو یقیناً اُسے کالج چھوڑنا پڑے گا۔ یہی اس کالج کی روایت رہی ہے۔ ایسے لڑکے کو ہم کبھی برداشت نہیں کر سکتے!"

لڑکوں نے پرنسپل صاحب کو ہر طرح سے یقین دلایا کہ شہزاد نے کوئی ایسی بات نہیں کہی ہے جس سے کسی کی توہین ہوتی ہو۔ اُس نے وہی بات کہی جو ہر لڑکے کو بہت پہلے کہنی چاہئے تھی۔ شہزاد نے جو احتجاج کیا ہے وہ ہم سب کی طرف سے تھا۔ اگر اُسے کالج سے نکالا گیا تو ہم سب بھی کالج چھوڑ دیں گے!

یونین ہال میں ایک لمحہ خاموشی چھائی رہی۔ پرنسپل صاحب کچھ سوچ کر کھڑے ہوئے: "حضرات! پروفیسر سلطنت کی شکایت ہی کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے ہمیں کارروائی کرنی ہے۔ شہزاد اُن کا طالب علم ہے۔ اس لئے اُس کی صفائی کو اُن کی شکایت پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ ایک ٹیچر کا جو مقام ہوتا ہے اُسے آپ لوگ فراموش نہ کریں اور پھر شہزاد سے اُن کی کوئی دشمنی تو ہے نہیں جس کی بنا پر اُنھوں نے ایسا کیا ہو۔ ویسے یہ معاملہ پروفیسر سلطنت اور شہزاد کا ہے۔ اگر وہ شہزاد کو معاف کر دیتی ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ ہم مجبور ہیں۔ اِس کالج میں یہ ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا ہے۔ آج وہ کالج نہیں آئیں۔ اُنھوں نے فون پر مجھے اطلاع بھیجی ہے کہ کل وہ اپنا فیصلہ کالج بھیج دیں گی۔"

اِس کے بعد میٹنگ برخواست ہو گئی۔ ہر لڑکا پریشان تھا۔ پروفیسر سلطنت کی بے رحم طبیعت سے سبھی واقف تھے۔ وہ شہزاد کو کالج سے نکال کر ہی چھوڑیں گی!

پروفیسر سلطنت کی خواب گاہ میں دودھیا بلب روشن تھا۔ وہ ٹوٹ کر بکھری ہوئی موتیوں کی مالا کی طرح بے ترتیبی سے بستر پر پڑی تھیں۔ اُن کے جسم پر صرف شب خوابی کا ایک باریک اور مختصر سا گاؤن تھا۔ دراز بالوں کا آبشار سینے پر سے بہتا ہوا کمر کے نشیب میں گر رہا تھا۔ چہرے پر وحشت اور اضطراب کا تسلّط تھا۔ گلاب کی پنکھڑی کی طرح ہونٹ پژمردہ اور کھردرے ہو گئے تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں کبھی خود بخود بند ہو جاتیں اور کبھی ٹکٹکی باندھے خوابگاہ کی چھت کو تکنے لگتیں۔ اُن کا ذہن خیالات کی لڑی میں اب ایک ایسا موتی گوندھنے والا تھا جسے وہ کب سے تصوّر کے ہاتھوں میں لئے، لڑی میں اُس کا مقام ڈھونڈنے کی سعی کر رہی تھیں۔ گوندھنے سے پہلے اُنھوں نے پھر موتی سے پار دیکھا۔ ایک کلاس رُوم کا نقشہ اُبھر آیا۔ کلاس رُوم کی اگلی سیٹ اُن کے ذہن سے ٹکرائی۔ کتنا حسین، کتنا ذہین ہے یہ لڑکا! یونان کے دیوتا سا! بالکل پریوں کے دیس کا شہزادہ! اُنھوں نے کروٹ بدل لی۔ ٹیبل لیمپ کی بھرپور روشنی اُن کے صبیح چہرے کو منوّر کرنے لگی۔ منتشر خیالات نے کلاس رُوم کی اگلی سیٹ کا احاطہ کر لیا۔ اُف! مجھے کیا ہو گیا ہے! وہ کرب سے تلملا اُٹھتیں۔ یہ سب کیسے ہو گیا؟ پہلے دن کالج میں اُسی سے ملاقات ہوئی تھی۔ اُس کے آداب کرنے کا انداز کتنا دلنشیں تھا اور پھر پہلے دن کی کلاس کے بعد وہ میرے دل میں آن بسا۔ کیسے؟ میرے دل کے دروازے پر میری آن اور غرور کا پہرہ ہے۔ اُس لڑکے نے یہ حد کیسے پار کر لی؟ میرے اللہ! میں گندی زمین پر آتی جا رہی ہوں۔ نہیں کبھی نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا! لیکن . . . لیکن یہی سب کچھ تو ہوا جا رہا ہے۔ ایک پھانس سی دل میں چبھتی ہے۔ ایک خلش ہے جو جسم کے نہ جانے کس حصّے سے شروع ہوتی ہے اور رگ رگ کو پکا ہوا پھوڑا بنا دیتی ہے۔ اپنی مجرم خود میں ہی تو ہوں۔ کیوں میں نے اپنے آپ کو اِس سانچے میں ڈھال لیا۔ مجھے اپنی تمناؤں پر بھی کوئی اختیار نہ رہا۔ میں نے ہمیشہ اُسے حقارت کی نظر سے دیکھا۔ تاکہ وہ میری آنکھوں کے پس منظر کو نہ پڑھ سکے۔ میری یہ کوشش کامیاب بھی رہی۔ جس آگ میں مَیں پچھلے دو سالوں سے جل رہی ہوں اُس کی ہلکی سی تپش بھی اُس تک نہ جا سکی۔ میں نے کبھی یہ بھول کر بھی نہ سوچا کہ ہر ایک کو اپنی شخصیت سے متاثر کراتے کراتے ایک دن میں خود بھی کسی شخصیت سے متاثر ہو سکتی ہوں۔ وہ دن، وہ لمحہ، وہ پل آج میری گرفت میں ہے۔ اُسے بھینچ کر فنا کر دوں یا مانگ میں سجا لوں . . . لیکن کیسے؟ میری غیرت کا کیا ہوگا۔ میں گر نہیں سکتی۔ اُس سے کیسے کہہ دوں مجھے تم سے محبت ہے۔ اُف ری میری سہیلیاں تمھیں لوگوں نے حسین کہہ کہہ کر مجھے اِس مقام پر لا کھڑا کیا ہے۔ مجھے مغرور بنا دیا۔ اب میں تم سے جواب مانگتی ہوں۔ بولو کیا کروں؟ اور کمبخت یہ آئینہ ہر صبح چپکے سے میرے کان میں نہ جانے کیا کہہ دیتا ہے۔ سامنے رکھے پیپر ویٹ پر یکلخت پروفیسر سلطنت کی گرفت سخت ہو گئی اور دوسرے ہی پل قدِ آدم آئینہ چھناکے کے ساتھ ٹوٹ کر اُن کے قدموں کے آس پاس بکھر گیا۔ اُن کی سانسیں پھول رہی تھیں: "آسمان کی سمت پرواز کرتے رہنے کی جستجو میں میں یہ سوچنا بھی بھول گئی کہ زمین سے کتنی دور آ گئی ہوں! اور اب یہ دوری ایک ایسی خلیج بن چکی ہے جسے عبور کر کے اپنے دل کی منزل کی طرف جانا بھی چاہوں تو ممکن نہیں۔ لیکن میں ایسا کیوں سوچ رہی ہوں۔ پیچھے مُڑ کر دیکھنا میری توہین ہوگی! لوگ کہتے ہیں میں احساسِ برتری کا شکار ہوں۔ ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔ میں نے اُن پر رعب جمانا چاہا۔ اپنے فن اور صلاحیتوں کی چھاپ اُن کے ذہنوں پر مسلط کرنی چاہی۔ لیکن کسی نے مجھے روکا کیوں نہیں۔ کسی نے میری تذلیل کیوں نہیں کی۔ سبھی نے مجھے شہہ دی . . . لیکن اُسی نے ایسا کیوں کیا؟ مجھے نیچا دکھانے کا جرم اُسی نے

کیوں کیا؟ وہ کیوں مجرم بنا؟ لے لڑکے تو آخر کیا ہے؟ تو میری زندگی میں کیوں آیا۔ ..!" اُنھوں نے پھر خیالات کو پرے دھکیل دیا۔ اپنے اندر چھپی سہمی سہمی سی اُس عورت کا گلا دبا دیا جس کے ہونٹوں پر محبت کے ابدی ترانے مچل رہے تھے۔ ..! آج مجھے فیصلہ کرنا ہے، آخری فیصلہ! مجھے اُس کا رسٹیکیشن کرانا ہے۔ اُسے اپنے آپ سے دُور کرنا ہی ہوگا۔ میرے خیالات کی لڑی میں یہ موتی جگہ نہ پا سکے گا۔ میں ایک سیمیں لہر گرداب میں گم ہوجاؤں گی لیکن کھُردرے اور حقیر ساحل سے پناہ نہ مانگوں گی! کاغذات کی فائل اپنی طرف گھسیٹ کر وہ کچھ لکھنے لگیں۔ دو منٹ تک وہ فائل پر جھکی رہیں۔ وہ اپنا فیصلہ لکھ رہی تھیں ـــــ وہ اپنا فیصلہ لکھ چکیں۔ اُن کے لبوں پر ایک ہلکا سا تبسم پھوٹ پڑا تھا۔ اب اُن کی خوابگاہ میں تاریکی تھی۔

کالج کے یونین ہال میں طلباء کا جمِ غفیر تھا۔ اسٹاف ممبرس نے بھی اِس میٹنگ میں شرکت کرنا اپنا فرض سمجھا تھا۔ سبھی کے چہرے حالات کی نوعیت کے زیرِ اثر مرجھائے ہوئے تھے۔ ایم۔ اے سائیکلوجی کے طلباء خاص طور سے شہزاد کے قریبی دوستوں پر جیسے غم کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ شہزاد کو اِس بے بنیاد الزام سے بری کرانے کے لئے اُنھوں نے ہر ممکن کوشش کر ڈالی تھی۔ یونین کے صدر نے بھی اپنی تقریر میں ہر طرح کا یقین دلاتے ہوئے کہا تھا کہ شہزاد ایک سچا طالب علم ہے۔ اُس کی ذہانت اور بلند کرداری کی دوسرے کالجوں میں مثالیں دی جاتی ہیں۔ ایسی قیمتی اور عزیز شئے کو ہم اِتنی آسانی سے نہیں کھو سکتے جتنا پروفیسر سلطنت کا خیال ہے۔ ہم شہزاد کی موافقت میں ہزاروں دلیلیں لاکر کھڑی کردیں گے۔ پروفیسر سلطنت معمولی سی بات کو بھی پرسٹیج ایشو (Prestige issue) بناکر اپنی برتری کا سِکّہ ہم پر جمانا چاہتی ہیں۔ لیکن وہ یاد رکھیں کہ بناوٹ کے اصولوں سے حقیقت چھُپی ہے نہ چھُپے گی۔

لیکن درحقیقت کوئی بھی مطمئن نہ تھا۔ سبھی کے ہونٹوں پر بس ایک ہی سوال تھا۔ کیا واقعی شہزاد کو کالج سے نکال دیا جائے گا؟ اِس سوال کا جواب تو کسی کے پاس نہ تھا لیکن ہر لڑکے کی یہ دِلی خواہش تھی کہ آج کی میٹنگ میں اُسے شہزاد کو بے گناہ ثابت کرنے کا موقع مِلے۔

چند لمحوں بعد پرنسپل صاحب وائس پرنسپل صاحب کے ساتھ یونین ہال میں داخل ہوئے۔ لڑکے احترام سے کھڑے ہوگئے۔ ہاتھ سے لڑکوں کو بیٹھنے کا اِشارہ کرتے ہوئے وہ ڈائس پر آئے۔ ایک لمحہ کو اُنھوں نے لڑکوں کے رنجیدہ چہروں کو دیکھا۔ پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ لڑکے اب تک کھڑے تھے۔ پرنسپل صاحب کے دوبارہ اِشارہ کرنے پر وہ بیٹھ گئے۔ صدر کی پُرجوش تقریر کے بعد پرنسپل صاحب کھڑے ہوئے۔ اُن کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ذہنی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ لڑکوں کے دلوں میں ایک بار پھر خوف نے سر اُبھارا۔ وہ سانس روکے اُن کے چہرے کو تکنے لگے۔ قدرے توقف کے بعد وہ کہنے لگے ـــــ

"معزز ساتھیو اور پیارے طالب علمو! کالج کے تمام طلباء مجھے اُتنے ہی عزیز ہیں جتنے میرے اپنے بچے! اِس کا اندازہ شاید آپ لوگ نہ لگا سکیں۔ میں آپ کی اور کالج کی فلاح کے لئے ہمیشہ کی طرح آج بھی سرگرداں ہوں۔ مجھے رنج ہے کہ کالج کی قدیم روایت کے بموجب آج کے مسئلہ پر میرا کوئی اختیار نہ رہا۔ میں موقعِ واردات پر موجود کبھی نہ تھا اِس لئے مجھے نہیں معلوم حقیقت کیا ہے۔ پروفیسر سلطنت کا فیصلہ ہی ہمارے لئے آخری فیصلہ ہوگا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اُنھوں نے اطلاع بھیجی ہے کہ کسی ضروری کام کی وجہ سے وہ کالج نہ آسکیں گی۔ یہ لفافہ جو آپ لوگ میرے ہاتھوں میں دیکھ رہے ہیں، اُنھیں کا بھیجا ہُوا ہے۔ اِس میں اُن کا فیصلہ بند ہے۔ میں اِسے کھول کر آپ کے سامنے پڑھوں گا۔ خُدا آپ کی مدد کرے!"

لڑکوں کے مُنہ حیرت سے کھُلے رہ گئے۔ استعجاب سے اُن کی آنکھیں اِتنی پھٹی ہوئی تھیں کہ اگر کوئی ایک لمحہ کو اُن کی طرف دیکھتا تو اُن کے چہروں پر آنکھوں کے سوا شاید کچھ اور نظر نہ آتا! پرنسپل صاحب فیصلہ پڑھ چکے تھے۔ ہر طرف ایک شور مچا ہُوا تھا۔ ہر کوئی ایک دُوسرے سے خود سُنی ہوئی بات کی تصدیق یوں کر رہا تھا جیسے اُسے اپنے کانوں پر یقین نہ ہو کیونکہ جو مراسلہ ابھی پرنسپل صاحب نے پڑھ کر سُنایا تھا وہ شہزاد کا رسٹیکیشن آرڈر نہیں، پروفیسر سلطنت کا استعفیٰ تھا ـــــ!!

غزل

محمد عثمان عارف نقشبندی ایم۔ اے، ایل ایل بی ممبر پارلیمنٹ

ہونے دیا نہ موت کا احساس بھی مجھے
کس طرح تو نے مار دیا زندگی مجھے

رویا ہوں پھوٹ پھوٹ کے شبنم کے حال پر
گل مسکرا دئے تو ہنسی آ گئی مجھے

کھویا ہوا تھا اس کے تصور میں اے جہاں!
کس وقت تیرے غم نے بھی آواز دی مجھے

دل درد مند، آنکھ میں آنسو، جگر میں سوز
کن منزلوں میں چھوڑ گئی زندگی مجھے

کیا منہ دکھاؤں گا ترے ناز و ادا کو میں
آنے لگا ہے راس غمِ زندگی مجھے

جب سے فریب تیرے تبسم کا کھل گیا
گزری ہے ناگوار گلوں کی ہنسی مجھے

ساقی کی چشمِ مست کا اعجاز دیکھنا
ملتا ہے بیخودی میں سرورِ خودی مجھے

تیرا خیال راہ دکھاتا چلا گیا
تاریکیوں میں ملتی رہی روشنی مجھے

اشکوں سے آج بھر گیا پیمانۂ حیات
ظالم ڈبو گئی تری دریا دلی مجھے

عارف اس انجمن کا سماں کچھ نہ پوچھئے
کچھ ہوش کی سی بات تھی کچھ بیخودی مجھے

۴۷۔ نارتھ ایوینیو، نئی دہلی

بیسویں صدی دہلی ستمبر ۱۹۷۲ء

قطعات

پروفیسر بیتاب پیلی بھیتی ایم۔ کام (علیگ)

ہے ترا حسن بھی کچھ ایسا ہی لہکا لہکا
جیسے پھولوں سے چمن ہوتا ہے مہکا مہکا
جو نظر ملتی ہے تجھ سے وہ مچل جاتی ہے
جو قدم اٹھتا ہے پڑتا ہے وہ بہکا بہکا

چاند کا ٹکڑا ہو جیسے کہ یہ چہرہ تیرا
حسن ہی حسن ہو جیسے رخِ زیبا تیرا
رات دن میری نگاہوں میں بسا رہتا ہے
اے مری جانِ چمن پھول سا مکھڑا تیرا

پھول سے تیرے تر و تازہ شہابی رخسار
یہ کنول آنکھوں کے یہ تیری جبینِ انوار
یہ ترے کاکلِ خمدار یہ شادابیٔ لب ۴۱
جیسے پر کیف بہاروں میں شگفتہ گلزار

یہ جوانی یہ ترا روپ ترا حسن و شباب
جیسے شاداب مہکتا ہوا خوش رنگ گلاب
اب یقیں ہو گیا ہے تیرا ہی اک عکسِ جمیل
چودھویں شب کا دمکتا ہوا روشن مہتاب

...دلِ بیتاب کی بات

رفیعہ شبنم عابدی ایم۔ اے، بی۔ ایڈ

۱۲/۱۷۰۔ باڑہ امام روڈ، بمبئی نمبر۳

محترمی! تسلیمات

۱۹۷۲ء کی آخری رات دَم توڑ رہی ہے اور نئے سال کی گھڑیاں بانہیں پھیلائے آگے بڑھتی آرہی ہیں۔ جاتے ہوئے سال کو رخصت کرتے وقت دل میں عجیب سے جذبات ہیں۔ گذشتہ سال ہم نے کیا کھویا، کیا پایا؟ اِس کا حساب لگانا تو ناممکن ہے۔ بہرحال یہ احساس ہی کیا کم ہے کہ نسلِ انسانی نے ترقی کی ایک اور منزل طے کرلی۔ ذہنِ آدم نے سائنس کے راستے میں ایک سنگِ میل اور عبور کرلیا۔ وحشت و بربریت نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اقتدار کے خریداروں اور اجارہ داروں کو وقت نے ایک اور موقع دیا۔ جبر و استبداد کو ایک اور ہتھیار ہاتھ آیا اور حق و انصاف کے احساس نے ایک اور کروٹ لی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ۷۳ء ہمیں کیا دیتا ہے۔ نئے سال کی پہلی فرصت میں آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ اِس اُمید پر کہ یہ سلسلہ سارا سال چلتا رہے گا۔ ورنہ مصروفیت کا یہ عالم ہے کہ آج تقریباً دو سال بعد "بیسویں صدی" کی بزم میں شریک ہونے کا موقع ملا ہے۔ لیکن پھر بھی فخر محسوس کر رہی ہوں۔ یہ سوچ کر کہ —— اِن دو سالوں میں نہ آپ نے مجھے بُھلایا اور نہ قارئین نے —— آپ باقاعدگی سے "بیسویں صدی" بھجواتے رہے اور قارئین برابر خط لکھتے رہے۔ صرف خط ہی نہیں لکھتے رہے، اصرار کرتے رہے اور اُنھیں کے پُرخلوص اصرار کے باعث آج یہ حوصلہ ہُوا ہے۔ ایک "دلِ بیتاب کی بات" ارسال کر رہی ہوں۔ افسانے کے متعلق اِس کے سوا کچھ نہ کہوں گی کہ مجھے اپنے افسانے کی شاذیہ سے ہمدردی ہے۔ نہ جانے کیوں؟ شاید اِس لئے کہ اُس کی زندگی اِن دو شعروں کی ترجمان ہے ؎

بے بسی ایسی کہ اظہارِ تمنّا مشکل
کتنے بے رحم ہیں، سفّاک ہیں ایّامِ حیات
نغمۂ گیت میں شامل ہے غمِ دہر کا سوز
لب پہ آنے بھی نہ پائی دلِ بیتاب کی بات

اور قارئین تو شاید اِس افسانے کے تینوں کرداروں سے ہمدردی کریں —— بہرحال افسانہ کی رسید اور رائے سے مُطّلع فرمائیے۔ نئے سال کی میری پہلی دُعا یہی ہے کہ خُدا آپ کو اُردو اور

اُردو والوں کے لئے زندہ و سلامت رکھے اور ایسے ہزاروں سال آپ کو دکھائے۔ آمین! ——
سالنامہ نظر سے گزرا۔ ماشاءاللہ

سو حسن کروں پیدا ایک ایک تمنا ہے!

یہ کام آپ ہی کا ہے۔ کرشن چندر، رام لعل، پشکر ناتھ، مہندر ناتھ، کوثر چاند پوری حسبِ معمول خوب ہیں۔ لیکن اس سالنامے کی خاص بات جو ہے وہ یہ کہ تمام خواتین افسانہ نگاروں کے افسانے بہت اچھے ہیں . . .

مخلص

رفیعہ شبنم عابدی

★

شام تاریک ہے!!

اور دُور پہاڑی کا منظر بہت خوبصورت اور دلآویز ہو گیا ہے۔ میرے سامنے کینوس پڑا ہے اور آس پاس رنگ کے بے شمار ٹیوبس ہیں۔ ایک ادھوری سی تصویر کینوس پر اُبھر آئی ہے۔ نہ جانے یہ کس کی تصویر ہے؟ نہ جانے یہ کس کے ارمان ہیں جو پورے نہ ہو سکے۔ نہ جانے . . . نہ جانے یہ کون ہے جو بار بار میرے برش سے سر اُبھار کر مجھ پر طنز کر رہا ہے۔ چاہتے ہوئے بھی میں یہ تصویر پوری نہیں کر سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ تصویر ساری زندگی ادھوری رہے گی، میری تمناؤں اور آرزوؤں کی طرح جو پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکیں۔ جن میں میں نے نہ جانے کیسے کیسے رنگ بھرنا چاہے۔ لیکن آسمان پر پھیلے ہوئے اس قوسِ قزح کی طرح اُن رنگین تمناؤں پر بھی سفیدی پھر گئی اور اُس سفیدی پر ناکامی نے اپنی سیاہ مُہر لگا دی۔ یہی سیاہی اب میرا مقدر بن چکی ہے۔ کیوں نہ ہو۔ سیاہ رنگ مجھے پسند بھی تو ہے۔ آخر یہ تمھاری آنکھوں کا رنگ ہے شاذی! میں اِسے کیونکر نہ چاہوں۔ اِس سیاہی میں مجھے تمھاری آنکھوں کا عکس نظر آتا ہے۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، جن پر لمبی گھنی پلکوں نے سایہ کر دیا تھا۔ وہ آنکھیں جو مجھے دیکھتے ہی مُسکرا دیا کرتی تھیں، جن میں شرارت ناچنے لگتی تھی اور پھر دھیرے دھیرے تمھارا چنچل، شوخ پیکر سامنے آجاتا تھا۔

عشرت باجی کی شادی تھی اور مہمانوں کی ریل پیل میں کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ برات آنے والی تھی اور ہم سب دُولھا اور براتیوں کے استقبال کے لئے شاندار تیاری میں مصروف تھے۔ اجنبی بستی اور شادی کا گھر۔ کوئی کہاں تک کسی کا خیال رکھتا۔ میں نے سوٹ کیس کھولا۔ شرٹ اور پینٹ پہن کر ٹائی تلاش کرنے لگا۔ لیکن ٹائی کی تلاش کسی آتش فشاں علاقے کی سرزمین سے کم نہ تھی۔ اُس پر آئرن ضروری تھی۔ سوٹ سے میل کھاتی ہوئی یہی ایک ٹائی میرے پاس تھی۔ اِستری کا کہیں پتہ نہ تھا۔ سارے مرد تیار ہو کر بیٹھک میں جا چکے تھے اور مجھے دیر ہو رہی تھی۔ عورتیں کاموں میں لگی ہوئی تھیں۔ نوجوان لڑکیوں کے دلکش قہقہے اب بھی دُولھن کے کمرے سے آ رہے تھے۔ ہر لڑکی کی آنکھوں سے سُرور و انبساط کی شراب چھلک رہی تھی۔ موقع غنیمت جان کر میں نے سامنے زنان خانے میں قدم رکھ ہی دیا۔ نہ جانے یہ کس کا کمرہ تھا۔ مختصر سا۔ لیکن سلیقے سے سجا ہُوا۔ ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ چھوٹی سی پلائی وُڈ کی میز پر ایک ریک رکھا تھا جس میں کتابیں چُنی ہوئی تھیں۔ ایک رائیٹنگ پیڈ، قلم اور دوات پاس ہی رکھے تھے۔ میز کے قریب ہی اسٹینڈ پر اِستری رکھی تھی۔ میں نے اِستری کا پلگ لگا کر سوئچ آن کر دیا۔ اِستری گرم ہونے تک کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ دروازے کے اُوپر دیوار پر ایک بڑی سی تصویر فریم میں آویزاں تھی۔ ابھی میں تصویر کو اچھی طرح دیکھنے بھی نہ پایا تھا کہ اچانک ایک ہلکی سی کھانسی کی آواز آئی۔ پھر دبا دبا سا قہقہہ اُبھرا اور پھر دروازے پر پڑے ہوئے نیلے پردے میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے نگاہیں اُٹھائیں۔ پردے کی اوٹ سے دو آنکھیں جھانک رہی تھیں۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں! لمبی لمبی پلکیں، اُن کے اُوپر گھنے ابرُو اور پھر ایک کُشادہ پیشانی!

"نہ جانے بھائی جان نے کیسے کیسے شریف جمع کر رکھے ہیں اِس گھر میں۔ جنھیں مردانے اور زنانے کمروں کی بھی تمیز نہیں۔" ایک تیز

چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے ٹائی پر استری کرتا رہا۔

"اوہو! اِمالِ مُغت دل بے رحم ——— ایک گھنٹے سے استری چپک رہی ہے اور جناب ہیں کہ ایک ٹائی پر ابھی تک استری نہیں کر پائے ہیں!" پردے کے پیچھے سے پھر آواز آئی۔

میں نے جلدی جلدی سوئچ آف کر دیا اور ٹھنڈی ہی استری پھیرنے لگا۔

"نہ جانے کون افلاطون کی اولاد ہے۔ بھلا ٹھنڈی استری بھی کی ہے کسی نے آج تک؟"

گھبراہٹ میں میں نے پھر سوئچ آن کر دیا۔ اپنائی استری کے نیچے دبی ہوئی تھی۔

"اُفوہ ——— جنابِ عالی ذرا دیکھئے ٹائی استری کے نیچے دبی پڑی ہے کہیں جل نہ گئی ہو!"

اب وہاں ٹھہرنا میرے لئے محال تھا۔ میں نے سوئچ پھر آف کر دیا۔ استری الگ رکھ دی اور ٹائی باندھنے لگا۔

"اُفوہ ——— ذرا انداز تو دیکھئے۔ معلوم ہوتا ہے فرنگیوں کا کوئی زر خرید غلام آگیا ہو! صورت بھی کسی بلڈاگ سے کم نہیں!" آواز پھر آئی۔ آخری جملہ میرے لئے زہر سے کم نہ تھا۔

"یہ کون سی بلی پردے کے پیچھے سے میاؤں میاؤں کر رہی ہے؟" میں نے کہا۔ ایک لمحے کے لئے ہنسی دب کر رہ گئی۔ لیکن پھر فوراً ہی جواب مِلا۔

"گھر میں گھسنے والے چوہے پر ترس آگیا ہے ورنہ اب تک اندر آ گئی ہوتی۔"

"نہیں حضور! ہم تو بلڈاگ ہیں۔ اب تو آ جائیے۔ گھبرائیے نہیں!" میں نے بھی تُرکی بہ تُرکی جواب دیا۔

اچانک پردہ اُٹھ گیا اور میری نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ جیسے آنکھوں کے سامنے بجلی کوند گئی ہو۔ سامنے وہی قیامت کھڑی تھی! آنکھوں سے انتہائی شرارت ٹپک رہی تھی۔ ہونٹوں پر مضحکہ خیز ہنسی اور چہرے پر عجیب سی چمک۔ ایک لمحے کے لئے ذہن کے کسی گوشہ میں سوئی ہوئی یادیں جاگ اُٹھیں۔

ماضی کی پرچھائیاں اُبھرنے لگیں۔ تصوّرات کے دُھندلے اور مدّھم پیکر واضح سے واضح تر ہوتے چلے گئے اور بے ساختہ میری زبان سے نِکل گیا۔

"شا... شا... شاذی تم!"

"ج... جی ہاں!" ایک لمحے کے لئے شرارت سے بھرپور آنکھوں پر شرم نے اپنا سایہ کر لیا۔ غلافی پلکوں کی جھالریں اور وسیع ہو گئیں۔ اور چمپئی چہرے پر حیا کی شمعیں جِھلملا اُٹھیں۔ اُس کی مخمور آنکھوں پہ حیا سے بوجھل پلکیں چلمن بن کر گِر گئیں۔

"مجھے یقین نہیں آتا کہ تم وہی چھوٹی سی، ننھی سی شاذی ہو جس کی گُڑیا کی چوٹی پکڑ کر میں دُور پھینک دیا کرتا تھا۔"

"اور مجھے بھی یقین نہیں آتا کہ آپ وہی احمر ہیں جِن کی ناک پہ بے شمار مکّھیاں بِھنبھنایا کرتی تھیں!"

اپنے تبسّم کی چاندنی میں نہائی ہوئی سی۔ وہ اب بھی شرارت سے باز نہ آئی۔

"بھئی شاذی! واقعی تم کافی بدل گئی ہو!"

"اور آپ بھی!"

اِتنے میں براتیوں کی آمد کا شور اُٹھا اور ناہید دُولہا دیکھنے اور دکھانے کے اشتیاق میں اُسے کوٹھے پر لے بھاگی اور یوں وہ میری نِگاہوں سے دُور ہو گئی۔ لیکن اُس ایک لمحہ میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی نامعلوم سی شئے اندر ہی اندر بہت تیزی سے میرے دل کے پار اُتر گئی ہو۔

جب سے شاذی کو دیکھا تھا میرا ذہن مفلوج سا ہو کر رہ گیا تھا۔ جی کسی طرح بہلنے ہی نہ پاتا تھا اور میرا زیادہ وقت خالہ جان ہی کے ہاں کٹتا تھا۔ یوں بھی شاذی سے دن بھر میں ایک بار تو ملاقات ہو ہی جایا کرتی تھی۔ ناہید انوار چچا کی لڑکی تھی جِن کے گھر میرا قیام تھا۔ یہاں آنے پر ملازمت تو مِل گئی تھی۔ لیکن اب تک مکان کا کوئی بندوبست نہ ہُوا تھا۔ کیونکہ دہلی اور بمبئی ——— دو ایسے شہر ہیں جہاں مکان کا مِلنا اِتنا ہی مشکل ہے جِتنا کسی غریب کی لڑکی کے لئے اچھا بَر مِلنا مُحال ہے۔ ناہید کے ڈرائنگ رُوم میں اکثر شاذی سے سامنا ہو جاتا۔ مجھے دیکھ کر وہ یوں مُنہ بناتی جیسے حلوہ کھاتے کھاتے اچانک کوئی تلخ چیز مُنہ میں آ گئی ہو۔ لیکن مجھے شاذی کی یہ ادا بھی پسند تھی۔ کیونکہ وہی میری سب کچھ تھی۔ میری سب کچھ! انہیں میری کچھ بھی نہیں! نہ جانے

کون تھی وہ میری۔ آج تک دل فیصلہ نہ کر سکا۔

اُس دن پیانو پر ایک اُداس سی دُھن چھیڑ رہا تھا کہ اچانک زینے پر کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ دھپ دھپ دھپ!! میں چونک سا گیا۔ چاپ میرے کمرے کی طرف بڑھتی جا رہی تھی اور جس وقت میں نے Finishing Touch کو Tune کر دیا دروازہ زوروں سے کھلا اور شاذی دندناتی ہوئی میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔ پیانو پر جھکتے ہوئے ایک تحکمانہ اور سرپرستانہ انداز میں مجھ سے پوچھا۔

"کیوں جی، کل شام کناٹ پلیس پہ کسے بے وقوف بنایا جا رہا تھا؟"

"نہیں تو ــــ میں کل کناٹ پلیس گیا ہی نہیں ــــ" میں نے دروغِ مصلحت آمیز سے کام لیا۔

"اچھا تو ہم سے بھی چالیں چلنے لگے؟ اور وہ گلابی بیل باٹم میں کون محترمہ آنکھیں مٹکا مٹکا کر جناب سے محوِ گفتگو تھیں؟" وہ کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"بالکل غلط! کل میرے ساتھ کوئی لڑکی تھی ہی نہیں" میں نے جان بوجھ کر جھوٹ کا سہارا لیا۔

"اچھا تو کل آپ بالکل اکیلے گئے تھے کناٹ پلیس؟"

"ہاں۔ بالکل اکیلے! یہاں تک کہ سایہ بھی ساتھ نہ تھا!"

"وہ مارا ــــ" اُس نے ایک زوردار تالی بجائی جیسے چور پکڑ لیا گیا ہو۔ "پہلے تو قبول ہی نہیں کر رہے تھے کہ آپ کناٹ پلیس گئے تھے۔ خیر یہ بتایئے وہ صاحبہ کون تھیں؟"

"تمھیں اِس سے کیا۔ وہ میرے آفس کی کلرک تھی" میں نے بے پروائی جتاتے ہوئے کہا۔

"بھڑک گئے ناسیدھے؟" وہ اِس طرح مُسکرائی۔ جیسے کلیوں نے اپنی دلکش مُسکراہٹیں اُس کے ہونٹوں پر سجا دی ہوں۔ اُس نے کہا۔ "کیا میں جان سکتی ہوں اُس قیامت کا نام میرا مطلب ہے اسمِ شریف کیا ہے؟"

"شاذی ــــ زیادہ تحقیق کی ضرورت نہیں۔ وہ میری Colleague ہے۔ اِتنا ہی بتا دینا کافی ہے۔"

"اُفوہ ــــ آپ تو بگڑنے لگے۔ میرا مطلب یہ تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں اُن محترمہ کا نام نازنین ہو۔ حالانکہ وہ ــــ وہ معاف کیجیے گا۔ اُن کا بدن تن تن کے مقابلے میں کافی نازک ہے۔ ویسے بس ذرا کمر کے عرض میں خُدا نے فیاضی سے کام لیا ہے۔ اگر خُدانخواستہ اُن کا نام یاسمین ہوا تو پھر کہنا ہی کیا۔ کیونکہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یاسمین کا رنگ سفید ہوتا ہے اور اُن محترمہ کا رنگ ــــ بھئی کیا بتائیں۔ اُس وقت آسمان پر گھٹائیں چھا گئی تھیں۔ آپ نے دیکھا ہی ہوگا اور اگر اُن صاحبہ کا نام روزی . . ."

"بس بس ــــ میں تمھاری بکواس نہیں سُننا چاہتا۔ مجھے کچھ لکھنا ہے"

"اچھا ــــ آپ سے اِتنے سیریس ہو گئے؟" وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔

"شاذی ــــ!" میں تقریباً چیخ اُٹھا۔

"جی میں بہری نہیں۔ اِتنے زور سے نہ چیخیے۔ میں آپ کی آواز سُن رہی ہوں" وہ مُسکراتی ہوئی بولی۔

"شاذی ــــ! آخر تمھیں کیا مِلتا ہے اِتنا ہنگامہ برپا کرنے سے؟" میں نے تھک کر پُوچھا۔

"ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق!" وہ شاعرانہ انداز میں جھُوم جھُوم کر بولی۔

"میں تمھیں ختم کر دوں گا شاذی!" میں نے زچ ہو کر کہا۔

"سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!" وہ پھر گویا ہوئی۔

"بے وقوف!" میں دانت پیس کر رہ گیا۔

"آپ کو میرے تعارف کی ضرورت کیا ہے" وہ پھر گُنگُنائی۔

"مجھے شاعری سے قطعی دلچسپی نہیں سمجھیں!"

"دلِ مضطر کو بہلانے کی خاطر شعر کہتی ہوں"

"تمھاری اِس بکواس سے میرے سر میں درد ہو رہا ہے"

"نزاکت اِس گُلِ رعنا کی دیکھیو انشاؔ!" شاعری کا بھوت اب بھی اُس کے سر سے نہ اُترا تھا۔

"دیکھو شاذی ــــ! چپ چاپ یہاں سے چلی جاؤ ورنہ میں تمھاری چمڑی اُدھیڑ دوں گا!" میں دھاڑا۔

"سِتم سِتم پہ، جفا پہ جفا اُٹھائیں گے" وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"خدا کی قسم میں پاگل ہو جاؤں گا!" میں نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ پھر نغمہ سرا ہوئی۔

"اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں؟"

"شاذی ——! جاتی ہو یا نہیں؟" میں نے اُسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

"بنے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے" وہ پھر بولی۔ اچھا خدا حافظ —— بائی بائی!"

دُور تک اُس کی گلابی ہتھیلیاں لہراتی ہوئی نظر آئیں اور پھر وہ ناہید کے دروازہ میں جا کر غائب ہو گئی۔

عجیب لڑکی تھی یہ شاذی بھی! جب بھی آتی کسی آندھی یا طوفان کی طرح! اور دل کے سمندر میں ایک تلاطم سا بپا ہو جاتا۔ جب تک وہ میرے قریب رہتی، میں اپنی زندہ دلی، اپنی حاضر جوابی سب کچھ کھو بیٹھتا تھا۔ اُس کا شوخ و شنگ وجود مجھ پر اتنا حاوی ہو جاتا تھا کہ میں چاہتے ہوئے بھی اُس سے اپنے دل کی بات نہ کہہ سکتا تھا۔ شاذی ایک خوبصورت تتلی تھی جو بہت تیز رفتاری سے اڑتی پھرتی تھی اور اُسے پکڑ لینا میرے بس میں نہ تھا یا شاید میں ہی بزدل تھا۔ جان بوجھ کر اُس سے دُور رہنے کی کوشش کرتا۔ راشد کے ساتھ پکچر دیکھنے چلا جاتا یا پھر ناہید کو کسی نظم کا مطلب سمجھانے لگتا۔ لیکن کبھی نہ کبھی وقت، کہیں نہ کہیں سے شاذی آ ٹپکتی۔

اُس دن بھی کافی گرمی تھی۔ میں نے Fan آن کر لیا اور ٹیبل کے سامنے بیٹھا کسی افسانے کی تخلیق میں غرق تھا کہ پشت سے کسی کی آواز سُنائی دی۔

"اُفوہ ——! معلوم ہوتا ہے جہنّم کی ساری آگ اسی کمرے میں بھر دی گئی ہے!"

"تم پھر آ گئیں؟" میں نے بغیر مڑے شاذی سے پُوچھا۔

"جی حضرتِ ابلیس ——! آپ نے کچھ مجھ سے فرمایا؟"

وہ بولی۔

"ہاں ہاں تم سے!" میں نے کرسی گھماتے ہوئے کہا۔ "آخر تم لکھتے وقت ہی کیوں آتی ہو میرے کمرے میں؟"

"آپ کے کمرے میں؟" اُس کی سیاہ آنکھوں میں حیرت کے دائرے سے بننے لگے اور وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

"جنابِ عالی ——! یہ محترم احمر سرّوش کا کمرہ ہے۔ آپ جانتے ہیں اُنھیں؟"

وہ مجھ سے یوں استفسار کر رہی تھی جیسے میں کوئی اجنبی ہوں۔ یا پھر پاگل جو غلطی سے اِس کمرے کو اپنا سمجھ بیٹھا ہو۔

"آپ کیا جانیں گے اُنھیں" وہ خود ہی بولی "لٹریچر سے تو آپ کا دُور کا واسطہ نہیں اور احمر سرّوش تو لٹریچر کی دُنیا کا راجہ ہے!"

"یہ کِس سے تعارف کروا رہی ہو میرا؟" اپنی تعریف سُن کر میں مُسکرایا لیکن اُس کے چہرے پر ویسی ہی سنجیدگی طاری تھی۔

"اجی وہی احمر سرّوش —— وہ دیکھئے۔ بالکل سامنے اپنے مقابل کے آئینے میں۔ جی ہاں وہی راجستھانی اونٹ کی سی گردن والا سرّوش۔ اجی ذرا بال تو دیکھئے۔ معلوم ہوتا ہے افریقہ کا جنگل اُگا ہُوا ہے! اور وہ باریک سی آنکھوں میں آسام کا دلدل دیکھئے۔ ناک، ہمالیہ کی مونٹ ایورسٹ بھی اِس کے آگے کچھ نہیں۔ گال جیسے پامیر کا سطحِ مرتفع۔ ہونٹ، مہاراشٹر کی قحط زدہ زمین۔ کان، جیسے جاپانی پنکھے۔ قد، برما کا بانس! تو دیکھا آپ نے سروش صاحب کو؟ یہ ہے اُس کی شخصیت کا جغرافیہ" وہ بے تکان بولتی جا رہی تھی —— کیا مضحکہ خیز صورت بے غریب کی۔ کاش! وہ بھی سُہیل جیسا خوبصورت ہوتا۔"

اُس نے میرے چہرے پر نگاہیں جما دیں اور اُس کی کھوئی کھوئی آنکھوں میں عجیب سی چمک بیدار تھی۔ اُس کی آواز بھرّا سی گئی۔

"یہ سُہیل کون ہے؟" میں چونک گیا۔

"تمھیں اِس سے کیا" اچانک اُس نے سنبھل کر کہا۔ "وہ میرا کلاس فیلو ہے۔"

"وہی گلابی سُوٹ والا؟" میں نے اُسے چھیڑا۔

"جی نہیں۔ اُس کی پسند اتنی گھٹیا نہیں۔ وہ ہمیشہ سُرمئی سُوٹ پہنتا ہے۔"

"اچھا تو پھر وہی جو کل شام تمھارے ساتھ کناٹ پلیس پر گھوم رہا تھا؟" میں نے انتقاماً جرح شروع کی۔

"بالکل غلط! وہ آپ جیسا بے وقوف نہیں جو تفریح کے لئے

اِتنی غلط جگہ کا انتخاب کرے۔"

"تو پھر وہی جیسے دیکھتے ہی افریقہ کے آدم خور حبشیوں کا خیال آتا ہے؟" میں نے مضحکہ اُڑاتے ہوئے کہا۔

"احمر بھائی!" وہ چِڑ سی گئی۔ "زیادہ تحقیق کی ضرورت نہیں۔ وہ میرا کلاس فیلو ہے۔ اِتنا ہی بتا دینا کافی ہے۔" اُس نے میرا ہی جُملہ مجھے لَوٹا دیا۔

"خیر صاحب ــــ! اِتنا اور بتا دو کہ وہ تم میں کب سے دلچسپی لینے لگا؟"

"بہت دنوں سے۔" وہ اِٹھلا کر بولی۔ "اُسے میری سیاہ زُلفیں پسند ہیں۔ وہ کہتا ہے شاذی ــــ! اختر شیرانی کی طرح میری بھی ہمیشہ یہی آرزو رہی ہے کہ اپنی محبوبہ کی زُلفوں سے قطرہ قطرہ ٹپکنے والی شراب کو ایک پیالے میں جمع کروں اور پی جاؤں۔"

"پھر پی یا نہیں؟"

"جی نہیں۔ کبھی بال دھونے کے بعد اُس سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔" وہ شوخی سے بولی۔

"اچھا ہی ہُوا۔ ورنہ فراق کے شاگرد کا لطیفہ دوبارہ زندہ ہوجاتا۔" میں نے چوٹ کی۔

"جی کیا مطلب؟" وہ چونکی۔

"مطلب یہ کہ شراب کے ساتھ جوئیں بھی اُس میں شامل ہوجاتیں!" میں نے قہقہہ لگایا اور وہ جھلاّ سی گئی۔

"اِس غلط فہمی میں مُبتلا نہ رہئے۔ اُسے میری ہر چیز سے پیار ہے۔"

"بہت خوب! خوش قسمت ہو پھر تو تم۔"

"شُکریہ!" وہ اِترا کر بولی اور پھر اچانک ــ جیسے اُسے کچھ یاد آگیا۔ "وہ آپ کی گلپوش صاحبہ کیسی ہیں؟"

"دیکھو میں اِس وقت مذاق کے مُوڈ میں نہیں ہوں ــ مجھے اپنے ایک دوست کے لئے سائیکالوجی کے نوٹس تیار کرنے ہیں۔" میں نے پیچھا چُھڑاتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو لائیے نوٹس ہی ڈکٹیٹ کرادوں آپ کو۔ ہاں تو لکھئے ـــ
"Psychology is the study of woman's mind"

[illegible] گدھی! ــــ وہ woman نہیں Human [illegible]

میں نے کہا۔

"جی کیا فرمایا؟ گدھی؟ دیکھئے اتنا [illegible] میں آپ کی بہن بننا نہیں چاہتی۔"

اور اُس کی ساری شوخی میری کی [illegible] موٹی، لمبی چوٹی میرے مضبوط ہاتھوں میں تھی۔

"اُف ــــ! اُوئی! مر گئی! ہائے اللہ میری چوٹی تو چھوڑو؟" میری گرفت اور مضبوط ہوجاتی۔ لیکن ناہید نے آکے بچاؤ کرا دیا۔

"آپ بھی غضب کرتے ہیں احمر بھائی! ذرا سی شرارت تو برداشت کی جاسکتی ہے۔"

"یہ کیا برداشت کریں گے۔ اِس کے لئے تو شہیل جیسی وسیع القلبی چاہیئے۔"

شاذی کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور وہ ناہید کا سہارا لئے چُپ چاپ میرے کمرے سے جا رہی تھی۔ نہ جانے کیوں اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر دل پر ایک دھچکا سا لگا۔ جی میں آیا کہہ دوں۔

"شاذی ــــ! خُدا کے لئے اِن آنسوؤں کو پونچھ لو۔ تمہاری پلکوں کی جھالروں میں ٹکے ہوئے یہ موتی بہت قیمتی ہیں اور میں بہت غریب آدمی ہوں شاذی ــــ! اپنا یہ خزانہ یوں نہ لُٹاؤ میری جان!"

لیکن میں نے حسبِ معمول کچھ نہ کہا اور شاذی اور ناہید کے اُبھرتے ڈُوبتے پیکر شام کے دُھندلکوں میں مجھ سے دُور ہوگئے۔ اور دل پھر اُداسیوں کے سمندر میں ہچکولے کھانے لگا۔ میں سوچنے لگا واقعی مجھے شاذی کی شرارتوں کو برداشت کر لینا چاہیئے تھا۔ لیکن ــــ "یہ کیا برداشت کریں گے۔ اِس کے لئے تو شہیل کی سی وسیع القلبی چاہیئے!"

شاذی کا یہ جُملہ پھر میرے کانوں سے ٹکرایا اور میرے دل میں آگ سی لگ گئی۔ شہیل ــــ شہیل ــــ شہیل ــــ شہیل میرے لئے ایک مُستقل اُلجھن بن گیا تھا۔ میں اُسے جانتا نہ تھا۔ لیکن غائبانہ طور پر کافی متعارف ہوچکا تھا۔ پھر بھی اُسے [illegible]

دیکھنے کا شوق تھا۔ آخر سُہیل میں کون سی کشش ہے جس نے شاذی کو اپنی طرف کھینچ رکھا ہے۔ آخر مجھ میں سُہیل کے مقابلے میں ایسی کون سی کمی ہے جو شاذی کو مجھ سے دُور کئے ہوتے ہے؟ میں سُہیل سے ملنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ بات میں شاذی سے کیسے کہتا۔ پھر بھی حُسنِ اتفاق سے اُس سے ملاقات ہو گئی۔ ناہید اور شاذی بھی ساتھ تھیں۔ شاذی نے خود ہی میرا تعارف اُس سے کرایا۔

دُوسرے دن آتے ہی پہلا سوال اُس نے مجھ سے یہی کیا۔۔۔

"کیسے پسند آیا آپ کو سُہیل؟"

"ہاں بس ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک نہ کہیئے۔ یہ خواہ مخواہ کی بُغاشش اچھی نہیں۔ وہ بہت حسین ہے!"

"یوں ہی سہی۔"

"اور بہت ہی بااخلاق!"

"بجا ہے۔"

"بہت ہی خوش مزاج ہے!"

"بالکل دُرست۔"

"اسمارٹ بھی!"

"صحیح کہا۔"

"اور جذباتی بھی!"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔"

"آج صبح مجھ سے کہہ رہا تھا تمھارے کزن ہیں تو سیدھے سادے۔ صُورت بھی بُری نہیں۔ بس ذرا ناک پکوڑا ہے اور دانت لمبے ہیں۔ بال زیادہ لمبے نہیں۔ لیکن آخر انھیں 'خواجہ گیسُو دراز' بننے کی کیا ضرورت تھی! اور ہاں احمر سرُوش وہی ہیں؟ میں نے اُن کی دو تین نظمیں پڑھی ہیں۔ اچھا کہہ لیتے ہیں۔ بس ذرا اصلاح کی ضرورت ہے۔ اگر شائع کروانے سے پہلے مجھے دکھا دیا کریں تو شاید اس کی بھی ضرورت نہ رہے گی۔"

"لیکن مجھے ذرا بھی پسند نہیں آیا تمھارا سُہیل!"

"پسند اپنی اپنی۔ ویسے وہ مجھ سے یہی کہہ رہا تھا کہ شاذی! کل تم نے کس وحشی سے مِلا دیا۔ میں نے چڑیا گھر دیکھا ضرور ہے لیکن خُدا کی قسم اِتنا خوبصورت جانور آج تک نہیں دیکھا۔۔۔!"

اور پھر وہ ہنستے ہوئے مجھے پریشان چھوڑ کر چلی گئی۔ رات دیر تک مجھے نیند نہ آئی۔ آخر ناہید کے کمرے میں روشنی دیکھ کر وہاں چلا گیا اور اُس کے پاس سے ایک ناول لے کر پڑھنے لگا۔ صبح دیر تک سوتا رہا۔ کسی کے جھنجھوڑنے پر آنکھ کھولی تو شاذی اور ناہید کو سامنے پایا۔

"بہت دیر تک سوتے رہے آپ؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

ناہید نے پُوچھا۔ میں نے کچھ جواب نہ دیا۔

کیونکہ شاذی کو بے موقع یہاں دیکھ کر میں کچھ حیران سا تھا۔

"تم اور اِس وقت؟ کالج نہیں گئیں؟"

"شاذی نے کالج چھوڑ دیا۔" ناہید نے جواب دیا۔

"کالج چھوڑ دیا؟" مجھ پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ آخر کیوں؟"

"امّی جان سے پُوچھیئے۔ جنھیں دقیانوس کی پرستش سے فرصت نہیں ملتی۔"

نہا دھو کر سب سے پہلے میں خالہ جان کے پاس پہنچا۔ لیکن اُن کے پاس میرے سارے سوالوں کا ایک ہی جواب تھا۔

"شاذی اب سیانی ہو گئی ہے اور میں جلد از جلد اُس کے ہاتھ پیلے کر دینا چاہتی ہوں۔"

میرے ہونٹوں پر مُسکراہٹ سی دَوڑ گئی۔ لیکن فوراً ہی ایک نامعلوم خوف نے مجھے گھیر لیا۔

"کہیں سے بات آئی ہے کیا؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پُوچھا۔

"ہاں پیغام تو کئی آئے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ احتشام صاحب کے لڑکے کا رشتہ بہتر رہے گا۔"

"لیکن خالہ جان! آپ نے شاذی کی مرضی بھی تو معلوم کی ہوتی۔"

"لڑکی کی مرضی کا کیا سوال ہے بیٹا! میں جو بھی کروں گی اُسے منظور کرنا ہی پڑے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے خالہ جان! لیکن دیکھئے نا یہ نیا زمانہ ہے اور شاذی پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ ہو سکتا ہے اُسے کوئی لڑکا پسند۔۔۔"

"تم کیا بک رہے ہو۔ میری شاذی ایسا نہیں کر سکتی اور اگر ایسی بات ہے تو پھر تم ہی پُوچھ لو اُس سے وہ تم سے کافی بے تکلف ہے۔۔۔"

خالہ جان یہ کہہ کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئیں۔ لیکن مجھ پہ

ایسا ہوا کہ وہ کٹ پڑا۔ آخر شاذی سے کیا پوچھیں؟ کیا شاذی اپنی پسند کے متعلق بتلائے گی؟ لیکن شاذی کی پسند تو میں خود ہی جانتا ہوں۔ وہ شہیل کو چاہتی ہے۔ شہیل اُس کا کلاس فیلو۔ ایک امیر باپ کا خوبصورت بیٹا۔ لیکن . . . لیکن . . . اس کے آگے میں سوچ نہ سکا اور چپ چاپ شاذی کے پاس چلا آیا۔ وہ کسی سوچ میں غرق تھی۔ اُس کی پلکوں پر خلافِ معمول کچھ آنسو تھے۔

"شاذی ——— کیا شہیل کی طرف سے کوئی نہیں آیا؟"

اُس نے اِنکار میں گردن ہلا دی۔

"میں جانتا ہوں تمھیں اُس کا انتظار ہے۔ ویسے اُمیدواروں کی لسٹ تو کافی لمبی ہے۔ اختر، پرویز، جمشید، ندیم، اقبال اور پتہ نہیں کون کون۔ لیکن سُنا ہے محترمہ نے اب تک کسی کے لئے ہاں نہیں بھری۔"

وہ خاموش رہی۔

"اچھا کل شہیل سے ملنے کی کوشش کروں گا۔"

"آپ کو اِس مہربانی کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے آپ کا احسان نہیں چاہیئے۔" اُس کی تیوریاں چڑھ گئیں اور پھر وہ سسکنے لگی۔

"اوہو ——— ! تم تو رونے لگیں۔ یہ کیا کوئی اور لڑکا نظر میں ہے؟"

"جی . . . جی میں . . ."

"ہاں ہاں کہو۔ میں ہر طرح سے تمھاری مدد کرنے کو تیار ہوں۔"

"جی میں چاہتی ہوں کہ وہ . . . وہ . . ."

"ہاں ہاں وہ کون؟"

"جی وہ . . . وہ . . ."

"وہ وہ کیا لگا رکھی ہے۔ آخر نام تو بتاؤ۔"

لیکن اِس سے پہلے کہ وہ کسی کا نام بتاتی ناہید کمرے میں داخل ہوئی اور اُس کے کندھوں پر سر رکھ کے زار و قطار رونے لگی۔ میں چپ چاپ وہاں سے کھسک آیا۔

لیکن آہ ——— پانچ دنوں کے بعد جب اُس کے کمرے میں قدم رکھ رہا ہوں تو ایک عجیب سا احساس میری رگ رگ میں دوڑ رہا ہے۔ شاذی کے کھنکتے ہوئے قہقہے میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ اُس کی شوخ اور شریر پرچھائیاں چاروں طرف سے مجھے گھیر رہی ہیں اور اُس کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سوئے ہوئے چہرے کو دیکھ کر میں نہ جانے کِس سوچ میں غرق ہو گیا ہوں۔ پانچ دن پہلے کی بات ہے جب ناہید کے ذریعے شاذی کی مرضی معلوم کر کے میں نے شہیل تک شاذی کی بات پہنچائی تھی اور اُسے پیغام دینے کے لئے کسی نہ کسی طرح اُس کے ماں باپ کو بھی اُس کی رضامندی پر مجبور کر لیا تھا۔ وہ دن میری زندگی کا سب سے اُداس دن تھا۔ کچھ عجیب سے جذبات نے مجھے گھیر رکھا تھا۔ شاذی ——— ! جسے میں اپنا سب کچھ سمجھتا تھا میں نے خود اپنے ہاتھوں سے شہیل کے حوالے کر دی تھی۔ اُس رات مجھے ایک لمحے کے لئے بھی نیند نہ آئی۔ کانٹوں کے بستر پر کروٹیں لیتے لیتے انتقام کی آگ میرے دل میں بھڑک اُٹھی تھی۔ نفرت کے شعلوں نے میرے دل کو جکڑ رکھا تھا اور اُس رات میں نے اپنی زندگی کا ایک اہم فیصلہ کر لیا ——— دوسرے دن وہ فیصلہ سب کے سامنے تھا۔ میں ناہید سے شادی کر رہا تھا۔ ابھی کل ہی تو میری شادی ہوئی تھی۔ رات ناہید میرے پہلو میں دُولھن بنی مسکرا رہی تھی اور میرا شکست خوردہ دل یک گونہ اطمینان سا محسوس کر رہا تھا کہ اچانک مہمانوں کی بھیڑ میں مجھے شاذی نظر آئی تھی۔ میں نے پہلی بار اُسے پوری سنجیدگی

کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی ہم دونوں کے پاس آئی تھی اور بہت گرمجوشی سے مبارکباد دیتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"میں چاہتی ہوں میری زندگی کی ساری خوشیاں آپ دونوں کو مل جائیں۔"

اور پھر وہ کچھ کہے بغیر واپس چلی گئی۔

"شازی! ذرا رکو تو۔ بیٹھو گی نہیں؟" میں نے اسے پکارا تھا تو وہ پلٹ کر صرف اتنا بول سکی تھی۔

"اب چلوں گی۔ بہت تھک گئی ہوں۔ سونا چاہتی ہوں!" اور پھر اس کی آواز بھیڑ میں گم ہو گئی تھی۔ لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ شازی اتنی جلدی سو جائے گی اور وہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے! رات کی رات نہ جانے اس پر کیا بوجھ پڑ گیا کہ وہ برداشت نہ کر سکی اور اپنی پریشانیوں کو یوں سلجھا لیا۔ آج پانچ دنوں کے بعد جب اس کے کنوارے ارمانوں کو دفن کر کے گھر پہنچا ہوں تو رات بہت بھیانک نظر آ رہی ہے۔ آنکھوں سے نیند کوسوں دور ہے۔ وقت گزارنے اور دل کا بوجھ کم کرنے کے لئے میں ناہید سے باتیں کرنے لگا ہوں۔ ناہید جو شازی کی دوست تھی، اس کی ہمراز تھی۔ ناہید جو اتنی دیر سے چپ چپ اور خاموش خاموش سی تھی، اچانک میری باہوں پر سر رکھے رکھے اس نے ایک عجیب سا انکشاف کیا ہے اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میرا سارا جسم مفلوج سا ہو کر رہ گیا ہو۔ صرف میری آنکھیں باقی ہیں جن سے میں شازی کو دیکھ رہا ہوں اور میرے کان باقی ہیں جن سے میں ناہید کی آواز سن رہا ہوں اور ناہید کہہ رہی ہے ——

"ایک بات بتاؤں آپ کو۔ شازی آپ کو بہت چاہتی تھی۔ لیکن وہ خود کبھی اظہار نہ کر سکی۔ حالانکہ وہ آپ پر جان . . ."

"لیکن سہیل؟" بے ساختہ میری زبان سے نکل جاتا ہے۔

"سہیل تو محض ایک افسانوی کردار تھا۔ وہ سہیل کا نام لے کر آپ کے جذبات مشتعل کرنا چاہتی تھی۔ اس دن جب آپ اس کے پاس سے آئے تو اس نے ہاتھ جوڑ کر اور رو رو کر مجھ سے اصرار کیا کہ میں آپ کو پیغام دینے پر مجبور کر دوں۔"

"لیکن تم نے تو خود ہی بتایا تھا کہ وہ سہیل کے حق میں ہامی بھر چکی ہے۔ بتاؤ ناہید! تم نے ایسا کیوں کیا ——؟ تم نے جھوٹ کیوں بولا؟ بتاؤ۔ جواب دو ——؟"

میں تقریباً چیخ اٹھا ہوں اور ناہید کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ ناہید کانپتے ہوئے لبوں سے صرف اتنا ہی کہتی ہے۔

"میں یہ بات آپ سے کیسے کہتی جبکہ میں بھی . . . میں بھی آپ کو . . . چاہتی . . ."

اور وہ میری گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں ناہید کی اس بے بسی پر آنسو بہاؤں یا شازی کی بے کسی پر ——؟ ناہید جو میری شریکِ زندگی ہے اور شازی! جو میری شریکِ دل، میری شریکِ محبت تھی!


اسے پیجیے۔ یہ آپ کا دل موہ لیگی
یہ ذائقے دار ہے اور تیز بھی
اس اعلیٰ درجے کی چائے کا
اعلیٰ ذائقہ آپ کو ضرور پسند
آئیگا اور یہی نہیں بلکہ رچبرو
کے ہر پیکٹ سے بہت زیادہ
پیالیاں بھی حاصل ہونگی
صرف پیکٹوں میں بند چائے
بھی بہت دنوں تازہ اور
ذائقے دار رہتی ہے۔
LIPTON'S
RICHBRU
لپٹن کی
رچبرو
/72 URDU

غزل

علی احسن جلیلی ایم۔ اے

دل میں جب بھی تیری یادوں نے قدم رکھا ہے
ہنس کے زخموں نے بہاروں کا بھرم رکھا ہے

صحنِ گلزار میں بکھری ہوئی شبنم کی طرح
ہم نے بھی آنکھ کو کچھ سوچ کے نم رکھا ہے

نقشِ پا تیرے جہاں سجدہ طلب کرتے ہیں
نام اُن رہگزاروں کا حرم رکھا ہے

تیرے ہونٹوں نے پلائی مجھے پھولوں کی شراب
تیری آنکھوں نے مجھے ہوش میں کم رکھا ہے

جب کبھی برق نشیمن کی طرف آئی ہے
ہم نے یہ سمجھا کہ اُجالوں نے قدم رکھا ہے

جس کو الفاظ کا جامہ نہیں پہنا سکتا
آنکھ میں بھر کے وہ افسانۂ غم رکھا ہے

اے علی بڑھ کے مری سمت ہی رحمت آئی
اک گنہگار نے کچھ پاسِ کرم رکھا ہے

غزل

پروفیسر سید حسن سرمد ایم۔ اے

مری فغاں سے ہی ہوگا غمِ نہاں معلوم
کہیں ہے آگ جو ہوتا ہے کچھ دھواں معلوم

ہزار بار محبت کا لے لیا اقرار
غضب کہ اس پہ بھی ہوتا ہے بدگماں معلوم

خبر نہیں مرے شکووں کا کیا اثر ہوگا
وہ گفتگو سے تو ہوتا ہے مہرباں معلوم

کہیں کہیں سے سنا ہے تو سوچ میں کچھ ہیں
ابھی ہے حال مرا اُن کو سب کہاں معلوم

بیاں کیا ہو مصیبت کہ اُن کو ہوتی ہے
مرے غموں کی حقیقت بھی داستاں معلوم

غموں کے سہنے سے دل اس قدر ہوا نازک
ذرا سا رنج بھی ہوتا ہے اب گراں معلوم

یاد آتا ہے تو۔۔۔؟

اکرام جاوید بی۔ کام

۱۶-۲-۲-۷۲/۳/۲ چنچل گوڑہ۔ حیدرآباد۔ ۵۰۰۰۲۴

عزیز القدر خوشتر بھائی! تسلیم

"بیسویں صدی" ہر ماہ بپابندی سے ملتا اور آپ کی صحت و سلامتی اور اردو زبان اور اس کے ادب کے لئے آپ کے پُرخلوص جذبات اور گرانقدر خدمات کا احساس دلاتا رہا ہے۔ اپنی طویل خاموشی کا مجھے احساس بھی ہے اور افسوس بھی۔ آپ سے اور "بیسویں صدی" سے میری وابستگی برس دو برس کا قصہ نہیں پورے اٹھارہ سال کی بات ہے! ـــــ میری طویل خاموشی سے آپ بدگمان نہ ہوں، میں آپ کے خیال سے کبھی غافل نہیں رہا ہوں۔ ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۲ء تک کا زمانہ سخت صبر آزما تجربات ہوش و حواس کا زمانہ تھا۔ نظاروں نے حیران کر دیا ہے۔ چشم تر چشم حیران بنی محوِ دید رہی۔ سلسلۂ نظر اب تک دراز ہے۔ "خاموشی" شاید میرے لئے ناگزیر تھی! ـــــ میں نے اس تمام عرصے میں بہت کم لکھا ہے۔ چند افسانے اور دو ناول۔ اس سال شاید افسانوں کے مجموعے اور ناول شائع ہو جائیں گے ـــــ میرے احباب نے نہ جانے میری طویل خاموشی کا کیا مطلب لیا ہے۔ میں آپ کی وساطت سے اپنے ادیب و شاعر دوستوں اور پُرخلوص قارئین سے تجدید تعلق کا آرزومند ہوں ـــــ "بیسویں صدی" کے لئے ایک تازہ افسانہ ارسال کر رہا ہوں۔ یہ میری طویل غیر حاضری کی تلافی نہ کر سکے تو بھی "تحفۂ برگِ سبز" ضرور ثابت ہوگا۔ ادارۂ "بیسویں صدی" سے وابستہ احباب سے میرا سلام فرما دیجئے۔

خیریت نامے کا منتظر

اکرام جاوید

★

ایک زوردار دھماکہ روح کی گہرائیوں میں گونج اٹھا ہے۔ فضائے دل تھرتھرا رہی ہے۔ کائنات نظر دھواں دھواں ہو گئی ہے۔ آسمان شق ہو گیا ہے۔ زمین جگہ جگہ سے پھٹ رہی ہے۔ ان ویرانیوں میں دم بخود سا رہ گیا ہوں۔

اگست کی تیسری صبح کتنی طوفانی ہے۔ کتنے خوابیدہ آتش فشاں جاگ اٹھے ہیں۔ حیران ہوں۔ یقین نہیں آتا۔ وہ جو کبھی لوٹ کر نہ آنے والے تھے وہ کیسے آ گئے؟ وہ۔ میری کھوئی ہوئی خوشی۔ خیالوں کی جنّت۔ میری روح کا اُجالا۔ وہ جو ایک بھولی ہوئی کہانی ہے۔ ایک خواب ہے۔ وہ اب پھر حقیقت بن رہی ہے۔ وہ جن کا آنا بیتے ہوئے وقت کے لوٹ آنے کی طرح محال تھا اب میرے شہر میں آ گئی ہے۔

میرے کانوں میں کال کی آواز گونج رہی ہے۔

"پرویز! سُنا تم نے۔ یاسمین امریکہ سے آئی ہے۔ اپنے شوہر

...مجھے خاک ہو... آج میرے ہاں آئے گی۔ تم اگر چاہو تو ——— !" وہ
مسکرا کر کہتا ہے۔ "ہاں کوئی مضائقہ نہیں۔ تم آجاؤ۔ میرا مکان تو
تمہیں معلوم ہے لیکن ——— " وہ کچھ اُلجھ سا جاتا ہے۔ "اس سے مل کر
اُداس نہ ہونے کا وعدہ کرو تو مجھے خوشی ہوگی!"

میں چونک جاتا ہوں۔

میں اِن منزلوں سے آگے نکل چکا ہوں دوست۔ بہت آگے!
دل کو ہر طلب اور ہر تمنّا سے بے نیاز ہوئے مُدّت گزری۔ زمانہ ہُوا
کہ رشتۂ اندوہ و مسرّت ٹوٹ گیا۔ گویائی میرے احساسات کا ساتھ
نہیں دے رہی ہے۔ بہت مشکل سے خود اپنے لئے بھی اجنبی لہجے میں
کہتا ہوں۔

"وعدہ تو نہیں کر سکتا۔ آ گیا تو آجاؤں گا۔ تم انتظار نہ کرنا۔"
اور کمال چلا جاتا ہے۔

اسٹوری ڈیپارٹمنٹ کی اُداس خاموش فضا میں سارا دن بند رہا
ہوں۔ کیبن ایک قفس بن گیا ہے۔ کون آیا؟ کون گیا؟ کس نے کیا کہا؟
کچھ یاد نہیں۔ فلم والوں کو کہانی جلد از جلد چاہیئے۔ میں آج کچھ بھی کام
نہیں کر سکا ہوں۔ خیالوں کی دھندلائی ہوئی کائنات میں پرچھائیں
کی طرح رینگتے ہوئے دن گزرا۔ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ بنا پنکھ اُڑے
پنچھی۔ اُڑ کے جائے تو کہاں جائے؟ میں ایک باغی وجود جس نے
ہر بلندی و پستی کو ٹھکرا دیا۔ اپنے اطراف منڈلانے والے ہر دائرے،
ہر قوس اور ہر حصار کو توڑ دیا۔ ایسے ناقابلِ برداشت اور ناقابلِ
قبول وجود کو لے کر میں کہاں جاؤں؟

داستان کب شروع ہوئی، کچھ یاد نہیں۔ کہاں ختم ہوئی، کچھ
خیال نہیں۔ ایک زمانہ تھا جب میں بڑے چاؤ سے ارمانوں کے تنکے
چُنا کرتا۔ خوابوں کے نشیمن تعمیر کرتا۔ ناتراشیدہ بُت تراشا کرتا۔
کائنات کی ہر شئے کو خود سے متعلّق اور وابستہ سمجھتا تھا۔ ذرّہ ذرّہ میں
مجھے اپنی تمنّا بکھری ملتی۔ قدم قدم پہ آرزو منتظر ہوتی۔ ہر نفس ایک
نئی زندگی، ہر لمحہ ایک قفس نادرہ۔ میں اسیرِ حُسنِ جہاں ابھی بجلی اور
نشیمن کے رشتے سے ناواقف تھا۔

اور آج، زندگی کی اس منزل پر میں بہت آزاد ہوں۔ بہت
بے دردی سے میں نے دل سے تمنّا کے ایک ایک نقش کو مٹایا ہے۔

جہاں آرزو کو تُندیِ آتش کیا ہے۔ اپنی ہر شے سے خود کو الگ کیا ہے۔ ہر حلقۂ زنجیر کو توڑ دیا میں نے۔ محبت کی زنجیر، رشتے ناطوں کے جال۔ پابندیٔ عہدِ وفا۔ ہاں! میں نے اپنی ہر وابستگی ختم کر دی۔ ہر تعلق کو توڑ دیا۔ پھر یہ درد سا کیوں ہوتا ہے میرے دل میں۔ سینے میں کیا چیز ہے جو ٹوٹ رہی ہے شیشے کی طرح اور جل رہی کافور کی مانند۔ غمِ نشاط خیال اتنی دھواں دھواں کیوں ہو گئی ہے؟

یاد مت آ۔ یاد نہ آ گزرے زمانے!

دُور برگد تلے بوڑھا ازلی اندھیرا اُمنگ رہا ہے۔ شعلوں میں جلتے ہوئے احساس پر ایک لطیف سی آواز کا دھواں بل کھا رہا ہے۔

پریتم آن ملو۔۔۔!

اور جو کبھی نہ ملنے کے لئے بچھڑے تھے، وہ لوٹ آئے ہیں۔ پھر بھی مجھے یقین نہیں آتا۔ کوئی میری ساری زندگی لے لے اور مجھے اس ایک بات کا یقین دلا دے کہ وہ آئے ہیں۔ آگ اور دھوئیں کے طوفانوں میں عود و عنبر کی طرح جلتے ہوئے دن گزرا۔ شام ہوئی تو اپنے گھر لوٹ آیا ہوں۔ بیوی۔ بچے۔ دنیا۔ مسائل اور مطالبات۔ گرد آلود شور ——— ہاں! میں آج زندگی میں پہلی بار تھک گیا ہوں۔ بہت تھک گیا ہوں۔ وفا شعار بیوی۔ پیارے معصوم بچو! آج میں اتنا لطیف نہیں رہا کہ باآسانی تم سے گزر جاؤں۔ بند ہر دل دامن گیر ہے۔ قدم ٹوٹی ہوئی زنجیروں میں اُلجھ رہے ہیں۔ آج چھ سال بعد ایک بار اور میں خود کو پھر ایک ٹوٹی ہوئی شاخ اور جلا ہوا آشیانہ محسوس کر رہا ہوں۔ ہائے وہ پیار کے دن۔ وہ ٹوٹے تعلقات ——!

کتنی ستم گر ہے یہ رات! آج کی رات! ایک منقسم اکائی کے دو ٹکڑے مشرق اور مغرب سے سمٹ کر آج کی رات ایک شہر میں ایک نقطہ پر کھنچ آئے ہیں۔ لیکن فاصلہ اب بھی درمیان ہے۔ فاصلہ وقت کا۔ بیوی، بچوں اور شوہر کی موجودگی کا۔ ہم جو ایک تھے۔ ایک ہیں پھر بھی ایک نہیں ہو سکتے! یہ سوچ کر ہی تو میں نے اُسے خود سے جدا کیا۔ نظامِ کائنات برہم ہو یہ اُسے کبھی منظور نہ تھا۔ جبھی تو اُس نے مجھ سے الگ ہو جانے کا فیصلہ کیا۔ کبھی لوٹ کر نہ آنے کے لئے وہ شہر سے رُخصت ہوئی تھی۔ اب وہ یہاں کیوں آئی ہے؟ دُور صدیوں پرانے برگد کی رُومانی چھاؤں میں نارسائی کی گہری تاریکی میں رُوح جلتی رہی۔ کائناتِ قلب و نظر جلتی رہی ساری رات ——!

بیسویں صدی دہلی ستمبر ۱۹۷۳ء

راکھ اور لہو ت ڈومر اسٹوریج اُبھرا تو اسٹوری ڈپارٹمنٹ میں ایک ہی منظر میرے آگے اُبھر آیا ہے۔ خواب ہے یا ایک حقیقت! کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ گلابی لباس میں ملبوس چھریرے بدن کی ایک دراز قامت پری وش، گورا گلابی رنگ، سنہرے، سیاہ ریشمی بال جو خشک ہیں اور شانوں پر گھٹاؤں کی طرح جھوم رہے ہیں۔ چہرہ کتابی ہے۔ آنکھوں میں مستی بھری چمک ہے۔ سُرخ لبوں پر جو مسکراہٹ ہے وہ بہت آشنا مسکراہٹ ہے۔ آواز، رفتار اور گفتار کا انداز جانا پہچانا ہے۔ اُس کے ساتھ اسٹوڈیو میں کام کرنے والی لڑکی سیتا بھی ہے۔

"معاف کیجئے۔ آپ نے مجھے نہیں پہچانا؟"

"پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ پر یاد نہیں آتا کہ کب اور کہاں آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔" میری آواز میں بے بسی کی لرزش ہے۔

"گذشتہ سال شہر میں 'شبِ افسانہ' منعقد ہوئی تھی؟"

اور میں چونک جاتا ہوں۔ ہاں 'شبِ افسانہ' میں اس فتنۂ قیامت سے ملاقات ہوئی تھی۔ مجھے یاد آ جاتا ہے۔

"اُس رات آپ نے کوئی افسانہ بھی سُنایا تھا؟"

"جی ہاں۔"

وہ اداۓ ناز سے مسکرا کر کہتی ہے۔ "میں کہانیاں لکھتی ہوں۔ رسالوں میں میری کہانیاں چھپتی رہی ہیں۔ ایک کہانی حال ہی میں لکھی ہے۔ وہ کہانی کچھ یوں ہے۔"

وہ پوری روانی سے، سادگی، بے ساختگی اور بے تکلفی سے کہتی جا رہی ہے۔ تیز لیکن خلوص اور اپنائیت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں۔ میں اُس کی زبان میں گم ہوں۔

گلابی لباس میں ایک گلابی برق چمک رہی ہے۔ وہ اپنی تازہ کہانی سُنا رہی ہے۔ زبانی اور تیز رفتار سے۔

کہانی کا ہیرو ایک شکاری ہے۔ ہرن کا تعاقب کرتے ہوئے ایک گھنے جنگل میں بھٹک گیا ہے۔ جنگل میں صدیوں پرانے محل کے کھنڈر ہیں۔ کھنڈرات کے درمیان ایک حوض ہے۔ حوض میں ایک خوبصورت عورت کا مرمریں مجسمہ ایستادہ ہے۔ ہیرو جوں ہی حوض کے قریب پہنچتا ہے ایک درد بھری آواز بلند ہوتی ہے۔

"مجھے بچا لو ——— راجکمار! جُرمِ محبت میں مجھے زمانے نے پتھر کا بُت بنا دیا ہے۔ بُت کو توڑ کر تم مجھے آزادی دلا سکتے ہو۔ مجھے بچاؤ!"

وہ کہانی سُنا رہی ہے اور میں اُس کے جلوؤں میں حیران سوچ رہا ہوں کہ لڑکی یاسمین سے کتنی مشابہہ ہے! صورت شکل، رنگ رُوپ اور آواز۔ ہو بہو یاسمین! یاسمین جو برسوں بعد امریکہ سے آئی ہے اور اِس وقت شہر میں اپنے شوہر کے ساتھ موجود ہے... آئینہ کیوں بار بار میرے سامنے آتا ہے۔ کیوں اُس صورت کو دکھاتا ہے جسے بھول جانے کا عہد کر چکا ہوں۔ میرے دل میں غم کا طوفان پوری شدت سے اُبھر آیا ہے۔ ضبط کا دامن ہاتھوں سے چھوٹ چھوٹ جاتا ہے۔ افسانہ نگار لڑکی شاید اپنی کہانی سُنا رہی ہے۔ الفاظ صرف الفاظ۔ مفہوم کی مجھے خبر نہیں ہے۔ میرے کانوں میں اُس کی مترنم آواز گونج رہی ہے۔ اچانک کیبن کا دروازہ کھلتا ہے۔ سیاہ فام کمال گونجدار آواز میں قہقہے لگاتا ہوا نمودار ہوتا ہے۔

"اچھا ہُوا تم نہیں آئے" وہ ہنستے ہوئے کہتا ہے "امریکہ سے ارجمند اور اُس کا شوہر آئے ہیں"

میں چونک پڑتا ہوں۔

"بہت دلچسپ غلط فہمی ہوئی" وہ خفّت سے ہنسنے لگتا ہے۔

"ارجمند میری چچا زاد بہن ہے۔ میں سمجھ رہا تھا اپنی یاسمین آئی ہے۔ پتہ نہیں کیوں میں نے ایسا فرض کیا تھا۔

"اس کا مطلب ہے یاسمین نہیں آئی!" زوردار بارش جیسے ایکدم رُک جائے۔ ایک پُر حبس مہیب سنّاٹا میرے ذہن پر چھا گیا ہے۔ دل ڈوب رہا ہے۔ ڈوبتا ہی جا رہا ہے...

آج سے چھ سال پہلے اور اُس سے دو سال پہلے اِسی کیبن میں کمال کے ساتھ وہ مجھ سے ملی تھی۔ گلابی لباس میں چمکتی ہوئی گلابی بجلی! پھر ایک کہانی شروع ہوئی۔ ایک شادی شدہ مرد اور ایک کنواری لڑکی کا رُومان جو خاندانی زندگی کی سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا اور آج آٹھ برس بعد وہی کیبن ہے، ویسا ہی ماحول ہے۔ خیالوں کے آسمان پر ایک گلابی بجلی کوند رہی ہے!

"یاسمین! تمھاری کہانی کا انجام بہت دردناک ہے!"

"جی ———" وہ بوکھلا کر کہتی ہے "میرا نام افروز ہے آپ شاید بھول رہے ہیں"

"اوہ مس افروز!" میں خفّت آمیز اُداس لہجے میں کہہ اُٹھتا ہوں "معاف کیجئے!"

"پھر بھول گئے آپ... میں مسز افروز سُلطان ہوں۔ میری شادی حال ہی میں ہوئی ہے!"

"اوہ ——— آپ اِسی شہر میں رہتی ہیں؟"

"کبھی یہاں رہتی تھی۔ اب تو یہاں مہمان بن کر آتی ہوں۔ اُن کا کاروبار دِلّی میں ہے۔ اگلے اتوار کو میں دِلّی چلی جاؤں گی!"

کمال حیرت سے مجھے اور اُس لڑکی کی طرف دیکھ رہا ہے۔ غم اور اُداسی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر مجھے خیال آتا ہے۔ تم یاسمین نہیں ہو سکتیں۔ تم افروز ہو۔ حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں۔ اِس ایک لمحہ میں اُس کا چہرہ کتنا بدل گیا ہے! نہیں تم واقعی اُس سے مختلف ہو۔ تم اُس سے قطعاً مشابہہ نہیں ہو!

وہ جو ہمیشہ کے لئے جُدا ہوتے ہیں کبھی نہیں ملتے کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔ بھولنے والے مگر کیوں یاد آتا ہے تو ———؟؟؟

مدیرِ بیسویں صدی تک کے نام خط لکھتے وقت اختصار سے کام لیا کریں تاکہ آپ کا ارشاد کی تعمیل فوراً ہو سکے۔ طویل خطوط معروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے۔

غزل

غلام رسول دانش سہارنپوری بی-اے-ایل ایل بی-ایڈوکیٹ

برسات کی بھیگی راتوں میں جب ان کا خیال آجاتا ہے
اُس وقت کا عالم کیا کہیے بے ساختہ دل بھر آتا ہے

انسان شعورِ منزل سے بیگانہ اگر ہو جاتا ہے
ہر راہ میں کانٹے ملتے ہیں ہر گام پہ ٹھوکر کھاتا ہے

صہبائے خودی کے متوالے کہنے کو بہت سے ہیں لیکن
میخانہ اُسی کا ہے جس پر ساقی کا کرم ہو جاتا ہے

یہ چاند ستارے سب اُس کے قدموں پہ نچھاور ہوتے ہیں
تقدیر کی زُلفِ برہم کو تدبیر سے جو سلجھاتا ہے

جلووں کی طلب کرنے والو جلووں کی طلب کچھ کھیل نہیں
اِس پیار کی نازک منزل میں عرفانِ نظر کام آتا ہے

اپنوں کا تو کوئی ذکر نہیں اس دہر میں لیکن اے دانش
جو حسنِ رضا کا حامل ہے غیروں کو وہی اپناتا ہے

غزل

انور تاباں بی-اے، ایل ایل، بی-ایڈوکیٹ

اے راہ روو! عزم جو محکم ہو تمہارا
خود راہ سے مل جائیگا منزل کا پتا بھی

شکوہ ہے کہ آتے نہیں محفل میں ہماری
کیا دل سے کبھی تم نے ہمیں یاد کیا بھی؟

اے ہم سفرو عزم جواں جس کا ہے ساتھی
منزل پہ پہنچ جائے گا وہ آبلہ پا بھی

لب سِل گئے آنکھوں میں حجاب آگیا اُسکی
بھولے سے اگر اُس نے میرا نام لیا بھی

اُس دور میں منزل پہ پہنچنے کا یقیں کیا
بھٹکا کئے جس دور میں خود راہ نُما بھی

احساسِ خودی نے مرے لب سی دیے تاباں
اظہارِ محبت کا ارادہ جو کیا بھی

غزل

مسعودہ حیات ایم-اے، بی-ٹی

رہینِ درد ملے کچھ جگر فگار ملے
تری گلی میں سبھی ہم کو بیقرار ملے

رہے جو رنگِ لطافت پہ بھی خزاں بردوش
چمن میں ایسے بھی پروردۂ بہار ملے

ہمارے شوق نے روشن کیا ہے راہوں کو
ہزار طور سرِ شامِ انتظار ملے

رُخِ حسیں پہ تبسم کی یوں لکیریں ہیں
چمن کو جیسے مہکتی ہوئی بہار ملے

ہجومِ غم میں بھی ہم مسکرائے ہیں اکثر
کہ بیقرار دلوں کو یونہی قرار ملے

حیات عمر بھر محبت ہے سوزشِ پیہم
جہاں بھی اہلِ محبت گئے شرار ملے

لذت کی بازی جیتنے کے لئے — مونیکو

بسکٹ ایک - مزے سے کھانے کے طریقے دو





یوں ہی کھائیں تو
لاجواب —

من پسند چیزیں
اُس پر لگاکر کھائیں
تو اور مزیدار

پیارے

مونیکو

بھارت کے سب سے زیادہ بکنے والے نمکین بسکٹ —

مونیکو — کُرکُرا — نمکین بسکٹ —
محکم کے اسکے جیسا —
یوں ہی کھائیے یا مَن پسند چیزیں
اُس پر لگاکے کھائیے — ہاں!
ہر بار مونیکو طلب کیجیے
اور بازی جیتئے!

everest/8860/PP/HR

بیسویں صدی دہلی ستمبر ۹۳ء

احساس کی خوشبو

اسلم آزاد ایم۔ اے
شعبۂ اُردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ (بہار)

محترمی! تسلیمات

"قُرب کی خوشبو" ابھی تک یہاں موضوعِ گفتگو بنی ہوئی ہے۔ کہانی کے بعض نام اتنے Common تھے کہ بیشتر لوگ (خصوصاً یونیورسٹی کیمپس میں) خوش فہمی میں ہیں کہ اُن کا نام ہے ـــــ گذشتہ دنوں راکھی کا تہوار تھا۔ مجھے یہ تہوار بے حد پسند ہے۔ علی گڑھ سے "بیسویں صدی" کی دو پرستار راحت فریدی اور انجم علوی نے مجھے راکھی بھیجی ہے۔ یہ دونوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طالبہ ہیں۔ اِن کی محبت، خلوص اور اپنائیت سے میری آنکھیں وفورِ جذبات سے نم ہو گئیں ـــــ اب "احساس کی خوشبو" ارسالِ خدمت ہے۔ کہانی کیسی ہے؟ اِس کا فیصلہ آپ ہی کر سکتے ہیں۔ قارئینِ "بیسویں صدی" کے مشورے ہمیشہ میرے لئے مشعلِ راہ بنے ہیں . . .

مخلص ـــــ اسلم آزاد

★

میں کس نام سے تمھیں پکاروں، کن القاب سے یاد کروں۔

بہرحال تم تم ہو۔ خواہ جو بھی نام دے دیا جائے تمھیں۔ تم تم رہو گی۔ تمھاری شخصیت، تمھارے خیالات اور تمھارے نظریات تمھارے رہیں گے۔ زندگی گزارنے کے اصول اپنے ہوتے ہیں۔ اُن میں تبدیلی کسی دباؤ کے باعث نہیں ہوتی۔ یہ اصول ایسے ہوتے ہیں جنھیں بعض لوگ آخری وقت تک سینے سے لگائے رہتے ہیں۔ ابدی نیند سو جاتے ہیں لیکن اپنے مزاج اور رویّے کو نہیں بدلتے۔

آخر وہی ہُوا نا جس کا مجھے خوف تھا۔ مجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں، کوئی شِکوہ نہیں۔ یہ تو اپنا اپنا مقدر ہے۔ اپنا اپنا نصیب۔

چاندنی!

خوشبو!!

سایہ!!!

کسی کو سرِراہ مِل جاتا ہے۔ کوئی بھٹکتا رہتا ہے دربدر کو بکو۔ خاک چھانتا ہے شہر شہر، قریہ قریہ اور میں سوچتا ہوں تم بھگوان تو نہیں تھیں۔ لیکن بھگوان کی طرح میرے من مندر میں تمھاری کلپناؤں اور بھاؤناؤں کی مُورت بسی ہوئی تھی۔ آج تک یہ بات میری سمجھ میں نہ آسکی کہ تم بھگوان کی طرح میرے قریب کیوں آگئیں؟ رگوں میں کیوں سما گئیں؟ رُوح میں کیوں بس گئیں؟ وہی سکون، وہی شانتی جو دُھونی رمائے سادھو کے گرد بیٹھے عقیدت مندوں کو مِلا کرتی ہے، مجھے حاصل تھی۔

جس طرح چُپکے سے تم کسی کی پُرسکون زندگی میں داخل ہو گئی تھیں، اُتنی ہی خاموشی سے چلی کیوں نہیں جاتیں؟ یوں دل کی اندھیری گپھاؤں میں ڈیرا ڈال دینے سے، گھر بنا لینے سے گھٹن کا احساس نہیں ہوتا تمھیں؟ تم میری محسن ہو نا، میری دوست۔ قدم بقدم، شانہ بشانہ ساتھ چلنے کا وعدہ کیا تھا نا۔ چلو اچھا ہی ہُوا۔ ورنہ میری ہمراہی میں پاؤں زخمی ہو جاتے تمھارے۔ آبلے پڑ جاتے تمھارے

تلوؤں میں۔ کیا مِلتا تمھیں ؟

زخم !

آنسو !!

یادیں !!!

ایک بات بتاؤ گی مجھے ؟ یوں بھی کوئی کسی کے اِتنا قریب آجاتا ہے کہ بچھڑنے کے بعد اُس کی زندگی، اُس کی شخصیت ادھوری اور نامکمل ہو جاتی ہے۔ کہانی کار ہو نا۔ ایک کہانی لکھو گی۔ پلاٹ بتا دوں تمھیں ؟ لیکن سُنو ! اُوں ہُوں، یوں نہیں، اور قریب آجاؤ۔ لیکن اِتنا بھی نہیں کہ میرے سُلگتے ہوئے ہونٹ تمھاری بھیگی پلکوں پر اپنے نِشانات چھوڑ جائیں۔ سمجھیں۔ میں تو بھٹکا ہُوا ایک تھکا ماندہ راہی ہوں جسے اپنی منزل کا خود ہی پتہ نہیں۔ جس کا مقدر ہے ——

جادہ پیمائی !

صحرا نوردی !!

کوچہ گردی !!!

آج پھر پُونم کی رات ہے۔ پہاڑ، درخت، سبزہ ہر چیز بارش میں نہا چکی ہے۔ شام کو ٹوٹ کر بادل برسا تھا۔ خنک ہوا کا لمس میرے کمرے کی دیواروں کو چھُو رہا ہے، بھٹک رہا ہے۔ دُور دُھلے آکاش میں بادلوں کے ساتھ چاندنی کی آنکھ مچولی کا کھیل جاری ہے اور میرے سارے وجود میں چنگاریاں سی بھر گئی ہیں۔ چاند میری سب سے بڑی کمزوری ہے نا؟ بچپن سے چاند کا شیدائی رہا ہوں۔ شاید اِس لئے کہ وہ میری دسترس سے باہر ہے۔ اب بھی گھنٹوں اُسے دیکھتا رہتا ہوں۔ قریب اور یاس سے بے خبر ہو کر، دُنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر۔ پاگل پن ہے نا یہ ؟ کھڑکی کی سلاخوں سے چاند میرے کمرے میں جھانک رہا ہے اور میں اپنے بستر پر کروٹیں بدل رہا ہوں۔ سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے کر چاند کے اُجلے اور روشن چہرے پر پھینکتا ہوں لیکن کمرے کی گھُٹن بتدریج بڑھ جاتی ہے اور میں سُوئچ آن کر دیتا ہوں۔ کوئی میگزین اُٹھا کر چند لمحے تک اُس کی ورق گردانی کرتا ہوں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا میں کیا چاہتا ہوں۔ بے نام سی خواہش اکمرے سے نکل کر لان کی بھیگی بھیگی گھاس پر بیٹھ جاتا ہوں۔ پھر دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنا کر چت لیٹ جاتا ہوں۔ چاند کو میں اور چاند مجھے دیکھتا رہتا ہے۔

چُپ چُپ !

خاموش خاموش !!

تنہا تنہا !!!

اور پتہ نہیں یہ سلسلہ کب تک جاری رہتا ہے۔ جب کمرے میں سُورج کی نرم آگ پھیل جاتی ہے تو میں اپنے بستر پر بیٹھ جاتا ہوں۔ آنکھوں کو مَلتا رہتا ہوں اور پھر بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ جلتی آنکھوں میں سُوئیاں سی چبھنے لگتی ہیں۔ سُرخ ڈورے اِس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ رات نیند نہیں آئی تھی۔ لیکن کیوں؟ اِس کا جواب تو میرے پاس بھی نہیں۔ ہاں صرف سرگوشیاں سی سُنائی دیتی ہیں۔ لیکن میرے سونے کمرے میں تو سسکتی تنہائی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ فریم میں لگی ہوئی ایک تصویر اور تجریدی آرٹ کا ایک کیلنڈر جس کی تشریح ہر کوئی اپنی پسند اور نظریے کے مطابق کرتا ہے۔ وہ تو مجھے بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن پھر بھی پتہ نہیں مجھے کیوں بے حد پسند ہے۔ شاید اِس وجہ سے کہ اُس میں چاروں طرف بکھری ہوئی آگ تازہ لہو اور سسکتی تنہائی کا پس منظر ہے۔

تمھارا کہنا ہے کہ میں زیادہ سگریٹ نہ پیوں۔ آخر تم ہی بتاؤ کیا پیا جائے؟

شراب !

آنسو !!

سگریٹ !!!

جانتی ہو رات میں نے شراب پی تھی۔ ہاں قسم کھاتا ہوں (تمھاری نہیں) جھوٹ نہیں بولتا۔ فنکار کہیں جھوٹ بولتا ہے؟ (تم بھی تو فنکار ہو نا) جام میں ایک پیکر اُبھرتا اور میں اُسے ایک ہی گھونٹ میں اپنے سینے میں اُتار لیتا۔ چھپانے کے باوجود وہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہوتا۔

خوبصورت !

دل آویز !!

سرو قد !!!

اور ایک غیر مرئی قوت میرا ہاتھ تھام تھام لیتی۔ لیکن اُس کی آنکھیں میری آنکھوں کی تاب نہ لاسکتیں۔ مجرم بہرحال مجرم ہوتا ہے نا؟ تمھاری تحریر نقطوں میں تبدیل ہوتی گئی۔ یہ کیا شراب کے بغیر کوئی شاعر اور ادیب نہیں بن سکتا؟ کیوں پریشان کرتے ہو تم؟

تمھارے لیے تو وقتی تفریح ہو گئی اور کسی کے جذبات کو کتنی ٹھیس پہنچی۔ کاش اِس کا اندازہ تم کر سکتے۔ اب نہ پیو گے نا؟ بہت بُرے ہیں تمھارے دوست جو گندی عادتیں ڈلواتے ہیں۔ اب مت ماننا اُن کا کہنا۔ سمجھے؟"

تین دنوں تک بُخار میں جلتا رہا۔ اِس کا ذمّہ دار میں خود ہوں۔ اپنی بے پروائی سے بارش میں بھیگ گیا تھا۔

رِم جھم !

برکھا !!

بارش !!!

موسم بہت ہی پاگل کر دینے والا تھا نا۔ اِسی لئے گنگا کے کنارے جاتا ہوں۔ دُھندلکا گہرا ہو جاتا ہے۔ تنہائی کی کرچیاں میری آنکھوں میں کُھبنے لگتی ہیں۔ شاید اِس لئے کہ دُوسرے لوگ تنہا نہیں ہوتے۔ گنگا کی لہریں اور تیز ہو جاتی ہیں اور حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے مناظر دُھندلے ہو جاتے ہیں اور میں رُومال سے اپنی پلکوں کو چند لمحوں کے لئے چُھپا لیتا ہوں۔ غور سے اُن بے تاب اور مچلتی ہوئی لہروں کو دیکھنے لگتا ہوں جو نہ جانے کیوں ساحل سے ٹکراتی ہیں۔ سوندھی مٹی کی خوشبو شاید اُنھیں پاگل بنا دیتی ہے۔

تم نے کیا نہیں دیا مجھے؟ تمھاری دی ہوئی سوغات بڑی گراں قدر ہے۔ اِس لئے تادمِ حیات اِسے سنبھال کر رکھنا چاہتا ہوں۔ دیکھو جب بھی میرا خیال آجائے، ایک پاگل کی باتیں یاد آجائیں تو میری تحریروں کو پڑھ لینا۔ میں وہاں موجود ہوں گا۔ سارے پردوں اور نقابوں سے غیر مستور۔ تمھاری طرح میری شخصیت بھی ایک کُھلی ہوئی کتاب ہے۔ لیکن میری آنکھوں کی تحریر پڑھ کر اِن کا مفہوم سمجھ سکو گی تم؟ شاید سمجھ کر بھی نہ سمجھ سکو اور نہ سمجھ کر بھی سمجھ جاؤ !!

غزل

عبدالقدوس ناطق

شامِ غم مائلِ دلبری ہوگئی
اب مکمل مری زندگی ہوگئی

کچھ تو بربادیوں کا سبب دل بنا
کچھ نگاہِ کرم آپ کی ہوگئی

داغِ دل کی بدولت ضیا دل میں تھی
داغِ دل بجھ گیا تیرگی ہوگئی

حسن جب مائلِ خود نمائی ہوا
ذرّے ذرّے میں جلوہ گری ہوگئی

میکدے میں گزر آج کس کا ہوا
مے جو شیشے میں تھی وہ پری ہوگئی

یہ زمانہ وفا کا زمانہ نہیں
جو لگی دل کی تھی دل لگی ہوگئی

جس کو فرزانگی کہہ رہا ہے جہاں
وہ مرے حق میں دیوانگی ہوگئی

منحصر میکشی میکشی پر نہیں
جب نگاہیں ملیں میکشی ہوگئی

یہ کرشمہ ہے ناطق غمِ عشق کا
زندگی نازشِ زندگی ہوگئی

غزل

شباب للت ایم۔ اے

یہ واقعہ ہے کہ جب تیرے خواب آتے ہیں
مرے سوالوں کا لے کر جواب آتے ہیں

پیامِ عشق کے اب کامیاب آتے ہیں
جوابِ خط میں شگفتہ گلاب آتے ہیں

مقام کچھ بھی زمانہ ہمیں نہیں دیتا
ہر امتحاں سے تو ہم کامیاب آتے ہیں

نہیں ہے جب سے میسر مجھے ترا آغوش
بُرے بُرے مجھے دن رات خواب آتے ہیں

تمہارے حصے کی خوشیاں شمار سے باہر
ہمارے حصے میں غم بے حساب آتے ہیں

نہ پوچھ کٹتی ہیں کیسے وہ ہجر کی راتیں
نہ نیند آتی ہے جن میں نہ خواب آتے ہیں

جہاں ہم آتے ہیں اے شیخ روزِ روشن میں
وہاں اندھیرے میں عالی جناب آتے ہیں

صلیب پر مجھے لٹکا کے رو رہے ہیں لوگ
مرے خدا! یہ مجھے کیسے خواب آتے ہیں

شباب لاکھ میں رہا ہیں بدل بدل کے چلوں
جنم جنم کے عمل ہم رکاب آتے ہیں



FERRADOL
STANDARDIZED
PARKE - DAVIS

افسانہ

جامِ صحت اُس پری وش کا

ڈاکٹر انور سیوانی، ایم اے، پی ایچ ڈی

شیخ محلہ نئی گلی، سیوان ضلع سیوان، بہار،

محترمی خوشتر گرامی صاحب! نیاز و تسلیمات۔

ایک طویل عرصے کی غیر حاضری کے بعد "بیسویں صدی" کی بزم میں "جامِ صحت اُس پری وش کا" لے کر شریک ہو رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ افسانہ آپ کو اور قارئین کرام کو پسند آئے گا۔۔۔۔

خلوص کیش ——— انور سیوانی

★

"ہمارے انٹلکچول طبقے نے اپنا ضمیر کافی کی پیالیوں میں ڈبو دیا ہے!" رمیش نے کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے فقرہ اچھالا۔

"یار تم ضمیر کی بات کر رہے ہو! ضمیر، ضمیر... بکواس! اب ضمیر کا وجود ہے کہاں؟ اس سوپر سونک جیٹ کے عہد میں یہ اتنا بڑا بوجھ ہے کہ نہ کوئی اسے اپنی پیٹھ پر لاد سکتا ہے اور نہ اپنے ذہن کے خول میں اسے برداشت کر سکتا ہے" شہباز نے اُسے سہارا دیا۔

"ضمیر، ہاہا! ہندوستان کے انٹلکچولس نے اُسے کھویا نہیں، سڑی گلی شئے سمجھ کر نالی میں پھینک دیا ہے۔ آج کوئی صاحبِ ضمیر ایک دن کے لئے بھی کسی کاروبار میں ٹِک نہیں سکتا۔ بھئی صورتِ حال تو یہ ہے کہ ہماری قسمتوں کا فیصلہ سیاست داں کرتے ہیں، وہی سیاست داں جو سیاسیات سے کورے اَن پڑھوں کے نمائندے ہیں" رنجیت نے رمیش اور شہباز کو لقمہ دیا۔

"بالکل، بالکل! میں تو یہی کہنا چاہتا تھا کہ آج کل انٹلکچول رجعت پسند تصور کئے جاتے ہیں۔ بھئی سچی بات تو یہ ہے کہ اب سماج کو انٹلکچولس کی ضرورت ہی نہ رہی۔ یہ زمانہ تو نعرہ بازی کا ہے" فیروز نے مزید تائید کی۔

"ضمیر فضول بکواس! آج کل تو یہ گھاس بھاجی کے مول کی بلکہ اُس سے بھی کم وقعت چیز بن کر رہ گئی ہے ——— اور انٹلکچولس بوچ!" ناصر نے منہ بنا کر کہا۔

"اور کیا، انٹلکچول ہی طبقے پر کیا مار پڑی ہے، ہمارا سارا معاشرہ سڑ گل گیا ہے نیچے سے اوپر تک سماج کے جس طبقے کو دیکھو، وہ منگر و خوا نیچے والا ہو چاہے تلک دھاری سوامی جی یا جبہ قبا والے شیخ جی ہوں یا دیس سیوا کی مالا جپنے والے دَل بدلو اور وزارت کی کرسی کے بھوکے نیتا جی ہوں، سب کی حقیقت ایک جیسی ہے کسی کا گلا کٹے لیکن ایمانداری کی ساکھ قائم رہے۔ سب کی کوشش یہی رہتی ہے" فیروز نے خیال آرائی کی۔

"اماں کیا بکواس چھیڑ دی! کافی میں زہر گھول دیا۔ ساری تفریح غارت ہو گئی۔ اب تو کافی کی گھونٹ حلق سے اتارے نہیں اترتی" بچی ہوئی کافی کو ایک ہی گھونٹ میں حلق سے اتارتے ہوئے ناصر بڑبڑایا۔

اور پھر بول اُٹھا "رمیش ڈیر! تم تو کتاب کے کیڑے بنتے جا رہے ہو۔ یہ کیا تُک ہے کہ تفریح کے وقت بھی تمہارے منہ سے غیر ہضم شدہ جملے اُبل پڑتے ہیں"

"اوہ، لو! رمیش ڈیر آج سنجیدگی کے موڈ میں دکھائی دیتا ہے۔ کچھ دیر آج ضرور تمہیں کوئی تکلیف پہنچی ہے، نہیں تو ..." فیروز نے رمیش پر سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"بات سنجیدہ ہونے کی نہیں، سچائی بہر حال سچائی ہے اور آج رمیش ڈیر تو..."

شہباز کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی ناصر بول اُٹھا "گولی مارو سچائی کو اور اُس کے ساتھ ہی انٹلکچولس کے ضمیر کو..... سیدھی بات بتاؤ رمیش ڈیر آج تمہیں کہاں درد ہو رہا ہے؟"

"درد، ناصر ڈیر، درد کی بات کر رہے ہو! یقین مانو میرے ساتھ

قیامت

نظر جس کی طرف کر کے نگاہیں پھیر لیتے ہو
قیامت تک پھر اُس دل کی پریشانی نہیں جاتی ——— آنند نرائن ملّا

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہونچی تری جوانی تک ——— فانی بدایونی

یہی رفتار کا انداز ہے تو کیا ٹھکانا ہے
خدا جانے کہاں چھپنا پڑے جا کر قیامت کو ——— آغا شاعر قزلباش

لینا سنبھالنا کہ مرے ہوش اُڑ چلے
آتا ہے کوئی مست قیامت کی شان سے ——— داغ دہلوی

الٰہی کیوں نہیں آتی قیامت ماجرا کیا ہے
ہمارے سامنے پہلو میں وہ دشمن کے بیٹھے ہیں ——— داغ دہلوی

مرسلہ:- آمیر انصاری، جورہاٹ (آسام)

ایسی کوئی بات نہیں اور اگر پوچھتے ہی ہو تو کیسے بتاؤں کہ کہاں درد نہیں ہے۔ دل میں، ذہن میں، تصورات میں ——— رمیش نے اُداس لہجے میں کہا۔

"اور کہو، زمین میں، آسمان میں، دائیں، بائیں، اوپر نیچے ——— ہا ہا، اگر تمہیں درد ہی ہے تو کسی اُلٹے سیدھے بام کی مالش کرو ——— ہاں یاروں کی محفل میں اس طرح کا پوز دینے سے کیا حاصل ——— ناصر نے جھلا کر کہا۔

"ناصر ڈیئر، اب یہ تمہاری زیادتی ہے، آخر انسانی ہمدردی بھی تو کوئی چیز ہے۔ اپنے دُکھ درد کا حال اپنوں ہی سے تو بیان کیا جاتا ہے۔ اگر رمیش" رنجیت کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی ناصر نے تمسخر کے انداز میں کہا" ہا ہا انسان انسانیت کی خدمت کا عالمی انعام تمہیں ضرور ملنا چاہئیے، یقین رکھو ہم تمہاری پُرزور سفارش کر دیں گے۔"

"یور، یور، آل نانسنس، بوسٹ بکواس" فیروز تلملایا۔

"نانسنس، نانسنس کہنے سے کام نہیں بنتا۔ ڈیئر اب تو نانسنس میں سنس تلاش کرنے کا زمانہ ہے" کیلاش نے جو دیر سے سب کی باتیں سُن رہا تھا خیال آرائی کی۔

"بالکل، بالکل! یہ اشلوکس، یہ سیاستداں، یہ دُنیا کے ہر جھگڑے، سب خطرے کی علامتیں ہیں۔ اب علم و فضل کے کمالات کا زمانہ لد گیا، سب کی جگہ حکمتِ عملی نے لے لی ہے۔ ماحول، حالات، صلاحیتیں، سب اضافی قید کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں" فیروز نے بات بڑھائی۔

رنجیت نے سنجیدہ لہجے میں کہا" درست، بالکل درست! یہ قدروں کے بحران کا زمانہ ہے۔"

"پھر وہی بکواس! قدر، قدر! یہ کوئی ٹھوس چیز تھوڑی ہے کہ اس پہ بحران کے آنے کا رونا رویا جائے۔ ماحول اور حالات کے ساتھ ہر قدر گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدلتی رہتی ہے" ناصر نے فقرہ چُست کیا۔

شہباز کہنے لگا" ارے لو تم آج کی بات کہتے ہو، میں پندرہ برس پہلے کی بات کہتا ہوں۔ یہ میرے عنفوانِ شباب کا زمانہ تھا، اُن دنوں محبت کے بارے میں میرے خیالات بہت پاکیزہ تھے اور انہیں خیالات کے تحت مجھے ایک لڑکی سے دوستی ہو گئی اور پھر دھیرے دھیرے اِس دوستی نے عشق کی صورت اختیار کر لی۔"

"عشق، پوچ!" ناصر نے منہ بنایا۔

"یار سُنو بھی تو سہی، اپنے اپنے تجربات ہیں، ہاں ڈیئر کہانی جاری رہے۔ لطف آرہا ہے اور مجھے اپنی عاشقی کا زمانہ یاد آرہا ہے"

"جب میں اپنے عشق کی ناکامی سے مایوس ہو کر خودکشی کرنے کی نیت سے ریلوے لائن پر کٹ جانے کا ارادہ کر کے چلا، وہ تو اتفاق سے ٹرین ٹھیک اُسی جگہ آ کر رک گئی جہاں مجھے کٹ کر اِس نامراد زندگی کو ختم کرنا تھا۔ جانتے ہو کیا ہوا؟

مدہوشی کے عالم میں میں ٹرین کے ایک ڈبے میں جا کر بیٹھ گیا اور پھر میری دوسری زندگی کا آغاز ہوا۔

ہاں ڈیئر بہت لطف آرہا ہے کہانی جاری رہے" کیلاش نے شہباز کو سہارا دیا۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا، میں ایک حسین لڑکی سے عشق کرنے لگا۔"

"پوچ، دوشیزہ تو حسین ہوا ہی کرتی ہے۔ ایک کی قید کیوں!" ناصر شہباز کی بات کاٹ کر بڑبڑایا۔

"یار چُپ بھی رہو، سُنو تو سہی، ہم سب کو لطف آرہا ہے" رمیش بولا۔

"ہاں تو وہ دوشیزہ بھی مجھ سے محبت کرنے لگی، جیسا کہ میں سمجھ سکا۔ ہم نے ساری زندگی ساتھ رہنے کے عہد و پیماں کئے۔ ہم نے یہ بھی عہد کیا کہ اگر ہم کسی وجہ سے ایک دوسرے کے نہ ہو سکے تو جان دے دیں گے۔"

"اتنی بڑی بات! جان دے دیں گے! ——— لیکن شہباز ڈیئر! تم تو

ابھی تک زندہ سلامت ہو اور یہ تو ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ لڑکی تمہاری نہ ہو سکی۔ تم آج تک لنڈورے کے لنڈورے ہی رہے۔" فیروز بول اٹھا

"اوہ، نہیں ایسی بات نہیں، فیروز ڈیئر، پوری بات تو سن لو۔ ہاں تو ہم نے ساری زندگی ساتھ رہنے کے عہد و پیماں کئے"

"اور ساتھ نہ ہونے پر جان دینے کا!" ناصر شہباز کی بات میں دخل دیتے ہوئے بولا۔

"ناصر ڈیئر! تم بڑے بے صبرے ہو، سنو تو سہی، شہباز ڈیئر کیا کہنے جا رہا ہے۔۔۔ ہاں ہاں بہت لطف آ رہا ہے ہم سب کو اپنی عاشقی کے دن یاد آ رہے ہیں شہباز ڈیئر کہانی جاری رہے" کیلاش نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"تو میں کہہ رہا تھا وہ دوشیزہ بھی مجھ سے محبت کرتی تھی، شدید قسم کا عشق! جیسا کہ میں نے اُس وقت سمجھا تھا۔ اگر کسی وجہ سے کسی دن ہم دونوں نہ مل پاتے تو دونوں ہی اُس وقت تک بیتاب رہتے جب تک تنہائی میں ملاقات نہ ہو جاتی۔ ہم چھپ چھپ کر ملتے اور انتہائی رازداری سے کام لیتے۔ دن گزرتے گئے اور ہمارا عشق پروان چڑھتا رہا، لیکن آخر کب تک ہمارا عشق چھپا رہتا۔ لوگوں کی نظروں سے بچنا مشکل تھا۔ لوگ ہمیں شک بھری نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ ایک دن جب ہم بہت انہماک سے پیار اور محبت کی باتیں کر رہے تھے، میں نے اپنی محبوبہ سے کہا "جانِ من، ہم کب تک اسطرح چھپ چھپ کر ملتے رہیں گے ــــ کیوں نہ ہم شادی کر لیں اور ساری پریشانیوں سے چھٹکارا پائیں"۔ شادی کا نام سن کر میری محبوبہ جو میرے پہلو میں بیٹھی تھی، یک بیک مجھ سے الگ ہو گئی، وہ خاموش رہی، میں نے لاکھ منت سماجت کی اس نے منہ نہ کھولا۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے میری طرف تیز نگاہوں سے دیکھا اور یہ کہتی ہوئی "میں نے تمہیں ایسا نہیں سمجھا تھا" وہ تیز تیز قدم بڑھاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

میں ہفتوں اپنے عشق کی بیچارگی کا ماتم کرتا رہا، کئی بار خودکشی کا خیال آیا لیکن کسی نہ کسی طرح میں زندہ رہا۔ اُس دن کے بعد وہ پھر کبھی مجھ سے تنہائی میں نہ ملی۔ راستہ چلتے اگر کہیں نظر آ جاتی تو منہ پھیر لیتی۔ میں نے اسے کئی خط لکھے۔ اس نے کسی کا جواب نہ دیا۔ آخری خط کے جواب میں اس نے صرف اتنا لکھا۔

"میں نے تم سے محبت کی تھی ــــ شادی تم سے ہرگز نہ کروں گی!" شہباز نے دکھ بھرے لہجہ میں کہا۔

"محبت اور شادی، ناکامی اور خودکشی، بوچ!" ناصر نے جھنجھلا کر کہا۔

"شہباز ڈیئر، یہ اچھا ہوا کہ اس فلرٹ نے تم سے شادی نہ کی اور یہ بھی

آنسو

آنسوؤں کی کمی نہیں لیکن
کچھ سبب تھا کہ آنکھ نم نہ ہوئی ــــ جگر

وقتِ رخصت آنسوؤں نے لاج رکھ لی عشق کی
چشمِ نم کو بے سروساماں سمجھ بیٹھے تھے ہم ــــ نامعلوم

اُس جانِ بہاراں نے عاصی جو نظر بدلی
آنسو نہ رہا آنسو دامن نہ رہا دامن ــــ عاصی

دل کھول کر مجھے کہاں رونا ہوا نصیب
دو آنسوؤں میں نوح کا طوفان آ گیا ــــ نامعلوم

آنسو سیف کی آنکھوں میں نہ آنا ہرگز
غم کے اظہار سے توہینِ محبت ہو گی ــــ سیف

مرسلہ:- کہکشاں نوری - ہرسنگھ پور - دربھنگہ

اچھا ہوا کہ تم نے خودکشی نہ کی۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ تم نے عشق کا ماتم کرتے ہوئے خود کو سنبھالے رکھا۔ یہ اور بھی اچھا ہے کہ تم عشق کرنے کے لئے آج بھی آزاد ہو" فیروز نے شہباز کی دلجوئی اور اُسے شاباشی دینے والے انداز میں کہا۔

"شہباز ڈیئر! یقین رکھو ہم سب تمہارے اس غم میں شریک ہیں۔ ہم سبھوں کی ناکام محبتیں تمہارے عشق کی ماتم گسار ہیں" کیلاش نے شہباز کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

"او یس، شہباز ڈیئر آؤ ہم سب مل کر اس غم کو جن کے پیگ میں ڈبو دیں ٹھیک اُسی طرح جیسے ہمارے انٹلیکچوئل طبقے نے اپنے ضمیر کو کافی کے پیالوں میں ڈبو دیا ہے" ناصر نے چہکتے ہوئے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک! کیوں نہ ہم روبی، شیلا، نیلو ڈارلنگس کو بھی فون پر بلا لیں" ــ فیروز نے رائے دی۔

"نو گاڈ، ڈیئرسٹ فرینڈس کبھی نہیں، کبھی نہیں ــــ تمہیں میری قسم روبی ڈارلنگ سے ہرگز ہرگز میری اس ناکام محبت کا ذکر نہ کرنا ورنہ مائی گاڈ وہ دن میرے لئے قیامت کا دن ہو گا! میں نے روبی ڈارلنگ کو یقین دلایا ہے کہ میں نے پہلے کسی لڑکی سے عشق تو کیا بات تک نہ کی ہے" شہباز نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"بالکل بالکل" ہم سب کو اس بات کا خیال ہے، روبی ڈیر کے سامنے تو کوئی اس ناکام محبت کا نام بھی نہ لے گا" فیروز نے شہباز کو یقین دلایا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے لیکن اس ناکام محبت کا ماتم تو ہم سب کے لئے اخلاقی فرض کی حیثیت رکھتا ہے" ناصر نے زور دے کر کہا۔

"آہ تو اب اس کا ذکر بھی نہ کرو۔ آؤ ہم اپنی نئی محبتوں کے جام صحت نوش کریں"

گلاس ٹکراتے ہیں اور سب کے چہروں پر خوشیوں کی لکیریں نمایاں ہو جاتی ہیں۔

"بیسویں صدی" میں وہی مضامین شائع ہو سکتے ہیں جن کے نیچے "غیر مطبوعہ" لکھا ہو۔ بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں۔ یہ نہایت نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے ——— ایڈیٹر

شگوفے

پروفیسر مہندر پرتاپ چاند ایم۔ اے

کوروکشیتر یونیورسٹی، کوروکشیتر (ہریانہ)

خوشتر صاحب قبلہ! آداب

آپ کا کرم نامہ موصول ہو کر نظر نواز ہوا مجھے افسوس ہے کہ لکھنؤ کانپور سے واپسی پر دلی میں حسبِ وعدہ آپ کے دولت کدے پر حاضرِ خدمت نہ ہو سکا۔ کیونکہ واپسی پر دلی پہنچتے ہی والدہ صاحبہ کی علالت کی خبر ملی جس کی وجہ سے ہمیں فوراً کوروکشیتر کے لئے روانہ ہونا پڑا۔ اُمید ہے آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔ "بیسویں صدی" کا افسانہ نمبر ہمیشہ کی طرح بے حد حسین بلکہ حسین تر ہے۔ آپ جس محنت اور کاوش سے علم و ادب کی خدمت کر رہے ہیں وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ خدا آپ کو عمرِ خضر عطا کرے تاکہ آپ تا ابد گلستانِ ادب کی آبیاری کرتے رہیں! — لیجئے آپ کی خدمت میں کچھ اور "شگوفے" بھیج رہا ہوں، قبول فرمایئے۔ پچھلی قسط کی اشاعت پر مجھے کئی خطوط موصول ہوئے تھے جن میں دو تین کرمفرماؤں نے انگریزی ادب کے واقعات کو ہندی اور پنجابی لباس پہنانے کی اجازت چاہی تھی میں نے اُن سب کو تحریر کر دیا تھا کہ وہ اِس سلسلے میں آپ سے اجازت طلب کریں۔ اُمید ہے آپ نے بخوشی اُنھیں اِس کی اجازت دے دی ہوگی — اس بار ماہ اکتوبر میں "بزمِ سُخن" "شامِ طنز و مزاح" منانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ آپ اِس پروگرام کی صدارت فرمائیں اور اپنے چُبھتے ہوئے تیروں اور نشتروں سے ہمارے سامعین کو محظوظ ہونے کی سعادت بخشیں۔ اُمید ہے آپ اِس گزارش پر سنجیدگی سے غور فرمائیں گے اور اسے قبول فرما کر مجھے ممنون فرمائیں گے — زیادہ اظہارِ خلوص۔ کوئی خدمت؟ اگلی بار کچھ ہندی اور پنجابی ادب کے "شگوفے" آپ کی خدمت میں بھیجوں گا۔ اُمید ہے "بیسویں صدی" کے قارئین انگریزی ادب کے واقعات کی طرح اُنھیں بھی پسند فرمائیں گے . . .

بہترین خواہشات کے ساتھ

آپ کا ممنونِ محبت

مہندر پرتاپ چاند

★

۱۹۲۶ء کا ذکر ہے۔ حضرت آصغر گونڈوی، یاس یگانہ عظیم آبادی اور جگر مراد آبادی روزانہ شام کے وقت ڈاکٹر منوہر سہائے انور کے مکان واقع سرگنگا رام روڈ لاہور پر جمع ہو کر ادبی موضوعات پر گفتگو اور شعر خوانی کیا کرتے تھے۔ ایک صحبت میں آصغر صاحب نے اپنی غزل سنائی جس کا مطلع یہ تھا —

خدا جانے کہاں ہے آصغرِ دیوانہ برسوں سے
کہ اُس کو ڈھونڈتے ہیں کعبہ و بُت خانہ برسوں سے

حضرتِ جگر اور یاس یگانہ نے خوب داد دی لیکن انور صاحب چُپ رہے۔ اصغر صاحب نے اُن سے کہا "شاید آپ کو مطلع پسند نہیں آیا؟"

انور صاحب نے کہا "کعبہ اور بُت خانہ دو عمارتیں ہیں اور عمارتیں کسی کو تلاش کرنے کے لئے اِدھر اُدھر نہیں پھرتیں۔ اِس لئے آپ کے مطلع کا مضمون صحیح نہیں"۔

یہ سُن کر اصغر بولے "آپ کا کہنا بالکل دُرست ہے۔ میں اِس مطلع کو قلم زد کرکے دُوسرا مطلع لکھ لوں گا"۔

انور صاحب نے بلا تامّل دُوسرے مصرعے کا نقص رفع کرتے ہوئے کہا "مطلع بدلنے کی کیا ضرورت ہے۔ دُوسرا مصرع یوں رکھ لیجئے ؎

کہ اُس کے منتظر ہیں کعبہ و بُت خانہ برسوں سے"

یہ ترمیم سب کو پسند آئی اور سب نے انور صاحب کی نکتہ سنجی اور طبعِ رسا کی بہت تعریف کی۔

مالیر کوٹلے کے ایک مشاعرے میں سٹیج سکریٹری نے اپنے اُستاد کو دعوتِ سُخن دی اور تعارف میں کہا "یہ بُزرگ شاعر اقبال کی ٹکّر کے ہیں!"

غزل غیر مُردّف تھی۔ "مے خانے" "پیمانے" وغیرہ قوافی۔

بُزرگ شاعر نے ایک شعر پڑھا جس کے مصرعِ ثانی میں آتا تھا "شمع و پروانے"۔

حضرتِ قیس جالندھری نے سحابِ سُخن مولانا ابر احسنی گنوری سے مخاطب ہوکر کہا "قبلہ! 'شمع و پروانے' کی نادر ترکیب کی داد دیجئے!"

(پروانے، جمع کی صورت میں فارسی لفظ نہیں اُردو ہے)

ابر صاحب نے فرمایا "ترکیب تو واقعی داد سے مُستغنی ہے۔ لیکن آپ کی 'داد' بھی قابلِ داد ہے!"

کچھ شاعر تو اِس نکتے کو سمجھ گئے۔ لیکن بُزرگ شاعر گراں گوش تھے۔ کچھ نہ سُن سکے۔

جنابِ ساحر سیالکوٹی (مُدیر شعبۂ ادبیات روزنامہ "پردیپ" جالندھر) ایک صُبح دفتر گئے تو دیکھا کہ کسی نے اُن کی کُرسی اور میز پر کاغذ کی کشتیاں بنا کر رکھ دی ہیں۔ وہ حیران و پریشان کھڑے انھیں دیکھ رہے تھے کہ ایک ساتھی نے وجہ پُوچھی۔ ساحر صاحب نے فی البدیہہ یہ شعر کہہ کر سُنا دیا ؎

"بچّوں کا کھیل تو نہیں طوفانِ بحرِ عشق
کاغذ کی کشتیوں کو چلایا نہ جائے گا"

۱۹۶۵ء کا واقعہ ہے ہند و پاک تصادم کی وجہ سے جگہ جگہ جنگی مُشاعرے ہو رہے تھے۔ ایک ایسے ہی مُشاعرہ کا اہتمام جیند کالج میں ہُوا تھا۔ جس میں پٹیالہ سے دُوسرے شعراء کے علاوہ جناب نوبہار صابر اور کرپال سنگھ بیدار بھی مدعو تھے۔ واپسی پر سب لوگ ٹیکسی میں سوار ہوکر پٹیالہ کی طرف آ رہے تھے کہ ایک مقامی بَرخود غلط شاعر کی بوالعجبیوں کا ذِکر چل پڑا۔ بیدار صاحب نے فرمایا ——— "موضوع نہایت دلچسپ ہے۔ کیوں نہ اس پر طبع آزمائی کی جائے۔ مصرع میں دیتا ہوں۔ گرہ لگائیے اور پھر شعر نکالئے ———" یہ کہہ کر اُنھوں نے مصرع دیا ؏

اے شاعرِ گرامی! اے شاعرِ گرامی!

صابر صاحب نے فوراً کہا:

ہر شخص کی زباں پر ہے تیرا نام نامی

اور دوستوں نے بھی گرہیں لگائیں اور شعر بھی کہے۔ صابر صاحب نے جو چند اور اشعار کہے وہ کچھ اس طرح سے تھے ؂

"اُستادِ محترم نے چابک بہت لگائے
اسپِ سخن کو لیکن آئی نہ تیز گامی
الفاظ سے معانی دامن چھڑا کے بھاگے
جب قافیئے نے بڑھ کر گرتی ردیف تھامی
مانگے ہوئے پروں سے پرواز کرنے والے
میں خوب جانتا ہوں تیری فلک مقامی!"

پٹیالہ سٹیٹ بنک کے ہال میں زیرِ صدارت جنابِ آبر احسنی گنوری ایک ادبی نشست کا اہتمام تھا۔ مہتمم صاحب شعر و شاعری سے تو شغف رکھتے تھے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ پینے پلانے میں یقین رکھتے تھے۔ مُشاعرہ گاہ سے ملحقہ کمرے میں اِس رنگین شغل کا بھی اہتمام تھا۔ جہاں میزبان (یعنی مہتمم مشاعرہ) کبھی خود پیگ لگانے اور کبھی کسی خاص مہمان کی تواضع کے لئے بار بار اُٹھ کر اندر جاتے تھے۔

جب جنابِ نوبہار صابر پڑھ رہے تھے تو آں حضرت مے نوشی فرما رہے تھے۔ جب باہر تشریف لائے تو پہلا دور ختم ہو چکا تھا۔ فرمایا۔ "صابر صاحب کو دوبارہ سُنا جائے" یہ کہا اور پھر اندر تشریف لے گئے۔ اتفاق سے دوبارہ بھی جب صابر صاحب کی باری آئی تو صاحبِ موصوف مے خانے میں تھے۔ جب آئے تو اصرار کرنے لگے کہ صابر صاحب ضرور کچھ سُنائیں۔ صابر صاحب اُن کے ارشاد کی تعمیل میں ایک بار پھر سٹیج پر تشریف لائے اور ذرا تامّل کے بعد یہ قطعہ پیش کیا ؂

ناز فرمانا تھا اُن کو، ناز فرماتے رہے
ہم ادائے ساقیٔ محفل پہ بَل کھاتے رہے
اپنے اپنے دل کو بہلانا تھا بہلاتے رہے
ہم غزل پڑھتے رہے وہ جام چھلکاتے رہے!

اِس پر اہلِ محفل نے زور سے قہقہہ لگایا اور میزبان بغلیں جھانکنے لگے۔

گورنمنٹ کالج ہوشیار پور میں گنگا جمنی مُشاعرہ ہو رہا تھا۔ (اُردو، ہندی، پنجابی) سٹیج سکریٹری پروفیسر پریم کمار نظر کسی ضروری کام سے باہر گئے اور سٹیج حضرت قیس جالندھری کے حوالے کر گئے۔ ایک شاعرہ کلام پیش کر چکیں تو قیس صاحب نے کہا "یہ نظم 'صنعتِ بے بحری' میں اپنی مثال آپ ہے!"

ایک پروفیسر نے کہا "قیس صاحب قبلہ! یہ 'صنعتِ' تو ہم نے کبھی نہیں پڑھی سُنی!"

قیس صاحب نے جواب دیا "یہ ایجادِ نو ہے!"

"کچھ مزید روشنی ڈالئے" پروفیسر نے پھر کہا۔

قیس صاحب نے تشریح کرتے ہوئے فرمایا "جو کلام کسی ایک 'مستند' بحر یا مختلف مستند بحروں میں نہ ہو (یعنی کسی بحر میں بھی نہ ہو) اُسے 'صنعتِ بے بحری' کا نمونہ قرار دیا جائے گا"

پروفیسر نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "واقعی اب تو ہماری معلومات میں اضافہ ہو گیا۔ اِس سے پہلے تو ہم اِس معاملے میں 'بے بہرہ' ہی تھے!"

بہت پُرانی بات ہے۔ پٹیالہ میں ایک طرحی مُشاعرہ ہُوا تھا۔ حفیظ جالندھری کی غزل کا یہ مصرعِ طرح تھا:

تم کو بھی محبت کہیں مجھ سا نہ بنا دے

ایک شاعر جب غزل پڑھ چکے تو جنابِ نوبہار صابر نے اُٹھ کر کہا "حضور! آپ اپنی غزل کا یہ شعر تو پڑھنا بھول ہی گئے ؂

بے پردہ مِرے سامنے آتے نہیں یوں تو
اللہ مجھے اُن کا 'غُسل خانہ' بنا دے"

اِس پر وہ شاعر بے چارے تو بہت کھسیانے ہوئے۔ لیکن سامعین نے خوب قہقہے لگائے۔

حضرت قیس جالندھری نے مثنوی مولانا رومؒ کا مطالعہ کیا تو اُن کے دل پر اِس کا گہرا اثر پڑا اور وہ مستی کے عالم میں جابجا دیوانہ وار گھومنے لگے۔ اِسی عالم میں وہ شملے بھی گئے اور

برف پوش سڑکوں پر ننگے پاؤں چلتے رہے۔ احباب نے بہت روکا۔ لیکن انھوں نے کسی کی نہ سنی۔

حال رو ڈ پر وہ ننگے پاؤں جا رہے تھے کہ شملے کے شعراء نے انھیں گھیر لیا اور جوتا پہننے کی درخواست کی۔ لیکن قیس صاحب نے انکار کر دیا۔ اس موقع پر باوا کرشن گوپال مغموم نے ایک مصرع کہہ دیا ؎

جنابِ قیس کو ہم نے بحالِ قیس دیکھا ہے

قیس تو وہاں سے چل دیے لیکن پنڈت گنگا دھر تسنیم نے دُوسرا مصرع یوں موزوں کیا ؎

سُنا تھا جو وہ آنکھوں سے کمالِ قیس دیکھا ہے

پھر رشی پٹیالوی نے بھی ایک مصرع کہا ؎

بہ اندازِ جنوں کسبِ کمالِ قیس دیکھا ہے

اسی طرح کئی اور حضرات نے بھی مصرعے کہے لیکن قیس، قیس اُسی طرح ننگے پاؤں برف پوش سڑکوں پر چلتے رہے۔

ایک بار پٹیالہ میں پروفیسر کرپال سنگھ بیدار کے دولتکدے پر سردار گیان سنگھ راڑیوالہ کے زیرِ صدارت ایک ادبی نشست کا اہتمام تھا۔ پروفیسر راجندر سوز میرِ مُشاعرہ تھے۔ ایک مقامی شاعر جو اپنی شاعرانہ صلاحیتوں سے متعلق بہت خوش فہمی میں مبتلا تھے، ذرا دیر سے تشریف لائے اور میرِ مُشاعرہ سے یہ کہہ کر کہ "سانس پھول رہی ہے ذرا بعد میں پڑھوانا، ساتھ کے کمرے میں تشریف لے گئے اور پھر جب بعد میں پڑھنے بیٹھے تو پڑھتے ہی چلے گئے۔ پھسپھسے شعر سُن سُن کر کچھ دیر تو سامعین ہنس ہنس کر ازراہِ مذاق داد دیتے رہے۔ جب اُکتا گئے تو محفل سرد پڑ گئی۔

لیکن اِن کے فوراً بعد حضرت تو بہار صابر کا نام پکارا گیا تو اُنھوں نے سب سے پہلے یہ فی البدیہہ قطعہ پڑھا جس سے محفل قہقہہ زار میں تبدیل ہو گئی اور مُشاعرہ پھر جم گیا ؎

اپنی خوش فہمیوں کے کیا کہنے
حسبِ خواہش مُراد مِلتی ہے
لوگ ہنستے ہیں کور ذوقی پر
ہم سمجھتے ہیں داد مِلتی ہے!

غزل

جرار چھولسی

گھر کر گھٹا جو ظلم کی اُٹھی تھی چھٹ گئی
موجِ ہوائے صبر چلی۔ رُت پلٹ گئی

برباد کر گئی مجھے خوئے نیازِ عشق
لیکن مزاجِ حسن سے پھر بھی نہ ہٹ کے گئی

کیا چاہتے ہو اور نشیمن کے نام پہ
فتنہ گرو! زمینِ گلستاں تو بٹ گئی

اہلِ سفینہ میں جو یہی شور و شر رہا
سُن لینا ایک روز کہ کشتی اُلٹ گئی

اپنی تباہیوں کا مجھے کچھ نہیں ملال
خوش ہوں کہ ساری عمر محبت میں کٹ گئی

پھیلی تو آسمان و زمیں تنگ ہو گئے
دل بن گئی، جہاں بھی محبت سمٹ گئی

یہ کون سا مقام ہے تنہا کھڑا ہوں میں
جرار! بھیڑ حسرت و ارماں کی چھٹ گئی

غزل

جگدیش بھٹناگر حیات ایم۔ اے

نازشِ ذوقِ آگہی تو ہے
دیدہ و دل کی روشنی تو ہے

اصلِ ہستی تجھے کہیں تو بجا
چارۂ دردِ زندگی تو ہے

کارفرمائے شغلِ سوز دروں
حسنِ توقیرِ عاشقی تو ہے

بندگی ہے تو ہے تری واجب
حاصلِ ذوقِ بندگی تو ہے

موت پھٹکے گی پاس کیا اُس کے
جس کے نزدیکِ زندگی تو ہے

سجدۂ بے ریا تو ہے مطلوب
اور ہر چیز سے غنی تو ہے

ابتدا بھی حیات کی تجھ سے
انتہا بھی حیات کی تو ہے

بدک جاتی۔ پھسل کر الگ ہٹتی۔ مُنہ چڑانے کے انداز میں کہتی ——

"ورٹی مین!"

میں بل کھا کر رہ جاتا۔ میری ساری نفاست پسندی کہیں دُبک کر بیٹھی ہوتی۔ جیب سے لیمن جُوس نکال کر میں چُپکے سے اُس کی طرف بڑھا دیتا۔ پُچکارتا ——

"بے بی! بے بی!"

اُس کے شوق بھی عجیب تھے۔ زبردستی میرے کپڑے پہن لیتی۔ کبھی میری لُنگی لپیٹ لیتی۔ کبھی میری قمیص، کبھی میرے نئے اُونی سوٹ کا تماشہ بنا دیتی۔ ٹائی کی گرہ باندھنا سیکھتے سیکھتے ایک دن اپنا گلا کس لیا۔ چیخ پڑی۔ آنکھیں اُبل آئیں۔ چُپ بیٹھے ہوئے یہ سب دیکھتے رہنا میرا معمول بن گیا تھا۔

گُڈّا گُڑیے کا کھیل اُسے پسند نہ تھا۔ گھروندے بھی اُسے اچھے نہ لگتے۔ میری چھت پر آ کر وہ مجھ سے پتنگ اُڑانا سیکھتی۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے ایک شام وہ بالکونی سے نیچے لُڑھک گئی ہوتی۔ میں نے اُسے اپنے بازوؤں میں روک کر بچا لیا۔ کئی لمحے میرے سینے سے لگی ہوئی وہ اپنی سانسیں دُرست کرتی رہی۔ پھر اُچک کر پتنگ کی ڈور کھینچنے لگی۔

سنڈے کو پپّو اور ببلی مہندی کی باڑھوں سے پرے ٹرائی سائیکل چلا رہے تھے۔ بندو چھلانگیں لگاتی ہوئی آئی۔ ضد کرنے لگی کہ میں اُسے بائیسکل چڑھنا سکھا دوں۔ میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں شرارت مچل رہی تھی۔ جی مار کر میں اُٹھا۔ بہت دیر تک اُسے پیڈل گھماتا سکھاتا رہا۔ اُس کی کمر میری بانہوں کے گھِر دری۔ پھر اپنے کندھوں کا سہارا دے کر اُسے سیٹ پر بٹھایا۔ ہینڈل موڑتا رہا۔ دو چار راؤنڈ کے بعد وہ چلّائی ——

"ٹھہرو!"

مجھے پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گئی۔ اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں نے بڑھ کر اُسے پکڑنا چاہا۔ آناً فاناً سائیکل سامنے مین گیٹ سے ٹکرا گئی۔ بندو تڑپ کر گھاس پر گری۔ دیر تک اُس کی پنڈلیاں سہلاتا رہا۔ اپنے ہاتھوں کی غیر معمولی توانائی اور اُس کے پیروں کی بے پناہ چکنائی، دونوں پر مجھے حیرت ہو رہی تھی۔

وہ سُرخ سبز سلیکس پہنتی تو اُس کی بھری بھری ٹانگیں اور بھی

نکھر آتیں۔ میں اُسے گھما پھرا کر، چھو کر، کھینچ تان کر دیکھتا کہ کہیں جھول تو نہیں۔ ہر طرح سے مطمئن ہونے کے بعد میرے ہونٹوں پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ اُبھر آتی۔ وہ گیس والے غباروں کے لئے اصرار کرنے لگتی۔ میں لا دیتا۔ اُنھیں لئے لئے وہ چھجے پر چڑھ جاتی۔ غبّاروں کی اُڑان سے وہ ایسے مسحور ہوتی جیسے وہ خود محوِ پرواز ہو! میں صرف اُس کے پیروں کے زاویے دیکھتا اور اپنے ناخن کترنے لگتا۔

میرے پاس جو بلو اپس (Blow-ups) اور پن اپس (Pin-ups) تھے اُنھیں دیکھ دیکھ کر تنہائی میں میں بندو کا خاکہ ذہن میں اُبھارا کرتا تھا۔ کبھی وہ تصویریں میں بندو کو دکھاتا تو انگوٹھا چوستے ہوئے تھرتھراتی آواز میں کہتی ——

"چھی!"

میں سہم کر اُس کی طرف دیکھتا۔ خجل ہو کر سر کھجانے لگتا۔ وہ بھویں سکیڑتی۔ میری رسٹ واچ اُٹھا کر اپنی کلائی پر رکھ لیتی۔ بیلٹ میں باندھ دیتا۔

اسکپنگ (Skipping) سے اُسے بڑی رغبت تھی۔ میں رسی کی قوسوں کو نہیں اُس کے تھرکتے ہوئے کولھوں کو دیکھتا۔ اُس کے تھرکتے ہوئے خوبصورت جسم کو دیکھتا۔ اسکرٹ کے اُڑتے ہوئے کناروں کو پُرشوق نظروں سے دیکھتا۔ پسینے سے تر بتر ہو کر وہ 'روپ' (Rope) میری طرف اُچھال دیتی۔ میری جیب سے رومال نکال کر ہوا کرنے لگتی۔ اُس کی سانسوں کے اُتار چڑھاؤ پر میری نظر رہتی۔

بہت دلچسپی کے ساتھ بکنی (Bikini) اور ہوٹ پینٹ (Hot pant) پہنے ہوئے گداز جسموں والی تصویروں کو دیکھ کر وہ میری طرف ایسے دیکھتی جیسے سوال کر رہی ہو کہ ان پوشاکوں میں وہ کیسی لگے گی؟ زیرِ لب میں مسکرا دیتا۔ کھلے شانوں، کھلی آستینوں، کھلے پیٹ، کھلی پیٹھ والے لباس بھی اُسے خوب جچتے۔

اُسے چڑ تھی تو صرف میرے ہاتھ، پاؤں اور سینے کے گھنے بالوں سے۔ نفرت سے منہ پھیر کر کہتی۔

"ایسے بال تو صرف جانوروں کے اچھے لگتے ہیں!"

میری ہتھیلیوں کے کھُرّے پن، میرے لمبے شیو اور میرے گاؤں کے کھُردرے پن سے بھی اُسے اُبکائی سی آتی۔

شہر میں جس دن کو گیا پاشا کا میجک شو ہونے والا تھا اُسی سہ پہر میں ڈریسنگ گاؤن پہنے وارڈ روب سے اپنے لئے کپڑوں کا انتخاب کر رہا تھا۔ اچانک ہی بندو نے پیچھے سے آکر میری آنکھیں مُوند لیں۔ چند لمحے میں کھویا کھویا رہا۔ آنکھیں کھلیں تو دیکھا بندو ممّی کی ساڑی اناڑی پن سے لپیٹے کھڑی تھی میں نے قہقہہ لگایا۔ وہ بسورنے لگی۔

"ایسے بھی کہیں ساڑی پہنتے ہیں!"

"تو پھر کیسے پہنتے ہیں؟"

میں نے اُسے ساڑی پہنا دی —— ڈوبتے سُورج کی ملگجی روشنی میں میں نے دیکھا بندو مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کاغذ کی تہہ پھاڑتے ہوئے ایک عدد لولی پوپ میں نے اُس کی طرف بڑھا دیا۔ عجیب نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی وہ مُڑی اور جانے لگی!!

پارک ڈیوس کا

تین طرح کے فائدے والا

نیکو صابن

آپ کی جلد کے لئے کسی دوسرے صابن سے کہیں زیادہ کارگر ہے۔

۱ نیکو جلد کے جراثیم کو ختم کرتا ہے

۲ نیکو پسینے کی بدبو کو دور رکھتا ہے

۳ نیکو آپ کی جلد کو صاف اور محفوظ رکھتا ہے۔

ہر روز، تین طرح سے پُر اثر نیکو صابن سے نہائیے۔
جلد کی تندرستی کے لئے یہ بہترین نسخہ ہے۔ نیکو
جراثیم کو ختم کر کے آپ کی جلد کی تندرستی
بنائے رکھتا ہے۔ نیکو میں شامل ادویاتی اجزا
پسینے سے پیدا ہونے والی بدبو کو
جسم سے دور رکھتے ہیں۔
نیکو آپ کی جلد کو چھوت کی بیماریوں سے بچاتا
ہے۔ آپ کی جلد کو آسانی سے اچھی طرح صاف
کر کے نرم و ملائم رکھتا ہے۔
اس سے آپ کی جلد ہمیشہ تروتازہ صاف
شفّاف و شگفتہ بنی رہتی ہے۔
نیکو آپ کی جلد کو کیلوں، مہاسوں اور
گرمی کی شدّت سے محفوظ رکھتا ہے۔
شمپو کی طرح باقاعدہ استعمال سے
نیکو آپ کے بالوں کی خشکی دُور کرتا ہے۔
اپنی جلد کی بہتر دیکھ بھال کے لئے
نیکو اپنائیے۔
تین فائدوں والا
واحد جراثیم کُش صابن،
جو آپ کی جلد کو صاف کرتا ہے۔
اور اُسے جراثیم سے
محفوظ رکھتا ہے۔

نیکو کی عادت اپنائیے۔ یہ آپ کی جلد کے لئے ضروری ہے۔

TRIPLE ACTION

NEKO®

The Original Antiseptic Soap



PARKE DAVIS

® Regd. Trade Mark. Regd. Users—Parke Davis (India) Ltd., Bombay-72 AS.

293

غزل

ظہیر غازی پوری

تجھ سے بچھڑے بھی تو مانندِ گلِ تر ہوں گے
ہم تری یاد کی خوشبو سے معطر ہوں گے

کام آئیں گے یہ تکمیلِ جنوں تک میرے
آئینے ٹوٹ بھی جائیں گے تو نشتر ہوں گے

زہر پی جانے کی بات آئے گی تو میری طرح
آپ دیکھیں گے یہاں کتنے ہی شنکر ہوں گے

کچھ نہ کچھ ہوں گے زمانے میں محبت کے صلے
تیشے جب ہوں گے نہ، پتھر کے لئے سر ہوں گے

میرا ہر قطرۂ خوں اب ہے امانت ان کی
غنچہ و گل جو بہاروں کے پیمبر ہوں گے

فیصلہ اب مری وحشت ہی کرے گی اس کا
پھول ہوں گے کہ ترے ہاتھ میں پتھر ہوں گے

گامزن قافلۂ زیست رہے گا یوں ہی
یہی رہرو، یہی رستے، یہی رہبر ہوں گے

غزل

کاشف الہاشمی اوجینی

میں فضاؤں میں بکھر جاؤں گا خوشبو کی طرح
پھول بن کر وہ مرے ذہن میں مہکے تو سہی

تو بھی دل تھام کے رہ جائیگا اے شیخِ حرم
حادثہ تیری نظر پر کوئی گزرے تو سہی

غم کے تپتے ہوئے صحرا میں کھڑا ہوں تنہا
میرے جلنے کا تماشہ کوئی دیکھے تو سہی

دوستوں سے تو ہمیں اتنی بھی امید نہیں
دشمنو! تم نے کچھ الزام تراشے تو سہی

ہمہ تن چشم ہوں وہ دعوتِ نظارہ تو دے
ہمہ تن گوش ہوں وہ مجھ کو پکارے تو سہی

محتسب معجزۂ مے کا ہوا ہے قائل
انقلاباتِ زمانہ کوئی دیکھے تو سہی

مجھ سے کس بات پہ ناراض ہیں وہ اے کاشف
میں بتاتا ہوں ابھی دل ذرا ٹھہرے تو سہی

پارک ڈیوس کا

تین طرح کے فائدے والا

نیکو صابن

آپ کی جلد کے لئے کسی دوسرے صابن سے کہیں زیادہ کارگر ہے۔

۱ نیکو جلد کے جراثیم کو ختم کرتا ہے

۲ نیکو پسینے کی بدبو کو دور رکھتا ہے

۳ نیکو آپ کی جلد کو صاف اور محفوظ رکھتا ہے۔

ہر روز، تین طرح سے پُراثر نیکو صابن سے نہائیے۔
جلد کی تندرستی کے لئے یہ بہترین نسخہ ہے۔ نیکو جراثیم کو ختم کرکے آپ کی جلد کی تندرستی بنائے رکھتا ہے۔ نیکو میں شامل ادویاتی اجزا پسینے سے پیدا ہونے والی بدبو کو جسم سے دور رکھتے ہیں۔
نیکو آپ کی جلد کو چھوت کی بیماریوں سے بچاتا ہے۔ آپ کی جلد کو آسانی سے اچھی طرح صاف کرکے نرم و ملائم رکھتا ہے۔
اس سے آپ کی جلد ہمیشہ تر و تازہ صاف شفّاف و شگفتہ بنی رہتی ہے۔
نیکو آپ کی جلد کو کیلوں، مہاسوں اور گرمی کی شدّت سے محفوظ رکھتا ہے۔
شیمپو کی طرح باقاعدہ استعمال سے نیکو آپ کے بالوں کی خشکی دُور کرتا ہے۔
اپنی جلد کی بہتر دیکھ بھال کے لئے نیکو اپنائیے۔

تین فائدوں والا
واحد جراثیم کش صابن،
جو آپ کی جلد کو صاف کرتا ہے۔
اور اُسے جراثیم سے
محفوظ رکھتا ہے۔

نیکو کی عادت اپنائیے۔ یہ آپ کی جلد کے لئے ضروری ہے۔

TRIPLE ACTION

NEKO®

The Original Antiseptic Soap



PARKE DAVIS

® Regd. Trade Mark. Regd. Users—Parke Davis (India) Ltd., Bombay-72 AS.

293

غزل

ظہیر غازی پوری

تجھ سے بچھڑے بھی تو مانندِ گلِ تر ہوں گے
ہم تری یاد کی خوشبو سے معطر ہوں گے

سامنے آئیں گے یہ تکمیلِ جنوں تک میرے
آئینے ٹوٹ بھی جائیں گے تو نشتر ہوں گے

زہر پی جانے کی بات آئے گی تو میری طرح
آپ دیکھیں گے یہاں کتنے ہی شنکر ہوں گے

کچھ نہ کچھ ہوں گے زمانے میں محبت کے صلے
تیشے جب ہوں گے نہ، پتھر کے لئے سر ہوں گے

میرا ہر قطرۂ خوں اب ہے امانت ان کی
غنچہ و گل جو بہاروں کے پیمبر ہوں گے

فیصلہ اب مری وحشت ہی کرے گی اس کا
پھول ہوں گے کہ ترے ہاتھ میں پتھر ہوں گے

گامزن قافلۂ زیست رہے گا یوں ہی
یہی رہرو، یہی رستے، یہی رہبر ہوں گے

غزل

کاشف الہاشمی ادھمبنی

میں فضاؤں میں بکھر جاؤں گا خوشبو کی طرح
پھول بن کر وہ مرے ذہن میں مہکے تو سہی

تو بھی دل تھام کے رہ جائیگا اے شیخِ حرم
حادثہ تیری نظر پر کوئی گزرے تو سہی

غم کے تپتے ہوئے صحرا میں کھڑا ہوں تنہا
میرے جلنے کا تماشہ کوئی دیکھے تو سہی

دوستوں سے تو ہمیں اتنی بھی امید نہیں
دشمنو! تم نے کچھ الزام تراشے تو سہی

ہمہ تن چشم ہوں وہ دعوتِ نظارہ تو دے
ہمہ تن گوش ہوں وہ مجھ کو پکارے تو سہی

محتسب معجزۂ مئے کا ہوا ہے قائل
انقلاباتِ زمانہ کوئی دیکھے تو سہی

مجھ سے کس بات پہ ناراض ہیں وہ اے کاشف
میں بتاتا ہوں ابھی دل ذرا ٹھہرے تو سہی

مالکان جائداد!
ٹیکس دہندگان!
کیا آپ کسی بینامی جائداد کے اصل یا سود مند مالک ہیں، یا بظاہر یہ جائداد کسی دوسرے شخص کے نام میں ہے؟

اگر آپ ہیں تو مہربانی کر کے ایسی جائداد کی اپنی بینامی ملکیت کے بارے میں اس حقیقت کا اس طرح انکشاف کرنا نہ بھولیں:-

(ا) اپنی آمدنی کے گوشوارے میں اس کی آمدنی کا اعلان کر کے؛

یا

(ب) اپنی دولت کے گوشوارے میں اس کی قیمت کا اعلان کر کے؛

یا

(ج) انکم ٹیکس رولز 1962ء کے رول 122 کے تحت مطبوعہ فارم 53 میں متعلقہ تفصیلات فراہم کر کے؛

ایسا کرنے میں آپ کا اپنا مفاد ہے، کیونکہ اگر آپ اپنی بینامی زمینوں کی تفصیلات کا انکشاف نہیں کریں گے تو:-

(ا) آپ ایسی کسی بھی جائداد سے متعلق اپنے حقوق پر عملدرآمد کرانے کے لئے کسی بھی عدالت میں مقدمہ دائر نہیں کر سکیں گے اور ہو سکتا ہے کہ آپ کو اپنی جائداد سے محروم ہو جانے کا خطرہ بھی مول لینا پڑے؛

(اا) آپ کو نادرست اور/یا جھوٹا گوشوارہ بھیجنے پر مقدمے میں پھنس جانے کا خطرہ بھی درپیش ہوگا۔

مزید معلومات کے لئے از راہِ کرم اپنے انکم ٹیکس افسر/محکمہ انکم ٹیکس کے افسر تعلقاتِ عامہ سے رجوع کریں۔

جاری کردہ:-

ڈائرکٹوریٹ آف انسپکشن (ریسرچ، سٹیٹسٹکس اینڈ پبلی کیشن)
میور بھون، کناٹ سرکس،
نئی دہلی

davp 73/155

افسانہ

محبت نامہ

ایس۔ ایم حیات بی۔ اے

بلاک نمبر ۱۲ اپارٹمنٹ نمبر ۱ پیٹرسن روڈ ہاؤسنگ کالونی نانگہ ننچھ مدراس نمبر ۱۴۔

مکرمی و معظمی! اسلام مسنون

اس بار ایک محبت نامہ لئے آپ کی خدمت میں باریابی کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔ اُمید کہ رسالے کے مزاج اور انداز پر پورا اترے گا۔ پسند آجائے تو کسی قریبی اشاعت میں جگہ دے کر ممنون فرمائیں۔ کہانی کی رسید اور اشاعت کے متعلق آپ کے فیصلہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔ آپ کی گرانقدر رائے میری لئے مشعل راہ ہوگی۔

"احساس کی خوشبو" کو آپ نے واپس کر دیا۔ کہانی بہت ہی خوب تھی پھر بھی "بیسویں صدی" کے معیار پر پوری نہ اتری۔ یہ میری قسمت کی بات ہے۔ آپ "بیسویں صدی" کے لئے ہر تخلیق خوب پرکھ کر منتخب کرتے ہیں۔ "بیسویں صدی" کی یہی انفرادیت نے اسے دوسرے مقتدر جرائد و صحائف میں ممیز و ممتاز بنا دیا ہے۔ سالنامہ میں شریک نہ ہونے کا بیحد افسوس ہے لیکن "بیسویں صدی" کے عام شمارے بھی سالنامہ سے کم نہیں ہوتے۔

عقیدت کیش ــــــــــــ ایس۔ ایم۔ حیات

★

ٹرین پلیٹ فارم پر پہنچنے کو ہے۔ بانی توش اٹھا۔ سوچا وہ تنہا ہے کچھ سامان وغیرہ ساتھ نہیں ہے۔ سب سے پہلے وہ ڈبے سے اترے گا اور جلد ہی کام سے فارغ ہو کر واپس آ جائے گا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ اس کے خیر مقدم کے لئے شاندار اہتمام کیا گیا ہے تو شاید ڈبہ سے اترنے میں کچھ دیر کرتا اور اپنے اعزاز میں اضافہ کرتا۔ عقیدت مندانہ جذبات سے لبریز آوازیں ـــ "کہاں ہیں؟ کس ڈبہ میں ہیں؟" اسے بھلی معلوم ہوتیں۔ وہ اپنے پرستاروں کو یہ سمجھنے کا موقع نہ دینا چاہتا تھا کہ وہ مہمانِ خصوصی ہے۔ وہ تو بھیڑ میں گم ہو جانے والا ایک مسافر ہے۔ ایسے نہ جانے کتنے ہی مسافر اس اسٹیشن پر روز آتے ہیں اور جاتے ہیں اور پھر مسافروں کے ریلے میں کھو کر بہہ جاتے ہیں۔ بہتے ہوئے پانی کی سطح پر تیرتا ہوا ایک پھول ـــ اس کا ہمسفر شاید پیچھے تیسرے کلاس کے ڈبہ میں سوار ہے۔ اس وقت یہی غنیمت ہے کہ وہ اسے کھوج نکالے۔ ایسا نہ ہو کہ اسے ٹرین میں بٹھا کر وہ وہیں رک گیا ہو۔ اگر وہ نہ بھی ملے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اکیلا پن بھی کبھی کبھی کافی دلچسپ ہوتا ہے۔ اسے خود ہی اپنی منزل کا پتہ لگانا پڑے گا۔ لوگوں سے پوچھتے پوچھتے وہ جلسہ گاہ تک پہنچ ہی جائیگا اور وہاں پہنچ کر منتظمین سے خود ہی اپنا تعارف کرا لے گا ـــ "میں ہی ہوں ـــ بانی توش بند ھوپادھیایا۔ آج کے جلسہ کا مہمانِ خصوصی!" ـــ اس نے پھر سوچا، لیکن اس کا ثبوت کیا ہے؟ نہیں اسے گھیر لیں گے۔ کوئی آپ کو جاننے والا یہاں موجود ہے؟ یہاں سے جسے آپ کو مدعو کرنے کے لئے بھیجا تھا اسے ساتھ کیوں نہیں لیتے آئے؟ کیا آپ بانی توش بنرجی کی تخلیقات کے نام بتا سکتے ہیں؟ ـــ اس طرح کے تصورات کے تانے بانے بننے میں بانی توش کو بہت لطف آتا ہے وہ چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی نیا حادثہ پیش آئے۔ نیا پن اسے ہمیشہ اچھا لگتا ہے۔ بانی توش ان لوگوں میں سے نہیں ہے جو سفر کرتے وقت پورے اہتمام کے ساتھ ساز و سامان اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ اسے کہاں ٹھہرایا جائے گا؟ کسی کا مکان ہوگا یا ڈاک بنگلہ؟ کسی کا مکان ہے تو صاحبِ خانہ کون ہیں؟ اس مکان میں اور کون کون رہائش پذیر ہیں؟ وہ جگہ اسٹیشن سے کتنی دور ہے؟ واپسی کے لئے ٹرین کتنے بجے ملے گی؟ نشست ریزرو کروا کے اسے ٹرین میں بٹھانے کے لئے اس کے ساتھ کون کون آئیں گے؟ باہر پہنچتے ہی گاڑی کا کیا انتظام ہے؟ ویسی

کوچہ

کبھی در کو تک کے کھڑے رہے، کبھی آہ بھر کے چلے گئے
ترے کوچے میں جو ہم آئے بھی، تو ٹھہر ٹھہر کے چلے گئے ——— مصحفی

کوچۂ جاناں کی ملتی تھی نہ راہ
بند کیں آنکھیں تو رستہ کھل گیا ——— قیصر دیاشنکر نسیم

جیتے جی کوچۂ دلدار سے جایا نہ گیا
اُس کی دیوار کا سر سے مرے سایہ نہ گیا ——— میر

ہم ہیں اور سایہ ترے کوچے کی دیواروں کا
کام جنت میں ہے کیا ہم سے گنہگاروں کا ——— ذوق

اُس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا ——— مومن

مرسلہ: نسرین انصاری بھیونڈی (مہاراشٹر)

کسی بھی بات کی اُسے پرواہ نہیں۔ بلکہ کچھ بے ترتیبی ہو۔ اُلٹا پلٹا ہو۔ زندگی نت نئے تجربے سے دوچار ہو جبھی زندگی کا صحیح لطف ملتا ہے۔ اگر کبھی کہیں کوئی بات اِس کی مرضی کے خلاف ہو گئی ہو اور یہ مشکلات میں پھنس جائے جب بھی وہ اُسے زندگی کا ایک دلچسپ پہلو سمجھ کر ہنسنے لگتا اور کہتا ——— زندگی کی راہ میں جہاں دشوار گزار مراحل درپیش آتے ہیں وہیں اُن کا ثابت قدمی کے ساتھ مقابلہ کرنے اور اُن پر قابو پانے کے مؤثر ذرائع بھی موجود ہیں، اِس لئے اپنے ہمسفر کا انتظار کئے بغیر ہی وہ گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔

"سنیئے!" ——— کسی نسوانی آواز نے اُس کے بڑھتے ہوئے قدموں میں زنجیریں پہنا دیں۔

بانی توش رُک گیا۔ ایک نامانوس اور اجنبی آواز۔ لیکن اِس میں شک نہیں کہ مخاطب وہی ہے۔

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟" ——— بانی توش نے پیچھے مُڑتے ہوئے پوچھا۔

جواب میں وہ عورت اُس کے پاؤں کی طرف جُھکی۔ وہ اُس کے پیر چھُونا چاہتی تھی۔

"میں ہوں وندنا اور یہ ہیں میرے پتی ڈاکٹر لوتس!"

جبھی پیچھے سے اُس کا ہمسفر دوڑتا ہوا آ پہنچا اور ہانپتے ہوئے کہنے لگا "آہی

کے بنگلہ پر آپ کو ٹھہرانے کا انتظام کیا گیا ہے۔"

"یہ جان کر بہت خوشی ہوئی!"

بانی توش نے ڈاکٹر لوتس کی طرف مُڑ کر نمستے کی۔

ڈاکٹر نے صرف ایک چھوٹے سے ادب کے ساتھ اپنا سر میکانکی طور پر ہلا دیا۔

"خوشی کی بات تو ہمارے لئے ہے کہ آپ جیسی عظیم ادبی شخصیت ہمارے غریب خانہ میں تشریف فرما ہو کر ہماری اور ہمارے گھر کی عزت کو دوبالا کرے۔"

اِتنا کہنے کے بعد وندنا کسی قدر چنچل ہو اُٹھی ——— "یہ کیا! آپ کا سامان؟"

"میں اپنے ساتھ کچھ نہیں لایا" ——— بانی توش نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا چھوٹا موٹا ایک بیگ بھی نہیں؟" وندنا کی چمکتی آنکھوں میں تحیّر کی آمیزش نے ایک خاص کیفیت پیدا کر دی تھی ——— "سویرے اُٹھ کر آپ شیو کے بارے میں کہہ رہی ہو؟" ——— بانی توش کو ہنسی آ گئی۔

"ایک دن شیو نہ بنائی جائے تو کیا حرج ہے؟"

"اور کچھ بھلے ہی نہ ہو۔ لیکن شیو نہ بنانے سے ڈاکٹر کی ضرورت ضرور پڑ جاتی ہے" ——— وندنا نے مُسکراتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر لوتس گلا پھاڑ کر ہنسنے لگا۔

"خیر! شیو کے سامان کے لئے آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔"

وندنا بھی ہنس پڑی لیکن وندنا کی ہنسی جیسے کسی فنکار کی ہنسی تھی۔

"لیکن خالی ہاتھوں سفر کرنا عجیب سی بات ہے!" وندنا کی آنکھوں سے ہلکا سا تمسخر عیاں تھا "جیب میں رومال ہے یا جیب بھی خالی ہے؟"

"نہیں نہیں وہ تو ہے!" بانی توش قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ دوسرے ہی لمحہ اُس کے چہرے پر خدشہ کے جذبات رونما ہوئے اور وہ کہنے لگا ——— "ٹھہریئے! ذرا دیکھ لوں، کہیں سچ مچ رومال بھی تو نہیں بھول آیا ہوں؟"

گھبراہٹ کے عالم میں وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے کُرتے کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔

"نہیں نہیں ہے! لایا ہوں۔ دیکھیئے نا! ساتھ ایک رومال نہ ہو تو بڑی مصیبت ہو جاتی ہے۔"

بانی توش کا بچپن جیسا کھویا کھویا پن وندنا کو بہت بھا گیا۔ اُس نے پوچھا "اُس جیب میں کیا ہے؟"

"صرف ایک ماچس۔"

"شاید سگریٹ نوشی کا شوق ہے؟"

"پیتا تھا۔ ابھی نہیں پی رہا ہوں۔ آخری سگریٹ اسٹیشن آنے کے

پہلے ہی پھونک چکا ہوں۔ یادگار کے طور پر یہ ایک ماچس بچی ہے بس!"

"ٹھہریئے! میں سگریٹ لاتا ہوں"ـــ ہمسفر لڑکا یہ کہتے ہوئے آگے بڑھا۔

"یہ کیا! سگریٹ تم کیوں لاؤگے؟ یہ تو میرا فرض ہے۔ اس میں جو پیش کش ہو میری ہی طرف سے ہونا چاہیئے" سامنے کی جیب سے بانی توش نے پرس نکالا۔ وہ انکار کا نہیں۔ وہ بھلا کیوں کرتا۔ مہمانِ خصوصی کی ساری ضروریات کی تکمیل منتظمین جلسہ کی اہم ذمہ داری ہے۔

"سامنے کی جیب خاصی بھری نظر آتی ہے!"ـــ وندنا نے شوخی سے کہا۔

پرس کو اپنی جیب میں رکھتے ہوئے بانی توش نے کہاـــ "لیکن پوری طرح نہیں!"

"آپ لوگوں کا کیا! آپ لوگ تو ـــــ"

اور وندنا نے سلسلۂ کلام کو ایک دم منقطع کر دیا۔ ڈاکٹر پرسادورس نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا اور کہا ـــ "چلو، اب چلیں!"

"ہاں، ہاں!" وندنا جیسے نیند سے ایکا ایک چونک پڑی ـــ "ہم پہلے سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ قلی وغیرہ کی ضرورت بھی تو نہیں۔ ساتھ میں کوئی سامان بھی تو نہیں ہے!"

"ہاں چلو!"ــــ ڈاکٹر نے پہل کی۔

اس لڑکے نے بانی توش کے ہاتھ میں سگریٹ کا پیکٹ تھما دیا۔ پیکٹ کھول کر بانی توش نے اسے ڈاکٹر کے سامنے پیش کیا۔ ڈاکٹر نے کہا "نو تھینکس!"

"یہ اس کی لذت سے ناآشنا ہیں!"ــــ منہ بناتے ہوئے وندنا نے کہا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے!"ــــ بانی توش نے عقیدت کے جذبات اپنے چہرہ پر لاتے ہوئے کہاــــ "کسی بھی نشہ کی گرفت میں آجانے کا مطلب ہے اپنے آپ کو اس کا غلام بنا دینا!"

سگریٹ سلگائے بغیر ہی بانی توش نے پھر پیکٹ اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"لکھنا بھی تو ایک نشہ ہی ہے!"ــــ وندنا نے کہا۔

"ہاں! اسی لئے صبح شام کچھ نہ کچھ لکھنا ہی پڑتا ہے۔ کچھ نہ لکھوں تو بھوک نہ لگے گی، نیند نہ آئے گی!"

"لیکن کچھ بھی ہو آج کی رات آپ کو لکھنے نہ دیا جائے گا۔ ہاں!" تھوڑا سا حق جتلاتے ہوئے وندنا نے کہا۔ "آپ کے پاس بیٹھ کر کہانیاں سنوں گی"

وہ لڑکا اچھل کر سر پر سوار ہونے کے انداز میں بولا ــــ "وندنا دی بھی لکھتی ہیں!"

وندنا دی! ــــ اس اندازِ تعارف سے وہ وندنا کی عمر کا اندازہ نہیں لگا نا چاہتا تھا۔ ایک واقف کار کسی اچھے گھر کی عورت کو دیدی کے علاوہ اور کہہ کا بھی کیا؟

"کیا یہ سچ ہے کہ آپ بھی لکھتی ہیں؟"ــــ لکھنا جیسے کوئی قابلِ صد ستائش کارنامہ ہو بانی توش کو دلی مسرت ہوئی۔

"سب کچھ کاغذات تک ہی محدود ہے!"ــــ وندنا کے شوہر ڈاکٹر پرسادنے کہا۔ اُس کے بولنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ ایک بھیگا کمبل پھینک کر مار رہا ہو!

بانی توش نے ایک جھٹکے کے ساتھ اُس کمبل کو اُتار پھینکنا چاہا۔ اُس نے کہا۔ "ابتدا میں سبھی کا لکھنا اپنی کاپیوں تک ہی محدود رہتا ہے۔ اُس کے بعد مقامی اخبارات اور رسائل میں جگہ ملنے لگتی ہے اور ایک منزل پر پہنچ کر فنکار کا فن اپنا لوہا منوالیتا ہے بشرطیکہ اُس میں آگے بڑھنے کی سچی لگن ہو اور وہ اپنا حوصلہ بلند رکھے۔ خیر آپ کیا لکھتی ہیں؟"

"طبع آزمائی کے لئے میں نے سب سے آسان صنفِ ادب کا انتخاب کیا ہے۔ جدید شاعری!"ــــ وندنا کا جواب مزاح کا پہلو لئے ہوئے تھا۔

تصوّر

سراپا آرزو بن کر تصوّر آشنا ہو کر
رہیں گے ہم انہیں کے روبرو اُن سے جدا ہو کر ــــ شکیل بدایونی

تصوّر ایک ذہنی جستجو کا نام ہے شاید
دل اُن کو ڈھونڈھ کر لاتا ہوا محسوس ہوتا ہے ــــ قتیل شفائی

تیری روداد کسی نے بھی سنائی نہ ہمیں
تیری صورت بھی تصوّر نے دکھائی نہ ہمیں ــــ فراق گورکھپوری

تصوّرات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں
کبھی گمان کی صورت کبھی یقیں کی طرح ــــ ساحر لدھیانوی

آج بھی اُن کی محبت کا تصوّر ہے وہی
آج بھی کوئی مجھے دادِ وفا دیتا ہے ــــ جاں نثار اختر

مرسلہ: سلطان احمد ساحل ہرگانوی، جمشید پور

بانی توش نے سنجیدگی سے کہا: "شاعری، شاعری ہوتی ہے وندنا جی
اس میں قدیم اور جدید نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ شاعری غیر فانی اور ابدی
چیز ہے!"

"اپنی کاپی ایک بار انھیں دکھاتا ہے تو اس کا سر پیر کچھ بھی سمجھ
میں نہیں آتا۔ شاید انھیں اچھی معلوم ہو!" ___ وندنا کے شوہر نے کہا۔

"ہاں، ہاں ضرور دکھائیے گا!" ___ بانی توش نے پُرخلوص انداز
سے کہا۔ "آپ کی نظمیں مجھے ضرور اچھی معلوم ہوں گی۔"

وندنا نے اپنے شوہر کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے پیار سے
کہا۔ "پاگل ہو گئے ہو کیا؟"

"جو پاگل نہیں ہوتا، کیا وہ کوئی شاعری کرتا ہے!" اپنے مذاق پر
آپ ہی منہ پھیلا کر ڈاکٹر ہنسنے لگا۔ "اگر انہیں پسند آجائیں تو ایک دو نظمیں
چھپوانے کا انتظام بھی کر دیں گے۔"

"ضرور کروں گا!" ___ بانی توش نے حوصلہ افزا جواب دیا۔

کار کے سامنے سبھی آکر کھڑے ہو گئے۔ ڈرائیور نے دروازہ کھولا۔
جبھی اس لڑکے نے کہا۔

"تو میں چلوں وندنا دی! فنکشن ۷ بجے شروع ہوگا۔ ابھی پورے
تین گھنٹے باقی ہیں۔ آپ آرام فرمانے کے بعد ٹھیک وقت پر جلسہ گاہ میں لے
آئیے گا!"

"تم لینے نہ آؤ گے؟" ___ وندنا جیسے کچھ ڈر سی گئی تھی۔

"کوشش کروں گا۔ اُدھر کا بھی تو دیکھنا ہے۔ کتنا کچھ ہوا ہے۔"

پھر اس نے بانی توش کی طرف دیکھتے ہوئے بغیر ہچکچاہٹ کے کہا۔

"آپ کو سب سے ذمّہ دار شخصیت کے ہاتھوں سونپ دیا ہے۔ ہمارے
ثقافتی ادارہ کی سکریٹری وندنا دی ہی ہیں!"

"سب ڈیکوریشن ہے" ___ ڈاکٹر نے ڈرائیور کی بغل میں بیٹھتے
ہوئے کہا۔

ڈاکٹر ہی کی کوشش سے کار میں نشستیں اس طرح سے رکھی گئی تھیں۔
خود ڈاکٹر یہ چاہتا تھا کہ وندنا بانی توش کے بغل میں بیٹھے۔ اس پر بانی توش
دل ہی دل میں ہنسنے لگا۔

ڈاکٹر نے کہا ___ "میں راستے میں اتر جاؤں گا۔ ایک بیمار کو دیکھنا ہے۔"

"کیا بہت سیریس کیس ہے؟" بانی توش نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہاں! بہت زیادہ سیریس!" وندنا نے تائید کی۔ "وہ ایک ایسے مرض کا
شکار ہے جس کا مریض صحت یاب نہیں ہوتا۔ وہ لاعلاج ہے۔"

"کیا مرض ہے؟" ___ ہمدردی اور خوف کے ملے جلے جذبات کے
تحت بانی توش پوچھ بیٹھا ___

"سردی!"

"سردی!" بانی توش نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

"آپ ہنس رہے ہیں؟ سردی کبھی ختم ہوتی ہے یا اس کی کوئی دوا موجود
ہے؟ جانتے ہو میرے پتی ڈاکٹر بیمار کو کیا کہتے ہیں؟ کہتے ہیں شدید ٹھنڈک میں
کھلے بدن رہ کر سردی کو مونیے سے بدل دو، پنسلین دیکر صحتیاب کر دوں گا۔
لیکن سردی کا علاج کروں یہ میرے بس کی بات نہیں!"

سبھی ایک ساتھ ہنس پڑے۔

"بہت خوب! چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج ڈاکٹر کے پاس موجود نہیں ہوتا
ڈاکٹر تو صرف خطرناک بیماریوں کا علاج کر سکتا ہے!" بانی توش نے ہنستے ہوئے کہا
___ ڈاکٹر بیچ سادہ راستے میں کار رکوا کر نیچے اتر گیا۔

"گاڑی بھیجنے کی ضرورت نہیں!"

"تم ان کی تقریر سننے نہ آؤ گے؟"

"کوشش کروں گا اگر وقت سے پہلے کام ختم ہو جائے!"

نہ جانے وندنا کیا کچھ کہنا چاہتی تھی کہ بانی توش بول اٹھا۔ "تمہارے
ایک سراسر بکواس سننے کی بجائے کسی بیمار کا علاج کہیں زیادہ اہم ہے۔

ڈاکٹر کے لبوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس نے وندنا سے کہا "مہمان کا
خاص خیال رکھنا خاطر تواضع میں کوئی کمی نہ رہ جائے، ہو سکا تو میں سیدھا وہیں
چلا آؤں گا۔" پھر بانی توش سے مخاطب ہوا: "آپ اپنا ہی مکان سمجھ کر یہاں
رہیے گا!"

کار نے رفتار پکڑ لی۔

بانی توش جوتے کے تسمے کھول کر انھیں پر پاؤں رکھے ہوئے بیٹھا تھا کہ
یکایک وندنا نے ان پر ہاتھ رکھ دیئے۔

"اس وقت آپ نے مجھے قدم بوسی سے روک دیا تھا۔ آپ کے چرن چھوئے
بغیر مجھے چین نہ آئے گا ___ آپ کتنے عظیم ___ کتنے بڑے ___"

"ہاں عمر میں تو بڑا ہوں ہی ___"

بانی توش نے وندنا کی عقیدت کا احترام کیا۔

"تو پھر آپ مجھے تم کیوں نہیں کہتے؟"

بانی توش قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

"فرمائش کر کے کہلوا لینے سے کیا اچھا لگتا ہے؟ جب یہ لفظ اپنے آپ ہی منہ سے نکل جائے تو وہ کچھ اور ہی کیفیت کا حامل ہوتا ہے۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے آپ اور تم میں ایک مبہم سا خط فاصل ہے۔ آج کل تو ہر جگہ ایک انقلاب برپا ہے آپ کہہ کر مخاطب ہوئیے۔ اگر ہم سب کو آپ کہہ کر بلانے لگیں تو پھر اپنا کون ہوگا؟"

"آپ کا ہو سکنا بھی قسمت کی بات ہے!" اپنے آپ خیالوں میں ڈوبی ہوئی وندنا کی زبان سے یہ بات بے اختیار پھسل پڑی تھی کہ وہ چونک کر اٹھی جلدی سے بات بدلتے ہوئے اس نے کہا "آپ کو سگریٹ کا شوق نہیں ہے سگریٹ سے تو ایک ادیب کی پُر وقار شخصیت اور بھی با وقار ہو جاتی ہے!"

بانی توش اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ "ایک عورت کے سامنے سگریٹ پینا کہاں تک مناسب ہے یہی سوچ رہا تھا۔"

"چھوڑیے بھی! میرے خیال میں آپ کا ہر فعل مستحسن ہوگا۔ آپ نہیں جانتے کہ میں آپ کی کتنی بڑی پرستار ہوں!"

"پرستار" — بانی توش نے جیسے کوئی نئی بات سنی ہو "کیا آج کے اِس دور میں بھی اب تک یہ سب باتیں ہوتی ہیں؟"

"آپ کے ناولوں کے کتنے ہی کرداروں کے مکالمے میری زبان زد ہو چکے ہیں۔ آپ کی بہت سی نظمیں میرے دل میں گُندھی پڑی ہیں۔ سُنیں گے؟"

"ضرور" بانی توش نے سگریٹ جلایا۔

وندنا، بانی توش کے ناولوں کے پسندیدہ مکالمے بولنے لگی۔ اُن کا حوالہ بھی برابر بتلاتی جا رہی تھی۔ بانی توش کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ کتنے غور و فکر کے ساتھ وندنا نے اِس کی تخلیقات کا مطالعہ کیا ہے۔ کتنی وسعت نظر سے اُن کا انتخاب کیا ہے۔ اُن کا تجزیہ کیا ہے ورنہ اتنی ساری چیزیں یاد کیسے کر سکتی جبکہ میری بہت سی تحریریں خود مجھے یاد نہیں۔

"آپ کا مطالعہ کافی گہرا ہے اور حافظہ بھی بلا کا تیز ہے!" بانی توش نے حوصلہ افزائی کی۔

"صرف مطالعے سے کیا ہوتا ہے — پیار — آپ نہیں جانتے آپ کی کتابوں سے میں کتنا پیار کرتی ہوں جب بھی اُن کا مطالعہ کرتی سوچتی تھی آپ کو کب دیکھ پاؤں گی، آپ کو کب سنوں گی۔ پتہ نہیں آپ کتنے خوبصورت ہوں گے!"

بانی توش یکایک چونک اُٹھا۔

"اپنے ڈرائیور سے کہہ کر گاڑی رکوا دیجیے۔ میں اُترنا چاہتا ہوں!"

"آپ اُتر جائیں گے؟ یہ کیا؟" وندنا نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بانی توش کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کیوں کیا ہوا؟"

"آپ کے حسین تصورات کے تار و پود بکھیر دینے کے بعد اب سیاہ پہاڑ کی طرح بیٹھا رہوں یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا — کہیے کار رکوا!"

"کیا آپ سچ مچ چلے جائیں گے؟" وندنا کے اضطراب میں اضافہ ہو گیا۔ "کیوں چلے جائیں گے؟ میں نے ایسا کیا کہا ہے؟"

بانی توش کسی بھی صورت یہاں سے بھاگ نکلنے کے لئے تیار نہ تھا۔

صرف وندنا کو مضطرب دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا — وہ بولا "اوہو! آپ کتنی باحوصلہ ہیں جس کی کتابیں آپ پسند کرتی ہیں اسے آپ دیکھنا چاہتی ہیں، اُس کے ساتھ واقفیت پیدا کرنا چاہتی ہیں۔ اور پھر ان سپنوں پر پانی پھیر دینے کے بعد بھلا کوئی بیٹھا رہ سکتا ہے؟"

"اُمیدوں پر پانی پھیر دینا! لیکن آپ تو میرے سارے تصورات سے بھی بہت آگے نکل گئے ہیں!" وندنا گہرے خیالات میں ڈوبی کہتی گئی —

"آپ نہیں جانتے آپ کی اَن دیکھی شخصیت میرے سامنے آسمان کے ستارے کی طرح جھلملا رہی تھی لیکن اب آپ کو دیکھ لینے کے بعد تو ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے آپ دیوتا ہیں۔ اُسی دیوتا کو میں اپنے گھر لئے جا رہی ہوں جس سے میرا گھر تیرتھ ہو جائے۔ میں آج خوشی سے پھولی نہیں سما رہی ہوں!"

بانی توش نے سوچا شاید اِسی کو پرستش کی معراج کہتے ہیں۔ ایک محبوب شخصیت سامنے ہو اور پرستار اُسے جی بھر کر دیکھنا چاہتا ہو اور دوسری طرف اُس محبوب شخصیت کا یہ عالم کہ وہ اپنے پرستار کے شوق کی شدت کو دیکھنا چاہتا ہے۔

خوشی کے ہنستے لمحات کو وندنا نے یکایک ایک درد بھری فریاد کی لَے میں ضم کر دیا اُس نے کہا۔

"لیکن جانتے ہیں آپ! مجھے کوئی کامیابی نہ ملی میں کچھ بھی نہ کر سکی!"

"کیا نہ کر سکیں آپ؟"

"کہانی وہانی تو خیر میں لکھ ہی نہ سکی نظمیں کہنا جنھیں میں آسان سمجھتی تھی وہ بھی مجھ سے نہ ہو سکا میری کوششیں رائیگاں گئیں جتنی بھی نظمیں میں نے کہی ہیں وہ سب کی سب ناقابلِ اشاعت ٹھہرا دی گئیں جیسے دنیا میں قدر دان ہی نہیں رہے۔"

انسانوں کو رنج بھی کتنے عجیب و غریب انداز سے ہوا کرتے ہیں۔

یہ بھی ایک طرح کا رنج ہے۔ زندگی کے دوسرے غموں کی طرح یہ بھی ایک گہرا غم ہے۔

بانی توش ہمیشہ اُمیدوں کو قائم رکھنے والی حوصلہ افزا باتیں لکھتا رہتا ہے۔ اسی لئے اس وقت بھی وہ وندنا کی ڈھارس بندھانے لگا۔

"سب کچھ ہوگا وندنا جی! ضرور ہوگا! حوصلہ کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ کامیابی تمہارے قدم ضرور چومے گی۔"

"یہ صرف خیال ہے، خواب ہے۔" وندنا نے مایوس لہجہ میں کہا۔ "یہ ایک ایسی چیز ہے جو صرف شاید حوصلہ رکھنے سے حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے لئے سرپرستی کی ضرورت ہے۔ اچھے کرموں کی بھی ضرورت ہے!"

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں جو ہوں!"

گھر پہنچ کر وندنا نے اپنے آپ کو مہمان نوازی میں تن اور من سے غرق کر دیا۔ شامی اور جمی نے پاؤں چاٹ کر اسے کچھ چڑچڑا کر دیا تھا۔ باقی سب کچھ پیار کے ساگر کی طرح ہلکورے لے رہا تھا۔

نچلی منزل پہ ایک خوبصورت اور پُر سکون کمرہ مہمان کی رہائش کے لئے سجایا گیا۔ بیش قیمت قالین، خوبصورت پردے، خوبصورت پلنگ ــــ پوش، ٹیبل، کرسیاں، ٹیبل پر قرینے سے رکھا لکھنے کا سامان، اخبارات اور رسائل، پھولوں سے سجے گلدان۔ بلوری صراحی اور گلاس ــــ روشنی میں دو رنگوں کا اہتمام ــــ بیڈ سوئچ پر چمکتا ہوا نیلا رنگ۔ ہر پہلو سے آرام و آسائش کا خاص خیال۔ چائے کے دوران کئی لوازمات کا اہتمام، حالانکہ رات کا کھانا ابھی باقی ہے۔ کپڑوں کی تبدیلی کے خیال سے وندنا ڈاکٹر کی نئی دھوتی اور کرتہ اٹھا لائی اور کہنے لگی "آج تو انھیں سے کام چلا لیجئے گا۔ کل تک نئے کا بندوبست کر دوں گی۔"

"نہیں نہیں! میں ایسے ہی ٹھیک ہوں!" ــــ بانی توش پریشان ہو اُٹھا۔ "میں انھیں کپڑوں سے جلسہ میں جاؤں۔ کسی دوسرے کے کپڑے میں کیسے پہن سکتا ہوں؟"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں!" وندنا ہنس پڑی ــــ میٹھی ناراضگی سے بھری ہنسی ــــ "ڈاکٹر صاحب کے کپڑے پہنیں گے تو ہو سکتا ہے آپ بھی اُن کی طرح خشک مزاج ہو جائیں۔ سوکھی لکڑی کی طرح خشک۔ منہ سے بات ہی نہ نکلے گی۔ سبھی کچھ تو ساتھیوں کی صحبت کے اثر سے بنتا اور بگڑتا ہے۔" چہرے پر پہلے سی گہری سوچ کی پرچھائیاں رینگنے لگیں ــــ "لیکن کل کیا کریں گے آپ؟"

"کل کی بات کل دیکھی جائے گی۔"

"لیکن کچھ بھی ہو میں آپ کو جلدی چھوڑنے والی نہیں۔ کچھ دن آپ کو یہیں رہنا ہوگا! آپ کو اپنے پاس رکھوں گی۔ جی بھر کر آپ کی خدمت کروں گی۔ ساتھ رہوں گی جب تک کہ آپ میری روح میں تخلیق کا اعجاز نہ سمو دیں اور آپ مجھے اچھی سی شاعرہ نہ بنا دیں۔"

یہ بھی ایک جنون ہی تو ہے ــــ پاگل پن ــــ بانی توش نے سوچا یہ ایک ادبی جنون ہے۔

"آپ کے پتی، ڈاکٹر بوس کو اعتراض تو نہ ہوگا؟"

"نہیں وہ ان سب باتوں کی طرف بھول کر بھی نہ دیکھیں گے۔ آپ اور میں لائبریری میں بیٹھ کر پڑھیں گے، لکھیں گے۔ اُن کے لئے لائبریری تو کالے پانی کی طرح ہے۔ اُدھر وہ جھانک کر بھی نہ دیکھیں گے۔ بلکہ وہ تو دل ہی دل میں خوش ہوں گے ــــ میں ایک نامور ادیب کی صحبت پا کر ادیبہ بن گئی ہوں۔ بیوی کی تخلیقات مقتدر رسائل میں شائع ہوں تو شوہر کا وقار بھی بڑھے گا! اچھا، بغل ہی میں میری لائبریری ہے۔ چل کر دیکھئے کتنی ساری کتابیں ہیں۔ آپ کی کتابیں ــــ" تھکن سے چُور بانی توش نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے کہا۔ "دل کی آنکھوں سے دیکھنے دیجئے!" پھر آنکھیں کھول کر ہنستے ہوئے اس نے کہا ــــ "یہ کیا! ابھی تک آپ لوگوں کے فنکشن کا وقت نہیں ہوا؟"

"بہت بیکار بات ہے!" وندنا ذرا سی بھی پریشان نہ ہوئی۔ "اگر یہ فنکشن نہ ہوتا تو کتنا لطف آتا! گاڑی لے کر ہم دونوں نکل پڑتے۔ کتنی دور چلے جاتے! اس کا کوئی اندازہ نہیں۔ آپ دل کھول کر باتیں کرتے۔ میں ہمہ تن گوش بنی رہتی۔ رات کو گھر لوٹ کر ــــ ایک نظم لکھ بیٹھتی۔ کون جانے ہو سکتا ہے وہی حقیقی شاعری بن جاتی ــــ بڑوں کی صحبت میں بڑا پھل ہی ملتا ہے!"

"آپ تو فنکشن کی سکریٹری ہیں نا؟" بانی توش حیرت سے بولا۔ "آپ اپنی ذمہ داری کو کیسے بھول سکتی ہیں؟"

"خاک پڑے فنکشن پر! ناحق ذمہ داری میرے سر تھوپ دی گئی ہے۔ میں چاہتی ہوں میں ایک اچھی ادیبہ بن جاؤں۔ میں کسی طرح کے ضابطے کو نہیں مانتی!"

بانی توش نے ایک دم خشک گلے سے کرخت لہجہ میں کہا۔ "بالکل نہیں! ادیبہ بن جانے کے بعد آپ محسوس کریں گی کہ آپ کی ذمہ داری

بیسویں صدی دہلی ستمبر ۱۹۷۳ء

سب سے زیادہ ہے! اچھئے اب چلیں فنکشن چاہے کتنا چھوٹا ہی کیوں نہ ہو اپنی ذمہ داری تو نہیں بھلائی جا سکتی۔ وقت کافی ہو گیا ہے!"

وندنا بادلِ ناخواستہ آگے بڑھی۔ وہ بھی بانی توش کی طرح جیسی بیٹھی تھی ویسی ہی چل دی کسی طرح کا بناؤ سنگھار کئے بغیر۔ یہ اُس کا غرور نہیں ہے، غرور اُسے زیبا نہیں دیتا۔ یہ صرف اُس عظیم شخصیت کی پیروی تھی۔ کمالِ دلفریبی کا اظہار!

گاڑی میں جاتے ہوئے بانی توش نے کہا "آپ سے ایک بات کہوں، ادب کوئی کسی کو سکھا نہیں سکتا۔ سب کچھ اپنے آپ ہی سیکھنا پڑتا ہے"

"اپنے آپ؟"

"ہاں گہرے حادثات سے، مسرتوں اور قہقہوں کے طوفانوں کے بیچ ہنسی اور کلکاریوں سے پُر لمحات سے۔ وندنا جی! ذاتی تجربات ہی سچے معلم ہوتے ہیں اور شاعری پیار سے بھی سیکھی جا سکتی ہے۔ کیا آپ کی زندگی میں کبھی کسی دن کوئی پیار کا کنول نہیں کھلا؟"

"نہیں ——"

"نہیں! مجھے یقین نہیں آتا۔ آپ دیکھنے میں کتنی خوبصورت ہیں!"

"میں خوبصورت ہوں! یہ آپ کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں! بالکل سچ کہہ رہا ہوں! اسی لئے تو پوچھ رہا ہوں کہ زندگی میں کیا آپ کو ایک بھی محبت نامہ نہیں ملا؟"

"محبت نامہ؟"

"ہاں! محبت نامہ کے جواب میں محبت نامہ لکھتے لکھتے ہی بے خودی کے عالم میں وہ تحریر شاعری بن جاتی ہے۔ کسی دن ڈاکٹر لوس نے بھی نہیں لکھا؟"

"انھوں نے اب تک مجھے کُل دو خط لکھے ہیں۔ اور وہ دونوں بھی دواؤں کے نسخے!"

"کوئی بات نہیں! میں آپ کو لکھوں گا!"

"آپ مجھے محبت نامہ لکھیں گے؟ کیا سچ مچ لکھیں گے؟"

"کہا نا! میں ضرور لکھوں گا!"

"بتائیے نا کیا لکھیں گے؟"

"ایک ادیب جب اپنے کسی پرستار کو خط لکھتا ہے تو وہ خط محبت نامہ بن جاتا ہے۔"

"سچ! میں صرف آپ کی تخلیقات کا مطالعہ ہی نہیں کرتی آپ کی پرستار بھی ہوں۔ سچ سچ بتائیے نا کیا آپ مجھے محبت نامہ لکھیں گے؟ آپ کتنے اچھے ہیں! کتنے بلند ہیں!"

جلسہ میں بانی توش کی تقریر پروگرام کے شروع میں ہی رکھوا کر وندنا اپنے مہمان کو اپنے ساتھ لئے وہاں سے چلی آئی۔ دوسرے منتظمین سے کہا "آپ کی طبیعت کچھ ناساز سی ہے بہت تھک گئے ہیں۔ جلسہ ختم ہونے تک نہ بیٹھ سکیں گے۔ آپ میرے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اس لئے مجھے بھی ان کے ساتھ ہی جانا ہوگا۔ اب تو آپ لوگ پروگرام کے مطابق کارروائی چلائیں۔" وندنا کے لئے ان پروگراموں میں آج کوئی کشش نہ رہی۔ یہ سب اُس کی نظر میں بے سود تھا لوگوں سے بھرے ہال میں وندنا کی متلاشی نظریں چاروں طرف گھوم پھر کر لوٹ آئیں۔ اگر وہ آئے ہوتے تو سامنے ہی کی نشستوں پر دکھائی دیتے۔ نہیں —— ڈاکٹر لوس دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔ کار واپس چل پڑی۔

"آپ کتنا اچھا بولتے ہیں!" —— وندنا کی آواز میں عقیدت اور گہرے تاثر کی آمیزش تھی۔ "آپ کی ایک ایک بات دل میں اُتر جاتی ہے جی چاہتا ہے کہ آپ ساری رات بولتے رہیں اور میں آپ کے سامنے بیٹھی سنتی رہوں!"

"مجھے اپنی ذمہ داری کا پورا خیال ہے" —— بانی توش مسکرایا۔

"اسی لئے آدھ گھنٹے سے زیادہ نہیں بولتا۔"

"تقریروں کے بعد پروگرام میں ناٹک اور ناچ وغیرہ شامل تھے۔ شاید اسی لئے آپ کو اختصار سے کام لینا پڑا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پروگرام میں اُنہیں فنکار اور تقریر کرنے والوں کو کیوں شامل کیا جاتا ہے؟"

"ناٹک تو تقریروں کے بعد ہی میں ہے" —— دل ہی دل میں بانی توش نے کہا۔ اور اس ناٹک ہی کو دیکھنے کے لئے تو اتنے لوگ جمع ہوئے ہیں۔ اُس نے کہا "وہاں سے جب پہلے ہی چھٹکارا مل گیا ہے تو میرا خیال ہے کہ آپ مجھے سیدھا اسٹیشن ہی چھوڑ آئیں۔"

"یہ کیا؟" —— وندنا کے دل میں ایک ٹیس اُٹھی —— "آپ چلے جائیں گے؟ میری نظمیں نہ دیکھیں گے؟ اُن پر اصلاح نہ کریں گے؟"

"ارے نہیں نہیں میں کوئی سچ مچ جا تھوڑے رہا ہوں" تسلی دیتے ہوئے بانی توش نے کہا "وہ تو میں نے ویسے ہی کہہ دیا تھا مجھے تو ابھی آپ کے ساتھ رات کا کھانا کھانا ہے اور مجھے تھوڑے آرام کی بھی ضرورت ہے۔ ایسا نہ کیا تو صحت کیسے بنی رہے گی؟"

بیچ بیچ ہی چلا جانا اچھا نہ ہوگا ــــ بانی توش نے اپنے دل میں سوچا وہ تو یہ چیز کو اس کے انجام تک دیکھنے والے لوگوں میں سے ہے اسی لئے وہ یہاں سے بھی آخر تک دیکھے بغیر نہ جائے گا۔

وندنا چند لمحوں تک گم صُم بیٹھی رہی۔ سچ ہی ہے۔ بانی توش بھلا بھلا وہاں کیوں سہنے لگا۔ اس میں ہے ہی کیا جو بانی توش کو وہیں روکے رکھے اُس کے پاس ایسا کیا ہے جو دے کر وہ اپنے محبوب فنکار کو خوش کرسکے۔ ایسا کوئی طلسم بھی نہیں جس سے وہ بانی توش کو باندھ کر رکھ سکے، وندنا کا چہرہ اچانک مُرجھا سا گیا۔

"میرا کوئی بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ میرا پورا گھر سُونا ہے۔ ساری نظمیں ادھوری ہیں۔ اسی لئے مجھے کچھ دیجئے۔ دکھ دیجئے یا خوشی لیکن مجھے آپ ایک کامیاب شاعر بنا دیجئے!"

"ہاں۔ ہاں! تم پریشان نہ ہو تم شاعرہ بنوگی اور ضرور بنوگی!" وندنا کو تسلی دیتے ہوئے بانی توش نے کہا۔

آدھی رات بیت جانے کے باوجود بانی توش سونے نہ گیا۔ کپڑے تبدیل کئے بغیر وہ وہیں بیٹھا رہا۔ اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا پھر بھی وہ ٹیبل لیمپ کے سامنے بیٹھا لکھ رہا ہے اور لکھتا چلا جا رہا ہے۔ کوئی طبع زاد تخلیق نہیں۔ صرف سامنے پڑے اخبار میں سے چند کالموں کے اقتباسات نقل کرتا جا رہا ہے جب دل کے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں اور دل بے چین ہو اٹھتا ہے تب وہ اسی طرح نقل کرنے لگتا ہے۔ اس سے اس کا سر ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ دل میں بھڑک اٹھے ہوش و خرد کو جلا دینے والے شعلے سرد پڑ جاتے ہیں۔

بانی توش لکھتا جا رہا ہے اور سوچ رہا ہے ـــــ شوہر نے سب کچھ دیا ہے۔ گھر بار دولت و ثروت آرام و آسائش پھر بھی وندنا سکھ سے محروم ہے!

اخبار کھولتے ہی ریل کے ایک بھیانک حادثہ کی خبر نے اسے متوجہ کرلیا۔ بانی توش اسی کالم سے مضمون نقل کر رہا ہے اور درمیان میں ایک دو سطر اپنی طرف سے شامل کرتا چلا گیا ہے۔ سبھی سکھوں کی تہہ میں انسان کی ذمہ داری کا صحیح احساس کارفرما ہے جو یہ کہہ سکتا ہے کہ ذمہ داری نبھائی ہے وہی سکھی ہوتا ہے۔ ٹرین کی ذمہ داری ہے پٹری پر چلتی رہے۔ ادیب کی ذمہ داری ہے وہ اپنے حواس کو اپنے قابو میں رکھے۔ اپنے حدود متعین کرلے اور اس سے آگے نہ بڑھے۔ ایک شاعر کی ذمہ داری ہے وہ ردیف و قوافی کے ضابطوں کا پابند رہے۔ ذمہ داری سے انحراف حادثات کا پیش خیمہ ہے!

"کتنی رات بیت چکی ہے کچھ اندازہ ہے آپ کو؟" وندنا نے آکر کہا۔ بانی توش چونک پڑا۔ اس نے دیکھا وندنا اس سے بالکل قریب کھڑی ہے بھرپور جوانی میں مدماتی خوشبو بکھیرتی ہوئی چنبیلی! ـــ بانی توش کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ اب کیا کرے؟ وہ اپنا لکھا ہوا کاغذ چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔

"کیا لکھ رہے ہیں آپ؟" ـــــ وندنا آگے بڑھ کر کاغذ پر جھک گئی۔

"تمہیں ہی لکھ رہا ہوں۔"

"میرے لئے لکھ رہے ہیں؟ سچ۔ کیا کوئی نظم ہے؟"

"نہیں ـــــ محبت نامہ!"

"سچ ــ دیکھوں!" ـــــ اچھل کر وندنا نے بانی توش کے ہاتھ سے کاغذ چھین لیا۔

"اوہو! کتنا بڑا ہے!"

پھٹی پھٹی آنکھوں سے وندنا وہ تحریر پڑھنے لگی

"تم پڑھو اجب تک میں تھوڑا سا ٹھنڈا پانی ڈال آؤں"
مانتھا گرم کر دینے والا خط تھا۔ اِسی نے خط کے ابتدائی مضمون کو سمجھنا مشکل تھا۔ اس نے سوچا جدید شاعری کے دور میں جدید محبت نامہ کو سمجھنا بھی شاید آسان نہیں ہے۔ وہ بعید از فہم اور نئی تکنیک کے حامل ہوتے ہیں۔ خط کے ابتدائی مضمون کی ناقابلِ برداشت خشکی سے گزرنے کے بعد ہی مضمون کا حقیقی لطف حاصل ہوتا ہے اور چھپے ہوئے مفہوم کھلنے لگتے ہیں۔ بانی توش کی تحریر پڑھنے کے اشتیاق میں کھوئی و تند ناخط کو دونوں ہاتھوں میں تھامے مدہوشی کے عالم میں پلنگ پر دراز ہوگئی اور سرگوشی کے انداز میں کہا ——— "جلدی آنا اور اپنے اِس خط کا جواب لیتے جانا"
بانی توش دبے پاؤں زینے پار کرکے اوپر جا پہنچا۔ ڈاکٹر کے کمرہ کا دروازہ کھلا تھا۔ پردہ ہٹا کر کمرہ میں داخل ہوا اور روشنی جلائی۔ دیکھا۔ ڈاکٹر بوس گہری نیند کا لطف لے رہا ہے۔ پاس ہی میز پر ٹیلیفون کا رسیور نیچے رکھا ہوا تھا۔
بانی توش نے ڈاکٹر کو جھنجھوڑ کر اٹھایا
"کون ؟ کیا چاہیئے ؟"

"معاف کرنا ڈاکٹر! ایک بیمار آیا ہے۔"
"بیمار ؟ کون بیمار ؟ کہاں ہے وہ ؟"
ڈاکٹر نے بانی توش کو اب پہچانا۔
"نیچے! جس کمرہ میں میں تھا۔ دیکھا!"
"اوہو! سمجھ گیا ——— کیوں، کیا ہوا ؟"
"جب تک سردی زکام تھا آپ کو زحمت نہ دی۔ اب ایکدم نمونیا ہوگیا ہے!"
"چلئے!"
بستر پر سے اُٹھ کر ڈاکٹر چپل ڈھونڈنے لگا۔
ڈاکٹر کو اُس نیلی روشنی والے لافانی نغمہ کے کمرہ میں پہنچا کر بانی توش باہر نکل گیا اور سڑک پر کھڑا ہوگیا۔ کہیں جانے سے پہلے جس طرح ایک پل رُک کر وہ سوچتا ہے کہ کچھ بھول تو نہیں گیا ؟
اسی طرح ——— وہ سوچنے لگا ——— نہیں! ——— وہ وہاں کچھ بھی تو نہیں چھوڑ آیا ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہے!
(اچنتیہ کمار سین گپت کی بنگلہ کہانی سے)

پیاسے بادل جنم جنم کی پیاسی ایک پہاڑی دوشیزہ کے پیار کی کہانی جو اپنی محبت اور محبوب کی تلاش میں بار بار پہاڑی وادیوں میں جنم لیتی رہی۔ ایک حسّاس نوجوان کی داستانِ محبت جس نے اپنے بڑے گھرانے کی رنگینیاں، رعنائیاں اور مسرت کوشیاں چھوڑ کر رومان پرور وادیوں کی خاموش کہانیوں کو اپنایا۔ تاکہ اپنی محبوبہ کی شبنمی سانسوں سے اپنے تشنہ خیالوں کی پیاس بجھا سکے۔ پاکیزہ اور دلآویز رومان کی ایک دردانگیز داستان ہے۔ پہاڑی رومانوں کے ترجمان نے ایک بار پھر پہاڑی دوشیزاؤں کی پیار بھری مسرتوں اور حسرتوں کو "پیاسے بادل" میں سمویا ہے۔ دیدہ زیب کتابت و طباعت۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے ۵۰ پیسے۔

آج کی بات آپ کے محبوب افسانہ نگار جناب جگدیش بمل کے دلچسپ، بلند پایہ، رومان پرور افسانوں کا حسین مجموعہ جس کے افسانے آج کے سماج، آج کے معاشرے اور آج کے ماحول کی رنگینیوں، مسرت کوشیوں اور الجھنوں کی ایک ایسی تصویر ہیں جس کے خد و خال کو حقیقت کی لکیروں سے ترتیب دیا گیا ہے۔ آپ ان میں بھرے ہوئے قہقہوں کو اپنے قہقہے، اِن میں سسکتی ہوئی آہوں کو اپنی آہیں اور اِن کے کرداروں کی پلکوں پر لرزتے ہوئے آنسوؤں کو اپنے آنسو سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

گونگے بھگوان حضرت کوثر چاندپوری کا یہ دلکش ناول جو فسادات احمد آباد کے گرد گھومتا ہے، نہایت اثرانگیز طریقہ پر انسانی خون کی عظمت کا اظہار کرتا ہے اور قومی ہم آہنگی اور یکجہتی کی مُنہ بولتی تصویر ہے، طباعت و کتابت دیدہ زیب۔ خوبصورت ٹائیٹل۔ قیمت صرف ۵۰/۱

سِنگھار کمرے میں پروفیسر کرشنا کمار ایم۔ اے کے بہترین، دلچسپ، جذبات آفریں افسانوں کے اِس مجموعے کے ہر صفحے پر مستیوں کا ایک طوفان اور جذبات کا ایک محشر انگڑائیاں لے رہا ہے۔ اِس میں آرزو کے پُر کیف گیت بھی ہیں، آہوں کا دھواں بھی اور چھلکتے ہوئے آنسوؤں کی نمی بھی۔ قیمت فی جلد صرف دو روپے۔

گلستانِ ہزار رنگ اِس میں تقریباً پانچ ہزار شعراء کے اشعار عنوان وار ترتیب دیئے گئے ہیں۔ اِس یادگار کتاب کا مقدمہ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا اور (ہندی) ایڈیشن کا ڈاکٹر راجندر پرساد نے۔ مولانا آزاد اور ڈاکٹر راجندر پرساد کا نامِ نامی ہی اِس بات کی ضمانت ہے کہ یہ کتاب کس پایہ کی ہوگی۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین (مرحوم) جناب رشید احمد صدیقی اور جناب نیاز فتحپوری (مرحوم) نے اِس کتاب کو اِس صدی کی بہترین کتاب قرار دیا ہے۔ قیمت اُردو ایڈیشن بیس روپے۔

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۶۔


ایسی سفیدی
نہ کبھی تھی، نہ ملے گی
صابنوں کے مقابلے
چوگنا زیادہ کپڑے
دھوتا ہے
پانی میٹھا ہو یا کھارا،
صابنوں کی بہ نسبت
آدھی محنت ۔
دگنی صفائی
NEW!
det
detergent washing cake
ڈیٹ ٹکیہ
ایک اور اعلیٰ درجہ کی ڈیٹ مصنوعات: نیا تین طرفہ عمل والا ڈیٹ پاؤڈر۔
سفید یا نیلا ہلکے کپڑوں کو نہایت سفید دھوتا ہے۔ رنگین کپڑوں کو نہایت چمکدار بناتا ہے۔
کپڑوں اور ہاتھوں کیلئے نہایت محفوظ ہے۔
Shilpi HPMA-36a/72 Urd

افسانہ

سپنوں کی راکھ

ڈاکٹر یوسف گوہر شاہجہانپوری

نزد چوپال ایمن زئی جلال نگر شاہجہانپور (یو۔پی)

محترم، خوشتر گرامی صاحب! خلوص بیکراں

ایک مختصر سا افسانہ "سپنوں کی راکھ" ارسال خدمت ہے۔ اُمید ہے "بیسویں صدی" کے بلند معیار پر پورا اُترے گا اور قارئین حضرات اسے پسند فرمائیں گے۔ آپ کی گرانقدر رائے کا منتظر رہوں گا۔ خدا کرے اب آپ کا مزاج گرامی بخیر ہو۔ . .

نیازمند

یوسف گوہر شاہجہانپوری

★

نہ جانے کتنی بار میں اُس خط کو پڑھ چکی تھی پھر بھی اُسے بار بار پڑھنے کو جی چاہ رہا تھا۔ یہ خط آج کی ڈاک سے مجھے موصول ہُوا تھا۔ بالکل منفرد اور بے حد دلکش خط تھا۔ یوں تو آج کی ڈاک سے بہت سے خط آئے تھے جو میرے سامنے میز پر بکھرے پڑے تھے، لیکن اُن میں کوئی خط توجّہ کے قابل نہ تھا۔ اُن میں تحریر کا لُطف تھا، نہ نُدرت، نہ جدّت، نہ خیالات و احساسات کی ہم آہنگی تھی۔ بعض خطوط تو بے حد مضحکہ خیز تھے۔ بعض شادی کا کُھلا اشتہار تھے۔ اور بعض رُومان و محبت کے سطحی جذبات کے امین، اور بعض میں ایک خاموش اِلتجا مضمر تھی۔ تنہائی میں مِل جانے کی التجا۔ مَن سرکھپاتا اُن خطوط کے ساتھ وسب کے سب لاوارث لاشوں کی طرح میز پر پڑے تھے۔

میں نے ایک بار پھر اُس خط کو دیکھا۔ کچھ مُسکرائی اور صوفے پر بیٹھ گئی۔

لکھنؤ کے کسی ڈاکٹر شمیم نے یہ خط میرے افسانہ "پھول کا زخم" سے متاثر ہو کر مُبارکباد کے طور پر بھیجا تھا۔ خط کا ایک ایک لفظ میرے دل پر گہرے نقوش بنا گیا تھا۔ میں ایک بار پھر خط پڑھنے لگی۔

محترمہ! تسلیم

آپ کا افسانہ "پھول کا زخم" رسالہ "راہ" کے سالنامے میں پڑھا۔ یہ افسانہ تکنیک، پلاٹ اور موضوع کے اعتبار سے بالکل اچھوتا ہے۔ عبارت اتنی صاف اور اثر انگیز ہے کہ تعریف کرنے سے قاصر ہوں۔ انجام اتنا حسین اور سبق آموز ہے کہ جی خوش ہو گیا۔ آپ نے اگر اسی طرح مشق جاری رکھی تو یقیناً آپ مُلک کی عظیم افسانہ نگار تسلیم کر لی جائیں گی۔ میں تہہِ دل سے اتنی کامیاب تخلیق پر آپ کو مُبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اُمید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔

مخلص

ڈاکٹر شمیم لکھنوی

کتنی پُرکشش تحریر تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ مکتوب نگار ادب سے گہرا شغف رکھتا ہے۔ وہ فنِ افسانہ نگاری سے بھی واقف ہے۔ موضوع، ہیئت، مواد، تکنیک اور پلاٹ کے محاسن کو بھی سمجھتا ہے۔

میں صوفے سے اُٹھ کر رائیٹنگ ٹیبل کے گرد پڑی کُرسی پر آ بیٹھی۔ فوراً اپنا رائیٹنگ پیڈ نکالا اور خط کا جواب دینے کی

تیاری کرنے لگی۔ قلم میرے ہاتھ میں تھا۔ رائٹنگ پیڈ کے اوراق ہوا سے پھڑپھڑا رہے تھے۔ میں عجیب کشمکش و پنج میں پھنس گئی تھی۔ القاب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کیا لکھوں؟ یہ بھی سوچنا پڑ رہا تھا۔ اس سے پہلے میں نے ہزاروں خطوط لکھے تھے۔ لیکن کبھی اس نوعیت کا نامہ لکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ بس ہمیشہ قلم ہاتھ میں لیا اور خط لکھنے لگی۔ لیکن آج تو جیسے دماغ ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔ نہ القاب سمجھ میں آ رہا تھا اور نہ عبارت بن رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا آج ذہن بھی میرا ساتھ نہیں دے رہا ہے ——— بمشکل تمام ایک گھنٹے میں خط مکمل کر سکی۔ پھر نظرِ ثانی کرنے لگی۔ مجھے اطمینان ہو گیا کہ جواب تسلی بخش ہی نہیں میرے دلی جذبات کا آئینہ دار بھی ہے۔ میں نے لفافہ بند کر دیا اور پتہ لکھ کر خط پوسٹ کر دیا۔

میرا یہ معمول بن گیا کہ میں روزانہ ڈاکٹر شمیم کا خط پڑھتی۔ ایک بار نہیں، کئی کئی بار۔ رات کو تکیہ کے نیچے خط رکھ کر سوتی۔ صبح اٹھتی تو سب سے پہلے خط پڑھتی۔ رات کو سونے سے پہلے ایک بار خط ضرور پڑھ لیتی۔ سچ تو یہ تھا کہ شمیم میرے دل کی گہرائیوں میں بسے جا رہے تھے۔ میں اُن کے خواب دیکھنے لگی تھی ——— میرے لاشعور میں ایک خوبصورت، خوش پوش نوجوان کی صورت بس گئی تھی۔ ایسا کا ایک خوبصورت بت میرے ذہن میں آ گیا تھا۔ اور میں اُس بت کو پوجنے لگی تھی۔

اب مجھے شمیم کے جواب کا شدت سے انتظار تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ جلد ہی جواب دیں گے اور ایک دن اُن کا جواب آ ہی گیا۔ میں بہت خوش ہوئی۔ میں نے جلدی سے لفافہ چاک کیا۔ خط کے ساتھ ایک مختصر سا افسانہ بھی لفافے میں رکھا تھا۔ خط میں شمیم نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں اُن کے افسانہ پر اصلاح کر دوں۔ میں نے افسانہ بھی پڑھا۔ افسانہ اچھا تھا۔ لیکن روایت پرستی کا پلندہ تھا۔ وہی عشق و محبت کی فرسودہ داستان ——— ایک لڑکی نے ایک لڑکے سے محبت کی۔ کالج میں اُن کی محبت رسوا ہوئی۔ پھر ایک دن لڑکے نے لڑکی سے شادی کی درخواست کی۔ لڑکی نے انکار کر دیا۔ اُس نے کسی ڈاکٹر سے شادی کر لی۔ اِس طرح افسانہ کا عنوان "بے وفا" رکھ دیا گیا۔ بہر حال افسانہ پر اصلاح کرنا میرے لئے دشوار تھا۔ کیونکہ میں خود ادب کی دنیا میں تجرباتی دور سے گزر رہی تھی۔ میں نے چند روایتی اور تجریدی افسانے لکھے تھے اور عوام کے ذوق اور پسند کو دیکھ رہی تھی کہ وہ کس طرح کے ادب کو پسند کرتے ہیں۔ میں نے اُن کا افسانہ واپس کرنے کا ارادہ کر لیا۔ رائٹنگ پیڈ نکالا اور خط لکھنے لگی ———

محترمی! تسلیم

آپ کا افسانہ پڑھا۔ بے حد پسند آیا۔ آپ احساسِ کمتری میں مبتلا ہیں۔ یہ ایک ذہنی بیماری ہے۔ اپنے ذہن پر احساسِ کمتری کا سایہ بھی نہ پڑنے دیں۔ آپ کے فن میں جان ہے، ندرت ہے۔ اندازِ بیان میں تاثر ہے۔ اصلاح کی ضرورت نظر نہیں آتی۔ اسے کسی بھی معیاری جریدے میں اشاعت کے لئے بھیج دیجئے۔ آپ کا افسانہ کامیاب افسانہ ہے۔ مجھے بے حد پسند ہے اور یہاں کچھ نئے موضوع پر بھی افسانے لکھنے کی کوشش کیجئے۔ ہو سکے تو آئندہ ایک فوٹو بھی مجھے ارسال کر دیجئے گا۔ نوازش ہوگی۔ اُمید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔

مخلص

زہرہ نظر

میں نے اُسی دن خط پوسٹ کر دیا۔ افسانہ بھی واپس کر دیا۔

دوسرے ہفتہ کے آخر میں شمیم صاحب کا ایکسپریس لفافہ موصول ہوا۔ میں نے بہت بے چینی سے اُسے کھولا۔ لفافہ میں تصویر مسکرا رہی تھی۔ میں بغور تصویر دیکھنے لگی۔ ایک خوبصورت، وجیہہ اور سجیلا نوجوان میرے سامنے تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر کہکشاں کی

طرح مُسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ نوجوان کی عُمر تیس سال سے زیادہ نہیں معلوم ہورہی تھی۔ میں جس کی پرستش کے جذبہ میں دیوانی ہورہی تھی، میرے دل کے حریم میں بسنے والا وہ بُت میرے سامنے تھا! میساختہ میں نے تصویر سینے سے لگالی۔ خوشی کی ایک خاموش بازگشت میرے تحت الشعور کی گہرائی میں گونج اُٹھی۔ میں گنگنانے سی لگی۔

یکبارگی مجھے شمیم کا خط پڑھنے کا خیال آیا۔ میں نے تصویر احتیاط سے رکھ لی اور خط پڑھنے لگی۔ لکھا تھا

"محترمہ انگلہائے عقیدت

آپ کا پُرخلوص خط موصول ہُوا۔ ساتھ ہی اپنا افسانہ بھی۔ شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ نے تحریر فرمایا کہ اس افسانہ کو کسی معیاری جریدے میں اشاعت کے لئے بھیج دوں۔ میں مُلک کے سبھی جرائد میں اسے بھیج چُکا ہوں۔ لیکن اس کی اشاعت تو الگ رہی، کسی مدیر نے جواب تک دینے کی زحمت گوارا نہ کی۔ اسی لئے افسانہ آپ کو بھیجا تھا تاکہ اس میں کچھ جان آجائے۔ لیکن آپ نے بھی حوصلہ شکن جواب دے کر میری اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ جس کا افسوس ہے۔ آپ کی فرمائش کے مطابق اپنی ایک تصویر ارسال کر رہا ہوں۔ میرے پاس اپنی کوئی تصویر نہیں ہے۔ یہ تصویر بیس سال پہلے کی ہے۔ شاید پسند آئے۔

مخلص

شمیم"

میرے شعور کے حریم میں ایک بُت تراش ہتھوڑا لئے آگے بڑھا اور اُس نے میرے ذہن میں مُسکراتے ہوئے اپنے خوبصورت خیالی بُت کو توڑ ڈالا۔ میرے اندر ایک طوفان قہقہے لگانے لگا۔ ڈاکٹر شمیم کے خط کا آخری جملہ نیر نشتر کی طرح دل میں چبھ رہا تھا ——— "یہ تصویر بیس سال پہلے کی ہے۔ شاید پسند آئے۔"

میرے سامنے ایک خوبصورت نوجوان کی تصویر تھی۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے سامنے میرے حسین و خوش آیند سپنوں کی راکھ پڑی ہو!!

نمائندگی بھیجتے وقت کوپن منی آرڈر پر ضرور تحریر فرما دیجئے کہ رقم کس سلسلے میں بھیجی گئی ہے تاکہ تعمیلِ ارشاد میں دیر نہ ہو۔ خط وکتابت کرنے اور منی آرڈر بھیجنے کے لئے پتہ رسالہ بیسویں صدی کا نمبر لکھنا لازمی ہے۔ منیجر

ایک خط

غزالہ اشفاق

آپ کو میری خبر ہے کہ نہیں — اب غزالہ پہ نظر ہے کہ نہیں

آپ کی بزم سے یوں دور رہوں — اور میں پھر بھی نہ رنجور رہوں

دشمنِ اہلِ وفا ہو گئے آپ — جانے کیوں مجھ سے خفا ہو گئے آپ

کہیئے تو کونسی تقصیر ہوئی — بات کیا موجبِ تعزیر ہوئی

کتنی تسکین مجھے رہتی تھی — آپ کو اپنا جو کہتی تھی

ہر نفس آپ کا دم بھرتی تھی — آپ پر ناز کیا کرتی تھی

شرکتِ بزم سے محروم رہوں — کہیئے کب تک یونہی مغموم رہوں

آپ نے جب سے نظر پھیری ہے — کیا کہوں میں جو دشا میری ہے

اب غزل کہنے میں لگتا نہیں جی — شاعری میں نہ رہی دلچسپی

رنج اب تک سہے خاموشی سے — شکوہ کرنے کو مرے لب نہ کھلے

لیکن اب صبر کی طاقت نہ رہی — دلِ مایوس میں ہمت نہ رہی

میری آنکھوں کے یہ دو پیمانے — کوئی دم میں ہیں چھلکنے والے

آپ پر اس کا اثر ہے کہ نہیں

قطعات

خلش دہلوی

ہر چمن پر نکھار آ جاتا — ہر کلی میں شگفتگی ہوتی
تم اگر میرے ہم نفس ہوتے — کتنی پیاری یہ زندگی ہوتی

شوخ چنچل ہوا کے جھونکوں نے — میرا در جب بھی کھٹکھٹایا ہے
تیری گم گشتہ قربتوں کی قسم — میرا دل درد سے بھر آیا ہے

رنگ و نور و سرور کی باتیں — اب کہاں وہ حسیں ملاقاتیں
میری دنیا میں حسرت و آلام — میری قسمت میں ہجر کی راتیں

جیسے ہر غم بھلا دیا تو نے — غنچۂ دل کھلا دیا تو نے
ساقیا تیرے میکدے کی خیر — مست و بیخود بنا دیا تو نے

لبوں پہ عشرتوں کی بات آئی — سہانا دن، انوکھی رات آئی
ذرا ساقی وہ میرا جام لانا — لہکتی جھومتی برسات آئی

کیوں خلش سارے زمانے سے خفا رہتے ہو — رہ کے دنیا میں بھی دنیا سے جدا رہتے ہو
کسی محفل میں تمہیں کیا کوئی اپنا نہ ملا — تم جو تنہائی کے عالم میں سدا رہتے ہو

طنزیہ

میں مالک مکان بنا

فکر تونسوی

اور آخر میں نے وہ ڈیڑھ کمرہ کرائے پر اُٹھا دیا۔ اُس سے اگرچہ خاندان کی روایت ٹوٹ گئی۔ لیکن بیوی نے نئی روایت قائم کر دی۔ شادی کے بعد خاندان کی حیثیت بیوی کے مقابلے پر سیکنڈری ہو جاتی ہے۔

یہ ڈیڑھ کمرہ میری مناسب ضروریات سے زیادہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ اُس کا مصرف یہ تھا کہ میرا لڑکا کبھی کبھی اُس میں گھس جاتا اور اپنی محبوبہ کے لو لیٹر پڑھا کرتا تھا۔ یا اُس کے ایک تاریک گوشے میں کچھ خستہ قسم کی خاندانی دستاویزات پڑی رہتی تھیں۔ جن کا میں خواہ مخواہ احترام کئے جا رہا تھا۔

میری ٹریجڈی یہ تھی کہ میں انسانیت کو کرائے داروں اور مالک مکانوں میں تقسیم کرنا نہیں چاہتا۔ یہ میرا اصول ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ انسانیت کے متعلق میری معلومات کافی ناقص تھیں۔ لیکن میرا خیال ہے اصول کا معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

میرے کرایہ دار کا نام گجانند تھا۔ جو اگرچہ نامعقول نام تھا۔ لیکن وہ ایک منسٹر کا سفارشی خط لایا تھا۔ اِس لئے مجبوراً میں نے کہا: "گجانند جی! منسٹر تو سفارشی خط لکھ کر اپنا سوشلزم کا گزارا کر لیتے ہیں۔ لیکن آپ کرایہ دار بن کر کیوں گزارا کرنا چاہتے ہیں؟"

اُس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ جو بے حد مانوس تھی، اور کہا: "جناب! مجھے جیوتشی نے بتایا ہے کہ اِس جنم میں تم مالک مکان نہیں بن سکتے۔ صرف اگلے جنم میں چانس ہے۔"

جواب میں معصومیت تھی۔ جو مجھے پسند آئی۔ مصیبت یہ ہے کہ معصوم انسانیت کے راستے میں جیوتشی حائل ہیں۔ گجانند کے لہجے میں جو سادگی اور پاکیزگی تھی اُس کی بنا پر میں نے پوچھا: "بھائی جان! آپ اِتنے شریف اور مہذب کیوں ہیں؟"

وہ جھٹ بول اُٹھے: "اِس میں میرا کوئی دوش نہیں جناب! یہ خاندانی وراثت ہے۔"

"عجیب بات ہے کئی ماں باپ ورثے میں مکان چھوڑ جاتے ہیں اور کئی صرف شرافت اور تہذیب ۔۔۔۔" میں نے اُسے سمجھایا۔ "گجانند جی! دراصل کمرہ تو ایک ہی ہے۔ صرف میری بیوی نے ایک چق لگا کر اُسے ڈیڑھ کمرہ بنا رکھا ہے تاکہ ڈیوڑھا کرایہ وصول کر سکے۔ مگر شرفاء کے لئے صرف ایک کمرے میں رہنا غیر موزوں ہے۔"

اور جواب میں اُس نے جیسے میری ساری فلاسفی کی توہین کر دی اور کہا: "مجھے شرفاء میں شمار نہ کیجئے اور اگر آپ شمار کرتے بھی ہیں تو اُس کا انکشاف دُوسروں پر نہ کریں۔" اِس کے علاوہ گجانند نے میری بیوی کا ذکر اپنے خاندانی ورثے سے بھی زیادہ احترام کے ساتھ کر دیا کہ وہ بے حد معقول خاتون ہیں۔

اور میں نے بیوی کی معقولیت سے گھبرا کر وہ ڈیڑھ کمرہ گجانند کے حوالے کر دیا۔

تین مہینے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہُوا جیسے گجانند اُس ڈیڑھ کمرے کو جنّت سمجھ کر رہ رہا ہے۔ وہ اِتنا مرنجان مرنج نکلا کہ محلّے کے پانچ سات چوہے تک نقل مکانی کر کے جنّت میں گھس گئے۔ شرفاء کی یہی ٹریجڈی ہوتی ہے کہ وہ چوہے اور انسان میں کوئی امتیاز نہیں برتتے۔

اچانک ایک دن محلّے کے تین چار معزّز لوگ میرے پاس تشریف لے آئے۔ میرا مطلب ہے، لباس سے وہ معزّز معلوم ہوتے تھے۔ ایک نے کہا: "مُبارک ہو فکر صاحب! آپ اب مالک مکان بن گئے ہیں!"

دُوسرے نے وضاحت کی "جب تک کرایہ دار نہیں آیا تھا۔ آپ مالک مکان کہلانے کے مُستحق نہیں ہوئے تھے"

تیسرے نے کہا: "یعنی اب آپ میں ایک مفہوم پیدا ہو گیا ہے"

چوتھے نے ایک فارم میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "اور اب آپ ہمارے محلّہ رنگ پُورہ مالک مکان ایسوسی ایشن کے معزز ممبر بن جایئے!"

میں نے اپنے علم میں اضافہ کرنے کی غرض سے پُوچھا: "اُس ایسوسی ایشن کے جنم کا کوئی معقول یا نامعقول مقصد؟"

وہ بولے: "بات یہ ہے جی! کہ یہ کرایہ دار لوگ بڑے بدمعاش

• • • ~~~~~ • ~~~~~ • • • ~~~~~ • ~~~~~ • • •

- جو انسان نیک عمل کرتا ہے وہ اپنے ہی لئے کرتا ہے۔ خُدا اُس سے بے نیاز ہے۔ (قرآنِ پاک)
- تم وہ کیوں سوچتے ہو جو نہیں کرتے۔ (قرآنِ پاک)
- حیا ایمان کی ایک شاخ ہے۔ (سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم)
- کلام سے پہلے سلام کرنا چاہئے۔ (سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم)
- جن سے تم سیکھتے ہو اور جنھیں سکھاتے ہو اُن کی عزّت کرو۔ (سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم)

• • • ~~~~~ • ~~~~~ • • • ~~~~~ • ~~~~~ • • •

ہوتے ہیں"

"یعنی میرا کرایہ دار بھی بدمعاش ہے؟"

"نہیں ہے تو ہو جائے گا۔ اِسی لئے ہم مالک مکان آپس میں بھائی چارہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اِس لئے آج سے آپ ہمارے بھائی ہیں"

میرا جی چاہا، اُنھیں کہہ دوں کسی منسٹر کی سفارش لایئے، جب آپ کا بھائی بنوں گا۔ لیکن یہ شرط بھونڈی معلوم ہوئی۔ معزّزین آسانی سے پُوری کر سکتے تھے۔ آنکھیں بند کر کے دستخط کر دئے۔ اگرچہ دستخط کے بعد اپنی حرکت پر بہت حیرت ہوئی۔ چند دن پہلے میں نے گجانند کو بھی اپنا بھائی کہہ دیا تھا۔ اب مکان مالکوں کا بھی بھائی بن گیا ہوں۔ یہ دو مُتضاد قِسم کے بھائی... ! لیکن پھر سوچا: اِس دُنیا کے سبھی انسان بھائی بھائی ہوتے ہیں۔

اُسی شام گجانند سے اِطّلاعاً عرض کر دیا کہ آج سے آپ بھائی صاحب نہیں ہیں۔ بلکہ کرایہ دار ہیں"

اور گجانند نے کہا: "چھوڑئے جی! آپ تو مذاق کرتے ہیں"

لیکن میں مذاق نہیں کر رہا تھا۔ بہت سیریس تھا۔ ایسوسی ایشن کا (معزّز) ممبر بن جانے سے میری ذمّہ داریاں بڑھ گئی تھیں، اِس لئے میں دن رات اِس ٹوہ میں رہنے لگا کہ گجانند کے کمرے سے کوئی آواز اُٹھے اور میں جھٹ پھاڑ دوں۔ فرش پر پلنگ گھسکانے کی آواز، رات کو دیر سے آنے کی آواز، چوہوں کے گلاس توڑنے کی آواز، مہنگائی کے خلاف گالیوں کی آواز، یہاں تک کہ اُس کے بچّوں کے رونے کی آواز بھی آئے تو میں للکار کر کہوں ——

"گجانند! اپنے بچّوں سے کہہ دو رونا بند کر دیں! کیونکہ اِس سے میرے بچّوں کو معلوم ہو جائے گا کہ انسان روتے بھی ہیں اور یوں میرے بچّوں کا مُستقبل تباہ ہو جائے گا"

لیکن ایسی کوئی آواز شاید گجانند کے نصیب میں نہیں لکھی تھی۔ ایسوسی ایشن کے معزّز عہدیدار وقتاً فوقتاً میرے یہاں وِزٹ کرتے رہے اور مجھے بتاتے رہے کہ گجانند سے کون کون سی بدمعاشیوں کے امکانات روشن ہیں اور اُن امکانات کا سدِّباب کرنے کے لئے تھانے کب جانا چاہیئے۔ گالیاں کب دینی چاہیئیں۔ پالتو کُتّا کب چھوڑنا چاہیئے اور غُنڈے بُلا کر اُنھیں شراب کب اور کیوں پلانی چاہیئے۔ بلکہ ایک معزّز عہدیدار کو تو اِس بات پر بہت حیرت ہوئی کہ کرایہ دار کی وجہ سے ابھی تک آپ کی آتما کی شانتی میں خلل نہیں پڑا؟

میں نے اعتراف کیا کہ میری آتما میں کوئی نقص ہے۔

یک دن ایسوسی ایشن کے پریذیڈنٹ جن کی شکل بھونڈی اور لباس حسین تھا، تشریف لائے اور جیسے مجھ سے رازدارانہ لہجے میں ہمدردی کرنے لگے "فکر صاحب! ایسوسی ایشن کے معزّزین میں آپ کی قدر و منزلت کچھ کم ہو رہی ہے۔ بلکہ کئی ایک تو (معاف کیجئے)

آپ کی نیت پر بھی شک کرنے لگے ہیں کہ آپ کی وجہ سے کرایہ دار کے حوصلے بلند ہوگئے ہیں۔ جن کا اثر اُن کے اپنے کرایہ داروں پر بُرا پڑ رہا ہے۔

میں نے عرض کیا "مگر پریذیڈنٹ صاحب! اسے میری ڈیسبڈی سمجھیے کہ گیانند شریف اور مہذب انسان ہے"

وہ بولے "یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ کرایہ دار مہذب ہوتے ہی نہیں!"

"مگر وہ کوئی غیر مہذبانہ حرکت نہیں کرتا"

"کیسے نہیں کرتا ——— ! اچھا بتائیے، غسل خانے میں جاکر گنگناتا ہے کہ نہیں؟"

"اوں ہوں"

"بڑا ڈل کرایہ دار ہے۔ آپ کرایہ دار بدل دیجئے!"

"ورنہ؟"

"ورنہ معززین آپ کا سوشل بائیکاٹ کرنے کے متعلق سوچ رہے ہیں"

یہ صریحاً دھمکی تھی مگر خاندانی ورثے کے باعث میں اس دھمکی کو چیلنج دینے کے اہل نہیں رہا تھا۔ اس لئے سوچ سوچ کر میں نے گیانند کے خلاف ڈائرکٹ ایکشن کا فیصلہ کر لیا اور بازار سے گالیوں کی ایک کتاب لے آیا اور ساری رات اُس کی سٹڈی کرتا رہا۔

اور دُوسری صبح کو اپنے نتھنے (وغیرہ) پُھلاکر گیانند کے پاس پہنچ گیا اور کہا۔

"تم انسان نہیں ہو۔ اُلّو ہو!"

وہ حیران ہُوا۔ جس سے مجھے خوشی ہوئی۔

"اور میں اُس اُلّو سے پُوچھتا ہوں۔ یہ کھڑکی کا شیشہ کس اُلّو کے پٹھے نے توڑا؟"

"آپ کے چھوٹے صاحب زادے نے سہواً ایک ڈھیلہ عرض کر دیا"

"تو نالائق! تم نے اُس کے باپ کو فحش گالیاں کیوں نہیں دیں؟"

"اجی، میں نے سوچا بچے سب کے برابر ہوتے ہیں۔ اگر میرا بچہ ڈھیلہ مار دیتا تو . . ."

مجھے بہت طیش آیا۔ گویا اب یہ بچوں کی ولدیت کو کنفیوز کر رہا ہے۔ بچے سب کے بچے ہوتے ہیں۔ سبھی انسان بھائی بھائی ہوتے ہیں۔ یہ انسان سنس ایسی کیسی ذنیا ہے؟ کیسی اس کی فلاسفی ہے میں ٹوٹے ہوئے شیشے اور فلاسفی کی درگت پر بڑبڑاتا ہوا لوٹ آیا۔ گالیوں کی کتاب آدھے دام پر فروخت کر دی۔ مجھے گیانند نفرت نہیں کرنے دیتا۔ میرے الزامات کو احمقوں کی بڑ سمجھتا ہے۔ ہُنہ! احمقوں!

میں دو تین دنوں تک مشاہدہ کرتا رہا کہ شاید وہ راہ راست پر آ جائے۔

تیسرے دن وہ اُلٹا مجھے راہ راست پر لے آیا اور رکیننگ کو

•••———•———•••———•———•••

- صداقت نیک انسانوں کی ماں ہے، علم باپ، یقین بھائی اور شانتی بہن۔ (مہاتما بدھ)
- اپنے اپنے دل پر قابو نصیب ہے۔ سچے معنوں میں چندر ق راجہ وہی ہے۔ جو آدمی اپنی بُرائیوں پر نظر رکھتا ہے اور انھیں دُور کرنے کی کوشش کرتا ہے، اُس کا خزانہ ایشور کی دیا سے بھر جاتا ہے۔
(سوامی سارشدانند جی)
- خُدا کا فضل و کرم وہاں ہوتا ہے جہاں غریبوں کی نگہداشت کی جاتی ہے۔ (گورو نانک)

•••———•———•••———•———•••

بُلاکر اپنی جیب سے نیا شیشہ فٹ کروا دیا تاکہ میرے تلوؤں کو آگ لگ جائے۔ جی چاہا اپنے چھوٹے صاحبزادے کو سوا روپیہ رشوت دے کر کہوں کہ اِس نئے شیشے کو بھی ڈھیلہ مار کر چکنا چُور کر دو۔ لیکن وہ ناخلف نکلا۔ کہنے لگا "گیانند مجھے انگریزی کے سبق اتنی خوبصورتی اور پیار سے پڑھاتا ہے کہ میں ناخلف بننا زیادہ پسند کروں گا"

گویا یہ ایک سازش تھی۔ وہ میرے بچے اور بچے کے باپ میں پھوٹ کا بیج ڈال رہا تھا۔ ایسے آدمی کو کرایہ دار رکھنا اپنے پاؤں بلکہ اپنے خاندان کے پاؤں پر کلہاڑی مارنا تھا! سوچ سوچ کر میں نے اس سازش کا توڑ تلاش کر لیا۔ دل ہی دل میں اُس کی گردن پکڑ لی

اور زبان ہی زبان سے کہا: "اگلے ہفتے میرے بڑے لڑکے کی شادی ہے۔ اس لئے میرا کمرہ خالی کر دو۔"

حالانکہ میرے بڑے لڑکے کو اُس کے سائز کی ہر لڑکی مسترد کر چکی تھی اور وہ تنگ آکر سماج کی نشکام سیوا کا پروگرام بنا رہا تھا۔

لیکن شادی کی خبر سنتے ہی گجانند نے کہا: "میں عزیزی رویندر کی شادی کی خوشی میں ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے تیار ہوں!"

عجیب ہونق انسان ہے۔ اُسے مکان خالی کرنے کا غم نہ تھا۔ بلکہ میرے بیٹے کے بیاہ کی خوشی تھی۔ یعنی اب میں اُس کا سامان بھی زبردستی نکال کر نہیں پھینک سکتا تھا۔ غصّے میں آکر میں شام کو بالکونی پر کھڑا ہو گیا اور ساری دُنیا اور اس دُنیا کو بنانے والے خُدا تک کو سُنانے کے لئے بلند آواز میں کہنے لگا

"سُنیئے حضرات! یہ کیا بدمعاشی ہے، میرا کرایہ دار مجھے زخمی کرنے کے لئے کل رات غُنڈے لے آیا۔ انھیں شرابیں پلائیں لیکن میں اِس غنڈہ گردی سے نہیں ڈرتا۔ میں اُس کی ہڈیاں چبا جاؤں گا! کیونکہ سپرنٹنڈنٹ پولیس میری سالی کا بہنوئی ہے اور ڈپٹی کمشنر مجھ سے طالب علمی میں ریاضی کے سوال حل کروا تا رہا ہے۔ ہُنہہ! میں اپنے لڑکے کی شادی پر اِس سے کمرہ خالی کروا کے رہوں گا۔"

پرش کر آسمان سے پھولوں کی بارش نہیں ہوئی۔ البتہ ایسوسی ایشن کے پریذیڈنٹ نے میرے اعزاز میں کاک ٹیل پارٹی کا اعلان کر دیا اور یہ اعلان اُس وقت دوآتشہ ہو گیا جب میری جُرأتِ رندانہ دیکھ کر محلّے کے چند مشٹنڈے کرایہ دار میری بالکونی پر چڑھ آئے اور گرجنے لگے "کون مائی کا لال ہے! جو گجانند سے کمرہ خالی کروالے! آپ کسی بھی کرایہ قانون کے تحت یہ غنڈہ گردی نہیں کر سکتے! ہم ڈپٹی کمشنر کے سبھی ریاضی کے سوالوں کو غلط قرار دے دیں گے۔ جو ہم سے ٹکرائے گا، پاش پاش ہو جائے گا!"

مجھے اُن مشٹنڈوں کی جُرأت پر خوشی ہوئی۔ گویا اب تنازعہ بڑھے گا اور دوآتشہ لطف آئے گا۔ لیکن گجانند نے میرے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا اور اپنا سامان پیک کرنے لگا۔ یہ میری واضح شکست تھی۔ میں بھاگا بھاگا اُس کے پاس آیا اور اُس کا کندھا زور زور سے جھنجھوڑ کر بولا: "ابے سُوّر کے تخم! مت جاؤ، اِس کمرے کا کرایہ دُگنا کر دو اور جھک مار کر رہتے رہو!"

وہ چُپ رہا۔ منحوس کے دل میں میرا احترام زیادہ تھا۔

میں نے اُس کے بال وحشیانہ انداز میں کھینچے: "ابے شیطان کی اولاد! مجھے انگوٹھا دکھا دو اور ٹھوکر میں ایک چھدام نہ بٹھاؤں گا!"

وہ اُسی طرح سامان باندھنے میں مصروف رہا۔

اب میرے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور پیمانے سے اچانک ایک قطرہ نکلا!

"گجانند! میں نے جھوٹ کہا تھا کہ تم نے غنڈے منگوائے تھے۔"

"آپ جھوٹ بول ہی نہیں سکتے!"

"یہ جھوٹ ہے کہ میرے لڑکے کی شادی ہو رہی ہے۔"

"آپ جھوٹ بول ہی نہیں سکتے!"

"میں نے دُگنا کرایہ مانگ کر تم سے جھوٹ بولا۔"

"آپ جھوٹ بول ہی نہیں سکتے!"

اور دُوسرے لمحے وہ میرے ہر جھوٹ کو پاؤں سے ٹھکرا کر چلا گیا اور میں بے قرار ہو کر سیدھا اُس کمرے میں داخل ہوا اور اپنی خاندانی دستاویزات پھاڑ کر کھڑکی سے باہر پھینک دیں!!

غزلیں

پروفیسر نازؔ قادری ایم۔ اے

دل اُس فریبِ تمنا میں آگیا ہوگا
کوئی تو شہرِ نگاراں میں جانتا ہوگا

بساطِ دل پہ شفق سی کھلی ہوئی ہے آج
ترے خیال کا سورج نکل رہا ہوگا

یہ ابرِ کیفِ محبت، یہ بارشِ نغمہ
کسی کی شوخ نگاہوں نے کچھ کہا ہوگا

کسی نگاہ کا جادو، کسی ادا کا فسوں
لبِ خموشی سے مجھ کو پکارتا ہوگا

ہزار ضبطِ تمنا کے باوجود اگر
لبوں پہ نام ترا آگیا تو کیا ہوگا

بیسویں صدی دہلی ستمبر ۱۹۷۳ء

پروفیسر مختار شمیمؔ ایم۔ اے

ذہن میں میرے ہوا کرتی ہے کیسی ہلچل
کون یہ ٹوٹتا رہتا ہے بدن میں ہر پل؟

آج بڑھتا ہی چلا جاتا ہے یادوں کا ہجوم!
جیسے آکاش پہ اُمڈے ہوں گھنیرے بادل

دلِ محزوں! ہے ازل سے یہ مقدر تیرا
اپنے ہاتھوں جو لگائی ہے اُسی آگ میں جل!

خود غرض لوگوں سے یارو! کوئی اُمید فضول
یہ شجر ہیں کہ نہ سایہ، کوئی پھول نہ پھل

دل کی ویرانیاں مجھ رشک کریں کیوں نہ شمیمؔ
میری آنکھوں میں ہیں آباد وہ خوابوں کے محل

دھرم پال عاقلؔ ایم۔ اے، بی۔ ٹی

نہیں دیکھا جو ہم نے آگہی میں
نظر آیا وہ جلوہ بیخودی میں

اسے کہتے ہیں اعجازِ تصور
نظر آنے لگے وہ ہر کسی میں

نہیں اِک رنگ پر رہتا زمانہ
یہ ہم بھولے رہے دورِ خوشی میں

فریبِ دوستی کھاؤں گا میں بھی
کمی رکھنا نہ تم بھی دشمنی میں

وہ اِک بھٹکا ہوا راہی ہے عاقلؔ
نہ ہو انسانیت جس آدمی میں

اُتر پردیش میں اردو کی تیز رفتار ترقی

موجودہ ریاستی حکومت کی جانب سے زبردست سہولتیں

اُردو جسے دستورِ ہند میں ایک قومی زبان کا درجہ حاصل ہے، ہمارے ملک خاص طور سے ہماری ریاست اُتر پردیش کی ایک اہم اور مقبول عام زبان ہے۔ یہ کسی ایک فرقے یا مذہب کی زبان نہیں۔ اس کے چمن کی آبیاری میں سب برابر کے شریک اور حصہ دار ہیں۔ اُتر پردیش کی موجودہ ریاستی حکومت نے اس کے پھلنے پھولنے اور اس کی ترقی و توسیع کے لئے متعدد اہم اور دُور رس اقدامات کئے ہیں:۔

پرائمری سطح پر:۔

- جولائی سے ریاست کے تمام شہری علاقوں کے پرائمری اسکول میں اُردو پڑھنے کی سہولت۔
- اس مقصد کے لئے تقریباً چار ہزار اُردو ٹیچروں کی تقرری کا فیصلہ۔
- اگر کسی پرائمری اسکول میں فی الحال اُردو پڑھنے والے بچے نہ بھی ہوں تب بھی اُس اسکول میں کم از کم ایک اُردو ٹیچر کا انتظام ہوگا۔
- تمام تسلیم شدہ اُردو میڈیم اسکولوں اور مکتبوں کو مالی امداد دینے کا بندوبست۔
- ٹریننگ اسکولوں میں اُردو کی استعداد رکھنے والے اُمیدواروں کو داخلے میں سہولت۔
- اُردو کے ٹرینڈ ٹیچر نہ ملنے پر اَن ٹرینڈ اُردو ٹیچروں کی تقرری کا فیصلہ۔
- کوئی اَن ٹرینڈ اُردو ٹیچر اوپر کے احکامات کے بغیر ملازمت سے علیحدہ نہیں کیا جائے گا۔
- ٹیچروں کو اُردو پڑھنے کی جانب زیادہ سے زیادہ توجہ کرنے کے لئے ترغیبی الاؤنس جاری رکھنے کا فیصلہ۔
- نئے اُردو میڈیم اسکول قائم کرنے کی کوششوں کی یقین دہانی۔

ثانوی سطح پر:۔

- جونیئر اور ہائر سکنڈری اسکولوں میں سہ لسانی فارمولے کے تحت اُردو پڑھنے کا بندوبست۔
- ہر گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکول میں سہ لسانی فارمولے کے تحت اُردو کی تعلیم کے لئے ایک اُردو ٹیچر کی تقرری۔
- تسلیم شدہ ہائر سکنڈری اسکولوں میں بھی سہ لسانی فارمولے کے تحت اُردو کی تعلیم کا بندوبست کئے جانے کے احکامات۔
- جونیئر ہائی اسکول تک تمام کتابیں اُردو میں دستیاب۔

ڈپٹی ڈائریکٹر (اُردو) • اُردو کی تعلیم، اس کی دیکھ بھال اور ترقی کی رفتار کو تیز کرنے کے لئے ڈپٹی ڈائریکٹر (اُردو) کی تقرری۔

ڈگری سطح پر • اعلیٰ سطح پر بھی اُردو کی تعلیم کا بندوبست۔

- بجنور، میرٹھ، سہارنپور، مظفر نگر، بریلی سمیت، بریلی، مراد آباد، رامپور وغیرہ ضلعوں میں ایک ایک ڈگری کالج کو ڈگری کلاسوں میں اُردو پڑھانے کیلئے آئندہ تعلیمی سال سے مالی امداد دینے کا فیصلہ۔
- یونیورسٹیوں کے علاوہ اُن سے الحاق شدہ ڈگری کالجوں میں بھی اردو کی تعلیم کی سہولت مہیا کرنے کے لئے کارروائی۔
- تمام گورنمنٹ کالجوں میں گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ کی سطح پر اُردو کی تعلیم کا بندوبست۔

اُردو اکاڈمی • اُردو زبان کے تحفظ اور ادب کی ترقی کے لئے ملک بھر میں سب سے پہلے ریاست اُتر پردیش میں اُردو اکاڈمی کا قیام۔

- اکاڈمی کے قیام سے ریاست میں اُردو زبان و ادب کا مستقبل روشن۔ اُردو ادیبوں، شاعروں، لائبریریوں اور مطالعہ گھروں کو اکاڈمی کی جانب سے اب تک پانچ لاکھ روپئے کے انعامات و عطیات

عدالتوں اور سرکاری کاموں میں اُردو کیلئے سہولت:۔

- تمام ضلع افسران کو اُردو میں لکھی ہوئی درخواستیں قبول کرنے کے سخت احکامات۔ ان احکامات کی خلاف ورزی کرنے والے افسران کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے گی۔
- دیوانی ملازمتوں کے لئے اُردو کا امتحان بھی پاس کرنا ضروری۔
- اہم قوانین، قواعد اور سرکاری اعلانات اور فہرست رائے دہندگان کی اُردو میں بھی اشاعت۔
- ہندی کی طرح اُردو اخبارات کو بھی سہولتیں۔

اُردو ہماری، آپ کی، سب کی زبان ہے اس کی خدمت کرنا اور ترقی دینا ہمارا فریضہ ہے

محکمۂ اطلاعات، اُتر پردیش کی جانب سے جاری کیا گیا

دیوانہ ہے دیوانہ...

محمد رفیع انصاری بی۔اے (آنرز)

۵۴، درگاہ روڈ، بھیونڈی، ضلع تھانہ (مہاراشٹر)

مکرمی خوشتر صاحب! تسلیمات

"شکست" کی پذیرائی سے مجھے نیا حوصلہ ملا۔ میرے حوصلوں اور اُمنگوں نے "دیوانہ ہے دیوانہ" کو جنم دیا۔ جسے میں دھڑکتے دل کے ساتھ افسانہ نمبر کے لئے ارسال کر رہا ہوں —— دیکھنا ہے آپ کیا حکم صادر فرماتے ہیں ——؟ "دیوانہ ہے دیوانہ" اِس کہانی کے متعلق صرف ایک جملہ کہا جا سکتا ہے کہ "یہ ایک ایسے عاشق کی کہانی ہے جو اپنے محبوب کی جدائی میں دیوانہ ہو گیا اور اُس کا محبوب اُس کی دیوانگی پر ہنستا رہا، قہقہے لگاتا رہا" کہانی کا پلاٹ کوئی اچھوتا نہیں۔ لیکن اسلوب تحریر میں ضرور جدت ہے اور اسی کے سہارے میں نے یہ جرأت کی ہے۔ مجھے آپ کی رائے کا شدت سے انتظار رہے گا...

آپ کا —— محمد رفیع انصاری

★

"انگلیاں فگار نہ ہو جائیں؟"

"تو کیا ہوگا؟"

"کشاری میرے دل کے ٹکڑے کر دے گی!"

"میں سمجھی نہیں!"

"یہی تو شکوہ ہے!"

"سمجھ کر بھی کیا کروں گی اِن موہوم باتوں کو؟"

"ہاں! میں پاگل جو ٹھہرا۔ گویا میں جنوں میں بک رہا ہوں۔ اِسے تم کیونکر سمجھو؟"

"تمہاری اِنہی باتوں پر مجھے ہنسی آتی ہے۔"

"اور تمہاری اِنہی باتوں پر مجھے غصہ آتا ہے۔"

"وہ بھلا کیونکر؟"

"تم نے غالب کا وہ شعر نہیں سُنا؟"

"کون سا؟"

"بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا"

"سُنا ہے!"

"یہ شعر بالکل میرے حسبِ حال ہے۔"

"ایک بات پوچھوں؟"

"شوق سے!"

"اِس کی بے نیازی کا کوئی علاج بھی تجویز کیا ہے؟"

"نہیں تو۔"

"ایک مشورہ ہے۔"

"فرمائیے!"

"ترکِ تعلق کر لیجئے۔"

"کس سے؟"

"وہی جو بے نیازی برت رہا ہے۔"

اتر پردیش میں اردو کی تیز رفتار ترقی

موجودہ ریاستی حکومت کی جانب سے زبردست سہولتیں

اردو جسے دستورِ ہند میں ایک قومی زبان کا درجہ حاصل ہے، ہمارے ملک خاص طور سے ہماری ریاست اتر پردیش کی ایک اہم اور مقبول عام زبان ہے۔ یہ کسی ایک فرقے یا مذہب کی زبان نہیں۔ اس کے چمن کی آبیاری میں سب برابر کے شریک اور حصہ دار ہیں۔ اتر پردیش کی موجودہ ریاستی حکومت نے اس کے پھلنے پھولنے اور اس کی ترقی و توسیع کے لئے متعدد اہم اور دور رس اقدامات کئے ہیں:-

پرائمری سطح پر:-

- جولائی [illegible] سے ریاست کے تمام شہری علاقوں کے ہر پرائمری اسکول میں اردو پڑھنے کی سہولت۔
- اس مقصد کے لئے تقریباً چار ہزار اردو ٹیچروں کی تقرری کا فیصلہ۔
- اگر کسی پرائمری اسکول میں فی الحال اردو پڑھنے والے بچے نہ بھی ہوں تب بھی اس اسکول میں کم از کم ایک اردو ٹیچر کا انتظام ہوگا۔
- تمام تسلیم شدہ اردو میڈیم اسکولوں اور مکتبوں کو مالی امداد دینے کا بندوبست۔
- ٹریننگ اسکولوں میں اردو کی استعداد رکھنے والے امیدواروں کو داخلے میں سہولت۔
- اردو کے ٹرینڈ ٹیچر نہ ملنے پر ان ٹرینڈ اردو ٹیچروں کی تقرری کا فیصلہ۔
- کوئی ان ٹرینڈ اردو ٹیچر اوپر کے احکامات کے بغیر ملازمت سے علیحدہ نہیں کیا جائے گا۔
- ٹیچروں کو اردو پڑھنے کی جانب زیادہ سے زیادہ متوجہ کرنے کے لئے ترغیبی الاؤنس جاری رکھنے کا فیصلہ۔
- نئے اردو میڈیم اسکول قائم کرنے کی کوششوں کی یقین دہانی۔

ثانوی سطح پر:-

- جونیئر اور ہائر سکینڈری اسکولوں میں سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو پڑھنے کا بندوبست۔
- ہر گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکول میں سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو کی تعلیم کے لئے ایک اردو ٹیچر کی تقرری۔
- تسلیم شدہ ہائر سکنڈری اسکولوں میں بھی سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو کی تعلیم کا بندوبست کئے جانے کے احکامات۔
- جونیئر ہائی اسکول تک تمام کتابیں اردو میں دستیاب۔

ڈپٹی ڈائرکٹر (اردو) • اردو کی تعلیم، اس کی دیکھ بھال اور ترقی کی رفتار کو تیز کرنے کے لئے ڈپٹی ڈائرکٹر (اردو) کی تقرری۔

ڈگری سطح پر • اعلیٰ سطح پر بھی اردو کی تعلیم کا بندوبست۔

- بجنور، میرٹھ، سہارنپور، مظفر نگر، پیلی بھیت، بریلی، مراد آباد، رامپور وغیرہ کے ضلعوں میں ایک ایک ڈگری کالج کو ڈگری کلاسوں میں اردو پڑھانے کیلئے آئندہ تعلیمی سال سے مالی امداد دینے کا فیصلہ۔
- یونیورسٹیوں کے علاوہ ان سے الحاق شدہ ڈگری کالجوں میں بھی اردو کی تعلیم کی سہولت مہیا کرنے کے لئے کارروائی۔
- تمام گورنمنٹ کالجوں میں گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ کی سطح پر اردو کی تعلیم کا بندوبست۔

اردو اکاڈمی • اردو زبان کے تحفظ اور ادب کی ترقی کے لئے ملک بھر میں سب سے پہلے ریاست اتر پردیش میں اردو اکاڈمی کا قیام۔

- اکاڈمی کے قیام سے ریاست میں اردو زبان و ادب کا مستقبل روشن، اردو ادیبوں، شاعروں، لائبریریوں اور مطالعہ گھروں کو اکاڈمی کی جانب سے اب تک پانچ لاکھ روپئے کے انعامات و امداد۔

عدالتوں اور سرکاری کاموں میں اردو کیلئے سہولت:-

- تمام ضلع افسران کو اردو میں لکھی ہوئی درخواستیں قبول کرنے کے سخت احکامات۔ ان احکامات کی خلاف ورزی کرنے والے افسران کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے گی۔
- دیوانی ملازمتوں کے لئے اردو کا امتحان بھی پاس کرنا ضروری۔
- اہم قوانین، قواعد اور سرکاری اعلانات اور فہرست رائے دہندگان کی اردو میں بھی اشاعت۔
- ہندی کی طرح اردو اخبارات کو بھی سہولتیں۔

اردو ہماری، آپ کی، سب کی زبان ہے — اس کی خدمت کرنا اور ترقی دینا ہمارا فریضہ ہے

محکمہ اطلاعات، اتر پردیش کی جانب سے جاری کیا گیا

دیوانہ ہے دیوانہ...

محمد رفیع انصاری بی۔اے (آنرز)

۵۲، درگاہ روڈ، بھیونڈی، ضلع تھانہ (مہاراشٹر)

مکرمی خوشتر صاحب! تسلیمات

"شکست" کی پذیرائی سے مجھے نیا حوصلہ ملا۔ میرے حوصلوں اور اُمنگوں نے "دیوانہ ہے دیوانہ" کو جنم دیا۔ جسے میں دھڑکتے دل کے ساتھ افسانہ نمبر کے لئے ارسال کر رہا ہوں ——— دیکھنا ہے آپ کیا حکم صادر فرماتے ہیں ——— ؟ "دیوانہ ہے دیوانہ" اس کہانی کے متعلق صرف ایک جملہ کہا جا سکتا ہے کہ "یہ ایک ایسے عاشق کی کہانی ہے جو اپنے محبوب کی جدائی میں دیوانہ ہو گیا اور اُس کا محبوب اُس کی دیوانگی پر ہنستا رہا، قہقہے لگاتا رہا" کہانی کا پلاٹ کوئی اچھوتا نہیں، لیکن اسلوب تحریر میں ضرور جدّت ہے اور اسی کے سہارے میں نے یہ جرأت کی ہے۔ مجھے آپ کی رائے کا شدّت سے انتظار رہے گا...

آپ کا ——— محمد رفیع انصاری

★

"انگلیاں فگار نہ ہو جائیں؟"

"تو کیا ہوگا؟"

"کٹاری میرے دل کے ٹکڑے کر دے گی!"

"میں سمجھی نہیں!"

"یہی تو شکوہ ہے!"

"سمجھ کر بھی کیا کروں گی اِن موہوم باتوں کو۔"

"ہاں! میں پاگل جو ٹھہرا۔ گویا میں جنوں میں بک رہا ہوں۔ اِسے تم کیونکر سمجھو۔"

"تمھاری اِنہی باتوں پر مجھے ہنسی آتی ہے۔"

"اور تمھاری اِنہی باتوں پر مجھے غصّہ آتا ہے۔"

"وہ بھلا کیونکر؟"

"تم نے غالب کا وہ شعر نہیں سُنا؟"

"کون سا؟"

"بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا"

"سُنا ہے!"

"یہ شعر بالکل میرے حسبِ حال ہے۔"

"ایک بات پُوچھوں؟"

"شوق سے!"

"اِس کی بے نیازی کا کوئی علاج بھی تجویز کیا ہے؟"

"نہیں تو۔"

"ایک مشورہ ہے۔"

"فرمایئے!"

"ترکِ تعلق کر لیجئے۔"

"کس سے؟"

"وہی جو بے نیازی برت رہا ہے۔"

"اُس کے بغیر جی نہ سکوں گا۔"
"لیکن وہ تمھارے بغیر جی لے گی۔"
"دیکھنا میں اُسے اپنا لوں گا!"
"وہ تم جیسے پاگل کے ہاتھ نہ آئے گی۔" اتنا کہہ کر شہناز کنارہ لئے گھر میں چلی گئی اور اسلم اُسے حسرت بھری نظروں سے دیکھتا رہ گیا۔ آج بھی اُسے وہی جواب ملا جو کل ملا تھا۔ پھر یہ خاموشی اُس کی خود کلامی میں تبدیل ہو گئی۔ "شہناز! میرا پیار تم نے اب تک نہیں پہچانا۔ میں نے تمھیں چاہا ہے۔ تمھاری پرستش کی ہے۔ لیکن تم نے میری وفاؤں کے صلے میں مجھے پاگل کہا ہے۔ یہ کیسا مذاق ہے؟ چلئے مان لیا میں پاگل سہی، دیوانہ سہی، لیکن سُن لو، تمھارا

- جو زیادہ بولتا ہے وہ زیادہ غلطی کرتا ہے۔
(حضرت علی کرم اللہ وجہہ)
- فرزند آدم کی بھلائی بندگی اور عزت سرافگندگی میں ہے۔
(احمد بن یحییٰ)
- قسموں سے بلکہ سچی قسموں سے بھی بچتے رہو۔ (حضرت ادریسؑ)
- اللہ کے فضل و کرم سے مایوس نہ ہو۔ اللہ کے فضل و کرم سے اہلِ کفر ہی مایوس ہوتے ہیں۔ (حضرت یعقوبؑ)
- گُناہ کی ندامت پاکبازی کے غرور سے بہتر ہے۔
(حضرت عیسیٰؑ)

وجود مجھے کیا ہر کسی کو دیوانہ بنا دیتا ہے۔ پھر اس میں میرا کیا قصور۔ مجھے آزما کر تو دیکھو شہناز! میں ہر آزمائش پر پورا نہ اتروں تو شوق سے مجھ سے ترکِ تعلق کر لینا۔ لیکن یہ بے نیازی اور بے رُخی خدا کے لئے چھوڑ دو۔" وہ اکیلا یوں ہی بہت دیر تک بڑبڑاتا رہا۔ خلاؤں میں گھورتا رہا۔ کبھی چاند کو دیکھتا اور کبھی شہناز کے نقش پا کو۔ کبھی اُڑتے ہوئے چکور کو دیکھتا اور کبھی اپنے وجود کا جائزہ لیتا۔ وہ سوچنے لگا چاند کتنا بے نیاز ہے۔ اُسے کیا خبر کہ کوئی اُس کی محبت میں دیوانہ وار گرفتار ہے، اتنا کہ اب اُسے اپنی بھی خبر نہیں۔ وہم و گمان کی اس دُنیا میں وہ اُمید کا ایک چراغ جلائے ہوئے ہے، ایک آس، اِک موہوم سی اُمید اپنے سینے میں چھپائے ہوئے۔ اِس انتظار میں کہ ایک نہ ایک دن ضرور وہ فرخندہ ساعت بھی آئے گی جب اُسے اُس کی وفاؤں کا صلہ اُس کی توقع کے مطابق نہ سہی لیکن ملے گا ضرور!

اِسی لئے تو دو دلوں کو ملانے والے اِس طویل راستے پر اُگے ہوئے کانٹے اُسے لہلہاتے سبزہ زار ہی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ گھٹن، یہ چُبھن، یہ تڑپ، یہ جان لیوا انتظار کی طویل گھڑیاں جیسے محبوب کی بارگاہ میں ایک نذرانہ ہوں۔ یہ انتظار ایک امتحان ہی تو ہے۔ تابناک و روشن مستقبل کا! کاش ایسا ہو سکتا۔

"ارے تم پھر چلی آئیں؟"
"میں چلی آئی یا تم ابھی تک گئے نہیں؟"
"اب تو اِس در سے نہ ہٹنے کی قسم کھائی ہے!"
"فیصلہ نہیں سُنا؟"
"میں تو آخری فیصلے کا منتظر ہوں!"
"میرا ہر فیصلہ قطعی ہُوا کرتا ہے!"
"میرا بھی یہ آخری فیصلہ ہے!"
"کہ یہاں سے نہ ہٹو گے؟"
"جی ہاں!"
"تو پھر جمے رہو!"
"جما رہوں گا!"
"لیکن کب تک؟"
"جب تک جواب نہ مل جائے۔"
"کیسا جواب؟ کس کا جواب؟"
"میری وفاؤں کا جواب۔"
"وفاؤں کا جواب مانگا نہیں جاتا۔ یہ دینے والے پر منحصر ہے ملا نہ ملا۔"
"تو کیا مجھے میری وفاؤں کا صلہ نہ ملے گا؟"
"ایک مشورہ ہے!"
"فرمایئے؟"
"تم نے غالب کا وہ شعر تو سُنا ہی ہو گا؟"
"کون سا؟"
"وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

”میں کچھ سمجھا نہیں۔“
”بہت آسان سی بات ہے۔“
”آسان سی بات؟“
”ہاں! یہی کہ جس در سے مانگنے سے بھی نہ ملے اُسے چھوڑ دیا جائے۔“
”لیکن جو در پسند آجائے؟“
”تو تم جیسے پاگل کی عقل پر رونا چاہئے۔“
”پھر تم نے مجھے پاگل کہا؟“
”اور نہیں تو کیا کہوں۔“
”پاگل کی اِس طرح ہنسی نہ اُڑاؤ! کہ رشہناز!“
”ہنسی تو تم میری اُڑا رہے ہو۔“
”یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ تم تو مجھے جان سے زیادہ عزیز ہو!“
”یہی تو مذاق ہے۔“
”تو کیا کوئی کسی سے پیار بھی نہ کرے؟“
”میں نے کب اِس سے انکار کیا ہے۔“
”تو پھر اِنکار کس بات کا ہے؟“
”میں تمھارے اِس سوال کا جواب کئی بار دے چکی ہوں۔“
”تم سمجھتی کیوں نہیں شہناز! میں تمھیں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے چاہتا ہوں۔ جب تک تمھارا دیدار نہ کرلوں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میری کوئی بیش بہا شئے کھو گئی ہو۔ تمھیں نہ دیکھ کر میں مضمحل ہو جاتا ہوں اور جب تم سامنے آجاتی ہو تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مجھے سب کچھ مل گیا ہو، میں نے سب کچھ پا لیا ہو۔ تمھاری اداؤں اور تمھارے بانکپن نے مجھے گھائل کر دیا ہے۔ تمھاری نشیلی آنکھیں مجھے نئی روشنی بخشتی ہیں۔ جی چاہتا ہے بس تمھیں دیکھتا ہی رہوں۔ ہمیشہ دیکھتا رہوں۔ تم ہی تو میری دُنیا ہو، میرا سب کچھ ہو! یقین مانو جب سے تم میرے پڑوس میں منتقل ہوئی ہو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے جنّت پڑوس میں آگئی ہو! اِس سے پہلے کبھی میری یہ حالت نہ ہوئی تھی۔ میں کتنا آزاد تھا۔ کتنا خود دار تھا۔ آوارہ پنچھی کی طرح کبھی اِس ڈال پر اور کبھی اُس ڈال پر۔ نہ منزل کا پتہ تھا اور نہ ساتھی کی تلاش۔ میں بھی تمھاری طرح بے نیاز تھا۔ اب میں کتنا بدل گیا ہوں۔ جیسے تم میرے لئے ہی یہاں آئی ہو۔ جیسے مجھے تمھارا انتظار تھا۔ لیکن کسی کو اپنا بنانا بھی کتنا مشکل ہے۔ کیسی کیسی یقینی و بایوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ کتنے صبر آزما مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ شہناز! میں ترس رہا ہوں۔ مجھے انتظار ہے۔ میرے اِس خواب کو حقیقت میں بدل دو۔“
”خواب؟“
”ہاں! میرے اِس خواب کو حقیقت کا رُوپ دے دو۔“
”خواب اور حقیقت دو متضاد چیزیں ہیں۔“
”خواب ہی تو حقیقت کا عکس ہوتے ہیں۔“
”لیکن ایک دیوانے کے خواب کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا؟“
”تو کیا دیوانے کا خواب کوئی خواب نہیں ہوتا؟“

- تنہائی بہترین ساتھی ہے۔ (تھورو)
- زندگی کا مقصد مسرّت ہی نہیں، تکمیلِ انسانیت ہے۔ (مینگل)
- اگر لوگ اِتنی سی بات سمجھ لیتے کہ اُن کی بہتری نیکی میں ہے تو وہ کتنے آسودہ ہوتے۔ (جان نوسٹین)
- عقلمند وہ ہے جو ہر کام میں میانہ روی اختیار کرے۔ (افلاطون)
- انسان لاکھ علم حاصل کرے۔ اگر عمل نہیں کرتا تو بے وقوف ہے۔ (سعدیؒ)

”بے شک!!“
”اِس طرح مجھے غصے میں نہ ڈالو شہناز! میں سچ مچ پاگل ہو جاؤں گا۔ میری آرزوؤں کو یوں پامال نہ کرو۔ میری آشاؤں کا اِس طرح گلا نہ گھونٹو۔ تم ہنس کیوں رہی ہو، قہقہے کیوں لگا رہی ہو۔ مجھے نہ جلاؤ——“

وہ ہنستی رہی۔ اُس کے قہقہے فضا میں گونجتے رہے اور معدوم ہوتے رہے اور پھر وہ پردے کی اوٹ میں چلی گئی۔ ہلکے ہلکے قہقہوں کی آوازیں اب تک آرہی تھیں۔ وہ دیوانے کی طرح اُسے گھورتا رہا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ قہقہے نہ ہوں اُس کے دل کے شیشے پر شدید پتھراؤ ہوں۔ اُس کی تمنّاؤں اور آرزوؤں پر

کاری ضربیں ہوں۔ وہ سوچنے لگا خوابوں کا دلکش آئینہ یوں ہی چکنا چور ہو جائے گا؟ نہیں !! نہیں ! ایسا نہ ہوگا۔ یہ تو محض ایک ہنسی ہے۔ ایک امتحان ہے۔ ایک آزمائش ہے۔ دیکھنا وہ ضرور ایک دن اُس کا سہارا ڈھونڈے گی۔ اُسے تلاش کرے گی اور وہ اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لے گا۔

دن گزرتے رہے۔ شہناز نے اِک فیصلہ کر لیا۔ حال کے دھندلکے میں اُس نے مستقبل کی روشنی دیکھ لی۔ اُس نے کچھ خواب بُنے۔ خیالی دُنیا کی تعمیر کی۔ اُس کے ذہن میں ایک خیالی پیکر اُبھرا۔ اُس کا محبوب... خوابوں کا شہزادہ۔ ایک دیوتا۔ اُسے دل و جان سے چاہنے والا۔ اُس سے بے پناہ محبت کرنے والا۔ نہیں ! نہیں ! وہ اسلم نہ ہوگا۔ وہ تو پاگل ہے۔ جنونی ہے۔ دیوانہ ہے۔ وہ مجھے سمجھ نہ پائے گا۔ اِسی لئے تو میں نے اُس سے ہمیشہ پہیلیاں بُجھوائی ہیں۔ اُس سے بے نیازی برتی ہے۔ دبے الفاظ میں میں نے اُسے اپنا فیصلہ بھی سُنا دیا ہے۔ پھر بھی وہ کمبخت بَلا کا جنونی ہے۔ اپنی ہی کہتا ہے۔ وہ کوئی اور ہوگا جو بہت دُور سے آئے گا۔ بہت دُور سے ! اور اُسے بہت دُور لے جائے گا۔ بہت دُور... !

"تم نے سامنے والی کھڑکی بند کیوں کر دی ہے؟"
"مجھے ڈر ہے۔"
"کہ کہیں کوئی تمھیں اُڑا نہ لے جائے !"
"چُپ رہو ! کیا کہتی ہو؟"
"میں نے تمھاری چوری دیکھ لی ہے۔"
"چوری ؟؟؟"
"تمھیں معلوم ہے نا ! سامنے ایک نوجوان رہتا ہے۔"
"کون ؟"
"اسلم !"
"ہوں ! وہ تو دیوانہ ہے !"
"ہاں ! تمھارے پیار کا دیوانہ !"
"تمھیں کیسے معلوم ؟"
"اجی مجھ سے کیا پوچھتی ہو۔ ساری بستی جانتی ہے !"
"کیا مطلب ؟"
"مطلب یہ کہ اب یہ راز، راز نہ رہا !"
"ہوں ! مجھے اِس راز کے افشا ہونے کا کوئی ڈر بھی نہیں ہے۔"
"ہاں کیوں نہیں ! عشق پر بھلا کب کسی کا زور چلا ہے۔"
"اُف او ! تم نے کیسے سمجھ لیا کہ یہ عشق ہے؟"
"یہ تو میں نے پہلے ہی کہہ دیا۔"
"تو تم نے مجھے غلط سمجھا زرینہ !"
"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"
"مجھے اُس سے ہرگز کوئی لگاؤ نہیں۔"
"یہ تو جھوٹی صفائی ہوئی۔"
"نہیں یہ حقیقت ہے !"
"کہ تم اُس سے پیار نہیں کرتیں؟"
"ہاں !!"
"یہ بھلا میں کیسے مان لوں۔"
"تمھارے ماننے اور نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے۔"
"تو کیا تم نے اپنا ردِّ عمل اُس پر ظاہر نہیں کیا؟"
"وہ خوب جانتا ہے میری بے نیازیوں کو۔"
"پھر بھی باز نہ آیا !"
"پاگل جو ٹھہرا !"
"ایک راستہ ہے۔"
"کون سا؟"
"اُسے اپنا کیوں نہیں لیتیں؟"
"اُسے اپنانا پاگل پن ہوگا۔ تم نہیں جانتیں زرینہ ! میں نے سپنوں کا جو محل تعمیر کیا ہے، وہ کتنا حسین ہے، کتنا خوبصورت ہے، کتنا عالیشان ہے ! وہ دن دُور نہیں جب شہنائیاں بجیں گی۔ ڈولی سجے گی۔ خوبصورت و دلکش شامیانہ تنے گا۔ ڈھول کی تھاپ پر سکھیاں وداع کے گیت گائیں گی۔ خوشی سے رگ رگ جھوم اُٹھے گی۔ پھر... وہ آئیں گے۔ گھوڑے پر سوار۔ ملن کا گیت گاتے ہوئے۔ خوشیوں کا طوفان لئے۔ کتنا حسین دن ہوگا وہ جب میں اُن کی ہو جاؤں گی !" اور پھر وہ ہنسنے لگی۔ قہقہے لگانے لگی۔ زرینہ بھی اُس کے ساتھ ہنسنے لگی۔ دونوں کے قہقہے فضا میں بکھرتے رہے اور

یہ سلسلہ جاری رہا۔ قہقہے بلند ہوتے رہے۔ کھڑکی بند رہی ۔۔۔ وہ انتظار کرتا رہا۔ اُس نے ساری دُنیا سے رشتہ توڑ لیا۔ سب سے مُنہ موڑ لیا۔ اُسے کچھ یاد نہ رہا۔ وہ سب کچھ بھولنے لگا۔ شہناز کی راہ دیکھتے دیکھتے اُس کی آنکھیں تھک گئیں۔ لیکن وہ کھڑکی کُھلنے کا منتظر رہا۔ طرح طرح کے وسوسے اور خدشات اُسے پریشان کرنے لگے۔ کہیں اُسے کچھ ہو تو نہیں گیا؟ پھر وہ کہاں کھو گئی۔ اُسے کوئی اُڑا تو نہیں لے گیا۔ نہیں! نہیں! جیتے جی اُسے کوئی نہیں لے جا سکتا۔ اُسے کوئی چھین نہیں سکتا۔ پھر یہ کھڑکی بند کیوں ہے؟ اُس نے کھڑکی کیوں نہیں کھولی؟ اُسے پاگل کیوں نہیں کہا؟ اُس کی باتوں کا مذاق کیوں نہیں اُڑایا؟ اُس پر ہنسی کیوں نہیں؟ اُس کی باتوں کا جواب کیوں نہیں دیا؟ ضرور کوئی بات ہوگی۔ وہ بیمار تو نہیں ہوگئی؟ کہیں کٹاری نے اُس کی اُنگلیوں کو زخمی تو نہیں کر دیا؟ نہیں ایسا نہ ہوگا۔ اگر ایسا ہو جائے گا تو میرے جگر کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ لیکن پھر یہ قہقہے کیسے ہیں؟ یہ کیسا راز ہے؟ خدا کے لئے کوئی بتائے؟ مجھے اِن سے بہت ڈر لگنے لگا ہے۔ یہ قہقہے میرے دل کی دھڑکنیں تیز کر دیتے ہیں۔ یہ مجھے پاگل نہ بنا دیں۔ میرا وجود اِن کی کرخت آوازوں سے لرزنے لگتا ہے۔ میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔ شہناز کی پرچھائیں دھندلی ہونے لگتی ہے۔ جلدی آؤ۔ اِس کھڑکی کو کھول دو شہناز! میرے سارے شکوک و شبہات کو دُور کر دو۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ کب سے کھڑا ہوں۔ میں سب کچھ بھول گیا ہوں۔ تم کہاں ہو۔ چلی آؤ۔ میری آنکھیں تمہارے لئے ترس رہی ہیں۔ چلی آؤ۔ پھر میں بھی قہقہے لگاؤں گا۔ تم بھی ہنسنا اور ہم دونوں کوئی سہانا خواب دیکھنے لگیں گے۔ محبت کا، روشنی کا، مہکتا ہوا، جگمگاتا ہوا خواب!

وقت گزرتا رہا ۔۔۔ اُس کی بے چینی بڑھتی گئی ۔۔۔ اور ایک دن تو طوفان آگیا ۔۔۔ شہنائیاں بجنے لگیں، گیت گائے جانے لگے۔ اُس کی سہیلیاں اُس کے پاس آگئیں۔ اُسے چھیڑنے لگیں۔ اُس کے کان میں نہ جانے کیا کیا کہتیں اور پھر قہقہوں کا ایک سمندر اُمڈنے لگا۔ دُلہن سجی۔ مانگ میں افشاں بھری گئی۔ ایک شور ہوا۔ دُولہا میاں آگئے۔ ایک جمِ غفیر لئے خوشیوں اور مسرتوں کی دُنیا لئے۔ باجے گاجے کے ساتھ، پٹاخوں کے شور میں، سِکّوں کی برسات لئے۔ وہ جُھوم اُٹھی۔ اُس کے خوابوں کا شہزادہ

> ہر نسل کے ادیبوں کا نمائندہ ماہنامہ "بیسویں صدی" اپنی روایات کی شاندار منزلوں کو طے کرتا ہوا اپنی ایک اور منزل کے ساتھ اُبھرا ہے اور اپنا ۱۹۷۳ء کا مرقع افسانہ نمبر شائع کر دیا ہے جس میں موجودہ سماج کی جذباتی، سوشل، سیاسی اور نفسیاتی زندگی کے تار و پود بڑی فنکارانہ اور خوبصورتی سے بکھیرے گئے ہیں۔ اس نمبر کے مطالعہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہماری سوسائٹی کا موڑ کیا ہے۔ وہ کیسے سوچتی ہے، کیسے عمل کرتی ہے اور کس طرف جا رہی ہے۔ ایک آئینہ ہے زندگی کے مختلف پہلوؤں کا جس میں پڑھنے والے کو نہ صرف اپنا عکس نظر آتا ہے بلکہ اپنے محلے، اپنے دوستوں اور اپنے رشتہ داروں کا بھی ہم "بیسویں صدی" کے جملہ اراکین، ایڈیٹر جناب خوشتر گرامی کو اس نمبر کی اشاعت پر مُبارکباد دیتے ہیں کہ وہ اُردو افسانہ نگاری کی تاریخ کو مسلسل آگے بڑھا رہے ہیں اور اہلِ ذوق کی تشنگی پوری کرنے کا سامان پیدا کرتے رہتے ہیں۔۔۔
>
> روزنامہ "ملاپ" نئی دہلی

اُس کے در پر اُسے لینے کے لئے آگیا! وہ دل ہی دل میں ناچ اُٹھی ۔۔۔ خوابوں کی دُنیا میں کھو گئی۔ سب کچھ بھول گئی۔ اُسے کچھ یاد نہ رہا ۔۔۔ جُدائی کا دردانگیز نغمہ بج اُٹھا۔ ڈولی سجی اور پھر سہیلیوں نے اُسے نمناک آنکھوں سے رُخصت کر دیا ۔۔۔ وہ چلی گئی۔ بہت دُور۔ بہت دُور ۔۔۔ اپنے جیون ساتھی کے ساتھ ۔۔۔ بہت دُور ۔۔۔ منڈپ خالی رہ گیا۔ چراغ بُجھ گئے۔ شمعیں گُل ہو گئیں۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ ویرانی برسنے لگی۔ خوشیاں اُس کے ساتھ چلی گئیں۔ جگمگاتی روشنیاں اندھیرے میں تبدیل ہو گئیں۔ سونی رات ظلمت میں ڈوب گئی۔ چاند بدلیوں میں چُھپ گیا ۔۔۔ وہ چیختا رہا، چِلّاتا رہا۔ اُسے آواز دیتا رہا۔ آسمانوں میں اُس کی چیخیں شگاف کرنے لگیں۔ تڑپتا رہا، ایک قیدی کی طرح۔ ایک پاگل کی طرح۔ نہیں! نہیں! یہ ایک خواب ہے۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ یہ ایک مذاق ہے۔ تم میری ہو! صرف میری! تمہیں کوئی نہیں چھو سکتا۔ لیکن پھر وہ شہنائی کیسی بجی تھی؟ ڈولی کیسی سجی تھی؟ وہ سکھیوں نے گیت کیسے گائے تھے؟ پھر وہ کون آیا تھا۔ گھوڑے پر سوار، بنا سنورا! تو کیا وہ اُسے اپنے ساتھ لے گیا؟ ہمیشہ کے لئے لے گیا؟ مجھ سے چھین کر لے گیا۔ کیا وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی تھی؟ کیا وہ مجھے پاگل نہیں کہتی تھی؟ ہاں! ہاں! وہ بے نیازی برتتی تھی۔ میری باتوں پر ہنسا کرتی تھی۔ کیا اس لئے کہ وہ یہاں سے چلی جائے گی مجھ سے جُدا ہو کر ۔۔۔ یہ ایک فریب ہے۔ ایک خواب ہے۔ ایک امتحان ہے۔ ایک آزمائش ہے۔ وہ آئے گی۔ ضرور آئے گی۔ مجھ سے ملنے کے لئے۔ یہ ایک فریب ہے۔

خوب مذاق کیا ہے اُس نے۔ وہ ہنسنے لگا۔ قہقہے لگانے لگا۔

"بند کر دو یہ قہقہے!"

"یہ قہقہے اب بند نہ ہوں گے۔ اِن پر کسی کا زور نہ چلے گا۔ تم بھی قہقہے لگاؤ میرے دوست۔ کتنا خوبصورت مذاق کیا ہے اُس نے!"

"اسلم! خُدا کے لئے اُسے بھول جاؤ!"

"اُسے کبھی نہ بھولوں گا!"

"وہ پرائی ہو چکی ہے!"

"نہیں وہ صرف میری ہے!"

"اُس کا جیون ساتھی اُسے مِل چکا ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے!"

"یہ سچ ہے!"

"یہ جھوٹ ہے!"

"تم پاگل ہو گئے ہو؟"

"تم نے بھی مجھے پاگل کہا۔ اُس نے بھی مجھے پاگل کہا تھا۔ تم سب کیوں مجھے پاگل کہتے ہو؟ مجھے کیوں دیوانہ کہتے ہو؟"

یہ کہہ کر وہ زور زور سے رونے لگا۔ پھوٹ پھوٹ کر۔ سسک سسک کر۔

"نہ روؤ میرے ہمدم، سمجھو کہ وہ مر چکی ہے!"

"وہ مر گئی تو میں اپنے آپ کو ختم کر دوں گا۔ تمہیں ختم کر دوں گا! مجھے اِس ویرانے میں اکیلا چھوڑ دو۔ یہاں کوئی نہ آئے گا۔ صرف میں رہوں گا۔ وہ رہے گی۔ ہم دونوں رہیں گے۔ یہاں تیسرا کوئی نہ ہو گا۔ میں کہیں نہ جاؤں گا۔ یہیں بیٹھا رہوں گا۔ دیکھنا تھوڑی دیر بعد وہ کھڑکی کھلے گی۔ شہناز اُس کھڑکی سے آ کر مجھے پاگل کہے گی۔ وہ مجھ سے کہے گی۔ او پاگل دیکھو! دیکھو میں آ گئی ہوں! پھر میں زور سے ہنسوں گا۔ چیخوں گا۔ چلّاؤں گا۔۔۔۔ اور پھر ایک دن جب کھڑکی کھلی تو۔۔۔۔ روشنیاں جگمگا اُٹھیں۔ شمعیں روشن ہو گئیں۔ ویرانے میں پھر بہار آ گئی اور دو قہقہے فضا میں اُبھرے۔ ایک جانی پہچانی آواز تھی اور ایک اجنبی قہقہہ۔۔۔۔ شہناز آج اپنے بابل کے آنگن میں آئی تھی۔ اپنے جیون ساتھی کے ساتھ! اپنے ماضی کی تصویریں دکھانے۔ بیتے دنوں کے نقش دکھانے۔ جہاں اُس نے سہانے سپنے دیکھے تھے۔ خوابوں کے شیش محل تعمیر کئے تھے۔ ایک حسین و جمیل مستقبل کے تانے بانے بُنے تھے۔ ماضی اور حال میں کتنا فرق تھا! حال ماضی کے خوابوں سے زیادہ دلکش تھا۔ زیادہ حسین تھا۔ زیادہ مسرت آگیں تھا، زیادہ فرحت بخش تھا۔ زیادہ مسحور کن تھا۔۔۔۔ جاوید نے شہناز کو پیار سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تو آپ کا ماضی یہاں گزرا ہے؟"

"جی ہاں!"

"بہت خوبصورت جگہ ہے!"

"ہوں!"

"ماضی اور حال میں موازنہ کر کے تم کس نتیجے پر پہنچی ہو؟"

"مجھے حال عزیز تر ہے!"

"سچ؟"

"بے شک!" اور وہ جاوید سے لپٹ گئی۔ دونوں ایک دُوسرے میں کھو گئے، سب کچھ بھول کر۔ انہیں کچھ یاد نہ رہا۔ کھڑکی کھلی رہی۔ اچانک شور اُٹھا۔ دونوں ایک دُوسرے سے جُدا ہو گئے۔ جاوید چیخا۔

"یہ شہناز۔۔۔۔ شہناز کی آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں۔۔۔ قہقہے کیسے بلند ہو رہے ہیں؟ یہ شور کیسا ہے؟"

"قہقہے! او یاد آیا! میں تو بھول ہی گئی تھی۔ سامنے والے کمرے میں کوئی پاگل رہتا ہے!"

"پاگل! تو وہ تمہیں کیوں پکار رہا ہے؟"

"مجھے نہیں۔۔۔۔ سُنا ہے وہ کسی کی محبت میں دیوانہ وار گرفتار ہو گیا تھا۔۔۔۔ پھر اُس کی شادی ہو گئی۔۔۔۔ وہ چلی گئی اور وہ پاگل ہو گیا۔۔۔۔ ہاں کہتے ہیں اُس لڑکی کا نام بھی شہناز تھا!"

"او! یہ بات ہے۔ میں تو ڈر گیا تھا۔"

"لایئے میں کھڑکی بند کر دوں۔"

"تم رہنے دو۔ میں ہی بند کر لیتا ہوں!!"

مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ مضمون حاشیہ چھوڑ کر روشن سیاہی سے خوشخط لکھا کریں اور دو سطور کے درمیان فاصلہ چھوڑنا بہت ضروری ہے۔ بعض اچھے مضامین محض بدخطی کی وجہ سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں ہمیشہ غیر مطبوعہ مضامین بھیجیں اور ایڈیٹر کی اطلاع کے لئے مضمون کے خاتمے پر غیر مطبوعہ لکھیں بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں یہ نہایت نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اپنے پاس مضمون کی نقل ضرور رکھیں کیونکہ ناقابل اشاعت مضامین ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔ ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجنا بے کار ہے۔ [illegible] مدیر

صحت و زندگی

۱۔ کیا چاول بطور غذا مفید ہیں؟

چاول بہت سے لوگوں کی مرغوب ترین غذا ہے۔ اسے لوگ بہت رغبت سے کھاتے ہیں۔ ہندوستان کے طول و عرض میں چاول کھانے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس سے بہت سی اقسام کے طعام تیار کئے جاتے ہیں۔ لیکن مسلسل چاول کھانا صحت کے لئے فائدہ بخش نہیں۔

دوسرے اناجوں کی بہ نسبت چاول میں وٹامن لے، پروٹین اور چربی کی مقدار بہت کم ہے اور صحت کو برقرار رکھنے کے لئے ان چیزوں کی بے حد ضرورت ہے۔

مسلسل چاول کھانے سے معدہ اور آنتیں پھیل جاتی ہیں۔ قبض کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس سے سوء ہضم اور نفخ بھی ہو جاتا ہے۔ چاول بکثرت کھانے سے کھانسی، نزلہ اور کئی دوسرے عوارض لاحق ہوتے ہیں۔

چاول بطور غذا کھانے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ گیہوں کا استعمال بھی رکھیں۔ گیہوں کی غذائی طاقت چاول سے بہت زیادہ ہے۔

چاول میں نشاستہ کے اجزاء سب سے زیادہ اور نائٹروجنی اجزاء، نمکوں کی مقدار اور روغنی اجزاء بہت کم پائے جاتے ہیں۔ چاول زود ہضم غذا ہے لیکن جسم کی نشو و نما کرنے والا جز پروٹین اس میں بہت کم ہوتا ہے۔ کیلسیم بھی بہت کم، بلکہ نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔

چاول میں وٹامن لے کی کمی کے باعث بکثرت چاول کھانے والوں کی بینائی کمزور ہو جاتی ہے۔ جنوبی ہند میں چاول بہت زیادہ کھایا جاتا ہے۔ اسی لئے اس علاقہ میں اندھے پن کی بیماری زیادہ ہے۔

اگر نفاست پسندی کو چھوڑ کر مشین سے صاف کیا ہوا چاول نہ کھایا جائے تو اس مرغوب غذا سے بہت حد تک غذائیت بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔

مشین سے صاف کئے ہوئے چاول میں سے وہ رنگین تہہ بھی صاف کر دی جاتی ہے جو چاول کا سب سے قیمتی جز ہوتی ہے۔ اناجوں، دالوں اور پھلوں کے باریک چھلکے جو ان سے اچھی طرح چسپاں ہوتے ہیں، یہ صرف تحفظ اور خوبصورتی ہی کا کام نہیں دیتے، ان سے جسم کے لئے نہایت قیمتی اجزاء حاصل ہوتے ہیں۔ وٹامنز اور معدنی اجزاء جن پر جسمانی افعال کی صحت کا مدار ہے ان میں بڑی مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ چاول کی وہ رنگین تہہ جیسے دھان کے اوپر کا سخت چھلکا دور کرتے وقت الگ کر دیا جاتا ہے۔ اس میں پورے چاول کی دس فی صد پروٹین ہوتی ہے۔ پروٹین کے علاوہ اور دوسرے قیمتی اجزاء بھی ہوتے ہیں، جو وٹامن بی کی بہترین اقسام ہیں۔ چاول کی اس رنگین تہہ میں دوسرے وٹامنز بھی ہوتے ہیں۔ جنہیں چاول صاف کرتے وقت چاول سے الگ کر دیا جاتا ہے۔

مشین سے صاف کئے ہوئے چاولوں سے ان کا چھلکا ضائع ہو جاتا ہے جس میں وٹامن بی ہوتا ہے۔ وٹامن بی ضائع ہو جانے کے بعد ان چاولوں کے کھانے سے مرض بیری بیری ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس کے انسداد اور اس کے بچنے کی تدبیر یہ ہے کہ مشین سے صاف کئے ہوئے چاولوں کے بجائے اوکھلی میں ہاتھ سے کوٹ کر صاف کئے ہوئے چاول کھانے چاہئیں۔

عام طور پر چاول پکاتے وقت اس کی پیچ کو بیکار سمجھ کر

خوب مذاق کیا ہے اُس نے۔ وہ ہنسنے لگا۔ قہقہے لگانے لگا۔

"بند کرو یہ قہقہے!"

"یہ قہقہے اب بند نہ ہوں گے۔ اِن پر کسی کا زور نہ چلے گا۔ تم بھی قہقہے لگاؤ میرے دوست۔ کتنا خوبصورت مذاق کیا ہے اُس نے!"

"اسلم! خُدا کے لئے اُسے بھُول جاؤ!"

"اُسے کبھی نہ بھُولوں گا!"

"وہ پرائی ہو چکی ہے!"

"نہیں وہ صرف میری ہے!"

"اُس کا جیون ساتھی اُسے مل چکا ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے!"

"یہ سچ ہے!"

"یہ جھوٹ ہے!"

"تم پاگل ہو گئے ہو؟"

"تم نے بھی مجھے پاگل کہا۔ اُس نے بھی مجھے پاگل کہا تھا۔ تم سب کیوں مجھے پاگل کہتے ہو؟ مجھے کیوں دیوانہ کہتے ہو؟"

یہ کہہ کر وہ زور زور سے رونے لگا۔ پھُوٹ پھُوٹ کر، سِسک سِسک کر۔

"نہ روؤ میرے ہمدم، سمجھو کہ وہ مر چکی ہے!"

"وہ مر گئی تو میں اپنے آپ کو ختم کر دوں گا۔ تمھیں ختم کر دوں گا! مجھے اِس ویرانے میں اکیلا چھوڑ دو۔ یہاں کوئی نہ آئے گا۔ صرف میں رہوں گا۔ وہ رہے گی۔ ہم دونوں رہیں گے۔ یہاں تیسرا کوئی نہ ہوگا۔ میں کہیں نہ جاؤں گا۔ یہیں بیٹھا رہوں گا۔ دیکھنا تھوڑی دیر بعد وہ کھڑکی کھُلے گی۔ شہناز اُس کھڑکی سے آ کر مجھے پاگل کہے گی۔ وہ مجھ سے کہے گی۔ او پاگل دیکھو! دیکھو میں آ گئی ہوں! پھر میں زور سے ہنسوں گا۔ چیخوں گا۔ چلاؤں گا ——— اور پھر ایک دن جب کھڑکی کھُلی تو ——— روشنیاں جگمگا اُٹھیں۔ شمعیں روشن ہو گئیں۔ ویرانے میں پھر بہار آ گئی اور دو قہقہے فضا میں اُبھرے۔ ایک جانی پہچانی آواز تھی اور ایک اجنبی قہقہہ ——— شہناز آج اپنے بابل کے آنگن میں آئی تھی۔ اپنے جیون ساتھی کے ساتھ! اپنے ماضی کی تصویریں دکھانے۔ بیتے دِنوں کے نقش دکھانے۔ جہاں اُس نے سُہانے سپنے دیکھے تھے۔ خوابوں کے شیش محل تعمیر کئے تھے۔ ایک حسین و جمیل مستقبل کے تانے بانے بُنے تھے۔ ماضی اور حال میں کتنا فرق تھا! حال ماضی کے خوابوں سے زیادہ دلکش تھا۔ زیادہ حسین تھا۔ زیادہ مسرت آگیں تھا، زیادہ فرحت بخش تھا۔ زیادہ مسُور کن تھا ———

جاوید نے شہناز کو پیار سے دیکھتے ہوئے پُوچھا۔

"تو آپ کا ماضی یہاں گزرا ہے؟"

"جی ہاں!"

"بہت خوبصورت جگہ ہے!"

"ہوں!"

"ماضی اور حال میں موازنہ کر کے تم کس نتیجے پر پہنچی ہو؟"

"مجھے حال عزیز تر ہے!"

"سچ؟"

"بے شک!" اور وہ جاوید سے لپٹ گئی۔ دونوں ایک دوسرے میں کھو گئے، سب کچھ بھُول کر۔ انھیں کچھ یاد نہ رہا۔ کھڑکی کھُلی رہی۔ اچانک شور اُٹھا۔ دونوں ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے۔ جاوید چیخا۔

"یہ شہناز ——— شہناز کی آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں ———؟ یہ قہقہے کیسے بلند ہو رہے ہیں؟ یہ شور کیسا ہے؟"

"قہقہے! او یاد آیا! میں تو بھُول ہی گئی تھی۔ سامنے والے گھر میں کوئی پاگل رہتا ہے!"

"پاگل! تو وہ تمھیں کیوں پُکار رہا ہے؟"

"مجھے نہیں ——— سُنا ہے وہ کسی کی محبت میں دیوانہ وار گرفتار ہو گیا تھا ——— پھر اُس کی شادی ہو گئی ——— وہ چلی گئی اور وہ پاگل ہو گیا ——— ہاں کہتے ہیں اُس لڑکی کا نام بھی شہناز تھا!"

"او! یہ بات ہے۔ میں تو ڈر گیا تھا۔"

"لائیے میں کھڑکی بند کر دوں۔"

"تم رہنے دو۔ میں ہی بند کر لیتا ہوں!!"

مضمون نگار حضرات سے درخواست ہے کہ مضمون حاشیہ چھوڑ کر روشن سیاہی سے خوشخط لکھا کریں اور دو سطور کے درمیان فاصلہ چھوڑنا بے حد ضروری ہے۔ بعض اچھے مضامین محض بدخطی کی وجہ سے چھپنے سے رہ جاتے ہیں۔ ہمیشہ غیر مطبوعہ مضامین بھیجیں اور ایڈیٹر کی اطلاع کے لئے مضمون کے خاتمے پر غیر مطبوعہ لکھیں۔ بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں یہ نہایت نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے۔ اپنے پاس مضمون کی نقل ضرور رکھیں کیونکہ ناقابلِ اشاعت مضامین ضائع کر دئے جاتے ہیں۔ ناقابلِ اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے مضمون کے ساتھ ٹکٹ بھیجئے یا اپنا پورا پتہ لکھا ہوا پوسٹ ٹکٹ لگا لفافہ ارسال کریں ورنہ [illegible] ——— مدیر

صحت و زندگی

۱۔ کیا چاول بطور غذا مفید ہیں؟

چاول بہت سے لوگوں کی مرغوب ترین غذا ہے۔ اسے لوگ بہت رغبت سے کھاتے ہیں۔ ہندوستان کے طول و عرض میں چاول کھانے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس سے بہت سی اقسام کے طعام تیار کیے جاتے ہیں۔ لیکن مسلسل چاول کھانا صحت کے لئے فائدہ بخش نہیں۔

دوسرے اناجوں کی بہ نسبت چاول میں وٹامن اے، پروٹین اور چربی کی مقدار بہت کم ہے اور صحت کو برقرار رکھنے کے لئے ان چیزوں کی بے حد ضرورت ہے۔

مسلسل چاول کھانے سے معدہ اور آنتیں پھیل جاتی ہیں۔ قبض کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ جس سے سوء ہضم اور نفخ بھی ہو جاتا ہے۔ چاول بکثرت کھانے سے کھانسی، نزلہ اور کئی دوسرے عوارض لاحق ہوتے ہیں۔

چاول بطور غذا کھانے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ گیہوں کا استعمال بھی رکھیں۔ گیہوں کی غذائی طاقت چاول سے بہت زیادہ ہے۔

چاول میں نشاستہ کے اجزاء سب سے زیادہ اور نائٹروجنی اجزاء، نمکوں کی مقدار اور روغنی اجزاء بہت کم پائے جاتے ہیں۔ چاول زود ہضم غذا ہے۔ لیکن جسم کی نشو و نما کرنے والا جز پروٹین اس میں بہت کم ہوتا ہے۔ کیلسیم بھی بہت کم، بلکہ نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔

چاول میں وٹامن اے کی کمی کے باعث بکثرت چاول کھانے والوں کی بینائی کمزور ہو جاتی ہے۔ جنوبی ہند میں چاول بہت زیادہ کھایا جاتا ہے۔ اسی لئے اس علاقہ میں اندھے پن کی بیماری زیادہ ہے۔

اگر نفاست پسندی کو چھوڑ کر مشین سے صاف کیا ہوا چاول نہ کھایا جائے تو اس مرغوب غذا سے بہت حد تک غذائیت بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔

مشین سے صاف کئے ہوئے چاول میں سے وہ رنگین تہہ بھی صاف کر دی جاتی ہے جو چاول کا سب سے قیمتی جز ہوتی ہے۔ اناجوں، دالوں اور پھلوں کے باریک چھلکے جو ان سے اچھی طرح چسپاں ہوتے ہیں، یہ صرف تحفظ اور خوبصورتی ہی کا کام نہیں دیتے، ان سے جسم کے لئے نہایت قیمتی اجزاء حاصل ہوتے ہیں۔ وٹامنز اور معدنی اجزاء جن پر جسمانی افعال کی صحت کا مدار ہے ان میں بڑی مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ چاول کی وہ رنگین تہہ جسے دھان کے اوپر کا سخت چھلکا دور کرتے وقت الگ کر دیا جاتا ہے اس میں پورے چاول کی دس فی صد پروٹین ہوتی ہے۔ پروٹین کے علاوہ اور دوسرے قیمتی اجزاء بھی ہوتے ہیں، جو وٹامن بی کی بہترین اقسام ہیں۔ چاول کی اس رنگین تہہ میں دوسرے وٹامنز بھی ہوتے ہیں۔ جنہیں چاول صاف کرتے وقت چاول سے الگ کر دیا جاتا ہے۔

مشین سے صاف کئے ہوئے چاولوں سے ان کا چھلکا ضائع ہو جاتا ہے جس میں وٹامن بی ہوتا ہے۔ وٹامن بی ضائع ہو جانے کے بعد ان چاولوں کے کھانے سے مرض بیری بیری ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس کے انسداد اور اس کے بچنے کی تدبیر یہ ہے کہ مشین سے صاف کئے ہوئے چاولوں کے بجائے اوکھلی میں ہاتھ سے کوٹ کر صاف کئے ہوئے چاول کھانے چاہئیں۔

عام طور پر چاول پکاتے وقت اس کی پیچ کو بیکار سمجھ کر

پھینک دیا جاتا ہے۔ اس طرح چاول کا ضروری جز وٹامن بی پانی میں حل ہو کر ضائع ہو جاتا ہے۔ اس لئے پیچ کو چاولوں میں جذب کر لینا چاہیئے۔ اطبّا اور ڈاکٹروں کی رائے میں چاولوں کی پیچ زود ہضم، ملیّن، بھوک لگنے والی اور دافع صفرا ہے۔

چاول کا مزاج سرد اور خشک ہے۔ اسہال، پیچش، نکسیر اور بخار میں موزوں خوراک ہے۔

۲ ـــ تعریف و توصیف کی جادوگری

کسی بے راہرو یا بُرے آدمی کی اصلاح ـــ کرنا چاہتے ہیں تو اُسے بُرا بھلا نہ کہیئے۔ اُس سے نفرت نہ کیجیئے۔

مشہور مفکّر ڈیل کارنیگی نے لکھا ہے ـــ "اگر آپ کسی بے راہرو شخص کے کردار سنوارنا چاہتے ہیں تو اُسے بُرا نہ کہیئے، بلکہ اُس کی تعریف کیجیئے۔ وہ یقیناً اُس تعریف پر پُورا اُترنے کی کوشش کرے گا۔ تعریف و توصیف کی اِس جادوگری کا میں بے شمار بار مشاہدہ کر چکا ہوں۔ آپ بھی تجربہ کر کے دیکھیئے۔

اگر آپ کسی بچّے یا مُلازم سے کہہ دیں کہ تم فلاں معاملے میں کورے اور نالائق ہو، تمھارے اندر کام کرنے کی صلاحیت نہیں ہے تو سمجھ لیجیئے کہ آپ نے اُس کی اصلاح کے ہر امکان کو ختم کر دیا۔ لیکن آپ اُس کے برعکس رویّہ اختیار کریں، اُس پر تلخ نکتہ چینی کرنے کے بجائے اُس کی حوصلہ افزائی کریں۔ اُس سے کہیں ـــ یہ کام کرنا تمھارے لئے زیادہ مشکل نہیں۔ تم میں کام کرنے کا جوہر موجود ہے۔ تم میں اِس طرح کا صحیح ذوق پایا جاتا ہے، صرف تربیت کی ضرورت ہے۔ تو یقین کیجیئے وہ شخص راتوں کی نیندیں حرام کرے گا اور اپنی اصلاح کی سرتوڑ کوشش کرے گا ـــ میں نے تعریف و توصیف کی جادوگری کا مشاہدہ بیشمار بار کیا ہے، آپ بھی کر کے دیکھیئے۔"

۳ ـــ بیکار نہ بیٹھیے

بیکار رہنے سے صلاحیت و طاقت مفلوج و معطّل ہو جاتی ہے۔ ہاتھ پاؤں اور دل و دماغ سے کام لیتے رہنے سے اُن پر جِلا ہوتی رہتی ہے۔

مشہور مفکّر نپولین ہل نے لکھا ہے ـــ "بیکاری محنت و مشقّت سے بھی زیادہ بُری ہے۔ تکلیف دہ اور تباہ کُن ہے۔ جب آپ کام کرتے ہیں تو آپ کی ساری قوتیں بیدار رہتی ہیں۔ آپ کام کرتے ہیں تو آپ کے اندر خود اعتمادی اور قوتِ ارادی بیدار ہو جاتی ہے، جس سے ایک کاہل اور بیکار آدمی محروم رہتا ہے۔

جدّوجہد نہ کرنے سے انسان کی خواہشات مُردہ، دل سرد اور اُس کی قوتِ ارادی اور خود اعتمادی مجروح نہیں ہو جاتی۔ سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہوتی ہے کہ اُس کا دماغ سُست، کاہل اور مفلوج ہو جاتا ہے۔

وہ آدمی جو کام کرنا جدّوجہد کرنا چھوڑ دیتا ہے، ایسے آدمی کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت کھو دیتا ہے۔ ایسا انسان دوسروں کے رحم و کرم پر زندہ رہنے کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیتا ہے۔"

مشہور مفکّر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے ـــ "قدرت کا یہ اصول ہے ـــ "کام لو، ورنہ واپس دے دو!" قدرت وہ چیز ہم سے واپس لے لیتی ہے، جسے ہم کام میں نہیں لاتے، جس سے ہم کام نہیں لیتے۔ وہی چیز ہمارے قبضہ میں رہتی ہے جسے ہم کام میں لاتے رہتے ہیں۔ اپنے بازو کو ایک مہینہ حرکت نہ دو، نتیجہ یہ ہوگا کہ بازو کمزور ہو جائے گا اور صرف ہڈیاں باقی رہ جائیں گی۔ اِسی طرح دماغ کی خلیات کو کاہلی اور جمود کی عادت

ڈال دو۔ دماغی کوٹھریاں سکڑ جائیں گی، ذہنی قویٰ میں انحطاط رُونما ہوگا اور ناکارہ ہو جائیں گے۔"

گھوڑوں کی دوڑ میں جیتنے والا گھوڑا چند ماہ کے لئے تھان پہ اصطبل میں بندھا رہے۔ اُسے کھانے کو اچھی سے اچھی خوراک ملتی رہے لیکن اُس سے سواری کا کام نہ لیا جائے تو اُس اسپِ تیز گام کے پٹھے اور اعصاب اِتنے کمزور ہو جائیں گے کہ وہ تیز روی کے قابل نہ رہے گا۔ اُس کی قوّت و طاقت مفلوج و معطّل ہو جائے گی۔ وہ بالکل ناکارہ ہو جائے گا۔ یہی حال انسان کا ہے۔ نقل و حرکت ہی زندگی ہے۔ بیکار بیٹھا رہنا موت ہے!"

۴ ــــ اگر آپ بوڑھے ہو رہے ہیں

اگر آپ بوڑھے ہو رہے ہیں تو اپنی غذا کی طرف آپ کو خاص توجّہ دینی چاہیئے۔ اِس لئے کہ بچپن، لڑکپن اور ابتدائی نوعُمری کے زمانہ میں تو غذائی افراط و تفریط اور بے احتیاطیوں کو برداشت کر سکتے ہیں۔ لیکن چالیس سال کی عُمر سے گزرنے کے بعد بھی اپنی غذا کی طرف سے بے پروائی و بے احتیاطی برتتے رہیں گے تو یقیناً آپ کو اُس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ غیر محتاط غذائی عادات ہر عُمر میں، خاص کر ادھیڑ عُمر میں کسی جِسمانی یا نفسیاتی بگاڑ یا سقم و خرابی کا بُنیادی سبب ہو سکتی ہیں اور بُڑھاپے کے آغاز میں آپ کے اندر جوانی کی جو بچی کھچی رمق باقی ہو اُسے بھی ختم کر سکتی ہیں۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ ادھیڑ عُمر میں بھی جوانی کے احساسات داستانِ پارینہ نہ بن جائیں تو آپ کے لئے ضروری ہے کہ غذا کی منصوبہ بندی کرکے اعلیٰ پروٹینی غذائیں کھانے کی عادات اختیار کریں۔ آپ کی غذا میں ایسی چیزوں کا ہونا بے حد ضروری ہے جن میں کافی مقدار میں پروٹین ہو۔ پروٹین غدود ہی کو صحت مند حالت میں نہیں رکھتی، سارے جِسم کے خراب اور فرسودہ ہونے والے خلّیات کی از سرِ نو تعمیر کرتی رہتی ہے۔ پروٹین آپ کو مختلف شکل اور مختلف چیزوں میں مِلے گی، وہ کسی بھی شکل میں ہو، اپنے صحت بخش اور مقوّی اثر سے آپ کے جِسم میں چُستی اور توانائی پیدا کرے گی، بُڑھاپے کو دُور کرے گی اور ڈھیلے اور چپٹے عضلات کو سخت و چُست بنا دے گی، اِس لئے ادھیڑ عُمر میں جوانی کا احساس پیدا کرنے کے لئے پروٹین کو ہرگز نظر انداز نہ کیجئے۔ پروٹینی غذا بکثرت کھانے سے جسمانی خلّیوں کی مرمّت و بحالی کرنے والے مادّے کی رسد برابر پہنچتی رہے گی اور وہ صحت مند و کارگزار حالت میں برقرار رہیں گے۔

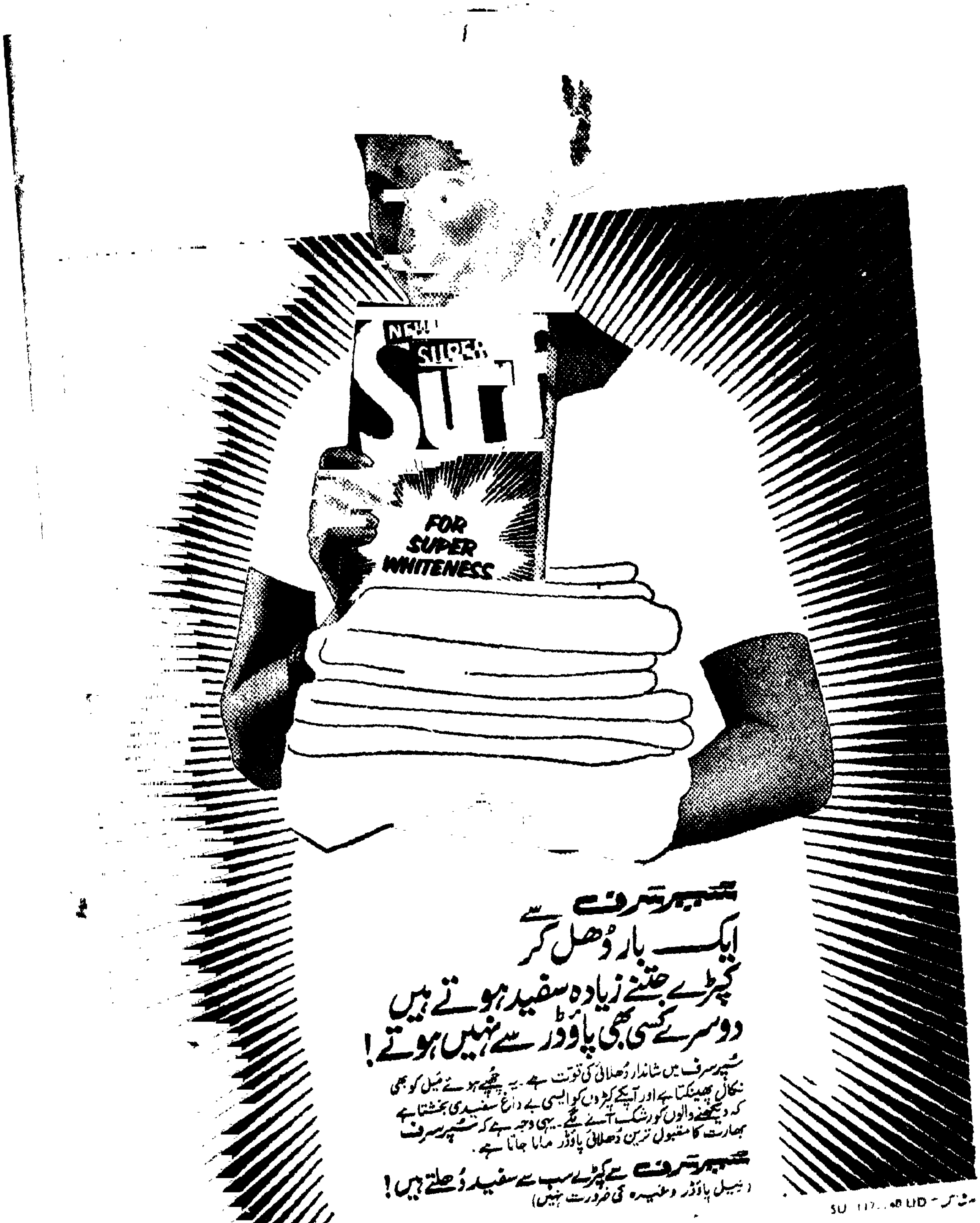
پروٹین ہر طرح کی دالوں میں، ارہر، مونگ، مسور، چنا، اُڑد، مٹر، لوبیا، اخروٹ، انڈے کی سفیدی، دُودھ اور دُودھ سے تیّار شُدہ چیزوں میں، مچھلی، گوشت، بغیر چھنے آٹے اور چاول کے باہر کے خول میں پائی جاتی ہے۔ گیہوں اور دُوسرے غلّے زیادہ پِیسنے سے اُن میں سے پروٹین کم ہو جاتی ہے۔

"بیسویں صدی" کے خصوصی شماروں کو دیکھ کر اُردو زبان سے محبت کے ناطے دل سے یہ دُعا نکلتی ہے کہ خدا اِس ماہنامہ کو دن دُونی اور رات چوگنی ترقّی دے۔ یقین ہے سبھی مُحبّانِ اُردو اِس دُعا میں میرے ساتھ ہیں۔ خوشتر گرامی کے "تیر و نشتر" میں چھپا ہوا طنز دلوں کو عجیب قسم کی تسلّی سی بخشتا ہے... افسانوں کے معاملہ میں "بیسویں صدی" نے جو معیار قائم کیا ہے وہ اپنی جگہ باقی ہے۔ یوں تو سبھی افسانے معیاری ہیں۔ لیکن ایم۔ ایف۔ پرویز کی "ڈوبتی ہوئی شام" رام لعل کی "پرائیویٹ ڈائری" کوثر چاند پوری کا "جلا ہوا سگار" مس نعیمہ کا "سینڈور کا رنگ" نور شاہ کا "ٹوٹے ہوئے آئینہ کا عکس" اور خورشید نکہت کا "آہ! اِس موڑ پر" ایسے افسانے ہیں جن میں افسانہ کی قدیم و جدید تکنیک نے کچھ زیادہ ہی ممتاز کر دیا ہے۔ ہندوستان کے ممتاز شعراء اور کہانی کاروں کو مُحبّانِ اُردو سے وقفہ وقفہ کے بعد ایک ساتھ مِلانا جنابِ خوشتر گرامی کا ایسا کارنامہ ہے جس کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

بہار برنی رُکن ادارہ روزنامہ "الجمعیتہ" دلی

حرفِ نیم شب پُختہ مشق اور شگفتہ خیال شاعر جنابِ فہیم کرہانی کی تازہ غزلوں کا حسین مجموعہ۔ سرگوشی کے لہجے میں قلبِ حیات کی دھڑکنوں کا نغماتی اظہار۔ ہر صاحبِ ذوق کے لئے اِس کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ عمدہ کتابت، سفید اعلیٰ کاغذ، مضبوط جِلد اور گرد پوش۔ قیمت صرف چھ رُوپے۔ محصول ڈاک علاوہ۔

پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۶



ہندوستان لیور کی ایک اعلیٰ پیشکش

بیسویں صدی دہلی، ستمبر ۱۹۷۳ء

سوال و جواب

سرگوشیاں

اس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشرتی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش و عریاں سوالات شامل اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے۔ (ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

کلام احمد۔ ہزاری باغ۔ پٹنہ

س۔ مسلمان عورتوں کو سیندور لگانا چاہیئے؟

ج۔ اس کے لئے کہیں ممانعت تو نہیں ہے۔

س۔ کچھ دین کی باتیں بتایئے۔

ج۔ تم میں خدا کے نزدیک بزرگ و محترم وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔

• سخی اللہ سے قریب، جنت سے قریب اور دوزخ کی آگ سے دور ہے۔

• اللہ تعالیٰ کریم ہے اور کرم اسے محبوب ہے۔ سخی اور سخاوت اسے محبوب ہے۔

ابن الحسن سعید۔ سہسرام

س۔ جب انسان کی راہ تاریک ہو جائے تب کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ امید کی شمع روشن رکھنی چاہیئے۔ ورنہ تاریکی اور گہری ہو جائے گی۔

س۔ کچھ اچھی باتیں بتایئے۔

ج۔ • زیادہ کھانا بیماری کا سب سے بڑا سبب ہے۔ پرہیز ساری دواؤں کی ایک دوا ہے۔

• جسم کی سلامتی کم کھانے میں، روح کی سلامتی گناہ سے بچنے میں ہے۔

• دانا وہ ہے جو کم بولے اور زیادہ سنے۔

• ذلیل وہی ہے جو بخیل ہے۔

• محتاط لوگ عموماً کم غلطیاں کرتے ہیں۔

• محنت وہ سونے کی کنجی ہے جو دولت کے دروازے کھول دیتی ہے۔

ایم۔ ڈی۔ چاند بینی پور۔ دربھنگہ

س۔ نیک کام کرنے پر بھی عزت نہ ملے تو؟

ج۔ نیک کام کر کے جو مسرت ہوتی ہے، اسے نیک کام کا سب سے بہتر صلہ سمجھنا چاہیئے۔

س۔ کیا کانٹوں کے صحرا میں پھول کھلایا جا سکتا ہے؟

ج۔ عزم و عمل سے بے آب و گیاہ وادی گلزار بن سکتی ہے۔ عزم و عمل سے کانٹوں کے صحرا میں پھول کھلایا جا سکتا ہے۔

س۔ گلاب جیسا نرم و نازک پھول کانٹوں سے گھر کر کیسے زندگی بسر کرتا ہے؟

ج۔ جس طرح بھلا انسان برے آدمیوں میں گھر کر زندگی بسر کرتا ہے۔

ایم۔ اے۔ منظر۔ رونڈیا۔ دربھنگہ

س۔ کیا اچھا اور خوبصورت لباس انسان کے عیبوں کی پردہ پوشی کر سکتا ہے؟

ج۔ لباس صرف ستر پوشی کرتا ہے۔

س۔ عورت پھول ہے تو مرد؟

ج۔ اپنی نظر میں پھول —— عورت کی نظر میں کانٹا۔

پنجاب ــــــــ خوشحالی کی طرف گامزن

پنجاب کے عوام نے مختلف پہلوؤں میں کامیابی کے لئے بہت سے قدم اُٹھائے ہیں۔ ہمارے کچھ کارہائے نمایاں اِس طرح سے ہیں :۔

- 640 کلومیٹر لمبے گورو گوبند سنگھ مارگ کی تکمیل۔
- 6626 دیہات کو بجلی سپلائی کی گئی۔
- مارچ 1974ء تک تمام دیہات کو مربوط سڑکوں سے مِلا دیا جائے گا۔
- اب تک 25 لاکھ ٹن سے زائد گندم مرکزی بھنڈار میں دی گئی۔
- 6 سے 11 سال عُمر گروپ کے 83% فیصدی بچّے پرائمری تعلیم کے زیر تحت لائے گئے۔
- 1,75,000 بے گھر دیہاتی عوام کو گھروں کے لئے مُفت جگہیں دی گئیں۔
- 2,000 سے زائد عام ٹیوب ویل اور 714 گہرے ٹیوب ویل لگائے گئے۔
- 1,000 متوسط اور چھوٹے صنعتی یونٹوں کو رجسٹرڈ کیا گیا۔
- 3,100 گاؤں کے لئے دیہاتی پانی سپلائی سکیموں پر بڑی شدّت سے زور دیا گیا۔
- ضلع روپڑ میں میڈیکل منتقل سکیم کو شروع کیا گیا۔

اِس یومِ سعید پر ہم بڑے جوش و خروش اور عقیدت کے جذبہ سے مُلک کی خدمت کرنے کی قسم کھاتے ہیں۔

منجانب :۔

ڈائریکٹر انفارمیشن اینڈ پبلسٹی ، پنجاب

شہناز بی۔ اے، لکھنؤ

س۔ عورت ...؟

ج۔ علامہ اقبال نے فرمایا ہے ___
وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ!

س۔ انسان ...؟

ج۔ گردوں پہ ہے، رازِ سینۂ دوراں سے آشنا
انسان نہ ہو سکا مگر انساں سے آشنا

اُڑے تو شہپرِ یزداں گرے تو شیطاں ہے
بشر کے حوصلۂ خیر و شر کو کیا کہئے

مرزا یٰسین بیگ۔ کمہرہ (بلڈانہ)

س۔ خوشتر بھائی! آپ اس طرح حکومت پر تیر و نشتر چلاتے ہیں تو حکومت آپ سے کوئی باز پرس نہیں کرتی؟

ج۔ کیوں نہیں کرتی۔ لیکن حق گو حق بات کہنے سے کب ڈرتے ہیں ___
راہِ طلب کے دیوانے کب روکے رکتے ہیں
عزمِ محکم کے آگے کیا زنداں کیا زنجیر!

س۔ کیا ماں کی ممتا بہن کے پیار سے زیادہ ہوتی ہے؟

ج۔ جی ہاں۔

جسونت سنگھ۔ انبالہ

س۔ دماغی کمزوری دور کرنے کے لئے کیا کروں؟

ج۔ سائنسدانوں کا تجربہ ہے کہ فاسفورس دماغی تقویت کے لئے ضروری چیز ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لئے ایسی غذا استعمال کیجئے جس میں فاسفورس کافی مقدار میں ہو۔ مچھلی، انڈے، مرغی کے چوزے، دودھ، مکھن اور خصوصیت سے بادام بہت مفید ہیں۔ چنے، مٹر، سویابین، مغزیات، کشمش، پستہ، اخروٹ اور پنیر بھی دماغ کے لئے اچھی غذا ہے۔

محمد زبیر، محمد آباد، گہنہ

س۔ انسان کا نفس اسے برائی کی طرف کیوں لے جاتا ہے؟

ج۔ اس لئے کہ برائی بظاہر دلکش ہوتی ہے۔

س۔ انسان کے لئے جھوٹ بولنا کب ضروری ہوتا ہے؟

ج۔ حضرت شیخ سعدی نے فرمایا ہے ___ "دروغِ مصلحت آمیز بہ از راستیِ فتنہ انگیز"

س۔ قوتِ ارادی کو کس طرح مضبوط بنایا جا سکتا ہے؟

ج۔ اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کر کے۔

سلطان احمد افک۔ کریم نگر

س۔ انسان اپنے مستقبل کو کس طرح روشن کر سکتا ہے؟

ج۔ قابلِ تحسین کارنامے کر کے۔

س۔ کیا نفرت محبت میں بدل سکتی ہے؟

ج۔ نیت میں خلوص ہو تو نفرت محبت میں بدل سکتی ہے۔

س۔ ماضی کی یاد کس طرح بھلائی جا سکتی ہے؟

ج۔ خود کو حال میں گم کر کے۔

خورشید اختر۔ دھنباد

س۔ وہ کون سا ملک ہے جہاں مذہب اسلام کے ماننے والے نہیں ہیں؟

ج۔ ایسا کوئی ملک نہیں ہے جس میں اسلام کے ماننے والے نہ ہوں۔

س۔ شادی شدہ عورت کا نشان مانگ کا سیندور ہوتا ہے، شادی شدہ مرد کی پہچان کیا ہے؟

ج۔ شادی شدہ مرد کی آنکھوں میں ایک عورت کا مجازی خدا ہونے کا غرور ہوتا ہے۔

کلیم انجم سنکتوڈیہہ۔ ڈیسر گڑھ

س۔ تقدیر ساتھ نہ دے تو کیا کرنا چاہئے؟

ج۔ تدبیر سے رشتہ استوار کر لینا چاہئے۔

کیلاش پتی۔ الٰہ آباد

س۔ سب سے پہلا ایٹم بم کس نے بنایا اور کب بنایا؟

ج۔ ۱۶ جولائی ۱۹۴۵ء کو امریکہ میں بنایا گیا۔

حضرت ابوالفصاحت قبلہ جوش ملسیانی کی علالت

جناب جوش ملسیانی شدید طور پر علیل ہو گئے ہیں۔ ان کے بائیں طرف کی کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے، جس کا علاج آپریشن کے سوا کچھ نہیں اور ۹۰ سال کی عمر میں آپریشن مناسب بھی نہیں۔ قبلہ چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔ قارئینِ بیسویں صدی اور اردو دوست حضرات قبلہ کی درازیٔ عمر کی دعا فرمائیں

ادارہ

مِس کرشنا سیٹھی۔ بمبئی

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں اِس وقت بھارت کی پارلیمنٹ میں کتنی عورتیں ہیں؟

ج۔ ۵۹ خواتین۔

س۔ ہندوستان کی ریاستی اسمبلیوں میں عورتوں کی تعداد کتنی ہے؟

ج۔ ایک سو پچانوے۔

مِس نوشابہ زیدی۔ لکھنؤ

س۔ اُتر پردیش اُردو اکیڈمی نے ساحر لدھیانوی کی کتاب "آؤ کہ کوئی خواب بُنیں" پر کتنا انعام دیا ہے؟

ج۔ دو ہزار۔

عشرت محمود۔ ہزاری باغ

س۔ احساسِ کمتری کا علاج؟

ج۔ خود کو کمتر نہ سمجھنا! اپنے سے کمتر لوگوں کو دیکھنا، اپنے سے بدتر لوگوں کو نظر انداز کر دینا!

س۔ کسی کا قول ہے ـــــ کم سخن لوگ اچھے ہوتے ہیں۔ اچھے مانے جاتے ہیں: لیکن عملی زندگی میں اس کے برعکس کیوں ہوتا ہے؟

ج۔ عملی زندگی میں بھی کم سخن آدمی اچھا سمجھا جاتا ہے۔ غیر سنجیدہ اور زیادہ بولنے والا آدمی اچھا نہیں سمجھا جاتا۔

کمال احمد۔ ڈیسر گڑھ۔ بردوان

س۔ عورت کا دل شیشے سے بھی زیادہ نازک ہوتا ہے، کیا یہ حقیقت ہے؟

ج۔ عورت کا دل شیشے سے بھی زیادہ نازک ہوتا ہے، لیکن حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے پتھر سے بھی سخت بن جاتا ہے!

س۔ جہیز اور تلک کی رسم کب ختم ہوگی؟

ج۔ جب جہیز اور تلک طلب کرنے والے جہیز اور تلک کو سماج کے لئے شرمناک لعنت سمجھنے لگیں گے۔

کلام احمد۔ ہزاری باغ

س۔ زندگی ویران کب نظر آتی ہے؟

ج۔ جب بے عمل انسان اُسے ویران بنا لیتا ہے۔

س۔ خوشتر بھیّا! حسرت موہانی کا کوئی مزاحیہ شعر سُنائیے۔

ج۔ حسرت موہانی مزاح نگار نہ تھے حضرت اکبر الٰہ آبادی کا ایک طنزیہ شعر سُنئے ؎

ترقی کی نئی راہیں جو زیرِ آسماں نکلیں
میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بی بیاں نکلیں

تارا شنکر۔ بمبئی

س۔ چاند زمین سے کتنے فاصلہ پر ہے؟

ج۔ تقریباً دو لاکھ اڑتیس ہزار میل کے فاصلہ پر۔

محمد شبیر علی سیماب۔ سنبھل پور

س۔ بھائی جان! تقدیر سے تدبیر بنتی ہے یا تدبیر سے تقدیر بنتی ہے؟

ج۔ حُسنِ تدبیر سے تقدیر سنور جاتی ہے!

س۔ لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

ج۔ لڑکیوں کو اتنی تعلیم دینی چاہئے جو اُنھیں چراغِ خانہ سے شمعِ محفل نہ بنا دے۔

س۔ کوئی پُر درد شعر سنائیے۔

ج۔ دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے
بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

عدنان فضل رب۔ کشن گنج۔ پورنیہ

س۔ "غریبی ہٹاؤ" کا نعرہ آپ کی نظر میں؟

ج۔ یہ نعرہ اب تک صرف خوش آئند اور خوبصورت نعرہ ہی ہے!

محمد ظہیر نظامی۔ دھنباد

س۔ ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کس حقیقت کا ثبوت دے رہی ہے؟

ج۔ ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی غذائی اعتبار سے تشویشناک ہی نہیں، خوفناک مستقبل کی نشاندہی کر رہی ہے!

کملا کانت چوہان۔ نئی دہلی

س۔ ہیلی کوپٹر اور ہوائی جہاز کس نے اور کب بنایا؟

ج۔ ہیلی کوپٹر بریکٹ نے ۱۹۰۹ء میں بنایا ـــــ ہوائی جہاز رائٹ برادرس نے ۱۹۰۳ء میں بنایا۔

محمد زبیر محمد طاہر۔ محمد آباد گوہنہ

س۔ اِس مشینی دَور میں انسان کا مستقبل؟

ج۔ مادّی اعتبار سے روشن ہے، روحانی اعتبار سے تاریک ہے۔

مقصود ربار ، بھنڈار یڈیہہ ۔ بہار

س ۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں اِس وقت دُنیا کی آبادی کتنی ہے ؟

ج ۔ ۴ ارب ، ۸۰ کروڑ ۔

س ۔ اگر میں کوئی افسانہ ارسال کروں تو آپ "بیسویں صدی" میں جگہ دیں گے ؟

ج ۔ افسانہ "بیسویں صدی" کے معیار کے مطابق ہُوا تو شکریہ کے ساتھ شریکِ اشاعت کیا جائے گا ۔

رفعت محمود ۔ بریلی

س ۔ مجھے ڈگریاں حاصل کرنے کا شوق ہے کیا میں کامیاب ہوسکتا ہوں ۔

ج ۔ جدّوجہد رائیگاں نہیں جاتی ۔ اپنے شوق کی تکمیل کے لئے جدّوجہد کیجئے ۔ یقیناً کامیاب ہوں گے ۔

س ۔ خوشتر بھائی ! میرا ایک دوست ہے ، وہ معاشی حالات سے مجبور ہو کر اپنی تعلیم پُوری نہ کر سکا ۔ اُس کی راہ میں اب بھی وہی مجبوریاں ہیں ۔ کوئی راستہ بتایئے کہ وہ اپنی تعلیم پُوری کر سکے ۔

ج ۔ کاش ! ایسے مجبوروں کے لئے دولتمندوں کے دلوں میں درد ہوتا !

مس نرگس ۔ ٹھاکر گنج ۔ پورنیہ

س ۔ انسان کی انسانیت کس چیز سے پہچانی جا سکتی ہے ؟

ج ۔ اُس کے اخلاق و کردار سے ۔

س ۔ "بیسویں صدی" ہندوستان کے علاوہ کن کن ممالک میں جاتا ہے ؟

ج ۔ تقریباً دُنیا کے سارے ممالک میں !

س ۔ خودکشی ؟

ج ۔ خودکشی کس لئے ؟ مر کے چھٹ جائیں گے زندگی عیش پرستوں کا اجارہ تو نہیں

جی ۔ ایم ۔ عاشق طیب پور ۔ پورنیہ

س ۔ دولت ، عزّت اور شہرت میں کس کو بلند مقام حاصل ہے ؟

ج ۔ کبھی عزّت کو سب سے بلند مقام حاصل تھا ۔ اب دولت کو سب سے بلند مقام حاصل ہے !

عشرت جہاں ۔ روزی ۔ رانچی

س ۔ زندگی کا مقصد ؟

ج ۔ زندگی کو قابلِ رشک بنانا !

س ۔ جذبۂ احساس کم کرنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے ؟

ج ۔ کم سے کم سوچنا چاہیئے ۔

س ۔ انسان خود اپنی نظروں سے گِر جائے تو ؟

ج ۔ اُسے کوئی نہیں اُٹھا سکتا ۔

مس کوشلیا ۔ نینی تال

س ۔ بھنڈی کے بارے میں کچھ بتایئے ۔

ج ۔ سرد و تر اور دیر ہضم سبزی ہے ۔ خون پیدا کرتی ہے ۔ ہاضمے کی خرابی میں اور چھوٹے بچّے کی ماں کو اس سے پرہیز کرنا چاہیئے ۔

شکیلہ بیگم ۔ معروف گنج ۔ گیا

س ۔ بنگلہ دیش کا مستقبل حال کے آئینے میں ؟

ج ۔ روشن و تابناک ہے !

س ۔ خود غرضی کب عذاب کی صورت اختیار کر لیتی ہے ؟

ج ۔ جب حد سے بڑھ جاتی ہے ۔

نواب اصغر علی محمد علی ۔ دھنباد

س ۔ سچّائی کی قیمت کب معلوم ہوتی ہے ؟

ج ۔ جب جھُوٹ کا منہ کالا ہوتا ہے !

س ۔ زندگی کا سب سے حسین موڑ کب آتا ہے ؟

ج ۔ جب انسان گرتے گرتے سنبھل جاتا ہے ۔

س ۔ خوشی کے ساتھ غم کیوں ہوتے ہیں ؟

ج ۔ اِس لئے کہ غم اور خوشی کا چولی دامن کا تعلق ہے ۔ غم بھی خوشی ہی کا ایک رُوپ ہے ۔

ایم شفیق شاکر ۔ پورنیہ ۔ بہار

س ۔ کیا آج کل دولت ہی کا نام قانون اور طاقت ہی کا نام عدل و انصاف ہے ؟

ج ۔ جی ہاں ۔

س ۔ آج کے دَور میں جب کسی کو کوئی بڑا عہدہ اور اعلیٰ پوزیشن مل جاتی ہے تو غریب رشتے اور جگری دوست کو بھی وہ حقیر نظر سے دیکھتا ہے ۔ ایسا کیوں ؟

ج ۔ اِسی دَور پر موقوف نہیں ہے ۔ ایسے کم ظرف لوگ ہر دَور میں رہے ہیں ۔

[illegible] ایڈیٹر ، پرنٹر ، پبلشر [illegible] مطبوعہ [illegible] پریس دہلی [illegible] پتہ دفتر بیسویں صدی [illegible]

مجیب مونگیری۔ مونگیر

س۔ میں نے ایک ڈرامہ لکھا ہے۔ کیا آپ اُسے "بیسویں صدی" میں جگہ دیں گے؟

ج۔ "بیسویں صدی" میں افسانے ہی پیش کئے جاتے ہیں۔

س۔ اُبلا ہوا انڈا، کچا انڈا، پکا ہوا انڈا ان تینوں میں سے کون سا زیادہ طاقت بخش ہوتا ہے؟

ج۔ نیم برشت (آدھا اُبلا ہوا) انڈا سب سے زیادہ فائدہ بخش ہوتا ہے۔

جمال الدّین انصاری۔ ہلدوانی

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں کس انگریز افسر نے کب نہتے لوگوں پر گولیاں چلوائی تھیں؟

ج۔ جنرل ڈائر کے حکم سے ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو بے گناہ نہتے لوگوں پر مشین گنوں سے گولیاں برسائی گئیں۔

شوکت حسین۔ ہزاری باغ

س۔ دُنیا میں کتنے اخبار نکلتے ہیں اور اُن کی تعدادِ اشاعت کتنی ہے؟

ج۔ دُنیا میں ۷،۵۲۰ روزانہ اخبارات نکلتے ہیں، جن کی مجموعی تعدادِ اشاعت ۲۱۷۱۴۷۴۹۰ ہے۔

شمیم احمد۔ اعظم گڈھ

س۔ ساحر لدھیانوی کا کوئی شعر سُنایئے۔

ج۔ زندہ رہنا ہے تو ساحر ڈھونڈنا اپنا اگر
مردِ خود آگاہ کی تدبیر ہی تقدیر ہے

میر امیر علی قیصر۔ کریم نگر

س۔ "پیسہ ساری بُرائیوں کی جڑ ہے" آپ کی کیا رائے ہے؟

ج۔ پیسے سے بہت سے اچھے کام بھی انجام پاتے ہیں۔ پیسہ ساری بُرائیوں کی جڑ نہیں ہے۔ پیسہ کا غلط استعمال بُرا ہے۔

ڈکشنریاں، صنعت وحرفت، کشیدہ کاری اور خانہ داری کی بہترین کتابیں

کشیدہ کاریاں و ڈکشنریاں

بیسویں صدی کشیدہ کاری کرشنا کماری ایم۔ اے	۴/-
ہما کشیدہ کاری	۵/-
نیو کشیدہ کاری البم	۹/-
سنگھار کڑھائی کلا	۹/-
ونودھنی " "	۷/۵۰
لکشمی کشیدہ کاری	۴/۵۰
رانی کشیدہ کاری	۶/-
سرلا بھارتی کشیدہ کاری	۷/-
دسوتی کشیدہ کاری	۳/-
کامیاب درزی خانہ	۲/۵۰
زینت کروشیا ڈیزائن بک	۵/-
قدسیہ کشیدہ کاری	۱/۵۰
حسین کشیدہ کاری	۲/-

ڈکشنریاں

مصباح اللغات	عربی۔ اردو	۲۸/-
لغاتِ کشوری	فارسی۔ اردو	۱۸/-
اردو عربی لغت	اردو	۱۲/-
فرہنگِ عامرہ	"	۷/۵۰
نقاد اللغات	"	۸/۵۰
کریم اللغات	مولوی کریم الدین	۲/۵۰
انگلش اردو ڈکشنری	عبد الحق	۱۵/-
" "	سنت سنگھ	۱۲/-
اردو انگلش	" " "	۱۱/-
اردو ہندی	" فیاض احمد	۳/۵۰
جیمز آکسفورڈ ڈکشنری	انگلش اردو	۴/۵۰

صنعت وحرفت

الیکٹرک انجینئرنگ بک	۸/-
الیکٹرک گائیڈ	۱۲/-
انسٹرکٹ وائرنگ	۶/-
موٹر کار وائرنگ	۶/-
بوٹ پالش سازی	۴/۵۰
الیکٹرک لائٹنگ	۸/۲۵
بغیر بجلی کا ریڈیو	۱/۵۰
تجارتی دوا خانہ	۴/۵۰
آئل و گیس انجن گائیڈ	۵/-
آئل انجن گائیڈ	۸/۲۵
درزی ماسٹر	۵/-
وائرلیس ریڈیو گائیڈ	۸/۲۵
ریڈیو سروسنگ (ریڈیو مکینک)	۱۰/۵۰
ٹانکا لگانے کا ہنر	۴/۵۰
چھوٹے ڈائنمو و الیکٹرک موٹر بنانا	۶/-
پریکٹیکل آرمیچر وائرنگ..	۱۰/۵۰
ریفریجریٹر گائیڈ	۱۲/-
ٹرانسفارمر گائیڈ	۸/۲۵
الیکٹرک موٹرز	۱۲/-
خراد شکشا یعنی ٹرنرز گائیڈ	۶/-
ورکشاپ گائیڈ	۶/-
خراد اور ورکشاپ گیان	۱۲/-
پریکٹیکل گھڑی سازی	۴/۵۰
سائیکل ریپیرنگ	۴/۵۰
ڈیری فارمنگ	۴/۵۰

صنعت وحرفت و خانہ داری

موم بتی کا روبار	۲/۵۰
کاروبار بڑھانے کی ترکیبیں	۴/۵۰
انڈو یورپین کُکری بک یعنی انگریزی کھانے	۶/-
تمباکو کا کاروبار	۴/۵۰
پان کی دکان	۴/۵۰
حلوائی ماسٹر	۴/۵۰
اسمال اسکیل انڈسٹری	۱۸/-
آتش بازی کا کاروبار	۴/۵۰
وارنش سازی	۴/۵۰
پرفیومری ماسٹر	۴/۵۰
فنِ مصوری	۴/۵۰
بیکری بہار (بسکٹ، ڈبل روٹی، کیک)	۴/۵۰
پینٹری کا کام	۴/۵۰
اپ ٹو ڈیٹ بوٹ پالش سازی	۴/۵۰
پلاسٹک گائیڈ	۴/۵۰
رنگ سازی	۴/۵۰
کنفیکشنری (انگریزی مٹھائیاں)	۴/۵۰
اپ ٹو ڈیٹ انک ماسٹر، روشنائیاں بنانا	۴/۵۰
خوشبودار تیل بنانا	۴/۵۰
فائن ٹیلر ماسٹر	۲/-
عصمتی دسترخوان	۳/۵۰
رضیہ کا شاہی دسترخوان	۴/-
پریکٹیکل انگلش ٹیچر	۶/-

پتہ:- رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۶

Telephones Office 271637 Residence 61992

RADIUM TONIC PILLS

نیا خون — نئی طاقت

کمزوری کا زبردست علاج

ریڈیم ٹانک پلز



نیا خون بکثرت پیدا کرکے نہ صرف کمزوری دور کرتی ہیں
بلکہ جسم میں زبردست طاقت بڑھاتی ہیں۔ وزن اور
خون کئی پونڈ بڑھ جاتا ہے۔ کھوئی ہوئی طاقت اور صحت
واپس لانے کے لئے ملک کے کونے کونے میں مشہور و
مقبول ہیں اور لاکھوں انسان روزانہ استعمال کرتے ہیں۔
کمزوری خواہ کسی وجہ سے ہو کمزور سے کمزور انسان کو بھی
نئی طاقت حاصل ہوتی ہے۔ تندرست نوجوان ریڈیم ٹانک پلز
کے علاج سے اپنی طاقت کئی گنا بڑھا سکتے ہیں۔ قیمت مکمل
علاج صرف چھ روپے۔ محصول ڈاک علاوہ۔

کلکتہ ایجنٹ:-
امین اینڈ اسمٰعیل پرائیویٹ لمیٹیڈ
نمبر ۸۰ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ ۱

پتہ :- ریڈیم کیمیکل ورکس (پرائیویٹ) لمیٹیڈ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۲۵۱ دہلی


بیسویں صدی
دہلی
Biswin Sadi
DELHI.
Rs. 1.50

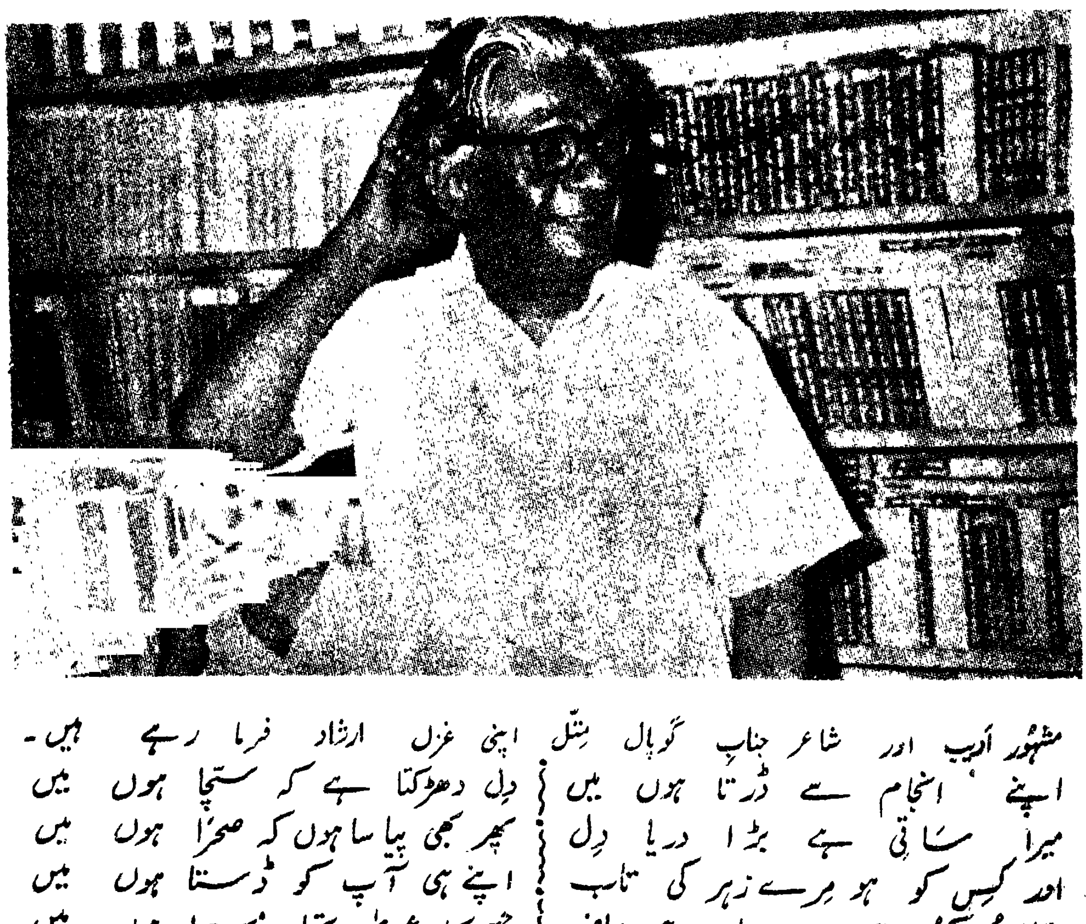






پچھلے دنوں ادارہ "تحریک" دلی کی طرف سے جناب نور تقی نور کے تازہ مجموعۂ کلام "شہر خوشبو" کی رسمِ اجرا کے سلسلے میں ایک ادبی اور شعری نشست کا انعقاد عمل میں آیا جس میں دلی کے ممتاز ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں نے شرکت کی۔ صدارت جناب شہباز حسین پرنسپل پبلیکیشن آفیسر ترقی اردو بورڈ نے فرمائی۔ تصویر میں جناب شہباز حسین "شہر خوشبو" کا اجرا کرتے ہوئے۔

متعدد شرکائے محفل نے "شہر خوشبو" کے شاعر کی گل پوشی کی، اور کتاب کی اشاعت پر انھیں مبارکباد دی۔ تصویر میں مدیر "بیسویں صدی" دلی، گل پوشی کے بعد اپنی مخصوص مشفقانہ مسکراہٹ کے ساتھ شاعر کو مبارکباد دیتے ہوئے۔



مشہور ادیب اور شاعر جناب گوپال متل اپنی غزل ارشاد فرما رہے ہیں۔

اپنے انجام سے ڈرتا ہوں میں
دِل دھڑکتا ہے کہ سچا ہوں میں

میرا ساقی ہے بڑا دریا دِل
پھر بھی پیاسا ہوں کہ صحرا ہوں میں

اور کِس کو ہو مِرے زہر کی تاب
اپنے ہی آپ کو ڈستا ہوں میں

تھا وہ کچھ ہم سے زیادہ ہی مریض
جس کا دعویٰ تھا: مسیحا ہوں میں

کیا نہیں ہے کوئی مے ہوش گداز
جتنی پیتا ہوں، سنبھلتا ہوں میں



جنابِ ساحر ہوشیارپوری اپنی غزل کا جادُو جگا رہے ہیں۔

اُن کی فُرقت کا اِس قدر احساس ... کتنا میلا ہے چاندنی کا لباس
لاکھ سیرابِ دید ہوں آنکھیں ... بجھ سکے گی مگر نہ دِل کی پیاس
مجھ کو خوشیوں کی کیا ضرورت ہے ... اِک زمانے کے غم ہیں میرے پاس
ہائے وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں ... جن کو ہوتا نہیں وفا کا پاس
کیا ہوتے ہیں وہ دُور نظروں سے ... نظر آتی ہے کائنات اُداس
ہم کہیں کس سے داستانِ دِل ... کوئی بھی تو نہیں مزاج شناس
چشمِ ساقی سے وہ شراب ملی ... بجھ گئی ہے جنم جنم کی پیاس
دیکھ کر میرا اہتمامِ حیات ... موت کا چہرہ ہوگیا ہے اُداس

فکرِ انجام کیوں کروں ساحر
مستیِ عشق آگئی ہے راس



جناب کرشن موہن اپنے مخصوص البیلے انداز میں اپنا کلام سناتے ہوئے۔

دلِ یاس خو کی اُداسی کے ہاتھوں ۔۔۔ بہاروں میں وقفِ خزاں ہو گئے ہم
یہ کیا ہو گیا ہم کو بیٹھے بٹھائے ۔۔۔ کہاں کھو گئے، گم کہاں ہو گئے ہم
بڑا ناز تھا ہوشمندی پہ ہم کو ۔۔۔ اچانک اسیرِ بتاں ہو گئے ہم
نہ رہبر نہ کوئی رفیقِ سفر ہے ۔۔۔ یہ کس راستے پر رواں ہو گئے ہم
ہوئے اس طرح خم زمانے کے ہاتھوں ۔۔۔ کبھی تیر تھے، اب کماں ہو گئے ہم
خرد کی بدولت رہے راستے میں ۔۔۔ غبارِ پسِ کارواں ہو گئے ہم
قتیلِ ہوس تھے تو آتش نفس تھے ۔۔۔ محبت ہوئی، بے زباں ہو گئے ہم
ملا ہے ہمیں عشق کا سوزِ پنہاں ۔۔۔ سلگتے سلگتے دھواں ہو گئے ہم

جو من اپنا روشن ہوا کرشنؔ موہن
حدیں مٹ گئیں، بے کراں ہو گئے ہم



نامور نوجوان شاعر جنابِ مخمورؔ سعیدی نے اپنی تازہ غزل پیش کی۔

ہم نے بنا لیا اُسے ساتھی شراب کا
منڈلا رہا تھا سر پہ جو لمحہ عذاب کا

اب میرے ساتھ ساتھ وہ خوشبو سفر میں ہے
آنگن میں اُس کے تھا کوئی پودا گُلاب کا

ٹھِٹھرے ہوئے پڑے تھے سیہ پانیوں میں ہم
ساحل پہ تیرتا تھا کنول آفتاب کا

لمسِ نظر کی تاب کب اوراقِ جاں میں تھی
کرتا مُطالعہ کوئی کیا اِس کتاب کا

ٹکرا رہے تھے سر کئی اُلجھے ہوئے سوال
لیکن کسی پہ کھُل نہ سکا دَر جواب کا

جاگے ہیں ہم تو اور پریشاں خیال ہیں
آنکھوں میں ہُو بہُو وہی منظر ہے خواب کا

تیزی سے ڈھلتی جاتی ہے یوں غفلتوں کی رات
جیسے بہت قریب ہو دِن احتساب کا

تپتے، سُلگتے، جلتے ہوئے راستوں کی دھوپ
دِکھلائے ہر قدم پہ تماشا سراب کا

مخمورؔ ہم بھی اپنے زمانے کے ساتھ ہیں
سیلِ رواں میں جیسے سفینہ حباب کا

بیسویں صدی دہلی

مدیرہ: خوشتر گرامی

اکتوبر ۱۹۷۳ء

جلد ۳۷ — شمارہ ۱۰

ٹیلیفون دفتر — ۲۷۱۶۳۷

ٹیلیفون رہائش — ۶۱۹۹۳۷

تیر و نشتر



"اندرا کے معافی مانگے بغیر سمجھوتہ نہیں ہوگا" مرارجی ڈیسائی —— یہی نہیں بلکہ آپ کو وزیر خزانہ اور نائب وزیر اعظم، سنجیوا ریڈی کو صدر جمہوریہ اور نجلنگپا کو صدر کانگرس بھی بنانا ہوگا۔

"بھارت میں اونچے سے لے کر نیچے تک سب جگہ کرپشن ہے" امریکن اخبار —— لیکن ابھی تک امریکہ سے ہم بہت پیچھے ہیں۔ یہاں واٹرگیٹ اسکینڈل نہیں ہوتے۔

"اندرا کا مزاج بات چیت پر" مرارجی ڈیسائی خوش" ایک خبر —— شاید کہ نکل آئے پھر کوئی چانس۔

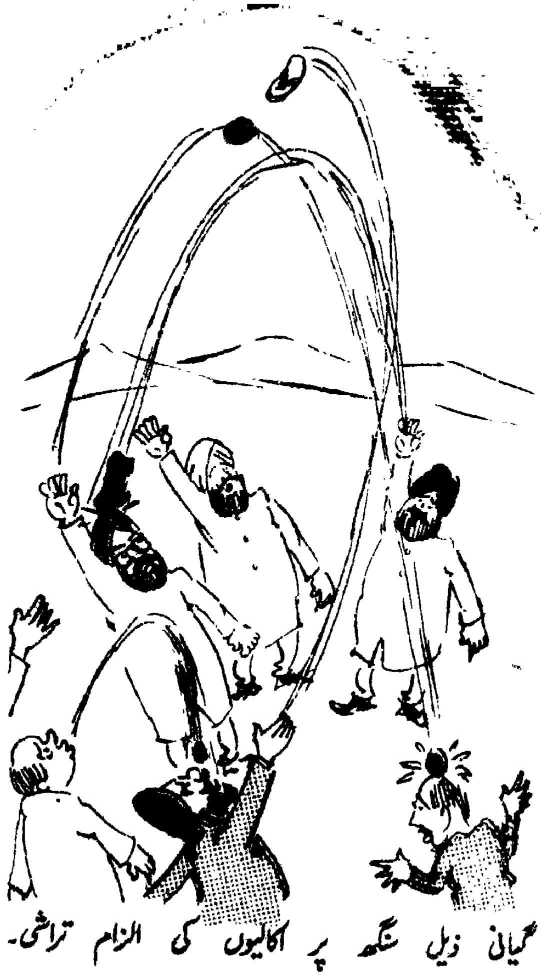
"پنجاب میں مہنگائی کے خلاف مہم تیز" ایک خبر —— گیانی راج ہے، بادل نہیں کہ برسا اور ختم۔

"ہڑتالیں ملک کی موت بن جائیں گی" ایک خبر —— اور ہمارا انتقال پُر ملال ہو جائے گا۔

"کرپشن اور رشوت کے لئے اندرا کی اقتصادی پالیسیاں ذمّہ دار ہیں" مرارجی ڈیسائی —— اور جب اقتصادی پالیسی کی کنجی آپ کے ہاتھ میں تھی تو کوئی کرپشن کا نام نہیں جانتا تھا۔

"یو۔پی کا غریبی ہٹاؤ فنڈ" ایک خبر —— صدر راج کے باعث ہٹائے جانے والے وزیر اس سے تنخواہ پائیں گے۔

"حکومت کسی دباؤ میں نہیں آئے گی" صدر کانگرس —— اس لئے کہ دبانے والی تمام مشینری اور تمام ہتھیار حکومت کے پاس ہیں۔



گیانی ذیل سنگھ پر اکالیوں کی الزام تراشی۔



”حالات پر جلد قابو پا لیا جائے گا“ اِندرا گاندھی

” ریلوے بھاری مالی سنکٹ میں“ ــــ دو چار ہڑتالیں اور ہوگئیں تو کلیان ہو جائے گا۔

” اُردو خوبصورت اور محبّت کی زبان ہے“ ایک عنوان ــــ اِس لئے گھر کی آرائش کرنی ہو تو اِس سے کام لیجئے۔ محبوب کو محبّت نامہ لکھنا ہو تو اِس سے کام لیجئے۔

” بناسپتی کے ڈبّے میں بھوسہ اور گائے بھینس کا پیشاب“ ایک خبر ــــ دِلّی میں صرف پانی بھرے ڈبّے نِکلے تھے۔ آپ تو پھر اچھے رہے۔

” روس میں طلباء کے تھیٹروں کی مقبولیت“ ایک خبر ــــ یہاں بھی پڑھائی کی بجائے تھیٹر شروع کر دیجئے۔ روس سے زیادہ مقبول ہوں گے۔

” ہندوستان زندہ باد“ ــــ جہاں لوگ ملاوٹی، زہریلی اور مضرِ صحت چیزیں کھا کر بھی زندہ رہتے ہیں۔

” گورنمنٹ کی فولادی پالیسی پر نظرِ ثانی ہوگی“ ایک خبر ــــ اور اُسے فولادی بنایا جائے گا۔

” ممبران پارلیمنٹ کا دودھ اسکینڈل“ ایک عنوان ــــ ممبرانِ پارلیمنٹ اب تک دودھ پیتے ہیں۔

” اُردو زبان پر جتنا حق مُسلمانوں کا ہے، اُتنا ہی حق ہندوؤں، سِکھوں اور عیسائیوں کا بھی ہے“ نامور افسانہ نگار جنابِ رام لعل چیف کنوینر آل انڈیا غیر مُسلم اُردو مصنّفین کا دعوت نامہ ــــ لیکن اُردو ہمارا ناقابلِ تقسیم قومی ورثہ ہے۔ اِس میں قرآن کا، گیتا کا، گرنتھ صاحب اور انجیل سب کا ترجمہ ہے۔



"ہم بلیک کے رُوپے کو ختم کرنے کے طریقے جانتے ہیں۔" وزیرِ خزانہ چوہان۔

"ٹریکٹر باہر سے نہیں منگوائے جائیں گے۔" ہند سماچار، جالندھر ـــــ بلکہ کھاد منگایا جائے گا جس میں ہندوستانی ایجنٹوں کو مٹی ملانے کا موقع مل سکے۔

"سری نگر میں دھماکہ ـــــ جو ہُوا ہی نہیں" ایک عنوان ـــــ اور خبر چھپ گئی یہ کمال ہے۔

"راجدھانی کے تمام بجلی گھروں میں کام ہو رہا ہے۔" ایک خبر ـــــ لیکن راجدھانی کے گلی کوچوں میں اب بھی جب چاہے اندھیرا ہو جاتا ہے۔

"ذخیرہ اندوزوں اور نفع خوروں کے خلاف سخت کارروائی ہوگی" ـــــ مگر جب ہم نہ ہوں گے

ہمیں کیا جو تُربت پہ میلے لگیں گے

"آنند نرائن مُلّا کی صدارت میں مشاعرہ" ـــــ اُردو کی سب سے بڑی خدمت۔

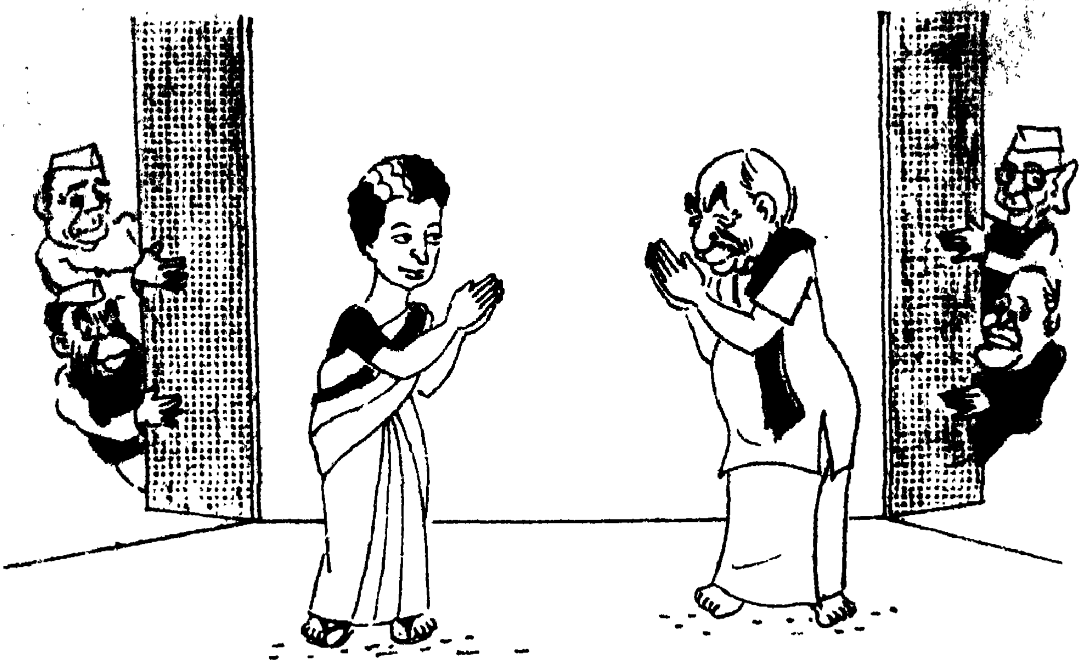
"امروہہ گرلز کالج میں یومِ آزادی" ایک خبر ـــــ گرلز کے لئے پیغامِ آزادی۔

"ہم سرکار سے جلد منوا لیں گے کہ یو۔ پی کی دوسری سرکاری زبان اُردو ہے" ایک عنوان ـــــ ع

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو

"اکیلا پاکر عورت کی گھڑی چھین لی" ایک خبر ـــــ شُکر ادا کرو کہ عورت نہیں چھین لی۔

"ڈپلومیٹ کا لڑکا ڈوب گیا" ایک خبر ـــــ کوئی ڈپلومیٹک چال ہے۔



شریمتی اِندرا گاندھی سے کامراج کی مُلاقات۔

"گاندھی جی کا نعرہ" ایک عنوان ——— سُننے اور عمل کے لئے نہیں لگانے کے لئے ہے۔

"بیوی کو لُوٹا، شوہر کو زخمی کیا" ایک خبر ——— غزل کے دونوں مصرعے برابر کے ہیں۔

"آزادی کے ۲۶ سال" ایک عنوان ———
- لیڈروں کی لُوٹ کھسُوٹ۔
- وزیروں کے بھاشن سُننے۔
- سرکار کے جھُوٹے وعدوں پر یقین کرنے۔
- مِلاوٹ کی چیزیں کھانے پینے۔
- مہنگائی کے خلاف ہائے ہائے کرنے۔
- اور ——— جلسوں، جلوسوں، مظاہروں اور نعرے بازی میں گُزر گئے۔

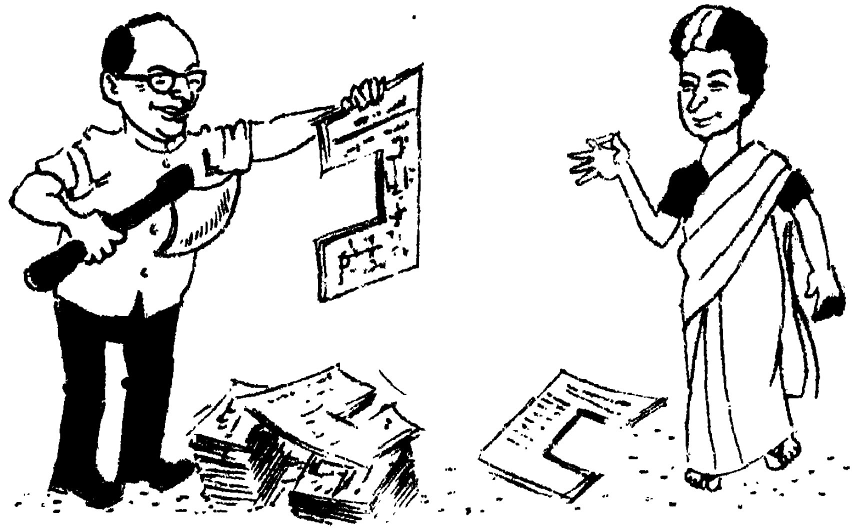
"چاول کی بلیک کے لئے سرکار ذمہ دار" ایک عنوان ——— اور بلیک میں خریدنے والے بری الذمہ۔

"پوسٹ مارٹم رپورٹ فائل سے غائب" ——— شُکر ادا کرو مُردہ نہیں غائب ہُوا۔ ورنہ جس دیش میں گنگا بہتی ہے وہاں مُردے غائب ہو جاتے ہیں۔

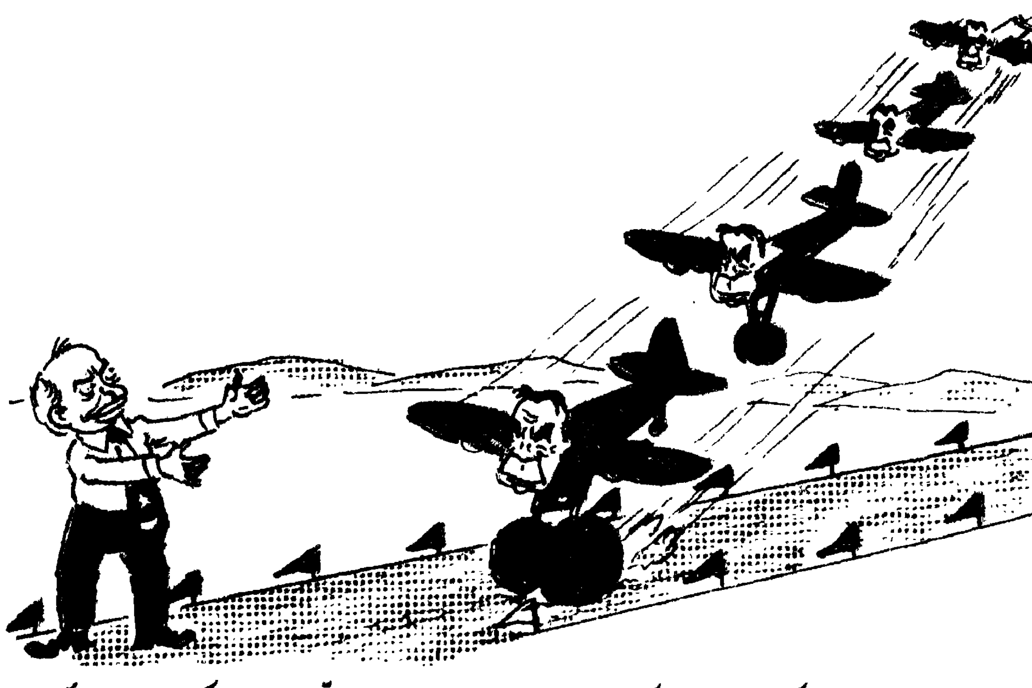
"لڑکی کی لاش کنویں سے برآمد" ایک خبر ——— ٹرکش باتھ لینے گئی ہوگی۔

"ڈاکٹر رِشوت لیتے ہوئے گرفتار" ——— مریض سے لے رہا تھا یا ملک الموت سے؟

"مزدور کو گولی سے اُڑا دیا" ——— جیسے کوئی مچھر اُڑا دیا۔



اخباری کاغذ کے کوٹے میں تیس فیصدی تخفیف۔ یعنی آزادیِ تحریر میں تیس فیصدی کٹوتی۔



چین سے پاکستان کو جدید بمبار طیاروں کی سپلائی۔

خوشتر گرامی

اخبارات و جرائد



قوم کا ضمیر، قومی سلامتی کے نگراں، سیاستدانوں کے دست و بازو، عوام کے ترجمان و نگہبان، دانشوروں کا سہارا، رائے عامہ منظم کرنے کا ذریعہ، زبانِ خلق اور نقارۂ خدا۔ اِس قوت و حیثیت کے مالک ہیں ــــــ

اخبارات و جرائد

دُنیا کے کسی مُلک کے ہوں۔ کسی خِطّے کے کسی زبان کے ہوں۔ اِن سے حکومتیں خم کھاتی ہیں۔ آمریت کے ایوانوں میں زلزلہ پڑ جاتا ہے۔ نوکر شاہی خشمگیں بھی رہتی ہے اور بھیگی بِلّی بھی بنی رہتی ہے ــــ سیاستداں ترقّی کے مدارج اور اقتدار کی منزلیں اِنھیں کے ذریعہ طے کرتے ہیں۔ ادیب، صحافی، شاعر، نثرنگار، آرٹسٹ، مصوّر، سائنسداں، دانشور اور ہر قسم کے فنکار اِن کے محتاج اور اِن کی نظرِ کرم کے خواہاں اور متمنّی رہتے ہیں ــــ تلوار کا گھاؤ بھر جاتا ہے۔ کینسر، دِق جیسے موذی امراض اور قلب کے مریضوں کو بچایا جاسکتا ہے۔ زہر کا بھی تریاق ہے۔ سانپ کے کاٹنے کا بھی منتر ہے مگر اخبار کے صفحے پر چھپے ہوئے الفاظ، کمان سے نِکلا ہُوا وہ تیر ہیں جن کا نشانہ شاذ و نادر ہی خطا ہوتا ہے ــــ اِن سے سب گھبراتے ہیں اور اِن کا گلا گھونٹنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ حکومتوں کے وار بھی ہمیشہ اِن پر ہوتے ہیں۔ اخبارات و رسائل نے بھی بڑے بڑے ڈکٹیٹروں کے تختے اُلٹے۔ کمزوروں کو زبان دی، بے شعوروں کو شعور دیا، سلیقہ سِکھایا، آداب عطا کئے، جہادِ زندگانی کی تدبیریں سِکھائیں، حکومتیں بنائیں اور بِگاڑیں، سیاسی جلسوں کی رونق بڑھائی، ادبی محفلوں کو سنوارا، مذہبی مجالس کو مقبول بنایا اور دُنیا کے ہر خِطّے میں بہت سے لوگوں کو قوموں کی کشتی کا ناخدا، قسمتوں کا مالک بنایا اِس لئے ہر اخبار اور جریدہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ

میرے نفس کی موج سے نشو و نمائے آرزو

افسانہ

ایک لڑکی

ایم۔ الیف پرویز ایم۔ اے

آفس آف دی ڈپٹی ڈائرکیٹر اکاونٹس اینڈ ٹریجریز ۲۲ وبلزلی روڈ۔ پونا نمبرا

محبی و مربی ـــــ کرم فرمائے اُردو محترمی خوشتر صاحب! آداب و نیاز

لیجئے طویل عرصے کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں" ایک لمبی چوڑی کار، سگریٹ کے ٹکڑے، کاغذ کے پُرزے اور ایک لڑکی"۔ لیکئے! معاف کیجئے گا یہ میرے اِس افسانے کا طویل اور بے ڈھنگا سا عنوان ہے ـــــ کیونکہ آجکل کے انسان کی زندگی ہی بے ڈھنگی ہوگئی ہے ـــــ کسی چیز کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا، سمجھنا، یہاں تک کہ اِس زرخیزی اور زراندوزی کے زمانے میں اپنوں کو اپنا سمجھنا بھی مشکل اور ناممکن سا محسوس ہونے لگا ہے۔ کہانی میں میں نے یہی بات بتانے کی کوشش کی ہے۔ شاید پسند آئے ـــــ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ خدا کرے آپ ہمیشہ بھلے چنگے رہیں۔ اِس سال جلد سے جلد آپ کے شرف نیاز حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔

آپ کا ـــــ ایم۔ الیف پرویز

★

میں نے ریلوے پُل پر سے اُسے دیکھ لیا تھا۔ وہ بہت تیزی سے پلیٹ فارم پر آئی تھی اور وِرار سے چرچ گیٹ جانے والی ٹرین کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ دفعتًا میری نظر اُس کی خوبصورت کلائی پر پڑی ـــــ" اوہ ـــــ! اُس پر وہ گھڑی نہیں تھی جو میں نے اُسے پہلی بار اُس کی "چوبیسویں سالگرہ" پر دی تھی۔ اب ایک نئی تکونی بلیو ڈائمنڈ کے ڈائل والی گھڑی چمک رہی تھی۔ میں پُل سے نیچے اُترا ـــ پُل کے نیچے بھیڑ میں کھڑے رہ کر کچھ دیر چُپ چاپ اُسے تکتا رہا۔ ہجوم میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ دفتروں سے لوگ گھر واپس جا رہے تھے اور ساحرہ بھی گھر جانے کی جلدی میں تھی۔ میں اب اُس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ لیکن اب بھی وہ اپنے آپ میں گُم تھی۔ بار بار اُس کا ہاتھ اپنی ساڑی کو دُرست کرنے میں لگ جاتا۔ وہی پرانی عادت! میں نے سوچا

ایک بار اُس سے اِس بات پر مجھ سے جھگڑا بھی ہو گیا تھا۔ جب کبھی وہ میرے ساتھ چلتی موقعہ پاتے ہی اُس کے ہاتھ اپنی ساڑی کی سلوٹیں اور شکنیں دُور کرنے میں لگ جاتے۔ حالانکہ ٹریلین کی ساڑی میں سلوٹیں بھی نہیں ہوتیں۔ جب میں کوئی دلچسپ بات کہہ رہا ہوتا وہ اچانک رُک جاتی، اور ساڑی کی کھینچ تان شروع ہو جاتی اور میں جھنجھلا جاتا۔ کئی بار ساتھ چلتے چلتے، میں خود ہی اپنے آپ سے بولتا ہوا آگے نکل جاتا اور مجھے خبر بھی نہ ہوتی کہ بیگم صاحبہ رُک کے اپنی ساڑی دُرست کر رہی ہیں۔

ٹرین بہت تیزی سے پلیٹ فارم پہ آ کھڑی ہوئی۔ وہ لپک کر سینکڑوں لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ "لیڈیز" کمپارٹمنٹ میں گھُس کر دروازے کی چٹخنی پکڑ کر لٹک گئی۔ میں بھی اُس کے ساتھ والے کمپارٹمنٹ میں باہر لٹک گیا۔ میرا ایک پیر ٹرین میں تھا اور ایک باہر۔ میں اُس کی

نقل و حرکت دیکھ سکتا تھا۔ وہ سیاہ گاگل لگائے اُفق پر پھیلتی ہوئی سُرخی کو دیکھ رہی تھی۔

ٹرین کی رفتار تیز ہو گئی ــــ تیز ہوا سے اُس کے سارے بال بکھر گئے تھے۔ ریشمی اور ملائم بال تھے اُس کے۔ جب وہ پُونا میں تھی، اکثر میرے ساتھ وہ بھی سکوٹر پر بیٹھی ہوتی۔ جب اسکوٹر تیز چلنے لگتی تو اُس کے بال بکھر بکھر کر ماتھے پر اسی طرح پھیل جایا کرتے تھے۔ وہ میری پیٹھ میں اپنا سر چھپانے کی کوشش کرتی۔ میرے بدن میں ایک جھرجھری سی آ جاتی۔ میں اسکوٹر کی رفتار اور بڑھا دیتا، وہ مجھ سے اور بھی چمٹ جاتی۔

"اتنی تیز نہ چلائیے!" وہ تقریباً چیخ پڑتی۔ لیکن میں چُپ چاپ اسپیڈ بڑھاتا رہتا تھا۔

دادر پر جب ٹرین رُکی تو وہ اُتر گئی۔ بھیڑ ناقابلِ برداشت تھی، شاید وہ اسی طرح لٹکی رہتی تو نہ جانے کب ایک جھٹکے سے اُس کا ہاتھ چھوٹ جاتا اور وہ کب نیچے آ جاتی۔ بہت سارے لوگوں کا ایک ریلہ ٹرین سے اُتر گیا۔ اب وہ لپک کر زینے کی طرف بڑھنے لگی۔ میں بھی اُس کے پیچھے ہو لیا ــــ میں اب اُس کے بالکل قریب تھا۔ میں اُس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا ــــ لیکن وہ اپنے آپ میں کھوئی ہوئی تھی۔ وہ زینے سے نیچے اُتر گئی۔ اُس نے ٹیکسی کو اشارہ کیا اور ٹیکسی چلی گئی۔

اب وہ میری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ بمبئی میں رہ کے آدمی کار میں (چاہے ٹیکسی کیوں نہ ہو) بیٹھنے کی اپنی خواہش ضرور پوری کر لیتا ہے۔ اُسے اسکوٹر پر بیٹھنا پسند نہ تھا۔ اُسے کار خریدنے کی خواہش تھی۔ جب بھی کوئی نئی نئی چمکتی دمکتی کار دیکھتی، اُس کے دل سے ایک سرد آہ اُٹھتی ــــ "وہ دیکھو نئی فیاٹ ہے! ارے یہ تو امپورٹیڈ شورلے ہے! یہ فورڈ ہے! یہ ایمبیسڈر ہے۔ یہ ٹویوٹا ہے ــــ یہ آسٹن ہے! یہ پلائی موتھ ہے!" ــــ کار دیکھتے ہی وہ دیوانی ہو جاتی تھی۔ پھر اُسے یہ بھی خیال نہ رہتا کہ لوگ اُس کے اِس حسرت بھرے چہرے کو دیکھ کر کیا کیا کچھ نہیں سوچ رہے ہوں گے۔

کتنے دن بعد میں ساحرہ کو دیکھ رہا تھا۔ ساحرہ جو میری بیوی تھی! لیکن اب وہ مجھ سے بہت دُور تھی۔ اگر اُس کی کوئی چیز اس وقت میرے پاس تھی تو اُس کے خطوط تھے۔ کبھی دس دس صفحات کے خطوط، کبھی نصف صفحہ سے کم کے پُرزے ــــ! میں اُنہیں پڑھتا رہتا اور سوچتا رہتا ــــ ساحرہ جو اُن خطوط میں نظر آتی تھی کتنی مختلف ہو گئی ہے۔ وہ مجھ سے بہت دُور ہو گئی ہے اور میں ابتک اُس کے اِن پُرزوں کو سینے سے لگائے بیٹھا ہوں!

ایک شام میں بہت پریشان تھا۔ وہ پہلی تاریخ کی شام تھی۔ ساحرہ میری منتظر تھی۔ اُس نے شراج میں فرسٹ شو دیکھنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ وہ مینا کماری کی آخری فلم دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ مینا کماری کے آرٹ کی قدر دان ہی نہ تھی اُس کی عاشق تھی۔ لیکن جس وقت میں گھر پہنچا میری جیب میں صرف پچاس روپے باقی تھے تنخواہ سب بٹ چکی تھی۔

کہنے کو مجھے پانچ سو روپے ملتے تھے۔ لیکن آج تو میری جیب میں صرف ۵۰ روپے تھے! میرے دماغ میں سارا حساب کتاب گڈمڈ ہو رہا تھا۔ انکم ٹیکس، انشورنس، پروڈنڈ فنڈ، ریلیف فنڈ، رفیوجی ریلیف فنڈ، بینک لون ریفنڈ، کینٹین کا بل۔ دفتر کے ایک کلرک کی شادی کا کونٹریبوشن .... غرض میری ساری تنخواہ مختلف فنڈوں اور بلوں کی نذر ہو گئی تھی اور میں پریشان تھا کہ مہینہ بھر کیا کروں گا۔ ابھی تو ساحرہ کی ساڑی لینی ہے۔ (۲۴۳ ۔ میڈ اِن جاپان۔ کلر لائٹ بلو) بیٹے کا بل دینا ہے۔ برشین گیس لینی ہے۔ مہینے میں چار فلمیں دیکھنی ہیں۔ ڈاکٹر کا بل دینا ہے۔ چھوٹے بھائی کی اسکول فیس! ایک بڑی لمبی چوڑی فہرست میرے سامنے تھی۔ میں جان بوجھ کر دیر سے گھر پہنچا تھا۔ ساحرہ پریشان ہو کر اکیلے ہی پکچر چلی گئی تھی۔ اپنی پڑوسن سہیلی کے ساتھ جس نے حال ہی میں نئی فیاٹ کار خریدی تھی۔ میں نو بجے تک کمرہ بند کئے سُلگتا رہا۔ سگریٹ خریدنے باہر گیا تو دس روپے کا چینج کسی نے نہ دیا۔ اِس لئے ایک ساتھ تین پیکٹ خریدنے پڑے۔ دو گھنٹوں تک مسلسل سگریٹ پھونکتا رہا۔ حلق میں سوزش سی ہونے لگی بیڈ روم میں فرش پر سگریٹ کے ٹکڑے بکھر گئے تھے۔ دماغ جھنجھلانے لگا تھا۔ کتنی عجیب لڑکی ہے یہ ساحرہ! ــــ ایک پکچر کے لئے وہ میرا انتظار بھی نہیں کر سکی۔ اگر میں کسی جنگ میں چلا جاؤں اور برسوں مجھے گھر آنے کا موقعہ نہ ملے تو وہ کیا کرے گی؟ چائے میں نے دو تین بار بنائی۔ پھر ہوٹل گیا۔ پھر گھر آ کے چائے بنائی۔ پھر سگریٹ کا آخری پیکٹ بھی ختم ہو گیا۔ میں بے چینی میں گھر کی چیزیں اُلٹ پلٹ کر پھینکتا رہا۔ جب ساحرہ پکچر سے لوٹی تو ہم میں خوب لڑائی ہوئی۔ لڑتے لڑتے دونوں

تھک گئے اور بھوکے ہی سو گئے۔ لیکن نیند بھی پریشانی میں نہیں آتی۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گذری۔ میں نے آخری بار اپنی رائے دی ”ساحرہ۔ دیکھو بینک میں جو اپنا جائنٹ اکاؤنٹ ہے، اور جس میں صرف سو روپیہ باقی رہ گئے ہیں اس بار اُسی سے خرچ چلایا جائے اور آئندہ مہینے۔۔۔۔“

”لیکن میں دستخط نہ کروں گی!“ اُس نے اُسی طرح تنک کر اور بپھر کر جواب دیا اور اب ہمارے لئے کوئی اور چارہ نہ تھا کہ دن میں صرف ایک بار ناشتہ کیا جائے اور دونوں وقت کھانے کی چھٹی کر دی جائے۔ لیکن انسان ہر چیز کی چھٹی کر سکتا ہے کھانے کی چھٹی نہیں کر سکتا۔ اگر کھانے کی چھٹی کر سکتا تو کیوں دفتر میں قلم گھسیٹتا۔ ملوں میں کیوں پسینہ بہاتا۔ آج کروڑوں لوگ اپنا خون پسینہ یوں نہ بہاتے، یا تو شاعری کرتے یا آسمان کے تارے توڑ لاتے!

دو تین دن بڑے TENSE گذرے۔ مجھے بھوکا رہنا پسند ہے۔ لیکن اس طرح سے TENSE رہنا پسند نہیں۔ مجھے مار پیٹ اور چھینا جھپٹی کی شدید جنگ پسند ہے، فیصلہ جلدی ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ سرد اعصابی جنگ میرا دماغ بوجھل بنا دیتی ہے کسی بات کا کوئی فیصلہ ہی نہیں ہوتا۔ اور آدمی اُکتا جاتا ہے۔ پھر سگریٹ پینے لگتا ہے، شراب پینے لگتا ہے۔

اتفاق سے اُس دن پڑوس کے ڈاکٹر صاحب کی لڑکی ایم۔بی۔ ایس میں فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہو گئی۔ اُن کے یہاں بڑی دھوم دھام تھی۔ نئی نئی کاروں میں اونچے اونچے لوگ دھڑا دھڑ چلے آ رہے تھے۔ ہم دونوں نے کھڑکی سے باہر گردن نکالی ہمارے اُداس مایوس تھکے ہوئے شکست خوردہ چہرے چمکتی ہوئی کاروں میں صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ساحرہ کاروں کی خوبصورتی دیکھ دیکھ کر مرعوب ہو رہی تھی۔ میں اپنے مایوس چہرے کی جھلک دیکھ دیکھ کر کڑھ رہا تھا ــــ

اچانک جیسے میرے جسم میں بجلی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ میں چپ چاپ ساحرہ کے قریب گیا۔ اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دئے اور پھر غیر ارادی طور پر میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ سرد اور بے جان محسوس ہوا۔ میں نے اُس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر اُسے اپنے سینے سے لگانا چاہا، لیکن اُس نے منہ پھیر لیا۔ میں نے ایک لمحہ کے لئے اُس کے پھیکے پھیکے ہونٹوں کی طرف دیکھا اور چپ چاپ باہر نکل گیا۔

کتنی بُری حالت ہے میری! میں جو پانچ سو روپے ماہانہ تنخواہ پاتا ہوں۔ پہلی تاریخ کو میرے پاس صرف پچاس روپے بچے ہیں! اُس غریب مزدور کی کیا حالت ہوگی جس کی پچاس روپے مہینہ سے زیادہ آمدنی نہیں! اُس غریب لاچار اور مایوس اندھی لڑکی کا کیا ہوتا ہوگا جس کی گود میں ایک چھوٹا بچہ بھی ہے، اور وہ دن میں بمشکل چار آنے کی خیرات پا سکتی ہے! آج مجھے محسوس ہوا جیسے پہلی بار میں نے بھوک سے بلکتے اُس بچے پر نظر ڈالی ہے، پہلی بار میں نے مفلسی اور غریبی کے دُکھ کو محسوس کیا ہے۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا ہے، روپیہ پاس نہ ہو تو آدمی کے انا اور EGO کو کیسے ٹھیس پہنچتی ہے۔ لیکن میں چلتا رہا۔ بھیڑ بھاڑ میں اپنا راستہ بناتا رہا۔ باہر شہر کے راستوں پہ چلنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ ٹرافک کا سلسلہ کسی طرح تھمتا نہ تھا اور بھیڑ پھیلتا ہوا زہریلا دُھواں ہے۔ یہ تلخی اور گھٹتا ہوا ماحول، یہ اونچی اونچی چاروں طرف گھری ہوئی بھیانک بلڈنگیں۔ اور ان سب کے درمیان ایک بے بس سا انسان!

اچانک ایک بس میرے سامنے آ کر رُک گئی۔ اور میں اپنی دھن میں گم بس میں گھس پڑا۔ کنڈکٹر پہلے تو مجھے گھورتا رہا پھر اُس کا ہاتھ بیل کی طرف چلا گیا، ٹریفک سگنل گرین تھا اور بس چل پڑی تھی لیکن کنڈکٹر نے بس روک لی۔

”اے مسٹر اُترو، سمجھ میں نہیں آتا یہاں اسٹاپ نہیں ہے۔ اُترو جلدی ــــ!“

بس کے سارے مسافر پلٹ پلٹ کر مجھے دیکھنے لگے جیسے میں نے کوئی خطرناک جرم کیا ہو! میں شرمندہ ہو کر نیچے اُتر گیا۔ کنڈکٹر اب تک بڑبڑا رہا تھا۔ جلدی میں میں نے اِدھر اُدھر نظر بھی نہ دوڑائی ایک سائیکل سوار سے بُری طرح ٹکرا گیا۔ وہ دھپ سے گر پڑا اور اُٹھ کر اُس نے گالیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ سڑک کے درمیان دو منٹ تک میں سانس روکے چپ چاپ کھڑا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا انسان قیمتی ہے یا ٹرافک اور یہ کاریں اور بسیں قیمتی ہیں۔ ٹرافک کا سلسلہ رُکتا ہی نہ تھا۔ آخر کسی کو کیوں کسی آدمی کی پرواہ ہو سکتی ہے۔ کاریں اور اسکوٹروں کو آگے جانا ہے۔ بیچ میں کوئی آدمی کھڑا ہو جائے تو کسی کو کیا پرواہ ہو سکتی ہے۔ کسی صورت لوگوں کو اپنی کار آگے بڑھانی ہے اور اگر مجھے دھکا لگ جائے اور میں گر جاؤں تو کیا ہو؟ کوئی خاص فرق نہ ہوگا۔ سڑک عبور کرنے کے اصول توڑنے کے سلسلے میں جرمانہ

مجھی کو دینا پڑے گا۔ بڈی پسلی میری ہی ٹوٹے گی ——— میں نے کسی طرح ایک سنسان راستے کی طرف خود کو موڑ لیا۔ یا شاید میرے قدم آپ ہی آپ مُڑ گئے ——— میں اب شہر کے باہر چل رہا تھا اور شام گہری ہو گئی تھی۔ مجھے پیاس سی محسوس ہوئی، شاید میں چکرا گیا۔ میں نے جلدی سے ایک پیڑ کو تھام لیا اور نیچے بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

وہاں بہت دُور سامنے ایک کالا کلوٹا سا آدمی خاموش اور اکیلا بیٹھا تھا۔ اُس کے تن پر لنگوٹی کے سوا کپڑا نہ تھا۔ وہ آنکھیں بند کئے کسی نامعلوم شے کو گھور رہا تھا۔ لیکن اُس کے چہرے پر مُسکراہٹ تھی۔ اُس کے ہونٹ ہل رہے تھے اور وہ مُسکراتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے بھی اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اُس شکل و شباہت والے سینکڑوں چہرے قطار در قطار میرے سامنے کھڑے ہو گئے۔ پھر ساحرہ کی شکل سامنے آ گئی۔ پھر وہ مُسکراتا ہوا جوگی نظر آیا۔ پھر چہروں کی قطار ——— اور وہ سب چہرے مہاتما بُدھ کی شکل میں ڈھل گئے۔ پھر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اور میں مُسکرا پڑا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے مجھے نہ بھوک لگی ہے نہ پیاس نہ مجھے کوئی رنج ہے نہ غم۔ میں ایک پُرسکون ماحول میں گُم ہو گیا ہوں۔

گھر آنے کے بعد میں نے ساحرہ سے پھر بات کی۔ پھر اُس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی، پھر اُس کا چہرہ پڑھنے میں ناکام رہا ——— وہاں تو بس ایک اُلجھن تھی، ایک بیزاری تھی، ایک جھلک تھی نفرت کی!

"تم مہاتما بُدھ بنتے جا رہے ہو ———" میری باتیں سُن کر وہ بھڑک اُٹھی۔ "شرم نہیں آتی گھر میں بیوی بھوکی بیٹھی ہے، صبح سے کچھ کھایا نہیں ہے اور تم مہاتماؤں کے خواب دیکھ رہے ہو ——— ہوش تو ٹھکانے ہیں؟"

وہ تلملاتی چیختی پڑوسن کے ہاں چلی گئی۔ پھر کچھ دیر بعد لَوٹ آئی۔ اُس کے چہرے پر ایک عزم سا جھلک رہا تھا۔ "میں ریحانہ کے ساتھ بمبئی جا رہی ہوں میکے!" اُس نے تنک کر کہا ——— "اور جب تم مہاتماؤں کے سپنے دیکھنا بند کر دو گے اور بازاروں میں گھومتے نظر آؤ گے جب ہی میں واپس آ سکوں گی۔"

مجھے غصّہ آیا لیکن دوسرے ہی لمحے کافور ہو گیا۔ میں پھر مطمئن تھا۔ شاید مہاتما بدھ نے اپنی بیوی یشودھرا اور اپنے ننھے بچّے کو اسی لئے چھوڑ دیا تھا۔

میں کچھ دن اکیلا پن محسوس کرتا رہا۔ پُرسکون رہا ——— لیکن کبھی کبھی ساحرہ بُری طرح یاد آنے لگتی۔ میں دفتر سے اچانک گھر چلا آتا۔ الماری کھولتا اور چُپ چاپ اُس کے کپڑوں کو دیکھتا رہتا۔ پھر اُس کی تصویر کو گھورنے لگتا اور آج صبح سے ساحرہ مجھے بہت یاد آ رہی تھی۔ ہزار کوشش کے باوجود اُس کا خیال میں دل سے نہ نکال سکا۔ میں بمبئی چلا آیا۔

ہر موڑ پر میں کسی ہوٹل میں چلا جاتا۔ جیب سے کاغذات کے پُرزے نکالتا، اور اُن میں ساحرہ کے دھڑکتے ہوئے دل کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا۔ میں یونہی بھٹکتا رہا۔ ساحرہ کے گھر جانے کی ہمّت نہ ہوئی۔ میں اپنے ایک دوست کے گھر چلا گیا اور پھر میں نے دیکھا کہ ساحرہ ہر روز کام کے لئے ایک ٹرین سے دوسری ٹرین کو پکڑنے کے لئے دوڑتی رہتی ہے۔ دن کے چار گھنٹے وہ اسی طرح صرف کرتی ہے۔ کام پر پہنچنے کی جلدی، گھر لَوٹنے کی فکر میں اُس کی صحت پر بھی اثر پڑا ہے۔

دوسرے دن میں نے اُسے پھر پلیٹ فارم پر دیکھ لیا۔ وہ اپنے آپ میں اتنی کیوں منہمک ہو گئی تھی۔ شاید وہ اپنے کام کی فکر میں تھی، شاید اُسے میری یاد آ گئی ہو۔

شادی سے پہلے ایک خوشگوار صبح ساحرہ نے مجھے ٹھیک ساڑھے دس بجے دفتر میں فون کیا تھا۔

"ہیلو ——— جمیل ——— ! آج میں بالکل فری ہوں۔ کالج ختم ہو گئے۔ چھٹی مل گئی، گھر پر کوئی نہیں ہے!"

"اچھا ——— بہت خوشی کی بات ہے۔ تو پھر کیا پروگرام ہے؟"

"پروگرام بنے گا۔ پہلے چھٹی لے لو۔"

"اوہ ——— ساحرہ ——— یہ دفتر ہے کالج نہیں کہ اپنے آپ چھٹی کر دی۔ آج تو مشکل ہے!"

"پلیز ڈارلنگ ———"

"اوہ ——— نو"

"اوہ یس ———" "میں ابھی آ رہی ہوں! بس سیدھے 'النکار' چلے آؤ!" اُس نے کہا اور فون رکھ دیا۔ مجھے النکار جانا پڑا۔ لیکن النکار میں بھیڑ بہت تھی۔ میرا دل پکچر دیکھنے کی بجائے کہیں آؤٹ ڈور جانے کے لئے بے چین تھا۔ ساحرہ بھی راضی ہو گئی۔ اور اُس دن ہم لوناولی کی ایک خوبصورت جھیل 'ولونڈ' چلے گئے۔ وہاں ہم نے بوٹنگ کی۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے کشتی چلائی۔ مانجھی سے پتوارے لئے ——— وہ حسین شام سُہانی ہوتی چلی گئی۔ ساحرہ لہک رہی تھی، بہک رہی تھی، اُس کے خوبصورت حسین اور گداز

جسم سے جوانی کی مہک پھوٹ رہی تھی۔ اور وہ گنگنا رہی تھی۔ اُس کے بال پیشانی پہ بکھر بکھر جاتے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں خوشی کی ایک وحشیانہ جھلک تھی۔ ۔۔۔ لہروں کے ساتھ رقص کرتی محسوس ہو رہی تھی، اُس کا سفید لباس سفید مُرغابی کی مانند نیلی جھیل میں چمک رہا تھا۔ اور وہ مُرغابیوں کے ایک غول کو دیکھ کر بے تحاشہ چیخ پڑی۔ آج وہ واقعی خوش تھی! سچ مچ' تری' اور آزاد پنچھی کی طرح اُڑی جارہی تھی۔ اُسے بار بار ڈھلک جانے والے ساری کے آنچل کی بھی کوئی پرواہ نہ تھی۔ وہ پانی کے چھینٹے اُڑا رہی تھی۔ مٹی کے ڈھیر پر کبھی لیٹ جاتی۔ کبھی جنگلی پھولوں کے خوشے توڑ توڑ کر بالوں میں لگاتی۔ اور پھر وہ کھلی ہوئی پگڈنڈی پہ دوڑتی جھیل کے دوسرے کنارے پہنچ گئی۔ اُس دن وہ واقعی ساحرہ معلوم ہو رہی تھی! اُس کی ہر ادا ایک طلسمی جال سا بُن رہی تھی۔ ایسا جال جس میں پھنسا پرندہ نہیں مار سکتا تھا۔ جب دن شام کے دُھندلکے کا آنچل اوڑھے گذر چکا اور پرندوں کے تیز شور و غل کے بعد رات اچانک خاموش ہو گئی، تب اچانک ہمیں محسوس ہوا! جیسے سارا جہاں سو گیا ہے۔ صرف دو دِل جاگ رہے ہیں۔ ہم دونوں کے دو دِل۔ ! ہم نہ جانے کتنی دیر ایک دوسرے کی باہوں میں سمٹے کھڑے رہے۔ شاید ہمارے جسم مُردہ ہو چکے تھے روح جاگ رہی تھی۔ صرف ہوا کے چلتے ہوئے ٹھنڈے جھونکے ہمیں جگا دیتے تھے۔

اُس شام میں اور آج کی شام میں اتنا فرق کیوں ہو گیا؟ میں پھر پلیٹ فارم پر چپ چاپ کھڑا ساحرہ کے دفتر سے لوٹنے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ آئی۔ تھکی ہوئی پژمُردہ ـــــ ویسٹرن ریلوے سے اُتری اور تیزی سے چلتی ہوئی آخری پلیٹ فارم پر پہنچ گئی۔ میں بھی تقریباً اُس کے پیچھے دوڑ رہا تھا ـــــ پھر اُس کی ٹرین آگئی ـــــ اور لوگوں کا ایک بے پناہ ہجوم دروازے کی طرف لپکا۔ شاید میں ساحرہ پر نظریں گاڑے آگے بڑھ رہا تھا۔ مجھے کسی نے بہت زور سے جھٹکا مارا اور میں سر کے بل پلیٹ فارم پر پڑے بنچ سے جا ٹکرایا ـــــ میں نے اپنا سر اپنے ہاتھوں میں تھام لیا جو لوہے کے دستانے سے ٹکرا گیا تھا۔ ٹرین چھوٹ گئی تھی۔ میں نے جھلّائی آنکھوں سے دیکھا۔ ساحرہ مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلا رہی ہے وہ چیخ رہی ہے پتہ نہیں وہ کیا کہہ رہی ہے ـــــ اور پھر ٹرین میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ میں کچھ نہ دیکھ سکا۔ شاید کسی نے مجھے قریب کے ہاسپٹل میں پہنچا دیا تھا۔ میرے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور میں اخبار دیکھ رہا تھا۔ بھلا ہو اُس نرس کا جس نے آج کا اخبار میرے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ ایک باریک سی سُرخی پہ میری نظر جم کر رہ گئی۔

"ایک لڑکی نے چلتی ٹرین سے چھلانگ لگا دی۔ اُس کے پیروں میں زبردست چوٹ آئی۔ اُسے قریب کے ہاسپٹل پہنچا دیا گیا۔ پتہ چلا ہے کہ وہ پلیٹ فارم پر اپنے شوہر سے ملنے کے لئے کود پڑی جو اُسی پلیٹ فارم پر ایک بنچ سے ٹکرا کر گر پڑا تھا ـــــ"

میری آنکھوں کے آگے دھیرا اندھیرا سا چھانے لگا۔ قریب تھا کہ میں پھر بیہوش ہو جاتا ـــــ لیکن میں نے نرس کو آواز دی۔ میری جیب میں صرف پانچ روپے کا آخری نوٹ تھا۔ میں نے نوٹ اُس کے ہاتھ پہ رکھ دیا ـــــ "پلیز ٹیکسی ـــــ!"

" نرس مُسکرائی اور نوٹ اُس نے واپس کر کے کہا۔ "نو تھینک یو"
ٹیکسی آئی اور میں ساحرہ کے گھر کی طرف چل پڑا۔

وہاں پتہ چلا کہ وہ اُسی ہاسپٹل میں ہے جہاں سے میں ابھی ابھی باہر نکلا تھا ـــــ میں پھر لوٹ پڑا۔ بہت پیار سے ساحرہ نے میری طرف دیکھا میں نے اُس کے پیروں پر بندھے پلستر پر نظر ڈالی ـــــ اور جب وہ میرے سینے سے لگی رو رہی تھی تو میں نے محسوس کیا میرے لبوں پر وہی مُسکراہٹ چھا گئی ہے جو اُس جوگی کے ہونٹوں پر تھی۔

پھر ایک لمبی چوڑی ایمبولنس کار آئی اور اُس میں ڈال کر ساحرہ کو گھر پہنچا دیا گیا ـــــ میں نے اپنی جیب سے خطوط کا ایک پلندہ نکالا اور پھر واپس اپنی جیب میں ٹھونس لیا۔

غزل

پروفیسر سراج الحسن سراج ادیبؔ ایم۔ اے

دلِ پشیماں ہے خطاؤں کی سزا مانگے ہے
یعنی ہر لمحہ کوئی زخم نیا مانگے ہے

دردو غم رنج و الم جور و جفا مانگے ہے
دلِ ناداں بھی ذرا دیکھئے کیا مانگے ہے

طنز و تشنیع کا بنتا ہے نشانہ اکثر
جو بھی فنکار یہاں اپنا صلہ مانگے ہے

ظلمتِ شب میں یہ ہے آج مجھے کس کی تلاش
دیدۂ تر مہ و انجم سے ضیا مانگے ہے

ہم نے گلشن کو نکھارا ہے لہو سے اپنے
اور کیا ہم سے تو اے موجِ صبا مانگے ہے

حسنِ مغرور نے بدلا ہے اگر اپنا چلن
عشق بھی اب نئے انداز و ادا مانگے ہے

آہ تنہائیِ زنداں میں بھی دیوانہ ترا
تیرے ملنے کی شب و روز دعا مانگے ہے

کیوں نہ میں نذر کروں خونِ جگر ہی اپنا
آج وہ جانِ حیا رنگِ حنا مانگے ہے

برق بیتاب ہے گرنے کو یقیناً اُس پر
ورنہ کیوں میرے نشیمن کا پتا مانگے ہے

اب تو گھبرا کے ہجومِ غمِ دوراں سے سراجؔ
دل مرا، جامِ مئے ہوش رُبا مانگے ہے

غزل

نسیم رفعت گوالیاری

رُخ پہ زُلفوں کو گراتے ہو، یہ کیا کرتے ہو
چاند بدلی میں چھُپاتے ہو، یہ کیا کرتے ہو

حسن خود اپنے ہی جلووں میں نہ کھو جائے کہیں
آئینہ سامنے لاتے ہو، یہ کیا کرتے ہو

عارضِ رُخ پہ بھیگے ہوئے گیسو، توبہ!
آگ پانی میں لگاتے ہو، یہ کیا کرتے ہو

کیا کروگے جو اُجالے نہ کہیں راس آئے
روز اِک شمع جلاتے ہو، یہ کیا کرتے ہو

آنکھوں آنکھوں میں ہر اِک رات گزر جائیگی
خواب پلکوں پہ سجاتے ہو، یہ کیا کرتے ہو

تم بھی رُسوائی سے دامن نہ بچا پاؤگے
مجھ کو دیوانہ بناتے ہو، یہ کیا کرتے ہو

طُور کی یاد کہیں پھر سے نہ تازہ ہو جائے
پھر مرے سامنے آتے ہو، یہ کیا کرتے ہو

جن چراغوں نے سدا بزم کو رونق بخشی
اُن چراغوں کو بجھاتے ہو، یہ کیا کرتے ہو

لذّتِ تشنہ لبی اِک بڑی نعمت ہے نسیمؔ!
جام ہونٹوں سے لگاتے ہو، یہ کیا کرتے ہو!

گلابی لفافہ

ابوالکلام بسمل قاسمی

نمبر ۱۲ بلاک سی، راس مسعود ہال مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

قابل صد احترام خوشتر صاحب اخلوص بیکراں

اردو کے لئے اِس کس مپرسی کے دور میں آپ کی شخصیت ایک عظیم مربّی اور روحِ رواں کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب تک آپ کے فیضان سے کتنے ہی ذرّے آفتاب اور کتنے ہی قطرے سمندر بن چکے ہیں۔ آج ایک ادنا ناچیز ذرّہ توقعات سے آپکی توجہ کا متمنی ہے، اُمید کہ آپ مایوس نہ فرمائیں گے۔

میں نے اِس کہانی میں دو جیتے جاگتے کرداروں کو قارئین سے متعارف کرانے کی کوشش کی ہے۔ اِس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوں وہ قارئین پر چھوڑتا ہوں۔ آپ کی رائے کا شدت سے انتظار کروں گا۔

نیاز کیش ——— ابوالکلام بسمل قاسمی

★

گرمیوں کی خوشگوار شام ہے، ایک طرف سورج غروب ہو رہا ہے اور دوسری طرف ناہید کا دل ڈوبا جا رہا ہے، اُس کی آنکھوں میں سارے جہاں کا کرب سمٹ آیا ہے، اُس کے ہاتھ میں ایک گلابی لفافہ ہے جس نے اُس کی کائنات ویران کر دی ہے۔ کبھی لفافہ سے خط نکال کر بہت غور سے پڑھتی ہے اور کبھی اُس خط سے بے نیاز ہو کر اپنے حواس مجتمع کرنے کی کوشش کرنے لگتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اُس کا دماغ پریشان خیالی کی تاب نہ لا کر اپنی یادداشت کھو بیٹھے گا۔ کبھی اُس کی آنکھیں برسنے لگتی ہیں تو کبھی اُس کے ہونٹوں پر زہر خند نمایاں ہو جاتا ہے، وہ ماضی کی ساری یادوں کو دماغ سے جھٹک کر ماضی سے فرار حاصل کرنا چاہتی ہے لیکن اُس کی یادداشت رہ رہ کر نشتر زنی کر رہی ہے، اُس کی آنکھوں میں پچھلے دو سال کی طویل کہانی آنسوؤں کے قطروں میں تبدیل ہو کر طوفان برپا کئے دے رہی ہے، اُس طوفان نے یادوں کے سارے دریچے کھول دیئے ہیں۔

دو سال پہلے ناہید کو پہلی بار ایم اے کی کلاس دی گئی تھی۔ وہ پچھلے پانچ سال سے اس یونیورسٹی میں معلمی کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ وہ تیس سال کی حسین و جمیل لڑکی تھی۔ وہ سب کی نظروں میں نہایت سنجیدہ، متین اور خاموش طبع لڑکی، بلکہ عورت تھی۔ لوگ اُسے خود سر اور مغرور سمجھتے تھے، جاوید کو اُس نے پہلے دن ایم اے کی پہلی کلاس میں دیکھا تھا۔ اُس دن وہ سارے طلباء سے متعارف ہوئی تھی۔ جاوید نے شوخی بھری مسکراہٹ کے ساتھ اپنا تعارف کرایا تھا۔

"ناچیز کو جاوید عالم کہتے ہیں، لکھنؤ کا رہنے والا ہوں، اِس سال لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے میں ٹاپ کیا ہے۔"

جاوید اُس کلاس میں سب سے کم عمر لڑکا تھا۔ اُس وقت اس کی عمر بیس سال رہی ہوگی۔ اِس کم عمری کے باوجود اُس کے مؤثر اندازِ گفتگو سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی تھی۔ ساتھ ہی جاوید کے چہرے پر کھیلتی مسکراہٹ ناہید کو اُس کی شوخ طبیعت کا پتہ دے گئی تھی۔ اُس کے بعد کلاسیں ہوتی رہیں اور ناہید طلبا کی اکثریت کو اپنے پُر وقار اندازِ بیان اور عالمانہ لکچرس سے متاثر کرتی رہی۔ جاوید اُن سارے لڑکوں میں منفرد رہا۔ اُس نے کبھی ناہید کو اہمیت نہ دی۔ وہ کلاس کے دوران زیادہ وقت اپنے شکوک رفع کرنے میں صرف کر دیتا۔ اُس کے اندازِ سوال سے معلوم ہوتا جیسے وہ اپنے سبجیکٹ پر پوری قدرت و دسترس رکھتا ہو۔ اُس کے بے باکانہ سوالات، منفرد طریقۂ استدلال اور عالمانہ اعتراضات سے ناہید گھبرائی سی رہنے لگی، وہ ہر روز زیادہ سے زیادہ محنت کر کے لکچر تیار کرتی۔ کبھی کبھی جاوید کو مطمئن کرنے میں وہ سارا وقت صرف کر دیتی۔ جس دن وہ جاوید کے کسی سوال کا اطمینان بخش جواب نہ دے پاتی اُس دن وہ گھنٹوں متفکر اور اپنے آپ سے پشیمان رہتی۔ وقت کے ساتھ ساتھ کلاس کے سارے لڑکے جاوید کی ذہانت کے سامنے ناہید کی ناچاری سمجھنے لگے۔ ناہید

جس کی بلند شخصیت اپنا ایک الگ مقام رکھتی تھی، جاوید کے پیدا کردہ تلاطم میں غوطے کھانے لگی، اُس کا وقار اور اُس کی خودی دن بہ دن مجروح ہوتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی اپنی مجبوری پہ بے اختیار اُس کا دل رونے کو چاہتا، اُس کے جی میں بار ہا یہ بات آئی کہ جاوید کو ڈانٹ دے اور اُسے سوال کرنے کی اجازت نہ دیا کرے لیکن یہ تو اصولِ تعلیم کے خلاف تھا۔ دوسرے اُس کے ضمیر نے بھی اِس کی اجازت نہ دی۔ اُن دنوں اُس کی مثال ایک ایسے شاہین کی تھی جو خود شکار ہو گیا ہو۔ وہ اپنے پر مار کر آزاد ہونا چاہتی تھی لیکن شکاری اُس کے پر کاٹنے پر تُلا ہوا تھا۔ وہ جاوید کے سامنے شکست تسلیم کر لینا چاہتی تھی لیکن خودداری مانع ہو جاتی۔ وہ احساسِ شکست سے ذرہ ذرہ بکھر گئی تھی۔ کچھ دنوں بعد یہ خبر پوری فیکلٹی میں گشت کرنے لگی کہ ناہید جیسی خود سر اور خود نما لیکچرر نے جاوید کا لوہا مان لیا۔ یہ افواہ بھی پھیلی کہ اُس نے اُسے اسٹاف روم میں بُلا کر رو رو کر اُس سے کلاس میں خاموش رہنے کی درخواست کی تھی۔ لوگوں کو اِس بات کا کامل یقین اُس وقت ہو گیا جب جاوید کلاس میں دوسرے طلبہ کی طرح خاموشی سے ناہید کے لیکچر سننے لگا۔ نہ کوئی سوال، نہ کوئی اعتراض اور نہ اب وہ ناہید کی کسی غلطی کی نشاندہی کرتا۔ جاوید کی یہ تبدیلی بلاوجہ تو نہیں ہو سکتی تھی۔ اُس کی اِس تبدیلی کے ساتھ ہی ناہید اُس میں زیادہ دلچسپی لینے لگی، وہ اُس کا محسن جو ہو گیا تھا، پھر یہ دلچسپی قربت میں بدل گئی، اِس قربت اور تعلق نے کتنے ہی افسانے جنم دیئے۔ سارے لوگ اِس پختہ عمر کی خوددار اور مغرور معلمہ کے ایک نوعمر طالبِ علم کے ساتھ بڑھتے ہوئے تعلقات پر ششدر و حیران تھے۔ اِس سے پہلے بھی تو بہت سے لیکچررز اور ریڈرز نے اُس کے قریب آنا چاہا تھا لیکن ناہید کی سرد مہری نے کسی کو آگے بڑھنے کی اجازت نہ دی تھی۔ اسٹاف کا ہر فرد اُس کے قیامت خیز حُسن سے مرعوب تھا لیکن ناہید کے رعب کی وجہ سے کوئی بھی آج تک اُس سے بے تکلف نہ ہو سکا تھا۔ اسٹوڈنٹ لائف میں بھی وہ عام ماحول سے الگ رہی تھی۔ عشق محبت کے موضوع پر اُس نے کبھی کسی لڑکی سے گفتگو نہ کی تھی جبکہ گرلز ہوسٹل کا یہ سب سے پسندیدہ اور عام موضوع ہوا کرتا ہے۔ اُس کے ہوسٹل میں بہت سی لڑکیوں نے اُسے ٹھنڈے گوشت کا نام دے رکھا تھا۔ لیکچرر ہو جانے کے بعد ناہید کا کنوارا رہنا اسٹاف روم میں اکثر گفتگو کا موضوع ہوا کرتا۔ لیکن کسی کو کیا پتہ کہ ناہید چاہتی کیا تھی۔ وہ بھی جوان تھی اُس کے پاس بھی دل تھا۔ اُس کے بھی جذبات تھے۔ اُس کی رگوں میں بھی گرم خون دوڑ رہا تھا۔ اِن ساری باتوں کے باوجود اُس کے کچھ ذاتی نظریات تھے۔ اُس کا ایک آئیڈیل تھا۔ اُس کی نظر سے اب تک کوئی ایسا شخص نہیں گزرا تھا جسے وہ اپنا آئیڈیل اور مثالی محبوب سمجھ لیتی۔ یوں تو وہ اب تک بہتوں کی شخصیت اور حُسن سے متاثر ہوئی تھی لیکن اُسے کسی کا معیار، فکر اپنے برابر نظر نہ آیا تھا۔ اُس کی نظر میں دولتِ حُسن، شخصیت اور اسمارٹنس سے زیادہ اہمیت ذہانت اور بالغ نظری کی تھی۔

اِن حالات میں جب جاوید پر اُس کی نظر پڑی تو اُس کی نظروں میں جم کر رہ گئی، جاوید ایکسٹرا اور ڈنری دماغ کا مالک تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہت جلد ناہید کے احساسات پر چھا گیا۔ اِس طرح سال کے بارہ مہینے گزر گئے۔ اِس عرصے میں ناہید کو اپنا نامکمل وجود مکمل ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا، دونوں کی ملاقات کلاس روم سے نکل کر فیکلٹی کے گرد و نواح، یونیورسٹی، ریستوران، اور پھر ناہید کے گھر تک پہنچ گئی۔ جاوید اب ہر روز ناہید کے گھر آنے جانے لگا۔ وہ اکثر ناہید کے ساتھ شام کی چائے پیتا۔ ناہید دل کھول کر اُس سے تبادلۂ خیال کرتی اور اُس کی پُر مغز باتوں اور اُس کی ذہانت سے محظوظ ہوتی۔ جاوید نے کبھی اپنی زبان سے کوئی ایسی بات نہ کہی تھی جس سے محبت کا اشارہ بھی ملتا لیکن ناہید دل ہی دل میں اُس کی پرستش کرنے لگی تھی۔ وہ مطمئن تھی کہ بہت جلد اپنی زبان سے جاوید اُس کے دل کی بات کہہ دے گا۔ ناہید کی ہر شام ایک نئی اُمید لے کر آتی۔ وہ ہر روز جاوید کی طرف سے اظہارِ محبت کی توقع کرتی۔ اُدھر جاوید کا یہ حال تھا کہ وہ اِس طرح کا کوئی موضوع زیرِ بحث آنے ہی نہ دیتا تھا۔ کئی بار ناہید نے باتوں کا رُخ اِس طرف موڑنا بھی چاہا تھا لیکن وہ ہر بار بہت خوبصورتی سے کوئی اور ہی موضوع چھیڑ دیتا۔ وہ اُسے اپنی لیکچرر ہی سمجھتا رہا۔ عمر میں کمی بے تکلفی کے باوجود ناہید کو میڈم ہی کہتا۔ ناہید کو اُس کا میڈم کہنا گراں گزرتا تھا۔ وہ بار بار میڈم، میڈم سن کر تلملا جاتی تھی۔ اُس نے بارہا جاوید سے کہنا بھی چاہا تھا کہ وہ اُسے صرف ناہید کہہ کر مخاطب کیا کرے لیکن اُسے ہر بار عجیب سی ندامت کا احساس ہوا کرتا اور اُس کے خود ساختہ اصولوں نے اُسے ایسا نہ کرنے دیا۔ جاوید سے گفتگو کرتے ہوئے نہ جانے اُسے کیا ہو جاتا تھا کہ اپنی ساری سنجیدگی اور اصول پسندی کو بھول کر جاوید میں کھو سی جاتی۔ اُس میں وہ طاقت اور توانائی باقی نہ رہتی جس کے سہارے اُس نے آج تک اپنے آپ کو منفرد و ممتاز بنائے رکھا تھا۔ جاوید کی ایک ایک ادا ناہید کے ہوش و حواس پر بجلی بن کر گرنے لگی، وہ سوچتی — کاش! جاوید ہی میرا ٹیچر ہوتا اور میں اُس کی طالبہ ہوتی۔ اِس طرح جاوید نے اب تک دل کی بات تو کہہ دی ہوتی۔

عجیب بات یہ تھی کہ جب جاوید اُس کے قریب آیا تھا وہ اپنے آپ میں بھی بہت دلچسپی لینے لگی تھی۔ وہ ناتجربہ کار کنواری لڑکیوں کی طرح دن میں کئی کئی بار آئینہ دیکھنے لگی تھی۔ وہ حساس بھی پہلے کی بہ نسبت زیادہ ہو گئی تھی۔ چھوٹی سی غم کی بات اُسے بے انتہا غمزدہ، اور ذرا سی خوشی کی بات بھی اُسے اِس قدر مسرور و شادماں اور جذباتی بنا دیتی کہ وہ پاگل سی لگتی۔ اُس نے اپنی عمر کی تیس سے زیادہ منزلیں طے کر لی تھیں لیکن اِس طویل عرصہ میں اپنے آپ کو اُس نے اتنا مسرور و مطمئن کبھی بھی نہ پایا تھا۔ اُس کا برسوں کا خوابیدہ حُسن اب بیدار ہو کر آنکھیں ملنے لگا تھا۔ اُسے اب

اپنے وجود کی اہمیت کا احساس بہت شدت سے ہو رہا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ اُس کے وجود میں آنے کا مقصد صرف جاوید سے ملاقات تھی۔ اُس کی ذہنی تشنگی کو آبِ حیات مل گیا تھا۔ لیکن وہ اُس آبِ حیات کے بحرِ بے کراں میں اُس پیاسے کی طرح غوطے کھانے لگی جس پر سیرابی کی خوشی سے زیادہ ڈوب جانے کا خوف غالب آگیا ہو، جاوید اکثر زیادتی کیا کرتا۔ "میڈم آپ میں اعتدال کیوں نہیں۔ کبھی تو آپ غیر معمولی سنجیدہ رہتی ہیں اور کبھی اتنی خوش کہ گھنٹوں قہقہے لگایا کرتی ہیں" ـــ اس طرح کے سوالات کے جواب میں ناہید نے کئی بار وہ سب کچھ کہہ دینا چاہا تھا جو اُس کے دل پر گزر رہی تھی وہ کہنا چاہتی کہ جاوید! تم ہی تو اس پردۂ زنگاری میں چھپے بیٹھے ہو جس نے مجھ سے میرا صحیح عکس بھی چھین لیا ہے۔ میں اپنے آپ کو اتنی بدلی ہوئی محسوس کرتی ہوں کہ مجھے میرا وجود بھی تمہارا مرہونِ منت نظر آتا ہے لیکن کاش وہ یہ سب کچھ کہہ سکتی! وہ ایک لکچرر تھی، وہ جاوید کی اُستاد تھی، اِس سماج میں اُستاد کا مرتبہ شاگرد سے بلند ہوتا ہے۔ اُسے اپنے سماج سے نفرت ہونے لگی جس نے اُستاد و شاگرد کے رشتے کو مُرشد و مرید کے رشتے کی شکل دے رکھی تھی۔ سماج کے بنائے ہوئے اصول و ضابطے بھی کتنے ظالم ہوتے ہیں! وہ سوچتی، جہاں ہماری ماحول میں دیکھو آدمی اپنے حقیقی وجود پر خول چڑھائے نظر آتا ہے، وہ کسی مغربی ملک میں کیوں نہ پیدا ہوئی۔ وہاں جاوید سے وہ سب کچھ تو کہہ سکتی تھی جو اُس کے بارے میں سوچتی تھی۔ وہاں اُستاد اور شاگرد میں زمین و آسمان کی دُوری نہ ہوتی۔ وہ جاوید سے اِس قدر قریب ہو کر بھی اُسے اپنے آپ سے دُور نہ پاتی۔ کبھی اُس کا دل کہتا جاوید بھی اِسے لوٹ کر چاہتا ہے۔ اِس کی بے تکلفانہ گفتگو اور ہر روز کا آنا جانا بے معنی تو نہیں ہے اسے اِس موقعہ کا بہت شدت سے انتظار رہا کرتا جب جاوید وہ سب کچھ کھل کر کہہ دے گا جو وہ آج تک اپنی زبان پر نہ لا سکی تھی۔ کبھی کبھی اُسے اندیشہ گزرتا کہ کہیں اُس کی اور جاوید کی عمر کا تفاوت تو سدِ راہ نہیں؟ ہو سکتا ہے جاوید خود کو میرے مقابلے میں ایک کمسن اور نوعمر نوجوان سمجھتا ہو، بعض وقت ناہید یہ تصور کر کے گھبرا جاتی کہ کہیں یہ میری خام خیالی نہ ہو، ہو سکتا ہے وہ مجھے محض ایک مشفق اور بے تکلف اُستاد سمجھتا ہو، ایسا تو نہیں کہ میں جنون میں ناعاقبت نااندیش نوجوانوں کی طرح بے تکلفی کو محبت سمجھ بیٹھی ہوں۔

"نہیں! ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا! جاوید کے بارے میں میری رائے غلط نہیں ہو سکتی!" وہ اپنے توہمات کو جھٹلانا چاہتی۔ مجھ سے بات کرتے وقت اُس کی آنکھوں میں بھی ایک خاص چمک ہوتی ہے وہ صرف خلوص اور بے تکلفی کی چمک نہیں ہو سکتی، اُس کی بھی کچھ مجبوریاں ہوں گی، ہو سکتا ہے عمر کے تفاوت کے باعث جاوید کو جرأت نہ ہوتی ہو، وہ ایک نہ دن ضرور بے نقاب ہو کر سامنے آجائے گا۔

اِسی طرح جاوید کا دوسرا تعلیمی سال بھی اپنی آخری سانسیں لینے لگا۔ سالانہ امتحانات شروع ہو گئے تھے، جاوید حسبِ معمول ناہید ہی سی محنت کرتا تھا۔ اب بھی اُس کا ہر شام ناہید کے گھر آنا کم نہ ہوا تھا۔ اُن دنوں وہ ناہید سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گیا تھا۔ اسی دوران یونیورسٹی میں تقسیمِ انعامات کا جلسہ ہوا۔ ناہید سُرخ ساری میں ملبوس شعلہ بنی ہوئی اِدھر اُدھر جاوید کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد جاوید اپنے کلاس فیلو کے ساتھ آتا ہوا نظر آیا۔ ناہید پر نظر پڑتے ہی اُس نے اپنے ساتھی سے اجازت لی اور اُس کے قریب آکر مخاطب ہوا۔ "میڈم! کہیں آج جلسہ گاہ میں آگ نہ لگ جائے!" وہ جاوید کے اِس ریمارک کا کوئی جواب نہ دے سکی، وہ خوب سمجھ رہی تھی کہ جاوید نے اُس کے سُرخ و سپید رنگ پر گلابی ساڑی دیکھ کر یہ بات کہی ہے، تو کیا جاوید مجھے سچ مچ ایسا شعلہ سمجھتا ہے جو کسی کو جلا کر رکھ دے؟ لیکن وہ آج تک خاموش کیوں تھا؟ جاوید کی اِس غیر متوقع جرأت پر اُس کا چہرہ اور سُرخ ہو گیا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جاوید کے اِس جملہ نے اُس کی جنم جنم کی پیاس بجھا دی، اُسے آج روحانی طمانیت کا احساس ہو رہا تھا۔

دونوں دو خالی کرسیاں دیکھ کر بیٹھ گئے۔ دو گھنٹے کے اِس پروگرام کے دوران ناہید دنیا و مافیہا سے بے خبر خوابوں کی وادیوں میں سیر کرتی رہی نہ جانے

جاوید کا کیا حال تھا۔ ناہید اس وقت چونکی جب اناؤنسر نے حاضرین کا شکریہ ادا کر کے جلسے کے اختتام کا اعلان کیا۔

اس واقعہ کے بعد ناہید کا رہا سہا شک بھی رفع ہو گیا، اسے اپنی منزل سامنے دکھائی دینے لگی۔ یہی وجہ تھی کہ جس دن جاوید اپنا آخری پرچہ دے کر نکلا تو امتحان گاہ کے دروازے پر ہی ناہید نے ایم اے کے بعد جاوید کا پروگرام پوچھا۔ جاوید نے جواب دیا کہ گھر والوں کی خواہش تو یہ تھی کہ میں ملازمت کر لوں لیکن میرا ارادہ گرمی کی چھٹیوں کے بعد یہیں ریسرچ جوائن کرنے کا ہے۔ ناہید اس کا یہ جواب سن کر پھولی نہ سمائی تھی کہ وہ ریسرچ اسکالر ہو جانے کے بعد اس سے اور بھی قریب ہو جائے گا۔ دوسرے دن جب لکھنؤ ایکسپریس سے جاوید گھر جا رہا تھا تو ناہید بھی اسے چھوڑنے اسٹیشن گئی تھی۔ گاڑی جب پلیٹ فارم چھوڑنے لگی تو اچانک ناہید کا دایاں ہاتھ آگے بڑھ گیا، جاوید کو ناہید کا مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھانا عجیب سا معلوم ہوا۔ وہ کچھ جھجکا یا تھا لیکن گاڑی کی رفتار تیز ہوتی ہوئی دیکھ کر اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ بڑھا کر ناہید سے ہاتھ ملایا۔ ناہید اسٹیشن سے رات کے دس بجے کے قریب گھر واپس پہنچی، ادھر جاوید کی گاڑی رات کے سناٹوں کا سینہ چیرتی ہوئی لکھنؤ کی طرف رواں دواں تھی اور ادھر ناہید گھنٹوں سے اپنے بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی اسے اپنے ہاتھ بڑھانے پر بار بار افسوس ہو رہا تھا۔ نہ جانے جاوید نے کیا سوچا ہو، ساتھ ہی جاوید کے ہاتھ کی گرمی نے اس کے تن بدن میں چنگاریاں سی بھر دی تھیں۔

جاوید کو دہلی سے گئے ہوئے ایک ماہ گزر گیا لیکن اس کا ایک بھی خط نہ آیا تھا۔ ناہید کے دل میں شکوک پیدا ہونے لگے۔ اس نے مختصر سی مدت میں جاوید کے نام آٹھ دس خطوط لکھ ڈالے لیکن کسی کا جواب نہ آیا۔

ڈیڑھ ماہ بعد آج شام کی ڈاک سے اسے جاوید کا گلابی لفافہ ملا تھا۔ اس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ لفافہ کھولا۔ کاش! یہ لفافہ کہیں گم ہو گیا ہوتا اگر یہ خط اسے نہ ملا ہوتا تو وہ امید پر تو جی سکتی تھی۔ لفافہ میں خط کے ساتھ ایک گلابی کارڈ بھی تھا۔ ناہید خط پڑھنے لگی۔

"ڈیر میڈم!

یہاں آ کر ایسا مصروف ہوا کہ آپ کو کوئی خط نہ لکھ سکا۔ آپ نے بھی تو کمال ہی کر دیا! آپ تو بہت کم خط لکھا کرتی تھیں۔ ایک ڈیڑھ ماہ میں اتنے سارے خط کیسے لکھ ڈالے ہیں ـــــ یہاں والد صاحب میری شادی کی بات اپنے کسی دوست کی لڑکی سے میرے پہنچنے سے پہلے ہی طے کئے بیٹھے تھے۔ سنا ہے لڑکی کی عمر مجھ سے چار پانچ سال کم ہے۔ عمر کا اتنا فرق تو ہونا ہی چاہئے میڈم! آپ یہ سن کر کتنی خوش ہوں گی کہ ۱۰ تاریخ میری شادی کی تاریخ ہے، دعوت نامہ ساتھ بھیج رہا ہوں، آپ کی شرکت کے بغیر شادی پھیکی رہے گی، امید ہے آپ ضرور تشریف لائیں گی۔

چشم براہ ـــــ جاوید"

شادی کا دعوت نامہ ناہید کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس کے قدموں میں گر پڑا اور کئی آنسوؤں نے جاوید کی تحریر پر گر کر اسے کئی جگہ سے دھندلا کر دیا ـــــ ناہید کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس کے سامنے پڑا ہوا شادی کے دعوت نامہ کا گلابی لفافہ سیاہ ہو گیا!

غزل

قاضی محمد ریاض الدین انصاری، ریاض ایم۔ اے، بی۔ٹی

راہِ وفا میں، ڈھونڈھ کے ہم سے، دل سا ہمدم چھوٹ گیا
پھر بھی مگر تھا ایک سہارا، وہ بھی سہارا ٹوٹ گیا

ہجر کے صدمے سہتے سہتے، صبر کا دامن چھوٹ گیا
عشق میں یہ ناکامی پیہم، دل ہی تھا، آخر ٹوٹ گیا

غیر سے اُلفت ہوگئی اُن کو، ہم سے ناتا ٹوٹ گیا
تھا جو کبھی کا ملنا جلنا، لو اب وہ بھی چھوٹ گیا

ضبطِ الم کرتے رہے جب تک ضبطِ الم کی تاب رہی
آہ جو کھینچی، زخمِ جگر کا اِک اِک ٹانکا ٹوٹ گیا

دِل کی حقیقت پوچھنے والو! دل کی حقیقت کیا کہیے!
نازک سا اِک شیشہ تھا، جو ٹھیس لگی اور ٹوٹ گیا

رہروِ راہِ عشق کا آخر ساتھ کوئی دیتا کب تک؟
دیکھ کر آفت اِس منزل کی، اِک اِک ساتھی چھوٹ گیا

دھیمی دھیمی تھی جو خلش کی لذّت، وہ بھی ختم ہوئی
رِستے رِستے ایک دِن آخر دِل کا چھالا پھوٹ گیا

غزل

قمر مرادآبادی

بے خبر ہو کر غمِ انجام سے
کھیلتا ہوں گردشِ ایام سے

کتنا نازک ہے مزاجِ عشق بھی
دِل دھڑک اُٹھتا ہے اُن کے نام سے

تیری زُلفوں میں اُلجھ کر رہ گئے
بچ گئے جو گردشِ ایام سے

رقص فرماتی رہے گی چشمِ ناز
جام ٹکراتا رہے گا جام سے

کتنی صبحیں آشکارا ہو چکیں
زندگی کی اِک اندھیری شام سے

جب تمنّا بے اثر ہو جائے گی
کام لیں گے حسرتِ ناکام سے

ہم سے دورِ جام قائم ہے قمر
اور ہم زندہ ہیں دورِ جام سے



جیون ساتھی

پروفیسر ڈاکٹر سید محمد محی الدین سُبحانی ایم۔ اے بی۔ ایل۔ پی ایچ۔ ڈی
شعبہ سیاسیات آر۔ ڈی۔ ایس کالج مظفر پور (بہار)

برادرِ محترم! آداب و تسلیمات

میں یہ سمجھ لینے لگا تھا کہ "بیسویں صدی" ہندوستان کا واحد مقبول ترین فیملی جریدہ ہے جس میں صرف ایسے ہی افسانے شائع ہوتے ہیں جن کا بُرا اثر ہمارے معاشرے پر نہیں پڑتا۔ سالنامہ ۷۳ء کے کئی بار مطالعہ کرنے سے یہ بات اور بھی زیادہ واضح ہو گئی ہے۔ آپ کی پرکھ اور پسندیدگی واقعی بے مثال ہے۔ جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ایک افسانہ "جیون ساتھی" بھیج رہا ہوں۔ اُمید کرتا ہوں کہ یہ افسانہ بھی سالنامہ میں شائع ہونے والے میرے افسانہ "میک اَپ" کی طرح مقبول ہوگا۔ آپ اور دوسرے قارئین "بیسویں صدی" اسے پسند کریں گے۔

نیاز مند ——— سید محمد محی الدین سُبحانی

شام ڈھل چکی ہے۔ سورج کی آخری شعاعیں دُور مغربی گھاٹ کی پہاڑیوں پر چمپئی کرنیں بکھیر رہی ہیں۔ بنارس سے بمبئی جانے والی کاشی ایکسپریس ٹرین اِسی رنگیں ماحول میں آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ میں ٹو ٹائر سلیپر کے چودہ نمبر کے برتھ پر بیٹھا مسلسل کئی گھنٹوں سے اُس خوبصورت لڑکی کی طرف دیکھے جا رہا ہوں جو میرے سامنے بیٹھی سویٹر بن رہی ہے۔ کبھی کبھی نظریں اُٹھا کر میری طرف دیکھ لیتی ہے۔ ہلکی سی مُسکراہٹ اُس کے لبوں پر بکھر جاتی ہے۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی ہیں۔ میرے جذبات مچل اُٹھے ہیں۔ ایک سرد سی لہر چہرے پر دَوڑ گئی ہے۔ کیف و سرور کی لکیریں اُبھرنے لگی ہیں۔ مجھ میں وہ تاب نہیں کہ میں اُس سے نظریں ملا سکوں۔ اُس کے تبسم میں ایک معصومیت ہے۔ ایک عجیب سی شوخی ہے۔ ہلکے آسمانی بیل بوٹم میں وہ بے حد پُرکشش معلوم ہو رہی ہے۔ چہرے پر بہت ہلکا سا میک اَپ ہے۔ رنگ صاف کِھلتا کِھلتا سا ہے۔ آنکھیں بڑی بڑی بے حد پُرکشش ہیں۔ جب وہ ہنستی ہے تو رخساروں پر خوبصورت گڑھے پڑ جاتے ہیں جو اُسے اور خوبصورت بنا دیتے ہیں۔ اِس کے رخساروں پر پڑ جانے والے گڑھے کو دیکھ کر میرے دل میں ایک کسک سی ہونے لگی ہے۔ میرا دل کیوں بیٹھنے لگا ہے۔ یہ رنگین فضا سوگوار اور بجھی بجھی سی معلوم ہونے لگی ہے۔ اپنا وجود کیوں آتش فشاں کا کھولتا ہوا دہانہ بن گیا ہے۔ میرے دل میں شعلے کیوں بھڑک اُٹھے ہیں۔ کون سی یادیں میرے تصور کے پردوں پر رقص کرنے لگی ہیں۔ اِس کے رخسار کے یہ خوبصورت گڑھے کون سی یادیں لئے میرے ذہن و احساس پر چھا گئے ہیں۔ کڑی سے کڑی ملتی چلی جاتی ہے اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا ہے میری شانو میرے سامنے بیٹھی سویٹر بُن رہی ہے۔ میرے تصور کو پَر لگ گئے ہیں۔ میرے خیالات بیتے دنوں کی اُن حسین وادیوں میں آ گئے ہیں جو اب بھولے بسرے خواب بن کر رہ گئے ہیں۔

یہ صرف پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ جب میں نے پہلی بار شانو کو کالج میں دیکھا تھا۔ کلچرل پروگرام کے سلسلہ میں اُس سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں کالج کے کلچرل سوسائٹی کا جوائنٹ سیکریٹری تھا اور وہ سیکریٹری تھی۔ میں تھرڈ ایئر میں نیا نیا آیا تھا۔ وہ فورتھ ایئر میں بہت پہلے سے پڑھتی تھی۔ میں اور لڑکوں سے زیادہ تیز طرار اور حاضر جواب تھا۔ کالج کی ہر بزم اور

کلچرل پروگرام [illegible] رواں تھا۔ وہ بلا کی کم سخن اور سنجیدہ تھی۔ مجھے موسیقی سے محبت تھی۔ کئی سالوں تک کلاسیکی موسیقی کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اُسے بھی رقص اور موسیقی سے بہت دلچسپی تھی۔ بڑی طرح ہر پروگرام میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی۔ ریڈیو اسٹیشن سے پروگرام دیتی تھی۔ حسنِ اتفاق دیکھئے ہم ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ ہمارے مکان بھی پاس پاس تھے۔ ہم ساتھ ہی کالج جاتے اور ساتھ ہی واپس آتے۔ دونوں کی پسند، غور و فکر اور مطالعہ کرنے کے طریقوں میں بہت مشابہت تھی۔ پڑھنے کے سلسلے میں اُس نے میری بہت مدد کی تھی۔ اُس کی حوصلہ افزائی نے میرے اندر عزم و حوصلہ اور استقلال بھر دیا تھا۔ اُس کے خد و خال، انداز بیان سے میں بے حد متاثر ہوا تھا۔ کالج کے ہر فنکشن میں ہم ساتھ ساتھ ہی رہتے تھے۔ خواہ وہ فائنل ایئر اسٹوڈنٹس کا پکنک پروگرام ہو، اُنھیں دی گئی فیرول پارٹی ہو، اُن کی آخری ثقافتی نمائش، جہاں بھی ہو ہم دوش بدوش رہتے۔ چند ہی دنوں میں مجھے شانو سے بے حد اُنسیت ہو گئی تھی۔ اُس کے مسکراتے ہوئے ہونٹ، رخساروں پر پڑتے گہرے نشان، کھلتا ہوا صاف رنگ مجھ پر اکثر نشہ طاری کر دیتا۔ میں سوچنے لگا تھا کاش شانو میری جیون ساتھی بن جاتی اور سدا سدا کے لئے ہم دونوں ایک ہو جاتے۔ لیکن اُن دنوں میری کون سنتا۔ میں نے جب کبھی ڈیڈی ممی سے شانو کا ذکر بھی کیا تو انہوں نے ڈانٹ دیا اور کہا پہلے اپنی تعلیم پوری کر لو، پھر کچھ سوچنا —— اور میں سوچتا ہی رہا۔ اور شانو دیکھتے ہی دیکھتے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مجھ سے روٹھ کر چلی گئی۔ کسی سن رسیدہ کے کھردرے ہاتھوں نے اُس کی مانگ میں سیندور بھر دیا۔

اب جب شانو کسی اور کی ہو چکی ہے۔ میری دنیا سے بہت دُور جا چکی ہے اُس کی یاد مجھے بے چین کر دیتی ہے۔ ہر نئے چہرے میں مجھے شانو کا روپ نظر آتا ہے۔ سامنے بیٹھی اِس خوبصورت لڑکی کے رخساروں کے گہرے نشان نے میرے جذبات میں شعلے بھر دیئے ہیں۔ میری غمناک آنکھیں کیوں آنسوؤں سے بھیگتی جا رہی ہیں۔ کسی کی نظریں میری آنکھوں کی طرف نہ اُٹھ جائیں۔ آنسوؤں کا یہ کیسا سیلاب ہے جو رُکنے کا نام نہیں لیتا۔ رومال میں جذب میرے آنسو محض پانی کے قطرے نہیں ہیں، یہ خونِ جگر ہیں جو برسوں کے بعد اُمڈ پڑے ہیں۔ میرا دل بیٹھنے لگا ہے۔ سامنے بیٹھی خوبرو لڑکی نے بار بار میرے اُداس چہرے کی طرف دیکھا ہے۔ اُسے مجھ سے کچھ ہمدردی سی ہونے لگی ہے۔ اُس کی ماں جو بہت دیر سے بیٹھی کوئی ناول پڑھ رہی تھی، میری طرف دیکھنے لگی ہے۔ ہر تھوڑے ایک کتاب سے [illegible] سن رسیدہ مسافر حریص نظروں سے اِس لڑکی کی طرف دیکھے جا رہا ہے کیسے کیسے خیالات اُس کے ذہن میں اُبھر رہے ہوں گے۔ وہ کیا کیا سوچ رہا ہوگا۔ یہ ماں بیٹی بھی بمبئی جا رہی ہیں۔ میں نے رات ایک بجے بھوپال سے یہ ٹرین پکڑی ہے۔ یہ بھوپال سے اِس ٹرین میں بیٹھی۔ بھوپال اسٹیشن پر [illegible] ٹرین پر بٹھانے آئے تھے۔ اِن میں سے ایک بزرگ آدمی نے مجھ سے کہا تھا، "بیٹا! تم بھی بمبئی جا رہے ہو۔ ذرا اِن کا بھی خیال رکھنا!"

میں نے سر کو ہلکی سی جنبش دے کر کہا تھا، آپ اطمینان رکھیں، میں اِن کا پورا خیال رکھوں گا۔ اُسی وقت سے میں برابر اس کوشش میں ہوں کہ اِنہیں کسی طرح کی کوئی تکلیف نہ ہو۔ جلگاؤں میں جب تھوڑی دیر کے لئے گاڑی ٹھہری تھی تو میں نے اُس سے پوچھا تھا، "آپ لوگوں کو کس چیز کی ضرورت ہے؟" انہوں نے انکار میں سر ہلا دیا تھا۔ چالیسگاؤں اسٹیشن پر جب میں کچھ دیر کے لئے ٹرین سے اُتر کر پلیٹ فارم پر چہل قدمی کرنے لگا اور پھر کھانے کے لئے اپنے تھرموس میں پانی لانے لگا تو سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی نے آہستہ سے مجھ سے کہا: "ذرا اس صراحی میں بھی پانی لا دیتے تو بڑی مہربانی ہوتی۔" اُس نے چھوٹی سی صراحی میری طرف بڑھا دی تھی۔ میں نے جب پانی بھر کر صراحی اُسے تھما دی تھی تو اُس نے ممنون نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر شکریہ کہا تھا اور جب میں تھوڑی دیر کے لئے پلیٹ فارم کے بنچ پر بیٹھ کر سگریٹ کے کش لینے لگا تو وہ مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ جب ٹرین چل پڑی اور میں پھر اپنی جگہ پر بیٹھ کر ٹفن باکس سے کھانا نکال کر کھانے لگا، تو اُس نے اپنی ماں سے کچھ کہا۔ میں نے اخلاقاً کھانا اُن کی طرف بڑھایا۔ لڑکی کے چہرے پر تبسم کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اُس کی ماں نے انکار میں سر کو ہلکی سی جنبش دی اور کہا، شکریہ! انہوں نے اپنا ناشتہ دان کھولا اور بہت سی مٹھائی نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔ میں انکار کرتا ہی رہا لیکن اُنہوں نے ایک نہ مانی۔ میں عجیب کشمکش میں پڑ گیا تھا۔ میں اُن کا شکریہ بھی ادا نہ کر پایا اور مٹھائیاں مجھے کھانی پڑیں۔ وہ بھی کھانا کھا رہی تھیں۔ لڑکی خاموش تھی۔ اُس کی ماں بار بار کہے جا رہی تھی "ارچنا! ذرا پانی دینا۔ ارچنا ذرا اِن پوریوں کو سمیٹ کر باہر پھینک دو، اب بچی ہوئی مٹھائی کو بھی سمیٹ لو۔ ارچنا! تم نے ملائی پوری کھائی ہی نہیں۔ تم بہت دُبلی ہوتی جاتی ہو، اپنا خیال نہیں کرتی۔"

اُس لڑکی کا نام مجھے معلوم ہو گیا تھا۔ اُس کا نام مجھے بہت پیارا

معلوم ہوا۔ ناشتہ اسٹیشن پر میں چائے پینے کے لئے پلیٹ فارم پر اُتر گیا تھا۔ کھانے کے فوراً بعد چائے پینے کی عادت مجھے شروع ہی سے ہے میں نے اُن سے بھی پوچھا تھا، "کیا آپ بھی چائے پیجئے گا؟" میرا اشارہ ارچنا کی طرف تھا اُس نے انکار میں سر کو ہلکی سی جنبش دی تھی۔ مجھے اُس کی خاموشی پر غصہ آنے لگا۔ اُس کی ماں سے بھی دریافت کیا، "ماں جی آپ چائے لینگی؟" اُس ماں نے جواب دیا، "بیٹا ابھی نہیں! آگے چل کر پانچ بجے کے بعد کسی دوسرے اسٹیشن پر پئیں گے۔" میں ٹی اسٹال کی طرف بڑھ گیا۔ ٹی اسٹال پر کافی بھیڑ تھی۔ کسی صورت سے میں ایک کپ چائے لینے میں کامیاب ہوگیا۔ گاڑی یہاں کافی دیر نہیں ٹھہرتی تھی۔ ابھی چائے پی ہی رہا تھا کہ انجن نے سیٹی دے دی، اور گاڑی چل پڑی۔ میں آدھا کپ چائے چھوڑ کر اپنے کمپارٹمنٹ کی طرف بڑھا۔ کسی صورت سے دوڑتا ہوا ہینڈل پکڑ کر ایک دوسرے کوچ میں لٹک گیا۔ کافی دیر تک ہانپتا رہا۔ پھر جب گاڑی دوسرے اسٹیشن پر رُکی تو اپنے کمپارٹمنٹ کی طرف بڑھا۔ میں نے دُور سے دیکھا ارچنا کی نگاہیں مجھے تلاش کر رہی تھیں مجھے آتے ہوئے دیکھ کر وہ بہی خوش ہوئی تھی اور مُسکرائی تھی۔ اُس کے رُخساروں پر پڑ جانے والے گڑھے نے اُس کے حُسن کو اور پُرکشش بنا دیا تھا اُس کی ماں کہنے لگی تھی ——

"بیٹا! ہم لوگ بہت گھبرا گئے تھے۔ تم کہاں چھوٹ گئے تھے؟ ارچنا پریشان ہو رہی تھی۔ چلتی ٹرین میں کبھی نہ سوار ہونا چاہیے۔" ارچنا مجھے دیکھ کر پھر مسکرا دی تھی، اُس کی نگاہیں مجھ سے باتیں کرنے لگیں تھیں۔ یونہی ایک میگزین ہاتھوں میں اُٹھا لیا۔ کچھ دیر کے لئے اُس نے سوئٹر بُننا چھوڑ دیا تھا۔ کچھ کھوئی کھوئی سی وہ سہانے سپنوں کی دُنیا میں کھو گئی تھی۔ کسی کا تصوّر اُس کے حواس پر چھا رہا تھا۔ پھر وہ کھڑکی سے باہر کی طرف جھانکنے لگی۔ اپنے گردوپیش سے بے نیاز ڈوبتے سورج کا منظر دیکھنے میں منہمک ہوگئی۔ میں سوچنے لگا۔ شانو تو اب مجھے مل نہیں سکتی، کاش یہ لڑکی ارچنا ہی مجھے مل جاتی۔ میں اپنے پاپا سے کہتا —— مجھے ارچنا کی طرح خاموش، کم گو اور سنجیدہ لڑکی پسند ہے۔ میں ایسی ہی لڑکی کو شریکِ حیات بنانا چاہتا ہوں جو صرف نگاہوں سے اپنے دل کی باتیں کرے۔ جس کے چہرے پہ حیا کی سُرخی ہو ——

رات ایک بجے سے میں کتنا بور ہو رہا تھا۔ کبھی کتابیں پڑھ کر کبھی سگرٹ جلا کر، کبھی سو کر سفر کاٹ رہا تھا۔ اب جب ارچنا کمپارٹمنٹ میں آگئی ہے۔ وقت کتنی تیزی سے گزرتا جا رہا ہے۔ اُسے دیکھ کر میں اپنے تصوّرات کی دُنیا میں کھو گیا ہوں۔ ہر پل یہی سوچ رہا ہوں۔ ارچنا کب مجھ سے بے تکلف ہوگی۔ مُسکرا مُسکرا کر میٹھی میٹھی شیریں باتیں کرے گی۔ جن سے پھول جھڑیں گے۔ اِس کی آواز کتنی سُریلی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے بچّوں کی طرح دُور بھاگتے ہوئے مور کو دیکھ کر بول پڑی تھی۔ "ممی ممی دیکھو! وہ کتنا سُندر مور ہے!" اور اُس کی ممی ناول پڑھتے ہوئے ہی بول پڑی تھی، "ہاں، ہاں! دیکھ رہی ہوں بیٹی!" میں نے دُور بہت دُور بھاگتے ہوئے مور کو دیکھا تھا۔ پھر میری نگاہیں ارچنا کی طرف لوٹ آئی تھیں۔ میں دونوں کے حُسن کا موازنہ کرنے لگا تھا۔ وہ خود بھی ایک مورنی تھی۔ ہر خوبصورت انسان کو دوسری خوبصورت چیز پسند ہوتی ہے۔ میں سوچنے لگا اِس خوبصورت لڑکی کی پسند کتنی حسین ہے! یہ جو سوئٹر بُن رہی اُس کا رنگ کتنا پیارا ہے۔ ہلکا فاسائی۔ جو مجھے سارے رنگوں سے زیادہ پسند ہے۔ اِن چند گھنٹوں میں ارچنا مجھے کسقدر بھا گئی ہے۔ مجھے اس میں شانو کا روپ نظر آتا ہے۔ وہی خاموشی، وہی سنجیدگی، وہی مُسکراہٹ ہے! کتنی مشابہت ہے دونوں میں! اِس کے بھی رخساروں پر خوبصورت گڑھے پڑتے ہیں۔ اِس کی بھی نگاہیں باتیں کرتی ہیں میں آنکھیں جھپکائے بغیر ارچنا کو دیکھے جا رہا ہوں۔ میں سوچنے لگا ہوں۔ کاش کچھ دن پہلے ارچنا سے ملاقات ہو گئی ہوتی۔ اب جب میرے پاپا بمبئی میں میری شادی طے کر چکے ہیں اور لڑکی دکھانے کے لئے مجھے بمبئی بلا رہے ہیں، میں کیوں کسی پرائی لڑکی کو دیکھوں؟ کاش! ارچنا مجھے پہلے مل گئی ہوتی! میں اِس کے سامنے اپنے پیار کی جھولی پھیلا دیتا اور اُس سے ہاتھ جوڑ کر کہتا، "ارچنا مجھے تمہاری ایک ہلکی سی مُسکراہٹ چاہیے۔ مجھے اپنے پاؤں تلے کی خاک کو پیشانی پہ ملنے کا موقع دے دو! اُس کے لئے میں اپنا سب کچھ قربان کر دیتا۔"

ٹرین ایک بڑے سے سرنگ کو پار کرنے لگی ہے۔ کمپارٹمنٹ کی بتیاں روشن ہو گئی ہیں۔ بجلی کی روشنی میں ارچنا کا چہرہ چمک اُٹھا ہے۔ اِس کے چہرے میں کتنی جاذبیت ہے۔ اِس کی آنکھوں میں کتنی کشش ہے۔ میں ارچنا کو دیکھے جا رہا ہوں۔ میں کیوں اپنے مقدّر کو کوسنے لگا ہوں۔ شانو تو مجھے ملی نہیں، کیا اُس کی ہم شکل کوئی بھی لڑکی میرے مقدّر میں نہیں؟ گاڑی بگتپوری اسٹیشن پر جا رُکی ہے۔ میں ٹرین سے اُتر کر ریفریشمنٹ روم کی طرف جا رہا ہوں، بیرے کو

ایک پوٹ چائے لے کر سلیپر کوچ کی طرف آنے کو کہا ہے۔ پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے میں نے دیکھا ہے۔ ارچنا میری طرف گہری نظر سے دیکھ رہی ہے۔ بیرا چائے لئے کمپارٹمنٹ میں داخل ہو گیا ہے۔ میں بھی اُس کے پیچھے ڈبے میں چلا آیا ہوں۔ انجن نے سیٹی دی ہے۔ ارچنا چائے بنا رہی ہے۔ اُس نے چائے بناتے ہوئے مجھ سے پوچھا ہے، "کتنی شکر ڈالوں؟"

"صرف دو چمچ!" میں نے آہستہ سے جواب دیا ہے۔ اُس نے چائے کی پیالی میری طرف بڑھاتے ہوئے آہستہ سے کہا ہے "لیجئے، چائے پیجئے" لہجہ بہت پیارا ہے۔ میں نے فارملٹی برتتے ہوئے "شکریہ" کہا ہے۔ اُس کے ہاتھوں میں بھی چائے کی پیالی ہے۔ کتنے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہی ہے۔ ذرا بھی مُنہ سے آواز نہیں نکلتی۔ کتنی شائستہ لڑکی ہے۔ اسے کتنی اچھی تعلیم ملی ہے۔ بیرا نے بل میری طرف بڑھا دیا ہے۔ میں بل ادا کرنے لگا ہوں۔ ارچنا کی ممی نے کہا ہے، "بیٹا! تم عمر میں مجھ سے چھوٹے ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم پیسے دو؟" ارچنا کہہ رہی ہے "ہاں! ہاں! ممی ٹھیک کہتی ہیں۔ آپ مان جائیے" میں مجبور ہو گیا ہوں۔ بیرا پیسے لے کر دوسری طرف چلا گیا ہے۔ ارچنا نے کچھ فلمی پرچے میری طرف بڑھا دئے ہیں۔ میں اُنہیں دیکھنے لگا ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ سوچنے لگا ہوں۔ کتنی نیک اور سلیقہ مند لڑکی ہے۔ میرے مقدر میں ایسی لڑکی کہاں ہو سکتی ہے۔ میرے پاپا نے بمبئی میں میرے لئے روپے اور جہیز کے لالچ میں آ کر ضرور کوئی ایک آنکھ کی کانی، نہایت ہی بدصورت لڑکی ٹھیک کی ہوگی۔ اور مجھے یونہی تشفی کے لئے خط میں لکھ دیا ہے، "سیٹھ دوندر لال جی کی اکلوتی بی۔ اے پاس سندر لڑکی سے تمہاری شادی طے کر دی ہے۔ پارٹی بہت بڑی ہے۔ لاکھ روپیوں سے اوپر شادی میں خرچ کرنے کو تیار ہیں۔ تم فوراً لڑکی دیکھنے چلے آؤ!" اب میں اُن سے صاف صاف کہہ دوں گا۔ مجھے کسی سیٹھ ویٹھ کی بدصورت لڑکی سے شادی نہیں کرنی ہے۔ روپیوں کا مجھے لالچ نہیں ہے۔ مجھے تو صرف لڑکی چاہئے ایک خوبصورت، سلیقہ مند، شائستہ لڑکی! میں اُن سے کہہ دوں گا۔ مجھے پہلے لڑکی دکھائیے اُس سے باتیں کرنے اور اُسے سمجھنے کا مجھے موقع دیجئے۔ اِس کے بعد ہی میں شادی کے سلسلے میں کوئی فیصلہ کروں گا۔ میں کوئی گنوار دیہاتی اَن پڑھ نہیں ہوں کہ آپ مجھے جس کے ساتھ چاہئے باندھ دیجئے۔ شادی کوئی مذاق نہیں ہے۔ کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ یہ تو دو دلوں کا سودا ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا جب لڑکے خود کو باپ ماں کی مرضی پر چھوڑ دیا کرتے تھے۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب ہم ایک نئے دور سے گزر رہے ہیں۔ جنہوں نے شادی کو بھی بزنس سمجھ رکھا ہے۔ یہ اُن کی بڑی بھول ہے۔

ٹرین کلیان اسٹیشن پر پہنچ گئی ہے۔ بہت سارے مسافر سلیپر کوچ میں چلے آئے ہیں۔ کافی بھیڑ ہو گئی ہے۔ بمبئی یہاں سے بہت نزدیک ہے۔ بہت سے لوگ ہر روز یہاں سے کام کرنے بمبئی جاتے ہیں اور شام تک لوٹ آتے ہیں۔ یہ بھی اچھی جگہ ہے۔ میں ریل سے اُن کے دونوں طرف کھڑکی کا اونچی اونچی عمارتوں کو دیکھنے لگا ہوں۔ اِن عمارتوں کے گرد میں کافی چہل پہل ہے۔ برقی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ عجیب سی زندگی نظر آتی ہے۔ کتنے لوگ ایک ساتھ رہتے ہیں۔ نہ کوئی چین ہے نہ سکون۔ آدمی مشین ہو گیا ہے۔ کتنا بے ہنگم ہے بڑے شہروں کا کاروبار۔ وہاں نہ کوئی کسی کا ہمدم ہے نہ دوست۔ سب کو اپنے غرض سے مطلب ہے۔ کسی کو دوسرے کے بارے میں سوچنے کی بھی فرصت نہیں۔ سب کو ایک ہی فکر ہے۔ پیسہ کماؤ، پیسہ! پیسہ کے سوا اب زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہا۔ بس پیسہ ہی سب کچھ ہو گیا ہے۔ ارچنا کی نظریں کھڑکی سے باہر کی طرف ہیں وہ جیسے بھاگتی ہوئی اِن عمارتوں کو دیکھ رہی ہے، جن میں شور و غل ہے، ہنگامہ ہے۔

ٹرین تھانہ اسٹیشن پر آ رکی ہے۔ میں کافی ہمت کر کے ارچنا سے پوچھ بیٹھا ہوں۔

"آپ بمبئی میں کہاں جائیے گا؟"

"مہالکچھمی"

"آپ بمبئی میں پڑھتی ہیں؟"

"جی نہیں"

"کہاں پڑھتی ہیں؟"

"کہیں نہیں۔ بی۔ اے کر چکی ہوں اب آگے پڑھنے کا ارادہ نہیں ہے"

"بمبئی میں آپ کے کون رہتے ہیں؟"

"بابو جی"

"وہ کیا کرتے ہیں؟"

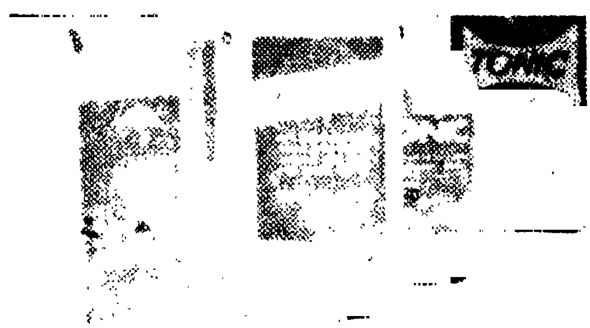
"اُن کا کپڑے کا بزنس ہے"

"اُن کا کیا نام ہے؟"

"دوندر لال"

یہ نام میرے دل میں کچھ کھٹکا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ

نام پہلے بھی سُن چکا ہوں۔ پاپا نے اپنے خط میں اِسی نام کے کسی آدمی کا ذکر کیا ہے۔ گاڑی کسی اسٹیشن چھوڑ کر آگے بڑھتی جاتی ہے۔ سربفلک عمارتیں دوڑتی ہوئی معلوم ہو رہی ہیں۔ جوں جوں ٹرین بمبئی اسٹیشن سے قریب ہوتی جاتی ہے۔ میرے دل میں ایک کسک سی ہونے لگی ہے۔ میں اُداس ہو گیا ہوں۔ ارچنا نے خاموش نظروں سے ایک بار پھر میری طرف دیکھا ہے۔ اُس کے چہرے پر اُداسی کی ہلکی سی جھلک دکھائی دے رہی ہے۔ سلیپر کوچ کے سارے مسافر اپنا سامان درست کرنے لگے ہیں۔ ہلچل کی ایک لہر سارے کمپارٹمنٹ میں دوڑ رہی ہے۔ میں بھی اپنا ہولڈال باندھ چکا ہوں۔ گاڑی وی۔ ٹی اسٹیشن پہ پہنچ گئی ہے۔ اُداس نظروں سے آخری بار ارچنا کی طرف دیکھتے ہوئے میں قلی کی تلاش میں پلیٹ فارم پر آ گیا ہوں۔ میرے پاپا مجھے لینے آئے ہیں۔ ارچنا اپنی ممی کے ساتھ کمپارٹمنٹ سے باہر نکل آئی ہے۔ ایک ادھیڑ عمر کے سیٹھ جی انہیں لینے آتے ہیں۔ ارچنا اُن کے پیر چھو رہی ہے۔ اُس کی نظر میرے پاپا پر پڑ گئی ہے۔ "جے رام جی کی، دونندرلال جی" کہہ کر میرے پاپا اُن کے گلے مل گئے ہیں۔ ارچنا میرے پاپا کے بھی پیر چھو رہی ہے۔ پاپا نے آہستہ سے مجھ سے کہا ہے، "یہی ہے دونندرلال جی کی بیٹی ارچنا۔ جس سے میں تیرا بیاہ کر رہا ہوں۔" یہ سُن کر میرے دل میں گدگدی سی ہونے لگی ہے۔ کانوں میں شہنائی کی آواز گونجنے لگی۔ ارچنا جیسی جیون ساتھی پا کر میں اپنے مقدر پر ناز کرنے لگا۔ میری شانو ایک نئے رُوپ میں مجھے مِل گئی ہے! اُس کا یہ نیا رُوپ کتنا پیارا ہے!









شان وشوکت کا صحیح روپ....
باثر شخصیت کیلئے
کیپیتان سٹرٹنگ اور واڈرین سوٹنگ
باںبے ڈائنگ
TERENE
کیپیتان شرٹنگ واڈرین سوٹنگ

غزل

ضیاؔ فتح آبادی ایم۔ اے

بے وفا کہیے مجھے یا باوفا کہیے مجھے
اپنے ہی در کا گدائے بے نوا کہیے مجھے

ڈال دیجے قفلِ رُعبِ حسُن کا لب پر مرے
پھر بھری محفل میں سازِ بے صدا کہیے مجھے

ظلم سہتا ہوں مگر شکوہ شکایت کچھ نہیں
پاسبانِ غم، نگہدارِ وفا کہیے مجھے

آپ کا سودائی کہتا ہے مجھے سارا جہاں
آپ سے اب کیا کہوں میں آپ کیا کہیے مجھے

موجِ طوفاں میں ڈبو کر اُس کو پاؤں گا سکوں
کشتیِ عمرِ رواں کا ناخدا کہیے مجھے

جانے کوئی رام کب آ کر مجھے بھی دے نجات
ٹھوکروں میں ایک پتھر راہ کا کہیے مجھے

ظلمتوں کا نام تک باقی نہ ہوگا اُس کے بعد
راستہ بن کر ہی ذرا اپنا ضیاؔ کہیے مجھے

غزل

دلؔ ایوبی ٹونکی بی۔ اے (علیگ)

مُدّت ہوئی وہ ربطِ دل و جاں بھی نہیں ہے
اِس دور میں جینا کوئی آساں بھی نہیں ہے

غمخوار نہ دیں طعنۂ کوتاہیِ داماں
تقدیرِ جنوں اب تو گریباں بھی نہیں ہے

حالات کے تپتے ہوئے صحرا میں کھڑا ہوں
ایسے میں تری زُلفِ پریشاں بھی نہیں ہے

ہر چند کہ آباد ہے دُنیائے تصوّر
پہلو میں ہمارے دلِ ویراں بھی نہیں ہے

تم طول دیئے جاتے ہو جتنا شبِ غم کو
اتنا تو مجھے وصل کا ارماں بھی نہیں ہے

کیوں ہاتھ اُٹھاتے ہو مری چارہ گری سے
کیا ہے جو مرے درد کا درماں بھی نہیں ہے

محفوظ تو اب بھی نہیں اے دلؔ کہ چمن میں
صیّاد نہیں ہے تو نگہباں بھی نہیں ہے

ماضی کے سمن زاروں میں

—— پروفیسر اقبال حسین ایم۔ اے (علیگ)

۳۵۔ رانا پرتاپ ہوسٹل۔ ریجنل کالج آف ایجوکیشن۔ اجمیر شریف (راجستھان)

مکرم و محترم جناب خوشتر گرامی صاحب! آداب

ایک تازہ ترین تخلیق لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ شاید یہ راجستھان کی جان لیوا گرمی کا اُبال ہے۔ پسند آئے تو "بیسویں صدی" کی بزم میں شریک کر لیجیے گا۔ سچ آپ کا اصول ہے۔ اِس کی مثال ابھی لکھنؤ والا واقعہ ہے۔ خدا آپ کو نظرِ بد سے بچائے۔ آمین . . .

خادم —— اقبال

★

آج اچانک یہ کیا ہو گیا، یکایک دیرینہ یادوں نے گھیر لیا۔

—— اُس وقت تم میرے پاس ہی تو کھڑی تھیں۔ سُرخ ریشمی کُرتے اور چوڑی دار پاجامے میں تم دُلہن معلوم ہو رہی تھیں۔ تمہارے انگ انگ سے جیسے مدہوش کُن خوشبو کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں۔ تمہاری آنکھوں میں تیرتی ہوئی نشہ بیز لکیریں، تمہارے پتلے گلابی ہونٹوں پر شرمیلا تبسم، گلابی پیروں میں نقرئی چپلیں اور گلابی رخساروں کو چومتی ہوئی ریشمیں بالوں کی آوارہ لٹیں۔ صندلی کلائی میں کھنکتی ہوئی خوبصورت چوڑیاں —— میں تو مدہوش ہونے لگا تھا۔ حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ اِتنے دنوں بعد اچانک تمہیں دیکھ کر میرا جی چاہا تھا تمہارے بہکتے قدموں کی مستی اپنی رفتار میں سمو لوں۔ تمہارے جسموں سے پھوٹتی ہوئی مہک اپنے دل میں بسا لوں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں تمہارے رُوپ سے ڈر گیا تھا۔ ایک انجانا خوف، ایک نامعلوم سا احساس مجھے جکڑ رہا تھا۔ ایک عجیب سا مایوس کُن احساس میرے دل میں چبھن پیدا کر رہا تھا۔ کاش تم آج نہ ملی ہوتیں؟ کتنا اچھا ہوتا اگر تم اِس وقت نہ آئی ہوتیں۔ لیکن یہ سب کچھ میرے بس میں نہ تھا۔ میری زبان بند تھی۔ میرے ہونٹ جیسے سِل گئے تھے۔ ایک ایک بات اب تک میرے ذہن میں ہے۔ تمہاری نظروں کی بیتابی کو میں نے دیکھا اور ششدر رہ گیا۔ پھر بجلی کی سُرعت سے تم نے نظریں بچالی تھیں۔

پھر اچانک کالج کا وہ دن یاد آگیا، جب پہلی بار تمہیں دیکھا تھا اور دل میں نامعلوم سی لہر دوڑ گئی تھی۔ تمہارے حسین خدوخال کو دیکھ کر میں دم بخود رہ گیا تھا۔ تمہاری کافر ادائیں، تمہاری گفتگو کا انداز شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ میں خاص طور سے تمہارے اندازِ گفتار سے بہت متاثر ہوا تھا۔ ویسے تو کالج میں سبھی تمہارے حُسن و رعنائی کے گرویدہ تھے۔ تمہاری انہیں باتوں نے مجھے تمہارے بہت قریب کر دیا تھا۔ دل میں اُٹھنے والی میٹھی سی لہر نے مستقل جگہ بنا لی تھی۔ کیونکہ دل کی آواز کو کبھی چھپایا نہیں جا سکتا اور اس طرح ہم ایک دوسرے سے قریب آگئے۔

اچانک ایک دن تم آئیں اور کہنے لگیں "کالج میں لوگ نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں، میرے اور آپ کے بارے میں"۔ جب میرا ماتھا ٹھنکا تھا اور میں نے بہت سنجیدگی سے تمہیں سماج کی پیچیدگیاں سمجھائی تھیں اور باتوں ہی باتوں میں تمہیں بتایا تھا کہ



bajaj
pressure cooker
IS-2347
ISI
زندگی بھر حاصل خوشیاں تب ہوں بجاج ساز و سامان گھر میں جب ہو
—اب ہر چیز زیادہ سلیقہ مندی سے!
باورچی خانہ میں زیادہ سلیقہ مندی اور تیزی میں اگر آپ کو دلچسپی ہے تو آپ کو
بجاج الیکٹریکلس لمیٹڈ
۴۵-۴۷ ویر نریمان روڈ، بمبئی ۲۰۰۰۰۱
شاخیں - بھارت بھر میں سب جگہ

ماضی کے سمن زاروں میں

پروفیسر اقبال حسین ایم۔ اے (علیگ)
۳۵۔ رانا پرتاپ ہوسٹل۔ ریجنل کالج آف ایجوکیشن۔ اجمیر شریف (راجستھان)

مکرم و محترم جناب خوشتر گرامی صاحب! آداب

ایک تازہ ترین تخلیق لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ شاید یہ راجستھان کی جان لیوا گرمی کا اُبال ہے۔ پسند آئے تو "بیسویں صدی" کی بزم میں شریک کر لیجئے گا۔ سچ آپ کا اصول ہے۔ اس کی مثال ابھی لکھنؤ والا واقعہ ہے۔ خدا آپ کو نظرِ بد سے بچائے۔ آمین . . .

خادم ——— اقبال

★

آج اچانک یہ کیا ہو گیا، یکایک دیرینہ یادوں نے گھیر لیا۔ ——— اُس وقت تم میرے پاس ہی تو کھڑی تھیں۔ سُرخ ریشمی کُرتے اور چوڑی دار پاجامے میں تم دُلہن معلوم ہو رہی تھیں۔ تمہارے انگ انگ سے جیسے مدہوش کُن خوشبو کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں۔ تمہاری آنکھوں میں تیرتی ہوئی نشہ بیز لکیریں، تمہارے پتلے گلابی ہونٹوں پر شرمیلا تبسم۔ گلابی پیروں میں نقرئی چپلیں اور گلابی رخساروں کو چومتی ہوئی ریشمیں بالوں کی آوارہ لٹیں۔ صندلی کلائی میں کھنکتی ہوئی خوبصورت چوڑیاں ——— میں تو مدہوش ہونے لگا تھا۔ حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ اتنے دنوں بعد اچانک تمہیں دیکھ کر میرا جی چاہا تھا تمہارے بہکتے قدموں کی مستی اپنی رفتار میں سمو لوں۔ تمہارے جسموں سے پھوٹتی ہوئی مہک اپنے دل میں بسا لوں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں تمہارے رُوپ سے ڈر گیا تھا۔ ایک انجانا خوف، ایک نامعلوم سا احساس مجھے جکڑ رہا تھا۔ ایک عجیب سا مایوس کُن احساس میرے دل میں چُبھن پیدا کر رہا تھا۔ کاش تم آج نہ ملی ہوتیں؟ کتنا اچھا ہوتا اگر تم اِس وقت نہ آئی ہوتیں۔ لیکن یہ سب کچھ میرے بس میں نہ تھا میری زبان بند تھی۔ میرے ہونٹ جیسے سِل گئے تھے۔ ایک ایک بات اب تک میرے ذہن میں ہے۔ تمہاری نظروں کی بیتابی کو میں نے دیکھا اور ششدر رہ گیا۔ پھر بجلی کی سُرعت سے تم نے نظریں بچالی تھیں۔

پھر اچانک کالج کا وہ دن یاد آگیا، جب پہلی بار تمہیں دیکھا تھا اور دل میں نامعلوم سی لہر دوڑ گئی تھی۔ تمہارے حسین خد و خال کو دیکھ کر میں دم بخود رہ گیا تھا۔ تمہاری کافرادائیں، تمہاری گفتگو کا انداز شاید ہی کہیں اور مل سکے! میں خاص طور سے تمہارے اندازِ گفتار سے بہت متاثر ہوا تھا۔ ویسے تو کالج میں سبھی تمہارے حُسن و رعنائی کے گرویدہ تھے۔ تمہاری انھیں باتوں نے مجھے تمہارے بہت قریب کر دیا تھا۔ دل میں اُٹھنے والی میٹھی سی لہر نے مستقل جگہ بنالی تھی۔ کیونکہ دل کی آواز کو کبھی چھپایا نہیں جا سکتا اور اس طرح ہم ایک دوسرے سے قریب آگئے۔

اچانک ایک دن تم آئیں اور کہنے لگیں "کالج میں لوگ نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں، میرے اور آپ کے بارے میں۔ جب میرا ماتھا ٹھنکا تھا اور میں نے بہت سنجیدگی سے تمہیں سماج کی پیچیدگیاں سمجھائی تھیں اور باتوں ہی باتوں میں تمہیں بتایا تھا کہ

تم اِس [illegible] میں کیسے رہوگی۔ یہ دُنیا ہے جہاں یونہی لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ اِس بے رحم سماج میں لوگ شاید یہی دیکھتے رہتے ہیں جیسے اُنھیں اور کوئی کام ہی نہ ہو۔ یہ آغاز تھا تمھاری اور میری قربت کا۔ مجھے خود نہیں معلوم کہ میں تمھارے اِتنے قریب کیسے آگیا! اِتنا قریب کہ تمھارا نام سُننے سے میرا دل دھڑکنے لگتا ہے اور میں سوچنے لگتا ہوں آخر یہ رات کیوں ہوتی ہے؟ کاش دن ہی رہتا اور کالج کبھی بند نہ ہوتا! لیکن یہ خاموش محبت تھی اور اندر ہی اندر میں کُھل رہا تھا۔ سوچ رہا تھا اِس طرح کتنے محبت کرنے والے بے رحم سماج کے ہاتھوں برباد ہو جاتے ہوں گے۔ تمھارے چہرے کے وہ حسین خد و خال ہمیشہ میری آنکھوں میں گھومتے رہتے اور میں سوچتا کیوں نہ سب کچھ صاف صاف تمھیں بتا دوں۔

سوچتا، کاش! مجھ میں اِتنی ہمت ہوتی اور میں سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ جاتا۔ ایک دن تم اچانک آئیں، تمھارے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور ہونٹوں پر پپڑیاں جم رہی تھیں۔ اُلجھے خشک بال تمھارے ذہنی انتشار کی غمازی کر رہے تھے۔ تم بے حد اُداس تھیں۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ تم اُداس کیوں ہے؟ دل بھی کتنے نازک ہوتے ہیں۔ ذرا سی ٹھیس لگی اور آبگینے چکنا چور ہوگئے۔ وہی گِلہ آپ نے کیا، آپ تو چلے جاتے ہیں یہاں کا ماحول کتنا بُرا ہے! آپ کبھی یہ بھی سوچتے ہیں کہ میرے اُوپر کیا گزرتی ہے؟ میں نے بہت سمجھایا، بہت سی باتیں کہیں۔ لیکن دل کی آواز اندر ہی رہی اور میں کچھ کہتے کہتے رہ گیا۔ اُنھیں دِنوں ایک لفافہ مجھے تمھارے نام سے مِلا۔ میں نے پڑھا اور سوچنے لگا آخر یہ کس نے لکھا ہے۔ بہت ہمت کرکے کئی مہینہ بعد تم سے اِس کا ذکر میں نے کیا۔ مجھے آج تک وہ سُہانی شام یاد ہے جب لفافہ لینے کے بعد تم دُور سے دیکھ کر مُسکرائی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ طویل خاموشی کے بعد سمندر میں طوفان آگیا ہو اور پت جھڑ کی جگہ بہار نے لے لی ہو۔ میں نے کئی بار محسوس کیا کہ دل پر کچھ بوجھ ہے۔ سوچتا رہتا آخر کب یہ بوجھ ہلکا ہوگا؟ لیکن جب تمھیں دیکھتا تو محسوس ہوتا وہی بوجھ شاید تمھارے سینے میں بھی رہا ہے اور میں یہی دیکھ کر

خاموش رہ جاتا۔ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے منصوبے بناتا رہتا اور پھر منصوبہ ختم ہوجاتا اور بات وہیں کی وہیں رہ جاتی۔ دل کی چبھن، دل کا بوجھ ہلکا نہ ہو پاتا۔ جس طرح سمندر کے ساحل میں لپٹ کر موجیں بے ننگ و نام ہوجاتی ہیں، میں نے بھی خود کو تم میں کھو دیا تھا۔ بے حقیقت بنا لیا تھا۔ اب میرا اپنا کوئی وجود نہ تھا۔ سب کچھ تمھیں تھیں۔ اب میں بالکل بدل گیا تھا۔ میں اپنا زیادہ وقت کالج میں گزارنے لگا۔ مجھے اب اپنے دوستوں کے ساتھ رہ کر بہت سکون ملتا۔ اس سے پہلے اُن کی باتیں مجھے ذرا بھی نہ بھاتی تھیں۔ مجھے شاید تمھاری اُس کم ہمتی سے چڑ تھی۔ میرے دل پر بے رحم وقت نے ایک پتھر رکھ دیا تھا اور دل میں اُٹھنے والے سارے جذبات مدت سے اپنے تاریک مدفن میں پڑے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ جلد سے جلد ساری قوت لگا کر اُسے اٹھا پھینکوں اور تمھیں دکھاؤں کہ میرے جذبات تمھارے لیے کیا ہیں۔

جب میں نے تمھیں دیکھا تو تم جوانی کے زینے پر قدم رکھ رہی تھیں۔ لیکن دیکھتے دیکھتے تم شباب کا چھلکتا پیمانہ بن گئیں اور میں تمھیں بے انتہا پیار کرنے لگا۔ روز بروز تمھارے قریب ہوتا گیا۔ میں جب کبھی تمھیں دیکھتا مجھے احساس ہوتا جیسے تمھارا شباب چمن میں جھومتا لہلہاتا پودا ہے۔ میرا دل ہمیشہ چاہتا ہے، اس پودے کے پاس بیٹھ کر اُس کی خوبصورت پتیوں کو دیکھتا رہوں۔ ہم دونوں پیار کی دنیا میں ڈوبتے رہیں۔ ایک دن اچانک تم میری وجہ سے بدنام ہوگئیں۔ اُس اچانک حادثے سے تم بے حد متاثر ہوئیں۔ تمھارا پھول سا چہرہ مرجھا گیا۔ چمن میں لہلہاتا شاداب پودا سوکھنے لگا، پتیاں مرجھانے لگیں۔ اُس کی وہ شوخی اور اُمنگ ختم ہوگئی جسے دیکھ کر میں ہمیشہ سرور پاتا تھا۔ میں نے سوچا اِس پودے کی شادابی کم نہ ہونے دوں گا، چاہے مجھے اپنے خون ہی سے اُسے کیوں نہ سینچنا پڑے۔ اُس کے بعد ایک دن کالج چھوٹ گیا۔ کالج چھوٹنے کے بعد محبت بھری ملاقاتیں بھی چھوٹنے لگی تھیں۔ اب ملاقات کے حسین لمحے کبھی ہی کبھی ملتے۔ تمھاری آواز جو ہمیشہ میرے کانوں میں رس گھولتی رہتی تھی، سُننے کو ترس گیا۔ اب ایک طرف فراغت تھی اور دوسری طرف زندگی کی مصروف اُلجھنیں۔ درمیان میں محبت تھی، مختصر ہوتے ہوتے بھی بوجھل تھی۔ تمھاری حسین یادیں کب تک ساتھ دیتیں۔ ایک دن میں نے اپنی تمناؤں کا گلا اپنے ہاتھ سے گھونٹ کر اپنی بھوکی ننگی زندگی کو سنبھالنے کی جسارت کر ڈالی۔ فضا غیر رُومانی تھی۔ پیشہ غیر رُومانی تھا۔ لیکن چھوٹی سی دُنیا کی حقیقتیں ضرور پوری ہوسکتی تھیں۔ ایک زمانہ مر گیا اور ایک خیال کمزور پڑ گیا۔ ایک زمانہ زندہ ہوگیا۔ اور ایک خیال مضبوط ہوگیا۔ محبت قائم رہی، ملاقاتیں کم ہوگئیں، خیال قائم رہے اور تخیلی دُنیا کا لبادہ اُتار کر جب میں نے دیکھا تو میں ایک معمولی کلرک تھا، جس سے اپنی ذات بھی نفرت کرتی ہے اور وہ اُسے بھی مطمئن نہیں کرسکتا!

انسان اور محبت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کبھی کبھی مل بیٹھنے کی تڑپ جاگ ہی پڑتی۔ کلرک اور محبت میں فطری بغض ہے۔ نہ ملنے کے بہانے مل ہی جاتے۔ ایک عرصہ کے بعد ایک دن اچانک ملاقات ہوگئی۔ لان کی وہی سرسبز گھاس جس نے ہماری محبت کو پروان چڑھتے دیکھا تھا۔ وہی پودے، وہی پھول، وہی پتیاں جو کئی بار مرجھا کر محبت کی کہانی سُننے کے لئے جوان ہوئی تھیں۔ میں خوش تھا۔ کیونکہ میں اپنی ویران چاہت کو دیکھ رہا تھا اور ایک عام زندگی کا سارا فلسفہ لوہے کی ترازو پر تول رہا تھا۔ کلرک کی بھی کوئی محبت ہوتی ہے، کوئی زندگی ہوتی ہے۔ نہ دولت نہ زندگی کے وہ عیش و آرام۔ لیکن کشمکش ہی کا نام زندگی ہے۔ کشمکش ہی کا دوسرا نام کلرکی ہے۔ ابتدا تمھاری نظروں میں بدصورت سہی، لیکن انتہا خوبصورت ہوسکتی ہے۔ کون جانتا ہے، کل میں تمھارے خوابوں کا نور بن جاؤں۔ آؤ آج اس غیر رُومانی حقیقت کو رُومان کی ابدی سانسوں سے شگفتہ کر ڈالیں۔ دیکھو اِس رات کی پریشان زُلفیں اور دیکھو ذرا اپنی نظریں گھما کر اپنا بیتا زمانہ! نیلگوں وسعتوں میں بے شمار ستاروں کی طرف دیکھو۔ آج کے اِن چند لمحوں میں ٹمٹماتے ستارے بھی ہماری محبت کی داستان میں شریک ہیں۔ جانتی ہو کیوں؟ کیوں کہ محبت کا تعلق رُوح سے ہے۔ انسان کی امیری اور غریبی سے نہیں۔ دولت اور امارت سے نہیں۔ محبت تو

تم اِس بے [illegible] میں کیسے رہو گی۔ یہ دُنیا ہے جہاں یونہی لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ اِس بے رحم سماج میں لوگ شاید یہی دیکھتے رہتے ہیں۔ جیسے انھیں اور کوئی کام ہی نہ ہو۔ یہ آغاز تھا تمھاری اور میری قربت کا۔ مجھے خود نہیں معلوم کہ میں تمھارے اِتنے قریب کیسے آگیا! اِتنا قریب کہ تمھارا نام سُننے سے میرا دل دھڑکنے لگتا ہے اور میں سوچنے لگتا ہوں آخر یہ رات کیوں ہوتی ہے؟ کاش دن ہی رہتا اور کالج کبھی بند نہ ہوتا! لیکن یہ خاموش محبت تھی اور اندر ہی اندر میں کُھل رہا تھا۔ سوچ رہا تھا اِس طرح کتنے محبت کرنے والے بے رحم سماج کے ہاتھوں برباد ہو جاتے ہوں گے۔ تمھارے چہرے کے وہ حسین خد و خال ہمیشہ میری آنکھوں میں گھومتے رہتے اور میں سوچتا کیوں نہ سب کچھ صاف صاف تمھیں بتا دوں۔

سوچتا، کاش! مجھ میں اِتنی ہمت ہوتی اور میں سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ جاتا۔ ایک دن تم اچانک آئیں، تمھارے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور ہونٹوں پر پپڑیاں جم رہی تھیں۔ اُلجھے خشک بال تمھارے ذہنی انتشار کی غمازی کر رہے تھے تم بے حد اُداس تھیں۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ تم لڑکیوں کے دل بھی کتنے نازک ہوتے ہیں۔ ذرا سی ٹھیس لگی اور آبگینے چور چور ہو گئے۔ وہی گلہ آپ نے کیا، آپ تو چلے جاتے ہیں۔ یہاں کا ماحول کتنا بُرا ہے! آپ کبھی یہ بھی سوچتے ہیں کہ میرے اُوپر کیا بیتتی ہے؟ میں نے بہت سمجھایا، بہت سی باتیں کہیں۔ لیکن دل کی آواز اندر ہی رہی اور میں کچھ کہتے کہتے رہ گیا۔ انھیں دِنوں ایک لفافہ مجھے تمھارے نام سے مِلا۔ میں نے پڑھا اور سوچنے لگا آخر یہ تمھیں نے لکھا ہے۔ بہت ہمت کر کے کئی مہینہ بعد تم سے اُس کا ذکر میں نے کیا۔ مجھے آج تک وہ سُہانی شام یاد ہے جب لفافہ لینے کے بعد تم دُور سے دیکھ کر مُسکرائی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ طویل خاموشی کے بعد سمندر میں طوفان آگیا ہو اور پت جھڑ کی جگہ بہار نے لے لی ہو۔ میں نے کئی بار محسوس کیا کہ دل پر کچھ بوجھ ہے۔ سوچتا رہتا آخر کب یہ بوجھ ہلکا ہوگا؟ لیکن جب تمھیں دیکھتا تو محسوس ہوتا وہی بوجھ شاید تمھارے سینے میں بھی رہا ہے اور میں یہی دیکھ کر

جا ہوش رہ جاتا۔ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے منصوبے بناتا رہتا اور پھر منصوبہ ختم ہو جاتا اور بات وہیں کی وہیں رہ جاتی۔ دل کی چبھن، دل کا بوجھ ہلکا نہ ہو پاتا۔ جس طرح سمندر کے ساحل میں لپیٹ کر موجیں بے ننگ و نام ہو جاتی ہیں، میں نے بھی خود کو تم میں سمو دیا تھا۔ بے حقیقت بنا لیا تھا۔ اب میرا اپنا کوئی وجود نہ تھا۔ سب کچھ تمھیں تھیں۔ اب میں بالکل بدل گیا تھا۔ میں اپنا زیادہ وقت کالج میں گزارنے لگا۔ مجھے اب اپنے دوستوں کے ساتھ رہ کر بہت سکون ملتا۔ اس سے پہلے اُن کی باتیں مجھے ذرا بھی نہ بھاتی تھیں۔ مجھے شاید تمھاری اُس کم ہمتی سے چڑ تھی۔ میرے دل پر بے رحم وقت نے ایک پتھر رکھ دیا تھا اور دل میں اُٹھنے والے سارے جذبات مدت سے اپنے تاریک مدفن میں پڑے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ جلد سے جلد ساری قوت لگا کر اُسے اٹھا پھینکوں اور تمھیں دکھاؤں کہ میرے جذبات تمھارے لیے کیا ہیں۔

جب میں نے تمھیں دیکھا تو تم جوانی کے زینے پر قدم رکھ رہی تھیں۔ لیکن دیکھتے دیکھتے تم شباب کا چھلکتا پیمانہ بن گئیں اور میں تمھیں بے انتہا پیار کرنے لگا۔ روز بروز تمھارے قریب ہوتا گیا۔ میں جب کبھی تمھیں دیکھتا مجھے احساس ہوتا جیسے تمھارا شباب چمن میں جھومتا لہلہاتا پودا ہے۔ میرا دل ہمیشہ چاہتا ہے، اس پودے کے پاس بیٹھ کر اُس کی خوبصورت پتیوں کو دیکھتا رہوں۔ ہم دونوں پیار کی دُنیا میں ڈوبتے رہیں۔ ایک دن اچانک تم میری وجہ سے بدنام ہو گئیں۔ اُس اچانک حادثہ سے تم بے حد متاثر ہوئیں۔ تمھارا پھول سا چہرہ مُرجھا گیا۔ چمن میں لہلہاتا شاداب پودا سوکھنے لگا، پتیاں مُرجھانے لگیں۔ اُس کی وہ شوخی اور اُمنگ ختم ہو گئی جسے دیکھ کر میں ہمیشہ سُرور پاتا تھا۔ میں نے سوچا اِس پودے کی شادابی کم نہ ہونے دوں گا، چاہے مجھے اپنے خون ہی سے اُسے کیوں نہ سینچنا پڑے۔ اُس کے بعد ایک دن کالج چھوٹ گیا۔ کالج چھوٹنے کے بعد محبت بھری ملاقاتیں بھی چھوٹنے لگی تھیں۔ اب ملاقات کے حسین لمحے کبھی ہی کبھی ملتے۔ تمھاری آواز جو ہمیشہ میرے کانوں میں رس گھولتی رہتی تھی، سُننے کو ترس گیا۔ اب ایک طرف فراغت تھی اور دوسری طرف زندگی کی مصروف اُلجھنیں۔ درمیان میں محبت تھی۔ منتشر ہوتے ہوتے بھی بوجھل تھی۔ تمھاری حسین یادیں کب تک ساتھ دیتیں۔ ایک دن میں نے اپنی تمناؤں کا گلا اپنے ہاتھ سے گھونٹ کر اپنی بھوکی ننگی زندگی کو سنبھالنے کی جسارت کر ڈالی۔ فضا غیر رُومانی تھی۔ ہمیشہ [illegible] تھا۔ لیکن مجبوری کی دنیا کی حقیقتیں ضرور نورانی ہو سکتی ہیں۔ ایک زمانہ مر گیا اور ایک خیال کمزور پڑ گیا۔ ایک زمانہ زندہ ہو گیا اور ایک خیال مضبوط ہو گیا۔ محبت قائم رہی۔ ملاقاتیں کم ہو گئیں۔ خیال قائم رہے اور تخیلی دُنیا کا لبادہ اُتار کر جب میں نے دیکھا تو میں ایک معمولی کلرک تھا، جس سے اپنی ذات بھی نفرت کرتی ہے اور وہ اُسے بھی مطمئن نہیں کر سکتا!

انسان اور محبت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کبھی کبھی ملنے بیٹھنے کی تڑپ جاگ ہی پڑتی۔ کلرک اور محبت میں فطری بُغض ہے۔ نہ ملنے کے بہانے مِل ہی جاتے۔ ایک عرصہ کے بعد ایک دن اچانک ملاقات ہو گئی۔ لان کی وہی سرسبز گھاس جس نے ہماری محبت کو پروان چڑھتے دیکھا تھا۔ وہی پودے، وہی پھول، وہی پتیاں جو کبھی بار بار مُرجھا کر محبت کی کہانی سُننے کے لئے جوان ہوئی تھیں۔ میں خوش تھا۔ کیونکہ میں اپنی ویران چاہت کو دیکھ رہا تھا اور ایک عام زندگی کا سارا فلسفہ لوہے کی ترازو پر تول رہا تھا۔ کلرک کی بھی کوئی محبت ہوتی ہے، کوئی زندگی ہوتی ہے۔ نہ دولت نہ زندگی کے وہ عیش و آرام لیکن کشمکش ہی کا نام زندگی ہے۔ کشمکش ہی کا دوسرا نام کلرکی ہے۔ ابتدا تمھاری نظروں میں بدصورت سہی، لیکن انتہا خوبصورت ہو سکتی ہے۔ کون جانتا ہے، کل میں تمھارے خوابوں کا نُور بن جاؤں۔

آؤ آج اِس غیر رُومانی حقیقت کو رُومان کی ابدی سانسوں سے شگفتہ کر ڈالیں۔ دیکھو اِس رات کی پریشان زُلفیں اور دیکھو ذرا اپنی نظریں گھما کر اپنا بیتا زمانہ! نیلگوں وسعتوں میں بے شمار ستاروں کی طرف دیکھو۔ آج کے اِن چند لمحوں میں ٹمٹماتے ستارے بھی ہماری محبت کی داستان میں شریک ہیں۔ جانتی ہو کیوں؟ کیونکہ محبت کا تعلق رُوح سے ہے۔ انسان کی امیری اور غریبی سے نہیں۔ دَولت اور امارت سے نہیں۔ محبت تو

انسان سے کی جاتی ہے۔ پیشے کی بلندیاں اور پستیاں آپس کا راستہ نہیں روکتیں —— اور اچانک میں چونک پڑا میرے خیالات کے تانے بانے ٹوٹ گئے۔ برابر سے کچھ بچے شور مچاتے ہوئے نکلے ... سوچ رہا تھا کہ اچانک تمہیں دیکھ کر کیسے کیسے خیالات آئے ... میں سب کچھ بھول کر تمہارے اور اپنے بارے میں کیا ... باندھنے لگا۔ ایسے کتنے ہی موقعے آئے۔ جب بھی تمہیں ... نہ جانے کیا سوچنے لگتا اور خیالات کی دُنیا میں کھو جاتا۔ ... جانے کتنا سکون ملتا تھا ان خیالات میں بھی۔

آج جب اچانک تمہیں دیکھا تو خیال آیا کہ ابھی کشمکش جاری ہے۔ تمہاری کامیابیوں میں بھی میری ناکامیوں کی جیت ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تمہیں عام لوگوں سے نفرت تھی، عام پیشوں سے نفرت تھی اور تم عزت، نام اور دولت کی بھوکی تھیں۔ جب بھی تم سے سامنا ہوا ہم نے ایک دوسرے سے آنکھیں چرالیں۔ میں نے تمہاری آنکھوں میں اکثر ایک تلاش دیکھی۔ ایسی تلاش جو خوبصورت جوانی میں جب بھی جاگتی ہے پریشان بھٹکتی پھرتی ہے۔ اُس کی کبھی تکمیل نہیں ہوتی۔ اُسے کبھی منزل نہیں ملتی۔

دن اس طرح گزرتے رہے۔ لیکن میں تخیلات کی دُنیا سے باہر نہ آسکا اور دل کا بوجھ ہلکا نہ کر سکا۔ لیکن آج پھر اچانک ایک عرصہ کے بعد جب تمہیں دیکھا تو دیرینہ یادیں ناسور کی طرح پھوٹ پڑیں۔ مجھے تو کئی بار کالج کی وہ سہانی صبح بھی یاد آگئی —— دل کے صفحات کا پہلا صفحہ اُسی صبح کی کرنوں سے لکھا ہے اور سینے میں اب تک درخشاں ہے۔ اُس صبح تمہارا کلاس میں آنا۔ ہانپتے ہوئے سلام کرنا۔ مسکراہٹوں کے زیرِ سایہ ایک خفیف سی شرم سے سُرخ ہو جانا۔ لیکن آج پھر میرے اور تمہارے درمیان ایک طویل فاصلہ حائل ہے۔ لیکن کیا کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ تم اُن احساسات کو ختم کر کے آؤ اور اپنی میٹھی آواز سے میرے کانوں میں رس گھول دو۔ دیکھو میری آنکھوں میں انتظار کی مایوسی نہیں۔ تمہیں حاصل کرنے کی چمک ہے۔ میرے رخساروں میں تمہیں کھو دینے کا ملال نہیں پالینے کا عزم ہے!

کبھی کبھی سوچتا ہوں تم نے سارے خواب توڑ دیئے۔ مجھے آج تک یہ احساس ہے، ایک خلش ہے کہ تمہیں نہ پاسکا۔ تمہارے سامنے اپنے دل کا بوجھ ہلکا نہ کرسکا۔ جذبات اندر ہی اندر گھٹتے رہے، باہر نہ آسکے۔

پھر بھی میں تمہیں کبھی نہ بھول سکوں گا —— تمہارے تصور کی چاندنی میری تاریک دُنیا کو روشن رکھے گی —— تنہا چاندنی راتوں میں تمہارا خیال آتا ہے تو ماضی کے سمن زاروں میں یادوں کی کلیاں مسکرانے لگتی ہیں!!

"بیسویں صدی" میں وہی مضامین شائع ہو سکتے ہیں جن کے نیچے "غیر مطبوعہ" لکھا ہو۔ بعض مضمون نگار مطبوعہ مضامین بھیج دیتے ہیں۔ یہ نہایت نامناسب اور غیر ذمہ دارانہ حرکت ہے —— ایڈیٹر

قطعات

قمر شاداب

(۱)

چاندنکاؤ، ستاروں کی ضیا بن جاؤ
بھیگی کلیاں جو کھلا دے وہ صبا بن جاؤ
قلب میں میرے رہو درد کا درماں بن کر
زخمِ دل کو جو سکوں دے وہ دوا بن جاؤ

(۲)

دل مسرت سے ہم کنار ہے آج
دشمنوں سے بھی مجھ کو پیار ہے آج
تیری نظروں کی داد حاصل ہے
میرا ہر گیت شاہکار ہے آج

(۳)

جب کبھی چاند مُسکراتا ہے
دل میں تیرا خیال آتا ہے
زِندگی گُنگنانے لگتی ہے
ہلکا ہلکا سرُور چھاتا ہے

(۴)

آنکھ سے آنکھ ملے اور کوئی بات ہوتے
مُدّتیں بیت گئیں ترکِ ملاقات ہوئے
اُسی دیوار پہ لرزاں ہے تمہارا سایہ
جس پہ صدیاں ہوئیں وہ رنگ کی برسات ہوئے

غزل

ڈاکٹر حکیم مخدوم اشرف

گم کردۂ منزل ہوں میں ایسا تو نہیں ہے
لایا ہے جہاں شوق یہ صحرا تو نہیں ہے

تو درد کی لذّت کو نہ چھین اپنے کرم سے
یہ زہر ہے اے دوست مداوا تو نہیں ہے

کچھ دور مرے ساتھ جو چلتا رہا کوئی
سچ کہئے کہیں آپ کا سایا تو نہیں ہے

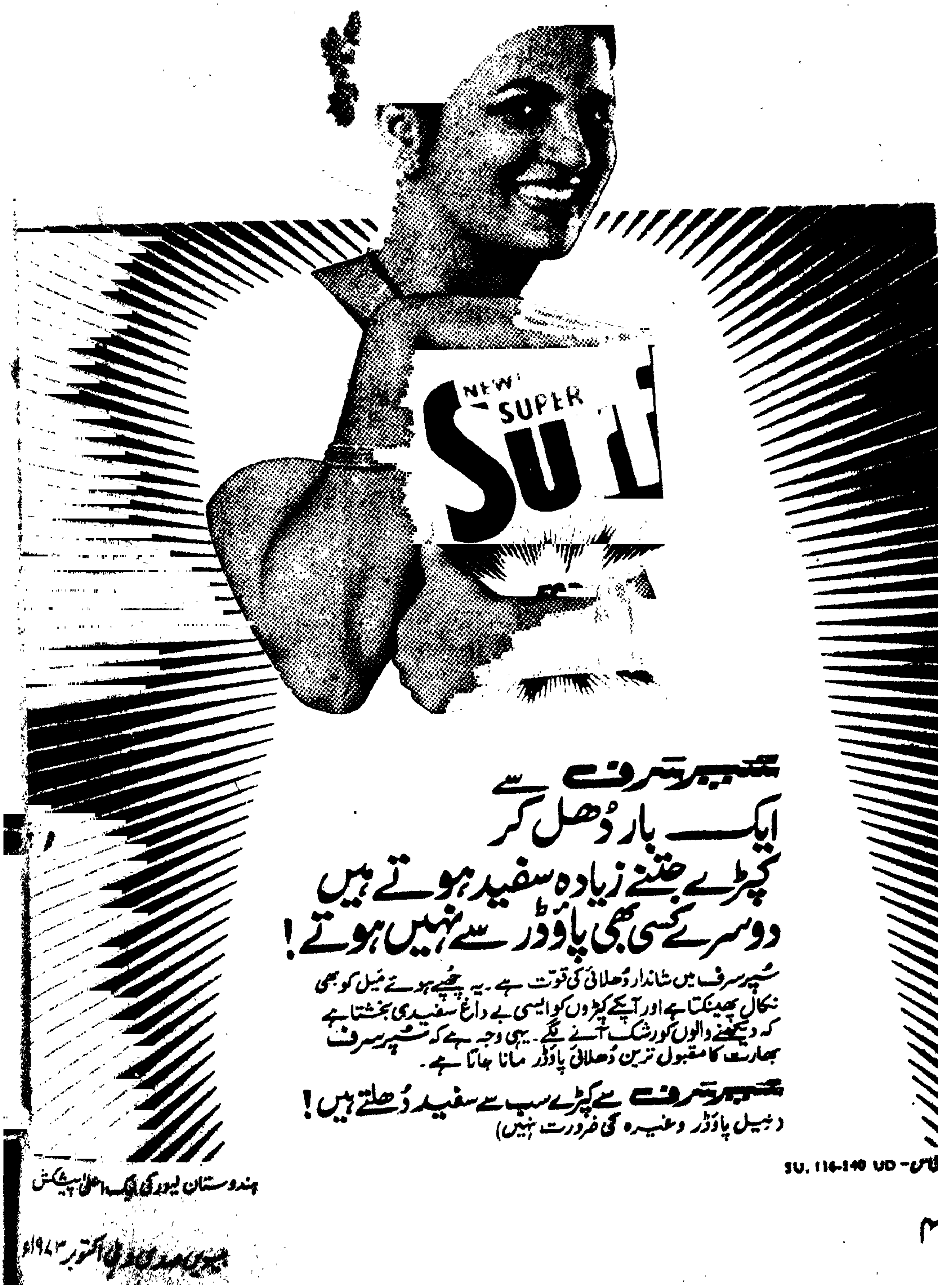
مائل بہ کرم وہ ہیں، بڑی ذرّہ نوازی
میں سوچ رہا ہوں کوئی دھوکا تو نہیں ہے

کیوں عرضِ تمنّا پہ جبیں پر ہے شکن سی
ہونٹوں پہ مرے جور کا شکوہ تو نہیں ہے

وہ دُور جو اِک دھندلی کرن سی نظر آئی
میری ہی اُمیدوں کا سہارا تو نہیں ہے

کیوں ملنے سے اُس کے مجھے ہو جاتی ہے تسکیں
قاتل ہی کہیں میرا مسیحا تو نہیں ہے

وہ پیکرِ غم گردشِ ایّام کا مارا
اشرف کو کہیں آپ نے دیکھا تو نہیں ہے


NEW SUPER Surf
سپر سرف سے
ایک بار دُھل کر
کپڑے جتنے زیادہ سفید ہوتے ہیں
دوسرے کسی بھی پاؤڈر سے نہیں ہوتے!
سپر سرف میں شاندار دُھلائی کی قوت ہے۔ یہ چھپے ہوتے میل کو بھی نکال پھینکتا ہے اور آپکے کپڑوں کو ایسی بے داغ سفیدی بخشتا ہے کہ دیکھنے والوں کو رشک آنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ سپر سرف بھارت کا مقبول ترین دُھلائی پاؤڈر مانا جاتا ہے۔
سپر سرف سے کپڑے سب سے سفید دُھلتے ہیں!
(نیل پاؤڈر وغیرہ کی ضرورت نہیں)
SU. 116-140 UD - لنٹاس
ہندوستان لیور کی ایک اعلیٰ پیشکش

کشمکش

ایس۔ ایم۔ عبّاس رضوی بی۔ اے، ایل ایل۔ بی
پوسٹ آفس مانی کلاں، ضلع جون پور (یو۔ پی)

گرامی قدر خوشتر صاحب قبلہ! احترام و خلوص
لیجئے! ایک او نفسیاتی مطالعہ۔ بسمل پٹیالوی کا ایک شعر ہے ؎

ہر طرح ہیں محبت کی مجبوریاں
اِبتدا جُرم ہے، اِنتہا جُرم ہے!

اور میں اِسی طرح کی ایک "کشمکش" لے کر حاضر ہوں —— میری پچھلی تخلیقات "عکس" اور "دائرے" کی Style اور Manner of Expression کو بلند ذوق قارئین نے بے حد سراہا ہے۔ آپ کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ دُور دراز سے "عکس" کے ترجمہ کی اجازت چاہی گئی ہے۔ لیکن سوچئے تو کہانی کی اِس مقبولیت میں "بیسویں صدی" کے فنک بوس معیار کا راز بھی تو مضمر ہے —— افسانہ نمبر دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہوگئی اور یہ بات معلوم کر کے دوہری خوشی ہوئی کہ یو۔ پی گورنمنٹ نے آپ کے خلاف قائم کئے ہوئے مقدمے کو واپس لے لیا ہے۔ دُعا ہے کہ خداوندِ عالم آپ اور "بیسویں صدی" کی قدر و منزلت، عزّ و وقار کو ہمیشہ قائم رکھے۔ آمین!

آپ کا اپنا —— ایس۔ ایم۔ عبّاس

★

"آخر تمھیں ہو کیا گیا ہے اِدھر؟"
اُس نے آہستہ سے لیکن کسی قدر رعب دار لہجے میں پوچھا اور میرا ہاتھ رکسونا، سجّے اور لکس کے ڈبے رکھتے رکھتے یکایک کانپ گیا۔
"آج پھر تم اُس سے جھگڑ پڑے؟"
ایک منٹ تک دونوں طرف خاموشی رہی، جیسے وقت کے قدم رُک گئے ہوں۔ کائنات ساکت ہو گئی ہو۔
"تم تو خود سمجھ دار ہو، اِس طرح کے برتاؤ کا بزنس پر کبھی اچھا اثر نہیں پڑ سکتا —— آئندہ خیال رکھو۔"
"... پیسہ کمانا بہت مشکل کام ہے۔ پیسہ جبھی ملتا ہے جب گاہک خوش ہوتا ہے، اور محض گاہک کی خوشی ہی کے لئے ہمیں کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔"

اُس کا لہجہ ایک دم ملائم ہو گیا ہے۔ وہ مجھے یوں سمجھا رہا ہے جیسے بات نہیں پیار کر رہا ہو۔ دراصل اُس کے بات کرنے کا انداز ہی نرالا ہے۔ وہ ایک تجربہ کار بزنس مین ہے۔ وہ کہتا ہے —— "جس طرح دُنیا کے بہت سے کام فن سے تعلق رکھتے ہیں اور فن میں مہارت رکھے بغیر لوگ اُس کے میدان میں ناکام ہو جاتے ہیں اِسی طرح بزنس بھی ایک 'کلا' ہے۔ اُس کے بھی کچھ اصول اور طریقے ہیں، جب تک اُنھیں نہ اپنایا جائے گا کوئی بھی بزنس میں خاطر خواہ ترقی

یادِ شباب

شباب مِٹ چکا یادِ شباب باقی ہے

ہے بُو شراب کی، ساغر میں اَب شراب نہیں ——— اختر شیرانی

ہائے وہ دَورِ زندگی جس کا لقب شباب تھا

کیسی لطیف نیند تھی، کیسا حسین خواب تھا ——— قدیر لکھنوی

ہر چیز پر بہار تھی ہر شے پہ حُسن تھا

دُنیا جوان تھی مرے عہدِ شباب میں ——— سیماب

سو عیب سے ہے بڑھ کے یہ پیری میں ایک عیب

کم بخت یاد آتے ہیں قصّے شباب کے ——— عبدالسلام خیال

وقتِ پیری شباب کی باتیں

ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں ——— ذوق

مرسلہ: قیصر جہاں امروہوی۔ دہلی ۶

ناممکن ہے!"

ہزارا سنگھ نے میرے سامنے اپنی زندگی کا ایک ایک ورق پلٹ دیا ——— "میرے پاس سندھ کے علاقہ میں بہت کچھ تھا۔ زمینداری، جائداد، باغات، مکان اور بہت بڑا بزنس ——— لیکن میں وہاں سے کچھ بھی نہ لا سکا۔ بس لا سکا تو یہی چند اصول جو ہر جگہ، ہر وقت میرے کام آتے رہے ہیں۔"

ہزارا کی عُمر ہوگی پینسٹھ سال۔ لیکن اِس سن و سال میں بھی اُس بوڑھے میں بلا کی ذہانت و جاذبیت ہے مُسکرانا، اور مُسکرا کر ذرا سی دیر میں غیروں کو اپنا بنا لینا جیسے اُس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو۔ باتوں کا وہ انداز جیسے مُنہ سے پھول جھڑ رہے ہوں۔ مِلنے جُلنے میں وہ نفاست، وہ شائستگی، وہ سلیقہ مندی جیسے ووکیشنل ٹریننگ کیا ہو۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ابھی چند سال پہلے ایک ہاتھ میں ربڑ کا کنگھا، دوسرے میں زیبائش کے سامان کا بکس لے کر گلی گلی گھومنے والا ہزارا آج نیو مارکیٹ ہی کا نہیں، بلکہ پُورے شہر کا مشہور جنرل مرچنٹ بن گیا ہے!

ہزارا نے جب مجھے اپنے ساتھ رکھا۔ وہ جتنی توجہ دُوکان پر دیتا تھا اُتنی ہی توجہ مجھ پر بھی دینے لگا۔ اُس نے ایک ایک بات مجھے یوں سمجھا کر بتائی جیسے کلاس میں سبق دیئے جاتے ہیں۔

"... ہمیشہ لوگوں سے ہنس کے مِلو، مُسکرا کر باتیں کرو۔ گاہکوں سے یوں مخاطب ہو جیسے عرصہ سے تمھیں اُن کی یاد آتی رہی ہے۔ پھر اُنھیں یوں بِٹھاؤ جیسے کسی عزیز، کسی دوست کا خیر مقدم کر رہے ہو۔ کبھی کسی سے ایسی بات نہ کرو جس سے ماحول میں تناؤ پیدا ہو، فضا میں ناخوشگواری آئے۔ گاہکوں کی نازیبا باتوں کو بھی ہنس کر ٹال جاؤ، ورنہ نہایت ہی سلیقہ سے بہت ہی نرم و ملائم لہجہ میں اُن کا جواب دو۔ کبھی کسی گاہک کو ناراض نہ جانے دو۔ اپنی غلطی نہ بھی ہو تو بھی معافی مانگ لینے میں نہ ہچکو، گاہک چھوٹا ہو یا بڑا سب کی عزّت کرو۔ سب کے ساتھ یوں سلوک کرو کہ ہر شخص یہ سمجھے جیسے اُس کے ساتھ تمھارے برسوں پُرانے تعلقات ہوں۔

رات نہ جانے کِتنے زینے اُتر آئی ہے۔

کائنات دبیز، سیاہ چادر کے نیچے سمٹی ہوئی ہے۔

ماحول پر سکوت طاری ہے۔

بجلی کی کمی نے ویرانی کو اور ویران بنا دیا ہے۔

فضا خاموش ہے۔ دُور تک کوئی آہٹ نہیں، کوئی آواز نہیں۔ میں نے گرمی سے پریشان ہو کر بستر پر پڑے ہوئے پنکھے کو اُٹھا لیا ہے اور آہستہ آہستہ جھلنے لگا ہوں۔

"ابھی تک تم سوئے نہیں؟"

"نہیں، سو تو رہا تھا ——— ابھی آنکھ کُھل گئی۔"

"دیر سے سونے پر آدمی دیر سے اُٹھتا ہے اور دیر سے اُٹھنے کا اثر سارے دن کے کاموں پر پڑتا ہے۔"

ہزارا سنگھ شاید میرے جاگتے رہنے کو سمجھ گیا ہے۔ وہ مجھے پھر سمجھانے لگا ہے۔

"اِسی لئے انگریزوں کے یہاں کہا گیا ہے ——— "

"جلدی سونے اور جلدی اُٹھنے سے آدمی صحت مند، دولت مند اور عقلمند بنتا ہے!"

"خیر، تم نے وہ بات نہیں بتائی۔"

"کیا؟"

"تو پھر آج اُسے ڈانٹ کیوں دیا تھا؟"
زمین نے کروٹ لی۔ در و دیوار لرز اُٹھے۔ بستر کے گرد نہ جانے کتنے شعلے اور بھڑک اُٹھے۔
ہزار اسنگھ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر پھر سو گیا ہے۔
لیکن میری آنکھوں میں نیند نہیں ہے۔

لمحہ لمحہ کا چہرہ بے نقاب ہو گیا ہے۔
ماضی کا ایک ایک ورق بکھر اُٹھا ہے۔
نہ جانے کتنی تصویروں نے مجھے گھیر لیا ہے۔
جی چاہتا ہے اپنی آنکھیں موند لوں۔ کسی طرف نظر نہ اُٹھاؤں۔
لیکن ہر لمحہ کے جیسے زبان ہو۔ ہر ورق میں جیسے بے پناہ سوز و درد ہو۔ ہر تصویر جیسے کچھ کہنے کے لئے مضطرب ہو۔

"تمھیں مجھ سے محبت ہے؟"
"ہاں" جیسے جلترنگ بج اُٹھا۔
"کتنی؟"
"بہت زیادہ!" جیسے نقرئی جام کھنک اُٹھے۔
"بے پناہ؟"
"ہاں"
"میرے مرنے پر تاج محل بنوا دو گے؟"
میں نے اس کے رسیلے نازک ہونٹوں پر انگلی رکھ دی تھی۔
کتنے چراغ جل اُٹھے تھے۔ کتنے شعلے بھڑک اُٹھے تھے۔
"سُنو!"
"کوکا کولا؟"
"نہیں"
"گولڈ اسپاٹ؟"
"نہیں"۔
"تو پھر لسّی؟"
"اس سے بھی کیا ہو سکتا ہے؟"
"تو؟"
"بس سمجھ لو!"
"کیا؟" اُس کے چہرے پر کئی رنگ آ گئے۔

"میری پیاس کے لئے کچھ اور چاہئے!"
دو منٹ کی خاموشی میں اُس نے مجھے پورا کھنگال ڈالا۔ میں مسکرا پڑا۔
"ہٹو بڑے وہ ہو تم!" اس کے صبیح رخسار شفق گوں ہو گئے۔
وہ جھینپ گئی۔ اس کا چہرہ گلنار ہو گیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے نقرئی پائل بج اُٹھی ہو۔ کہیں سرگم چھڑ گیا ہو۔ ساری کائنات رقصاں رقصاں ہو۔ ساون کی البیلی گھٹائیں جھوم کر برس پڑی ہوں اور روح کی گہرائیوں میں عجیب سی ٹھنڈک، عجیب سی لطافت سرایت کر گئی ہو۔

لیکن میں یہ سب کچھ کیوں سوچ رہا ہوں؟
یہ ڈرامہ ختم کیوں نہیں ہو جاتا۔
ماضی کی شمعیں بجھ کیوں نہیں جاتیں؟
فائدہ بھی کیا ہے آخر؟
رات کا نہ جانے کون سا پہر ہے۔
میرے بستر میں جیسے انگارے سما گئے ہوں۔
پورا وجود شعلوں کے لپیٹ میں ہو۔ میرا حلق سوکھ رہا ہے۔

انگڑائی

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا —— عزیز لکھنوی

ہر تن نازنیں کی انگڑائی
کہکشاں نے کمان لچکائی —— فراق

انگڑائی لے کر اپنا مجھ پر خمار ڈالا
کافر کی اس ادا نے بس مجھ کو مار ڈالا —— مصحفی

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ —— نظام رامپوری

عشق پر بھی چھا گئیں رعنائیاں
اُف! تری ٹوٹی ہوئی انگڑائیاں —— آرزو لکھنوی

مرسلہ: شمیم مظہری بی۔ اے لکھنؤ

میں پانی پینے کے لئے اٹھ گیا ہوں۔

"کیوں؟"

"تم پھر جاگ گئے۔ کیا نیند نہیں آتی؟ اِسی وجہ سے تم چڑچڑے ہوگئے ہو۔"

میں پھر پلنگ پر آکر لیٹ گیا ہوں۔

".. تم تو گاہکوں کے ساتھ بہت نرمی سے پیش آتے تھے۔ ہنسا ہنسا کر دوسروں کو اپنا گرویدہ بنا لینا، تمہاری یہ ادا مجھے بہت پسند تھی۔ لیکن... آج..." ہزارا سنگھ پر شاید غنودگی طاری ہوگئی۔

"ہاں یہ ناٹک ہی تو تھا، لیکن یہ ناٹک کھیلتے کھیلتے میں نہ جانے کب یہ بھول گیا کہ میرا روپ نقلی ہے، میری مُسکراہٹ بناوٹی ہے۔ میری باتیں فرضی ہیں۔ میرا خلوص زبانی ہے۔ یہ میری غلطی ہے، سنک ہے۔"

لیکن میں خاموش ہوں۔ میرے ہونٹ ساکت ہیں اور میرے وجود میں عجیب سی تلخی گھُل گئی ہے۔

"ہوڑہ سے دہرہ دون جانے والی 9 UP میل ٹرین اپنے وقت سے صرف دس منٹ لیٹ پلیٹ فارم نمبر ۴ پر آرہی ہے۔ سہسرام، مُغل سرائے، کاشی، بنارس، جون پور، فیض آباد، بارہ بنکی اور لکھنؤ جانے والے پسنجر اپنا سامان لے کر پلیٹ فارم نمبر ۴ پر پہنچ جائیں۔"

گیا اسٹیشن کی اناؤنسر کی سُریلی آواز میرے کانوں سے تین بار ٹکرا چکی۔ لیکن میں ایک دوسرے پر گرتی ہوئی لمبی قطار کو دیکھتا رہ گیا۔

"اُف! یہ بھیڑ!"

"کیوں آپ کو ٹکٹ چاہیئے؟"

"ہاں"

"لایئے میں لادوں"

میں نے ایک نظر اُس پر ڈالی۔ سانولا سلونا رنگ، چھریرا بدن، لمبا قد، متناسب جسم، اُونچی پیشانی، سیاہ گھنیری زُلفیں، نازک ہونٹ، ہلکے گلابی رنگ کی ساڑی اور اسی سے میچ کرتا بلاؤز پہنے، ایک ہاتھ میں ٹافی کا خوبصورت ڈبّہ، دوسرے میں چھوٹا سا سُنہرے رنگ کا پرس سنبھالے وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔

"کیا سوچنے لگے آپ؟"

"ہوں"

"پلیٹ فارم پر ٹرین کی آمد کا شور تیز ہو رہا ہے!"

"تو جلدی کیجئے۔ پریشان نہ ہوں۔ میں آپ کو خوب جانتی ہوں"

میری آنکھیں اُس کی طرف پھیل گئیں۔ میں نے تیس روپے کے نوٹ جیوں ہی نکالے وہ اُنھیں جھپٹ کر بکنگ تک پہنچ گئی۔

"ارے کہاں جانا ہے مجھے؟" میرے ضبط کا باندھ ٹوٹ چکا تھا۔

"میں جانتی ہوں وہ..." اُس کے چہرہ پر مُسکراہٹ تھی۔ میری حیرت اور بڑھ گئی تھی۔

دو منٹ بعد ہمارے قدم تیزی سے پلیٹ فارم کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"کہاں جانا ہے آپ کو؟"

"وہیں جہاں آپ کو!"

"بات کرنے کا کیا اچھا سلیقہ سیکھا ہے آپ نے!"

"کیا ہُوا؟"

"سوچئے"

"آپ بور ہونے لگے شاید؟"

"آپ نے بات ہی ایسی شروع کی۔ آپ مجھے خوب جانتی ہیں؟"

"ہاں یہ تو اب بھی کہہ رہی ہوں۔ مجھے آپ کا نام بھی معلوم ہے "آنند جی" ہے نا؟"

"کیا... کیا..." میری آواز جیسے حلق میں پھنس گئی ہو۔

"ارے میں آپ کے جنرل اسٹورس کو بھی جانتی ہوں۔ اب تو مطمئن ہوئے آپ — اور یہ لیجئے یہ رہا چلنے کا ثبوت!"

"اوہ! تو یہ، لکھنؤ!"

"وہاں کیا کرتی ہیں آپ؟"

"کچھ بھی نہیں!" اُس کے چہرہ پر شوخ مُسکراہٹ تھی۔ جیسے کلیوں نے اپنی مُسکراہٹیں اُس کے باریک ہونٹوں پر سجا دی ہوں۔

"پھر بھی؟"

"پڑھتی ہوں"

"کہاں؟"

"بالکل آپ کے ہزارا جنرل اسٹورس کے سامنے..."

"جی۔ آئی سی" میں بیچ ہی میں بول پڑا۔ پھر ہم ایک ساتھ مسکرا پڑے۔

"میرے بارے میں تو آپ کو پوچھنے کے لئے کچھ رہ نہیں گیا۔ البتہ اپنے بارے میں کچھ بتا دیجئے" میں مسکرا رہا تھا۔

"اپنے بارے میں؟ بتا تو چکی ہوں" وہ آہستہ سے لیکن قدرے حیرت زدہ ہو کر بولی۔

"ارے اپنا نام تو آپ نے بتایا ہی نہیں!" میرے چہرے پہ ہنسی پھیل گئی۔

"اوہ! نام؟" وہ ذرا توقف سے بولی: "انیتا کہتے ہیں مجھے"

"اور کوئی بات؟" میں قدرے بے تکلف ہو گیا۔

"اور تو کوئی بات نہیں" اس کے معصوم چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ اس کے صبیح رخسار شفق گوں ہو گئے۔

ہلکی پھلکی چہلے بازیوں، مدھم مدھم قہقہوں اور شوخ مسکراہٹوں میں ہم یوں کھو گئے جیسے کوئی خواب دیکھ رہے ہوں اور یہ خواب اس وقت ٹوٹا جب ٹرین چار باغ کی سرحد کو چھونے لگی تھی۔

بہت سی باتیں ہیں۔ بہت ساری سوچیں ہیں۔ کہاں تک یاد کروں۔ کتنا سوچوں!

"تمھاری Dealing بہت Sweet ہے"

"اور تمھارا 'کوئی رعایت' کہنے والا انداز بھی تو کس بلا کا ہے"

میری زبان سے بے ساختہ نکل پڑا اور انیتا جھینپ گئی۔

یہ انیتا کی خاص ادا تھی۔ رات گئے، سناٹے میں جب وہ میری دوکان پر قدم رکھتی تو معلوم ہوتا جیسے بہار آگئی ہو۔ دور دور تک پھول ہی پھول کھل اٹھے ہوں۔ یا کہیں نزدیک مشک و عنبر کی پھوار پڑ گئی ہو۔ وہ آہستہ آہستہ ہونٹوں کو جنبش دیتی، مسکرا مسکرا کر چیزیں پسند کرتی، پھر میمو (Cash memo) پر ایک نظر ڈال کر جب وہ یہ کہتی "کوئی رعایت؟" تو معلوم ہوتا جیسے دل کے ساز پر بے شمار نغمے چھڑ گئے ہوں۔ ساون کی البیلی گھٹائیں برس پڑی ہوں، فضا کی ساری خنکی روح کی گہرائیوں میں اتر گئی ہو اور سارے دن کی تھکن دور ہو گئی ہو۔

"تم نے یہ کیا کر دیا ہے؟"

"تم نے یہ کیسی آگ سلگا دی ہے جو دن پر دن بڑھتی جا رہی ہے؟"

"یہ کیسی شمع ہے جس کی لو لمحہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی ہے؟"

"ہاں یہ محبت کے شعلے ہیں جو دہکتے ہی رہتے ہیں۔ پیار کی شمعیں تیز ہی ہوتی رہتی ہیں۔ یہ شعلے کبھی بجھتے نہیں۔ یہ شمعیں کبھی مدھم نہیں پڑتیں۔ ان کی روشنی کبھی ماند نہیں پڑتی۔ بڑے بڑے طوفانوں کے رخ پر بھی یہ ہمیشہ رنگ و نور ہی بکھیرتی رہتی ہیں" میں نے انیتا کے جواب میں کہا تھا اور اس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

"لیکن مجھے تو ڈر لگ رہا ہے"

"کیوں؟"

"کہیں میں اس پیار کی قدر نہ کر سکی۔ محبت کی امانت کو نہ سنبھال سکی تو؟" اس کا لہجہ سرد پڑ گیا۔

"برے برے خیالات نہ پیدا کرو۔ دھیرج رکھو۔ ہم مل کر محبت کی اثاث کو اٹھائیں گے۔ پیار کی شمع کو سینہ میں چھپا کر اس کی روشنی میں ہم اپنی منزل کی طرف بڑھتے ہی جائیں گے اور ہماری راہ میں دنیا کی کوئی طاقت حائل نہ ہو سکے گی!" میں نے انیتا کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ جیسے وہ پوچھ رہی ہو "یہ خواب کی باتیں ہیں یا حقیقت کی؟"

اور آج انیتا کا وہ جملہ میرے ذہن کے پردوں پہ ہتھوڑے کی طرح پڑ رہا ہے ——

"یہ خواب کی باتیں ہیں یا حقیقت کی؟"

یکایک وقت نے اپنا چہرہ یوں بدل لیا ہے کہ میں بوکھلا گیا ہوں۔ وقت کے اس نئے روپ کو دیکھنے کے لئے میری ہمت چھوٹ گئی ہے۔

"یہ کیا؟"

"یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں ـــــ" میں بیتاب ہو گیا۔

"ہاں صبر کرو!" جیسے وہ رو رہی ہو، سسکیاں بھر رہی ہو۔ پھر اُس نے سامنے پڑا ہوا قلم اُٹھا کر کاغذ کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر لکھ دیا۔

"جھجھک میں گھر گئی تھی۔ وہیں زبردستی ۔۔۔ ہو گئی۔ مجبور تھی تمھیں بتا نہ سکی!"

'زبردستی' اور 'ہو گئی' کے درمیان جگہ چھوڑ دی گئی تھی اور عین اِسی درمیان اُس خالی جگہ کو اُس کی آنکھ سے ٹپکے ہوئے ایک آنسو نے پُر کر دیا تھا۔

لمحے پہاڑ بن گئے۔ ہر سمت منحوس سائے لہرائے۔ کہیں سے مہیب طوفانوں کا شور اُٹھا۔ جیسے کہیں بم گرا ہو۔ زمین کانپی ہو۔ آسمان تھرّا گیا ہو۔ دُور دُور تک سیاہی مائل بادل چھا گئے۔ جیسے ساری فضا دھواں دھواں ہو۔ جیسے کہیں کچھ اکھڑا ہو، گرا ہو۔ میرے ہاتھ کانپ اُٹھے، کاغذ کا وہ پُرزہ زمین پر گر پڑا۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا، کاغذ کا وہ ٹکڑا پھڑپھڑا کر دروازے کے باہر نکلا اور نالی میں بہہ گیا۔ میز پر آنسوؤں کی 'ٹپ ٹپ' کی آواز اُبھری۔ جیسے کوئی کہہ رہا ہو ـــــ انیتا بھی اب پرائی ہے۔ اُس کا وجود بھی تمھارے لئے نالی کا پُرزہ سا بن گیا ہے جسے تم چھُو نہیں سکتے، ہاتھ نہیں لگا سکتے۔

کہتے ہیں 'وقت ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے'۔

لیکن ایک زمانہ گزر جانے کے بعد بھی وقت اب تک میری بے چینیوں کا مداوا نہ کر سکا۔ کبھی کبھی وقت میرے زخموں پر اِس بے دردی کے ساتھ نشتر زنی کر دیتا ہے کہ میرا وجود چیخ اُٹھتا ہے، دل لہولہان ہو جاتا ہے۔

انیتا سے اکثر سامنا ہو جاتا ہے۔ وہ کبھی کبھی میری دُوکان پر بھی آتی ہے۔ لیکن اب اُس میں وہ بہار کی سی تر و تازگی نہیں رہ گئی ہے۔ اُس کے چہرہ کی رونق کھو گئی ہے۔ اُس کی آنکھوں کا جادُو ختم ہو گیا ہے۔ اُس کے ریشمیں بالوں کی چمک معدوم ہو گئی ہے۔ اُس کی مُسکراہٹ میں وہ کشش نہیں رہ گئی ہے۔

اب میری نگاہیں انیتا کا تعاقب نہیں کرتیں۔ اب میرا دل اُسے دیکھنے کے لئے بے قرار نہیں ہوتا۔ اب تو اُس کی صورت دیکھ کر میرا دل عجیب سا ہو جاتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے وہ سامنے نہ آئے تو اچھا ہو۔ اُس کی یاد نہ ستائے تو بہتر ہو۔

لیکن انیتا کی یاد، اُس کی باتیں تو جیسے زندگی کا جُزو بن چکی ہیں۔ ہر وقت، ہر ساعت دل کے نہاں خانوں میں کوئی چیز سُلگتی رہتی ہے۔ ذہن کے پردوں پر کوئی تصویر اُبھرتی اور ڈوبتی رہتی ہے، اور انیتا ـــــ اُسے دیکھ کر تو یہ محسوس ہوتا کہ جیسے کسی نے میرا دل اپنی مُٹھی میں دبا لیا ہو اور اُسے نہایت بے دردی سے مسل رہا ہو۔ میں عجیب سی تڑپ، عجیب سا کرب محسوس کرنے لگتا ہوں۔ میری طبیعت عجیب عجیب سی ہونے لگتی ہے۔

میں چاہتا ہوں اپنی بے چینی کا اظہار نہ ہونے دوں۔ خود اُس آگ میں جل بھُن کر راکھ ہو جاؤں۔ لیکن کسی کو اُس کی خبر تک نہ ہو۔ انیتا سے ملوں تو اُسی انداز سے، اُس کا خیر مقدم کروں تو بالکل پہلے ہی جیسا۔ لیکن نہ جانے کیوں اُسے دیکھ کر، اُس کے مانگ کے سیندور، اُس کی ماتھے کی بِندیا پر نظر پڑتے ہی میری حالت عجیب سی ہو جاتی ہے۔ میں ہر بات بھُول جاتا ہوں۔ جب وہ اپنا گھسا پِٹا جملہ ـــــ "کوئی رعایت؟" دُہراتی ہے تو میرے دل کے شعلے زبان تک آ جاتے ہیں۔ میری آواز بھاری ہو جاتی ہے۔ میرا لہجہ تُند و تلخ ہو جاتا ہے۔ میرے جی میں آتا ہے میں اُس کے ہاتھ سے سارا سامان چھین کر رکھ لوں اور اُس سے صاف کہہ دوں ـــــ "چلی جاؤ بس! میرے یہاں کوئی گنجائش نہیں!"

مُدیر بیسویں صدی کے نام خط لکھتے وقت اختصار سے کام لیجئے تاکہ آپ کے ارشاد کی تعمیل فوراً ہو سکے۔ طویل خطوط مصروفیت کے باعث فوراً نہیں پڑھے جاتے۔

رسالہ نہ ملنے کی شکایت

دو مرتبہ پتے چیک کرنے کے بعد بیسویں صدی ہر ماہ باقاعدگی سے نمبر وار ڈاک کیا جاتا ہے۔

اِس کے باوجود شکایتی خطوط موصول ہونے پر رسالہ دوبارہ بھیج دیا جاتا ہے۔ ۲۵ تاریخ کے بعد شکایتی خطوط موصول ہونے پر دوبارہ پرچہ بھیجنے سے ہم معذور رہتے ہیں۔ رسالہ نہ ملنے کی شکایت محکمہ ڈاک سے بھی کیجئے۔ (منیجر)

روشنی

راجیو مرزا

سی ۴۷/۱- رانا پرتاپ باغ، دہلی نمبر ۷

محترمی! تسلیم

"بیسویں صدی" سے اپنی پہلی دو کہانیاں واپس ملنے کے بعد میری تو ہمت نہیں ہوئی کہ تیسرا چانس لیا جائے۔ لیکن میرے اکثر دوستوں اور پرستاروں کا اصرار ہے کہ میری کوئی چیز "بیسویں صدی" میں بھی آنی چاہئے۔ اب یہ لوگ نہیں جانتے کہ "ہم چاہتے" پر میرا بس نہیں ہے ——— پیشِ نظر کہانی "روشنی" کے بارے میں بھی اکثر لوگ کہہ رہے ہیں کہ "بیسویں صدی" کے صفحات اس کا بہترین مقام ہیں۔ اس لئے کہ "روشنی" کی کہانی ایک پیغامِ محبت ہے۔ جسے جہاں تک پہنچنا چاہئے اور معیاری ادبی رسائل میں "بیسویں صدی" ایک ایسا ماہنامہ ہے جو گھر گھر پڑھا جاتا ہے۔ میری خواہش بھی یہی ہے کہ یہ دلوں سے منافرت دور کرنے کی سعی کرنے والی، سچی محبت کی کامرانی کا راگ گانے والی یہ پیار کی کہانی . . . کسی کثیر الاشاعت ادبی جریدے میں جگہ پائے۔ مجھے نہیں معلوم یہ کہانی "بیسویں صدی" میں جگہ پائے گی یا نہیں۔ لیکن یہ یقین ہے کہ جہاں کہیں بھی چھپے گی، پڑھنے والے اس سے متاثر ہوں گے، کتنے ہی دلوں میں نفرت کی برف پگھلے گی، کتنے ہی دماغ نئے سرے سے سوچیں گے . . . اور یہی اس تحریر کا مقصد ہے ——!

"روشنی" ہند و پاک کی گذشتہ جنگ میں قید ہونے والے ایک سپاہی کی کہانی ہے جس کے بارے میں آخر تک پتہ نہ چلا کہ پاکستانی ہے یا ہندوستانی ———؟ کہانی کے اس رومانی اسرار اور تحیّر کو میں نے آخری سطر تک نبھایا ہے ——— لیکن کہانی ختم کرنے کے بعد قاری کو پتہ چل جاتا ہے کہ یہ انسان کی کہانی ہے۔ انسان کے ایک جذبے محبت کی کہانی۔ محبت . . . جسے کوئی زنجیر، دیوار، سرحد اور گولی زیر نہیں کر سکتی ——— کہانی کے پیرہن کے بارے میں صرف اتنا کہوں گا کہ اس کا Structure اور تکنیک بہت اچھوتے اور نئے ہیں۔ ہاں اسلوب میں اگر کہیں کہیں کرشن چندر کی جھلک ہے تو اس کے لئے مجھے معاف کیا جائے کیونکہ میں برصغیر کے اس عظیم ترین مصنف سے بے حد متاثر ہوں۔ لیکن اس طور اور اس ڈھنگ سے کسبِ فیض کرنا کوئی عیب نہیں ہے۔ کرشن چندر، منٹو، بیدی، عصمت کے بعد آنے والی نسل نے اردو کے ان اکابر سے بہت کچھ سیکھا ہے جس کا اعتراف نہ کرنا ایک بد دیانتی ہے۔ امید ہے یہ کہانی آپ کو پسند آئے گی۔ گر قبول . . .

مخلص ——— راجیو مرزا

مجھے لندن سے کسی نے ایک ڈائری بھیجی ہے۔ ڈائری کے ساتھ کوئی رُقعہ یا خط نہیں ہے۔ گویا یہ ایک پُراسرار تحفہ ہے! کئی دن تک غور و فکر اور اپنے دوستوں سے بحث کرنے کے بعد میں جن نتائج پہ پہنچا ہوں، وہ یہ ہیں ———

یہ ڈائری لندن میں مقیم اُس ہندوستانی یا پاکستانی نے بھیجی ہے جو کچھ دن پہلے دِلّی یا لاہور میں موجود تھا اور یہ ڈائری غالباً اُسے کسی ایئرپورٹ پر ہی پڑی ملی ہوگی۔ کمال کی بات یہ ہے کہ ڈائری کے اوراق بھی اس کے مالک کی 'شناخت' میں مدد نہیں دیتے۔ یہ رُوداد محبّت پڑھنے کے بعد صرف اِتنا ہی پتہ چلتا ہے کہ یہ ڈائری اُس سپاہی کی ہے جو جنگی قیدی کی حیثیت سے کچھ عرصہ 'دشمن مُلک' میں

- صبر کرنا اور بُرے کاموں سے بچنا اولوالعزم انسان کا کام ہے۔ (قرآنِ پاک)
- نیکی کیا ہے؟ خُدا کو ماننا، سچ بولنا، چوری، جھُوٹ، فریب، شراب نوشی اور جھگڑے فساد سے بچنا، وعدوں کو پُورا کرنا، انسانی خدمت، خلقِ خُدا سے محبّت۔ (قرآنِ پاک)
- شِرک مت کرو۔ والدین کی عزّت کرو۔ خون مت کرو۔ چوری نہ کرو۔ شراب نہ پیو۔ شراب ناپاک کردیتی ہے۔ (توریت)
- جو اللہ اور قیامت پر اعتقاد رکھتا ہے، اُسے چاہئے کہ اپنے پڑوسی کی عزّت کرے۔ (سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم)

گزار کر" اپنے وطن" واپس جارہا ہے۔ اِس ڈائری میں بہت کچھ ہے، پھر بھی واضح طور پر یہ پتہ نہیں چلتا کہ اِس کا راقم کون ہے ——— ہندوستانی یا پاکستانی؟؟

ڈائری کا مصنّف 'شکی' ہے جو شکیل بھی ہو سکتا ہے اور مشکور بھی۔ اِک کردار 'رشی' ہے جو شہناز بھی ہو سکتی ہے اور رشی کشنا بھی۔ اِک 'شہرِ آرزو' کا ذکر ہے جو لاہور بھی ہو سکتا ہے اور دِلّی بھی!

ڈائری کی زبان اُردو ہے، جو اِس بات کی دلیل نہیں کہ یہ کسی پاکستانی یا مُسلمان کی تحریر ہے۔ (میں خود بھی اُردو کا مصنّف ہوں، نہ ہندو ہوں نہ مُسلمان) ——— اپنے اِس تحریر میں سموئے گئے جذبات ———؟ تو وہ کسی 'پُرانے ہندوستان' میں رہنے والے کے جذبات معلوم ہوتے ہیں ——— یوں بھی الفاظ اور اُن کا لب و لہجہ چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ اِن کا راقم خواہ وہ بھارتی ہو یا پاکستانی، ذہنی اور رُوحانی طور پر آج بھی ۴۷ء سے پہلے کے برِّصغیر میں رہتا ہے!

اب رہ گئی یہ بات کہ بھیجنے والے نے یہ ڈائری مجھے ہی کیوں بھیجی ہے؟ تو اِس کی وجہ غالباً یہی ہو سکتی ہے کہ 'پُرانے ہندوستان' کے موضوع پر میری کئی کہانیاں شائع ہو چکی ہیں، جن کا خاصہ چرچا بھی ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے ڈائری بھیجنے والے نے میری وہ کہانیاں پڑھی ہوں۔ ہندوستان یا لندن میں... یا پھر کہیں اور، اُردو کے کچھ رسائل غیر ممالک میں بھی جاتے ہیں۔ ڈائری بھیجنے والے کے خیال میں اِس لاشعوری تخلیق، گمشدہ امانت اور ادھوری لیکن پھر بھی مکمل کہانی کے ساتھ انصاف میں ہی کر سکتا تھا۔ اپنے انداز کے اِس واحد تحفے کے ساتھ میں انصاف کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

یہ ڈائری کس کی ہے؟

'شکی' اور 'رشی' کون ہیں؟ ——— 'شہرِ آرزو' کون سا شہر ہے؟ ایک مصنّف کے پاس یہ ڈائری بھیجنے کا مقصد ———؟ اِن سوالوں نے مجھے کئی دن تک پریشان رکھا اور پھر اچانک، جیسے مجھے اِن سوالوں کا جواب مِل گیا۔ ذہن کے دُھندلکوں میں ایک روشنی پھیل گئی۔ وہ 'روشنی' میں آپ تک پہنچا رہا ہوں۔

وہ ڈائری

۶ر جنوری: میں بہت تھک گیا ہوں۔ اِن فوجی بیرکوں، وردیوں، کیمپوں اور ایک جیسے مگوں سے میں بُری طرح اُوب چکا ہوں۔ بار بار، ہر وقت وہی موضوع، وہی گفتگو، سیاسی باتیں، نفرت، انتقام کا جذبہ۔ کاش میں میدانِ جنگ میں مارا جاتا!

۳۱ر جنوری: میں فرار کے منصوبے پر غور کر رہا ہوں۔ اسکیپ!

۲ر فروری: آج میرے سمیت کچھ قیدیوں کو... 'شہرِ آرزو' میں منتقل کیا گیا ہے۔ آہ! شہرِ آرزو... وقت کا یہ کیسا بے رحم مذاق ہے؟ [illegible] ہے وہ... 'رشی'... آہ!

۸ر فروری: میں پاگل ہو جاؤں گا!

۲۴ فروری: پتہ چلا ہے دونوں طرف کچھ قیدیوں کا تبادلہ کیا جا رہا ہے۔ رہا کئے جانے والے خوش نصیبوں میں مَیں بھی ہوں۔ لیکن مجھے خوشی کیوں نہیں ہو رہی ہے؟

۴ مارچ: وہ خواہش... وہ عجیب سی خواہش پھر شدت اختیار کر رہی ہے۔ یہ خواہش کتنی خطرناک ہے۔ خطرناک، عجیب اور احمقانہ بھی۔ واقعی؟ میں ایک بار پھر "فرار" کے بارے میں غور کر رہا ہوں۔ "فرار" کی اسکیم میرے ذہن میں مرتب ہو چکی ہے۔

۵ مارچ: سب پلان مکمل ہے۔ پھر...؟

۶ مارچ: کل ذرا سی غلطی سے ساری اسکیم بیکار ہو گئی۔ اگر گارڈ دیکھ لیتا؟ اس ناکامی کا مطلب کیا ہے؟ کیا اپنا ارادہ ترک کر دوں؟ ... نہیں! میں اپنے شہرِ آرزو کو دیکھوں گا! "شی" سے ملوں گا!! اب مجھے موت کا بھی خوف نہیں۔ میں "شی" سے ملنا چاہتا ہوں۔ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ عہد و پیمان کے بموجب کیا وہ آج بھی مجھ سے محبت کرتی ہے، یا میری گم شدہ دنیا کی طرح وہ بھی مجھے بھول گئی۔ محض ماضی بن گئی... کیا ہم دونوں کا پیار بھی ملک کی تقسیم کی بھینٹ چڑھ گیا؟... لیکن "رشی"... میں تمھیں نہیں بھولا! مجبوریوں اور مصلحتوں کی راکھ تلے دبی ہوئی محبت کی چنگاری کبھی بجھنے نہیں پائی۔ جلتی سلگتی ہی رہی اور آج جب میں تمھارے ہی "شہر" میں ہوں تو یہ چنگاری آج پھر شعلہ بن گئی ہے۔ آج اس لمحہ تمھاری یاد بہت شدت سے آ رہی ہے۔ شاید اس لئے کہ اس شہر کی فضاؤں میں تمھارے پیکرِ ناز کی خوشبو شامل ہے اور یہ فضائیں کچھ پیام دے رہی ہیں، ہوائیں اک سلام کہہ رہی ہیں "رشی"! مجھے معلوم ہے تمھاری شادی ہو چکی ہے — اب تم مسز ملک ہو... آخر ہماری محبت بھی تقسیم ہو گئی نا! اور کون جانے گردشِ دہر میں ہر چیز بدل جاتی ہے... تم تو اب کسی اور کی ہو چکی ہو۔ آہ! وہ شی کہاں ہے جو میری بانہوں میں چھپ کر چہکارے مارتی تھی — شکی... شکی... شکی... میرے شکی!" "شی! تم نے ایک دن کہا تھا — تم مجھ میں سمائے ہوتے ہو۔ ہم کبھی جدا نہیں ہو سکتے! "شکی" میں "شی" بھی ہے۔ "ش" اور "ی" کے بیچ "ک" — تم —!" خواب تھا جو کہ دیکھا، جو سُنا... کیا محض افسانہ تھا؟ پھر کوئی حقیقت مجھے آواز کیوں دے رہی ہے۔ کون پکار رہا ہے مجھے؟ یہ فضاؤں میں نغمگی کیسی ہے؟ یہ باہوش جنوں کی کون سی منزل ہے؟ — کبھی کبھی پاگل ہو جاتا ہوں شی... اُف! ابتی بجھنے والی ہے... مجھے روشنی...

۷ مارچ: مجھے روشنی مل گئی ہے۔ میں نے وہ خواہش پوری کر لی ہے!!

یہ سب کتنا سحر انگیز، کتنا خوابناک... کتنا ڈرامائی تھا... کون یقین کرے گا کہ میں اس سخت پہرے والے قیدی کیمپ سے باہر چھ گھنٹے گزار آیا ہوں! صبح کاذب نمودار ہونے میں تھوڑی ہی دیر باقی ہے، ہر طرف سناٹا ہے۔ آج یہ سکوتِ شب کیسا گیت گا رہا ہے؟ مجھ پر اِک اضطراب انگیز کیف طاری ہے، یہ کیف میری سوچ کے پیمانوں سے چھلکا پڑ رہا ہے۔ نشاط کی یہ شدت کچھ اذیت ناک بھی محسوس ہو رہی ہے۔ میں ٹارچ پنسل جلا کر یہ سطور لکھ رہا ہوں،

- زہر ماں بھی دے تو نہ کھانا چاہئے۔ بُرائی جہاں سے بھی ملے اُسے تیاگ دینا چاہئے۔ (بھرتری ہری)
- وفا سرشت عورت کو صرف اپنے شوہر سے تعلق ہوتا ہے، جیسے شیر کا بچہ کہ اُسے فاقہ تو منظور ہوتا ہے لیکن گھاس سے رغبت نہیں ہوتی۔ (کبیر داس)
- لوگوں کے دلوں میں خوشی کے کنول کھلانا ہزاروں زیارتوں سے افضل ہے۔ (مہاتما بدھ)
- بلند حوصلہ انسان یقیناً اپنی منزل پا لیتا ہے۔ (سوامی سارشبدانند جی)

تاکہ دل کی وحشی دھڑکنیں اس کاغذ پر بھی منتقل ہو جائیں۔ یہ اذیت... کچھ کم ہو جائے، میں پُرسکون ہو جاؤں — میں آج کا یہ دن، اپنی زندگی کے یہ چھ گھنٹے کیا کبھی فراموش کر سکوں گا؟ کبھی نہیں! اپنے انداز کا یہ واحد اور منفرد فرار کامیاب رہا۔ اس فرار کے اسکیپ میں کس نے میری مدد کی؟ شاید خدا نے — ہاں، ورنہ میرے فرار کا طریقہ عمل کتنا انوکھا اور غیر معمولی تھا۔ لیکن اس سے زیادہ غیر معمولی تھا میرے "فرار" کا مقصد اور وہ تجربات جو میں نے ان چھ گھنٹوں میں حاصل کئے ہیں۔

کیمپ کی حدود سے باہر آنے کے بعد میں خود کو بہت نڈر اور آزاد محسوس کر رہا تھا۔ اب میں اسی ملک، اسی شہر کا

باشندہ تھا۔۔ پہلے بھی تو تھا؟ (اُف اکون جانتا تھا کہ اِس نوعیت کے مجھے بھی وضع کرنے پڑیں گے)۔۔۔ سڑک پر پہنچتے ہی میں ایک سمت چلنے لگا۔ یہ سوچے بغیر کہ میرا اسٹاپ کس طرف ہے۔ لیکن سڑک کے کنارے اِک شناسا تاریکی کھنڈر سے مجھے بتا دیا کہ میں شہر ہی کی طرف یعنی ٹھیک سمت میں چل رہا ہوں۔۔۔ میرا شہر۔۔۔ مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے ـــــ اچانک میں نے محسوس کیا کہ میرے پیچھے بے آواز چلتی ہوئی کوئی موٹر نزدیک آتی ہوئی اپنی رفتار دھیمی کر رہا ہے۔ خوف کی ایک لہر میرے سارے بدن میں دوڑ گئی! میں ایک مفرور قیدی تھا۔ لیکن وہ ایک ٹیکسی تھی جس کا ڈرائیور مجھ سے پوچھ رہا تھا

"شہر جائیں گے صاحب؟"

"ہاں!" میں نے کہا اور ٹیکسی کا دروازہ کھول کر پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ یہ پہلی غیر فوجی آواز تھی جو میں نے دو سال بعد سُنی تھی۔ ایک 'سویلین آواز' جو بہت میٹھی اور راحت بخش محسوس ہو رہی تھی۔

ایک نیا تجربہ ـــ "شہر میں کہاں جائے گا؟" ٹیکسی اسٹارٹ کرنے کے بعد ڈرائیور نے پوچھا۔ "کہاں؟"۔۔۔ ایک لمحے کو میں گڑبڑا گیا۔ لیکن پھر میں نے ایک بہت صحیح جگہ بتائی "اسٹیشن!" لیکن اُس نے پھر پوچھا "کون سے اسٹیشن صاحب؟" ـــ اُف! یہ مشکل گھڑی تھی! کیا اب یہاں کئی اسٹیشن ہو گئے ہیں؟ آخر میں نے خوف آمیز جھنجھلاہٹ دبا کر کہا "پرانے اسٹیشن! (؟)" ـــ ڈرائیور نے سر کو جنبش دی اور گیئر بدلنے لگا۔ میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔

راستہ قریب قریب سنسان تھا۔ پختہ اور شفاف سڑک پر ٹیکسی دَوڑتی چلی جا رہی تھی۔ لیکن میرے خیالات اُس سے بھی زیادہ برق رفتار تھے۔ ماضی، حال، مستقبل، میری سوچ کے گول جھولے پر سوار آگے پیچھے ایک دُوسرے کے تعاقب میں دَوڑ رہے تھے ـــــ

پھر شہر کے مضافاتی علاقے میں برقی قمقمے روشن ہو گئے۔ میرے شہر نے میری راہوں میں چراغ جلا دئے! شہر قریب آنے لگا۔ فراموشی کی دُھند چھٹنے لگی۔ بہت کچھ نیا بھی تھا، پھر بھی کچھ پُرانی حالت میں تھی ہوئی میری شناسا چیزیں میرے سامنے سے گزرتی ہوئی مجھے سلام

کہہ رہی تھیں اور ایک مہربان شفیق لمس کی طرح میرے چہرے کو چھوتی ہوئی ہوا گنگنا رہی تھی۔۔۔ 'خوش آمدید!'

اور پھر شہر کا قلب نظر آنے لگا۔ جگمگاتا جاگتا، مسکراتا شہر اپنی بانہیں وا کر رہا تھا۔۔۔ میرا اپنا شہر۔۔۔ میرا شہرِ آرزو۔۔۔ میری گم شدہ جنت ـــــ میری جائے پیدائش۔۔۔ میرا وطن ـــ اِس کی گلیوں کی خاک آج بھی میرے خون میں شامل ہے جس کی ہوائیں میری سانس بنتی رہی ہیں۔ جس کی سڑکوں پر اپنے دوستوں کے ساتھ میں نے مٹر گشتی کی ہے۔ جس کے میدانوں میں مَیں ہاکی کھیلا ہوں۔ جس کی رُومان گاہوں میں اِک پیکرِ ناز کی شرمگیں نگاہوں میں جھانکا ہے (اور آشنائے راز و نیاز ہوا ہوں) جس کی درسگاہوں میں علم کے نُور سے فیض یاب ہوا ہوں۔ جس کی عبادت گاہوں میں خُدا کے حضور سر جُھکایا ہے۔ جہاں میری ماں۔۔۔ میری ماں! میری ماں کہاں ہے؟ وہ۔۔۔ وہ ابرِ رحمت تو نہیں رہ گیا تھا، م۔۔۔ ا۔۔۔ ں۔۔۔!

"صاحب آپ رو کیوں رہے ہیں؟" ڈرائیور نے بغیر

نے پوچھا تھا۔

آں؟ ! میں رو رہا تھا؟ ہاں، میں بہت زار و قطار رو رہا تھا۔ میری قمیص آنسوؤں سے تر تھی۔

"... کھوئی ہوئی دُنیا کی یاد آ رہی ہے ..." میری آواز جیسے دُکھ کے گہرے کنوئیں سے نکلی تھی۔

ڈرائیور کچھ نہ بولا۔ پتہ نہیں وہ کیا سمجھا تھا، لیکن میں اُس کی پُشت پر اُس کا چہرہ دیکھ سکتا تھا اور وہ چہرہ میرے غم کا شریک تھا۔ میں سوچنے لگا یہ 'پرائے مُلک' کا باشندہ وہی زبان بول رہا ہے جو میری زبان ہے اور یہ 'اجنبی' میرے دُکھ میں شریک ہے، کیوں؟ میرا دُکھ بانٹنے سے پہلے اُس نے نہیں پوچھا کہ تم کون ہو؟ تمہارا مذہب کیا ہے؟ تم کس صوبے کے رہنے والے ہو؟ شاید آنسوؤں کی دُنیا میں کوئی اپنا پرایا نہیں ہوتا۔ آنسو کا کوئی رنگ، نسل، مذہب، تمدّن اور صوبہ نہیں ہوتا ...

شہر.. بہت قریب آ گیا تھا، بہت قریب.. میرا جی چاہا اپنے دونوں بازو پھیلا کر اُسے اپنی آغوش میں لے لوں اور رو پڑوں ... میں شہر کے قلب سے گزر رہا تھا ــــ اور دونوں طرف نادیدہ ساز بج رہے تھے۔ شہر 'سواگت' گا رہا تھا ــــ پھول گر رہے تھے۔ خوشبو اُڑ رہی تھی ــــ دل رو رہا تھا۔ خوشی اور غم باہم مدغم تھے ــــ یہ وہی ہے، یہ بھی ... اور ... اور وہ بھی' یہ نیا ہے، نیا ہے لیکن اجنبی تو نہیں .. پرایا نہیں ہے اور دُشمن کیسے ہے ...؟

ــــ ٹیکسی پرانے اسٹیشن کے سامنے پہنچ کر رُک گئی۔ میں نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو ڈرائیور نے ہاتھ اُٹھا کر کہا ــــ

'رہنے دیجئے صاحب' ــــ "کیوں؟" میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے ... اور آنسوؤں میں کوئی کھوئی ہوئی دُنیا جھلملا رہی تھی ... میں آنسوؤں کی قیمت نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے اپنا خالی ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ جب ہم دونوں ... دو 'دُشمنوں' کے ہاتھ آپس میں ملے تو مجھے محسوس ہُوا کہ اِن دو بدنصیب مُلکوں کی سرحد پر کھڑی ہوئی دیوار بہت مصنوعی، بہت جھوٹی ہے ... کاش مُلکوں کی قسمت کا فیصلہ ایسے ہی ہاتھوں میں ہوتا!

"ہم پھر ملیں گے صاحب!" وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"ہم ضرور ملیں گے!!" میں نے اُس کے مضبوط ہاتھ پر اپنی گرفت بڑھاتے ہوئے کہا۔

پھر وہ اجنبی ــــ اپنی ٹیکسی کے ساتھ ٹریفک کے ہجوم میں گُم ہو گیا۔ ٹیکسی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں نے اسٹیشن کی طرف دیکھا۔ یادوں کی پازیب پھر چھنک اُٹھی !! اِس اسٹیشن سے کبھی اُن اسٹیشنوں کو گاڑیاں جاتی تھیں جو اب دُھندلکوں میں کھو چکے ہیں ــــ ننھیال ــــ پھوپی ــــ چچا ــــ ماموں ــــ سائیو ــــ سائیو میرے یار تو کہاں ہے، وہیں یا اِسی شہر میں؟ دیکھ میں آ گیا ہوں۔ آ اُسی ٹاکیز چلیں، پانچ آنے کی لین میں لگیں گے... پانچ آنے؟ اب آنے سمٹ کر پیسے بن گئے ہیں اور ہر ٹکٹ مہنگا ہو گیا ہے ...

میں نے پلٹ کر شہر کو دیکھا۔ بہت کچھ بدل کر بھی کچھ نہ بدلا تھا۔ میں بازار کی طرف چلنے لگا ــــ ہاں بھیڑ پہلے سے زیادہ ہے اور میں اِس 'دُشمن مُلک' کے لوگوں کی بھیڑ میں گُم ہو کر اُسی کا ایک حصّہ بن گیا تھا۔ کوئی مجھے دیکھ کر چونک نہیں رہا تھا۔ کسی کو پتہ نہیں چل رہا تھا کہ ایک دُشمن فوجی اُن کے بیچ میں ہے اور اُن کے کندھوں سے کندھا ٹکراتا ہُوا چل رہا ہے ــــ آخر ایک بھارتی اور پاکستانی۔ ہندو اور مسلمان۔ دوست اور دُشمن۔ اپنے اور پرائے میں فرق کیا ہے؟ اِس فرق کی پہچان کیا ہے؟ جو زبان یہاں ہے، وہ زبان وہاں بھی ہے۔ جو خُدا یہاں ہے، وہی وہاں بھی ہے۔ جو تہذیب و مزاج یہاں ہے، وہی اُدھر بھی ہے۔ رونے اور مُسکرانے کا انداز یکساں ہے۔ جو آلام، مسائل اور مصائب اِدھر ہیں، وہی اُدھر بھی ہیں۔ آنسو وہی، وہی قہقہے، وہی زمین، وہی آسمان، وہی مٹی، وہی پانی، دھوپ، ہَوا... پھر یہ تمیز، یہ خلیج، یہ تفریق کیسی ہے؟ اِس اِتنی یکسانیت میں مغایرت کہاں سے شروع ہوتی ہے، اور کون، کیوں شروع کرتا ہے؟ ہاں کس لئے آخر؟؟؟؟؟؟؟

... اِنھیں ایسے ہی 'ناآسودہ جواب سوالوں سے اُلجھتا ہُوا میں چلتا چلا جا رہا تھا، اُنھیں راستوں پر جو کبھی میری رہگذر تھے ... وہی جانی پہچانی خمدار گلیاں۔ تنگ لیکن بھانت بھانت خوشبوؤں سے مہکتے ہوئے بازار۔ چھوٹی اینٹ والی عمارتیں، محرابی دروازے، سانگلوں کی طرح گھومتے ہوئے موڑ، تراہے، چوک، پیڑ، سبیلیں، دُوکانیں

کہیں کہیں کچھ نیا بھی تھا۔ لیکن شہر کا قلب بُنیادی طور پر ویسا ہی تھا جیسا میں چھوڑ کر گیا تھا۔ آہ! وہی سنیما گھر۔۔۔ جہاں رابعہ کے ساتھ فلم 'جھنکار' دیکھی تھی۔۔۔ پرانا تھیٹر بالکل ویسا ہی ہے۔ ہاں فلم نئی ہے۔۔۔ میں نے ننّھے حلوائی کو دیکھا۔ جوان ننّھے اب بُوڑھا ہو چکا ہے۔ ننّھے کی امرتیاں، ابھی تک مجھ پر اُس کے چھ آنے واجب الادا ہیں۔۔۔ چھ آنے۔۔۔ اب تو آنے ختم ہو گئے! اچھوتے لیکن شہر کے مشہور بازار سے گزرتے ہوئے میں نے اپنے والد کے گہرے دوست 'ڈاکٹر صاحب' کو بھی دیکھا۔ جُھک کر چل رہے تھے۔ شاید دکھائی بھی کم دیتا ہے۔ میرے رُوبرو آنے کے باوجود مجھے پہچان نہ سکے۔۔۔ اور میرے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ انھیں روک کر کہتا ـــــ 'میں آپ کی گود میں کھیلا ہوں۔۔۔' بازار سے ملحق ایک گلی۔۔۔ اور اُس گلی کے موڑ پر۔۔۔ موڑ گھومتے ہی ماضی کے سارے ساز یکبارگی جھنجھنا اُٹھے، دل کی دھڑکن مضطرب ہو گئی۔۔۔ دُور ہی سے مجھے اپنا گھر دکھائی دے رہا تھا! میرا گھر۔۔۔ جہاں میں نے جنم لیا تھا۔ ایک بےخودی کی کیفیت میں میں آگے بڑھ رہا تھا، میرا گھر میری طرف آ رہا تھا۔ فاصلہ کم ہو رہا تھا۔ دھڑکن بڑھ رہی تھی۔ میں اپنے گھر کے قریب پہنچ کر رُک گیا اور میری نظریں 'اپنی گلی' کا طواف کرنے لگیں۔ میری گلی، میرے بچپن کی رفیق، میری ہمنوا، میری دُنیا۔۔۔ میں اپنی اِس معصوم دُنیا کو چھوڑ کر کہاں کہاں بھٹکتا پھر رہا ہوں؟ وقت۔۔۔ بہت تیزی سے پیچھے چلا گیا ہے۔۔۔ میں ننگے پاؤں نِکّر پہنے گلی میں بھاگتا چلا جا رہا ہوں، میرے پیچھے مُنّا ہے، اُس کے پیچھے راجہ۔ ہم سب آشی (شی!) کو پکڑنے جا رہے ہیں۔۔۔ 'چور سپاہی' کھیل رہے۔ قلفی والا گزر رہا ہے۔ اُس کے پیچھے پاپڑ والا آ رہا ہے۔ بھاگتے بھاگتے میں نے ایک کنکر اچھال دیا ہے۔ دو تین پاپڑ کڑکڑا گئے۔ پاپڑ والا ہا دیتا گالیاں بک رہا ہے۔ میں دَوڑ کر گھر میں گھس گیا ہوں۔۔۔' میں اپنے گھر کے سامنے اجنبی کی طرح کھڑا تھا۔ یہ وہی گھر ہے نا جس میں دندناتا گھستا چلا جاتا تھا۔۔۔؟ حال، ماضی پر غالب آ گیا، ہوشیاری بیخودی کو پیچھے دھکیلنے لگی ـــــ میں بہت دیر سے اپنے گھر کے آگے کھڑا تھا۔

"کِس سے مِلنا ہے صاحب؟" ایک شخص مجھ سے پُوچھتا ہے۔

"ایں؟!" میں چونکتا ہوں۔

"کِس سے مِلنا ہے آپ کو؟"

"۔۔ اپنے آپ سے۔۔" میں زیرِ لب بڑبڑایا۔

"جی۔۔۔؟" وہ آگے بڑھ گیا۔

میرے گھر کے دروازے پہل رہے تھے۔ مجھے بُلا رہے تھے؟ میرا جی چاہا میں لپک کر دروازے سے لپٹ جاؤں اور رو پڑوں۔ اُس وقت آنسو سامانِ نجات محسوس ہو رہے تھے۔ دل اِس سب کو نہیں سنبھال سکتا تھا۔ اِس لئے آنکھ کی طرف رواں تھا۔ لیکن میری 'بے بسی' میں تو رو بھی نہ سکتا تھا۔ لوگ پُوچھیں گے میں کیوں رو رہا ہوں؟ میں کیسے بتاؤں گا یہ میرا گھر ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ یہ میرا گھر ہے (یا کبھی تھا) مجھے بتانا پڑے گا کہ ہم ۴۷ء سے پہلے۔۔۔ اور پھر لوگ، چونک جائیں گے۔ انھیں پتہ چل جائے گا میں تو "غیر" ہوں، "دُشمن" ہوں، اور پتہ نہیں کیا تخریب کرنے آیا ہوں۔۔۔ مجھ سے باز پُرس ہو گی، مجھے پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ لیکن میں اپنے آنسو نہ روک پاتا۔ مجھے اپنے پیچھے سرگوشی سُنائی دیتی ہے ـــــ 'بیچارہ پاگل ہے'۔ ہاں میں پاگل تھا۔ اپنے گھر کو اپنا گھر کہنا پاگل پن ہی تو ہے ـــــ 'شی!۔۔۔؟' میں لوٹ پڑا۔۔۔ مِل کر بھی نہ مِل سکا اپنے بچپن سے ـــــ اور پھر وقت بہت تھوڑا تھا۔ لَوٹنے سے پہلے مجھے تم سے بھی ملنا تھا۔ میرے پاس تمھارا پتہ تھا۔ شہر کی ایک نئی کالونی۔۔۔ اُلٹے قدم چل کر جب اسٹیشن کے قریب آیا اور سوچنے لگا۔ تم سے مِلوں یا واپس کیمپ چلا جاؤں؟ تو کوئی قریب سے ٹرانسسٹر لئے گزر گیا۔

'اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بِن آئے نہ بنے'۔۔۔!

یہ سہگل کی آواز میں غالب تھا ـــــ میں ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف چلتے ہوئے سوچنے لگا۔ غالب اور سہگل کس مُلک کے فنکار ہیں؟ اِن دونوں کو جہاں سب سے زیادہ سمجھا اور سراہا جا سکتا ہے وہ ہندوستان اور پاکستان ہی ہیں۔ آج بھی دونوں کو دونوں مُلکوں میں پسند کیا جاتا ہے، اِس بات کی پروا کئے بغیر کہ ایک اسد اللہ خاں تھا اور دُوسرا کُندن لال! شاید فن تقسیم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ شاید فن مذہب سے کم بے ضرر چیز ہے۔۔۔

جب میں ٹیکسی اسٹینڈ کے قریب پہنچا تو قریب کے ایک

دریچوں میں ریڈیو بج رہا تھا۔ وہی غزل مقطع پر پہنچ رہی تھی۔۔۔

".........ہے یہ وہ آتش غالبؔ
جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے!"

میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو تمہاری کالونی کا پتہ بتایا، ٹیکسی چل پڑی ــــ شی، تمہارے کوچے کو خیال ہی نہیں میں بھی جا رہا تھا۔ بذاتِ خود، مجسّم۔۔۔ پھر مضرابِ خیال، یادوں کا ساز چھیڑ رہا تھا۔ ٹیکسی رفتار پکڑتی جا رہی تھی اور فضاؤں میں موسیقی گونج رہی تھی۔ پھر وہی فراموشی کا عالم، وہی کیف، وہی خوف، وہی غم، وہی دلاسہ ــــ

تو کسی اور کے دامن کی کلی ہے لیکن
میری راتیں تری خوشبو سے بسی رہتی ہیں

پتہ نہیں، میں نے کب ٹیکسی چھوڑی اور کب ڈی بلاک میں پہنچ گیا ــــ جب تمہارے گھر (بنگلے) کا مین گیٹ کھول کر اندر داخل ہوا تو برآمدے میں اندھیرا تھا۔ ایک کمرے کی بتی روشن تھی۔ میں کھڑکی سے اندر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ کھڑکی کا پردہ دھیرے دھیرے ہل رہا تھا۔ پردہ سرکنے پر مجھے اندر کا منظر نظر آ جاتا تھا۔ میری نگاہ کے فوکس میں صرف ڈرائنگ ٹیبل کا ایک کونا تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ تم گھر میں موجود ہو۔۔۔ ہر طرف تمہاری خوشبو تھی۔ میرا دل، بیوقوف، بے غیرت بدنصیب دل پھر دھڑک رہا تھا۔ آہ! تم جو میری آغوش میں آ جایا کرتی تھیں، جن کے دہکتے رخساروں پر میں اپنے جلتے ہوئے ہونٹ رکھ دیا کرتا تھا اور ساری فضا صرف ایک گنگناہٹ بن جایا کرتی تھی ــــ

مشکی! مشکی! میرے مشکی!"۔۔۔ وہی مشکی آج دور سے تمہاری ایک جھلک دیکھنے کی کوشش میں بھی خود کو مجرم سمجھ رہا تھا اور تمہارے خوبصورت ڈرائنگ روم میں کہیں رکھے ریڈیو گرام سے آواز آ رہی تھی ــــ

'جوگن بن جاؤں گی سیاں تورے کارن'۔۔۔

تم جوگن نہیں بن سکیں، میں جوگی نہیں بنا۔ لیکن میں یہ کیسا بھیس بنا کر تمہارے کرم یا ستم کا تماشہ دیکھنے وہاں پہنچ گیا تھا۔ ۔۔۔ اچانک میرے دل کی دھڑکن یکلخت بہت تیز ہو گئی! تم آ رہی تھیں۔۔۔ میرے سامنے۔ نظر محدود ہوتی ہے، لیکن دل تو لامحدود ہوتا ہے ــــ تمہارے پھول سے قدم میرے دل پر پڑ رہے تھے، مترنم مہکتا ہوا خرام۔۔۔ اور پھر تم میری نظر کے فوکس میں، میز کے اُس کونے کے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں۔۔۔ ہاں، وہ تم ہی تھیں، بالکل ویسی ہی، بالکل وہی۔ مجھے محسوس ہوا بتدریج تیز ہوتی ہوئی دل کی دھڑکن رک جائے گی، دھڑکن رک جائے گی، سانس تھم جائے گی، میں مر جاؤں گا ترے آستانے کے قریب ــــ

مری جان، مری محبوب! میری شی! میری۔۔۔؟ تم تو ویسی ہی جوان اور حسین تھیں۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا تمہارا حسن اور بھی نکھر گیا ہے۔ اب تمہارے حسن میں وقار بھی شامل تھا۔ فرق تھا تو صرف اتنا کہ تمہارے خوبصورت سر پر چھائی ہوئی سیاہ مشکبار گھٹاؤں پر اب کہیں کہیں چاندنی بھی اتر آئی تھی، جس سے تمہارے حسن کا اُجالا اور رخشندہ اور پاکیزہ ہو گیا تھا۔۔۔

تم شاید میز پر پلیٹیں سجا رہی تھیں۔ کھڑکی کا پردہ بار بار میرے تمہارے درمیان آ جاتا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا شیشے سے انگلیاں گزار کر پردے کو نوچ دوں۔ بلکہ میرا تو جی چاہ رہا تھا، اپنا دستِ جنوں بڑھا کر اس دنیا کے اُن تمام پردوں کو نوچ دوں، جو اپنوں کے درمیان ناقابلِ عبور دیواریں بن کر حائل ہو گئے ہیں۔

پردہ بیچ میں حائل تھا۔ میں تمہیں پکار رہا تھا ــــ شی!۔۔۔ یہ پردہ ہٹا دو۔۔۔ شی۔۔۔ "یہ پردہ خود بخود ہٹا۔ تم چونکی ہوئی نظر آ رہی تھیں (یا واہمہ تھا!) شاید تم نے میری آواز سُن لی تھی۔ گو میرے لب نہیں میری رُوح تمہیں صدا دے رہی تھی۔ عجب نہیں کہ جذبۂ دل نے تمہیں بھی کھینچا ہو۔ پردہ پھر سامنے آ گیا، جنون پھر بڑھ گیا! میں نے تہیہ کر لیا کہ ہاتھ مار کر شیشہ توڑ دوں گا! ہر شیشہ توڑ دوں گا!!

"مشکی!" اچانک تم نے مجھے پکارا؟ جھاکا! جیسے کسی نرم مٹھی نے دل کو جکڑ لیا۔ آخر۔۔۔ آخر تم نے مجھے دیکھ لیا تھا یا محسوس کر لیا تھا۔۔۔ تمہارے دل نے تمہیں بتا دیا تھا کہ میں وہاں ہوں۔۔۔؟

پردہ پھر ہٹا ــــ! تم اپنے سامنے دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھیں۔۔۔ کوئی۔۔۔ تمہارے قریب آ رہا تھا۔۔۔ تو یہ؟ یہ مشکی کوئی اور تھا! یہ آواز، یہ پیار میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ کسی اور کے لئے تھی؟؟ ــــ لیکن جلد ہی وہ 'مشکی' بھی میری نظر کے فوکس میں

آگیا۔ ایک ننھا منّا پیارا سا بچہ ــــــ!!! جیسے میرے کہیں بہت اندر موسیقی کا پھر ایک جھماکہ ہُوا۔

۔۔۔ تم تو مجھ میں سمائے ہوئے ہو۔ تم مجھ سے کبھی دُور، کبھی جُدا نہیں ہو سکتے۔ میرے لب پر ہمیشہ تمھارا نام رہے گا۔ تم ہمیشہ میری شہ رگ کے قریب رہوگے۔ قریب، بہت قریب ۔۔"

تو وہ ننھا شکی میں ہی تھا؟ تم میں سمایا ہُوا! تمھارے لب پر، تمھاری بانہوں میں، تمھاری دھڑکنوں کے قریب، بہت قریب ۔۔۔ تم نے اُس شکی کو سینے سے لگا رکھا تھا۔ میں نے تمھیں کہتے سُنا ــــ "شکی ۔۔۔ ممی کو پپّی دو بیٹے"

اور وہ ۔۔۔ تمھارے رخساروں کی طرف جھک رہا تھا۔ میں تمھارے رخساروں کی طرف جھک رہا تھا۔ اُس کے ۔۔۔ شکی کے ۔۔۔ میرے ہونٹ تمھارے رخساروں کو چھونے لگے۔ تم نے اُس کے ۔۔۔ میرے گرد اپنی بانہیں حمائل کر دیں ۔۔۔ میں تمھارے کتنا قریب تھا! تم میں سمایا ہُوا! 'ش' اور 'ی' کے بیچ 'ک' ۔۔۔ میں!!

۔۔۔ مجھے محسوس ہُوا جنگ کی صورت میں ملا ہُوا ابھیشاپ مجھ پر سے ہٹ گیا ہے۔ مجھے محسوس ہُوا خُدا کی رحمت شاید یہی ہے جس کا نزول میں اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ خود پر محسوس کر رہا ہوں۔ اُس وقت نہ جانے کیسا پاکیزہ خُمار مجھ پر طاری تھا۔ وہ منظر ۔۔۔ اب امر ہے، کیونکہ جب پردہ پھر سامنے آیا تو کہیں کچھ رُوپوش نہ ہُوا، اندھیرا نہ ہُوا۔ اِک اُجالا تھا جس میں مَیں تمھیں صاف دیکھ سکتا تھا، اور آج، اِس لمحہ بھی دیکھ سکتا ہوں۔ تمھارے پیار سے وابستہ میرے تصوّر کا ہر رنگ اب پھر گہرا ہوگیا ہے اور اعجازِ تخیّل اور عالمِ امکان کو چھیڑتا ہُوا یہ رنگِ تصوّر اب کبھی ماند یا پھیکا نہ پڑے گا۔ اِس کی خوشبو کبھی معدوم نہ ہوگی، کیونکہ محبت کبھی معدوم نہیں ہوتی، کبھی نہیں مرتی، کبھی بوڑھی، بیمار اور بدصورت نہیں ہوتی۔ محبت خُدا ہے اور خُدا لازوال ۔۔۔

۔۔۔ اِس لئے میں کھڑکی کے پاس سے ہٹ گیا۔ کیونکہ اب جسمانی وجود کو رُوبرو ہونے کی، ایک دُوسرے کو چھُونے کی ضرورت نہیں تھی۔ اِس لئے کہ محبت مادّہ نہیں رُوح ہے!

میں لوٹ رہا تھا۔ لیکن اکیلا نہیں، تم میرے ساتھ تھیں اور آج اِس وقت بھی رات کے اِس آخری پہر، جب ہر طرف اِک سنّاٹا ہے تو نغمگیں طاری ہے اور بظاہر میں تنہا ہوں، تم میرے پاس ہو اور کل ۔۔۔ جب میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ 'سرحد' کے اُس پار کے لئے روانہ ہو جاؤں گا تم میرے ساتھ چلوگی، تم میرے ساتھ رہوگی ہمیشہ ــــــ ہمیشہ!

۔۔۔ پنسل ٹارچ کی لائٹ اب بُجھ چکی ہے، لیکن دُور مشرق میں کہیں آفتاب نمودار ہو چکا ہے۔ پَو پھٹ رہی ہے۔ فضا کے شیشے میں اِک روشنی بھرتی جا رہی ہے۔ یہ روشنی ۔۔"

(یہاں قیدی سپاہی کی ڈائری ختم ہو جاتی ہے۔)

'یہ روشنی ۔۔' میں سوچ رہا ہوں 'اور کوئی بھی روشنی کبھی معدوم نہیں ہوتی۔ یہ تو ہماری سوچ کی زمینیں کبھی کبھی محبت کے آفتابوں سے پرے ہٹ جاتی ہیں اور لاعلمی، شک اور نفرت کے اندھیرے پھیل جاتے ہیں۔

ڈائری کے اوراق ہم نے آپ کے سامنے کر دیتے ہیں۔

دوستو ــــ! کیا اب بھی اِس 'کہانی' کے کردار، جذبات اور واقعات آپ کے لئے پُراسرار یا اجنبی ہیں ــــ؟؟

غزلیں

سعادت نظیر ایم۔ اے

شکستہ دل میں ترا اعتبار باقی ہے
خزاں رسیدہ چمن میں بہار باقی ہے

شبِ فراق کی اک یادگار باقی ہے
بلا نصیب دلِ داغ دار باقی ہے

جمالِ دوست سے ہے اعتبارِ ذوقِ نظر
متاعِ درد سے دل کا وقار باقی ہے

خرد سے حل نہ ہوا کوئی عقدۂ ہستی
کشاکشِ المِ روزگار باقی ہے

نجانے کونسی منزل پہ اب ہے جذبۂ شوق؟
وہ آ گئے ہیں مگر انتظار باقی ہے

نظیرؔ آگ تھے عہدِ شباب میں ہم لوگ
نشہ اُتر گیا لیکن خمار باقی ہے

صغیر احمد صوفی بی۔ اے، ایل ایل۔ بی

ہر اک شوریدہ سر نے اس کو شوقِ معتبر جانا
کسی کے غم میں مر جانے کو جینے کا ہنر جانا

بہت آساں نہ تھا طوفان کا سر سے گزر جانا
وہ میں تھا ہر کڑی منزل کو جس نے رہگزر جانا

مگر اب زیست کی شائستگی اس سے عبارت ہے
تشدد کی ہر اک منزل سے ہنس ہنس کر گزر جانا

ابھی عہدِ جنوں کی لغزشوں کی یاد باقی ہے
کسی کے گھر نہ جانے کی قسم کھانا، مگر جانا

مری آوارگی کے راز شب کی نذر ہوں لیکن
طلوعِ صبح ہوتے ہی فضاؤں میں بکھر جانا

مناسب ہے یہی صوفیؔ کہ اب اپنا چلن بدلو
نہیں اچھا زمانے کی نگاہوں سے اُتر جانا

اختر مدھوپوری

مقامِ جلوۂ جانانہ دل ہے
کبھی کعبہ کبھی بت خانہ دل ہے

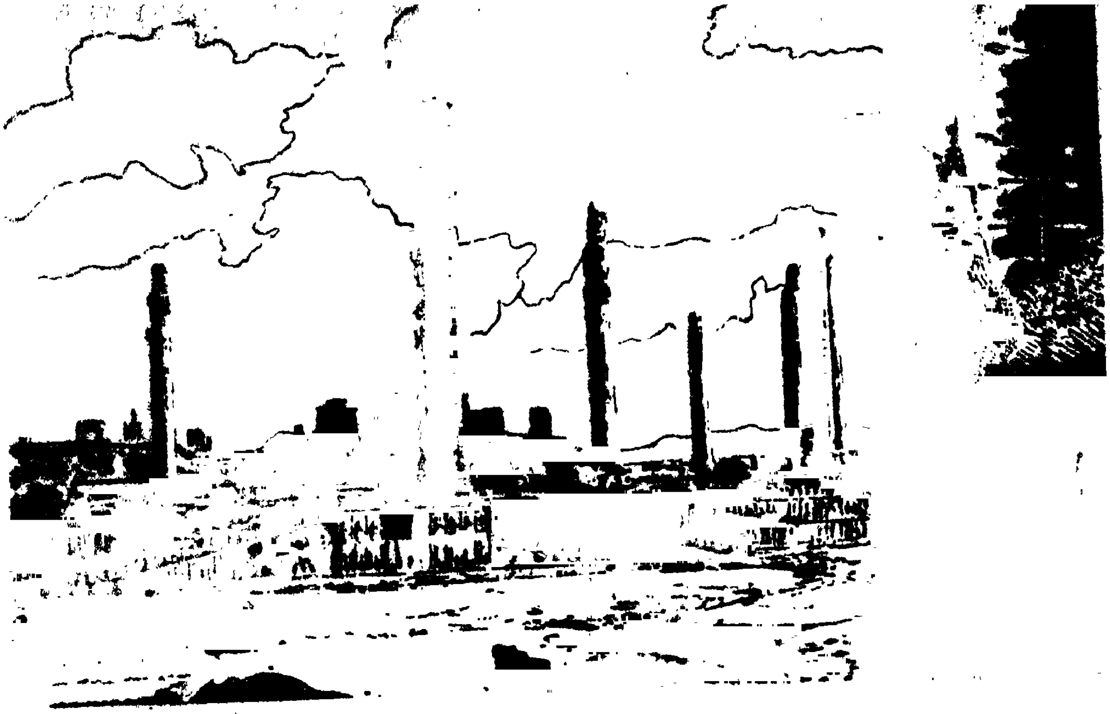
کہیں جلتا ہے شمعِ بزم بن کر
کہیں خاکسترِ پروانہ دل ہے

ارے توبہ تری آنکھوں کی مستی
ابھی تک ہوش سے بیگانہ دل ہے

اک ایسا حادثہ گزرا ہے اُس پر
ہمیشہ کے لئے ویرانہ دل ہے

نہ ٹھکراؤ اسے اے حُسن والو!
جہانِ عشق کا نذرانہ دل ہے

کسی کی چشمِ اُلفت کا کرم ہے
جو اخترؔ بے خود و دیوانہ دل ہے



جیٹ طیارہ سے یورپ کا سفر کیجئے...
ایران سے خوشگوار یادیں ساتھ لیجئے...
سائرس کے وقار کی مانند قدیم، خلائی دور کی مانند جدید

ایران ایئر سے بس تمام آسائش کے عظیم تاریخی شہر پرسی پولس پہونچئے یہاں کوہ رحمت، رستم، جمشید اور دارا، سیس دور کیس کی شجاعت کی گواہی دیگا۔ سینکڑوں عظیم الشان ستون آپ کے تصورات پہ چھا کر آپ کو ایران کے عظیم و پُر وقار ماضی کی تصاویر دکھائیں گے۔ یہاں بتائے ہوئے یہ لمحات آپ کبھی نہ بھلا سکیں گے۔

صرف ایران ایئر سے آپ شیراز، پرسی پولس اور طہران ہوکر یورپ کا سفر کرسکتے ہیں۔

شاہانہ وقار سے پرواز کیجئے
ایران ائیر سے پرواز کیجئے

ایران ائیر - سندر محل، میرین ڈرائیو، بمبئی نمبر ۴۰۰۰۲۰

mea. IA. 2743 UR.

غُبارِ راہ

وقار علی خاں۔ ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی (علیگ)
ڈسٹرکٹ ایمپلائمنٹ ایکسچینج نینی تال (یو۔پی)

محترم بھیا! آداب

بار بار آپ سے اپنی کوتاہیوں کی معذرت کرنا ۔۔۔ بہت عجیب سا معلوم ہوگا ناہ ویسے یوں ہی یہ معافی تلافی والی عادت پڑ جاتی تو اچھی بھی نہیں ——— میرے گزشتہ افسانہ "تمناؤں کا فریب" پر تمام جن سے جن پڑھنے والوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے وہ "بیسویں صدی" پڑھنے والوں کے ادبی شعور اور ستھرے خیالات کی ترجمانی ہیں۔ لیجئے ایک نئی کہانی "غبارِ راہ" آپ کی نذر ہے ——— سندھیا کا تصور ——— بہت دنوں سے بھٹک رہا تھا۔ ایک انجام کی تلاش میں۔ میں نے چاہا بھی کہ سکون کے لمحات میں بٹھا کر اُسے کسی خوبصورت منزل کے سپرد کر دوں۔ لیکن ——— چاہت ہی زندگی کے عنوان بنا دیا کرتی تو ——— کائنات کی تخلیق کا مقصد ہی ادھورا رہ جاتا، نہ کوئی اُمنگ رہتی نہ کوئی انقلاب آتا۔ چند اصولوں ہی کا نام زندگی بن جاتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ اِس لئے انسان کو حق ہے کہ وہ اپنے ذہن کے مطابق سوچے، عمل کرے، بغاوت کرے، انقلاب لائے۔ یہ الگ بات ہے ——— کس کے حصے میں کیا آتا ہے ——— سندھیا کا کردار ایسا ہی ہے، بے چین مچلتا ہوا سا۔ قلم نے اُسے ایک ایسی راہ پر لیجا کر چھوڑا ہے جہاں پہونچا کر خود مجھے ایسا محسوس ہوا ——— سردیوں کی ٹھٹھرتی رات میں کوئی کھلے آسمان کے نیچے آ کھڑا ہوا ہو۔ آپ کی رائے کا منتظر ہوں۔

بڑا عجیب یہ آوارگی کا رشتہ ہے   غبارِ راہ سہی، ہم سفر ہے کیا کہیئے

خیراندیش ——— رلشاد

★

"ہٹ سندھیا۔ دیوانی ہو گئی ہے کیا؟" اُس کا ضمیر اُسے بار بار جھنجھوڑتا "سایوں کے پیچھے دوڑ لینے سے کبھی کسی کو کچھ ملا ہے جو تو ہی پالے گی؟" سندھیا کی تمناؤں پر ہمیشہ محرومیوں کے گہرے سائے پڑتے رہے۔ "یہ تیری تقدیر ہے سندھیا۔" اُس کا ضمیر پھر چیخ اُٹھا "تیرے لئے زندگی میں ہمیشہ یونہی دروازے بند ہوتے رہیں گے!"

"نہیں! یہ جھوٹ ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا!" وہ احتجاجاً زور زور سے بڑبڑانے لگی "جس جذبے کی دی ہوئی اذیتوں میں اتنی لذت ہو وہ ——— وہ محبت کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا اور پیار

ساقی

دور سے آئے تھے ساقی سن کے میخانے کو ہم
بس ترستے ہی چلے افسوس! پیمانے کو ہم —— نظیر

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی
توبہ کرکے توڑ ڈالی جائے گی —— جلیل مانکپوری

ساقی تجھے اِک تھوڑی سی تکلیف تو ہوگی
ساغر کو مرے تھام میں کچھ سوچ رہا ہوں —— عدم

جانے کن نظروں سے دیکھا آج ساقی نے مجھے
میں تو یہ سمجھا کہ مجھ تک دورِ جام آہی گیا —— شکیل

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دُھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں —— انشاء

مرسلہ: ایس خلیق احمد حسن، علیگڑھ

اگر یہ بھی جھوٹا ہو سکتا ہے تو ساری زندگی ایک فریب!" وہ ذہنی ہیجان کی اسی کیفیت میں گھری تھوڑی دیر اپنے سامنے والی بند کھڑکی کو ٹکٹکی باندھے گھورتی رہی۔ اُسی کھڑکی کے پیچھے اُس نے ایک عرصہ کسی کو اپنا منتظر پایا تھا۔ وہ وہاں سے گھنٹوں چُپکے چُپکے سندھیا کو دیکھا کرتا۔ یہ خاموش اور گمنام سا تعلق سندھیا کی زندگی میں پھر ایک طوفان لے آیا۔ وہ پہروں بُت بنی اُسی کے بارے میں سوچا کرتی اور پھر —— ایک ایسا دَور بھی آیا جب وہ اُس اندیکھی انجان شخصیت سے اِس قدر منسوب ہو گئی کہ وہ نجانے کیا کیا باتیں سوچکر اُس کے نام طویل طویل خط لکھا کرتی۔ کبھی اپنی طرف سے کبھی —— یونہی تخیل میں پوچھے ہوئے سوالوں کے جواب دینے کے لئے۔ وہ ہمیشہ منتظر رہتی کہ اُن بند دروازوں کو کھول کر کوئی اُسے آواز دے۔ کہے "سندھیا۔ میں تجھ سے پیار کرتا ہوں۔ تیرا انتظار رہتا ہے مجھے۔ تو میرے پاس آجا!" وہ سوچا کرتی۔ اگر کوئی مجھے اِتنے پیار سے پُکارے گا تو میں —— میں پھر ایک بار سماج کے اصولوں کی ساری دیواریں پھلانگ کر ساری پابندیاں توڑ کر محبت کے آغوش میں جاکر مُنہ چھپا لونگی لیکن —— وہ مسرت بکنار لمحات اُس کی زندگی میں کبھی نہ آتے۔ وہ تو بس خاموش کھڑا سندھیا کو یونہی دیکھا کرتا۔

ادھورے انتظار کی گھڑیوں کے پیروں میں لپٹ لپٹ کر وقت تیزی سے آگے بڑھتا رہا اور بالآخر وہ دِن آپہونچا جب سندھیا کے آنگن میں بابل کے گیت گائے جانے لگے۔ ڈھولک کی تھاپ شہنائیوں کی آواز میں اُس کا تھکا ہوا جسم نئی زندگی کی نئی راہوں پر چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔ سندھیا سے تنہائی کے لمحات چھن گئے۔ گھر کے اندر دنی کمرے میں وہ سارا دن سُکڑی سمٹی بیٹھی رہا کرتی۔ سکھیوں نے اُس کے ہاتھوں پر مہندی لگائی۔ اُسے سنوارا سجایا اور جب وندنا نے اُسے دُلہن بنا کر آئینے کے سامنے کھڑی کرکے کہا "میرا من چاہتا ہے، آج تجھ پر ساری دُنیا کا حسن نچھاور کردوں!" اور فرطِ خوشی میں وندنا نے اُس کی پلکوں کو چوم لیا۔ اچانک سندھیا کے سارے جسم میں آگ سی لگ گئی۔ وہ سوچنے لگی میں چلی جاؤں گی تو وہ منتظر آنکھیں کیسے دیکھینگی۔ اندیکھی آنکھوں کے تصور نے سندھیا کے دل میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ ذہنی کشمکش کے اُسی عالم میں وہ سارے مراحل طے کر گئی۔ اُس نے آنکھیں میچ کے لرزتے ہاتھوں سے کسی کے گلے میں جے مالا پہنادی۔ پوتر اگنی کے سات پھیرے لگا لئے لیکن —— اُس کی آنکھوں میں بسا تصور، اُس تصور کو نہ وہ آگ جلا سکی نہ عمر بھر کے بندھن اُسے ماضی سے جُدا کر سکے۔ سبھی —— بہت راتسے گئے وہ دھیرے دھیرے اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگی۔ وہاں پہونچکر اُسنے بہت مشکل سے بوجھل سی پلکیں اُٹھا کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ نظریں اُٹھتے ہی اُس کا سارا جسم کانپ گیا۔ کھڑکی کے شیشوں پر کسی نے سیاہی پوت دی تھی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کے لئے پیار کے دروازوں کو کسی نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مقفل کر دیا ہو۔

"یہ تیری تقدیر ہے سندھیا! تیرے لئے زندگی میں ہمیشہ یونہی دروازے بند ہوتے رہیں گے" وہ اپنے تصور کو سیاہ شیشوں میں ٹٹولنے لگی۔ اچانک سندھیا کے سینے میں سوئی ہوئی بغاوت جاگ اُٹھی۔ اُس پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی اور پھر —— غیر شعوری طور پر اُس کے قدموں نے بغاوت پر آمادہ خیالوں کا کہا مان لیا۔ وہ دبے دبے پیروں سے گھر سے نکل گئی۔ اُس کے دروازے پر پہونچ کر سندھیا نے زور زور سے دستک دی۔

"کون ہے؟" کچھ دیر کے بعد گھٹی گھٹی آواز میں کسی نے پوچھا۔

"میں —— میں ہوں سندھیا!" اُس نے ہانپتے ہوئے جلدی جلدی کہا "دروازہ کھول دیجئے"

"تم!" وہ سندھیا کو اپنے سامنے کھڑی دیکھ کر متحیر ہو گیا۔

"ہاں میں آگئی!" سندھیا نے گہری لمبی سانس لے کر کہا اور اندر داخل ہو گئی۔

"لیکن تم کیوں آئی ہو یہاں پر؟" اُس کے چہرے پر حیرت اور اُلجھن کے تاثرات اُبھر آئے۔ "مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں آگئی!" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سندھیا کو گھورتا رہا اور ــــ سندھیا نے روہانسی آواز میں کھڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا "اس سیاہی نے آج مجھے بے بس کر دیا۔ میں ہار گئی" سندھیا کی آواز شدّتِ جذبات سے بھاری ہو گئی۔ "میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ اِس گمنام سے تعلق میں اتنی شدت آجائیگی۔ میں ــــ میں تو اپنے ماضی سے دُور بھاگنے کی غرض سے اِس شہر میں آگئی تھی تاکہ فاصلے مجھ سے اُن کی قُربت کا احساس چھین لیں۔ میرے دل سے دُوری کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ لیکن" سندھیا کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیرنے لگے۔ "لیکن میری تقدیر نے مجھے یہاں بھی چین نہ لینے دیا۔ تھوڑے ہی دن کے بعد مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ کسی کی آنکھیں یہاں بھی میرا تعاقب کرنے لگی ہیں۔ میں یہاں بھی کسی کے انتظار کی منزل بن گئی ہوں!" سندھیا نے ایک لمحہ ٹھہر کر دوپٹے کے آنچل سے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھے اور پھر اُس کی طرف دیکھ کر کہا "آپ اِس کھڑکی سے گھنٹوں میری طرف دیکھا کرتے ــــ میں نے کبھی آپ کو نہیں دیکھا مگر آپ کا اندیکھا تصور ــــ میں ایکبار پھر جذبات کے طوفانوں میں گھر کر غوطے کھانے لگی۔ میں نے بارہا کوشش کی کہ دل کے بند دریچوں سے جھانکتے ہوئے خوابوں سے منہ موڑ لوں تاکہ وہ پیار جس کا نشہ رفتہ رفتہ ڈھل سا گیا تھا پھر کسی نئے عنوان کا سہارا لے کر نہ جاگ اُٹھے ــــ مگر اِس کم بخت دل نے وہ بھی تو نہ کرنے دیا۔ مجھے آپ کے سامنے بیٹھے رہنے میں سکون سا ملنے لگا۔ آپ کو یقین نہ آئیگا میں کس کس دَور سے گزر رہی ہوں۔ میں نے خود کو لاکھ سمجھایا کہ ہر سائے کی طرف دوڑنے سے کچھ نہ ملے گا۔ لیکن ــــ محبت تو سدا کی اندھی رہی ہے۔ میں کچھ سوچ سکی نہ سمجھ سکی۔ میرے دل میں بس ایک ہی بات تھی کہ جو پیار آنکھیں کھول کر کیا جائے اُس میں کھوٹ آجاتا ہے۔ میں بہکتی رہی۔ میری عجیب حالت ہو گئی۔ ساری ساری راتیں میری آنکھوں سے گزر جاتیں۔ میں پاگلوں کی طرح تنہا بیٹھی بیٹھی آپ کے تصور سے باتیں کیا کرتی۔ نت نئے ناموں سے میں نے آپ کے نام بے شمار خط لکھے، پھاڑ دیئے جلا دیئے۔ اور ....." اُس نے سندھیا کی بات کاٹ دی "لیکن ایک انجان آدمی سے تمہیں اتنا لگاؤ ہو کیسے گیا؟" یہ کہکر وہ سندھیا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ سندھیا کی آنکھوں میں پھر آنسو اُمڈ آئے۔

"آپ میرے لئے انجان ضرور تھے ــــ آپ کہیں گے یہ عجیب لڑکی ہے لیکن یہ سچ ہے کہ محبت ہی عورت کی زندگی کا عنوان ہے۔ وہ ہر موڑ پر کسی کے پیار کا مرکز بننا چاہتی ہے۔ آپ کے اندر ــــ مجھے ہر لمحہ ایسا محسوس ہوتا جیسے راجیش کی آنکھیں میرا پیچھا کر رہی ہیں۔"

"یہ راجیش کون تھا؟" وہ ایکدم جیسے کسی خواب سے چونک کر اُٹھ گیا۔ اُس کے سوال پر سندھیا کے پیروں کی جان سی کھنچ گئی۔ اُس نے پیچھے ہٹ کر دیوار کا سہارا لے لیا۔ "راجیش!" وہ راجیش کے تصور میں کھو گئی۔

"میں راجیش سے محبت کرتی تھی۔ میں نے راجیش کے تصور کو پوجا، میں نے اُس کی پرستش کی۔ میں تو چاہتی تھی کہ اُنھیں جتنا پیار دے سکوں دوں۔ لیکن میری بدنصیبی ــــ ہمیشہ میرے آگے آگے چلتی رہی میرا بھگوان ساکشی ہے، میں نے اُن کے سوا زندگی میں کبھی کسی کو پیار نہ کیا۔ میں کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ لیکن ــــ جب اُنہیں پانے کی

شوق

شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا ــــ غالبؔ

وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا ــــ غالبؔ

ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلّی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے ــــ اقبالؔ

عرضِ نیازِ شوق سے گھبرا کے رہ گیا
دل رازدارِ حسن تھا شرما کے رہ گیا ــــ جگرؔ

لذّتِ جستجو یہ کہتی ہے
منزلِ شوق دور ہو جائے ــــ نا معلوم

مرسلہ: نذرالدین اقبال عمرنگری

اُمیدیں بالکل دُھندلی ہو کر اندھیروں میں جا کھوئیں تو مجھے ——— مجھے ہر طرف راجیش ہی راجیش کا تصور نظر آنے لگا۔ جس کسی میں راجیش کی جھلک نظر آئی میرے خیالات اُسی کی طرف کھنچتے چلے گئے۔ ذرا ذرا سی شباہت پر پاگلوں کی طرح نجانے کتنے لوگوں کا پیچھا کیا میں نے اور ——— اور ———" پھر سندھیا کی سسکیاں کمرے میں گونجنے لگیں "میں پیار کی آگ میں جھلستی رہی۔ مجھے ہر ایک نے اپنی اپنی نظر سے دیکھا۔ میرے جذبات کو کسی نے سمجھنے کی کوشش نہ کی ——— عورت تھی نا ——— صرف اسی لئے میری جستجو کو لوگوں نے من چاہے ہزار برے برے نام دے ڈالے۔ میرے پیار کو آوارگی، بد چلنی کہا۔ جو نظر میری طرف اُٹھی اس میں کوئی غرض چھپی رہی ہوتی تھی ہر نگاہ میں۔ مجھ سے ہر قدم پر پیار کے ناٹک کھیلنا چاہے لوگوں نے۔ سچا سا سراب بن گیا میری زندگی میں۔ میں دوڑتی رہی وہم و گمان کے سایوں کے پیچھے پیچھے۔ جب میں مایوس ہو گئی تو ——— تو مجھے نفرت ہو گئی محبت سے محبت کرنے والوں سے۔ مجھ سے کوئی ہمدردی کی باتیں کرتا تو مجھے یوں لگتا ——— میرے منہ پر تھوک دیا ہو کسی نے۔ میں تلملا اُٹھتی۔ میری زندگی کا یہ دوسرا دَور ——— مجھ سے رہے سہے اپنوں کو بھی چھین کر لے گیا۔ میں ساری دُنیا میں خود کو اکیلی محسوس کرنے لگی۔ غموں سے فرار کے لئے میں نے اپنے گرد چھوٹی خوشیوں کا خول چڑھا کر جینے کی آرزو کی۔ میں نے بھلا دینا چاہا ماضی کی ساری یادوں کو لیکن ——— زندگی کا دکھ کھلا رہا ——— میں زندہ لاش کی طرح خود کو اُٹھائے پھرتی رہی۔ پریشان، بدحال سی۔ لیکن میرے لاشعور میں سویا ہوا پیار ہمیشہ کلبلاتا رہا۔ مجھے یاد ہے ——— ایک ایک بات یاد ہے اُن کی۔ ایک بار جب میں نے کسی خوف کی بنا پر راجیش سے کہہ دیا تھا "راجو تم نے مجھے اپنی قربت کا اتنا عادی بنا دیا ہے کہ گوارا نہ کرے، تم مجھ سے ایک پل کے لئے بھی دُور ہو گئے تو ——— تو میں تنہائی کے احساس سے گھٹ کے مر جاؤں گی۔" تو انہوں نے بہت اعتماد سے کہا تھا "اللہ ہٹ پگلی! جس پیار کو جسمانی فاصلے ڈس لیں وہ محبت نہیں ——— وہم ہوتا ہے سندھیا۔ صرف وہم! تو مجھے جب بھی آواز دے گی میں آ جاؤں گا۔ جہاں ڈھونڈے گی مل جاؤں گا۔" مجھے بالکل وشواس تھا اُن کی ایک ایک بات پر۔ لیکن پھر بھی مجھے ڈر سا لگتا تھا۔ میں نے اپنے اطمینان کے لئے کہہ دیا "اچھا۔ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ راجو کہ ہمیشہ میرے رہو گے"! تو جانتے ہیں انہوں نے کیا کیا؟ میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چوم کر کہا "میں اپنی زندگی کی ساری خوشیوں کی قسم کھاتا ہوں سندھیا بہاتھ اگر تو میرے ہاتھوں سے نہ چھوٹے گی تو میں کبھی نہ چھوڑوں گا!" اور پھر مجھے سمجھانے لگے "محبت تو ہی سچی ہوتی ہے جس میں بغاوت کی بو آتی ہو۔ غلام ذہنوں میں جنم لے کر تو پیار ——— ایک داغ بن جاتا ہے عمر بھر کے لئے۔" "میں سمجھی کہ انہیں میرے پیار پر شک ہو رہا ہے" "تو کیا تمہیں مجھ پہ وشواس نہیں ہے راجیش؟" میں نے احتجاجاً کہا۔

"ارے وشواس تو ہے اپنی سندھیا پہ۔ پر تو ایسی اُلٹی اُلٹی باتیں سوچتی کیوں ہے؟" اِس کے بعد ——— پھر نہ میں نے اُن سے کبھی قسم مانگی نہ انہوں نے کبھی یقین دلانے کی ضرورت سمجھی۔ ہم ایک دوسرے کے اور قریب آ گئے۔ ایک دوسرے کی سانسوں میں رچ بس گئے۔ وہ میری تمناؤں کی، میری خوشیوں کی منزل بن گئے اور میں ——— وہ کہا کرتے "میری سندھیا! تو ہی میرا جیون ہے!" ہم گھنٹوں ساتھ بیٹھے باتیں کیا کرتے، وہ ضد کرتے "سندھیا تو ہی باتیں کرتی رہ۔ تیری آواز میں بڑا نشہ ہے۔" اور میں ——— میں کہتی "نہیں راجو تم بولو۔ میں آنکھیں بند کر کے تمہارے کاندھے پر سر رکھے سنتی رہوں گی۔ مجھے نیند آ جائے گی ——— اور پھر نہ وہ کچھ بولتے نہ میں کہتی۔ بس آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیر تک یونہی دیکھا کرتے ایک دوسرے کو۔ اُن کے پیار میں بڑا اچھوتا پن تھا، اُن کے ہر انداز سے بے پناہ محبت ٹپکتی۔ کبھی کبھی اُن کی چاہت پر مجھے خود پر غرور سا ہونے لگتا۔ وہ مجھے نجانے کتنے روپوں میں دیکھنا چاہتے۔ کبھی مجھے اپنے سامنے بٹھا کر آہستہ آہستہ گنگنانے لگتے، کبھی میری تصویر بنانے، کبھی ——— میرے چہرے پر گھونگھٹ نکال کر آہستہ سے اُٹھا کر کہتے "سندھیا میری طرف دیکھنا"۔ مجھ سے اُن کی طرف دیکھا نہ جاتا۔ میری آنکھیں شرم سے جھک جاتیں۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے۔ "اے سندھیا۔ تیری ایک بات مجھے بالکل اچھی نہیں لگتی۔"

میں ایک دم سہم گئی۔ میں نے جلدی سے پوچھا "کیا بات ہے میرے راجہ؟ جلدی سے بتاؤ نا"۔ تو وہ بے حد سنجیدگی سے میری آنکھوں میں جھانک کر بولے "بتا تو دوں گا، لیکن تو برا مانے گی؟" میں اور پریشان ہو گئی تو جھٹ میرا ہاتھ پکڑ کر کہا "بیٹھ جا!" میں جلدی سے بیٹھ گئی۔ "ایسا ہے سندھیا" اُن کے چہرے پر اور سنجیدگی آ گئی "تو میری ہر بات مان لیتی ہے نا۔ یہی مجھے اچھا نہیں لگتا"۔ میری جان میں جان آئی اور میں زور سے ہنس دی۔ "سُن تو سہی کبھی کبھی روٹھا بھی کر، ضد بھی کیا کر، ناراض ہو جایا کر۔ تو روٹھے گی میں

تجھے بتاؤں گا۔ کتنا اچھا لگے گا!" میں نے اُن کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے چہرے سے لگالئے "اچھا بابا! اب روٹھ جایا کروں گی" پھر نہ جانے کیا سوچ کر پوچھنے لگے "اچھا سندھیا یہ بتا ـــــ اگر تیرے گھر والوں نے کبھی مجھ سے ملنے کو منع کیا تو ـــــ کیا میرے پاس نہ آئے گی؟" میں نے یونہی چھیڑنے کی غرض سے کہدیا "گھر والے منع کردیں گے تو کیسے آؤں گی تم سے ملنے؟" میرا اتنا کہنا تھا کہ اُن پر ایک دم اُداسی کے پہاڑ سے ٹوٹ پڑے۔ آنکھوں میں ویرانیاں سمٹ آئیں۔ میرا ہاتھ زور سے تھام لیا "نہیں سندھیا! کہدے یہ جھوٹ ہے! ایسا کبھی نہیں ہوگا!" اُنکی آواز سے غم چھلکنے لگا "اگر تُو نے بھی ساتھ چھوڑ دیا تو ـــــ پھر کون ہے اِس دنیا میں جس پر اپنا اندھا وشواس کرلوں گا۔" میں حیرت سے اُن کا منہ تکتی رہی "راجو! میں نے تو ویسے ہی کہدیا تھا۔ تم سچ کیوں سمجھ رہے ہو؟" لیکن اُن پر وہی کیفیت طاری رہی۔ "ہاں سندھیا بھول سے کہی ہوئی باتیں بھی کبھی کبھی سچ ہو جاتی ہیں۔ میری سندھیا بھی تو ایک لڑکی ہے، اُن بے شمار لڑکیوں جیسی جو پیار کی دُنیا میں قدم رکھتی ہیں تو بس جھک کر وہ بس پیار کرینگی اُسی کے لئے جئیں گی، مر جائیں گی اُسی کے لئے۔ بڑی بڑی قسمیں کھاتی ہیں لمبے چوڑے وعدے کرتی ہیں۔ لیکن ـــــ حالات کی ایک معمولی سی کروٹ سے وہ اتنی بدل جاتی ہیں کہ کوئی پہچان بھی نہیں سکتا!" میری آنکھوں میں آنسو آگئے تو اُنہوں نے اپنے دامن سے میرے آنسو پونچھ دیئے۔ "کیا سوچتے رہتے ہو، سوچتا ہوں۔ میری سندھیا بھی ایسی ہی ہوگئی تو کیا رہ جائیگا زندگی میں؟" میں دیکھ رہی تھی اُنکی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ میں نے بہت سمجھایا، قسمیں کھائیں اور جب وہ کسی طرح نہ مانے تو میں نے ہار کر کہہ دیا "لو راجو میرا گلا گھونٹ دو! اُف بھی کر جاؤں تو دنیا کی ساری تہمتیں میرے سر لگا دینا۔ پھر ـــــ اُنہیں جیسے یقین آگیا۔ ساری باتیں بھول سے گئے۔ لیکن ـــــ اُن کے وہم کس قدر سچے تھے۔ حالات نے ایک دم کروٹ بدلی۔ ہمارا پیار گلی گلی بدنام ہوگیا۔ مجھ پر پابندیاں لگ گئیں۔ بلا سوچے سمجھے نہ چاہتے ہوئے بھی میں بدل سی گئی۔

وہ میرے خیالات سے کبھی ایک پل دُور نہ رہے۔ لیکن میں نے یہ ظاہر کرنیکی کوشش کی کہ میں اب وہ سندھیا نہیں رہی ہوں۔ کھچی کھچی سی رہنے لگی۔ کبھی مل جاتے تو بچ کر نکل جاتی، سامنا ہو جاتا تو منہ پھیر لیتی۔ میں نہیں جانتی یہ خودداری تھی یا نفرت ـــــ ان کے انداز بھی اچانک بدل گئے۔ وہ مجھے بالکل نظر انداز کرنے لگے۔ عورت دنیا کی ہر تکلیف برداشت کرسکتی ہے۔ لیکن اُس سے یہ کبھی نہیں سہا جاتا کہ اُسے کوئی پیار کرکے نظر انداز کردے۔ میں ذمہ دار تھی ساری باتوں کی مگر ـــــ مجھے اُنھیں پر غصہ آیا پھر ـــــ پھر میرے اندر احساسِ جرم سر اٹھانے لگا۔ میں ترسنے لگی راجو کی باتوں کو۔ جب مجھ سے نہ رہا گیا تو میں نے پھر فیصلہ کرلیا کہ اپنے راجو کے پاس جاؤں گی۔ راجیش میرا ہے۔ میں معافی مانگ لوں گی اُن سے۔ جو سزا دینگے منظور کرلونگی، جو کہیں گے مان لونگی۔

ایک رات میں چپکے سے راجیش کے پاس چلی گئی۔ میں نے آہستہ سے سہمتے سہمتے دروازہ کھٹکھٹایا۔ "کون! سندھیا؟" اُنہوں نے اس طرح سے دروازہ دیکر دروازہ کھولدیا جیسے ـــــ میرا ہی انتظار ہو۔ میرے قدموں کی آہٹ بھی پہچان لی ہو۔ میں گھبرائی ہوئی اُن کے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے دیکھا .... "سندھیا پھر دل لے لگی" اُنہوں نے بُری طرح سے شراب پی رکھی تھی۔ اُن کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں جیسے بہت دنوں سے آنکھیں بھی نہ جھپکی ہوں۔ اُن کے بستر پر شراب کی خالی بوتلیں اور میرے خط بکھرے پڑے تھے۔ مجھ سے ضبط نہ ہوا۔ میں رونے لگی۔ "راجو۔ یہ تم کیا کر رہے ہو۔ تم نے کیا حال بنا لیا ہے اپنا؟"

اُنہوں نے تھکی تھکی آنکھیں میرے چہرے پر گڑا کر کہا "روتی کیوں ہے پگلی؟ یہ تو تیری دی ہوئی خوشیاں ہیں۔ اُنہیں ہی سمیٹ رہا ہوں!" اُن کا ایک ایک لفظ میرے سینے میں پیوست ہوتا چلا گیا۔ میں تڑپ اُٹھی۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر راجو سے التجا کی "بھگوان کے لئے راجو شراب مت پیو!" تو اُنہوں نے بہت تھکے ہوئے لہجے میں کہا، "یہ شراب ـــــ اب تو لے دے کر یہی ایک ساتھی رہ گئی ہے۔ ہاں اگر تیرے پاس کچھ اور ہو میرے لئے تو ـــــ دے جا!" میرا جی چاہا کہ اپنی زندگی دیدوں لیکن ـــــ میری جگہ تو شراب نے لے لی تھی۔ میں نے جلدی سے کہدیا "ہاں، ہاں۔ مجھ سے مانگو تو سہی راجو ـــــ میں سب کچھ دیدونگی!" میں نے ایک ہی سانس میں بہت ساری قسمیں کھاکر وچن دیدیا۔ اُن کے چہرے پر بے حد پُرسکون مُسکراہٹ پھیل گئی "اچھا تو ایسا کر" اُن کی آواز بہت بھاری ہوگئی "اگر تیرے پاس ہو تو سندھیا ـــــ مجھے پتھر کا ایک دل دیدے!" بس اِتنا ہی کہہ پائے تھے کہ اُنکی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اُنہوں نے میری طرف سے منہ پھیر لیا۔ اُن کی بات سُن کر میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔ لیکن میں کہتی بھی کیا اُن سے ـــــ ساری رات وہ مجھ سے ایسی ہی باتیں کرتے رہے۔ وقت تیزی سے

گزرتا رہا۔ صبح ہونے لگی تو [illegible] کہا" اب میں چلوں راجو، پھر کبھی آؤں گی۔" میں نے جانے کے لئے پیٹھ موڑی تو اُنہوں [illegible] آواز دیکر مجھے روک لیا" سُن سندھیا! میرے قدم ایک دم رُک گئے" [illegible] میں نے جو بھی کہا ـــــ اپنی ہی سمجھ کر کہدیا۔ اگر کوئی بات بُری لگی ہو تو [illegible] کر دینا!"

"میں کتنی بدنصیب [illegible] کہ تمہیں مجھ سے یہ کہنا پڑ رہا ہے" میں نے آنسو روکتے ہوئے کہا اور بھاری بھاری قدموں سے لوٹ آئی۔ سارے راستے میرے کانوں میں راجو کی آواز گونجتی رہی۔ اور ـــــ جیسے ہی میں نے گھر میں قدم رکھا مجھ پہ مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ہر نظر مجھے کھانے کو دوڑنے لگی، جس کے مُنہ میں جو آیا کہہ دیا۔ میں مجرموں کی طرح خاموش آنکھیں جھکائے سُنتی رہی۔ اُس کے بعد ـــــ اُس کے بعد میں اُن کی آواز کو، اُن کی صورت کو ترس گئی۔ وہ مجھے دُنیا والوں کے بے رحم ہاتھوں میں تنہا چھوڑ کر نجانے کہاں چلے گئے۔ مجھ سے میرا راجو چھین گیا۔ لیکن اُن کے دئے ہوئے پیار کی آنکھیں میرے من میں ہر وقت کسکتی رہیں۔ اُن کا پیار میرے لئے کبھی نہ بجھنے والی پیاس بن گیا۔ نہ مجھے رات چین ملا نہ دِن آرام۔ عورت کی فطرت ہے ـــــ وہ پہلی بار اُس مرد سے محبت کرتی ہے جو اُسے چاہتا ہے۔ لیکن اُس کے بعد ـــــ اُسے صرف پیار سے پیار رہ جاتا ہے۔ مجھے ہر ایک کے پیار میں راجو کی تصویر دکھائی دیتی۔ میں قدم قدم پر بہکی، بھٹکی لیکن ـــــ محرومیاں میری تقدیر بن گئیں!"

سندھیا تھوڑی دیر خلا میں گھورتی رہی جیسے وقت کے اندھیروں میں کھوتے پیار کو ڈھونڈ رہی ہو۔

"مگر سندھیا" اُس نے بہت پُرسکون لہجے میں سوال کیا "کسی کی جیون ساتھی بننے کے بعد آج ـــــ تمہارے دل میں اِس بغاوت نے کیوں سر اُبھارا؟" سندھیا نے کھوئے ہوئے انداز میں راجیش کا وہی جملہ دُہرایا" محبت وہی سچّی ہوتی ہے جس میں بغاوت کی بُو آتی ہو۔ غلام ذہنوں میں جنم لے کر تو پیار ـــــ ایک داغ بن جاتا ہے عمر بھر کے لئے۔ اِسی لئے آج آپ کے پیار کے لئے میں یہ سب کچھ کر گزر رہی ہوں!"

"سندھیا! اگر تم عمر بھر کے داغ دھونے آئی ہو تو" اُس کی آواز بے حد فیصلہ کُن تھی "تو سُنو! تم جس کی تلاش میں آئی ہو۔ میں ـــــ وہ نہیں ہوں!" سندھیا کے کانوں میں ایک دم سیٹیاں سی بج اُٹھیں، اُس نے ہانپتے ہوئے کہا" آپ کون ہیں؟" اور وہ سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ "میں ـــــ میں

تو سندھیا اپنے اُس دوست کو دیکھنے آیا تھا جو تمہیں اِس کھڑکی سے دیکھا کرتا تھا" اُس نے کھڑکی کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"کہاں ہیں وہ؟" سندھیا گھبراہٹ میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی

"آؤ ـــــ" وہ اُس کا ہاتھ تھام کر برابر والے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔

"بڑے وقت سے آگئیں تم ورنہ ـــــ" وہ بمشکل کہہ پایا "شاید کبھی نہ دیکھ پاتیں اُسے!" یہ سُنتے ہی سندھیا سکتے میں آگئی۔ اُس کا سارا جسم لرز اُٹھا۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر بے تحاشا کمرے میں داخل ہو گئی اور ـــــ اندر جاتے ہی اُس کے ہاتھ پیر برف کی مانند ٹھنڈے پڑ گئے۔

راجیش اپنی زندگی کے آخری مراحل طے کر رہا تھا۔ وہ چیخ کر راجیش سے لپٹ گئی۔ اُس نے عالمِ بیخودی میں اُسے جھنجھوڑ ڈالا "یہ سب کیسے ہو گیا میرے راجو ـــــ کیسے ہو گیا؟" راجیش نے ایک بار اپنی ساری قوتیں یکجا کر کے زندگی کا ہاتھ موت سے چھڑانے کی کوشش کی۔ اُس کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلے۔ "سندھیا!" اُس کی آواز ڈوبتی گئی "وہ میرا دوست روی تھا۔ اُسے آواز دے لے پگلی ورنہ ـــــ وہ بھی چلا جائے گا!" سندھیا کے کانوں میں راجیش کے الفاظ پگھلے سیسے کی طرح بہنے لگے۔ اُس نے بوکھلاہٹ میں اُٹھ کر زور سے کھڑکی کے دونوں پٹ کھولکر باہر جھانکا۔ تیزی سے دوڑتی، غبار اُڑاتی بہت سی کاریں اُس کے سامنے سے گزر گئیں۔

"روی ویڈس سندھیا" (RAVI WEDS SANDHIA)

وہ آنکھیں پھاڑے ہر کار پہ چپکے لیبل کو دُور تک دیکھتی رہی!!۔

طنزیہ

شوخیٔ گفتار

رحمت جمال

۱۸/۲- مومن پور روڈ، کلکتہ نمبر ۲۳

محترم خوشتر گرامی صاحب، خلوصِ بیکراں

ایک مختصر مضمون "شوخیٔ گفتار" لے کر بزم "بیسویں صدی" میں شریک ہونے کی جسارت کر رہا ہوں۔ یہ اقبال کی زندگی کے کچھ لطائف ہیں جن سے اقبال کی زندہ دلی اور بذلہ سنجی پر روشنی پڑتی ہے۔ اقبال کی زندگی کے اس گوشے کو قطعی نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ اُمید ہے آپ اور قارئینِ "بیسویں صدی" میری اس کاوش سے محظوظ ہوں گے . . .

آپ کی رائے کا منتظر

آپ کا ——— رحمت جمال

★

زندگی ایک خوبصورت قوسِ قزح ہے اور ظرافت اُس قوسِ قزح کا ایک شوخ رنگ ہے جو زندگی کو زندہ اور شگفتہ بناتی ہے۔ اقبال کا جسدِ خاکی بھی اِسی آب و گِل سے بنا تھا۔ نجی زندگی میں وہ بہت بذلہ سنج تھے۔ بات سے بات پیدا کرنا اقبال کا طُرّۂ امتیاز تھا۔ اقبال کے مذاق میں ایک گہرا استہزا ہوتا تھا۔ اُس میں تحقیر یا نفرت کا احساس بالکل نہ ہوتا تھا۔ اپنی اِسی خصوصیت و انفرادیت کی بدولت وہ جس محفل میں ہوتے چھا جاتے تھے۔ ایسے ہی چند خوشگوار لمحوں کے کچھ عکس پیشِ خدمت ہیں۔

ایشیا اور یورپ کا فرق

جس زمانے میں اقبال کیمبرج میں زیرِ تعلیم تھے، ایک دن دوستوں میں یہ بحث چھڑ گئی کہ کیا بات ہے کہ جتنے بانیانِ مذاہب ہوئے وہ ایشیا ہی میں ہوئے۔ ڈاکٹر اقبال نے فرمایا کہ "اصل بات یہ ہے کہ شروع ہی میں اللہ میاں اور شیطان نے اپنا اپنا پینترا جما لیا۔ اللہ میاں نے ایشیا کو پسند کیا اور شیطان نے یورپ کو!"

"تو پھر شیطان کے پیغمبر کیا ہوئے؟" ایک صاحب نے سوال کیا۔

"یہ کیا تمھارے میکاؤلی وغیرہ ہیں۔" اقبال نے جواب دیا۔

غیر متوقّع حادثہ

۱۹۰۷ء میں جب اقبال انگلینڈ میں تھے، ایک دن لیڈی ایلیٹ نے ایک شاندار پارٹی دی جس میں اقبال بھی مدعو تھے۔ اقبال لوگوں سے محوِ گفتگو تھے کہ ایک خاتون جن کا نام مِس سروجنی داس تھا، گہنوں سے لدی پھندی تمام لوگوں کو نظرانداز کرتے ہوئے سیدھے اقبال کے پاس پہنچیں اور اُن کا ہاتھ تھام کر کہنے لگیں "مسٹر اقبال! میں صرف آپ سے ملنے کے لئے یہاں آئی ہوں۔" اقبال نے آہستہ انداز میں جواب دیا "یہ حادثہ میرے لئے اتنا غیر متوقّع ہے کہ مجھے حیرت ہوگی اگر میں اِس کمرے سے زندہ واپس

چلا گیا۔

سِتاروں کا جھرمٹ

اُسی زمانے کا ایک واقعہ ہے۔ ایک دن ویگی ناسٹ، سینی گال، مس کیڈ آرنا ٹھ اور عطیہ بیگم ورزش کر رہی تھیں۔ سب ایک حلقے میں کھڑی تھیں۔ اُسی دَوران اقبال آگئے۔ یہ سماں دیکھ کر بُت کی طرح خاموش کھڑے ہوگئے۔ ویگی ناسٹ نے ٹوکا "اِس طرح کیوں گھُور رہے ہو؟" اقبال نے کہا "میں نجومی ہوگیا ہوں اور سِتاروں کے حسین جھرمٹ کا مطالعہ کر رہا ہوں!"

وعدہ اور مُسلمان

۱۹۲۷ء کا واقعہ ہے۔ اُن دنوں پنجاب کے مُسلمانوں میں اپنی حق تلفی کا بہت چرچا تھا۔ اُس وقت ڈاکٹر سر جارج اینڈرسن محکمۂ تعلیماتِ پنجاب کے ڈائرکٹر تھے۔ ایک وفد ڈائرکٹر موصوف کے پاس گیا۔ علامہ اقبال بھی اُس وفد میں شریک تھے۔ شکایت سُننے کے بعد ڈائرکٹر موصوف نے ہمدردی جتاتے ہوئے کہا۔ "جہاں جہاں حق تلفی یا بے قاعدگی ہوئی ہے میں اُس کی تلافی کی پُوری پُوری کوشش کروں گا۔" اِس رسمی جملے کو سن کر اقبال نے فوراً کہا "اجی صاحب! اِتنی کاوش مت کیجئے گا۔ ہم لوگ مُسلمان ہیں، آپ کے وعدہ ہی سے خوش ہوگئے۔ اب کچھ کرنے کرانے کی ضرورت نہیں۔"

آسمانی زبان

جب اقبال کیمبرج میں تھے تو کچھ طلباء نے سیر و تفریح کی غرض سے ایک پارٹی بنائی اور اقبال کو اُس پارٹی کا سربراہ بنایا گیا۔ اقبال چلتے جاتے تھے اور مختلف مقامات کے بارے میں تاریخی واقعات بھی بتاتے جاتے تھے۔ جب وہ لوگ کونگ اسٹال (ایک بادشاہ کا قدمچہ) کے پاس پہنچے تو اقبال اُچھل کر اُس پر بیٹھ گئے اور اُردو میں مزاحیہ اشعار سنانے لگے۔ ایک جرمن طالب علم نے پُوچھا۔

اشعار کا مطلب کیا ہے؟ اقبال نے کہا" نادیدہ خدا کی طرف سے مجھے یہ کہا گیا ہے کہ میں آپ لوگوں کو آسمانی زبان میں حکم دوں کہ آپ ایک میجک سرکل بنائیں اور پھر فرشتوں کا نغمہ سنائیں"

حُور ملکہ

ایک دن طلباء کی ایک پارٹی لندن کے ایک باغ "فردوس" کی سیر کے لئے گئی۔ یہ باغ کسی بادشاہ نے بنوایا تھا جس میں سارے مذاہب کی عبادت گاہیں تھیں۔ اُس میں ایک مسجد بھی تھی جو آبشاروں، جھیلوں اور پھلدار درختوں کے درمیان تھی۔ مسجد میں جگہ جگہ اللہ اور مختلف سورتوں کی کچھ آیات بھی کندہ تھیں۔ ہر شخص یہ جاننے کا خواہش مند تھا کہ ان تحریروں کا مطلب کیا ہے؟ اقبال نے نہایت سنجیدگی سے اُن کتبوں کو پڑھا اور یہ بتایا" جس بادشاہ نے یہ باغ تعمیر کیا تھا اُسے اتفاق سے ایک حُور مل گئی اور وہ یہ چاہتا تھا کہ اُس سے شادی کرے۔ حُور نے کہا میں آپ کی ملکہ بننے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ آپ مسلمان ہو جائیں اور ایک مسجد تعمیر کریں جہاں ہمارا نکاح پڑھایا جائے گا۔ بادشاہ نے اُس کا حکم مان لیا اور ایک مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیا جو اب تک موجود ہے۔ یہیں اُنکا نکاح پڑھایا گیا"

اقبال نے اس سنجیدگی سے سارا واقعہ بیان کیا کہ بہتوں کو یقین ہو گیا کہ یہ سارا واقعہ تاریخی ہے۔

طلائی استرا

لندن میں مس عطیہ بیگم کے گھر ایک پارٹی تھی۔ اُس پارٹی میں ایک لڑکی بھی تھی جس کے بال بہت خوبصورت اور سنہرے تھے۔ وہ بہت نوعمر تھی اس لئے رُخسار پر نرم نرم سنہری روئیں زیادہ نمایاں تھیں۔ اقبال نے مس عطیہ کو مخاطب کر کے یہ شعر پڑھا

اِس کے عارض پہ سنہرے بال ہیں
ہو طلائی استرا اِس کے لئے

خُدا اور انسان

ایک جرمن سیّاح علّامہ اقبال کے پاس آیا۔ یہ سیّاح جہاں گرد تھا۔ اُس نے اپنی ڈائری دکھائی جس میں ہر مُلک کے مشہور و معروف لوگوں کے دستخط تھے۔ اُس نے ڈائری اقبال کے سامنے پیش کی اور عرض کیا کہ آپ بھی اس میں کچھ لکھ دیں۔ اقبال نے فارسی کا ایک قطعہ لکھ کر دستخط کر دئے۔ اُس سیّاح نے پھر سوال کیا" آپ کس چیز کی تعلیم دیتے ہیں؟"

اقبال نے فرمایا" میرے آبا و اجداد نے اپنی عُمر اِس فکر میں گزار دی کہ خُدا کیا ہے اور میں اِس فکر میں گزار رہا ہوں کہ انسان کیا ہے؟"

آجرین !

ہرماہ اپنے ملازمین کو تنخواہ دیتے وقت از راہِ کرم اس بات کا اطمینان کرلیں کہ

(i) اگر اُن کی تنخواہ ۵ ہزار روپے سالانہ (بشمول دیگر آمدنی) سے بڑھ گئی ہے تو جس جگہ سے اُنہیں تنخواہ ملتی ہے، وہاں اُن کا صحیح ٹیکس وصول کرلیا گیا ہے۔

(ii) اس طرح ٹیکس کی جو رقم وضع کی گئی ہے، ایک ہفتہ کے اندر اندر وہ مرکزی حکومت کے کھاتے میں جمع کروا دی جائے۔

مہربانی کرکے قانون کے تقاضوں کو پورا کریں اور اپنے آپ کو جُرمانہ، سزا اور قانونی چارہ جوئی سے بچائیں۔

مزید معلومات کے لئے اپنے انکم ٹیکس افسر / محکمۂ انکم ٹیکس کے افسرِ تعلقاتِ عامہ سے رابطہ قائم کریں۔

جاری کردہ

ڈائریکٹوریٹ آف انسپکشن

(ریسرچ، سٹیٹسٹکس اینڈ پبلی کیشن)

میور بھون، کناٹ سرکس، نئی دہلی

DAVP 73/168 (Urdu)

غزلیں

شاہد ساگری

پھولوں میں گلستاں کے مہک تیرے بدن کی
شاخوں نے بھی پائی ہے لچک تیرے بدن کی

کرتا ہے قمر رُخ سے ترے کسبِ تجلّی
شرماتی ہے تاروں کو چمک تیرے بدن کی

حیران ہیں آنکھیں کہ نظر تک نہیں جمتی
آئینہ سے بڑھ کر ہے دمک تیرے بدن کی

ہر شب مہ و اختر کو ترے سامنے کر کے
تصویر اُتارے ہے فلک تیرے بدن کی

گلشن میں جو کھلتے ہیں یہ اندازِ حسیں سے
اِن پھولوں میں شاید ہے چٹک تیرے بدن کی

اے دوست فقط لالہ و گُل ہی نہیں شیدا
شاہد کے بھی دل میں ہے کھٹک تیرے بدن کی

واحد ادیب رام پوری ایم۔ اے، بی۔ ٹی۔

نگاہوں سے تری پینے بھی کچھ مفہوم ہوتے ہیں
زباں سے کہہ نہیں سکتے مگر معلوم ہوتے ہیں

سکونِ زندگی پایا سکوں نا آشنائی میں
طلب ہے جنکو راحت کی وہی مغموم ہوتے ہیں

اگر اپنی خودی کو دے سکیں تعمیر کی صورت
تو ہم مجبور ہوتے ہیں نہ ہم مظلوم ہوتے ہیں

حوادث پر زمانے کے جو غالب آ نہیں سکتے
وہی قسمت کے شاکی ہیں وہی محروم ہوتے ہیں

بہاروں پر جو نازاں ہیں نہیں واقف زمانے سے
خزاں کے دور بھی قسمت میں کچھ مرقوم ہوتے ہیں

ہمارے لفظ واحد ہمنوائے دل ہی ہوتے ہیں
زباں سے ہم جو کہتے ہیں وہی مفہوم ہوتے ہیں

شکیل احمد عاصم بریلوی ایم۔ اے، ایم۔ کام، بی۔ ٹی

راحت سمجھ کے دل کی لگی کو کبھی کبھی
ڈھالا ہے آنسوؤں میں ہنسی کو کبھی کبھی!

وارفتگیِ شوق میں ہم اہلِ شوق نے
سمجھا ہے خلد تیری گلی کو کبھی کبھی

پیمانۂ نشاط میں بھر کر شرابِ غم
ٹھکرا دیا ہے میں نے خوشی کو کبھی کبھی

اے باغباں تری رَوِشِ دلخراش پر
دیکھا ہے آبدیدہ کلی کو کبھی کبھی

لاکر تمہارا چاند سا چہرہ خیال میں
چمکا لیا ہے تیرہ شبی کو کبھی کبھی

عاصم کسی سے ترکِ تعلق کے باوجود
دل نے کیا ہے یاد کسی کو کبھی کبھی



Shilpi HPM A-20a/72 Urd

بیسویں صدی دہلی ۱۹۷۲ء

طنزیہ

الّم غلّم

فکر تونسوی

آج میں الّم غلّم باتیں کروں گا۔ تاکہ انٹلکچول حضرات اُنھیں ہنسی میں ٹال سکیں اور زیادہ عمیق اور دقیق باتوں کے لئے وقت بچا سکیں۔ مثلاً یہ کہ کتّے کے کردار میں ایسی کون سی نفسیاتی پیچیدگی ہے کہ وہ ہمیشہ ننّھے بچّوں پر جارحانہ حملہ کرتا ہے اور اتنا جارحیت پسند ہونے کے باوجود محبوب دوشیزائیں پیار سے اُسے "کاکا" کہتی ہیں۔ جب ساون کے مدماتے جھونکے دوشیزہ کے سیب ایسے بدن سے ٹکراتے ہیں تو وہ بے قرار ہو کر کسی کاگے کی تلاش کیوں کرتی ہے؟ کیا وہ اپنے بدن کا یہ پیغام اپنے دُور دیس کے عاشق کے پاس پہنچانا چاہتی ہے اور پھر کاگے کے ساتھ "چوری" کا تصوّر کیوں وابستہ ہے، چاکلیٹ کا کیوں نہیں۔ جب تک تو لیٹروں میں "چوری" کی خوشبو شامل نہ کر دی جائے، ساون کے مدماتے جھونکے میں کوئی مفہوم کیوں پیدا نہیں ہوتا؟

اور پھر دانش مند حضرات (سُنا ہے جن کے لمحے بیش قیمت ہوتے ہیں) جو خُدا کے ہر عمل اور ردِّ عمل کا باہمی تعلق معلوم کرنا ہی اپنا نصب العین سمجھتے ہیں، اس تضاد پر صدیوں غور کرتے رہے ہیں جو کتّے کے کردار میں ہے۔ ایک طرف اُس میں جارحیت ہے، دوسری طرف محبّت کی پیغام رسانی ہے۔ محبّت اور جارحیت میں آخر یہ تک بندی کیوں ہے؟ کہیں یہ تو نہیں کہ خُدا کی ہر تخلیق میں تضاد ہے ——— میں اکثر اِن دانش مند انٹلکچولز سے یہ کہتے ہوئے شرما جاتا ہوں کہ یہ آپ کی صرف ذہنی عیاشی ہے۔ بھوک کی ماری ایک دوشیزہ کو مکئی کا ایک گرما گرم بھُنا ہُوا بھٹّہ دے دیجئے تو اُس کی آنکھیں آپ کی طرف تبسّم کا ایک ہدیہ پیش کر دیں گی۔ اِس تبسّم میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ کوئی تضاد نہیں۔ ساون کا مدماتا جھونکا بھی ایسا ہی ایک دوشیزہ تبسّم ہے۔ زندگی کا حُسن اسی تبسّم میں بھیگ کر جوان ہوتا ہے جب ایک آوارہ لڑکا اُس دوشیزہ کی بھوک اور بے بسی کو لبوں کا ایک پیاسا سمجھ کر بھیڑئے کی طرح جھپٹتا ہے تو دوشیزہ کا تبسّم ایک دم آنسو میں بدل جاتا ہے۔ حُسن کا شباب مرجھا جاتا ہے۔ ایک ہی آنسو اُسے بُڑھیا بنا دیتا ہے۔ پیار میں کشش اُس وقت تک رہتی ہے جب تک رُخسار پر جھرّیاں نہ پڑ جائیں۔ لیکن بھیڑیا اندھا ہے۔ اُسے جھرّیاں دکھائی نہیں دے سکتیں۔ وہ تو صرف اتنا جانتا ہے کہ جن لبوں کا بوسہ لینا چاہتا ہے، وہ مکئی کے بھٹّے کے بھُوکے لب ہیں۔ دوشیزہ کو بھی مرد کے پیار میں اسی وقت لذّت محسوس ہوتی ہے جب معدے میں مکئی کے کچھ دانے چلے جائیں۔ حُسن اور رس دراصل مکئی کے دانوں میں ہے۔ نہ دوشیزہ کے رُخساروں میں ہے، نہ اُس کی گلابی جِلد میں۔ لیکن وہ چیختی ہے، فریاد کرتی ہے، چوک میں تعینات کانسٹبل سے کہتی ہے جو آوارہ گرد بھیڑیوں کا محافظ نہیں، کنواری بھیڑوں کا رکھشک ہے۔ لیکن فریاد اُس کانسٹبل سے نہیں ٹکراتی، اُس بٹوے سے جا ٹکراتی ہے جو بھیڑئے کی جیب میں ہے اور جونہی فریاد اُس بٹوے سے ٹکراتی ہے، بٹوا اُچھل کر کانسٹبل کی جیب سے جا ٹکراتا ہے۔ کانسٹبل اور بھیڑئے کے درمیان قانون کا کوئی رشتہ نہیں، بٹوے کا رشتہ ہے اور بٹوے میں مکئی کے بھٹّے ہیں، سیب ہیں، سکاچ وہسکی کے پیگ ہیں اور مکھن ہے اور چلغوزے ہیں۔ اس لئے کانسٹبل کے لب مُسکرا دیتے ہیں۔ بھیڑیا بھی مُسکرا دیتا ہے اور آنکھوں آنکھوں میں اُس مُسکراہٹ کا تبادلہ ہوتا ہے اور دوشیزہ کے آنسو، وسیع اور لمبی سڑک پر گرتے رہتے ہیں۔ اُس کا بوسہ جو لطیف تھا اور شیریں تھا، آنسوؤں کی طرح مٹّی میں مل جاتا ہے۔ اُس آنسو اور بوسے کی کوئی سوشل ویلیو نہیں۔ جو ایک ہزار گز کی کوٹھی میں جنم نہیں لیتا۔ خُدا! ایسی دوشیزائیں بھی تو دُنیا میں بسی رہتی ہیں جن کے ایک آنسو پر سلطنتیں اُلٹ جاتی ہیں۔ جن کے ایک پیار کے لئے میدانِ جنگ میں لاشوں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔

اور دُنیا کے انٹلکچول حضرات صرف اِسی موضوع پر ہزاروں صفحات کے شاستر لکھ ڈالتے ہیں کہ خُدا کی ہر تخلیق میں تضاد پایا جاتا ہے۔

لیکن دوشیزہ [illegible] ماحول میں پیاری رہتا ہے۔ اُس کی لذّت ایک جیسی ہو [illegible] کی جھونپڑی میں جو پیار اُگتا ہے اُس میں بھی اُسی نشے کی [illegible] ہوتی ہیں۔

قارئین (کرام) آپ اعتراض کریں گے کہ یہ تو الم غلّم باتیں نہیں ہیں۔ ان کی صورت ضرور الم غلّم ہے، سیرت نہیں۔ لیکن آپ کے اس اعتراض میں ایک بنیادی نقص ہے۔ صورت اور سیرت کی یہ تھیوری اپنا چارم کھو چکی ہے۔ دونوں کی سماجی حیثیت کچھ سیکنڈری سی ہو گئی ہے۔ سائنس اتنی ترقی کر گئی ہے کہ مصنوعی بارش تک برسائی جا سکتی ہے۔ تو کیا مصنوعی رخسار اور مصنوعی لب تخلیق نہیں کئے جا سکتے؟ خدا کا نہیں، خدا کو شکر ادا کرنا چاہیئے کہ ابھی تک اُسے خالق مانے جا رہے ہیں۔ حالانکہ بادل اُس کے کنٹرول میں نہیں رہے۔ برق جو کبھی آشیانوں اور مسلمانوں پر گرا کرتی تھی، اب انسان کی رضا سے گرتی ہے اور ہمارے بنائے ہوئے شیڈولڈ پروگرام کے مطابق گرتی ہے۔ وہ تین بجے ویتنام پر گرائی جاتی ہے تو ساڑھے تین بجے مصر پر گرائی جاتی ہے۔ صرف آشیانوں پر نہیں گرائی جاتی، سمندروں اور بیابانوں پر بھی گرائی جاتی ہے اور صرف مسلمانوں پر نہیں، عیسیٰ کے متوالوں پر، کرشن کے گوالوں اور بدھ کے پرستاروں پر بھی گرائی جاتی ہے۔

اس لئے خداوند تعالیٰ صاحب اب ضمنی قسم کے خالق بن کر رہ گئے ہیں۔ کیونکہ مارکیٹ میں پلاسٹک کے ہونٹ اور پلاسٹک کے رخسار آ گئے ہیں۔ بھونڈی سے بھونڈی صورت کی بھی سرجری کر کے ہم اُسے ملکۂ شیبا بنا سکتے ہیں اور اُس کے بنک لاکر میں ایک ارب روپے کا سمگلنگ کا سونا رکھ سکتے ہیں جس کی بنا پر وہ کسی بھی ملک کے حکمران کی ملکہ بنائی جا سکتی ہے۔ پلاسٹک سرجری اُس میں صورت پیدا کر دیتی ہے۔ سمگلنگ کا سونا اُس میں ملکہ کی سی سیرت پیدا کر دیتا ہے۔ ریڈیو، اخبار، ٹیلی ویژن اور فیشن میگزین (ظاہر ہے، مارکیٹ ریٹ پر) اُس کے جسم اور ذہن دونوں کے حسن کا دن رات پروپیگنڈہ کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی صورت اور سیرت کی پرانی تھیوری کا قائل ملکہ شیبا کے بھونڈے پن کو ننگا کرنا چاہتا ہے تو اُس کے منہ کو طلائی سوئی دھاگے سے سی دیا جاتا ہے۔ اُسے شیر کے آگے اس لئے نہیں پھینکا جاتا کیوں کہ یہ فاشزم ہے۔ جمہوریت کے اس دور میں فاشزم کا پرانا سکہ نہیں چل سکتا۔ اگر اُسے دنیا سے غائب ہی کرنا ہو تو کئی جمہوری طریقے ہیں۔ اُس کی جیب

میں ناجائز افیون کے پانچ چھ کلو رکھے جا سکتے ہیں۔ جو ایک غیر جمہوری فعل ہے اور پھر پولیس کے ساتھ تصادم میں اُسے گولی کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے اور افیون کے پانچ چھ کلو کسی پرانی تھیوری کے مجرم کو پھنسانے کے لئے بچا لئے جاتے ہیں۔

میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ سائنس کچھ اس طرح ترقی کر گئی ہے کہ اُس کے سامنے صورت اور سیرت دونوں بے وقت کی راگنی بن کر رہ گئے ہیں۔ صورت بھی سمگلنگ کے سونے میں ہے اور سیرت بھی سمگلنگ کے سونے کی کوکھ سے جنم لینے لگی ہے۔ بمبئی کا وہ سیٹھ کھونڈا نہیں ہے جس کا بنک بیلنس ایک ارب روپیہ ہے۔ اگر وہ ایک کروڑ روپے سے گئو شالہ اور مندر اور ودیا یام شالہ بنوا دیتا ہے تو اُس میں خواہ مخواہ ایک سیرت پیدا ہو جاتی ہے۔ مخلوق اُسے دیش بھگت کہتی ہے۔ مندر کا ہیڈ پجاری اُس کے ماتھے پر تین انچ لمبا تلک لگا دیتا ہے اور آسمان پر بیٹھا ہوا خداوند کریم صاحب ٹھنڈی آہ بھر کر اپنے فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ اس شخص پر پھولوں کی بارش کر دو اور اس کا نام جرائم پیشہ قبائل کی فہرست سے کاٹ کر بھگتوں کی فہرست میں درج کر دو کہ یہ اگرچہ اپنا آدمی نہیں ہے۔ لیکن اپنا معلوم ہوتا ہے۔

غرض قارئین حضرات! میری باتیں صرف الم غلّم ہیں۔ ان میں نہ صورت تلاش کیجئے نہ سیرت — زندگی کا حسن نہ صورت میں ہے نہ سیرت میں۔ اُس روپہلی سکّے میں ہے جو ہر قسم کا حسن پیدا کر سکتا ہے۔ بد ذوقی میں بھی حسن، سمگلر میں بھی حسن۔ یہاں تک کہ اُس کوٹھے کی طوائف میں بھی حسن پیدا کر دیتا ہے۔ جو ہماچل کے کسی غریب کسان کی بیٹی تھی اور اپنے افلاس کے درد و کرب کو پہاڑی تاریکیوں میں چھوڑ کر اُس سیٹھ بھینگا مل ٹھینگا مل کے سِتھل تھلاتے پیٹ پر بیٹھ کر شہر میں آ گئی جو پہاڑوں کی پسماندگی کو بلیک مارکیٹ کے روپے سے دُور کرنے کا دعوے دار ہے۔ وہ پہاڑوں میں پچاس لاکھ روپے کے ایک آبی پروجیکٹ کا ٹھیکہ لیتا ہے اور اُس پہاڑی چھوکری کو شہر میں لا کر طوائف سازی کے پروجیکٹ میں فکس کر دیتا ہے اور شہر کے انٹلکچولوں کو کاک ٹیل پر مدعو کر کے اُن سے اس بیان پر دستخط کرا لیتا ہے کہ وہ طوائف نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے کلاسیکل [illegible] ہے اور اُس کی آواز میں رُوح کی [illegible] ہے۔

ہاں، رُوح کُشادہ ہوتی ہے سِکّے کی جھنکار سے اور یہی جھنکار ہی نغمے پیدا کرتی ہے، شاعری پیدا کرتی ہے، پینٹنگ پیدا کرتی ہے۔

اور جب پھُول اور پینٹنگ سے لے کر اللہ تعالیٰ کے حُسن تک کو سُنہری ترازو میں تولا جانے لگا ہو اور اُس کی نئی مارکیٹ ویلیو مقرر کی جا رہی ہو تو پُورا انسانی سماج اپنے ہر ایکشن کو اِسی نئی ویلیو کی آنکھ سے تولنے لگتا ہے۔ کل کی بات ہے ایک وومنز کلب میں جانے کا اتفاق ہُوا۔ اُس کلب میں مَردوں کو ہفتے میں صرف ایک بار وِزٹ [illegible] کرنے کا اعزاز بخشا جاتا ہے۔ تاکہ عورتیں (حسین اور بھونڈی دونوں) اپنی ہی نسائی یکسانیت سے بور نہ ہو جائیں۔ اِس کلب میں جو دن (رات سمیت) مَردوں کے وزٹ کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ میں نے محسوس کیا۔ اُس دن کلب کی وومنز ممبروں کی شخصیتیں پیرہن تن کے تکلف سے کھل اُٹھتی ہیں۔ چہروں کی تابندگی میں ایسی شعاعوں کی نمائش شامل ہو گئی ہے جیسے مشرقی اُفق سے صُبح طلوع ہو رہی ہو۔ نہ جانے کیوں؟ اُس دن عورتوں کے شرنگار میں "ہپّی پن" کا عنصر غالب ہو گیا تھا۔ یکسانیت کو توڑنے میں "ہپّی پن" نے بڑا نمایاں رول ادا کیا ہے۔

لیکن اِس ہپّی پن کی ورائٹی کے علاوہ مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہُوا کہ اُس دن اُس کلب میں اُن مَردوں کی بھرمار تھی جو سوسائٹی کے کرپٹ سیکشن میں خاص مرتبہ رکھتے ہیں۔ حالانکہ میرا فرض تھا کہ میں متعجب نہ ہوتا۔ بلکہ اُسے سوسائٹی کی روٹین سمجھ کر برداشت کر لیتا۔ لیکن اِس تعجب کے ساتھ ساتھ مجھ پر یہ انکشاف بھی ہُوا کہ کرپشن کے لئے وومنز کلب زیادہ موزوں بلکہ مہذّب مقام ہے۔ نہ جانے وومنز اور کرپشن میں کیا رِشتہ ہے؟ شاید ذہنی حُسن کا سُنہری ترازو اُس کے پیچھے کارفرما ہو۔ کرپشن بھی تو سوسائٹی کا ایک نیا حُسن ہے جس نے نئی ویلیو پیدا کر دی ہیں اور عورتوں کے کلب میں شباب کی جو بہار ہوتی ہے۔ اُس سے بھی صرف وہی لُطف اندوز ہو سکتے ہیں جو کرپشن کا حُسن رکھتے ہوں۔ حُسن کی یکسانیت کو بورڈم سے بچانے کے لئے کرپشن کا رول بہت اہم ہے۔

اور میری ناقص معلومات میں ایک اضافہ یہ ہُوا کہ یہ وومنز کلب نئی ویلیو کا مرکز ہے۔ نئی ویلیوز کی تخلیق کرتا ہے۔ ایک موٹے پیٹ اور پتلی ٹانگوں والے کرپٹ معزز نے مجھے بتایا کہ ہم کرپٹ لوگ اپنی ایک ٹریڈ یونین بنا رہے ہیں کیونکہ ہمارے ساتھ بڑی ناانصافی ہو رہی ہے۔ شریفانہ ڈھنگ سے کوئی کرپشن بھی نہیں کرنے دی جاتی۔ اِس لئے اِس کلب کے تمام کرپٹ حضرات نے مجبور ہو کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے ٹریڈ یونین ہی بہترین طریقہ ہے۔

میں نے اپنی حیرانی کو ذرا دبا کر پوچھا، "مگر آپ کیا جمہوری نظام میں ایسے ٹریڈ، آئینی تحفظ تو رکھ سکتے ہیں۔ معاف کیجئے۔ کرپشن کو آپ جمہوریت میں کیا مقام دیتے ہیں؟"

وہ بولے "کرپشن بھی ایک ٹریڈ ہے۔ جیسے ساڑیوں کی ٹریڈ۔ طوائفوں کی نقل کرنے کی ٹریڈ، جھوٹ، اناج کی بلیک اور غیر سرکاری ٹریڈ۔ جمہوریت اُس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی۔ جب تک ہر ٹریڈ کے لئے یونین نہ بنائی جائے۔ یہ پہلا حادثہ ہو گا کہ کرپٹ لوگوں میں ایکتا پیدا ہو گی۔ ہماری مہنگائی تیزی سے مہنگائی میں بدلتی جا رہی ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں۔ جیب کترے ہیں، بلیک مارکیٹیے ہیں، رشوت خور ہیں، ملاوٹیے ہیں، دل بدلتے ہیں اور یہ سب جمہوریت کی پیداوار ہیں۔ اور اِس پیداوار کو ایک ہی طریقے سے بچایا جا سکتا ہے ہم میں ایکتا ہو۔ ہماری ایک ٹریڈ یونین ہو۔"

میں نے کرپشن کی اِس نئی جمہوری ویلیو پر صاد کیا اور کہا۔

"میری رائے ہے کہ آپ حضرات کو ایک آل انڈیا نیشنل کنونشن بُلانی چاہیئے۔"

"بُلا رہے ہیں۔ کنونشن کا پوسٹر شائع ہو چکا ہے۔"

"معاف کیجئے۔ پوسٹر شائع کرانے میں بھی کوئی کرپشن کی گئی کہ نہیں؟"

"کی گئی جناب! بِل میں ڈیڑھ ہزار روپے کی ہیرا پھیری کی گئی!"

"ارے یا! اسے کہتے ہیں اپنے کاز سے سچّا عشق! کنونشن کا اُدگھاٹن کون صاحب کر رہے ہیں؟"

"ایک مرکزی وزیر سے ایک کروڑ روپے پر بات طے ہو گئی ہے۔ وہ رِسک (Risk) لینے کے لئے تیار ہیں۔ وشنو دیوی کی یاترا سے واپسی پر اُدگھاٹن کریں گے!!"

مشہور افسانہ نگار حضرت آسی رام نگری مناسب حق محنت پر اصلاح کا کام بھی کرتے ہیں۔ ضرورت منداصحاب خصوصاً نئے لکھنے والے اپنے مضامین، افسانوں اور کتابوں پر اصلاح لے کر ایک مستند ادیب کی خدمات سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ یا ٹکٹ بھیجئے۔ پتہ: حضرت آسی رام نگری مغلسرائے (یو پی)

غزل

مہدی پرتاب گڈھی

جدھر وہ حسن کا پیکر دکھائی دیتا تھا
اُدھر کا اور ہی منظر دکھائی دیتا تھا

یہ اونچی اونچی فصیلیں نگل گئیں ہیں اُسے
یہیں سے پہلے مرا گھر دکھائی دیتا تھا

دیارِ مکر و ریا کا عجیب عالم تھا
ہر ایک شخص پیمبر دکھائی دیتا تھا

اِسی میں ڈوب گئی میری کشتیٔ اُمید
یہ دل کبھی جو سمندر دکھائی دیتا تھا

کسی بھی چہرے پہ ملتا نہ تھا خلوص کا رنگ
عجیب شہر کا منظر دکھائی دیتا تھا

مجھے گلہ تو کسی سے نہ تھا مگر مہدی
تمہارے ہاتھ میں پتھر دکھائی دیتا تھا

غزل

عزم رحمانی ایم۔ اے

واقعات ایسے کچھ رونما ہو گئے
رند اک راستے میں پارسا ہو گئے

یاد سے جن کی ہوتا ہے دل شادماں
آہ! یا رب زمانے وہ کیا ہو گئے

انقلاب آ گیا کیسا یہ دوستو
راہزن جتنے تھے رہنما ہو گئے

دیکھئے اب خدائی کا کیا حال ہو
آج کل کے صنم سب خدا ہو گئے

بے وفائی پہ اپنی نہیں ہے نظر
ہم سے کہتے ہیں تم بے وفا ہو گئے

عزم قانونِ گلشن نے بدلا ہے رُخ
ظلم اُس کے لئے سب روا ہو گئے

غزل

سعادت نواز امروہوی

زندگی سخت نہیں موت بھی دُشوار نہیں
ہاں اُسے جس کو ترے عشق کا آزار نہیں

ہم نے اشکوں سے نچوڑی ہیں ہمیشہ خوشیاں
ہم مُسرت سے مُسرت کے طلبگار نہیں

تیری محفل میں جو آیا تو یہ محسوس ہُوا
جیسے اک میرے سوا کوئی گنہگار نہیں

تُم مہک ڈھونڈتے پھرتے ہو یہ کس گلشن میں
پھُول کو اپنی ہی خوشبو سے جہاں پیار نہیں

کِس کی رفتار سے سیکھا ہے یہ اندازِ خرام
اے نسیمِ سحری تیری یہ رفتار نہیں

ہر زمانے میں رہا دار و محبت کو عرُوج
کون سے دَور میں منصور نہیں دار نہیں

نامور مصنفین کی مشہور کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
شرارِ سنگ	عرش ملسیانی	۸/۰۰
شکوہ جواب شکوہ	اقبال	۰/۲۵
شاعروں کی محفل	عنایت علی کرابت	۶/۰۰
شہزادہ	مخمور سعیدی	۱۲/۰۰
شہنا یتی	ریحان عباسی	۳/۵۰
شہر ممنوع	واجدہ تبسم	۱۲/۰۰
شاد اور اس کی شاعری	پورن کمار ہوش	۲/۰۰
صبوحی	مہرندر کوثر	۳/۵۰
صنم وحرم	شکیل بدایونی	۳/۵۰
صید ہوس	آغا حشر کاشمیری	۲/۰۰
طوفان	چاؤلی پو	۶/۰۰
عندلیب	سلمیٰ کنول	۶/۰۰
عصمتی دسترخوان	آمنہ نازلی	۳/۵۰
عورت ایک پہیلی		۳/۰۰
غدار	کرشن چندر	۳/۰۰
... گردش	عرش ملسیانی	۶/۰۰
فلمی ہارمونیم گائیڈ		۱/۰۰
فاصلے پر قابو پانے کی جدوجہد		۲/۰۰
فن شاعری	علامہ اخلاق	۳/۰۰
فلاحِ دین و دنیا	شوکت علی فہمی	۸/۵۰
فتح بیت المقدس	صادق حسین سردھنوی	۵/۰۰
فیروز اللغات اردو		۴/۵۰
فاؤنٹین پین ماسٹر		۱/۵۰
قرآن مجید		۱۰/۰۰
قاشیں	نریش کمار شاد	۴/۰۰
کینسر وارڈ	الیگزنڈر سولنسٹن	۳/۰۰

کتاب	مصنف	قیمت
کلیات اقبال	علامہ اقبال	۶/۰۰
کلام جوش	جوش ملیح آبادی	۱/۰۰
کھیتی	پروفیسر محمد مجیب	۱/۰۰
کامیاب درزی خانہ		۲/۵۰
گھریلو ڈاکٹر		۲/۵۰
گیس اور الیکٹرک ویلڈنگ		۱۲/۰۰
گجرے	قتیل شفائی	۱/۰۰
گفتنی	مخمور سعیدی	۲/۰۰
گھر آنگن	جاں نثار اختر	۳/۰۰
گلِ رعنا	برج لال رعنا گلی	۳/۵۰
گلستانِ ہزار رنگ	بہاء الدین احمد	۲۰/۰۰
گونگا ہے بھگوان	کوثر چاندپوری	۱/۵۰
لالہ رخ	ل۔ احمد اکبرآبادی	۳/۵۰
لکھو ادھیوگ تال اسلیل انڈسٹریز کے سی گپتا		۱۶/۰۰
موم بتی کا کاروبار		۲/۵۰
میرے بہترین افسانے	منشی پریم چند	۴/۰۰
مویشی		۳/۰۰
میر تقی میر کے ادبی معرکے	محمد یعقوب	۵/۰۰
ملاوجہی کے انشائیے	جاوید وششٹ	۹/۰۰
موٹر سائیکل گائڈ		۴/۵۰
مطالعہ ولی	ڈاکٹر شارب ردولوی	۱۰/۰۰
مرغی پالن (ہندی)		۳/۰۰
مصوری		۴/۵۰
نرملا	منشی پریم چند	۳/۵۰
نغمۂ سرمد	عرش ملسیانی	۵/۰۰
نوائے دل	محمد منشاء الرحمٰن منشاء	۱/۵۰

کتاب	مصنف	قیمت
نند آبہ		۱۰/۰۰
نسیم بہار	اے۔ سی۔ بہار	۴/۵۰
نیا دیش بنگلہ دیش	اندرجیت گاندھی	۳/۵۰
نئی صبح	ارشد مختار	۰/۰۰
نقوش	پروانہ بی۔ اے	۱/۵۰
ویران بہاریں	ستیش بترا	۳/۰۰
وجدان	نریش کمار شاد	۳/۰۰
نیو کشیدہ کاری		۹/۰۰
پائنیر پریکٹیکل ڈکشنری		۱۱/۰۰
پوسٹ مارٹم	عرش ملسیانی	۲/۲۵
پتھر کا گلاب	کوثر چاندپوری	۲/۰۰
پھوار	نریش کمار شاد	۳/۰۰
پتوار	شباب للت	۳/۵۰
پریوار نیوجن	اے۔ سی۔ بہار	۱/۵۰
پریکٹیکل اردو انگلش ٹیچر		۶/۰۰
پنکھڑیاں	سہیل مرادآبادی	۳/۰۰
یہ لڑکیاں		۳/۰۰
ہماکشیدہ کاری		۵/۰۰
ہفت رنگ	عرش ملسیانی	۳/۰۰
ہندوستان شاہراہِ ترقی پر		۱/۵۰
ہماری عادتیں ہمارے خیالات دیانند ورما		۲/۵۰
ہندوستان ہمارا		۲/۵۰
ہومیوپیتھک ٹریٹمنٹ		۲/۵۰
ڈیری فارمنگ کا کاروبار		۳/۵۰
ڈکشنری عبدالحق انگلش اردو عبدالحق		۱۵/۰۰
روپ رس	جاوید وششٹ	۵/۰۰

ملنے کا پتہ:۔ رسالہ بیسویں صدی، دریا گنج، دہلی نمبر ۶

افسانہ

حسبِ معمول

ایس۔ پی ملہوترہ دلیش چترکار بی۔ اے

ای۔اے۔ ۲۲، اندرپوری نئی دہلی (۱۲-۱۰)

محترمی و مکرمی خوشتر صاحب! تسلیم و نیاز

ایک عرصہ ہو گیا "بیسویں صدی" کے لئے کچھ نہ لکھ سکا۔ حالانکہ پرچے کا باقاعدگی سے ملتے رہنا میری اِس کوتاہی کی یاد دلاتا رہا ہے۔ اِس طویل غیر حاضری کی تلافی کے لئے ایک مختصر افسانہ "حسبِ معمول" ارسالِ خدمت ہے۔ — کہانی کے ذریعہ سماج کے ایک گھناؤنے عنصر پر چوٹ کی گئی ہے ....

خلوص کار —— دلیش چترکار

★

اسٹاپ پر بس رُکنے کے چند ہی لمحوں کے بعد میں نے محسوس کیا کوئی لڑکی میری سیٹ کے قریب آکر کھڑی ہو گئی ہے۔ لیکن میں خاموش بیٹھا رہا، اِس احساس کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ قریب کھڑی لڑکی، کون ہے؟ کیسی ہے؟

کنڈکٹر نے گھنٹی بجائی تو بس پھر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔

لیکن میرے ذہن پر قریب ہی کھڑی لڑکی کی موجودگی کا احساس جیسے ایک ہلکا سا بوجھ بن کر چھا گیا تھا۔ اُس لڑکی کی طرف رُخ کئے بغیر، اُس کی صورت کا جائزہ لئے بغیر، میرا دماغ کئی سوالوں اور اُن کے جوابوں کا تانا بانا بُننے لگا —— صنفِ نازک کی قدر کرتے ہوئے شرافت کا تقاضہ ہے کہ اُٹھ کر اپنی جگہ اُس لڑکی کو پیش کر دوں .... لیکن کیوں؟ آجکل تو عورتیں بھی مردوں کے برابر کے حقوق کا دعویٰ کرتی ہیں....

عین اُسی وقت اچانک ذہن میں کچھ ہی دنوں پہلے کا ایک واقعہ کوند گیا —— اُس دن بس مسافروں سے اِتنی بھر چکی تھی کہ اب کسی اور آدمی کے اندر داخل ہو کر کھڑے ہونے کی بھی گنجائش باقی نہ رہ گئی تھی۔ قطار میں کھڑے چند مسافروں نے اِسی وجہ سے اُس بس میں سفر کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ وہ وہاں سے ہٹ کر اگلی بس کے انتظار میں قطار باندھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ لیکن جبھی قطار میں دُور کھڑی دو منچلی لڑکیاں قطار سے نکل کر آدمیوں سے بھری بس کے دروازے کے پاس جا پہنچیں اور پھر کہنے لگیں ——

"اری، رُک کیوں گئی؟"

"چھوڑ دو، بہت بھیڑ ہے!"

"پھر کیا ہوا۔"

"فضول ہے اِس بس میں سفر کرنا۔ اگلی بس میں آرام سے چلیں گے...."

"کیا بات کرتی ہو؟"

"نا بابا...."

"بڑی بدّھو ہو! سمجھتی کیوں نہیں۔ چڑھ چلو۔ ہمیں دیکھ کر کوئی نہ کوئی ضرور سیٹ دے دیگا...." اور وہ دونوں چہکتی ہوئی جیسے تیسے اُس بس میں چڑھ گئیں، اور مسافروں کی بھیڑ میں گم ہو گئیں۔

اِس واقعہ کی یاد آتے ہی میرے دِل کو ایک دھچکا سا لگا۔ کیا ایسی تیز و طرار اور ایسی ذہنیت کی لڑکیاں کسی کی ہمدردی کی مستحق

ہو سکتی ہیں۔

اچانک میری نگاہیں بس کے ماحول کا جائزہ لینے لگیں۔ میں نے دیکھا بس میں بھیڑ بالکل نہ تھی۔ لیکن اتنا ضرور تھا کہ ساری بس میں صرف وہی ایک لڑکی کھڑی تھی۔ باقی سبھی سیٹیں فل تھیں۔

دل کے ایک گوشے سے پھر آواز اٹھی ——— یہ شائستگی کی بات نہیں۔ سبھی انسانوں کی خصلت اور فطرت یکساں نہیں ہوتی اور نہ ذہنیت ہی ایک جیسی ہو سکتی ہے۔ تو پھر کسی ایک کے سلوک سے سب کے بارے میں کوئی رائے کیسے قائم کی جا سکتی ہے؟ اسی خیال کے تحت میں اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا اور نگاہیں نیچے کئے اُس لڑکی سے مخاطب ہوا ——— ———

- خدا خودی اور فریب کار سے نفرت کرتا ہے۔ خدا جھوٹوں اور بغض رکھنے والوں کو نابود کر دے گا۔ خدا چاپلوس کے ہونٹ کاٹ دیتا ہے، خدا کی عدالتیں سچی اور اُس کی ساری راہیں سیدھی ہیں۔

(زبور)

- جو شخص اِس غرض کے لئے غلّہ جمع کر کے روک لے کہ نرخ بڑھنے پر بیچے تو وہ خطا کار ہے۔

(سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم)

- جو اپنے بال بچوں کو رزقِ حلال سے پرورش کرتا ہے اُس کا یہ عمل جہاد سے افضل ہے۔ (حضرت عبداللہ بن مُبارکؒ)

"آپ بیٹھ جائیے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ بیٹھے رہیئے۔" گلاب کی مُنہ بند کلی جیسے اُس کے لب وا ہوئے۔ اُس نے شیریں آواز میں رَس گھولا۔

"نہیں، نہیں، آپ بیٹھ جائیں...."

اور جب میری پیش کی ہوئی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے چہرہ اوپر اُٹھا کر اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے "شکریہ!" کہا تو بے اختیار میرے لبوں پر ایک ہلکی سی مُسکراہٹ کھِل اُٹھی۔

بس چلتی رہی ——— !

اگلا اسٹاپ آنے سے چند لمحے پہلے لڑکی کے پاس بائیں طرف بیٹھا مسافر اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ شاید اُس اسٹاپ پر اُتر جانا چاہتا تھا۔ جیسے ہی اُس نے سیٹ خالی کی، وہ لڑکی بائیں جانب کھڑکی کی طرف سرک گئی۔ بظاہر یہ مجھے بیٹھ جانے کی دعوت تھی جسے میں ٹھکرا نہ سکا اور جس سیٹ کو میں نے کچھ منٹ ہی پہلے خالی کیا تھا، آہستہ سے پھر اُسی پر بیٹھ گیا۔

بس چلتی رہی ——— !

چند ہی لمحوں کے بعد مجھے ایسا محسوس ہونے لگا میرے داہنے پہلو بھی بائیں طرف قریب ہی بیٹھی ہوئی لڑکی اور میرے درمیان کا مختصر فاصلہ تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ ہم دونوں کے وجود ایک دوسرے کو چھونے لگے۔ اِس سے پہلے کہ میرے دِل میں اِس کیفیت سے کوئی تاثر رونما ہوتا، میرے داہنے شانے کی پُشت میں سیٹ کے ساتھ سٹ کر کھڑے کنڈکٹر کی آواز گونج اُٹھی

"ٹکٹ، پلیز!" اُس کا اشارہ میری بائیں جانب بیٹھی لڑکی کی طرف تھا۔

لڑکی نے پرس میں سے ایک روپے کا نوٹ نکالا اور کنڈکٹر کو دینے کی غرض سے بازو اُٹھا کر اُس کی طرف اِس طرح گھومی کہ دو متضاد جنسوں

میں اجنبیت جیسے سلوک سے وابستہ وہ شائستگی بالکل ختم ہو گئی۔

”کھلے پیسے دیجئے، میرے پاس ریزگاری نہیں ہے“ کنڈکٹر نے معذرت چاہی۔

”چینج تو میرے پاس بھی نہیں ہے“ لڑکی بولی۔ اُس کے اُوپر اُٹھے ہوئے بازو اور میری طرف جھکنے کے انداز میں اب بھی کوئی فرق نہ آیا تھا۔

”تو کیا کیا جائے؟ ... اجازت ہو تو لفافہ ٹکٹ کے پیچھے لکھ دوں؟“

”ٹھہرو ... پینتیس پیسے لگتے ہیں نا، ایک بار پھر دیکھتی ہوں۔ شاید کام بن جائے“ اُس نے بازو واپس کھینچ لیا اور پرس میں ریزگاری تلاش کرنے لگی۔

”اُف! میرے پاس تو صرف پچیس پیسے ہیں“ چند لمحوں کے بعد وہ بولی۔ عین اُسی وقت اُسے جیسے کوئی نئی ترکیب سوجھ گئی ہو۔ میری طرف ترچھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی ”کیا آپ مجھے دس پیسے اُدھار دے سکیں گے؟ یہ حضرت تو دس پیسے چھوڑنے سے رہے ورنہ دوسری صورت میں پینسٹھ پیسوں کے لئے مجھے ہیڈ آفس میں دھکے کھانے پڑیں گے“

میں نے بٹوے میں سے دس پیسے کا سکہ نکال کر اُس کی طرف بڑھا دیا۔ ”لیجئے!“

کالونی کے بس اسٹاپ پر پہنچتے پہنچتے، جو کہ اُس روٹ کا ٹرمینس بھی تھا، بس کافی خالی ہو چکی تھی۔ ہم دونوں کے علاوہ اب صرف تین اور مسافر باقی رہ گئے تھے

کالونی کی آبادی سے بس اسٹاپ ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر مین روڈ پر ہے۔

ٹرمینس پر بس رُکتے ہی وہ تینوں مسافر اُتر گئے۔ میونسپل لیمپ پوسٹ پر لگے بجلی کے قمقمے کی مدھم روشنی میں صرف ہم دونوں آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ وہ لڑکی اب بھی میرے بالکل قریب چل رہی تھی۔ مجھے ایسا محسوس [illegible] تھا، ایک لڑکی نہیں، میرے ساتھ رنگ و نکہت کا کارواں چل رہا ہے۔

”لیجئے، آپ کے دس پیسے“ جبھی اچانک رُک کر اُس نے میری طرف دس پیسوں کا سکہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ایسا بھلا کیوں؟“ بے ساختہ میرے مُنہ سے نکل گیا۔ ”آپ کے پاس تو ....“

”آپ بھی بڑے بدھو ہیں!“ میں نے ہلکی تاریکی میں اُس کی آنکھوں کی پتلیوں کو شوخ انداز سے رقص کرتے پایا۔

”یہ آپکی غلط فہمی ہے“ میں نہایت بے باک لہجہ میں بولا۔ ”میں اتنا بدھو نہیں جیسا تمہارا خیال ہے۔ میں بار کتنی دن سے تمہارے اس معمول کو بغور دیکھ رہا ہوں .... اچھا گڈ نائیٹ! ....“ کہہ کر تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا میں آگے بڑھ گیا۔

میں نے پیچھے مُڑ کر اُس لڑکی کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہ محسوس کی۔ ہاں، اِس بات پر ہنسی ضرور آ رہی تھی کہ آج اُس لڑکی کو خلافِ معمول، مایوسی کا سامنا کرنا پڑا!۔

- بھوکوں کو کھانا کھلانا اور حاجت مندوں کی حاجت پوری کرنا، میرے نزدیک مسجد تعمیر کرانے سے زیادہ اجر و ثواب کا باعث ہے۔ (حضرت عبداللہ مبارکؒ)
- دولت کا حریص حقیقی راحت سے محروم ہے۔ (حضرت معروف کرخیؒ)
- زندگی کے نخل کے پھول خوش مزاج لوگوں کے لئے کھلتے ہیں۔ (رانٹ)
- بہت سے لوگ محض اس لئے ترقی نہیں کرتے کہ وہ مشکل کام اور ناموافق حالات سے گھبراتے ہیں۔ (ڈاکٹر ماٹرن)

ہریانہ ـــــــ عزم وعمل کی سرزمین

اگرچہ ہریانہ کا شمار بھارت کے نوعمر اور چھوٹے راجیوں میں کیا جاتا ہے تاہم گذشتہ پانچ برسوں کے دوران اِس راجیہ نے برق رفتاری سے حیران کُن ترقی کی ہے ۔

آبپاشی

راجیہ کا کُل آبپاشی رقبہ ۱۹۶۶ء میں ۸۳ر۴ ۱۱ لاکھ ہیکٹر سے بڑھ کر اب ۶۵ر۱۵ لاکھ ہیکٹر ہو گیا ہے ۔

بجلی

ہریانہ مُلک میں پہلا راجیہ ہے جس نے تمام دیہات کو بجلی کی سہولیات مہیّا کر کے امتیازی مقام حاصل کیا ہے ۔

اناج

راجیہ میں اناج کی پیداوار ۶۷-۱۹۶۶ء میں ۲۶ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ۷۲-۱۹۷۱ء میں ۴۸ر۴۵ لاکھ ٹن ہو گئی ہے ۔

فی کس آمدن

راجیہ میں فی کس آمدن ۶۹-۱۹۶۸ء میں ۳۸۲ رُوپے سے بڑھ کر ۷۲-۱۹۷۱ء (۶۱-۱۹۶۰ء کی قیمتوں کی بنا پر) میں ۴۳۵ رُوپے ہو گئی ہے ۔ اِس اعتبار سے ہریانہ کو مُلک بھر میں دُوسرا مقام حاصل ہے ۔

سڑکیں

راجیہ کے ساٹھ فیصد دیہات کو پُختہ سڑکوں کے ساتھ مِلا دیا گیا ہے ۔

نقل وحمل

۱۹۷۲ء میں مسافر ٹرانسپورٹ کو سو فیصد قومیانے کا کام مکمل کر لیا گیا ۔ ہریانہ روڈ ویز کا شمار مُلک کے بہترین اور اہل ترین اداروں میں کیا جاتا ہے ۔ اِس وقت یہاں گاڑیوں کی تعداد ایک ہزار چار سو تیس ہے جبکہ ۱۹۶۸ء میں یہ ۵۶۷ تھی ۔

جاری کردہ :-
محکمہ تعلقات ، ہریانہ
چنڈی گڑھ

صحت و زندگی

۱۔ کیا آپ جانتے ہیں؟

• پرول ایک مشہور ترکاری ہے۔ اس کا مزاج معتدل ہے۔ زیادہ گرم ہے، نہ سرد۔ یہ غذائیت رکھتی ہے اور صالح خون پیدا کرتی ہے۔ زود ہضم، مقوی دل و دماغ اور اشتہا آور ہے۔ معدے کو طاقت دیتی اور پیٹ کے کیڑوں کو ہلاک کرتی ہے۔ اور صفرا کی گرمی کو دور کرتی ہے ——— مادۂ تولید پیدا کرتی ہے اور مقوی باہ ہے۔

• بھنڈی کا مزاج سرد اور تر ہے۔ کسی قدر دیر ہضم، قابض اور ہاضمے کے لئے نقصان دہ ہے۔ خون پیدا کرتی اور مادۂ تولید کو گاڑھا کرتی ہے۔ بلغمی کھانسی اور دمہ کے مریضوں کے لئے مضر ہے۔ قبض کے مریضوں کو اس کا استعمال کم کرنا چاہئے۔ ہاضمے کی خرابی میں اور چھوٹے بچے کی ماں کو بھنڈی نہ کھانی چاہئے۔

• کدو۔ اس کی کئی قسمیں ہیں۔ لوکی، گول کدو اور گھیا کدو۔ اس کا مزاج سرد اور تر ہے۔ یہ کافی غذائیت رکھتا ہے۔ اسے کھانے سے اجابت صاف ہوتی ہے۔ بلغمی مزاج والوں کے لئے مضر ہے۔ جگر کی گرمی اور صفرا کو دور کرتا ہے قبض کھولتا ہے۔ پیاس بجھاتا ہے۔ خشک امراض اور بخاروں میں مفید ہے۔ سرد مزاج والوں اور بوڑھوں کو مضر ہے۔ کدو کا رائتہ حرارت جگر اور اسہال جگری کو نافع ہے۔

• پیٹھا۔ ایک قسم کا گول کدو ہے۔ جو مٹھائیوں کے کام آتا ہے۔ اس کی ترکاری نہیں پکاتے۔ اس کا مزاج سرد اور تر ہے۔ گرم مزاج والوں کے لئے بہت موافق ہے۔ بہت لذیذ، مقوی اور طاقت بخش ہے۔ پیشاب آور ہے۔ سرد مزاج والوں کو مفید نہیں۔ سل، دق اور بواسیر کے مریضوں کے لئے عمدہ غذا اور دوا ہے۔ دل و دماغ، جگر اور پھیپھڑے کو طاقت بخشتا ہے۔ خون، گوشت اور قوت بڑھاتا ہے۔ گرمی کی شکایت کو رفع کرتا ہے۔ حاملہ عورت کے لئے اکسیر ہے غذا کی غذا، دوا کی دوا ہے۔

• کرونده۔ کا مزاج سرد و تر ہے۔ یہ گرم مزاج والوں کے لئے فائدہ بخش ہے۔ معدہ کو قوت دیتا ہے۔ لیکن قبض پیدا کرتا ہے۔ گرمی کی وجہ سے دست آتے ہوں تو بند ہو جاتے ہیں۔

• کھیرا۔ اس کا مزاج سرد اور تر ہے۔ دیر ہضم ہونے کے باوجود قبض کشا ہے۔ دل اور جگر کی گرمی دور کرتا ہے۔ صفرا اور خون کی تیزی اور گرمی کو کم کرتا ہے۔ جگر کا سدہ کھولتا ہے۔ پیشاب کھول کر لاتا ہے۔ گرمی کے تمام امراض میں مفید ہے۔ پیاس، یرقان اور پیشاب کی جلن میں، فائدہ بخش ہے۔ کھیرا کھانے کے بعد پانی نہ پینا چاہئے۔ ورنہ ہیضہ کا اندیشہ ہوتا ہے۔

۲۔ اپنے معدہ کی طرف سے بے پروائی نہ برتئے

انسان کے جسم میں معدہ بہت اہم عضو ہے۔ اپنے معدہ کی طرف سے کبھی بے پروائی نہ برتئے، ورنہ کئی امراض لاحق ہو سکتے ہیں۔

اگر پابندیٔ اوقات کے ساتھ معدہ میں غذا پہنچائی جائے تو وہ بہتر طور پر کام کرتا ہے۔ آپ تھکے ماندے یا فکرمند ہوں تو کم مقدار میں غذا کھائیے۔ اس کے بعد جب تکان کم ہو اور سکون ہو جائے تو کچھ اور کھا کر کمی کی تلافی کر لیجئے۔

کچھ لوگ غذا کو جلد ہضم کر سکتے ہیں، لیکن وہ ایک وقت میں زیادہ نہیں کھا سکتے۔ ان کے لئے تھوڑے تھوڑے وقفوں سے کچھ کھانا بہتر ہے۔

کھانا کھاتے وقت جذبات کو پُرسکون رکھنا چاہیئے۔ کھانا کھانے کے دوران گفتگو دلچسپ اور مسرت بخش ہونی چاہیئے۔ غم و غصہ اور ناگوار بحث و گفتگو سے احتراز کرنا چاہیئے۔

معدہ سے غلط طور پر کام لینے سے قبض لاحق ہوسکتا ہے۔ اُس سے بچنے کے لئے یا اُس کے ازالہ کے لئے قبض کُشا دوائیں کھانے سے بہتر یہ ہے کہ سبز ترکاریاں اور پھل وافر مقدار میں کھائے جائیں۔ صُبح و شام لمبی سیر کی جائے اور گہرے سانس لینے کی عادت ڈالیں۔

معدہ میں فتور پیدا ہو جائے اور نتیجہ کے طور پر دردِ شکم کی تکلیف لاحق ہو جائے تو دواؤں سے دردِ شکم میں کمی تو ہوسکتی ہے، لیکن درد ایک علامت ہے جس کے بُنیادی سبب کو دُور کرنا چاہیئے۔ ہاضمہ کی دُرستی ہی پر جسمانی صحت کا دار و مدار ہے، اِس لئے اپنے معدہ کی طرف سے کبھی بے پروائی نہ برتنی چاہیئے۔

معدہ کو دُرست حالت میں رکھنے کے لئے اِن ہدایات پر عمل کرنا بے حد فائدہ بخش ہے۔

- کھانے کے اوقات میں باقاعدگی رکھیئے۔ ہلکی ورزش بھی باقاعدگی کے ساتھ کیجیئے۔
- بدن کی تعمیر کرنے والی غذائیں وافر مقدار میں کھایئے۔ دودھ اور پانی زیادہ پیجیئے۔
- کھانا کھانے سے پہلے تمباکو یا سگریٹ نہ پیا کیجیئے۔
- اپنے معمولات بالخصوص فِطری ضروریات کے لئے باقاعدگی کی عادت ڈالئے۔
- دانتوں کی صحت اور صفائی کا خاص اہتمام رکھا کیجیئے۔ اور جب ضرورت ہو ماہرِ دندان سے مشورہ کرنے میں بے پروائی ہرگز نہ کیجیئے۔

۳۔ ایک بڑی غلط فہمی

آج کے معاشرہ میں یہ ذہنیت روز بروز ترقی پذیر ہے کہ شادی کا پھندا انسان کو مقیّد و پابند کر کے زندگی کو دُوبھر بنا دیتا ہے۔ یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ مختلف ممالک کے اعداد و شمار سے یہ حقیقت آشکار ہو گئی ہے کہ شادی شُدہ لوگ غیر شادی شُدہ لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ عُمر تک زندہ رہتے ہیں۔ شادی شُدہ لوگوں کی زندگی غیر شادی شُدہ لوگوں کی زندگی سے زیادہ پُر مسرّت ہوتی ہے۔

مجرّد زندگی کے مقابلہ میں شادی شُدہ زندگی زیادہ صحیح، صحت مند اور باقاعدہ ہوتی ہے۔ بیس سال سے اُوپر کی عُمر کے سارے مرنے والوں میں غیر شادی شُدہ لوگوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ شادی کے بعد بے اعتدالیاں اور بے احتیاطیاں بہت کم ہو جاتی ہیں۔ نظم و باضابطگی کی عادتیں شادی کی زندگی کا اہم جُز ہیں۔ شادی سے جسمانی توانائی اور دل و دماغ کی صحت مندی کی بُنیادیں مُستحکم ہوتی ہیں۔

اعداد و شمار سے انکشاف ہوا ہے کہ شادی شُدہ مردوں کے مقابلہ میں غیر شادی شُدہ مردوں کی زبوں حالی زیادہ بڑھی ہوتی ہے۔

شادی ذمّہ داری کا احساس پیدا کر دیتی ہے، جس کی

وجہ سے شادی شدہ مرد و عورت بہت سے خطرات سے خود کو محفوظ سمجھتے ہیں اور محتاط رہتے ہیں۔ ایسی شادی سے جو واقعی شادی کے نام کی مستحق ہو، جو صحیح معنوں میں شادی ہو، شوہر اور بیوی کو ایک دوسرے کی مستقل رفاقت و تعاون حاصل ہوتا ہے۔ جس میں اپنے رفیقِ حیات کو ہر طرح کے رنج و غم اور ہر طرح کے خطرہ اور پریشانی سے محفوظ رکھنے کا پُرخلوص جذبہ شدت سے موجود ہوتا ہے۔ شوہر اور بیوی ایک دوسرے کی صحت کے متعلق معمولی سے معمولی بیماری میں بھی احتیاط اور حفظِ ماتقدم کی تدابیر سے کام لیتے ہیں اور طبی مشورہ کی طرف جلد از جلد متوجہ ہوتے ہیں، تاکہ مرض کوئی خطرناک صورت اختیار نہ کر سکے۔ غیر شادی شدہ لوگ ایسی باتوں کی ذرا بھی پروا نہیں کرتے۔

یہ حقیقت ہے کہ شادی شدہ لوگوں کی عادتیں بہتر اور زیادہ باقاعدہ ہوتی ہیں۔ وہ سونے، بیٹھنے، کام کرنے، آرام لینے اور خاص کر کھانے پینے میں بہت احتیاط برتتے ہیں۔ اپنے بچوں کے لئے زیادہ سے زیادہ دنوں تک زندہ رہنا چاہتے ہیں۔

۴ — دُنیا ایک آئینہ خانہ ہے

یہ آپ پر موقوف ہے کہ آپ اپنی زندگی کا دامن حزن و ملال کے کانٹوں سے بھر لیں یا مسرت و شادمانی کے پھولوں سے بھر لیں۔ مشہور مفکر ڈاکٹر مارڈن نے لکھا ہے — "ایک شخص کا ہر جگہ خوشی اور مسرت انتظار کرتی ہے۔ وہ جہاں جائے گھر ہو یا بازار، دفتر ہو یا دوکان، مسرت اور شادمانی اُس کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ ہر آدمی اُس سے مل کر خوش ہوتا ہے۔ اُس کی مدد کرکے، اُس کے ساتھ دو میٹھے بول بول کر اُسے سکون و مسرت بخشتا ہے۔ ایک دوسرا آدمی ہے جو ہر بات پر تلخ ہو جاتا ہے۔ اُس کے ابرو تن جاتے ہیں، ناک پھول جاتی ہے۔ وہ ہر شخص پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ اُسے کہیں خوشی اور مسرت نظر ہی نہیں آتی۔ اُسے ایسی کوئی چیز نظر نہیں آتی جسے دیکھ کر اُس کے لبوں پر تبسم نمودار ہو۔ وہ دُنیا کو ایک تنگ و تاریک سرد خانہ سمجھتا ہے، جس میں بغیر روشنی کے جاتے ہوئے بھی خوف معلوم ہوتا ہے۔ دُنیا والے بھی اِس سے اُس سے ویسا ہی سلوک کرتے ہیں۔ اِس لئے کہ دُنیا ایک گنبدِ گراں ہے۔ ہم دوسروں سے جو کہیں گے، اُسی کی گونج، وہی گونج ہمارے کان سنیں گے۔ دُنیا ایک آئینہ خانہ ہے جس میں داخل ہو کر ہم اپنا عکس جا بجا دیکھتے ہیں!"

منی آرڈر بھیجتے وقت کوپن منی آرڈر پر ضرور تحریر فرمائیے کہ رقم کس سلسلے میں بھیجی گئی ہے تاکہ تعمیلِ ارشاد میں دیر نہ ہو۔ خط و کتابت کرنے اور منی آرڈر بھیجنے کے لئے پتہ رسالہ بیسویں صدی دہلی نمبر ۶ لکھنا کافی ہے۔ منیجر

آج ہی اپنے گرتے بالوں کا کوئی علاج کیجیے





کل غالباً بہت دیر ہو چکی ہوگی!

آج ہی سے پیور سلوکرین کا استعمال شروع کر دیجیے۔ یہ فارمولا سائنسی طور پر تحقیق کرنے اور آزمانے کے بعد ترتیب دیا گیا ہے جو (۱) گرتے بالوں کو روکنے میں مدد دیتا ہے (۲) ۱۷ نہایت ضروری پروٹینوں کو ملا کر بنایا گیا ہے۔ تاکہ آپ کے بالوں کی جڑوں کے نیچے تک پہنچ کر انہیں ایسی قوت عطا کرے کہ بال پھر سے صحتمند اور گھنے پیدا ہونے لگیں۔



اس بات کا ثبوت کہ پیور سلوکرین بالوں کا گرنا روک دیتا ہے۔



بال باریک اور غیر صحتمند پیدا ہوتے ہیں کیونکہ ان کی جڑوں میں نہایت اہم امینو ایسڈ نہیں ہوتی۔ اگر اس کی اصلاح نہیں کی گئی تو نتیجتاً بال کمزور ہو کر ٹوٹنے اور گرنے لگتے ہیں۔



پیور سلوکرین کا ایک قطرہ (بڑا کر کے) نام کے تمام ۱۷ امینو ایسڈ پر مشتمل ہے۔ اور اس میں وہ قدرتی پروٹین بھی ہے جو صحتمند بالوں کی پیدائش کے لئے ضروری ہیں۔ پیور سلوکرین تیزی کے ساتھ بالوں کی جڑوں میں گہرائی تک جا پہنچتا ہے اور انہیں وہ اہم پروٹین عطا کرتا ہے جو آپ کے بالوں کی گھنی اور صحتمند پیداوار کے لئے ضروری ہے!

آج سے ہی پیور سلوکرین کے ذریعے علاج شروع کر دیجیے!

پیور سلوکرین کا استعمال باقاعدگی کے ساتھ کیا جانا چاہیے تاکہ بہترین نتائج حاصل ہوں۔ ہر روز اپنے سر پر دن میں دو بار ناپی ہوئی مقدار میں پیور سلوکرین لے کر مالش کیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ کے سر میں بہتر بال اُگنے لگے ہیں اور وہ زیادہ صحتمند دکھائی دیتے ہیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں لاجواب پیور سلوکرین سے علاج کی بدولت آپ کے بالوں میں اصلی بالوں کی طرح اُگنے کی قوت آجائے گی۔

پیور سلوکرین

بالوں کیلئے قدرتی پروٹینی غذا

mcm/S/13 ur

سوال و جواب

سرگوشیاں

اس عنوان کے تحت قارئین کے منتخب اور دلچسپ سیاسی، معاشی، تمدنی، علمی، ادبی سوالات کے جوابات دئے جاتے ہیں فلمی، اخلاق و تہذیب سے گرے ہوئے اور فحش دعریاں سوالات شاملِ اشاعت نہیں کئے جاتے۔ ہر شخص خواہ وہ "بیسویں صدی" کا خریدار ہو یا نہ ہو زیادہ سے زیادہ تین سوال بھیج سکتا ہے۔ سوالات مختصر اور خوشخط لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لئے جگہ چھوڑنی لازمی ہے ورنہ جواب نہیں دیا جائے گا۔ سوالات بھیجتے وقت یہ خیال رکھئے کہ اس عنوان سے ہمارا مقصد قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنا ہے۔

(ایڈیٹر "بیسویں صدی" دہلی)

نسرین جمیل۔ لکھنؤ

س۔ اُردو کا پہلا ڈرامہ؟

ج۔ "اندر سبھا"

س۔ اُردو کا پہلا عوامی شاعر؟

ج۔ نظیر اکبرآبادی۔

س۔ اُردو کا سب سے پہلا اخبار؟

ج۔ اُردو کا سب سے پہلا اخبار "اُردو اخبار" تھا جسے مولانا محمد حسین آزاد نے جاری کیا تھا۔ کئی تذکروں میں لکھا ہے اُردو کا پہلا اخبار "اُردو اخبار" مولوی باقر علی نے دہلی سے جاری کیا تھا۔

کلام احمد آرزو۔ ہزاری باغ

س۔ کیا امرود صحت بخش پھل ہے؟

ج۔ مناسب طریقے سے کھایا جائے تو امرود صحت بخش پھل ہے۔ فرحت و طاقت بخشتا ہے۔ دل و دماغ اور معدے کو طاقت دیتا ہے۔ اسے نمک مرچ چھڑک کر کھانا کھانے سے پہلے کھانا مفید ہے۔ اس طرح بھوک بڑھتی ہے۔ کھانا کھانے کے بعد امرود نہ کھانا چاہئے قبض پیدا کرتا ہے۔

س۔ انسان کو وقت کا احساس کب ہوتا ہے؟

ج۔ جب وقت ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔

نعیم الحق مجروح۔ ہزاری باغ

س۔ غم کو بھلانے کے لئے کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ غم کو خوشی بنالینا چاہیئے۔

س۔ برسات کا موسم آگیا ہے۔ مکئی کے بارے میں کچھ بتائیے۔

ج۔ مکئی سرد و خشک طاقت بخش غلّہ ہے۔ مکئی گوشت اور خون پیدا کرتی ہے۔ طاقت بڑھاتی اور پھولے ہوئے جسم کو اعتدال پر لاتی ہے۔ مکئی کا تازہ بُھٹا بھون کر کھانا معدے کو طاقت دیتا اور خون پیدا کرتا ہے۔ مکئی بہت مقوّی غذا ہے۔ اس میں روغنی اجزاء بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔ یہ قدرے قبض کرتی ہے۔

نواب اصغر علی۔ دھنباد

س۔ خوشی کس کے نصیب میں نہیں لکھی ہوتی؟

ج۔ کسی کے نصیب میں خوشی یا غم لکھا نہیں ہوتا۔ یہ انسان کے عزم و عمل پر موقوف ہے۔ وہ اپنی زندگی کا دامن خوشی کے پھولوں سے بھرلے یا غم کے کانٹوں سے۔

س۔ عورت کا سب سے اچھا زیور کیا ہے؟

ج۔ شرم و حیا۔

س۔ رشوت لینا گناہ ہے یا جُرم؟

ج۔ رشوت لینا گناہ بھی ہے اور جُرم بھی۔

غفران اللہ۔ ٹانڈہ۔ فیض آباد

س۔ مذہب کیا ہے؟

ج۔ بہترین ضابطۂ حیات۔

س۔ سماج واد کے معنی کیا ہیں؟

ج۔ سوشلزم۔

س۔ "پرچھائیاں" اور "تلخیاں" کے علاوہ ساحر لدھیانوی کے اور کون سے مجموعے ہیں؟

ج۔ "گاتا جائے بنجارہ" اور "آؤ اِک خواب بنیں" بھی اِن کے کلام کے مجموعے ہیں۔

ایم۔ احسان قاسمی۔ پورنیہ

س۔ کیا پیڑوں میں بھی کینسر کی بیماری پائی جاتی ہے؟

ج۔ ہماری نظر سے یہ تحقیق ابھی تک نہیں گزری۔

س۔ بھنڈی کے فوائد اور نقصانات سے آگاہ فرمائیں۔

ج۔ بھنڈی دیر ہضم سبزی ہے۔ ہاضمہ کے لئے نقصان دہ اور قوتِ باہ کے لئے بہت مفید ہے۔ خون پیدا کرتی ہے، ہاضمے کی خرابی میں اور چھوٹے بچے کی ماں کو بھنڈی نہ کھانی چاہیئے۔

س۔ آٹے کو گرم پانی سے گوندھنا چاہیئے یا ٹھنڈے پانی سے؟

ج۔ دونوں طرح گوندھ سکتے ہیں۔ گرم پانی سے گوندھنا بہتر ہے۔

محمد ظہیر نظامی۔ دھنباد

س۔ غم کا کیا علاج ہے؟

ج۔ غم کو خوشی بنا لیں۔

س۔ آج کے منسٹروں سے فلم ایکٹروں کی عزت بڑھ گئی ہے۔ ایسا کیوں؟

ج۔ اِس لئے کہ فلم ایکٹر عوام کو دھوکا نہیں دیتا۔ خود غرض اور خویش پرور نہیں ہوتا۔

نہال چند۔ غازی آباد

س۔ دُنیا کا سب سے بڑا مُلک چین ہے؟

ج۔ دُنیا کا سب سے بڑا مُلک روس ہے۔ اُس کا کچھ حصّہ ایشیا میں ہے، کچھ یورپ میں ہے۔

گلفام نسرین قریشی۔ گورکھپور

س۔ ہندوستان کی سب سے بڑی لائبریری کہاں ہے؟ اُس میں کتنی کتابیں ہیں؟

ج۔ ہندوستان کی سب سے بڑی لائبریری کلکتہ میں ہے۔ اُس میں پانچ لاکھ، سات ہزار کتابیں ہیں۔

نجیب الرحمٰن۔ سدی پیٹ۔ تلنگانہ

س۔ جگر کا ایک ادبی شعر سنائیے۔

ج۔ بے ادبی معاف! جگر کے بارے میں ایسا کہنا بڑی بے ادبی ہے۔ جگر کے سارے اشعار ادبی ہیں۔ ایک شعر سُنئیے ؎

کیا بتاؤں کس قدر زنجیرِ پا ثابت ہوئے
چند تنکے جن کو اپنا آشیاں سمجھا تھا میں

م۔ ع۔ غنی۔ سداسیو پیٹ

س۔ کیا یہ سچ ہے کہ گہرے مطالعہ سے دماغ پر اثر پڑتا ہے اور دماغ خراب ہوتا ہے؟

ج۔ یہ صرف وہم ہے۔ گہرے مطالعہ سے دماغ خراب ہونے کی بات جس نے کہی ہے اُس کا مطالعہ گہرا نہ ہوگا۔

س۔ دُنیا کے سات عجائبات کون سے ہیں؟

ج۔ کبھی دُنیا میں صرف سات عجائبات تھے، اب تو ساری دُنیا ہی عجائب خانہ ہے!

م۔ کاظمی۔ مدھوپور۔ بہار

س۔ عورت کا سب سے اچھا رُوپ؟

ج۔ ماں!

عبدالحفیظ۔ دربھنگہ

س۔ شادؔ مرحوم کا کوئی خوبصورت قطعہ سنائیے۔

ج۔ سُنئیے ؎

کچھ مرقع ہیں شادمانی کے
چند عنواں ہیں اک کہانی کے
چاندنی، زلف، رقص، شعر، شراب
مختلف نام ہیں جوانی کے

س۔ اقبالؔ کے اشعار میں زیادہ گہرائی ہے یا غالبؔ کے اشعار میں؟

ج۔ غالبؔ کے اشعار میں زیادہ گہرائی ہے۔ اقبالؔ کے اشعار میں زیادہ گیرائی ہے۔

س۔ دو بوند آنسو اور دو بوند پانی میں کیا فرق ہے؟

ج۔ آپ نے آنسو کی وضاحت نہیں کی — مگرمچھ کے آنسو، بناسپتی لیڈر کے آنسو یا خویش پرور خود غرض لیڈر کے آنسو، یا انسانیت کے درد سے بھیگے ہوئے دیدۂ تر کے آنسو؟

مسرت جہاں۔ لکھنؤ

س۔ بھائی جان! کچھ اچھی باتیں بتائیے۔ اپنی بیاض میں اچھے اشعار اور اچھی باتیں محفوظ کرنے کا مجھے بہت شوق ہے۔

ج۔ • صحت مند رہنا چاہتے ہو تو کھانے کی حرص سے بچو۔

• سیر ہو کر کھانا مباح ہے۔ اس سے زیادہ کھانا ممنوع ہے۔

• اعتدال کو اپنا شیوہ بناؤ۔ دولتمند ہو کر آپے سے باہر اور غریب ہو کر شکستہ خاطر نہ ہو جاؤ۔

• دانا وہ ہے جو کم بولے اور زیادہ سُنے۔

• دُنیا ایک خوبصورت کتاب کی طرح سبق آموز ہے لیکن اُس کے لئے بیکار ہے جو اُسے پڑھ نہیں سکتا۔

س۔ کچھ اچھے اشعار سنائیے۔

ج۔ سُنئے ؎

بشر سے جذبۂ تخلیق کو نکھرنے دو
زمیں ستارے بنائے نئے آسماں کے لئے

•

غبار راہ کو لے جاؤ آسمانوں تک
یہ اہل عزم کا تحفہ ہے آسماں کے لئے

•

وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا

•

جو غم حد سے زیادہ ہو خوشی نزدیک ہوتی ہے
چمکتے ہیں ستارے رات جب تاریک ہوتی ہے

•

پھیلی ہے میرے لب پہ تبسم کی چاندنی
جلتی ہے غم کی آگ میں گو زندگی تمام

سید ثروت حسین۔ سیتاپور

س۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی کتنی ہے؟

ج۔ ۷ کروڑ۔

س۔ غالبؔ کی تاریخِ پیدائش اور تاریخِ وفات بتائیں۔

ج۔ غالبؔ دسمبر ۱۷۹۵ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء میں انتقال ہوا۔

س۔ باپ کے قدموں میں سعادت ہے تو ماں کے قدموں میں؟

ج۔ ماں کے قدموں میں جنت ہے۔

کملا کانت۔ الہ آباد

س۔ ہمارے ایک دوست نے بتایا کہ ہندوستان میں دس کروڑ روپے کی سالانہ شراب پی جاتی ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟

ج۔ جی ہاں۔ ایک اخباری بیان کے مطابق صرف یو۔پی میں پانچ لاکھ روپیہ ماہانہ کی مزید دیسی شراب کی کھپت کی وجہ سے حکومت یو۔پی کو تین سے چار لاکھ روپیہ کی ماہانہ مزید آمدنی ہوتی ہے۔

عائشہ ساحل۔ جھمری تلیا

س۔ انسان اپنی نظروں سے کب گر جاتا ہے؟

ج۔ جب کوئی غلط کام کرنے پر اُس کا ضمیر اُسے ملامت کرنے لگتا ہے۔

محمد شفیق۔ بحرین

س۔ ہر وقت سوچوں میں کھویا رہتا ہوں۔ ہزاروں خیالات ذہن میں کھولتے رہتے ہیں، کیا کروں؟

ج۔ اپنے ذہن کو اچھے خیالات کی آماجگاہ بنا لیجئے۔ پھر طرح طرح کے خیالات ذہن میں نہ آئیں گے۔

س۔ بھیا! ایک اچھا افسانہ نگار بننے کے لئے آپ کے خیال میں کیا کیا ہونا ضروری ہے؟

ج۔ وہ سب کچھ جو آپ ایک اچھے افسانہ نگار میں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔

اگلا بچہ ہونے سے پہلے ذرا سوچئے

کیا آپ اس بچے
کی صحیح دیکھ بھال
نہیں کرنا چاہیں گے ؟



اس کے روشن مستقبل کیلئے اعلیٰ تعلیم کی شروعات اور باقی سبھی ضرورتوں کو پورا کرنے کا انتظام ... لیکن اگر بچہ جلد ہو گیا تو یہ سب کچھ کرنا آپ کے لئے مشکل ہوگا۔ آپ اس پریشانی سے ضرور بچنا چاہیں گے۔

نِرودھ کی مدد سے اب آپ اگلے بچے کی پیدائش کو تب تک ٹال سکتے ہیں، جب تک آپ اسکی پوری دیکھ ریکھ کرنے لائق نہیں ہو جاتے۔

نِرودھ مردوں کیلئے ہے۔ ربڑ سے بنا حمل روکنے کا یہ آسان ذریعہ برسوں سے ساری دنیا میں مقبول ہے۔ آپ بھی نِرودھ استعمال کیجئے۔

نِرودھ ہر جگہ ملتا ہے۔ سرکاری رعایتی دام، 15 پیسے میں 3



جب تک نہ چاہیں تب تک نہ پائیں سنتان

نِرودھ

لاکھوں میں مقبول، بے ضرر اور آسان

کریانہ فروشوں، دوا فروشوں، پنساریوں، پان و سگریٹ کی دکانوں وغیرہ کے یہاں بکتا ہے۔

davp 72/658

ایم صلاح الدین انور۔ کریم گنج گیا

س۔ دُنیا کے سارے مرد اگر اندھے ہوجائیں تو؟

ج۔ دُنیا کے سارے مرد اندھے ہوجائیں تو آپ کے اِس معلومات افزا اور قابلِ داد سوال کو پڑھ کر داد کون دے گا!

س۔ غم اور آنسو میں کیا رِشتہ ہے؟

ج۔ پھول اور خوشبو کا۔ جسم اور لہو کا۔

محمد زبیر محمد طاہر۔ محمد آباد گوہنہ

س۔ کیا سماج کے ضابطوں کا احترام ضروری ہے؟

ج۔ جی ہاں، اگر ایسا نہ ہو تو معاشرہ بے راہ رو ہوجائے گا۔

س۔ ہندوستان میں کس زبان میں سب سے زیادہ رسائل چھپتے ہیں؟

ج۔ ہندی میں۔ اِس لئے کہ ہندی کے حامیوں کے پاس وسائل ہیں۔ ہندی کے حامیوں میں اپنی زبان کو فروغ دینے کا جذبہ جنون کی حد تک ہے۔

س۔ زندگی کا حُسن کیا ہے؟

ج۔ بلند کردار!

ارشاد احمد۔ بدنیرہ۔ امراوتی

س۔ خوشتر بھیا! کیا ہر کامیابی پہلے خوابوں اور خیالوں ہی میں جنم لیتی ہے؟

ج۔ جی ہاں۔ مشہور مفکر نپولین ہل نے یہی لکھا ہے۔

س۔ مومن کا کوئی شعر سنائیے۔

ج۔ عمر ساری تو کٹی عشقِ بُتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

س۔ بھیا! آپ کوئی لطیفہ سُنا سکتے ہیں؟

ج۔ یہ لطیفہ کس لطیفہ سے کم ہے کہ آپ ہم سے لطیفہ سُننا چاہتے ہیں!

محمد تبارک علی صابری۔ سدّی پیٹ

س۔ دماغی صلاحیتوں میں اضافہ کرنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے؟

ج۔ خیال افروز کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

غالب محمد خاں۔ علی گڑھ

س۔ اندرا گاندھی کے مسلم چمچوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج۔ اندرا گاندھی کے مسلم چمچوں کا تصور بے جا اتہام ہے۔

س۔ کیا آپ ہندوستان کی موجودہ اندرا حکومت کو جمہوری حکومت کہہ سکتے ہیں؟

ج۔ یقیناً کہہ سکتے ہیں! کیا آپ کو اِس میں کلام ہے؟ ہندوستان میں جمہوری حکومت نہ ہوتی تو ہر شخص من مانی کرنے اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے اِتنا آزاد نہ ہوتا!

فیاض احمد آرزو۔ ڈیسر گڑھ

س۔ بیوی کب حسین نظر آتی ہے؟

ج۔ اپنی فرمائش پوری نہ ہونے پر بھی جب مُسکراتی ہے۔

س۔ جب ارمان پورے نہ ہوں تو؟

ج۔ صرف آرزو کرنے سے ارمان پورے نہیں ہوتے۔ ارمان پورے کرنے کے لئے جدّوجہد کرنی چاہیئے۔

س۔ محبت کا نتیجہ شادی ہو تو؟

ج۔ ایسی شادیاں حُسنِ اتفاق سے اپنے ساتھ شادمانی لے کر آتی ہیں۔

مِس کملا دویدی۔ نئی دہلی

س۔ میری مادری زبان ہندی ہے۔ لیکن مجھے اُردو سے بے اِنتہا پیار ہے۔ اُردو زبان کی شان میں کچھ اشعار سنائیے۔

ج۔ طاہرہ سعید کے یہ اشعار سُنئے:

کتنی میٹھی زباں، کیسی پیاری زباں
میری اُردو زباں، فخرِ ہندوستاں
اِس میں رادھا کے پائل کی جھنکار ہے
زُلفِ زیب النساء کی بھی مہکار ہے
اِس میں جھانسی کی رانی کی للکار ہے
اِس کے دامن میں ہیں کتنی رنگینیاں
میری اُردو زباں، فخرِ ہندوستاں

●

ہند ماتا کی بیٹی ہے اُردو زباں
سانولی، چلبلی، نوجواں، گلفشاں
ہندو مُسلم کے اخلاص کی داستاں
اتّحاد و محبّت کا قومی نشاں
کیوں اِسے غیر کہتا ہے ناقدرداں
میری اُردو زباں، فخرِ ہندوستاں

غلام احمد خلیل۔ سداسیو پیٹ

س۔ شباب اور شراب میں کیا فرق ہے؟

ج۔ شراب کا نشہ جلد ہی ٹوٹ جاتا ہے۔ شباب کا نشہ شراب کے نشہ سے دیرپا ہوتا ہے۔

مشہور مصنفین کے مشہور ناول اور کتابیں

اردو ادب میں سکھوں کا حصہ	امام مرتضیٰ نقوی	۱۵/--
آج کی سائنس	اندرجیت لال	۵/۴۰
اقبال کے ابتدائی افکار	عبدالحق	۱۰/--
اسیر حرص	آغا حشر کاشمیری	۱/۵۰
آٹھواں سمندر	واجدیلہ	۴/۵۰
اعمال قرآنی		۱/۵۰
ایڈوڈیٹ اینگ ماسٹر		۲/۵۰
آہنگ	مجاز	۴/۵۰
آہنگ غزل	پورن سنگھ ہنر امرتسری	۲/۵۰
اقبال کا فلسفۂ حیات و شاعری	محمد عدیل عباسی	۶/--
اقبال اور اس کا عہد	جگن ناتھ آزاد	۳/--
اندرجالی		۴/--
آوارہ رجعین	ابراہیم اسلوی	۴/--
افکار محروم	مالک رام	۵/--
اجنبی	وشنو ناتھ درد	۵/--
۱۹۷۱ء کی منتخب شاعری	پریم گوپال متل	۴/--
آہنگ حجاز	عرش ملسیانی	۱/--
آئینہ اصلاح	جوش ملسیانی	۵/--
آواز کا جسم	مخمور سعیدی	۱۰/--
آوازیں	پورن کمار ہوش	۳/--
آخرت کا سفرنامہ	وحید الزماں	۲/۵۰
آشادیپ بجھے نا	ست پرکاش سنگھ	۲/--
اینگلو پنجابی ڈکشنری	ہرمہندر سنگھ	۷/۵۰
بے نام گلیاں	کلام حیدری	۲/۲۵
باقیات فانی	فانی بدایونی	۳/۵۰
بانگ درا	علامہ اقبال	۶/--

باقیات اقبال	سید عبدالواحد ایم اے	۲/۵۰
بی بی عائشہ		۰/۷۵
باسٹھ دن	دت بھارتی	۲/۵۰
بغیر بجلی کا ریڈیو	اے۔ بی ماتھر	۱/۷۵
بوٹ پالش		۲/--
ترقی پسند ادب	عزیز احمد	۴/--
تبسم غم	وسیم بریلوی	۲/۵۰
تاریخ الامت	مولانا محمد اسلم جیراجپوری	۴۲/۵۰
تفسیر عام فہم اردو		۱/۲۵
توبۃ النصوح		۴/--
تیس مار خاں کے کارنامے	م ندیم	۱/۵۰
تبسم و قہقہے	ایم۔ اے۔ خاں	۳/--
تمباکو کی دکان		۲/۵۰
حرف نیم شب	شمیم کرہانی	۶/--
جینے کے لئے	ستیہ پال آنند	۲/۵۰
جواہر خمسہ		۸/--
خاندانی منصوبہ بندی	اے۔ سی بہار	۱/--
خدانخواستہ	شوکت تھانوی	۴/--
جنون ہوش	جوش ملسیانی	۴/--
جانم	گلزار	۳/--
دسوتی کشیدہ کاری		۳/--
دار و رسن کی آزمائش	نکولائی آستراوسکی	۲/--
دو قدم ایک منزل	شلیال قدوائی	۵/--
داغ رسوائی	چندر موہن لاٹیہ	۳/۵۰
درخشاں	حفیظ بنارسی	۵/--
دوشیزۂ پاکستان	ایم۔ اسلم	۶/۵۰

دشمن کون	ضیاء عظیم آبادی	۴/--
دل کی وادیاں سو گئیں	کرشن چندر	۳/--
ذکر خوباں	محمد منشاء الرحمن خاں منشا	۲/--
ذکر آزاد	ملیح آبادی	۷/--
چنبل کی چمبلی	کرشن چندر	۴/۵۰
رنج افکار	واجد سحری	۶/--
رضیہ کا شاہی دسترخوان	رضیہ سلطانہ	۳/۵۰
ریگ رواں	رشی پٹیالوی	۴/--
رات اندھیری ہے	مہندر ناتھ	۲/۵۰
رشیدہ کی کشیدہ کاری		۳/۵۰
ریڈیو ٹرانجسٹر		۴/۵۰
روحانی عورت	مجاز اعظمی	۲/--
رقص حیات	پرویز شاہدی	۳/۵۰
رنگینیاں	شکیل بدایونی	۳/۵۰
سیاہ پوش خاتون	ناز انصاری	۲/--
سوویت یونین پروگرام		-/۳۰
ستاروں سے ذروں تک	جگن ناتھ آزاد	۲/۷۵
سکھ	نائل ملیح آبادی	۱/۵۰
سحر نغمہ	ساحر ہوشیارپوری	۱۰/--
سریلی بانسری	آزاد لکھنوی	۳/۷۵
ستاروں کے قیدی	ظفر پیامی	۲/--
سر وادی سینا	فیض احمد فیض	۲/--
سحر غزل	ساحر ہوشیارپوری	۳/--
سیاہ تاج محل	موہن یاور	۳/--
شرعی نماز	وحید الزماں قاسمی	۲/--
شمع ہدایت	بشیر دہلوی	۲/۵۰

پتہ :- رسالہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی نمبر ۲

بلراج سکسینہ۔ شملہ

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں اقوامِ متحدہ کے ممبر ممالک کی تعداد کتنی ہے؟

ج۔ تقریباً ۹۹۔

س۔ اقوامِ متحدہ کے ممبر کچھ ایسے ممالک کے نام بتائیے جو زیادہ مشہور نہیں ہیں؟

ج۔ ٹوگو۔ پیراگوئے۔ ایتھوپیا۔ میکسیکو۔ یوراگوئے۔ ہونڈورس۔

سعادت حسین۔ رامپور

س۔ ویت نام کی جنگ پر کتنے روپے خرچ ہوئے ہوں گے؟

ج۔ ۱۲ سالوں کی اس طویل جنگ پر اتنے روپے خرچ ہوئے کہ سن کر آپ کو حیرت ہوگی۔ امریکہ کے محکمۂ دفاع نے انکشاف کیا ہے کہ امریکہ نے ۱ کھرب، ۲۷ ارب ۵۰ کروڑ روپے خرچ کئے۔ اس جنگ میں ہونے والے مشرقِ بعید کے متعدد مستقروں کے اخراجات شامل کر لیے جائیں تو اخراجات ایک کھرب ۵۰ ارب روپے ہو جائیں گے۔

شوکت انجانا۔ آسنسول

س۔ بھائی جان اعنایت ہوگی اگر آپ فکر تونسوی کا پتہ تحریر کریں۔

ج۔ آپ فکر صاحب کو اس پتہ پر خط لکھ سکتے ہیں ——

جناب فکر تونسوی، معرفت اخبار "ملاپ" متھرا روڈ، نئی دہلی —— انھیں "بیسویں صدی" کی معرفت بھی خط بھیج سکتے ہیں۔

س۔ عظیم شاعر اقبال کا ایک شعر سنائیے۔

ج۔ سنئے ؎

اے طائرِ لاہوتی اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

س۔ یہ شعر کس کا ہے ؎

نہیں تیرا بسیرا قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

ج۔ یہ شعر بھی علامہ اقبال کا ہے۔

محمد احمد علی روشن۔ تلکنڈہ

س۔ ہندوستان میں فسادات کی روک تھام کب ہوگی؟

ج۔ جب فسادات کرانے والوں کو عبرتناک سزائیں دی جائیں گی۔

س۔ مظلوم کی آہ کب اثر دکھاتی ہے؟

ج۔ جب دل سے نکلتی ہے۔

آہ جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

محمد ناصر پٹیل نیوپل۔ قلابہ

س۔ بغیر دوست کے زندگی؟

ج۔ بغیر دوست کے زندگی ادھوری ہوتی ہے۔ ایک مفکر نے کہا ہے —— ہر انسان کو ایک ایسا دوست ضرور بنانا چاہیے جو اس کا جاں نثار دوست ہو۔

س۔ عورت اپنے غم کا اظہار آنسوؤں سے کر سکتی ہے، لیکن مرد؟

ج۔ مرد سرد آہوں سے بھی اپنے غم کا اظہار کرتا ہے۔

س۔ زیادہ سوچنا انسان کے لیے مضر ہے، پھر بھی سوچتا ہوں۔ کیا کروں؟

ج۔ زیادہ سوچنا انسان کے لئے مضر ہے، لیکن اتنا مضر نہیں کہ آپ اتنے فکرمند ہوں کہ یہ فکر اس سے زیادہ مضر ثابت ہو۔

شمیم الدین صفی پور۔ اُناؤ

س۔ موہن کمار منگلم جس جہاز میں سفر کر رہے تھے وہ آپ کے بہت نزدیک ہی گرا ہے۔ وہ جہاز کی خرابی سے گرا یا کہیں ٹکرا گیا تھا؟

ج۔ کمانڈر اور معاون کمانڈر کی غلطی سے وہ جہاز حادثہ سے دوچار ہوا۔ اس وقت آندھی آگئی تھی۔ طیارہ خطرناک حد تک نیچے اتر گیا تھا۔

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر ۔۔۔ مطبوعہ ۔۔۔ آفسیٹ پریس ۔۔۔ دہلی ۔۔۔ پتہ: دفتر بیسویں صدی، دہلی

[illegible] آپ کے سامنے ہے۔

[illegible] کو آرسی کیا؟

س۔ عورت کو دلی مسرت کب حاصل ہوتی ہے؟

ج۔ جب کوئی اس کے حسن کی تعریف کرتا ہے، خواہ وہ دل سے نہ کی جائے۔

س۔ نسل پرستی ہندوستان میں زیادہ ہے یا غیر ممالک میں؟

ج۔ ہندوستان میں۔

شکنتلا دویدی۔ الہ آباد

س۔ اندرا گاندھی نے کہاں تعلیم حاصل [کی]؟

ج۔ شانتی نکیتن میں۔ انھوں نے انگلینڈ میں بھی تعلیم حاصل کی ہے۔

س۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں ہندوستان میں بسنے والی قوموں کی آبادی کا تناسب کیا ہے؟

ج۔ بھارت سرکار کی طرف سے شائع ہونے والی ایک کتاب میں ۱۹۶۱ء کے اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی ۴۳ کروڑ ۹۰ لاکھ آبادی میں سے ۳۶ کروڑ ۶۰ لاکھ ہندو، ۴ کروڑ ۷۰ لاکھ مسلم، ایک کروڑ ۱۰ لاکھ عیسائی، ۸۰ لاکھ سکھ، ۳۰ لاکھ بودھ اور ۲۰ لاکھ جین مذہب کے ماننے والے ہیں۔

سہیلہ جبیں قریشی [illegible]

س۔ لوگ بھول کر اچھا بھی کہتے ہیں [illegible] بھی۔ ایسا کیوں؟

ج۔ اس لئے کہ بہت سی باتیں [illegible] ہوتی ہیں جنھیں بھول جانا [illegible] بہتر ہوتا ہے۔ کتنی باتیں ا[illegible] ہوتی ہیں جنھیں بھول جانا شاید نا[illegible] حاصل ہوتا ہے۔

س۔ دل کی قسمیں ——؟ دل دیوانہ، بیگانہ، دل مستانہ۔

ج۔ —— دل کی ایک اور قسم ہے — فرزانہ!



[illegible]